جامع تاریخِ ہند

محمد حبیب۔ خلیق احمد نظامی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

انٹرنٹ پر منتخب معیاری کتابوں کے لئے وزٹ کریں کتب خانہ
www.bhatkallys.com

اپنے موبائل پر انہیں حاصل کرنے کے لئے جوئن کریں ٹیلگرام چینل اخبار وافکار
https://telegram.me/akhbaroafkar

جامع تاریخ ہند

محمد حبیب۔ خلیق احمد نظامی

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک، آر۔ کے پورم، نئی دہلی-110066

JAM-E-TAREEKH-E-HIND

By

M. HABIB / K.A.NIZAMI

© قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : پہلا اڈیشن 1984
: دوسرا اڈیشن 2001 تعداد 1100
قیمت : 306/=
سلسلہ مطبوعات : 450

ناشر ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1،
آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
طابع فہمی کمپیوٹرس، دین دنیا ہاؤس، جامع مسجد دہلی۔ 110006

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

تعارف 8

دیباچہ 10

پہلا باب: ایشیائی ماحول

1- مسلمانوں میں بادشاہت اور طبقہ امراء کی ابتدا 14

2- خوارزمی سلطنت 63

3- چنگیز خاں کا عروج 87

4- عجم پر منگول حملہ 103

5- قاآن اور منگول اُو ر سات 130

6- امیر تیمور 154

دوسرا باب: دہلی سلطنت کی بنیاد

1- ترکی حملوں کے وقت ہندستان کی حالت 200

2- غوری کی تاریخ 215

3- سلطان معزالدین کی ہندستانی مہمیں (92ء-1175ء) 226

4- شمالی ہندستان کی فتح (1192-1206ء) 239

5- ترکی تسلط کی اہمیت 257

تیسرا باب: دہلی کے ابتدائی ترکی سلاطین

1-سلطان قطب الدین ایبک 274
2-سلطان شمس الدین التتمش کے نام کے سلسلہ میں اختلاف 299
3-شمس الدین التتمش کے ورثاء 331
4-سلطان ناصر الدین محمود 364
5-سلطان بلبن اور کیقباد 393

چوتھا باب: خلجی خاندان

1-جلال الدین فیروز خلجی 442
2-علاؤالدین خلجی: حصولِ اقتدار 464
3-علاؤالدین خلجی : بغاوتوں کے انسداد کی تدابیر 496
محکمہ مال گزاری میں اصلاحات
4-علاؤالدین خلجی: معاشی ضوابط 528
5-علاؤالدین خلجی، آخری منگول حملے -مالوہ اور راجستھان 556
6-علاؤالدین خلجی، دکن اور مزید جنوبی علاقہ 567
7-علاؤالدین خلجی-اواخر سال، کافور 593
8-قطب الدین مبارک شاہ خلجی 606
9-ناصر الدین خسرو خاں 629

پانچواں باب: تغلق خاندان

1-سلطان غیاث الدین تغلق (25-1320ء) 652

2-سلطان محمد بن تغلق(1324-51ء) 684
3-فیروز شاہ تغلق 797
4-فیروز شاہ تغلق کے جانشین 873

چھٹا باب: سید خاندان

1-خضر خاں 888
2-مبارک شاہ(1421-33ء) 903
3-مبارک شاہ کے جانشین 928

ساتواں باب: لودی خاندان

1-تعارف 936
2-بہلول لودی(1451-89ء) 948
3-سلطان سکندر لودی(1489-1517ء) 970
4-سلطان ابراہیم لودی(923-32ھ/1517-26ء) 988

تعارف

انڈین ہسٹری کانگریس کے زیر اہتمام "جامع تاریخِ ہند" تیار کرنے کے پروجکٹ کی اشاعتی کمیٹی اور ایڈیٹوریل بورڈ کو اس پانچویں جلد کی پیش کش پر، جو اس سلسلہ کے تحت شائع ہونے والی دوسری کتاب ہے، نہایت مسرت ہے۔ انڈین ہسٹری کانگریس نے 1940ء میں اپنے لاہور کے سیشن میں جدید ترین تحقیقات پر مبنی "جامع تاریخِ ہند" (A Comprehensive History of India) کی تیاری اور بارہ جلدوں میں اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا تاکہ وہ ہندستانی تاریخ کے طلباء کے لیے ایک حوالہ کی کتاب کی حیثیت سے کام آسکے۔ 1943ء میں علی گڑھ سیشن میں اس کام کا منصوبہ بنایا گیا اور مرتبین کے ایک بورڈ کی تقرری ہوئی اور معاونین کا انتخاب عمل میں آیا۔ ہم ڈاکٹر تاراچند کے مشکور ہیں جن کی کوششوں کی بنا پر پروجکٹ کے مالی اخراجات کے لیے مطلوبہ رقم اکٹھا کی جاسکی۔

توقع تھی کہ یہ جلدیں یکے بعد دیگرے جلد ہی تیار ہوتی چلی جائیں گی اور اس پوری اسکیم کی تکمیل میں دس سال سے زیادہ صرف نہ ہوں گے۔ تین یا چار جلدیں جن کے مسودات ہمیں حاصل ہو چکے تھے، ان کی تیاری میں ابتدائی کامیابی نے اس اُمید کو تقویت پہنچائی۔ لیکن اس اُمید کی تعمیل میں بہت سے نامساعد حالات رکاوٹ کا باعث بنے۔ متعدد مرتبین اور معاونین کی افسوس ناک موت نے بہت سی تبدیلیوں کو ناگزیر بنا دیا۔ تقسیم ملک کے بعد کے سیاسی حالات نے بھی ایسی صورت حال پیدا کر دی جو علمی مشاغل کے لیے موافق نہ تھی۔ تاہم 1951ء میں ایک جلد پریس کے حوالہ کر دی گئی لیکن اس کی اشاعت میں بھی، ایسے حالات کی بنا پر جو ہمارے بس سے باہر تھے، چھ سال صرف ہو گئے۔

ایک جلد کی اشاعت نے ہمارے اس یقین کی ہمت افزائی کی کہ دوسری جلدوں کی اشاعت میں زیادہ وقت صرف نہ ہوگا۔ لیکن دوسری جلد کی اشاعت میں پھر تیرہ سال صرف ہو گئے۔ ایڈیٹوریل بورڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے میں اس غیر

ایک جلد کی اشاعت نے ہمارے اس یقین کی ہمت افزائی کی کہ دوسری جلدوں کی اشاعت میں زیادہ وقت صرف نہ ہوگا۔ لیکن دوسری جلد کی اشاعت میں پھر تیرہ سال صرف ہوگئے۔ ایڈیٹوریل بورڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے میں اس غیر معمولی تاخیر کے لیے جو اس نوعیت کے ایک اجتماعی کام میں بسا اوقات متوقع ہے عوام سے معذرت خواہ ہوں، متعدد سال پیشتر لکھے گئے ابواب نظر ثانی کے متقاضی ہوتے ہیں اور جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں انھیں از سر نو مرتب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ترتیب کا کام وقت طلب اور صبر آزما ہوتا ہے۔ موجودہ جلد کی ترتیب میں پانچ سال صرف ہوگئے۔

میں معاون مدیران پروفیسر ایم۔ حبیب اور پروفیسر کے۔ اے۔ نظامی کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اس کام کو شوق و تندہی کے ساتھ اور اس مخلصانہ لگن کے ساتھ جس کے بغیر اس کی تکمیل تقریباً ناممکن تھی، انجام دیا۔ میں ان معاونین کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میری یاد دہانیوں کا برا نہ مانا اور ہندستانی تاریخ پر تحقیقات کے ارتقاء کی خدمت کے لیے وقت اور محنت سے دریغ کیے بغیر اس بے لوث مہم کا بیڑا اُٹھایا۔ آخر میں میں پیپلس پبلشنگ ہاؤس کے تعاون کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ان جلدوں کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی۔

اس موقعہ پر میرے لیے ان معاونین کے احسانات کا تذکرہ بھی ضروری ہے جن کے مالی تعاون نے "جامع تاریخ ہند" کی تیاری ممکن بنادی۔

بشیشور پرشاد
سکریٹری ایڈیٹوریل بورڈ

21/ مئی 1970ء

دیباچہ

"جامع تاریخ ہند" جلد 5 کے مدیران و معاونین کے لیے تاریخ کے طلباء کے سامنے ہندستانی تاریخ کی اہم تبدیلیوں و ترقیوں سے بھری تقریباً چار صدیوں پر محیط اس جلد کی پیش کش باعث مسرت ہے۔

اس جلد کا خاکہ انڈین ہسٹری کانگریس کی کمیٹی نے مرتب کیا تھا جب اس کی میٹنگ علیگڑھ میں 1943ء میں ہوئی تھی۔ کمیٹی کا منصوبہ یہ تھا کہ دہلی سلطنت کے ہر شاہی، خاندان پر ایک ایک باب ہو اور ہر صوبے کے شاہی خاندانوں (علاقائی سلطنت) کے لیے ایک باب ہو۔ ہم نے اس اسکیم میں کوئی ردوبدل نہ کیا لیکن ان برسوں کے دوران فراہم شدہ تاریخی مواد کی کثرت نے اس پلان کے حسن ترتیب میں کچھ گڑبڑی پیدا کر دی اور ابواب کو فصول میں منقسم کرنا پڑا۔ اس کے آگے، معاونین کو ذیلی فصول اور پیراگرافوں کی سرخیوں کے سلسلے میں پوری آزادی حاصل تھی۔

ہم لوگ معاونین کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہجوں کی یکسانیت کے سلسلے میں ان مشوروں پر لطف و کرم کے ساتھ غور کیا جو ہم نے ان کے سامنے پیش کیا۔ ان کے مکمل تعاون کے بغیر اس جلد کی تکمیل بہت مشکل ہو جاتی۔

ہمیں اس بات پر سخت افسوس ہے کہ ہم اعراب کے سلسلہ میں کسی اصول پر کاربند نہ ہو سکے۔ اس کے خاص اسباب یہ تھے۔ (الف) ہندستان، ایران اور عرب میں تلفظ حروف میں اختلاف (ب) ہندستان کی مختلف علاقائی زبانوں میں اعراب کے سلسلہ میں اپنائے گئے اصولوں کا اختلاف (ج) طباعت کے اخراجات اور اہلکاروں کی کمی۔ لہٰذا ہم نے اس اعلام کی ہجے شمالی و جنوبی ہند کے ان اشخاص کے تلفظ کے مطابق کی ہے جو اپنے ناموں کو ایسے ہی تلفظ کے مطابق لکھتے ہیں جو ہم تک عہد وسطیٰ سے

پہنچے ہیں لیکن حتی الوسیع ہم نے اعلام کی ہجے کے سلسلہ میں ایک یکساں اصول کی تقلید کی ہے۔ فارسی اور عربی ناموں کی ہجے کی ذمہ داری مدیران کو اٹھانی پڑی ہے اور صوبائی ناموں کی ہجے کی ذمہ داری معاونین پر ہے۔

یہ جلد ان محققین کے آپسی تعاون پر مبنی ہے جنھوں نے ہندستان کے مختلف علاقوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور ادبیات، کتبات، سکہ جات اور دیگر دستیاب بہتر شہادتوں کی بنیاد پر اپنی رائیں قایم کی ہیں۔ ہر محقق نے اپنی رائے کے مطابق لکھا ہے۔ یہ پوری جلد اس حقیقت کی بنیاد پر ایک یکسانیت کی حامل ہے کہ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ تاریخی حقائق کی مناسب طور پر تحقیق کرنے والے اشخاص یکساں نتائج پر نہیں پہنچ پاتے۔ مرتب کی حیثیت سے ہمارا فرض بس اتنا ہی تھا کہ ہم انہیں ایک دوسرے کے مضامین کی حد بندی سے مطلع رکھیں تاکہ کام میں تکرار نہ ہو۔ تاہم ہمارا اور (ہمارے) معاونین کا خیال یہ ہے کہ مختلف علاقوں سے متعلق حقائق کو ان کے معقول تناظر (Proper Perspective) میں رکھنے کے لیے ایک حد تک اس طرح کی تکرار ناگزیر ہے۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہماری پہلی کوشش یہ رہی کہ ہم مختلف معاونین کو ایک ہی وقت پر لکھنے کا کام شروع کرنے کی درخواست کریں۔ یہ بات ایک انتشار کا باعث بنی اور بعض مضامین کو ازسر نو لکھنا پڑا۔ ہماری دوسری کوشش جس کا ثمرہ یہ جلد ہے، یہ رہی کہ ہم ہر معاون کو وہ ابواب بھیج دیں جو (ان کو دیے گئے باب کے عہد سے) ماقبل دور کے متعلق تھے یا جو آس پاس کے علاقوں کی اسی عہد کی تاریخ پر محیط تھے۔ چنانچہ راجستھان کے باب کے مصنف کے لیے دہلی سلطنت کی تاریخ سے متعلق ضروری ابواب کو فراہم کیا گیا اور پھر دہلی سلطنت کی تاریخ کے سلسلہ میں جہاں کہیں تصحیح کی ضرورت ہوئی اس کے لیے ان کی رائے کو بھی استعمال میں لایا گیا۔

ہمارے اختیار میں جتنا مواد تھا اس کا محض ایک مختصر حصہ ہی کام میں لایا جا سکا ہے۔ لیکن اس جلد کا اصل مقصد ماضی کے متعلق اہم معلومات کا ایجاز کرنا ہے اور آئندہ تحقیقات کے لیے ایک نقطہ آغاز مہیا کرنا ہے۔

چونکہ ہندستان کی تاریخ ہمارے شمال اور شمال مغرب کے ممالک سے قریبی طور پر وابستہ ہے لہٰذا ہم نے یہ بہتر سمجھا کہ ہم اسلام کے عروج سے لے کر بابر کے

عہد تک ان ممالک کے ایک عام جائزہ سے اس جلد کا آغاز کریں تاکہ ہندستانی اور ایشیائی تاریخ کے ارتقاء کو زیادہ وسیع تناظر (Wider perspective) میں دیکھا جا سکے۔ اس جلد کو 1525ء پر ختم کرنے کا ارادہ تھا لیکن صوبائی (علاقائی) شاہی خاندانوں پر کام کرنے والے معاونین نے پانی پت کی پہلی لڑائی سے لے کر سلطنت مغلیہ میں ان علاقوں کے الحاق تک کی مدت کا ایک مختصر بیان (بھی) پیش کر دیا ہے۔ سلطنت وجے نگر کے سلسلہ میں اورنگ زیب کے عہد تک کے اس کے تمام شاہی خاندانوں کی تاریخ کو شامل کر لیا گیا ہے۔

فی الحال دستیاب مواد کا ہم لوگوں نے حتی المقدور اچھا مصرف لیا ہے۔ لیکن تاریخ ایک ترقی پذیر علم ہے اور اس بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ اس علم کو ابھی ہزاروں میلوں تک اور آگے جانا ہے، اگر ہم نے اسے صرف چند ہی ملی میٹر آگے بڑھانے میں کامیابی حاصل کر لی، تو ہم اس بات پر مطمئن ہیں۔ ہم ڈاکٹر تاراچند کے شکر گزار ہیں جنھوں نے عطیات مہیا کیے جن کی بنا پر اس سلسلے کا آغاز ممکن ہو سکا۔ ایڈیٹوریل بورڈ کے سکریٹری ڈاکٹر بشیشور پرشاد کے مخلصانہ اور حوصلہ افزانہ تعاون کے لیے ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں۔ پیپلس پبلشنگ ہاؤس نے بھی ہر طرح سے تعاون کیا۔

ہمیں اس بات کا شدید صدمہ ہے کہ ہم میں سے تین۔ سری نیواسا چاری، ڈاکٹر داؤر پوتا اور مسز کے۔ نور الحسن۔ اس سے قبل کے یہ جلد منظرِ عام پر آئے ہم سے رخصت ہو گئے۔

ماخذ اور مصطلحات کی فہرست اس جلد کی تعلیقات میں مذکور ہے، تاریخِ عالم اور تاریخِ ہند کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے عیسوی سن کی تقلید کی ہے لیکن جہاں ضرورت ہوئی وہاں ہندستانی سن بھی دے دیا گیا ہے۔

محمد حبیب

27/ مئی 1970ء خلیق احمد نظامی

پہلا باب

ایشیائی ماحول

1

مسلمانوں میں بادشاہت اور طبقہ امراء کی ابتداء

عرب، اسلام کے آغاز سے قبل

جزیرہ نمائے عرب، ریاست ہائے متحدہ (امریکہ) کے رقبہ کا تقریباً ایک تہائی ہے۔ لیکن یہ ایک خشک و ویران خطہ ہے۔ اور ازمنہ وسطیٰ کے حالات کے تحت اسّی لاکھ یا ایک کروڑ سے زیادہ آبادی کی کفالت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے شمال میں قوس نما زرخیز (Fertile Crescent) کا علاقہ ہے جہاں قدیم تہذیب و تمدن کے چند اوّلین آثار ہمیں ملتے ہیں۔ آپس کی متواتر خانہ جنگیوں اور غیر متمدن عرب قبائل سے اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بازنطینی اور فارسی حکومتوں نے شمال کی جانب دو چھوٹی (تابعدار) مملکتیں قایم کر دی تھیں۔ بُسترہ (Bostra) کے غسانی، بازنطینی حکومت کے زیر نگیں تھے اور حیرہ کے لخمی لوگ ایرانیوں کے۔ دونوں مملکتوں کے باشندے کہنے کو عیسائی تھے لیکن ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ عیسائیت نے ان کے دلوں میں گہری جڑیں نہیں پکڑی تھیں۔

جنوبی عرب میں موسمی بارش اتنی ہو جاتی تھی کہ باضابطہ زراعت کی جا سکے اور یہاں بھی ہمیں پرانے تمدنوں کے کچھ آثار ملتے ہیں۔ قدیم عرب کی چار حکومتیں یعنی سباء، معین، حضر موت اور قتبان میں سے پہلی تین اور یہی تینوں اہم ترین تھیں۔ کا تذکرہ عہد نامہ عتیق[1] (Old Testament) میں ہے۔ اگرچہ عرب ایک زبان کی بنا پر اسلام کے آغاز سے چند صدی قبل ہی ایک قوم ہو گئے تھے لیکن جنوبی عرب (یمنی)

---

(1) ہِتّی (Hitti)، عربوں کی تاریخ، ص 42

اور شمالی عرب (بنو مُضر) کا فرق مسلمانوں کے دور میں بھی کافی عرصہ تک قایم رہا۔ عربی میں بادشاہ کے لیے لفظ ”مَلِک“ ہے لیکن عربوں نے ”مَلِک“ کا لفظ کبھی استعمال نہ کیا سوائے غیر ملکی حکمرانوں اور غسان اور حیرہ کے شاہی خاندانوں کے واسطے، جو کہ کسی حد تک رومی اور فارسی اثرات کے تحت تھے۔ بنو کندا کے حکمراں اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے۔[1]

شمال میں غسان اور حیرہ کی مملکتوں اور جنوب میں یمن اور حضر موت کے درمیان ”خوشحال عرب“ (Arabia Felix) کا وسیع خطّہ ہے۔ دراصل یہ ”خوشحال عرب“ نہیں تھا بلکہ وہ خطہ عرب تھا جہاں باقاعدہ حکومت یا مرکزی اختیارات کبھی بھی قایم نہیں ہوئے تھے۔ آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ حجاز کے نشیبی علاقوں کا اوسط درجہ حرارت قریب اسی (80) کے بجائے نوے (90) ڈگری فارن ہائٹ کے قریب تر ہے اور مدینہ کا ستر سے کچھ اوپر۔ بڑے سے بڑا نخلستان دس مربع میل سے زیادہ نہیں اور اس کا خاص پھل کھجور ہے۔

ظاہر ہے کہ انسان بغیر سوسائٹی (معاشرہ) کے نہیں رہ سکتا اور معاشرہ کی بنیاد کسی طرح کے حفاظتی نظام پر ہی قایم کی جاسکتی ہے تاکہ معاشرہ کی ضرورت کی حد تک اشتراک و تعاون مہیا ہو۔ ”خوشحال عرب“ (Arabia Felix)۔ عرب کا وہ حصہ جس سے اولین مسلمانوں کا سروکار تھا۔ میں ’حفاظتی نظام‘ کی بنیاد خون کے رشتے پر تھی۔ خاندان فرقوں میں اور فرقے قبیلوں کی صورت میں منظم ہوئے۔ عام طور پر قبیلے انتظامی اختیارات نہ رکھتے تھے۔ بالفعل ایک عرب اپنے فرقہ کا پابند تھا۔ اگر اسے کوئی نقصان پہنچتا تو وہ اپنے فرقہ سے یہ امید کرتا تھا کہ اسے ہرجانہ دلوائے۔ اگر وہ مارا جاتا تھا تو یہ توقع کی جاتی تھی کہ اس کے فرقے والے اس کے قاتل کو قتل کریں گے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ مخالف فرقہ کے کسی شخص کو قتل کردیتے یا اس کا خون بہا ورثاء کے لیے حاصل کرتے۔ کوئی عدالت نہیں تھی لیکن مخصوص معاملات میں آپس کی رضامندی سے کوئی ثالث مقرر کیا جاسکتا تھا۔ خونی رشتہ کے تحت جو تحفظ حاصل تھا اس کو ”حلف“ یعنی باہمی حفاظت کے لیے فرقوں کے اجتماع اور ”جوار“ یعنی طاقتور

---

(1) ایضاً، ص28

فرقہ کی جانب سے کمزور فرقہ کی مدد کے ذریعہ مستحکم کیا جا سکتا تھا۔ فرقہ یا قبیلے کی جنگیں پھیلتی جاتی تھیں اور برسوں تک جاری رہتی تھیں۔ گبن (Gibbon) لکھتا ہے کہ ”روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ (حضرت) محمدؐ سے قبل جہالت کے دور میں سترہ سو جنگیں ہوئیں۔[1] اصل جنگ سے زیادہ مستقل خوف تھا جو ان لوگوں کے دماغوں پر آسیب کی طرح مسلط رہتا، جن کے فرقے برسرپیکار تھے۔

فرقہ یا قبیلہ کی اندرونی تنظیم کے لیے کوئی مسلمہ اصول نہ تھا۔ خلف اکبر (کی وراثت) کا قانون ماقبل اسلام کے عربوں میں مروج نہ تھا اور اسلام نے (بھی) اسے منسوخ کر دیا ہے۔ لائق اولاد یا باصلاحیت شخص ہی سرداری کرتا۔ خلف اکبر (کی وراثت) کے معنی فرقہ کی تباہی ہوتی۔ قبیلہ یا فرقہ کا سردار منتخب ہوتا یا قبول کر لیا جاتا۔ اس کے لیے کوئی مقررہ قانون یا رواج نہ تھا۔ اگر قبول کردہ سردار قبیلہ کی بہبودی کے سلسلہ میں کاہلی اختیار کرتا اور لاپرواہی برتتا تو اس کو اس کے مخالف سے بدل دیا جاتا تھا۔ جو سردار اپنے حلقہ کا اعتماد کھو دیتا وہ کسی طرح اپنے عہدہ پر برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔

عرب کے قبائل کا اخلاقی نظریہ جسے عام طور پر ”مروّہ“ کہا جاتا ہے ان کی معاشرتی تنظیم کے مطابق تھا۔ پروفیسر نکلسن (Nicholson) نے ”مروّہ“ کی تعریف یوں کی ہے۔ ”جنگ میں بہادری، مصیبت میں تحمل، انتقام میں استقلال، کمزور کی حفاظت اور ظالم کی مخالفت، ان کے ساتھ ساتھ فیاضی، مہمان نوازی، وفاداری کو بھی شامل کر لینا چاہیے تاکہ یہ فہرست مکمل ہو سکے۔ مروّہ کے اصولوں کا سب سے بڑا مخزن مسلم عرب سے پہلے کی ترقی یافتہ شاعری ہے۔ لیکن یہ ذہن نشین رہے کہ عباسیوں کے عہد تک یہ تحریر میں نہیں لائی گئی تھی۔

وہ تینوں شہر جن سے ہمیں یہاں بحث ہے، قبائلی نظام کے پابند تھے۔ پورے عرب کا مذہبی مرکز کعبہ تھا جس کی بنیاد (قرآنی روایت کے مطابق) ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے ڈالی تھی۔ بہرکیف یہ ایک بہت قدیم عمارت ہے جو 'دنیا کے خالق' اللہ کے نزدیک متبرک ہے ہم اس کو ایک غیر مسقف عمارت تصور کر سکتے ہیں۔ موجودہ چھوٹا کمرہ پیغمبر (اسلام) کی جوانی کے زمانہ میں بنا تھا۔ اور اسی طور پر اس وقت تک قائم ہے۔ حج

---

(1) سلطنت روم کا زوال اور خاتمہ، باب 50 بیوری کا شائع کردہ ایڈیشن، ص 340

کے ارکان کعبہ کے اندر انجام نہیں پاتے بلکہ چاروں جانب زمین پر جس کو حطیم کہتے ہیں۔ ابتدائے اسلام سے تقریباً بارہ نسل قبل ایک شخص فہر (قریش) نے کعبہ کی خدمت و حفاظت کا کام حاصل کر لیا اور اس کے وارثوں نے (اس عمارت کے ارد گرد) مکہ کا شہر بسایا۔ وہ لوگ بحیثیت تجار بھی مشہور ہوئے۔ چونکہ ہندستان اور جنوبی عرب کی مغربی ممالک سے تجارت کا بڑا حصہ ان کے ہاتھوں میں تھا عرب کے قبیلوں میں قریش نے نمایاں حیثیت بنالی۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ مکہ، جسے قرآن میں ایک بے آب و گیاہ وادی بیان کیا گیا ہے، کی آمدنی کے ذرائع صرف تجارت اور زائرین تھے۔ مکہ میں واحد حکومتی ادارہ مجلس یا "مالا" تھی۔ یہ مختلف قبیلوں کے سرداروں اور سربر آوردہ لوگوں کی جماعت تھی۔ یہ مجلس صرف مشورہ و مباحثہ کی تھی اس کے اپنے کوئی انتظامی اختیارات نہ تھے۔ ہر قبیلہ بالفعل آزاد تھا اور اس کا اپنا طریقہ کار تھا اسی لیے "مالا" کے موثر فیصلے وہی تھے جو مکمل اتفاق رائے پر مبنی ہوں[1]۔ مکہ سے چار دن کی مسافت پر طائف کا شہر چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے جو کہ لبنان سے ملتا جلتا شام کی زمین کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ثقیف قبیلہ کے لوگ رہتے تھے لیکن یہاں مکہ کے دولت مندوں کی جائدادیں بھی تھیں۔

یثرب جو بعد کو مدینہ کہلایا (پیغمبر کا شہر) کوئی شہر نہیں تھا بلکہ آبادیوں کا ایک سلسلہ جو بیس میل لمبا اور 20 میل چوڑا تھا اور جو مکہ سے شمال کی جانب کئی دن کی راہ تھا۔ اور بحر احمر سے تقریباً اسی میل کی۔ اس کی فوجی اہمیت اس لحاظ سے تھی کہ پڑوسی قبیلوں کے تعاون سے یہ مکہ کی نطنطائین کے ساتھ منافع بخش تجارت کو روک سکتا تھا۔ یہودی جن کے مخصوص قبیلے قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ تھے غالباً مدینہ میں پہلے آباد ہوئے۔ بعد میں جنوبی عرب کے دو قبیلے اوس اور خزرج داخل ہوئے اور اہم مقام حاصل کر لیا۔ لیکن اوس اور خزرج آپس میں متفق نہ رہ سکے اور یہودیوں کو بھی اس جھگڑے میں شریک ہونا پڑا۔ ان دونوں قبیلوں میں 617ء میں "بعص" (Bu'as) میں سخت خوں ریز جنگ ہوئی۔ کوئی جماعت فتحیاب نہ ہوئی لیکن نفرت بے اعتمادی اور شکوک کی ایسی فضا طاری ہو گئی کہ ایک دوسرے کے قریب رہنا ناممکن ہو گیا۔ اس

---

(1) منٹگمری واٹ - محمد، مکہ میں، ص 8

لیے دونوں جماعتوں نے (حضرت) محمدؐ کو مدعو کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ آکر رہیں اور ان لوگوں کے ہر ایک اختلاف کو اللہ کے نام پر غیر جانبدارانہ فیصلہ کریں۔

زیادہ تر عرب بت پرست تھے۔ وہ اللہ کو حاکم مطلق مانتے تھے اور تمام مسودات کے شروع (اوپر) اللہ کا نام ہوتا تھا لیکن اللہ عبادت کے لیے نہ تھا۔ قرآن میں تین مشہور بتوں کا نام لات، منات اور عزیٰ۔ اللہ کی بیٹیاں ہونے کی حیثیت سے شفاعت کے لیے ان کی مدد طلب کی جاتی۔ دوسرے قبیلوں کے بتوں کے نام گنانا لاحاصل ہوگا۔ تقریباً آٹھ سو بت یا ان کی شبیہیں کعبہ میں گنجائش کی کمی کے باوجود رکھے تھے۔ لیکن ان میں صرف ''ہبل'' کا ایک مجسمہ تھا۔ ''کسی ایک بت کی جانب پُر خلوص اعتقاد کی شہادت کہیں نہیں ملتی''۔ ماقبل اسلام کے عربوں کا کوئی مذہبی صحیفہ نہ تھا اور نہ کوئی سوچا سمجھا علم الاصنام (دیومالا)۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی آبادیاں مختلف مقامات پر تھیں لیکن مشرک عربوں میں یہودیوں یا عیسائیوں کی جانب مخالفانہ جذبات نہ تھے۔ دنیا کے دیگر حصوں کی طرح عرب کے یہود اپنے سراسم کے پابند رہے۔ گرچہ وہ ان سے مکمل طور پر واقف نہ تھے۔ جہاں تک اسلاف کی دعوت کا تعلق ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عرب خواہ وہ عیسائی ہوں یا مشرک وہ اپنے اسلاف کے مذہب کے پابند تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے روایتی خیالات میں خلل پڑے اور ان کے بزرگوں پر بہتان باندھا جائے۔ مشرک عربوں کا گو اپنے بتوں پر مکمل ایمان نہ تھا پھر بھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا وجود نہ تسلیم کیا جائے۔ علاوہ اس کے وہ پیغمبر کے مطالبہ کو ناپسند کرتے تھے کہ ہر یقین کو عرفان کی تاریخ کے پیشِ نظر بہت غور و فکر اور تحقیق کے ساتھ قبول کیا جائے۔ پیغمبر نے جب مکہ فتح کیا تو ان عیسائیوں نے جو بدعتی فرقہ کے تھے اور جو اپنے مذہب کی بنا پر بازنطینی حکومت میں سزا پا سکتے تھے۔ اسلام قبول کرنا بہتر سمجھا۔

پیغمبرؐ کا حفاظتی نظام

(حضرت) پیغمبرؐ کے سب سے بڑے ہندستانی سوانح نگار مولانا شبلی پیغمبر کو صرف دنیاوی آدمی نہیں سمجھتے۔ اس لیے کہ اصولی طور پر وہ ان کو ایک روحانی اور

اخلاقی مصلح مانتے ہیں۔ یہ صحیح ہے اور پیغمبر کی کوئی سوانح، مختصر سے مختصر بھی، ان کی مذہبی تبلیغ کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ پھر بھی سیاسی اداروں کے نقطۂ نظر سے حضرت پیغمبر کا سب سے بڑا کارنامہ وہ حفاظتی نظام ہے جو انھوں نے پورے عرب کے لیے قایم کیا۔ سوائے ان علاقوں کے جو بازنطینی اور فارس کے تحت تھے۔ اسی بنیاد پر ان کے جانشینوں نے ڈھانچہ تیار کیا۔

(حضرت) محمدؐ ابن عبداللہ عبدالمطلب ابن ہاشم قریشی 570ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا ان کی ولادت سے قبل انتقال ہو گیا تھا اور وہ چھ سال کے تھے کہ ان کی والدہ آمنہ بھی انتقال کر گئیں۔ اس لیے ان کے چچا ابو طالب نے جو قبیلہ کے سردار اور چچازاد بھائی علیؑ کے باپ تھے ان کی پرورش کی ابو طالب کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اس لیے محمدؐ کو بچپن ہی میں بکریاں چرانا پڑا لیکن جوانی میں انھوں نے کاروانوں کے انتظامات میں ایک ایمان دار اور قابلِ اعتماد کارگزار کی حیثیت سے نام حاصل کیا۔ جبکہ وہ پچیس سال کے تھے تو انھوں نے ایک دولت مند بیوہ “خدیجہ” سے جو چالیس سال کی تھیں اور جن کے کاروانوں کے وہ انتظام کار تھے شادی کر لی۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ پیغمبر کی سوانح اور حدیثوں کے جمع کرنے والوں نے ان کے اس “تمہیدی دورِ زندگی” کے متعلق بہت ہی کم لکھا ہے۔ لیکن دو مفروضے بآسانی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جب سارے عرب کا حفاظتی نظام ان کے ہاتھوں میں آیا اس وقت یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں تمام قبیلوں اور فرقوں کے باہمی اختلافات اور مالی حالت کی اتنی مکمل واقفیت تھی کہ اس میں کوئی انھیں فریب نہیں دے سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے یہودی، عیسائی اور یونانی (Hellenie) خیالات، جو عرب میں جاری تھے، کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ یہ روایت صحیح ہی ہے کہ وہ کئی کئی دنوں کے لیے اپنے مختصر توشہ کے ساتھ غور و فکر کے لیے “حرا” کے غیر آرام دہ غار میں رہتے تھے۔

اپنی عمر کے چالیسویں سال میں محمد کو ایک طویل روحانی تجربے سے گزرنا پڑا جس سے ان کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی اور رسول بنائے گئے ہیں تاکہ قدیم انسانیت کے مذاہب یعنی آدمؑ و نوحؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور ان تمام انبیاء جن کے درمیان “ہم کوئی اختلاف نہیں پاتے (کرتے)” (سورہ

2رکوع 136)[1] کے مذہب کو جو پھر سے جاری اور ساری کریں اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اس عیسائیت اور یہودیت کو جو اس وقت وہاں مروج تھی۔ صحیح تسلیم کرتے تھے۔ وہ حضرت عیسیٰ کا بحیثیت روح اللہ اور کلمۃ اللہ بہت احترام کرتے تھے لیکن توحید فی التثلیث کے نظریے کے وہ سخت مخالف تھے۔ جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے وہ (محمدؐ) اس بات سے انکار کرتے تھے کہ کسی بھی قوم کے افراد خود کو پیدائشی طور پر چنیدہ بندے، تصور کر سکتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ”تم میں اچھے وہی ہیں جن کو اللہ کا قرب حاصل ہے“۔ محمد کا اللہ کسی قبیلہ کا دیوتا نہیں بلکہ سارے جہاں کا مالک (رب العالمین) ہے۔ (انھوں نے) کفار عرب سے کہا کہ ”جن دیوتاؤں کو تم اللہ کی بیٹیاں سمجھ کر پوجتے ہو یا جن کو درمیانی درجہ دیتے ہو (ذریعہ نجات سمجھتے ہو) ان کا کوئی وجود نہیں۔ اللہ کی عبادت براہ راست کرنی چاہیئے“۔ قرآن کہتا ہے ”تم مجھ کو یاد کرو اور ہم تم کو یاد کریں گے“۔ (سورہ 2 رکوع 152) اور (پھر یہ کہ) ”جب میرا بندہ میری عبادت کرتا ہے تو ہم اس کے قریب ہوتے ہیں“۔ (سورہ 2 رکوع 186) وہ نیا دین جس کو ”اسلام“ کہتے ہیں اس کا طریقہ غیر مصالحت پسندانہ توحید ہے۔ سب مسلمان برابر ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اسلام کسی قسم کی رہبانیت اور مقرر کردہ مُلّائی کو نہیں مانتا (قبول کرتا)۔

تقریباً تین سال تک دین اسلام کی خاموشی سے تبلیغ ہوتی رہی۔ پھر پیغمبر کو ہدایت ہوئی کہ کھلے طور پر تبلیغ کریں۔ اس کی مخالفت یقینی تھی۔ ابو طالب نے محمدؐ کے دین کو نہیں مانا مگر اپنے قبیلہ کی ان کو حمایت دی۔ چونکہ قریش میں کوئی باقاعدہ انتظامیہ نہ تھی اس لیے مسلمانوں کو پورے طور پر سزا دینے کی کوئی صورت نہ تھی

---

(1) یوروپین مصنفین نے حضرت پیغمبر کے اس روحانی تجربہ پر موجودہ رجحانات کے حامل علم نفسیات کا اطلاق کرنے میں غیر ضروری طور پر کافی وقت اور محنت برباد کی ہے۔ اوّلاً جیسا کہ پروفیسر واٹ (Watt) نے لکھا ہے:

”ہمارے پاس ماخذ کے محض چند ٹکڑے ہیں جو ہم تک ظہوری اور ابن سعد کے ذریعے پہنچے ہیں اور جو ان دونوں نے ولید کے دور حکومت میں، اس واقعہ کے سو سال بعد جمع کیے تھے۔ مولانا شبلی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ظہوری کی پوری روایت مسترد کر دینی چاہیئے چونکہ اس کی تصدیق اور قبل کے ذرائع سے نہیں ہوتی ثانیاً اس روایت میں ناقابل یقین اجزا شامل ہیں۔ اور

سوائے اس کے کہ انھیں خرید لیں۔ لیکن آزاد مسلمان جنھیں اپنے قبیلہ کی حمایت حاصل تھی انھیں صرف برا بھلا کہا جا سکتا تھا اور پریشان کیا جا سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ وہ کعبہ میں عبادت کرتے ہوں۔ پیغمبر نے اپنے کچھ ماننے والوں کو ہدایت کی کہ وہ حبشہ ہجرت کر جائیں، غالباً دو ہجرتیں ہوئیں۔ ہاشم، اور ابو طالب کے قبیلوں سے دو سال تک عدم تعاون کا تجربہ کیا گیا (لگ بھگ 616-618ء) لیکن اسے جلد ہی ختم کر دیا گیا۔ پیغمبر اور ان کے پیرو کسی مذہبی مسلک کو اختیار کرنے کے اس آزادانہ حق کا استعمال کر رہے تھے جو عرب کی روایت کے تحت تمام عربوں کو حاصل تھے۔ علاوہ ازیں دونوں فرقے خون اور ازدواج کے رشتے سے بہت ہی قریب تھے۔ اس لیے تقریباً دس سال آپس کے بحث و مباحثے میں گزر گئے جن کا کچھ ذکر قرآن کی اوائلی آیتوں میں موجود ہے۔ کناروں کی تعذیب کی وجہ سے کسی شخص کے مارے جانے کا

بحیثیت مفکر حضرت پیغمبر کے تمام کاموں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

قرآن اور حدیث دونوں میں بالصراحت درج ہے کہ جب پیغمبر پر وحی نازل ہوتی تو ان کی کیا کیفیت ہوتی تھی۔ وہ خود کو ایک کمبل میں لپیٹ لیتے تھے۔ پسینے میں نہا جاتے، خواہ اس وقت درجۂ حرارت کتنا بھی ہو۔ اور کچھ وقت کے لیے جو عموماً چند منٹوں سے زیادہ نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں ایسے غرق ہو جاتے کہ انھیں اور کسی شے کا احساس نہ رہتا تھا۔ اس کے بعد وہ اس وحی کو بیان کر دیتے تھے جو ان پر نازل ہوئی تھی۔ اور صحابہ ان کو یاد کر لیتے تھے۔ قرآن انھیں وحیوں پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے اس طرح سے بیان کی ہوئی آیت اور قلم بند کی ہوئی آیت میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن بعد کی نازل ہوئی کوئی آیت اپنے قبل کی آیت کو منسوخ کر سکتی تھی۔

پروفیسر واٹ لکھتے ہیں کہ "ہمیں قرآن (کی آیتوں) اور (حضرت) محمدؐ کے عام احساس و آگہی کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے چونکہ خود (حضرت) محمد کی نظر میں ایک بنیادی فرق تھا۔ شروع سے انھوں نے وحی، جیسا کہ وہ انھیں سمجھتے تھے، اور خود اپنے خیالات کے درمیان فرق قایم رکھنا ہوگا۔ یہ فرق وہ کس طور پر قایم کرتے تھے یہ پورے طور پر واضح نہیں لیکن یہ حقیقت کہ وہ یہ فرق کرتے تھے۔ تاریخ کے کسی اور واقعہ کی طرح بالکل صاف ہے۔" (محمد مکہ میں، ص ص 3-53) پروفیسر واٹ اس جگہ ایک راسخ مسلم عقیدہ کی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ جس فرق کی جانب وہ توجہ دلاتے ہیں وہ قرآن اور حدیث (پیغمبر کے اقوال و افعال کا مجموعہ) کے درمیان فرق ہے۔ تمام مسلمانوں کے لیے صرف قرآن کی عبارت لاقابل انکار ہے۔ ابتدا ہی سے اس کو تحریری طور پر اور حافظوں میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

کوئی واقعہ درج نہیں ہے۔

لیکن 619ء میں پیغمبر کی بیوی خدیجہؓ اور ان کے چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا۔ اور بنی ہاشم کے نئے سردار ابو جہل نے اعلانیہ طور پر محمدؐ سے قبیلہ کی حمایت واپس لے لی۔ اس طرح پیغمبر گویا قانون کی حمایت سے محروم ہو گئے۔ اسلام کی خوش قسمتی سے اوس اور خزرج قبیلوں کی متحدہ جماعت نے انھیں مدعو کیا اور وہ 622ء میں وہاں گئے۔

اس دستاویز کے مطابق جس کو عام طور پر مدینہ کا دستور[1] کہتے ہیں اور جس کی چند دفعات پیغمبر کے وہاں پہلے سال کے قیام کے دور کی ہیں ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مدینہ کے قبائلی نظام کی ضمانت دی اور جو اختیارات انھوں نے اپنے ہاتھوں میں لیے وہ بہت محدود تھے۔ واٹ کہتا ہے ''قبیلہ کے سرداروں کے اختیارات برقرار رہے اور پیغمبر کو، سوائے جنگ کے موقع پر، کوئی انتظامی اختیارات نہ تھے۔ ان کا مخصوص اختیار عدلیہ کا اختیار تھا یعنی امن قایم رکھنا۔ ایامِ جاہلیہ کے اصولوں کے مطابق محمدؐ کسی قبیلہ کے کیا کسی فرقہ کے بھی سردار نہیں ہو سکتے تھے پھر بھی مدینہ میں ایک مسلم مرکز قایم ہونے پر ایک نئی تنظیم یعنی ملت یا مسلمانوں کی مذہبی جماعت فروغ پانے لگی اور اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ محمدؐ اس کے بانی اور سردار اعلا تھے۔ یہ حکم کہ ''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو'' قرآن میں تقریباً چالیس بار آیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ پیغمبر کو بھی ہدایت کی گئی کہ مسلمانوں سے ان کے معاملات کے متعلق مشورہ کریں اور یہ اصول مسلمانوں کی عام ہدایت کے لیے نافذ کیا گیا کہ وہ اپنے معاملات کو صلاح و مشورہ سے طے کریں۔ مگر ملت نے قبیلہ کے انتظامی اختیارات کو فی الفور منسوخ نہیں کیا اس لیے کہ پیغمبر کے پاس اس کا کوئی بدل نہ تھا لیکن خلیفہ اول اور ان کے مشیروں نے مرتدوں (ردہ) کی جنگ کی وجہ سے گروہوں اور قبیلوں کے انتظامی اختیارات کو ختم کر دیا اور ایک باضابطہ ریاست کی تنظیم ہوئی۔ پھر بھی قبائلی نظام اور قبائلی اشتراک اور نفرت کی یاد بنی امیہ کے عہد تک جاری رہی۔ لیکن جہاں تک پیغمبر کا سوال ہے مسلم ملت جس کے وہ سربراہ تھے ابتدا ہی سے مسلم قبائل سے بالاتر تھی۔

---

(1) یہ دستاویز ابن اسحٰق سے ہم تک پہنچی جس نے بنی عباس کے اوائلی دور میں اپنی کتاب لکھی تھی۔ اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ بعض دفعات جنگ بدر کے قبل لکھی گئی تھیں اور بقیہ بعد کی ہیں۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ قرآن کے متذکرہ بالا امتناعی احکام کی کس طرح تشریح کی گئی۔ پھر بھی کچھ بات واضح ہے۔ پیغمبر صنعت کاروں کی مہارت کی قدر کرتے تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ مذہبی شیرازہ بندی کے معاملات میں، جن میں ان کو خاص ملکہ تھا، ان کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ باوجود اس کے کہ قرآن میں اس قسم کی کوئی وعید نہیں۔ عمدہ مثال کے طور پر ہم پیغمبر کے ان احکام وہدایات کا ذکر کر سکتے ہیں کہ اسلام خانقاہیت نہیں ہے یا یہ کہ اس ریاضت کی اجازت نہیں ہے جس کا مقصد جسم کو تکلیف پہنچانا ہو، یا یہ کہ کوئی شخص اپنی ملکیت میں سے ایک ثلث سے زیادہ وقف نہیں کر سکتا اور باقی ماندہ سے اپنے ورثہ کو محروم نہیں کر سکتا۔

[دوسری جانب] (یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ) اپنے مشن کی نوعیت کے اعتبار سے پیغمبر کو اس بات کا خیال رکھنا ضروری تھا کہ تمام مردوں اور عورتوں کو ان تک رسائی حاصل ہو، وہ سمجھانے، سکھنے اور یقین دلانے کے لیے بھیجے گئے تھے لیکن تمام مردوں اور عورتوں سے عوامی امور میں رائے طلب کرنا مشکل تھا اس لیے ہم پیغمبر کے مشیروں کی ایک جماعت پاتے ہیں جو بعد کے دور کے حکمراں طبقہ کا پیش خیمہ بنی۔ مشیروں کے تین گروہ تھے۔ مدینہ کے مہاجر جنھوں نے اسلام کی بیحد خدمت کی تھی۔ مدینہ کے مسلم قبیلوں کے سردار (انصار) اور فوجی اور انتظامی امور کے ماہرین۔ پیغمبر کو مشورہ میں ''جی حضور'' قسم کے لوگوں کی ضرورت نہ تھی۔ اکثر انھوں نے اپنے صحابیوں (کے مشورہ) کو اپنی رائے پر ترجیح دی اور ان کی اجتماعی رائے کو مسترد کر دیا۔ بعض مواقع پر انھوں نے ان کی رائے طلب کی اور اس وقت تک مشورہ کرتے رہے جب تک کوئی حل بر آمد نہ ہوا۔ لیکن آخری فیصلہ پیغمبر پر منحصر تھا۔ چند معمولی معاملات میں ہم انھیں اپنی غلطی کا معترف پاتے ہیں لیکن زیادہ تر موقعوں پر وہ صحابیوں کو اپنی اصابت رائے کا قائل کرنے میں کامیاب رہے۔ منافقوں کے اس گروہ کے علاوہ، جن کا ذکر قرآن میں ہے مگر نام نہیں، (ایسے) سچے ایماندار بھی تھے جنھوں نے امن وجنگ کے موقعوں پر خصوصاً تقسیم مالِ غنیمت کے متعلق پیغمبر کے اقدام سے اختلاف رائے کیا۔ ان اعتراضات اور پیغمبر کے جوابات کا ذکر محفوظ ہے۔ بہر کیف، اگرچہ وہ کسی لحاظ سے بھی ایک مستند حکمراں نہ تھے لیکن

"خوشحال عرب" کی تاریخ میں محمدؐ پہلے منتظم یا حاکم تھے۔ اگر وہ جنگ کا فیصلہ کرتے تو (فوج کا) سالار خود مقرر کرتے اور لڑنے والوں کی جماعت تیار کرتے۔ وہ قوم کے چندے (صدقات، زکوۃ) سے جنگ کے لیے رقم جمع کرتے۔ جنگ میں فتحیاب ہونے پر وہ مال غنیمت کا 4/5 حصہ اپنے لوگوں میں تقسیم کر دیتے اور باقی 1/5 حصہ مخصوص قومی کاموں کے لیے اپنے پاس رکھتے۔[1] جب ان کے اثر و رسوخ میں وسعت آئی تو انھوں نے اپنے قائم مقام نمائندے مقرر کیے اور ان کو جیسا مناسب سمجھا اختیارات تفویض کیے۔ صلاح و مشورہ بلکہ حق اعتراض کی پابندی کے باوجود تمام معاملوں میں آخری فیصلہ پیغمبر ہی کا ہوتا تھا۔

قرآن اس امر کی تائید کرتا ہے کہ پیغمبر کا بحیثیت پیغمبر احترام کیا جائے۔ چونکہ ان کے گھر میں کوئی ملازم نہ تھا اس لیے ملنے والوں کو اندر آنے کے لیے تین بار آواز دینے کی ہدایت تھی۔ اگر تیسری آواز کے بعد بھی اجازت نہ ملے تو ان کو ناگوار نہ ہونا چاہیے اور دوسرے وقت حاضر ہونا چاہیے۔ پیغمبر بھی اسی اصول کو برتتے تھے۔ جب وہ خود کسی سے ملنے جاتے۔ لوگوں کو ہدایت تھی کہ وہ پیغمبر سے گفتگو میں ان کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کریں۔ جب پیغمبر مسجد میں آتے تو نمازیوں سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ آپ کی تعظیم کی خاطر کھڑے ہوں لیکن ان کو مرکز میں جگہ دینے کے لیے ان لوگوں کو تھوڑا ہٹنا پڑتا۔

پیغمبر کے پاس صرف ایک جگہ تھی مسجد جہاں پانچوں وقت نماز پڑھتے اور کل کاموں کو انجام دیتے۔ مولانا شبلی کہتے ہیں کہ پیغمبر کی مسجد کا تصور ہندستانی عیدگاہ سے کر سکتے ہیں ایک کچی نیچی دیوار زمین کے ایک بڑے حصے کو گھیرے ہوئے تھی۔ اس کے ایک حصہ پر کھجور کے پتوں کی چھت تھی جو کھجور کے درختوں کے تنے پر قایم تھی۔ خطبہ کے دوران پیغمبر ان میں سے کسی ایک ستون کا سہارا لیتے تھے، لیکن بعد میں

---

(1) مخصوص آٹھ مقاصد یہ تھے۔ مفلس ضرورت مند اور مجبور (لوگوں کی امداد) عمال کی تنخواہ، دل جمعی، غلام آزاد کرنا، مقروض کا قرض ادا کرنا اور مسافروں کی امداد (قرآن سورہ 60:9) اس بات سے کہ یہ تمام اور فوری ضرورتوں کے پورا کرنے سے متعلق ہیں۔ یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ طویل المدت رفاہ عامہ کے منصوبوں میں ریاست دلچسپی نہ لے۔ خاص کر اس حالت میں جبکہ وہ ان کی کفیل ہو۔

ایک بڑھئی نے آپ کے لیے ایک ممبر بنادیا۔ یہ تین زمینوں کا ایک اونچا ڈھانچہ تھا جس پر آپ کھڑے ہو کر تقریر کر سکتے تھے۔ (مسجد کی زمین) ایک مدت تک کچی رہی لیکن بعد میں پتھر کے چھوٹے ٹکڑوں سے اس کی فرش بندی کر دی گئی تاکہ برسات کا پانی جمع نہ ہونے پائے۔

پیغمبر کے پاس حکومت یا ریاست کا کوئی ساز و سامان نہ تھا۔ انھیں خزانہ کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جو رقم (آتی) اسی دن تقسیم ہو جاتی۔ ان کے دور دراز حصوں کے ایجنٹوں (نمائندوں) کو اختیار حاصل تھا کہ کچھ فوجی بھرتی کر لیں لیکن خود پیغمبر کے لیے کوئی محافظ، فوجی یا پولیس نہ تھی۔ محمدؐ نے اپنی پوری زندگی اس طرح بسر کی جیسی ایک پیغمبر کو چاہیے۔ (یعنی) بلا کسی قسم کی محافظت کی زندگی۔ بعد کی تحریروں میں کچھ لوگوں کے نام ان کی خدمت گزار کی حیثیت سے ملتے ہیں لیکن ان اشخاص کی خدمات محض اعزازی تھیں۔ ہم لوگوں کو ان لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں جو پیغمبر کے معتمد تھے لیکن ان کی خدمات بھی یقیناً رضاکارانہ ہوں گی۔ پیغمبر کا کوئی دفتر یا محکمہ نہ تھا اور ہم لوگوں کو اس کا علم نہیں کہ صلح ناموں، معاہدوں اور دیگر کاغذات جس کی نقلیں آئندہ حوالے کے لیے پیغمبر ضرور رکھ لیتے ہوں گے کس طرح محفوظ رکھے جاتے تھے۔ پیغمبر کی ایک مہر تھی اور جب کوئی خط لکھواتے یا معاہدہ کرتے تو گواہوں کے نام ضرور لکھے جاتے۔

گبن (Gibbon) کے مندرجہ ذیل بیان کی تائید پیغمبر کے (متعلق) تمام مستند روایات میں ملتی ہیں۔

"محمدؐ کی فہم سلیم نے شاہانہ کروفر کو پسند نہ کیا۔ خدا کے نبی نے گھریلو زندگی کے معمولی کام کیے۔ چولھے سلگائے، دودھ دوہے، اپنے جوتے اور اونی کپڑے خود سیتے۔ ایک راہب کے عقوبت نفس کے بر خلاف وہ ایک عرب یا فوجی کی طرح سوکھی غذا بغیر کسی خود پسندی کے استعمال کرتے۔ مخصوص موقعوں پر وہ اپنے صحابیوں کی معمولی مگر افراط سے تواضع کرتے۔ مگر خانگی زندگی میں پیغمبر کے گھر میں ہفتوں چولہا نہیں سلگتا تھا۔ ان کی بھوک مختصر جو کی روٹی سے مٹ جاتی۔ وہ دودھ اور شہد کو پسند

کرتے مگر ان کی عام غذا کھجور اور پانی تھی۔[1] صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ قد و قامت اور صورت کے اعتبار سے ایک امتیازی شان رکھتے تھے۔ یہ عطیۂ حسن ایک ایسی نعمت ہے جس سے بہت کم لوگ بے اعتنائی برتتے ہیں سوائے ان کے جو خود اس سے محروم ہوں۔ لوگ ان کی باوقار شخصیت، اُن کی بااثر آنکھوں، ان کی خوش کن مسکراہٹ، لہراتی داڑھی اور ان کے بشرے جس سے روح کا ہر تصور ظاہر ہوتا ہے اور ان کے انداز جو ان کی گفتگو کو اور موثر بناتا، کے مداح تھے۔"

پیغمبر کے غزوات کا محض ایک مختصر ذکر یہاں کافی ہوگا۔ ان کی بنیادی سیاست یہ تھی کہ جنگ اور معاہدوں دونوں کے ذریعے اپنے مذہب کے مخالفوں کو سخت سزا اور بعض اوقات رحمدلی اور کریم النفسی کے ذریعہ ہم خیال بنایا جائے۔ تین جنگیں جو قریش کے مدینہ پر حملہ کی وجہ ہوئیں۔ جنگ بدر (مارچ 624ء) جنگ اُحد (مارچ 625ء) اور جنگ خندق (مارچ۔ اپریل 627ء) مدینہ میں پیغمبر کے اثر کو کم کرنے میں ناکام رہیں۔ بلکہ ان کے مخالفین کی شکست سے یہ اور زیادہ بڑھی کیونکہ تینوں جنگوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ پیغمبر نے ان قیدیوں سے جو اس قابل تھے فدیہ لے کر اور دوسروں کو بلاشرط آزاد کر دیا تاکہ وہ اپنے مخالفین کے اخلاق اور دین کے متعلق غور کر سکیں۔

مارچ 628ء میں پیغمبر نے امن پسند (صلح جویانہ) اقدام کا فیصلہ کیا اور بارہ سو یا چودہ سو حجاج کو احرام بندھوا کر اور قربانی کے جانور ساتھ لے کر عمرہ کی غرض سے روانہ ہوئے[2] لیکن متبرک علاقے کے نزدیک واقع حدیبیہ پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ قریش نے جن کی رہنمائی اس وقت تین اشخاص عکرمہ بن ابو جہل، سہیل بن عمرو اور صفیان بن امویہ کر رہے تھے۔ جنگ کرنے کا عہد کیا ہے۔ پھر بھی اپنے باز نطانی تجارت کے نقصانات کی وجہ سے وہ مندرجہ ذیل شرائط پر سمجھوتہ کرنے کو تیار تھے۔

1- حج دوسرے سال

2- ہر قبیلہ پیغمبر یا قریش کا حلیف بننے کے لیے آزاد ہو

---

(1) جلد 5، ص 409

(2) ذی الحجہ کے مخصوص ایام میں مکہ کا سفر حج ہے۔ اور دوسرے زمانے میں سفر عمرہ ہے۔

3- پیغمبر اور قریش کے درمیان دس سالہ امن کا معاہدہ جس (کی رو سے) کسی ایک دوسرے کے حلیف قبیلہ پر حملہ نہ کرنا ہوگا۔

4- قریش کا کوئی آدمی بغیر اپنے مالک یا ولی کی اجازت کے اگر محمدؐ کے پاس آئے گا تو محمدؐ کو اس کو واپس کر دینا ہوگا اور اگر محمدؐ کی طرف کا کوئی آدمی قریش کے پاس آئے گا تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

آخری دفعہ کا اطلاق خاندان کے سردار یا شادی شدہ افراد پر نہیں تھا لیکن قریش خاندان کے سرداروں کو اپنے ان ماتحتوں کو جو اسلام قبول کر چکے تھے زدوکوب کرنے اور ذیت دینے کا موقع فراہم کر دیا۔ قبائلی نظام کے پیرو عرب میں مدینہ کو ہجرت ہی ایک واحد حفاظت تھی جو اسلام قبول کرنے والوں کو دی جا سکتی تھی۔

لیکن ایک معاہدہ کی رو سے پیغمبر اسلام قبول کرنے والوں کو حفاظت کے اس حق سے دستبردار ہو رہے تھے۔ جہاں تک قریش کا تعلق تھا یہ بات معاہدہ میں درج تھی لیکن کنایتاً یہ حق تمام کافر قبیلوں کو بھی مل گیا۔ پیغمبر کے پیرو اور قریب ترین احباب ان پر اعتقاد اور ان کی تعظیم سے کبھی نہیں بھٹکے۔ لیکن سب اس معاہدہ کے مخالف تھے۔ اگر اس بات پر استصواب رائے ہوتا تو صلح حدیبیہ یقینی طور پر منظور نہ ہوتی لیکن پیغمبر معاہدہ کو منظور کرنے پر مصر تھے۔ ان کو اپنے مذہب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر یقین تھا۔ کوئی مسلمان بُت پرستی کی طرف واپس نہیں ہوا۔ اور عرب بُت پرست اسلام میں داخل ہوتے گئے جو ان کے لیے مقدر تھا۔ وہ معاہدے کی دفعات کو توڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن ان کو یقین تھا کہ اللہ کوئی راہ نکال دے گا۔ انھوں نے معاہدہ پر مہر لگائی اور اپنے ماننے والوں سے اپنے لیے وعدہ لیا۔ بیعت الرضوان سبھوں نے اس وقت موجود تھے عہد لیا۔

صلح حدیبیہ حقیقت میں جو اسلام کی فتح تھی۔ مکہ سے سربرآوردہ لوگ مدینہ ہجرت کرنے لگے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور خالد بن ولید تھے جو اوائل اسلام کے سب سے بڑے فوجی ماہر تھے۔ اور عمرو بن العاص جنھوں نے بعد میں مصر فتح کیا۔ تقریباً ستر نو مسلموں نے، جنھیں پیغمبر نے معاہدے کی دفعات کے مطابق مدینہ میں پناہ نہ دی تھی، مکہ سے شمال کی جانب اپنا آزاد مرکز قایم کر لیا اور مکہ کے کاروانوں کو

لوٹنا شروع کیا۔ قریش نے اپنی مصیبتوں سے تنگ آکر پیغمبر سے استدعا کی کہ انھیں مدینہ میں بسا لیا جائے تاکہ وہ لوگ بھی معاہدہ کی دفعات کے پابند ہو جائیں اس طرح صلح نامے کی یہ غیر مساوی دفعہ ختم ہو گئی۔

مکہ کے اربابِ ثلاثہ کو دس سالہ معاہدہ کی مدت کو اپنی تجارت کو فروغ دینے اور اپنے پرانے دین کو برقرار رکھنے کے لیے ایک بڑی اتحادی جماعت کی بنیاد ڈالنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے تھا لیکن وہ کوتاہ نظر ثابت ہوئے۔ بنو خزاعہ، جو پیغمبر کے حلیف تھے اور بنو بکر جو قریش کے (حلیف) تھے کے درمیان ایک جھگڑا ہوا۔ مکہ اور مدینہ (والوں) کو بالکل غیر جانبدار رہنا تھا لیکن قریش نے خزاعہ کو کچل ڈالنے کی خاطر بنو بکر کی مدد کی اور اس کے بعد اپنے عمل کے نتائج کے متعلق سوچنے لگے۔ چنانچہ پیغمبر نے مکہ فتح کرنے، اس سرزمین پر قبضہ کرنے اور اس کے باشندوں کو ہم خیال بنانے اور اس مقام امن (حرم) کو وہ درجہ دینے کا جو اس کو قبل کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ فیصلہ کیا، لیکن وہ یہ کام اسی وقت کر سکتے تھے جبکہ ان کے پاس اتنی طاقت ہو کہ ان کی مخالفت کو ناممکن بنا دے اور کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تقریباً دس ہزار کی جماعت تیار کر لی۔ اس کوچ کی وجہ اس وقت تک ظاہر نہیں کی گئی جب تک کہ فوج مکہ سے صرف دو منزل نہ رہ گئی۔ سفیان بن حرب (بعد کے خلیفہ معاویہ کے باپ) جو پیغمبر کے ہمیشہ سے دشمن تھے ان سے ملنے آئے اور پیغمبر نے انھیں پناہ دی اور ان سب لوگوں کو بھی پناہ دی جو ان کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ بعد میں ان تمام لوگوں کو جو اپنے دروازے بند کر کے اپنے مکانوں میں رہ گئے تھے پناہ دی گئی۔

مسلمانوں کے فوجی دستے شہر میں ہر چہار جانب سے داخل ہوئے (11 رجنوری 630) لیکن لوٹ مار اور غارت گری کے خلاف سخت حکم نافذ کیے گئے تھے۔ خالد کی سرکردگی میں جو فوجی دستہ تھا اس نے اٹھائیس مخالفوں کو قتل کیا۔ لیکن دیگر دستے پُرامن طور پر شہر میں داخل ہوئے۔ کعبہ اور ذاتی مکانوں سے بتوں کو ہٹا دیا گیا اور عثمان بن طلحہ کا جو کعبہ کے محافظ (شیبی) تھے، از سر نو تقرر کیا گیا۔ معاہدہ کی کسی دفعہ کے طور پر کسی کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ ان لوگوں کی جنھوں نے مخصوص جرائم کا ارتکاب کیا تھا ایک فہرست شائع کی گئی۔ لیکن پیغمبر کی خدمت

میں معافی کی درخواست نے اس فہرست کو بہت مختصر بنا دیا۔ پیغمبر کے خلاف گزشتہ سیاسی اور فوجی مخالفت کو جرم نہیں سمجھا گیا۔ اور ان کے سخت مخالفین مثلاً سفیان بن حرب اور مکہ کے ارباب ثلاثہ کے ممبران نے نئی حکومت کی خدمت کی اور فلاح پائی۔

قریش کے سردار ہو جانے کے بعد پیغمبر کو فوراً ہوازن کے بدو قبیلہ اور طائف کے ثاقف کی جنھوں نے بیس ہزار فوج جمع کر لی تھی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان لوگوں کو جنگ حنین میں شکست ہوئی اس جنگ کی ایک قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ جانبین نے ایک دوسرے کی جان لینے سے احتراز کیا۔ پیغمبر نے جنگ کے مال غنیمت کے طور پر ان کے مویشی لے لیے لیکن مخالفوں کے نئے مذہب (اسلام) قبول کر لینے پر ان کی بیویاں اور بچے واپس مل گئے۔

قرآن کہتا ہے کہ مذہب میں کوئی دباؤ نہیں (لااکراہ فی الدین) (سورہ256:2) اپنی تبلیغ کے ابتدائی تیرہ سالوں تک پیغمبر نے اپنے مذہبی اصولوں کو امن کی بنیاد پر رکھا۔ مدینہ میں ان کی گفتگو، جس طور پر یہ ثقہ روایات میں درج ہے، اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ اپنے دین کی اشاعت اسی طور پر کرنا چاہتے تھے جیسا کہ کسی بھی دین کے مبلغ کو کرنا چاہیے۔ یعنی بحث، رضامندی اور منظوری کے ذریعہ۔ وہ کفار عرب کے بت پرستی کے اصول کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے ان کے اور اہل کتاب کے درمیان بین امتیاز قایم کیا۔ قرآن صاف صاف بیان کرتا ہے کہ موخرالذکر نے ابتداً سچائی سے کی لیکن غلطی کی جانب مائل ہو گئے لہٰذا باوجود اس کے کہ وہ ایمانداروں میں شمار نہیں کیے گئے لیکن ایک منظور شدہ مذہب (دین) کے ماننے والے قبول کیے گئے۔ اب آٹھ سال کی کامیاب جدوجہد کے بعد محمدؐ پھر اپنے پرانے تجربات کو آزمانا چاہتے تھے۔ اگر وہ معاہدے جو روایت کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں اُن کی کوئی اہمیت ہے تو پیغمبر کو مسلمان اور ”اہل کتاب“ کے سیاسی جماعت کا سربراہ ہونے اور ان کو (اہل کتاب کو) مذہبی آزادی دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ اہل کتاب کو مراعات دینے کی وجہ سے بعد کے مسلم علماء کے اس لفظ کو صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا جن کے صحیفوں کا ذکر قرآن میں ہے لیکن قرآن صاف کہتا ہے کہ اس میں کل انبیاء کا نام (ذکر) نہیں اور (اس

طرح) کنایتاً دیگر بھیجے ہوئے صحیفوں کے نام بھی (نہیں ہیں)۔ علماء نے جو حد بندی کی ہے وہ قرآن کی تصدیق کردہ نہیں۔

مسلمان مورخوں نے 9 ہجری (اپریل 630 تا اپریل 631ء) کو سنہ وفود لکھا ہے۔ ان علاقوں کے علاوہ جن پر غسان اور حیرہ کا تسلط تھا پیغمبر کی خدمت میں عرب کے تمام حصوں سے وفود پہنچے اور آپ نے اللہ اور اس کے رسول کے نام پر (ان سے) حفاظتی معاہدے کیے۔ پیغمبر تحریری معاہدوں کے قائل تھے۔ اور وہ خطوط بھی صاف واضح اور مختصر طور پر لکھواتے جو بیشتر معاہدے کی نوعیت کے ہوتے تھے[1]۔ ان معاہدوں میں مسلمانوں کے فرقوں اور قبیلوں اور یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتو کی منظم جماعتوں (کے امور کے) متعلق ہدایات ہوتیں۔ موخرالذکر کو پہلے لیں۔ معاہدوں میں صاف طور پر یہ درج ہوتا ہے کہ غیر مسلم جماعت کو یکمشت نقد یا سالانہ پیداوار کا کچھ حصہ دینا ہوگا۔ اور معاہدوں میں اس کی بھی ضمانت ہوتی کہ اس مقررہ خراج سے زیادہ طلب نہیں کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہبی معاملات میں دخل دیا جائے گا۔ اس کی مخصوص مثال خیبر کے اور ایلا میں واقع مگنہ کے یہودیوں کے ساتھ کے معاہدے ہیں۔ آپ کا (ایک خط) مگنہ کے یہودی کے نام، کل عمدہ کپڑے، فوجی سامان، غلام اور کھجور کی پیداوار کا چوتھائی حصہ مچھلیاں اور بنے ہوئے کپڑے کی طلب کے بعد یوں ختم ہوتا ہے ”اس کے بعد تم لوگ ہر طرح کے خراج (جزیہ) اور بیگار سے آزاد ہو[2]۔“ جنوبی عرب کے نجران کے نسطورین فرقہ کے عیسائیوں کا وفد پیغمبر کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا اور ان کے نمائندوں کو (مسجد میں) نماز پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ان لوگوں سے سال میں دو بار دو ہزار پوشاک (وردی) دینے اور یمن میں

---

(1) اب یہ معاہدے اور خطوط ابن سعد کے طبقات (کی جلدوں) میں دستیاب ہیں۔ ابن سعد نے پیغمبر کی وفات کے دو سال بعد یہ مواد جمع کیے اور انھوں نے یقینی لوگوں کی یادداشت سے کام لیا ہوگا۔ ابن سعد کی جلدیں پروفیسر ذکاؤ (P. Sachau) اور دیگر مستشرقین نے بڑی محنت سے جمع کی ہیں۔ مولانا شبلی اس کو قابل وثوق سمجھتے ہیں مگر اپنی قبل از وقت موت کی وجہ سے وہ اس سے زیادہ مستفید نہ ہو سکے جیسا کہ پروفیسر واٹ (مستفید) ہوئے۔

(2) واٹ، محمدؐ، مدینہ میں، 358

مقامی جنگ کی صورت میں تیس زرہ، تیس گھوڑے اور تیس اونٹ دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے عوض انھیں اللہ اور رسول کا تحفظ (جوار)، ان کی ذات، مال اور معیشت اور ان کے گرجوں اور عبادتوں کے لیے ہمیشہ حاصل رہے گا۔ کوئی اسقف (Bishop) اپنے علاقے سے، کوئی راہب اپنے راہبانہ عہدے سے اور کسی گرجا کے پاسبان[1] (نگران) کو اپنے عہدے سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ حکم بھی جاری کیا گیا کہ مشرقی عرب کے صوبہ بحرین کے زرتشتوں سے جزیہ لیا جائے اور ان کے مذہب کا احترام کیا جائے۔

مسلمانوں سے تین مطالبے کیے گئے۔ صدقہ، زکوٰۃ اور عشر۔ قرآن نے صدقہ کو اس طرح واضح کیا ہے۔ ''جو تم دے سکو'' (سورہ 2-219) زکوٰۃ کے بعد کے فقہاء نے آمدنی کا 2.5 فیصد بیان کیا ہے۔ انھوں اس جمع شدہ سرمایہ پر بھی زکوٰۃ دینا واجب قرار دیا جسے تجارتی کاموں میں نہ لگایا جائے مثلاً سونے اور چاندی کے زیورات۔ عشر کا مطلب پیداوار کا دسواں حصہ یا ڈول کے ذریعے آب پاشی کی صورت میں پیداوار کا بیسواں حصہ۔ مشرک عربوں کے لیے کوئی علیحدہ انتظام نہ کیا گیا۔ امید یہ تھی کہ وہ مناسب وقت پر اسلام قبول کرلیں گے۔ اس کے برعکس، جزیہ کے تصور بطور ایک علیحدہ ذاتی اور مزید ٹیکس کے جو غیر مسلموں پر غیر مسلم رہنے کی وجہ سے عائد ہوتا تھا اور جس کی وضاحت بعد کے عہد کی فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے، پیغمبر کی روایات سے صحیح ثابت نہیں ہوتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر کی زندگی کے آخری دو تین سال میں عرب پر کس طرح حکومت کی گئی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کی پیغمبر کے پاس کسی قسم کی پولیس یا پیشہ وریا مستقل فوج نہ تھی اور نہ کوئی مستقل دیوانی ملازمتیں۔ یہ بات کافی زور دیکر کہی جاسکتی ہے کی پیغمبر نے کوئی حکومت یا ریاست قایم نہیں کی۔ انھوں نے قبیلوں اور فرقوں کی آزادی برقرار رکھی اور یہ آزادی اس عہد کی روایات کے مطابق تھی۔ وہ یقیناً اس خاندانی شہنشاہیت سے بیزار ہوتے جو بعد میں ان کے پیروؤں نے اپنے سماجی اور سیاسی ڈھانچے کے جزو لاینفک کے طور پر قایم کردی۔ انھوں نے اس (شہنشاہیت) کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں اور نہ اس کے متعلق کوئی قانون بنایا۔ فطرتاً وہ استدلال

---

(1) واٹ، محمدؐ مدینہ میں، ص: 359-60

سے کام لینا پسند کرتے تھے نہ کہ مستبدانہ اختیارات کے ذریعے اور عہد ناموں سے جو
اختیارات انھیں حاصل ہوئے تھے اسی کے اصول پر عرب کو متحد کرنا چاہتے تھے۔

انھوں ے 35 یا اس سے کچھ زیادہ اپنے نمائندے مقرر کیے اور عہد ناموں کے تحت ان کو اختیارات تفویض کیے۔ (یعنی) ٹیکس، عشر، زکوٰۃ، صدقات اور جزیہ کی فراہمی۔ امن بحال رکھنا اور انصاف کرنا۔ ان کے نمائندے جو ان سے بہت دوری پر تھے ان کو حکم تھا کہ امیروں سے ٹیکس وصول کر کے مقامی غریبوں کی مدد کریں۔ روایات میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو انھوں نے معاذ بن جبل کے ساتھ کی تھی جو حضر موت میں کسی عہدے پر مامور کیے گئے تھے۔ پیغمبر کے اس سوال پر کہ وہ کس طرح قانون نافذ کریں گے، معاذ نے جواب دیا تھا کہ وہ قرآنی احکام نافذ کریں گے اور جہاں قرآن خاموش ہے اس بات کو جو انھوں نے پیغمبر سے حاصل کی تھی" اگر وہ بھی خاموش ہے" معاذ نے جواب دیا کہ وہ اپنی "رائے" سے کام لیں گے۔ یہاں "رائے" کے معنی ذاتی خیال نہیں ہے بلکہ موجودہ قانون جس کو اصول معولت اور اچھے ضمیر سے تعبیر کرتا ہے۔ پیغمبر کے نمائندے کسی حیثیت سے "گورنر" نہیں کہے جا سکتے تھے۔ چند سپاہیوں کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ انھیں مقامی قبیلوں کی وفاداری پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ قابل سماعت اور ناقابلِ سماعت جرموں کے بنیادی فرق کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا کوئی باضابطہ حکومت مع اپنی پولیس اور عدلیہ کے موجود ہے یا نہیں۔ جہاں، جیسی کہ عرب کی صورت حال تھی، کوئی حکومتی فوج نہ تھی، وہاں تمام جرائم ناقابلِ سماعت تھے۔ یہ مظلوم کا کام تھا کہ وہ (ریاست سے) معاوضہ یا انتقام طلب کرے اور پیغمبر کے نمائندے صرف اتنا کر سکتے تھے کہ وہ مقامی لوگوں کو اس بات کے لیے آمادہ کریں کہ مظلوم کو معاوضہ یا بدلہ لینے میں "جو اس کا حق تھا" اعانت کریں۔ قرآن میں لفظ "حکام" آیا ہے جس کا مطلب یا تو قبیلہ کا سردار یا پیغمبر کا نمائندہ ہو سکتا ہے لیکن اس میں فرماں روائی، قومیت، شہنشاہیت، حکومت یا ریاست کے تصورات کے حامل کسی لفظ کا ذکر نہیں ہے۔

"اللہ اور اس کے رسول" کا نعرہ سب طرح کے موقعوں کے لیے تھا۔ وہ سربراہ جو عرب کے قبائل کی خودمختاری میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا تھا وہ کسی

دوسرے کے ملک کو بہ زور فتح کرنے کے لیے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ واٹ (Watt) کا خیال ہے کہ "محمدؐ کے بارے میں یہ سوچنا کہ انھیں عربوں کے آئندہ توسیع کے بارے میں مفصل اندازہ تھا بالکل غیر مناسب ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ اوائل مسلم ماخذ بھی اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کرتے۔ محمدؐ بازنطائی اور ایرانی حکومتوں کی کمزوریوں سے واقف تھے یا نہیں قیاس آرائی کا معاملہ ہے، لیکن[1] پیغمبر کو بازنطائی حملہ کا خوف تھا۔ 626ء میں انھوں نے اس طرف ایک مہم کی سرکردگی کی تھی اور پھر دو فوجیں 627 اور 629ء میں روانہ کی۔ ان کا آخری غزوہ 630ء میں تبوک کی مہم تھی جس میں 30 ہزار سپاہی اور دس ہزار گھوڑے تھے۔ یہ فوج اس خبر کی بنا پر روانہ کی گئی تھی کہ ایک بازنطائی فوج عرب پر حملہ کرنے والی تھی۔ بعد میں یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔

محمدؐ صاف طور پر کہتے تھے کہ "میں غیب نہیں جانتا۔" کوئی بھی باادب طالب علم ان کی طرز حکومت کی کامیابی سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرے گا کہ یہ طریقہ لازمی طور پر عارضی تھا۔ ایک باضابطہ ریاست کا قیام، کسی نہ کسی صورت میں لازمی تھا۔

تبوک سے واپس آنے کے بعد پیغمبر نے اپنے کچھ نمائندوں کو مسلم ارکان حج قایم کرنے کے لیے بھیجا۔ دوسرے سال (مارچ 632ء) میں انھوں نے پہلا اور آخری حج ادا کیا۔ تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع ہو گیا جب یہ معلوم ہوا کہ وہ آئیں گے۔ اور انھوں نے اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات کو بیان کرنے (تبلیغ) کے لیے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا[1]۔

پیغمبر کا جسمانی ڈھانچہ مضبوط تھا اور صحت بھی بہت اچھی تھی۔ باوجود اس کے کہ ان کو بیحد مشقت اور صعوبت اٹھانی پڑتی تھی ان کو 63 سال کی عمر تک کوئی بیماری نہ

---

(1) شبلی کی "سیرت النبی" سے چند جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ 'جہالت کے ایام کے کل رسم و رواج میرے قدم کے نیچے ہیں۔ عرب غیر عرب (عجم) سے اعلیٰ نہیں اور نہ غیر عرب عرب سے۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے"۔ کل مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، اپنے غلاموں کو اس طرح کھلاؤ اور پہناؤ جس طرح خود کھاتے پیتے ہو، ہر شخص اپنے قصور کا خود ذمہ دار ہے۔ باپ اپنے بیٹے کے جرم کا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹا باپ کے جرم کا، 'اگر ایک چپٹی ناک کا بدتو تمہارا آفیسر ہے اور اللہ کے حکم کے مطابق تمہاری رہنمائی کرتا ہے تو اس کی بات سنو اور حکم مانو۔

ہوئی۔ لیکن ان کو 14 یا 15 مئی کو تپ محرقہ کی شکایت ہوئی اور تیرہ دنوں کی بیماری کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ جب تک ان کی قوت نے اجازت دی وہ خود جماعت کی امامت کرتے رہے لیکن جب مجبور ہو گئے تو یہ کام ابو بکرؓ کے سپرد کر دیا۔ ان کی بیوہ عائشہؓ کے بیان کے مطابق پیغمبر نے کوئی وراثت نہیں چھوڑی۔ نہ درہم و دینار اور نہ اونٹ اور بکریاں[1]۔

خلافت راشدہ (661-633ء)

جیسے ہی مدینہ کے باشندوں (انصار) کو یہ معلوم ہوا کہ پیغمبر کا انتقال ہو گیا ویسے ہی انھوں نے ایک میٹنگ (شوریٰ) اپنوں میں سے ایک حکمراں منتخب کرنے کے لیے طلب کی۔ قبیلہ خزرج کے سعدؔ بن عبیدہ (اس عہدے کے) متوقع امیدوار تھے۔ ابو بکرؓ، عمرؓ اور ابو عبیدہ جراح قریش کے نمائندوں کی حیثیت سے بغیر بلائے پہنچ گئے اور شائستہ مگر صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ صرف ایک قریش ہی کو سارا عرب پیغمبر کا جانشین (خلیفہ) مانے گا۔ کچھ ناخوشگوار بحث کے بعد کل لوگوں نے سوائے سعد بن عبیدہ کے ابو بکرؓ سے بیعت کر لی۔ سبھوں نے اس انتخاب کو پسند کیا۔ مگر عمرؓ نے بعد میں کہا کہ خلیفہ کے انتخاب کا یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے۔ یہ اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ایسا خلیفہ ملا جس کو سبھوں نے قبول کیا تھا کیونکہ بہت جلد ہی اسے اپنی طویل تاریخ کے سب سے سنگین بحران کا مقابلہ کرنا تھا۔

جیسے ہی پیغمبر کے مرنے کی خبر قبیلہ در قبیلہ پہنچتی گئی زیادہ تر لوگ بغاوت پر آمادہ ہو گئے جبکہ بعض دوسروں نے موقع شناسی کا رویہ اختیار کیا۔ تین پیغمبر اور ایک پیغمبرانی بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ایسے دین کی تبلیغ کرنے لگے جو اسلام کی نقالی تھے لیکن انھیں کچھ پیروکار حاصل ہو گئے اور ان میں سب سے زیادہ مشہور مسلیمہ نے چالیس ہزار پیروکار جمع کر لیے۔ "موقع شناس" پیغمبروں کی تعلیم کے باوجود، اور ان کی تعلیم کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں، لوگ بت پرستی کی جانب پلٹے۔ مدینہ کی اہمیت اور ٹیکس کی طلبی پر اعتراضات ہوئے۔ پیغمبر کے نمائندے یا تو واپس آ گئے یا نکال

---

(1) سیرت النبی جلد 2 ص 158، الخ

کر باہر کیے گئے لیکن مکہ، مدینہ اور طائف (کے لوگ) وفادار رہے اور چند قبیلہ والوں نے خراج بھیجے۔ دیگر قبیلہ والوں نے مصالحت چاہی۔ (انھوں نے یہ کہا کہ) اگر ابو بکرؓ خراج نہ طلب کریں تو وہ اسلام کے اصولوں اور مراسم کے پابند رہیں گے مگر خلیفہ نے مصالحت سے انکار کر دیا۔ اگر تم ایک اونٹ کو باندھنے والی رسی (جیسی ادنیٰ چیز) پر بھی زکوٰۃ نہ دو گے تو ہم اس کے لیے تم سے لڑیں گے، یہی ان کا جواب تھا۔ قبیلہ اور جماعت والوں نے یک طرفہ طور پر ان معاہدوں کی خلاف ورزی کی تھی جو انھوں نے پیغمبر کے ساتھ کیے تھے۔ اور عرب کو ان وفاداروں کی مدد سے جو بچ رہے تھے، دوبارہ فتح کرنا ضروری تھا۔ ابو بکرؓ جو ساٹھ سال کے تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا، اس کام کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے عرب کے تمام صوبوں کو فتح کرنے کے لیے گیارہ فوجی دستے تیار کیے ان میں سے سب سے زیادہ اہم کی سرکردگی خالد بن ولید نے کی اور ایک سال کے اندر ایک ناقابل مقابلہ مرکزی طاقت نے امن وامان قایم کر دیا۔

ابو بکرؓ کے عہدے کے دوسرے سال عرب کی فوج نے عراق (chaldea) اور شام، جو عرب ممالک تھے پر حملہ کر دیا۔ جنگ جاری ہی تھی کہ ابو بکرؓ نے 13/ اگست 634ء میں انتقال کیا۔ اپنی علالت کے آخری ایام میں انھوں ے عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور ایک حکم نامہ اس سلسلہ میں جاری کیا اور مسلمانوں سے جو مسجد نبوی میں جمع تھے منظوری لی۔ اور فرمایا کہ ’ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جب ہم اپنے مالک کے پاس جائیں گے تو اس سے کہیں گے کہ ہم نے تیرے بندوں پر اس شخص کو مقرر کیا جو ان میں سب سے بہتر تھا۔

اہل سنت خلافت راشدہ کے عہد کو اپنی مذہبی تاریخ کا زرین زمانہ شمار کرتے ہیں۔ چاروں خلفاء پیغمبر کے اصولوں کے پابند رہے اور سادہ زندگی بسر کی۔ چونکہ وہ لوگ پانچوں وقت نماز کی امامت فرماتے اور جب ضرورت ہوتی وعظ فرماتے اس وجہ سے تمام مدینہ والوں اور باہر سے آنے والوں کو ان سے ملنے کا موقع ملتا۔ پیغمبر کے مشہور صحابیوں کو جنگی سرحدوں پر اعلیٰ فوجی کمان پر مقرر نہیں کیا گیا بلکہ انھیں مدینہ میں خلیفہ کے مشیر کی حیثیت سے رکھا جاتا۔ لیکن وقت کی رفتار کو روکنا غیر ممکن ہے۔

پیغمبر نے قبائل کو جو انتظامی اختیارات دے رکھے تھے اس کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے مدینہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جب ابو بکرؓ نے دوبارہ اپنی حکومت قایم کر لی تو قبیلوں کے انتظامی اختیارات ختم ہو گئے اور مدینہ مرکزیت پسند ایک حکومت کا دارالسلطنت بن گیا۔ اس کے علاوہ ابو بکرؓ نے اپنا جانشین منتخب کرنے کی ذمہ داری لی اور یہ بات، اس وقت کی صورت حال کو نظر انداز کر کے آئندہ زمانہ کے لیے ایک افسوس ناک مثال بن گئی۔

گو ابو بکرؓ کو تفوق حاصل ہے، مگر دوسرے خلیفہ عمرؓ (644-634ء) کو اہل سنت مسلمان ایک معیاری حکمران تصور کرتے ہیں۔ ان کا انصاف کا تصور سخت اور بے درد تھا۔ ان کی زندگی سادہ اور کھلی ہوئی تھی جس کو ہر شخص دیکھ سکتا تھا۔ اور کوئی شخص ان کے تقویٰ اور بے غرضی پر حرف نہیں لا سکتا۔ اس کے ماسوا وہ ایک ہوشیار، دور اندیش اور عقلمند انسان تھے۔ اپنی خواہش سے نہیں بلکہ وقت کے تقاضے کے تحت انھیں ایک عظیم فاتح بننا پڑا۔ قدسیہ کی تین روزہ جنگ (نومبر 635ء) کے نتیجہ میں سعد بن وقاص نے عراق اور فارس کے دارالسلطنت مدائن پر قبضہ کر لیا۔ خالد بن ولید کی حکمت عملی کی وجہ سے یرمق کی جنگ (20/اگست 636ء) میں سارے ملک شام پر قبضہ ہو گیا۔ اور وہ بیت المقدس بھی گئے ان زمینوں کی جہاں عرب رہتے تھے (سوائے دجلہ کے علاقہ کے) فتح کے بعد عمرؓ کو اطمینان ہو گیا اور انھوں نے اپنی فاتح فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ لیکن فارس کی حکومت کے ارکان اپنی سلطنت کو بحال کرنے کے درپے تھے اس لیے عمرؓ کو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ پورے ملک فارس کو فتح کر لیا جائے۔ 41-640ء میں عمرو بن العاص نے ان کے حکم سے مصر فتح کیا۔

مال غنیمت بے شمار تھا اور کہا جاتا ہے کہ عمرؓ اس مضر اثرات کو سوچ کر رو پڑے تھے لیکن برخلاف ابو بکرؓ کے جنھوں نے سب مسلمانوں کو برابر کا حصہ دیا۔ عمرؓ نے مسلمانوں میں طبقات قایم کیے۔ یعنی پیغمبر کی بیویاں، جنگ بدر کے سپاہی، یا وہ لوگ جو بیعت الرضوان میں شریک تھے یا جنگ ارتداد میں شامل ہوئے یا شام و فارس میں لڑے تھے۔ سب سے اونچے درجہ والوں کو دس ہزار سکے اور سب سے نیچے درجہ والوں کو دوسو۔ یہ درجہ بندی مناسب تھی۔ عمرؓ نے کہا کہ "اعلیٰ نسبی کی بنا پر نہیں بلکہ

مذہب (اسلام) کی قبولیت کی بنا پر ہم یہ تقسیم کرتے ہیں۔" عرب کے غلاموں کو خرید کر آزاد کر دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فوجوں کی قبائلی تنظیم کے مطابق تمام عربوں کی ایک فہرست بنالی گئی تھی۔ بصرہ اور کوفہ کی فوجی چھاؤنی 638ء میں خلیفہ کے حکم سے قایم کی گئی تھی۔ عمرؓ نے پیغمبر کے جانشین کے لقب خلیفہ کے علاوہ "امیر المومنین" کا لقب اختیار کیا۔ علاوہ ازیں عمرؓ نے غیر مسلموں سے زمین خرید کر انھیں دوسرے مقام پر آباد کر کے عرب کو ایک خالص ملک بنادیا۔ پیغمبر کے اس حکم کی صحت پر جس کی رو سے یہ کارروائی عمل میں آئی شک ظاہر کیا گیا ہے۔ اور حقیقتاً یہ (کارروائی) ان کے عہد ناموں کے خلاف معلوم ہوتی ہے پھر بھی ایک حکومت کو ضرورت کے لحاظ سے خریداری کا اختیار ہے بشرطیکہ اس کا پورا معاوضہ دیا جائے۔

نومبر 644ء میں جبکہ عمرؓ صبح کی نماز کی امامت کر رہے تھے ایک عجمی غلام آبو لو لوا نے چھ زخم کاری لگائے اور پھر خود کو ہلاک کر لیا۔ عمرؓ کو اپنے جانشین مقرر کرنے اور اہل ایمان سے اپنے جانشین کے لیے مشورہ کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے پیغمبر کے چھ معتبر صحابیوں۔ عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن وقاص، زبیر اور طلحہ کو مقرر کیا کہ وہ ایک مخصوص مدت کے اندر اپنوں میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کر لیں۔ اس کمیٹی (مجلس) کے روح رواں، عبدالرحمٰن بن عوف، ایک ملک التجار اور اقتصادی مسائل کے ماہر تھے۔ اور وہ عثمانؓ کو خلیفہ بنانے میں کامیاب ہوئے۔

خلیفہ عثمان (56-644ء) ستر سال کی عمر میں منتخب ہوئے اور 82 سال کی عمر میں شہید ہوئے۔ مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کا جو دروازہ ان کے عہد میں کھلا وہ پھر کبھی بند نہ ہو سکا۔ پہلے دو خلیفہ (جو عام طور پر شیخین مشہور ہوئے ہیں) عام لوگوں کی طرح مدینہ میں رہتے تھے۔ لوگوں کا احترام اور وفاداری یہی ان کی محافظت کا ذریعہ تھی۔ پیغمبر کے مشہور صحابہ کے مشوروں سے وہ حکومت کے کل امور کا فیصلہ کرتے تھے۔ جنگ، صلح، فتح کردہ زمینوں کی بندوبستی، اس کے علاوہ گورنروں کا انتخاب، برطرفی اور ان کی نگرانی۔ عثمانؓ نے کسی وجہ سے عوام کی محبت اور احترام کھو دیا۔ ان پر الزام تھا کہ انھوں نے اپنی قوم اور قبیلہ کے لوگوں کو مقرر کیا اور پیغمبر کے قبیلے بنی ہاشم کو نظر انداز کر دیا۔ (اسلامی) مملکت کا حکمراں طبقہ عرب تھے

جن کی فتوحات سے یہ قایم ہوئی تھی لیکن یہ قریش اور دیگر شہری قبیلے مثلاً اہل مدینہ اور ساقف، جو خود کو صحیح اشراف سمجھتے تھے، اور بدوؤں میں منقسم تھے۔ شمالی اور جنوبی قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے۔

اس زمانہ کی سب سے بڑی مصیبت بے جا ہوس تھی۔ امیر معاویہ نے جن کو عمر نے شام کا گورنر مقرر کیا تھا اپنے صوبہ کو خوشحال بنایا لیکن بقیہ جگہوں پر عثمانؓ کے (مقرر کردہ) گورنروں کے خلاف شور تھا۔ 655ء میں مدینہ میں گورنروں کی میٹنگ میں معاویہ نے کہا کہ اگر خلیفہ شام میں آکر رہیں تو وہ ان کی حفاظت کریں گے اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ مدینہ میں فوج بھیجنے کو تیار ہیں جو خلیفہ کی حفاظت کرے گی۔ عثمانؓ نے دونوں تجویزوں کو نامنظور کیا۔ صوبوں میں ان کے افسروں کے ماتحت کافی فوج تھی۔ لیکن وہ اپنی ذاتی حفاظت کے لیے مدینہ میں انھیں نہیں رکھتے تھے۔ اس نے مخالفوں کو موقع دیا۔ ان لوگوں نے مصر، بصرہ، کوفہ سے مدینہ آکر ان کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ صرف اٹھارہ رشتہ دار اور شہری خلیفہ کو بچانے کے لیے موجود تھے۔ وہ 17/جون 656ء کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کی خون آلودہ قمیض اور ان کی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں جو ایک قاتل کی تلوار سے کٹ گئی تھیں کسی طرح سے دمشق لے جاکر مسجد میں عثمان کے قاتلوں سے انتقام لینے کی نشانی کے طور پر آویزاں کر دی گئیں۔ پانچ دنوں تک قاتلوں نے مدینہ کے خوف زدہ لوگوں کو قابو میں رکھا اور مسجد نبوی میں نمازیں پڑھائیں۔ پھر ان لوگوں نے خلیفہ منتخب کرنے کا فیصلہ کیا۔ علیؓ نے انکار کیا اور طلحہ یا زبیر سے بیعت کے لیے رضامندی ظاہر کی۔ لیکن بعد میں قاتلوں کے دباؤ اور دوستوں کے کہنے سننے پر (علیؓ) راضی ہو گئے۔ اور عثمانؓ کے قتل کے چھٹے دن خلیفہ کی حیثیت سے سلامی لی[1]۔ علیؓ (656-61ء) کی خلافت کا زمانہ زیادہ جنگ میں گزرا۔ پہلے زبیر اور طلحہ پیغمبر کی بیوی عائشہؓ کے ہمراہ مکہ سے بصرہ آئے۔ علیؓ کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان کا تعاقب کریں اور ان لوگوں کو 656 میں جنگ جمل میں شکست ہوئی۔ طلحہ اور زبیر قتل ہوئے اور پیغمبر کی بیوی کو پورے احترام کے ساتھ مدینہ بھیج دیا گیا۔

---

(1) موئر، خلافت، ص235

خلافت کے آباد و خوش حال مقامات سے مدینہ کافی دور تھا۔ اس لیے علیؓ نے کوفہ کو دار السلطنت بنایا۔ اس کے بعد مدینہ دوبارہ سیاسی اقتدار حاصل نہ کر سکا۔ علیؓ کو سوائے شام کے تمام دنیائے اسلام نے خلیفہ مان لیا۔ لیکن شام جو معاویہ کے عمدہ انتظام میں تھا وہاں ساٹھ ہزار فوج تھی اور وہ اس قدر مضبوط تھا کہ دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ علیؓ کے اس مطالبہ پر کہ معاویہ ان کو خلیفہ مان لے، معاویہ کے پاس فوری جواب تھا کہ علیؓ پہلے ان لوگوں کو جو عثمان کی شہادت کی سازش میں تھے اور جو ان کی فوج اور حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، سزا دیں تب اس کے بعد یہ سوال اٹھائیں۔ دونوں حریف صفین کی جنگ لڑے۔ مگر اس کے قبل کہ جنگ کا کوئی نتیجہ بر آمد ہو علیؓ کی فوج نے مخالفت کی۔ اس بات کو منظور کر لیا کہ فیصلہ قرآن کی رو سے ہوگا۔ یعنی حَکَمَ کے ذریعے۔ اس ثالثی میں علیؓ کے نمائندہ ابو موسیٰ الشعری کو معاویہ کے نمائندے عمرو بن العاص نے دھوکہ دیا جب اول الذکر نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے دونوں حریفوں کو معزول کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے صرف علیؓ کو معزول کیا۔ اس لیے معاویہ خلیفہ بنے رہے۔

علیؓ نے اس ثالثی کو نامنظور کیا اور جنگ جاری رہی لیکن خود ان کے زیر اثر علاقوں کے خارجیوں کی متواتر بغاوت نے انھیں مفلوج کر دیا اور وہ دوبارہ معاویہ کے مقابلے کے لیے فوج نہیں لا سکے۔ عمرو بن العاص جنھوں نے عمرؓ کے زمانہ میں مصر فتح کیا تھا، 658ء میں دوبارہ معاویہ کے زمانہ میں فتح کیا۔ 661ء میں تین خارجیوں نے عمرو معاویہ اور علیؓ کو ایک صبح میں قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ عمرو کافی علیل تھے اس لیے صبح نماز کی امامت نہ کر سکے اور جو شخص ان کی نیابت کر رہا تھا مارا گیا۔ معاویہ زخمی ہوئے مگر بچ گئے۔ مگر ابن ملجم نے جس نے علیؓ کو قتل کرنے کی ذمہ داری لی تھی وہ اپنے کام میں کامیاب ہوا اور اسلام کے چوتھے خلیفہ راشد 25؍ جنوری 661ء کو قتل ہوئے۔ علیؓ کے بڑے لڑکے حسن کو ان کی جماعت نے خلیفہ بنایا۔ لیکن وہ (26؍ جنوری 661ء) کو معاویہ کے حق میں دست بردار ہو کر مدینہ واپس چلے آئے۔

خلافت راشدہ کے عہد میں کچھ ایسی خوبیاں تھیں جس کی وجہ سے سنی مسلمان اس کے گرویدہ ہیں لیکن اس میں تین کمزوریاں تھیں جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اگر کسی مملکت کا سر براہ عام لوگوں کی طرح غیر محفوظ طور پر رہتا ہے تو اس کا عوام سے واسطہ تو رہے گا لیکن اس کی زندگی مستقل خطرہ میں رہے گی (اسی لیے) چار خلفا میں سے تین شہید ہوئے۔ اس کے بر خلاف اگر سر براہ مملکت کے محافظ مقرر کیے گئے تو پھر وہ امیر المومنین باقی نہ رہتے بلکہ صرف ان لوگوں کے کمانڈر رہ جاتے جو ان کی ملازمت میں تھے۔ دوسرے عہدۂ خلافت کی جانشینی کے لیے کوئی مناسب اور باقاعدہ قانون نہیں بنایا جا سکا۔ اس انتخاب کو کسی مخصوص شہر خواہ مدینہ یا کسی اور شہر کے باشندوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ خلیفہ کو مجاز کیا جائے کہ پوری قوم میں سے بہتر شخص کو جانشین مقرر کرے۔ ابو بکرؓ ہی صرف ایسے تھے جنھوں نے اس کام کو (صحیح طور پر) انجام دیا اور آخری بات جس کو مسلم مصلحین نے عام طور پر نظر انداز کر دیا یہ تھی کہ خلافت راشدہ اسی وقت تک قایم رہ سکتی تھی جب کہ صوبوں کے گورنر، فوج کے سپہ سالار اور خلیفہ کے مشیران کی حیثیت سے صحابیوں کے ہاتھ میں اقتدار باقی رہتا۔ ضیاء الدین برنی نے صحیح لکھا ہے کہ خلافت راشدہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہی ایک عارضی تنظیم تھی۔

معاویہ سفیان کے لڑکے تھے جو کسی وقت مسلمانوں کے خلاف قریش کے سردار تھے اور جنھیں فتح مکہ کے بعد معاف کر دیا گیا تھا۔ وہ پیغمبر کے برادر نسبتی بھی تھے اور ان کے سکریٹری بھی رہے تھے۔ خلیفہ عمرؓ نے 639ء میں انھیں شام کا گورنر مقرر کیا تھا اور 661ء میں اپنی وفات کے وقت تک پورے ملک کے تنہا سربراہ تھے اور انھوں نے بیس سال تک لوگوں کو امن وامان کی زندگی بخشی۔ کہتے ہیں کہ وہ حلیم، فیاض، اور عفو پرور تھے اور وہ جانتے تھے کہ کس طرح عرب سرداروں کو مالی امداد کے ذریعے اور ان کی خودسری کے آگے مصلحتاً جھک کر زیر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایک مدبر کی حیثیت سے ان کی کامیابی صرف اس وراثتی مملکتی تنظیم کی بنا پر کی جا سکتی ہے جو انھوں نے قایم کی تھی۔ معاویہ عمرؓ پر معترض تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں جانشین مقرر نہیں کیا اور ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر کے ایک اچھی مثال قایم کر رہے تھے۔ ان کے دو اہم مشیر مغیرہ اور زیاد نے اس اصول کو پسند کیا لیکن ان کو مشورہ دیا کہ بہت احتیاط سے پہلے لوگوں سے گفت وشنید کریں۔ لیکن ان لوگوں کے انتقال

کے بعد انھوں نے خود کو اتنا مضبوط سمجھا کہ اب وہ ضروری کارروائی انجام دے سکتے ہیں۔ پہلے حکومت کے اشارے پر چند وفد معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے گزارش کی کہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر کے جانشینی کا معاملہ طے کر دیں۔ اس کے بعد انھوں نے مکہ اور مدینہ کے سرداروں کو یزید کی حمایت پر آمادہ کرنے کی کوشش شروع کی۔ ان کے مخالفوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان کے سامنے صرف تین صورتیں ہیں۔ وہ اس معاملہ کو غیر فیصل شدہ چھوڑ دیں جیسا کہ پیغمبر نے کیا، یا وہ قریش میں سے سب سے بہتر شخص کو اپنا جانشین مقرر کریں جیسا کہ ابو بکرؓ نے کیا، یا وہ خلیفہ کی جانشینی کو ایک کمیٹی کے سپرد کر دیں جیسا کہ عمرؓ نے کیا اور ان ہی لوگوں کی طرح اپنے بیٹوں اور باپ کے بیٹوں کو علیحدہ رکھیں، مگر معاویہ راضی نہ ہوئے۔ ہر ایک خلیفہ کی موت کے بعد جانشینی کے جھگڑوں کے خطرات سے اسلام کو بچانا ضروری تھا۔

آخر ش حکومت کی قوت سے کام لینا پڑا۔ باوجود اس کے کہ مکہ اور مدینہ کے چند نہایت باہمت لوگ (جس میں علیؓ کے لڑکے حسینؓ اور عبداللہ بن زبیر تھے) تقریباً سبھی اہم لوگ یزید کی بیعت پر راضی ہو گئے جس کو اپنے باپ کی جگہ حاصل کرنے میں دقت نہ ہوئی۔ حسینؓ (علیؓ اور پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ کے لڑکے) کو کوفہ کے لوگوں نے مدعو کیا کہ وہ ان لوگوں کے خلیفہ ہوں۔ لیکن یزید کے افسروں کو کوفہ والوں کو مرعوب کرنے میں اور حسینؓ کو ان کے مرد ساتھیوں کے ساتھ جن کی تعداد ستر ہو گی، کربلا کے میدان میں جو کوفہ سے تقریباً پچیس میل کے فاصلہ پر ہو گا، شہید کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ یزید کو خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے ان افسروں کو جو اس میں شریک تھے سزا نہیں دی۔ اور اس جان فرسا (ہولناک) واقعہ کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ (10 / محرم 61ھ مطابق 10 / اکتوبر 680ء)

قرآن میں خلیفہ کا لفظ نائب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ انسان کو دنیا میں اللہ کے خلیفہ کے طور پر بھیجا گیا اس لیے ساری مخلوق میں دینی اخلاقی قانون کو برتنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن تعجیل وقت کی بنا پر پیغمبر کے جانشین کے لیے صرف

خلیفہ ہی کا لفظ دستیاب تھا۔ مَلِک کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ اس میں خاندانی جانشینی مضمر ہے۔ اسی لیے ابو بکرؓ نے فرمایا "میں پیغمبر کا خلیفہ ہوں (نائب)۔ اللہ کا خلیفہ (نائب) نہیں ہوں۔ صرف روایت کے احترام اور کثرت استعمال کی بنا پر خلیفہ کا لفظ اُمیہ اور عباسیہ خاندان کے سربراہوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جنھیں خون کے رشتے اور اپنے پیش رو کے منتخب شدہ ہونے کی وجہ سے یہ مقام حاصل ہوا۔ بادشاہ یا خلیفہ کو دنیا میں اللہ کا عکس (ظل اللہ فی الارض) کہنا ایک بے معنی جملہ ہے جس کے لیے کوئی شرعی حکم نہیں اور مسلمانوں کو اپنے بادشاہوں، جو خلیفہ کہلاتے ہوں، یا سلطان، امیر یا خان کو قتل کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ خلافت راشدہ کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ سب سے بہتر قریش کو انتظامِ حکومت کا حق ہے خواہ اس کے انتخاب کی کوئی بھی صورت ہو، جب یہ اختیار پیش رووں کو حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ دار کو مقرر کریں تو خلافتِ راشدہ لا محالہ ختم ہو گئی۔

اس بات پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے کہ قرآن اور حدیث نے ایک سیاسی ادارے کی حیثیت سے سلطنت، خواہ وہ کسی طرح کی ہو، کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ چنانچہ مسلمانوں کے کسی بھی مذہبی قانون یا شریعت نے سلطنت یا اس کی جانشینی کے متعلق کچھ نہیں کہا اور چونکہ مسلمانوں کا مذہبی قانون سلطنت کو ایک سیاسی ادارہ تسلیم نہیں کرتا اس لیے بغاوت اور سازش کو جرم نہیں سمجھتا۔ علاوہ ازیں ایک سلطان، ایک ظالم اور ایک غاصب کے درمیان۔ ان کی پالیسیوں اور انتظامی عمدگی کے علاوہ۔ اور کسی بنا پر تمیز نہیں کی جا سکتی تھی۔ مسلمانوں میں خاندانی بادشاہت کے لیے اور کوئی جواز نہ تھا سوائے اس کے جو معاویہ نے اور عہد وسطیٰ کی ضروریات اور روایات نے اسے رکھا تھا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ یہ ضروریات ناگزیر رہی ہیں۔

بادشاہ کے غیر محدود اختیارات کی تائید میں قرون وسطیٰ میں اکثر یہ غیر مذہبی توضیح کی جاتی کہ "اگر کوئی سلطان نہ ہو تو انسان انسان کو کھا جائے گا" اہل یوروپ کو اپنی تاریخ کے دوران مختلف قسم کی حکومتوں کا تجربہ ہوا (مثلاً) قدیم یونانی شہری ریاستوں کی چند سری اور جمہوری حکومتیں، جمہوریہ روم کے امراء (کے زیر اثر حکومتیں)، جینوا (Genoa) اور وینس (Venice) کی چند سری حکومتیں اور مقدس رومی سلطنت

کے آزاد شہروں کی حکومتیں۔ لیکن مسلمان انیسویں صدی کے آخر تک سوائے وراثتی بادشاہت کے کسی اور طرز حکومت سے واقف نہ تھے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے فقہاء قرآنی آیات پر مبنی اسلامی اخوت اور مساوات کے اصول اور شخصی یا خاندانی اقتدار کی تلخ حقیقت کے فرق سے ناواقف تھے۔ چند نظری انقلاب پسندوں مثلاً ابن تیمیہ کا خیال تھا کہ خلافتِ راشدہ دوبارہ واپس لائی جا سکتی ہے۔ صوفیائے کبار نے حکومتی معاملات سے علیحدگی کے ذریعہ راہ نجات تلاش کی۔ پھر بھی (ہم یہ دیکھتے ہیں) کہ علماء کی اکثریت، مثلاً امام غزالی کو یہ احساس تھا کہ عوامی حقوق کا انحصار بادشاہ کے حقوق کو جائز تسلیم کیے جانے پر تھا مثلاً کسی عدالت کے فیصلے کا جائز ہونا۔ بادشاہِ وقت کے اختیارات کو جائز تسلیم کرنے پر منحصر تھا (جس نے وہ عدالتی نظام قایم کیا تھا۔) لہٰذا وہ لوگ ایک بادشاہ کی حکومت کو، خواہ اس بادشاہ کا عمل خلافت راشدہ کی قایم کردہ روایات کے مطابق نہ ہو، اس لحاظ سے تسلیم کرنے کو تیار تھے کہ وہ ایک حقیقت تھی۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی غاصب کو مناسب وجوہات کی بنا پر اگر قتل کر بھی دیا گیا ہو تو اس کے عہد کی عدلیہ اور انتظامیہ کے روز مرہ کے کاموں کو قانونی اور جائز تسلیم کیا گیا۔

لہٰذا مختلف اسلامی ممالک کی مختلف حالات کے باوجود، اسلامی سیاسی تاریخ زیادہ تر خاندانی بادشاہت کی تاریخ رہی ہے۔ اور مسلمانوں کے درمیان خاندانی (نوعیت کی) سیاست کی دو اہم خصوصیات رہی ہیں۔ اوّلاً حق وراثت سے متعلق رسوم و روایات اور ثانیاً ایک لائق حکمراں کے غیر معمولی اختیارات۔ ان دونوں اعتبار سے مسلمانوں کی بادشاہت عام طور پر دوسرے لوگوں کی بادشاہت سے بالکل مختلف ہے۔

عباسیوں نے حق وراثت کے اس طریقہ کو جاری رکھا جو امویوں کے دور میں ترقی پذیر ہوا تھا۔ بڑے لڑکے کے حق وراثت کو جائز یا ضروری مانا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے اس اصول کو اپنے ذاتی یا عوامی قانون کے لیے صحیح نہیں تصور کیا۔ ماں کی حیثیت کو بھی اکثر لیکن ہمیشہ نہیں، غیر اہم تصور کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار، بھائی یا بیٹے کو نامزد کر سکتا تھا اور اپنے امرا اور برگزیدہ اشخاص سے اس کی منظوری حاصل کرا سکتا تھا۔ اس کی بھی کوشش کی گئی کہ بادشاہ اپنے کئی ایک جانشینوں کو علی

الترتیب نامزد کر دے جو اسی ترتیب کے مطابق اس کے جانشین ہوں گے اور اس انتظام کی منظوری لے لے مگر یہ تجربہ کامیاب نہیں رہا۔ اس صورت میں اندیشہ یہ رہتا تھا کہ پہلا نامزد کیا ہوا وارث بقیہ وارثوں کی نامزدگی کو برطرف کر کے ان کی جگہ اپنے کسی ایک بیٹے کو نامزد کر دے گا۔ اموی خلفا اور عظیم عباسی خلفا کے دور میں خلیفہ کے ذریعے نامزدگی اور اس کے بعد (سربرآوردہ اشخاص کی) بیعت کافی تھی۔ لیکن بعد کے شاہی خاندانوں کے زمانہ میں ایک مزید شرط یہ جوڑی گئی کہ بادشاہ کی موت کے بعد اس کی نامزدگی کی تصدیق امرا کریں اور وہ خاندان کے کسی دوسرے فرد کے حق وراثت کو جائز قرار دے سکتے تھے۔ اگر کوئی بادشاہ کسی کو نامزد کیے بغیر مر جائے تو امرا اس کے کسی رشتہ دار، عموماً بیٹے کو، اس کا جانشین چن سکتے تھے۔

رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ دو بڑی ناخوشگوار اور مکروہ صورتیں روپذیر ہوئیں۔ اوّل یہ کہ مسلم رائے عامہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی کہ شاہی خاندان میں میل محبت خصوصاً برادرانہ میل محبت کی کوئی جگہ نہیں[1]۔ اگر کسی بادشاہ کے چار لڑکے تھے، تو ان میں سے کوئی ایک ہی تخت نشین ہو سکتا تھا۔ بقیہ تین اس کے مخالف بن جاتے اور خواہ اپنی مرضی یا سازش کرنے والے دوسروں کی ترغیب پر ضرور ہی اس کے خلاف بغاوت کرتے اس لیے یہ سمجھا جاتا تھا کہ بادشاہِ وقت نہ صرف اپنے حق میں بلکہ ریاست اور ملت کے حق میں، اور خدا کی نظر میں بھی، ایک مستحسن کام کرتا۔ اگر وہ اپنے مخالفین اور رشتہ داروں کو ختم کر کے (ملک میں) امن و امان قایم رکھتا ہے۔ بے گناہ رشتہ داروں کا بلا کسی سبب کے قتل، سوائے اس کے شاید وہ اس کے مخالف بن جائیں، بڑے بڑے متقی مسلم بادشاہوں کے ضمیر کو ذرا بھی نہیں کھٹکتا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ بادشاہ کسی ایک خاندان ہی سے لیے جاتے تھے اس لیے اس خاندان کی عظمت بہت بڑھ جاتی اور یہ تصور کیا جاتا تھا کہ جب اس خاندان کا کوئی فرد باقی تھا اس کا تخت پر حق تھا اور وہ اس حق کے حصول کی کوشش کر سکتا تھا۔ لہٰذا جب کسی دوسرے خاندان کا ایک فرد تخت حاصل کر لیتا تو وہ اپنی اور اپنے جانشینوں کی حکومت کے استحکام کے لیے یہ ضروری سمجھتا کہ ماقبل خاندان کے ان تمام افراد کو جن کو وہ گرفتار کر سکتا

---

(1) (لیکن) مسلم بادشاہی روایات پدرکشی کی اجازت نہیں دیتیں اور اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

قتل کرادے یا نابینا کرادے۔ عباسیوں کے ہاتھوں امویوں کا قتل عام ایک مثال بن گئی جس پر بعد کے باغیوں کو بھی عمل کرنا پڑا۔ یہ بات بھی کہہ دی جائے کہ امویوں اور عباسیوں دونوں ہی نے پیغمبر کے ان وارثوں کو، جن سے وہ اپنے خاندان کے لیے خطرہ محسوس کرتے تھے، قتل کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔

عاقل مگر غیر جاہ طلب، حافظ کہتے ہیں کہ ''شاہی تاج ایک بہت ہی جاذب دستار (ٹوپی) ہے مگر چونکہ اس کو (پہننے میں) جان کو خطرہ لاحق ہے اس لیے یہ اس قابل نہیں کہ اس کو سر پر قایم رکھنے کی دردسری مول لی جائے''۔ بادشاہ کے اقتدار کو خود اس کے رشتہ داروں اور مخالفین کی جانب سے ایسے متواتر خطرات لاحق رہتے کہ جب تک کہ وہ بادشاہ اپنے مدمقابل افراد سے بہت زیادہ اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل نہ ہوتا اس کا 15 یا 20 برسوں تک تخت پر قایم رہنا مشکل ہوتا تھا۔ ایک سرسری اندازہ کے مطابق نصف سے کچھ زیادہ مسلم سلاطین مقید ہوئے یا قتل کردیے گئے۔ جو نابالغ تخت پر بٹھائے گئے ان میں سے بہت کم زندہ رہ پائے۔ اکبر اعظم کی مثال مستثنیات میں سے ہے۔ دوسری جانب (ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ) تخت نشینوں کو اپنے قریبی رشتہ داروں کی خاصی تعداد کو تہہ تیغ کرنا ہوتا تھا۔ شاید فی بادشاہ دس رشتہ داروں (کے قتل) کا اندازہ بیجا نہ ہوگا۔ اوسط اور باصلاحیت مسلمان حکمرانوں کی طاقت کا اندازہ حاصل کرنے کے لیے نابالغ اور کمزور حکمرانوں کے شمار کی ضرورت نہیں۔ (اس لیے کہ) جو اقتدار ان حکمرانوں سے سلب ہوگئے وہ ان کے لایق جانشینوں نے دوبارہ حاصل کرلیے۔

مسلم بادشاہوں کے اختیارات کی تشریح مشکل ہے۔ مگر مندرجہ ذیل باتیں بالکل صاف ہیں۔ اکابر صحابہ سے مشورہ کی ذمہ داری کے علاوہ، پیغمبر کو جنگ و صلح کے معاملات میں، اور اپنے نمائندوں کی تقرری، برطرفی اور نگرانی کے معاملوں میں مکمل اختیار حاصل تھا۔ ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں عوام کے ان اختیارات کو تسلیم کیا کہ وہ خلیفہ کے کاموں پر روک تھام کرسکتے ہیں ''اگر میں صحیح کام کروں تو میری معاونت کرو اور اگر غلطی ہو تو اس کی تصحیح کرو۔ میرا حکم مانو جب میں خدا اور پیغمبر کے احکام پر عمل کروں اور جن معاملات میں مجھ سے (کسی طرح کی نادانستہ) خلاف ورزی سرزد ہو تو اس میں ہماری اطاعت نہ کرو''۔ بہرحال خلافتِ راشدہ کے عہد میں مرکزی

حکومت کے اختیارات بڑھ گئے۔ پیغمبر کے نمائندوں کی جگہ خلفاء کے گورنروں نے لے لی اور ان کی تقرری، نگرانی، اور برطرفی خلیفہ کے اہم کام بن گئے۔ پیغمبر کے نمائندوں کے برخلاف خلیفہ کے گورنر کو وہ طاقت (فوج) مہیا تھی جس کے ذریعے وہ مرکزی حکومت کے احکام کی تعمیل کرا سکتے تھے۔ جب خلافتِ راشدہ کی جگہ وراثتی حکومت نے لے لی تو یہ تمام اختیارات سلطان کو حاصل ہو گئے۔ لیکن چونکہ اس کو خلفاء کی طرح اخلاقی عظمت حاصل نہ تھی اس لیے اس کو (وقتاً فوقتاً) بعض اعلیٰ ترین افسروں کو برطرف یا قتل کر کے اس بات کو یاد دلاتے رہنے کی ضرورت پڑتی کہ وہ واقعی صاحب اقتدار ہے۔ وہ بادشاہ جو اپنے (اعلیٰ ترین) عہدہ داران کو برطرف نہ کر سکے وہ صحیح معنوں میں بادشاہ سمجھا ہی نہ جا سکتا تھا اور اس کی بادشاہت قلیل المدت ہی ثابت ہوتی۔

ہمیں معلوم ہے کہ پیغمبر نے معاذ بن جبل کو اپنی رائے، (یعنی ذاتی رائے بشرطیکہ وہ پیغمبر کی تعلیمات، اصول معدلت اور ضمیر کی پکار کے مطابق ہو) سے کام لینے کا اختیار دیا تھا اور یہ فرض کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ انھوں نے ایسے ہی اختیارات اپنے دوسرے نمائندوں کو بھی دیئے ہوں گے۔ پیغمبر نے بیرون ممالک کو فتح کرنے کا خیال ہی نہیں کیا تھا اور ظاہر ہے کہ جہاں پیغمبر کی سنت خاموش ہے ان معاملات میں خلفائے راشدہ نے اپنی رائے سے کام لیا ہوگا، جسے اب ہم غیر دینی (سیکولر) قانون سازی کہہ سکتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ وہ فقیہ جن کے پیروؤں کی تعداد مسلمانوں میں سب سے زیادہ ہے، رائے، کو شریعت کا جزوِ لازم مانتے ہیں۔ لیکن امام شافعیؒ نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ جہاں تک ایشیا کے مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کی پیروی کی ہے۔ لیکن امتداد زمانہ اور تبدیلی حالات کے ساتھ ساتھ ریاست کے اقتدار کے تصور میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی ہے۔ 'رائے' اب 'ضوابط' یا آئین (ریاستی قوانین) بن گئی۔ اب یہ شریعت کی ایک معاون نہ رہی بلکہ اس کے بدل کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ان دونوں میں ایک بنیادی تضاد تھا۔ شریعت کی بنیاد حکم پر تھی۔ قرآن، حدیث، قیاس۔ (اس کے برخلاف) ریاستی قوانین جو حکومت کی جانب سے جاری ہوتے ان کا

کوئی ایک عوامی مقصد ہوتا۔ مثلاً استحسان، استصلاح وغیرہ۔ چنانچہ ہندستانی (مورخ) ضیاء الدین برنی 'تاریخ فیروز شاہی، میں ریاستی قوانین کی یہ تشریح کرتا ہے کہ ان کا مقصد انسانوں کو ان تمام آفات سے محفوظ رکھنا تھا جن سے بچانا انسان کے اختیار میں تھا۔ اس زمانہ میں جب کہ اس نے یہ کتاب لکھی (تقریباً 1357 ہجری) قحط اور وبا کو ان آفات میں شمار نہیں کیا جاتا تھا جو انسانی کوششوں سے روکی جاسکیں۔ برنی کا یہ بھی خیال تھا کہ جہاں شریعت و ضوابط میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو بادشاہ کو موخر الذکر کو ترجیح دینی چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مسلمان کی حیثیت سے بادشاہ کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ (ضوابط کو ترجیح دینے کی) پالیسی کو نہ بدلے۔ لیکن وہ شریعت کی خلاف ورزی کے لیے خدا سے معافی کا طلب گار ہو اور خیرات تقسیم کرے۔

چند رومن بادشاہوں اور نشاۃ ثانیہ عہد کے بعض یوروپین حکمرانوں کے علاوہ بقیہ ان تمام سلاطین، جن کا ذکر تاریخ میں ہے، کے مقابلہ میں مسلم بادشاہوں کو زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ بادشاہوں کو یہ غیر معمولی اختیارات ابتدائی زمانہ میں اسلام کی توسیع اور عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کے زیر اثر وسیع علاقے میں امن و امان قایم رکھنے کے لیے درکار تھے۔ اسلام میں دین و ریاست کے تعلق کے مسئلے کی نوعیت اس سے کہیں مختلف ہے جو عیسائیت یا ہندویت میں ہے۔ اسلام میں کوئی منظم اور مقرر کردہ پجاری طبقہ نہیں ہے۔ علماء اسلام کو اور کوئی فضیلت حاصل نہیں سوائے اس کے جو انھیں علم اور عوامی عقیدے کے ذریعے ملی ہو۔ ہندوؤں میں ایک برہمن تمام برہمنوں کی طرف سے اظہار کر سکتا تھا لیکن مسلمانوں میں ایک عالم صرف اپنی رائے کا اظہار کر سکتا تھا۔ اور اس پر بھی حکومت کے لیے یہ ہمیشہ ممکن تھا کہ وہ اس کا ایک مدمقابل پیش کر دے۔ دوسری بات یہ کہ مسلمانوں میں خلافت (یا ریاست) کی تشکیل پہلے ہوئی۔ قرآن کے علاوہ مسلمانوں کے پاس ایسی بہت کم کتابیں ہیں جو پہلی صدی ہجری کے دور کی ہوں۔ مسلم فقہ و دینی علوم کی بنیاد عباسی دور میں پڑی۔ اور مختلف مذاہب (فقہی مکتب فکر) کے مطابق ریاست کی پالیسیاں بدلتی رہیں۔

بالآخر راسخ العقیدہ اشعری مکتب فکر کو مسلم عوام اور حکومت نے تسلیم کر لیا

حالانکہ خدا، زمان و مکان اور علت (Causation) کے متعلق اس کا نقطہ نظر پر تضاد تھا۔ اس طرح حکومت کے ساتھ علماء کے تعلق کا مسئلہ کچھ آسان ہو گیا۔ بادشاہ مطلق العنان اور صاحب ثروت ہوتا تھا جب کہ زیادہ تر علماء نچلے متوسط طبقہ کے ہوتے اور ان کی امیدیں اس سے وابستہ ہوتی تھیں کہ حکومت کے زیر اختیار لیکن مذہبی یا نیم مذہبی ادارے میں نوکری مل جائے یا پھر بادشاہ کی طرف سے کوئی مدد معاش مل جائے۔ صوفیاء نے خود کو حکومت سے آزاد رکھنا چاہا۔ بعض غیر روادار ذہنیت کے ملاؤں نے ریاست میں من حیثیت ریاست کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس کے لیے سزا پائی۔ عمومی طور پر مذہبی امور پر اخراجات کے ذریعے ریاست نے علماء کو زیر اثر رکھا۔ اسلام کی تاریخ میں یوروپ کی مذہبی "اصلاح" (Reformation) جیسی کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ ریاست ہی ہمیشہ سب کچھ بنی رہی۔ مذہبی امور میں کل اختلافات کا حل راسخ العقیدگی (orthodoxy) کے حوالے سے کیا گیا۔

چونکہ عموماً مسلمان بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا اور زمانے اور حالات کے مطابق مستبد طریقوں سے وہ خود کو برسر اقتدار رکھتا تھا اس لیے کل اختیارات کا شمار مشکل ہے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ (اس پر عائد) دو پابندیوں کی نشاندہی کر دیں۔ اوّل یہ کہ ذاتی امور کے متعلق شریعت کے تسلیم شدہ اصول کی وجہ سے غیر سیاسی عوام کی جان و مال اور ان کی پیشہ ورانہ املاک کی آمدنی کی حفاظت عموماً ہوتی تھی۔ دوسری یہ کہ اگرچہ مسلم بادشاہ کو مخالفین اور باغیوں کو سزا دینے کے اختیارات لامحدود تھے پھر بھی اس کو ہمیشہ قتل، بغاوت اور سازش کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ گرچہ اس کا اندازہ ہو گیا تھا کہ عوام کا پیمانہ صبر گہرا تھا اور وہ کافی مصیبتیں اٹھانے کے بعد ہی کسی ظالم حکمراں کے خلاف تلوار اٹھائیں گے، پھر بھی سازشیں برابر ہوتی رہتی تھیں اور سیاسی قتل کرنے کا ارادہ رکھنے والوں کی تعداد کثیر تھی۔

اب ہمیں بادشاہ اور حکمراں طبقہ کے تعلقات پر نظر ڈالنا ہے۔ حکومت کے ملازمین کو تین درجوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ نچلے درجے کے مقامی افسران جنھیں زیادہ ترقی حاصل کرنے کی امید نہ تھی، درمیانی درجہ کے افسران جنھیں عموماً بادشاہ مقرر کرتا تھا اور جن کی ترقی کی گنجائش تھی، اور اعلیٰ ترین درجہ کے افسران جو عموماً صوبوں

کے نگراں یا مرکزی حکومت کے شعبوں کے سر براہ ہوتے تھے اور جن سے بادشاہ حکومت کے معاملات میں اکثر صلاح و مشورہ کرتا تھا۔ تقرری خواہ براہ راست بادشاہ کی جانب سے ہو یا اس کے کسی اہل کار کے ہاتھوں ہو، تمام عہدیداروں کو بادشاہ کا ملازم سمجھا جاتا تھا۔ تقرری اور برطرفی کے اپنے اختیارات کا استعمال اس لیے ناگزیر تھا کہ اس صورت میں ایک ایسا حکمراں طبقہ تیار کرسکتا تھا جس پر وہ بھروسہ کرسکے۔ جیسے جیسے ہم مختلف زمانوں کی تاریخ کی ورق گردانی کریں گے ہم اس حکمراں طبقہ کو بدلتا ہوا پائیں گے۔

اموی سلطنت (661-750ء)

اموی سلطنت کے عہد میں چودہ حکمراں ہوئے اور یہ تقریباً نوّے سال تک قایم رہی[1]۔ چونکہ سلطنت کی بنیاد عربوں نے ڈالی تھی لہٰذا انھوں نے بلا شریک غیر اس پر حکومت کرنے کے حق پر اصرار کیا۔ نتیجتاً غیر عرب خصوصاً کسانوں پر خواہ وہ اسلام قبول کیے ہوئے ہوں یا نہیں، ظلم و زیادتی ہوئی۔ کسی فارسی کی، خواہ اس نے اسلام قبول کرلیا ہو، اس وقت تک کوئی حیثیت نہ تھی جب تک کہ وہ ایک موالی کی حیثیت سے کسی عرب قبیلہ میں شامل نہ ہو جائے۔ اور اس کے بعد بھی اسے سارے حقوق حاصل نہ ہوتے۔ مثال کے طور پر عرب گھوڑے پر بیٹھ کر جنگ کرسکتے تھے لیکن موالی کو پاپیادہ لڑنا پڑتا تھا لیکن کچھ عرصہ تک مفتوح لوگ احتجاج کرنے یا بغاوت کرنے کے لائق نہ تھے لہٰذا کسی حریف کا خدشہ نہ ہونے کی وجہ سے عرب آپس میں معاندانہ گروہ بندی کا کھیل رچا سکتے تھے۔ یہ بات تسلیم شدہ تھی کہ عربوں کا طبقہ اشرافیہ قریش تھا لیکن قریش دو مخالف شاخوں میں بٹ گئے تھے۔ اموی اور ان کے حلیف جو ریاست کے اقتدار اور اعلیٰ عہدوں پر اجارہ داری رکھتے تھے اور ان کے حریف ہاشمی (جس میں رسول کے اہل بیت شامل تھے) جن پر امکانی حریف سمجھ کر ظلم و ستم کیا جاتا۔ دونوں شاخیں

---

(1) فہرست مندرجہ ذیل ہے:-

1-معاویہ 661-80ء، 2-یزید 680-83ء، 3-معاویہ دوم 683-84ء، 4-مروان اول 684-85ء، 5-عبدالملک 685-705ء، ولید اوّل 705-15ء سلیمان 715-17ء، 8-عمر دوم 717-20ء، 9-یزید دوم 720-24ء، 10- ہشام 724-43ء، 11-ولید دوم 743-44ء، 12-یزید سوم 744ء، 13-ابراہیم 744ء، 14-مروان 744-50ء۔

ایک ہی مورث اعلیٰ عبد مناف سے نکلتی تھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت نے آپس کی تلخی میں اور اضافہ ہی کیا۔ مزید براں یمنی (جنوبی) اور بنو موزر (شمالی) عرب قبائل اپنی اس دشمنی کو سلطنت کے ہر گوشے میں پھیلانے کے درپے تھے۔ ہمیں اسبات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ فارس اور عراق کے مظلوم عوام نے اپنی امیدیں اہل بیت کے برسر اقتدار ہونے سے وابستہ کرار کھی تھیں اور وہ اس مقصد کے لیے بارہا لڑے بھی لیکن انھیں اس بات کی خبر نہ تھی کہ جب وقت آئے گا تو چالاک سیاست داں ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیں گے۔

معاویہ کا بیٹا یزید ساڑھے تین سال کی حکومت کے بعد انتقال کر گیا۔ یزید کا بیٹا معاویہ دوم دق کا مریض تھا جو دو یا تین ماہ بعد انتقال کر گیا۔ لہٰذا گروہ کے اکابروں نے مروان بن حکم کو دوسرے خلیفہ کی حیثیت سے منتخب کیا اور اس خاندان کے بقیہ سارے حکمراں اسی کے اخلاف تھے۔ اسی زمانہ میں عبداللہ بن زبیر نے خلافت کا دعویٰ کر دیا اور ان کے ساتھ تقریباً نو سالوں (684-92ء) تک کشمکش جاری رہی۔

اموی بادشاہ عموماً ذاتی طور پر حلیم، رحم دل اور فیاض تھے۔ وہ خود اپنے وزیر اعلیٰ بھی تھے لیکن اس بات نے ان کے لیے ناگزیر بنا دیا کہ وہ اپنے گورنروں کو وسیع اختیارات سونپیں اور اس اختیار کے لازمی طور پر غلط استعمال کے لیے ان کی سرزنش بھی کریں۔ معاویہ نے اپنے بھائی زیاد کو کوفہ، بصرہ اور پورے فارس کا گورنر مقرر کیا تھا اور زیاد نے سختی کے ساتھ قوانین کی پابندی کرا کے عزت و وفاداری حاصل کی۔

عبدالملک نے عبداللہ بن زبیر کو شکست دی اور پوری سلطنت اپنے زیر نگیں کر لی اور اس کے بیٹے ولید نے اپنے مورث اعلیٰ کے کام میں اضافہ کیا۔ ولید اول کا عہد بیرون ملک اور اندرونِ ملک دونوں ہی جگہ شاندار تھا۔ عمر اول کی حکومت کو بھی مستثنیٰ کیے بغیر کوئی ایسا دوسرا عہد نہ تھا جس میں اسلام اتنا پھیلا اور مستحکم ہوا ہو[1]۔ اب تک مشرق میں ترکوں کی اور شمالی افریقہ میں بربروں کی سرزمینوں پر عربوں کے محض حملے ہوا کرتے تھے لیکن حملہ آوروں کو شکست دے دی جاتی تھی اور خلیفہ کی سلطنت کی توسیع نہیں ہو پائی تھی۔ حجاج بن یوسف ثقفی، جو مشرق میں ولید کا وائسرائے تھا،

---

(1) موئر، خلافت، ص 360-61ء

کی ماتحتی میں قتیبہ بن مسلم نے فارس کی مشرقی سرحد سے لے کر چین کی سرحد تک ترکوں کی سرزمین کو فتح کر کے نو آبادیات قایم کیں جب کہ حجاج کے ایک عم زاد بھائی محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر لیا۔ مصر کی مشرقی سرزمینوں کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے پورے شمالی افریقہ کو فتح کر کے نو آبادیات قایم کیں جب کہ اس کے بربری غلام افسر طارق نے اندلسیہ یا جنوبی اسپین کو فتح کر کے آباد کیا۔ اموی عہد حکومت کی لعنت فرقہ پرستانہ بغاوتیں باندھی شکلوں کے اندر پوشیدہ ذاتی حرص و ہوس تھی۔ لہٰذا اموی افسران مثلاً حجاج کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ ان بغاوتوں کو مضبوط ہاتھوں سے فرد کریں اور (اس وجہ سے) اموی بادشاہ دوسرے شاہی خاندانوں کی بہ نسبت زیادہ جابر شمار کیے جاتے ہیں۔

جس مفروضہ پر خلافت راشدہ اور اموی سلطنت کی بنیاد تھی وہ یہ تھا کہ تمام مسلمان، زبان، نسل اور تمدن کے تمام امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک ہی ریاست سے متعلق ہوں، اور یہ ریاست اسلام کی پہلی صدی میں صرف عرب اشرافیہ کی ہی ایک سلطنت ہو سکتی تھی۔ قدرتی طور پر اس ریاست کے خلاف فارسی موالیوں کے درمیان نیز ان عربوں کے درمیان جو اپنے سیاسی حقوق سے محروم کر دیئے گئے تھے ناراضگی پائی جاتی تھی اور نبی کے اہل بیت یا ہاشم کا گھرانہ، بغیر تعیین امیدوار، ایک ایسا نعرہ جنگ معلوم پڑتا تھا جو ان تمام لوگوں کو اکٹھا کر سکتا تھا جو قابل نفرت امویوں سے غیر مطمئن تھے۔

شیعوں کے امام حسین بن علی کے اخلاف نے (اس) بغاوت میں کوئی حصہ نہ لیا اور اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کیا۔ لیکن ہشام کے عہد حکومت میں (43-724ء) نبی کے چچا عباس کے پڑپوتے محمد نے خفیہ طور پر گاؤں حمیمہ، جو جنوبی فلسطین میں ہے، سے اپنے خاندان کی حمایت میں اشاعت شروع کی۔ اس نے اشاعت کی بنیاد ان تاجروں پر رکھی جو شہر بہ شہر سفر کیا کرتے تھے۔ 743ء میں مکہ میں قیام کے دوران ایک نوجوان ایرانی غلام ابو مسلم خراسانی کو خریدا جس میں ایک کامیاب انقلابی کی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ لیکن محمد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بڑے لڑکے ابراہیم کو گرفتار کر کے قید خانے میں ہلاک کر دیا گیا۔ اور ابراہیم کے چھوٹے بھائی ابوالعباس اور ابو منصور کوفہ میں روپوش ہو گئے۔ 747ء میں محتاط تیاریوں کے بعد ابو

مسلم خراسانی نے ہرات اور مسرو میں عباسیوں کا سیاہ علم بغاوت بلند کیا۔ اس کے موقف (دعویٰ) کو عام حمایت حاصل ہوئی۔ خراسان کے پچاسی سالہ اموی گورنر نصر کا واپس بھاگنے کے دوران حمدان کے قریب انتقال ہو گیا۔ انقلابی لہروں کا روکنا ناممکن ہو گیا۔ کوفہ پر قبضہ ہو گیا۔ اور زاب کی جنگ میں (25 جنوری 750ء) مروان کو شکست ہوئی۔ اور مصر کے ایک کلیسا میں اسے مار ڈالا گیا۔ تمام سر بر آوردہ امویوں کو بے رحمی سے مار ڈالا گیا۔ سوائے ہشام کے ایک پوتے عبدالرحمٰن (الداخل) کے، جو اسپین بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا اور جہاں اس نے اپنی ایک آزاد حکومت قایم کر لی۔ اکتوبر 749ء کو پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس کی حمایت میں حلفِ وفاداری اٹھایا گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ "میں زبردست منتقم ہوں اور میرا نام "السفاح" یعنی خون بہانے والا ہے[1]۔

خلافت عباسیہ (750-1258ء)

تاریخ اسلام میں عباسی طویل ترین حکمراں خاندان ہے۔ یہ پانچ سو سال سے بیشتر قایم رہا اور اس کے عہد میں 37 حکمراں ہوئے۔ لیکن ان میں سے صرف پہلے آٹھ ابوالعباس سفاح (749-54) ابو جعفر منصور (754-75ء) مہدی (775-85ء) ہادی (785-86ء) ہارون رشید (786-809ء)، امین (808-13ء)، مامون (808-30ء) اور معتصم (833-42ء) کو ہی خلفاء یا بادشاہوں میں لفظ کے صحیح معنوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہاں محض عظیم عباسیوں کی حکومت کی اہم خصوصیات سے غرض ہے۔

دو اہم معاملوں میں ان کی دین قابل توجہ ہے۔ عباسی انقلاب نے اونچے عہدوں پر عرب اجارہ داری کا خاتمہ کر دیا۔ نئے خاندان کو خاص حمایت فارس سے ملی تھی اور یہ زیادہ تر اپنے انتظام حکومت کے لیے عربی تمدن میں رنگے ہوئے فارسیوں کی خدمات کا مرہون منت تھا۔ انقلاب کی موثر روح ابو مسلم خراسانی، برمکی (خالد، یحیٰی اور یحیٰی کے دو بیٹے فضل اور جعفر) جو تقریباً نصف صدی تک اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز تھے اور مامون کا وزیر فضل بن سہل اور اس کا سپہ سالار طاہر نئے نظام حکومت کے

---

(1) ایضاً ص 237

فارسی افسران کی نہایت عمدہ مثالیں ہیں۔ عرب رفتہ رفتہ ماند پڑ گئے۔ نویں صدی عیسوی کے آخیر تک فارسی زبان (جیسی کہ وہ آج ہمارے سامنے ہے) کی کوئی ترویج نہ ہوئی۔ فارسی سیاست دانوں اور محققین نے عربی زبان اپنی زبان بنالی۔ شاید ایک محتاط تفتیش یہ واضح کر دے گی کہ عباسی دور حکومت میں عربی کو سب سے زیادہ ترقی فارسی النسل اشخاص ہی سے ملی۔ اگرچہ انھیں غلطی سے عربوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

عباسی دور کا دوسرا بڑا کارنامہ سیکولر تمدن اور مذہبی علوم کی مختلف شاخوں میں تھا۔ یونانی زبان جاننے والے عیسائیوں کی مدد سے، یونانی ادبیات کا ترجمہ کیا گیا اور اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمے بالکل ابتدا ہی میں ختم ہو گئے لیکن نصاب کی وہ کتابیں جو ان کی بنیاد پر تیار کی گئی تھیں ازمنہ وسطیٰ میں سیکولر تعلیم کا اہم سرچشمہ رہیں۔ معلم اوّل، ارسطو، کو بہت اہمیت دی گئی اور اس کی تصانیف کی واقفیت اسپین کے ذریعے یوروپی ممالک میں پہنچی۔ سائنس اور علم نجوم کی سنسکرت تصانیف کے بھی ترجمے کیے گئے اور ہم ایک کتاب ”سندھ-ہند“ کا حوالہ پاتے ہیں جو غالباً ”برہماسدھانت“ کا ایک ترجمہ ہے۔ عظیم عباسی خلفاء نے ان معاملات میں ایک کشادہ دلانہ پالیسی اختیار کی لیکن ایک غیر متوقع سمت سے بھی مدد لی۔ 751ء کی ایک سرحدی جھڑپ میں عربوں نے چند ایسے چینیوں کو گرفتار کر لیا جو انھیں کاغذ بنانے کا فن سکھلا سکتے تھے۔ اور دسویں صدی کے اختتام سے بیشتر ”سمرقند کے کاغذ“ نے پیرس اور جھلی نما کاغذ کے استعمال کو بالکل غیر ضروری بنا دیا۔ بڑی بڑی کتابیں اب لکھی جا سکتی تھیں اور تعلیم کو نچلے متوسط طبقے تک بڑھایا جا سکتا تھا۔

مسلم مذہبی علوم کے میدان میں نہایت اہم کارنامے سنّی قانون یا اصول فقہ کے چار مذاہب حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کا قیام تھا۔ اور نبی کی حدیثوں پر چھ (یا سات)[1] تصانیف جن میں بخاری اور مسلم نہایت مستند شمار کی جاتی ہیں کی تالیف تھی۔ مذہبی علوم (کی ترقی سے) قدرتی طور پر دینیاتی اختلافات کا باعث بنے۔ مامون اور اس کے جانشینوں نے طریقہ معتزلہ کی سرپرستی کی جس نے دوسری باتوں کے علاوہ ”تقدیر الٰہی“

---

(۱) سات، اگر ہم حنفی مسلک کے ذریعے قبول کی گئی چھ تالیفات کے ساتھ امام مالکؒ کی ”موطا“ کو بھی شامل کر لیں۔

کے خلاف (نظریہ) ''اختیار'' کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ قرآن ''غیر مخلوق'' نہیں بلکہ ''مخلوق'' ہے۔ اور یہ کہ خدا ''انسانی آنکھوں'' کے لیے کبھی بھی ''قابل دید'' نہ ہوگا عظیم عباسیوں کے خاتمہ کے بعد بھی یہ اختلاف بہت دنوں تک باقی رہا۔ بالآخر ابوالحسن اشعری اور ان کے پیروکاروں، مثلاً امام غزالی، نے دو اصولوں پر راسخ العقیدگی کی بنیاد رکھی۔ یونانی فلسفہ اور آزادی خیال کا امتناع اور روایتی دینیات پر مبنی مختلف قسم کے تناقص کا بلا چون وچرا اقبال۔

شیعہ بھی دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ راسخ العقیدہ یا اثنا اشعری جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے بارہ امام کامل ہیں لیکن اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ اور اسمٰعیلی جن کا اعتقاد ہے کہ ان کا امام ایک خدائی تجسیم، ہے جو وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق قرآن کے احکام میں بھی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ امام جعفر صادق (عباسی خلیفہ منصور کے ہمعصر) نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو شرابی ہونے کی بنا پر محروم الارث کر دیا اور موسیٰ کاظم کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ مزید یہ کہ جب اسمٰعیل کا انتقال ہو گیا تو امام نے مدینہ کے تمام ممتاز لوگوں کو ان کے جنازے میں بلایا۔ امام صادق نے جو کچھ کیا اس کے جواز پر اسمٰعیلی یقین نہیں رکھتے ہیں یا پھر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ تجہیز و تکفین اس حقیقت کو چھپانے کے لیے محض ایک بہانہ (تقیہ) تھا کہ حقیقی امامت اسمٰعیل کے بیٹے محمد کو حاصل ہو گی۔ سنی ادب اسمٰعیلیوں کے خلاف ہر قسم کے حملوں سے بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پر محرمات کے ساتھ مباشرت کے سلسلے میں انھیں ملزم ٹھہرایا جاتا ہے۔ اسمٰعیلیوں کے حقیقی مذہبی ادب کی اشاعت اب بھی باقی ہے۔ اسمٰعیلی پروپگنڈے کی قوت اس اپیل میں تھی جو اس نے ایک شفیع (Redeemer) کی شدید ضرورت کے سلسلہ میں کی تھی۔ پروفیسر برنارڈ لیوس اپنی کتاب ''اسمٰعیلیت'' (Ismailism) میں راسخ العقیدہ امام غزالی کے اس بیان کا حوالہ دیتے ہیں کہ فارس کے مزدور طبقہ کو اسمٰعیلی مذہب سے متاثر ہونے سے روکنا ممکن نہ تھا۔ سیاسی میدان میں اس کی تین تحریکات قابل ذکر ہیں۔ خلیج فارس کے علاقے کے قرامطہ جنھوں نے 929ء میں مکہ کو تاخت و تاراج کیا اور مقدس حجر اسود کو اٹھا کر لے گئے۔ لیکن بعد میں بلا مطالبہ اسے واپس کر دیا۔ مصر کی فاطمی خلافت (909-1171ء) اور الاموت امامت یا بادشاہت (1090-1256ء)

جہاں تک جنگ اور نظام حکومت کی صلاحیت کا تعلق ہے اموی عظیم عباسیوں سے کہیں زیادہ بلند ہیں۔ در حقیقت کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ سر ولیم موئر لکھتے ہیں کہ ”حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کے بعد اسلام کا سب سے بہترین دور اموی عہد تھا۔ معاویہ اور ولید، ہارون یا مامون کے آگے ماند نہیں پڑ جاتے۔ اموی حکومت، جس نے اپنی فتوحات کے ذریعے مشرق و مغرب میں اسلام کی وسیع بنیاد ڈالی، کی عظمت و شوکت کے سامنے عباسی سلطنت ماند پڑ جاتی ہے۔ مزید براں زبردست خوں ریزی، بے رحمانہ گردن زدنی، اور سازشانہ قتل جو السفاح اور اس کے جانشینوں کے دربار کا ایک وحشیانہ منظر پیش کرتا ہے مجموعی طور پر امویوں کے درمیان اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی[1]۔“

بالکل ابتدا ہی سے عباسی (خلفاء) امویوں کے پورے ورثہ کی نگرانی کرنے میں ناکام رہے۔ صوبے یکے بعد دیگرے اختیار سے باہر ہو گئے اور بالآخر صرف بغداد اور اس کے اطراف کا علاقہ، جس کی سرحدیں بدلتی رہتی تھیں، خلافت کے اندر باقی بچا۔ گبین کہتا ہے کہ ”عباسیوں کے آٹھویں (خلیفہ) معتصم کے ساتھ ہی اس کے خاندان اور قوم کی عظمت اور جلال کا خاتمہ ہو گیا۔“

باقی ماندہ چھوٹے چھوٹے خلفاء پہلے تو ترکی محافظین، جنھیں معتصم نے منظم کیا تھا، کے زیر اثر رہے۔ (842-945ء) اور اس کے بعد بویہہ کے 945-1031ء اور[2] آخر میں سلجوقی اور خوارزمی سلاطین کے (1031-1218ء)-1258ء میں ہلاکو خان کے

---

(1) موئر، خلافت، ص 597

(2) چھوٹے چھوٹے عباسی خلفاء کے یہاں صرف خطابات اور تاریخیں دی جا سکتی ہیں۔

9-واثق (842-47ء)، 10-متوکل (847-61ء)، 11-منتصر (861-62ء)، 12-مستعین (862-66ء)، 13-معتز (866-69ء)، 14-مہتدی (869-70ء)، 15-معتمد (870-92ء)، 16-المعتضد (892-902ء)، 17-مکتفی (902-7ء)، 18-مقتدر (907-32ء)، 19-قاہر (932-34ء)، 20-راضی (934-41ء)، 21-متقی (941-45ء)، 22-مستکفی (995-46ء)، 23-مطیع (946-74ء)، 24-طائع (974-99ء)، 25-قادر (999-1031ء)، 26-قائم (1031-75ء)، 27-مقتدی (1075-94ء)، 28-مستظہر (1094-1118ء)، 29-مسترشد (1118-34ء)، 30-راشد (1139-35ء)، 31-مقتفی (1135-60ء)، 32-مستنجد (1160-61ء)، 33-مستضی (1161-80ء)، 34-ناصر (1180-1225ء)، 35-ظاہر (1225-26ء)، 36-مستنصر (1226-42ء)، 37-مستعصم (1242-58ء)

ذریعے ان کی معدومی سے قبل انھیں تقریباً چالیس سال کی مہلت نصیب ہوئی۔ ان 29 چھوٹے خلفاء میں سے آٹھ مار ڈالے گئے دو اندھے بنا دیے گئے اور دو کو معزول کر دیا گیا لیکن غالباً ہلاک نہیں کیا گیا اور ایک سے تخت سے دست برداری کی درخواست کی گئی۔ تاہم لوگ اس طرح کی من گھڑت احادیث کی تکرار کرتے رہتے کہ نبی نے اپنے چچا عباس کے خاندان کے لیے برکت کی دعائیں دی ہیں۔ مزید یہ کہ چونکہ قرآن سلطنت کے سلسلے میں خاموش ہے لہٰذا یہ خلیفہ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس جواز واباحت کا کچھ حصہ۔ اگر معمولی، کمزور اور گھٹیا ہو۔ جس کا وہ خود مالک ہے، نئے مسلم شاہی خاندانوں کو تضویض کرے۔ سکوں پر ''امیر المومنین'' کی تحریر اس حالت میں بھی کہ اس کا نام معلوم نہ ہو عالم اسلام کے اتحاد کا ایک نشان تھا۔

عجم کے چھوٹے چھوٹے خاندان

ولید بن عبدالملک کے ذریعہ قایم کردہ عظیم سلطنت کو محض ایسے غیر معمولی صلاحیت کے حکمرانوں کے ذریعے ہی سنبھالا جا سکتا تھا جو ان مقامی باغیوں کو، جنھیں مقامی آزادی پسند افراد کی حمایت حاصل تھی، دبائے رکھ سکے ہوں اور جو دور دراز کے ان گورنروں کو بھی اطاعت میں رکھ سکتے ہوں جنھیں خود مختارانہ اختیارات دے دیے گئے تھے اور جو ان بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کر سکتے تھے، جنھیں انھوں نے معزول کر دیا تھا۔ چند تخفیف مثلاً اسپین، اور چند اضافے مثلاً انڈونیشیا، سے قطع نظر مسلم ''آبادیات'' کی حدیں آج وہیں ہیں جہاں ولید بن عبدالملک نے 715 میں مسلم خلافت کی ''سرحدیں'' قایم کی تھیں۔

یہ معلوم نہیں کہ آبادی کی اس بڑی تعداد کو کس طرح قبول اسلام پر آمادہ کیا گیا۔ عیسائیوں نے اپنے مشنریوں کی کدوکاوش کو بڑے شوق سے قلمبند کیا ہے لیکن مسلمانوں کے تبلیغی کام کچھ اتنے زیادہ نہیں جو قلم بند کیے جا سکیں، سوائے ان کاروائیوں کے جو پیغمبر اور خلیفۂ اول کے دور میں کی گئیں۔

اس موضوع پر قدیم اور قابل اعتماد مواد کی تقریباً ہر سرزمین میں کمی ہے۔ بہر حال چند نکات واضح ہیں۔ امویوں کی وسیع و عریض سلطنت صرف عرب نسل اور

عربی زبان کی مسلمہ فوقیت کے ذریعہ ہی سنبھالی جاسکتی تھی لیکن عمر اول کی فتوحات کے بعد کی صدی یا اس سے بیشتر مدت میں مفتوح لوگوں نے خاص طور پر فارس نے خود اپنی زبان کو نظر انداز کر دیا۔ سیکولر اور سائنسی لہر کے ان تمام دنوں میں عربوں کے ہم پلہ بلکہ ان سے سبقت لے گئے جن کا واحد ذریعہ عربی زبان تھی جو تمام مسلمانوں کے درمیان واحد ذریعہ اظہار تھی۔ اب عربی نسل کی جگہ پر اسلامی عقیدہ حکمراں طبقہ کی رکنیت کی ایک شرط بن گیا تھا۔ پرانے مذاہب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں نے، شاید پنچایتی فیصلوں کے ذریعے جن کا کوئی ریکارڈ اب موجود نہیں ہے، خود کو زمرہ اسلام میں داخل کر لیا تاکہ وہ اس کی عالمگیر ملت میں شامل ہو جائیں اور پورے شہری حقوق حاصل کر لیں۔ لازماً مسلم دنیا کے مختلف حصے مختلف حصوں میں مڑ گئے۔

اپنی انتظامی نااہلیت کے علاوہ عباسی خلفاء عربی اثرات کے حامل اپنے فارسی حکمراں طبقہ کے ذریعہ افریقی علاقہ جات کی وفاداری کو قایم رکھنے کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اسپین کبھی بھی ان کے قبضہ میں نہ آیا۔ خلیفہ منصور کے حکم سے دو بھائیوں، محمد اور ابراہیم، جن کا جرم یہ تھا کہ وہ علی کے ایک پوتے حسن کی نسل سے تھے، قتل کر دیئے جانے کے بعد تیسرا بھائی ادریس مکہ سے (Tangiers) بھاگ گیا اور اس نے وہاں ادریسی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ افریقہ کے مسلمانوں نے خواہ عربوں یا بربروں نے عباسی خلافت کو قبول کر لینے کی وجہ نہ پائی۔ وہاں کے دارالسلطنت 'قیروان' کے حالات منصور کے عہد حکومت کے بیشتر حصہ میں ابتر تھے۔ اس نے ملک کو یا کم از کم اس کے صدر مقام کو عباسی حکومت کے زیر نگیں کر لیا تھا لیکن یہ اقتدار زیادہ دنوں تک قایم نہ رہ سکا۔ ہارون رشید کے جنرل ہرسامہ کو قیروان میں اتنی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کہ آخر کامیابی کی کوئی امید نہ پا کر اس نے کسی دوسری جگہ تبادلہ کی درخواست کی اور اس کی روانگی کے بعد قیروان کے اغلابی خاندان کی بنیاد پڑی جو بالآخر آزاد ہو گیا۔

مصر کے دو چھوٹے چھوٹے خاندانوں-طولونی(83-868ء) اور اخشیدی (61-933ء) کا عروج و زوال رونما ہوا۔ بالآخر ابو محمد عبیداللہ جو امام جعفر صادق کے بیٹے اسمٰعیل کی نسل سے ہونے کا دعویدار تھا، نے فاطمی خلافت (1171-909ء) کی

بنیاد ڈالی۔ اس نے شمالی افریقہ کے بیشتر حصہ کو فتح کر لیا اور مہدیہ (تیونس کے قریب) کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ساٹھ سال کے بعد اس کے جانشین نے مصر کو فتح کر لیا۔ فاطمی نبی کے جائز خلف ہونے کی حیثیت سے خلیفہ ہونے کے دعویدار تھے اور نتیجتاً وہ بغداد کے عباسی خلفاء کے حریف تھے لیکن چونکہ مصریوں کی بڑی اکثریت سنّی تھی لہٰذا انھوں نے مذہبی رواداری کی ایک پالیسی اپنائی۔

اسی اثنا میں مشرقی خلافت کی سرزمین میں چھوٹے چھوٹے خاندانوں کے تصرف میں آ گئیں۔ ہمارے تصرف میں جتنی جگہ ہے اس میں محض ان کی ایک فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ اور ان کی جنگوں اور ان کے مستقل پذیر سرحدوں کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی جاسکتی ہے ان میں سے کم سے کم دو کے قیام کے لیے (خلیفہ) مامون ذمہ دار ہے۔

(الف) طاہری:- (820-72ء) میں مامون نے اپنے کمانڈر انچیف طاہر کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔ دو یا تین سال انچارج رہنے کے بعد طاہر نے خلیفہ مامون کا نام جمعہ کے خطبہ سے حذف کر دیا اور دوسرے ہی دن وہ اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ مامون نے طاہر کے بیٹے طلحہ کو اس کی جگہ مقرر کر دیا۔ طلحہ کے بعد عبداللہ، طاہر دوم اور محمد (مقرر) ہوئے اور آخر الذکر کو صفاری، یعقوب بن لیث، نے زیر کر لیا۔

(ب) سامانی (874-999ء):- مامون نے بلخ کے ایک نومسلم فارسی سمان کے چار لڑکوں کو سمرقند، فرغانہ، شاش اور ہرات کی گورنری دینے کا حکم دیا۔ ہرات بہت زیادہ دور تھا لہٰذا وہ اس خاندان کے اختیار سے نکل گیا لیکن سمان کے ایک خلف اسمٰعیل نے (874) میں ماوراء النہر میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا۔ اس خاندان کی طاقت خراسان تک پھیل گئی اور یہ (سلطنت) اونچ نیچ کے تغیرات کے ساتھ قایم رہی۔ یہاں تک کہ 999 میں قراخانیوں نے اس کا چراغ گل کر دیا۔

(ج) صفاری (861-900ء):- اسلام کے شاہی خاندانوں میں تنہا ہم صفاریوں کو پاتے ہیں جنھیں اس بات پر ناز تھا کہ ان کی ابتدا مزدور طبقے سے ہوئی تھی۔ اسی خاندان کے بانی یعقوب بن لیث نے اپنی زندگی سیستان کے ایک شہر میں فی ماہ پندرہ مسی سکّے کی مزدوری پر ایک (صفار) کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اس کے چھوٹے

بھائی عمر نے بھی ایک مزدور کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ تک دونوں بھائیوں نے شارع عام پر ڈاکہ زنی بھی کی ہو لیکن (بعد میں) وہ ایک طاہری افسر صالح بن نصیر جس پر خارجیوں کے ساتھ جنگ کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی کی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ 861ء میں یعقوب سیستان کی فوج کا کمانڈر بن گیا۔ اور ہرات، کرمان اور فارس کو فتح کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ ان دور دراز علاقوں پر اس کے اقتدار کا اعتراف عباسی خلیفہ نے 871ء میں کر لیا۔ نیز یعقوب نے کابل کو بھی اس کے ترکی بادشاہ، جو بودھ مذہب کا ماننے والا تھا، سے فتح کر لیا لیکن 872 میں جب یعقوب نے طاہریوں سے خراسان کو فتح کر لیا تو خلیفہ بغداد کے ساتھ اس کا تصادم ناگزیر ہو گیا۔ یعقوب نے جس کے قبضہ میں اب تقریباً نصف فارس تھا، بغداد پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن خلیفہ کے بھائی موفق کے ہاتھوں راجدھانی کے قریب اسے شکست ہو گئی۔ اور تقریباً تین سال بعد سیستان میں اس کا انتقال ہو گیا۔ عمر جو اپنے بھائی کا جانشین ہوا تھا چند سالوں تک پھولا پھلا لیکن 896ء میں نیشاپور کی حصولی کے بعد اس نے بھی ماوراالنہر کو فتح کرنا چاہا۔ لیکن اس کے بعد (900ء) کی جنگ میں اسے اسمٰعیل سامانی کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہوا اور بطور ایک قیدی بھیج دیا گیا۔ جہاں غالباً اسے اپنے قید خانہ میں بھوک سے مرجانے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اس کا ایک پوتا سلطان محمود کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔

(د) زیاری خاندان (928-1042ء):- مرداوج بن زیار نے طبرستان اور چند دوسرے اضلاع پر قبضہ کر کے اس خاندان کی بنیاد ڈالی۔ خصوصی طور پر یہ (خاندان) اپنی علم و ادب کی سرپرستی کے لیے مشہور ہے۔ البیرونی نے اپنی (Chronology of Ancient Nations) اس خاندان کے حکمراں قابوس بن دشمگیر کے نام معنون کی تھی۔ جبکہ قابوس کے پوتے کیکاؤس نے اپنی دلکش (تصنیف) قابوس نامہ ہمارے لیے چھوڑی ہے۔

(ہ) بویہی یا دیلمی خاندان (932-1052ء):- زیاری خاندان کے بانی نے ہمدان کے جنوب میں واقع خطہ کراج کو بویہی کے بیٹے علی کو عطا کیا، جس نے اپنے لائق بھائیوں کی مدد سے فارس کو فتح کر لیا۔ اس خاندان کی اندرونی تاریخ بے ترتیب ہے لیکن بویہی حکمرانوں کو دو اسباب کی بنا پر یاد کیا جائے گا۔ وہ شیعہ تھے اور راسخ

العقیدہ شیعہ لٹریچر ان کی سرپرستی میں تیار کیا گیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں تقریباً ایک صدی تک امیر الامراء کے خطاب کے ساتھ خلافت کو بھی اپنے زیر اثر رکھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اس خاندان کو اس کی بیشتر املاک سے محروم کر دیا اور جن چیزوں پر محمود قبضہ نہ کر سکا۔ انھیں سلجوقیوں نے ہتھیا لیا۔

(و) قراخانی:۔ دریائے سیر کے مشرق میں ترکستان میں قراخانی رہتے تھے، جن کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ بارتھولڈ ہمیں بتاتا ہے کہ "قراخانیوں کی حکومت میں تمام خانہ بدوش سلطنتوں کی طرح، آبائی جائداد کا تصور شخصی قانون کے حلقۂ اختیار سے ریاستی قانون کے حلقہ میں منتقل ہو گیا تھا.........اس خاندان کے علیحدہ علیحدہ افراد کی حکومتوں کی تاریخ کو ٹھیک متعین کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے[1]"۔ اس خاندان کے ایک حکمراں بغرا خاں نے 990ء میں بخارا پر قبضہ کر لیا لیکن اپنی بیماری کی بنا پر اسے ترک کر دینا پڑا اور اس کے بعد جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ لیکن 999 میں غالباً اسی خاندان کے دوسرے حکمراں ایلک خاں نے کسی مزاحمت کے بغیر بخارا پر قبضہ کر لیا اور سامانیوں کا خاتمہ کر دیا۔

(ز) غزنوی (962-1186ء):۔ 962ء میں سامانیوں کے ایک غلام[2] افسر

---

(1) بارتھولڈ، ترکستان منگولوں کے حملوں کے عہد تک، (گبس میموریل سیریز) ص268

(2) نظام الملک (سیاست نامہ میں) سامانی دربار میں ایک ترکی غلام کی زندگی کو مندرجہ ذیل طور پر بیان کرتا ہے۔ پہلے سال کے دوران غلام ایک سائیس کی حیثیت سے پیدل خدمت انجام دیتا تھا اور سزا کے ڈر سے پوشیدہ طور پر بھی وہ ایک گھوڑے پر سواری کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس دور میں وہ زندانی کپڑوں کی پوشاک (جس کا نام بخارا کے ایک گاؤں، زنداں، سے ماخوذ ہے) پہنتا تھا۔ ایک سال بعد صاحب خیمہ کے کمانڈر (وثاق) کی مرضی سے اسے معمولی ساز و سامان کے ساتھ ایک ترکی گھوڑا دیتا تھا۔ تیسرے سال اسے ایک خاص قراچور (بیلٹ)، پانچویں سال ایک بہترین زین، ستاروں سے مزین ایک اکہری لگام، بیش بہا کپڑے اور ایک ڈنڈا، چھٹے سال پریڈ میں شرکت کا لباس، ساتویں سال وثاق باشی یعنی خیمہ کے کمانڈر کا عہدہ حاصل ہوتا جس میں اس کے ساتھ تین دیگر اشخاص شامل ہوتے تھے۔ وثاق باشی کے عہدہ کی امتیازی علامتیں ایک کالی نمدہ ٹوپی جس پر چاندی کی پھول پتیاں بنی ہوتی ہیں اور گنجہ (گنجہ موجودہ ایلزبتھ پول ہے) کی پوشاک ہوتی تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ مندرجہ ذیل درجوں پر ترقی پاتا۔ خیل باشی (دستہ کا سردار) اور حاجب۔ پوری تنظیم کے سرے پر حب الحجاب ہوتا تھا جو سلطنت کے اعلیٰ ترین معززین میں سے ایک ہوا کرتا تھا۔ (بارتھولڈ، ترکستان، ص227)

الپتگین نے جو خراسان کا گورنر تھا بخارا میں جانشینی کے معاملہ میں ایک ناکامیاب دعویدار کا ساتھ دیا اور اس سزا کے خوف سے جو اس پر نازل ہو سکتی تھی وہ غزنی کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں اپنے آپ کو مستحکم کر لیا۔ اس کی جانشینی اول تو اس کے بیٹے ابو اسحٰق اور پھر اُس کے بعد دو غلام افسروں، بلکتگین اور پیرے نے کی۔ موخر الذکر جو ایک ظالم و جابر فرماں روا تھا، کو 977ء میں الپتگین کے دوسرے ترکی غلام سبکتگین کو جگہ دینی پڑی۔ سبکتگین (99-977ء) اور اس کے بیٹے محمود (1030-999ء) کی فتوحات نے ایک نئی قسم کی مملکت کو فروغ دیا جسے "سلطنت" کہا جاتا تھا جو خلیفہ کے ذریعہ منظور شدہ تھی لیکن فتوحات پر مبنی تھی۔

سلطنتوں یا ایرانیوں اور ترکوں کی سرزمینوں پر حکمرانی کرنے والی وسیع مملکتوں کے فروغ کے علاوہ دسویں اور گیارہویں صدیاں عجم کی تاریخ میں دوسری دو تحریکات کی بنا پر قابل توجہ ہیں۔ پہلی عسکری اور ایک حکمراں طبقہ کی حیثیت سے ترکوں کی ترقی ہے۔ خلیفہ معتصم نے ایک ترکی باڈی گارڈ کو منظم کیا تھا۔ سامانیوں نے جو اگرچہ نسلاً فارسی تھے۔ اپنی ترکی فوج کی تنظیم سخت اور کٹھن فوجی تربیت کے ذریعے کی تھی۔

دوسری تحریک بھی کم اہمیت کی حامل نہیں جسے پروفیسر براؤن (Prof. Browne) "فارسی نشاۃ ثانیہ" کا نام دیتے ہیں۔ فارسیوں نے اپنے قدیم تمدن، جسے انھوں نے عرب فتح کے بعد پہلی پشت کے دوران ترک کر دیا تھا کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی تعریف کرنے لگے اور عربی رسم الخط میں لکھی ہوئی جدید فارسی مسلم تمدن کا دوسرا بڑا مخزن بن گئی۔ اگر فارسی ادب کے سلسلے میں کہا جائے کہ اس کا کوئی بانی تھا تو وہ اپنی عظیم تصنیف "شاہنامہ" کے ساتھ، فردوسی ہے لیکن فارسی نظم مجموعی طور پر انسانیت کا سب سے عظیم تہذیبی کارنامہ ہے[1]۔ عباسی خلافت کے لیے مسلمانوں کے عام ورثہ کی حیثیت سے عربی کی سرپرستی کرنا ایک قدرتی بات تھی لیکن (عجم کے) چھوٹے چھوٹے خاندان فارسی زبان، اولاً نظم اور تب نثر، کے احیاء کے سلسلے میں تعاون کرنے لگے۔ عظیم ترین مربی بلاشبہ غزنوی تھے۔

---

(1) انگریزی میں اس موضوع پر عظیم تصانیف میں سے ایک پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن کی "فارس کی ایک ادبی تاریخ" (A Literary History of Persian) (چار جلدیں) ہے پرفیسر براؤن کے مطابق

فارس کا ماقبل اسلام، ادب بہت مختصر ہے اور ضخامت میں عہد نامہ عتیق (old testament) سے زیادہ نہیں ہے۔ شاہنامہ میں ساسانیوں کے عروج سے بیشتر کہیں بھی تاریخی واقعات سے کوئی سروکار نہیں۔ بیشتر ماقبل اسلام فارسی تاریخ کو اور اسی طرح فارسی عقل و دانش کے دعویٰ کو گڑھی ہوئی لغویات کے بطور ترک کر دیا جانا چاہئے۔ ☆

2

خوارزمی سلطنت

غزنوی اور سلجوقی مملکتیں

مورخین نے عموماً مسلم تاریخ میں پہلے سلطان ہونے کا سہرا ہندستان کے مشہور حملہ آور سبکتگین کے بیٹے محمود کے سر باندھا ہے۔ یہ خطاب اس کے سکوں پر نہیں پایا جاتا ہے۔ جس میں اسے محض "امیر محمود" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور یہ خطاب اسے خلیفہ کی جانب سے نہیں دیا گیا تھا پھر بھی اس ادارے کا انکشاف کر لینا مشکل نہیں جس کا اظہار اس نئی اصطلاح کا مقصد تھا۔ خلافت ایک موثر طاقت کی حیثیت سے ختم ہو چکی تھی، صوبائی (شاہی) خاندان اپنی مستقل جنگوں کے ساتھ ایک لعنت بن گئے تھے لیکن اگر ان چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایک دیگر تمام پر فوقیت پا جاتا اس طرح پر کہ وہ چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں کو ختم کر دیتا اور قبائلی سرداروں کے درمیان امن و امان کی فضا قایم رکھ سکتا تو عجم کو خوش حالی اور (امن و امان دونوں ہی حاصل ہو جاتا[1]۔

سلطان محمود (1030-999ء) فارس اور ماوراالنہر میں اپنی فتوحات کی بنا پر اس خطاب کا مستحق تھا۔ بد قسمتی سے نہ محمود اور نا ہی اس کا بیٹا مسعود (40-1030ء) اچھا حکمراں تھا۔ لیکن جب طغرل نے مشرق سے سلجوق نو آبادوں کی قیادت کرتے ہوئے مرو کے شمال میں دندنیقان کی سہ روزہ جنگ میں مسعود کو شکست دے دی تب وہ اور اس کے جانشین عجم کو ایک بہتر نظام حکومت دے سکتے۔ "روضۃ الصفا" کے مطابق "سلجوق سلاطین میں سب سے عظیم تھے"۔ اس خاندان نے چھ بادشاہی۔ سلاطین کو

---

(1) سلطان، کا خطاب اس سے قبل بھی کبھی کبھی حکمرانوں کو دیا جاتا تھا۔ (بار تھولڈ ترکستان، ص 271)

جنم دیا۔ طغرل (1037-63ء)، الپ ارسلاں (1063-72ء) ملک شاہ (1072-92ء) برکیاروق (1094-1104ء)، محمد (1104-17ء) اور سنجر (1117-57ء) ملک شاہ، جس نے پورے عجم کو عہد وسطیٰ کے دوران پائی جانے والی حکومتوں میں سے غالباً سب سے بہتر مرکزی نظام حکومت عطا کیا، کا ذکر گبین نے حسب معمول اپنے خاص انداز میں بیان کیا ہے:

"یہ بربری اپنی ذاتی خوبیوں اور اپنی مملکت کی وسعت کی بنا پر اپنے عہد کا سب سے عظیم شہزادہ تھا۔ آمودریا کے اس پار اس نے بخارا اور خوارزم کے شہروں کو اپنا مطیع بنالیا اور ہر باغی غلام یا باغی وحشی کو کچل ڈالا جس نے اس کی مزاحمت کی جرات کی"۔

ملک شاہ نے فارسی تہذیب و تمدن کی آخری سیر دریا یا جیکسارٹس کو عبور کر لیا۔ ترکستان کے خانہ بدوش اس کی بالادستی کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ چین کی آخری سرحدوں پر واقع ایک تاتار بادشاہت کاشغر کے سکوں میں اور وہاں کی نمازوں کے بعد خطبوں میں اس کا نام شامل کیا گیا۔ اس کا بلاواسطہ اختیار یا جاگیری حکمرانی چینی سرحد سے مغرب و جنوب میں جورجیا (Georgia) کے پہاڑوں قسطنطنیہ اور بیت المقدس کے قرب و جوار اور خوشحال، عرب کے مصالحہ کے باغات کی حدوں تک پھیل گئی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی وسیع مملکت کی، جو کائرس اور خلفاء کی ایشیائی مملکتوں سے زیادہ بڑی تھی، بارہ بار سیاحت کی[1]۔

ان تین مملکتوں۔ غزنوی، سلجوقی، خوارزمی کا بنیادی طور پر لگاؤ ایک ایسے ترکی حکمران طبقہ سے تھا جو فارسی تمدن کو جذب کر چکا تھا اور جس کی زبانیں دو تھیں۔ لیکن جسے اپنی (ترکی) نسل پر فخر تھا۔ تیمور لنگ کا سوانح نگار، یزدی کہتا ہے کہ "ترکی نسل نے اپنے اتحاد اور باہمی تعاون کے ذریعے دنیا پر فتح پائی ہے اور اپنی فیاضی اور انصاف میں وہ انسانیت کے تمام گروہوں پر فوقیت رکھتا ہے اور اپنی اعلیٰ خوبیوں کی بدولت اس نے اپنے آپ کو اس قرآنی آیت کا اہل بنالیا کہ "ہم نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے"۔ ترکیوں کے کارنامہ کا تجزیہ اس دعویٰ کو درست نہیں ثابت کرے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ تیموریوں کے سقوط تک عجم میں عسکری طاقت بحیثیت مجموعی ایک

---

(1) گبین، سلطنت روم کا زوال اور خاتمہ، باب 57

ترکی اجارہ تھی اگرچہ وزارت اور انتظامی شعبے فارسیوں کے ہاتھوں میں تھے[1]۔

سلطان سنجر اور گور خاں

اگرچہ اسلام کا پھیلنا صدیوں سے رکا ہوا تھا لیکن عجم میں اس کی مغربی سرحدیں محفوظ تھیں۔ لیکن سلطان سنجر کے دور حکومت نے مسلم فوجوں کی پہلی اہم شکست اور متعدد مسلم قوموں پر ایک غیر مسلم طاقت کے قیام کو دیکھا۔ یہ ایک تنبیہ تھی کہ مسلمان عالمی معیار کے قائد کی حیثیت سے اپنی پوزیشن نہیں سنبھال رہے تھے۔ لیکن اس غیر سائنسی اور روح کو مردہ کر دینے والی ملائیت، جو مسلمانوں کے ذہنوں میں سرایت کر چکی تھی، کی وجہ سے اس سنگین تنبیہ کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ لیکن جو کچھ واقع ہوا اسے سمجھنے کے لیے ہمیں دور افتادہ، عقلیت پسند اور لامذہب چین پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہوگی۔

”تانگ خاندان کے زوال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مشرقی منگول قبیلہ ختا نے چین میں جنوبی سمت کی طرف دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ 938ء میں انھوں نے اپنا دارالسلطنت پیکنگ میں بنایا خطہ (قبیلے والوں) نے بہت تیزی سے چینی تہذیب کو جذب کر لیا۔ اور 180 سال سے پیشتر تک پیکنگ میں حکومت کی۔ لیکن 1114ء میں ایک شمالی منچوری قبیلہ کن پر تاتاروں نے حملہ کر دیا جنھوں نے بالآخر 1123ء میں پیکنگ پر قبضہ کر لیا۔ خطائیوں کی ایک مخصوص تعداد نے کنوں کے حق میں دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ ہم جانتے ہیں کہ تارک الوطنوں کا ایک گروہ جو منگولیا کے ریگستان کے اس پار بھاگ رہا تھا، 1128ء میں یا اس کے کچھ بعد کاشغر کے شہزادے شیر خاں کے ذریعہ کچل ڈالا گیا تھا۔ (محصورین کا) ایک دوسرا دھاوا کہیں زیادہ اہم نتائج کا باعث بنا۔ ختائی شاہی خاندان کا ایک فرد۔ تیح۔ لو۔ تاشیح (Yeh-Lu-Tashih) چند

---

(1) ایک ”ترک“ کی تعریف کرنا آسان نہیں۔ خلیج، الکزینڈریٹہ سے ہمالیہ کے شمال تک کھینچا گیا ایک خط موٹے طور پر فارسیوں کو غیر فارسیوں اور غیر چینی گروہوں سے منقسم کر دے گا جس کے لیے فی الحال کوئی نام نہیں ہے۔ جب ان گروہوں کے افراد مہذب ہو گئے اور انھوں نے شہری زندگی کے اطوار اپنا لیے تو انھیں ”ترک“ کہا جانے لگا۔ اس نسل کے پچھڑے ہوئے فرقوں کو ان کے قبائلی ناموں سے پکارا جاتا تھا یا پھر انھیں ”ترکمان“ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

سو پیروکاروں کے ساتھ بیش بالیغ کے (ایغور شہزادے سے پناہ کے حصول کے لیے بھاگ نکلا۔ یہاں تاشیح نے ایک فوج اکٹھا کی اور فتوحات کی حامل ایک ایسی زندگی شروع کی جو اپنے انداز میں اتنی ہی حیرت انگیز ہے جتنی کہ خود چنگیز کی۔ تقریباً چھ سالوں میں (اس کا انتقال 1135ء یا 1136ء میں ہوا تھا) اس نے ایک بادشاہت قایم کر لی جو زنگاری ریگستان سے ہندستان کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ مسلم دنیا میں یہ قراختائی (Block Cathayans) کی حیثیت سے معروف ہیں[1]۔

قراختائی حکمرانوں کو گورخاں (خان عالم) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ہمارے مسلم مورخین گورخانی ریاست کی اندرونی تنظیم کے بارے میں بہت کم علم رکھتے تھے اور گورخوانین کے نام جو انھوں نے پیش کیے ہیں وہ اتنے غیر واضح طور پر لکھے ہوئے ہیں کہ کسی دوسری زبان میں ان کے صحیح ہجے نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ منہاج السراج لکھتا ہے کہ ”ابتدائی قراختائی حکمراں عادل، جری اور انصاف ور تھے۔ وہ مسلمانوں کی بڑی عزت کرتے، ان کی مذہبی محققین کے ساتھ لطف و کرم کا برتاؤ کرتے اور کسی مظلوم پر ظلم کی اجازت نہ دیتے“[2]۔

سلطان سنجر کی مملکت بظاہر مضبوط تھی۔ مشرق و مغرب میں اس کے احکامات کی تعمیل کی جاتی اور اس کی وسیع جاگیروں اور اپنی کثیر دولت کی بنا پر اس کے امراء اور اعلیٰ افسران مغرور ہوگئے اور لوگوں پر ظلم کرنے لگے[3]۔ 43-1142ء میں سلطان سنجر نے سمرقند کے اپاہج حکمراں احمد خاں کو زیر کیا اور یہی نہیں اپنی حد سے تجاوز کر کے گورخاں کے ساتھ جھگڑا مول لے لیا۔

گورخاں نے ایک طاقتور فوج اکٹھا کی اور سلطان کے خلاف روانہ ہوا۔ اپنی اندرونی ناچاقیوں کے باوجود خراسانیوں کا یہ خیال تھا کہ ایک سو گورخاں بھی ان کی مزاحمت نہ کر سکیں گے۔ وہ اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ تکبر اور گھمنڈ بربادی اور

---

(1) آرتھر ویلی (Arther walley)، ایک کیمیاگر کے سفرنامے کا مقدمہ (Introduction to the Travels of an Alchemist Brood way Traveller) ص2

(2) طبقات ناصری، فارسی متن، ص325

(3) روضۃ الصفا، جلد چہارم، ص112

بے عزتی کا باعث ہوتی ہے۔ جب فوجیں ٹکرائیں تو دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ سلطان سنجر ہر سمت سے گھر گیا۔ مسلم فوج پر ایک زبردست شکست نازل ہوئی اور تقریباً تیس ہزار آدمی مارے گئے۔ سنجر کے چھکے چھوٹ گئے کیونکہ لڑنا اور بھاگ کھڑا ہونا دونوں ہی ناممکن ہو گئے تھے۔ بالآخر تاج الدین ابوالفضل نے کہا "بادشاہ سلامت! ہمیں گھیرا توڑ کر نکل جانے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ اب مزید مزاحمت ناممکن ہے"۔ سلطان نے تقریباً تین سو بہادر سپاہیوں کے ساتھ کافر فوجوں پر حملہ کیا اور دس یا پندرہ آدمیوں کے ساتھ گھیرے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ترمذ پہنچا جہاں زندہ بچ جانے والے اس کے زخمی اور لاچار سپاہی اس سے آملے۔ اس جنگ میں سلطان سنجر کے دس ہزار ممتاز تابعین مار ڈالے گئے اور اس کی بیوی ترکان خاتون متعدد مشہور امیروں کے ساتھ گرفتار کر لی گئی[1]۔

گور خان نے ملکہ اور قیدیوں کو واپس بھیج دیا لیکن سنجر کا بلکہ حقیقتاً مسلمانوں کا عسکری وقار ختم ہو گیا۔ 1152ء میں جب غز ترکوں نے سنجر کو شکست دی اور گرفتار کر لیا اور اس کے بعد عجم کے بڑے شہروں کی تاخت و تاراجی شروع کر دی۔ سنجر 1156ء میں قید سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن دوسرے ہی سال دل شکستگی کی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔

گور خانوں نے ماوراء النہر میں اپنا براہ راست نظام حکومت قایم کرنے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ صرف خراج کی وصولی پر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا۔ لیکن پھر بھی آئندہ نصف صدی سے پیشتر تک انھوں ے اعلیٰ عسکری پوزیشن قایم رکھی۔ طبقات ناصری بتاتی ہے کہ:

"جب غز (قبیلہ کی پیش قدمی) کا مسئلہ کھڑا ہوا اور سلطان سنجر کے اقتدار کا زوال ہو گیا تو قراختائی کافی طاقتور ہو گئے۔ ترکستان کے ملکوں نے ان کے تعاون سے ایک دوسرے کو مغلوب کرنا شروع کیا اور انھیں ان کی مدد کے حصول کی توقع میں روپے اور تحائف بھیجے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو مغلوب کر لینے کے لیے سخت جدوجہد کی جس کے نتیجہ میں قراختائی ان سبھوں پر حکمراں ہو گئے اور یہ تسلط اسّی سالوں

---

(1) ایضاً، ص ص 112-13

سے زیادہ تک قایم رہا۔ متعدد موقعوں پر ان کی فوج نے آمو دریا کو عبور کیا اور بلخ، ترمذ، آمو، طالقان، خوارزم، غرجستان کے علاقوں میں داخل ہو گئے اور تاخت و تاراج کے خیال سے غور کی سرحدوں تک آگئے۔ نیز بسا اوقات انھوں نے ان علاقوں کے مسلمانوں کو بھی گرفتار کیا۔ ماوراء النہر فرغانہ اور خوارزم کے تمام (حکمرانوں) نیز خراسان کے بھی چند حکمرانوں نے انھیں خراج بھیجا۔ غور اور بامیان کے سلاطین جو تنہا آزاد رہ گئے تھے، کے علاوہ (اسلام کی) سرحدوں کے تمام حکمراں گورخانوں کے مطیع ہو گئے[1]۔

دیگر حکمرانوں کے علاوہ خوارزم کے حکمراں اتسیز (Atisiz) نے بھی گورخاں کے پاس سفیروں کو بھیجا اور اشیاء اور مویشی کی شکل میں تین ہزار سونے کے دیناروں کے ایک سالانہ خراج کا وعدہ کیا۔

خوارزمی سلطنت کی بنیاد

اگرچہ معاصرین اس کا اندازہ نہ کر سکے لیکن ایک نئی سلطنت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ایک اعلیٰ سلجوق افسر بلگتگین نے غرجستان کے ایک غلام نشتگین کو خریدا تھا۔ نشتگین نے اپنی ذہانت و ذکاوت کی بدولت ملازمت میں ترقی کی اور شاہی طشت دار مقرر ہو گیا اور چونکہ خوارزم کی مالیات شاہی مطبخ کے اخراجات کے لیے مخصوص کر دی جاتی تھی لہٰذا اسے اس شہر کا شحنا بھی بنا دیا گیا۔

نشتگین نے اپنے بیٹے قطب الدین کو مرو میں معقول تعلیم دلائی اور ملک شاہ کے بیٹے اور جانشین سلطان برکیاروق کے عہد حکومت میں خراسان کے گورنر داد بک حبشی نے 98-1097ء میں قطب الدین کو خوارزم شاہ کا عہدہ دیا۔ ماضی میں یہ عہدہ اکثر سرکاری افسران کو دیا جاتا تھا اور 'شاہ' کی اصطلاح خود مختاری یا آزادی کی علامت نہ تھی۔ قطب الدین نے تقریباً تیس سال خوارزم پر حکومت کی وہ ہر ایک سال کے بعد دوسرا سال سنجر کے دربار میں گزارا کرتا تھا اور جس سال وہ نہیں جا پاتا اپنے بدلے اپنے بیٹے اتسنر کو خدمت میں بھیج دیتا۔

---

(1) فارسی متن، ص ص 29-328

اپنے باپ کی جانشینی میں اتسنر کی تقرری (56-1128ء) کے ساتھ خوارزم رفتہ رفتہ سلجوقیوں سے آزاد ہو گیا۔ سنجر نے خوارزم پر تین حملے کیے لیکن اتسنر کی طاقت کو توڑا نہ جا سکا۔ جب 1142ء میں قراختائیوں نے سنجر کو شکست دے دی تو اتسنر نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ''شہر بلخ کو لوٹا اور زبردست قتل و خون کیا۔''

اتسنر سلجوقیوں کا وفادار نہ رہا، جن کے زیر سایہ اس کے باپ اور دادا نے ترقی کی تھی، اور وہ گور خانوں کا باج گزار بن گیا۔ اس نمک حرامی کی واحد معذرت یہ تھی کہ جب اس نے سلطان سنجر کو اس کے غلاموں کے ہاتھوں شکار کے دوران قتل ہونے سے بچا لیا تو اس کے بعد سے سلجوقی افسران اس سے بہت زیادہ حسد کرنے لگے تھے لہٰذا اسے 1135ء میں خوارزم واپس لوٹنے کے لیے سنجر کی اجازت حاصل کرنی پڑی۔ پھر بھی اتسنر نے آئندہ نسلوں کے لیے مکارانہ (Machiavellian) سازش اور نمک حرامی کی ایک بڑی مثال قایم کر دی۔ گور خانوں کی باج گزاری خوارزمی سلطنت کے گلے کا ایک پھندا بن گئی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتسنر کے بیٹے اور جانشین ایل ارسلان (70-1156ء) نے اپنے چھوٹے بھائی سلیمان شاہ کو قید کر کے جانشینی کی جنگ پر قابو پا لیا تھا۔ خراسان کے معاملات ابتر تھے لیکن ایل ارسلان کی قسمت میں انھیں درست کرنا نہ تھا۔ اس نے 1158ء میں سمرقند کے خلاف ایک مہم چلائی لیکن اس کا کوئی قطعی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ دوسری جانب قراختائی اور ماوراء النہر کی فوج 1170ء میں اس کے خلاف روانہ ہوئی اور آمو دریا کے کنارے پر واقع ایک شہر آمویا کی جنگ میں اس کی فوج بھاگنے پر مجبور ہو گئی اور اس کا کمانڈر انچیف عیار بیگ گرفتار ہو گیا۔ ایل ارسلان اگست 1170ء میں اپنے خوارزم کے سفر میں انتقال کر گیا۔

ایل ارسلان نے اپنے چھوٹے بیٹے سلطان شاہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ سلطان شاہ تخت نشین ہوا جب کہ اس کی ماں ملکہ ترکان نے انتظام حکومت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس کے بڑے بھائی تکش[1] نے، جو جند میں تھا، اپنے حصے کا دعویٰ کیا اور

---

(1) جوینی کہتا ہے کہ اس نے یہ حقائق رازی کی ''جوامع العلوم'' جو سلطان تکش کے لیے لکھی گئی تھی، اور ابن فندق بیہقی کی ''مشارق التجارب'' جو ''مشکوٰۃ'' کی معروف ''تجارت الامم'' کا ایک سلسلہ ہے، سے حاصل کیے ہیں۔

بھائیوں کے درمیان کشمکش کی ابتدا رباعیات کے تبادلہ سے ہوئی۔ تکش نے جو ایک شاعر نہ تھا اپنے بیٹے ملک شاہ سے درخواست کی کہ وہ اپنے چچا کے اشعار کا جواب دے۔ ملک شاہ نے ایک رباعی میں مشورہ دیا کہ سلطان شاہ مرو کو رکھے اور خراسان جس کو فتح کرنا باقی تھا تکش کی ملکیت ہو۔ لیکن سلطان شاہ نے جواب دیا کہ "پیارے بھتیجے! یہ معاملات تلوار کے ذریعہ طے کیے جاتے ہیں۔" تکش نے مایوسی کی حالت میں گور خاں سے اپیل کی۔ اس وقت حکمراں گور خاں ایک عورت تھی اور ریاست کے معاملات کا انتظام اس کا شوہر فوما کرتا تھا۔ تکش خاں نے خزانوں کی یکمشت ایک بڑی رقم اور جواہرات، نیز سالانہ خراج کا وعدہ کیا۔ سلطان شاہ، تکش اور فوما کی مشترکہ فوجوں کو روکنے کے قابل نہ تھا۔ لہٰذا وہ بغیر لڑے ہوئے خوارزم سے ملک موید کے پاس شادیاخ بھاگ گیا اور دسمبر 1172ء میں تکش خوارزم کے تخت پر بیٹھا۔ خوارزم کو فتح کرنے کی کوشش میں ملک نوید جنگ میں گرفتار ہو گیا اور قتل کر دیا گیا۔ سلطان شاہ اور اس کی ماں دہستان بھاگ گئے۔ تکش نے دہستان پر قبضہ کر لیا اور (سلطان شاہ کی) ماں کو قتل کر دیا۔ لیکن سلطان شاہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

مستقبل میں یہ بات واضح ہو گئی کہ سلطان شاہ نہ صرف معمولی درجہ کا ایک شاعر تھا بلکہ شکر و احسان مندی سے مبرا، نیز حکمت عملی سے بعید تر ایک بے چین جنگجو اور محملاً ایک سیاسی وبال جان تھا۔ وہ پہلے تو ملک موید کے بیٹے طغان شاہ کے پاس اور پھر غوری بھائیوں غیاث الدین اور شہاب الدین کے پاس بھاگا۔ انھوں نے ایک معزز مہمان کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کیا لیکن یہ بات واضح کر دی کہ وہ اس کے مقاصد کے سلسلے میں اس کی مدد کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن سلطان شاہ کے پاس دوسرے حلقے سے مدد پہنچی۔ اس وقت اور آگے چل کر بھی یہ ایک شکایت تھی کہ قراختائی سفراء خوارزمی حکمرانوں کے حق میں بڑے گستاخ تھے۔ وہ سلطان کے بغل میں اس کے تخت پر بیٹھنے پر اصرار کرتے اور شاہی دربار کی روایات کا خیال نہ کرتے۔ اب جب کہ تکش کی صورت حال بہتر ہو چکی تھی، وہ اس گستاخی کو مزید برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے ختا کے ایک ممتاز شخص کو جو سفارت کے عہدے پر مامور تھا اس کی ناشائستہ حرکت کی بنا پر قتل کرا دیا لہٰذا اس کے اور ختا کے عوام کے درمیان سخت کلامی

ہو گئی۔

گور خاں اور اس کے افسران نے خوارزمی تخت کے کسی دعویدار کی تلاش شروع کی، اور سلطان شاہ ہی تنہا قابل حصول امیدوار تھا۔ سلطان شاہ ختائی سفراء کی دعوت پر جلد روانہ ہونے کو تیار ہو گیا اس کے غوری میزبانوں کو اس بات سے اطمینان ہوا۔ ختائی افسران کو عوام میں اپنی مقبولیت کا یقین دلانے میں وہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن جب فوما دوسری بار خوارزم پہنچا تو اس نے وہاں سلطان شاہ کی حمایت میں کسی بھی تحریک کی کوئی علامت نہ پائی۔ سڑکیں آمو دریا کے سیلاب کی زد میں تھیں اور خوارزمی لوگ آخر دم تک لڑنے کے لیے تیار تھے۔ فوما نے واپس ہونے کا فیصلہ کیا لیکن سلطان شاہ نے فوما کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسے ایک دستہ دے دے۔ اس نے سرخس پر ایک ناکام حملہ کیا لیکن غز ترکوں سے فرو حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ خوارزم کی بادشاہت کو ایک عظیم سلطنت بنانا تکش کی قسمت میں تھا۔ تکش کے عسکری کارناموں کی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں لیکن شاعر قاآنی کی ایک رباعی میں ان کا خلاصہ بیان مل جاتا ہے۔ ”خوش خبری! خوارزم شاہ نے اصفہان کی مملکت کو فتح کر لیا ہے۔ اس نے خراسان ہی کے طریقے پر دونوں عراقوں کو بھی فتح کر لیا ہے“۔ خلیفہ کے ساتھ اس کے ناخوشگوار تعلق کے سلسلے میں اصل ذمہ داری خلیفہ کے وزیر موید الدین پر عائد ہوتی ہے۔ جس نے دیگر نامعقول مطالبات کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا کہ تکش اس کے گھوڑے کے آگے چلے۔ لیکن 1195ء میں خلیفہ ناصر کی فوج کو شکست دینے کے بعد تکش نے اس کے ساتھ امن وامان کی فضا ساز گار کر لی اور عراق، خراسان اور ترکستان کے سلطان کی حیثیت سے اپنی تقرری کے سلسلے میں ناصر کا فرمان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنی حکومت کے اختتام پر تکش نے الموت کی بدعتی مملکت کو کچل ڈالنے کا فیصلہ کیا لیکن 1200 عیسوی میں ترشیز جاتے ہوئے وہ انتقال کر گیا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے جانشین کو گور خاں کے ساتھ بہتر تعلقات قایم رکھنے کا مشورہ دیا تھا ”کیونکہ وہ وہ ایک زبردست دیوار تھی جس کے پیچھے خطرناک دشمن تھے“ چنگیز خاں نے تقریباً منگولیہ کا استحکام مکمل کر لیا تھا اور تکش غالباً اس بات سے واقف تھا کہ اس کا کیا مطلب تھا“۔[1]

---

(1) ”تاریخ جہاں کشا، فارسی متن جلد دوم ص 8، بوائل کا ترجمہ جلد اول ص 357۔

علاؤالدین محمد خوارزم شاہ

تکش کا جانشین علاؤالدین محمد خوارزم شاہ جس کو "سکندر الثانی" کا خطاب دیا جاتا ہے (20-1200ء) قدیم طرز کے شہنشاہ سلاطین (Emperors-Sultans) میں آخری تھا۔ کیوں کہ تیمور کی حیثیت اس نوعیت کی نہ تھی۔ اس کے المناک خاتمے نے یہ ثابت کر دیا کہ جس نظام کی وہ نمائندگی کر رہا تھا وہ بالکل فرسودہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی قسمت نے اسے اقبال مندی کے پندرہ سال بخشے۔

اس عہد کی ایک اہم حقیقت خود اپنی سرزمین اور ہندستان دونوں ہی جگہوں میں غوریوں کی بڑھتی ہوئی طاقت تھی۔ منہاج السراج کے مطابق علاؤالدین نے غیاث الدین اور شہاب الدین سے اپیل کی کہ وہ اس کے ساتھ اپنے بیٹے جیسا سلوک کریں اور اس نے شہاب الدین اور اپنی ماں ترکان خاتون کے درمیان شادی کا مشورہ دیا[1] لیکن شہاب الدین نے اس خوفناک عورت سے رشتہ ازدواج کرنے میں کسی رغبت کا مظاہرہ نہ کیا (بلکہ) غوری (برادران) خلیفہ کے اشتعال پر جارحانہ اقدام کا فیصلہ کر چکے تھے۔ شروع شروع میں انھیں عظیم کامیابی نصیب ہوئی "پورا خراسان ان کے زیر نگیں ہو گیا اور دشمنوں سے پاک ہو گیا"۔ ایک ممتاز غوری جنگجو محمد خرنگ نے جو شیروں اور ہاتھیوں سے لڑنے کا عادی تھا ایک دستے کی قیادت کی، جس نے دور افتادہ

---

(1) بیشتر مورخین ترکان خاتون کا ایک ہیبت ناک عفریت صفت انسان کی حیثیت سے تذکرہ کرتے ہیں۔ دیگر لوگوں میں جوینی یوں، رقمطراز ہے "نسلاً وہ ان ترکی قبائل سے تعلق رکھتی تھی جنھیں قنقلی کہا جاتا تھا اور اپنی اصل کی بنا پر ترکاں (قنقلی) ترکوں کی حمایت کرتی تھی۔ جو اس کی زندگی میں عروج پر تھے انھیں عجمی کہا جاتا تھا اور رحم و محبت ان کے دلوں سے بہت دور تھی جہاں کہیں سے وہ گزرتے وہ علاقہ بربادی کا ڈھیر بن جاتا اور لوگ اپنے اپنے قلعوں میں بھاگ جاتے اور یہ یقیناً ان کی بے رحمی، تشدد اور بدمعاشی ہی تھی جو شیطان کے خاندان کے زوال کا سبب بنی" اپنے بیٹے کے اقتدار کو محفوظ رکھنے کی خاطر وہ یرغمال کی حیثیت رکھنے والے لوگوں کو جو خوارزم لائے جاتے آمو دریا میں ڈبو دیا کرتی تھی (چنگیز کی فوج کے پہنچنے کے سبب خوارزم سے) اپنی روانگی کے وقت اس نے مقامی حکمرانوں کی ایک تعداد کو جو یرغمال کے طور پر روک لیے گئے تھے تمام کے تمام کو آمو دریا میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔ سوائے ان لوگوں کے جو شاہی درجہ کے نہ تھے۔

(بوائل کا ترجمہ، جلد اوّل، ص ص465-466)

مرو کو فتح کر لیا شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ممتاز غوری افسران کو مفتوحہ شہروں کا انچارج بنایا گیا۔ غیاث الدین کے ایک چچیرے بھائی اور داماد ملک ضیاء الدین کو نیشاپور کا خطہ سپرد کیا گیا۔ سرخس کو دونوں سلطانوں کے ایک چچیرے بھائی ملک تاج الدین زنگی کے ذمہ کیا گیا۔ ہرات کو وہ لوگ چند سال پیشتر ہی ایک سلجوق غلام افسر بہاء الدین طغرل سے حاصل کر چکے تھے۔ ہر اس شخص کی جائداد غوریوں نے قرق کرلی جس کا خوارزمی وزارت مالیہ کی انتظامیہ سے کچھ بھی تعلق تھا۔"

بہرحال خوارزم شاہ 1200ء میں شادیاخ اور سرخس پر دوبارہ قبضہ کر لینے میں کامیاب ہوگیا اور جب دوسرے سال اس نے ہرات کے خلاف پیش قدمی کی تو وہاں کے کوتوال عزالدین مرغزی نے صلح کی درخواست کی لیکن اسی وقت سلطان شہاب الدین نے ایک بار پھر نیشاپور پر چڑھائی کر دی۔ خوارزم شاہ نے ایک گھمسان کی جنگ کو مناسب نہ سمجھا اور اپنی راجدھانی واپس ہو گیا۔ لیکن اس نے خراسان کے ایک حصہ سے بھی دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ شہاب الدین نے طوس پر قبضہ کرلیا۔ اور وہاں کے باشندوں کی جائداد قرق کرلی اور اس غلہ کو ضبط کر لیا جو مشہد اس توقع پر لایا گیا تھا کہ یہ امام علی الرضا کے روضے کے زیر سایہ محفوظ رہ سکے گا۔ جوینی کہتا ہے کہ "جو کچھ اس سے پیشتر بیت چکا تھا اور اس کے علاوہ ان تلخ اسباب کی بنا پر امراء اور عوام دونوں ہی غوریوں سے متنفر ہو گئے تھے اور لوگوں کی زیادہ خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو خوارزم کی پارٹی سے منسلک کر لیں[1]۔

اس موقع پر سلطان غیاث الدین غوری کا ہرات میں 27/جمادی الاول 599ہجری (13مارچ 1203ء) میں انتقال ہو گیا اور شہاب الدین کو پسپا ہونا پڑا۔ اس نے غزنی اور اپنے ہندستانی علاقہ جات کو اپنے قبضہ میں رکھا اس مقصد سے کہ وہ اس کے اعلیٰ غلام افسران کو مل سکیں۔ لیکن اس نے غیاث الدین کی موروثی جاگیروں کو اس کے وارثوں میں تقسیم کر دیا۔ مرحوم سلطان کے داماد ضیاء الدین کو غور اور گرمسیر کی جاگیریں دی گئیں جن میں فیروز کوہ کی راجدھانی مرواردو (کا شہر) اور زمین داور شامل تھے۔ اس کے بیٹے غیاث الدین محمود کو اپنے آپ کو بست کے شہر اور فرح اور اسفرار کی جاگیروں پر ہی مطمئن کر لینا پڑا۔ ہرات دونوں سلطانوں کی ایک بہن کے

---

(1) بوائل کا ترجمہ، جلد اول، ص319

لڑکے الپ غازی کو دیا گیا۔ غیاث الدین کے ترکے کی اس تقسیم کو حق بجانب ثابت کرنا مشکل ہے۔ لیکن تجربے نے شہاب الدین (جس نے اب معزالدین کا خطاب اختیار کر لیا تھا) کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ اس کے رشتہ دار ناکارہ ہیں اور یہ کہ غور کے قبائلی سرداروں پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

معزالدین کی واپسی نے مرو میں خرنگ کی صورت حال کو غیر محفوظ بنا دیا تھا۔ ایک خوارزمی فوج نے مرو پر قبضہ کر کے خرنگ کا سر کاٹ لیا اور اسے خوارزم بھیج دیا۔ خوارزم شاہ اس کے بعد بذات خود ہرات کی جانب روانہ ہوا۔

الپ غازی نے دعویٰ کیا کہ اسے صلح کرنے کے لیے معزالدین کی جانب سے اختیار حاصل ہے اور اس نے ہرات سے دست بردار ہو جانے کی پیشکش کر دی۔ معزالدین نے، جسے خرنگ کی موت کا سخت صدمہ پہنچا تھا، الپ غازی کے معاہدے کو رد کر دیا اور خوارزم کے خلاف نکل کر اور اپنے حریف کی راجدھانی پر قبضہ کر کے کشمکش کے خاتمہ کا فیصلہ کیا۔ لیکن خوارزم شاہ نے اس اقدام کا اندازہ کر لیا اور ریگستان کے راستے خوارزم لوٹ گیا۔ نبیؐ کے اس قول کی بنیاد پر کہ "ہر وہ شخص جو اپنی زندگی اور جائداد کے دفاع میں مارا جائے شہید ہے"۔ غوری نے جارحیت کے خلاف ایک مقدس جنگ کا اعلان کر دیا۔ نُزوار میں جو غالباً آمو دریا پر کسی جگہ واقع ہے اپنے خیمہ کے گرد وہ تقریباً ستر ہزار آدمیوں کی فوج اکٹھا کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ غوری مخالف سمت پر خیمہ زن ہو گئے اور چشمہ کو پار کرنے کے ذرائع کی جستجو میں لگ گئے۔

معزالدین نے اپنے صدر مقام سے اتنی دور کی ایک مہم پر روانہ ہونے میں ایک زبردست غلطی کی تھی۔ وہ غالباً شہری آبادی کی شدید مخالفت پر حیرت زدہ رہ گیا اور جب اس نے سنا کہ گور خاں نے خوارزم شاہ کی اپیل کے جواب میں سمرقند کے "سلطان السلاطین" سلطان عثمان کے ساتھ طراز کے اپنے مشہور جنرل تانیکو (یا تیانیکو) کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی ہے تو وہ ہوش باختہ ہو گیا۔ اس مددگار فوج نے بڑی دانشمندی سے خوارزم نہ جا کر معزالدین کو کچل ڈالنے کے لیے اپنے آپ کو اس کے غزنی کے بیچ ڈال دینے کا فیصلہ کیا۔ معزالدین نے واپس بھاگنے کا فیصلہ کیا اور خوارزمیوں نے اس کا تعاقب کیا۔ ہزار اسپ کے قلعے کے نزدیک وہ لڑنے کے لیے

واپس مڑا لیکن بری طرح شکست کھا گیا۔ "متعدد غوری امراء اور اکابرین قید کی جکڑ بندیوں کا شکار ہو گئے اور باقی نے بے آب و گیاہ ریگستان کی ٹھوکریں کھائیں۔"

بقیہ مہم کی وضاحت منہاج السراج نے یوں کی ہے: "چونکہ خوارزم کی فتح سازو سامان کی کمی، مہم کی طوالت اور مویشیوں کے چارے کی کمی کی بنا پر ممکن نہ تھی لہٰذا معزالدین آمودریا کے کنارے پر واقع خوارزم سے بلخ لوٹ آیا۔ ختا کی فوج اور ترکستان کے مَلک آمودریا کو عبور کر چکے تھے اور اسلام کی فوج کے راستے میں کھڑے تھے۔ جب سلطان اندخود پہنچا تو کافر فوج کا ہراول دستہ ظہر کی نماز کے بعد سلطان کے خیمہ کے نزدیک آیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ خضرواں کے ملک اور سلم مقدمۃ الجیش کے لیڈر عزالدین حسین خرمیل نے انھیں شکست دے دی اور فوراً فاتح سلطان کے پاس آیا اور بولا: "مسلمانوں کی فتح اور کافروں کی شکست ہوئی ہے۔ اسلام کے بادشاہ کے لیے مناسب یہ ہو گا کہ وہ مسلمانوں کو فوراً سوار ہونے کا، کافروں کے تعاقب کا اور اچانک ان پر حملہ کر دینے کا حکم دے دیں تاکہ ایک عظیم الشان فتح حاصل ہو۔" سلطان نے جواب دیا کہ "میں سالہا سال سے اس قسم کے ایک غزوہ (مقدس جنگ) کی تلاش میں تھا میری جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو گی۔ کل صبح خدا کی عنایت سے، میں دشمن سے لڑوں گا اور دیکھوں گا کہ خدا کسے کامیابی دیتا ہے۔ بہر صورت میں سنت کے مطابق انعامات سے نوازا جاؤں گا۔"

خرمیل سلطان کی دماغی حالت کو دیکھ کر اچھی طرح سمجھ گیا کہ سلطان نے یہ الفاظ اسلام پر ایمان اور اس کی حفاظت کے جذبے سے متاثر ہو کر کہے ہیں لیکن کافروں کی فوج ناقابلِ شمار تھی اور اس کے تمام سپاہیوں کی حالت مناسب و درست تھی جب کہ اسلام کی فوج مہم کی طوالت سے چور چور تھی اور دشمن سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سلطان کے پاس سے واپس آ گیا اور خود اپنے دستہ کے ساتھ جو پانچ ہزار گھوڑسواروں پر مشتمل تھا رات کو خوارزم کے لیے روانہ ہو گیا۔ بیشتر سواروں نے بھی جن کے گھوڑے کمزور تھے متفقہ طور پر معزالدین کا ساتھ چھوڑ دیا۔

دوسری صبح سلطان نے صفیں مرتب کیں اور اپنے منتخب غلاموں اور قلب لشکر کے چند گھوڑسواروں کے ساتھ جو اب بھی اس کے ساتھ رہ گئے تھے جنگ کا آغاز

کر دیا۔ کافروں کی فوج نے انھیں متحد المرکز دائروں میں گھیر لیا۔ سلطان کے غلاموں نے اسے سمجھایا بجھایا کہ چونکہ اب صرف چند مسلمان باقی رہ گئے ہیں لہٰذا انھیں پسپا ہونا چاہیے لیکن وہ اپنے مقام پر لڑتا رہا۔ بالآخر تقریباً ایک سو گھوڑسوار اور غلام اور نہایت قلیل تعداد میں ہاتھی سلطان کے پاس بچ رہ گئے اس کے ترکی غلاموں اور غوری سرخیلوں نے اس کے گھوڑے کے آگے قدم جما لیے اور کافروں کو ہلاک کرنے لگے اور ان کے ہاتھوں شہید ہونے لگے۔ معتبر شہادتیں بتاتی ہیں کہ سلطان نے ایسی سخت مزاحمت کی تھی کہ اس کا شاندار چھتر تیروں سے اس طرح چھد گیا تھا جس طرح سیہہ کی پیٹھ کانٹوں سے بھری ہوتی ہے لیکن اس نے کسی بھی صورت میں پیٹھ نہ دکھائی۔ آخر کار ایک جوگی نامی ایک غلام نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور اسے اندخود کے قلعہ کی طرف کھینچ لے گیا اور بحفاظت قلعہ کے اندر لے آیا[1]۔

ختائیوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک دیوار توڑ دی گئی اور قلعہ پر قبضہ ہو جاتا لیکن نام نہاد "کافر فوج" میں محض دس ہزار ختائی سپاہی تھے اور فوج کا باقی حصہ ایسے مسلم ملکوں کے دستوں پر مشتمل تھا جو ذاتی طور پر معزالدین کو گزند نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ سلطان عثمان، تانیکو کے ساتھ یہ سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ معزالدین کو غزنی چلے جانے کی اجازت دے دی جائے گی بشرطیکہ وہ تمام چیزوں سے جو اس کے قبضہ میں تھیں دست بردار ہو جائے۔

غزنی پہنچنے پر خوارزم شاہ کے پاس سے معزالدین کے پاس قاصد اس بیان کے ساتھ آئے کہ معزالدین ہی نے جنگ کا آغاز کیا تھا اور مستقبل میں ان کے درمیان ایک اتحاد ہونا چاہیے۔ دونوں ہی خطا سے عاجز آ چکے ہیں۔ معزالدین راضی ہو گیا اور اس نے اپنے افسروں کو گورخاں کے خلاف ایک جنگ کے لیے تین سالوں میں تیار ہو جانے کا حکم دیا لیکن دوسرے سال (1206) اسمٰعیلی زاہدوں نے سندھ کے قریب دمیاک نامی ایک مقام پر اسے قتل کر دیا اور اس کی موت کے نتیجے میں جو افراتفری پھیلی اس نے خوارزم شاہ کو یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ غوری سلطنت کی اصلی سرزمین کو جو اب تین حصوں میں منقسم ہو چکی تھی اپنی سلطنت میں ملا لے۔

---

(1) طبقات ناصری، فارسی متن، ص 23-122

(الف) علاء الدین جہاں سوز بامیان پر فتح حاصل کر چکا تھا اور اس نے اپنے بڑے بھائی فخر الدین مسعود کو اس کا انچارج مقرر کر دیا تھا۔ فخر الدین نے اپنی سرحدیں اتنی وسیع کر لیں کہ پورا طخارستان یا شمالی افغانستان اس کی بادشاہت میں داخل ہو چکا تھا۔ خوارزم شاہ نے 1213 میں طخارستان کو اس کے آخری غوری حکمراں سلطان جلال الدین سے حاصل کر لیا اور اسے قتل کر دیا۔

(ب) غوری دارالسلطنت فیروز کوہ میں کئی ایک انقلابات رونما ہوئے۔ غیاث الدین محمود نے ضیاء الدین سے فیروز کوہ کو چھین لیا اور خوارزم شاہ سے اس مقام کا اپنے حکمراں ہونے کا ایک فرمان حاصل کیا۔ لیکن غیاث الدین کو 13-1211ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے ایک چودہ سالہ لڑکے بہاء الدین سام کو اس کے تین ماہ حکومت کر لینے کے بعد علاء الدین جہاں سوز کے ایک لڑکے علاء الدین اتسیز نے خوارزمی مدد سے بے دخل کر دیا۔ ملک نصیر الدین حسین، جسے غزنی کے حکمران تاج الدین یلدوز نے علاؤ الدین اتسیز کے خلاف بھیجا تھا، کے مدمقابل ایک جنگ میں زخمی ہو کر علاؤ الدین اتسیز مارا گیا۔ 1212ء یا 1213ء میں ملک ضیاء الدین، جو اس سے قبل فیروز کوہ کا حکمراں رہ چکا تھا، کو قید خانے سے نکال کر تخت پر بٹھایا گیا اور تاج الدین یلدوز نے معز الدین غوری کے چھتر کو اس کے مقبرے سے نکالے جانے کی اور ضیاء الدین کے پاس بھیج دیے جانے کی ہدایت کی۔ ایک ایسا حکمراں جو غزنی کا ماتحت ہو خوارزم شاہ کو راس نہ آیا لہٰذا اس نے ضیاء الدین کے پاس وہ دستاویز بھیجی جس میں موخر الذکر نے نیشاپور میں یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ خوارزم شاہ کے خلاف دوبارہ اسلحہ نہ اٹھائے گا۔ ضیاء الدین نے، جو شاید نہایت مذہبی خیال کا آدمی تھا، 1215ء عیسوی میں فیروز کوہ خوارزم شاہ کے افسروں کے حوالے کر دیا اور اپنی بقیہ زندگی خوارزم میں مذہبی زہد و تقویٰ میں گزار دی۔ یوں اس شنشبانی خاندان کا خاتمہ ہوا جو ایک ہندستانی مملکت کی بنا ڈالنے کے جلد ہی بعد خود اپنی سرزمین سے غائب ہو گیا۔

(ج) جب 1206ء میں معز الدین غوری کا جنازہ دمیاک سے غزنی لے جایا جا رہا تھا، اس وقت اس کے غوری افسروں اور اس کے ترکی غلاموں کے درمیان ایک سخت کشمکش واقع ہو گئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موخر الذکر نے تمام چیزوں پر قبضہ کر لیا

اور انھوں نے سب سے اعلیٰ غلام افسر تاج الدین یلدوز کو غزنی کے تخت پر بٹھا دیا۔ طخارستان کے سلطان جلال الدین نے جو غزنی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا دوبارہ شکست کھائی اگرچہ وہ معزالدین کے ذریعے مال غنیمت کا ایک حصہ ڈھائی سو اونٹوں پر لے جانے میں کامیاب ہو گیا جو بالآخر خوارزم شاہ کو پہنچے۔ یلدوز نے ہر جانب اپنی بادشاہت کی توسیع کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ تقریباً 16-1215ء میں خوارزم شاہ طخارستان کے راستے اس کے خلاف روانہ ہوا۔ یلدوز ہندستان بھاگ آیا جہاں اسے شمس الدین التمش نے شکست دے کر مار ڈالا۔

اگرچہ گورخاں نے 1205ء میں علاء الدین خوارزم شاہ کو ایک بحرانی صورت حال سے نجات دلائی تھی لیکن ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی کی توقع نہ تھی۔ خوارزمی سلطنت اب اتنی وسیع تھی جتنی سلجوقیوں کی سلطنت رہ چکی تھی اور علاء الدین نے محسوس کیا کہ گورخاں کو خراج دینا اس کی شان کے خلاف ہے۔ اس نے تین سالوں تک خراج بند کر دیا۔ یہاں تک کہ گورخاں نے اپنے وزیر محمد طائی کو اسے وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ سلطان نے جو اپنی قپچاق کی مشہور مہم پر روانہ ہونے کو تھا اس معاملے کا فیصلہ اپنے ماں ترکان خاتون پر چھوڑ دیا اور اس کی ماں نے پورا کا پورا جو واجب الادا تھا ادا کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اپنی مہم سے واپسی کے بعد سلطان نے گورخاں کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا۔ ماوراء النہر کے امراء کی جانب سے متعدد خطوط وصول ہوئے تھے جن میں اس سے گورخاں، جس کے افسروں نے اپنی سابقہ روایت کے برخلاف "ایک غیر قانونی اور جابرانہ رویہ "اپنانا شروع کر دیا تھا، کے خلاف مدد کی اپیل کی تھی۔ سمرقند کے "سلطان السلاطین" عثمان نے بھی گورخاں کے خلاف اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ خان نے اپنی لڑکی کی شادی عثمان کے ساتھ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ایک نہایت خوبصورت لڑکی تھی اور عثمان اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب 1209ء میں گورخاں کا سفیر توشی سلطان کے بغل میں اس کے تخت پر بیٹھا اور گستاخانہ رویہ اپنانے لگا تو سلطان نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آمو دریا میں پھینک دینے کا حکم دے دیا۔

یہ جنگ کا اعلان تھا۔ گورخان نے تانیکو کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ سلطان نے

فناکت کے قریب سیر دریا کو پار کیا اور الامش کے مقام پر اگست۔ ستمبر 1210ء میں جمعہ کے دن جنگ ہوئی۔ تانیکو جو (منہاج السراج کے مطابق) 45 جنگوں کا فاتح رہ چکا تھا زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا اور بعد میں مار ڈالا گیا۔ جنگ غیر فیصلہ کن رہی تھی لیکن سلطان نے اپنی تمام مملکت میں ایک فتح کی حیثیت سے اس کا جشن منانے کا حکم دیا اور عوام نے اس کی تعمیل کی۔ صرف شادیخ کے سید غلام مرتضیٰ نے خوشی منانے سے انکار کر دیا۔ وہ بظاہر چنگیز خاں کے عروج سے واقف تھا اور اس نے اعلان کیا کہ "آج میں اسلام کے لیے ماتم کناں ہوں"۔

گور خاں کی فوج جب اس مبینہ شکست سے واپس ہوئی تو اپنی راجدھانی بلاساقون کے پھاٹکوں کو بند پایا۔ باشندوں نے محمد طائی اور امراء کے مشورے کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور بالآخر سپاہیوں نے تین دن اور تین راتوں تک باشندوں کا قتل عام کیا اور شہر کے 4700 ممتاز اکابرین قتل شدگان میں شمار کیے گئے[1]۔ اس اثنا میں خوارزم شاہ اور سلطان عثمان کے درمیان اختلافات بڑھ چکے تھے۔ موخر الذکر کی سلطان کی بیٹی کے ساتھ شادی ہو گئی تھی لیکن اس نے اپنے شوہر کے خلاف سخت شکایتیں کی تھیں۔ خوارزم شاہ سمرقند کے خلاف روانہ ہو گیا اور اگرچہ کہ عثمان اپنی گردن سے ایک تلوار باندھے مطیع ہو کر باہر نکلا لیکن پھر بھی سلطان نے ایک قتل عام کا حکم دیا یہاں تک کہ دس ہزار باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کی بیٹی نے اپنے شوہر کی موت کا مطالبہ کیا اور اس نے اس کی خواہشات مان لیں۔ اس کے بعد سمرقند کو دارالسلطنت بنالیا گیا۔

ایسے وقت میں قبیلہ نایمان کے سردار تایانک خاں کے بیٹے کوچلک کے نمودار ہونے سے معاملات اور پیچیدہ ہو گئے۔ چنگیز نے کوچلک کے باپ کو شکست دے دی تھی اور غالباً اسے مار ڈالا تھا اور اس کی دادی گورسو کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اب وہ کوچلک کو مار ڈالنا چاہتا تھا اور اس کے کاسۂ سر سے ایک جام بنانا چاہتا تھا لیکن اسی وقت چنگیز شمالی چین کی کِن سلطنت کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا اور کوچلک کے ساتھ ایک مدت تک چھیڑ چھاڑ نہ کی گئی۔ گور خاں نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا تھا

---

(1) جوائنی، فارسی متن، جلد دوم ص 92

لیکن کچھ دنوں کے بعد کوچلک اپنے آدمیوں کو اکٹھا کرنے کے بہانے سے خان سے الگ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے سابقہ میزبان کے خلاف خوارزم شاہ کے ساتھ مندرجہ ذیل شرائط پر ایک معاہدہ کر لینا اپنے لیے زیادہ سود مند سمجھا ”اگر سلطان کو گور خاں پر فتح حاصل ہو جاتی ہے تو اسے ختن اور کاشغر تک کا تمام علاقہ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اگر گوچلک فاتح رہا تو اسے سیر دریا پر واقع فناکت تک کا تمام علاقہ حاصل ہو جائے گا۔“ سلطان گور خاں کے خلاف روانہ ہوا لیکن اس کے بعد جو جنگ ہوئی وہ غیر فیصلہ کن تھی اور کچھ مدت کے لیے سلطان لاپتہ ہو گیا۔ دوسری جانب کوچلک گور خاں پر بے خبری میں حملہ کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس نے گور خاں کا ساتھ ،ایک سال یا دو سال بعد اس کی موت تک اچھا سلوک کیا۔

اس فتح نے سیر دریا کے اس پار تک کے علاقے کو کوچلک کے قبضہ میں کر دیا جو مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ اس کی پرورش ایک عیسائی کی حیثیت سے ہوئی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ختائی لڑکی سے شادی کے بعد اس نے بدھ مت اختیار کر لیا۔ اس نے اپنی مسلم رعایا سے کہا کہ وہ عیسائی مذہب اختیار کر لیں یا چینی لباس پہنیں۔ چونکہ پہلی صورت ناممکن تھی لہٰذا انھوں نے دوسری صورت قبول کر لی۔ ”مسلمانوں کی اذان اور تکبیر پر پابندی لگا دی گئی“۔ کوچلک عربی نبی کو بُرا بھلا کہا کرتا تھا اور جب ایک عالم علاء الدین محمد نے ایک عوامی مباحثہ میں اسے چیلنج کرنے کی جرات کی تو انھیں اذیت دے کر مار ڈالا گیا۔ لیکن جب یمہ کی فوج میں ایک منگول فوج نمودار ہوئی اور کوچلک بھاگ کھڑا ہوا تو مسلمانوں کو کچھ آرام ملا۔ منگولوں کا کہنا تھا کہ انھیں کسی کے مذہب سے کوئی جھگڑا نہیں اور انھوں نے مسلم عقیدہ پر سے تمام پابندیاں ختم کر دیں۔ انھیں کوچلک کے علاوہ کسی سے جنگ کرنے کا حکم نہ تھا۔ کوچلک بدخشاں بھاگ گیا جہاں گرفتار کر کے اس کا سر کاٹ لیا گیا اور اس کی کھوپڑی کو پینے کا ایک پیالہ بنا لیا گیا۔

جب علاؤ الدین خوارزم شاہ نے 16-1215ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا تو اسے غوری دفتر خانوں میں خلیفہ ناصر کے خطوط کا انکشاف ہوا ”جن میں غوریوں کو سلطان پر حملہ کے لیے اکسایا گیا تھا اور موخر الذکر کے افعال و اعمال کو برا بھلا کہا گیا تھا“ علاؤ الدین کا غصہ قدرتی طور پر اس وقت مشتعل ہو گیا جب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس

کے اور اس کے باپ کے ساتھ غوریوں کی مستقل عداوت کا ذمہ دار ناصر تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنے آپ کو بویہیوں اور سلجوقیوں کے، خلفاء جن کے ماتحت و فرمانبردار رہ چکے تھے، کم تر تصور کرنے پر تیار نہ تھا اور اس نے تین مسائل پر اپنے مذہبی محققین کی منظوری حاصل کر لی۔ (الف) یہ کہ ایک ایسا امام یا خلیفہ جس کی حرکت ناصر جیسی ہو اس عہدہ کے لیے موزوں نہیں (ب) یہ کہ ایک ایسا حکمراں جس نے اپنی ساری زندگی مقدس جنگوں میں گزاری ہو ایک ایسے خلیفہ کو برطرف کرنے اور اس کی جگہ پر ایک مناسب شخص کو مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے۔ (ج) اور یہ کہ عباسی غاصب تھے اور یہ کہ خلافت امام حسینؓ کے اخلاف کو ملنی چاہیئے تھی۔ اس فتویٰ کی بنیاد پر خوارزم شاہ نے ناصر کا نام اپنی ساری وسیع مملکت میں خطبہ سے خارج کرا دیا[1]۔

1217 عیسوی میں علاؤالدین خوارزم شاہ نے سید علاؤالدین ترمذی کو خلافت کے لیے کھڑا کیا اور عراق، خراسان اور ماوراء النہر کے سرداروں کے ساتھ بغداد کے خلاف روانہ ہوا۔ خلیفہ ناصر نے عظیم صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی کو خوارزم شاہ سے ملاقات اور اس سے واپس جانے کی اپیل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ لیکن شیخ کی شہرت سے خوارزمی دربار ناواقف تھا لہٰذا شیخ کو ملاقات کے سلسلے میں دشواری ہوئی اور جب ان کی ملاقات ہوئی تو خوارزم شاہ نے، جو ایک قالین پر بیٹھا تھا، نہ تو شیخ کے سلام کا جواب دیا اور نہ ہی انھیں بیٹھنے کی دعوت دی۔ شیخ نے عربی میں گفتگو کی اور سلطان کے لیے اس کا ترجمہ کیا گیا۔ سلطان کا جواب بڑا تلخ تھا: "یہ شخص جو کچھ (ناصر کی خوبیوں کے سلسلہ میں) کہتا ہے صحیح نہیں۔ جب میں بغداد پہنچوں گا تو میں خلافت کے تخت پر ایک شخص کو بٹھاؤں گا جو مناسب لیاقت رکھتا ہو۔ رہی یہ بات کہ نبیؐ نے ہمیں عباسیوں کو تکلیف پہنچانے سے روکا ہے تو خود عباسیوں نے ہی ایک دوسرے کو تکلیف پہنچائی ہے اور متعدد عباسی شہزادے قید خانوں میں پیدا ہوئے"۔ روضۃ الصفا کے مطابق "اس زمانہ میں عباس کے اخلاف کی ایک بڑی تعداد قید خانے میں تھی[2]۔ جب

---

(1) علاؤالدین عطا ملک جوینی، تاریخ جہاں گشا، فارسی متن (گب سیریز) ص ص 33، 86، 120، 122 جون اینڈریو بوائل کا ترجمہ، جلد اوّل 53، 303 جلد دوم ص 390-92

(2) خوارزم شاہ کی اس مہم کے لیے ملاحظہ ہو۔ روضۃ الصفا، جلد سوم، ص 182-83

شیخ نے اپنے مشن کی ناکامی کی اطلاع دی تو ناصر نے محاصرہ کے مقابلے کی تیاری کی لیکن اس سال بغداد میں سردی غیر متوقع طور پر نہایت سخت تھی حملہ آوروں کے خیمے برف سے گھر گئے۔ خوارزمی کیمپ کے مویشی مر گئے، سپاہیوں کے ہاتھ اور پیر ٹھنڈ کے مارے شل ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ حرکت نہیں کر سکتے تھے اور خوارزم شاہ کے لیے پسپائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے ضروری سازوسامان کے ساتھ دوبارہ آنے کا وعدہ کیا لیکن منگول حملہ کی وجہ سے یہ بات اس کے لیے ناممکن بن گئی۔

الموت کی اسمٰعیلی ریاست (1255-1090ء)

سلجوقیوں اور خوارزمیوں کی عظیم راسخ العقیدہ مملکتوں کے باوجود اسمٰعیلی یا الموت کی خلاف عقیدہ ریاست نے، جس کی بنیاد حسن بن صباح نے ڈالی تھی، اپنی آزادی برقرار رکھنے میں اور اپنی طاقت وسیع کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ حسن کا باپ یمن سے آیا تھا اور ایران میں سکونت پذیر ہو گیا تھا[1]۔ حسن کی پرورش راسخ العقیدہ اثنا عشری شیعہ مذہب میں ہوئی تھی لیکن اس نے اسمٰعیلی مذہب قبول کر لیا اور اسے ایک "داعی" یا مبلغ مقرر کر دیا گیا۔ فاطمی خلیفہ مستنصر (95-1035ء) کے دور حکومت میں وہ ڈیڑھ سال مصر میں رہا۔ 1090ء میں اس کے پیروکاروں نے الموت (آشیانہ عقاب) نامی ایک قلعہ کو، جو قزوین کے شمال میں ہے، ملک شاہ سلجوقی کے ایک افسر مہدی سے چھین لیا۔ حسن نے مہدی کو ایک سلجوقی افسر مظفر جو خفیہ طور پر اس کا پیرو تھا، کے نام 30 ہزار دینار کی ہنڈی دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مظفر نے یہ رقم ادا کر دی اور اسمٰعیلیوں کو اپنی تبلیغ کے لیے ایک مرکز ہاتھ آ گیا۔ اس وقت الموت کسی بڑی اہمیت کا حامل نہ تھا کیونکہ جب سلجوقی افسروں نے حسن کا محاصرہ کر لیا تو اس کے ساتھ صرف ساٹھ آدمی تھے اور اسے تین سو رضاکاروں کو باہر سے منگوانا پڑا تھا۔

---

(1) ہولاکو نے الموت کو فتح کیا تو اس نے اپنے مسلمان سکریٹری عطا ملک جوینی کو اس کے کتب خانے کا جائزہ لینے کی اجازت دی۔ حسن بن صباح کی تصانیف کو اس کے ایک جانشین جلال الدین نے نذر آتش کر دیا تھا لیکن جوینی کو وہاں "سرگزشت سیدنا" نامی حسن بن صباح کی ایک سوانح عمری ملی۔ بیشتر مورخین نے الموت مملکت کے سلسلہ میں اپنی معلومات کے لیے جوینی کی "تاریخ جہاں گشا" کی تیسری جلد پر انحصار کیا ہے۔ روضۃ الصفا جوینی کی بالکل تقلید ہے لیکن اس میں کچھ چیزوں کا اور اضافہ بھی ہے۔

حسن کو المؤت میں 35 سال رہنا نصیب ہوا جس کے دوران اس نے مطالعہ کیا، تصنیف کی اور اپنے گھر ہی سے انتظام حکومت کے سلسلہ میں ہدایات جاری کیں لیکن وہ کبھی بھی اپنے قلعہ سے باہر نہ آیا جس نے اپنے آپ کو محض ایک داعی تصور کیا جس کا فرض اسمٰعیلی امام کے ظہور کے لیے راستہ ہموار کرنا تھا اور اس سے زیادہ اس نے کبھی کوئی دعویٰ نہ کیا۔ فارسی مورخین، اگرچہ وہ دوسرے اعتبارات سے مخالف ہیں، حسن بن صباح کی علمی شہرت منطقی صلاحیت اور انتظامی مہارت کے معترف ہیں۔ وہ نبیؐ کے مذہبی قوانین کا سخت پابند تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے جنھیں اس نے مختلف الزامات پر قتل کر دیا۔ وہ المؤت یا اپنے دیگر مقبوضات میں کسی ایسی چیز کی اجازت نہیں دیتا تھا جس کی شریعت سے ممانعت تھی۔

المؤت کی ریاست، جس کی بنیاد حسن بن صباح نے ڈالی تھی، کی تین قابل ذکر خصوصیات تھیں۔ اول تو یہ کہ یہ مکمل طور پر پہاڑی قلعوں پر مشتمل تھی۔ حسن اور اس کے جانشین برابر پرانے قلعوں پر قبضہ کرتے رہتے اور نئے قلعوں کی تعمیر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی ریاست میں قلعوں کی تعداد 105 ہو گئی۔ ستر قہستان کے ایرانی صوبے میں اور ماقی اس کے باہر، مع عراق اور شام کے۔ ان قلعوں کی وجہ سے ملک کی تجارت (کے راستوں) پر المؤت کے حکمرانوں کی سخت گرفت قایم ہو گئی تھی۔ دوم یہ کہ قلعوں کی دفاعی فوج کے علاوہ اور کوئی باضابطہ فوج تیار کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ فوج سلجوق مملکت کے تربیت یافتہ سپاہیوں کے مقابلہ میں بالکل بے کار ثابت ہوتی۔ لہٰذا اس کے بدلے میں حسن نے فدائین کی ایک ایسی جماعت کو تربیت دی جو اس کے فرمان یا اس کے جانشینوں کے فرمان پر (کسی کو بھی) قتل کر دیں۔ اگر ہم یاد رکھیں کہ پچھلی دو صدیوں سے عجم میں اسمٰعیلیوں کو برابر موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا تھا۔ بسا اوقات سخت اذیتوں کے ساتھ۔ تو اس بے باک ہمت و جرأت کو سمجھنا ممکن ہو جائے گا۔ جو ان ”قاتلوں“ کی روحوں میں سمائی تھی۔ انھوں نے راسخ العقیدہ بادشاہوں کو قتل کیا جو اسمٰعیلیوں کو قتل کرتے آ رہے تھے اور راسخ العقیدہ ”ملاؤں“ کو بھی جنھوں نے بادشاہوں اور عوام کو ان کے خلاف بھڑکایا تھا خالصاً انتقامی کارروائی تھی۔ ان کی ہمت و جرات کی وضاحت کے لیے ایک ”مصنوعی جنت“

کی مشہور کہانی کی ضرورت نہیں۔

روضۃ الصفا ہمیں بتاتی ہے کہ "سلطان سنجر سلجوقی، حسن صباح کے ساتھ تین شرائط پر سمجھوتہ کرنے پر تیار تھا۔ وہ لوگ نئے قلعے تعمیر نہ کریں یا زیادہ اسلحے نہ خریدیں یا تبدیلیٔ مذہب کے سلسلے میں اپنی تبلیغ کو آگے نہ بڑھائیں۔ لیکن "ملا" راضی نہ ہوئے اور اسے اسمٰعیلیوں کے ساتھ ہمدردی کا ملزم ٹھہرایا۔ لہٰذا سنجر کو خود اپنی ذمہ داری پر کام کرنے کو مجبور ہونا پڑا۔ جوینی بیان کرتا ہے کہ "اس نے قومش کے علاقہ میں واقع ان کی سرزمینوں پر لگائے گئے ٹیکسوں سے تین ہزار دینار کی ایک پنشن (ادرار) ان کے لیے مقرر کر دی اور انھیں گرد کوہ سے گزرنے والے مسافروں سے معمولی چنگی وصول کرنے کی بھی اجازت دے دی، جو رواج آج تک باقی ہے۔ میں نے سنجر کے بہت سے فرامین کو دیکھا جو ان کے کتب خانہ میں محفوظ تھے اور جن میں اس نے انھیں منایا اور پھیلایا۔ مختصر یہ کہ اس کے دور حکومت میں وہ خوش اور پُر امن تھے"۔

1124 میں اپنی موت سے قبل حسن بن صباح نے اپنے عمر بھر کے دوست کیا بزرگ امید کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس نے اس کی مدد کے لیے تین دیگر اعلیٰ افسران کا بھی تقرر کیا اور انھیں اس وقت تک "صلاح و مشورہ" سے کام کرنے کی تلقین کی جب تک کہ اپنی حکومت سنبھالنے کے لیے امام کا ظہور نہ ہو جائے۔ کیا بزرگ امید (38-1124ء) نے تندہی سے حسن بن صباح کے کام کو آگے بڑھایا لیکن اپنی موت سے قبل اس نے اپنی بیٹے محمد (62-1138ء) کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اس کے بعد یہ عہدہ موروثی ہو گیا اور رفتہ رفتہ اس میں ایک ایسی مسلم سلطنت کی، جو بڑے بیٹے کے حق وراثت کے اصول پر مبنی ہو، تمام بُرائیاں ابھر آئیں۔

محمد کے بیٹے حسن (66-1162ء) نے 1164ء میں دعویٰ کیا کہ وہ خلیفہ اور امام کی حجت ہے لیکن اس نے اپنے بعد منشوروں میں کھلے طور پر امام ہونے کا دعویٰ کر دیا جس کے اسمٰعیلی منتظر تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دعویٰ کو قبول کر لیا گیا اور اس کے پیروکاروں نے اسے "علی کرہ السلام" کا خطاب دے دیا۔ جوینی کے مطابق حسن نے ان باتوں پر یقین رکھنے میں فلاسفہ کی تقلید کی "کائنات غیر مخلوق ہے، یہ کہ وقت غیر محدود ہے، یہ کہ قیامت روحانی ہوگی اور یہ کہ جنت اور جہنم خالص مجازی

معنی میں سمجھی جانے والی چیزیں ہیں" اگر حسن محض امامت کے دعویٰ سے پرے اپنی قوم کے لیے کوئی پروگرام رکھتا تھا تو یہ ظاہر نہ ہو سکا کیونکہ 1166ء میں وہ اپنے نسبتی بھائی کے ہاتھوں مار ڈالا گیا۔

دوسرا امام کی رونمائی حسن کے بیٹے محمد کی پینتالیس سالہ طویل حکومت (1210-1166ء) ہوئی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ شخص تھا اور اس نے اپنے امامت کے دعویٰ کو منوانے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی لیکن اس کے بیٹے جلال الدین حسن نے خود کو ایک راسخ العقیدہ سنّی اعلان کر دیا اس نے اپنے اسلاف کو بُرا بھلا کہا اور حسن بن صباح کی کتابیں نذر آتش کر دیں۔ لیکن اس کی گیارہ سالہ حکومت اس کے عوام کو راسخ العقیدگی کی طرف واپس لے جانے کے لیے کافی نہ تھی۔ اور نو سال کی عمر میں اس کے بیٹے علاؤالدین کی تخت نشینی کے بعد وہ اپنے پرانے طریقوں پر واپس آ گئے۔

اس بات کو ثابت کرنا کہ امامت کا یہ نیا تجربہ ایک ناکام تجربہ تھا، علاؤالدین (55-1221) کی قسمت میں تھا۔ روضۃ الصفا بتاتی ہے کہ "چونکہ اسمٰعیلیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ امام کی عظمت مساوی ہے خواہ وہ ایک لڑکا ہو یا ایک نوجوان شخص ہو یا ایک بوڑھا ہو اور یہ کہ جو احکامات بھی وہ دیتا ہے وہ "سچائی" کے مطابق ہوں گے۔ اس لیے کسی کو اس پر تنقید کا یا اس کی نافرمانی کا حق نہیں۔ لہٰذا جو کچھ علاؤالدین کہتا اسے من جانب اللہ سمجھا جاتا اور اس کی کامل اعتقاد کے ساتھ پیروی کی جاتی۔ پانچ سال حکومت کرنے کے بعد اس نے کسی طبیب کے مشورہ کے بغیر ایک رگ کھلوالی اور کافی مقدار میں خون ضائع ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں اسے مالیخولیا یا کوئی اعصابی مرض ہو گیا لہٰذا علاؤالدین ایک ایسا شخص بن گیا جو "محض بیڑیوں اور زنجیروں میں رکھے جانے کے لائق" ہو۔ لیکن ایک امام کو معزول نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا علاؤالدین کی دیوانگی کی حکومت نے مکمل طور پر الموت کے نظام حکومت کو تباہ کر دیا۔ اس کے باپ جلال الدین نے بڑی دانشمندی سے چنگیز خاں کی وفاداری قبول کر لی تھی لیکن علاؤالدین نے اپنی جہالت کی وجہ سے منگولوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور منگولوں نے اسے غداری کے مترادف سمجھا۔ 1255ء میں جب علاؤالدین کا پاگل پن حد سے زیادہ بڑھ گیا اور اس کا بیٹا اور وارث دوسرے قلعے میں بھاگ جانے کے متعلق سوچ رہے تھے اس وقت علاؤالدین

کے ایک مقرب، حسن مازندانی نے، جسے اس نے اپنی مسلسل تعذیب سے پاگل بنادیا تھا آدھی رات کو اس کا سر کاٹ لیا۔ (1/دسمبر 1255ء)

رکن الدین خورشاہ نے فوراً منگولوں کے سامنے اپنی اطاعت کی پیشکش کردی لیکن قراقرم کی 1251ء کی قوریلتائی میں یہ فیصلہ کیا جاچکا تھا کہ خورشاہ اور اس کے تمام لوگوں کو قتل کردیا جائے۔ ہلاکو نے اس سے اور اس کے لوگوں سے سلامتی کے جھوٹے وعدے کیے اور ان کی دستبرداری کے بعد مار ڈالا۔ عطاملک جوینی "ان بد عقیدہ لوگوں کے" قتل عام پر اظہار خوشی کرتا ہے اور مسلم راسخ العقیدگی کی اس خدمت کے لیے منگولوں کا شکریہ ادا کرتا ہے[1]۔ اسے اس کی خبر نہ تھی کہ ان ہی کے ہاتھوں جلد ہی اس پر اس کے (مسلم) بھائیوں پر کیا گزرنے والا تھا۔ روضۃ الصفا (کا مصنف) زیادہ محتاط ہے: ایسے مسلمانوں نے جو تاتاریوں کی تلوار سے بچ رہے تھے ہلاکو کے اس کام کا ممنوعیت سے اعتراف کیا ہے[2]"۔

---

(1) جوینی۔ بوائل کا ترجمہ، جلد دوم، ص 25-724

(2) فارسی متن، جلد چہارم، ص 85

3

چنگیز خان کا عروج

(STEPPE) دشتی[1] سماج

زمانہ قدیم اور عہد وسطیٰ کی تاریخ میں ایک صورت حال جو برابر رونما ہوتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ سیر دریا کے مشرق سے لے کر چین کے شمال تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے میں آباد فاتح خانہ بدوش قبائل مغرب کی سمت بڑھتے رہے ہیں۔ ایسی تمام (قبائلی) نقل و حرکت نے ہمیشہ فاتحانہ صورت اختیار نہ کی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر کو مشرق کے آرام پسند شہروں میں بسنے والے لوگوں نے دبا دیا اور ضم کر لیا۔ لیکن اس طرح کی نقل و حرکت کو ہم سفید ہنوں اور سرخ ہنوں سے صدیوں پیشتر شروع ہوتے ہوئے پاتے ہیں اور ان میں سے شدید ترین چنگیزی منگولوں یا مغلوں کا حملہ[2] رہا ہے۔ اور یہی اپنے اثرات میں سب سے زیادہ مخرب اور دیرپا بھی رہا۔

---

(1) STEPPE، لق ودق میدانی علاقہ کو کہتے ہیں، جہاں درخت نہ اگتے ہوں اور جو عموماً جنوب مشرقی یورپ اور ایشیا میں واقع ہیں۔ اس لفظ کا صحیح مفہوم ترجمہ کے ذریعہ ادا کرنا مشکل ہے۔ اس علاقہ کی خصوصیات زراعت کی عدم موجودگی اور خانہ بدوشانہ طرز زندگی ہے۔ اس لحاظ سے اس کو راعیانہ یا خانہ بدوشانہ سماج بھی کہہ سکتے ہیں مگر چونکہ انگریزی میں کتاب اس کے لیے دشت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس لیے ترجمہ میں اسے قایم رکھا گیا ہے۔ مترجم

(2) چنگیز اور اس کے لوگ خود کو "داد ا" کہا کرتے تھے۔ "منگ" کو جس سے منگول بنا ہے، ایک چینی لفظ ہے جس کے معنی بہادر کے ہیں اور جس کی ابتدا تیسری صدی سے شروع ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے اس جم غفیر کو تاتار، ترک، مغل بلکہ چینی بھی کہا ہے۔ یوروپینوں نے انھیں تاتار (یونانی) (لفظ جہنم Tartarus کے نام پر) کے نام سے پکارنے کو ترجیح دیا۔

ترکستان کے شہر صرف سیر دریا کے مشرقی کنارے اور صحرائے تکلمکان کے جنوب میں پائے جاتے تھے۔ اس کے بعد منچوریا کی سرحد تک، جو تین مہینوں کے سفر کی مسافت کا علاقہ تھا، لق دوق میدان اور چٹانی پہاڑیاں اور پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔ تقریباً اس کے وسط میں اور منگول (الوسات یا عسکری قبائل کی سرزمین کے جنوب میں گولی ریگستان ہے۔ بالوؤں کا سمندر (ریگستان) یا خشک شدہ سمندر کی سطح جس کو دشت (STEPPE) کے علاقہ سے واضح طور پر فرق کر لینا ضروری ہے۔ موخرالذکر قایم زمانہ کی برف کے وزن کے نتیجے میں بن گئے ہیں۔

دشتی (علاقے میں رہنے والے) لوگوں کی گزراوقات کے اصل ذرائع مویشیوں کی پرورش، گھوڑوں کی پرورش اور جانوروں اور مچھلیوں کے شکار ہیں۔ زراعت تقریباً غیر معروف تھی، چنگیز خاں کے ابتدائی حالات زندگی کے سلسلے میں ہمارا واحد محفوظ ماخذ، یوان چاؤ۔ پی۔ شی۔، "منگولوں کی خفیہ تاریخ" (سیکرٹ ہسٹری آف دی منگولس) کسی مزروعہ زمین یا کسان کا ذکر نہیں کرتا۔ چونکہ گڈریوں کو صحرا میں صرف کہیں کہیں چراگاہیں مل پاتی تھی لہٰذا انھیں برابر گھومتے رہنا ہوتا تھا۔ وہ اپنے اقسوس (خیموں) کو چھکڑوں پر ڈھوتے رہتے اور عارضی طور پر خیمہ کے گاؤں (اُرتس) کو آباد کرتے رہتے تھے[1]۔ لیکن اچھی چراگاہیں اور میٹھے پانی کی جھیلیں (کول) بھی پائی جاتی تھیں۔ جہاں گڈریوں کا ایک گروہ دشمنوں کو بھگانے کی طاقت رکھتا ہو چرانے کے تنہا حق کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ وہاں کوئی شہر نہ تھا اور شہری زندگی کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مویشی، دشتی سماج کے لیے ان کی بنیادی ضرورتیں۔ دودھ، دہی، گوشت اور ان کے کپڑوں اور خیموں کے لیے چمڑے مہیا

---

(1) اس دشتی سماج، جس طور پر یہ گزشتہ نسل میں موجود تھا، کا ایک عمدہ بیان سکران (Skrine) کی چینی ترکستان میں موجود ہے۔ چینی ترکستان میں تقسیم انگریز قونسل جناب سکرائن کا اندازہ ہے کہ مل کر کام کرنے والی دو عورتیں 45 منٹ میں ایک خیمہ گاڑ سکتی تھیں۔ اور پندرہ منٹوں میں اسے اکھاڑ کر سمیٹ سکتی تھیں۔ ایک پورا خاندان۔ مرد، عورتیں اور مویشی۔ ایک خیمہ میں رہتا تھا جس کے اوپری سرے میں دھواں نکلنے کے لیے ایک کھلا ہوا حصہ ہوتا تھا۔ سماجی رائے اس بات کی متقاضی تھی کہ کوئی نوجوان اس وقت تک شادی نہیں کر سکتا تھا جب تک اس کے پاس اس کا اپنا خیمہ نہ ہو جائے۔ ایک خیمہ۔ جانوروں کی کھال کا بنا ہوا ایک گول ڈھانچہ۔ کی قیمت تقریباً تین انگریزی پونڈ ہوتی تھی۔

کرتے تھے۔ جب انھیں ضرورت مجبور کر دیتی تو وہ اپنے گھوڑے یا اونٹ کی ایک رگ کو کاٹ دیتے اس جگہ پر اپنے منہ کو لگا کر تازہ خون چوس لیتے اس کے بعد اس شگاف کو جو انھوں نے بنایا تھا، بند کر دیتے۔

مسلمانوں کا روشن خیال طبقہ، جو جسمانی پاکی کو اپنے مذہب کا ایک حصہ تصور کرتا تھا، ان خانہ بدوشوں کو، بحیثیت ایک قوم کے، ناقابل برداشت حد تک گندہ اور نہایت نفرت انگیز سمجھتا تھا۔ ہندستان کے بعض پسماندہ قبائل کے مانند وہ تمام جانوروں۔ چوہے، چیوہیا، نیولا اور اسی قسم کے جانوروں کو کھاتے تھے۔ حلال اور حرام گوشت کے درمیان فرق سے وہ ناواقف تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ بعض علاقوں میں موسم گرما میں سخت گرمی ہوتی ہے، غسل کا رواج تقریباً غیر معروف تھا۔ گرمیوں کے زمانے میں ایک چشمہ میں غسل کرنے یا کپڑوں کو دھونے کی سزا موت ہوتی تھی۔ مرد اور عورتیں سبھی سخت بدبو سے مہکتے۔ ان کے میلے کپڑے جوؤں سے بھرے ہوتے اور وہ مستقل اپنے جسموں کو کھجاتے رہتے۔ ان میں سے بیشتر اپنے سروں کے بالوں کو مونڈ دینا پسند کرتے، اپنی غیر تشفی بخش اور غیر متنوع غذا کی وجہ سے ان کے جسم کا وزن اور اعصابی قوت سکونت پذیر لوگوں کے مانند نہ ہوتی ان کی بچی کھچی تصویریں ڈبلے پتلے بازو، پتلی کمر، چھدری داڑھیوں اور سخت چہروں کی نمائش کرتی ہیں۔

دشتی سماجوں میں سے کسی کے پاس تحریر کے لیے الیغور کے علاوہ کوئی رسم الخط نہ تھا اور چنگیز خاں نے، جو نہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا اور نہ منگولی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان بول سکتا تھا، اپنے سرداروں کے بیٹے کے لیے اس بات کا انتظام کیا کہ انھیں الیغور رسم الخط میں منگولی زبان لکھنا سکھایا جائے۔ صحرائی سماج اکائیوں یا الوسوں میں منقسم تھا۔ یہ الوس عسکری نوعیت کے تھے۔ صرف سرداروں ہی کا سلسلہ نسب ضروری سمجھا جاتا تھا یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تابعین کا سلسلہ نسب ان کے سرداروں جیسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ معمولی گدڑیے جنگوں کے نتائج کے مطابق ایک سردار کے الوس سے دوسرے کے یہاں منتقل کر دیے جاتے۔ گوبی کے ریگستان کے شمال میں دادادلوس (یا اصل منگول) مقیم تھے جن کے سردار اپنی نسل پہلے خاقان (قاآن یا شہنشاہ) توبیلائی سے جوڑتے تھے۔ منگولوں کے مشرق میں تاتار رہتے تھے اور تاتاروں کے مشرق میں

منچو لوگ رہتے تھے۔ چنگیز کا اصل زمانہ ان صحرائی قوموں کو ایک ایسی واحد تنظیم میں متحد کرنا تھا جو ایک مرکزی طاقت کے حکم پر چلے۔

ابتدائی سماج کے کردار۔ ان کے پجاری بادشاہوں، محرمات، اصنام، دیومالاؤں وغیرہ کا گزشتہ تین پشتوں میں بڑی احتیاط سے مطالعہ کیا گیا۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ صحرائی سماج، ناموافق اور سخت حالات کے باوجود، کسی بھی معنی میں غیر مہذب یا غیر ترقی یافتہ نہ تھا۔ یہ بات اور بھی صاف ہو جائے گی اگر ہم اس کی ذہنی و عقلی ترقی کو عسکری علم اور مذہب کی روشنی میں دیکھیں۔

وسائل زندگی کے لیے مستقل جدوجہد۔ قدرت کے خلاف جدوجہد جو ضروریات زندگی نہایت قلیل مقدار میں مہیا کرتی تھی، اور پاس پڑوس کے اولوسات کے خلاف کشمکش جو ان مختصر وسائل کو بھی اڑا لے جانے کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے، نے صدیوں کے تجربات کے دوران یہ بات سکھا دی تھی کہ وہ خود اعتمادی پیدا کریں اور قوی اور خود کفیل بنیں۔ وہ زبردست قوت برداشت، تکلیف جھیلنے اور اذیت دینے کی غیر معمولی صلاحیت اور گرمی و سردی، بھوک و پیاس سہہ لینے کی تقریباً ناقابلِ یقین طاقت کے حامل تھے۔ یہ بات مشکوک ہے کہ آیا کسی اور انسانی گروہ نے اس سلسلہ میں ان کی ہمسری کی ہو۔ مزید براں صدیوں تک مستقل جنگوں نے (ان میں) ایسی مخصوص صلاحیتیں پیدا کر دی تھیں جو عہد وسطیٰ کے عسکری علم کی بنیاد تھی۔ بہترین گھوڑ سواری، تیز رفتاری فوجی پیش قدمی اور جوابی پیش قدمی، اچانک حملوں کی منصوبہ بندی، راتوں میں ستاروں کا مطالعہ، پاؤں کے نشانوں کے ذریعے (دشمنوں کا) تعاقب، مخبری اور جنگوں میں تعاون، جو عسکری نظم و انضباط کی بنیاد ہے اور سب سے بڑھ کر خود کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال سکنے، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے نئے ذرائع دریافت کرنے اور دشمن سے ہر ممکن سبق سیکھ لینے، کی فطری صلاحیت۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ کس طرح منگول جنرلوں نے، جو اپنی قدیم صحرائی جنگوں کے علاوہ دوسری قسم کے جنگی طریقوں سے بالکل ناواقف تھے، بڑے بڑے قلعہ بند شہروں اور پہاڑی قلعوں کو، جو انھوں نے خواب و خیال میں بھی نہ دیکھے تھے، تسخیر کرنے کے لیے مروجہ عسکری مشینوں اور دشمنوں سے سیکھے ہوئے

طریقوں کو زیادہ موثر طور پر کام میں لا کر نئے اور غیر متوقع طریقوں سے قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن یہ کامیابیاں ممکن نہ ہوتیں اگر صدیوں سے جاری صحرائی "خانہ جنگیوں" نے سپاہیوں اور گھوڑسواروں میں یہ صلاحیت نہ پیدا کر دی ہوتی کہ وہ ان کاموں کو صحیح طور پر انجام دیں جو ان کے سپرد کیے گئے ہوں، صحرائی سماج میں ہر شخص ایک پیشہ ور سپاہی ہوتا تھا۔

دستاویزات کی مکمل ناموجودگی کی بنا پر اس بات کا اندازہ بھی ناممکن ہے کہ منگولوں کا مذہب کن ادوار سے گزرا۔ لیکن چنگیز خان کے عہد میں ہم جس آخری شکل میں اسے پاتے ہیں وہ صاف اور واضح ہے منگول کسی مقدس صحیفہ کے حامل نہ تھے۔ ان کے دیوتا اور دیویاں نہ تھیں اور نہ دیومالائی قصے اور کہانیاں۔ علاوہ ازیں ان کے پاس نہ کوئی بت نہ مخصوص خیمے یا مندر، نہ پجاری نہ پاک و مقدس مقامات اور نہ زیارت گاہیں ہی تھیں۔ وہ تمام مذہبی رسوم و رواج اور منگول اخلاقی قانون کے ماسوا مذہبی احکامات و ممنوعات ان کے لیے اجنبی تھے۔ وہ سادہ لوحی اور اخلاص کے ساتھ ایک خدا پر یقین رکھتے جسے وہ تنگیری یا اِل تنگیری (یعنی آسمان یا خلا) کے نام سے موسوم کرتے جو مادی کائنات اور اخلاقی نظام دونوں ہی کی قایم مقامی کرتا۔ لیکن ان کے یہاں عبادت کی کوئی متعین شکل نہ تھی۔ اگر کوئی شخص اِل تنگیری کی عبادت کرنا چاہتا تو وہ سورج کے سامنے یا اگر سورج غروب ہو گیا ہو تو پچھم کی جانب گھٹنے ٹیک دیتا۔ زمین پر شراب یا پانی چھڑکتا اور ان الفاظ میں جو ان کے ذہن میں آجاتے عبادت کرتا۔ اجتماعی عبادت بالکل غیر معروف تھی۔

صحرائی سماج غیر سائنسی مذہبی ممانعات کی قیود میں نہ تھا۔ دو صحرائی گردہ نایمان اور کریئت عیسائی تھے لیکن چند علاقوں مثلاً ناقوس کے استعمال کے علاوہ وہ کسی بھی شکل میں اپنے پڑوسیوں سے مختلف نہ تھے۔ مہملات سے مبرا خالص توحید منگول مذہب کی روح تھی۔ صحرائی (لوگوں کے) دماغ کے لیے کسی قسم کی مذہبی مناقشت بالکل ایک اجنبی چیز تھی۔ تمام مذاہب کے ساتھ وہ مکمل رواداری رکھتا اور اس نے مذہبی تبلیغ کی مکمل اجازت دے رکھی تھی۔ مسلمان جن کا چنگیز نے اتنی بڑی تعداد میں قتل و خون کیا تھا "اپنے" خدا پر اس کے ایمان اور مذہبی معاملات میں اس کی رواداری

پر حیرت زدہ تھے۔ صحرائی سماج کے سربراہ، گو خود اپنے پجاری نہیں رکھتے تھے، لیکن دوسرے تمام مذاہب۔ مسلم، عیسائی، تاؤن اور بدھ کے پجاریوں کے ساتھ حیرت انگیز رواداری کا سلوک رکھتے۔ انھیں ٹیکسوں سے بری کر دیا جاتا تھا اور ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے طریقہ کے مطابق منگولوں کی کامیابی کے لیے خدا کی عبادت کریں اور آخری بات یہ کہ منگولوں کو مختلف خاندانوں اور قوموں کے درمیان شادی بیاہ پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ یہی نہیں خود چنگیز نے اپنی ایک لڑکی ایک مسلم سردار کیالیق کے ارسلاں خاں کی زوجیت میں دی تھی۔

ابتدائی روایات، یسوگائی بہادر تک

1228 عیسوی میں ایک منگول افسر نے منگولوں (دادا) کی روایات کے متعلق اور اولوسوں کی جنگوں کے متعلق، جن کی وجہ سے چنگیز خاں کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوا، ایک چھوٹی کتاب لکھوائی۔ یہ کتاب چینی ترجمہ میں ایک چینی نام۔ یوان۔ چاؤ۔ پی۔ شی[1]۔ کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے مصنف کے جغرافیائی حوالوں کی چھان بین کی گئی ہے اور انھیں درست پایا گیا ہے۔ کتاب میں محض چند تاریخیں مذکور ہیں۔ واقعات، جیسا کہ ایک لکھائی گئی تحریر میں اغلب ہے، ہمیشہ صحیح و درست تسلسل میں نہیں ہیں لیکن کتاب کے وہ اجزا جن کی ہم جانچ کر سکتے ہیں اتنے صحیح و درست ہیں کہ ہم تصنیف کے باقی غیر داستانی حصہ پر بلا خوف و خطر اعتماد کر سکتے ہیں۔ اسی تصنیف کا التون

---

(1) پروفیسر ڈاکٹر وائی کوائی سن (Wei kwai sun) نے انگریزی میں ترجمہ کیا اور شعبہ فارسی معلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس کو شائع کیا۔ یوروپ میں بھی، مسلم ایشیا کے ان علاقوں کی طرح جہاں منگول نہ پہنچ سکے تھے، منگولوں کے خلاف نفرت کا آزادی سے اظہار کیا گیا۔ لیکن بعد میں چنگیز اور تیمور کے مسلم اخلاف نے عجم کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا اور ان کے سرکاری مورخین سے چنگیز اور اس کے اسلاف کی مدح سرائی کا مطالبہ کیا گیا یوروپ میں چنگیز خاں ملٹن کے الفاظ میں ”Combuscan bold“۔ رومان کی ایک تمثیل بن گیا اور سر ہنری ہورتھ کی ”منگولوں کی تاریخ“ جیسی تصانیف میں بھی اس کی پوزیشن وہی رہی۔ ہارولڈ لیمب کی ”چنگیز خاں اور بربروں کے حملے“ کا تو ذکر ہی کیا۔ ڈاکٹر وائی نے پہلی بار منگولوں کو صحیح تاریخی پس منظر میں پیش کیا۔ میں نہایت خوشی کے ساتھ اپنے چینی شاگرد کے زبردست احساس کا معترف ہوں۔ خوش قسمتی سے ایک چینی محقق ان تصورات سے آزاد ہوتا ہے جو بسا اوقات سامی مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی غلط رہنمائی کرتے ہیں۔

دفتر (گولڈن بک) نامی فارسی ترجمہ رشید الدین (جامع التواریخ کے مصنف) کے ہاتھ لگا اور بعد کے فارسی مصنفین (ابوالفضل اور دیگر لوگوں) نے اس کے اس داستانی حصہ کو، جو تاریخی لحاظ سے ناقابل قبول ہے، زیادہ بڑھا چڑھا کر بالکل بھیانک اور بعید از قیاس بنادیا ہے۔

یو آن۔ چاؤ۔ پی۔ شی۔ (منگولوں کی خفیہ تاریخ) بیان کرتی ہے کہ "دادا" لوگ آسمان سے نازل کردہ خاک بھیڑیے اور ایک سفیدی مائل ہرنی" کے خلاف تھے جو دریائے اونان کے سرچشمہ پر واقع کوہ برخان کے دامن میں بس گئے اور جن کے یہاں بتاچی خاں نامی ایک انسانی بچہ پیدا ہوا۔ دوبان میرگان، جو بتاچی کی نسل میں گیارہواں تھا، کی بیوی الان گوا تھی جس نے دو بیٹے اس کی زندگی میں اور تین بیٹوں کو اس کی موت کے بعد جنم دیا۔ اس نے اپنے جائز بیٹوں کو، جنھوں نے خاندانی ملازم کے ساتھ زناکاری کا الزام لگایا تھا، بتایا کہ "تم نہیں جانتے کہ ہر رات ایک سنہرے رنگ کا آدمی میری روشن کھڑکی سے داخل ہوتا ہے اور میرے سینے سے لگ جاتا ہے جس کے اندر اس کی روشنی داخل ہو جاتی ہے۔...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے بقیہ تین بیٹے خدائی بچے ہیں"۔ یہ کہانی بظاہر عیسائیت کے زیر اثر گڑھی گئی تھی۔ بعض مسلم مصنفین الان گوا کو ابتدائی عباسیوں کی ہم عصری بتاتے ہیں۔

الاق گوا کے اخلاف کا فروغ ہوا اور ان کی نسلیں بڑھیں۔ لیکن جہاں تک خفیہ تاریخ کے مصنف کی واقفیت کا تعلق ہے اس کے مطابق چنگیز کا پرداد قوبلائی خاقان (یا قاآن) پورے "داد،" لوگوں کا پہلا حکمراں تھا۔ اس کا جانشین انہبائی، جو اس کے سات بیٹوں میں شامل نہ تھا، تاتاروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور کِن شہنشاہ کے حوالے کر دیا گیا۔ کِن ایک تاتاری خاندان تھا جو 1114ء سے شمالی چین پر حکمرانی کرتا آرہا تھا اور جس نے رفتہ رفتہ چینی طریقۂ زندگی کو اپنا لیا تھا چونکہ "کِن" کے معنی "سونا" کے ہوتے ہیں لہٰذا کِن شہنشاہ کو فارسی مورخین "التون خاں" لکھتے ہیں۔ انہبائی نے اپنے رشتہ داروں کے پاس ایک پیغام بھیجا کہ [illegible] اس کا انتقام لیں۔ انھوں نے تاتاروں کے ساتھ تیرہ جنگیں لڑیں لیکن نتیجہ غیر فیصلہ کن رہا۔ ان جنگوں کے دوران 1163ء میں چنگیز کی

پیدائش ہوئی[1]۔ اس کے ہاتھوں میں خون کا ایک تھکا تھا اور ایک تاتار جسے اس کے باپ نے گرفتار کر رکھا تھا، کے نام پر اس کا نام تیموچین رکھا گیا۔

تیموچین کا باپ یسوگائی بہادر قوبلائی بہادر کے دوسرے بیٹے برتان بہادر کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنے دو بھائیوں کی مدد سے ییک چیرادو نامی ایک مرکت کی بیوی اویلون کو گرفتار کر لیا تھا لیکن وہ اس کے شوہر کو گرفتار کرنے اور مار ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اگرچہ ان لوگوں نے اس کا تعاقب سات پہاڑوں پر کیا۔ لہٰذا یہ شادی مکمل طور پر جائز نہ تھی کیونکہ منگول قانون اس طرح کی شادی کو اس وقت تک جائز قرار نہیں دیتا جب تک کہ گزشتہ شوہر کو قتل نہ کر دیا گیا ہو۔ لیکن منگول ان معاملات میں بہت کٹر نہ تھے۔ اویلون جو اپنے پہلے شوہر کو بہت چاہتی تھی یسوگائی کی بھی ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی اس نے اس کے چار بیٹوں۔ تیموچین، خسر، قاچیون اور تموگا (اوتکین) کو اور ایک بیٹی تیمولون کو جنم دیا۔ ان کے علاوہ یسوگائی کی دوسری بیوی سے بیکتور اور بیلکتائی دو بیٹے تھے۔ جب تیموچین نو سال کا تھا تو یسوگائی نے انگیر اکلاں کے دائی سچنہ کی لڑکی بورتہ کے ساتھ اس کی شادی کا عہد کیا اور اسے اس کے مستقبل کے سسر کے گھر چھوڑ دیا۔ گھر لوٹتے وقت یسوگائی کو کھانے میں زہر دے دیا گیا اور وہ اس کے بعد جلد ہی انتقال کر گیا۔

ابتدائی کشمکشیں۔ تائچوت اور مرکٹس

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یسوگائی نے پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد اکٹھا کر لی تھی لیکن ایک اہم اصل شاخ تائچوت ان تمام کو بھگا لے گئی۔ انھوں نے کہا کہ ”گہرا پانی ختم

---

(1) چنگیز کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف رہا ہے۔ ترک اور چینی اپنے سالوں کو بارہ کے ادوار میں منقسم کرتے تھے اور ہر سال ایک جانور کے نام پر موسوم ہوتا تھا۔ روضۃ الصفا بتاتی ہے کہ چنگیز نے دور کے اسی سال انتقال کیا جس سال اس کی پیدائش ہوئی تھی یعنی وہ ایک ایسی عمر تک زندہ رہا جو بارہ کا حاصل ضرب ہے۔ طبقات ناصری بتاتی ہے کہ اس کی عمر 55 سال کی تھی جب اس نے خراسان پر حملہ کیا تھا۔ رمضان 624ء (اگست - ستمبر 1227ء) میں چنگیز کا انتقال ایک عالمی واقعہ تھا۔ مذکورہ بالا دونوں شرطیں اس حالت میں پوری ہو جاتی ہیں جب ہم اس کا سن پیدائش 1163ء مان لیں۔ اسے 1155ء تسلیم کرنے میں شاید ہورتھ نے غلطی کی ہے۔ بارتھولڈ کا یہ بیان کہ چنگیز کا انتقال 72 سال کی عمر میں ہوا تھا (ترکستان 459 طبقات ناصری سے مطابقت نہیں رکھتا۔

ہو گیا اور پتھر ٹوٹ گیا" اس طرح تیموچین کو اپنی ماں کے خیمہ میں لوٹ کر معلوم ہوا کہ خاندان کو روزانہ کی محنت سے اپنی روزانہ کی خوراک حاصل کرنا پڑتی ہے۔ خفیہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ "تاپچوتوں نے جب اس طرح بے سہارا چھوڑ دیا تو تیموچین کی لائق اور مستقل مزاج ماں نے اپنے بیٹوں کا پیٹ بھرنے کی خاطر پھلوں کے درخت کے چننے اور اکھاڑنے کا سہارا لیا اور اس کے بیٹوں نے جوان کٹھن اور سخت حالات میں جوان ہوئے تھے۔ شہزادوں جیسی صفتیں آشکارا کیں۔ اویلون کے بیٹے اگرچہ انھوں نے سادہ سبزیوں کی غذا پر پرورش پائی تھی، کسی جارج کے مقابلہ کے لیے کافی سخت جان ثابت ہوئے" لیکن ان حالات میں بھی تیموچین اور خسر نے بیکتور سے جھگڑا مول لے لیا اور اسے مار ڈالا اویلون نے اپنے آوارہ بیٹوں کو بہت ساری بد دعائیں دیں لیکن وہ اس بات کا اندازہ بھی نہ کر سکتی تھی کہ اس نے دنیا کے عظیم ترین قاتل کو جنم دیا تھا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد (پرانے) دشمن پھر نمودار ہوئے۔ تاپچوتوں نے انتقام کے خوف سے اویلون کے خاندان پر حملہ کر دیا لیکن ان کا کہنا تھا کہ اگر تیموچین کو حوالہ کر دیا جائے تو وہ مطمئن ہو جائیں گے۔ چنانچہ تیموچین اپنے گھوڑے پر جنگل کی جانب بھاگ گیا اور وہاں نو دنوں تک تنہا اور بھوکا رہا لیکن جب وہ باہر نکلا تو تاپچوتوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ انھوں نے اس کی گردن میں ایک جوا (گانگ) باندھ دیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اسے ہر روز ایک مختلف خیمہ میں ایک قیدی بنا کر رکھا جائے۔ بہر حال تیموچین ایک رات اپنی گردن میں بندھے ہوئے جوئے سمیت نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے آپ کو دریائے اونان کے ایک اتھلے حصہ میں اپنی ناک کو پانی سے ذرا اوپر رکھ کر چھپا لیا۔ صرف ایک تاپچوت، سورخاں شیرا نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مزید تلاش کو اگلے دن تک ملتوی کر دیں۔ بعد میں تیموچین شیرا کے خیمہ میں آ گیا اور شیرا کے دونوں جوان بیٹوں نے اس کی مدد کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اس کا جوا اُتار دیا اور اسے اپنے چھکڑوں میں اون کے نیچے چھپا دیا۔ دوسرے دن جب تاپچوتوں نے تمام خیموں کی مکمل تلاشی کا فیصلہ کیا تو شیرا بھی انھیں یہ کہہ کر اون سے لدے ہوئے چھکڑے سے دور رکھنے میں کامیاب ہو گیا کہ "ایک اتنے گرم موسم میں کوئی کیوں ان تمام اونوں کے نیچے زندہ رہ سکتا ہے؟" اس

طرح تیمو چین نے دوبارہ آزادی حاصل کر لی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس خاندان کی اقبال مندی و خوش حالی میں کافی اضافہ ہوا۔ گلہریاں اور جنگلی چوہے اب بھی غذا کا ایک ذریعہ تھے لیکن (کسی طرح) نو گھوڑے اس خاندان کے قبضے میں آ گئے تھے اور تیمو چین اس پوزیشن میں تھا کہ وہ بورتہ کو بلا بھیجے اور اس سے شادی کر لے۔ اسی زمانہ میں تیمو چین نے نوجوانوں کے ایک بہترین کیپٹن کی حیثیت سے اپنی شہرت کی دھاک جمالی تھی۔

پھر بھی اُسے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ ایک دن علی الصباح تین مرکٹ گروہوں نے اویلون کے کنبہ پر حملہ کر دیا۔ چونکہ یسوگائی نے ایک مرکت کی بیوی کو گرفتار کر لیا تھا لہٰذا مرکتوں نے اسے اپنا فرض خیال کیا کہ اس کے بدلے میں وہ چنگیز کی بیوی بورتہ کو گرفتار کر لیں۔ خاندان کے دیگر تمام افراد نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے لیکن بورتہ گرفتار ہو گئی۔ اور اسے بیوی کی حیثیت سے طاقتور و توانا سلچار کے حوالے کر دیا گیا۔ کئی سال بعد چنگیز نے اسے دوبارہ حاصل کر لیا مع اس کے لڑکے جوجی کے جس کا باپ سلچار تھا۔ منگولوں کے اخلاقی قانون کے مطابق جوجی چنگیز کا سب سے بڑا لڑکا تھا اور چنگیز نے اسے اسی حیثیت سے قبول کر لیا لیکن بعد میں اس کے جائز ہونے پر اعتراض کیا گیا[1]۔

چنگیز کی جموکھا، وانگ خاں اور نائمانوں سے جدوجہد

اپنے وطن میں تیمو چین کی زندگی کے صرف اہم مراحل ہی کا ذکر اس موقع پر ممکن ہے۔ کیرئس نامی ایک دادا گروہ سیاہ جنگل میں رہتا تھا۔ اس کی وفاداری دو بھائیوں تغرل جو اپنے رشتہ داروں کے قتل کا عادی تھا اور جموکھا جو حد سے زیادہ بوالہوس اور ناقابل بھروسہ تھا، کے درمیان منقسم تھی۔ دونوں ہی بھائی بیس ہزار کی فوج میدان میں اتار سکتے تھے۔ طغرل، یسوگائی بہادر کا ایک قریبی دوست رہ چکا تھا جس نے اسے

☆(1) اس سلسلہ میں جوجی اور چغتائی کے درمیان جھڑپ کے لیے ملاحظہ ہو: منگولوں کی خفیہ تاریخ، ص 67-164 جوجی نے جواز کا دعویٰ نہیں کیا لیکن چغتائی کو لڑنے کا چیلنج دیا چنگیز خاموش رہا۔ بالآخر معاملہ اس بنیاد پر طے ہوا کہ شہزادوں کو اپنے ماں کے احساسات کا خیال کرنا چاہیئے۔

اس مصیبت سے بچایا تھا۔ جب اس پر اس کے چچا غور خاں نے حملہ کر دیا تھا اور اس کے پاس صرف ایک سو آدمی باقی رہ گئے تھے لہٰذا تیموچین باپ کی طرح طغرل کی عزت کرتا تھا۔ تیموچین اور جموکھا اپنے بچپن میں ساتھ ساتھ کھیلے کودے تھے اور ایک دوسرے کو اپنا ہم جولا بھائی یا انداس (Andes) سمجھتے تھے۔ تیموچین کی اپیل پر طغرل اور جموکھا اس کے ساتھ میر کیتوں کے خلاف روانہ ہوئے اور انھیں کچل دیا گیا۔ وہ تین سو میر کیت جنھوں نے چنگیز کے خاندان پر حملہ کیا تھا اور اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی کو بلا استثنا قتل کر دیا گیا۔ ان کی بیویوں کو، اگر وہ شادی کے لائق تھیں تو، (فاتحین) نے اپنی اپنی بیویاں بنالیا۔ اور انھیں جو صرف دائی کی حیثیت سے خدمت کر سکتی تھیں غلام بنالیا گیا۔[1] لیکن جموکھا کے ساتھ تیموچین کی دوستی نے رفتہ رفتہ بد گمانی کی شکل اختیار کرلی اور بدگمانی دشمنی میں بدل گئی۔

تقریباً 1196ء میں طغرل ایک بار پھر مصیبت کا شکار ہو گیا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی یرے کے خان کو مار ڈالنا چاہا اور یرے کے خان نائمانوں کے پاس بھاگ گیا۔ نائمانوں کے سردار نے طغرل کو سیاہ جنگ سے گور خاں کے پاس بھگا دیا لیکن طغرل نے گور خاں کے خلاف بغاوت کر دی اور ایغور اور تنگوت (مشرقی چین) کے علاقے کو (صرف) پانچ بکریوں اور ایک اونٹ کے ساتھ پار کر گیا لیکن چنگیز خاں اس کی مدد کے لیے آیا اور اسے اس کے قدیم اقتدار پر بحال کر دیا۔

1201ء میں جموکھا نے گیارہ قبیلوں کے "خاں" کی حیثیت سے اپنا انتخاب کرا لیا۔ ان قبائل میں نائمان بھی شامل تھے جو داد اگروہ کے رکن نہ تھے اس کے بعد اس نے طغرل اور چنگیز پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے نتیجہ میں جو جنگ ہوئی اس میں جموکھا کو شکست ہو گئی۔ نائمان خود اپنے مقام پر واپس آگئے (اور وہ قبائلی) اتحاد ختم ہو گیا۔ چنگیز نے اگرچہ اسے ایک تیر سے گردن پر سخت زخم لگایا تھا، اس موقع کا فائدہ اٹھا کر تائچوت سرداروں کا استیصال کیا۔

1202ء میں چنگیز اور طغرل نے غالباً کن شہنشاہ کی فوجوں کی مدد سے،

---

(1) خفیہ تاریخ، ص 82، اسی موقع پر بورتہ (چنگیز خاں کو) پھر سے حاصل ہوئی۔

تاتاروں کو شکست دے دی۔ تاتاروں کے ذریعے اپنے باپ کو زہر دیئے جانے کی پاداش میں چنگیز نے ان تمام تاتاروں کو "جن کے قدم چھکڑ کی دھری جتنے اونچے تھے" مار ڈالنے کا اور باقی کو غلام بنا لیے جانے کا حکم دے دیا۔ غالباً یہ وہی موقع تھا جب کہ کن شہنشاہ نے طغرل کو وانگ (شہزادہ) کا خطاب اور چنگیز کو چاؤ کھلی (Chao khuli) (سرحدی علاقے کا کمانڈر) کا خطاب بخشا۔

ان فتوحات کے نتیجہ میں تیموچین 1203ء کے قوریلتائی میں چنگیز خاں (طاقتور حکمراں) کے خطاب کے ساتھ "خان" منتخب ہوا۔ یہ خطاب جموکھا کے اقتدار بالا کے دعویٰ کے لیے ایک قطعی چیلنج تھا۔ ایک دوسری جنگ ناگزیر تھی جس کے لیے طرفین نے تقریباً تیس ہزار سپاہیوں کو اکٹھا کیا لیکن جموکھا کے آدمیوں کو لڑنے کی ہمت نہ تھی اور اس کو پسپا ہونا پڑا۔ (سزا کے طور پر) اس نے اپنے غیر وفادار سرداروں کے سروں کو کھولتے ہوئے پانی کی دیگوں میں ابال دینے کا حکم دیا۔ اب صرف تین موثر طاقتیں۔ چنگیز، وانگ ور نائمان۔ میدان میں باقی رہ گئیں۔ اب جموکھا نے وانگ کے بیٹے سینگن کو چنگیز سے اس بنیاد پر بدظن کرنے کی کوشش کی کہ وانگ کا جانشین چنگیز ہوگا، جسے وانگ نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ تاکہ سینگن وانگ نے چنگیز کے اقرار وفاداری پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وانگ اور چنگیز کے درمیان سہ روزہ جنگ ہوئی جس کے دوران کیرٹ طاقت کا مکمل طور پر شیرازہ بکھر گیا۔ چنگیز نے مفتوحہ لوگوں کو اپنے پیروکاروں میں تقسیم کر دیا۔ وانگ خاں ایک نائمان سپاہی کے ہاتھوں مارا گیا اور سینگن کو خود اس کے ایک پیروکار نے مار ڈالا۔ جموکھا نائمان کے پاس بھاگ گیا۔

نائمان کے حکمراں انانچہ بلگا نے یہ دیکھ کر اس کا بیٹا تایانگ ایک کمزور و نااہل ہے حکم کر دیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد انتظام حکومت اس کی بیوی گوربیسو کے سپرد ہوگی۔ لیکن چنگیز کی طاقت کو بڑھتے ہوئے دیکھ تایانگ نے اس سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے چنگیز کو یہ پیغام بھیجا کہ "میں تمہاری کمانوں اور تیروں کو چھیننے آرہا ہوں۔" نائمانوں کی کثیر تعداد کے باوجود چنگیز نے فوراً چیلنج قبول کر لیا اور کیرولین دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ تایانگ اور اس کے سپاہیوں نے ایک پہاڑ پر پسپا ہو کر پناہ کی تلاش کی لیکن

انھیں گھیر لیا گیا اور اسلحہ رکھ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ تایانگ گرفتار ہو گیا مگر اس کا بیٹا کشلوق بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ گوربیسو کو چنگیز خان کے ساتھ شادی کرنی پڑی۔ وہ "دادا" اولوس جو اب تک جموکھا کی پیروی کرتے آئے تھے اب بالآخر چنگیز سے آملے۔ جموکھا اب صرف پانچ ساتھیوں کے ساتھ رہ گیا جو اسے چنگیز کے پاس لے آئے جنھیں جموکھا کی درخواست پر اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ آخر میں جموکھا نے اپنے لیے ایک باعزت موت کا مطالبہ کیا۔ ایک ایسی موت جو خون بہائے بغیر ہو۔ اس کا پیغام تھا کہ "اے میرے انداال تنگیری نے ہمیشہ تمھیں ترجیح دی ہے۔ تم ایک ایسا رحمدلانہ حکم دو جو میرے وجود کا فوراً خاتمہ کر دے تاکہ تمہارے دل کو سکون میسر آسکے" چنگیز رضامند نہ تھا لیکن اس نے یہ بات مان لی" اس نے جموکھا کو اسی جگہ اور اسی طریقہ پر قتل کر دینے کا حکم دیا اور تجہیز و تکفین کی ایک شاندار رسم منا کر اس کو عزت بخشی۔"

چنگیز بحیثیت خان، فوجی تنظیم پر کن کا حملہ

1206ء میں چنگیز کو دوسری بار قوریلتائی روم نے تخت نشین کیا لیکن اس مرتبہ وہ قوبلائی خاقان کی طرح صرف "دادا" لوگوں کا لیڈر ہی نہیں تھا بلکہ شہنشاہ (Huangdi) تھا۔ "پورے صحرائی سماج کا شہنشاہ" اس مرحلے میں اس نے کسی مسلم یا چینی سرزمین کا دعویٰ نہ کیا لیکن پورے صحرا پر فرمانروائی کا دعویٰ۔ اور اگر فرمانروائی قبول نہ ہو تو براہ راست انتظامیہ - نئی تخت نشینی میں مضمر تھا۔ تمام صحرائی سرداروں سے توقع کی گئی تھی کہ وہ اپنی اپنی پسند کا انتخاب کر لیں، سبتیائی کو مرکیرت کے خلاف بھیجا گیا جو اب بھی دریائے ارتش کے کنارے پر موجود ہے۔ دوسرے جنرل جیسے نویان کو کشلوق کے تعاقب میں بھیجا گیا۔

اگر ہم خفیہ تاریخ پر اعتماد کریں تو یہ وہی وقت تھا جب کہ چنگیز خاں نے اپنی زبردست فوج کی تنظیم کی طرف توجہ دی۔ اس کی بنیاد لازمی عسکری ملازمت تھی۔ تمام لوگوں سے جو لڑنے کے قابل تھے فوجی خدمت کا مطالبہ کیا گیا اور انھیں دس دس کی اکائیوں میں منظم کیا گیا۔ دس دس کی یہ جماعتیں سو سو کی جماعتوں میں اور سو سو کی

جماعتیں ایک ہزار کی جماعتوں میں ضم کر دی گئیں۔ اس زمانہ میں چنگیز کے پاس ایک ہزار جماعت کے 95 کمانڈر تھے۔ انھیں میسرہ میمنہ اور قلب لشکر کے اعلیٰ تر کمانڈروں کے ماتحتی میں رکھا جاتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک تیس ہزار آدمی اپنی ماتحتی میں رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں مخصوص طور پر بھرتی کیے گئے دس ہزار شاہی باڈی گارڈ جو "مرکزی فوج" کے نام سے موسوم تھے، شامل تھے لیکن اس کا مخصوص کام خان کی حفاظت تھی اور یہ صرف اس مہم میں حصہ لیتی تھی جس میں وہ خود شامل ہو۔ صرف چند افسروں کو اس بات کی اجازت حاصل تھی کہ وہ اپنے رشتہ داروں اور قبیلہ کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کر سکتے ہیں ورنہ چنگیز تو محض عسکری ملاحظات پر نظر رکھتا تھا۔ اس نے ان سرداروں کو قتل کرڈالا تھا جنھوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ (اس لیے) یہ بات فرض کر لینا چاہیے کہ جو لوگ بچ رہے تھے انھیں معاف کر دیا گیا تھا۔ پرانی اولوس پر مبنی تنظیم اب ختم ہو چکی تھی۔ "دادا" لوگ مرکیت اور کریت سب ہی اب دس، سو یا ہزار کی بنیادی اکائیوں میں شامل تھے۔ اعلیٰ عہدے صرف خان خاندان کے افراد کو دیے جاتے بشرطیکہ وہ مطلوبہ معیار پر اترتے۔ ان کے بعد ان افسران کا نمبر آتا جنھیں اپنی قوت کارکردگی اور وفاداری کی بنیاد پر چنگیز کا اعتماد حاصل تھا۔ اسے بڑی بڑی مہمیں سر کرنی تھیں اس لیے اگر وہ جانبداری اور رشتہ داروں کے ساتھ بیجا رعایت برتتا تو تباہی یقینی تھی۔ سپاہیوں کے مطلوبہ گھوڑوں اور اسلحہ جاتوں (کے معیار) کا تعین بہت سوچ سمجھ کر کیا جاتا۔ کسی بھی ناممکن چیز کا مطالبہ نہیں کیا جاتا لیکن وہ چیزیں جو ضروری تھی انھیں تیار رکھا جاتا۔ جب احکامات جاری کیے جاتے تو ہر سپاہی سے اس بات کی توقع کی جاتی کہ وہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اپنے یونٹ میں شامل ہو جائے گا۔ جب مرد فوجی خدمت میں ہوتے تو ان کے تمام کاموں کو عورتوں کو انجام دینا پڑتا تاکہ ٹیکسوں کی ٹھیک ٹھیک وصولیابی کی جاسکے اور سماج کے غیر فوجی کاموں میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ پڑے۔

اتنی زیادہ منظم اور اتنی زیادہ بے رحم کسی فوج نے اس کرہ زمین پر قدم نہ رکھا۔ چنگیز خاں کے قریبی سرداروں نے بہت جلد انقلاب کی اہمیت سمجھ لی۔ تین ترکستانی حکمراں۔ ایغور کا ید یقوت (حکمراں)، بردجوت، کیالیق کا ارسلاں خاں جو ایک مسلمان

تھا، اور المالیغ کا حکمراں اوزار-1209ء یا 1210ء میں چنگیز کو اپنا حلف وفاداری پیش کرنے کی خاطر آئے۔ ان میں سے ہر ایک کی زوجیت میں خود چنگیز کے خاندان سے ایک ایک شہزادی عطا کی گئی۔

ان دنوں چین تین مملکتوں میں منقسم تھا۔ شمال کی کِن بادشاہت کا تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ جنوبی چینی خاندان سُنگ (1279-960ء) خالص چینی تھا لیکن یہ بہت سی لازمی اور اندرونی کمزوریوں کا حامل تھا۔ فوجوں کی تعداد دو لاکھ سے بڑھا کر ساڑھے بارہ لاکھ کر دی گئی تھی۔ ڈاکٹر وی کا خیال ہے کہ "سپاہیوں کی تعداد جتنی زیادہ تھی اتنے ہی زیادہ وہ ناکارہ ثابت ہوئے۔ خانہ بدوشوں میں سے کچھ رضاکار گروہوں، مہاجرین اور قحط زدہ علاقوں کے (سے بھاگے) تندرست لوگوں پر (یہ) فوج مشتمل تھی"۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ غیر فوجی اخراجات میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان گزیٹیڈ افسران کی تعداد جو مقابلہ کے امتحانات کے ذریعے بحال کیے جاتے، دوگنا سے زیادہ ہو گئی تھی اور اگرچہ کہ ٹیکس چھ گنا بڑھ گئے تھے لیکن بجٹ غیر متوازن ہی رہا۔ مغربی چین اور مرکزی ایشیا کے ٹھیک قلب میں Si-hsia (جسے مسلمان تنگوت کے نام سے پکارتے تھے) کی بادشاہت کی بنیاد 976 عیسوی میں ہی ڈالی جا چکی تھی۔ یہ تینوں بادشاہوں میں سب سے زیادہ کمزور اور کِن کی مانند اپنی اصل میں خانہ بدوش تھی۔

1209ء میں نئے نئے تخت نشین کِن حکمراں چھانگ ہائی کے ذریعے خراج کے مطالبہ کے جواب میں چنگیز نے اپنے افسروں کو مخاطب کیا، ال تنگیری سے دعا کی اور ایک مسلمان جعفر خور شاہ (خواجہ) کو اس تلخ اور ترش پیغام کے ساتھ بھیجا کہ "کِن جنگ یا امن جسے وہ چاہیں ترجیح دے سکتے ہیں لیکن چنگیز ایک ماتحت نہیں بن سکتا"۔ اس کے بعد وہ اپنی فوج کے ساتھ دریائے کیسرولین سے روانہ ہوا۔ حملہ بڑا کامیاب رہا۔ yellow دریا کے شمال کا پورا چین تاخت و تاراج کر دیا گیا اور تقریباً 90 خوشحال شہروں کو تباہ کر دیا گیا۔ اس مرحلہ میں مملکت کا کوئی اضافہ نہ ہوا لیکن شمالی چین پر دو حملوں کے بعد منگول فوج مالِ غنیمت سے مالا مال ہو کر لوٹی۔ اب چنگیز خاں دولت میں کسی بھی دیگر حکمراں سے کم نہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل یہ حقیقت تھی کہ

اور اس کے افسران شہری لوگوں کے فن حرب سے واقف ہو گئے۔ چینی کاریگر جنھوں نے ان کے لیے منجنقین بنائی تھیں بڑی تعداد میں منگولیہ لائے گئے۔ شاید ایسے دس ہزار خاندان ہوں۔ نفتھایا بارود کی ایک بڑی مقدار بھی حاصل کی گئی تھی۔ منضبط منگول فوج نے بڑے بڑے شہروں کو مفلوج کر دینے اور ناقابل تسخیر قلعوں کو تسخیر کر دینے کا راز بھی سیکھ لیا تھا۔ مغرب کے نیم خوابیدہ مسلمانوں پر اب اس بات کا مطلب ظاہر ہونے والا تھا۔

4

عجم پر منگول حملہ

مسلم تاجرین صدیوں پہلے منگولیہ میں داخل ہو چکے تھے لیکن ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ منگول انھیں تبادلہ میں بہت کم چیزیں دے سکتے تھے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کا ایک چھوٹا گروہ چنگیز کی ابتدائی زندگی سے ہی اس کی ملازمت میں تھا لیکن اس وقت حالات یکسر بدل گئے جب منگول مال غنیمت سے لدے ہوئے چین سے لوٹے۔ سب سے پہلے تین مسلم تاجرین قیمتی کپڑوں، ساتھ ہی معمولی سوتی کپڑوں کے ساتھ چنگیز کے پاس آئے۔ چنگیز نے جو کچھ ان کے پاس تھا سب خرید لیا اور اس کے بعد اس نے اپنے شہزادوں اور افسروں کو حکم دیا کہ وہ اس کے اپنے مسلمان تجار کے لیے ضروری سرمایہ فراہم کریں تاکہ ان لوگوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہو وہ مسلمانوں کی سرزمینوں سے حاصل کر سکیں۔ اس نے ان لوگوں کے ساتھ شاہ خوارزم کے پاس یہ پیغام بھی بھیجا کہ چونکہ اب وہ لوگ پڑوسی ہو گئے ہیں لہٰذا ان لوگوں کے درمیان امن قایم رہے اور تاجرین کی آزادانہ آمدورفت ہونی چاہیے۔ لیکن جب یہ مسلم تاجرین جن کی تعداد 450 تھی سیر دریا کے کنارے اُترا (otrar) پہنچے تو اس مقام کے گورنر اینالجق نے، جو غایر خاں کے خطاب کا حامل تھا اور خوارزم شاہ کی ماں ترکان خاتون کا ایک نہایت قریبی رشتہ دار تھا، انھیں اس بنیاد پر گرفتار کر لیا کہ وہ لوگ جاسوس ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی برہمی کا باعث ایک ہندستانی تاجر کا رویہ رہا ہو جس نے پرانی دوستی کی بنا پر اسے اس کے ذاتی نام سے پکارا تھا اور نہایت بے تکلفی کا اظہار کیا تھا۔

شاہ خوارزم کو ان تاجرین کے سلسلے میں غایر کا پیغام اس وقت ملا جب وہ بغداد کے خلاف اپنی ناکام مہم سے لوٹ رہا تھا۔ لہٰذا معاملہ پر غور کے لیے توقف کیے بغیر اس نے تاجرین کو قتل کر دینے کا اور ان کی جائداد ضبط کر لینے کا حکم دے دیا۔ حالانکہ وہ

چنگیز کی طاقت کے استحکام اور کن سرزمین پر اس کے حملہ سے ناواقف نہ تھا۔ در حقیقت اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر باخبر رکھنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کر رکھی تھیں اور کم از کم اس کا ایک پیغامبر اس کے پاس چنگیز خاں کی نیک خواہش کے پیغام کے ساتھ ساتھ چین میں منگولوں کی قاتلانہ کارروائیوں کی ایک تفصیلی روداد پیش کر چکا تھا[1]۔

چنگیز جنگ کا فیصلہ کرتا ہے

غایر خاں نے اپنے آقا کے حکم کی ٹھیک ٹھیک تعمیل کی لیکن ایک تاجر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے یہ خبر چنگیز کو پہنچائی۔ خان سخت برہم ہو گیا اور اسے ایک طرح کا بخار چڑھ آیا اس نے تین دن اور تین راتیں ایک پہاڑی کی چوٹی پر دعائیں کیں اور تب اس نے جنگ کا فیصلہ کر لیا لیکن سمرقند جانے والی سڑک لمبی اور دشوار گزار تھی لہٰذا اس کے لیے محتاط طریقے پر تیاریاں کرنی تھیں۔ دو دشمنوں سے بھی جو راستہ میں حائل تھے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ لہٰذا چنگیز نے اپنے بڑے لڑکے جوجی کو ایک تارک الوطن مرکیت سردار تغاں کے خلاف اور یمے (جیبے)[2] یونان کو چلک کے خلاف روانہ کیا۔ دونوں کو ہرا دیا گیا۔ اور انھیں مار ڈالا گیا۔ 1218 کے موسم بہار میں چنگیز کی فوج نے اپنی روانگی شروع کی۔ ایغور، کیالیق اور بیش بالیغ کے اتحادی حکمراں اس سے راستہ میں آملے۔ اوترار تک کے تین ماہ کے سفر کے لیے انتظامات بڑے محتاط طریقے سے کیے گئے تھے۔

شاہ خوارزم نے 1217ء کا موسم سرما سمرقند اور بخارا میں گزارا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1218ء کے موسم بہار میں وہ جند کے مقام سے سیر دریا کے اس پار لق ودق صحرا میں چلا گیا۔ یہاں اسے ایک منگول فوج۔ جوجی کی فوج۔ کے قدموں کے نشانات ملے اور اس نے مردہ لوگوں کا ایک ڈھیر پایا جو اس منگول فوج نے میدان جنگ میں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اس فوج کا پیچھا کیا اور دوسرے دن اسے جا لیا۔ منگولوں نے کہا کہ انہیں

---

(1) سید اجل بہاؤالدین، طبقات ناصری، فارسی متن، ص 37-335

(2) یمہ (یا یامہ) ایک لوہار کا بیٹا تھا جس نے اسے چنگیز کی ملازمت کے لیے نذر کر دیا تھا۔ سبتائی جو منگول کا سب سے بڑا فنون حرم کا ماہر تھا وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔

سلطان کے ساتھ لڑنے کا حکم نہیں ہے لیکن اگر ان پر حملہ کیا جائے گا تو وہ لڑیں گے۔ سلطان نے حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ صبح سے شام تک گھمسان کا رن پڑا اور قلب لشکر پر منگولوں کا حملہ اتنا سخت تھا کہ محض اس کے بیٹے جلال الدین کی ہمت و جرأت نے، جو داہنے بازو (میمنہ) سے اس کی حفاظت کے لیے چلا آیا تھا، سلطان کو منگولوں کے ہاتھوں میں جا پڑنے سے بچا لیا۔ جب رات نے (دونوں) فوجوں کو الگ الگ کر دیا تو منگول فوج نے بڑی تعداد میں آگ روشن کی اور اپنے پروگرام کے مطابق روانہ ہو گئی۔ سلطان ان کے خیموں کو خالی پا کر سمرقند لوٹ گیا[1]۔

شاہ خوارزم کی خودکشانہ عسکری پالیسی

سلطان بہت مضطرب تھا۔ اس کی مڈبھیڑ منگول فوج کے دو مقدمۃ الجیش میں سے صرف ایک کے ساتھ ہوئی تھی اور فی الواقع اسے شکست ہو گئی تھی۔ وہ کس طرح اس زبردست جتھہ کا مقابلہ کرے گا جو اس کے خلاف آ رہا تھا؟ کیا عجم کا بھی وہی حال ہو گا جو چین کا ہوا تھا؟ اس کی ماں جو فطرتاً ایک خونی تھی اور جس کے اثر سے وہ محفوظ نہ رہ سکا، یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ازلق سلطان جو اس وقت ایک نو عمر لڑکا تھا اس کا جانشین ہو گا اور اس بات نے اس کے وفادار افسران کے اندازوں کو یکسر الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے کچھ افسروں کو خیال ہوا کہ ماوراء النہر بچایا نہ جا سکے گا لہٰذا انھوں نے آمو دریا کے کنارے پر مقابلہ کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ کچھ اسے غزنی یا عراق یا کسی ایسی سرزمین میں جہاں منگولوں اور تاتاروں کا ہاتھ نہ پہنچ سکے، بھاگ جانے کا مشورہ دیا۔ اس کے حوارین میں سے تنہا سلطان کے بڑے لڑکے جلال الدین منکبرنی نے ہی اسے درست اور صحیح مشورہ دیا۔ شاہی خاندان نے کئی پشتوں تک اپنی رعایا کے ٹیکسوں پر اپنی گزر بسر کی ہے۔ یہ بات ایک فرض کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان کی خاطر لڑا جائے اور مدافعت صرف سیر دریا کے مشرقی کنارے پر، اس بڑے دریا کے کناروں پر آباد شہروں کے پار لق ودق صحرا میں، ہی ممکن تھی۔ اگر کہیں منگولوں

---

(1) اس مہم کی تاریخ کے سلسلے میں مآخذ میں اختلاف ہے۔ ملاحظہ ہو، بارتھولڈ کی، ترکستان ص 37 میں نے منہاج السراج اور جوینی کے ذریعے دی گئی تاریخوں اور واقعات کے تسلسل کی تقلید کی ہے۔

نے دریا عبور کر لیا تو (مدافعت کے لیے) وقت باقی نہ رہے گا۔ چنگیز خاں سے لڑنے کے لیے اگر کسی اور کو ہمت نہ تھی تو اس نے اپنی خدمات پیش کیں لیکن سلطان کی طاقت پوری طرح جواب دے چکی تھی۔ خواہ اس کی وجہ جو بھی رہی ہو۔

اغلب یہ ہے کہ اگر جلال الدین، جو سب سے بڑا لڑکا تھا اور جسے ولی عہد تسلیم کیا جا چکا تھا اور جسے سلطان نے مکمل اختیار سونپ دیا تھا، کی قیادت میں جنگ ہوتی تو مسلمان ڈٹ کر مقابلہ کرتے۔ آدمیوں اور ساز و سامان کی کمی نہ تھی۔ جلال الدین جوان تھا غالباً اس کی عمر تیس سال سے کم تھی۔ تھوڑا سا جلد باز اور انفرادی مقابلوں میں اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دینے کی طرف بہت زیادہ مائل و راغب تھا۔ پھر بھی اس کی قیادت میں ایک گشتی فوج باضابطہ جنگ سے گریز کر کے منگولوں کو ایک ایسے ناواقف علاقے میں جہاں کی زبان وہ نہیں سمجھتے تھے چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے ذریعے خستہ حال کر کے، ان کے وسائل کا راستہ بند کر کے قلعہ بند شہروں کی حفاظت اور ان کے باہر کی غیر فوجی آبادی کی اعانت و قیادت کی پالیسی اختیار کر کے، کامیابی کی توقع کر سکتی تھی۔ جیسا کہ اس کا اظہار مستقبل میں ہوا۔ جلال الدین طاقت، جرأت اور ابھرنے کی صلاحیتیں رکھتا تھا جن کا یہ بحران متقاضی تھا۔ عوام اس کے وفادار تھے اور دفاعی فوج کے سردار کی حیثیت سے وہ اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے۔

لیکن سلطان اور اس کے درباری جلال الدین کی لیڈر شپ اور شہرت سے خوفزدہ تھے۔ مزید براں بدقسمتی سے وہ ایک ہندستانی ماں کا بیٹا تھا اور اس کا رنگ کالا تھا۔ اس طرح اپنے درباریوں سے غلط مشورہ پا کر سلطان نے ایک مہلک قدم اٹھایا جس نے چنگیز خاں کی مکمل کامیابی کو یقینی بنا دیا۔ اس نے اپنی چار یا پانچ لاکھ کی فوج کو اپنے اہم شہروں اور قلعوں میں اس حکم کے ساتھ منقسم کر دیا کہ وہ منگولوں کے خلاف جمی ہے۔ عہد وسطیٰ کے عجم کے تمام شہر ہندستان کے شہروں کی طرح قلعہ بند ہوتے تھے لیکن عجم کے شہروں میں اندرونی قلعہ - عموماً انھیں آرک کہا جاتا تھا۔ ہوتا تھا۔ جہاں سپاہیوں کو متعین کیا جاتا تھا۔ سپاہیوں کو اندرونی قلعہ میں متعین کیے جانے کے بعد میدانِ کارزار میں لڑنے والی کوئی فوج کہیں بھی حملہ آور منگولوں کے مقابلہ کے لیے نہیں باقی بچی۔ کھلا ہوا میدانی علاقہ، غیر قلعہ بند نخلستان اور گاؤں اور زرخیز دریا کے

کنارے مزاحمت کی کسی بھی کوشش کے بغیر منگولوں کے لیے چھوڑ دیے گئے۔ منگول ایک شہر سے دوسرے شہر اپنی مرضی کے مطابق آ جا سکتے تھے اور یہ امید کہ آرک میں متعینہ حفاظتی دستے کسی طور پر فائدہ مند ثابت ہوں گے غلط ثابت ہوئی[1]۔

اس خطرناک غلطی میں سلطان نے مزید تین اور غلطیوں کا اضافہ کر دیا جن کے بارے میں اس کے مشیر کاروں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ وہ جہاں کہیں گیا وہاں اس نے دہشت پھیلا دی اس نے سمرقند کے عوام سے کہا کہ "اگر اس فوج کا ہر سپاہی جو ہم پر حملہ کرنے والی ہے اپنے چابک کو ڈال دے تو تمہارے شہر کے خندق بھر جائیں گے"۔ اس نے شہریوں کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنے مسکنوں کو چھوڑ دیں اور کسی محفوظ گوشہ میں چلے جائیں کیونکہ شہروں پر حملہ اور ان کا چین کے شہروں کے مانند کچل دیا جانا یقینی تھا۔ اور آخر میں ریاست کے سردار اور اس کی دفاع کے ایک ذمہ دار شخصیت کی حیثیت سے اس نے خود اپنی حفاظت کے لیے غیر مناسب فکر و تشویش کا اظہار کیا۔ وہ سمرقند سے ترمذ (جہاں اس کی زندگی پر حملہ ہوا) کی جانب بڑھا اور

---

(1) شاہ خوارزم کی مملکت کے زوال کے اسباب بارتھولڈ نے مختصراً مندرجہ ذیل بیان کیے ہیں (الف) اپنی ماں ترکان خاتون کو خوش کرنے کے لیے سلطان نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے قطب الدین شاہ کو اپنا وارث مقرر کر دیا۔ خراسان، مازندران اور خوارزم کے صوبے اسے سپرد کر دیئے گئے لیکن ان پر حکومت ترکان خاتون کرتی تھی اور عملاً شاہ خوارزم کا اختیار تسلیم نہ کرتی تھی۔ سابقہ غوری مملکت کی جاگیریں، ہرات کے علاوہ سلطان کے بڑے لڑکے جلال الدین منکبرنی کے سپرد تھیں۔ (ب) سلطان اور اس کی ماں کے تعلقات بغداد سے اس کی واپسی کے بعد بڑے تلخ ہو گئے۔ (ج) اس فتوی کی بدولت جو سلطان نے زبردستی علماء سے خلیفہ کے خلاف لیا تھا، علماء اس کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور یہ عداوت سلطان کی چند حرکات کی بنا پر اور بھی مشتعل ہو گئی مثلاً مسلم صوفیاء کے کبروی مسلک کے بانی شیخ نجم الدین کبرا کے ایک شاگرد شیخ مجد الدین کو پھانسی دے دینا۔ (د) شاہ خوارزم کی پوری عسکری طاقت کی تشکیل بھاڑے کے فوجیوں پر تھی، سلطان غیر فوجی شہریوں اور کسانوں پر سپاہیوں کو ترجیح دیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ عوام کی وفاداری حاصل نہ کر سکا۔ (ر) تاہم سلطان اور اس کی ماں کے درمیان کشمکش میں فوجی اور علماء کا طبقہ موخر الذکر کی حمایت میں تھا۔ لہٰذا شاہ خوارزم نہ تو انتظامیہ کے کسی ایک عنصر پر اور نہ ہی آبادی کے کسی ایک طبقہ پر بھروسہ کر سکتا تھا (ترکستان ص385-80) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام اندراجات میں مبالغہ آمیزی کا ایک عنصر ہے۔ جہاں تک عسکری اندازے کی غلطی کا تعلق ہے اس سلسلہ میں بارتھولڈ مجھ سے متفق ہیں۔

18/اپریل 1220ء میں نیشاپور جا پہنچا۔ یہاں اس اثنا میں جبکہ اس کی رعایا کو بھیڑوں کی طرح ذبح کیا جا رہا تھا اس نے تقریباً تین ہفتہ اپنے حرم کی عورتوں کی صحبت میں اور ان کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھ کر اپنی تمام مشکلات کو بھول جانے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن یہ اطلاع پاکر کہ ایک منگول فوج اس کے خلاف روانہ کی گئی ہے وہ مشرق کی جانب بھاگ گیا اور دیگر بہت سے منصوبوں پر غور و فکر کے بعد بالآخر اس نے بحرہ کاسپین کے ایک جزیرہ میں پناہ لی اور وہاں 1220ء میں انتقال کر گیا۔

چنگیز کا کردار اور شخصیت

منہاج السراج جس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور جو چند ایسے اشخاص سے مل چکا تھا جنھوں نے چنگیز خاں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ہمارے سامنے فاتح اعظم کی ایک نامکمل قلمی تصویر پیش کرتا ہے لیکن ان سبھوں سے بہتر ہے جو ہمیں ایک ایسے شخص سے ملتی ہے جو اپنے خیال کے اظہار میں آزاد ہے:-

"معتبر گواہوں نے بیان کیا ہے کہ خراسان کے حملہ کے وقت چنگیز خاں کی عمر پچپن سال کی تھی۔ وہ ایک طویل القامت، لحیم شحیم اور مضبوط جسم والا شخص تھا اس کی بلی جیسی آنکھیں تھیں اور اس کی چھدری ہوئی داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ نہایت بہادر، دانشمند، دور اندیش، چالاک اور عادل تھا۔ وہ حکمرانی اور اپنے دشمنوں کے استیصال میں اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل تھا لیکن وہ ایک خوفناک قاتل اور ایک ظالم خوں ریز بھی تھا لہٰذا یہ بات پوری دنیا کے لیے واضح ہے کہ وہ کچھ عجیب و غریب خصوصیات کا حامل تھا۔

اولاً اس گنہگار کی عیاری اور معجزات۔ کہا جاتا ہے کہ چند شیطان ان کے دوست ہو گئے تھے۔ ہر چند دنوں بعد وہ ایک بار بے ہوش ہو جاتا اور اپنی بے ہوشی کے دوران ہر قسم کی باتیں بکتا تھا۔ اس کا واقعہ یوں ہے کہ جب وہ پہلی بار بے ہوش ہوا تھا اور شیطانوں نے اس کے دماغ کو مغلوب کر لینے کے بعد اسے جلد ہی پیش آنے والی فتحیابی کی اطلاع دی تھی تو اس نے جبہ اور ان کپڑوں کو جو وہ اس وقت زیب تن کیے ہوئے تھا ایک مہر بند جھولے میں رکھ دیا اور اسے اپنے ساتھ رکھتا۔ جب کبھی یہ بے

ہوشی اس پر غالب ہونے والی ہوتی (وہ ان کپڑوں کو پہن لیتا) اور تمام واقعات فتح و نصرت، مہم، دشمنوں کی شکل و صورت اور ان سرزمینوں کی فتحیابی، جن کا وہ خواہش مند ہوتا کے متعلق باتیں کرتا تھا۔ کوئی شخص ان تمام باتوں کو جو وہ کہتا لکھ لیتا اور ان تمام (کاغذات) کو ایک جھولے میں رکھ کر ان پر مہر ثبت کر دیتا۔ جب چنگیز ہوش میں آتا تو تمام باتیں اسے پڑھ کر سنائی جاتیں اور وہ انھیں کے مطابق عمل کرتا۔ عموماً بلکہ درحقیقت ہمیشہ ہی اس کے منصوبے کامیاب ہوتے۔

دوم یہ کہ وہ اس بات سے واقف تھا کہ بھیڑوں کے مونڈھوں کی ہڈی کے ذریعے کس طرح پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ ان مونڈھوں کو آگ پر رکھتا اور ان کے بھننے کا معائنہ کرتا اور جلے ہوئے مونڈھوں سے تعبیر نکالتا۔ اس معاملہ وہ عجم (ایران اور مرکزی ایشیا) کے تعبیر بتانے والوں سے مختلف تھا جو محض مونڈھوں کا معائنہ کرتے۔

سوم یہ کہ چنگیز خاں کا انصاف اتنا سخت تھا کہ مالک کے علاوہ کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اس کوڑے کو اٹھالے جو سڑک کے کنارے گر گیا ہے۔ اس کی فوج میں جھوٹ اور چوری بالکل نامعلوم چیزیں تھیں اور کوئی بھی ان میں اس کا سراغ نہیں پا سکتا۔

چہارم یہ کہ ان عورتوں کے سلسلہ میں جنھیں انھوں نے خراسان اور پورے عجم میں گرفتار کیا تھا "اگر کسی عورت کا شوہر ہوتا تو کوئی شخص اس سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا تھا لیکن اگر کوئی کافر کسی شادی شدہ مسلم عورت کو چاہتا تو اسے سب سے پہلے اس کے شوہر کو مار ڈالنا پڑتا تبھی وہ اس عورت کی ملکیت حاصل کر سکتا تھا" کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ جھوٹ بول سکے یہ بات سبھی کو معلوم ہے[1]۔"

چنگیز خاں کی پالیسی: دہشت زدگی کی حکومت، بڑے پیمانہ پر قتل عام اور جسمانی صفایا

چنگیز خاں جو صدق دل سے یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ "اِل تنگیری" نے اسے اور اس کے خاندانوں کو اور اس کے افسران کو ہمیشہ کے لیے دنیا پر حکومت کرنے کا اختیار

---

(1) طبقات ناصری، فارسی متن، ص 76-373

بخشتا ہے اور یہ کہ اس کی حکم عدولی "ال تنگیر ی" کے ایک واضح حکم کے مزاحم ہے، یقیناً بڑا خوش ہوا ہو گا جب اس نے یہ سنا ہو گا کہ اسے کسی لڑاکو فوج سے مقابلہ نہ کرنا ہو گا اور یہ کہ خوارزمی فوج منقسم ہو گئی ہے اور شہروں کے اندرونی قلعوں میں بند کر دی گئی ہے یا دشوار گزار پہاڑی قلعوں میں رکھ دی گئی ہے۔ اگرچہ غالباً اس نے چھوٹے چھوٹے معاملات کو فوری فیصلوں کے لیے چھوڑ دیا لیکن اس کے بنیادی لائحہ عمل کا تعین، یقیناً سیر دریا پر پہنچنے کے قبل ہی ہو چکا تھا۔

چھ صدیوں سے کچھ ہی کم مدت تک مسلمانوں نے عجم میں خود اپنی پسند کے سرداروں، یا کم از کم اپنے ہم عقیدہ اور بسا اوقات اپنے ہم زبان اور قرابت مندوں، کی ماتحتی میں فروغ پایا تھا۔ لہٰذا یہ بات واضح تھی کہ چنگیز خاں اور اس کے خاندان کا اقتدار اس وقت تک مستقل طور پر قایم نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کا قتل عام نہ کیا جاتا اور ان کے بڑے شہروں میں سے کم از کم نصف کو تاراج نہ کر دیا جاتا۔ چنگیز اس بات کے لیے تیار تھا کہ جتنی بھی ضرورت ہو اتنی تعداد میں مسلمانوں کو قتل کر دیا جائے بلکہ "احتیاطاً" اس تعداد سے کچھ زیادہ ہی کو۔ بہر حال یہ "ال تنگیر ی" کا حکم تھا لہٰذا چنگیز کا ضمیر مطمئن تھا اور وہ خود کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتا تھا۔ بڑے پیمانے پر قتل عام کے نتیجہ میں یہ دہشت زدہ حکومت پوری انسانیت کے لیے ایک خطرہ کی گھنٹی تھی۔ اس سلسلہ میں کچھ بھی پوشیدہ نہ تھا۔ چنگیز اور اس کے جانشین پوری دنیا میں اس بات کا اشتہار چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ منگولوں کے سرکاری مورخین مثلاً جوینی اور رشید الدین ان قتل عاموں کو "نافرمانی اور بغاوت" کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے ان کے صحیح کردار اور حد کی تشریح کرنے میں بڑے محتاط ہیں۔

وہ مصنفین جو منگولوں کے مخالف ہیں مثلاً منہاج السراج ان قتل عاموں کا بیان مختلف زاویوں سے کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کی تفصیلات میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے۔

دوسری طرف چنگیز خاں مشکل ہی سے یہ بات نظر انداز کر سکتا تھا کہ وہ تمام باشندوں کو مار ڈالے گا تو پھر کوئی بھی نہ رہے گا جن سے ٹیکسوں کو وصول کیا جا سکے۔ لہٰذا اس نے مختلف علاقوں کے لیے مختلف پالیسیاں اپنائیں۔

(الف) چنگیز کا ترکستان کے باشندوں سے کوئی جھگڑا نہ تھا۔ اس علاقہ کے چند

شہروں کو کوچلک نے مذہبی بنیادوں پر ستایا تھا۔ جب یبے نے ان سے مذہبی رواداری کا وعدہ کر لیا تو وہ لوگ بالکل مطمئن ہو گئے۔ ان شہروں میں مسلم تہذیب، چینی تہذیب کے دوش بدوش قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ بات صحرائی علاقوں میں نہیں پائی جاتی۔ علاوہ ازیں (اس علاقہ کے) سردار، جس میں کیالیق کا ایک مسلمان ارسلاں خاں بھی شامل تھا، اپنی فوجوں کے ساتھ چنگیز سے جا ملے تھے۔ لہٰذا ترکستان میں کوئی قتل عام نہ ہوا۔ چونکہ یہ علاقہ منگولوں کے اصل راستہ پر واقع تھا لہٰذا اس کا مسلسل فروغ گزرنے والے لشکروں کو ذخیروں کی رسد کے لیے ضروری تھا۔

(ب) ماوراء النہر (سیر دریا کے مشرق کے شہروں کو شامل کر کے) کا مسئلہ مختلف تھا۔ یہ علاقہ گور خاں کی حکمرانی میں رہ چکا تھا لیکن براہ راست حکومت مسلم سرداروں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس علاقے کے مرکز میں دریائے زرفشاں کے کنارے پر بخارا اور سمرقند کے مسلمانوں کے بڑے بڑے شہر تھے جو خانہ جنگیوں اور مسلسل بدانتظامیوں کے باوجود اسلام کے ثقافتی مراکز کی حیثیت سے فروغ پا رہے تھے۔ چنگیز پہلے ہی اس علاقہ کو اپنے دوسرے لڑکے چغتائی کی براہ راست حکومت میں دے دینے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن اس کی حکومت چند روزہ ثابت ہوتی جب تک کہ اس کا قیام خوفناک قتل عام اور مقامی سرداروں کی مکمل نیست و نابودی کے بعد نہ کیا جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ چغتائی کے لیے کچھ (رعایا) اور آمدنی کے کچھ ذرائع کو بھی باقی رکھنا تھا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ سمرقند اور بخارا کے چند شہروں کو تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے لیکن بعض دیگر شہروں کے مکانوں اور باشندوں کو چھوڑ دیا جائے لیکن تقریباً تمام شہروں کو مکمل طور پر غارت کر دیا گیا۔

(ج) اس زمانہ کا خراسان اسی نام کے موجود ایرانی صوبے کے مقابلہ میں ایک نہایت بڑے رقبہ کا حامل تھا۔ اس کے چار بڑے شہر تھے۔ مرو (سلجوقیوں کی پرانی راجدھانی) شمالی افغانستان میں بلخ، نیشاپور اور ہرات۔ چنگیز نے ان شہروں کو مکمل طور پر نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان شہروں کی تعمیر نو ان کے پرانے جائے وقوع پر نہیں ہوئی ہے۔ دیگر شہروں کو جنھوں نے ذرا بھی مزاحمت کی انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور منگولوں سے مخالفت کرنے کی صلاحیت رکھنے والے کسی خاندان کو زندہ نہیں

چھوڑا گیا۔ خوارزم اور اس کے قریب وجوار کے شہروں کے ساتھ اور غور کی گزشتہ سلطنت کے آباد حصوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

(د) اس مرحلہ میں چنگیز کو جنوبی ایران سے کوئی تعلق نہ تھا جس کے حکمرانوں نے خراسان کی بدنصیبی دیکھ کر فوراً ہی اطاعت قبول کر لی۔ الموُت کے حکمراں جلال الدین نے بھی اپنی وفاداری کی پیش کش کر دی اور چنگیز نے اسے قبول کر لیا۔ ایران کے بیچ سے گزرنے میں کوپر کا بڑا دشت ملتا ہے اور چنگیز نے اسے پار کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کیا۔ گزرتی ہوئی منگول فوجوں نے آزربائجان اور عراق کو تاراج کیا لیکن اس مرحلہ میں الحاق واضافہ کی کوشش نہیں کی گئی۔

تباہی و بربادی کے متعلق جوینی کا اندازہ

جو تباہی و بربادی عمل میں آئی اس کی ایک تصویر جوینی نے جو اس موضع پر ہمارا ماخذ ہے، پیش کی ہے:

"جہاں کہیں بھی کسی بادشاہ یا حکمراں یا کسی شہر کے گورنر نے اس کے ساتھ کوئی مزاحمت کی، چنگیز نے اسے اس کے خاندان، پیروکاروں اور رشتہ داروں کے ساتھ نیست و نابود کر دیا۔ اس طرح جہاں ایک لاکھ کی تعداد میں لوگ تھے وہاں بلا مبالغہ ایک سو سے بھی کم لوگ زندہ بچے۔ اس کے ثبوت کے طور پر مختلف شہروں کی بدنصیبی کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کا تذکرہ مناسب جگہوں پر کر دیا گیا ہے۔۔۔[1]"

جب چنگیز خاں نے بخارا اور سمرقند پر قبضہ کیا تو وہ صرف ایک بار وہاں قتل و خونریزی اور لوٹ مار سے مطمئن ہو گیا اور اس نے قتل عام کو راہ نہ دی۔ ان سرزمینوں کی جو ان شہروں کے ماتحت تھیں یا ان کی سرحدوں پر واقع تھیں چونکہ ان میں سے اکثر نے اطاعت قبول کر لی تھی اس لیے ان کی ایذا رسانی سے کچھ حد تک ہاتھ کھینچ لیا گیا اور بعد میں منگولوں نے زندہ رہ جانے والوں کی تالیف قلب کی اور دوبارہ تعمیر کے کاموں کو آگے بڑھایا یہاں تک کہ اس وقت یعنی 657ہجری (60-1259ء) ان ضلعوں کی ترقی اور خوشحالی بعض صورتوں میں اپنی اصلی سطح پر پہنچ چکی ہے اور دیگر

---

(1) تاریخ جہاں گشا، فارسی متن، جلد اول ص 17، بوائل کا ترجمہ جلد دوم ص 23

صورتوں میں اس کے قریب پہنچ چکی ہے۔ خراسان اور عراق کے[1] ساتھ صورتحال دیگر ہے۔ یہ ممالک ایک طرح شدید بخار اور کپکپی کا شکار ہیں۔

ہر شہر اور ہر گاؤں کئی کئی بار لوٹ مار اور قتل عام کا نشانہ بنا اور برسوں ابتری کا شکار رہا لہٰذا اگر قیامت تک بھی وہاں افزوئی نسل ہوتی رہے تو بھی یہ اصل آبادی کے دسویں حصہ تک نہ پہنچ سکے گی۔ اس علاقہ کی تاریخ کی تصدیق کھنڈرات اور کوڑے کے ڈھیروں کے ان آثار سے کی جا سکتی ہے جو بہ بانگ دہل اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ کس طرح بدنصیبی نے اپنے کارناموں کی تصویریں محلوں کی دیواروں پر کھینچ دی ہیں۔[2]"

حمد اللہ مستوفی اپنی نزہتہ القلوب میں جو منگول حملہ کے ایک صدی بعد لکھی گئی ہے نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ یہ ایران نے اس خوشحالی کا جو منگول سے پیشتر تھی ایک تہائی بھی حاصل نہیں کیا ہے۔

علاؤ الدین خوارزم شاہ کی حیرت انگیز بے وقوفی ہی نے چنگیز کے لیے اس پالیسی کی نشاندہی کر دی جس پر وہ چلے۔ دیواروں سے گھرے شہر اپنے ان اندرونی قلعوں کے ساتھ جو سپاہیوں سے بھرے تھے امید کا دامن چھوڑ دیں گے جب منگول انھیں گھیر لیں گے کیونکہ وہ اپنی خلاصی و نجات کے لیے معدوم خوارزمی حکومت سے کوئی امید نہیں کر سکتے تھے۔ چنگیز کے پاس شہر کی دیواروں کو مسمار کر دینے کے لیے منجنیقیں اور محاصرہ کے دیگر ضروری آلات بنانے کے لیے بہت سے تربیت یافتہ چینی کاریگر تھے اور اس نے یہ واضح کر دیا تھا کہ مزاحمت کی صورت میں شہری آبادی اور فوجی دونوں ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور ان کی عورتوں کو غلام بنا لیا جائے گا۔ اور افسروں اور لوگوں میں انھیں تقسیم کر دیا جائے گا۔ لیکن مطیع ہونے کی صورت میں صرف فوجیوں کو قتل کیا جائے گا شہری آبادی کو نہیں۔

لیکن ان پہلے شہروں میں ہی جو منگولوں کے مطیع ہو گئے تھے اس کے رویہ سے شہری آبادی کے لیے اس میں شک کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی کہ کس قسم کی بقاء کی وہ

---

(1) یہ بات جوینی کے آقا ہلاکو۔ نہ کہ چنگیز کے ذریعے کی گئی عراق کی تباہی کا حوالہ دیتی ہے

(2) تاریخ جہاں گشا، فارسی متن، جلد اول ص 75 (بوائل) کا ترجمہ

امید کر سکتے تھے۔ تمام باشندوں مردوں اور عورتوں دونوں ہی کو شہر سے باہر لایا گیا اور باہر رکھا گیا جب کہ منگولوں نے ان کے لوگوں کو لوٹا کھسوٹا۔ اس کے بعد نوجوان لوگوں کو چنا گیا اور ان کو فوج میں حشر کے طور پر شامل کر لیا گیا اور اگلے شہروں کے محاصرہ کے سلسلے میں ضروری محنت و خدمت کے لیے لے جایا گیا۔ عموماً اس طرح کے دس آدمیوں کو ایک منگول سپاہی کی ماتحتی میں رکھا گیا۔ محاصرہ کے قبل ابتدائی اقدامات اور اس کے بعد شہر کے مکانوں کی تباہی کے لیے ان ہی مسلمان دستوں کو منگول افسروں کے کوڑوں کے زیر سایہ استعمال کیا جاتا تھا چونکہ منگول فوج کو تربیت یافتہ کاریگروں کی ضرورت تھی اور صحرائی علاقہ میں ایسے کاریگروں کی کمی بھی تھی لہٰذا تمام اچھے کاریگروں کو چن لیا گیا اور انھیں یا تو فوج کے ساتھ لے جایا گیا یا وہ ترکستان اور منگولیا کی جانب لے جائے گئے۔ بالآخر جب کوئی شہر منگولوں کے ہاتھوں میں آجاتا تو اندرونی قلعہ یا آرک کے سپاہیوں کو گرفتار کر لیا جاتا اور انھیں مار ڈالا جاتا جب کہ قلعوں کو سڑکوں کے برابر کر دیا جاتا۔

ان سفاکانہ صورت حال سے دوچار ہو کر تقریباً تمام شہروں کی شہری آبادی نے ہتھیار رکھ دینے کا اور سپاہیوں کو اپنی قسمت پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا وہ فوجی دستے جو دشوار گزار پہاڑی قلعوں میں متعین تھے، جن تک سیڑھیوں سے نہیں پہنچا جا سکتا تھا یا جنھیں منجنیق کے پتھروں سے مجروح نہیں کیا جا سکتا تھا چند مہینوں تک منگولوں کا مقابلہ کر سکتے تھے یہاں تک کہ ان کے آباد شہروں میں اس طرح کی مزاحمت ممکن نہ تھی۔ ہر مقبوضہ شہر سے حاصل شدہ بھرتی فوج اور کاریگروں نے منگول فوج اور اس کے زور و ضرب کو اور موثر بنایا۔

عسکری صورت حال کی ان خصوصیات کو ذہن نشین رکھا جائے تو چنگیز خاں کی سات سالہ مہم کے دوران کی مختلف نقل و حرکت کا ہم صحیح اندازہ کر سکیں گے۔

سیر دریا پر واقع شہروں کا انجام

چنگیز خاں کو سیر دریا پار کرنے سے روکنے کے لیے کوئی فوج نہ تھی۔ اس نے جوجی کو جند کے خلاف، اپنے دوسرے اور تیسرے بیٹے چغتائی اوگتائی، کو اترار کے

خلاف اور اپنے دیگر افسران کو فوجند، فناکٹ وغیرہ کے خلاف روانہ کیا جب کہ وہ بذات خود سمرقند اور بخارا کے خلاف روانہ ہوا۔ اترار کی مدافعت ساٹھ ہزار کی ایک فوج کے ساتھ غائر خاں کر رہا تھا۔ شہر نے پانچ ماہ تک مزاحمت کی جس کے بعد غائر کے ماتحت قباچانے اپنے آدمیوں کے ساتھ رحم کی امید پر ہتھیار ڈال دیے لیکن اسے مار ڈالا گیا۔ باشندے، نقاب اوڑھنے والے اور وہ لوگ جو کلاہ (ٹوپی) اور پگڑیاں پہنتے تھے دونوں ہی، کو شہر سے باہر لایا گیا جب کہ منگولوں نے ان گھروں کو لوٹا کھسوٹا۔ نوجوانوں کو بھرتی فوج (حشر) کے لیے اور کاریگروں کو ملازمت کے لیے چنا گیا۔ غائر خاں نے بیس ہزار فوجیوں کے ساتھ آرک میں پناہ لی۔ انھوں نے مزید ایک ماہ تک مزاحمت کی اور لڑتے ہوئے مارے گئے۔ ماوراء النہر کا کوئی دوسرا شہر اتنے دنوں تک مزاحمت نہ کر سکا جوجی نے ایک مسلمان تاجر حاجی حسن کو، جو بہت دنوں تک چنگیز کی ملازمت میں رہ چکا تھا سقناق کے شہریوں سے مطیع ہو جانے کی درخواست کے لیے بھیجا۔ لیکن چند اشخاص نے اللہ اکبر کے نعرہ کے ساتھ حاجی پر حملہ کر دیا اور اسے مار ڈالا۔ اس کے انتقام میں منگولوں نے سات دنوں میں پوری آبادی کو ذبح کر ڈالا۔

”اوزکنت (نیر اور جند) اور بار جلیغ کنت“: یہاں کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی اور نہ قتل عام ہوا۔ ”اشناس“: قلعہ کی محافظ فوج بہادری سے لڑی اور بیشتر سپاہی شہید ہوئے۔ ”جند“: محافظ فوج کا کمانڈر قتلغ خاں ریگستان کے اس پار اپنے آدمیوں کے ساتھ خوارزم کی طرف پسپا ہو گیا۔ 21/اپریل 1229ء کو جب منگول پہنچے تو وہاں کے باشندے بالکل لاچار و بے مددگار تھے۔ انھیں شہر سے نکال لایا گیا اور انھیں ایک میدان میں نو دن اور نو راتوں تک رکھا گیا جب کہ منگولوں نے شہر لوٹا اور تاراج کیا۔ اس کے بعد ایک شخص علی خواجہ کو جو بخارا کے قریب ہی پیدا ہوا تھا، اور منگولوں کی ملازمت میں ان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے داخل ہو گیا تھا۔ اس مقام کا انچارج بنا دیا گیا ”فناکٹ“: ایلنکو ملک کی قیادت میں محافظ فوج نے تین دن تک مقابلہ کیا پھر انھوں نے جان بخشی کی درخواست کی۔ تمام سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا لیکن کاریگروں اور نوجوانوں کے علاوہ جن کی فوجی بھرتی کے لیے ضرورت تھی شہری آبادی کو چھوڑ دیا گیا۔ ”خجند“: کمانڈر، تیمور ملک نے اپنے آپ کو ایک جزیرے میں قلعہ بند کر لیا اور

بہادرانہ کارناموں کے ایک سلسلہ کے بعد وہ خوارزم شاہ کے پاس بھاگ گیا لیکن خجند کے حصہ میں بھی دوسرے شہروں کی طرح بد نصیبی ہی آئی اور اس کے نوجوانوں کو حشر میں بھرتی کر لیا گیا۔ اس موقع پر بھرتی فوج کی تعداد پچاس ہزار بتائی گئی ہے جب کہ منگول فوج کی تعداد بیس ہزار تھی۔

بخارا اور سمرقند کی تباہی

اگرچہ سمرقند زیادہ قریب تھا لیکن چنگیز خاں نے زرنوق اور نور کے راستے پہلے بخارا کے خلاف پیش قدمی کا فیصلہ کیا۔ دونوں شہروں نے ہتھیار ڈال دیے اور ان کے ساتھ حسب دستور منگول طریقہ پر سلوک کیا گیا ان سے بخارا کے خلاف بھرتی فوجوں کے مہیا کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن نور کی صنعت اور زراعت کے لیے کم از کم جتنے آدمیوں کی ضرورت تھی ان کو چھوڑ دیا گیا۔ بخارا کا قلعہ کوک خاں کے ذمہ تھا جو ایک منگول تھا اور چنگیز خاں کے پاس سے سلطان کی ملازمت میں چلا آیا تھا۔ کوک نے آخری وقت تک لڑنے کا فیصلہ کیا لیکن شہریوں نے مطیع ہو جانے کو ترجیح دی اور انھوں نے اپنے مذہبی نمائندوں کو چنگیز کو شہر میں لانے کے لیے بھیجا۔ چنگیز جامع مسجد کے ممبر پر چڑھا اور اس نے مطالبہ کیا کہ "دیہی علاقوں میں چارہ دستیاب نہیں ہے ہمارے گھوڑوں کے پیٹوں کو بھرو۔" اس وقت اکابر مذہبی رہنما منگولوں کے گھوڑوں کی نگرانی کر رہے تھے جب کہ وہ جزدان جن میں قرآن رکھا جاتا تھا گھوڑوں کے چارہ کے برتن کے طور پر استعمال کے لیے اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے دو سو اسی معزز لوگوں کو اپنے خیمہ میں بلایا اور اس کی یہ دوسری تقریر بھی مختصر ہی تھی:' میں خدا کا عذاب ہوں، اگر تم لوگ بڑے گناہوں کے مرتکب نہ ہوتے تو خدا مجھ جیسے شخص کو تم لوگوں پر ایک عذاب بنا کر نہ بھیجتا۔۔۔ تمھیں اپنی اس جائداد کے اعلان کی ضرورت نہیں جو زمین کے اوپر ہے مجھے بتاؤ زمینوں کے نیچے کیا ہے۔ ایک منگول یا ترکی باسقاق کو دو سو اسی آدمیوں میں سے ہر ایک پر یہ دیکھنے کے لیے متعین کیا گیا کہ ان لوگوں نے تمام چیزوں کو اکٹھا کر دیا جو ممکن تھی۔

لیکن آرک کے اندر کوک خاں اور محافظ فوج کا مسئلہ باقی رہا۔ وہ لوگ اپنی

زندگیوں کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرنے کے لیے لڑ رہے تھے اور دن رات دونوں ہی اوقات میں منگولوں کے خلاف حملے کر رہے تھے۔ جامع مسجد اور چند محلوں کے علاوہ بخارا کے تمام مکانات لکڑیوں کے بنے تھے۔ لہٰذا جب چنگیز نے آرک کے قریب کے تمام مکانوں کو آگ لگا دینے کا حکم دیا تو پورا شہر شعلوں کی نذر ہو گیا۔ بالآخر آرک پر قبضہ ہو گیا اور تمام سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مزید یہ کہ قنقلی ترکوں[1] کے تمام ایسے بچوں کو جن کی لمبائی ایک کوڑے کے دستے سے زیادہ تھی قتل کر دیا گیا اور تیس ہزار سے زیادہ لاشیں گنی گئیں۔ جب کہ ان کے زیادہ چھوٹے بچوں کو اور ان کے ممتاز لوگوں کے بچوں اور عورتوں کو جو سرو کی طرح نازک تھیں غلامی میں لے لیا گیا۔ بخارا کے تمام شہری باشندوں، مرد اور عورتوں کو شہر سے باہر مصلۃ کے میدان میں لایا گیا۔ نوجوانوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کو جو سمرقند کے خلاف بھرتی فوج کے لائق تھے چن لیا گیا اور بقیہ کو چھوڑ دیا گیا جب چنگیز نے اس مقام کو چھوڑا اس وقت 'بخارا ایک مسطح میدان تھا'۔

سلطان نے ساٹھ ہزار ترکوں اور پچاس ہزار تاجکوں کی ایک فوج سمرقند میں رکھی تھی اور اس کے دماغ کو مضبوط و مستحکم کیا تھا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ 'سمرقند کئی سالوں تک کسی محاصرہ کا مقابلہ کر سکتا ہے، لہٰذا چنگیز نے پہلے سمرقند کے ارد گرد کے شہروں کو مغلوب کرنے کا فیصلہ کیا جب اس نے یہ کام ختم کر لیا تب سمرقند کے مقدر پر مہر ثبت کر دی گئی۔ شہر کو گھیرے میں لے لینے کے بعد چنگیز نے دو دنوں تک جنگ نہ کی۔ تیسرے اور چوتھے دن کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ پانچویں دن شہری آبادی نے اپنی اطاعت کی پیش کش کے لیے اپنے قاضی اور شیخ الاسلام کو بھیجا۔ شہر کی فصیلوں کو ڈھا دیا گیا اور دوسرے دن صبح اور عصر کی نماز کے دوران اندرونی قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ تقریباً تیس ہزار قنقلی اور ترکوں کو سلطان کے تقریباً بیس اعلیٰ امراء کے ساتھ قتل کر دیا گیا لیکن تقریباً پچاس ہزار لوگوں کو جن کو قاضی اور شیخ الاسلام نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا بلا ایذا پہنچائے چھوڑ دیا گیا۔ بقیہ آبادی کو باہر لایا گیا اور ان کی گنتی کی گئی جب کہ ان کے گھروں کو لوٹ لیا گیا۔ تقریباً تیس ہزار مردوں کو ان کی دست کاری کے

---

(1) تاریخ جہاں گشا، بوائل کا ترجمہ جلد اول ص 107

لیے اور اسی تعداد میں بھرتی فوج کے لیے چنا گیا۔ بقیہ لوگوں کو اپنے اجڑے ہوئے گھروں میں واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن (بعد میں بھی) جبری فوجی بھرتیوں کا سمرقند سے بار بار مطالبہ کیا گیا اور اس کے باعث شہر بالکل تباہ ہو گیا۔

سمرقند میں جنگ شروع ہونے سے قبل چنگیز نے اپنے دو بڑے افسر یمہ اور سبتائی برادران کو تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ سلطان کے تعاقب کے لیے روانہ کیا اور شہر کے فتح ہونے کے بعد اس نے اپنے بیٹے چغتائی اور اوگتائی کو خوارزم کے خلاف روانہ کیا۔ اس نے 1221 کا موسمِ بہار سمرقند کے نزدیک گزارا اور اس کے بعد وہ نخشب کے مرغزاروں میں چلا گیا۔

خوارزم

شہریوں نے مطیع ہونے سے انکار کر دیا۔ ”انھوں نے شہر کی ہر گلی اور کونے میں منگولوں کا مقابلہ کیا۔ ہر گلی کوچہ میں انھوں نے جنگیں کیں اور ہر کوچہ سربستہ میں انھوں نے بہادری سے مزاحمت کی۔۔۔ شہر کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ مکانات اپنے سامانوں اور خزانوں کے ساتھ محض مٹیوں کا ڈھیر ہو گئے اور منگول ان کے خزانوں سے فائدہ حاصل کرنے سے مایوس ہو گئے۔“ جب منگولوں کو شہر پر جو بالکل برباد ہو چکا تھا، قبضہ کر لینے میں کامیابی حاصل ہو گئی تو انھوں نے عوام کو کھلے ہوئے میدانوں میں کھدیڑ دیا۔ ایک لاکھ سے زیادہ دستکاروں کو چنا گیا اور انھیں مشرق کے ملکوں میں بھیج دیا گیا بچوں اور نوجوان عورتوں کو قیدیوں کی حیثیت سے لے جایا گیا۔ بقیہ کو ذبح کر ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ ہر منگول نے 24 اشخاص کی گردنیں ماریں۔ کسی بھی باشندے کو نہیں چھوڑا گیا۔ پورے دشت کو یا مغرب کے صحرائی خطہ کو جہاں تک منگولوں اور تاتاروں کے گھوڑے پہنچ سکتے تھے خاندانی ورثہ کے طور پر جوجی کے حوالے کر دیا گیا۔

یمہ اور سُبتائی کی مہم

ان دونوں بھائیوں کا مشن سلطان کو زندہ گرفتار کرنا تھا جس میں وہ ناکام ہو گئے لیکن سبتائی الال کے مازندراں قلعہ میں ترکان خاتون اور سلطان کے حرم کو اس کے وزیر ناصر الدین کے ساتھ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب انھیں چنگیز کے

پاس طالقان لایا گیا تو اس نے ناصر الدین کو سخت جسمانی ایذا پہنچائی اور سلطان کے تمام مرد لڑکوں کو قتل کر دیا گیا۔ جلال الدین منکبرنی اور سلطان کے دیگر لڑکے جو آخر وقت تک اس کے ساتھ ہی تھے منگولوں سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ بہر حال کیسپین ساگر ارد گرد یمہ اور سبتائی کا چکر لگانا عسکری تاریخ کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ ان کی تیس ہزار کی فوج اس خطہ کی فتح یابی کے لیے حقیقتاً کافی نہ تھی اور بسا اوقات یمہ اور سبتائی کو الگ الگ کوچ کرنا پڑتا تھا۔ جہاں کہیں ان سے ہو سکا انھوں نے قتل عام کا سہارا لیا تاکہ ایک ایسی دہشت ناک فضا پیدا کر دیں جس میں خورد و نوش کے ذخائر حاصل ہو سکیں۔ بالآخر آزربائجان اور عراق کو تاراج کر لینے کے بعد وہ کوہِ قاف اور کاسپین ساگر کے درمیان ایک تنگ گزرگاہ دربند سے ہو کر شمال کی طرف روانہ ہوئے اور کاسپین کے شمال میں قبچاق صحرا کے راستے چنگیز سے آملے۔ اس مہم کی حقیقی اہمیت شمالی ایران میں اس کی تحقیقانہ اور تفتیشانہ کردار میں تھی۔ اس راستہ کا دوبارہ استعمال بہت سے اہم منگول فوجوں کی قسمت میں لکھا تھا۔

تولوئی کا خراسان اور مرو کو فتح کرنا

چنگیز نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے تولوئی کو اپنے ساتھ ہی رکھا تھا لیکن بلخ کے قتل عام کے بعد اس نے ہر دس آدمیوں کے ایک دستہ سے ایک آدمی دیا اور خراسان کو فتح کرنے اور خاص طور پر مرو، نیشاپور اور ہرات کے بڑے بڑے شہروں کو تباہ کر دینے کی غرض سے بھیجا۔ تولوئی، جس کے مقدر میں ایک مصیبت زدہ اور مفلوج شرابی کی مانند اپنی زندگی کو ختم کرنا تھا اور جو شدید طور پر ان لوگوں کی روحوں سے خائف رہتا تھا جنھیں مار ڈالا گیا تھا، اپنی زندگی کے اس مرحلہ میں غیر معمولی طور پر بے رحم اور کارگزار تھا۔ خراسان میں ایسے لوگوں کے درمیان جو مطیع ہو جانا چاہتے تھے اور جو آخری دم تک مزاحمت پر مصر تھے، رائے میں شدید طور پر اختلاف تھا۔ اس کے علاوہ منگولوں کے خوف کی وجہ سے بہت سے لوگ، جن میں ستر ہزار ترکمان بھی شامل تھے، مرو کی گھاٹی میں آ گئے۔ تولوئی نے ترکمانوں کا جلد ہی خاتمہ کر دیا اور شہر مطیع ہو جانے پر مجبور کر دیا اس کے بعد ایک سخت ظالمانہ طرز عمل اختیار کر کے اس

نے تمام مخالفت کو کچل ڈالا۔ مرو کے تمام باشندوں عورت اور مرد دونوں ہی کو باہر لایا گیا۔ اس کے بعد چار دن اور راتیں میدان میں رکھ کر انھیں مار ڈالنے کا حکم دے دیا گیا۔ ہر منگول کو تین سے لے کر چار سو اشخاص کی گردنیں مارنی پڑیں ایک شخص سید عزالدین نسابہ کو جو اپنے چند دوستوں کے ساتھ قتل عام سے بھاگ نکلے تھے، تیرہ دن اور راتیں ایسی لاشوں کے گننے میں صرف ہو گئیں جن کا آسانی سے انکشاف کیا جا سکتا تھا۔ اس کی تعداد تیرہ لاکھ تھی (فروری 1221ء) مرو کی گھاٹی کی زرخیزی کے پیشِ نظر یہ تعداد ایک مبالغہ معلوم نہیں پڑتی لیکن لوگ شہر میں بار بار اکٹھا ہوتے اور انہیں بار بار تباہ کیا گیا۔

نیشاپور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیشاپور پور نے یمہ کے ساتھ مصالحت کر لی تھی لیکن خورد و نوش کے ذخائر کے بار بار مطالبہ نے عوام کو سخت مصیبت سے دو چار کر دیا (لیکن) اب جب کہ خراسان کے شہروں کو مکمل بربادی کا فیصلہ ہی ہو چکا تھا، نیشاپور پر حملہ کے لیے کسی بہانہ کا تلاش کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اسی اثنا میں کہ تولوئی مرو پر حملہ کر رہا تھا چنگیز کا ایک داماد تغاجار گورگاں دس ہزار کی فوج کے ساتھ نیشاپور میں نمودار ہوا۔ وہ اتفاقاً ایک تیر کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا اور منگولوں کی بداعمالیوں کے معذرت خواہوں کو اس واقعہ میں نیشاپور کی مکمل تباہی کا ایک جواز مل گیا۔ تولوئی کی فوج کی آمد نے انتظار کے دوران تغاجار کی فوج چھوٹے چھوٹے شہروں پر حملہ کرنے کی غرض سے پیچھے لوٹ آئی۔ سبزدار (بیہق بھی کہا جاتا ہے) پر تین دنوں کی سخت جنگ کے بعد قبضہ کر لیا گیا اور ایک عام قتل کا حکم ہوا۔ اور ستر ہزار لاشوں کو گن دیا گیا۔ نقان اور قار دو دیگر شہروں کو بھی فتح کر لیا گیا اور ان کے باشندوں کو قتل کر ڈالا گیا۔ تولوئی نے اپنی آمد پر نیشاپور کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا بدھ (17 اپریل 1221ء) کو جنگ شروع ہوئی اور سنیچر کو شہر پناہیں منگولوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ تمام باشندوں کو باہر لایا گیا اور انھیں قتل کر ڈالا گیا۔ اس کے بعد تغاجار کی بیوی اپنے ہم رکابوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوئی اور جو لوگ بچ گئے تھے

انھیں بھی قتل کرڈالا گیا۔ یہاں تک کہ بلیوں اور کتوں کو بھی نہ چھوڑا گیا۔

"نیشاپور کے جو باشندے زندہ رہ گئے وہ صرف چالیس دستکار تھے جنھیں ان کی ہنر مندی کی بنا پر ترکستان لے جایا گیا۔ سات دن اور راتیں شہر میں پانی بہایا گیا تاکہ جو بویا جا سکے۔ بعض تاریخوں میں کہا گیا ہے کہ بارہ دنوں تک مردوں کو گنا گیا اور یہ کہ عورتوں اور بچوں کی لاشوں کے علاوہ دس لاکھ چالیس ہزار لاشیں تھیں[1]"۔

اس مقصد کے لیے مردوں کی لاشوں کا عورتوں اور بچوں کی لاشوں سے الگ ڈھیر لگایا گیا۔ اب اس عظیم تاریخی شہر کے محل وقوع پر کچھ بھی باقی نہیں ہے۔" میں نے قدیم شہر نیشاپور کی شکستہ دیواروں سے گھرے علاقے میں صحرائی پرندوں (Sandgrouse) کا شکار کیا ہے اور وہاں میں نے منگول کاشت کی غیر شعوری تقلید میں جو کی کاشت ہوتے ہوئے دیکھا"۔ یہ ہمیں سر پرسی سائیکس (Sir persysykes) اپنی فارس کی تاریخ" (History of Persia) میں بتاتے ہیں[2]۔ لیکن اس علاقہ میں دو بڑے ٹیلے جو مٹی سے ڈھکے ہوئے ہیں جو غالباً نیشاپور کے مکانات کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں پر مشتمل ہیں جو مقامی بھرتی فوج نے اکٹھا کر دی تھیں کیونکہ شہر کو کھیتوں میں تبدیل کرنے سے پہلے یہ عمل ضروری تھا۔

ہرات

ملک شمس الدین جرجانی جسے علاؤ الدین خوارزم شاہ نے تقریباً ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ ہرات کا انچارج متعین کیا تھا، نے قسم کھائی تھی کہ وہ کسی حال میں بھی منگولوں اور تاتاروں کے آگے گھٹنے نہ ٹیکے گا۔ لہٰذا تولوئی کی آمد کے بعد ایک زبردست جنگ ہوئی لیکن جب ملِک کا انتقال ہو گیا تو محافظ فوج کی رایوں میں اختلاف ہو گیا۔ بالآخر جب تولوئی نے بذات خود خندق پر سے ان سے بات چیت کی اور انتہائی درجہ کی قسمیں کھا کر انھیں یقین دلایا کہ وہ اس خراج کے نصف پر ہی جو وہ خوارزم شاہ کو ادا کرتے تھے مطمئن ہو جائے گا تو ان لوگوں نے مطیع ہو جانے کا فیصلہ کیا تو تولوئی نے تقریباً بارہ ہزار سپاہیوں کو جو سلطان جلال الدین منکبرنی کی ملازمت میں تھے قتل کر دیا

---

(1) روضۃ الصفا، جلد پنجم، ص 37، فارسی متن

(2) فارس کی تاریخ، جلد دوم، ص 81

گیا اور منگول شحنا منتک تائی کی ماتحتی میں شہزادہ ملک ابو بکر کو انتظامیہ کا انچارج متعین کرنے کے بعد وہ اپنے باپ سے ملنے طابقان واپس چلا گیا۔ لیکن جب جلال الدین منکبرنی نے غزنی پہنچ کر اور وہاں اپنی فوج کی از سر نو تنظیم کے بعد پاردان میں ایک منگول فوج کو شکست دے دی تو افواہ اور خوش خیالوں کی بنا پر اس عارضی فتح کو منگولوں کی مکمل شکست کے مترادف سمجھا گیا۔ اس خطہ کی تاریخ کے ہم عصر ماخذ طبقات ناصری اور روضۃ الصفا دونوں ہی ہمیں بتاتے ہیں کہ خراسان کے بہت سے شہروں کے مسلمانوں نے علم بغاوت بلند کیا اور منگول شحناؤں کو مار ڈالا۔ چنگیز اس اچانک بغاوت سے گھبرا گیا اور تولوئی کو موثر طور پر اپنی تلواروں اور بھالوں کو استعمال نہ کرنے کا قصور وار ٹھہرا کر ایک چیک تائی نوین کو اسی ہزار آدمیوں کے ہمراہ ہرات کی پوری آبادی کو مار ڈالنے کی واضح ہدایات کے ساتھ روانہ کیا۔ ایک چیک تائی چھ ماہ اور سات دنوں تک کے محاصرہ کے بعد ہرات کو زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا اور جمعہ کی صبح کو زبردستی شہر کے اندر داخل ہو گیا۔ (1222) سات دنوں تک منگولوں نے اپنے آپ کو قتل و خون، آتش زنی اور عمارتوں کو برباد کر دینے میں لگائے رکھا۔ 16 لاکھ سے کچھ ہی کم باشندے شہید کر ڈالے گئے۔ اس کے بعد ایک چیک تائی نے کالیوان کے قلعہ کے خلاف پیش قدمی کی لیکن دس ہزار کے ایک منگول دستہ کو اس نے واپس بھیج دیا، جس نے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل کر ڈالا جو ہرات میں دوبارہ اکٹھا ہو گئے تھے۔

بالآخر صرف خطیب مولانا شرف الدین اور دیگر پندرہ اشخاص جن کے نام تاریخ ہرات میں مرقوم ہیں باقی بچے ان پندرہ اشخاص میں سے ایک تاتار کے چلے جانے کے بعد اپنی پوشیدہ جگہ سے باہر نکلا۔ وہ ایک مٹھائی بیچنے والے (حلوائی) کی (خالی) دوکان کے سامنے بیٹھ گیا اور تاحد نظر کسی کو نہ دیکھ کر اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور چیخ اُٹھا "خدا کا شکر ہے کہ ایک لمحہ کے لیے مجھے سکون کے ساتھ سانس لینے کا موقعہ ملا ہے" ہرات کے مضافات سے چوبیس دیگر اشخاص ان سے آ ملے اور پندرہ سالوں تک ہرات کے شہر یا ہرات کی سرزمین پر ان چالیس اشخاص کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ لوگ ملک غیاث الدین[1] کے مقبرے کے گنبد کے نیچے رہتے تھے۔ جس کو

---

(1) غالباً غیاث الدین غور کا مقبرہ مراد ہے۔

منگولوں نے تباہ نہ کیا تھا۔ اگر کوئی شخص آمو دریا سے لے کر استر آباد (مازندران میں) کی سرزمین تک کے خطہ میں کسی گوشہ یا غزلہ میں زندہ بچ رہا تو اسے ایک مدت تک خشک روٹیوں اور سڑے ہوئے گوشت پر گزر بسر کرنی پڑی[1]۔

سندھ کی جانب چنگیز کی روانگی

1221ء کے موسم گرما کے اختتام پر چنگیز نے آمد کے شمالی کنارے پر واقع شہر ترندے کے جنوب کی طرف پیش قدمی کی عوام نے مطیع ہونے سے انکار کر دیا۔ گیارہویں دن منگولوں نے اچانک اس مقام پر قبضہ کر لیا۔ چنگیز نے باشندوں کی گردن مار دینے کے لیے اپنے سپاہیوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور شہر کے مکانات منہدم کر دیئے گئے۔ اس کے بعد اس نے تاجکستان کے دو مقام کنکرت اور شمان میں موسم سرما کا اپنا کیمپ قایم کیا اور اپنے سپاہیوں کو آمو کے اس پار بدخشاں کے شہر کو زیر کرنے کے لیے روانہ کیا۔ 1222ء کے موسم بہار میں اس نے خود آمو دریا عبور کیا۔ بلخ جو آمو دریا کے جنوب میں واقع تھا، ایک نہایت خوش حال شہر تھا اور صرف اس کے ممتاز باشندوں کی تعداد پچاس ہزار تھی[2]۔ باشندوں نے چنگیز کے پاس اپنے نمائندے بھیجے اور مطیع ہو گئے لیکن انجام کار نے یہ ظاہر کر دیا کہ، جیسا کہ بعد میں ہرات میں ہوا۔ چنگیز بلخ کے باشندوں کو زندہ باقی رکھنے پر تیار نہ تھا۔ ایک بہانے سے کہ مردم شماری کی جائے گی تمام باشندوں کو شہر کی دیواروں سے باہر ایک میدان میں لایا گیا اور وہاں انھیں گردن زدنی کے لیے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

چنگیز کے حامی اس کے جرم کو اس بنیاد پر حق بجانب ثابت کرتے ہیں کہ سلطان جلال الدین نے غزنی میں قدم جما رکھا تھا۔ جہاں تک خراسان اور افغانستان کے شہروں کا تعلق تھا، وہاں کے شہریوں کا ایک ہی انجام ممکن تھا۔ خواہ وہ چنگیز کے مطالبے کو منظور کر لیتے یا لڑنے کا فیصلہ کرتے۔ طالقان کی محافظ فوج نے اطاعت گزاری کی صورت میں بقا کے لیے چنگیز خاں کے جھوٹے وعدوں کے بہلاوے میں

---

(1) روضۃ الصفا، جلد پنجم ص ص 39-38

(2) ایضاً، ص 36

آنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے رات اور دن چھ ماہ تک جنگ کی اور یہ دکھلا دیا کہ ایک اچھی لیڈر شپ کیا کچھ حاصل کر سکتی تھی۔ چنگیز خاں لاچار رہا یہاں تک کہ تولوئی کی آمد نے اسے قلعہ پر قبضہ کے لائق بنایا۔ توقع کے مطابق قلعہ یا اس کے باشندوں کا نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑا گیا۔ بامیان میں چغتائی کا بڑا لڑکا اتفاقاً ایک تیر سے مار ڈالا گیا۔ چنگیز نے انتقاماً اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اس مقام پر قبضہ کر لیں اور کوئی بھی زندہ مخلوق۔ یہاں کہ بلیوں اور کتوں تک کو نہ چھوڑیں۔ حاملہ عورتوں کے رحموں کو چاک کر کے بچوں کے سروں کو کاٹ ڈالا گیا اور شہر پناہوں، محلوں اور مکانات کو منہدم کر دیا گیا[1]۔

سلطان جلال الدین مکبرنی کی زندگی

علاؤ الدین خوارزم شاہ نے غزنی کی مفتوحہ سلطنت اپنے بڑے بیٹے سلطان جلال الدین منکبرنی کے سپرد کر دی تھی جو کسی جگہ اپنے قدم نہ جما سکنے پر بال بال بچنے کے ایک متواتر سلسلہ کے بعد غزنی جا پہنچا۔ یہاں پچاس ہزار کی ایک خوازمی فوج امین مَلِک کی ماتحتی میں متعین کی گئی تھی اور سیف الدین اغراق کی ماتحتی میں بھی ایک غوری فوج اس کی مدد کے لیے آگئی۔ جلال الدین نے موسم سرما غزنی میں گزارا لیکن 1222ء کے موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی وہ منگول جنرل تکجک اور موسوغور کے خلاف روانہ ہوا اور انھیں یاروان جو بامیان کی سرحد پر ایک مقام ہے کی جنگ میں شکست دی۔ لیکن منگولوں کے خلاف ایک لائق لیڈر کی ہر دل عزیز خواہش سرداروں کے انتشار پسندانہ رویّہ کی بنا پر مفلوج ہو کر رہ گئی۔ امین ملک اور سیف الدین اغراق ایک گھوڑے کے لیے لڑ پڑے۔ امین نے اغراق کے سر پر ایک کوڑے سے مار دیا اور چونکہ جلال الدین امین امَلِک کو سزا نہیں دے سکتا تھا لہٰذا اغراق اور غوریوں نے یک جماعت ہو کر سلطان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دو ماہ کے اندر ہی ان کی قسمت میں ایک دوسرے کے ہاتھوں اور منگولوں کے ہاتھوں برباد ہونا لکھا تھا۔ لیکن جلال الدین کی طاقت بھی پارہ پارہ ہو گئی

---

(1) ایضاً، ص 36

اور اس نے دریائے سندھ کو عبور کرنے اور ہندستان میں پناہ لینے کے انتظامات کرنے شروع کر دیے۔ جیسے ہی وہ دریا عبور کرنے والا تھا چنگیز کی فوج وہاں تک جا پہنچی۔ جلال الدین نے بہادری سے لڑ کر منگولوں کو پیچھے کھدیڑ دیا جنھوں نے اسے ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا اور اس کے بعد واپس لڑتے ہوئے اس نے اپنے گھوڑے کو سندھ میں اتار دیا۔ اور اپنے شاہی چھتر کو اپنے ہاتھوں میں لیے اسے عبور کر لیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے اپنا چھتر زمین میں گاڑھ دیا اور اس کے سائے میں بیٹھ گیا۔ چنگیز حیرت زدہ رہ گیا ”ایک باپ کے ایسا ہی بیٹا ہونا چاہیے“ اس نے یہ اظہار خیال کیا اور اپنے منگولوں کو تیر نہ چلانے کا حکم دیا۔

جلال الدین کی آئندہ زندگی کے متعلق یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے تقریباً تمام چیزیں۔ اپنا خاندان، اپنا خزانہ اور اپنا لشکر سندھ کے دوسرے کنارے پر چھوڑ دیں۔ اس نے چند سال اپنے آپ کو ہندستان میں مستحکم کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس کی بار بار کی کوششیں ناکام ہو گئیں تو وہ کرمان ہو کر اصفہان اور تبریز چلا گیا اور ایک ایسی زندگی کے بعد جو طاقت و قوت اہمیت و جرات اور بے دھڑک ذاتی شجاعت کو بہادری میں ممتاز تھی۔ وہ 1231ء میں چند کردوں کے ہاتھوں مار ڈالا گیا۔ اپنے زمانہ کے مسلم جنرلوں میں تنہا وہی تھا جو منگولوں کے مقابلہ سے کبھی خائف نہ ہوا۔

منگول کا غور کو فتح کرنا

منگولوں کے ذریعہ غور کی سلطنت کی فتح کے سلسلہ میں اپنے بیان کو مکمل کرنے کی لیے چند الفاظ ضروری ہیں۔ ازبیکتائی کو سلطان جلال الدین منکبرنی کے تعاقب کے لیے بھیجا گیا۔ وہ سلطان کو تلاش نہ کر سکا لیکن اس نے قباچہ کو شکست دیدی۔ اس نے ملتان کا محاصرہ کیا۔ یہاں تک کہ موسم گرما کی سختی نے اسے واپس ہونے پر مجبور کر دیا اور اس نے راستہ میں لاہور کے مضافات کو لوٹا کھسوٹا۔ غزنی کے عوام اوگتائی کے مطیع ہو گئے پھر بھی ان تمام کو، سوائے منتخب کردہ دستکاروں کے، قتل کر دیا گیا۔ چنگیز نے اپنے کیمپ کے ہندستانی غلاموں کو فی کس چار سو من چاول کو

صاف کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ لوگ اس کام سے فارغ ہو گئے تو تمام کی گردن اڑا دی گئی[1]۔ اوگتائی کی فوج کا ایک دستہ 1222ء میں فیروز کوہ کے خلاف روانہ کیا گیا۔ باشندوں کو مار ڈالا گیا اور فیروز کوہ کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ صرف سیفرود اور تولک ہی ایسے قلعے تھے جو منگول محاصرہ سے بچ نکلے۔ لیکن ان کے بیشتر باشندوں کو منگول فوجوں نے اس وقت مار ڈالا جب وہ لوگ محاصرہ کے اٹھا لیے جانے کے بعد نیچے اترے[2]۔ عجم کے قلعوں میں تنہا صرف تولک چار سالوں تک کامیابی کے ساتھ محاصرے کے سامنے ڈٹا رہا۔ منہاج السراج غرجستان کے پانچ مضبوط قلعوں کا نام دیتا ہے۔ ان تمام کو 1222ء میں اوگتائی کے دستوں نے مغلوب کر لیا۔ کالیوان اور فیوار کے ناقابلِ حصول قلعوں کا معاملہ تو اور بھی زیادہ دلچسپ ہے جو ہرات سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے واقع تھے۔ سوری جذب اور کیلا لیق ارسلان نے ان کا محاصرہ کیا۔ ان پر طاقت سے قبضہ کر لینا ممکن نہ تھا لیکن جب تقریباً ایک سال میں دونوں قلعوں کی محافظ فوجوں کو وبائی مرض نے ہلاک کر دیا تب منگول ان پر قبضہ کر سکے[3]۔

بھڑوں کے مونڈھوں نے جن سے وہ مشورہ لیا کرتا تھا چنگیز کو ہندستان کے راستہ چین کی طرف بڑھنے کی اجازت نہ دی۔ ساتھ ہی اس کے ایجنٹوں نے اسے اطلاع دی کہ تنگوت (ہسیا) اور کِن کا رویہ مخالفانہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر بھی وطن کی جانب اس کا سفر دھیرے دھیرے ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ سمرقند کے مقامات میں اس نے دو مسلم محققین سے گفتگو کی اور خدا پر اسلامی اعتقاد اور حج کے علاوہ اس کے چار اعتقاد کے ساتھ اپنے اتفاق کا اظہار کیا۔ "خدا ہر جگہ ہے اور تم اسے ہر جگہ پا سکتے ہو" اس نے مزید مسلم مذہبی رہنماؤں (اماموں) اور قاضیوں کو تمام ٹیکسوں سے مستثنیٰ کرنے کا ایک حکم بھی نافذ کیا۔

---

(1) طبقات ناصری، فارسی متن، ص 361، موٹے طور پر ایک ایرانی من سے مراد چاول کی اتنی مقدار ہے جسے آپ اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا سکتے ہیں۔

(2) ایضاً، ص 70-364، منہاج السراج جس نے تولک میں جنگ کی تھی، دونوں قلعوں کی تفصیل بتاتا ہے۔

(3) ایضاً، ص 60-357

چنگیز خاں 1224ء میں اپنے وطن پہنچا۔ اس کے آخری سال تنگوت کی فتح میں صرف ہوئے۔ لیکن فتح کی تکمیل سے پہلے ہی رمضان 624ھ (اگست 1227ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اسے منگولوں یا بلکہ اس عہد کے شروع سے لے کر آخیر تک کے صحرائی سرداروں کے عام قاعدے کے مطابق دفنایا گیا۔ منہاج السراج کہتا ہے کہ:

''ان لوگوں کے یہاں کا یہ رواج ہے کہ جب ان کے سردار کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ زمین کے اندر ایک مکان یا ایک حجرہ (صفہ) اس آدمی کی حیثیت کے لحاظ سے بناتے ہیں جو جہنم رسید ہو چکا ہے۔ وہ اس مقام کو ایک تخت، قالینوں، برتنوں اور بہت سی قیمتی اشیا سے سجاتے ہیں اس کے اسلحوں اور ان تمام چیزوں کو جن کا وہ شائق تھا اس جگہ رکھ دیا جاتا ہے اس کی کچھ عورتوں اور غلام لڑکیوں کو اور دیگر اشخاص کو بھی جن سے وہ اوروں کی بہ نسبت زیادہ محبت کرتا تھا اس حجرہ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس مقام کو مٹیوں سے بھر دیا جاتا اور اس کے اُوپر درختوں کو لگا دیا جاتا تاکہ اس مقام کا انکشاف ناممکن ہو جائے۔ ان کے اس رواج سے تمام مسلمان اچھی طرح واقف ہیں۔ [1]''

چنگیز کی موت کو تین ماہ تک راز میں رکھا گیا تاکہ اس کے افسران تنگوت کی فتح کو مکمل کر سکیں۔ اس کی قبر کا نشان و پتہ نامعلوم ہے۔

وہ شخص جس نے تاریخ میں مندرج سب سے وسیع پیمانے پر موت کی سودے بازی کو باعث تفخر سمجھا تھا اور جو اپنے دشمنوں کی سڑی ہوئی لاشوں کو بڑی مشتاقانہ نظروں سے دیکھا کرتا تھا اور ان کے کاسہ سر سے جام شراب بنایا کرتا تھا اب اپنی باری میں کیڑوں اور مکوڑوں کا شکار ہونے کے لیے بلایا گیا۔ انسانی تاریخ میں سب سے بڑے مجرم کی حیثیت سے اس کی پوزیشن کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا مشاہدہ کر چکا تھا اور اس کے کردار اور صلاحیتوں کی نشو و نما تجربے کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ اس کی سنگدلی (سفاکی) نے اسے اس قابل بنایا کہ اپنے مد مقابل سرداروں کا مکمل خاتمہ کر کے صحرائی علاقہ کے اموسوں کو ایک متحدہ ایکائی بنا سکے۔ اس کی ذہانت اور اعلا درجہ کی اس کی تنظیمی صلاحیت پر کوئی شک نہیں۔ لیکن عجم

---

(1) ایضاً، ص 307

میں اس کی عسکری فتح، جیسا کہ گزشتہ جائزہ ظاہر کرتا ہے دراصل اس کے ناجائز اور بزدلانہ طریقہ جنگ کی بدولت تھی۔ بلکہ حقیقت میں اس کے کردار کے اس کمینہ پن (رذالت) کی بنا پر جس کے تحت اس نے ایک نہایت وسیع پیمانے پر شہری آبادی پر حملے کیے یہ ایک ایسا طریقہ جنگ تھا جس کی آرام طلب مسلمانوں اور چینیوں نے توقع نہ کی تھی۔

مسلمانوں نے جو مصیبتیں جھیلیں ان پر مزید تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن صحرا کے ان گڈریے سپاہیوں (Shepherd Soldiers) کا، خواہ ہم انہیں منگول، تاتار یا ترک کہیں۔ جو پاک اور ناپاک کے درمیان فرق نہیں جانتے تھے، کیا ہوا؟ ان کے لیے جیسا کہ مستقبل میں ظاہر ہوا، پوری مہم ایک زبردست فریب تھی۔ جوینی نے تقریباً 1259ء میں لکھا کہ ”چنگیز خان کے پوتوں اور پڑپوتوں کی تعداد دس ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنا ایک مقام، یورت (علاقہ)، فوج اور ساز و سامان رکھتا ہے[1]۔“ چونکہ مقامی گروپوں کے لیڈروں کو بالکل نیست و نابود کر دیا گیا تھا لہٰذا چنگیز خاں کے اخلاف اور اس کے افسران نے عجم پر ڈیڑھ صدی تک حکومت کی یہاں تک کہ تیمور نے ان کی جگہ پر خود اپنی پسند کے ایک سرکاری گروپ کو متعین کر دیا۔ لیکن لڑنے والے عام سپاہیوں کا کیا ہوا؟ فتح بھی بہتوں کی موت کا سبب بنی اور مال غنیمت- چارے، مویشی اور اسی طرح کی چیزیں جو انھوں نے اکٹھا کی تھیں- زیادہ دنوں تک نہ چل سکیں۔ رفتہ رفتہ ان میں کا صحرائی عنصر مر کر ختم ہو گیا یا نپولین کے پسندیدہ الفاظ میں ”کھا پی ڈالا گیا“ ایرانی اور ترکی دونوں ہی بدنصیب مسلم بھرتی فوجوں کو جنھیں منگول فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا منگول بنانے کی ایک کوشش- جو کامیابی کے بغیر نہ تھی- کی گئی اور انھوں نے رفتہ رفتہ صحرائی عنصر کی جگہ لے لی۔

مذہبی معاملات میں چنگیز متحمل اور بردبار تھا اس نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی عیسائیت یا اسلام اپنانے سے نہیں روکا۔ لیکن ان سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ اس کی یاساؤں (کے احکام کی) پیروی کریں گے۔ یعنی صحرائی حکمراں طبقہ کو اس کی وحشیانہ رسم و رواج کے ساتھ ساتھ قایم رکھیں گے۔ سر ہنری ہورتھ (Sir Henry

---

(1) تاریخ جہاں گشا، فارسی متن، جلد اوّل ص 31، بوائل کا ترجمہ جلد اوّل ص 46

Howorth) کے انداز پر چنگیز کی تصویر ایک زبردست مقنن کی حیثیت سے کھینچنا ایک زبردست بھول ہے۔ بلاشبہ یاسائیں صحرائی اشرافیہ کی اقتدار اعلا قایم رکھنے کے سلسلہ میں ایک عارضی اہمیت کی حامل تھیں۔ لیکن ان یاساؤں، جنھیں فارسی ذرائع سے بآسانی مرتب کیا جا سکتا ہے، کا ایک محتاط مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی انسانی ترقی میں کسی طور پر سمجھوتہ نہ ہوا۔ جرائم سے متعلق یاسائیں وحشیانہ ہیں اور محض ان کا مقصد عسکری نظم وامبصاد کے ایک اعلا معیار کو برقرار رکھنا تھا۔ شہری حقوق کے سلسلہ میں کوئی یاسائیں نہیں ہیں۔

پھر بھی کامیابی کی مانند کوئی کامیابی نہیں ہے۔ تمام آزاد اور مخالف لیڈروں کی مکمل تباہی نے اس بات کو یقینی بنا دیا کہ ایک صدی تک عجم کی ساری خانہ جنگیاں چنگیز خاں کے اخلاف اور اس کے افسران کے درمیان ہوں گی۔ اور یہ کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو ٹھیک اسی انداز پر تباہ و برباد کریں گے جو انداز اس نے انھیں سکھایا تھا۔

5

قاآن اور منگول اولوسات

اُولوسات

اپنی مفتوحہ مملکت، جس کا علاقہ ایک سال کی مسافت کے برابر تھا، میں کسی مخالف کے باقی نہ رہ جانے کے بعد چنگیز خاں نے اس قسم کے دلائل کے ذریعہ جنھیں ہم ایسوپ کی کہانیوں (Aesop's Fables) میں پاتے ہیں اپنے بیٹوں اور رشتہ داروں کو اتحاد کے فوائد کی تعلیم دینا شروع کیا۔ انہوں نے اس کی تعلیمات کو بس چوبیس سالوں تک یاد رکھا لیکن اس کے بعد بے رحمی اور ظلم کے انہیں مزاجوں پر جو انھوں نے اس سے سیکھا تھا ایک دوسرے کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خاں کا خیال یہ تھا کہ اس کے چاروں بیٹوں اور ان کے اخلاف کے پاس اپنے اپنے علاحدہ اُلوس (فوجیں، جتھے، سلطنتیں) ہوں۔ اور یہ کہ اس کے خاندان اور اس کی مملکت کے اتحاد کو ایک قاآن کے ذریعہ برقرار رکھا جائے۔ قاآن کی نامزدگی اس کے فوری پیش رو کے ذریعہ ہو اور اس کی تصدیق اس پیش رو کے مرنے کے بعد ایک قوریلائی یا شہزادوں اور اعلیٰ افسران کی اسمبلی کے ذریعہ ہو۔

منگول مملکت کی توسیع چنگیز کے پوتوں، منگو، ہلاکو اور قوبیلائی تک جاری رہی۔ اس کے بعد اس کے علاحدہ علاحدہ حصے اپنے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کم ہونے لگے۔ چنگیز نے اپنی مملکت اپنے چاروں بیٹوں میں تقسیم کر دی تھی لیکن خانہ جنگیوں اور انقلابات نے بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ بہر حال کوئی ایسا دشمن نہ تھا جس سے خوف کھایا جائے اور ہم چنگیز کے اخلاف کی ماتحتی میں مندرجہ ذیل الوسات یا

مملکتیں پاتے ہیں۔

(1) سفید جتھہ

چنگیز کے سب سے بڑے لڑکے جوجی کے حوالے پورا مغربی صحرائی میدان تھا۔ اس کا انتقال اپنے باپ کی زندگی ہی میں ہو گیا۔ اس کا سب سے بڑا لڑکا اورڈہ سیر دریا کے شمال مشرق میں سفید جتھے کا حکمراں ہوا۔ اسے توقتمش غیاث الدین نے سنہرے جتھے (Golden Horde) کے ساتھ متحد کر دیا (91-1376ء)[1]۔

(2) سنہرا جتھہ

جوجی کے دوسرے بیٹے باتو نے سنہرے جتھے پر حکومت کی جو روس اور مشرقی یوروپ تک پھیل گیا تھا اور تمام الوسوں میں سب سے زیادہ خوش بخت تھا۔ اس کی طاقت تیمور نے کچل ڈالی فارسی مصنفین اس کا تذکرہ الوس جوجی کے نام سے کرتے ہیں۔

(3) منگولیا

چونکہ منگول قانون کے مطابق ورثہ سب سے چھوٹے لڑکے کے حصہ میں آتا تھا لہٰذا منگولیا کے الوسات تولوئی کو ورثہ میں ملے۔ منگ حکمرانوں خاندان نے جس نے چین میں منگولوں کا استیصال کر دیا تھا، منگولیا پر بھی اپنا اقتدار قایم کر لیا۔ 1634ء کے بعد تولوئی کے اخلاف کی حیثیت چین کے باجگزار کی ہو گئی۔

(4) چین کا یوآن خاندان

جب منگو قاآن 1248ء میں تخت پر آیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اس کا ایک بھائی قوبیلائی چین کا حکمراں ہو اور دوسرا بھائی ہلاکو ایران کا حکمراں ہو۔ چین میں حکمرانی کرنے والے دو خاندان کن اور ہسیا (یا تنگوت) کا پہلے ہی استیصال کیا جا چکا تھا۔ 1280ء مین چینیوں نے منگولوں کو اپنے ملک سے کھدیڑ دیا۔

---

(1) اسٹین لے لین پول (Mohammadan Dynasties) ص 321۔ اس جتھ کے آٹھ یا نو حکمراں تھے لیکن ہمارے فارسی مورخین اس کے بارے میں بہت کم علم رکھتے ہیں۔

(5) ایران کے ال خان

1258ء آتے آتے تک ہلاکو نے ایران کی فتح مکمل کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اس کا خاندان 1334ء تک اس ملک میں حکمرانی کرتا تھا۔

(6) اوگتائی چغتائی الوس

اوگتائی کو اصلاً جو سرزمین عطا کی گئی تھی اس کا انکشاف مشکل ہے۔ غالباً یہ بکعاش جھیل سے لے کر سنہرے جتھے کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔ چغتاتی کو ماوراء النہر اور ترکستان دیا گیا تھا۔ 1251ء کی قوریلتائی کے (اجلاس کے) زمانے میں بہت سے چغتائی اور اوگتائی شہزادوں کو قتل کردیا گیا۔ لیکن وہ لوگ قوبیلائی کے دورِ حکومت میں مرکزی ایشیا میں اپنا مشترکہ اقتدار قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف آخری دو اولسوں سے یہاں ہمارا تعلق ہے۔

منگول قاآن: اوگتائی

محتاط طریقے پر غور و فکر کے بعد چنگیز نے فیصلہ کیا کہ اس کا تیسرا بیٹا اوگتائی، قاآن کی حیثیت سے اس کی جانشینی کے لیے مناسب شخص ہے اور اس انتظام کے سلسلہ میں اس نے تولوئی اور چغتائی کی منظوری حاصل کرلی۔ چنگیز کے انتخاب کی 1229ء میں منعقدہ ایک قوریلتائی کے ذریعہ توثیق ہو گئی۔ اوگتائی اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں کچھ کم سنگدل تھا اور وہ ہمیشہ اتنا زیادہ مدہوش رہتا تھا کہ وہ اسے کشادہ دل سمجھتے۔ مفتوحہ سرزمینوں میں یقیناً خوف و دہشت میں کمی آگئی تھی لیکن مملکت میں توسیع حسبِ دستور قتلِ عام کے ساتھ جاری رہی لیکن سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور اس خاندان کے آخری حکمراں نے اپنے آپ کو جلا کر ہلاک کردیا۔ منگولوں کا مشہور فوجی جنرل سبتائی کو بہت سے شہزادوں مثلاً کیوک (اوگتائی کا بیٹا) اور منگو (تولوئی کا بیٹا) کے ساتھ مشرقی یورپ کے شہزادوں کے خلاف باتو کی مدد کے لیے بھیجا گیا۔ وہ سکسونی تک پہنچے اور ان کی پیش قدمی حسبِ دستور قتل و غارت کے ساتھ ساتھ ہوئی جو رماغوں، جسے ایران بھیجا گیا تھا۔ جلال الدین منکبرنی کے اقتدار کو توڑ دینے میں کامیاب

ہو گیا اور اس نے آزربائجان اور عراق کو تاراج کر لیا۔ ہندستان میں منگول لاہور کو تاراج کر لینے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس فتح کے دوسرے ہی دن خبر آئی کہ نشے کی بے ہوشی کے عالم میں عظیم قاآن کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔ تولوئی کا انتقال کچھ ہی پہلے اسی سبب سے ہو چکا تھا۔ اس کے فوراً بعد چغتائی کا انتقال ہو گیا۔

درمیانی مدت: توراکینا خاتون، کیوک

اوگتائی نے اپنی جانشینی کے سلسلے میں اپنے پوتے شرمان کو نامزد کر دیا تھا لیکن ایک قوریلتائی کے ذریعہ اس معاملہ کی توثیق کرنی تھی اور اس دوران اوگتائی کی سب سے بڑی بیوہ توراکینا خاتون نے ولی (Regent) کا فرض انجام دیا توراکینا خاتون خود اپنے بیٹے کیوک کو منتخب کرانا چاہتی تھی لیکن چونکہ وہ اپنی موافقت یا مخالفت کے معاملوں میں بہت انتہا پسند مزاج کی عورت تھی لہٰذا منگول مرکز میں پانچ سالوں تک بد نظمی و انتشار کی حکمرانی رہی۔

1246ء کے قوریلتائی کے ذریعہ کیوک قاآن منتخب ہو گیا۔ اس نے اپنی ماں کی بدانتظامی کا خاتمہ کر دیا اور اس کے بعد جلد ہی وہ انتقال کر گئی[1] لیکن کیوک اپنے اعلیٰ عہدہ کے لیے مناسب نہ تھا اور وہ چنگیز خاں کے اخلاف کو متحد نہ رکھ سکا۔ 1248ء میں کیوک اور ایک معزز چنگیزی شہزادہ باتو، جو 1246ء کے قوریلتائی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کی غرض سے روانہ ہوئے لیکن جب وہ ایک دوسرے سے ایک ہفتہ کے سفر کے فاصلہ پر تھے۔ کیوک بالیغ کے شمال تھا اور باتو الاقامہ میں تھا۔ کہ کیوک کا اچانک 43 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

منگو قاآن

اس بہانے پر کہ اسے گٹھیا کا مرض لاحق ہو گیا ہے باتو نے ایک بے ضابطہ

---

(1) کیوک کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ایک عیسائی ہے لیکن لوئس نہم کے پاس اس کے مندرجہ ذیل خط سے واضح ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کی عیسائیت پر یقین رکھتا تھا۔ "خدا نے میرے آباواجداد کو اور خود مجھے یہ حکم دیا ہے کہ ہم اپنے آدمیوں کو بدمعاش قوموں کے استیصال کے لیے روانہ کریں۔ تم پوچھتے ہو کہ کیا میں عیسائی ہوں۔ خدا جانتا ہے اور اگر پوپ بھی جانتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ آئے اور دیکھ لے (ہوورتھ اول ص125)

قوریلتائی اپنے خیمہ میں بلایا۔ اس نے اپنے لیے تاج کو رد کر دیا لیکن حاضر شہزادوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ تولوئی کے بیٹے منگو کو اپنے قاآن کی حیثیت سے منظور کر لیں۔ اوگتائی اور چغتائی شاخوں کے شہزادوں نے اپنے نمائندوں کو بھیجا تھا جو اس فیصلہ پر متفق ہو گئے لیکن جب 1251ء میں باضابطہ طور پر قراقرم میں قوریلتای منعقد ہوئی تو ان شہزادوں نے بار بار بلائے جانے کے باوجود آنے سے انکار کر دیا اور نجومیوں کے ذریعہ متعین کی گئی تاریخ، ایک جولائی کو برکا نے اپنے بھائی باتو کی جانب سے فرض انجام دیتے ہوئے منگو کو تخت پر بٹھا دیا۔ بعد میں چند مخالف شہزادے قوریلتائی کے پڑاؤ کے قریب آئے لیکن ٹھیک وقت پر اس بات کا انکشاف ہو گیا کہ ان کی گاڑیاں ہتھیاروں سے بھری ہیں اور اس بات کا شبہ ہوا کہ ان لوگوں نے ان شہروں پر جو قوریلتائی میں لطف اندوز ہو رہے تھے آدھی رات میں حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان کی لعنت ملامت کی گئی اور انہیں مار ڈالا گیا۔ اس کے بعد منگو خاں نے محمود ایلواج کے مشورہ پر ایک لاکھ کی فوج اور دوسرے بیس ہزار کی فوج ان مخالف شہزادوں کو جو گھر ہی پر رہ گئے تھے گرفتار کرنے کیلئے بھیجی۔ تقریباً ستر ہزار شہزادوں اور اعلیٰ افسران کو قتل کر دیا گیا۔ سنہرے جتھے کا حکمراں باتو کا رویہ دوستانہ مگر آزادانہ تھا۔ منگول مملکت کے بقیہ حصہ کو منگو کے زیرِ اقتدار لایا گیا۔

چنگیز اور چغتائی کی خواہش کے مطابق موخر الذکر کی جانشینی اس کے پوتے قرا ہلاکو نے کی تھی۔ لیکن کیوک نے قراہلاکو اس بنا پر برطرف کر دیا تھا کہ ایک پوتا بیٹے کے حق کو منسوخ نہیں کر سکتا ہے اور اس نے چغتائی کے ایک بیٹے بیسو کو؛ جو تقریباً مستقل نشے میں مدہوش رہتا تھا، تخت پر بٹھا دیا۔ اور قراہلاکو منگو کی قوریلتائی میں آیا اور اسکا تخت اسے دوبارہ واپس کر دیا گیا لیکن اپنے گھر جاتے ہوئے راستہ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ منگو نے سلطنت قراہلاکو کے سپرد کر دی لیکن چونکہ وہ نابالغ تھا لہٰذا انتظام حکومت قراہلاکو کی بیوہ اورگنہ کے سپرد کیا گیا۔

قوبیلائی اور اریق بوقا

ہلاکو نے منگو کے دورِ حکومت میں ایران کی فتح مکمل کر لی لیکن قوبیلائی کا کام

زیادہ وقت طلب تھا لہٰذا منگو، سونگ کے خلاف اپنے بھائی کی مدد کے لیے روانہ ہوا۔ 1268ء میں سخت پیچش سے اس کا انتقال ہو گیا۔ قوبیلائی نے پیکنگ میں اور اس کے بعد اس کے بھائی اریق بو قا نے منگولیا میں علیحدہ علیحدہ قوریلتائی منعقد کر کے اپنے آپ کو قاآن اعلان کر دیا۔ چار سال کی خانہ جنگی کے بعد اریق بو قا 1264ء میں قوبیلائی کا مطیع ہو گیا۔ اس کی جاں بخشی کر دی گئی لیکن اس کے بعد اس کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اب چنگیز کے اخلاف پیکنگ سے لے کر ہنگری تک کی آدھی دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔ لیکن منگو کے انتقال کے ساتھ ہی منگول مرکزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

ہلاکو کی ایران روانگی

ایران کے ''خان'' کی حیثیت سے اپنے بھائی کی کامیابی کے لیے منگو نے محتاط تیاریاں کیں تمام منگول شہزادوں سے ہر دس اشخاص کی یونٹ سے دو سپاہی اسے بھیجنے کو کہا گیا۔ خراسان کا ویران خطہ، جس پر چِن تیمور، کورگز اور امیر ارغون یکے بعد دیگرے حکومت کر چکے تھے اور ساتھ ہی پورا افغانستان اور راوی تک کا پنجاب جس پر منگولوں کا قبضہ تھا، ہلاکو کو منتقل کر دیا گیا اور ان علاقوں کے تمام منگول افسران کو اپنے احکامات اس کے پاس سے حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی۔ المؤت کی اسمٰعیلی ریاست اور بغداد کی خلافت کو بھی نیست و نابود کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

رشید الدین لکھتا ہے کہ منگو نے ہلاکو سے خلیفہ کے ماتحت ہو جانے کی صورت میں اس کی جاں بخشی کا حکم دیا تھا لیکن خلیفہ کی طاقت کے دوبارہ احیاء کا ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا لہٰذا ہلاکو ان دونوں ریاستوں کے صفائے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ لیکن حکمتِ عملی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ سب سے پہلے بدعتی ریاست (الموت) پر حملہ کر کے راسخ العقیدہ مسلم رائے کی حمایت حاصل کرے اور تب راسخ العقیدہ لوگوں کو دہشت زدہ کر کے بغداد پر حملہ کر دے۔ ساتھ ہی منگولوں کی سفارتی روایات جو کم سے کم جنگ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ علاقہ حاصل کرنے کی متقاضی تھی۔ نے ہلاکو کو مسلمان حکمرانوں اور ان کی رعایا دونوں ہی کے تحفظ کے سلسلہ میں وسیع پیمانہ پر ایسے وعدے کرنے پر ابھارا جنھیں وہ پورا کرنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا تھا۔ اور یہ حقیقت کہ ہتھیار

ڈال دینے والے بہر صورت بڑے پیمانے پر اس کے قتل عام کا نشانہ بنے۔ بجا طور پر ایک جھوٹے کی حیثیت سے اس کی بدنامی کا سبب بنی جس کے وعدے ناقابل بھروسہ تھے لیکن اس کے کردار کا یہ پہلو خلافتِ عباسیہ کے زوال کے بعد ہی دنیا کے لیے واضح ہو سکا۔

المؤت کی بدعتی حکومت کی تباہی

اگرچہ اس مہم کا فیصلہ 1251 کی قوریلتائی ہی میں ہو گیا تھا لیکن ہلاکو نے 1255ء کے موسم سرما تک آمو دریا کو عبور نہ کیا۔ یہ تاخیر سستی و کاہلی سے زیادہ حکمت عملی کی بنا پر تھی۔ تمام سلطانوں اور اسلام کے بادشاہوں، اور ساتھ ہی چھوٹے سرداروں کے پاس یہ مطالبہ کرتے ہوئے اطلاع نامے بھیجے گئے کہ وہ المؤت کی فتح کے لیے اپنے دستخط بھیجیں۔ اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہیں گے تو المؤت کا انجام جیسا ہی ان کا بھی انجام ہو گا۔ اہم مسلم سردار بذاتِ خود آئے۔ سب سے پہلے ہرات کا شمس الدین کرت آیا اور اس کے بعد فارس سے اتابگ سعد اور رم (Asia Minor) سے عزالدین اور رکن الدین آئے۔ خلیفہ نے اطاعت کا خط تو بھیجا لیکن فوج نہیں۔ ایک منگول فوج اس مہم کے سلسلہ میں ہلاکو کے ایک اعلیٰ افسر قتیوبوتا کی قیادت میں 1253ء میں کافروں کے قلعوں کے خلاف قہستان میں شروع کر چکی تھی۔

31؍ دسمبر 1253ء کو الموت کے علاؤالدین کو قتل کر دیا گیا اور اس کے لڑکے رکن الدین خور شاہ نے اس کی جانشینی کی۔ جب منگول فوج قہستان پہنچ گئی تو ہلاکو کے سفیروں نے خور شاہ کو یہ اطلاع دی کہ وہ اپنے باپ کے گناہوں کا ذمہ دار نہیں اور یہ کہ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بشرطیکہ وہ اپنے تمام قلعوں کو تباہ کرنے کے بعد اپنے عوام کے ساتھ مغلوب ہو جائے اور اپنی اطاعت کی پیش کش کر دے۔ علاؤالدین کے پاگل پن اور ظلم و استبداد کے باوجود اسمٰعیلیوں میں حسن بن صباح کی روح اب تک باقی تھی اور ایک جرأت مند حکمراں جو الموت سلطنت کے 105 دشوار گزار قلعوں کی کمان کر رہا تھا۔ منگولوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا تھا لیکن رکن الدین کمزور، غیر مستقل مزاج اور ناتجربہ کار تھا اس نے نمائشی طور پر چند قلعوں کی مورچہ بندی توڑ

دی اور باہر آنے کے لیے ایک سال کی اجازت چاہی۔ ہلاکو نے اپنے تئیں یہ چاہا کہ خورشاہ کو مطیع ہو جانے کے لیے دہشت زدہ کر دے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تاکہ وہ اپنے دیگر قلعوں کو بھی ہتھیار رکھ دینے کا حکم دے دے اور تب وہ آخری شخص تک ان کی گردنیں مار دے۔

3 نومبر 1255ء کو ہلاکو نے قلعۂ میمون ڈز، جس میں رکن الدین مقیم تھا، کا محاصر شروع کر دیا اور اسے پانچ دنوں کا ایک الٹی میٹم دیا قلعہ کی فتح آسان نہ تھی لیکن خورشاہ 2 دسمبر 1255ء کو ہلاکو کے پاس آیا اور اس نے اپنے تمام خزانوں کی پیشکش کر دی۔ عوام میں اس کے متعلق جو اندازہ تھا، یہ اس سے بہت کم تھا۔ عارضی طور پر خورشاہ کی ہر طرح سے عزت کی گئی اور تحفظ کے وعدہ پر مبنی ہلاکو کی ایک یریغ جس کی تصدیق خورشاہ کے ایک حکم نامہ سے بھی ہوتی تھی، نے بدقسمتوں کے پہاڑی قلعوں کی فوجوں کو نیچے آنے اور منگولوں کے آگے ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ کیا۔ لیکن لمبسر (لماسر) کا قلعہ ایک سال تک جما رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک وبائی مرض کے اثرات کی وجہ سے مفلوج ہو گیا اور گردکوہ کے قلعہ نے پورے بیس سالوں تک اپنی مزاحمت قایم رکھی۔ یہ کم از کم اس بات ظاہر کرتا ہے کہ ایک بہادرانہ لیڈر شپ کیا کچھ حاصل کر سکتی تھی۔ خورشاہ ایک منگول لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور ہلاکو نے اسے اس لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد اس نے منگو کے دربار میں جانے کی خواہش ظاہر کی اور ہلاکو نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

رشید الدین لکھتا ہے کہ ”خورشاہ کی موت کیوں کر ہوئی اس سلسلہ میں مختلف کہانیاں ہیں لیکن صحیح بیان کے مطابق جب منگو قاآن نے خورشاہ کے آنے کی خبر سنی تو اس نے کہا کہ ”وہ یہاں کیوں آ رہا ہے؟ اسے جتنا جلد ہو سکے قتل کر دیا جانا چاہیے۔“ اس نے قاصدوں کو بھیجا جنھوں نے خورشاہ کو راستہ ہی میں مار ڈالا۔ اس طرف (ایران میں) خورشاہ کے روانہ ہو جانے کے بعد اس کے تمام رشتہ داروں اور پیروکاروں۔ مردوں، عورتوں اور یہاں تک کہ پالنے میں رہنے والے بچوں تک۔ کو قتل کر دیا گیا[1]۔ کئی لاکھ یا غالباً دس لاکھ سے زیادہ پر مشتمل پوری برادری مویشیوں کی طرف

---

(1) جامع التواریخ، پیرس ایڈیشن، 1847ء ص 65، یہ ایڈیشن صرف ہلاکو کی زندگی پر مشتمل ہے۔

ذبح کردی گئی۔ (اور) زوال پذیر مسلم راسخ الاعتقادی نے اسے اسلام کی ایک خدمت سمجھا۔

خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ

اب بغداد کی "راسخ العقیدہ خلافت" کی باری تھی۔ ہلاکو خاں نے جورموغان کے جانشین بیجو نویان کو بلایا اور اسے بہت سخت سست کہا "خلیفہ کے رعب اور اس کے دبدبہ سے (اپنے) سپاہیوں کو خوفزدہ کرنے کے علاوہ تم نے اور کیا کیا؟" بیجو نے وضاحت کی کہ اس نے رَم (Asia Minor) کی سرحدوں تک عراق کو فتح کر لیا تھا لیکن بغداد کی فتح کے لیے اس کی فوج کافی نہیں تھی۔ ہلاکو نے اپنا صدر مقام ہمدان میں قایم کیا اور خلافت کے صفائے کے لیے تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ خلیفہ مستعصم کے پاس ایک حکم نامہ اس مضمون کا بھیجا گیا کہ "بدعتیوں" کے خلاف اپنے لشکر نہ بھیج کر اس نے غداری کی تھی اور یہ کہ اب اس کی خیر اسی میں تھی کہ وہ بغداد کی پشت پناہوں کو تباہ کر دے اور خندقوں کو بھر دے پھر اس کے بعد وہ بذات خود ہلاکو کے پاس آئے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہیں ہے تو وہ اپنے وزیر مویدالدین علقمی اور اپنے دوات دار کو بھیج دے۔

لیکن کیا ہلاکو کے مسلم حلیف خلافت کے معاملے میں اس کے وفادار ثابت ہوں گے؟ اس کے لیے ایک مثال قایم کرنی ناگزیر تھی جو اس معاملہ کو کسی طرح کے شک و شبہ میں نہ رکھے۔ درتانگ میں خلیفہ کے گورنر حسام الدین اکا نے ہلاکو کی اطاعت قبول کر لی تھی اس کے بعد اس نے خلیفہ کے ساتھ ساز باز کرنی شروع کر دی تھی اور کچھ معاوضہ کے بدلے میں ایک لاکھ گھوڑ سواروں کے ساتھ بغداد کی مدافعت کی ذمہ داری لی تھی۔ منگولوں نے اس بات کا اظہار کیے بغیر کہ ان لوگوں کو اس کی سازش کا علم ہو گیا ہے اکا اور اس کی فوج کو تحفظ کے اسی قسم کے جھوٹے وعدوں کے ذریعہ، جو انھوں نے خورشاہ اور بدعتیوں سے کیے تھے۔ اپنے قلعوں سے اترنے پر ابھارا۔ ایک مرتبہ کرہ اور اس کی فوج ان کے اختیار میں آگئی تو منگولوں نے ان کے ایک آدمی کو ذبح کر دیا۔ مشہور سائنسداں نصیر الدین طوسی نے، جس سے ہلاکو نے

مشورہ طلب کیا تھا، یہ رائے دی کہ وہ عام افواہ پر کوئی توجہ نہ دے کہ خلیفہ کو مار ڈالنے کی صورت میں کیا ہوگا۔ نبیؐ کے متعدد صحابہ شہید کر دیئے گئے تھے اور متعدد خلیفہ مار ڈالے گئے تھے لیکن کسی طرح کا کوئی انقلابی طوفان رونما نہ ہوا۔ بغداد کی فتح کا صرف ایک ہی نتیجہ ظاہر ہوگا کہ وہاں مستعصم کی جگہ ہلاکو حکومت کرے گا۔

اسی اثنا میں بغداد میں موید الدین علقمی کی قیادت میں ایک امن پسند گروہ اور دوات دار اور سلیمان شاہ کی قیادت میں جنگ کرنے والے گروہ میں شدید اختلاف رائے تھا۔ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرایا لیکن دونوں ہی میں سے کسی کے پاس کوئی ایسا منصوبہ نہ تھا جو بغداد کو تباہی سے بچا سکے۔ رشید الدین لکھتا ہے کہ ”عوام عباسیوں سے عاجز ہو گئے تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے“ لہٰذا خود اپنے مستقبل سے بالکل بے بہرہ ہو کر انھوں نے خلیفہ اور خلافت کے لیے کوئی سرگرمی نہ دکھائی۔ وزیر نے خاکسارانہ اور موثرانہ اطاعت کا مشورہ دیا تاکہ عباسی خلافت منگولوں سے نجات پا جائے جس طرح یہ دوسرے شاہی خاندانوں سے نجات پا گئی تھی (مزید یہ کہ) خلیفہ کو اپنے خزانوں کا ایک اہم حصہ ہلاکو کو بھیج دینا چاہیئے۔ اور جمعہ کے خطبہ میں اور سکوں پر ہلاکو کا نام کندہ کرانا چاہیئے[1]۔

دوات دار نے کہا کہ جیسے ہی یہ خزانے بغداد سے باہر جائیں گے وہ انہیں لوٹ لے گا لہٰذا کچھ بھی بھیجا نہ جا سکا۔ دوسری طرف تربیت یافتہ سپاہی دستیاب نہ تھے جنگ کا حامی گروہ محض غنڈوں کو بھرتی کر سکتا تھا۔ اور خلیفہ ان غنڈوں پر خزانہ ضائع کرنے پر تیار نہ تھا لہٰذا کچھ نہ کیا جا سکا۔

جنوری 1257ء کے آغاز میں ہلاکو ہمدان سے روانہ ہوا۔ بیجو اور دوسرے افسران کو بغداد کے خلاف موصل کے راستے بڑھنے کا حکم دیا گیا۔ بغداد کو ہر طرف سے گھیرے میں لینا تھا اور اس بات کا خاص خیال رکھنا تھا کہ کوئی کشتی دریائے دجلہ سے

---

(1) چونکہ وزیر علقمہ ایک شیعہ تھا اور ہلاکو نے اسے خلیفہ کے قتل کرنے کے بعد بغداد پر حکومت کرنے کے لیے مقرر کیا تھا لہٰذا سنی اسے اپنے آقا کے ساتھ غداری کی تہمت لگاتے ہیں لیکن اس الزام کا حقیقتاً کوئی جواز نہیں۔ اس کا مشورہ مخلصانہ تھا اگرچہ منگول خلافت کا خاتمہ کر ہی دیتے چاہے مستعصم کی جو بھی پالیسی ہوتی۔

نہ بھاگ نکلے۔ گفت و شنید کو طول دینے میں ہلاکو کو کوئی اعتراض نہ تھا جب کہ اس اثنا میں وہ بغداد کے ارد گرد کی سرزمینوں کو زیر کر رہا تھا اور اپنے عسکری منصوبوں کو پختہ بنا رہا تھا۔ خلیفہ نے اسے اپنے خاندان کی عظمت بتائی لیکن ایک سالانہ خراج ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا اگر ہلاکو کو واپس ہو جائے۔ ہلاکو نے جواب دیا کہ اس پورے راستہ کو طے کرنے کے بعد میں خلیفہ کو دیکھے بغیر کیسے واپس ہو سکتا ہوں؟ اس سے ملنے کے بعد ہی میں اس سے واپس ہونے کی اجازت چاہوں گا"۔ بالآخر منگولوں کا خوفناک حملہ ہوا۔ دوات دار کو شکست ہو گئی اور وہ واپس بھاگا اور 30 جنوری 1258ء کو محاصرہ شروع ہوا اور چھ دنوں تک جاری رہا۔ ہلاکو نے چھ یرلیغ (احکامات) کے لکھنے کا حکم دیا اور انہیں تیروں میں باندھ کر شہر میں پھینک دیا۔ ان میں قاضیوں، دانشمندں، مشائخ، حضرت علیؓ کے اخلاف اور ان تمام لوگوں کی زندگی کے تحفظ کا وعدہ تھا جنہوں نے ہتھیار نہ اٹھائے تھے۔

جب منگولوں نے شہر پناہوں پر قبضہ کر لیا تو خلیفہ کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں اور س نے گفت و شنید شروع کر دی۔ 7 فروری 1258ء میں دوات دار اور سلیمان شاہ شہر سے باہر آئے لیکن انہیں اپنے لشکر لانے کے لیے واپس بھیج دیا گیا تاکہ انہیں مصر یا شام چلے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ "بغداد کے سپاہیوں اور ان کے ساتھ دیگر بہت سے لوگوں نے اس امید پر کہا انہیں زندہ رہنے کی اجازت مل جائے گی باہر آنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن انہیں دس ہزار اور ایک ہزار گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا اور تمام کو مار ڈالا گیا۔ ان لوگوں نے جو شہر میں رہ گئے تھے تہہ خانوں اور نالیوں میں پناہ لی[1]۔"

دوات دار کو 8 فروری قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد سلیمان شاہ کو سات سو اشخاص کے ساتھ جو اس سے متعلق تھے مار ڈالا گیا۔

11 فروری کو خلیفہ اپنے تین بیٹوں اور تین سو ممتاز اشخاص کے ساتھ باہر آیا اور ہلاکو کے سامنے حاضر ہو گیا۔ ہلاکو نے اس سے بڑے مودّبانہ طور پر گفتگو کی اور کسی غصہ کا اظہار نہ کیا۔ اس نے کہا کہ "بغداد کے لوگوں کو حکم دے دیجیے کہ وہ اپنے اسلحوں کو ڈال دیں اور باہر آجائیں تاکہ میں ان کا شمار کرا سکوں"۔ خلیفہ نے قاصدوں کو شہر بھیجا کہ لوگ ہتھیاروں کو پھینک دیں اور باہر آجائیں۔ لوگ گروہ در گروہ باہر

---

(1) جامع التواریخ، پیرس ایڈیشن ص 92

آئے اور منگولوں نے انہیں قتل کر دیا[1]۔

14 فروری کو شہر کی عام لوٹ شروع ہوی۔ منگول فوج شہر میں داخل ہو گئی اور چند گھروں کے علاوہ جو گلہ بانو (گاؤبان) اور غریب لوگوں کے تھے اس نے خشک و تر تمام چیزوں میں آگ لگادی۔ 16 فروری کو ہلاکو اپنے افسروں کے ساتھ محل کی طرف بڑھا اور خلیفہ کو لانے کا حکم دیا۔ ہم لوگ تمہارے مہمان ہیں تم ہمارے لیے کیا تحائف رکھتے ہو؟ خلیفہ جو سر سے پیر تک کانپ رہا تھا، بیس ہزار ملبوسات، دس ہزار دینار[2] اور دوسری قیمتی اشیاء پیش کیں۔ ہلاکو نے انہیں موجود لوگوں میں تقسیم کر دینے کا حکم دیا لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ مطمئن نہ تھا۔ ”زمین کے اوپر تم جو کچھ رکھتے ہو وہ معلوم ہے اور وہ ہمارے لوگوں کے لیے ہے۔ مجھے بتاؤ کہ زمین کے نیچے تمہارے خزانے کہاں ہیں؟ خلیفہ نے اقرار کیا کہ محل کے وسط میں ایک تالاب ہے جو سونے سے بھرا ہے۔ کھدائی پر انکشاف ہوا کہ وہ سو مثقال سونے کے ٹکڑوں سے بھرا تھا۔ یہ پایا گیا کہ خلیفہ کا حرم سات سو عورتوں، ور ایک ہزار غلاموں پر مشتمل تھا۔

اس متواتر درخواست پر اس کی عورتوں میں سے ایک سو کو اس کے پاس چھوڑ دیا گیا اس کے بعد بچے کھچے شہریوں نے رحم کی درخواست کرتے ہوئے ایک وفد بھیجا اور ہلاکو نے قاتلوں کو رُک جانے کا حکم دیا۔

21 فروری 1258ء کو ہلاکو سڑی ہوئی لاشوں کی بدبو کی وجہ سے وہاں سے روانہ ہو گیا اسی دن شام میں خلیفہ کو اس کے سب سے بڑے لڑکے اور پانچ ملازموں کو وقف کے گاؤں میں قتل کر دیا گیا[3]۔

دوسرے دن ان تمام لوگوں کو جو اس کے ساتھ بغداد کے کلواذی دروازے سے باہر آئے تھے شہید کر ڈالا گیا۔ کوئی بھی عباسی جو ملا اسے زندہ نہیں چھوڑا گیا سوائے چند کے جو کسی اہمیت کے حامل نہ تھے[4]۔

---

(1) ایضاً (ص ص 94-93)

(2) ایک مثقال ایک ڈرام 3/7 کے برابر ہے۔

(3) اس کے قتل کیے جانے کو صیغہ راز میں رکھا گیا تھا اور اب اس کے متعلق قیاس کرنا بیکار ہے۔

(4) جامع لتواریخ ص96

خلافتِ عباسیہ کے خاتمہ بعد کے مورخین کے مطابق ایک زبردست حادثہ تھا۔ لیکن معاصرین میں جو تاثر تھا وہ محض تاسف کا تھا (اس واقعہ سے) کوئی سیاسی ردِ عمل رونمانہ ہوا۔ وسیط کے شہر نے مزاحمت کی اور اس کے چالیس ہزار باشندوں کا قتل عام کر دیا گیا۔ ایران اور عراق کی منگول فتح اب مکمل ہو گئی۔

شام کے شہروں کا قبضہ

شام اور مصر کی فتح ہلاکو کے منصوبہ کا ایک جزلاینفک تھی اور وہ 12 دسمبر 1259ء کو شام کے لیے روانہ ہوا۔ مصر کی سلطنت مملوکوں یا غلام افسروں کے ہاتھوں میں آگئی تھی لیکن شام کے شہر اور اضلاع پر پہلی صلیبی جنگ کے مسلم ہیرو صلاح الدین ایوبی کے اخلاف کی حکومت تھی۔ شام کے حکمراں منگول حملہ آوروں کے خلاف متحد نہ ہوئے۔ گرچہ ان میں سے اکثر بڑی بہادری سے لڑے۔ لہٰذا شام میں منگولوں کا کام بڑا آسان ہو گیا۔ اس کے پیش نظر کسی منظم اور بڑی فوج سے خوفزدہ ہوئے بغیر یکے بعد دیگرے شہروں اور قلعوں کو مغلوب کر لینا تھا۔ الپّو (صلب) نے چالیس دنوں تک منگولوں کی مزحمت کی لیکن نومبر / دسمبر 1259ء میں اس پر قبضہ کر لیا گیا اور سات دنوں تک اسے لوٹا گیا۔ مقریزی لکھتا ہے کہ "سڑکوں پر لاشوں کی رکاوٹ تھی اور منگولوں نے انہیں روند ڈالا۔ اس نے غلام بنائی جانے والی عورتوں کی تعداد ایک لاکھ شمار کی ہے۔

حریم کے قلعہ کے باشندوں نے ایک لمبی مدت تک منگولوں کی مزاحمت کی۔ ہلاکو نے ان کے تحفظ کا وعدہ کیا لیکن وہ جب نیچے آئے تو اس نے ان تمام کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ میاں فریقین کے حکمراں ملک کامل نے ہلاکو کے بیٹے یشموتھ سے کہا کہ اس کا باپ جھوٹا ہے اور وہ دھوکے میں نہیں آئے گا اس کی قیادت میں میاں فریقین کے عوام نے پورے ایک سال تک منگولوں کی مزاحمت کی لیکن بالآخر خورد و نوش کے سامانوں کی کمی کی بنا پر وہ لوگ آدم خوری کی طرف مائل ہو گئے اور ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گئے۔ ملک کامل کو ہلاکو کے پاس لایا گیا جس نے اس کے گوشت کو کاٹ کر اس کے منہ میں رکھ دینے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ (1259ء) رشید الدین

کے مطابق ملک کامل ایک خدا ترس آدمی تھا جو اپنی روزی ایک درزی کی حیثیت سے کماتا تھا۔ مردین کے حکمراں ملک سعید نے بھی یشموت کو اطلاع دی کہ وہ منگولوں کے وعدوں پر بھروسہ نہیں کر سکتا لیکن آٹھ ماہ تک محاصرہ کے جاری رکھنے کے بعد سعید کو اس کے بیٹے مظفر الدین نے زہر دے دیا اور اس نے ہتھیار رکھ دینے کا فیصلہ کیا۔ ہلاکو نے اسے اس کے باپ کی جگہ پر مقرر کر دیا اور مردین کو لوٹا نہیں گیا۔ انہیں حالات میں دمشق کا حکمراں ملک ناصر مصر بھاگ گیا اور باشندوں نے منگولوں سے صلح کر لی۔

منگولوں پر مصری فتح

1260ء کے موسم گرما میں تیز رفتار قاصدوں نے منگو قاآن کی موت کی خبر ہلاکو کو پہنچائی۔ وہ شخص پریشان ہوا اور اس نے شام کو قتیو بوقا کے حوالے کر کے یہاں سے واپس ہونے کا فیصلہ کیا لیکن ایسا کرنے سے قبل اس نے چالیس ملازموں کے ہمراہ مصر کے حکمراں قندوز کے پاس حسبِ معمول منگول بد تمیزی کے ساتھ ایک سفیر بھیجا۔ ”خدا نے دنیا کی حکومت چنگیز خاں کے خاندان کو بخشی ہے لہٰذ قندوز کو اطاعت اور خراج کی ادائیگی منظور کرنی چاہیئے اور اپنے آپ کو ہلاکو کے سامنے حاضر کر کے مصر میں ہلاکو کی نمائندگی کے لیے ایک منگول شحنا کی درخواست کرنی چاہیئے“۔

قندوز اور اس کے عوام ایک ساتھ اس موقع کے لیے کھڑے ہوئے قندوز نے اپنے شیروں سے کہا کہ

”منگول طاقت اتنی زبردست ہے کہ اس کا مطیع ہونا کوئی ذلت کی بات نہیں لیکن ہلاکو کے عہد و پیمان اور وعدوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے خور شاہ سے، خلیفہ سے، حسام الدین اکاسیا اور اربیل کے حکمراں سے تحفظ کا وعدہ کیا تھا لیکن جیسے ہی وہ اس کے ہاتھوں میں آگئے اس نے ان تمام کو قتل کر دیا۔ اب تین ہی چارہ کار ہیں۔ پوری آبادی کا مغرب کی جانب منتقل ہو جانا، ہلاکو کے ساتھ معاہدہ اور سمجھوتہ یا جنگ لیکن منتقلی ناقابلِ تصور ہے[1]۔“

---

(1) جامع التواریخ، پیرس ایڈیشن 1847ء ص 111

اس کے افسران نے مزید اضافہ کیا کہ سمجھوتہ بھی بالکل ناممکن ہے لہٰذا جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ رات میں ان لوگوں نے ہلاکو کے سفیر اور اس کے ملازموں کو قتل کر دیا اور تب مہم کا آغاز کر دیا۔ نہایت اعلیٰ لیاقت اور حیثیت کے افسران اور سپاہیوں نے منگولوں کی پیش قدمی کی بنا پر مصر میں پناہ لے رکھی تھی اور تمام کے تمام جنگ کے لیے دستیاب تھے۔ اگر وہ جنگ میں کامیاب نہ ہوئے تو قاہرہ ایک دوسرا بغداد بن جائے گا۔ ہلاکو اپنے دستِ مجرمانہ کا اس قدر مظاہرہ کر چکا تھا کہ اب مزید دھوکہ دینا ناممکن تھا۔

پہلا منگول کمانڈر بیدار جس سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی دریائے آسی کی طرف کھدیڑ دیا گیا۔ چیف کمانڈر قیتوبوقا نے جو بعل بک (Antioch) میں تھا، دس ہزار کی ایک فوج کے ساتھ آگ کے دریا کی مانند اپنی طاقت اور عظمت پر نہایت بھروسہ کے ساتھ تیزی سے ان کے مقابلے میں آگے بڑھا۔ اس کے بعد 3 ستمبر 1220ء کو جنگ ہوئی اس میں منگول نہایت احمقانہ طور پر اپنی خود اعتمادی کا شکار تھے جب کہ مصریوں نے نہایت شاطرانہ مہارت کا مظاہرہ کیا قندوز جو قلب لشکر کی قیادت کر رہا تھا پسپا ہو گیا اور منگولوں نے مصریوں کو مارتے ہوئے ان کا تعاقب کیا۔ تبھی تین مصری دستوں نے جو تین مختلف جگہوں پر کمین گاہوں میں چھپے ہوئے تھے منگولوں پر حملہ کر دیا"۔ صبح سے عصر کی نماز کے وقت تک گھمسان کا رن پڑا۔ منگولوں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا۔ کہ مزید ٹھہر سکیں اور انہیں شکست ہو گئی[1]۔

منگولوں کی ایک بڑی تعداد نے سرکنڈے کے جنگل میں پناہ لے رکھی تھی لہٰذا مصریوں نے جنگل کو نذرِ آتش کر کے انہیں مار ڈالا۔ قیتوبوقا کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ رشید الدین کے مطابق قیتوبوقا نے بہادری سے جنگ لڑی اور گرفتار کیے جانے کے بعد بہادری سے گفتگو کی۔ لیکن جب اس نے انہیں ہلاکو کے غضب کی دھمکی دی تو انہوں نے اسے مزید لغویات کے بکنے سے روکنے کے لیے اس کا سر کاٹ کر اسے قاہرہ بھیج دیا۔

سر ہنری ہورتھ کہتا ہے کہ "مصریوں کی فتح دنیا کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت اس حقیقت میں تھی کہ اس نے منگولوں کے ناقابلِ تسخیر ہونے کے تصور اور منگول اقتدار کی توسیع کا خاتمہ کر دیا۔ اپنے مقبوضہ علاقوں

---

(1) ایضاً ص 113

میں منگولوں نے نہایت وحشیانہ طور پر تمام مخالفتوں کا خاتمہ کر دیا تھا اور چند نسلوں تک وہاں ان کی طاقت بر قرار رہ سکی۔ لیکن اس کے آگے اب وہ اپنے سروں کی قیمت پر ہی اپنی سرحدوں کو عبور کر سکتے تھے۔ منگولوں کے سات ماہ اور دس دن کے قبضے کے بعد دمشق آزاد ہو گیا۔ منگولوں کو شام سے دریا تک کھدیڑ دیا گیا۔ قیتو بوقا کا خیمہ لوٹ لیا گیا اور اس کی عورتیں، بچے اور پیروکار غلام کی حیثیت سے لے جائے گئے۔ شام میں موجود تمام (منگول) افسران اور ٹیکس وصول کرنے والوں کو مار ڈالا گیا سوائے دمشق کے ان ٹیکس وصول کرنے والوں کے جو خبر پہنچنے کی رات کو ہی بھاگ گئے تھے[1]۔"

ہلاکو کسی طرح بھی انتقام لینے کی حالت میں نہ تھا۔ سنہرے جتھے کے خان باتو کے بعد 1255 یا 1256ء میں اس کا بھائی برکہ اس کا جانشین ہو چکا تھا۔ اپنی اعلیٰ تربیت کے پیش نظر ہلاکو اس کے طریقِ عمل کو ناپسند کرتا تھا۔ برکہ جو مسلمان ہو چکا تھا ہلاکو کی پالیسی سے اور زیادہ شاکی تھا۔ برکہ کا جنرل بوقا جس نے داربند کے جنوب کے خطہ میں داخل ہونے کی جسارت کی تھی شکست کھا گیا۔ لیکن جب ہلاکو کا بیٹا اباکا شمال کی جانب دریائے تیرک کے اس پار روانہ ہوا تو اسے اور بھی زیادہ ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ 13 جنوری 1223ء میں اباکا نے صبح سے لے کر سہ پہر تک جنگ لڑی اور اس کے بعد جمے ہوئے تیرک کو پار کر کے بھاگ کھڑا ہوا لیکن برف چھٹ جانے کی وجہ سے اس کے بہت سے سپاہی غرق ہو گئے۔

ہلاکو کو اب ایک دفاعی پالیسی اپنانی پڑی کیونکہ ہر طرف سے۔ مصر، برکا اور مرکزی ایشیا میں اوگتائی اور چغتائی کے اخلاف کی نئی ظہور پذیر طاقت۔ دشمنوں کے نرغے میں تھا۔ ایک منگول جنرل سالی نے کشمیر پر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں سے اس نے بڑی تعداد میں قیدیوں کو بھیجا تھا[2]۔

لیکن ہلاکو کسی طرح بھی اس حالت میں نہ تھا کہ وہ پنجاب میں اپنے افسروں کو مدد بھیج سکے لہٰذا اس نے دہلی سلطنت کے ساتھ امن قایم رکھا۔ 8 جنوری 1264ء میں 48 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

---

(1) ایضاً ص 44

(2) ایضاً ص 44

ایران کے اِل خان

ہلاکو کے اخلاف جو اس کے بعد ایران میں برسر اقتدار ہے "اِل خان" کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے--(1) ہلاکو کا بیٹا آباکا خان 82-1264ء (2) اَباکا خان کا بھائی تکودار اگول، اس نے اسلام قبول کیا لیکن وہ اپنے بھتیجے ارغون خاں کے ذریعہ اکھاڑ پھینکا گیا اور قتل کر دیا گیا (84-1282ء)-(3) اَباکا کا سب سے بڑا لڑکا ارغون خاں (91-1284ء)-(4) اَباکا کا بیٹا **الجیتو** خاں (95-1291ء) باغیوں کے ذریعہ قتل ہو گیا (5) بیدو اغول جسے آٹھ ماہ تخت پر رہنے کے بعد غازان نے قتل کر دیا۔ (6) ارغون کا بیٹا غازان 1304-1295ء-(7) ارغون کا بیٹا **الجیتو** خدا بندہ 16-1306ء اور (8) **انجیتو** کا بیٹا ابو سعید خاں (34-1316ء) ابو سعید بارہ سال کی عمر میں تخت نشیں ہوا تھا اور اس کی موت کے بعد مرکزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی سال (1334ء) میں تیمور پیدا ہوا۔

چنگیز خاں نے جس خاندانی مفاہمت کی آرزو کی تھی اس کی روایات 1251ء کے منگو کے قتل عاموں کے بعد ختم ہو گئیں۔ ال خانوں میں، جیسا کہ رشید الدین کا خیال ہے، جانشینی کی توثیق حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ قانونی ہوتی، تلواروں کے ذریعہ کی جاتی۔ یہی عدم تحفظ اعلیٰ افسروں میں بھی ظاہر ہوا۔ چونکہ پورے ملک کو مکمل طور سے لوٹ لیا گیا تھا اور اس کی ازسرِ نو تعمیر کے سلسلہ میں کوئی معقول کوششیں نہیں کی تھی تھیں لہٰذا وزرا بجٹ کے توازن کے فرض کو ایمانداری سے ادا نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجتاً ال خانون کے وزرا مختصر مدتوں کے بعد عہدہ سے برطرف کر دیے جاتے اور اس بنیاد پر قتل کر دیۓ جاتے کہ انہوں نے خزانے میں خرد برد کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ایک ہی وزیر نے اپنی زندگی بچائی اور قتل شدہ وزراء میں شمس الدین (علاءالدین عطاملک جوینی کے بڑے بھائی) اور عظیم مورخ رشید الدین تھے۔ مزید یہ کہ اعلیٰ منگول امراء اور اِل خانوں کے درمیان ایک مستقل کشمکش تھی۔ ملک ارغون کا بیٹا، ملک نوروز، جس نے پرانی حکومت کے تحت تیس سالوں تک خراسان میں حکومت کی تھی۔ غازان کو تخت نشیں کرنے میں زبردست حصہ لیا اور س کے بعد

ریاست کے تمام اعلیٰ عہدوں کو خود اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ بھرنا شروع کیا تاکہ اصل اقتدار اس کے ہاتھوں میں رہ سکے۔ غازان نے بطور انتقام نوروز اور اس کے بیشتر رشتہ داروں کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ ابو سعید خاں کا ایک مقدم افسر ملک چوپان اپنے بہت سے رشتہ داروں کے ساتھ اسی انداز میں قتل کر دیا گیا۔

اَباکا کے بھائی تکودار اغول نے اسلام قبول کر لیا اور سلطان احمد کا خطاب اختیار کیا۔ ممکن ہے کہ اس کے خلاف بغاوت جزوی طور پر اس کے تبدیلی مذہب کے خلاف برانگیختگی کی بنا پر ہو۔ لیکن جب غازان نے محمود کے نام پر اسلام قبول کیا تو اس وقت رائے عامہ اس تبدیلی کے لیے تیار تھی اور اس کے بیشتر افسران مسلمان ہو گئے۔ لیکن یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ محض مذہب کی تبدیلی چنگیز کی تردید یا انسانی زندگی کے تقدس کے اصول کی قبولیت کی نہ تھی جو تمام بڑے مذاہب کی روح ہے لیکن جس کو یاسا نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح غازان کی حکومت گردن زدنی کے ایک خوفناک کردار میں ممتاز تھی۔ رشید الدین (اس کے سرکاری مورخ) کا کوئی صفحہ کسی عوامی عہدہ دار گردن زدنی کی اطلاع سے مشکل سے ہی خالی ہے[1]۔

حکمرانوں اور امراء دونوں نے ہی ایک دوسرے کو نئے نئے ظالمانہ طریقوں سے قتل کیا۔

ان حالات میں ال خانوں میں اپنی کمزوری کی بنا پر ایک دفاعی غیر ملکی پالیسی اپنانی پڑی۔ ان لوگوں کے پاس نہ ایک لائق فوج تھی نہ وفادار عوام تھے اور نہ ہی ان کے خزانوں میں کافی دولت تھی۔ مصر کے ناخوشگوار تعلقات ہلاکو سے انہیں ورثہ میں ملے تھے اور فتح مجموعی طور پر مصریوں کے ہی ہاتھوں میں رہی تھی۔ اَباکا مصری بیبار کے مقابلہ میں کم صلاحیت رکھتا تھا۔ جس نے 16 اپریل 1227ء کو روم میں واقع ابلیس تن کے مقام پر منگولوں کو ذلت آمیز شکست دی۔ اَباکا نے سوچا کہ بیبار کی موت کے بعد اسے ایک موقعہ میسر آئے گا لہٰذا اس نے 1280ء میں دونوں تک الپّو کو لوٹا۔ لیکن اس کے جنرل منگول تیمور کو ایک ذلت آمیز شکست کا سامنا ہوا لہٰذا اباکا نے پی کر مر جانے ہی میں اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈ نکالا۔ دوسرا ایک ہی ال خاں، جو سنجیدگی سے

---

(1) ہورتھ، منگولوں کی تواریخ، جلد سوم ص 421

مصریوں کا مقابلہ کر سکا، وہ تھا۔ 1299ء میں ایک نمائشی فتح نے اسے تقریباً ایک سو دنوں تک شام پر قبضہ جمائے رکھنے کے قابل بنا دیا اور دمشق اور دیہاتی علاقے حسبِ معمول منگول رویّے کے مطابق لوٹے گئے لیکن 1303ء میں مصریوں نے دمشق کے باہر غازان کی فوج کو ایک خوفناک شکست دی۔ دس میں سے صرف ایک آدمی اپنے گھر لوٹا اور غالباً اس شکست کی کلفت ہی 33 سال کی عمر میں ہی اس کی موت کا سبب بنی۔

مشرق سے ایک چغتائی حکمراں براق نے خراسان پر حملہ کر دیا اور 68-1267ء میں اس نے اس کے بیشتر حصہ پر قبضہ کر لیا اور اَباکا نے جو مصریوں کے ساتھ بر سر جنگ تھا امن کی حصولی کی خاطر براق کو سندھ تک غزنی کی سرزمین حوالے کر دینے کی پیشکش کر دی۔ لیکن براق نے غیر دانشمندانہ طور پر پیشکش رد کر دی۔ اسے ہرات کے قریب ایک جنگ میں بری طرح شکست ہوئی اور اسے ماوراالنہر تک واپس کھدیڑ دیا گیا۔ جہاں مسلمان ہونے کے بعد 1271ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اِل خانوں اور مرکزی ایشیا کے چغتائی شہزادوں کے درمیان سرحدی جھڑپوں نے اب سالانہ مشغلے کی شکل اختیار کر لی۔ اِل خانی افسران اپنے ذرائع اور اپنی ذمہ داری پر ہندستانی سرحدوں پر بھی چھوٹے موٹے حملے کرتے رہے (لیکن) دہلی مملکت کے غدار جوان سے مدد حاصل کرنے آئے تھے انہیں مایوس ہو کر لوٹنا پڑا۔

جب سلطان ابوسعید خاں کا 1334ء میں کسی اولاد نرینہ کے چھوڑے بغیر انتقال ہو گیا تو اِل خانوں کی مرکزی وحدت کا خاتمہ ہو گیا۔ اصولی طور پر یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ صرف ہلاکو کا کوئی خلف ہی ایک ’خان‘ ہو سکتا ہے۔ لیکن غزن نے شاہی خاندان کے بیشتر افراد کو اتنے وسیع پیمانے پر قتل کر ڈالا تھا کہ ہلاکو کی نسل سے وہ براہِ راست تعلق رکھنے والے تمام شہزادے کم و بیش گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لہٰذا افسروں کے حریف گروہ حریف خانوں کو برسر اقتدار لائے اور ان کے جھنڈوں تلے لڑے۔ لیکن انھوں نے اپنے خانوں کو اقتدار کے شائبہ سے بالکل محروم کر رکھا۔ ان کی مستقل کشمکشوں سے ملک بے چینی و اضطراب کا شکار تھا لیکن کوئی گروہ بھی پورے ملک پر اپنا اقتدار قایم نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ تیمور نمودار ہوا جنوبی ایران میں مظفری خاندان کا عروج، جس کا سب سے بڑا حکمراں شاہ شجاع شاعر حافظ کا مربی تھا، ایک رحمت ثابت

ہوتا لیکن بد قسمتی سے اس خاندان کے شہزادے ایک دوسرے کے قتل و خون کے عادی تھے۔ لہٰذا ملک کو امن وامان حاصل نہ ہو سکتا تھا جس کی اسے سخت ضرورت تھی۔

مغربی ایشیا کے اوگتائی چغتائی حکمراں

مرکزی ایشیا کے اوگتائی اور چغتائی الوسوں کی ایک مربوط تاریخ مرتب کرنی مشکل ہے جنھوں نے علاؤ الدین خلجی کے دور میں ہندستان کی فتح کے لیے ایسی زبردست کوششیں کی تھیں[1]۔

جب 1260ء میں منگو کا چین میں انتقال ہو گیا تو ہلاکو کی بیوہ اور قینہ نے جوجش عمید اور اس کے بیٹے ناصر الدین کی مدد سے چغتائی الوس پر حکومت کر رہی تھی۔ اریق بوقا کی حمایت کی لیکن اریق نے چغتائی کے ایک پوتے الغو کو اس خطہ میں بھیجنے کی غلطی کر دی قینہ قراقرم واپس ہو گئی۔ لیکن اریق بوقا کے زوال کے بعد پھر اپنی گزشتہ سرزمین پر لوٹ آئی اور الغو سے شادی کر لی۔

اس کے بعد ایک نئی شخصیت قایدو بن خش بن اوگتائی حکومت نمودار ہوئی۔ بارتھولڈ کہتا ہے ”یقیناً قائدو ممتاز ترین منگول حکمرانوں میں سے ایک ہوگا“ اس کے متعلق ہماری اطلاعات ناکافی ہیں۔ اس کے باپ کا انتقال کثرت شراب کی بنا پر ہوا تھا لہٰذا اس نے کسی نشہ والی چیز کو کبھی ہاتھ نہ لگایا وہ شکل و شباہت میں ایک حقیقی منگول تھا اور اس کی داڑھی میں (رشید الدین کے مطابق) صرف نو بال تھے۔ وہ 1206-64ء کے پریشان کن زمانہ میں اریق بوقا کے ساتھ تھا۔ لیکن جب اریق نے قوبیلائی کے پاس جانے اور مطیع ہو جانے کا فیصلہ کیا تو وہ اس کے ساتھ نہ گیا اور اس نے اوگتائی کی موروثی قاآنیت کا دعویٰ کر دیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نامساعد حالات کے باوجود ایک فوج کی تشکیل کی (اور) اس کی فوج کی جرأت و ہمت اور نظم و انبساط نے ضرب المثل کی شکل اختیار کر لی۔ اس نے شہری آبادی کے مفادات کو فوج کے بھینٹ نہ چڑھایا جس کی اقبال مندی اس کے دورِ حکومت میں ایک اعلیٰ معیار کو پہنچ گئی تھی[1]۔

---

(1) بارتھولڈ کی Semirechye ان تمام منتشر حقائق کا شیرازہ بندی کرتی ہے جن کا انکشاف فارسی کی کتاب میں کیا جا سکتا ہے۔ مارکوپولو، قایدو کا تذکرہ ایک زبردست خان کی حیثیت سے کرتا ہے ہورتھ اور میرخوند نے بھی جتنا ہو سکا اس کی شیرازہ بندی کی ہے لیکن ابھی بہت زیادہ کام باقی ہے۔

قایدو کو الغو کے ساتھ سخت کشمکش کا سامنا کرنا پڑا جس کا انتقال 1265ء یا 1266ء میں ہو گیا۔ اس کے بعد قراہلا کو اور تینہ کے ایک لڑکے مبارک شاہ کے قاآن ہونے کا اعلان کیا گیا۔ قوبیلائی اس دعویٰ پر برانگیختہ ہو گیا اور ایک چغتائی شہزادے براق کی ماتحتی میں اس نے مبارک کے خلاف ایک فوج بھیجی جس نے مبارک کو شکست دے دی اور اسے کچل ڈالا براق اور قایدو نے پہلے تو دو جنگیں لڑیں پھر سیر دریا کے کنارے انہوں نے ایک قوریلتائی منعقد کی۔ جہاں انھوں نے انداس یا نہایت جگری دوست ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ اپنی مشترکہ مملکت کی توسیع کے لیے براق نے خراسان پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست ہو گئی اور واپس ہو کر 1271ء میں انتقال کر گیا۔ 1282ء میں قایدو نے براق کے ایک لڑکے داوا خاں کو اپنا شریکِ کار حکمراں منتخب کیا۔ دونوں خانوں کو تمام مورچوں پر جنگ لڑنی پڑی لیکن منگول سلطنت کا سب سے زیادہ خوش حال علاقہ ان کے قبضہ میں تھا لہٰذا ان کے اختیارات وسیع ہوتے گئے۔ چنگیز کی نظیر کو اپناتے ہوئے قایدو نے اپنی فوجی ڈویژنوں کی تشکیل اپنے بیٹوں کی کمانوں کی ماتحت کی۔ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اس نے اپنی سلطنت کی سرحدوں کی دفاع بھی انہیں کے سپرد کر دی۔ اور ارس چینی سرحد کی کمان میں، بے کچار، سنہرے جتھے کی سرحد پر اور ساربان افغانستان میں تھا جب کہ اسے قاید اور داوا کے لشکروں نے رفتہ رفتہ ال خانوں کی فوجوں کو نکال باہر کیا[2]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داوا نے بھی یہی پالیسی اپنائی۔ دونوں خانوں نے ہندستان میں توسیع کی زبردست کوشش کی۔ دریائے روای تک جس کی سرحدیں 1292ء میں علاؤالدین خلجی کی تخت نشینی سے کچھ پہلے غالباً ان کے قبضہ میں آچکی تھیں۔ یہ مہم گرچہ کہ کئی سالوں تک جاری رہی لیکن بڑی بری طرح ناکام ہو گئی[3]۔

---

(1) بار تھولڈ Semirechye ص124

(2) ایضاً ص128

(3) ضیاء الدین برنی اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ہلاکو کے بعد کسی ال خان کے علم کا اظہار نہیں کرتا لیکن وہ قتلوق خواجہ کا ماوراء النہر کے خان دوا کے بیٹے کی حیثیت سے تذکرہ کرتا ہے۔ امیر خسرو اپنی فزاء الفتوح میں قائدو کے آدم خوروں کا تذکرہ کرتا ہے (فارسی متن ص36)

غالباً قایدو کا 1301ء میں انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا چاپر اس کا جانشین ہوا۔ داوا 1306ء تک زندہ رہا۔ آگے چل کر مرکزی ایشیا کے منگول آپسی لڑائیوں میں اتنا زیادہ الجھ گئے کہ غیر ملکی سرزمین کے متعلق سوچ بھی نہ سکے۔ علاؤالدین ترمہ شیریں خاں نے جو 1226ء تک تخت نشین ہوا۔ ہندستان پر حملہ کیا اور کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ تمام مزاحمت کو سر کرلے گا۔ لیکن یہ حملہ ایک بھول تھی کیونکہ اس کی طاقت اپنے ملک میں نہایت کمزور تھی 1332ء میں بازن نامی ایک مسلمان شخص کی قیادت میں اس کے خلاف ایک بغاوت ہو گئی جو اس بنیاد پر کہ اس نے چنگیزی یاساؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ترمہ شریں نے غزنی بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے گرفتار کر کے بازن کے پاس بھیج دیا گیا جس نے اسے قتل کر دیا۔

مرکزی ایشیا کے تمام پے چیدہ معاملات کی تفصیل یہاں بیان کرنا مشکل ہے 733ہجری (33-1332ء) میں قران سلطان خاں تخت پر بیٹھا لیکن وہ ظالم و بے رحم خون کا پیاسا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ قوریلتائی میں کسی امیر کو بلاتا تو مواخرالذکر پہلے ایک وصیت نامہ لکھتا تب اس کے بعد خان کے پاس جاتا۔ 776ہجری 46-1345ء میں امیر قازغن نے جو آمودریا کے شمال شالی سرائے کی جاگیر کا مالک تھا اس کے خلاف غیر مطمئن امرا کی ایک بغاوت کی پہلی جنگ میں قازغن کو شکست ہو گئی اور اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی جب کہ خان قرشی چلا گیا۔ لیکن قزغن نے خسان کو دوسری بار اور قران کو شکست ہو گئی اور ماوراالنہر اور ترکستان پر چودہ قمری سالوں تک حکومت کرنے کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد مرکزی حکومت امیز قازغن کے اختیار میں آگئی۔ پہلے تو اس نے خان کا عہدہ اوگتائی خان کے ایک خلف دانش مند اوغن کو دیا لیکن دو سال بعد اس نے دانش مند کو قتل کر دیا اور خان کا عہدہ بیان قلی اور اغلن بن سرغود ابن داواخاں کو دیا۔

مورخین نے قازغن کو ایک اچھا حکمراں اور ایک بہادر سپاہی تسلیم کیا ہے وہ 1351ء میں ہرات کے ملک معزالدین کے خلاف روانہ ہوا جس نے ایک خود مختار شہزادہ کا سا رویہ اپنانا شروع کر دیا تھا لیکن عوام کی بھلائی کے پیشِ نظر اس نے اس کی اطاعت کو منظور کر لیا۔ تقریباً اسی زمانہ میں اس کے بیٹے امیر زادہ عبداللہ نے خوارزم

کو فتح کر لیا1359ء میں قازغن کو اس کے داماد قتلغ تیمور بورالدائی نے ایک شکار کے دوران قتل کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بیٹا عبداللہ جسے اس کے جانشین کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا تھا۔ اس عہدہ کے لیے مکمل طور پر نااہل ثابت ہوا۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس نے بایان قلی خاں کو قتل کر دیا کیونکہ وہ خان کی بیوی پر قبضہ کرنا اور بیسون تمور کے بیٹے تیمور شاہ اوراغلن کو اس کی جگہ پر مقرر کرنا چاہتا تھا۔

عبداللہ کی سرزنش کے لیے امیر بایان سلدوز، حصار شادمان سے سمرقند روانہ ہوا اور راستہ میں کیس کے مقام پر امیر حاجی برلاس بھی اس سے آملا۔ عبداللہ کو شکست ہوئی۔ وہ آمو دریا پار کر کے انداراب بھاگ گیا اور وہیں کچھ دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ خان تمور شاہ کو اس کی اپنی کسی غلطی کے بغیر قتل کر دیا گیا۔ بایان سلدوز اور حاجی برلاس ماوراءالنہر پر اپنا اقتدار قایم کر سکتے تھے اگر انہیں ایسا کرنے کی صلاحیت ہوتی۔ لیکن سلدوز اگرچہ کردار کا بڑا معتدل اور کریم النفس تھا لیکن وہ شراب کے پیالے کا بڑا دلدادہ تھا اور وہ سال میں مشکل ہی سے ایک ہفتہ ہوش میں آتا۔ امیر حاجی برلاس جیسا مستقبل میں ظاہر ہوا، بالکل ہی نااہل تھا۔ نتیجتاً مرکزی طاقت ختم ہو گئی اور ماوراءالنہر کے آٹھ یا نو اضلاع کے ذمہ دار افسران نے آزاد سپہ سالاروں جیسا رویہ اپنانا شروع کر دیا۔ تیمور کے سرکاری مورخ یزدی نے ان میں سے مندرجہ ذیل سرداروں کا ذکر کیا ہے۔ (1) کِش میں حاجی برلاس (2) خجند میں بایزید جلایر (3) امیر حسن بن مسلی بن امیر قازغن چند جاگیروں کا مالک تھا اور اس نے ان اختیارات کے حصول کی کوشش کی جن کا اس کا دادا حامل تھا (4) بلخ میں اولجائی بوغائی سلاویز (5) شبورغان میں محمد خواجہ آپردی (6) ختلان میں کیخسرو (7) ارہنگ میں الجیتو آپردی اور (8) سمرقند میں خضر یسوری۔ مزید یہ کہ بدخشاں چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ہاتھوں میں تھا جنھیں "شاہ" کہا جاتا تھا اور جنہوں نے اپنے اونچے پہاڑوں میں محفوظ ہو کر تمام بیرونی طاقت کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یزدی کا خیال ہے کہ "ہر امیر اور نویان جہاں کہیں بھی وہ ہوں اپنے آپ کو لیڈر شمار کرتے تھے اور انہوں نے ظلم و ستم اور آزادی کا جھنڈا اُٹھا رکھا تھا"۔

اسی اثنا میں ترکستان (جسے اس عہد کے مورّخین جتہ کہتے تھے) نے اپنے آپ

کو ماورالنہر سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ جب کہ ماوراء النہر میں تقریباً تمام منگول نو آباد کار اسلام قبول کر چکے تھے اور جتہ کے بھی چند لیڈروں کے مسلم نام ملتے ہیں۔ لیکن ہمارے ماخذ بتاتے ہیں کہ جتہ منگولوں کے بڑے حصے نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ مزید یہ کہ ترکستان یا جتھہ کا بھی اپنا ایک خان، تغلق تیمور خاں بن الغو خواجہ بن داوا خاں تھا جو اپنے آپ کو ماوراء النہر پر بھی حکومت کا حقدار سمجھتا تھا۔

6

امیر تیمور

جرائم معذرت نامہ اور اعتراف جرم

ان ''قاتلوں'' میں جو نبیؑ کے مسلک کے دعویدار تھے، امیر تیمور گورکان جس کا خطاب صاحب قران (قسمت کا بادشاہ) تھا، امن پسند غیر فوجی مسلمان اور اس سے بہت کم حد تک غیر مسلم شہریوں کو قتل کرنے یا نئے نئے طریقوں سے ان کی جان لینے کے اعتبار سے تمام دیگر لوگوں سے بازی لے گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ 36 سالہ حکومت (1370ء-1405ء) جو بے مثل عسکری و سیاسی کامیابی اور عالم گیر قتل و خونریزی کی خصوصیات کی حامل تھی، جس کے بعد تیمور ایک ذہنی کرب کے ساتھ اپنے کیفر کردار کو پہنچا کیونکہ اس قسم کے جرائم (اسلام یا کسی دوسرے مذہب کے مطابق) محض پچھتاوے اور مجرم کی عبادتوں کی بناء پر معاف نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان ممالک میں جہاں اس نے غارتگری مچائی۔ خاص طور پر عربی سرزمینیں جہاں اسے ایک غیر مسلم بدطینت، وحشی اور جہنمی سمجھا گیا۔ اس کی موت پر نہ صرف یہ کہ سکون و عافیت کی ٹھنڈی سانسیں لی گئیں بلکہ مرحوم ظالم حکمراں کو بانگ دہل بددعائیں بھی دی گئیں۔ یہ بات عیاں تھی کہ ان بددعاؤں کا ایک بڑا حصہ عربوں کے تاریخی ادب میں شامل ہو جائے گا۔ اور تیمور کو ہمیشہ کے لیے مطعون قرار دے گا۔ اسی اثنا میں تیموری مملکت کا خاتمہ ہو گیا اور ہرات، فارس، ماوراء النہر کابل کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں ہی باقی بچیں۔ تیمور نے اپنی موت کے وقت 36 اخلاف چھوڑے تھے اور اس کا خاندان افزائش کی نمایاں طاقت کا حامل تھا تاہم تیموری شہزادے ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے یا ان کے دشمنوں نے

ان کے سر قلم کر دیئے۔ ان حالات میں ہرات کے مرزا شاہ رخ اور اس کے بیٹے فارس کے سلطان ابراہیم نے تیمور کی ایک سرکاری تاریخ کی اشاعت ضروری سمجھی۔ شرف الدین علی یزدی کی "ظفر نامہ" جو چغتائی کے سرکاری دستاویزات، حقائق سے واقفیت رکھنے والے افسروں کے ذریعہ دی گئی معلومات اور شاہی احکام پر مبنی ہے، یہ تصنیف تیمور کے انتقال کے انیس سال کے بعد شائع ہوئی۔

ظفر نامہ کا مقصد تیمور کی تعریف اور اسے حق بجانب ٹھہرانا ہے لیکن اگر روغن قاز کی ملمع سازیوں کو، جو اس کے شاہی برسیوں کے خاطر چڑھائے گئے ہیں کھرچ دیا جائے تو یزدی کا ظفر نامہ دنیا کے ایک زبردست مجرم کے خلاف ایک فرد جرم بن جائے[1]۔

گبن خیال ظاہر کرتا ہے کہ "ایسے زمانے میں جب حقیقت ہزاروں (لاکھوں) لوگوں کے ذہنوں میں تازہ تھی سراسر دروغ بیانی تیمور کے حقیقی کردار پر ایک اظہار ملامت کا سبق بنتی"[2] لہٰذا یزدی تیمور کے بڑے بڑے قتل عاموں اور تباہ کاریوں کا اعتراف کرتا ہے تاکہ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے جرائم کی پردہ پوشی کر سکے۔ مندرجہ ذیل خطوط پر تیمور کو حق بجانب ٹھہرانے کی ایک کوشش کی گئی ہے جن میں سے ہر

---

(1) تیمور کے خلاف لکھی گئی کتابوں میں سے زبردست عربی کتاب ابن عرب شاہ کی عجائب المقدور فی احوال تیمور ہے، اس کے مخالفانہ خیالات کے اظہار کی بناپر گبن اس کتاب کو بغض پر مبنی بتاتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ ابن عرب شاہ تیمور کے سلسلہ میں اپنے تعلیم یافتہ معاصرین کے خیالات کا اظہار کرتا ہے لیکن چونکہ اپنی کوششوں کے باوجود اس کے پاس وہ حقائق نہ تھے جو یزدی کو دستیاب تھے لہٰذا میں نے اس باب کی بنیاد یزدی کی سرکاری تصنیف پر رکھنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔

(2) ہندستان میں وہ تمام چیزیں جو تیمور کے خلاف شان تھیں ممنوع قرار دے دی گئیں مثلاً عفیف کی تاریخ فیروز شاہی کا آخری حصہ صرف نام نہاد تزک (قانونی مبادیات کے مجموعے) جو دو حصے پالیسی (کنکاش) اور ضوابط پر مشتمل ہیں اور جن میں تیمور کو ایک متکلم کی حیثیت دی گئی ہے، اپنی اندرونی شہادتوں کی بنا پر ایک مہمل تالیف ثابت ہوتی ہے جو بعد میں تیار کی گئی تھی۔ لیکن ایک ہندستانی حاجی ابو طالب حسینی اس منظوم ترکی خفیہ سوانح عمری (Autobiography) کا ایک حصہ محفوظ کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ جو تیمور کے حکم پر تیار کی گئی تھی۔ یہ تصنیف شاہ جہاں کے ذریعہ ممنوع قرار دیئے جانے کے باوجود اب تک باقی ہے۔ اور مجھے اس کا استعمال کرنے میں کسی طرح کا تامل محسوس نہیں ہوا ہے۔ تیمور کو لعنت و ملامت کرنے والا عید گاہ کا ایک کتبہ بھی دہلی میں اب تک موجود ہے۔

ایک ناکام ثابت ہوتی ہے۔

(الف) یزدی کی تصنیف قرآنی آیتوں سے پُر ہے جو زیادہ تر بے موقع ہیں اس کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیمور کی زندگی قرآنی خیالات کی ہدایت پر تھی۔ لیکن مندرجہ ذیل معروف آیت، جو قرآن سے واقفیت رکھنے والے اس کے کسی بھی مطالعہ کنندہ کے ذہن میں لازماً آسکتی تھی، کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے!"اور وہ جو ایک مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دیتا ہے اس کی سزا جہنم ہے اور یہ ایک بُرا ٹھکانہ ہے"۔ کیا خاموشی کے ذریعہ یہ اسی بات کی جانب اشارہ ہے؟[1]

(ب) یہ کائنات وحدت الوجود کا ظہور ہے۔ انسانی ڈھانچہ، جو کائنات کا ایک خلاصہ ہے، کے اعضاء دماغ کے ذریعہ ضابطہ میں رکھے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح بادشاہ کی طاقت اور اختیارات سماج کو ضابطہ میں رکھتے ہیں۔ اس ناقص تشبیہ اور قرآن کی آیت کے ایک غلط مفہوم کی بنیاد پر یزدی ہم سے مندرجہ ذیل نتیجہ قبول کرنے کی توقع رکھتا ہے۔

"چونکہ کامیاب بادشاہوں اور فاتح عالم بہادروں کو مکمل خدائی حمایت حاصل ہوتی ہے"اور ہم نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے" قرآن کہتا ہے[2] لہٰذا رحمت و زحمت کے خدائی کرشموں کا ظہور اسی نہایت معزز اور ممتاز گروہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان کے غصہ کی بجلی گرنی شروع ہوتی ہے اور وہ اپنے غضب سے دنیا کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں یا پورے ملک کو تہہ و بالا کر ڈالتے ہیں لیکن جب (خدائی) لطف و کرم کی ہوائیں چلنی شروع ہوتی ہیں تو وہ اپنی رحمت و مہربانی سے رحم کے ہزاروں دیپ جلاتے ہیں اور پوری دنیا کو خوشحال و بامراد بنا دیتے ہیں[3]۔"

لیکن چونکہ ایسی ایک دلیل ہر جرم کو حق بجانب ثابت کر دے گی بشرطیکہ اس

---

(1) گبن، سلطنت روم کا زوال اور خاتمہ، V×L واں باب

(2) قرآن (جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے) یہ بات بادشاہوں کے سلسلہ میں نہیں کہتا بلکہ انسان کے سلسلہ میں کہتا ہے۔ تمام زندہ مخلوقات کے درمیان تنہا صرف انسان سے ہی اخلاقی قانون کے مطابق رہنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

(3) ظفر نامہ، جلد دوم ص253-54

کا ایک وسیع پیمانہ پر ارتکاب کیا گیا ہو جس طرح وہ جرائم جنھیں قرآن فرعونوں سے متصف کرتا ہے لہٰذا اس پر زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے۔

بہر حال اسی کو بعد میں اکبر کے سلسلہ میں ابو الفضل نے بھی اپنایا لیکن ذرا مختلف طور پر۔

(ج) مندرجہ ذیل بیان تیمور کے سلسلہ میں بار بار دہرایا جاتا ہے:

"آنحضور کے حقیقی کردار کا رجحان عدل وانصاف اور عوام کی خوشحالی و بہتری کی جانب تھا اور اس کی بلند خواہشات کا مقصد مملکتوں کا قیام تھا۔ جس دہشت و بربریت کا مظاہر کیا گیا اور جو بربادی اس کے عالم گیر لشکروں نے بسا اوقات مچائی وہ فتوحات کی ضرورتوں کی بنا پر تھیں کیونکہ ملکوں پر فتح سرزنشوں اور رعب و عظمت کے قیام کے بغیر نہیں پائی جا سکتی۔[1]

لیکن "بسا اوقات" کی اصطلاح ان مال غنیمت پر مشکل ہی سے صادق آتی ہے جو اس کی فوج نے ہر سال اکٹھا کیا۔ شرف الدین اعتراف کرتا ہے کہ "فاتح لشکروں کے افسران دوسرے زمانے کے افسران کے مقابلہ میں خورد و نوش کے زیادہ بہتر اہتمامات کے حامل تھے اور وہ زیادہ مالدار تھے"۔ جہاں تک عام سپاہیوں کا تعلق ہے یہ بات دونوں جانب واضح تھی کہ جب اس کی قیادت اور ان کی مشقت کی بناء پر کسی دولت مند شہر یا دیہات کی لوٹ کا موقعہ مہیا ہو جائے گا تو عسکری نظم وضبط کے سلسلے میں تیمور کے اعلیٰ معیارات میں ڈھیل دے دی جائے گی۔ مغلوب عوام کی کوئی ناشائستہ حرکت ہمیشہ ہی ایک بہانہ بن سکتی تھی اور جہاں اس کا تلاش کر لینا بھی مشکل ہو جاتا تو ان کی، دمشق کے باشندوں کے مانند، سرزنش ان کے کئی صدیوں پرانے آباو اجداد کے مفروضہ جرائم کے بدلے کی جا سکتی تھی۔ جہاں تک اس سے ہو سکا ہے یزدی تیمور کے مختصر تعمیری کاموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔

(د) دلیل کا دوسرا انداز جو بار بار دہرایا جاتا ہے وہ تیمور کے جرائم کے سلسلہ میں قسمت یا مقدر کو ذمہ دار ٹھہرانا ہے۔ اگر خوشحال و ترقی یافتہ شہروں کو تباہ کر دیا گیا تو ایسا اس لیے ہوا کہ خدا نے ابتدائے آفرینش سے ہی یہی چاہا تھا۔ کیا یزدی ہم سے یہ

---

(1) ایضاً ص 449

توقع کرتا ہے کہ ہم یہ بھول جائیں کہ اس قسم کی دلیل ہر جرم اور ہر مجرم کے لیے دستیاب ہے؟

تیمور کی زندگی میں ایک مضمر تضاد تھا۔ ابن عرب شاہ اپنے اس بیان میں حق بہ جانب ہے کہ چنگیز کی یاسائیں اور منگولوں کی روایات تیمور کے کردار اور پالیسی کی بنیاد تھیں اور قرآن اور مسلم روایات کی حیثیت ظاہری رُسوم سے زیادہ نہ تھی تاہم اس کے باپ اور دادا خدا ترس مسلمان تھے اور اُس کی پرورش ایک مسلم ماحول میں ہوئی تھی۔ لہٰذا اپنی زندگی کے آخری دور میں جب وہ موت سے بالکل قریب تھا ان جرائم کے احساس سے جن کا اس نے ارکاب کیا تھا وہ ذہنی کوفت میں مبتلا ہو گیا۔

کلاویجو (Clavijo)' جو اس کی حکومت کے اختتام کے قریب سمرقند پہنچا تھا تیمور تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ حالانکہ اس کے افسران یہ نہیں کہتے تھے کہ وہ بیمار ہے۔ ابو طالب حسینی تیمور کی سوانح حیات کے اپنے جز میں اسی زمانہ کے تیمور کے دو خوفناک خوابوں کا تذکرہ کرتا ہے[1]۔

تیمور نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہوا ہے جبکہ ان لوگوں نے جن کا اس نے قتل کیا تھا نہایت ڈراؤنی شکلوں میں ایک وسیع دائرہ بنا رکھا ہے جو آہستہ آہستہ چاروں طرف سے اس کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ جب وہ تقریباً گھیرے میں لے لیا گیا تھا تو تیمور سہم کر بیدار ہو گیا۔ اس نے اپنے پیر کے پاس لکھا تو انہوں نے اسے اپنی عبادتوں اور مذہبی رسوم کا بہت زیادہ خیال رکھنے کا مشورہ دیا۔ لیکن دوسرے خواب نے تیمور کے لیے امید کی کوئی کرن نہ چھوڑی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بڑے دیوان کے سامنے ہے اور وہ اس ملک کے متعلق جس کے آمدنی کے اندراجات وہاں رکھتے تھے دریافت کرنے اندر گیا۔ ہم کسی مُلک کے آمدنی کے اندراجات نہیں رکھتے بلکہ انسانی زندگیوں کے ریکارڈ رکھتے ہیں'' یہ اسے بتایا گیا۔ ''میری کتنی زندگی باقی ہے'' اس نے پوچھا۔ ''بہت ہی مختصر'' یہ جواب تھا۔ اس مرتبہ اس کا مذہبی پیشوا بھی اسے کچھ تسلی نہ دے سکا،

حقائق اتنے زیادہ واضح تھے کہ ان کی پردہ پوشی ناممکن تھی لہٰذا ایزدی نے انہیں

---

(1) مسلم یونیورسٹی لائبریری کا مخطوط۔

بہترین ممکن شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

”جب صاحب قرآن کی طاقت مدد الٰہی کے ذریعہ ظہور میں آئی اس وقت آباد دُنیا کئی سالوں سے طوائف الملوکی کا شکار تھی۔ چونکہ شہروں اور اضلاع کے (چھوٹے چھوٹے) حکمرانوں کی جنگیں اور کشمکش عوام کی تباہی و بربادی کا سبب تھیں لہٰذا ملکوں اور بری راستوں سے امن و تحفظ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ دیہاتوں پر لٹیروں کا قبضہ ہو گیا تھا اور شہروں میں مطلق العنان جابر حکمرانوں کا۔ انسانی معاملات مکمل طور پر دیانت و راستبازی کی راہ سے منحرف ہو گئے تھے۔ جب انسانی جسم میں جو کائنات کا خلاصہ ہے زہریلے عناصر جمع ہو جاتے ہیں اور صحت گرنے لگتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا علاج کسی طاقت ور سہل کے بغیر ممکن نہیں جو بگڑے ہوئے بیمار مادوں کو باہر نکال دیتا ہے اور جب بیمار مادوں کو اچانک باہر پھینکا جاتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سے صحت مند جراثیم بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔

”چونکہ الٰہی تقدیر نے پہلے ہی یہ بات مقدر کر دی تھی کہ دنیا کے معاملات کو لاثانی صاحب قرآن کے میٹھے اور تلخ شربت۔ رحمت و دہشت۔ کے ذریعہ معمول کی حالتوں پر واپس لایا جائے گا۔ خدا کی رحمت نے اسے اس کے خوش قسمت معاصرین سے بلند کر دیا اور مملکت کی بخشش کے ذریعہ اسے معجزاتی طور پر ممتاز کر دیا۔ لہٰذا خدا کی ہدایت کے مطابق دنیا کی فتح اور دنیائی حکمرانی کا خیال اس کے ذہن میں پیدا ہونے لگا اور خدائی مدد کی بنا پر اس نے تھوڑی ہی مدت میں دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کو فتح کر لیا۔ اس نے انہیں اس زمانہ کے ظالم و جابر حکمرانوں سے چھین لیا اور انھیں انصاف و مساوات سے آراستہ پیراستہ کر کے اس طرح سے امن وامان کی چادر پھیلا دی کہ اگر ایک تنہا شخص سونے اور چاندی سے بھرا ہوا برتن لے کر مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتا ہے تو اسے ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے پریشانی لاحق نہ ہوتی۔

”لیکن ان واقعات کے دوران جیسا کہ اس ظفر نامہ میں تفصیل سے بتلایا جا چکا ہے بہت سی مصیبت ناک چیزوں۔ قتل عام، تباہی، لوٹ، غلامی۔ کا فتح و تسلط کے مقصد کے لیے حکم دینا پڑا۔ لہٰذا جب حضور والا شام، روم اور جورجیا کی فتح اور پورے ایران میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اپنی طاقت کے استحکام کے بعد اپنی

خوش قسمتی کے ساتھ اپنی راجدھانی واپس لوٹے تو ان کی دائمی خوش قسمتی نے انہیں اس بات کا احساس دلایا کہ وہ ان غلطیوں کی تلافی ایک جہاد کے ذریعہ کریں"۔ "اور ایک جہاد اس دنیا اور جو کچھ اس میں ہے کہ مقابلہ میں کہیں بہتر ہے"۔ لہٰذا اپنے پوتوں کی شادی کی رسموں سے فراغت کے بعد قرآنی فرمان "اپنے معاملات میں ان سے مشورہ لو" کے مطابق انھوں نے شہزادوں اور امراء کو ایک خاص میٹنگ میں بلایا اور ان سے یہ باتیں کہیں: "خدائے بزرگ و برتر نے مجھے ایسی خوش قسمتی بخشی کہ میں نے اپنی تلوار سے دنیا پر قبضہ کر لیا ہے اور میں نے دنیا کے بادشاہوں کو طاقت و دہشت کے ذریعہ مغلوب کر لیا ہے۔ اس کے لیے خدا کی تعریف ہے کیونکہ چند ہی بادشاہ خطۂ ارض کی وسعت، اپنی سلطنت کی طاقت، اپنے احکامات کی معقول تعمیل اور مددگاروں اور پیروکاروں کی بڑی تعداد کے اعتبار سے میرے ہم پلّہ ہوئے ہیں اور چونکہ اس طرح کا کوئی مقصد دہشت پسندی، قتل عام اور انتقام کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ان مہمات و فتوحات کے دوران چند واقعات جو عوام کی کلفت و پریشانی کا سبب بنے بہ حالت مجبوری وقوع پذیر ہوئے اس موقع پر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان گناہوں کی تلافی کے لیے کچھ کروں۔ ایسی نیکی جس کو ہر شخص کا ہاتھ انجام نہیں دے سکتا وہ کافروں کے ساتھ جنگ ہے اور مشرکوں کا استیصال ہے کیونکہ یہ چیز طاقت اور وقار دونوں ہی کا مطالبہ کرتی ہے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوج جس کی مہمات کے دوران ان جرائم کا ارتکاب ہوا ہے لے کر میں چین اور ختا، جو کفر کا گڑھ ہیں، جاؤں اور ایک مقدس جنگ لڑوں۔ ان کے آگ کے اور بتوں کے مندروں کو تباہ کردوں اور ان کی جگہوں پر مسجدیں اور (مسلمان) کے عبادت خانے تعمیر کروں۔ تب ہی قرآنی آیت "اچھی باتیں، بری باتوں کو ختم کر دیتی ہیں" کے مطابق یہ خدمت شاید مری غلطیوں کی معافی کا سبب بن سکی ہے[1]۔"

مندرجہ بالا دلیل کا خلاصہ گبن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے! "مسلم خون کی ندیاں جو اس نے بہائی تھیں ان کا کفارہ مساوی مقدار میں مشرکین کی تباہی کے ذریعہ ہی ادا کیا جا سکتا تھا۔ "خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے چین کو بچانے کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا

---

(1) یزدی، ظفر نامہ، جلد دوم ص ص 31-227

تیمور اُترار کے مقام پر، جب کہ اس کے گناہ و جرائم نقط عروج کو پہنچے ہوئے تھے، موت کے پنجے کا شکار ہو گیا۔

تیمور کی کامیابی کے اسباب

ان خاص اسباب کا انکشاف مشکل نہیں جنھوں نے تیمور کے کامیابی ممکن بنائی۔ کوئی ایسی بڑی علاقائی حکومت نہ تھی جو اس کا مقابلہ کر سکے۔ لہٰذا چھوٹے چھوٹے مقامی حکمرانوں کو یکے بعد دیگرے زیر کر سکتا تھا اور ان لوگوں کے درمیان اتحاد کا ذرہ برابر بھی اندیشہ نہ تھا۔

دوم یہ کی اعلیٰ معیار کے تربیت یافتہ سپاہیوں کو کسی بھی تعداد میں حاصل کیا جاسکتا تھا بیشتر وہ امن پسند باشندے جن کو چنگیز اور اس کے جانشینوں نے بھرتی فوجوں (حشر میں) داخل کر لیا تھا اکثر و بیشتر مر چکے تھے لیکن جو لوگ بچ رہے تھے وہ غالباً پیشہ ور سپاہی بن چکے تھے بہر حال تیمور کے بھرتی کرنے والے افسران کو ایسے سپاہیوں کی جن کی اسے ایک متعینہ مدت کے لیے ضرورت تھی حاصل کر لینے میں کوئی مشکل در پیش نہ تھی۔ یہ بات طے تھی کہ اس چھوٹی یا بڑی مدت میں وہ اتنا مال غنیمت حاصل کر لیں گے جو ان کے بقیہ زندگی کے لیے کافی ہوگا اور تیمور اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ اگر اس کے سپاہیوں کو ان کے ضرورت بھر مال غنیمت حاصل نہ ہو سکا تو آئندہ اسے فوجی ”(بآسانی) نہ مکمل کر سکیں گے۔

سوم یہ کہ ان ممالک میں جنھیں منگولوں نے فتح کر لیا۔ ماوراء النہر، ایران اور عراق- وہاں ایک منگول حکمراں طبقہ قایم کر دیا گیا تھا۔ یہ طبقہ رسماً اسلام کی طرف جھک گیا تھا لیکن اہم معاملات میں وہ اب بھی منگول روایات پر قایم تھا جس میں وسیع پیمانوں پر قتل عاموں کی نہ صرف اجازت تھی بلکہ اس کی حوصلہ افزائی و ستائش بھی ہوتی اگر چنگیز سے قبل کسی مسلمان حکمراں ان شہروں کی مکمل تباہی کا حکم دیتا جو صدیوں تک مسلم تمدن و صنعت کا مرکز رہے تھے تو اس کو ایک پاگل سمجھا جاتا- سپاہیوں کے ذریعہ اس کی نافرمانی کی جاتی اپنے افسروں کے ذریعہ اسے معزول کر دیا جاتا اور قتل کر دیا جاتا۔ لیکن چنگیز نے امن پسند شہری باشندوں کے قتل عام کی

روایت قایم کردی تھی اور تیمور اس روایت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان باتوں کے ساتھ ہمیں تیمور کی ذاتی عبقریت۔ تجربات سے سیکھنے کی صلاحیت، غیر معمولی انتظامی و عسکری مہارت، بے عیب قوت فیصلہ، اپنے زمانہ کی سائنسی ایجادات کو استعمال کرنے اور ان کو بہتر بنانے کی صلاحیت، اپنے ماتحتین پر سزاؤں اور انعامات کے ذریعہ اختیار قایم رکھنے کی صلاحیت، سفارتی چالیں اور مہارت ان تمام باتوں کے علاوہ زبردست ہمت اور حد سے زیادہ احتیاط کا ایک غیر معمولی مرکب۔ کو بھی شامل کرنا ہو گا۔ لہٰذا ہم اسے کوئی غلط قدم اٹھاتے ہوئے شاذ و نادر ہی پاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تیمور کے جیسے کارنامے، جو 46 سال کی مسلسل جدو جہد کا نتیجہ تھے، محض ایک ایسے ہی شخص کے لیے ممکن ہو سکتے تھے جسے بہترین صحت، بھرپور جسمانی طاقت اور ایک ایسا جسمانی ڈھانچہ بخشا گیا ہو جو ان تمام آزمائشوں کا مقابلہ کر سکے جن کا اسے مسلسل مہارت میں متحمل ہونا پڑتا تھا۔ پیر کے ایک زخم نے اسے لنگڑا مشہور کر دیا لیکن ضرورت کے وقت وہ تین یا چار میل تک پیدل چل سکتا تھا۔ ہم اسے بارہا مسلسل چوبیس گھنٹے سواری کرتے ہوئے اور خود کو سرکاری کاغذات میں یا گھوڑے کی پیٹھ پر پوری رات جاگنے کے بعد کسی محاصرہ یا جنگ کے انتظامات کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ جلال الدین منکبرنی کے برخلاف ذاتی مقابلوں کے سلسلہ میں اس کی کوئی شہرت نہ ہوئی لیکن مساوی حیثیت کے ایک ترکی مخالف نے جب اسے ایک ڈوئیل کے لیے چیلنج کیا تو اس نے اسے قبول کرنے میں کوئی تامّل نہ کیا۔

تیمور کے کردار کا المیہ یہ حقیقت تھی کہ محض ذاتی حبِ جاہ سے بڑھ کر اس کا کوئی دوسرا اصول نہ تھا۔ یہ خیال کے خدا نے اُسے دُنیا پر حکمران کے لیے منتخب کیا ہے اس کے ذہن میں اس کی تخت نشینی کے کچھ دنوں بعد آیا۔ لیکن واضح طور پر یہ چنگیز کی ایک میراث تھی۔ یزدی، تیمور کے ایک خیال کو نقل کرتا ہے جس کا ماحصل یہ تھا !" آباد دنیا ایک حکمراں کے لیے زیادہ وسیع نہیں ہے"۔ اور التو اور دیگر شہروں کے عوام کی تیمور کے مندرجہ ذیل دعویٰ کو فوراً قبول نہ کرنے پر سرزنش کی گئی"۔ مشیت ایزدی نے پوری دنیا میرے ماتحت کر دی ہے اور ہمیشہ رہنے والے خدا نے تمام ممالک میری کمان کے سپرد کر دیئے ہیں"۔ پھر بھی ایک بھی عوامی ادارہ ہم تک تیمور سے

نہیں پہنچا۔ سلجوقیوں اور عجم کے دیگر بانیین سلطنت کے برخلاف اس نے ان لوگوں کے لیے جن پر اس نے فتح حاصل کی تھی امن اور خوشحالی نہ مہیا کی۔ وہ خود اپنے خاندان کے افراد کو وراثت کا کوئی ایسا قانون بھی ترکے میں نہ دے سکا جو انہیں ایک دوسرے کو اندھا کر دینے اور مار ڈالنے سے باز رکھتا۔

حصولِ اقتدار

بعد کے دور میں اس بات پر بہت زور دیا گیا کہ تیمور اور چنگیز دو بھائی قوم نامی اور قاچولی بہادر کی نسل سے ہے لیکن یہ ایک ایسا اعزاز تھا جس میں تیمور کے کئی ہزار معاصرین بھی شامل تھے۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ تیمور، چغتائی کے وزیر قراچار نوہان کی نسل سے تھا لیکن کِش اور قرشی کی حکومت اس کے ہم جدی خاندان کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی جو اس کے چچا حاجی برلاس کی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ تیمور کے باپ طراغائی اور اس کے دادا اتکل نے اپنی زندگیاں ایک متمول درمیانی طبقہ کے حالات میں بسر کی تھیں لیکن وہ کوئی سرکاری رتبہ کے حامل نہ تھے۔ تیمور طبقہ اشرافیہ کا ایک فرد تھا جو منگولوی اور باعزت تھا لیکن جیسا کہ یزدی اس بات پر زور دیتا ہے کہ اور لحاظ سے اس کی شخصیت خود ساختہ تھی اور وہ خاندان کا حقیقی بانی تھا۔

تیمور 7 اور 8/اپریل 1334ء کی شب میں پیدا ہوا جب اس کی عمر 25 سال کی ہوئی تو اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اسی سال موسم بہار 1360ء میں ترکستان (جتھ) کے حکمران توغلوق تیمور (ابن اُوغول خواجہ بن داوا) نے اپنے وراثتی حق کے قیام کے لیے ماوراء شہر پر حملہ کر دیا۔ ترمہ شیرین خاں کی موت کے بعد کے 38 سالوں میں ماوراءالنہر میں آٹھ خان ہوئے تھے۔ لیکن اب وہاں کوئی خان نہ تھا۔ جتھ کے تین امراء کو کِش کے خلاف پیش قدمی کا حکم دیا گیا۔ امیر حاجی برلاس آمو دریا کے پار بھاگ گیا لیکن تیمور اپنے چچا سے الگ ہو کر جتھ کے تینوں امراء سے جا ملا جنھوں نے اپنے خان کے حق میں اس کی وفاداری کی پیش کش کے عوض اس کا خیر مقدم کیا اور کِش اس کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن خانگی مشکلات نے توغلوق تمور کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ حاجی برلاس واپس لوٹا اور اس نے کِش پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

دوسرے سال 1361ء کے موسم بہار میں تو غلوق تمور خاں دوبارہ لوٹا۔ حاجی برلاس پھر ایک بار خراسان بھاگ گیا اور ضلع سبز دار میں قتل کر دیا گیا۔ تیمور نے اپنے آپ کو خان کے سامنے پیش کیا اور اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن خان نے فیصلہ کیا کہ اس کی موجودگی اس کے اپنے ملک میں ناگزیر ہے۔ لہٰذا اس نے ماوراء النہر کا علاقہ اپنے بیٹے الیاس خواجہ کے حوالے کیا اور امیر بیکیچک کو اس کا مشیر خاص مقرر کیا۔ ہو سکتا ہے کہ تیمور کی بھی تقرری مشیر کار کی حیثیت سے ہوئی ہو لیکن بیکیچک نے اسے کچل دینے کا فیصلہ کیا۔ تیمور کے لیے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ جو کوئی بھی اسے حکومت وقت کے حوالے کر دیتا اسے زبردست انعام ملتا آئندہ دو سالوں تک تیمور نے ایک مغرور قیدی کے مانند زندگی گزاری۔ اس کی بدقسمتی کا تنہا ساتھی امیر قزغن کا ایک پوتا امیر حسین اور اس کی بیوی الجائی ترکان آغا[1] کا بھائی تھا۔

خیوق کے حکمراں تکل نے ان پر ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ حملہ کر دیا۔ وہ لڑے اور انھوں نے تکل کو مار ڈالا۔ لیکن جنگ کے بعد صرف اس کے سات پیروکار بچے۔ وہ آمو دریا کے مغرب صحرائی علاقہ (چول) میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان کے پیروکاروں میں سے تین جو خراسانی تھے اپنے گھوڑوں سمیت بھاگ گئے۔ تیمور جوف کے نخلستان کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں چند ترکمانوں نے اسے روکا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک غلہ کے کنویں میں چھپا دیا اور لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اسے حاجی محمد نامی ایک شخص نے پہچان لیا اور اس نے ترکمانوں کو مناسب برتاؤ کرنے کو کہا۔ اور محمودی میں امیر حسین سے جا ملنے میں تیمور کی مدد کی لیکن تیمور کی بدترین بدنصیبی ابھی آنے کو باقی تھی مخان کے ترک[2] حکمراں علی بیگ نے جو جون غربانی الوس کے ارغون شاہ کا بیٹا تھا، اسے گرفتار کرنے کے لیے ساٹھ آدمی روانہ کیے۔ اور اسے ایک تاریک کمرے میں 62 دنوں تک قید میں رکھا جو پسوؤں سے اتنا بھرا تھا کہ تیمور انہیں پیروں پر چڑھ جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن علی بیگ کے

---

(1) آغا کی اصطلاح اس وقت شہزادوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔

(2) ترک اور مغل کی اصطلاح رفتہ رفتہ صحرائی گروہوں کے مذہب تبدیل شدگان اور غیر تبدیل شدگان افراد کو ظاہر کرنے لگی تھی۔

بڑے بھائی محمود بیگ نے اسے ایک ہم حیثیت ترکی امیر کے ساتھ اس غیر انسانی اور بلا مقصد ناروا سلوک پر ایک سخت پیغام بھیجا اور تیمور رہا کر دیا گیا۔

اس کے بعد امیر حسین نے جتھ کی سرحد سے باہر جنوبی افغانستان میں گرمیسر کی جانب پیش قدمی کی۔ اور تیمور کِش میں اور سمرقند میں اپنی بڑی بہن کے گھر میں چند دن چھپ کر گزارنے کے بعد راستہ میں اپنے چند پیروکاروں کو اکٹھا کر کے وہاں اس سے جاملا۔ سیسان کے حکمران نے ان سے اپنی حمایت میں سکزیان کے خلاف لڑنے کی درخواست کی۔ اس کے بعد جو جنگ ہوئی اس میں تیمور کے پیر میں زخم آئے اور اُسے تومن میں اپنی صحت کی بحالی تک انتظار کرنا پڑا۔ تو غلوق تیمور کی موت کے باعث ان دو مہم جوؤں نے اطمینان کی سانسیں لیں الیاس کو اپنے باپ کے تخت پر بیٹھنے کی غرض سے وطن واپس ہونا پڑا اور حسین اور تیمور جتھ کی پسپا فوجوں کو پلِ سنگین (Iron Bridge) کی جنگ میں شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک قوریلتائی منعقد کی اور داوا خاں کے ایک خلف کاملشاہ اوغلن کو جو ایک نہایت غربت کی زندگی بسر کر رہا تھا اپنے خان کی حیثیت سے منتخب کیا۔ امیر حسین نے خان کو اپنے ساتھ رکھا۔

مئی 1365ء میں جتھ کی فوجوں نے ایک بار پھر ماوراء النہر پر حملہ کیا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد حسین اور تیمور کو شکست ہوئی۔ اور وہ پناہ کے لیے آمو دریا کے جنوبی خطہ میں بھاگ گئے۔ تب فتحیاب جتھ سمرقند کے خلاف روانہ ہوا لیکن دو ملاؤں اور ابو بکر کبیر نامی ایک دھنیے کی قیادت میں شہریوں نے چار ماہ تک جتھ فوج کا مقابلہ کیا اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ امیر حسین اور تیمور پھر دوبارہ نمودار ہوئے۔ انھوں نے صرف ملاؤں کو چھوڑ دیا لیکن تمام مزدور طبقہ کے لیڈروں کی جنھوں نے جتھ کو شکست دی تھی سرزنش کی۔ آخیر میں امیر حسین نے امراء سے ایک زبردست مال گزاری اکٹھا کرنے پر زور دیا اور تیمور کو اپنے افسروں کی جانب سے خود اپنی جیب سے ادائیگی کرنی پڑی۔

تیمور اپنے بڑے شریک کار، جو لالچی اور گھمنڈی تھا، کے ساتھ [مزید] وفاداری پر تیار نہ تھا۔ اس نے اپنے ساتھی امراء سے رابطہ قایم کیا۔ انھوں نے اسے

حسین سے لڑنے کا مشورہ دیا لیکن جب یہ بات ایک کھلے تصادم تک پہنچی تو وہ اس کے خلاف ہو گئے۔ نتیجتاً پورے ماوراء النہر پر امیر حسین کا اقتدار مستحکم ہو گیا اور تیمور کو آمو دریا کے مشرقی صحرا میں بھاگنا پڑا۔ اسے مزید دو سالوں تک ایسی مصیبتوں اور عسرت کا سامنا کرنا پڑا جن سے وہ اس سے قبل واقف نہ تھا۔ اس پریشان حالی کے دوران اس نے 243 آدمیوں کے ساتھ قرشی جس کے دِفاع میں 20 ہزار سپاہی تھے، پر قبضہ کر کے دوستوں اور دشمنوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس کارنامے کی اہمیت محض اپنے اخلاقی اثر کی بنا پر تھی کیونکہ جب امیر حسین پوری طاقت کے ساتھ بڑھا تو تیمور کو سیر دریا کے پار بھاگ جانا پڑا۔ جتھ سے اپیل اس کا آخری سہارا تھی لیکن چونکہ جتھ کی اکثریت نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا تھا لہٰذا مذہبی محققین نے تیمور اور حسین کے درمیان ایک سمجھوتہ پر زور دیا۔ تیمور راضی ہو گیا۔ اور اس کے بعد تعاون کے زمانہ میں اس نے بدخشاں کے ہمالیاتی بلندیوں کے علاقوں کے شاہوں پر فتح حاصل کرنے میں حسین کی مدد کی۔ بعد اس نے اس جنگ کو اپنی "سب سے سخت جنگ" مانا۔ یزدی کے مطابق امیر حسین کے کردار کے مندرجہ ذیل عیوب اس کے زوال کا سبب بنے کیونکہ انہوں نے امراء کو تیمور سے مل جانے پر مجبور کر دیا۔ "دولت کا لالچ، اپنے متعلق غلط خیالات، غرور اور گھمنڈ"۔

تیمور ان امراء کے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہ تھا جن سے نمٹنا تھا لیکن جب تک اکثریت نے اپنے وعدوں کو پورا کیا اس وقت تک عہد شکنوں کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کی اس کی شرائط یہ تھیں کہ سیور غمتش جو چنگیز کی نسل کا ایک تیموری افسر تھا اور جس کی وفاداری پر وہ بھروسہ کرتا تھا، کو مہم کے آغاز میں 'خان' منتخب کیا جائے اور خود تیمور کو، کامیابی کی صورت میں 'امیر' اور صاحب قران کے القاب کے ساتھ بادشاہ، منتخب کیا جائے۔

جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے تو تیمور نے اپنی فوجیں اکٹھا کیں اور نئے خان کے ساتھ امیر حسین کے خلاف روانہ ہوا جو چنگیز کے زمانے سے غیر آباد قلعہ ہندوان میں تھا جسے اس نے بلخ کے قریب تعمیر کیا تھا اگرچہ تیمور کے چند معاہدین نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن (جنگ کا) فیصلہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ حسین کو تیمور کا

پیغام صاف اور واضح تھا! ”باہر آؤ اور مطیع ہو جاؤ“ بالآخر حسین نے اپنے آپ کو قدیم بلخ کی مسجد میں چھپانے کی کوشش کی لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ہاتھوں کو باندھ کر تیمور کے سامنے پیش کیا گیا۔ تیمور نے مکر کے آنسو بہائے اور اُسے ن تنہا گھوڑے کی پیٹھ پر سفر حج کے لیے روانہ ہونے کی اجازت دیدی لیکن ابھی وہ زیادہ دور بھی نہ جانے پایا تھا کہ تیمور کے دو افسروں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے چار بیٹوں میں سے دو کو بھی قتل کر دیا گیا جب کہ وہ ہندستان بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوان کا قلعہ تباہ کر دیا گیا اور حسین کے گھروں کو منہدم کر دیا گیا۔ 13/اپریل 1370ء (12/رمضان) کو تیمور منگول انتخاب کے مکمل رسم و رواج کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ جمع امراء نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیکے اور ”ایک دل اور ایک زبان سے اس کی اطاعت کا وعدہ کیا“۔ تیمور نے سمرقند کو اپنا دارالسلطنت بنانے کا فیصلہ کیا۔

جتھ کی مہمات

تیمور کا پہلا فرض ماوراءالنہر کو جتھ سے محفوظ کر لینا تھا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی پندرہ سالوں میں تیمور اور اس کے افسران نے جتھ کے خلاف تقریبا چھ مہمیں چلائیں اور 1375ء میں تیمور ان کی سرزمین پر پانچ ماہ کے لیے خیمہ زن ہو گیا۔ دفاع کا ہیرو قمرالدین دغلات تھا جس نے اپنی نہایت اعلیٰ ہمتی کا ثبوت پیش کیا اور تیمور کے دوسرے بیٹے عمر شیخ کی ناک میں دم کر دیا جو اندیجان (اندگان) میں جتھ کی طاقت کو نہ توڑا جا سکا تھا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی سالوں میں تیمور کی مہمات اپنے ان افسروں کی بغاوتوں کی بناء پر متعدد بار مفلوج ہو کر رہ گئیں جو اس کے پاس سے جتھ یا اور دس خاں کے سفید جتھ میں بھاگ سکتے تھے۔

خوارزم

چنگیز کی سرزمین کو اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم میں خوارزم، جوجی کے الوس کے حصہ میں آیا تھا۔ یہ اب ترکی۔ منگولی خاندان کے قبضہ میں تھا جس کا خاندانی نام صوفی تھا اور جو کھنگھیرت ذیلی الوس سے تعلق رکھتا تھا۔ تیمور نے خوارزم کے خلاف پانچ مہمیں چلائیں اور چونکہ یہ ماوراءالنہر کا ایک حصہ نہ تھا لہٰذا اس کے سلسلہ

میں تیمور نے دہشت زدگی اور تباہی کی پالیسی اختیار کی۔ 1375ء میں پہلی مہم کے دوران خوارزم کی سرزمین لوٹ لی گئی لیکن جہاں تک شہر کا تعلق تھا تیمور نے ایک معاہدہ کو قبول کر لیا۔ 1375ء میں حسن صوفی، جس نے تیمور کی سرزمین پر حملہ کیا تھا، نے جنگ کے بغیر اطاعت قبول کر لی۔ تیمور کی تیسری مہم ملک ہی میں اپنے افسروں کی بغاوت کی بنا پر ناکامیاب ہو گئی۔ 1375ء میں حسن صوفی نے اورس خان کے ساتھ تیمور کی جنگ کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ادھر تیمور بھی کسی مزید مصالحت کے لیے تیار نہ تھا۔ تین ماہ اور چھ دنوں کے محاصرے کے بعد خوارزم پر قبضہ کر لیا...... عمارتیں تباہ کر دی گئیں اور تمام ممتاز لوگوں کو۔ تعلیم یافتہ اشخاص، تربیت یافتہ غلاموں (موالی) قرآن کے محافظوں اور صنعت کاروں کیش لیجایا گیا.......... عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا گیا۔ اور مردوں کو تلواروں اور تیروں سے مار ڈالا گیا[1]۔“

بالآخر 1389ء میں جب توقتمش کی ایک فوج خوارزم کی راہ سے ماوراء النہر روانہ ہوئی تو تیمور نے جو اس وقت ایران سے لوٹ رہا تھا اس کی مکمل تباہی کا فیصلہ کیا ”یہ حکم جہاں مطاع صادر کیا گیا کہ سرزمین میں خوارزم کے تمام شہری باشندوں کو سمرقند لے جایا جائے۔ شہر کو تباہ و برباد کر دیا گیا اور وہاں جو بو دیا گیا[2]۔

توقتمش

ہمارے ماخذ سیر دریا کے مشرق کی تین سلطنتوں کا ذکر کرتے ہیں! ترکستان جو جتھ کے زیر اختیار تھا، مغلستان دریائے ارتش تک، اور اس کے مغرب میں اورس کے خاں کا سفید جتھ۔ ایک جوجی شہزادہ توقتمش کو اورس کے ذریعے شکست ہوئی اور تیمور کے پاس بھاگ گیا۔ چونکہ تیمور نے توقتمش کو حوالہ کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا ایک تناؤ پیدا ہو گیا مگر کسی جنگ کی نوبت نہ آئی۔ موسم سرما کی تین ماہ کی سخت سردیوں کے دوران اورس خاں شقناق میں خیمہ زن رہا اور تیمور اُترار میں۔ تقریباً ایک دوسرے سے 84 میل کے فاصلہ پر۔ اورس خاں پسپا ہو گیا غالباً اس وجہ سے کہ وہ بیمار تھا۔ اس

---

(1) ظفر نامہ، جلد اوّل ص ص 300-299

(2) ایضاً ص 448

کے بعد جلد ہی اس کا انتقال ہو گیا اسی طرح اس کے بڑے لڑکے توختہ قیا کا بھی۔ اس اثنا میں تیمور ملک اوغلن جو ایک عادی شرابی تھا سنہرے جتھ کے تخت پر متمکن ہوا۔ نتیجتاً 1376ء میں تیمور خاں کی مدد سے توقمتش نے سفید جتھ کا تخت حاصل کیا اور (بعد میں) خود اپنی کوششوں سے سنہرے جتھ کا تخت، مع اس کی اسرائی اور استراخاں کی بڑی بڑی دارالسلطنتوں کے، حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہلی خراسان مہم: ہرات

ہرات کے حکمراں ملک غیاث الدین کرت نے نیشاپور اور دوسرے اضلاع کو فتح کر کے اپنے علاقے بہت زیادہ وسیع کر لیے تھے لیکن وہ کسی طرح بھی اس پوزیشن میں نہ تھا کہ 1381ء میں اپنے خلاف تیمور کے حملہ کی مزاحمت کر سکے۔ تیمور کی راہ کے تمام شہر اور قلعے مطیع ہو گئے لیکن فشنج کی فوج نے مزاحمت کا فیصلہ کیا جس کے نتیجہ میں قلعہ کو تباہ کر دیا گیا اور محافظ فوج تہ تیغ کر دی گئی۔ ہرات کا شہر تیمور کے ہاتھوں میں آ گیا اور غیاث الدین نے صرف قلعہ کے اندرونی حصوں کے دفاع کی کوشش کی لیکن تیمور کے اس حکم کی بنا پر دفاع مفلوج ہو کر رہ گیا جو شہر پناہوں تک لڑنے کے لیے آئے گا اسے قتل کر دیا جائے گا لیکن جو لوگ گھر ہی میں رہیں گے انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ غیاث الدین باہر آیا اور اس نے اطاعت قبول کر لی۔ ہرات کے اندرونی و بیرونی قلعوں کو تباہ کر دیا گیا۔ کیرت ممالکوں کے جمع شدہ خزانے تیمور کے ہاتھوں میں آ گئے اور چار دنوں میں ضمانت کے روپے ہرات سے وصول کر لیے گئے۔ کیرت خاندان کے تمام شہزادوں کو گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں انھیں قتل کر دیا گیا۔

اسی اثنا میں تیمور کے افسروں نے نیشاپور اور سبزوار پر قبضہ کر لیا۔ تیمور شمال کی جانب طوس روانہ ہوا اور مازندان کے حکمراں شیخ بائسو کے لڑکے امیر ولی کو اپنے سامنے حاضر ہونے کی ہدایت کی۔ ولی کو اپنی طاقت کا مزہ چکھانے کی خاطر اس نے اسفارین پر حملہ کر دیا جو ولی کے افسروں کے قبضہ میں تھا۔ یزدی لکھتا ہے کہ "پوری آبادی کا قتلِ عام کر دیا گیا اور شہر تباہ کر دیا گیا۔ اسفارین کا اس کے نام کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا۔[1]"

---

(1) ایضاً ص 325

کلاویجو نے، جو تیمور کی حکومت کے آخر میں اسفارین سے گزرا تھا، شہر کو کھنڈر کی صورت میں پایا۔ لیکن چند اشخاص نے جو ان کھنڈرات میں رہ رہے تھے (اس کے ساتھ کے) مسافروں کو ضرورت بھر کھانے دیئے تھے۔

دوسری خراسان مہم

تیمور نے موسم سرما اپنی فوجوں کو اکٹھا کرنے میں گزارا اور 1382ء کے موسمِ بہار میں مخان اور کلات کی راہ سے خراسان روانہ ہوا۔ علی بیگ جون غزبانی نے، جس نے ایک بار تیمور کو قید کیا تھا، اپنے آپ کو سمرقند کے جیل میں پایا۔ غوریوں کے ایک گروہ سدیدیوں کو جنھوں نے ترشیز کے قلعہ کی مدافعت کی بہادرانہ کوششیں کی تھیں گرفتار کر لیا گیا اور انہیں تیمور کے ترکسان کے قلعوں کی مدافعت کے لیے بھیج دیا گیا۔ خراسان، جو اب دشمنوں سے پاک ہو چکا تھا، تیمور کے تیسرے بیٹے میران شاہ کے سپرد کر دیا گیا۔ 1383ء میں ہرات کی ایک بغاوت کو سختی سے کچل دیا گیا۔

سیستان اور جنوبی افغانستان

1383ء میں تیمور نے موسم خزاں میں سیستان کے خلاف پیش قدمی کا اور گرسیر، قندھار اور کابل کے راستہ لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ بزوار کے قلعہ کو جس نے بغاوت کی تھی زیر کر لیا گیا۔ ”تقریباً دو ہزار اشخاص کو پکڑ لیا گیا اور جب کہ ابھی وہ زندہ ہی تھے کہ انہیں ایک دوسرے پر رکھ کر اینٹ گارے سے ان کا ایک مینار بنا دیا گیا تاکہ عوام الناس ان سزاؤں سے آگاہ ہو کر غرور تکبر کا شکار ہو کر اپنے آپ کو تباہی و بربادی کے گڑھے میں ڈھکیلنے پر آمادہ نہ ہو جائیں“۔ اس کے بعد فوج کے مقدمۃ الجیش نے شہر سیستان کے دروازوں تک کے علاقے کو لوٹا اور کھسوٹا۔ اس کے حکمران شاہ قطب الدین کا مزاحمت کا ارادہ نہ تھا لہٰذا اس نے اپنی اطاعت کی پیش کش کے لیے اپنے سفراء بھیجے اس کے بعد وہ باہر آیا اور اس نے ہتھیار ڈال دیئے لیکن اس کی چند رعایا کے ذریعہ کی گئی مزاحمت شہر کی تباہی کے لیے ایک بہانہ بن گئی۔ ”جنگجو سپاہیوں نے باشندوں کو مار ڈالا اور شہر کو اکھاڑ پھینکا۔ تمام لوگوں کو بچوں سے لے کر سو سال تک کے لوگوں تک مرد اور عورتوں، بوڑھے اور نوجوانوں سبھی کو ذبح کر ڈالا گیا۔ تمام چیزوں کو نذر

آتش کر دیا گیا اور لوٹ لیا گیا یہاں تک کہ دیواروں کی کیلوں تک کو"۔

اس کے بعد تاتار فوج دریائے ہلمنڈ کے کنارے آگے بڑھی۔ دریائے ہلمنڈ پر ایک بڑے کار آمد بند کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ تومن تکودری نے، جو ایک منگول تھا، جس نے مذہب تبدیل نہیں کیا تھا، لڑ کر مر جانے کو ترجیح دی اور اس کے تین ہزار پیروکاروں جنہوں نے ابھی اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا، اور قلعہ دہنا بھی جو تاآجی نامی قبیلے کے قبضہ میں تھا، اسی بدنصیبی کا شکار ہوا۔ کوہِ سلیمان کے افغانی قلعوں پر قبضہ کر لیا گیا اور ان کی فوجوں کو گردن زدنی کے لیے منگول روایات کے مطابق تیمور کے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ قندھار بغیر کسی کشمکش کے مطیع ہو گیا۔ یہ مہم سیستان اور زادستان (غزنی) کو تیمور کے قبضہ میں لے آئی۔

مازندران

یہ ایرانی صوبہ، جس کا صدر مقام استر آباد تھا، ایک اِل خانی افسر، شیخ بائسو کے ایک خلف ولی کے زیرِ اقتدار تھا، لیکن مشرقی مازندران کے دو اضلاع، آمل اور ساری جو بحیرہ کاسپین سے ملتے تھے، کو سید قوام الدین اور اس کے چیلوں نے اس کے ترکی منگولی افسر افراسیاب سے غصب کر لیا تھا۔ مازندران مں سالانہ تقریباً18انچ کی زبردست بارش ہوتی ہے لہٰذا اس خطّہ کے جنگلات کافی گھنے تھے۔ 1383ء کے موسم بہار میں تیمور نے جنگلوں کے بیچ سے کاٹ کر بیس دنوں میں استر آباد تک اپنا راستہ بنا لیا اور تب ایک زبردست قتل و غارتگری کے بعد وہاں اپنی طاقت مستحکم کر لی۔ آمل اور ساری کے سیدوں کو استر آباد میں اس کے گورنر کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا لیکن دیگر اعتبار سے انہیں وقتی طور پر خلل انداز نہ کیا گیا۔ اس کے بعد تیمور آذربائجان کی جانب روانہ ہوا اور اس نے اِل خانوں کے ایک صدر مقام سلطانیہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر یہ سوچ کر کہ اس کا اقتدار وہاں محفوظ ہے وہ سمرقند لوٹ آیا۔ لیکن 84-1383ء کے موسم سرما میں توقمتش نے دربند کے راستے جنوب میں ایک فوج روانہ کی۔ اس نے دس دنوں تک تبریز کو لوٹا اور اس کے بعد واپس لوٹ گئی۔ چونکہ توقمتش تیمور کے احسانات تلے بہت زیادہ دبا ہوا تھا لہٰذا اس کا رویہ غیر متوقع تھا۔ لیکن اس کے دربار میں

ایک تیمور مخالف گروہ کی تشکیل ہو گئی تھی۔

تین سالہ مہم

تیمور نے پورے ایران کی ذمہ داری سنبھال لینے کا فیصلہ کیا اور اپنے بھرتی کرنے والے افسروں کو تین سالوں تک ایک فوج کی بھرتی کا حکم دے کر 1386ء کے موسم بہار میں وہ دوبارہ روانہ ہوا اس نے آذربائجان میں دوبارہ اپنی طاقت کو مستحکم کیا اور یہ بات دونئے دُشمنوں-ترکمان جن کی قیادت قرا یوسف، اور بعد میں اس کے بیٹے قرا محمد اور ایک مشہور اِل خان، افسر حسین بزرگ جو بغداد اور عراق کے ایک حصہ کا حکمراں تھا کے ایک خلف، سلطان جلدیر، نے کی- کے ساتھ ایک کشمکش کا سبب بنی۔ یہ دشمن تیمور کی زندگی کے آخیر تک اس کی پریشانی کا مقدر بن گئے۔ لیکن فی الحال اس نے دوسرے معاملات کی طرف توجہ دینے کا فیصلہ کیا۔

(الف) لار۔ ای۔ کوچک کے حکمراں ملک عزالدین کو کچل دیا گیا اور اس کے خرم آباد کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کی محافظ فوج کو پہاڑوں کے کنارے پھینک دیا گیا۔

(ب) تیمور نے روایتی منگول طریقہ پر جوجیا میں قتل و غارت گری مچائی اور اسے "مقدس جنگ" کا نام دیا۔ تفلس کے حکمراں کو، جسے بقراط کہا جاتا تھا، گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے مسلمان ہو جانے کا فیصلہ کیا اور اس نے تیمور کو ایک زرہ تحفہ میں پیش کش کی جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ اسے پیغمبر داؤد علیہ السّلام پہنا کرتے تھے۔

(ج) چونکہ عثمانی شہنشاہ بایزید ایلارم (بجلی کا کڑکا) اناطولیہ کے آزاد شہزادوں کی سرزمینوں پر قبضہ کر رہا تھا لہٰذا ارزرم کا حکمراں طہرتن نے تیمور کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ تیمور آذربائجان کے قلعہ کی طرف روانہ ہوا اور ایک دن میں اسے زیر کر کے طہرتن کے حوالہ کر دیا۔ حیرت ہے کہ بایزید نے اس واقعہ پر کوئی توجہ نہ کی۔

(د) اس کے بعد تیمور نے ہر طرف اپنی فوجیں روانہ کیں۔ اوران کے حکمراں ملک عزیزالدین شیر اور آرمینیا کے عیسائی حکمراں تیزک دونوں ہی مطیع ہو گئے۔ لیکن چونکہ وان کی محافظ فوج نے مزاحمت کی لہٰذا اسے بیس دنوں کے محاسرے کے بعد زیر کر لیا گیا۔ اور (محافظ سپاہیوں کو) پہاڑی کنارے نیچے پھینک دیا گیا۔

(ر) تیمور کا دوسرا مقصد جنوبی ایران تھا جس کے مختلف اضلاع پر مظفری خاندان کے شہزادوں کی حکومت تھی۔ شاہ شجاع نے، جو حافظ کے غیر قانونی اشعار میں اپنی تعریف کی بنا پر مشہور ہے، 1384ء میں اپنے بستر مرگ سے ایک نہایت دردمندانہ خط میں تیمور سے اپنے خاندان کے سلسلہ میں اپیل کی تھی اور تیمور نے اس کی درخواست قبول کرلی تھی۔ تیمور بہر صورت اپنی تسلط، لوٹ اور قتل وغارتگری کی عام پالیسی ہی کی تقلید کرتا کیونکہ اسے اپنے سپاہیوں کو مالِ غنیمت مہیا کرنا تھا اور دہشت و خوف کی حکومت قایم کرنی تھی۔ لیکن مظفری شہزادوں کے رویہ نے اسے ان کے مکمل استیصال کے لیے ایک بہانہ مہیا کردیا۔

شاہ شجاع کے بیٹے اور اصفہان کے حکمراں زین العابدین کو تیمور نے بلایا تھا لیکن حکم کی تعمیل کے بجائے اس نے تیمور کے قاصدوں کو قید کردیا تھا۔ لہٰذا جب تیمور اصفہان کے خلاف روانہ ہوا تو زین العابدین اپنے چچیرے بھائی منصور کے پاس بھاگ گیا جس نے اسے اندھا کردیا۔ بہر حال اصفہان کے ممتاز لوگ تیمور کو اپنی وفاداری کی پیش کش کی غرض سے باہر آگئے۔ تیمور نے اپنے افسروں میں سے ایک کو شہر کا انچارج متعین کردیا۔ آبادی سے اپنے ہتھیار اور گھوڑوں سے دستبردار ہونے کو کہا گیا اور تاتار افسران کو ہدایت کی گئی کہ وہ شہر کے ممتاز لوگوں سے ضمانت کی رقم کی وصولی پر نگرانی رکھیں۔ لیکن رات کو کسی علی کچ نامی ایک شخص نے جو تہران کا ایک لوہار تھا ایک ڈھول پیٹنا شروع کردیا اور شہر کے ایک مجمع نے ضمانت کی رقم کے وصول کرنے والوں کو اور تقریباً 3 ہزار سپاہیوں کو مار ڈالا۔ اس بات نے تیمور کے لیے وہ موقعہ فراہم کرایا جس کی اسے تلاش تھی۔

''دوسرے دن اس نے شہر پر قبضہ کر لینے کا حکم دیا اور ان مکانات کے علاوہ جن میں سید لوگ اور موالی (جج) رہتے تھے اور امام الدین واعظ جو گزشتہ سال انتقال کر چکے تھے کے گھر کے علاوہ اس نے، ہر قسم کی بے رحمیوں کے ساتھ شہریوں کے ایک قتل عام کا حکم نافذ کیا۔ جن چند لوگوں نے تاتار سپاہیوں کی حفاظت کی تھی ان کے گھر بھی محفوظ رہے لیکن یہ خوفناک حکم دیا گیا کہ ہزار، سو اور دس تاتار سپاہیوں کے ہر گروہ کو قلم زدہ سروں کی ایک مقررہ تعداد حاضر کرنی ہے اور اس حکم کی تعمیل کی دیکھ

بھال کے لیے علیحدہ افسران کی تقرری کی گئی۔ میں نے معتمد گاہوں سے یہ بات سنی ہے کہ متعدد سپاہیوں نے جو قتل کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے تھے باقیان (وہ افسران جو حکم کے نفاذ کے ذمہ دار تھے) سے قلم زدہ سروں کو خرید کر ان کے سپرد کیا۔ شروع میں ایک قلم زدہ سر کی قیمت بیس دینار کبکی تھی لیکن بعد میں جب متعدد سپاہیوں نے مطلوبہ تعداد میں سروں کو حوالے کر دیا تو ایک قلم زدہ کو نصف کبکی دینار میں پیش کیا جاتا اور اسے کوئی نہ خریدتا تھا۔[1]

چند اشخاص نے جنہیں دن میں قتل نہ کیا جا سکتا تھا رات میں نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن چونکہ برفباری ہو گئی تھی لہٰذا ان کے نقش پا کی بناء پر ان کی کمین گاہوں کا پتہ لگا لیا گیا اور انہیں قتل کر دیا گیا۔" مرقوم اعداد کے مطابق کم از کم ستر ہزار اشخاص کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اصفہان سے باہر مختلف جگہوں پر ان کے سروں کا ڈھیر لگایا گیا۔"

جب تیمور نے شیراز کی جانب پیشقدمی کی تو لار کے اتابکوں اور گرگین لاری کے ہمراہ تمام مظفری شہزادوں نے آخر اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اور شیراز کے لیے ضمانت کی رقمیں ادا کر دی گئیں۔ تیمور نے جسے وطن سے تشویشناک خبریں موصول ہوئیں تھیں انہیں دوبارہ ان کی سرزمینیں سپرد کر دیں اور راستہ میں خوارزم کو تباہ کرتا ہوا واپس لوٹ گیا۔

1388-89ء کا جزوی بحران

اگر تیمور کے خانگی اور غیر ملکی دشمنوں کے درمیان کوئی اتحاد عمل ہوتا تو اسے ایک حقیقی بحران کا سامنا ہو جاتا۔ پھر بھی اس کی طاقت کو جو بری طرح متزلزل ہو گئی تھی اس کے افسران نے اس کی غیر موجودگی میں دوبارہ مستحکم کر لیا۔ اول تو یہ کہ توقتمش کی ایک فوج نے بحیرہ ارال اور سیر دریا کے مشرق میں واقع دشت کی راہ سے تیمور کے بیٹے عمر شیخ کو، جسے اس نے اندیجان (اندگان) کا انچارج مقرر کیا تھا، جو گلک میں ایک ذلت آمیز شکست دی۔ عمر شیخ اندیجان واپس بھاگا۔ تیمور کے افسران سمرقند

---

(1) ایضاً ص 433-34

واپس ہو گئے تا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اس کی محافظت کر سکیں۔ (لیکن) حملہ آور فوج کھلے علاقوں کو تاراج کرتی ہوئی واپس ہو گئی۔ اسی اثناء میں توقمتش کی دوسری فوج نے خوارزم کی راہ سے ہو کر آمو دریا کو عبور کر لیا۔ وہ بخارا کو زیر نہ کر سکی لیکن اس نے زنجیر سرائے نذر آتش کر دیا اور واپسی سے پہلے سیر دریا تک کے کھلے دیہاتوں کو لوٹا۔

توقمتش سے بالکل آزادانہ طور پر حاجی بیگ ارنکوٹ کا بھتیجا انکٹورا، مغلستان کی فوج کے ساتھ سیرم اور تاشقند کی راہ سے روانہ ہوا اور اس اندیجان میں عمر شیخ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن پھر چند نامعلوم اسباب کی بناء پر وہ خود اپنی سرزمین کو واپس ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد تیمور کی لڑکی سلطان بخت بیگم کے شوہر محمد میرک نے سمرقند میں بغاوت کر دی اور بھاگ گیا۔ عمر شیخ نے اس کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا اور اس کے بھائی ابوالفتح کے ساتھ قتل کر دیا بورلدائی الوس نے جنوب میں بغاوت کر دی۔ ہندو کش تک اس کا تعاقب کیا گیا اور اس کے لیڈران پناہ کے لیے ہندستان بھاگ آئے۔

تیمور کی طاقت کے دوبارہ مستحکم ہو جانے کے بعد توقمتش نے جنوبی سائبیریا کو پار کر کے موسمِ سرما کے وسط میں سیر دریا کے مشرقی شہروں پر حملہ کر دیا۔

اگرچہ اس قدر شدید برف باری ہوئی تھی کہ برف اس کے گھوڑوں کے سینوں تک پہنچ گئی لیکن پھر بھی تیمور دشمن کے خلاف روانہ ہونے پر ڈٹا رہا۔ توقمتش حقیقی معنوں میں کچھ حاصل نہ کر سکا اور پسپا ہو گیا۔

1391ء کی مشرقی مہم

اگرچہ تیمور توقمتش سے اس کے وطن میں لڑنے کا خواہشمند تھا لیکن اس نے اپنے افسروں کے اس مشورہ کو قبول کر لیا کہ سب سے پہلے اسے خضر خواجہ اغلن (تغلق تیمور کا بیٹا) اور انکٹورہ کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ انہیں ایک سہولت یہ حاصل تھی کہ وہ لمبے عرصے تک جنگ کر سکتے تھے اور تیمور کے لیے ان کی نیست و نابودی ممکن نہ تھی۔ تیمور نے اپنا صدر مقام ہلدوزم میں قایم کیا جو سمرقند سے دو ماہ کے سفر کی دوری پر ایک مقام ہے۔ انکٹورہ کے تعاقب کے لیے ایک فوج روانہ کی گئی۔ وہ ارتش پہنچی اور تیمور کے افسروں نے دریا پار کیا اور دوسرے کنارے پر درختوں کے

تنوں پر اپنے نام کھود دیئے۔ دوسری فوج عمر شیخ کی قیادت میں قراخواجہ نامی ایک جگہ، جو سمرقند سے تین ماہ کے سفر کے فاصلہ پر واقعہ تھی، پہنچی۔ خضر خواجہ اُغلن کو شکست ہوئی لیکن وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

قیچق کی راہ سے توقمش کے خلاف مہم

تیمور نے قیچق (جنوبی سائبیریا) کے اس پار (علاقے میں) پانچ یا چھ ماہ لمبی ایک مہم چلائی تاکہ شمال کی جانب سے سنہرے جتھے کی سرزمین پر حملہ کر کے اسے اپنے اندرونی علاقے میں جنگ لڑنے کے قدرتی فائدے سے روک سکے اور فرار کو ناممکن بنا دے۔ اس کے سپاہیوں کو سخت دشواریاں درپیش تھیں لیکن انھیں مالِ غنیمت بھی کافی ملا۔ تیمور کی عسکری عبقریت اور فوجوں کی صحیح تعیناتی کی صلاحیت نے والگا کی جنگ میں توقمش کی مکمل شکست کو یقینی بنا دیا۔ اس کے بعد فاتح فوج مال غنیمت- مویشیوں کے رائس، گھوڑے، لڑکے، لڑکیاں، چھکڑا اور خاص قسم کے نقل پذیر خیمے (خرگاہ کوترمہ)- اکٹھا کرنے کی خاطر ہر طرف پھیل گئی۔ فوج کے سپاہیوں نے جو اپنی روزانہ کی روٹیاں حاصل کرنے میں بڑی بڑی مشکلات اٹھایا کرتے تھے اب اتنے گھوڑے اور بکریاں اکٹھا کر لی تھیں کہ وہ انہیں واپس لے جانے سے عاجز آ گئے اور انہوں نے کچھ کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔[1]

پانچ ہزار لڑکے اور لڑکیوں کو صرف تنہا تیمور کے لیے غلام بنا لیا گیا اور ایک عام سپاہی نے بھی اپنا حصہ پایا۔ تیمور 21 دنوں سرائی میں مقیم رہا اس کے بعد تیز رفتاری سے وطن لوٹ گیا۔ اصل کیمپ، جس کا انچارج امیر سیف الدین تھا، دسمبر 1391ء میں آمو دریا کے پاس پہنچا۔ آنے اور جانے والے دونوں سفروں میں گیارہ ماہ لگے۔[2]

---

(1) ایضاً ص 549-50

(2) جنوبی سائبیریا کے بیچ سے روانگی کے سلسلہ میں بڑے محتاط انتظامات کرنے پڑے تھے۔ پھر بھی یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ تیمور کسی خطہ کی کھوج لگا رہا تھا۔ حقیقت میں یہ ایک عام راستہ تھا جس سے سنہرے جتھے کی فوجیں بارہا گزر چکی تھیں۔ تیمور نے اپنے سپاہیوں سے الق تق میں پتھروں کا ایک ٹیلہ رکھ چھوڑنے کو کہا تھا۔ ممکن ہے یہ اب بھی وہاں موجود ہو۔

پانچ سالہ مہم

تیمور نے اپنے افسروں کو ایک پانچ سالہ مہم کے لیے سپاہیوں کی بھرتی کا حکم دیا اور کچھ آرام کے بعد وہ دوبارہ 1392ء کے موسم بہار میں روانہ ہوا۔ اس کی اہم کامیابیوں کا ایک مختصر بیان ہی یہاں ممکن ہے۔

(الف) آمل اور ساری

سید کمیل الدین اور دیگر سیدوں نے تیمور کی پیش کردہ شرائط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور وہ مہاناسر میں پناہ گزیں ہو گئے۔ تیمور نے ہر دن آدھے فرسخ کے حساب سے جنگل کاٹ کر اپنا راستہ بنایا"۔ مہاناسر کے قلعہ کو ایک ٹیلہ کی شکل میں ڈھیر کر دیا گیا اور یہ اب بھی اسی حالت میں ہے۔[1] "اسماعیلیوں اور دیگر غلط عقاید رکھنے والے لوگوں کو ذبح کر ڈالا گیا اور سیدوں کو تاشقند بھیج دیا گیا۔

(ب) لُرستان

لُر بزرگ کا حکمراں اتابیک پیر محمد آیا اور مطیع ہو گیا۔ بہت سی جگہوں پر جیسے خرم آباد، درد جرد، نہاوند اور تُستر پر قبضہ کر لیا گیا اور کردوں اور لٹیروں کو کچلنے کے لیے فوجی مقرر کیے گیے۔

(ج) جنوبی ایران

تیمور کی غیر حاضری کے دوران مظفری شہزادے شدید خانہ جنگی میں مشغول تھے۔ جب تیمور شیرازہ پہنچا تو شاہ منصور نے صرف تین یا چار ہزار آدمیوں کے ساتھ تیس ہزار کی ایک تیموری فوج پر حملہ کر دیا۔ اصل جنگ کو چھوڑ کر وہ تیمور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے تیمور کی خود پر تلوار کی دو ضربیں لگائیں لیکن اس کے بعد جلد ہی تیمور کا چھوٹا لڑکا مرزا شاہ رخ اس کے پاس منصور کا قلم ردہ سر لے آیا۔ دیگر مظفری شہزادے آکر مطیع ہو گئے۔ قومشہ میں 9/ جون 1393ء کو تیمور نے بوڑھے

---

(1) ایضاً ص ص 77-376

اور جوان تمام مظفری شہزادوں کو جہاں کہیں بھی وہ ہوں قتل کر دینے کا حکم دیا اور اس پوری سرزمین کو جو مظفریوں کے قبضہ میں تھی اپنے بیٹے عمر شیخ کے حوالے کر دیا۔

(د) بغداد، دیار بیکر، جورجیا

تیمور کے افسروں نے سلطان احمد جلایر کو بغداد سے کھدیڑ دیا (اگست 1393ء) تیمور نے دو ماہ بغداد میں قیام کیا اور باشندوں سے ضمانت کی رقم وصولی۔ اس کے بعد اس نے شام کے صوبے، دیارِ بیکر کی جانب پیش قدمی کی اور متعدد قلعوں کو فتح کر لیا۔ شیر واں کا شیخ ابراہیم اس کا وفادار حلیف بن گیا اور گیلان کے حکمرانوں نے اطاعت اور خراج کا وعدہ کیا۔ 1395 کے موسم سرما میں تیمور نے دوسری بار جورجیا کے خلاف ایک مقدس جنگ شروع کی اور اس نے تفلیس تک کا علاقہ لوٹ لیا۔

اس مہم کا آغاز کرتے وقت تیمور نے "غزنی کے سلطان محمود کی پوری سلطنت" اپنے پوتے پیر محمد بن جہاں گیر کے حوالہ کر دی تھی۔ بعد میں ہلاکو کی پوری مملکت" کو اس نے اپنے تیسرے بیٹے میران شاہ کے حوالے کر دیا۔ عمر شیخ، تیمور سے ملاقات کے لیے آ رہا تھا کہ خرماتو کے چلائے گئے ایک تیر سے وہ ہلاک ہو گیا لہٰذا قلعہ کو اور اس کے باشندوں کو تباہ کر دیا گیا اور تیمور نے عمر شیخ کے ایک سولہ سالہ لڑکے پیر محمد کو اس کی جگہ پر فارس کا حکمراں مقرر کر دیا۔

(ر) سنہرا جتھ اور جنوبی روس

تیمور نے از سرِ نو بھرتی کا حکم دیا اور تب ایک ایسی فوج کے ساتھ، جو چنگیز خاں کے زمانہ سے اب تک نہ دیکھی گئی تھی، وہ توقتمش کے خلاف شمال کی جانب بڑھا جسے اس نے ترک کی جنگ (25/اپریل 1395ء) میں شکست فاش دی۔ یزدی کا یہ بیان کہ تیمور نے مسکو (ماسکو) کو لوٹا غالباً صحیح نہیں ہے لیکن جنوبی روس دریائے دوں تک کا علاقہ یقیناً لوٹا گیا اور قوبان کے شہر کو تباہ کر دیا گیا۔ سرالی پر قبضہ کر کے لوٹا گیا اور اُسے نذرِ آتش کر دیا گیا۔ استر خان (کے لوگوں) نے برف کی اینٹوں سے اپنی حفاظت کی کوشش کی تاہم اسے مطیع ہونا پڑا اس کے باشندوں کو باہر لایا گیا اور ان کے شہر کو ان کی آنکھوں کے سامنے نذرِ آتش کر دیا گیا۔ یہ اندازہ تھا کہ دیگر اشیاء کے علاوہ ہر تاتار

سپاہی کو چار یا پانچ لڑکیاں مال غنیمت کے حصہ کے طور پر ملیں۔

(س) ہرمز

جولائی 1396ء میں ہمدان سے وطن روانہ ہونے کے قبل تیمور نے اپنے پوتے محمد سلطان کو ہرمز کے خلاف روانہ کیا۔ محمد سلطان نے اس صوبہ کے قلعہ کو زیر کر لیا اور ہرمز کے ملک محمد شاہ کو مطیع ہو جانے پر مجبور کر دیا۔

ہندستانی مہم

تیمور کے پوتے پیر محمد نے سوچا کہ وہ سلطان محمود کے مال غنیمت کی برابری کر سکتا ہے بلکہ ان پر سبقت لے جا سکتا ہے لیکن انجام کار یہ ہوا کہ وہ ایک مصیبت میں پھنس گیا۔ 97-1396ء کے موسم سرما میں اُس نے اُچھ اور دیپال پور پر قبضہ کر لیا اور مختلف مقاموں پر اپنے داروغہ متعین کیے پھر اس کے بعد ملتان میں اس نے ملو خاں کے بڑے بھائی سارنگ خاں کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ گرمیوں کے چھ ماہ تک جاری رہا اور ملتان پر قبضہ ہونے کے فوراً بعد برسات شروع ہو گئی پیر محمد کی فوج کے گھوڑے مرنے لگے۔ اور اسے ان لوگوں کی نفرت کا نشانہ بننا پڑا۔ جنھیں اس نے لوٹا تھا۔ لیکن پیر محمد جس کی قسمت میں ایک نامعقول شرابی کی صورت میں تنزلی لکھی تھی کو اس کی مصیبتوں سے اس وجہ سے چھٹکارا مل گیا کہ اس کا دادا ملتان سے 40 کوس دور بیاس کے کنارے جنجان نامی مقام پر بروقت آ پہنچا۔

تیمور کی ہندستانی مہم، تربیت اوقات کے عمدہ انتظامات کے ساتھ، ایک لوٹ مار کے حملے کے طور پر تیار کی گئی تھی۔ 1398ء کے گرمیوں کے مہینے ماوراءالنہر سے ہندستانی سرحد تک بہ اطمینان آنے میں گزارے جا سکتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی مہم کو 1399ء-1398ء کے سردیوں کے مہینوں کے دوران ختم کر دینا تھا۔ طویل محاصروں کے لیے اس کے پاس وقت نہ تھا۔ 1398ء میں اپنی فوجوں کے اکٹھا ہو جانے کے بعد تیمور جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے پاس پامیر کے دو کافر گروہوں۔ کتور کے باشندوں اور سیاہ پوشاں لوگوں کے خلاف اندراب سے روانہ ہونے کے لیے کافی

وقت تھا۔ تیمور کاتور کے اطراف کے اونچے پہاڑوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا اس نے وادی میں کافروں کے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا اور اس کے بعد انہیں پہاڑوں کی چوٹی پر مار ڈالا جہاں وہ بھاگ آئے تھے۔ لیکن اس کے جنرل بُرہان اُغلن کو سیاہ پوشوں نے جن کے خلاف اسے بھیجا گیا تھا شکست دے دی اور وہ بزدلوں کی طرح واپس بھاگ گیا۔ اس مہم میں، جو پیدل ہی سر کرنی پڑی، اٹھارہ دن صرف ہو گئے۔

تیمور نے قلعوں کی تعمیر اور قبائل کی سرزنش کے ذریعہ کابل سے افغانوں کی سرزمین میں گزرنے والی اپنی آمد و رفت کی راہ کی حفاظت کا انتظام کیا۔ ایک افغان سردار، موسیٰ، کو ارباب کے قلعہ کی تعمیر پر آمادہ کیا اور پھر اسے اس کے پیروکاروں کے ساتھ مار ڈالا گیا۔ نغز کے قلعہ کو خود تیمور کے اپنے افسران نے تعمیر کیا۔ دو قبائل، جنھیں پرنیاں اور کلاتیاں کے نام سے پکارا جاتا تھا، کے مخصوص تیموری طرز کے قتل عام نے ایک ایسی دہشت کی فضا تیار کر دی کہ راستوں کے تحفظ کا انتظام ہو گیا۔ نغز سے بنّو کے راستے تیمور نے دریائے سندھ کی جانب پیش قدمی کی۔ تپائیوں، کشتیوں اور سرکنڈوں کی مدد سے اس کے ماہرین نے سندھ پر ایک کشتیوں کا پل تعمیر کر دیا۔ جسے 21/ ستمبر 1398ء میں عبور کیا گیا۔

تیمور کا اصل مقصد لوٹنا تھا اور اس نے اپنے راستے کا انتخاب محتاط طریقے پر کیا تھا۔ بڑے شہروں سے گریز کرنا تھا ساتھ ہی مجبور، چھوٹے شہروں اور دیہاتوں کو لوٹ کر اپنے سپاہیوں کے لیے خورد و نوش کے ذخیرے بھی فراہم کرنا تھا۔ وہ ایک بغیر پانی کے خطّہ یا چاؤل سے گزرا جسے ظفر نامہ چاؤل جلالی کا نام دیتا ہے[1]۔

سالٹ رینج (کوہ جودی) کے مقدموں اور رئیسوں نے اپنی سرزمین کے پار کرنے میں تیمور کی مدد کی اور اس کی عنایات حاصل کیں۔ جزیرہ جو غالباً دریائے جہلم میں ایک جزیرہ تھا کے حکمراں شہاب الدین مبارک شاہ نے تیمور کے راستہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی لیکن اسے کچل ڈالا گیا۔ اور اپنی کشتیوں پر دریا میں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ جہلم کے کنارے پانچ یا چھ دنوں تک چلنے کے بعد تیمور چناب کے ساتھ اس کے سنگم پر واقع پر ایک قلعہ تک پہنچا اور کشتیوں کے ایک پل کی تعمیر کا

---

(1) یہ وہی بیابان تھا جہاں جلال الدین منکبرنی چنگیز خاں سے پسپا ہو کر دریائے سندھ پار کر کے پہنچا تھا۔

حکم دیا اسے یکم اکتوبر 1398ء کو مکمل کر لیا گیا۔

تیمور کے ہندستانی حملہ کو بجا قرار دینے کی کوشش میں شرف الدین علی یزدی کہتا ہے کہ دہلی کی مرکزی حکومت، گرچہ مسلم ہاتھوں میں تھی، کمزور تھی۔ لیکن یہ اس لاچار حکومت کو تقریباً نیست و نابود کر دینے کا کوئی سبب نہ تھا۔ تلخ حقیقت یہ تھی کہ تیمور ایک لٹیرے کی حیثیت سے مذہبی بنیادوں پر کوئی امتیاز نہیں برت سکتا تھا۔ لہٰذا مذہبی محققین اور سیدوں کو، جو متمول نہ تھے، چھوڑ کر بلا امتیاز اور ایک وسیع پیمانہ پر اسے لوٹ و غارتگری مچانی پڑی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے بھی اس کے خلاف ایک مورچہ بنایا۔ 13/ اکتوبر کو تیمور کی پالیسی واضح ہو گئی جب وہ تلمی کے شہر میں پہنچا جو ملتان سے 35 فرسخ کی دوری پر تھا۔ یہاں دونوں فرقوں کے ممتاز اشخاص- ہندو رئیس، مسلمان ملک، سید لوگ اور مذہبی محققین- اس سے ملاقات کے لیے آئے اور دو لاکھ ضمانت کی رقم کے بطور پیش کیا۔ تیمور نے منظور کر لیا لیکن وہ ہندستان چندوں کی وصولی کے لیے یا عوامی استقبال حاصل کرنے کے لیے نہیں آیا تھا لہٰذا اس اثنا میں جب کہ ضمانت کی رقم وصول کی جا رہی تھی اس نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے۔“

حکم جہاں مطاع صادر کیا گیا کہ سپاہیوں کو غلوں پر قبضہ کر لینا ہے جہاں کہیں بھی وہ اسے پا سکیں۔ لہٰذا اپنی عادت کے مطابق وہ شہر میں گھس گئے۔ گھروں کو جلا دیا، باشندوں کو گرفتار کر لیا اور جو کچھ وہ پا سکے اسے لوٹ لیا۔ بالآخر مذہبی محققین اور سیدوں کے سوا کوئی بھی اس قتل عام سے نہ بچ سکا۔[1]”

20/ اکتوبر کو تیمور تلمی سے روانہ ہوا اور دوسرے روز دریائے بیاس کے کنارے اور قصبہ شاہ نواز کے پاس جال کے نزدیک خیمہ زن ہوا۔ شیخا کھوکر کے بھائی جسرتھ کھوکر نے اپنے دو ہزار آدمیوں کے ساتھ حملہ آور کا مقابلہ کیا۔ لیکن انہیں شکست ہو گئی اور وہ ذبح کر دیے گئے گرچہ یہ معلوم نہیں کے جسرتھ کے ساتھ کیا پیش آیا۔ شاہنواز، جو ایک بہت بڑا قصبہ تھا، کے باشندے بھاگ گئے تھے لیکن وہاں اتنے غلے تھے کہ سپاہی انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے لہٰذا تیمور نے اسے نذر آتش کر دینے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد وہ قصبہ جنجان کے مد مقابل دریائے بیاس کے

---

(1) ایضاً، جلد دوم، ص 55

کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ پیر محمد نے اس سے یہاں ملاقات کی اور اسے اس کے فوجیوں کے لیے تیس ہزار گھوڑے دیئے گئے۔ بیاس کو تیر کر یا کشتیوں کے ذریعہ عبور کیا گیا۔ اگلے مرحلے ساہوال، اسوان، جاہوال، کے بتائے جاتے ہیں تیمور نے اپنے اصل کیمپ (انحرق) کو دیپال پور کے راستے پیش قدمی کا اور اس سے سمانہ میں ملاقات کرنے کا حکم دیا جب کہ وہ بذاتِ خود تقریبادس ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ روانہ ہوا۔ دیپال پور کے تمام باشندے، جنھوں نے پیر محمد کے تعیین کردہ داروغہ مسافر کابلی کو مع ایک ہزار تاتاروں کے مار ڈالا گیا تھا بھٹنیر بھاگ چکے تھے۔ اس کے علاوہ جب تیمور ایک رات کے سفر کے بعد جودھان (پاک پٹن) جو شیخ فرید گنج شکر کے مقبرے کے لیے مشہور ہے۔ پہنچا تو اس نے پایا کہ اس بزرگ کے اخلاف بھی، بیشتر باشندوں کے ساتھ، اسی قلعہ میں بھاگ گیے تھے۔ وہاں کسی نے بھی اس کا خیر مقدم نہ کیا۔

بھٹنیر کا قلعہ ایک بے آب خطہ میں واقع ہے۔ تیمور نے شیخ فرید کے مزار پر دعائیں مانگیں اور تب رات بھر کے ایک لمبے سفر میں ۱۰۰ میل طے کر کے 7ر نومبر 1398ء کو وہ بھٹنیر پہنچ گیا۔ بھٹنیر کا حکمراں رائے دولچن ان مسلمانوں اور ہندوؤں کی مدافعت کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا جو پناہ کے لیے اس کے اس بھاگ آئے تھے۔ لیکن جب رائے نے اطاعت قبول کر لی تو اس کے ایک بھائی کمال الدین نے جو مسلمان تھا مزاحمت جاری رکھی لیکن بھٹنیر کا انجام بھی دوسرے شہروں جیسا ہوا۔" ہندوؤں نے اپنی عورتوں اور بچوں اور جائداد تمام کو آگ میں ڈال کر جلا ڈالا۔ وہ لوگ جو مسلمان ہونے کے دعویدار تھے انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کے سر اس طرح کاٹ لیے گویا کہ وہ بکریاں ہوں۔ یہ کام کرنے کے بعد دونوں فرقوں کے لوگ آخری دم تک لڑنے کو تیار ہو گئے۔ تقریبا دس ہزار ہندوؤں کو قتل کر دیا گیا۔ مارے گئے مسلمانوں کی تعداد مرقوم نہیں ہے۔ عمارتوں کو نذر آتش کر دیا گیا یا منہدم کر دیا گیا۔

سرسوتی کے باشندے جو سوروں کے پالنے میں مخصوص تھے اپنے شہروں سے بھاگ نکلے تھے لیکن ان کا تعاقب کیا گیا اور انہیں مار ڈالا گیا۔ قلعہ کے لوگوں کو لوٹ لیا گیا اور مار ڈالا گیا اور ان کے قلعہ کو چند مٹی کے ڈھیروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ قاتل حملہ آور کا کام اس بناء پر بہت زیادہ آسان ہو گیا کہ فتح آباد کیتھل، سمانہ اسو ندی اور پانی

پت کے تمام باشندے خوف و دہشت کی بناء پر دہلی کی طرف بھاگ گئے تھے۔ جب کہ معمولی فہم و فراست سے کام لے کر انہیں اور بھی زیادہ مشرق کی جانب دو آب کے مختلف حصوں میں بھاگنا چاہیئے تھا۔

نومبر کے تیسرے ہفتہ میں اصل کیمپ سمانہ پہنچا۔ دو دسمبر کو باضابطہ طور پر کیتھل سے روانگی شروع ہوئی۔ کہیں بھی کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور 11/دسمبر کو تیمور نے جمنا پار کیا اور قصر جہاں پناہ میں مقیم ہو گیا جو دہلی سے دو فرسخ کے فاصلہ پر تھا۔ دوسرے دن ملو اقبال خاں چار ہزار گھوڑوں، پانچ ہزار پیادہ اور 27 ہاتھیوں کے ساتھ تاتاروں کے خلاف روانہ ہوا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ہی جھڑپ کے بعد وہ واپس بھاگ گیا تھا۔ پورے ایک لاکھ ہندو قیدیوں کو جو تیمور کے کیمپ میں تھے اور جنھوں نے ملو کے ذریعہ بچا لیے جانے کے خیال پر خوشی کا اظہار کیا تھا ذبح کر ڈالا گیا۔

تیمور نے اپنے کیمپ کو مضبوط بنانے کی ہر احتیاط برتی لیکن فیصلہ کن جنگ، جو 18/دسمبر 1398ء کو ہوئی خاص طور پر قابل ذکر نہیں ہے۔ محض دس ہزار گھوڑوں اور چالیس ہزار پاپیادہ کی ایک فوج ہی سلطان محمود تغلق اور ملو میدان میں لا سکتے تھے۔ وہ بری طرح پسپا ہو گئے اور شہر کی جانب واپس بھاگے۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت سلطان اور ملو جنوبی دہلی کے دو مختلف دروازوں سے شہریوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ جمعرات 20/دسمبر 1398ء کو دہلی کے ممتاز اشخاص اپنی اطاعت کی پیش کش کے لیے حوض خاص کے قریب آئے، جہاں تیمور نے اپنا خیمہ گاڑ رکھا تھا۔ انہوں نے تیمور کے نام پر خطبہ پڑھنے اور باشندوں سے ضمانت کی رقم وصول کرنے کی حامی بھری، ادھر تیمور نے ”دہلی کے باشندوں“ کے تحفظ کا وعدہ کیا لیکن یہ وعدہ دل میں ان بھگیڑوں کو مستثنیٰ رکھ کر دیا گیا تھا جو بڑی تعداد میں دہلی آ گئے تھے۔ اس طرح یہ محض دھوکا تھا اس کے پورے سفر کا مقصد دہلی کو لوٹنا تھا۔ لیکن تیمور نے ایسا رویہ اختیار کرنا مناسب سمجھا کہ گویا اس کے سپاہی اس کے اختیار سے باہر ہو گئے ہیں۔

شرف الدین علی یزدی، جو چاپلوسانہ الفاظ میں حقیقت کو یوں منتقل کرنے کے فن کو جانتا تھا کہ بازپرس سے بھی بچے اور اپنے دو شاہی آقاؤں کی حمایت بھی حاصل کر لے، دہلی کی لوٹ و غارت گری کا حال مندرجہ ذیل پیراگرافوں میں پیش کرتا ہے،

جو بہت محتاط طور پر لکھے ہوئے ہیں۔

جمعرات 27/ دسمبر 1398ء کو فوجیوں کی ایک جماعت دہلی کے پھاٹک پر جمع ہو گئی اور اس نے شہریوں پر حملہ شروع کر دیا۔ بڑے بڑے امراء کو اسے روکنے کا حکم دیا گیا” لیکن چونکہ مشیت شہر اور اس کے باشندوں کی تباہی کا فیصلہ کر چکی تھی لہٰذا اس کی تباہی کے تمام ذرائع مہیا ہو گئے” شاہی خواتین قصر ہزار ستون کو دیکھنے آئی تھیں جسے ملک جونا (سلطان محمد بن تغلق) نے جہاں پناہ میں بنوایا تھا۔

”بڑے بڑے امراء افسران مالیات (بی تکچی) اور ملازمین دروازے پر بیٹھ کر ضمانت کی وصول شدہ رقم کا اندراج کر رہے تھے۔ اسی وقت تقریباً ایک ہزار گھوڑ سوار جنہیں چینی اور غلہ پر قبضہ کر لینے کا حکم ملا تھا شہر میں داخل ہو گئے تھے۔

جب تاتار سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد شہر میں داخل ہو چکی تھی تو ہندوؤں کے بہت سے گروہ دہلی کے تین شہروں میں - سری۔ جہاں پناہ اور پرانی دہلی - گستاخی پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے لڑنا شروع کر دیا۔ ان میں بہتوں نے اپنے گھروں اور جائدادوں کو آگ لگا دی اور اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ جل کر مر جانے کو ترجیح دی۔ سپاہیوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور تیمور کے افسران نے ہندوؤں کی بدتمیزیوں کے باوجود دروازوں کو بند کر دیا تاکہ باہر کے سپاہی اندر داخل نہ ہو سکیں اور مزید بربادیاں واقع نہ ہوں۔ لیکن اس وقت پندرہ ہزار سپاہی شہر میں موجود تھے۔ انہوں نے شام سے لے کر صبح تک مکانوں کو لوٹا اور جلایا اور چند جگہوں پر ہندو بہادری سے لڑے۔

”دوسرے دن صبح کو پوری فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ سپاہیوں میں زبردست اضطراب تھا اور جمعہ 28/ دسمبر کو عام لوٹ و غارت گری کا آغاز ہوا اور جہاں پناہ اور سری کے بیشتر مکانوں کو لوٹ لیا گیا۔ سنیچر 29/ دسمبر کو لوٹ و غارتگری اسی طرح جاری رہی۔ ہر سپاہی نے تقریباً ڈیڑھ سو مردوں، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا۔ بیس قیدی کم سے کم تعداد تھی جو ایک سپاہی کو حاصل ہوئی لوٹی گئی قیمتی اشیاء - موتی، قیمتی پتھر خاص طور پر ہیرے جواہرات، قسم قسم کے قیمتی کپڑے، سونے اور چاندی کے برتن -- کا حساب لگانا مشکل ہے۔ طلائی ٹنکوں کی شکل میں نقدیاں بھی اندازے سے باہر تھیں۔ گرفتار کی گئی بیشتر عورتوں نے اپنی انگلیوں میں سونے اور چاندی کے

زیورات اور اپنے پیروں کے انگوٹھوں میں قیمتی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ کسی نے بھی سبزیوں، دواؤں اور مویشی جیسی چیزوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

"اتوار 30ر دسمبر کو فوجی، پرانی دہلی کی طرف بڑھے کیوں کہ بہت سے ہندوؤں نے وہاں بھاگ کر جامع مسجد میں پناہ لے رکھی تھی"۔

تیمور کے دو افسروں نے انہیں ذبح کر ڈالا۔ اسی دن پوری پرانی دہلی کو لوٹ لیا گیا۔ تمام قیدی کئی دنوں تک شہر سے باہر لائے گئے اور افسروں کے ذمہ کر دیئے گئے۔ دستکاروں کو شہزادوں اور ان اعلیٰ افسران میں تقسیم کر دیا گیا جو اس جگہ موجود تھے اور انہیں ان لوگوں کے پاس بھی بھیجا گیا جو وطن میں تھے۔

شرف الدین علی یزدی اس حقیقت کی بنا پر تیمور کی تعریف کرتا ہے کہ اس نے سمرقند میں ایک مسجد بنوانی چاہی، جو کچھ واقع ہوا اسے وہ ان خطوط پر حق بجانب ٹھہراتا ہے! "اہلِ نظر اس بات کا مشاہدہ کرنے میں نہ چوکیں گے کہ اگرچہ سزا کے لئے نامزد لوگوں تک کو شاہی معافی دے دی گئی اور خطبہ میں تیمور کے نام نامی کا پڑھا جانا امن و سلامتی کی ایک ضمانت تھی، لیکن تب بھی چونکہ خدا کا حکم اس کے برعکس تھا........ لہٰذا واقعات وقوع پذیر ہوئے جن کا ذکر (اوپر) کیا گیا ہے[1]۔"

دہلی کے قتلِ عام میں سرکاری مورخ صرف ہندوؤں کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن ایسا سوچنے کی کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کو چھوڑ دیا گیا۔ جورجیا میں دو مقدس جنگوں کے علاوہ تیمور اور اس کے تاتاروں نے اپنی طاقت مسلمانوں کو لوٹنے اور انہیں قتل کرنے میں صرف کی تھیں- اور مسلمانوں کی بدترین لوٹ وغارتگری ابھی آنے کو باقی تھی۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ دستکاروں کے علاوہ زندہ رہ جانے والے قیدیوں کو لوٹ لینے کے بعد چھوڑ دیا گیا ہو۔ بہر صورت ان کا قتل کیا جانا مرقوم نہیں ہے۔

تیمور پندرہ دنوں تک دہلی میں مقیم رہا۔ اس کا دوسرا مسئلہ ایک ایسے راستہ سے وطن لوٹنا تھا جس پر اسے کسی زبردست مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن جس پر اس کے فوجی اس قسم کے مالِ غنیمت حاصل کر سکیں جن کی انھیں ضرورت تھی۔ عورتیں، بچے غلے اور مویشی ماضی کے منگول تجربہ سے رہنمائی پاکر اس نے دون-

---

(1) ایضاً ص ص 25-124

ہمالیہ اور سیوالک (پہاڑوں) کا درمیانی علاقہ - کا انتخاب کیا۔ لیکن میرٹھ کا شہر جو بد قسمت ترمی شیرین کو شکست دے چکا تھا، راستہ میں حائل تھا۔

اور تیمور کے افسروں نے، جنہیں پہلے ہی روانہ کیا جا چکا تھا، اسے خبر دی کہ شہری صفی[1] نامی ایک ہندو اور دو مسلمان الیاس افغان اور مولانا احمد تھانیسری کے بیٹے کی قیادت میں مزاحمت پر تیار تھے۔ تیمور 8/ جنوری 1399ء کی سہ پہر کو چالیس میل کی ایک لمبی مسافت کے بعد دس ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ میرٹھ کے اطراف میں جا پہنچا۔ دوسرے دن تاتاروں نے شہر پناہوں پر قبضہ کر لیا اور شہر میں داخل ہو گئے۔ چند غیر واضح اسباب کی بنا پر دفعتاً مدافعت کمزور پڑ گئی۔ صفی نے لڑتے ہوئے جان دے دی۔ اس کے دو مسلم رفیقوں کو باندھ کر تیمور کے سامنے لایا گیا۔ باشندوں کو ذبح کر ڈالا گیا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔

اب سیوالک تک کا راستہ صاف تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور امن پسند دیہاتوں کا علاقہ تھا جو محض مجبوراً لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ تیمور نے ہردوار اور جمنا کے درمیان کی خوش حال سرزمین کو تاراج کرنے میں تقریباً ایک ماہ (26/ جنوری سے لے کر 24/ فروری 1399ء تک) صرف کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اس خطہ کے سات قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے دیہاتوں سے بیس جنگیں لڑیں۔ ہر تاتار سپاہی کو کوئی ایک سو سے لے کر دو سو تک گائیں اور دس سے لے کر بیس تک قیدی حاصل ہوئے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کوئی بھی اہم ہندستانی۔ مسلمان امیر تیمور کے ساتھ شامل نہ ہوا اور چونکہ اسے اپنے نمائندے کی حیثیت سے کسی نہ کسی کو منتخب کرنا ہی تھا لہٰذا اس نے خضر خاں کو ترجیح دی[2]۔

بہادر ناہر میرٹھ کے راستے میں اس سے اس ملاقات کے لیے آیا۔ کشمیر کے کٹر سلطان سکندر نے سوچا کہ تیمور میں وہ شاید ایک ہم خیال انسان پا سکے گا لہٰذا اس سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن جب تیمور کے افسروں نے اس سے تیس ہزار گھوڑے اور دس لاکھ چاندی کے سکّے فی سکہ 205 مثقال چاندی کا وزن، مانگے تو اس

---

(1) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام مغالطے میں لکھا گیا ہے۔

(2) خضر خاں، تیمور کے ڈر سے میوات بھاگ گیا تھا۔

نے واپس ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ شیخا کھوکر نے تیمور کو اپنی خدمات پیش کی تھیں لہٰذا اس کا لحاظ کر کے ان تمام ہندوؤں کو جو اس سے متعلق تھے معاف کر دیا گیا۔ لیکن جس وقت تیمور سیوالک کے علاقے میں تھا شیخا نے اس سے وطن جانے کی اجازت چاہی۔ اس کے بعد ہی اس نے تیمور کو بحیثیت مجموعی نظر انداز کر دیا۔ اور وہ خراج ادا نہیں کیا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا اس تاتار فوج نے جسے لاہور سے ضمانت کی رقم وصول کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا اس کی سرزمین کو لوٹ لیا اور اسے قیدی بنا کر تیمور کے پاس لے آئی۔

جموں کے رائے کو زخمی کر کے گرفتار کر لیا گیا لیکن اس نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ گائے کا گوشت کھا کر اس نے اس حقیقت کی مزید توثیق کی۔ تیمور، جس کو اسی وقت اپنی مملکت کے مغربی حصہ سے نہایت تشویشناک خبریں موصول ہوئی تھیں، نے اس تبدیلی مذہب کو مخلصانہ تصور کیا۔ اب اسے ہندستان سے مزید دلچسپی نہ تھی لہٰذا اصل فوج کو پر سکون رفتار سے آنے کے لئے چھوڑ کر وہ تیزی سے وطن چلا گیا۔ اس نے 3/ مارچ کو چناب پار کیا اور یکم مئی کو آمو پہنچ گیا۔ ہندستان میں اس کی سردیوں کی مہم کے ٹائم ٹیبل پر بالکل پابندی وقت کے ساتھ عمل کیا گیا۔

سات سالہ مہم (1404-1399ء)

اس اثناء میں جب کہ تیمور ہندستان میں تھا مصری حکومت نے شام میں اپنی طاقت دوبارہ مستحکم کر لی تھی اور سلطان احمد جلایر نے بغداد پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بھی ہوا کہ تیمور کا بیٹا میران شاہ اپنے گھوڑے سے گرنے کی چوٹ سے صحت یاب تو ہو گیا تھا لیکن ذہنی طور پر اتنا زیادہ بدحواس ہو گیا تھا کہ جورجیا کے لوگوں نے بھی تیموری فوج کو ایک ذلت آمیز شکست دی تھی۔ میران کی بیوی نے جس کے ساتھ اس نے بد سلوکی کی تھی آ کر تیمور کو اطلاع دی کہ وہ (میران) تیمور کے خلاف بغاوت کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ تیمور نے اپنے بھرتی کرنے والے افسروں کو ایک سات سالہ مہم کے لیے فوج اکٹھا کرنے کا حکم دیا اور آذربائجان کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے سمرقند میں صرف چار ماہ قیام کیا تھا۔ میران شاہ کو تمام اختیارات سے محروم کر دیا گیا اور اس کے خصوصی دوستوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اس سات سالہ مہم کے دوران تیمور نے چار

ممالک۔ جورجیا، شام، عراق اور اناطولیہ۔ کو فتح اور تاراج کیا۔

(الف) جورجیا

تیمور اس سے پہلے جورجیا پر دو مرتبہ حملہ کر چکا تھا۔ اب اس نے 5 اور مزید حملے کیے اور پورے علاقہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس دوران کی بدترین صورتحال۔ وسیع پیمانے پر قتل عام کا کیا جانا، گرجا گھروں کا تباہ کر دیا جانا، امن پسند باشندوں کے مکانات کو مسمار کر دیا جانا اور انگوروں کے باغوں اور فصلوں کا باشندوں کو ان کی گزر اوقات سے محروم کر دینے کی غرض سے کاٹ لیا جانا اور چھوٹے چھوٹے سرداروں کو ان تمام چیزوں سے محروم کر دینا جس کے وہ مالک تھے۔ کا تصور ہر قاری کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان تمام باتوں کو شرف الدین یزدی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جورجیا کے تمام قلعوں پر قبضہ کر کے تباہ کر دیا گیا۔ بالآخر اگست 1403ء کے آتے آتے تیمور کے افسران تھک گئے اور جب ممتاز جورجیائی سردار ملک گرگین (یا جورج) نے اسلام اور مسلمانوں کی عزت، اور سالانہ خراج کی ادائیگی کی پیش کش کی تو مذہبی محققین نے بحران کے عیسائیوں کے ساتھ نبیؐ کے تصفیہ پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھتے ہوئے اس بات کا اعلان کر دیا کہ اس سے زیادہ اور کسی بات کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پہلا اور آخری موقعہ تھا جب انہوں نے سیاسی معاملات میں تیمور سے کچھ کہنے کی جسارت کی تھی۔

(ب) شام

مصر کے بادشاہ برقوق کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا چھوٹا بھائی فرج اس کا جانشین ہوا تھا۔ تیمور کو یہ توقع تھی کہ تخت پر ایک کمسن بادشاہ کی وجہ سے مصری حکومت کمزور ہو جائے گی لیکن دراصل اس کی طاقت اس شدید جذبہ نفرت میں مضمر تھی جو عام عرب تیمور سے بحیثیت ایک وحشت انگیز، غیر انسانی، مسلم مخالف مخلوق کے کرتے تھے۔ انجام کار نے اس تاثر کو درست ثابت کر دیا۔ تاہم تیمور، جو قلعہ کی دیواروں کو بارود کے استعمال سے اڑا دینے کا فن بھی جانتا تھا[1] کی پیش قدمی کو روکنا ممکن نہ تھا۔

بہشتی اور عنتاب کے شامی شہروں کو جب تیمور نے زیر کر لیا تو تمام آس پاس کے شہروں کی فوجیں اس سے لڑنے کے لیے اکٹھا ہو گئیں۔ تیمور نے جو بہت آہستہ آہستہ اور محتاط طریقے پر پیش قدمی کر رہا تھا الپّو کی جنگ میں دشمنوں کو ایک شکست فاش دی۔ ان سپاہیوں کو جنھوں نے واپس بھاگنے کی کوشش کی شہر کے دروازوں پر قتل کر دیا گیا۔ ان لوگوں کا جنھوں نے دمشق بھاگنے کی کوشش کی تعاقب کیا گیا اور انہیں قتل کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ صرف ایک گھوڑ سوار شکست کی خبر قاہرہ پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔

شام کے شہر اب بآسانی تیمور کے ہاتھوں میں آ گئے۔ فرج بذات خود دمشق آیا تھا لیکن تیمور نے جنوری 1481ء میں شامی فوج کو ذلت آمیز شکست دے دی اور فرج واپس بھاگا۔ شہر کا بیرونی علاقہ، ”حقیقی دمشق“ آسانی سے قبضہ میں آ گیا۔ اور کوتوال نوک جس نے اندرونی قلعہ کے دفاع کی کوشش کی مار ڈالا گیا۔ اپنی کلفت و پریشانی میں غیر مذہبی اور مذہبی دونوں ہی طرح کے ممتاز اشخاص تیمور کے حق میں اپنی وفاداری کی پیش کش کے لیے باہر آئے اور انہوں نے اپنے شہر کے لیے ضمانت کی رقم منظور کر لی۔

عربی اسکالروں سے، جنہیں اس سے ملاقات کے لیے بلایا گیا تھا تیمور نے بار بار شکایت کی کہ! ”دمشق کے باشندوں نے آل نبی کے خلاف امویوں اور مروانیوں کی

---

(1) ”نفتھا“ کی اصطلاح سے اصلاً یونانی آگ مراد لی جاتی تھی۔ موجودہ ایران میں اس سے مراد پٹرول ہے، منگولوں اور تیمور کے زمانہ میں اس کا کیا مطلب تھا؟ بارود ایک چینی ایجاد ہے اور چنگیز اپنے ساتھ تقریباً دس ہزار چینی کے ماہرین محاصرہ لایا تھا۔ چونکہ ہم منگولوں کے ذریعہ گھروں کی آتش زنی کے سلسلہ میں ’نفتھا سیاہ“ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ جس کا مطلب صرف بارود ہی ہو سکتا تھا۔ یزدی کے مطابق تیمور کے آدمی پہلے تو قلعہ کی دیوار کے پتھر کو گرم کرتے اور تب اس پر سرکہ ڈالتے۔ یہ پتھر کو بہت ہی کمزور بنا دیتا جسے ایک چھینی سے باہر نکال لیا جاتا۔ یہی عمل جاری رہتا اور قلعہ کی دیوار کو گرنے سے روکنے کے لیے لکڑیوں کے کھمبے لگا دیئے جاتے جب وہ کافی اندر تک بڑھ جاتے تو اس میں بارود کی ایک سرنگ بچھا دی جاتی اور آگ لگا دی جاتی۔ لیکن تیمور کے محاصروں کے سلسلہ میں یزدی کے بیان کی محتاط تفتیش بہ ظاہر کرتی ہے کہ بارودوں کے ذریعہ سرنگوں کو اڑا دینا قطعی طور پر پرانی ترکیبوں۔ منجنیق سے پتھروں کا چلانا اور شہر پناہوں پر رسیوں اور سیڑھیوں سے چڑھنا۔ سے زیادہ بہتر ثابت نہ ہو سکا تھا۔ یزدی ”کمان رعد“ کا بھی بار بار تذکرہ کرتا ہے جسے میں توپ کا ایک ابتدائی نام سمجھتا ہوں۔

کیوں مدد کی تھی" اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا بیان یزدی نے بہترین طور پر لیا ہے۔

"یہ شکایت فوجیوں کے دماغ میں رچ بس گئی اور 17/مارچ 1401ء کو فاتح عالم فوج نے شہر کو دہشت زدہ کرنے اور اسے لوٹنے کے لئے دست درازی کی۔ دمشق کے مردوں اور عورتوں دونوں ہی باشندوں کو غلام بنالیا گیا اور ان کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا گیا۔ سونا ہیرے جواہرات عمدہ کپڑے اور ہر قسم کی قیمتی اشیاء.......... حقیقت میں وہ بیش بہا اشیاء جو یہاں لوٹی گئی تھیں اتنی زیادہ تھیں کہ سپاہیوں کے پاس جو بھی گھوڑے، گدھے اور اونٹ تھے اس بوجھ کو نہ لے جاسکتے تھے۔ میں نے ان معتبر اشخاص سے سنا ہے جو عینی شاہد تھے کہ بہت سے فوجیوں نے اپنے روسی اور مصری مال غنیمت کو اس لیے پھینک دیا تھا کہ وہ اپنے جانوروں پر نقدی، ہیرے جواہرات اور سونے اور چاندی کے برتنوں کو لاد سکیں جو انھوں نے یہاں سے حاصل کیے تھے۔

"دمشق کے مکانات کی سب سے نچلی منزل پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ لیکن اوپر کی دو یا تین منزلیں لکڑیوں کی بنی ہوئی تھیں اور چونکہ یہ لکڑیاں وارنش زدہ اور رنگی ہوئی تھیں اس لیے یہ اور بھی زیادہ آتش گیر بن جاتی تھیں عام اور پرامن حالات میں بھی قاضیوں، حکومت کے افسروں، ممتاز شہریوں اور عوام کی متحدہ کوششیں اس وقت تک ایک آگ پر قابو نہیں پاسکتی تھیں جب تک دمشق کا ایک پورا محلہ یا اس سے بھی زیادہ حصہ شعلوں کی نذر نہ ہو جاتا۔ 18/مارچ 1405ء کو اتفاقاً شہر میں ایک آگ لگ گئی اور شہری اپنی کلفت و پریشانی کے عالم میں اسے بجھانے میں بالکل ناکام رہے۔[1]"

امویوں کی جامع مسجد بھی، جس کی چھت لکڑی کی تھی، جل گئی۔ اور صرف اس کا ایک منارہ باقی بچا۔

یزدی ہمیں بتاتا ہے کہ "پورا دمشق نذر آتش کر دیا گیا۔ لیکن اس میں جو بھی قیمتی اشیاء تھیں ان پر پہلے ہی قبضہ کیا جا چکا تھا۔ مزید براں شام کی پوری سرزمین کو لوٹ لیا گیا اور برباد کر دیا گیا"۔ اپنے واپسی سفر میں تیمور نے جو کچھ بچ رہا تھا اسے بھی اجاڑ ڈالا۔ حمص کو تاراج کر لیا گیا۔ الیپّو کے قلعہ کو منہدم کر دیا گیا اور ان مکانات کو جو ابھی قایم تھے نذرِ آتش کر دیا گیا۔

---

(1) ظفر نامہ، جلد دوم ص ص 41-339

(ج) بغداد کی غارتگری

سلطان احمد جلایر ڈر سے بھاگ گیا لیکن جلایر قبیلہ کے ایک افسر فرج نے آخیر دم تک مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ تیمور نے اپنی تمام فوجیں بلائیں اور 9؍ مئی 1401 میں چالیس دنوں کے محاصرہ کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔ یہ عظیم شہر ہلاکو کی غارتگری سے بچ گیا تھا لیکن تیمور نے اسے بالکل تباہ کر دیا۔ "چونکہ جنگ کے دوران بہتیرے فوجی مارے گئے تھے لہٰذا یہ خوفناک حکم دیا تھا کہ ہر فوجی کو (بغداد کے ایک باشندے کا) قلم زدہ سر لانا ہے...... قتل و خون کا بازار اتنا تیز تھا کہ موت کے دلال نے ایک اسّی سالہ شخص اور ایک آٹھ سالہ بچے کو ایک ہی قیمت پر فروخت کیا اور نفرت کے آگ کی بھٹی اتنی تیزی سے بھڑک رہی تھی کہ دولت مند شخص اور بھکاری ایک ہی انداز میں اس کی نذر ہو گئے" بالآخر تیمور نے مذہبی اسکالروں اور مشائخ کی اپیل پر قتل عام کو روک دیئے جانے کا حکم دیا۔ "لیکن اس انداز میں مکینوں کے قتل کر دیئے جانے کے بعد اب ان کے مکانوں کی باری تھی۔ یہ حکم دیا گیا کہ مسجدوں، اسکولوں اور خانقاہوں کے علاوہ کسی عمارت کو نہ چھوڑا جائے۔ اس حکم کے مطابق شہر پناہوں، بازاروں، مکانوں، عمارتوں، محلوں، حویلیوں اور اس کے علاوہ تمام چیزوں کو تحس نحس کر دیا گیا۔[1]"

یہ عباسی منصور کے تعمیر شدہ عظیم بغداد کا آخری انجام تھا جو صدیوں تک مسلمانوں کی سیاسی زندگی تہذیب، صنعت اور تجارت کا مرکز رہا تھا۔

(د) اناطولیہ یا روم

بایزید کے باپ مراد اول نے یہ انوکھا انکشاف کیا تھا کہ مشرقی یوروپ میں فتوحات ایشیاء کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہیں۔ یہ بات پہلے تو عثمانی عظمت کا اور پھر اس کے زوال کا سبب بنی۔ یہ بایزید (1403-1389ء) کا طرہ امتیاز تھا کہ اس نے اناطولیہ کے آزاد حکمرانوں کا خاتمہ کر کے ایک عثمانی۔ ترکی قوم کے ظہور کو ممکن بنا دیا اور یہی ایک تنہا کارنامہ تیمور کی پوری قاتلانہ شہرت کو دھندلا کر دیتا ہے۔

تیمور اور بایزید کے درمیان تلخ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا اور سرحد پر مستقل

---

(1) ایضاً ص 367-69

جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ لیکن 1402ء کے موسم بہار میں تیمور کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اپنی عسکری مشین کو درست رکھنے کے لیے اسے کسی اور دوسرے ملک کو تاراج کرنا پڑے گا لہٰذا اس احتیاط کے ساتھ جو اس کی فطرت میں رچی بسی تھی وہ انقرہ کی طرف روانہ ہوا۔ بایزید کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خلاصی کے لیے روانہ ہو۔ 21/جولائی 1402ء میں انقرہ کی جنگ میں تیمور کی فتح فیصلہ کن تھی۔ بایزید نکل بھاگا۔ لیکن دوسرے دن اسے گرفتار کر کے تیمور کے سامنے لایا گیا۔ اسے کسی کٹہرے میں نہیں رکھا گیا تھا جیسا کہ اکثر مذکور ہے۔ لیکن آٹھ ماہ کے قید کے بعد 20/مارچ 1403ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

انقرہ نے اطاعت قبول کر لی اور پورا اناطولیہ یا روم فاتح کے قدموں میں تھا۔ محمد سلطان کو بایزید کی راجدھانی بروسا بھیجا گیا جہاں بایزید کے غیر معمولی خزانے ہاتھ لگ گئے۔ "باشندوں کو لوٹا گیا اور ان کے لکڑی کے مکانات کو آگ لگادی گئی"[1]۔

تیمور نے بروسا سے دو منزلوں کے فاصلہ پر کوٹ ہو جا میں ایک ماہ قیام کیا جب کہ اس کے شہزادوں اور افسروں نے اس علاقہ کے تمام شہروں - عدالیہ، علانیہ، قراحصار، عقشاہ، قونیا وغیرہ وغیرہ - کو لوٹا - "اتنے زیادہ مال غنیمت ہر سپاہی کے ہاتھ لگے کہ انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا"۔ تیمور نے اپنے فوجیوں کو مختلف شہروں کے سردیوں کے مکانات میں رکھا جب کہ وہ بذاتِ خود سمرنا (ازمیر) کا مسئلہ حل کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ یہاں سینٹ رھڈوس (St Rhodes) کے نائٹوں (Knights) نے سمندر کے کنارے ایک شہر کی تعمیر کی تھی اور یوروپی قدموں کے جہازوں کی مدد سے انہوں نے سات سالوں تک بایزید کے ایک محاصرے کا مقابلہ کیا تھا۔ تیمور کی عبقریت نے اس کا ایک حل ڈھونڈھ نکالا۔ لکڑیوں کی بڑی بڑی تپائیاں سمندر میں ڈال دی گئیں اور ان تختوں کی ایک سڑک بنائی گئی تاکہ سمرنا کو سمندر کی جانب سے گھیرے میں لے لیا جائے۔ قلعہ کی محافظ فوج کو دو ہفتوں کے بعد ہتھیار رکھ دینا پڑا (دسمبر 1403ء)- جب بہت تاخیر کے بعد یوروپ کے جہاز پہنچے تو تیمور نے سمرنا کی محافظ فوج کے قلم زدہ سروں کو اپنی توپ (کمان رعد) سے ان پر پھینکنے کا حکم دیا۔

---

(1) ایضاً ص 451

اناطولیہ چھوڑنے سے قبل تیمور نے بایزید کی مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس نے بایزید کے دو بیٹوں کو ان سرزمینوں کے حکمراں کی حیثیت سے منظور کر لیا جسے مراد اول نے چھوڑا تھا یا جنہیں خود بایزید نے فتح کیا تھا۔ اس کے برخلاف، امیر محمد اور یعقوب چلپی کو ان اناطولیائی سرزمینوں پر بحال کر دیا گیا جنھیں بایزید نے ان کے باپ سے غصب کیا تھا۔ اگر تیمور نے ان انتظامات کے ذریعہ عثمانی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی توقع کی تھی تو یہ تجربہ ناکام رہا۔ کیونکہ محمد اول نے دس برسوں ہی میں ان تمام سرزمینوں کو دوبارہ متحد کر دیا جب کہ خود تیمور کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔

اس کے بعد تیمور نے خود اپنے خاندان کے لیے انتظامات کیے۔ میران شاہ کے بڑے لڑکے ابو بکر کو بغداد، عراق اور دیار بکر دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے باپ میران شاہ کی رکھوالی بھی اس کے ذمہ سونپی گئی۔ میران شاہ کے سب سے چھوٹے لڑکے عمر کو اس نے آذربائجان اور نام نہاد "ہلاکو کی سلطنت" عطا کی۔ عمر شیخ کے دو لڑکوں پیر محمد اور رستم کو شیراز اور اصفہان دیا گیا۔ تیمور کے سب سے چھوٹے لڑکے شاہ رخ کو پہلے ہی ہرات میں مسند نشین کیا جا چکا تھا۔ اس موقع پر تیمور نے اپنے خاندان کے افراد کے لیے مرکزی عہدیدار کے سلسلہ میں یا ماوراء النہر کی سلطنت کے جانشین کے سلسلہ میں کوئی بات نہ کہی۔ وہ جولائی یا اگست 1404ء میں سمرقند پہنچا۔

آخری مہم

ممکن ہے یہ لکھتے وقت کہ "[اپنی خواہشات کے حصول کے لیے] سخت کوشاں لوگوں پر دنیا کی گرفت سخت ہوتی ہے"۔ حافظ کے ذہن میں اس کا ہم عصر، تیمور، رہا ہو۔ کیونکہ عظیم فاتح کو اب ایک ایسے دشمن - موت - سے مقابلہ کرنا تھا جس کا مطیع بننے پر وہ تیار نہ تھا۔ اور جسے وہ فتح کرنے کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے خاندان کے سلسلہ میں جو احمقانہ انتظامات اس نے مشرقی ایران میں کیے تھے وہ واضح طور پر ایک پراگندہ ذہن کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس رویہ کو بھول کر جو اس نے شاہ شجاع کی بستر مرگ کی اپیل کے ساتھ کیا تھا اس نے 3/ گز ×17 گز کے غیر معمولی سائز کا ایک خطہ فرج کو اس مضمون کا لکھا کہ قرا یوسف کے قلم زدہ سر کے ساتھ

سلطان احمد جلایر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ مصری حکومت نے قدرتی طور پر ایک ایسے قاتل کی مرتی ہوئی اپیل کو نظر انداز کر دیا جس نے اتنے سارے عربوں کو قتل کیا تھا۔

تیمور نے اپنی ذہنی کرب و اذیت کے مداوے کے لیے دو ذرائع تلاش کیے۔ اول یہ کہ تمام باتوں کو جشن و مسرت میں بھلا دیا جائے۔ اس نے اپنے پانچ پوتوں کی شادی کا انتظام کیا جن میں سے کوئی بھی گیارہ سال سے زیادہ کی عمر کا نہ تھا۔ لیکن ان جشنوں نے اسے کچھ بھی ذہنی سکون نہ دیا۔ کلاویجو (Clavijo) ہمیں بتاتا ہے کہ عوام شاذو نادر ہی اس کی ایک جھلک پاتے اور یہ کہ اس کی صحت ظاہری طور پر گرتی جا رہی تھی۔

تیمور کی ذہنی اذیت اور مروڑے ہوئے ضمیر کا دوسرا نفسیاتی علاج ایک چینی مہم تھی جس میں وہ اپنے جرائم کی تلافی کے لیے بہت سے غیر مسلموں کو قتل کر سکے گا۔ اس نے حکم دیا اور اس کی عسکری مشین انتہائی کار گزاری کے ساتھ کام کرنے لگی۔ تقریباً دو لاکھ آدمیوں کو بھرتی کیا گیا اور چونکہ پیکنگ کی روانگی میں چار سے پانچ ماہ تک صرف ہوئے لہٰذا یہ منصوبہ بنایا گیا کہ سیر دریا کے پرے فوج کو سردیوں کی دو چھاؤنیوں میں رکھا جائے۔ تاشقند میں ایک پوتے خلیل کی ماتحتی میں اور سرام اور لیسی میں دوسرے پوتے سلطان حسین کی ماتحتی میں۔ ایسے انتظامات کیے گئے کہ ایک فوجی کے لیے خورد و نوش کا اتنا ذخیرہ ہو جو دس کے لیے کافی ہو اور خورد و نوش کے ذخیروں سے بھرے چھکڑوں کو برف سے ڈھکے سیر دریا سے گزارا گیا۔ موسم بہار کے آغاز کے ساتھ ہی فوج روانہ ہونے لگے گی۔

بظاہر سب انتظامات کر دیئے گئے تھے۔ لیکن پھر بھی کوئی فریب میں مبتلا نہ تھا۔ کافی وقت گزر چکا تھا اور اب تیمور اپنی روحانی پریشانی کا کوئی حل نہیں ڈھونڈھ سکتا تھا۔ یزدی لکھتا ہے کہ "ایک زبردست خوف عوام کے دِلوں میں منڈلا رہا تھا- اور وہ اس کے متعلق اظہار کرنے لگے تھے۔ جب اتنی زبردست فوج اتنے مختصر وقت میں اکٹھا ہو گئی تو ان کے شبہات بڑھ گئے اور ان کے ذہن فکر مند ہو گئے.......... اس زمانہ میں لوگ پریشان کن خواب دیکھا کرتے۔" تیمور 71ر سال کا ہو چکا تھا اور کسی کو اس میں شک نہ تھا کہ اس کے دن گنے چنے ہیں۔

اس نے برف سے ڈھکے سیر دیا کو عبور کیا اور اُترار میں اپنے ایک افسر بردی

بیگ کی رہائش گاہ میں مقیم ہو گیا۔ 11/ فروری 1405ء کو وہ بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ اس کی بیماریاں اتنی پیچیدہ ہیں کہ ان کے اختیار سے باہر ہیں۔

"میری روح کے لیے خدا سے دعاء کرو۔[1]"

اپنے ارد گرد کے افسروں سے یہی اس کی التجا تھی۔ اس نے ان سے یہ بھی التجا کی کہ وہ اس کی وصیت کی تعمیل کریں۔ جس کے ذریعہ اس نے جہانگیر کے بیٹے پیر محمد کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ اس کا انتخاب یہ واضح کر دیتا ہے کہ کس حد تک اس کا ذہن پراگندہ ہو گیا تھا۔ پیر محمد کا کوئی کارنامہ نہ تھا۔ اور نا ہی تیمور کے افسروں پر اس کا کوئی اثر ورسوخ تھا اور اس وقت تک وہ ایک ایسا لاعلاج شرابی بن چکا تھا جس نے اپنے تمام انتظامی امورا اپنے شربت دار پیر علی تاز کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔

15-16/ فروری 1405 کی رات کو تیمور کا انتقال ہو گیا اور تیموری مملکت کی مرکزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

پیر محمد نے سمرقند کے تخت کی حصولی کے لیے کوئی فوری کوشش نہ کی۔ تیمور کے صرف دو اعلیٰ افسران، شیخ نورالدین اور شیخ ملک ہی اس کی وصیت پر زور دینے کی بے وقوفی کر رہے تھے۔ انہیں ماوراء النہر سے باہر کر دیا گیا اور باقی افسروں ے مرزا خلیل کو سمرقند کے تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ صرف 21/ سال کا تھا لیکن اس سے زیادہ عمر کا اور کوئی شہزادہ اس جگہ موجود نہ تھا۔ خلیل کی مختصر حکومت کے صرف دو ہی کارنامے ہیں۔ اس نے چار سالوں میں تیمور کے جمع شدہ خزانوں کو بالکل ہی اڑا ڈالا۔ قیمتی پتھر غلّوں کی مانند بڑی بڑی ترازوؤں میں تول تول کر اس کے مصاحبوں میں تقسیم ہو گئے اور کچھ بھی باقی نہ بچا۔

تیمور کے دورِ حیات میں ہی خلیل نے ایک سابقہ غلام لڑکی یا ملک سیف الدین لی ایک مدخولہ شاد ملک سے خفیہ طور پر شادی کر لی تھی۔ تیمور نے اسے قتل کر دینے کا حکم دے دیا تھا لیکن یہ جان کر کہ وہ حاملہ ہے اس نے اپنے حکم کی تعمیل کو ملتوی کر دیا تھا۔ فطری طور پر پرانی شہزادیوں نے سمرقند کی نئی ملکہ کو حقیر سمجھا۔ شاد ملک نے خلیل کو اس بات پر اکسا کر اس کا انتقام لیا کہ وہ تیمور کی بیویوں اور غلام لڑکیوں کو اپنے افسروں میں

---

(1) ایضاً ص644

تقسیم کر دے تاکہ وہ ان کی وفاداری حاصل کر لے۔ خلیل نے ان شہزادیوں کے ساتھ جن کی اسے اپنی ماؤں کی حیثیت سے عزت کرنی چاہیے تھی ایسا سلوک کیا جسے کوئی بھی دانشمند شخص پسند نہ کرتا۔ اس نے بزور اور زبردستی ان میں سے ہر ایک کو ایک ایسے افسر کے حوالہ کر دیا جن کے پاس ان کی ضروریات بہم پہنچانے کے ذرائع بھی نہ تھے"۔[1]

یزدی اپنی کتاب کے آخیر میں تیمور کی پالیسی کے متعلق اپنے جائزے میں لکھتا ہے کہ تیمور، دوسرے فاتحین کے برخلاف، جو محض مقامی حکمرانوں کی اطاعت سے مطمئن ہو جاتے تھے، ہر اس سرزمین کی انتظامیہ کا جسے وہ فتح کرتا یا تو اپنے خاندان کے کسی شہزادے کو یا خود اپنے کسی افسر کو انچارج بناتا۔ لیکن ماوراء النہر سے باہر ایسا صرف یزدی کے وطن خراسان ہی میں ممکن ہو سکتا تھا (اور) ان دونوں خطوں میں تیمور کے اخلاف تقریباً ایک صدی تک حکمراں رہے۔

جیسے ہی تیمور کے انتقال کی خبر موصول ہوئی شاہ رُخ نے ہرات میں اور عمر نے آذربائجان میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ لیکن ابو بکر نے اپنے چھوٹے بھائی کی اس گستاخی کو ناقابلِ برداشت پایا اور دونوں کے درمیان ایک جنگ کا آغاز ہو گیا۔ لیکن جلد ہی انھوں نے سمجھ لیا کہ انہیں نئے دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ سلطان احمد جلایر اور قرا یوسف ترکمان پناہ کے لیے پہلے تو بایزید کے پاس اور پھر مصر بھاگ گئے تھے۔ اب وہ اپنے علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے واپس لوٹے۔ سلطان احمد، دیار بکر، بغداد اور عراق پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ قرا یوسف نے 16/ اپریل 1408ء کو میران شاہ اور ابو بکر کو ذلت آمیز شکست دی۔ میران شاہ مارا گیا لیکن ابو بکر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اگلے سال مارا گیا اور عمر بھی اس طرح کی موت سے جلد ہی دوچار ہوا۔ اس طرح مغربی علاقوں کے تمام تیموری شہزادوں کے سر قلم ہو گئے اور وہ منظر عام سے غائب ہو گئے۔

پیر علی تاز نے پیر محمد کو، جس کے گناہ اور شراب نوشیاں حد سے تجاوز کر چکی تھیں، فروری 1408ء میں قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ لیکن وہ خود جلد ہی مار ڈالا گیا۔

---

(1) ایضاً ص 28-727

اور رُخ نے سکندر شاہ مرزا (عمر شیخ کے لڑکے) کو تیموری افغانستان کے تخت پر بٹھا دیا۔ ماوراء النہر میں خلیل کو اکھاڑ پھینکا گیا اور اسے ایک تیموری افسر خداداد حسینی نے 1408ء میں گرفتار کر لیا۔ لیکن خداداد نے شاہ رُخ کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا اور شاہ رُخ نے اپنے سب سے بڑے لڑکے اُلغ بیگ مرزا کو سمرقند کے تخت پر بٹھایا۔

ہرات کی سلطنت شاہ رخ (1405-48ء) اور سلطان حسین مرزا (1469-1506ء) کی طویل حکومتوں کی بدولت خوش قسمت ثابت ہوئی۔ سلطان حسین کی حکومت کے زمانہ میں اس کے ایک وزیر امیر علی شیر، جو ایک ممتاز ترکی شاعر تھا اور محققین کی ایک جماعت مولانا عبدالرحمان جامی کی قیادت میں اکٹھا کر لی تھی، اور ان کے لیے کتابیں، مکانات اور وظائف مہیا کیے تھے، کی کوششوں کی بدولت ہرات علم و تحقیق کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ لیکن سلطان حسین مرزا کے بیٹے اس قابل نہ تھے کہ وہ خواہ شیبانی ازبک یا شاہ اسماعیل صفوی - ازبک اور ایرانی قومی تحریکوں کے لیڈران - کے خلاف ہرات کی مدافعت کر سکیں۔

سمرقند کے تیموری اتنے خوش قسمت نہ ثابت ہوئے۔ الغ خاں ایک ماہر علم نجوم اور صاحب علم و فضل کی حیثیت سے مشہور تھا۔ لیکن وہ ترکستان کے جوجی شہزادے براق اُغلن سے بری طرح شکست کھا گیا۔ اور جتھ نے ماوراء النہر کو تاراج کیا اور اس سے بھی بد ترین بات یہ تھی کہ وہ خود اپنے بیٹے عبداللطیف کو مار ڈالنے کا منصوبہ بنا رہا تھا جبکہ موا خرالذکر نے اسے معزول کر دیا اور 1449ء میں اسے مار ڈالا۔ تقریباً چھ ماہ بعد اُلغ خاں کے افسروں نے عبداللطیف کو مار ڈالا اور انھوں نے اس کے قلم زدہ سر کو اُلغ بیگ کے مدرسہ کے محراب پر نصب کر دیا۔ ابو سعید مرزا (بادشاہ ظہیر الدین بابر کے دادا) جو اب تخت نشین ہوا، نے کئی برسوں تک سلطنت تیمور کی از سر نو تعمیر کی جدو جہد کی۔ لیکن جنوری 1469ء میں حسن بیگ ترکمان نے اس کی فوج کو کچل ڈالا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے خلاف، جیسا کہ بابر کی تزک واضح طور پر ثابت کرتی ہے۔ شہبانی خان ازبک کے حملہ کا مقابلہ نہ کر سکے، اس طرح بالآخر تیمور کی ماوراء النہر اور ایران دونوں ہی جگہوں سے معدوم ہو گئے۔ بس وہی جو افغانستان اور ہندستان نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے زندہ بچ نکلے۔

دوسرا باب

دہلی سلطنت کی بنیاد

1

ترکی حملوں کے وقت ہندستان کی حالت

ذات کا نظام

ہندستان میں سلطان محمود کی کارگزاریوں (999-1031ء) کے بعد کے ڈیڑھ سو سالوں کے عرصہ میں راجپوت سلطنتوں کی ابتدا ہوئی۔ ذات کے نظام میں اور شدت پیدا ہوئی اور گنگا کے میدانی علاقہ میں ترکوں کا دباؤ بڑھا۔ ان محرکات کی وجہ سے ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے ہندستان میں غوریوں کی فتح کی راہ ہموار کر دی۔ راجپوتی نظامِ سیاست (Polity) جاگیر دارانہ اداروں کو وجود میں لائی۔ ذات کے نظام نے سماج کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور ایک مشترکہ شہریت کے احساس کو مٹادیا اور ترکوں کی آزمائشی (reconnoitering) کارروائیوں نے ہندستان کی بنیادی (فوجی) کمزوری کو ظاہر کر کے بڑے پیمانہ پر فوجی اقدامات کی حوصلہ افزائی کی۔

راجپوتوں کی ابتداء کے متعلق مختلف نظریات ہے بحث اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ البیرونی کی کتاب الہند میں راجپوتوں کا ذکر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی نے جس طبقہ کو چھتری کا نام دیا ہے وہ رفتہ رفتہ جنگجو قبیلہ کی حیثیت سے برسر اقتدار آگیا تھا۔ یہ لوگ شجاعت اور اولوالعزمی کی رومانی روایت میں رنگے ہوئے تھے اور ان کو راجپوت یا راج پتر۔۔۔ یعنی شاہی نسل کے اخلاف کہا جانے لگا۔ انہوں نے دریائے ستلج سے سون تک کے علاقہ پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ غوریوں کو اس نئے ذی اقتدار طبقہ سے نپٹنا پڑا۔ چونکہ بارہویں صدی کے سیاہی میدان میں سمبھر اور اجمیر کے چوہانوں، مالوہ کے پرمیرا۔ اور و چیدی کے کلاچوریوں، بندیل کھنڈ کے چندیلوں،

گجرات کے چالوکیوں، قنوج کے گڑھوال، مگدھ کے پالوں اور مغربی بنگال کے سوروں اور پھر بعد میں سیناؤں کا دور تھا۔ متعدد خود مختار ریاستوں پر مبنی یہ سیاسی نظام بارہویں صدی کے آخری ربع کے ہندستان کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ ہندوستان متعدد ریاستوں کا ایک مجموعہ تھا جس کی ہر ریاست خود مختار تھی۔ آپس کی حاسدانہ چشمکوں اور جارحانہ اقدامات کی وجہ سے ریاستوں کی سرحدیں بدلتی رہتی تھیں اور ناقابل اصلاح گہری دشمنی کے جذبات کو دائمی بنا دیا تھا۔

یہ راجپوت ریاستیں جاگیردارانہ نوعیت کی تھیں، ہر سلطنت شاہی خاندان (کول) کے افراد کو دی ہوئی جاگیروں پر مشتمل تھی۔ اگلے دور میں اس طرح کے جاگیری ماتحتوں (Vassals) کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اے، ایس الٹیکر لکھتے ہیں کہ ان ماتحتوں کو سکہ جاری کرنے کا اختیار نہ تھا اور ان کو یہ کام انجام دینے پڑتے تھے۔ (الف) اپنے سربراہ کے نام کا (اپنے کتبوں) ذکر کرنا (ب) تقریب کے موقعوں پر دربار میں حاضر ہونا (ج) باقاعدگی سے خراج ادا کرنا (د) تقریب کے موقعوں پر اور لڑکیوں کی شادی کے موقعوں پر تحفے دینا (ہ) مقرر تعداد میں افوجی دستہ فراہم کرنا[1] لیکن زیر مطالعہ دور میں ان ذمہ داریوں سے تغافل برتا جانے لگا تھا اور اس کے برعکس جاگیرداروں کی طاقت بڑھ جانے اور اپنی فوج کو اکٹھا کرنے اور ٹیکس عاید کرنے کی وجہ سے سیاسی اقتدار منتشر ہو گیا تھا اور مرکز گریز (Centrifugal) رجحانات کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے زمیندار امرا طبقہ کے لیے مخصوص ہو گئے تھے اور اس کی وجہ سے بادشاہ کا اقتدار کمزور ہو گیا تھا۔ ذاتی فوجیں رکھنے کی وجہ سے جاگیرداروں میں بڑے پیمانے پر جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور اس کی وجہ سے مزید انتشار پیدا ہوتا تھا۔

جب ترک ہندوستان میں داخل ہوئے اس وقت جاگیردارانہ نظام اپنی تاریخ کے آخری اور سب سے شورش انگیز دور میں داخل ہو چکا تھا اور جاگیروں کی تقسیم در تقسیم (Sub- Infeudation) کا طریقہ زیادہ مروج ہو گیا تھا اور اکثر بڑے جاگیرداروں

---

(1) قدیم ہندوستان میں ریاست اور حکومت (The state and Government in Ancient India)
بنارس 1949ء ص: 225

کے تحت ان کے چھوٹے جاگیر دار تھے۔ مثلاً سامنت، ٹھاکر، راوت وغیرہ ہوتے تھے۔ مثلاً راشٹر کوٹوں کے ماتحت گجرات کے راشٹر کوٹ اور سلاہار تھے اور پھر ان ماتحتوں کے اپنے ماتحت تھے۔(۱) کشمیر کے سیاسی میدان میں ڈمرا (جاگیردار، سردار) سب سے زیادہ پریشان کن عنصر تھے۔[2] وہ اپنے چھوٹے محلوں میں رہتے تھے۔ ان کی ذاتی فوج تھی اور اپنے مفاد کے مطابق جب چاہتے مرکزی حکومت کی خلاف ورزی کرتے۔ در حقیقت ملک کی انتظامیہ خاص کر اندرونی علاقوں میں ان کے ہاتھوں میں تھی۔

یہ نظامِ سیاست ملک کے سماجی نظام کی بنیادی کمزوری کی عکاسی کرتا تھا۔ ذات کی نظام نے جس پر گیارہویں اور بارہویں صدی کا ہندستان سماجی نظام مبنی تھا۔ مشترکہ شہریت اور حب الوطنی کے تمام جذبات کو ختم کر دیا تھا۔ اس نظام کی ابتدا خواہ کسی بھی صورت حال میں ہوئی ہو اس کے نتیجہ کے طور پر شہریت اور ملک سے وفاداری کے احساس کا مکمل فقدان تھا۔ اس کے زیر اثر حالات میں جو انفرادی اور اجتماعی ابتری پیدا ہو گئی تھی وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے تباہ کن ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر بینی پرشاد اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ (ذات کا نظام) گروہ (جماعت) کو ترجیح دینے میں انفرادی اقدار کو قربان کر دیتا ہے۔ یہ انفرادیت کی جڑوں پر ضرب لگاتا ہے اور یہ (انفرادی) شخصیت کے باوجود انکار کے مترادف ہے۔ یہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے کہ ہر فرد اپنی فطرت کے لحاظ سے عمومی (Universal) ہے اور نہ اس کو اپنی شخصیت کے اظہار کا، اپنی خواہشات کو طے کرنے کا اور اپنے مفاد کو حاصل کرنے کا اختیار ہے۔ ذات کا اصول انسان کی من حیث الانسان عظمت کے منافی ہے۔[3]

ہندستانی سماج کی چوٹی پر چاورن یا ذاتیں تھیں۔ برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ گرچہ یہ طبقے ایک دوسرے سے مختلف تھے، پھر بھی سب ایک ہی شہر اور گاؤں میں رہتے تھے۔

البیرونی لکھتا ہے کہ ”ہندو اپنی ذات کو ورن یعنی رنگ کا نام دیتے ہیں اور نسبی

---

(۱) اے، ایس، الٹیکر، راشٹر کوٹ حکمراں اور ان کا عہد، پونہ، 1934ء، ص:265

(2) رجت رنگنی۔ (مترجم) 1 سٹین VIII 1028

(3) قدیم ہندستان میں ریاست اور حکومت، ص:12

اعتبار سے ان کو جاتک (یعنی پیدائش) کہتے ہیں۔ شروع سے ہی یہ ذات صرف چار ہیں۔ برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔[1]

سماجی نظام میں سب سے اونچا مقام برہمنوں کا ہے۔ وہ تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔[2] اور مذہبی معاملات اس کی اجارہ داری میں تھے۔ البیرونی کے مطابق صرف برہمن اور چھتری وید کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لہٰذا مکش یا نجات صرف ان ہی کو حاصل ہو سکتی تھی۔[3]

سماج کے درجاتی نظام (Social Hierarchy) میں دوسرا مقام چھتریوں کا تھا۔ ملک کا انتظام اور اس کی سرحدوں کی حفاظت کا کام ان کے ذمہ تھا۔ بقیہ دو ذاتیں۔ ویش اور شودر کو سماج کے درجاتی نظام میں نیچا مقام دیا گیا تھا۔ ویش کا مخصوص کام یہ تھا کہ کھیتی کرے مویشی پالے یا اپنا ذاتی یا کسی برہمن کی طرف سے کاروبار کرے۔ شودر کی حیثیت بقول البیرونی برہمن کے نوکر جیسی تھی[4]۔ ویش اور شودر کو مقدس (مذہبی) علوم سے محروم رکھا گیا تھا۔ البیرونی کے مطابق اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ کسی ویش یا شودر نے وید پڑھا تو اس کی زبان کاٹ لی جاتی تھی۔[5] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حبیب لکھتے ہیں "ایسی پالیسی رگ وید کے عہد میں ضروری رہی ہو یا نہیں لیکن گیارہویں صدی میں البیرونی، بو علی سینا اور سلطان محمود کے دور میں یہ ایک حماقت اور پاگل پن تھا اور خودکشی کے مترادف اور خود برہمنوں کو، جو ایک منطقی اور بہت ہی روشن خیال طبقہ تھا، اس نا قابل معافی گناہ کی بہت بھیانک قیمت ادا کرنی پڑی[6]۔

ان چار ورنوں کے نیچے غیر اہم معمولی انسانوں کا جم غفیر تھا جن کو انتیاجہ کہا جاتا تھا۔ ان کا شمار کسی ذات میں نہ تھا بلکہ ان کا تعلق پیشہ یا حرفہ سے تھا۔ ان کے آٹھ پیشہ ورانہ گروہ تھے۔ (1) قصار (2) چمار (3) نٹ (Juggler) (4) ٹوکری اور ڈھال

---

(1) کتاب الہند، ترجمہ Sachau، جلد اول ص: 100-101 (2) ایضاً، جلد اول 101-100

(3) ایضاً، جلد اول ص: 104، مگر ہندو فلسفیوں کا عقیدہ مختلف تھا۔ ان کے مطابق نجات ہر ذات کے لیے بلکہ تمام نسل انسانی کے لیے مشترکہ تھی۔ بشرطیکہ ان کے حصول کی نیت صاف ہو۔

(4) ایضاً! جلد 2، ص: 136

(5) ایضاً، جلد 1، ص: 125

(6) جرنل آف علی گڑھ:۔ ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ اپریل 1940 ص 86

بنانے والے (5) ملاح (6) مچھلی فروش (7) جنگلی جانوروں اور طیور کے شکاری (8) جولاہے۔ یہ لوگ چار اعلیٰ ذاتوں کے بسنے والے شہروں کے نزدیک رہتے تھے لیکن ان کے باہر[1] البیرونی لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ذات کے کام اور فرائض کو چھوڑ کر دوسری ذات کے کاموں اور فرائض کو اختیار کرنا چاہے تو اس کو گناہ سمجھا جاتا۔ خواہ اس سے اس ذات کی عزت افزائی ہی کیوں نہ ہو۔[2]

سب سے کم درجہ کے لوگ ہادی، ڈوم، چانڈال اور بدھاتو تھے۔ ان کے ذمہ سب سے گندے اور ناپاک کام تھے۔ مثلاً گاؤں کی صفائی اور دیگر خدمات۔ البیرونی کے مطابق ان کو حرام زادوں (ناجائز بچوں) کی طرح سمجھا جاتا تھا اور ان کا شمار ذات کے باہر ہوتا تھا۔[3] وہ شہر کی چار دیواری کے اندر نہیں رہ سکتے تھے اور شہر کی صفائی وغیرہ کے لیے جس کے بغیر کسی قسم کی شہری زندگی شاید ناممکن تھی۔ شاید مقررہ اوقات پر اطلاع کے مطابق شہر کے اندر داخل ہوتے ہوں گے۔[4]

عہد وسطیٰ کے ہندستان کے سماجی نظام پر سب سے مہلک اثر جسمانی ناپاکی (چھوت) کے اصول سے ہوا۔ البیرونی نے حیرت اور تنفر کے ساتھ لوگوں کی سماجی زندگی میں اس اصول کے اطلاق کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر شے جو نجاست میں ملوث ہو جاتی ہے وہ پھر سے کامیابی کے ساتھ کوشش کرتی ہے کہ اپنی اصل پاک

---

(1) کتاب الہند جلد 1، ص: 101، یہ ان تمام پیشوں کی مکمل فہرست تصور نہیں کی جاسکتی جو کہ اس قت ہندستان میں مروج ہوں گے۔ ایسا معلوم ہتا ہے کہ البیرونی نے اپنے تبصروں کی وضاحت کے لیے صرف چند قسم کے پیشہ وروں کا ذکر کیا ہے جنہیں اس نے ان علاقوں میں دیکھا تھا جہاں اس کو رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پیشہ وروں کی زندگی مختلف علاقوں میں علیحدہ علیحدہ طرز کی رہی ہوگی۔ چونکہ اس پر مختلف تمدنی روایات اور انتظامی تشکیل کا اثر تھا۔

(2) کتاب الہند، جلد 1، ص: 103

(3) ایضاً- ص 102-101

(4) مند سمرتی کے مندرجہ ذیل اشلوک گرچہ ان کی تالیف ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ قبل ہوئی تھی۔ البیرونی کے بیان کیے ہوئے حالات کے ضمن میں قابل توجہ ہیں اور یہ بخوبی فرض کیا جاسکتا ہے کہ رائے عامہ کی لہر منو کے اصولوں کی مطابقت میں بہہ رہی تھی۔ 51، لیکن سیوا پچاؤں کی جھونپڑیاں گاؤں کے باہر ہوں گی۔ ان سبھی کو اپنا پتر بنا دینا چاہیے اور ان کی ملکیت سور اور کتے ہوں گے۔" (منو سمرتی باب 10)

حالت کو حاصل کر لے۔ سورج اور ہوا فضا کی صفائی کرتے ہیں اور سمندر کے اندر نمک گندگی کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کرۂ زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی۔ لیکن برہمنوں کا چھوت کا اصول فطرت کے اس مسلمہ اصول کے خلاف ہے۔ اگر کوئی ہندو سپاہی کسی مسلمان کا قیدی بن جاتا اور بعد میں رہا کر دیا جاتا تو اس کی ذات والے یا اس کے ہم پیشہ اس کو اپنا ماننے سے انکار کر دیتے۔ البیرونی لکھتا ہے کہ "یہ بات مجھ سے کئی مرتبہ کہی گئی کہ (مسلم ملکوں سے) جب ہندو غلام بھاگ کر اپنے ملک و مذہب کو واپس آتے ہیں تو مقامی ہندو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ لوگ کفارہ کے طور پر پرائشچت کریں۔ تب وہ ان کو گوبر اور گائے کے دودھ کے ڈھیر میں کئی دنوں تک دبائے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ گندگی سڑنے لگتی ہے پھر وہ ان کو اس گندگی سے باہر کھینچتے ہیں اور اس کو اس طرح کی غلاظت کھانے کو دیتے ہیں۔ میں نے اکثر برہمنوں سے دریافت کیا کہ کیا یہ بات صحیح ہے مگر وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ ایسے شخص کی نجات ممکن ہی نہیں۔ اور اس کو اس مقام تک پھر کبھی نہیں پہنچنے دیا جاتا جس پر وہ قید ہونے سے پہلے تھا۔ اور یہ ممکن بھی کیسے تھا؟ اگر کوئی برہمن کسی شودر کے گھر میں چند دنوں تک کھا لے تو وہ اپنی ذات سے خارج کر دیا جاتا ہے اور پھر اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔[1] ایسے قیدی جن کو خود ان کے فرقہ والے خارج کر دیتے تھے وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

ترکوں کا دباؤ

زیر مطالعہ زمانہ میں ترک شمالی ہندستان میں اپنے زیر اثر علاقوں کی توسیع کی برابر کوشش کرتے رہے۔ گنگا کے میدانی علاقہ میں ان کا دباؤ برابر محسوس کیا جا رہا تھا۔ ان کی قراولی کارروائیوں کا مقصد یہ تھا کہ راوی کے اس پار کے علاقہ میں قدم جمایا جائے۔

(1) بقول بیہقی، احمد نیالتگین نے بنارس تک پیش قدمی کی تھی۔[2]

(2) مسعود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ہانسی فتح کر لیا تھا۔[3]

---

(1) کتاب الہند، جلد 2، ص: 102-3

(2) بیہقی (مولفہ غنی اور فیاض) ص: 402

(3) ایضاً، ص: 530-35

(3) مدن پال کے رہن میں واقع کتبہ میں یہ ذکر ہے کہ اس کے باپ گووند چندر نے "اپنی بے مثل شجاعت سے ہمیرہ (ترکوں) کو مخالفت سے باز رکھا تھا۔"[1]

(4) بدایوں میں لکھن پال کے کتبہ میں اس کے مورث مدن پال کا اس حیثیت سے ذکر ہے کہ اس نے "دیوتاؤں کے دریا" (گنگا) میں ہمیراؤں کے حملوں کو ناممکن بنادیا تھا۔[2]

(5) کومارا دیوی کے سارناتھ کے کتبہ میں گوند چندر (1114-55ء) کی یہ تعریف درج ہے کہ اس نے بنارس کو بد معاش ترشکا جنگ بازوں سے محفوظ رکھا۔[3]

(6) مسعود سوم کے عہد میں حجیب تغاتگین نے گنگا کے پار اس علاقہ تک پیش قدمی کی جہاں مسعود کے علاوہ اب تک کوئی نہیں گیا تھا۔[4]

(7) وجے چندر (1155-70ء) کی ہمیراؤں کے خلاف کارروائیوں کی بھی تعریف کی گئی ہے۔[5]

(8) وشالدیو کا دہلی سیوالک کا ستونی کتبہ مورخہ 1164ء اس بادشاہ کا ذکر ملیچھوں (3 کے فاتح کی حیثیت سے کرتا ہے۔

(9) پرتھوی رائے اول کا ایک کتبہ مورخہ 1167ء ہانسی کی قلعہ بندی کا ذکر کرتا ہے تاکہ ہمیرا کی پیش قدمی کو روکا جائے۔[6]

(10) مسعود سعد سلمان کے دیوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدایوں، دہگان، قنوج، مالوہ اور کالنجر پر بعد کے غزنوی سلطانوں کے حملوں کا دباؤ خاص طور پر رہا۔[7]

(11) کراڈو (جودھپور) کے ایک کتبہ مورخہ 1178ء میں یہ ذکر ہے کہ ایک عورت نے ترشکوں کی توڑی ہوئی مورتی کی جگہ پر ایک نئی مورتی بنوائی تھی۔[8]

---

(1) IA ; XVIII-16

(2) E.I.:-I-64

(3) E.I.:-IX-319

(4) منہاج-22

(5) E.I.:-IV-119

(6) I.A.-XXX-218

(7) دیوان مسعود سعد سلمان (مولفہ رشید یاسمی) ص ص 226-65, 307, 319,71-170, 28, 247, 219

(8) محکمہ آثار قدیمہ، مغربی سرکل رپورٹ 7-1906، ص 42

(Pr.Reb.Arch. Surveu W.C. 1906-7.42)

(12) دابھوئے کا کتبہ گجرات کے چالوکیہ بگھیلہ خاندان کے لاون پرشاد 1200ء کے لگ بھگ کی ایک ترک حکمراں کی خلاف کارگزاریوں کا ذکر کرتا ہے۔[1]

(13) سندھیا پہاڑی کے کتبہ میں ذکر ہے کہ لکھان (1164-94ء کے لگ بھگ) نے ایک ترشک کو شکست دی تھی اور ایک طلائی دروازہ تعمیر کیا تھا۔[2]

بعد کے غزنوی دو شعراء مثلاً سید حسن مسعود سعد سلمان، رونی، ثنائی وغیرہ کے کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ممالک میں اکثر ہندستان کا ذکر ہوتا تھا اور ہندستان پر حملے بعد کے غزنوی سلطانوں کا معمول بن گئے تھے۔

بارہویں صدی کے آخری ربع اور تیرہویں صدی کے اوّل ربع میں غوریوں کی بڑے پیمانے پر جنگی کارروائیاں نہ اچانک تھیں اور نہ غیر متوقع۔ درحقیقت یہ پچھلی ڈیڑھ صدی کے ان چھٹ پٹ حملوں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھیں جس کے دوران مختلف علاقے فتح ہوئے اور پھر قبضہ سے نکل گئے اور سیاسی اقتدار کی توسیع اور پھر پسپائی ہوئی اس طور پر غزنوی سلطنت کی سرحدوں میں تغیر ہوتا رہا۔

غوریوں کی فتح کے قبل کی مسلم آبادیات

بعد کے غزنوی دور میں جب کہ راجپوت سیاسی اقتدار کی توسیع کا مقابلہ جم کر کر رہے تھے (اس وقت) مسلم تاجر، سوداگر، بزرگ اور صوفی باامن طور پر ملک میں داخل ہوئے اور متعدد اہم مقامات پر بس گئے۔ اول تو ذات کی پابندیوں کی وجہ سے اور پھر ہندستانی عوام سے تعلقات قایم کرنے کی سہولت کے خلاف سے یہ مسلم مہاجرین قلعہ بند شہریوں کے باہر آبادی کے نچلے طبقوں کے ساتھ رہتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہندستان پر غوریوں کی فتح کے تقریباً نصف صدی قبل سے ہی چھٹ پٹ طور سے مسلم تہذیبی گروہ (Culture-group) ملک کے اندر قدم جما چکے تھے۔ بنارس کے متعلق ابن اثیر لکھتا ہے کہ اس علاقہ میں محمود سبکتگین کے عہد سے ہی مسلمان موجود تھے جو کہ اسلام کے مطیع تھے اور عبادات اور کارِ خیر

I-26-E.I.(1)

IX-69- E.I(2)

میں مستعد[1] بہرائچ میں سپہ سالار مسعود غازی کا مزار تھا جو کہ سلطان محمود کے فوج کا ایک سپاہی تھا۔[2] غزنوی حملوں اور شمالی ہندستان پر فتح کے طویل درمیانی عرصہ میں ان کے نام اور ان کے مزار کا قایم رہنا ایسی حقیقت ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ مسلم آبادی رہی ہوگی جو مزار کی دیکھ بھال کرتی رہی اور جس نے سالار کی شہادت کی روایت کو بعد کی نسلوں کے لیے محفوظ رکھا۔ شیخ معین الدین چشتی ترائن کی دوسری جنگ سے قبل اجمیر آئے۔[3] اور ان کی گہری انسان دوستی اور پاک طریقہ حیات نے ان کے گرد عقیدتمندوں کا ایک گروہ جمع کر دیا۔ مشارق الانوار کے مشہور مصنف رضی الدین حسن صفانی کی پیدائش بدایوں میں اس شہر پر غوریوں کی فتح کے بہت قبل ہوئی۔[4] قنوج میں مسلمانوں کی نو آبادی کے وجود کی تصدیق ابتدائی عرب تذکروں سے ہوتی ہے۔

صوبہ یوپی اور بہار کے بعض شہروں میں مسلمانوں کی چند عبادت گاہیں ہیں جو مقامی روایات کے مطابق غوریوں سے قبل کے عہد کی ہیں۔ بدایوں میں میراں ملہم کا مزار[5] بلگرام میں خواجہ مجد الدین کا مزار[6]۔ بلگرام میں ملاواں کے اونچا ٹیلہ میں واقع مزار[7]۔ گوپامئو میں عظمت ٹولہ میں لال پیر کی درگاہ[8]، بدایوں میں بلسی روڈ میں واقع

---

(1) ایلیٹ اور ڈاؤسن (Elliot and Dowson) جلد دوم، ص: 251

(2) برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص: 491

مزید دیکھیے خسرو کی اعجاز خسروی جلد دوم، ص: 155

سالار مسعود کا ذکر غزنوی کی کسی ہم عصر تحریر میں نہیں ملتا۔ عتبی کے بقول سلطان محمود نے گنگا پار کرنے کی ممانعت کر دی تھی سالار مسعود کی سلطان محمود کے ساتھ نسبت شاید بعد کی افسانہ طرازی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ گیارہویں نصف صدی کے اواخر میں ملک میں داخل ہوا ہو۔

(3) سیر الاولیاء، ص: 46

(4) ان کی مختصر سوانح کے لیے آگے کے اوراق ملاحظہ کیجیے۔

(5) کنز التاریخ (بدایوں کی تاریخ از رضی الدین) ص: 51-53

(6) ڈسٹرکٹ گزیٹیر (District Gazetteer) ہردوئی 41 ص: 178)

(7) ایضاً، ص: 130

(8) ایضاً، ص: 187

قبرستان[1]، اناؤ میں ایسواں میں واقع گنج شہیداں[2] بہار میں حاجی پور کے نزدیک جروہا میں واقع مزارات منیر میں بڑی درگاہ کے مغربی دروازہ کے قریب امام تقی فقیہہ کا مزار[3]۔ یہ سب کے سب غوری دور کے قبل کے زمانے کے جانے جاتے ہیں اور ان شہروں کے بعض خاندان کے افراد کا دعویٰ ہے کہ ان کے بزرگ اسی زمانہ میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ ان کے یہ دعوے صحیح یا غلط ہو سکتے ہیں لیکن ان مزارات کی تاریخی واقعیت (Historiety) کے متعلق مقامی روایات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ ان علاقوں میں مسلم نو آبادیوں کی موجودگی کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔

یہ نو آبادیاں ہندستان میں جس صورتِ حال کے تحت قایم ہوئیں ان کو مختصراً بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ بیرونی ملکوں کے ساتھ ہندستان کے تعلقات کی ابتدا وادی سندھ کی تہذیب کے زمانے سے ہی کی جاسکتی ہے۔ ہندستان میں بعض ایسی اشیاء تیار ہوتی تھیں۔ مثلاً شکر، روئی، رنگنے والی اشیاء خاص طور پر نیل اور کتھا۔ جن کی سرد ممالک میں زبردست مانگ تھی اور بیرونی تاجران چیزوں کے لیے مقامی خریداروں سے زیادہ قیمت دینے کو تیار تھے۔ دوسری جانب ہندوستان کو بھی بیرونی چیزوں کی ضرورت تھی۔ مثلاً عمدہ نسل کے گھوڑے، خشک میوے، موتی، مختلف قسم کے قیمتی پتھر (بدخشاں کا لعل اور فارس کا فیروزہ) فارسی ادب کی شہادت کے مطابق اوائلِ عہد وسطیٰ کے ایک عمدہ طور پر مسلح سپاہی کو اپنے لیے ایک تلوار، ایرانی کمان اور تاتاری نیزہ کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

منوسمرتی اور اس طرح کی دیگر کتابوں میں ہندو مذہب کے جو خود عاید کردہ عقائد ہمیں ملتے ہیں ان کے مطابق اونچی ذات کے ہندوؤں کو یہ حکم ہے کہ وہ اس علاقہ تک محدود رہیں جہاں مونج گھاس اُگتی ہے اور جہاں ہرن چرتے ہیں۔ اس کو

---

(1) ڈسٹرکٹ گزیٹیر، بدایوں جلد 15، ص 190

(2) ڈسٹرکٹ گزیٹیر، اناؤ، جلد 38، ص: 118

(3) ملاحظہ ہو حسن عسکری کا مضمون Historical Significance of Islamic Mysticism in Medieval Bihar (Hist. Miscellany 10-11)

سمندر پار نہیں جانا چاہیے اور نہ ایسی جگہ جہاں ذات کے باہر کے لوگ حکمراں ہوں۔ منوسمرتی کے مطابق ذات سے باہر کے لوگوں میں سب سے ادنیٰ گروہ، یوواناؤں، پہلواؤں اور ترشکوں کا ہے۔ (یونانی، ایرانی اور ترک) قبل کے عہد کے ہندو مذہب کے توسیعی رجحانات کسی طور پر منوسمرتی کے زمانہ کی تنگ نظری میں تبدیل ہو گئے۔ اس بحث سے ہمیں یہاں غرض نہیں لیکن ہندستان کے تمام حصوں (سوائے کشمیر) میں عرب تاجروں کی موجودگی اور فارس اور مرکزی ایشیا میں ہندستانی تاجروں کی غیر موجودگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ منوسمرتی کے احکامات موثر تھے اور یہ کہ ہندوؤں کے تاجر طبقہ کو، جو عہدِ وسطیٰ میں اپنے کام میں بہت کارگزار اور لائق تھا۔ تجارتی درآمد اور برآمد کا کام غیر ملکیوں کے حوالہ کرنا پڑا تھا۔

ڈاکٹر حبیب اللہ لکھتے ہیں کہ "اپنی تجارت کو فروغ دینے کے خواہش مند راجگان ان لوگوں کے ساتھ فراخدلی کا برتاؤ کرتے تھے جو کہ مہذب دنیا کے خاص خاص تجارتی راستوں پر قابض تھے۔ لانبے، گھیر دار عباؤں میں ملبوس اور داڑھی رکھنے والے یہ لوگ مقررہ وقتوں پر عبادت کے لیے ایک مستطیل نما عمارت میں جمع ہوتے تھے۔ جس میں کوئی مورتی نہیں ہوتی تھی اور یہ لوگ ذات کے کسی اصول کے پابند نہ تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ (مقامی لوگوں میں) اجنبیوں اور ان کے معمولات پر حیرت کا احساس کم ہوتا گیا۔ انہوں نے اپنی نو آبادیات قایم کر لیں اور ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ یہ مقامی آبادی کا ایک لازمی حصہ بن گئے یہ تاجک نو آبادیاں رائے کی اجازت سے اکثر بڑے شہروں کے مضافات میں قایم ہوئیں۔ رائے نے مسلمانوں کو اپنے مکانات، مسجدیں، مدرسے، گودام اور دُکانیں وغیرہ بنانے کی اجازت دی اور قبرستان کے لیے بھی ایک جگہ دی۔ ان نو آبادیوں کے علاقہ میں ترقی ہوئی۔ کسی حد تک یہ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے ہوا۔ شیخ علی ہجویری کے اس جملہ سے کہ ان کا لاہور آنا کچھ "ناخوشگوار لوگوں" (غالباً قبیلہ کے ترک) کی وجہ سے ہوا۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے ایک ایسے بڑے طبقے کی نمائندگی کر رہے تھے جن کو فارس اور وسطیٰ ایشیا کے متواتر سیاسی بحران نے ہندستان جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ جہاں وہ سکون کے ساتھ گزر اوقات کر سکتے تھے۔ بعض مثالیں جن کا تذکرہ

محفوظ رہ گیا ہے یہ ثابت کرتی ہیں کہ ان نو آبادیوں نے تہذیبی بلندی حاصل کی۔ ان میں درسی کتابیں عربی زبان میں تھیں۔ تعلیم کا ذریعہ شاید فارسی زبان تھی مگر ان میں رہنے والوں کی مادری زبان مقامی تھی۔

اگر ہم نفس مضمون سے تجاوز کر کے دہلی کے دو ایسے ہندستانی مسلمانوں کی سوانح حیات کو سرسری طور پر پیش کریں جن میں سے ایک کی پیدائش غوری فتوحات کے قبل اور دوسرے کی دہلی پر غوری فتح کے فوراً بعد ہوئی تو یہ بے جانہ ہوگا چونکہ اس سے ہمیں ان نو آبادیوں میں حالاتِ زندگی کا صحیح اندازہ حاصل ہوگا۔

مولانا رضی الدین حسن صاغانی[1]

اس مشہور عالم حدیث اور مشارق الانوار کے مصنف کی پیدائش بدایوں میں اس شہر پر ترکوں کے قبضہ کے بہت قبل ہوئی تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم ان کے پیدائشی شہر میں ہوئی۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں مسلم مذہبی امور میں تعلیم کے اعلیٰ انتظامات مہیا تھے۔ ان کے طالب علمی کے دور کا ایک واقعہ جو مولانا کبھی نہیں بھول سکے یہ تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے استاد سے ایک حدیث کا مجموعہ ملخص عاریتاً طلب کیا تھا مگر استاد نے دینے سے انکار کر دیا اس سے ان کی غیرت اور شوقِ تعلیم کو دھکا لگا۔ شاید یہ واقعہ اس زمانے میں کتابوں کی کمی کی وجہ سے ہوا ہوگا۔ بعد میں غوری کی فتح کے بعد وہ کوئل (علیگڑھ) پہنچے اور وہاں کے مشرف کے نائب مقرر ہوئے۔ ایک روز مشرف کی کسی احمقانہ بات پر مولانا مسکرا دیئے۔ مشرف نے بے عزتی محسوس کر کے روشنائی کی دوات مولانا پر پھینک ماری۔ مولانا نے رنجیدہ ہو کر نوکری چھوڑ دی اور کہا کہ "جاہلوں کے تحت کام نہیں کرنا چاہیئے۔"

بعد میں وہ ایک سوتنکہ سالانہ پر کوئل کے گورنر کے ایک لڑکے کے استاد مقرر ہوئے مگر بہت دنوں تک اس ملازمت میں نہیں رہے۔ اور بڑے پیمانہ پر

---

(1) سوانحی حالات کے لیے دیکھیے فوائد الفواد، ص: 1-4، یعقوبی، معجم الادباء، جلد سوم، ص: 211 ابن شاکر، فوائد الوفایات، جلد اول، ص: 133، سرور الصدور (قلمی) مزید دیکھیے تیرہویں صدی کے ہندستان میں مذہب وسیاست، ص: 54-152 اور عربی ادب میں ہندستان کی دین

ہندستان کے اندر سفر کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے علم و قابلیت کی وجہ سے ان کی شہرت ہوئی اور وہ جہاں بھی گئے ان کی عزت کی گئی۔ جب وہ ناگپور پہنچے تو ممتاز علماء مثلاً قاضی حمید الدین اور قاضی کمال الدین ان کے گرد جمع ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ ان کو حدیث کی تعلیم دیں۔ مولانا رضی الدین اپنی ایک کتاب مصباح الدجہ ناگور کے عالموں کو پڑھاتے تھے۔ اور ان کو اسنادِ تعلیم بھی تقسیم کرتے تھے۔ ایک مقامی شخص نے ان سے تصوف کی تعلیم کی درخواست کی مگر مولانا نے معذرت کی اور کہا کہ "میں بہت مصروف ہوں، چونکہ ناگور کے لوگ ان دنوں مجھ سے حدیث کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، فی الحال مجھے فرصت نہیں کہ آپ کو تصوف کی تعلیم دوں۔ اگر آپ اس کے خواہش مند ہیں تو آپ میرے ساتھ غیر مسلم علاقوں کے سفر میں چلیں، وہاں اتنا ہجوم نہ ہوگا اور تب میں آپ کو تعلیم دے سکوں گا۔"

مولانا ناگور سے جالور اور گجرات تشریف لے گئے وہاں کے حالات ایسے تھے کہ وہ آزادانہ طور پر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنا لباس تبدیل کر دیا اور خفیہ طور پر گھومنے لگے۔ سفر کے دوران انہوں نے متذکرہ بالا شخص کو تصوف میں تعلیم دی۔ بعد میں وہ لاہور گئے اور پھر وہاں سے بغداد جا پہنچے۔ ان کی علمیت کی وجہ سے خلیفہ کی توجہ ان کی جانب ہوئی اور ان کو ایک سرکاری ملازمت پیش کی گئی۔ 1220ء میں خلیفہ الناصر نے ان کو اپنے سفیر کی حیثیت سے التمش کے دربار میں بھیجا۔ چند سال بعد ان کو پھر دہلی آنے کا اتفاق ہوا اور وہ 1239ء تک وہاں رہے۔ شیخ نظام الدین نے ایک مجلس میں کہا تھا کہ "ان دنوں دہلی میں بہت سے علماء موجود تھے۔ مولانا رضی الدین علم حدیث میں ان سبھوں سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے اور دیگر شعبہ جاتِ علم میں بھی ان سے کم نہ تھے۔

اس بات سے کہ بدایوں میں مسلم حکومت کی ابتدا کے بہت قبل ہی وہاں ایک نوجوان مسلم طالب علم کو مذہبی مضامین میں تعلیم دینے کی سہولیتیں تھیں۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان مسلم نو آبادیوں کی جڑیں گہری ہو چکی تھیں اور ان میں ثقافتی ادارے نشو و نما پا رہے تھے۔

شیخ حمید الدین صوفی[1]

شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے یہ مشہور شاگرد، دہلی میں معز الدین کا قبضہ ہونے کے بعد پہلے طفل تھے جس نے اس شہر میں آنکھ کھولی۔ ان کی اوائل زندگی بڑی عیش و عشرت کی تھی لیکن شیخ معین الدین کے حلقہ شاگردی میں شرکت کر لینے کے بعد انہوں نے پچھلے گناہوں سے توبہ کر لی اور اطاعت و فقر کی زندگی اختیار کر لی۔ شہر کی ہماہمی سے دور ناگور کے نزدیک سوال نامی ایک بستی میں انہوں نے سکونت اختیار کر لی اور کاشتکاری شروع کر دی۔ ان کی جو بھی ضروریات تھیں اور یہ چند من غلہ اور چند گز موٹے بنے ہوئے کپڑوں سے زیادہ نہ تھیں۔ وہ خود مہیا کرتے تھے اور حکومت وقت سے کسی قسم کے تعلق سے پرہیز کرتے تھے۔

ناگور میں ان کی زندگی سے ہمیں ہندستان کے دیہی علاقوں میں مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے اوّلین نمونے مہیا کرتی ہے۔ مٹی سے بنے ہوئے ایک چھوٹے مکان میں وہ رہتے تھے اور ایک بیگہ زمین کی کاشت سے کسی طور گزر اوقات کرتے تھے۔ فصلوں کو بدل بدل کر کاشت کرنے کا طریقہ اس زمانہ میں معلوم نہ تھا اور وہ اپنی زمین کا ایک نصف ایک فصل میں جوتتے تھے اور دوسرا اگلی فصل میں۔ وہ ایک عام ہندستانی کسان کی طرح کپڑے پہنتے تھے اور جسم کے بالائی اور زیریں حصوں کو ڈھانپنے کے لیے دو الگ الگ کپڑے کے ٹکڑے استعمال کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک گائے تھی جس کو وہ خود دوہتے تھے۔ ان کی اہلیہ، جو ایک نیک اور صوفی منش خاتون تھیں، اپنا وقت عام کسان عورتوں کی طرح کھانا پکانے اور کپڑا بننے میں صرف کرتی تھیں۔ ان دیہاتوں کی طرح جن کے درمیان وہ رہتے تھے۔ شیخ حمید الدین کھانے میں صرف ترکاری اور سبزی استعمال کرتے تھے۔ گوشت کو وہ اس قدر ناپسند کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ ان کے انتقال کے بعد ایصالِ ثواب کے سلسلہ میں کھانے تقسیم کرنے میں گوشت کا استعمال نہ کریں۔ ان کے خاندان میں

---

(1) سوانحی تفصیل کے لیے دیکھیے سرور الصدور (قلمی) سیر الاولیاء، ص: 156-64، سیر العارفین ص: 13-14 اخبار الاخیار ص 29-36، مزید دیکھیے نظامی مذہب اور سیاست ص: 185-87

ہندوی زبان میں بات چیت ہوتی تھی اور ماں کو مائی اور برادر کو بھائی پکارا جاتا تھا۔

ان کی طاعت و فقر سے متاثر ہو کر ناگور کے مقطع (حاکم) نے ان کو کچھ نقد اور زمین پیش کی۔ شیخ نے معذرت کی اور انکار کر دیا۔ مقطع نے التمش کو خبر دی اور اس نے ایک فرمان کے ذریعہ 500 نقرئی ٹنکہ اور ایک گاؤں عطا کیا۔ انہوں نے بطورِ آزمائش اپنی بیوی کو مطلع کیا تاکہ مادّی آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کے اس موقع کے متعلق ان کے تاثرات کا اندازہ ہو۔ اس وقت ان لوگوں کی تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ ان کی بیوی کے سر پر ایک پھٹا ہوا دوپٹہ تھا اور ان بزرگ کے جسم پر ایک گندہ زیریں جامہ تھا۔ ان کی بیوی نے جواب دیا۔ "اے خواجہ کیا آپ اس تحفہ کو قبول کر کے برسوں کی اطاعت و عبادت پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں؟ آپ فکرمند نہ ہوں میں نے دو سیر سوت کات لیا ہے۔ آپ کے لیے ایک زیریں جامہ اور میرے لیے ایک دوپٹہ اس سے تیار ہو سکتا ہے۔" شیخ حمید الدین اس جواب سے بہت متاثر ہوئے اور مقطع کو مطلع کر دیا کہ انہوں نے یہ عطیہ نہ قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

2

غوری کی تاریخ

(سلطان معزالدین کے بر سر اقتدار ہونے تک)

غور

غور، وہ علاقہ جہاں حملہ آور ہوئے تھے، موجودہ افغانستان کے مغربی مرکزی حصہ میں واقع ہے۔ اور یہ ہری رد، فرح رد، رد غور اور کش رد کی وادیوں اور پہاڑی سلسلہ پر مشتمل ہے۔[1] منہاج نے اس کے جغرافیہ کا مندرجہ ذیل بیان دیا ہے۔

”غور کے ملک کو پانچ پہاڑی سلسلے منقسم کرتے ہیں اور غور کے باشندوں کے خیال میں یہ پہاڑی دنیا میں بلند ترین ہیں۔ پہلا زار مرغ مینڈش میں ہے اور جس کے زیریں حصہ میں شہنشاہوں کا دارالسلطنت اور قلعہ واقع تھا۔ دوسرا پہاڑ جس کو سرخ غاز[2] کہا جاتا ہے، بھی مینڈش علاقہ میں تجز[3] کے نزدیک ہے۔ تیسرا، اشک، جو کہ ضلع تمران میں واقع ہے، غور کے دیگر حصوں سے بلند اور رقبہ میں بڑا ہے۔ تمران کا ضلع اس کے دونوں جانب اور اس کی گود میں واقع ہے۔ چوتھا (پہاڑ) ورنی کا بلند اور بڑا پہاڑی سلسلہ جو داور اور والشت کے اضلاع سے ہو کر گزرتا ہے اور جس پر کجوران[4] کا شہر واقع ہے۔ بعض بیان کے مطابق روئن جو سارے غور میں اپنی دشوار گزار بلندی کے

---

(1) احمد علی کوہ زد جس نے گھوڑے پر سوار ہو کر غور کا سفر کیا تھا، نے اس علاقہ کا موجودہ دور کا عمدہ بیان پیش کیا ہے، افغانستان 9-6 کابل 54-1951 (6 حصوں میں) زیر عنوان کوہی بابا اور ہری رد میں)

جدید ضلع غوری جو خان آباد کے جنوب مغرب میں ہے، عہد وسطی کے غور سے مختلف ہے۔

(2) ریورٹی (ترجمہ طبقات ناصری) 318 طبقات ناصری (جیبی ایڈیشن)، 1: 328 پشتو زبان میں غار پہاڑ کو کہتے ہیں۔

(3) طبقات ناصری (جیبی ایڈیشن) 1، 328

(4) ایضاً، 328

لیے مشہور ہے، پانچواں (پہاڑی) سلسلہ ہے لیکن بعض دوسرے بیانات کے مطابق پانچواں درہ خائیسر فج کا ہے جس کی لمبائی چوڑائی اور بلندی انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔

ان پہاڑی سلسلوں، جن کی بلندی ۱۰ ہزار فٹ تک ہے اور جو مشرق کی جانب کوہِ ہندوکش تک آتے آتے اور بلند ہو جاتے ہیں کی وجہ سے غور میں داخلہ دشوار گزار تھا اور انہوں نے غور کو بیرونی دنیا کے تمام ثقافتی اور تجارتی تعلقات سے منقطع کر دیا تھا۔ آس پاس کے علاقوں سے ثقافتی علیحدگی کی حد کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ سلطان مسعود غزنوی نے 1020ء میں غور پر حملہ کیا تو اسے ایک مقامی مترجم بحال کرنا پڑا تھا۔ چونکہ علاقائی لسانی اختلاف کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کی بولی ناقابل فہم تھی۔ اس کے علاوہ جغرافیائی حالات نے بھی غور میں سیاسی اقتدار کو (مختلف حصوں میں) منقسم کر رکھا تھا اور ہر قلعہ (کا مالک) اپنے تابع علاقوں پر بلا شرکت غیر حکمراں تھا۔ قطب الدین محمد وفات 7-1146ء کے زمانہ میں غور کے ایک حصہ ہری رد پر واقع ورشادا کی چھوٹی مملکت نے فیروز کوہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کے قبل کوئی ایسا مرکزی مقام نہ تھا جہاں سے کوئی ایک حکمراں سارے علاقہ کی نگرانی کر سکتا تھا۔

غور عام طور پر ایک زراعتی علاقہ تھا۔ آج کل اس کی وادیاں درختوں سے بھری ہیں۔ پتے ہر سال گر جاتے ہیں اور ان میں شہتوت اخروٹ اور خوبانی کے درخت اور انگور کی بیلیں لگی ہیں۔ یہ دسویں صدی میں بھی اس قدر زرخیز تھا کہ اصطخری نے اس کی زرخیزی، اس کے نہروں اس کے سبزہ زاروں اور اس کی کاشت کی تعریف کی ہے۔ یہاں کوئی قابل ذکر شہر نہ تھے بلکہ صرف زراعتی نو آبادیاں اور القہ جات اور مینارے (قصر، قلعہ، حصار، کوشک) جو کہ ملک کے بری منظر کی سب سے نمایاں خصوصیت تھے۔ ان قلعوں میں بقول مصنف حدود العالم (ص:110) "بدمزاج سرکش اور جاہل قسم کے لوگ" اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔[1] (عمدہ) گھوڑے پالنے کے لیے بھی یہاں کے لوگ مشہور تھے۔ اس کے علاوہ غور کی ہرات اور سستاں[2]

---

(1) اصطخری (ایڈیشن ڈی گوئج) 281، بیہقی (ایڈیشن غنی اور فیاض)، 117.

(2) سنٹرل ایشیاٹک جرنل، جلد نمبر 6، 1961 صفحہ 118 پر سی، ای بوسورتھ کا مضمون بعنوان "غور کی اوائل اسلامی تاریخ"

کے بازاروں کے لیے غلام مہیا کرنے کے لیے بھی شہرت تھی۔ [1]

اس علاقہ کے پہاڑوں میں مختلف قسم کی دھاتیں پائی جاتی تھیں اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غور میں لوہا کافی مقدار میں پایا جاتا تھا غور کے باشندے اسلحہ اور جنگی سامان بنانے کے لیے مشہور تھے [2]۔ اور ان سامانوں کو آس پاس کے ممالک میں بر آمد کرتے تھے۔ حدود العالم کا نامعلوم مصنف لکھتا ہے کہ اس صوبے سے غلام زرہ، جوشن اور عمدہ اسلحے منگائے جاتے تھے [3] بقول طغاں غور اور کابل سے لے کر قرلوق تک کا سارا علاقہ دھات کی کاریگری کے لیے مشہور تھا۔ [4] شاید اس وجہ سے غور کے قلعہ کو پل آہنگران بھی کہا جاتا تھا۔ جب 1020ء میں مسعود نے غور پر حملہ کیا تھا تو وہاں کے حکمران ابوالحسن خلف نے اس کو تلواریں اور ڈھالیں پیش کی تھیں [5] اور جب جرواس کا قلعہ فتح کیا گیا تو خراج کے طور پر اسلحے وصول کیے گئے تھے۔ [6] غوری اسلحوں کی وقعت کا اعتراف مسود نے کیا اور اس نے غوری افسران کو محاصروں کے ماہرین کے طور پر بحال کیا۔ جب غور کے عزیز الدین (540-493ھ 1140-1100ء) نے سلجوقی سلطان سنجر کو سالانہ خراج بھیجا تو اس میں خصوصی طور پر زرہ بکتر، آہنی خود اور دوسرے جنگی سامان شامل تھے اور غور میں پالے گئے خونخوار کتے بھی۔

لہٰذا غور، جس نے مسلم ثقافتی اثرات حال ہی میں قبول کیے تھے کے پاس عہد وسطیٰ کے دو اہم ترین جنگی سامان موجود تھے یعنی لوہا اور گھوڑے۔

شنسبانی خاندان

سنسبانی خاندان، معزالدین جس کا ایک فرد تھا، کی ابتدائی تاریخ اسرار اور

---

(1) ایضاً 118، 121

(2) ایضاً، -120

(3) حدود العالم 110

(4) .Z.D.M.G جلد نمبر XC (1936ء) 33-34

(5) بیہقی 115، 20-119

(6) ایضاً 116

(7) طبقات ناصری، 47

رومانس سے ڈھکی ہوئی ہے۔ حقائق کو افسانوں سے علیحدہ کرنا مشکل ہے اور اس موضوع پر ہماری معلومات کا انحصار تمام تر منہاج السراج پر ہے اور خود وہ اپنی تصنیف طبقات (ناصری) میں اس بات پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ کتاب لکھتے وقت وہ ان حوالہ جات اور ماخذ کو پھر سے نہ دیکھ سکا جو غور میں اس کے پاس تھے جب وہ منگولوں سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تو وہ سب (مآخذ) وہیں رہ گئے اور اس لیے اس کو اپنی یادداشت سے ہی کام لینا پڑا لیکن تاریخ ناصری[1] اور تاریخ ہیضم نبی[2] اس کی دسترس میں تھیں اور وہ ان کو اوائل شنسبانی کا حال مرتب کرنے میں کام میں لایا جیسا کہ مشرق کے بعض اور ایسے حکمراں خاندان جن کے ابتدائی حالات نامعلوم یا گمنام تھے، کے ساتھ ہوا، معز الدین کے خاندان کے لیے بھی ایک روایتی سورما، ضحاک مہیا کیا گیا جو اس کا مورثِ اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔

ایرانی علاقوں کی روایات میں ضحاک ایک مکروہ شخصیت تھی، مگر غزنی اور زبوستان کے علاقہ میں اسے مقبولیت حاصل تھی اس لیے غور کے ماہرین انساب نے اس کو معزالدین کے خاندان کے لیے چنا۔ زرتشتوں نے ضحاک کو، جو اولاً ایک اسیریائی دیوتا تھا، کو مسکن شیاطین میں پھینک ڈالا۔ فردوسی جیسے ایک ایسے نمونے کی نمائندگی کی تلاش تھی جس سے اسے شدید نفرت تھی مگر جس کو وہ نظرانداز نہیں کر سکتا تھا، نے ضحاک کو ایک مشرقی عرب کی صورت میں دوبارہ پیش کر کے زندہ جاوید بنا دیا۔ روایت یہ تھی کہ جب فریدوں نے ضحاک کی "ہزار سالہ مملکت" کا تختہ الٹ دیا تب اس کے اخلاف غور میں آباد ہو گئے۔

شنسب جس نے اپنا نام خاندان کو دیا، ضحاک کا ایک خلف تھا۔ بقول منہاج وہ حضرت علی کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوا تھا جنہوں نے اس کو ایک علم اور ایک عہد نامہ عطا کیا تھا۔ یہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا گرچہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان

---

(1) کشف الزنون (جلد2) کے مطابق بیہقی کی تاریخ آلِ سبکتگین کا یہ دوسرا نام تھا۔ عبدالحی جیسی اس بات کو اس لیے تسلیم کرتے ہیں کہ سبکتگین کا لقب ناصر الدین تھا۔ (طبقات ناصری جلد2، ص:83-282) یہ جلد اب موجود نہیں۔

(2) اس کتاب پر جیسی کے نوٹ کے لیے ملاحظہ ہو طبقات ناصری، جلد2، ص:299-305

کے زمانہ سے مسلمانوں نے غور پر چھٹ پٹ حملے شروع کر دیے تھے۔ یہ علاقہ باضابطہ مسلم حکومت کے تحت نہیں آیا اور طبری اور ابن اثیر نے جن مہمات کا ذکر کیا ہے وہ محض جھڑپیں تھیں۔ بقول بوسورتھ غور کی اہمیت محض غلاموں کی منڈی کی حیثیت سے تھی اور ان کا حصول وقتاً فوقتاً حملوں کے ذریعہ ممکن تھا۔ اس علاقہ پر واقعی عمل داری اور اس کا الحاق بعد کا واقعہ ہے۔ حدود العالم کا مصنف، جو کہ فریغندوں (Ferighunids) کی ملازمت میں تھا اور ملحقہ صوبے گوزگان میں رہتا تھا، اپنی کتاب جو (982-3ھ میں مکمل ہوئی) میں لکھتا ہے کہ اس کے آقاؤں کو غور پر اقتدار اعلیٰ حاصل تھا اور یہ کہ غوری لوگ جو اس کے قبل کافر تھے اس کے زمانہ میں زیادہ تر مسلمان ہو چکے تھے۔ مینورسکی کے خیال میں یہ بیان مبالغہ آمیز ہے۔ در حقیقت حدود العالم کے اُس بیان سے اگر کوئی مبالغہ آمیز نتیجہ نکالا جائے گا تو اس علاقہ میں مسعود اور محمود کی جنگیں بے مقصد نظر آئیں گی۔ اصطخری قطعی طور پر غور کو ''دار الکفر'' لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے تذکرے میں اس علاقہ کے شمول کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کچھ مسلمان تھے اور چونکہ ''یہ اسلامی حدود میں سب سے بڑا کافر علاقہ تھا۔[1]''

لیکن منہاج لکھتا ہے کہ شنسب خاندان کے ہر حکمراں کو تخت نشینی سے پہلے حضرت علی کے عہد نامہ کی تائید کرنی پڑتی تھی۔ غوریوں کو آلِ علی سے اس قدر عقیدت تھی کہ انہوں نے خلافت بنی امیہ کو تسلیم نہ کیا۔

طبری اور ابن اثیر کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 47ھ / 667ء اور 107ھ / 6-725 میں غور کے خلاف جنگیں لڑی گئیں موخرالذکر کی قیادت ابو منظر اسعد نے کی۔ اس موقعہ پر غوریوں نے اپنے مال و اسباب دشوار گزار غاروں میں چھپادیئے۔ اسعد داس صورت حال سے پریشان نہ ہوا اس نے اپنے آدمیوں کو توابیت کے ذریعہ زنجیروں کے سہارے نیچے اتارا اور ان مال واسباب پر قبضہ کیا۔ اس پورے عہد میں بنی امیہ (حکومت) کے چھٹ پٹ حملے غور پر ہوتے رہے لیکن جغرافیہ (جغرافیائی دشواریوں) کی وجہ سے مستقل طور پر سیاسی یا ثقافتی فنی قبضہ قایم رکھنا ممکن تھا۔ چونکہ پہاڑی راستے جن کو پار کرنا موسم گرما میں بھی دُشوار تھا، سردیوں میں بالکل

---

(1) اصطخری (ایڈیشن ڈی گوئج) 245

بند ہو جاتے تھے۔[1] منہاج لکھتا ہے کہ جب ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو سنسبانی خاندان کے ایک فرد امیر فولاد نے اس کی مدد کے لیے کوچ کیا۔ ہارون الرشید کی خلافت کے دوران کچھ قبائل نے اپنے اختلافات کے سلسلہ میں اس نے ثالثی فیصلہ طلب کیا۔ یہ بھی محض خیال آرائی معلوم ہوتی ہے، یا پھر ”بعد کی سیاسی صورت حال کی تشریح کو ماضی میں انعکاس کی ایک کوشش۔“

منہاج مزید لکھتا ہے کہ یعقوب بن لیث (آخری نویں صدی) کے زمانہ میں غوری سرداروں کی مسلم اور غیر مسلم پارٹیاں ایک دوسرے کی دشمن تھیں۔ لیکن غور کے مذہبی حالات کے متعلق اصطخری کے قطعی بیان کی روشنی میں یہ بات بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ گردیزی[2] اور بیہقی لکھتے ہیں کہ 369ھ /80-979ء کے لگ بھگ سامانی حکمران امیر نوح بن منصور نے ابو جعفر زبیری کو غور کی فتح کے لیے بھیجا لیکن صرف قلعہ فتح کرنے کے بعد اسے واپس ہونا پڑا۔ بعد میں جب سبکتگین سامانیوں کی جانب سے غزنی اور زبوستان کا گورنر تھا تو اس نے غور پر کئی حملے کیے۔ عنصری کے ایک قصیدے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمود، جو اس وقت کم سن تھا، نے بھی ایک مہم میں حصہ لیا تھا۔ سبکتگین نے ایک شنسبانی شہزادہ جس کا نام محمد بن سوری[3] لکھا گیا ہے سے خراج وصول کیا تھا۔

محمد بن سوری نے سبکتگین کے انتقال کے بعد خراج روک کر اور کاروانوں کی

---

(1) منہاج 113

(2) زین الاخبار 7-46

(3) اس نام جس کا ذکر منہاج (320،74) کرتا ہے کی وجہ سے کافی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک مسلم نام ہے اور اگر منہاج اور اس کے بعد کے کاتبین نے اسے صحیح لکھا ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب سبکتگین نے غور کی جانب توجہ کی تو اس وقت تک مسلم سیاسی اثرات وہاں کافی حد تک جم چکے تھے۔ عتبی اسے ابن سوری کہتا ہے اور یہ کہ وہ ایک ہندو تھا۔ شاید لفظ ہندو کو کافر کے عام معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ تاریخ گزیدہ (G.S.M. Facs, London, 1910, 406-8) روضۃ الصفا ایڈیشن رضا قلی طہران (1270-74, IV, 241) کے مصنفین ابن سوری کے اخلاف کے متعلق دلچسپ معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے بقول سوری کا ایک بیٹا ہندستان بھاگ گیا تھا اور ایک مندر میں پناہ لی تھی۔ اس کا بیٹا حسین مسلمان ہو گیا اور دہلی جا کر ایک امیر تاجر بن بیٹھا جو ہندستان اور غور کے درمیان مال لیجایا کرتا تھا لیکن یہ باتیں بعد کی اختراع معلوم ہوتی ہیں۔

آمد و رفت میں خلل اندازی کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس وجہ سے سلطان محمود غزنوی کو طیش آیا اور اس نے 401ھ / 1011ء میں ہرات کے گورنر التنتنتش کو اور طسس کے گورنر ارسلن جاذب کو پیش رودستہ بنا کر بھیجا اور خود جغرافیائی مشکلات سے ڈرے بغیر غور کی جانب کوچ کیا۔ محمد بن سوری دشوار گزار پہاڑیوں میں خود کو قلعہ بند کر لیا اور محمود کو ایک چال چلنی پڑی اس نے پسپائی کا ڈھونگ رچایا۔ اس وجہ سے پہاڑی لوگ پسپا شدہ فوج کو لوٹنے کے لالچ میں نیچے اُتر آئے۔ تب محمود نے محمد بن سوری کو شکست فاش دے دی اور اس کو اور اس کے بیٹے شیش کو گرفتار کر لیا۔ 405ھ / 1015ء میں محمود نے غور کے جنوب مغربی علاقہ خوابین کی جانب کوچ کیا اور چند قلعوں کو فتح کیا۔ چند سال بعد مسعود کو غور کے شمال مغربی حصہ طاب کی طرف بھیجا گیا۔ اس کی مدد ابوالحسن اور شروان کے سرداروں نے کی جو علی الترتیب غور کے جنوب مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کے منتظم تھے۔ مسعود نے غور کے بہت سے قلعوں کو فتح کیا اور ماسوائے اندرونی دشوار گزار علاقوں کے پورے غور کو غزنوی دائرہ اختیار میں لے آیا۔ ابوالفضل بیہقی لکھتا ہے کہ ’’کوئی بھی غور میں اتنی دور تک داخل نہ ہو سکا تھا اور اتنے کارنامے انجام نہ دے سکا تھا جتنا کہ سلطان مسعود اپنی رضا یا مجبوری سے غور کے امیران اپنی اطاعت پیش کرنے اس کے پاس آئے۔ وہ اس کی کامیابی سے خوفزدہ اور دم بخود تھے۔ روایات یا تصنیفات کسی میں بھی یہ ذکر نہیں کہ غور کے لوگ کسی اور بادشاہ کے اتنے اطاعت گزار تھے جتنا کہ مسعود کے۔

جب کہ محمد بن سوری سلطان محمود کے خلاف بغاوت کر رہا تھا اس کا بڑا لڑکا ابو علی سلطان کو اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا یقین دلا رہا تھا۔ اس غداری نے خاندان کا چراغ گل نہ ہونے دیا۔ محمود نے ابو علی کو اس کے باپ کے تخت پر بٹھا دیا۔ ابو علی سلطان محمود کی حکومت کے زمانے تک برسر اقتدار رہا۔ منہاج لکھتا ہے کہ اس نے غور میں کئی ایک اسلامی اداروں کو قایم کیا اس نے ملک غور میں جامع مسجدیں اور مدرسے بنوائے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے اوقاف قایم کیے۔ وہ علماء کی اور مذہبی پیشواؤں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اور صوفیوں اور تارک الدنیا بزرگان کی خدمت کو اپنا فرض جانتا تھا۔[1]

---

(1) طبقات ناصری 41

ابو علی نے اپنے چھوٹے بھائی شیش کو غزنی واپس آنے اور اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ لیکن شیش کے بیٹے عباس نے اچانک بغاوت کی اور اپنے چچا کو قید میں ڈال دیا۔ عباس نے غور کے حصاروں کے استحکام، قلعہ بندی اور ان میں فوج تعینات کرنے کے لیے کافی کوشش کی لیکن وہ بہت مطلق العنان اور ظالم تھے اور غور کے امیر اس کے بے رحم رویوں سے اس قدر بدظن تھے کہ انہوں نے سلطان مسعود کے بیٹے سلطان رضی الدین ابراہیم کو اس ظالم سے نجات دلانے کے لیے دعوت دی۔ ابراہیم نے عباس کو گرفتار کر لیا اور غزنی لے گیا۔ لیکن اس نے خاندان کو ختم نہیں کیا بلکہ سلطان محمود کے نمونے پر عمل کرتے ہوئے عباس کے بیٹے محمد کو تخت پر بٹھادیا۔ محمد نے اپنی غزنوی فرماں روا کے ساتھ بہت اچھے تعلقات قایم رکھے۔

قبل اس کے کہ معزالدین کے برسر اقتدار آنے تک کی غور کی تاریخ کا ذکر آگے بڑھایا جائے ایک ضروری معاملہ پر غور کرنا ہے۔ اس وقت غور کی مذہبی صورت حال کیا تھی اور کن ذریعوں سے یہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔

غور میں تبلیغ

غور کے ما قبل اسلام مذہبی حالات کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات ہیں اور غوریوں کے اسلام قبول کرنے کے متعلق کوئی ہم عصر تحریر دستیاب نہیں ہے۔ چونکہ طخارستان بامیان اور کابل بدھ مذہب کے سرگرم مراکز تھے۔ اس لیے یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ غور کے لوگ بھی شاید ایک قسم کی مہایانہ بدھ مذہب کے پیرو ہوں گے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی ہوگی کہ گور کے جنوبی علاقے مثلاً زمندوار، غزنی اور قصدار ہندستان سے ملحق تھے اور دسویں صدی تک ثقافتی اعتبار سے اور اکثر سیاسی اعتبار سے بھی اس کا ایک حصہ تھے۔ کابل، غزنی اور بست ہندستان اور مشرقی اسلامی ممالک کے درمیانی تجارتی سلسلہ کی اہم کڑیاں تھیں اور اکثر جغرافیہ داں ان کو سوداگروں کی آماجگاہ اور ہندستان کی منڈی کہتے ہیں۔ اوائل غزنوی دور میں پہلے دو ان شہروں میں ہندستانی تاجروں کی آبادی مستقل طور پر

رہتی تھی۔[1] اس لیے یہ بعید از قیاس نہیں کہ غور علاقہ زیادہ تر بدھ مذہب کے ماننے والوں سے آباد ہوگا۔

غور میں اسلامی سیاسی اور ثقافتی اثرات کی ابتدا سلطان محمود غزنوی 421-338ھ / 1030-998ھ کے زمانہ میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی 11-1010 کی مہم کے بعد اس نے معلمین کی تقرری کی تاکہ وہ غور کے لوگوں کو اسلامی ہدایات کی تعلیم دیں۔[2]

کرامی فرقہ محمد بن کرام (وفات 869ء) سے منسوب ہے جو سجستان کا رہنے والا تھا۔ جس کو اپنی مذہبی تبلیغ کے اوائل دور میں بہت ظلم برداشت کرنا پڑا تھا۔ لیکن بعد میں اس فرقہ غور، غرجستان بامیان اور متصل علاقوں میں پھیل گیا۔ بغدادی لکھتا ہے کہ نیشاپور کے مضافات کے ستم زدہ لوگ خصوصی طور پر اس فرقہ کی جانب متوجہ ہوئے۔[3] اس کے مذہبی عقائد کے متعلق بغدادی لکھتا ہے کہ "ابن کرام نے اپنے پیرووں کو تاکید کی کہ وہ اپنے معبود کی جسمانیت یا مادّیت پر عقیدہ رکھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک جسم مادّی سے ہے جس کے حدود متعین ہیں اور جس کی زیریں حد اس کے تخت سے متصل ہے۔[4] اس طرح کرامی لوگ اللہ اور اس کے تخت کو اس طرح تصور کرتے ہیں۔ جیسے گوتم بدھ کنول پر بیٹھتے تھے۔ آہستہ آہستہ کرامی فرقہ کو اسلام اور بدھ مذہب کے بیچ ایک درمیانی مقام حاصل ہو گیا اور غور کی مذہبی زندگی میں ایک اہم عنصر بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کے پیرووں نے شنسبانی حکمرانوں کو بھی اپنے زمرہ میں شامل کرلیا تھا۔

جب سلطان علاؤالدین جہاں سوز نے اسمٰعیلی ملحد بن کے مرکز الموٗت کے داعین کو اپنی مملکت کے سارے طول و عرض میں مذہبی تبلیغ کی اجازت دی تو غور، جہاں عمومی طور پر کرامیوں کا اثر تھا کی مذہبی زندگی میں ایک گہرا بحران کھڑا ہو گیا۔

---

(1) اسطخری 245، 280 ابن حوقل، 450، مقدسی، 4-303، حدود العالم 111 سنٹرل ایشیاٹک جرنل، جلد 6، 124 پر بوسورتھ کا مضمون

(2) I.A.، جلد 9، 156، جیسا کہ بوسورتھ نے اقتباس پیش کیا ہے اور 3-122، 8-127، مضمون بعنوان غور کی اوائل اسلامی تاریخ

(3) الفرق بین الفراق (انگریزی ترجمہ از اے، ایس، ہالکنس) جلد 2، 19-18

(4) ایضاً 30-18

بقول منہاج الموت کے ملحدین نے غور کے لوگوں کو اپنے عقیدے میں شامل کر لینے اور ماتحت بنا لینے کی ٹھان رکھی تھی۔[1] علاؤ الدین کا رویہ شاید سیاسی اسباب سے متاثر تھا۔ اسمٰعیلیوں کو غور بلا کر شاید وہ کرامیوں کے مذہبی اثر کو کم کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ کرامی باطنیوں کے مخالف تھے اس لیے دونوں کے درمیان ایک شدید تصادم شروع ہو گیا۔ سلطان سیف الدین محمد (سلطان علاؤ الدین جہاں سوز کا بیٹا) نے اپنے باپ کی پالیسی کو بدل دیا اور اپنی مملکت میں تمام "ملحدین" کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔[2]

بقول منہاج، غیاث الدین اور معزالدین دونوں بھائی پہلے کرامی تھے۔[3] بعد میں وہ علی الترتیب شافعی اور حنفی عقائد مذہب کے پیرو ہو گئے۔ جن حالات میں ان کی تبلیغ ہوئی اور ان کا جو ردعمل ہوا اس کو منہاج اور ابن اثیر نے بیان کیا ہے۔

منہاج لکھتا ہے کہ جب معزالدین تخت نشین ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس علاقہ کے رہنے والے زیادہ تر امام ابو حنیفہ کے پیرو تھے اس لیے اس نے بھی حنفی (عقائد) قبول کر کے ان کی مطابقت حاصل کر لی۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدھے سادھے حالات کے تحت یہ سیدھا سادھا فیصلہ ہوا۔ لیکن۔۔۔ جیسا کہ پروفیسر حبیب نے سوال کیا ہے۔ (اگر واقعہ یہ ہو) کہ غزنی کے شہری ابھی بھی بدھ مذہب کے ماننے والے تھے تو؟

ابن اثیر نے قدر سے مختلف بیان پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہ کہ اہل خراسان جو کرامیوں کے مخالف تھے کے دباؤ کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں نے کرامی عقائد کو چھوڑ دیا، غیاث الدین کا شافعی عقیدہ قبول کرنا گہرے غور و فکر کا نتیجہ تھا اور شیخ وجیہہ الدین مرورودی کی کوششوں کی وجہ سے ہوا۔[4] کرامی علماء پجاریوں کو اس تبدیلیٔ عقائد

---

(1) طبقات ناصری 63

(2) ایضاً 65

(3) ایضاً 77

(4) ابن اثیر نے اس کا نام شیخ وجیہہ الدین ابوالفتح لکھا ہے بقول منہاج، غیاث نے ایک رات کو خواب دیکھا کہ وہ قاضی مرو درودی کے ساتھ ایک مسجد میں موجود تھا جبکہ امام شافعی تشریف لائے اور نماز میں دونوں کی امامت کی۔ اگلے دن سلطان نے قاضی کو وعظ کے لیے حکم دیا۔ وعظ شروع کرنے کے قبل قاضی نے ایک خواب کا حال سنایا جو اس نے پچھلی رات دیکھا تھا۔ وہ بلکہ اس طرح کا تھا جیسا سلطان کا خواب۔ اس واقعہ نے غیاث الدین کے ذہنی تذبذب کو ختم کر دیا اور اس نے شافعی مذہب اختیار کر لیا۔

سے ناراضگی ہوئی اور ان کے رہنما امام صدرالدین علی ہیضم نیشاپوری جو افشن (غرجستان) کے ایک کالج کے پروفیسر تھے، نے سلطان کی ایک ہجو لکھی، وہ ہجو کچھ اس طرح تھی۔

”خراسان میں بہت سارے شافعی تاجر ہیں۔ اعلیٰ حضرت انہیں اکثر شہزادوں کے محلوں کے آگے منتظر پائیں گے۔ لیکن آپ سات اقلیم میں ڈھونڈھنے پر بھی شافعی مذہب کا پیرو بادشاہ نہیں پائیں گے۔۔۔ اگر آپ کو اپنا آبائی عقیدہ بدلنا ہی تھا تو آپ دیگر بادشاہوں کی طرح حنفی ہو سکتے تھے۔۔۔ بخدا ابو حنیفہ اور امام شافعی دونوں آپ سے قیامت کے روز کہیں گے۔

3

سلطان معزالدین کی ہندستانی مہمیں

(1175-92ء)

ملتان

سلطان معزالدین کی ہندستان کی جانب پہلی فوجی پیش قدمی 571ھ / 1175ء میں ہوئی جب اس نے ملتان کے قرامطیوں پر حملہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سلطان محمود غزنوی نے قرامطی حکمراں پر کاری ضرب لگائی اور ان کو ملتان سے بے دخل کر دیا تھا۔ مگر اس کی موت کے بعد انہوں نے پھر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔[1] معزالدین نے دوبارہ ان کی طاقت کو اکھاڑ پھینکا۔ یہ معلوم نہیں کہ معزالدین نے ملتان کے لیے کس طرح کا انتظامی ڈھانچہ تیار کیا لیکن اس علاقہ میں قرامطی اقتدار پھر کبھی قایم نہ ہو سکا۔ بہرحال اس کی وجہ سے قرامطیوں کے دل میں سخت نفرت پیدا ہوئی اور چونکہ ان کی خفیہ تنظیم بڑی موثر تھی اس لیے بالآخر انہوں نے معزالدین کو قتل کرڈالا۔

اُچھ

ملتان پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد معزالدین نے اچھ کی جانب توجہ کی ہو گی۔ منہاج نے اچھ کی مہم کا علیحدہ تذکرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن جب وہ بعد میں سلطان کے ہروالا انہل واڑ) مہم کا ذکر کرتا ہے تو وہ اچھ کا ایک غور مملکت کی حیثیت سے ذکر کرتا

---

(1) آداب الحرب، الیف۔ 76۔ الف

ہے۔ فرشتہ کے مطابق اچھ پر 572ھ / 1176ء میں قبضہ ہوا[1] سلطان نے اچھ کو علی کرماج کے حوالہ کیا۔ طبقات ناصری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اندخود کی جنگ کے وقت اچھ کا علاقہ ملک ناصر الدین ایتم[2] کے تحت تھا بعد میں معزالدین نے اس کو قباچہ کے حوالہ کیا۔[3]

نہروالا

574ھ / 1178-79ء میں اچھ اور ملتان سے گزرتے ہوئے معزالدین نے نہروالا کی طرف کوچ کیا۔ کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی راجپوتانہ میں ترکی کا دباؤ پچھلے دس سالوں سے محسوس کیا جارہا تھا۔ بہرام کے گورنر پنجاب بابلیم نے ناگور فتح کرلیا تھا۔[4]

لیکن اس فتح کی نوعیت ایسی تھی کہ شیخ رضی الدین حسن صغانی جب اس علاقہ کا دورہ کر رہے تھے تو انہیں اپنی پوشاک بدلنی پڑی تھی۔[5]

(تاکہ ان کا مسلمان ہونا ظاہر نہ ہو جائے) اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کو گنگا کے دوآب علاقہ کے مقابلہ میں مغربی راجپوتانہ سے زیادہ واقفیت تھی۔ معزالدین نے محمود کے کارنامے کو دہرانے کی کوشش کی اور جنوبی ہندستان اور اس کے مندروں کی دولت تک راجپوتانہ اور گجرات ہو کر پہنچنے کی کوشش کی۔ آیو پہاڑ تک پہنچ کر معزالدین کی فوج تھک کر پریشان ہو گئی ہو گی۔ کسی ہندستانی حکمراں سے اس کے مقابلے کا یہ پہلا موقع تھا۔ نہروالا کے رائے

---

(1) فرشتہ، جلد 1، 56، ابن اثیر (11، 71) نے اچھ کی فتح کا جو تذکرہ کیا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستانی مورخین نظام الدین (طبقات اکبری جلد 1، 36) اور فرشتہ (جلد 1، 56) نے معمولی ردوبدل کے ساتھ اسی تذکرہ کو دہرایا ہے۔ اس کے مطابق معزالدین نے اچھ کے بھٹی رائے کی بیوی کے ساتھ سازش کی تھی کہ اگر وہ اپنے شوہر کو زہر دے گی تو وہ اس سے شادی کرلے گا۔ یہ کہانی تصدیق کی محتاج ہے اس کے علاوہ یہ مشکوک ہے کہ بھٹی سرداروں کا اچھ پر قبضہ تھا۔ زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ قرامطیوں کے قبضہ میں تھا۔

(2) طبقات ناصری کے دونوں ایڈیشن (حبیبی 1، 419 اور اشیاٹک سوسائٹی 142) نے اس کا نام ناصر الدین ایتم لکھا ہے لیکن ریورٹی (Revety) نے اس کو ناصر الدین اتیمور لکھا ہے۔ (531)

(3) ایضاً 142، (4) ایضاً 24 (5) سرور الصدور (قلمی)

کے پاس۔[1]

ایک طاقت ور فوج اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ آبو پہاڑ کے نزدیک ایک گاؤں کیادرا میں جنگ ہوئی۔ معزالدین کی فوج کو شکست فاش ہوئی اور وہ کسی طور پر اپنی شکست خوردہ فوج کے ساتھ گجرات سے بھاگ نکلا۔

پشاور

نہروالا کی شکست معزالدین کے لیے فوجی حکمت عملی میں ایک سبق تھی۔ اگر وہ محمود کی برابری کی کوشش کر رہا تھا تو وہ غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ ذرائع، سربراہی اور تبدیل شدہ حالات نے بالکل نقشہ پلٹ دیا تھا اور اپنے تجربات کی روشنی میں اس نے اپنی جنگی کارروائیوں کا پورا نقشہ بدل دیا۔ 575ھ 80-1179ء میں اس نے فرشور پشاور، جو کہ غزنویوں کی ہندستانی مملکت میں شامل تھا، پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔

لاہور

پشاور، ترائن کی جانب پہلا قدم تھا اور اس کے دو سالوں کے اندر (577ھ / 82-1181ء) اس نے لاہور کی جانب کوچ کیا۔ خسرو ملک کی طاقت مدافعت کے قابل نہ تھی اور اس نے معزالدین سے گفت و شنید کا فیصلہ کیا اپنی خوش نیتی اور معزالدین کے ساتھ خوشگوار تعلقات قایم رکھنے کے ثبوت کے طور پر اس نے اپنے لڑکے کو مع ایک ہاتھی کے معزالدین کے پاس بھیجا لیکن یہ محض ایک وقتی مصالحیت ہی ہو سکتی تھی۔ چونکہ ملک کے اندر اپنے اقتدار کی توسیع کے لیے معزالدین کو لاہور پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ محمود کے خاندان اور شنسبانوں کے ساتھ جو تعلقات رہے تھے اس کے پیش نظر یہ مصالحت زیادہ دیرپا نہیں ہو سکتی تھی۔

578ھ / 1182ء میں معزالدین نے دیبل کی جانب کوچ کیا اور سمندر تک کا سارا علاقہ قبضہ کر لیا۔ مگر حکمراں نے اس کی ماتحتی قبول کر لی اگلے تین سالوں تک

---

(1) منہاج لکھتا ہے کہ اس وقت بھیم دیو رائے تھا (116) لیکن کتبوں سے اور ہندو مآخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت انہلواڑا کا حکمراں مول راج دوئم تھا۔ I.A.، 1877، 186، 198

سکون رہا۔ 581ھ /85-1184ء میں معزالدین کی فوجوں نے لاہور کی جانب حرکت کی اور پورے علاقے کو تاراج کیا۔ خسرو ملک کو شہر پناہ کے اندر محصور ہونا پڑا۔ غزنی نے واپس جاتے ہوئے سیالکوٹ کے قلعہ پر[1] قبضہ کرنے اور وہاں اپنی فوج تعینات کرنے کا حکم دیا اور حسین ابن خرمیل خلیفہ مقرر ہوا۔ سلطان کے تبدیل شدہ نقشہ جنگ میں سیالکوٹ کی بڑی اہمیت تھی اور ملک کے اندر مزید فوجی کارروائیوں کا مرکز بنانے کے لیے معزالدین اس کو اور مستحکم بنانا چاہتا تھا، لیکن خسرو ملک اپنے دارالخلافہ کے اس قدر نزدیک غوری طاقت کے استحکام کو اپنی مملکت کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اس نے تمام دستیاب ذرائع کو اکٹھا کر کے اور کھوکھر قبیلہ کی مدد سے[2] سیالکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن یہ محاصرہ اس کے لیے دشوار ثابت ہوا اور اس کو شرمندہ ہو کر لاہو رواپس ہونا پڑا۔ اس طرح بغیر کوئی فائدہ حاصل کیے اس نے معزالدین کی مخالفت مول لی 582ھ /1186ء میں معزالدین غزنوی طاقت کے آخری آثار کو مٹانے کا ارادہ کر کے لاہور پہنچ گیا۔ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لحاظ سے خسرو ملک کے ذرائع محدود تھے اور معزالدین سے گفتگو کرنے کے لیے وہ قلعہ سے باہر نکل آیا۔ کسی قسم کے اخلاقی تامل سے بے نیاز ہو کر معزالدین نے اس کو گرفتار کیا اور غرجستان کے مالاروان قلعہ میں بھیج دیا جہاں کچھ عرصہ بعد 587ھ /1192ء میں اس کو مار دیا گیا۔[3]

اس طرح لاہور غوریوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اب دیبل سے سیالکوٹ تک اور پشاور سے لاہور تک معزالدین کی فوجی چھاونیاں تھیں۔ اس کی فتح کا ایک اہم پہلو جو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ راجپوت حکومتوں پر حملہ شروع کرنے کے قبل اس نے سندھ اور پنجاب میں اپنی طاقت کا استحکام کیا۔ یہ سارا علاقہ ایک ہی تھا۔ یہ

---

(1) بعد کی ایک تاریخ کے مطابق Raj Darshani، 1.0.507 F 45 (جس کا حوالہ حبیب اللہ نے اپنی کتاب Foundation, 35 میں دیا ہے) سیالکوٹ، جو ریاست جموں کی جانب سرحدی علاقہ تھا، خسرو ملک کے خلاف تھا، جموں کے رائے چکر دیو نے خسرو کے خلاف معزالدین کو مدعو کیا اور مدد دی۔

(2) منہاج 117 راج درشنی کے مطابق (ص:45ب) کھوکر شروع میں جموں کے ماتحت تھے مگر بعد میں انہوں نے خراج دینا بند کر دیا تھا اور خسرو کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ اس لیے رائے نے معزالدین کو مدعو کیا اور اسی کے کہنے کے مطابق سیالکوٹ میں فوج رکھی گئی تھی۔ (Foundation-36)

(3) منہاج نے اس واقعہ کی تین تاریخیں بتائی ہیں۔ ص:118 پر 587، ص:74 پر 588 اور صفحہ 27 پر 598

بات اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ علی کرخ جو ملتان کا والی اور سپہ سالار تھا وہ لاہور میں تعینات ہوا۔ حالانکہ علی کرماخ اس علاقہ کا فوجی اور انتظامی حاکم اعلیٰ تھا لیکن عدلیہ کا انتظام مولانا سراج الدین کو دیا گیا جو طبقات ناصری کے مصنف کے والد تھے۔ ان کے تحت کچھ اہلکار بھی بحال کیے گئے جن کی سواری کے لیے بارہ اونٹوں کی ضرورت پڑتی تھی۔

تبرہندا

معزالدین کا دوسرا نشانہ تبرہندا (بھٹنڈا) کا قلعہ تھا۔[1] اس پر قبضہ کر لیا گیا اور اس کو ملک ضیاء الدین تولکی کے زیرِ انتظام کر دیا گیا۔ اور بارہ ہزار سواروں کی ایک فوج جو کہ غزنی کی فوج اور ہندستان میں تعین شدہ فوج سے چنی گئی تھی اس کے ذمہ کر دی گئی۔ تبرہندا کے قلعہ کو آٹھ مہینوں تک سنبھالے رکھنے کی ذمہ داری اس کو دی گئی۔ معزالدین کا ایک ارادہ تھا کہ اس عرصہ کے بعد وہ پھر ہندستان آئے گا تاکہ تبرہندا میں اپنی طاقت کو اور مستحکم کرے اور مزید علاقوں کو فتح کرے۔ رائے پتھورا (پرتھوی راج سوئم) نے معزالدین کو استحکام کا موقعہ دینے کے خطرہ کو محسوس کیا۔ س کے سیاسی شعور نے اس کو فوری اقدامات اختیار کرنے پر رجوع کیا اور غوریوں کو ان کی فوجی اہمیت کے مقام سے ہٹانے کے ارادے سے وہ تبرہندا کی جانب روانہ ہوا۔ معزالدین رائے پتھورا کا مقابلہ کرنے کے لیے واپس لوٹا۔ معزالدین نے شاید اس جنگ کا اندازہ نہیں کیا تھا اور وہ اس وقت کسی راجپوت حکمراں کے خلاف بڑی جنگ کے لیے تیار نہ تھا۔ مزید براں رائے پتھورا بھی میدانِ جنگ میں نہیں آیا تھا۔

”کولاہ کے رائے کے ساتھ ہندستان کے سب رانا شامل تھے۔[2] فرشتہ کے مطابق اس کی فوج میں دو ہزار گھوڑے اور ۳۳ ہزار ہاتھی شامل تھے۔[3] اعداد نا قابل

---

(1) اس جگہ کے تعین کے متعلق کچھ غلط فہمی اور اختلاف رائے ہے۔ طبقاتِ ناصری کے بعض ایڈیشن میں اسے تبرہند لکھا گیا ہے (حبیبی ایڈیشن، 398) بعض میں سرہند (Nassau:Lees) کا ایڈیشن (118) بعد کی کتابوں میں اس جگہ کو یا تو سرہند لکھا گیا ہے (زبدۃ التواریخ ص: 7ب) یا بھٹنڈا (فرشتہ جلد 1، 57) یا تبرہندا (تاریخ مبارک شاہی 7، منتخب التواریخ جلد 1، 49) ڈاکٹر حبیب اللہ بھٹنڈا کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی تصدیق روایات اور آثارِ قدیمہ کی شہادت سے ہوتی ہے (Foundation, 57) لاہور سے ہندستان کو سب سے مختصر راستہ مغربی پٹیالہ ہو کر گزرتا ہے اور بھٹنڈا اسی علاقہ میں ہے۔

(2) طبقات ناصری 118

(3) فرشتہ جلد 1، 57، ابن اثیر 11، 255

یقین ہیں۔

ترائن

یہ جنگ ترائن میں ہوئی تھی۔[1] فرشتہ نے تمام فارسی مآخذ کے مطالعہ کی بنا پر اس جنگ کا تذکرہ اس طور پر کیا ہے:

''معزالدین کی فوج کے داہنے اور بائیں دستے منتشر ہو گئے تھے اور مرکز میں بھی بہت زیادہ آدمی باقی نہیں تھے۔ اس مقام پر سلطان کے ایک افسر نے عرض کیا کہ ''داہنے اور بائیں جانب کے امراء جن کی پرورش آپ کے شاہی خاندان میں ہوئی، منتشر اور فرار ہو چکے ہیں۔ افغان اور خلجی امراء جو ہراول دستہ تھے اور برابر اپنی مردانگی اور شجاعت کی ڈینگ مارتے تھے ان کا میدان میں پتہ نہ تھا۔ اس صورتِ حال میں سب سے مفید قدم یہ ہوگا کہ آپ فوراً لاہور کی جانب باگ موڑ دیں'' سلطان یہ مشورہ سن کر ناخوش ہوا۔ اس نے اپنی تلوار کھینچ لی اور مرکزی دستہ کو لے کر دشمن پر حملہ کیا۔ دوست اور دشمن سب ہی نے اس کی ہمت اور چابکدستی کی تعریف کی۔ کھنڈے رائے کی نظر سلطان پر پڑی اور اس نے اپنے بلند ہاتھی کو لے کر اس کی جانب رُخ کیا۔ سلطان بھی ہاتھ میں نیزہ لے کر کھنڈے رائے کی طرف بڑھا اور اس کے منہ پر ایسا سخت وار کیا کہ اس کے بہت سے دانت اس کے منہ میں گر گئے لیکن رائے نے بڑی ہمت اور اطمینان سے کام لیا اور سلطان کے بازو پر ایسا وار کیا کہ وہ اپنے گھوڑے پر لڑکھڑا گیا۔ اس موقع پر ایک خلجی پیدل سپاہی جس نے سلطان کی خطرناک صورتِ حال دیکھ لی تھی، اس کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور سلطان کے پیچھے بیٹھ کر ایڑ لگائی اور سلطان کو بھاگتے ہوئے غوری امیروں کے پاس لے گیا جو تقریباً ۲۰ کروہ آگے جا چکے تھے۔

---

(1) اس مقام کے تعین کے بارے میں اختلاف ہے، منہاج اس کو ترائن کہا ہے (Bib Indica edition 118) جیبی ایڈیشن، 1، 399) نظام الدین (طبقات اکبری 38) اور فرشتہ (جلد 1، 57) منہاج کی پیروی کرتے ہیں لیکن بعض بعد کے مورخین نے اس کو نرائن لکھا ہے۔ شاید کتابت کی غلطی کی وجہ سے دو لفظوں کی جگہ ایک لکھا گیا ہے اور اسی وجہ سے یہ نام نرائن لکھا گیا ہے۔ فرشتہ مزید لکھتا ہے کہ یہ جگہ تراوری کہلاتی ہے اس وجہ سے الفنسٹن نے اس میدان کو کرنال اور تھانیسور کے درمیان بتایا ہے۔ الفنسٹن کی اس

(باقی صفحہ 231 پر)

سلطان کی حاضر دماغی نے فوج میں نظم بحال کر دیا۔

فرشتہ نے زین الاخبار کی بنا پر ایک دوسرا تذکرہ قلمبند کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ سلطان گھوڑے پر سے گر گیا لیکن کسی نے اس کو نہیں پہچانا اور وہ اس طرح میدان جنگ میں پڑا رہا۔ جب کچھ رات گزر چکی تب چند ترکی غلام میدانِ جنگ میں مقتولوں کے درمیان سلطان کو تلاش کرنے آئے۔ سلطان نے اپنے غلاموں کی آواز پہچانی اور انہیں پکارا۔ وہ اسے زندہ پاکر بے حد خوش ہوئے۔ رات ہی میں وہ سب یکے بعد دیگرے اس کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے گئے۔ اگلی صبح وہ سب اپنے خیمہ میں پہنچ گئے اور اس کو ایک پالکی پر بٹھایا۔[1]

منہاج کے السراج کے مطابق کئی امراء غوری نوجوان اور دوسرے معزز اشخاص نے سلطان کو اس شیر صورت خلجی کے ساتھ دیکھا اور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے اپنے نیزو کو توڑ کر ایک پالکی اور (Stretcher) بنایا اور اس کو اپنی جائے قیام تک لے گئے۔[1] زین المعاصر کے بیان کی مطابقت منہاج جس کی معلومات زیادہ قابل وثوق ہیں، سے نہیں ہوتی۔ سلطان کے میدانِ جنگ میں ایک لمبے عرصہ تک زخمی پڑے رہنے کی ہمیں تصدیق نہیں ملتی ہے۔ منہاج نے سلطان کے زخمی ہونے کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں۔

"سلطان نے اس ہاتھی پر حملہ کیا جس پر سوار ہو کر دہلی کا حاکم گووندرائے اپنی فوج کی اگلی صف میں گھوم رہا تھا۔ اس نے رائے کے منہ پر اس زور سے نیزہ مارا کہ اس

(بقیہ ص:230 سے آگے) نشاندہی کو ریورٹی نے مانا ہے 459 نوٹ 7) اور ویدیا (Downfall of Hindu India جلد 3، 333) اور پنجاب گزیٹیر (جلد 1، 318) نے صحیح تسلیم کیا ہے۔ کننگھم (Reports XIV, 68-691) نے ترائن کو بھٹنڈا اور سرسہ کے درمیان بتایا ہے اور بھٹنڈا سے 27 میل دور اور سرسہ سے 20 میل دور گاؤں توارانہ نا کو جائے وقوع بتایا ہے۔ کننگھم کی رائے کو حبیب اللہ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ (Foundation 326) اس بات کی تصدیق بعض ابتدائی مورخین کی دی ہوئی تفصیلات سے بھی ہوتی ہے۔ خاص طور پر یحییٰ سرہندی کے بیان سے جو یہ کہتا ہے کہ یہ خطہ سرسوتی کے اندر واقع تھا (تاریخ مبارک شاہی، 8) چونکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ بھٹنڈا فتح کرنے کے فوراً بعد معزالدین غزنی کی جانب روانہ ہوا تھا لہٰذا یہ جگہ توراونا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گاؤں کے نام بدل جاتے ہیں۔

(1) فرشتہ جلد ا ص 57　　　(2) طبقات ناصری 119

کے دو دانت منہ میں گر گئے۔ رائے نے اس پر بھالا پھینکا اور اس کا بازو زخمی کر دیا۔ سلطان نے اپنے گھوڑے کا منہ موڑ دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ زخم کی تکلیف کی وجہ سے وہ گھوڑے پر بیٹھا رہ سکا اور نیچے گرنے ہی والا تھا کہ ایک شیر دل کم سن خلجی سپاہی نے اس کو پہچان لیا اور اس کو اپنے بازوؤں میں لے کر گھوڑے کو آواز دی اور اسے میدانِ جنگ سے باہر نکال لایا۔[1]

معزالدین کو شکست دینے کے بعد رائے پتھورا کی فوج تبرہندا (بھٹنڈا) کی جانب بڑھی۔ ملک ضیاء الدین نے اس قلعہ کی تیرہ مہینوں تک محافظت کی مگر بعد میں ہتھیار ڈال دیے۔ اس درمیان میں معزالدین نے رائے پتھورا سے ایک اور مقابلہ کی تیاریاں کیں۔

معزالدین کی تیاریاں

معزالدین کی انتقامی تیاریوں کے متعلق منہاج نے اختصار سے کام لیا ہے۔ لیکن فرشتہ ایسے ماخذ کی بناپر جواب موجود نہیں یا زبانی روایات کی بناپر کچھ تفصیلات مہیا کرتا ہے۔ لیکن تفصیلات معزالدین کے مزاج اور کردار اور بعد کے کارناموں کے بالکل مطابق ہیں۔ غور واپس جانے کے بعد، جہاں وہ اپنے بھائی سے ملنے گیا تھا معزالدین نے اپنے غوری، خلجی اور خراسانی امیروں کو سخت سزائیں دیں۔ اس نے افغانوں کو کچھ نہیں کہا۔ شاید اس لیے کہ جن علاقوں میں یہ قبیلے آباد تھے وہ معزالدین کی حالیہ مفتوحات میں سے تھے اور دانشمندی کا تقاضہ تھا کہ ان کی غلطی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ غوری خلجی اور خراسانی امیروں کی گردنوں میں غلوں کے تھیلے ڈال کر ان کو شہر میں گھمایا گیا۔ اگر ان میں سے کوئی وہ غلہ کھانے سے انکار کرتا تو اس کا سر قلم کر دیا جاتا۔ جب معزالدین اپنے دارالخلافہ غزنی واپس ہوا تو وہ سخت غمگین اور شرمسار تھا اور اس نے کھانا پینا ترک کر دیا وہ اپنی بیوی کے پاس بھی نہیں گیا۔ اور اس نے اپنا زیریں جامہ بھی تبدیل نہیں کیا۔ وہ شب و روز جنگ کی تیاریوں میں لگا رہتا۔ ایک سال کی تیاری کے بعد معزالدین نے یک بیک ہندستان کی راہ اختیار کی۔ جب وہ پشاور پہنچا تو

---

(1) ایضاً 118-119

غور کے ایک قدیم افسر نے ہمت کر کے اس کی منزلِ مقصود کے متعلق دریافت کیا۔ سلطان نے اس کو اپنا ارادہ بتایا اور یہ کہا کہ اس نے غوری، خلجی اور خراسانی امراء کو اپنے سامنے حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی تھی اور ان کے بغیر اللہ پر بھروسہ کر کے ہندستان جا رہا تھا۔ اس قدیم افسر نے ان مطعون امراء کی وکالت کی اور سلطان سے معافی حاصل کر لی۔ ملتان پہنچ کر اس نے ان امراء کو انعام دیا جو اس کی غیر حاضری میں ثابت قدم رہے تھے۔ عصامی کا کہنا ہے کہ سندھ کی سرحد کے نزدیک 40 بہادر اور جنگجو ترک سوار فوج میں شامل ہوئے۔

تاج المعاصر کے مطابق معزالدین نے قوام الملک رکن الدین حمزہ کو لاہور سے رائے پتھورا کے پاس روانہ کیا تاکہ ماتحتی قبول کرنے کا پیغام دیا جائے۔ رائے نے ایک سخت جواب دیا اور ہندستان کے تمام رایو سے مدد طلب کی۔ فرشتہ کے مطابق رائے کی فوج میں "تین لاکھ راجپوت اور افغان تھے۔[1]" لیکن یہ تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے اور قابلِ قبول نہیں۔ منہاج کو معین الدین اوشی نامی ایک قابلِ بھروسہ آدمی نے بتایا تھا کہ اس وقت معزالدین کی فوج میں غزنی کے چار جانباز سپہ سالار تھے جو کہ تجربہ کار اور ہوشیار تھے۔ خدیک، خرمیل، الٰہ، مکلبہ ان میں سے ہر کے تحت ایک بڑی فوج تھی۔[2] ان کے علاوہ تاج الدین یلدوز، قباچہ اور ایبک تھے سلطان غزنی سے 587ھ / 1191ء[3] میں روانہ ہوا۔ اور ترائن 588ھ / 1191-92ء،[4] میں پہنچا۔ اس نے اسی جگہ اپنا خیمہ نصب کیا جہاں ایک سال قبل اس کو شکست ہوئی تھی۔ فرشتہ کے مطابق رائے پتھورا کے ساتھ جنگ میں 150 رائے تھے جو یہ سوچ کر نکلے تھے کہ یا تو دشمنوں کو کچل دیں گے یا خود اپنی جانیں گنوا دیں گے۔[5]

ترائن کی جنگ

اس مرتبہ معزالدین نے بہت سوچ سمجھ کر جنگ کا نقشہ تیار کیا۔ اس نے قلبی دستہ کو جس میں سامان علم جھنڈے اور ہاتھ شامل تھے۔ کئی میل پیچھے چھوڑ دیا تاکہ

---

(1) فرشہ، جلد 1، ص 58

(2) طبقاتِ ناصری، 119، عصامی نے دس لاکھ تیس ہزار کی تعداد بتائی ہے (78)

(3) فتوح السلاطین، مدراس ایڈیشن، 74،73 (4) تاج المعاصر (قلمی)

(5) فرشتہ، جلد 1، 58

دشمن کو اس کی طاقت کا صحیح اندازہ نہ ہو۔ یہ دستہ ایک طرح کی Reserve Force تھی اور یہ اس وقت میدانِ جنگ میں لایا جاتا جب کی بقیہ فوج راجپوت فوجوں سے نبرد آزما ہو چکی ہو۔ اس دستہ کو پیچھے چھوڑ کر معزالدین کی بقیہ فوج آگے روانہ ہو لی۔[1]

فوج کے اس حصہ کو جو ہلکے اسلحوں سے لیس گھوڑ سواروں پر مشتمل تھا۔ چار دستوں میں تقسیم کر دیا گیا تا کہ یہ ہندستانی فوج پر چاروں طرف سے حملہ کر سکے۔ اپنی فوج کو یوں منقسم کر کے معزالدین نے دس ہزار گھوڑ سوار تیر اندازوں کو یہ حکم دیا کہ وہ دشمن کی فوجوں کو داہنے، بائیں، آگے اور پیچھے کی جانب سے الجھائے رکھے۔ اس نے ان کو حکم دیا کہ جب ان کے (دشمنوں کے) ہاتھی گھوڑے کی دوڑ (Course) کے برابر کا فاصلہ رکھو۔[2] اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کی فوج کو اس طرح پر ہر ساں رکھا جائے کہ مقابل فوج کی پوری تعداد میدانِ جنگ میں موجود رہے۔ معزالدین نے اپنی فوج کو کس طور پر آراستہ کیا اس کا بیان منہاج نے اس طور پر کیا ہے۔ فرشتہ نے جنگ کے قبل چند دلچسپ واقعات کی تفصیلات دی ہیں۔

"اپنی پہلی فتح سے مغرور ہو کر ان لوگوں نے (رائے نے) سلطان کو ایک سخت خط لکھا کہ "ہماری فوج کی تعداد اور طاقت تمہیں جلد معلوم ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ہندستان کے تمام علاقوں سے کمک پہنچنے والی ہے۔ اگر اپنے آپ پر نہیں تو ان گمراہ لوگوں پر رحم کرو جن کو تم اپنے ساتھ یہاں لائے ہو۔ اگر تم اپنی حرکت پر پشیمانی کا اظہار کرو اور واپس چلے جاؤ تو ہم لوگ اپنے دیوتاؤں کی قسم کھاتے ہیں کہ واپسی میں تمہاری فوجوں کو ہراساں نہ کریں گے۔ ورنہ کل ہم لوگ تین لاکھ گھوڑ سواروں بے شمار تیر اندازوں اور اتنی بڑی تعداد کی فوج سے حملہ آور ہوں گے جس کا اندازہ دائرہ تصور سے باہر ہے اور تم کو کچل دیں گے۔" معزالدین نے جواب دیا کہ آپ کا پیغام بہت مشفقانہ اور مہر آمیز ہے لیکن اس معاملہ میں خود مختار نہیں ہوں۔ میں اپنے بھائی کے حکم سے یہاں آیا ہوں اور اس مہم کی دشواریوں کو برداشت کیا ہے۔ اگر آپ مجھے وقت دیں تو میں اپنے بھائی کو آپ کی زبردست طاقت سے مطلع کر دوں گا اور اس شرط

---

(1) ایضاً 119-20

(2) ایضاً-120

پر کہ معاہدہ کی اجازت طلب کروں گا کہ سرہند، ملتان اور سندھ پر میرا قبضہ ہو اور بقیہ ہندستان پر آپ حکمراں رہیں۔[1]

فرشتہ کے اس بیان پر یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ راجپوت حکمراں اتنے کم عقل نہ تھے کہ ایسے وقت میں کہ جب دونوں فوجیں صف آرا ہوں وہ اس طرح کا پیغام قبول کرتے۔ لیکن فرشتہ اپنا بیان اسی طور پر جاری رکھتا ہے۔ ”راجپوت حکمرانوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں کے جواب کی نرمی ان کی فوج کی کمزوری کی وجہ سے تھی۔ اور وہ اس رات کو آرام سے سو گئے۔ لیکن معزالدین رات بھر جنگ کی تیاریاں کرتا رہا اور جب صبح کے وقت راجپوت اپنی ضروریات سے فارغ ہونے کو نکلے اور منہ ہاتھ دھونے لگے تو وہ اپنی صف بستہ فوج کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا۔ اس غیر متوقع حملہ سے ہندو گھبرا گئے لیکن کسی طرح انہوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور میدانِ جنگ میں آئے۔ سلطان ہندو فوجوں کے عزم و ہمت سے واقف تھا اور اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ چاروں دستے یکے بعد دیگرے دشمن کے مقابلے پر آئے۔ جب ہندو فوج کے ہاتھیوں اور گھوڑوں نے معزالدین کی فوج پر حملہ کیا تو یہ بھاگ پڑی مگر جب دھوکہ کھا کر دشمن کی فوج ان کے تعاقب میں آگے بڑھی تو یہ پلٹ گئی اور اپنے تیغوں سے دشمنوں کے جسموں کو ان کے سروں کے بوجھ سے ہلکا کر دیا۔ اس طور سے صبح سے دوپہر تک جنگ جاری رہی تب معزالدین نے اپنی زرہ اور خود پہن کر بارہ ہزار آدمیوں کے ساتھ، جو تلوار کھینچے ہوئے تھے اور نیزے لیے ہوئے تھے، دشمن پر حملہ آور ہوا۔ جانبازوں کا خون خاک میں ملنے لگا اور چشم زدن میں ہندوؤں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں۔ اسی وقت خرمیل اور دوسرے امراء نے راجپوتوں پر تمام جانب سے حملے کر دیے اور انہیں میدانِ جنگ سے بھگا دیا۔[2]

عصامی نے فوجوں کی آراستگی کے متعلق اور دلچسپ تفصیلات بتائی ہیں۔ اس کے مطابق راجپوت فوجوں کا مقدم گوبند رائے تھا۔ وہ پتھورا کی فوج کے ہراول دستہ میں نبرد آزما تھا اور قلبی دستہ میں۔ پتھورا کی فوج کا بایاں دستہ بھولا کی سرکردگی

---

(1) فرشتہ، 58,1

(2) ایضاً 28

میں تھا جو کہ وزیر تھا، داہنا دستہ بدمسار اول کے تحت تھا۔ معزالدین کی فوج اس طور پر تھی۔ قلبی دستہ میں خود معزالدین تھا۔ ہراول دستہ یا مقدمہ کا سردار خربک تھا۔ داہنا دستہ الہ کے تحت تھا اور بائیں دستہ کی سرکردگی کمبل کر رہا تھا۔ خرمیل قلبی دستہ کی پشت پر تھا۔ قطب الدین کے ذمہ فوج کی عام نگرانی تھی۔ اور وہ معزالدین کے نزدیک تھا۔ معزالدین کی فوج عصامی کے مطابق ایک لاکھ تیس ہزار سواروں پر مشتمل تھی، اور اس کا ہر سپاہی آہنی زرہ اور ہتھیاروں سے لیس تھا۔ گووند رائے ہاتھیوں کے دستہ کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور خربک پر حملہ آور ہوا۔ خربک نے اپنی حفاظت کے لیے منہ پر ڈھال رکھ لی اور اپنے تیر اندازوں کو فیل بانوں پر نشانہ لگانے کو کہا۔ جیسے ہی تین چار فیل بان زخمی ہوئے ہاتھیوں کی صفیں بکھر گئیں اور ہاتھی میدان سے بھاگنے لگے۔[1]

جب ہاتھی پیچھے ہٹ گئے تو خربک نے ان پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ جب معزالدین نے دشمن کی صفوں کو درہم برہم دیکھا تو اس نے داہنے اور بائیں جانب سے حملہ کر دیا اور خود قلبی دستہ کی سرکردگی کی۔ ہندوؤں کی صفیں پیچھے ہٹ گئیں اور وہ بھاگ گئے۔[2]

معزالدین کی ترکیب کامیاب ہوئی اور رائے پتھورا کو سخت شکست ہوئی۔ وہ اپنے ہاتھی سے اتر گیا اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو رہا تھا کہ سرسوتی کے نزدیک گرفتار ہو گیا۔ منہاج لکھتا ہے کہ وہ اسی وقت قتل کر دیا گیا۔[3]

---

(1) یحیٰی سرہندی کے مطابق معزالدین کی جنگی تیاریاں اسی طور پر تھی۔ جب ہندوؤں کے ہاتھی گھوڑے اور اس کی فوج کے ایک حصہ پر حملہ کریں گے تو بقیہ فوج بیک وقت تینوں جانب سے ان پر حملہ کر دے گی۔ تاریخ مبارک شاہی، 10

(2) فتوح السلاطین (مدراس ایڈیشن) 77-78 گرچہ ترائن کی جنگ سے اس کے استعمال کا ذکر ہم عصر تحریروں میں نہیں ملتا لیکن غوری فوج کا ایک اہم حربہ کارہ تھا اور یہ بخوبی ممکن ہے کہ ہندستانی مہموں میں اس کا استعمال ہوا ہو۔ یہ ایک طرح کی ڈھال تھی جو بیل کے کھال سے بنتی تھی اور دونوں جانب روئی اور اون سے بھری ہوتی تھی۔ یہ پیادہ فوج دیوار کی طرح کرتی تھی اور کوئی حربہ اس پر کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔ مزید دیکھیے منہاج 56

(3) منہاج-120-- عصامی بھی یہی بیان کرتا ہے۔

لیکن حسن نظامی کے مطابق[1] اس کو اجمیر لے جایا گیا اور کچھ دنوں تک بحال رکھا گیا۔ لیکن غداری کا الزام عاید ہونے پر وہ قتل کر دیا گیا۔ سکوں اور نیم ہم عصر سنسکرت تذکرہ وِرُداویدھی ودھاوسہ کی شہادت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس کو کچھ عرصہ تک حکومت کرنے کا موقع دیا گیا۔[2] رائے پتھورا کے بعض سکوں کے اوپر کی جانب یہ عبارت کندہ ہے ”سری محمد سام[3] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے معزالدین کی ماتحتی قبول کی۔ رائے پتھورا کے قتل کے بعد بھی اجمیر کی حکومت کو فوراً اپنے اختیار میں نہیں لیا گیا اور رائے پتھورا کے بیٹے کو کچھ عرصہ تک ماتحت حکمراں کی حیثیت سے کام کرنے دیا گیا۔[4]

دہلی کا گووندرائے میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ لیکن جو پالیسی اجمیر کے متعلق اختیار کی گئی تھی وہی دہلی کے متعلق بھی اپنائی گئی۔ گووندرائے کے جانشین نے معزالدین کی ماتحتی قبول کی۔ حسن نظامی لکھتا ہے کہ ”اس علاقے کے رائے اور مقدموں نے اطاعت اختیار کی اور جب انہوں نے مال گزاری اور مراسم خدمتی ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو انہیں جاری رکھا گیا۔[5] لیکن اندپت میں ایک لشکر گاہ قائم کر دی گئی۔[6]

---

(1) تاج المعاصر (قلمی)

(2) I.H.Q., 1940, 567 et Seq

(3) Chronicles of the Pathan Kings of India

(4) تاج المعاصر (جیسوال انسٹی ٹیوٹ کا قلمی نسخہ 97) حسن نظامی نے اس باب کی یہ سرخی دی ہے، رائے پتھورا کے بیٹے اجمیر کی امارت کی تفویض،

(5) ایضاً 100

(6) ایضاً 101

4

شمالی ہندستان کی فتح

(1192-1206ء)

ترائن راجپوتوں کے لیے ایک بڑا حادثہ تھا۔ راجپوتوں کی سیاسی عظمت کو عام طور پر اور چوہانوں کے اقتدار کو خاص طور پر سخت دھکا لگا۔ ساری چوہان حکومت اب حملہ آوروں کے قدموں میں تھی۔ چونکہ ترائن کی جنگ راجپوت شہزادوں کی ایک بڑی جماعت کی مشترکہ کوشش تھی اس لیے اس کے اثرات بڑے پیمانہ پر محسوس ہوئے اور دور دور تک پست ہمتی پھیل گئی۔ ترائن میں اپنی کامیابی کے فوراً بعد معزالدین نے سیوالک کا پورا علاقہ جس میں ہانسی اور سرسوتی شامل تھے، قبضہ کر لیا، کہرام کو ایبک کے حوالے کر کے معزالدین غزنی واپس چلا گیا۔

اجمیر میں ترکی اقتدار کا استحکام

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے رائے پتھورا کو ترائن میں اس کی شکست کے فوراً بعد قتل نہیں کیا گیا۔ اس کو اجمیر میں بحال کر دیا گیا۔ لیکن اس نے زیادہ دنوں تک وفاداری قایم نہ رکھی اور جب اس پر غداری کا الزام ثابت ہو گیا تو اس کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی ایبک پرتھوی رائے (یا رائے پتھورا) کے خاندان کو ملک کی سیاست سے بالکل علیحدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ماتحتی قبول کرنے کی شرط پر اجمیر کو اس کے بیٹے کے حوالہ کر دیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چوہانوں نے یہ حیثیت قبول نہ کی۔ انہوں نے پرتھوی رائے کے بیٹے کو بھگا کر اجمیر پر قبضہ کر لیا۔

جس شخص نے اجمیر اور اطراف میں ترکی اقتدار کی مخالفت میں نمایاں حصہ لیا وہ پرتھوی رائے کا بھائی ہری رائے تھا۔ اس نے رنتھمبور کا محاصرہ کیا جس کو ایک

نے قوام الملک کے حوالہ کیا تھا۔ ایبک اس کے مقابلہ کو گیا اور ہری رائے حالات کے موافق نہ دیکھ کر **رنتھمبور** سے پیچھے ہٹ گیا۔ اجمیر پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ اور ایبک نے پر تھوی رائے کے بیٹے کو بحال کر دیا۔

گرچہ ایبک نے ہری رائے پر دباؤ ڈال کر اس کو ان جگہوں کو خالی کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن ہری رائے کی طاقت باقی تھی۔ حالات اس وقت تک مکمل طور پر قابو میں نہ آئے تھے۔ جب 589ھ / 1193ء میں معزالدین نے یک بیک ایبک کو غزنی واپس بلالیا اب ہری رائے کے لیے میدان خالی تھا اور اس کا موقع تھا کہ وہ اپنے وسائل کو اکٹھا کر کے ترکوں سے مقابلہ کرے۔ جب ایبک دہلی واپس ہوا تو اس کو معلوم ہوا کہ اجمیر میں پھر دشواریاں بڑھ رہی تھیں۔ ہری رائے نے دوبارہ پر تھوی رائے کے لڑکے کو ہٹا دیا اور دہلی پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس مجوزہ حملہ کا نگراں جھٹ رائے تھا۔ ایبک اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے فوراً آگے بڑھا۔ دہلی سے اس اچانک کارروائی کی وجہ سے ہری رائے اور اس کے کارگزار سپہ سالار جھٹ رائے گھبرا گئے جھٹ رائے نے اجمیر میں پناہ لی اور ہری رائے نے جوہر ادا کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

ایبک نے اب راجپوتانہ میں ترکی مقبوضات کے انتظامی معاملات کو درست کیا۔ اجمیر کو ایک مسلمان افسر کے تحت کر دیا گیا اور پر تھوی رائے کے بیٹے کا تبادلہ **رنتھمبور** کر دیا گیا اور وہاں کا قلعہ اس کے حوالے کر دیا گیا۔

چند مہینے گزرے تھے کہ راجپوتوں نے اجمیر میں ترکی طاقت کو اکھاڑ پھینکنے کی ایک اور کوشش کی۔ مہر قبیلہ کے راجپوت جو اجمیر کے نزدیک رہتے تھے۔ وہ بغاوت کر بیٹھے اور اجمیر میں محصور ترکی فوج کو صورتِ حال سے نپٹنے میں بڑی دشواری ہوئی۔ مہر قبیلہ والوں نے چالوکیوں کی فوج سے بھی مدد طلب کی تھی۔ ایبک فوراً محاذ پر روانہ ہوا لیکن اس نے صورتِ حال کو بہت دشوار پایا اور اجمیر کو واپس ہو گیا۔ راجپوتوں کا دباؤ اجمیر پر بڑھنے لگا اور ایبک کی حالت بہت نازک ہو گئی لیکن غزنی سے بروقت امداد نے صورتِ حال کو سنبھال لیا اور راجپوتوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

ترائن کے بعد کی توسیعات اور مسائل

ترائن کی جنگ کے بعد رمضان 588ھ / ستمبر 1192ء میں جتوان نے ہانسی کا محاصرہ کیا۔ ایبک اس کا مقابلہ کرنے کو بڑھا اور (مغربی راجستھان) تک اس کا تعاقب کیا۔ اس مقام پر جنگ ہوئی لیکن اس کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ ہانسی میں ایک فوج متعین کر دی گئی۔

اس کے بعد ایبک اپنے دارالخلافہ کہرام واپس ہو گیا، اور اپنی فوجوں کو تیار کیا تاکہ جمنا پار کر کے بالوئی دوآب کے علاقہ میں اپنا قدم جمائے۔ ادھر کے تمام اہم مقامات مثلاً میرٹھ اور باران ڈور راجپوتوں کے تحت تھے۔ اور انہوں نے ترکی حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایبک کہرام سے میرٹھ کو روانہ ہوا اور اس پر 588ھ/119[1] میں قبضہ کیا۔ اسی وقت باران (موجودہ بلند شہر) پر بھی قبضہ ہوا۔ میرٹھ اور باران کی فتح فوجی اور جغرافیائی سیاسی نقطہ نظر سے بہت اہم تھی چونہ ان مفید مقامات سے وہ گڑھوال حکومت پر حملوں کا انتظام کر سکتا تھا۔ بعد میں 588ھ / 1192ء میں ایبک دہلی کی جانب روانہ ہوا اور اس پر قبضہ کر لیا۔[2] اس وقت تک ایبک کو خود اپنی فوجی طاقت اور اپنے مدمقابل کے وسائل اور انتظامات کا صحیح اندازہ ہو گیا تھا۔ فوجی نقطہ نظر سے دہلی کا محل وقع اس کو بہت مفید معلوم ہوا۔ یہ اس کی دفاعی اور اقدامی کارروائیوں کے لحاظ سے مفید تھا۔ دہلی سے وہ پنجاب میں غوری فوجی چوکیوں سے بہ آسانی رابطہ قایم رکھ سکتا تھا اور یہاں سے سے وہ راجپوتوں کے خلاف موثر طریقے سے مہمیں چلا سکتا تھا۔ شروع میں تومار حکمراں کو تخت پر قائم رکھا گیا لیکن 589ھ / 1193ء میں جب ایبک کو معلوم ہوا کہ وہ کچھ غدارانہ کارروائیوں میں شامل تھا تو اسے تخت سے برطرف کر دیا گیا اور دہلی پر قبضہ کر لیا گیا۔

859ء / 1193ء میں ایبک کو اس کے آقا نے غزنی میں طلب کیا۔ ایسے موقع

---

(1) طبقاتِ ناصری کے صفحہ 139 پر منہاج نے میرٹھ کی تاریخ 587ھ / 1191ء لکھی ہے۔ حالانکہ صفحہ 120 پر 588ھ / 1192 لکھا ہے۔ موخرالذکر صحیح تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

(2) تاج المعاصر اور طبقات ناصری (120) دونوں میں دہلی کی فتح کی تاریخ 588ھ / 1192ء لکھی ہے۔

پر جب کہ وہ فوجی کارروائیوں میں مشغول تھا۔ اسے کیوں بلایا گیا؟ منہاج اس نکتے پر خاموش ہے مگر عصامی لکھتا ہے کہ کچھ لوگوں نے ایبک کے خلاف سلطان کے کان بھر دیئے تھے اور اس کی وفاداری کے متعلق شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ سلطان نے ایبک کو غزنی بلا کر ان کی شکایات کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیا۔ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ شاید وہ اس لیے بلایا گیا تھا کہ سلطان کو مزید توسیعی کارروائیوں میں مدد کرے۔ ایبک چھ مہینوں تک غزنی میں رہا۔

590ھ / 1194ء میں غزنی سے واپسی پر ایبک نے جمنا پار کر کے کول (علیگڑھ) پر قبضہ کر لیا۔

معزالدین کی بنارس کی مہم

ایبک نے کول کی فتح بہ مشکل تمام کی تھی کہ معزالدین اس ارادہ سے ہندستان آ پہنچا کہ گہڑوال اقتدار کا خاتمہ کیا جائے۔ اس نے دہلی میں فوجیوں کی بھرتی کی اور پھر پچاس ہزار کے ساتھ قنوج اور بنارس کی جانب کوچ کیا۔ ایبک اور سپہ سالار عزالدین حسین بن خرمیل کے ذمہ ہراول دستہ کی قیادت سونپی گئی۔ یہ جنگ چندوار کے پاس لڑی گئی۔ سخت مقابلہ ہوا بالآخر معزالدین کی شاندار کامیابی ہوئی اور جو بھی فوری فوائد اسے نظر آئے ہوں گے مگر منہاج اس پر اظہار خوشی کرتا ہے کہ تین سو سے کچھ زائد ہاتھی معزالدین کے قبضہ میں آئے۔ در حقیقت یہ فتح اور زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ گرچہ پوری گڑھوال سلطنت پر تسلط نہ جم سکا لیکن اس (فتح) نے بنارس اور بانسی جیسے مقامات پر فوجی چھاؤنیاں قایم کرنے کا موقع پیش کیا۔ اب بھی کئی گڑھوال مراکز اپنی آزادی قایم کیے ہوئے تھے مثلاً قنوج پر 595ھ / 1198-99ء تک قبضہ نہ ہو سکا۔ اور اس وقت بھی مکمل طور پر قبضہ نہ جم سکا، چونکہ ہم (بعد میں) التتمش کو قنوج پر حملہ کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

شاید یہ کہ ایبک کول پر اچھی طرح قبضہ نہ جما پایا تھا۔ جب کہ سلطان نے اس

تاج المعاصر نے اس واقعہ کی تاریخ 590 لکھی ہے مگر منہاج (120) اس کا ایک سال قبل ذکر کرتا ہے یعنی 89ء

کو جے چند کے خلاف اپنی مہم میں شامل کرنے کے لیے بلالیا تھا اس لیے معزالدین کے غزنی چلے جانے کے بعد پھر کول میں اپنی طاقت کے استحکام پر توجہ دی۔

معزالدین کی 1195-96ء کی مہم

592ھ / 1195-96ء میں معزالدین پھر ہندستان آیا۔ اس مرتبہ اس نے بیانہ پر حملہ کیا جو ایک جاڈوں بھٹی راجپوت حکمراں کمارپال کے قبضہ میں تھا۔ اس نے اپنے دارالسلطنت بیانہ میں جنگ سے اعتراض کیا اور تھنکر میں جاکر قلعہ بندی کی۔ لیکن اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور تھنکر اور وجے مندر گڑھ پر قبضہ کر لیا گیا اور بہاء الدین طغرل کے حوالہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد معزالدین نے گوالیار کی جانب کوچ کیا۔ لیکن پریہار خاندان کے سللکھن پال نے (بغیر جنگ کے ہی) معزالدی کی ماتحتی قبول کرلی۔

ایبک کو اجمیر کے علاقہ میں مہر بغاوت، جس کا ذکر قبل ہو چکا ہے، کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کر کے وہ انہلوارا کی طرف روانہ ہوا اور اس مقام پر جہاں چند سال قبل معزالدین کو شکست ہوئی تھی اس کا مقابلہ آبو کے حکمراں دھرورشا اور ناڈول کے کلہانا کی فوجوں سے ہوا۔ ایبک نے چالوکیوں کو یہ تاثر دیا کہ یہ ایک کھلی جنگ سے احتراز کر رہا ہے۔ گرچہ اس میں اس کی کامیابی کی زیادہ امید تھی۔ چالوکیہ میدان میں آگئے اور اس کے بعد جو جنگ ہوتی اس میں برتر حرکت پذیری (Superior mobility) اور اچانک حملہ کے طریقہ جنگ فیصلہ کن ثابت ہوئے۔[1] بادشاہ بھیم ثانی انہلوارا سے فرار ہو گیا۔ شہر کو لوٹا گیا اور بقول فرشتہ ایک مسلم افسر کی تقرری ہوئی تاکہ اس علاقہ میں ترکی اقتدار کو اور مستحکم بنایا جائے۔ لیکن انہلوار کا (ترکی سلطنت میں) انضمام کئی وجھوں سے مشکل تھا۔ خاص کر اس وجہ سے کہ راجپوتانہ، جو کہ (Safety-valve) کا کام ادا کر سکتا تھا۔ وہ بھی ترکی حلقہ اقتدار سے باہر تھا۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ ایبک نے ان علاقوں کو ہندستان کے تحت رہنے دینے کی پالیسی اختیار کی۔ یہ ترکوں کی اس مجموعی پالیسی کے مطابق تھا کہ پرانے حکمراں خاندان کو بالکل ختم نہ کر دیا

---

(1) منہاج، 140، جیسا کہ حبیب اللہ نے Foundation، 67 میں نقل کیا ہے۔

جائے۔ لیکن کتبوں کی شہادت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چالوکیوں نے ترکوں کو مار بھگایا اور یہ 1240ء تک ان کے قبضہ میں رہا۔

594ھ / 8-1197ء میں ایبک نے بدایوں پر قبضہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران بنارس پر ترکوں کا قبضہ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اور ایبک کو دوبارہ اس پر قبضہ کرنا پڑا۔ 595ھ / 99-1198ء میں چنتر وال (چنڈواڑ) اور قنوج پر قبضہ کر لیا گیا۔

ان مہموں کے بعد ایبک نے راجپوتانہ کی طرف توجہ کی۔ اس نے سروہ (سروہی) پر قبضہ کر لیا اور بعد میں بقول فخر مدبر 596ھ / 1200-1119ء میں مالوہ فتح کر لیا۔ لیکن دوسرا کوئی مورخ ایبک کے مالوہ پر قبضہ کا ذکر نہیں کرتا۔ اغلب ہے کہ یہ ایک سرسری قسم کا حملہ ہوگا۔

تب ایبک نے بندیلکھنڈ کے چندیلوں کی جانب رخ کیا۔ 599ھ / 1200ء میں پرامر دی دیوا کے اہم فوجی مرکز کالنجر پر حملہ کیا۔ محاصرہ کچھ عرصہ جاری رہا اور تب پرامردی دیوا نے ایبک سے مصالحتی گفتگو شروع کی۔ اس نے ایک (نزدیکی) پہاڑی چشمہ سے پانی کا انتظام کر لیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ انتظام ناکامیاب نہ ثابت ہوگا۔ جب ترکوں کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے پانی کا راستہ موڑ دیا اب اجے دیو کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہ رہ گئی کہ مصالحت کی بات چیت کرے۔ چنڈیلوں کو قلعہ خالی کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور وہ نزدیک کے اجے گڑھ قلعہ میں چلے گئے۔ اس کے بعد کالنجر، مہوبا اور کھجوراہو پر قبضہ ہو گیا اور ان کو حسن ارنال کے تحت ایک فوجی کمان میں منقسم کر دیا گیا[1]

ملک بہاء الدین

ان معزی غلاموں میں جنہوں نے شمالی ہندستان پر غوری تسلط کے قیام میں نمایاں حصہ لیا، ملک بہاء الدین طغرل، معزالسلطانی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ بقول ریورٹی وہ "سلطان معزالدین کے مملوکوں میں سب سے عظیم سب سے ملنسار

---

(1) تاج المعاصر (حاشیہ 185–ب۔ فخر مدبر–25

اور سب سے اہل تھا۔[1] وہ معزالدین کی حکومت کے اوائل دور میں ہی اس کے غلاموں میں شامل ہوا۔ محض اپنی اہلیت سے اس نے سلطان کی نظروں میں وقعت پائی۔ جب تھنکر کا قلعہ فتح ہوا تو اس کے حوالہ کیا گیا۔ اس نے اس کا انتظام بڑی صلاحیت کے ساتھ کیا اور اس کی ترقی کے لیے کارروائیاں کیں۔ در حقیقت اس نے ہندستان میں ترکوں کی شہریت فروغ پالیسی (Policy of Urbanization) کو آگے بڑھایا۔ اس نے اس علاقہ میں مسلم نو آبادیات کے قیام کی ہمت افزائی کی۔ منہاج لکھتا ہے کہ "خراسان اور ہندستان کے مختلف حصوں کے تاجر اور مشاہیر اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ اور وہ ان سب ہی کو مکانات اور اسباب انعام دیا کرتا تھا جو ان کی ملکیت ہو جاتے تھے۔ اس طرح وہ سب اس کے (محل کے) نزدیک آباد ہو گئے۔[2]

اپنے آدمیوں کی سہولت کے اعتبار سے تھنکر کو تکلیف دہ اور ناموافق (مقام) پاکر اس نے بیانہ کے علاقہ میں ایک نئے شہر سلطان کوٹ کی بنیاد ڈالی اور اس کو اپنا صدر مقام بنایا۔ گوالیار کے خلاف مہموں میں اس نے اس نئے صدر مقام کو اپنا اڈا بنایا۔ جب معزالدین گوالیار کے قلعہ کو فتح کیے بغیر واپس ہوا تو اس نے یہ نامکمل کام بہاء الدین کے حوالہ کیا۔ اس مشکل کام میں جو اس کے آقا نے اس کے ذمے لگایا تھا، وہ سرگرمی کے ساتھ لگ گیا اور اس علاقہ کو زیر کرنے کی باقاعدہ اسکیم بنانے لگا۔ اس نے گوالیار کے قلعہ کے نزدیک اپنا قلعہ بنایا۔ تاکہ اس کی فوج رات کے وقت اس میں پناہ لے سکے۔ ایک سال بعد اس نے گوالیار کا محاصرہ کیا۔ محاصرین جب بہت مجبور پریشان ہو گئے تو انہوں نے ایک کے پاس سفیر بھیجے اور 1200ء میں قلعہ اس کے حوالہ کر دیا۔[3]

اس کی وجہ سے ایک اور بہاء الدین کے بیچ شکر رنجی ہوئی۔ شاید ان دونوں

---

(1) طبقاتِ ناصری 544، نوٹ 4

(2) ایضاً 145

(3) تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، 24، ریورٹی۔ شاید اس خیال سے کہ ایسی صورتِ حال معزالدین کی زندگی

(بقیہ اگلے صفحے پر)

کے بیچ بہت التفات نہ تھا۔[1] چونکہ اگر گوالیار کے حاکمان کو ان دونوں کے درمیان ناخوشگواری کی خبر نہ ہوتی تو وہ اس طرح کی تجویز، جس سے ان دونوں کے درمیان ناخوشگوار اختلاف ہو سکتا تھا۔ ایک کے پاس پیش کرنے کی بات نہ سوچ سکتے تھے۔ فرشتہ کے مطابق دونوں نے لڑائی کی ٹھانی مگر اس وقت طغرل کی موت نے ایک کا یہ معاملہ طے کر دیا۔[2] بہر حال منہاج نے طغرل کی ذاتی صفات اور کارناموں کی بہت تعریف کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ "میانہ کے علاقہ میں اس نے اپنی نشانیوں کے طور پر رفاہِ عامہ کے لیے بہت سی عمارتیں بنوائیں۔[3]

محمد بختیار خلجی

مشرقی علاقہ کی فتح کا کام محمد بختیار خلجی نے کیا جس کی شخصیت اور کارگزاریوں نے عہد وسطیٰ کی تاریخ میں ایک افسانوی رنگ اختیار کر لیا ہے۔

مک عزالدین محمد بختار خلجی گرمیسر کا رہنے والا تھا۔ وہ تلاشِ معاش میں غزنی آیا۔ دیوان ارض کے افسر کو وہ ایک منکسر المزاج اور غیر دلکش شخص نظر آیا اور اس نے اس کی قلیل تنخواہ مقرر کر دی۔ بختیار نے تقرری سے انکار کر دیا اور ہندستان روانہ ہو گیا جہاں باصلاحیت نوجوانوں کی ترقی کی بہتر صورتیں تھیں۔ لیکن دہلی میں بھی فوج کے کمانڈر نے اس کی بدصورتی کی وجہ سے اس کو کوئی جگہ نہ دی۔ اس طرح غزنی اور دہلی میں نظر انداز کیے جانے کے بعد بدایوں کی جانب اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا کہ اپنے لیے ایک مناسب ذریعہ معاش پا سکے۔ اور اپنے عہد کی تاریخ پر اپنا نقش چھوڑ جائے۔ سپہ سالار ہزبر الدین حسن ادیب، جو بدایوں کا مقطع تھا، نے اس کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ منہاج کی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بختیار خلجی کی پہلی

(صفحہ 244 کا بقایہ) کے دوران ممکن نہ تھی کا خیال ہے کہ یہ واقعہ معزالدین کی موت کے فوراً قبل یا بعد ہوا لیکن جیسا کہ آگے توضیح کی گئی ہے۔ ایک اور طغرل دونوں ہی معزالدین کے خود مختار افسران کی حیثیت سے ہندستان میں کام کر رہے تھے اور ایسی صورتِ حال میں اس طرح کی ٹکر ممکن نہ تھی۔

(1) منہاج، 145

(2) فرشتہ جلد 1، 64

(3) طبقاتِ ناصری، 145

تقرری تھی۔[1] عصامی کے مطابق بختیار کی پہلی تقرری چتوڑ کے جے سنگھ[2] کے یہاں ہوئی۔ اس بات کی ہم عصر تصدیق نہیں ملتی اور یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی گرچہ اس سے قبل کی بعض ہم عصروں میں ہم کرایہ پر کام کرنے والے افغان سپاہیوں کو راجپوت فوجوں کے شامل لڑتے ہوئے پاتے ہیں۔[3]

بختیار کسی گمنام خاندان کا فرد نہ تھا۔ اس کا چچا محمد بن محمود ترائن کی دوسری جنگ میں پرتھوی راج کے خلاف لڑا تھا۔ شاید اس جنگ میں اس کے کارنامے کی وجہ سے ہی علی ناگوری جو بعد میں ناگور کا مقطع مقرر ہوا، کی توجہ اس پر ہوئی اس نے اس کو اپنی ملازمت میں لے لیا اور جب اس کو ناگور کا اقطاع ملا تو اس نے محمد بن محمود کو بھی اعزاز بخشا اور کاشمندی[4] کا اقطاع اس کو عطا کیا۔ ماسوا اس کے اس نے بطورِ اعزار اس کو ایک نقارہ اور علم بھی عطا کیا۔ جب محمد کا انتقال ہو گیا تو اس کا اقطاع بختیار کو ملا۔ کاشمندی کے مقطع کی حیثیت سے بختیار کی کارگزاریوں کی معلومات کم ہیں۔ شاید وہ وہاں زیادہ دنوں تک نہ رہا۔ اس کے بعد وہ اودھ گیا جہاں اس کی ملاقات بنارس اور اودھ کی فوج کے کمانڈر ملک حسام الدین اغول بک سے ہوئی۔ اس کی بہادری سے متاثر ہو کر اغول بک نے بھگوت اور بھیولی کے اقطاعات اسے دیے۔[5] یہ (علاقہ) ملحقہ علاقوں پر حملہ کرنے کے لیے اس کا صدر مقام بن گیا۔

بختیار نے اس علاقے کے چھوٹے چھوٹے گہڑوال سرداروں کی جگہ پر اپنا تسلط قایم کر لیا اور منیر اور بہار کے علاقوں میں یلغاریں شروع کر دیں۔ ان یلغاروں میں اسلحے، گھوڑے اور دیگر سامان کی صورت میں جو مالِ غنیمت اس نے اکٹھا کیا، ان

---

(1) ایضاً، 7-146

(2) شاید اس سے مراد گہلوٹ قبیلہ کا جیتر سنگھ ہے وہ اس وقت نگداہ کا حکمراں تھا جو چتوڑ سے تقریباً ۷۰ میل مغرب میں تھا۔

(3) فرشتہ، جلد 1، 58

(4) منہاج، 146

(5) طبقاتِ ناصری کے مطبوعہ ایڈیشن میں یہ نام سہلت اور سہلی لکھے ہوئے ہیں۔ ریورٹی نے صحیح طور پر ان کی تشخیص بھیولی اور بھگوت سے کی ہے بھیولی چنار تحصیل کا شمالی مشرقی پرگنہ ہے۔ مغرب کی جانب یہ بھگوت کے پرگنہ سے متصل ہے۔ یہ دونوں پرگنے موجودہ مرزاپور ضلع کے جنوب مشرقی حصہ میں واقع ہیں۔

سے اس علاقہ پر اس کے حملوں کے حدود کی توسیع اور تواتر کو تیز کرنے کے وسائل مہیا ہو گئے۔ جلد ہی اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور بہت سے خلجی (فوجی) اس کی ملازمت میں آنے لگے۔ ایبک نے بھی اس کی اہلیت اور کارناموں کی خبر سنی اور اسے اعزاز بخشا۔[1] اس طرح اپنی شہرت قایم کرنے کے بعد اس نے بہار پو فوج کشی کی اور اس علاقہ میں لوٹ مار کی۔ "اس کے پاس ہندوؤں کے قلعوں پر قبضہ کرنے کے لیے سامان محاصرہ نہ تھا نہ یہ اس کی پالیسی تھی کہ اس علاقہ میں بہت زیادہ ہلچل مچائی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کم از کم خطرہ مول لے کر اور بغیر شدید خون خرابے کے زیادہ سے زیادہ مالِ غنیمت حاصل کیا جائے۔ اس لیے اس نے صرف میدانی علاقے جس کی حفاظت منظم ریاست کی افواج نہ کر رہی تھیں، کی لوٹ مار تک خود کو محدود رکھا۔[2]

641ھ / 1253ء میں منہاج کی ملاقات لکھناؤتی میں شمس الدین سے ہوئی جو کہ بختیار کی ملازمت میں تھا اور اس سے منہاج نے بہار و بنگال میں بختیار کے کارناموں اور اس کی افسوسناک موت کے حالات معلوم کیے۔ منہاج کو اطلاع ملی کہ بختیار نے اچانک بہار پر حملہ کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ صرف دو سو مسلح سوار تھے۔ اس نے اس جگہ کے پچھلے دروازہ پر حملہ کیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ منہاج لکھتا ہے کہ "اس جگہ کے زیادہ تر باشندے برہم تھے اور ان کے سر منڈے ہوئے تھے۔ وہاں کافی تعداد میں کتابیں تھیں۔ جب ان کتابوں پر مسلمانوں کی نظر پڑی تو انہوں نے کئی ہندوؤں کو بلوایا جو کہ ان کتابوں کے متعلق ان کو کچھ اطلاع دے سکیں۔ لیکن تمام (پڑھے لکھے) ہندو مارے جا چکے تھے (ان کتابوں کے مطالب سے) واقفیت حاصل ہونے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ پورا قلعہ اور شہر ایک مدرسہ تھا اور ہندوی زبان میں مدرسہ کو وہار کہتے ہیں۔[3]

منہاج یا شاید ان حملہ آوروں نے ہی بھکشوؤں کو غلطی سے برہمن سمجھ لیا۔

---

(1) ایضاً 147

(2) تاریخ بنگال، جلد 2، 3

(3) منہاج 148

پندرہویں صدی کے ایک تبتی مورخ تاراناتھ کے بیان کے مطابق بختیار نے اسی موقعہ پر وکرم شیلا اور نالندہ کے خانقاہی شہروں پر بھی قبضہ کر لیا اور اودنڈپور کی جائے وقع پر ایک قلعہ تعمیر کیا۔ بدھ مذہب کی ایک روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ 1200 میں کاشمیر کا مشہور عالم بزرگ سری بھدر اودندپورا[1] اور وکرم شیلا مٹھوں میں گیا تھا لیکن ان کو تباہ پایا۔[2]

فتح کے بعد بختیار کثیر مالِ غنیمت اور تحائف کے ساتھ ایبک کے پاس گیا۔ حسن نظامی لکھتا ہے کہ وہ 8 رجب 599ھ / 23 مارچ 1203ء کو بدایوں میں ایبک کے پاس حاضر ہوا۔ جب کہ موخر الذکر نے فوراً ہی کالنجر کی فتح حاصل کی تھی۔ اور اس نے 20 کوہ قامت اژدہا شباہت ہاتھی پیش کیے اور بہت قسم کے جواہرات اور نقد روپے پیش کیے۔[3] ایبک نے بختیار کے کارِ نمایاں پر اس کی عزت افزائی کی۔ اس سے دوسرے ترکی امیروں کو حسد ہوا۔ ایک موقع پر اس کے دشمنوں نے اس کو ہاتھی سے جنگ کرنے پر بھی مجبور کیا۔ لیکن بختیار نے ہاتھ کی سونڈ پر ایک گرز مار کر اس کو میدان سے بھاگنے پر مجبو کر دیا۔ ایبک اس کی ہمت اور بہادری سے اس قدر خوش ہوا کہ نہ صرف خود اس نے انعام دیا بلکہ امیروں کو بھی اس کو انعام دینے کو کہا۔ اس کے بعد بختیار بہار کے لیے روانہ ہو گیا۔[4]

اب بختیار سینا حکمرانوں کی سرحد پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی بہادری اور ہمت کی شہرت ندیا کے رائے لکھمینا کے کانوں تک پہنچی۔ منہاج کے مطابق رائے اسّی سالوں سے حکومت کر رہا تھا اور انصاف اور سخاوت کی وجہ سے عوام کی رائے اس کے بارے میں بہت اچھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ منجموں نے رائے سے عرض کیا تھا کہ ان کی کتابوں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ ان کا ملک ترکوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ نجومیوں

---

(1) انڈین اینٹی کیوٹی IV ص 366-367

(2) ایس سی داس اینٹی کیوٹی آف چٹگام:- JASB-1898-25

(3) تاج المعاصر (قلمی)

(4) ریاض السلاطین کے مصنف کے مطابق اس نے فوجی چھاؤنیاں قایم کر کے اور دیگر فوجی انتظامات کے ذریعہ اپنے تسلط کو مستحکم کیا۔

نے رائے کو مشورہ دیا کہ "ترکوں کی چھیڑ چھاڑ" سے بچنے کے لیے وہ اپنا ملک چھوڑ دے۔ جب رائے نے اپنے ملک کے فاتح کی شناخت کے لیے کسی قسم کی علامت یا نشان کے متعلق دریافت کیا تو نجومیوں نے کہا کہ جب وہ شخص اپنے پیروں پر سیدھا کھڑا ہوگا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو نیچے گرائے گا تو اس کے ہاتھ اس کے گھٹنوں تک پہنچ جائیں گے۔ اور اس کے پیر کی پنڈلیوں کو چھوئیں گے۔ رائے نے معتبر لوگوں کو اس امر کی تحقیق کے لیے بھیجا اور انہوں نے بختیار میں یہ خصوصیت پائی۔ چنانچہ اس شہر کے اکثر باشندے اور برہمن وہاں سے فرار ہو گئے اور سنکست، نیگ کے دیگر شہروں اور قصبات اور کامروپ کی جانب چلے گئے۔ لیکن رائے لکھمنیا دارالسلطنت کو اس طرح چھوڑ دینے کے حق میں نہ تھا اور وہ ٹھہرا رہا۔ لیکن (بعد میں) وہ بھی توہم پرستی کے زبردست دباؤ میں آ گیا۔ کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1203ء میں اس نے ایک بڑی رسم قربانی، جس ایندری مہاسنتی کہا جاتا ہے اور جو آنے والی آفات سے بچانے کے لیے دیوتاؤں کی خوشنودی کی خاطر کی جاتی ہے، ادا کی۔[1]

اگلے سال بختیار بہار سے آگے بڑھا اور ندیا کے شہر کے سامنے آ پہنچا۔ منہاج کے مطابق صرف 18 سوار بختیار کی شہزوری کا ساتھ دے سکے بقیہ فوج آہستہ آہستہ اس کے پیچھے آئی۔ شہر کے دروازے پر پہنچ کر بختیار نے کسی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی بلکہ آگے بڑھتا گیا۔ اس طور پر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ یہ تاجروں کی جماعت ہے جو گھوڑے فروخت کرنے آئی ہے۔ جب وہ رائے کے محل کے دروازے پر پہنچا تو اس نے تلوار کھینچ لی اور حملہ شروع کر دیا۔ رائے اس وقت کھانا کھا رہا تھا۔ جب تک اس کو اس قلعہ کی خبر ہوتی بختیار دروازے سے آگے کی جانب بڑھ چکا تھا۔ رائے ننگے پاؤں پچھلے دروازے سے فرار ہو گیا۔ اور اس کی تمام دولت، اس کی بیویاں اور دوسری عورتیں، خادمان اور اس کا خصوصی خدمتگار۔ یہ سب گرفتار ہوئے۔ مسلمانوں نے کئی عدد ہاتھیوں پر بھی قبضہ کر لیا اور اتنا مالِ غنیمت ان کے ہاتھوں میں آیا کہ اس کا بیان مشکل ہے۔[2] کچھ ہی دیر بعد بختیار کی فوج بھی آ ملی اور اس کے بعد ندیا کے شہر اور

---

(1) جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" خطوط-1942-17-21

(2) طبقاتِ ناصری، 151

اطراف پر قبضہ ہو سکا۔ محل پر چالاکی سے قبضہ کر لیا گیا اور شہر، جو کہ اس وقت خوف زدہ اور پست ہمت ہو رہا تھا۔ طاقت کے مظاہرے سے زیر اختیار کر لیا گیا۔ رائے لکھمینا" ملک سنکیت اور بنگ وکامروپ کے شہروں کی جانب بھاگ گیا۔ کچھ عرصہ تک وہ سونار گاؤں سے اپنی وسیع سلطنت کے مختصر بقیہ حصہ پر حکومت کرتا رہا۔

بختیار ندیا پر مستقل قبضہ جمانا نہیں چاہتا تھا۔ چونکہ وہ اس جگہ کو اپنا دار السلطنت بنانے کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لیے لکھناوتی کو چنا جو بہار میں اس کے صدر مقام سے قریب تھا۔ لکھناوتی کے انتخاب کا فیصلہ سیاسی اور جغرافیائی دونوں ہی ضرورتوں کے پیش نظر اس نے کیا ہوگا۔ اس نے جلد ہی یہ سمجھ لیا کہ زیریں بنگال میں واقع ندیا پر قبضہ و اختیار قایم رکھنا ایک مشکل کام ہوگا۔ اور یہ اس کے محدود فوجی وسائل پر دباؤ ڈالے گا۔ بختیار کا یہ اندازہ صحیح تھا۔ اس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ ندیا کئی سالوں تک ہندوؤں کے قبضہ میں رہا۔ بختیار نے شمالی بنگال میں مقبوضہ علاقوں میں اپنی فوجی اور تہذیبی حیثیت مستحکم بنایا۔ اس علاقہ میں متعدد مساجد، مدارس اور خانقاہیں قایم کی گئیں اور معزالدین کے نام خطبہ پڑھا گیا۔

اس کے بعد بختیار نے اپنا وقت اور قوتِ عملی لکھناوتی کے مشرق میں (واقع) ترکستانی اور تبتی پہاڑی علاقے اور وہاں کے رہنے والوں کے حالت کی تفتیش میں لگائی۔ اس کی تبت کی مہم کے اغراض و مقاصد ایک معمہ بنے رہے ہیں۔ یہ بات قابل تعجب ہے کہ اس نے ہندو علاقوں کو نظر انداز کر دیا جو بآسانی اس کے دسترس میں آسکتے تھے۔ خلجی کی مہم جوئی، تحریک وغیرہ اور تمام حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی زیادہ دلچسپی شاید ترکستان میں ایک ایسے راستے کی تلاش تھی جو مختصر ہو۔ ترکستانی علاقہ سے اس طرح رابطہ قایم کر کے وہ بنگال کے علاقہ میں مزید مہموں اور اپنی مملکت کی توسیع کے لیے آدمیوں اور اسباب کی بلا روک ٹوک آمدورفت کا انتظام کر سکتا تھا۔ مز برآں بختیار خلجی جیسا اولوالعزم اور مہم جو شخص دہلی سے آزاد ایک علیحدہ سلطنت کے قیام کے ممکنات پر بھی غور کر سکتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم کے لیے بختیار نے کافی تیاریاں کر رکھی تھیں۔ اس نے بعض قبائل سے رابطہ بھی قایم کر رکھا تھا جو اس کے مقصد کے حصول کے

لیے کار آمد ثابت ہو سکتا تھا۔ منہاج لکھتا ہے کہ:

”ان پہاڑوں کے جو تبت اور اقلیم لکھناؤتی کے درمیان واقع ہیں۔ مختلف حصوں میں تین نسل کے لوگ رہتے تھے۔ ایک وہ جن کو کوچ کہا جاتا تھا۔ دوسرے میچ (میگ) اور تیسرے تھارو۔ ان سبھوں کی صورت ترکوں جیسی تھی۔ ان کی علیحدہ علاقائی زبان بھی تھی جو کہ ہند اور ترکی زبانوں کے درمیان کی تھی۔ کینج اور میچ قبائل کا ایک سردار جسے وہ علی میچی کہا کرتے تھے محمد بختیار خلجی کے قبضہ میں آگیا اور اس کے ہاتھوں اوّل الذکر مشرف بہ اسلام ہوا۔“

یہ وہ آدمی تھا جو ان پہاڑوں میں بختیار کی رہنمائی کے لیے اور اس کا رہبر بننے پر راضی ہوا۔ وہ اس کو بردھن (کوٹ)[1] لے گیا اور اس جگہ کے سامنے ایک دریا بیگمتی[2] بہتا تھا اور جب یہ ملک ہندستان میں داخل ہوتا تھا تو اسے ہندوی زبان میں سمند (سمندر) کہا جاتا تھا۔ اس دریا کے کنارے کنارے اوپر کی جانب دس دنوں تک علی میچ بختیار کی فوج کی رہنمائی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں تراشے ہوئے پتھروں کا ایک پل بنا تھا جس میں 20 سے زیادہ محرابیں تھیں۔“ جب فوج اس کو پار کر گئی تو بختیار نے پل کے سرے پر اپنے دو امیروں کو جن میں سے ایک ترکی غلام افسر تھا اور دوسرا خلجی تھا۔ اپنی واپسی کے وقت تک پل کی حفاظت کے لیے ایک فوجی دستہ کے ساتھ متعین کر دیا۔ جب کامروپ کے رائے کو اس مہم کی خبر ہوئی تو اس نے بختیار کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنی مہم کو اگلے سال تک ملتوی کر دے اس کے بعد اس نے اس علاقہ کی فتح میں اس کو مدد دینے کا وعدہ کیا۔ بختیار نے اس کا مشورہ قبول نہیں کیا اور تبت کے پہاڑوں کی جانب آگے بڑھا۔

پندرہ دنوں تک بختیار کی فوج ہمالیہ کی دشوار گزار گھاٹیوں اور دروں سے گزرتی رہی۔ سولہویں دن فوج تبت کے میدانی علاقہ میں داخل ہوئی۔ یہ علاقہ خاصا آباد تھا۔ اور زیر کاشت بھی تھا بالآخر فوج ایک مضبوط قلعہ کے نزدیک پہنچی اور اس پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ قلعہ کے اور قرب وجوار کے آدمی مقابلہ کے لیے اکٹھا ہوئے

---

(1) روایتاً یہ شہر ایران کے بادشاہ گرشسپ نے مشرق میں اپنی سیاحت کے دوران قایم کیا تھا۔

(2) جیسا کہ ملبوک من نے تجویز کیا ہے کہ یہ دریا (Tista) ہے۔

جو کہ صبح سویرے شروع ہوا اور مغرب تک جاری رہا۔ بہت سے مسلم سپاہی میدان میں کام آئے۔ منہاج لکھتا ہے کہ "اس فوج کے تمام دفاعی اسلحے بانس کے ٹکڑوں کے تھے یعنی ان کے زرہ بکتر، ڈھالیں اور خود یہ سب اس (بانس) کے ٹکڑوں سے بنتے تھے جو کہ ڈھیلے ڈھالے طور پر سیے ہوئے تھے اور ایک دوسرے پر منطبق تھے اور یہ تمام لوگ ترک تیر انداز تھے اور ان کے پاس لمبی کمانیں تھیں۔"

رات کے وقت مسلم سپاہیوں نے جنگی قیدیوں سے تفتیش کی جنہوں نے یہ بتایا کہ 5 لیگ کی مسافت پر ایک شہر کاربتان نام کا تھا وہاں تقریباً پچاس ہزار جری ترک سوار اور تیر انداز تھے اور اگلی صبح تک ان کے پہنچنے کی توقع تھی۔

لکھناؤتی کے قیام کے دوران منہاج کی کاربتان[1] کے متعلق تفتیشات نے مندرجہ ذیل اطلاعات اس کو پہنچائیں۔

(1) کاربتان (کے / قلعہ) کی دیواریں تراشے ہوئے پتھر کی تھیں۔

(2) اس کے باشندے برہمن اور نونی تھے۔

(3) اس شہر کا حاکم مہتر کہلاتا تھا۔

(4) اس شہر کے بازار میں پندرہ سو گھوڑے روزانہ فروخت ہوتے تھے اور وہ تمام گھوڑے جو لکھناؤتی لائے جاتے تھے وہ اسی شہر سے آتے تھے۔

جب بختیار کو اس شہر کی خصوصیات معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے سپاہیوں کو کوچ سے تھکا ہوا پایا تو اس نے امیروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے واپس لوٹنے اور اگلے سال بہتر تیاری کے ساتھ حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ بختیار کی پیچھے ہٹتی ہوئی فوج کا حال منہاج نے یوں لکھا ہے:

"جب وہ واپس ہوئے تو سارے راستہ میں نہ تو کہیں گھاس نظر آئی او نہ جلانے کی لکڑی کا کوئی ٹکڑا دکھائی دیا۔ مقامی لوگوں نے ان سبھوں کو جلا دیا تھا۔ اور وہ لوگ جو گھاٹیوں اور دروں میں رہتے تھے وہ فوج کے راستہ سے ہٹ گئے تھے۔ ان پندرہ دنوں میں گھوڑوں اور دیگر مویشیوں کو دانہ یا گھاس بالکل نہ ملی تھی۔ اس وقت تک کہ وہ کامروپ کے پہاڑی علاقہ سے نکل کر اس پل کے سرے تک نہ پہنچ گئے۔ سپاہیوں کو

---

[1] اغلب خیال ہے کہ کمری کونہ بھوٹان میں ہے۔

اپنے گھوڑوں کو مار کر کھانا پڑا۔ انہوں نے پل کے دو محرابوں کو برباد کیا ہوا پایا۔ وجہ یہ تھی کہ ان دو امیروں (جن کو پل کی حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا تھا) کے درمیان دشمنی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نااتفاقی کی وجہ سے انہوں نے پل کی نگہبانی اور سڑک کی حفاظت سے بے پروائی برتی تھی۔ اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کامروپ کے ہندو آئے اور پل کو برباد کر دیا۔[1]

جب بختیار پل کے قریب پہنچا تو اس نے اپنی بدقسمتی سے یہ حال پایا کہ دریا کو پار کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور کشتیاں بھی مہیا نہ تھیں۔ ان حالات کے تحت اسے ایک جگہ ٹھہر کر کشتیاں تیار کرانی پڑیں۔ اس (جگہ) کے نزدیک اسے ایک مندر ملا جہاں اس نے پناہ لی۔ اس نے دریا پار کرنے کے لیے اور کشتیاں تیار کرنے کے لیے رسی اور لکڑی کے حصول کا انتظام کیا۔ جب کامروپ کے رائے کو (بختیار کی) ان ناکامیابیوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے مالک کے ہندوؤں کو حکم دیا اور وہ (اس) مندر کے گرد جمع ہونے لگے اور انہوں نے زمین میں نوکدار بانسوں کو گاڑ کر ایک دوسرے سے باندھ دیا اور ایک طرح سے بانسوں کی دیوار بن گئی۔"

بختیار نے جلد اپنا لائحہ عمل طے کیا۔ اس نے احاطہ کو توڑ کر میدانی علاقہ میں پہنچنے کے لیے دھاوا بول دیا۔ دریا کے کنارے پر پہنچنے کے بعد وہ اپنی فوج کے ساتھ کچھ دیر ٹھہرا رہا۔ یکایک کچھ سپاہیوں نے اپنے گھوڑوں کو پانی میں ڈال دیا۔ پانی کچھ ہی دور تک پایاب تھا۔ سپاہی جب آگے بڑھے تو تیرنا (بھی) مشکل ہو گیا اور بہت سے سپاہی ڈوب گئے۔ ہندوؤں نے ان کا تعاقب کیا اور دریا کے کنارے پر قبضہ کر لیا۔ جب بختیار کے سپاہی بیچ دریا میں پہنچے تو وہ سب کے سب غرقاب ہو گئے۔ صرف بختار اور اس کے سو ساتھی بہ مشکل دریا پار کر سکے۔[2]

---

(1) طباتِ 154-55 (2) ڈاکٹر حبیب اللہ لکھتے ہیں کہ اس مہم میں بختیار نے جو راستہ اختیار کیا اور اس کی واقعاتی ضمنی تفصیلات ایک عرصہ سے متنازع فیہ معاملہ بنی ہوئی ہیں۔ گرچہ بردھن کٹی (بردھن کوٹ) ابھی بھی اسی نام سے واقع ہے لیکن دریائے بیگمتی کا تعین مشکل ہے۔ برہم پتر میں شامل ہونے والی برنڈی پر سلہاکو سے اس سنگی پل کی شناخت کی وجہ سے اس راستہ کا ایک عمومی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ گوہاٹی کے سامنے ایک سنسکرت کتبہ، جس میں مارچ 1206ء ایک ترکی فوج کی بربادی کا ذکر ہے، کی حالیہ دریافت نے اس معاملہ کو قطعی طور پر طے کر دیا ہے۔ Foundation (دوسرا ایڈیشن) 76

کنج اور میچ کے قبیلوں کو بختیار کی فوج کی ان مصیبتوں کا حال معلوم ہوا انہوں نے اس کی مدد کرنے کا ارادہ کیا۔ خاص طور سے علی میچ کے قبیلہ والوں نے بختیار کا استقبال کیا اور ریوکوٹ پہنچنے میں ہر طرح کی مدد کی۔ لیکن اس حادثہ نے بختیار کی شہرت اور اس کے مستقبل کو برباد کر دیا۔ جب وہ گھوڑے پر سوار گزر رہا تھا تو مردوں اور عورتوں نے آہ وزاری کی اور اس پر طعن و تشنیع کی بوچھار کی۔ بختیار کو اس قدر رنج و ملال ہوا کہ اس نے گھوڑے پر سوار ہونا بھی ترک کر دیا۔ اس سانحہ کے دوران وہ کہا کرتا تھا کہ شاید سلطان غازی (معزالدین) پر کوئی مصیبت آ پڑی تھی جس کی وجہ سے قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یہ بات صحیح تھی کہ چونکہ تقریباً اسی وقت معزالدین کو دمبارک کے نزدیک قتل کر دیا گیا تھا۔ اس سانحہ نے اس جنگ کی ہمت توڑ دی اور وہ بیمار ہو گیا۔ اس کی مصیبتوں کا حال سن کر اس کا ایک امیر علی مرداں دیوکوٹ آیا۔ بختیار اس وقت صاحب فراش تھا اور تین دنوں سے کسی نے اس کو نہ دیکھا تھا۔ علی مردان اس کے بستر کے قریب گیا اور اس کے منہ پر سے چادر اُٹھا کر اس کے سینے میں خنجر مار دیا۔

معزالدین کی آخری ہندستانی مہم اور اس کا قتل

اندخود میں معزالدین کی شکست، جس کا ذکر ہو چکا ہے، سے اس کی شہرت کو دھکا لگا۔ ساری مملکت میں منحرف عناصر زور پکڑنے لگے اور اس کی مملکت میں بدامنی پھیلانے کی غرض سے اس کی موت کی افواہوں کو ہوا دی گئی۔ حسن نظامی کے مطابق اس کے ایک افسر ایبک بیک نے اندخود کے میدان میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور ملتان پہنچ گیا۔ جہاں اس نے گورنر کا قتل کر کے اپنی مطلق العنانی قایم کر لی۔[1] منہاج (بھی) حسین خرمیل کے دھوکہ سے بھاگنے کا ذکر کرتا ہے۔[2] تاریخ گزیدہ جس کے بیان کی تصدیق کسی اور قبل کی تاریخ سے نہیں ہوتی لیکن جس کو فرشتہ نے دہرایا ہے، کے بیان کے مطابق معزالدین کے ایک افسر الادگز نے اس موقعہ پر غزنی پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔[3]

---

(1) تاج المعاصر، ورق 78، اب جیسا کہ حبیب اللہ اقتباس پیش کیا ہے۔

(2) منہاج، 122

(3) تاریخ گزیدہ، جلد 1، 12-411

ان افواہوں کا اثر ہندستان میں بھی ہوا۔ دو کھوکھر سردار بکن اور سرکھا جو غزنی، لاہور شاہراہ کے علاقہ میں رہتے تھے، نے پورے علاقہ میں ہنگامہ بپا کیا اور لاہور میں قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کی کارروائیوں کی وجہ سے غزنی اور لاہور کے بیچ مراسلات کا سلسلہ کٹ گیا۔ اس خطرے کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے معزالدین خود ہندستان روانہ ہوا تاکہ کھوکھروں سے نپٹ سکے۔ کھوکھر بہادری سے لڑے لیکن ان کو ہرادیا گیا اور پسپا کر دیا گیا۔ معزالدین نے لاہور کے معاملات طے کیے اور ایبک کو دہلی جانے کی اجازت دے کر غزنی کو روانہ ہوا۔ غزنی جاتے ہوئے معزالدین دریائے سندھ پر واقع ایک مقام درمیاک میں ٹھہرا اور دریا کے کنارے ایک ٹھنڈے سبزہ زار میں خیمہ زن ہوا۔ جب وہ مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا تو چند قاتل[1] اس کے خیمہ میں چپکے سے داخل ہو گئے اور 3 شعبان 602ھ / 1202ء کو اس کو قتل کر دیا اور اس طرح فاتح فوج کا ایک جلوس جنازہ میں بدل دیا۔

---

(1) قاتلوں کی شخصیت کے تعین کے متعلق مختلف رائیں پیش کی گئی ہیں۔ طبقاتِ ناصری (24-123) نے فدائی ملاحدہ، جوینی (جلد 2، 81) نے اسمٰعیلی لکھا ہے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ جب قاتلین کو گرفتار کر لیا گیا تو ان میں سے دو کو مختون پایا گیا۔ چونکہ کھوکہر اور اسمٰعیلی دونوں ہی معزالدین کے مخالفین تھے۔ یہ ممکن ہے کہ دونوں نے مل کر اس قتل کا منصوبہ بنایا ہو۔ اس مقام کے تعین کے لیے ملاحظہ ہو، کے اے رشید کے تاریخی مقالات (Historical Dissertation) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کتاب نمبر 30، 58-54

5

ترکی تسلط کی اہمیت

معزالدین کا کردار اور کارنامے

سلطان معزالدین محمد بن سام کے کارناموں کے مختلف جائزے لیے گئے ہیں۔ درحقیقت اکثر اس کے فوجی کارناموں کو موازنہ کے غیر شعور احساس کے ساتھ سلطان محمود کو سامنے رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس عظیم غزنوی فاتح سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وسطی ایشیا کے بڑے پس منظر میں اس (معزالدین) کے کارنامے کم موثر ہیں لیکن "تین عظیم شکستوں، اندخود، ترائن اور انہلوار کے اس ہیرو" جیسا کہ پروفیسر حبیب اس کو کہتے ہیں، کو عہدِ وسطی کی ایک عظیم ترین سلطنت کے قیام کا فخر حاصل ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ یقیناً محمود غزنوی سے بڑھ جاتا ہے۔ بلاشبہ ہندستانی معاشرہ کی کمزوری، جس کا عکس عوام کی سیاسی اور معاشی زندگی میں نظر آتا ہے، نے شمالی ہندستان کی فتح کی راہ ہموار کردی۔ لیکن ہندستان میں ترکی سلطنت کے قیام میں معزالدین کی خدمات کا جتنا بھی اعتراف کیا جائے وہ کم ہوگا۔ صرف ایک دوراس اور ہوشیار فوجی رہنما ہی دریائے آمو سے جمنا تک کے وسیع علاقے میں مہموں کا انتظام کرسکتا تھا۔ اور صرف ایک محتاط اور جرأت مندانہ منصوبہ بندی کے ذریعہ ہی اس کو محکم رکھا جاسکتا تھا۔ شمالی ہندستان کی فتح کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ راجپوت حکمراں طبقوں نے ڈٹ کر اس کی مزاحمت کی۔ معزالدین نے صورتِ حال کی تمام دشواریوں کا استقبال اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور اگرچہ

معزالدین کا زیادہ وقت اپنے وطن میں گزرا لیکن اس کی نظریں ہندستان میں اپنی افواج کی نقل و حرکت میں برابر لگی رہیں۔

تنظیم کی حیثیت سے معزالدین کے متعلق ہمارے ماخذ کچھ بھی نہیں بتاتے لیکن اس عہد کی عمومی سیاسی اور ثقافتی فضا اور معزالدین کے وسائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم بآسانی کچھ نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ مفتوح علاقوں پر براہِ راست حکومت قایم کرنے کے لیے معزالدین کو ذرائع حاصل نہیں تھے۔ اور باتوں سے قطع نظر صرف زبان کا مرحلہ ہی ایک ناقابل حل دشوار تھا۔ سلطان غزنوی نے راوی کے آگے کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں ضم نہیں کیا تھا اور اس لیے وہ علاقے جو معزالدین نے فتح کیے وہاں مسلم انتظامیہ کی کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ لیکن ایک اہم بات سے اس کو بڑی مدد ملی۔ محمود کی جنگی کارگزاریوں کے بعد سے 150 سالوں کے عرصہ میں شمالی ہندستان میں کچھ مسلم نو آبادیاں قایم ہو گئی تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسے مسلمانوں جو دو زبانیں بولتے تھے، کی خدمات معزالدین کو انتظامی معاملات طے کرنے میں ضرور حاصل رہی ہوں گی۔ لیکن ان کی تعداد اتنی مختصر تھی کہ یہ مرکزی، صوبائی اور مقامی انتظامیہ کی ضرورت کے لیے بہ مشکل کافی ثابت ہوئی ہو گی۔

پنجاب سے بنگال تک پھیلے ہوئے وسیع علاقے کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرنے والے عملہ کو کہاں سے مہیا کیا جا سکتا تھا؟ معزالدین کو جس طرح کے لوگوں کی ضرورت تھی وہ غور مہیا نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اعلیٰ کمانوں کی تفویض کے لیے ان کو فنونِ جنگ و انتظامیہ میں عمدہ تعلیم حاصل کیے ہوئے غلاموں پر تکیہ کرنا پڑا۔ لیکن اس کو یہ شعور ضرور تھا کہ ہندستان کے مفتوحہ علاقوں کا براہِ راست انتظام ممکن نہ تھا۔ لیکن اگر وہ بڑے بڑے رایوں کو ختم کر کے دیہی اور قصباتی علاقوں کو چھوٹے چھوٹے رایوں اور راوتوں کے تحت چھوڑ دے تو عوام کی تبدیلی حکومت کا احساس کم ہو گا اور اس کی حکومت قایم رہ سکے گی۔ اس صورتِ حال کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غوری (حکومت) صرف بڑے بڑے اور فوجی اہمیت کے شہروں اور تجارتی راستوں پر قبضہ رکھے۔ اس کے علاوہ معزالدین یہ بھی سمجھتا تھا کہ بڑے بڑے رایوں کا اتحاد اس کے لیے مشکل (مرحلہ) ہو گا۔ اس لیے وہ اس طور پر لڑا کہ وہ آپس میں نہ مل سکیں۔ وہ

بہت سے علاقوں کی جزوی فتح پر ہی قناعت کر گیا اور معاملات کو بہت آگے نہ بڑھایا۔

معزالدین کے کردار کی دو نمایاں خصوصیتیں۔ اس کی راسخ العزمی اور سیاسی حقیقت پسندی تھی۔ ہندستان میں دو مرتبہ اس کو شکست ہوئی۔ انہلوار اور ترائن میں۔ لیکن کوئی بھی شکست اس کے عزم کو پسپا نہیں کر سکتی تھی۔ ایک چھوٹے درجہ اور کم ہمت کا جرنل ان شکستہ کے بعد پنپ نہیں سکتا تھا۔ لیکن معزالدین نے ان شکستوں کو آخری اور قطعی نہ مانا۔ اس نے اپنی فوجوں کو دوبارہ ترتیب دیا اور اپنے مقصد کے حصول کا مصمم ارادہ کر کے پھر آیا۔ اس نے اپنی شکست کی وجوہات کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کیا اور وقت اور حالات کے مطابق اپنی پالیسی کو بدلا۔ جب راجپوتانہ کی جانب سے اس کا حملہ ناکام ثابت ہوا تو وہ اپنا منصوبہ بدلنے میں نہیں ہچکچایا۔ سیاسی طور پر غیر یقینی حالات میں اس نے خود کو نہیں الجھایا بلکہ ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ اپنی طاقت کو اور مستحکم بناتے ہوئے اور تمام باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ جب کہ اس کو اپنے وطن کے نزدیک کئی ایک دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس وقت بھی اس نے اپنے ہندوستانی علاقوں کے معاملات میں غفلت نہیں برتی۔ جب وہ ہندستان میں کھوکھروں کی سرکوبی کر رہا تھا اس وقت ماوراء النہر میں ایک مہم کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور آمور دیار پر ایک پل بنایا جا رہا تھا[1] اور ایک پل جس کا نصف حصہ زیر آب تھا[2] بنایا جا چکا تھا در حقیقت اس کی فوجی منصوبہ بندی گنگا سے ہری رود تک ایک وسیع علاقہ پر محیط تھی۔

غور کی ثقافتی ترقی میں بھی معزالدین کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ در حقیقت وہ اور اس کے بھائی غیاث الدین ہی غور کی ثقافتی طرزِ زندگی میں ایک تبدیلی لائے۔ اس نے مولانا فخر الدین رازی جیسے علماء کے لیے اس پسماندہ علاقہ میں مذہبی تعلیم کی اشاعت کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور غور کو ایک علمی اور ثقافتی مرکز بننے میں مدد دی۔ فن تعمیر کی روایات میں بھی اس نے کچھ قابل ذکر اضافے کیے۔ ایک خاص

---

(1) ابن اثیر، جلد 2، 138 جیسا کہ بارتھولڈ (352) نے اقتباس پیش کیا ہے۔

(2) جوینی جلد 2، 59

قسم کے روغن دار ٹائل (Tile) کو جو غزنی میں پایا گیا ہے۔ یو۔ اسکریٹو (U.S.cretto) معزالدین سے منسوب کرتا ہے۔[1]

معزالدین کے شمالی ہند کے فتح پچر (Wadge) کے نچلے تیز حصہ کی مانند تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ پیش بینی کرنے سے قاصر تھا کہ اس کے مرنے کے چودہ سالوں کے اندر اس کے ہم وطن منگولوں کے ہاتھ مارے جائیں گے۔ اور دہلی ہی اس واحد مرکز کی حیثیت سے ابھرے گا۔ جو منگولوں کی طاقت کو للکار سکے گا۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ایک زبردست، موثر تحریک۔ صوفی سلسلوں کی تنظیم۔ اپنے ابتدائی مرحلہ سے گزر رہی تھی اور منگولوں کی تباہ کاری کے بعد یہ تمام مسلم ممالک پر چھا جانے والی تھی۔ فارسی متصوفانہ شاعری کی ابتدا غزنی حکمرانوں کے تحت غزنی اور ہرات میں ہوئی۔ لیکن شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری (وفات 1230/627) کے ہاتھوں یہ باطنی رموز اور کائناتی تصورات کے اظہار کا ایک ذریعہ بن گئی۔ فیروز کوہ سے کچھ ہی دور وادی ہری رود میں چشت کا شہر تھا۔ جس کی قسمت میں ایک صوفی سلسلہ جس کا نام اس شہر سے منسوب ہے۔ کا گہوارہ بننا لکھا گیا۔ جب معزالدین ہندستان کی فتح کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا اس وقت اس کے وطن کے اہم ترین شہروں غزنی، ہرات، جم چشت، اوش۔ میں لوگ تصوف کے مسائل پر غور کر رہے تھے، اور مسلم معاشرہ کے اخلاقی اور روحانی احیاء کی تیاریاں کر رہے تھے۔

مہموں کے مقاصد

اکثر و بیشتر غوری مہمات میں مذہبی مقاصد تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن تمام دستیاب مواد کا ایک محتاط تجزیہ اس تشریح کی تردید کرتا ہے۔ وہ سپاہی مسلمان ضرور تھے مگر وہ اسلام کے نمائندے نہ تھے۔ مزید براں گرچہ بعض اوقات مذہبی جذبات نے ان کی کارروائیوں پر اثر ڈالا ہوگا لیکن وہ زیادہ تر سیاسی مقاصد سے متاثر تھیں۔ غوریوں نے ہندستان میں اپنے اقتدار کا جال (بالکل) اس طرح پھیلایا

---

(1) ایسٹ اینڈ ویسٹ (East and west) نیا سلسلہ جلد 13 شمارہ 4 روم 1962 میں مضمون بعنوان "غزنی کے روغن دار منقش اسلامی ٹائلز (خشت) 263-87

جس طرح انہوں نے فارس اور وسط ایشیا میں اپنے اقتدار کی توسیع کی کوشش کی۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں (حریفوں) سے ایک ہی طرح لڑے۔ اغلب ہے کہ خواز میں فوج کی طرح، غوری فوج بھی کرایہ پر کام کرنے والوں سے بنی ہو۔ سعدی نے وضاحت کر دی ہے کہ لشکری (پیشہ ور سپاہی) اپنی اجرت کے لیے لڑتے تھے وہ کسی بادشاہ یا کسی ملک یا مذہب کے لیے نہیں لڑتے تھے۔ معزالدین اور اوائل ترکی سلاطین دہلی کا رویہ اس بات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ قطب الدین نے ہندو سواروں[1] کو بحال کیا اور ہندو افسران کو مقرر کیا۔ 1193ء میں ایبک کے ہاتھوں آسی کی فتح اور اس کے انتظامیہ کا ذکر کرتے ہوئے حسن نظامی لکھتا ہے کہ اس نے اس علاقہ اور وہاں کے لوگوں کے امورِ انتظام کے لیے ہر طرف راناؤں کو مقرر کیا۔[2] دہلی اور اجمیر میں انتظامیہ میں اچانک تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ سیاسی ذکاوت نہ کہ مذہبی کٹرپن اور جوش وخروش نے ان کی رہنمائی کی۔ ابن اثیر کے مطابق انہلوار کو بھی اس کے ہندو حکمرانوں کے ہاتھوں واپس سونپ دیا گیا۔[3]

غوری فتوحات کے بعد مذہبی جوش و تعصب کے تحت انتظامی کارروائیاں نہیں کی گئیں۔ انہوں نے مفاد پرستانہ طریقہ پر معاملات کو طے کیا اور کسی مذہبی میلان یا تعصب کے بغیر مصالحتی انتظامات کیے۔ اجمیر کی فتح کے بعد معزالدین نے وہاں کا انتظام خود نہیں سنبھالا بلکہ پرتھوی راج کے بیٹے کو بشرط قبول ماتحتی سونپ دیا۔ جب دہلی فتح ہوا تو کھنڈے رائے کے بیٹے کو اس علاقہ پر حکومت کرنے دیا گیا۔ جب چوہانوں نے پرتھوی راج کے بیٹے کو پریشان کیا تب ایبک نے اس کا علاقہ ضم کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کے عوض اس راج کمار کو رنتھمبور کا علاقہ دے دیا۔

معزالدین کی آخری ہندستانی مہم کے متعلق عطا ملک جوینی کا مندرجہ ذیل بیان سلطان کے ہندستانی مہمات کے مقاصد پر روشنی فراہم کرتا ہے:

---

(1) تاریخ فخرالدین مبارک شاہ، 33

(2) تاج المعاصر ورق 125اب جیسا کہ حبیب اللہ (پہلا ایڈیشن) 252 میں اقتباس پیش کیا ہے۔

(3) الکامل فی التاریخ، جلد 2، 79، لیکن ایک چالوکیہ کتبہ (E.L.)، جلد 1، 22-339-338 جلد 2، 439 اس علاقہ سے ترکوں کے نکالے جانے کا فخریہ اعلان کرتا ہے۔

اگرچہ دونوں سلاطین (شاہ خوارزم اور شہاب الدین) کے درمیان صلح ہو چکی تھی، پھر بھی اپنی پچھلی شکست کا بدلہ لینے کی غرض سے سلطان شہاب الدین غزوہ (یا جہاد[1]) کی تیاریوں کے بہانے ایک فوج تیار کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ 602ھ میں اس نے ہندستان کی مہم شروع کی تاکہ وہ اپنی فوج کو مکمل طور پر تیار کر سکے چونکہ پچھلے چند سالوں میں اس کی کارروائیوں میں اس کی ساری دولت اور سامان خرچ ہو چکا تھا اور اس کے سپاہی بہت بری حالت میں تھے۔ جب وہ ہندستان پہنچا تو ایک ہی فتح جو خدا کی عنایت سے اسے حاصل ہوئی، اس کی مالی حالت درست کرنے کے لیے اور فوج کے سامان مہیا کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔[2]

ترکوں کی کامیابی کے وجوہات

تین ہم عصر مورخین۔ حسن نظامی، منہاج السراج ار فخر مدبر میں سے پہلے دو ہندوستان میں ترکوں کی کامیابیوں کے اسباب کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔ گرچہ انہوں نے ان مہمات کا بیان پیش کیا ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ان کی نظر میں فوجی حکمت عملی، رسید آرائی یا اس طرح کے دوسرے فوجی اسباب کی کوئی اہمیت نہیں "خدائے مطلق نے اسلام کو فتح نصیب کی" "یا بھیم دیو کی فوج کثیر تھی اور اس کے پاس ہاتھی بہت تھے اور جب جنگ ہوئی تو اسلام کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ پڑی۔" اس طرح کے تبصرے (جو یہ مورخین کرتے ہیں) بہت زیادہ دقیع نہیں۔ حسن نظامی کے تبصرات بھی اتنے ہی روایتی اور غیر مفید ہیں۔ فخر مدبر کا ترکی فتوحات بھی اسی انداز کا ہے لیکن اس کی (دوسری تصنیف) آداب الحرب نے اس لحاظ سے زیادہ کار آمد ہے۔ جنگ کے خصوصی آلہ کی حیثیت سے گھوڑوں کا مفصل بیان اور راجپوتوں کی جاگیردارانہ (نوعیت) کی فوج کی اس نے جو مذمت کی ہے وہ ہمیں فوجی نقطہ نظر سے ترکوں کی فوقیت اور ہندستانی فوجوں کی کمزوری کا کچھ اندازہ پیش کرتی ہے۔ ترکوں کی کامیابی کا اس کے علاوہ کوئی ہم عصر تجزیہ نہیں ملتا۔ درحقیقت عہد وسطیٰ کے کسی

---

(1) اس جہاد کا نشانہ وہ قراختائی ترک تھے جنہوں نے معزالدین کو اندخود میں شکست دی تھی۔

(2) تاریخ جہاں گشا، تہران ایڈیشن 11 13، جلد 2، 37

مورخ نے اس سوال کی تشریح پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔

برطانوی مورخین، جنہوں نے عہد وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کو ایک تناظر (Perspective) دینے کی کوشش کی، نے تیرہوں صدی میں مسلمانوں کی کامیابیوں کی وجہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ الفنسٹن لکھتا ہے کہ چونکہ اس (معزالدین) کی فوجیں، سندھ اور آمور کے درمیانی علاقے کی صوبجات سے بھرتی کی گئی تھیں اور سلجوقیوں اور تاتاریوں کی شمالی افواج سے نبرد آزمائی کی عادی تھیں۔ اس لیے ہمیں یہ توقع نہ ہونی چاہیے کہ انہیں فطری طور پر نرم مزاج اور غیر جارحانہ ایک قوم، جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھی اور جس پر ایک غیر امید افزا اور غیر سود مند جنگ زبردستی عاید کر دی گئی تھی، سے کوئی خاص مدافعت پیش آئی ہو گی۔[1] لیکن اس (تشریح) سے اس بات کا سبب نہیں معلوم ہوتا کہ 20-1218ء میں بغیر کسی خاص جنگ کے تمام مسلم علاقے کس طرح منگولوں کے زیر اقتدار آ گئے۔ اس کے علاوہ الفنسٹن اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ راجپوت، جن سے ترکوں کا مقابلہ ہوا، وہ بہادری ہمت اور جنگ بازانہ فطرت میں کسی طرح ترکوں سے کم نہ تھے۔

سر جادو ناتھ سرکار نے مسلم کامیابیوں کے اسباب کا مندرجہ ذیل تجزیہ پیش کیا ہے۔

اسلام نے (جیسا کہ ایچ۔ اے ایل فیشر نے بتایا ہے) اپنے پیروؤں کو تین مخصوص صفات عطا کی تھیں۔ یہ فیضان اور کسی دوسرے مذہب کی جانب سے اس کامیاب طور پر نہیں ہوا۔ ان صفات نے فطری طور پر جنگ باز عربوں، بربروں، پٹھانوں اور ترکوں کو مزید فوجی اہلیت بخشی۔ یہ (صفات) مندرجہ ذیل تھیں۔ اوّل قانونی حیثیت اور مذہبی سہولتوں کے لحاظ سے مکمل مساوات اور معاشرتی استحکام۔ اس طور پر ذات اور نسل کے تمام امتیازات ختم ہو گئے اور یہ فرقہ ایک وسیع خاندان کے افراد اور بھائیوں کی طرح متحد ہو گیا۔ دوئم۔ عقیدہ قضا و قدر کا قائل ہونا (Fatalism) جس کی اصل بنیاد خدا پر مکمل بھروسہ اور یہ اعتقاد تھا کہ اللہ کی مرضی تمام انسانی کوششوں پر فوقیت رکھتی ہے اس کی وجہ سے جنگ میں موت کا ڈر ختم ہو گیا۔ سوئم۔

---

(1) ہسٹری آف انڈیا، 361

شراب نوشی سے نجات۔ قرآن کے حکم کے مطابق مے خوری ایک گناہ ہے۔ اور اس جرم کی سزا مسلم ممالک میں ریاست پر عاید ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف شراب نوشی راجپوتوں، مراٹھوں اور دوسرے ہندو فوجیوں کی خاص لعنت تھی اور اس نے ان کو دور میں فوجی منصوبہ بندی، اچانک حملوں اور خود اپنے فوجی ٹھکانوں کی حفاظت کرنے کے قابل نہ رکھا۔[1]

شمالی ہندستان پر ترکوں کی فتح کے متعلق مختلف تشریحات اور مختلف نظریات پیش کیے گئے۔ تاریخی حقائق اس دعویٰ کی تصدیق نہیں کرتے کہ ہندستانیوں کو ان کی امن پسندی اور جنگ سے احتراز کے سبب شکست ہوئی۔ جنگ ایک راجپوت کا ''پیشہ'' تھی اور پوری بارہویں صدی آپسی تنازعات، جنگوں، تصادم اور مقابلوں کی ایک طویل داستان ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی سرگرمی میں ترکوں کی کامیابی کی وجہ ڈھونڈنا بھی انتہائی غیر تاریخی ہوگا۔ اوائل عرب فاتحین کا مذہبی جوش و خروش اب ان لوگوں کی زندگی میں ایک ولولہ انگیز محرک کی حیثیت سے باقی نہ رہا تھا۔ درحقیقت بہت سے ترکی قبیلے جو اس وقت ہندستان آئے وہ مکمل طور پر مسلمان نہ ہو پائے تھے اور ان کے اکثر سرداروں کو اس مذہب کے متعلق بہت سطحی واقفیت تھی۔ یہ باتیں اس امکان کو کلی طور پر ختم نہیں کر دیتی ہیں کہ جب ترکوں کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہوا جس کے افراد اداروں میں اکثریت پرستانہ (Polytheistic) اور اصنام پرستانہ طریقے رائج تھے تو انہوں نے مذہبی جذبات، خواہ وہ کتنے ہی خام نوعیت کے ہوں کو ابھارنے کی کوشش نہ کی ہوگی۔ لیکن محض یہ ایک ''وقتی کیفیت'' رہی ہوگی نہ کہ ''مستقبل مقصد'' یا ان کی مہموں کے لیے ایک ولولہ انگیز محرک۔

ہندستانیوں کی شکست کی اصلی وجہ ان کے سماجی معاشرہ اور ان غیر منصفانہ ذات پات کی ممنوعات اور امتیازی برتاؤ نے تمام احساس اتحاد معاشرتی اور سیاسی کو ختم کر دیا تھا۔ مذہب بھی محض ایک خاص گروہ کی اجارہ داری بن کر رہ گیا تھا اور ہندستانی

---

(1) ہسٹری آف انڈیا، 26

عوام کی اکثریت واونچی ذات والوں کے مندروں کے اندرونی حصوں کی ایک جھلک بھی نصیب نہ تھی۔ لہٰذا ہندستانی عوام کی بڑی تعداد کے لیے ایسی کوئی شے نہ تھی جو ان کے اندر جذبہ حب الوطنی کو اس صورت میں ابھارتی جب ان کا مقابلہ غوری حملہ آوروں سے ہوا۔ وہ ایک بیزاری اور بے توجہی کے ساتھ ہندستانی حکمراں طبقہ کی قسمت کا تماشہ دیکھتے رہے تھے۔ لہٰذا پکے ہوئے پھلوں کی طرح شہر (حملہ آوروں کے آگے) گرتے گئے صرف قلعہ بند مقامات نے کچھ مقابلہ کا۔ لیکن وہ بھی اس وقت بے بس ہو گئے جب دشمنوں نے اس آس پاس کے کھلے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اگر حکمراں طبقہ نے اپنے دفاعی منصوبوں کے لیے عوام کی حمایت حاصل کر لی ہوتی تو یہ تمام قلعے ان کی فوجوں کو ایک واحد ریاستی مرکز (Stat Centre) میں منضبط کر کے ایک بڑے فعال نوعیت قلعہ بند فوجی اڈے کی حیثیت سے کام آتے۔ لیکن مروجہ معاشرتی حالات کے تحت یہ قلعے دفاعی اعتبار سے بے کار بن گئے اور خود اپنے آس پاس کے علاقوں کی محافظت بھی نہ کر سکے۔

ذات کے نظام نے راجپوتوں کی فوجی کارکردگی پر کاری ضرب لگائی۔ چونکہ جنگ صرف ایک طبقہ کا پیشہ بن گئی تھی اس لیے (فوج میں) بھرتی مخصوص قبیلوں اور ذات کے لوگوں سے ہوتی تھی۔ آبادی کے ایک بڑے حصہ کو فوجی تعلیم سے محروم رکھا جاتا تھا۔ چھوت کے اصول کی وجہ سے سپاہیوں کے درمیان مختلف طرح کے کاموں کی تقسیم ممکن نہ تھی اور ایک ہی شخص کو شمشیر زنی سے لے کر پانی بھرنے تک کے سارے کام کرنے پڑتے تھے۔

خالص فوجی نقطہ نظر سے ہندستانی فوجیں وسطی ایشیا میں فن حرب کی جدید ترقیوں سے پوری طرح واقف نہ تھیں۔ اس حقیقت کے علاوہ کہ جاگیردارانہ فوجی دستے، جن پر بارہویں صدی کی ہندستانی فوج مشتمل تھی۔ بڑی ہندستانی فوجوں کو مختلف العناصر (Heterogeneous) نوعیت کا بنا دیتے تھے اور ان کے جذبہ وفاداری کو منتشر کر دیتے تھے۔ ان اصولوں میں بھی بنیادی فرق تھا جن کے مطابق ہندستانی اور ترکی فوجیں منظم کی جاتی تھیں اور میدانِ جنگ میں لڑتی تھیں۔

حرکت پذیری (Mobility) اس وقت کی ترکی فوجی تنظیم کا بنیادی عنصر تھا۔ یہ

گھوڑوں (کی اہمیت) کا زمانہ تھا اور تیزی سے نقل و حرکت کرنے والی مسلح گھوڑسوار فوج اس وقت کا تقاضہ تھا۔ ہندستانی فوجی حکمت عملی جسامت اور وزن کو حرکت پذیری پر ترجیح دیتی تھی۔ راجپوت کی نقل و حرکت کے ساتھ حملہ کرنے کے بجائے دشمن کو کچل دینا بہتر سمجھتے تھے۔ کثیر التعداد اور غیر منضبط صفیں، جن کے آگے آگے بھڑکیلے سازوسامان سے سجے ہوئے ہاتھی ہوتے تھے، جب ایک تیز رفتار گھوڑسوار فوج، جو گھوم کر دشمنوں کے داہنے اور بائیں جانب یا عقب سے حملہ کر سکتی تھی، کے مدمقابل ہوتے تو ان کی قطعی شکست لازمی تھی۔

تیز نقل و حرکت کی صلاحیت کا ہندستانی فوج میں مکمل فقدان تھا۔ سر جادوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ "ان سرحدپار حملہ آوروں کے اسلحے اور گھوڑے انہیں ہندستانیوں پر فیصلہ کن فوقیت عطا کر دیتے تھے۔ ان کے اسباب بھی تیز رو اونٹوں پر لائے جاتے تھے جن کو چارہ کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی اور جو راستہ میں ملنے والے درختوں کی پتیوں اور جڑوں پر گزار کر لیتے تھے اس کے برخلاف بنجاروں کے زیر انتظام بیلوں پر لدا ہوا ہندوؤں کا محکمہ سست رفتار اور تکلیف دہ تھا۔[1]

حرکت پذیری کے بعد، جیسا کہ آر۔ سی اسمٰعیل[2] نے بتایا ہے ترکوں کے فن جنگ کی دوسری خصوصیت ان کی تیر اندازی تھی۔ وہ گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے اور حرکت کرتے ہوئے تیر چلاتے تھے۔ یہ بات بھی ان کو سست رفتار راجپوت فوجوں پر مزید فوقیت بہم پہنچاتی تھی۔

ترکی فتح کا اثر

شمالی ہندستان پر غوریوں کی فتح تدریجاً لیکن یقیناً ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں اہم تبدیلیاں لائی۔ اس نے اس مختلف الریاستی نظام (Multi-state) جو کہ گیارہویں اور بارہویں صدی میں ہندستان کی سیاسی زندگی کی اہم خصوصیت بن گیا تھا، کے اختتام کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اوائل ترک سلاطین کا

---

(1) ایضاً، 26

(2) Crusading Warfare, A Contribution to Medieval Military History, 80-81

سیاسی مطمع نظر ایک مرکزیت پسند سیاسی تنظیم تھی جس کی دیکھ بھال ایک مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھوں میں ہو۔ جاگیریت، مع اپنے دو بنیادی تصورات۔ انتظامیہ میں مقامیت (Localism in administration) اور جاگیرداری امیروں کا قوانین سے حق استثنا۔ اس نئے سیاسی نظام کے لیے موزوں نہ تھی اور اس لیے اس کے خاتمہ کے لیے موثر اقدام کیے گئے۔ مختلف علاقوں کی جاگیردارانہ روایات کے اختتام کے لیے اور سلطنت کے دور دراز علاقوں کو ایک مرکز سے متحد کرنے کے لیے اقطاع کا ادارہ استعمال کیا گیا۔

صدیوں سے ہندستان کے رائے ایک دوسرے سے ہر موسم سرما میں لڑتے آئے تھے (دشمن کے) قتل کی شہرت یا جذبہ جانبازی کے علاوہ ملک کا انتظامی اتحاد ہی اس "خون دولت کی بربادی" کا جواز ہو سکتا تھا۔ لیکن ہرش کے بعد کوئی بھی ہندستانی حکمراں شمالی ہندستان کو انتظامی یکجہتی نہ دے سکا تھا۔ اور اب بیرونی حملہ آوروں نے ایک پشت کے اندر وہ کام کر دکھایا تھا جس کو ایک ہندستانی حکمراں کو پانچ یا چھ سالوں قبل (خود) کر لینا چاہیے تھا۔ انہوں نے شمالی ہندستان کے مرکزی علاقہ میں جو علاقہ آب و ہوا کے اعتبار سے بہت مناسب نہ تھا، ملک کا ایک دارالسلطنت قایم کیا اور تبرکاً وہاں ایک مینارہ نصب کیا۔ بڑے بڑے شہروں کو اور شاہراہوں کو شہر دہلی کے زیر اختیار کر کے انہوں نے ملک کے لیے ایک ہندستان گیر انتظامیہ کا ڈھانچہ بھی تیار کیا۔ غوریوں اور ترکوں کو (برخلاف ان رایوں کے جن کی جگہیں انہوں نے لے لی تھیں) ایک آسانی یہ تھی کہ انہیں ایک شہنشاہی (یا بڑے علاقہ پر محیط) انتظامیہ کے بنیادی حالات سے شناسائی حاصل تھی۔ اعلیٰ درجہ کے شاہی نوکروں کے لیے ایک ہندستان گیر سلسلہ ملازمت اور اس کے تحت، بادشاہ کی مرضی اور امراء کے ساتھ محتاط مشوروں کے مطابق ان کی تقرری، تبادلے، ترقیاں اور معزولیاں۔ اس قسم کے تصورات پرتھوی راج سوئم کے لیے اپنے ماتحت رایوں کے ساتھ ممکن نہ تھے۔

شمالی ہندستان میں ایک مرکزیت پسند بادشاہت نے سیاسی افق کا رنگ بدل دیا۔ سیاسی نقطہ نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور علیحدگی پسندانہ رجحانات سمٹنے لگے۔ سر جادو ناتھ تبصرہ کرتے ہیں۔

”ہندستان اور بقیہ ایشیائی ملکوں کے درمیان جو گہرے تعلقات بدھ مذہب کے اوائل دور میں قایم ہوئے وہ آٹھویں صدی عیسوی میں، جب کہ ہندو معاشرہ کی ازسرنو تنظیم ہوئی اور اسے پکی عمارت کی طرح بے لوچ بنادیا گیا، منقطع ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان محو باالذات بن کر رہ گیا اور اپنے فطری حدود کے باہر کی ترقی پذیر دنیا سے کٹ گیا۔ بقیہ ایشیا اور افریقہ کے قریبی علاقہ جات سے اس (منقطع) تعلق کو بارہویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کی فتح نے پھر سے قایم کیا[1]۔۔۔“

شمالی ہندستان پر ترکوں کی فتح کا ایک دوسرا اہم پہلو وہ ہے جسے پروفیسر حبیب نے شہری انقلاب[2] (Urban revolution) کا نام دیا ہے۔ راجپوتوں کے عہد کے شہر جن میں صرف اونچی ذات کے لوگ ہی رہ سکتے تھے۔ (Caste-Cities) اب ہر طرح کے لوگ اونچے اور نیچے مزدور اور کاریگر، ہندو اور مسلمان، چنڈال اور برہم کے لیے کھل گئے۔ ترکی حکومت نے ذات کے نظام کو معاشرتی درجہ بندی یا شہری زندگی کی بنیاد تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اجرت کمانے والا طبقہ، مزدور کاریگر، ذات سے باہر کے لوگ اور غیر سہولت یافتہ طبقے نے حکومت کے ساتھ بخوشی تعاون کیا۔ درحقیقت اوائلی ترکی سلاطین کی اصلی طاقت وحمایت ان ہی شہروں میں تھی جنھوں نے اپنے کل مزدور طبقہ کی محنتوں کا فاضل سرمایہ (Surplus) حکومت کے ہاتھوں سونپ دیا۔

فوجی اعتبار سے ترکی تسلط کا اثر ہندستانی فوجوں کی نوعیت اور مسافت میں تبدیلیوں اور ان کی بھرتی اور خبرگیری کے (نئے) طریقوں میں ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ جنگ اب کسی ایک ذات یا طبقہ کی اجارہ داری نہ رہی اور فوج میں داخلہ اب ان تمام مناسب طور پر تربیت یافتہ سپاہیوں کے لیے کھل گیا تھا جو جنگ کی صعوبتیں برداشت کرسکتے تھے۔ اس طرح ایسی ہندستانی فوج وجود میں آئی جن میں جنگی جوہر اب مختلف ذرائع سے، بلا کسی تفریق ذات اور رنگ و مذہب مہیا ہوتے تھے۔ جاگیردارانہ دستوں کا طریقہ اب ترک کردیا گیا اور مرکزی انتظام کے تحت اور مرکزی طور پر بھرتی کی ہوئی

---

(1) India through the Ages، 43

(2) ایلیٹ اور ڈاؤسن کی تاریخ ہند، جلد 2، کا دیباچہ

اور تنخواہ پانے والی ایک مستقل فوج قایم کی گئی۔ اس طرح فن حرب میں بھی ترکوں نے جلد ہی ہندستان کو مرکزی ایشیا کی طاقتوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ اب پایکوں کی جگہ سواران مقاتلہ (شہ سوار جنگ باز) نے لے لی۔ اور جسامت اور وزن سے کچل دیئے کی جگہ اب تیز رفتار اور ضرب لگانے کی صلاحیت فوجی تنظیم کی بنیاد بن گئی۔[1] در حقیقت صرف یہ نئے طور پر منظم ہندستانی فوج ہی ملک پر (آئندہ) منگولوں کے حملوں کا مقابلہ کر سکی۔

باہری دنیا سے دوبارہ تعلقات قایم ہونے اور نئے مزدور طبقہ کے شہروں کے عروج سے تجارت کو فروغ ہوا۔ طرز قانون، طریقہ محصولات اور اسکول کے ایک مرکزی نظام نے تاجر کے دائرہ آمد و رفت کو بڑھایا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کی سہولت مہیا کی۔

ایک اور پہلو جو ترکی فتح سے متاثر ہوا وہ انتظامیہ کی زبان تھی۔ راجپوتی عہد میں انتظامیہ اور دیگر مقاصد کے لیے جو زبان مستعمل تھی وہ مختلف علاقوں میں الگ الگ تھی۔ تمام غوری مملکت کی انتظامیہ کی اونچی سطح پر فارسی کے استعمال کی ابتدا نے انتظامیہ کی زبان میں یک رنگی پیدا کی۔ ترکوں کے فیضان کے اس پہلو سے متاثر ہو کر امیر خسرو نے کہا۔

"لیکن تمام ہندستان میں دریائے سندھ کے کناروں سے لے کر سمندر تک فارسی گفتار یکساں طور پر رائج ہے، ایسی عظیم زبان ہمارا ذریعہ اظہار ہے۔۔۔ اور ہماری یہ فارسی اصلی فارسی (دری) ہے۔ ہندستانی مقامی زبانیں ہر ایک سو کروہ پر بدل جاتی ہیں لیکن فارسی زبان ہزار فرسنگ کے علاقہ میں یکساں ہے۔۔۔ یہی وہ فارسی زبان ہے جس میں الفاظ کا تلفظ ان کے املے کے عین مطابق ہے۔[2]

قبل کے ایک باب میں ترکی حملوں کی شروعات کے وقت ہندستان میں مسلم نوآبادیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ترک فاتحین کا ان مسلم نوآبادیات کی جانب کیا رویہ تھا اور ترکوں کی جانب ان کا کیا انداز تھا۔ ہمارے مآخذ اس سوال پر خاموش ہیں لیکن امیر

---

(1) نظامی کی مذہب سیاست کے چند پہلو بھی ملاحظہ کریں۔ 86-87

(2) دیباچہ، دیوان غرۃ الکمال (قیصری پریس، دہلی) 33

خسرو دکن کے مسلمانوں کے رویہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جب علاؤالدین کی فوج نے ملک کافور کی سرکردگی میں رائے ویرپانڈیہ کے علاقوں پر حملہ کیا تو مسلمانوں نے جو اس کی ملازمت میں تھے، حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ لیکن جب رائے نے خود فرار ہونے کا تہیہ کیا تو اس کے مسلمان سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنا پڑا۔[1] شمال کے مسلمانوں کے (رویے) کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اگر انہوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ یا ان کی مدد کی ہوتی تو اس بات کا کچھ ذکر ضرور ملتا۔ چونکہ ہندستانی مسلمان عام طور پر رائے کی ملازمت میں نہ تھے اس لیے ہمارے مآخذ کی خاموشی سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ انہوں نے اس جنگ میں کسی جانب سے بھی کوئی حصہ نہ لیا اور یہ کہ ان کو کسی خاص اہم عہدے پر تقرری کے قابل نہ سمجھا گیا۔ اوائل ترک سلاطین کے دور میں اس اصول سے الگ ایک ہی مثال ملتی ہے اور وہ ہے عماد الدین ریحان۔ لیکن اس کا مختصر عروج اور زوال اس حقارت کی شہادت دیتا ہے جو ترک غلام، افسران، ہندستانی قبائلی کے افراد کی جانب اختیار کرتے تھے۔ پھر بھی دہلی سلطنت کا کام ان کی خدمات کے بغیر چلنا مشکل تھا۔ وہ طبقے جن میں سے سپاہی اور گھوڑ سوار بھرتی کیے جاتے تھے ان میں ہندستانیوں کا قطعی ذکر ملتا ہے اور اس فقرہ کے معنی میں ہندستانی مسلمان ضرور شامل ہوں گے۔

ہم لسانی مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ موجودہ ہندستان کی تقریباً تمام ریاستی (سرکاری) زبانیں عہد وسطیٰ میں فروغ پائیں۔ التتمش کے عہد میں عوام کی بول چال کی زبان ہر تین چار ضلعوں کے بعد بدل جاتی تھی۔ ترکی زبان ابھی بالکل خام تھی اور عربی بہت کم لوگ جانتے تھے۔ ہندستان کے ہنود ایک دوسرے کے خیالات کو صرف سنسکرت کے ذریعے سمجھ سکتے تھے۔ دہلی کی حکومت کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ فارسی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرے۔ لیکن ہندستان کی مقامی زبانیں صرف وہ لوگ ہی جانتے تھے جن کی مادری زبان تھی یا جو اس علاقہ میں بہت مدت تک رہ کر انہیں سیکھ چکے تھے ان (ترکوں) کے پاس نہ تربیت یافتہ معلم تھے نہ لغت اور نہ صرف و نحو کی کتابیں یہ ناقابل تصور معلوم ہوتا ہے کہ ہندستانی

---

(2) ایم حبیب، ترجمہ خسرو کی خزائن الفتوح، ترجمہ 90

مسلمانوں کو بڑے پیمانہ پر مترجموں کی حیثیت سے استعمال کیے بغیر کس طرح اوائل ترکی سلاطین کی حکومت پورے شمالی ہندستان پر عمل داری کر سکی ہوگی۔ شروع میں ان ہی کی ایک ایسی جماعت تھی جو دو زبانیں جانتی تھیں۔[1]

بارہویں صدی میں ہندستان کی صورتِ حال پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے یہ ناقابل گریز حقیقت سامنے آتی ہے کہ ذات کا نظام اور چھوت کے تصور نے ہی ملک کی ترقی روک رکھا تھا۔ اور معاشری افراتفری (Social anarchy) مچار کھی تھی اور سیاسی اعتبار سے ملک کو مختلف العناصر (Political heterogeneity) بنا رکھا تھا۔ ترکی تسلط سے اس نظام کو ایک شدید جھٹکا دیا اور اسے فطری طور پر ان عناصر کی حمایت حاصل ہوئی جو ماقبل معاشرتی نظام کے تحت مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ ہندستانی عوام کی ترکی حکومت کی قبولیت اور اس سے رضامندی کا اعتراف کیے بغری ہندستان میں ترکی حکومت کا طویل المدت قیام اور اس کے سیاسی اثرات کے دائرہ کا تقریباً مسلسل پھیلاؤ ناقابل توجیہہ بن جاتا ہے۔ اگر ہندستانی عوام نے ان کی حکومت کے قیام کی مخالفت کی ہوتی تو غوری ہندستانی علاقہ ایک انچ زمین پر بھی قبضہ قایم نہ رکھ سکتے تھے۔

---

(1) جب دہلی سلطنت قدرے مستحکم ہوگئی تو حالات بدل گئے، فارس میں رہنے والے ہندستانیوں کے مشاہدے پر انحصار کرتے ہوئے پروفیسر حبیب یہ قیاس آرائی کرتے ہیں۔ "عام بول چال کی فارسی کا علم شمالی ہندستان کے رہنے والوں کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ فارسی افعال ہندستانی زبانوں کے افعال سے مختلف ہیں لیکن اسموں کی ایک مختصر تعداد مشرک ہے اور جملوں کی ساخت بھی ملتی جلتی ہے۔ ان پڑھ مسلمان (خواہ ہندو یا مسلمان) کو اگر فارس لے جایا جائے اور اسے ایک خالص فارسی ماحول میں رہنا پڑے تو وہ چھ یا سات ہفتوں کے اندر فارسی کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ علاؤ الدین کے عہد کی دہلی کا ایک ہندو بغیر زیادہ محنت کے پانچ یا چھ مہینوں میں فارسی بولنا سیکھ سکتا تھا۔ Political Theory of the
129-30-Delhi Sultanate

تیسرا باب

دہلی کے ابتدائی ترکی سلاطین

1

سلطان قطب الدین ایبک

سلسلہ سلاطین: تسمیہ کا مسئلہ

ہماری فارسی تاریخیں سلاطین کے اس سلسلہ کو جس نے تیرہویں صدی میں ہندستان پر یا اس کے کچھ حصوں پر حکومت کی، معزی (جس میں مشرق میں قباچہ اور مغرب میں خلجی شامل ہیں)، قطبی، شمسی اور بلبنی میں تقسیم کرتی ہیں۔ اگرچہ یہ تقسیم شجر تا صحیح ہے لیکن یہ اس تسلسل کو نظر انداز کر دیتی ہے جو اس عہد حکومت کی مختلف ادوار میں پنہاں ہے۔ جدید مصنفین انہیں 'پٹھان'، 'غلام بادشاہ' ابتدائی ترکی سلاطین' 'ترکی مملوک' اور 'البری' کے نام سے موسم کرتے ہیں۔ چونکہ وہ لوگ پٹھان یقینی نہ تھے لہٰذا اس نام کے استعمال کا کوئی جواز نہیں۔ نیز یہ کہ چونکہ وہ لوگ تقریباً ہمیشہ تخت نشینی سے قبل آزاد کر دیے گئے تھے لہٰذا انہیں 'غلام بادشاہ' کے نام سے پکارنا صحیح نہیں۔ "مملوک" کی یہ اصطلاح بہتر لگتی ہے کیونکہ اس اصطلاح میں ایک ایسے غلام کے معنی پنہاں جو آزاد والدین سے پیدا ہوا ہو لیکن اس میں بھی غلامی کا مفہوم بہر حال موجود ہے۔ سلطنت دہلی کا حقیقی بانی شمس الدین، التمش ایک البری ترک تھا لیکن ایبک نہ تھا۔ بلبن نے البری ترک ہونے کا دعویٰ کیا تھا لیکن اس موضوع پر منہاج جو اس کا سرکاری مورخ ہے، کا قلم اتنا محتاط ہے کہ اس کا بیان ایک تردید کے مترادف ہے۔ ہمیں بلبن کے البرائی ہونے کا دعویٰ کو ایسا ہی سمجھنا ہو گا جیسا کہ اس کا دیومالائی افراسیاب کا خلف، ہونے کا دعویٰ۔ اس طرح مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ مذکورہ بالا چاروں سلسلہ سلاطین کے تمام ہندستانی حکمرانوں کے

لیے 'ابتدائی ترکی سلاطین' استعمال کی جائے۔

حکمراں طبقہ

شاہی سلسلہ سلاطین کے بعد حکمراں طبقہ کا سوال سامنے آتا ہے۔ حکمراں طبقہ کے اجارہ دارانہ کردار اور اس عہد کے مخصوص طوائف الملوکی رجحانات کی وجہ سے 1206-90ء کا عہد ایک وحدت کا حامل ہے۔ سب سے پہلے معزالدین غوری نے اپنے ہی خاندان والوں اور غور کے قبائلی سرداروں میں سے اپنے اعلیٰ عہدیداروں کی تقرری کی لیکن ان لوگوں نے اس کی توقعات کو پورا نہیں کیا اور (طبقات ناصری) کے مطابق اس نے اپنے ایک سابق افسر سے یہ کہا کہ اس کی امیدیں اس کے غلاموں سے وابستہ تھیں۔ صرف وہی اس کی دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کی ذمہ داریوں کو نبھا سکتے تھے۔ اندخود کی جنگ میں اس نے کچھ فوجی دستوں کو آزاد غوری افسروں کی ماتحتی میں رکھا تھا اور اپنے غیر متوقع قتل کے باعث وہ اپنے جانشین کے سلسلہ میں کوئی ہدایت نہ دے سکا۔ اقتدار کی رسہ کشی جو ایک طرف معزالدین کے خاندان والوں اور ان کے حامیوں اور دوسری طرف بلدوز کی رہنمائی میں اس کے ترکی غلام افسروں کے مابین ہوئی اس کا تذکرہ بعد میں کیا جائے گا۔ اس سرزمین میں جو آج افغانستان کے نام سے مشہور ہے۔ ترک غلام افسروں کی جیت زیادہ دنوں تک باقی نہ رہی کیوں کہ چھ یا سات سالوں کے اندر ہی علاؤالدین خورازم شاہ نے وہ علاقہ فتح کر لیا اور اسے اپنے سب سے بڑے لڑکے جلال الدین منکبرنی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح دونوں غوری بھائیوں کے موروثی اور مفتوحہ تمام علاقہ جات میں صرف ہندستانی علاقہ معزالدین کے وارثوں کے ہاتھ میں رہ سکا۔

جہاں تک حکمراں طبقہ کا تعلق ہے ضیاء الدین برنی، بلبن کی تخت نشینی کے پہلے کے دور کو دو حصوں میں منقسم کرتا ہے اگرچہ ایک التتمش خود غلام افسران میں سے تھے لیکن انہوں نے غلام افسران اور معزز خاندانوں کے ان ترکوں اور ایرانیوں کے درمیان جو اونچے عہدے پر فائز ہونے کی امید پر ہندستان آئے تھے، ایک قسم کا توازن قایم کیا۔ یہ بات شاہی مفاد میں تھی کہ تمام اعلیٰ عہدے ایک ایسے اجارہ دارانہ

(نوعیت کے) طبقہ کے ہاتھوں میں نہ آ جائیں جو بادشاہ کے تمام حقیقی اختیارات کو سلب کر لینے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن 1218ء میں چنگیز خاں نے ترکستان اور ماوراالنہر پر حملہ کیا۔ دو سال بعد ہی وہ سندھ کے کنارے تک جا پہنچا اور افغانستان (ہرات سے غزنی تک) اس کے افسروں کے قدموں میں آ گیا۔ منگولوں کے طریقہ عمل کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ کوئی مسلمان اس علاقہ سے نہ بھاگ نکلے جسے انہوں نے قتل عام کا نشانہ بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس لیے ترکی اور ایرانی مہاجرین کا بری راستہ سے ہندستان بھاگ جانا مشکل تھا سوائے اس کے کہ وہ بروقت بھاگ نکلیں۔ لیکن چنگیز خاں کے افسران نے اس بڑے ایرانی ریگستان (دشت لوت یا دشت کویر) کو کبھی پار ہی نہ کیا جو ملک کو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کرتا ہے لہٰذا جنوبی ایران گرچہ دہشت زدہ تھا مگر وقتی طور پر دخل اندازی سے محفوظ رہا۔ خلیفہ اور بغداد کے شہریوں کو بھی ایک خیالی تحفظ میں رکھنے کا موقع دیا گیا۔ اس لیے جنوبی ایران سے ہندستانی بندرگاہوں تک کچھ مہاجرین کی آمد ممکن تھی۔

التتمش کے خلاف اس کے بیٹے اور پوتے نااہل تھے۔ برنی[1] لکھتا ہے کہ شریف النسل افسران کی موجودگی میں زر خرید غلام افسروں کی عزت کی کسے پرواہ ہوگی؟ التتمش کے انتقال کے فوراً بعد ترکی غلام افسران ان تمام افسروں کا صفایا کرنے اور انہیں مار ڈالنے کے لیے متحد ہو گئے جو ان کے گروپ کے نہ تھے۔ اور چونکہ بادشاہ نے یہ محسوس کیا کہ اس کی کارکردگی، آزاد افسران کی، کم از کم ایک اقلیت پر منحصر تھی۔ لہٰذا ان لوگوں نے خود بادشاہ کے اختیارات پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی اور اس تجربے کے دوران انہوں نے یکے بعد دیگر بادشاہوں کا قتل کیا۔ لازماً ملک میں ابتری پھیل گئی ہر ترکی غلام افسر نے (جیسا کہ برنی لکھتا ہے) اپنے ساتھی افسران اور ملک و بادشاہ دونوں ہی کو نظر انداز کر کے اعلان کیا کہ ”میں اور کوئی دوسرا نہیں“ طوائف الملوکی کا اس وقت دور دورہ تھا جبکہ ترکی غلام افسران آپسی جنگ میں مبتلا تھے۔ اسی اثنا میں ہدورایوں نے ان قلعوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جنہیں وہ التتمش کے دورِ حکومت میں کھو بیٹھے تھے۔ ملک کی شاہراہیں غیر محفوظ ہو گئیں اور میواتیوں نے دہلی کے

---

(1) تاریخ فیروز شاہی، ص: 27-28، پورے اقتباس کا ترجمہ آگے دیا ہوا ہے۔

مضافات میں لوٹ مار مچادی۔

اس دوسرے دور کی بہت ہی زیادہ سرگرم اور سازشی ہستیوں میں سے ایک بہاء الدین ہے جس کے کردار کا مطالعہ مناسب جگہ پر کیا جائے گا۔ التمش کے انتقال کے وقت وہ ایک معمولی غلام افسر تھا۔ لیکن ہمیں آزاد افسروں اور بادشاہوں کے خلاف ہر سازش میں اس کا ہاتھ ملتا ہے۔ اگرچہ وہ ''چھوٹا بلبن'' (بلبن خرد) کی حیثیت سے مشہور تھا لیکن جب التمش کا پوتا ناصر الدین محمود بادشاہ ہوا تو اصل اقتدار بلبن ہی کے ہاتھوں میں تھا۔ واقعی اقتدار کے استعمال کے لیے محمود کی ساری کوششوں کو ناکام بنادیا اور بالآخر اسے زہر دے کر خود تخت پر متمکن ہو گیا۔ لیکن بادشاہ کی حیثیت سے اس نے اپنی اس پالیسی کو کالعدم کرنے کی کوشش کی جس پر وہ چلتا آیا تھا۔ زہر کا پیالہ اور قاتلوں کا چاقو ترکی غلام امراء کے ان لیڈروں کے خلاف آزادانہ طور پر استعمال کیا جاتا تھا جو اس کے عم زاد بھائی شیر خاں کی طرح شاہی اختیارات کے مکمل استعمال میں رکاوٹ تھے۔ یہ بات بلا تکلف تسلیم کی جانی چاہئیے کہ بلبن ایک بہترین اداکار تھا اور وہ اپنے ناظرین کے دل کو موہ لیا کرتا تھا جس طرح ایک جدید فلم اسٹار سکندر، جولیس سیزر اور نپولین کی نقل اتار کر ہم لوگوں کو وقتی طور پر مسحور کر دیتا لیکن جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو ہم لوگ فطرتاً یہ پوچھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ سب کیا تھا؟ مملکت دہلی کے مسلمہ حدود کے اندر باغی قبائل کے سرداروں کو زیر کرنے اور نظم وضبط کے قیام کے سلسلہ میں بلبن نے عمدہ کام کیے لیکن بس اسی حد تک، ترکی غلام افسروں کے صفایا کے متعلق اس کی پالیسی نظام الدین نے جاری رکھی اور بالآخر علاؤالدین خلجی نے اپنی حکومت کے دوسرے یا تیسرے سال میں ان سبھوں کو گرفتار کرنے یا قتل کرنے کا حکم دیا اور ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔

بلبن نے کبھی کسی راجپوت رائے سے جنگ کی جسارت نہ کی (اس کے لیے) اس کا بہانہ منگولوں کی بڑی طاقت تھی لیکن ہلاکو بلبن کی تخت نشینی کے ایک سال پہلے ہی مر چکا تھا اور بلبن یقیناً اس بات سے واقف تھا کہ مصریوں کی فتح ہی نے ہلاکو کو قبل از وقت قبر تک پہنچا دیا تھا۔ اور یہ کہ مناسب طور پر محفوظ ہندستان کے لیے ایران کے ''ال خان'' کوکوئی خطرہ نہ تھے۔ علاؤالدین خلجی کی تو بات ہی کیا، التمش کے معیاروں

کے مطابق بھی اگر فیصلہ کیا جائے تو بلبن ہر لحاظ سے ناکام رہا۔ اپنے تمام دعوے اور دلائل کے باوجود کہ اس کے سیاسی اختیارات کا ماخذ الٰہی ہے، اسے کبھی کسی راجپوت قلعہ پر حملہ کرنے کے کی ہمت نہ ہوئی۔ اپنی مذہبی عبادت گزاریوں اور مذہبی مواعظ پر اشک ریزیوں کے باوجود وہ ایک خود مختار حکمراں کی طرح اپنے افسروں پر فرمانوں کے ذریعے قابو نہ پا سکا۔ بلکہ اسے زہر کے پیالے اور قاتل کے خنجر کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ بنگال کے باغی گورنر طغرل نے دو فوجوں کی جو بلبن نے اس کے خلاف بھیجی تھیں شکست دے دیا اور بلبن تین سالوں کی جدوجہد کے بعد ہی صوبے کو قابو میں لا سکا۔ ال خانی سلطنت جو اپنے وسائل کی کمی کی خود معترف تھی۔ کا ایک سرحدی افسر اس کے بڑے لڑکے کو شکست دینے اور اسے قتل کر دینے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک سپاہی کی طرح امن وامان کے قیام کی انجام دہی کے باوجود کوئی ایسا قانون باضابطہ نہیں ہے جس کی بنا پر بلبن کو یاد رکھا جائے۔ یہ بات کہ انقلاب پسندوں میں سب سے زیادہ حکم اور سن رسیدہ جلال الدین خلجی ترک غلام افسروں کے نظام حکومت کا تختہ الٹ دے۔ قطعی طور پر ثابت کرتی ہے کہ وہ ڈھانچہ پر کتنا کمزور اور کرم خوردہ ہو چکا تھا۔ جلال الدین خلجی کی تخت نشینی کے متعلق برنی لکھتا ہے کہ "چونکہ دہلی کے شہری اسّی سالوں سے ترکی بادشاہوں (ملک) کے تحت پھل پھول رہے تھے۔ لہٰذا خلجیوں کی حکومت انہیں ایک ناممکن سی چیز معلوم ہوئی۔[1] یہاں "ترک" کی اصطلاح سے مراد ترکی نسل نہیں بلکہ معزالدین غوری، ایبک، التتمش اور ان کے ورثا کے ترکی غلام افسران ہیں جو التتمش کی موت کے وقت سے اعلیٰ سیاسی عہدوں کے اجارہ دار تھے اور جو دہلی میں صوبوں سے حاصل کیے ہوئے مالِ غنیمت پر عیش کرتے تھے۔

ترکی غلام افسران کا ارتقاء

غلام افسروں کی ایک جماعت کا مل کر ایک سلطنت کے قیام میں مدد کرنا اور ایک مدت تک اس کے اعلیٰ عہدوں پر اجارہ داری قایم رکھنا عوامی انتظامیہ کی تاریخ کے نقطہ نظر سے اتنا اہم موضوع ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے نفس مضمون سے

---

(1) ایضاً، ص: 175

تھوڑا سا تجاوز نامناسب نہ ہوگا۔ غلاموں کے آقاؤں کی قدیم تہذیبی ریاستوں مشرق وسطیٰ، مصر اور ایران کی شہری ریاستوں میں ایک عالم کے جینے کا حق پالتو مویشیوں یا جنگلی جانوروں سے زیادہ نہ تھا۔ غلاموں کی کوئی قانونی حیثیت نہ تھی۔ اگر اس کا مالک اسے قتل کردے یا اسے سخت سے سخت تکلیفیں پہنچائے اس سے ریاست کا اور نا ہی سماج کا کوئی تعلق ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کفار عرب نے غلاموں کے جینے کے حق کو تسلیم کرلیا تھا کیونکہ گرچہ ان غلاموں کو جنہوں نے نبیؐ کی زندگی میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا ان کے کافر آقا سخت تکلیفیں پہنچاتے لیکن ان میں سے کوئی بھی قتل نہ کیا گیا۔ اسلام کے تحت اس ادارے (غلامی) کو جن قوانین کے ذریعہ منضبط کیا گیا ان کی وضاحت مندرجہ ذیل طور پر کی جاسکتی ہے:

(الف) نبیؐ کی اس نصیحت کو کہ آقا اپنے غلاموں کو وہی کھلائے اور پہنائے جو وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے، ایک فرد کے ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیا گیا تھا (چونکہ یہ ایک ایسا اصول تھا جس کا نفاذ قانونی عدالتیں نہیں کرسکتی تھیں (ب) آقاؤں کو معاوضہ دے کر غلاموں کے لیے آزادی حاصل کرنا نبیؐ کے خزانے کے آٹھ مقاصد میں سے ایک تھا لیکن فنڈ کی کمی کی وجہ سے اس سلسلہ میں کوئی موثر کام نہیں کیا جاسکا تھا۔ (ج) خلاف راشدہ کے زمانہ میں جب اراضی مفتوحہ کے مال غنیمت کو لے کر مدینہ کے خزانے میں چلے آئے تو آقاؤں کو معاوضہ دے کر تمام عرب غلاموں کو آزاد کردیا گیا۔ (د) پھر بھی غلاموں کے بازاروں کو فروغ ہوا۔ چونکہ غیر مسلم قیدیوں مرد اور عورت دونوں ہی کو غلامی میں لایا جاسکتا تھا اور وہ آزادانہ طور پر تقسیم اور خرید و فروخت کیے جاتے تھے۔ قرآنی نظریہ کہ ”اور ہم نے تم کو (نبیؐ کو) انسانیت کے لیے محض ایک رحمت بنا کر بھیجا۔“ کی اس خلاف ورزی کی کوئی مسلمان مدافعت نہیں کر سکتا۔ بہر حال تین تلافی کن اصول تھے، (ر) اس بات کی اجازت نہ تھی کہ کسی مسلم یا کسی مسلم ریاست کے کسی باشندے کو غلامی کا طوق پہنایا جائے۔ (ز) ولید بن عبدالملک کی وفات کے بعد جب خلافت اپنی آخری حد کو پہنچ گئی تو ایک بار پھر غلامی اپنی اسی حالت پر پہنچ گئی جس پر وہ ارسطو کے زمانہ میں تھی۔ ”غلاموں کے حاصل کرنے کا فن۔ میری مراد ان کے جائز حصول سے ہے۔ مالک بننے اور غلام بننے دونوں

ہی فن سے مختلف ہے چونکہ یہ شکار کرنے یا جنگ کرنے کے فن کی ایک قسم ہے، (پولیٹکس، 8،1) لہٰذا اب غلام صرف سرحدوں کے باہر ہی سے لائے جا سکتے تھے چونکہ ایک نرالا قانون یہ تھا کہ گرچہ ایک مسلمان جنگ میں گرفتار کیے جانے یا خریدے جانے کی بنا پر غلام نہیں ہو سکتا تھا پھر بھی محض قبول اسلام کسی غیر مسلم غلام کی آزادی کا سبب نہیں بن سکتا تھا۔ (س) آخری بات یہ ہے کہ غلاموں کی قانونی شخصیت پورے طور پر تسلیم کر لی گئی۔ اگر غلام اور آقا اس بات پر سمجھوتہ کر لیں کہ غلام آقا کو اپنی کمائی کا ایک مخصوص حصہ دے گا اور قاضی یا مجسٹریٹ اس سمجھوتہ کی توثیق کر دے تو غلام کو آزاد کیا جا سکتا تھا۔

خلیفہ عمرؓ کو ابولوؤ نے خنجر مار دیا تھا کیونکہ آپ اس کی کمائی کے اس تناسب پر رضامند نہ تھے جسے ابولولو جو ایک ماہر کاریگر تھا مناسب سمجھتا تھا اور جو خلیفہ کے نزدیک بہت ہی کم تھا۔ یہ حقیقت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ یہ قانونی اصول ابتدا سے ہی تسلیم کیا جاتا تھا۔ شیخ نظام الدین اولیاءؒ اپنی گفتگو (فوائد الفواد) کے دوران کہتے ہیں کہ صوفی نور ترک کی گزراوقات فی دن تانبے کے ایک سکہ کی ادائیگی پر تھی جو ان کا غلام، جس کی روزانہ کی آمدنی تین تانبے کے سکوں کی تھی، دیا کرتا تھا۔ یہ قانون غلامی کے رواج کو تدریجاً ختم کرنے کا ایک ذریعہ مہیا کرتا تھا بشرطیکہ مزید غلام ملک میں باہر سے نہ لائے جائیں۔ شاید اسی ضابطہ کی بدولت اکثر مسلم سرزمینوں سے غلامی بغیر کسی طرح کے انسدادی قانون کے اور ان کے آقاؤں کو بغیر کسی طرح کا معاوضہ دیے ختم ہو گئی۔

لیکن اوائل عہد وسطیٰ میں ہندستان اور غیر ملکی سرزمینوں دونوں ہی جگہوں میں غلاموں کا بازار گرم تھا۔ لیکن یہاں غلاموں کی عام جماعت سے ہمارا تعلق نہیں۔

تنظیمی، جنگی اور حکومتی صلاحیتوں کے حامل اکثر غلاموں نے اسلامی تاریخ میں نمایاں رول ادا کیا ہے، جیسے طارق، جس نے اسپین کو فتح کیا اور ابو مسلم خراسانی، جس نے اموی خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجادی لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اعلیٰ ترین فرائض خاص طور پر عسکری فرائض کی انجام دہی کے لیے اگر غلاموں کی ضرورت پڑے تو انہیں ترکوں میں تلاش کرنا چاہیے۔

گزشتہ باب میں ان حالات کے مطالعہ کی کوشش کی گئی ہے جنھوں نے دشتی

سماج (ترک اور منگول دونوں ہی) (لوگوں) کو عہد وسطیٰ کے بلند ترین عسکری معیاروں تک پہنچانے کے قابل بنایا۔ اس حقیقت کا اعتراف خلیفہ معتصم نے اسی وقت کر لیا تھا جب اس نے اپنی حفاظت کے لیے ایک ترک باڈی گارڈ کی تقرری کی تھی۔ اس بات کا اعتراف سامانیوں نے بھی کر لیا تھا۔ اپنے ترک سپاہیوں کے سلسلے میں ان کے سخت قوانین (جس کا خلاصہ بارتھولڈ نے نظام الملک کے سیاست نامہ میں پیش کیا ہے) کا حوالہ گزشتہ ایک باب میں دیا جا چکا ہے۔ یہ قوانین ناقص تھے کیونکہ وہ خالص عسکری تھے ان میں موزوں تعلیم کی قطعی کمی تھی۔

بہت سے گراں قدر امور ہیں، جن میں غلاموں کی تعلیم و تربیت بھی شامل ہے، ہمیں یونانیوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے (پولیٹکس، ص: 1-8) کہ "غلاموں کی تعلیم و تربیت ایسی ہونی چاہیے جیسی کہ Syracuse کا آدمی انہیں دیا کرتا تھا۔ وہ غلاموں کو ان کے عام فرائض کی تعلیم دے کر پیسے کمایا کرتے تھے۔ اس طرح کی تعلیم و تربیت میں مزید اضافے کے طور پر طباخی اور اس سے ملتے جلتے خانگی امور و فنون شامل کیے جا سکتے ہیں۔" یونانی آقاؤں کی شہری ریاستیں خانگی امور کے ماسوا غلاموں کو دوسری تعلیم دینے کی اجازت نہ دے سکتی تھیں۔ کیونکہ اس کا مطلب آزاد شہریوں کے حقوق دست درازی ہوتا ہے۔ لیکن عجم میں ان دو صدیوں کے دوران جو سامانی سلطنت کے زوال کو دہلی سلطنت کے قیام سے جدا کرتی ہیں ایسی پابندیاں نہ تھیں۔ عجم کے چھوٹے سلاطین اور ان کے اعلیٰ افسران ہر قسم کے فرائض کی انجام دہی کے لیے، جس میں فوجی انتظام اور نظامِ حکومت کا کنٹرول بھی شامل ہے، تربیت یافتہ غلاموں کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ حکومت کے کسی عہدے کو ایک تربیت یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ غلام کے سپرد کر دینے میں ایک حکمراں کے لیے تین قانونی اور دو سماجی سیاسی فوائد تھے۔ غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا تھا۔ غلام کے بچے بھی اپنی باری میں آقا اور اس کے وارثوں کے غلام ہوتے، آخری بات یہ کہ غلام کا ترکہ اس کے مرنے کے بعد اس کے آقا کو ملتا نا کہ اس کے اپنے بچوں کو۔ سماجی اور سیاسی فوائد اس حقیقت میں پنہاں تھے کہ چونکہ اس کا تعلق کسی بھی گروپ سے نہ تھا لہٰذا وہ پورے طور پر اپنے آقا کا ہی دست نگر ہوتا۔

چند اعداد و شمار جو کسی طرح باقی بچ گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ صلح و جنگ کے فنون کا حامل ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ غلام ایک ایسا غلام کار آموزی ایک مدت کے بعد ایک نہایت ذمہ دار آفس کا نچارج بنایا جا سکے۔ کی قیمت حیرت انگیز طور پر بہت زیادہ تھی۔ ہمارے لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ غلاموں کے کچھ بڑے تاجرین کچھ نہایت ہنر مند ترک غلاموں کو چن لیا کرتے تھے اور Syracuse کے (متذکرہ بالا) شخص کی طرح خانگی امور کی نہیں بلکہ بادشاہوں اور حکمرانوں کی خدمت کے لیے ان کی تربیت کیا کرتے۔ یہ چنیدہ غلام عموماً اپنے آقاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہی پرورش پاتے لیکن ان کی تعلیم و تربیت پر روپے خرچ کرنا ایک ایسا راس المال ہوتا جو اپنی قیمت کئی گنا زیادہ ادا کرتا۔ غلاموں کا تاجر خود اپنے لڑکوں پر اس طرح کے خرچ کو ایک غیر ضروری تضیع شمار کرتا۔ انہیں جنگ شہ سواری، تیر اندازی نیز تلوار، ڈھال اور نیزہ چلانے کے فنون، فنون لطیفہ کی موزوں تعلیم، فارسی ادب و نظم، بنیادی عربی و دینیات، آداب مجلس، اچھے اطوار، اسلوب بیان کی روانی، اخلاقیات حکومت اور آقا کے ساتھ وفاداری کے اصول۔ تمام ضروری مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ اور انتظام حکومت کے لیے صرف علمی درس ہی کافی نہیں بلکہ عملی کاموں کی تربیت اور کار آموزی کی ایک مدت ضروری ہے۔ لیکن بادشاہ اور اعلیٰ افسران کو ایسے ترکی غلاموں کی ضرورت تھی جنہیں مناسب عسکری اور علمی تعلیمات دی جا چکی ہوں اور جنہیں چند سالوں کی آزمائش کے بعد ایک ذمہ دار عہدہ پر بحال کیا جا سکے۔ ہندستان کی ہی دو مثالیں لی جائیں۔ 1197ء میں انہلوارہ کی فتح کے کچھ دنوں بعد ایبک نے التتمش کو خریدا تھا لیکن چار سالوں کے اندر ہی ہم اسے گوالیار کے گورنر (امیر) کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے پاتے ہیں۔[1] 1232ء میں التتمش نے بہاء الدین بلبن کو خریدا تھا اور اس سے پہلے کہ بلبن آخری سانس لے (1236ء) وہ حکومت کے معملات میں اقتدار حاصل کر چکا تھا اور التتمش کی ایک لڑکی اس کے حرم میں تھی۔[2]

مرکزی ایشیا اور ایران کی منگول فتح (22-1218ء) نے غلاموں کے اس

---

(1) منہاج، ص 168

(2) ایضاً، ص 169

کاروبار کا خاتمہ کر دیا۔ اگرچہ (جیسا کہ یہ بات دہرائی جا چکی ہے) غلام افسران کے ورثاء جن کی تعداد التتمش کی موت کے بعد نئی بحالی کے ذریعے بڑھ نہ سکی وراثت کے حقوق کی بنیاد پر ہمیشہ اعلیٰ عہدوں پر اپنی اجارہ داری کا دعویٰ کرتے رہے۔

معزالدین غوری کی موت کے وقت ایبک کی پوزیشن

کیا ایبک معزالدین کے ذریعہ ترائن کی فتح کے بعد اپنی ہندستانی املاک کا وائسرائے بنا دیا گیا تھا یا اس نے یہ مقام بتدریج، محض اپنی کوششوں کے بل بوتے پر اور اپنے عسکری کارناموں کے لیے اسے بطور انعام حاصل کیا؟ ڈاکٹر حبیب اللہ تاج المعاصر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "دہلی کے قریب اندرپت میں قبضہ مخالفانہ کرنے والی ایک فوج کا اسٹیشن قایم کیا گیا تھا جس کی قیادت قطب الدین ایبک کے سپرد تھی جسے معزالدین کے ایک نمائندے کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔[1]" فخر مدبر کے مطابق ایبک کو رسمی طور پر وائسرائے کے اختیارات دے دیے گئے پھر ترقی دے کر ملک کا درجہ دیا گیا۔ اور 1206ء میں جب معزالدین کھوکھروں کو زیر کر کے غزنی کے راستہ پر تھا اسے ہندستانی املاک کا ولی عہد متعین کیا گیا تھا۔[2] یہ دونوں بیانات اثر راجع رکھتے ہوئے ایک ایسی صورتحال کی وضاحت کرتے ہیں جو بہت بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ ایبک کبھی بھی ولیعہد متعین نہیں ہوا۔ نہ تو ترائن کے بعد نا ہی کھوکھروں کی جنگ کے بعد۔ یہ مقام اس نے اپنے آقا کی موت کے بعد سیاسی و عسکری دونوں طرح کی سخت جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا۔

معزالدین نے اپنی ہندستانی املاک کے نظم و نسق کے لیے جن انتظامات کی تشکیل کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین (یا اس سے زاید) آزاد افسران پر مبنی تھی، جو خود اس کے ماتحت تھے۔ اس نے اپنے تمام ترکی غلام افسران کو ایبک کے کنٹرول میں نہیں

---

(1) تاج المعاصر ورق، 46، جیسا کہ ڈاکٹر حبیب اللہ نے حوالہ دیا ہے The foundation of Muslim rule in India (ہندستان میں مسلم حکومت کی تاسیس)، ص:59 تاج المعاصر کا اقتباس (جیسوال انسٹی ٹیوٹ کے نسخہ کا ورق 102) حقیقت سے زیادہ مبالغہ آمیز ہے۔ حسن نظامی کہرام اور سامانہ کے ایالت کا حوالہ دیتا ہے جو ایبک کے حوالے تھی اور کہتا ہے کہ ایبک نے اپنی لیاقت سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ معزالدین کا جانشین ہونے کے لائق تھا۔ (2) تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، ص 28

دیا تھا۔ چونکہ اس کی موت اچانک واقع ہو گئی تھی لہٰذا اسے ایک وارث کی تقرری کا یا اپنی حکومت کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے اسے کسی مشینری کو ترکے میں دے دینے کا موقع نہ مل سکا۔ ہم جتنا بھر کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنے خاندان کے کسی فرد پر یا غور کے قبائلی سرداروں میں سے کسی پر اسے یکسر بھروسہ نہ تھا۔ اس طرح انہیں الگ کر کے وہ اپنی بڑی بڑی مہمات میں صرف اپنے غلاموں پہ ہی بھروسہ کر سکتا تھا۔ اس کے تین غلاموں یلدوز، قباچہ، ایبک نے اپنے آپ کو مساوی پوزیشن میں پایا۔ محمد بختیار خلجی (اگر اسے اس بات (معزالدین کی موت) کا پتہ ہوتا) کا بھی کوئی افسر اعلیٰ باقی نہ رہا تھا۔ ایبک کی نظر میں علی ناگوری اور محمد بختیار خلجی کی مہمات کی قدر یا تو مصلحت کے تحت تھی یا محض اتفاقی تھی کیونکہ ان پر اس کا کوئی قانونی انتظامی کنٹرول نہ تھا۔ علاوہ ازیں گوالیار کے رائے نے طغرل کو نظرانداز کر کے جس نہج پر ایبک سے سمجھوتہ کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معزالدین کے یہ دو افسران مکمل طور پر مساوی اور آزاد درجہ کے حامل تھے۔

مشرقی علاقہ میں محمد بختیار کی سرگرمیاں اس طرح کی تھیں جیسے کہ وہ معزالدین کی جانب سے ایک خود مختار عامل ہو۔ جب تبت کی جنگ بدقسمتی کا شکار ہو گئی اور محمد بختیار شکست خوردہ مایوس اور دلگیر ہو کر بستر سے لگ گیا اس وقت اسے بار بار اپنے آقا کا خیال آیا کہ "شاید میرے آقا سلطان معزالدین پر کوئی آفت آپڑی ہے جس کی وجہ سے میری قسمت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔" ایبک کا اس نے کبھی تذکرہ نہ کیا اور نا ہی کبھی اس کا خیال تک لایا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ اس کے ماتحت نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر محمد بختیار زندہ رہ جاتا اور بہار و بنگال کی فتوحات کو یکجا کر دیتا تو یہ بات ایبک کی طاقت کے لیے ایک چیلنج بن سکتی تھی۔

معزالدین کے جانشین کے سلسلہ میں جو مبہم صورتحال ہندستان میں پائی جاتی تھی اسکے کچھ واضح اسباب ہیں۔ معزالدین اپنے خاندان والوں سے پرامید نہ تھا جیسا کہ اس کے اس طریق عمل سے واضح ہوتا ہے کہ اس نے غیاث الدین کے بیٹے محمود کے حق کو نظرانداز کر کے فیروز کوہ علاؤالدین محمد (غیاث الدین کا داماد) کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ غوری سرداروں سے بھی جو اسے ترائن کے میدان میں جنگ میں اور پھر

دوبارہ اندخود میں چھوڑ بھاگے تھے، مایوس تھا۔ اس کا قول کہ اس کے غلام اس کے لڑکے ہیں اور اس کے بعد اس کے جانشین ہوں گے۔ اپنے خاندان والوں اور ساتھ ہی اپنے غوری افسروں کی طرف سے اس کی انتہائی بے اعتمادی اور مایوسی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس کے تحت پوری صورت حال کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ اس کی امیدیں اپنے غلاموں سے وابستہ تھیں۔ منہاج ہمیں بتاتا ہے کہ:

”سلطان معزالدین غوری کو ترک غلام خریدنے کا بے حد شوق تھا اور اس نے انہیں بڑی تعداد میں خریدا بھی۔ اس کے (ترکی) غلاموں میں سے ہر ایک ہمت، جنگ اور قربانی میں تمام مشرقی ممالک میں مشہور تھے۔ نیز پوری دنیا اس کے غلاموں کے ناموں سے آشنا تھی۔ سلطان معزالدین نے یلدز کو نوجوانی کی عمر میں خریدا تھا اور اسے ابتدا سے ہی فرائض منصبی پر فائز کیا اور اسے ترکی غلاموں کا افسر اعلا متعین کیا۔ جب وہ جوان ہوا تو اسے اس کے اقطاع کے طور پر کرمان اور سنقران عطا کیا۔ سلطانی احکامات کے مطابق یلدوز کی ایک لڑکی کی شادی قطب الدین ایبک کے ساتھ اور دوسری کی نصیر الدین قباچہ کے ساتھ کر دی گئی۔“

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معزالدین نے یلدوز یا اپنے کسی دوسرے اعلیٰ مرتب غلام کو آزاد نہیں کیا۔ یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ معزالدین کے ذہن میں اگر کوئی تجویز تھی تو وہ کیا تھی۔ اس کی آخری جنگ کے موقع پر یلدوز کا غزنی کے ولی عہد کے عہدہ پر اور ایبک کا ہندستان کے ولی عہد کے عہدہ پر مقرر کیے جانے کے تذکرے، جانبین (یلدوز اور ایبک) کی ایک سوچی سمجھی اسکیم معلوم ہوتے ہیں، جس کا مقصد اپنی طاقت کی رسہ کشی کے لیے قانونی بنیاد قایم کرنا تھا۔ حقیقی صورتحال یہ معلوم ہوتی ہے کہ معزالدین کی موت نے یلدوز، ایبک اور قباچہ کو اقتدار کی کشمکش کے لیے اور اس مسئلہ کو بقائے اصلح کی بنیاد پر طے کرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ لہٰذا اپنی حیثیت منوانے کے لیے ایبک کو جان توڑ کوشش کرنی پڑی۔

معزالدین کی موت پر لاہور کے شہریوں نے ایبک کو لاہور بلایا اور اس سے حاکم اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کی درخواست کی لیکن وہ لاہور کیوں بلایا گیا جبکہ اس کا صدر مقام دہلی میں تھا؟ یہ بات یقیناً ان بڑھتے ہوئے خطرات کی باعث تھی جن سے لاہور

دوچار تھا۔ ایبک نے فوراً حالات کا اندازہ لگالیا اور اس نے اپنی حکومت لاہور منتقل کر دی۔

اگرچہ معزالدین غوری کے تمام عالی مرتب غلاموں میں ایبک قطعی طور پر سب سے زیادہ لائق تھا لیکن ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے اس کا مقام کافی تاخیر کے بعد ہی تسلیم کیا گیا۔ حقیقت میں اس کی غیر رسمی تخت نشینی تو 17/ذیقعدہ 602 ہجری مطابق 25/جون 1206ء میں ہی ہو گئی تھی لیکن رسمی طور پر اس کے عہدہ کی منظوری اور شاید غلامی سے آزادی کی دستاویز بھی، 9-1208ء مطابق 605 ہجری میں حاصل کی گئی۔ اس تین سالہ مدت میں وہ ملک اور سپہ سالار ہونے پر بھی قانع رہا۔[1] اور شاید اسی بنا پر وہ اپنے نام کا سکہ بھی نہ ڈھال سکا۔[2] اس کے قانونی رتبہ کی منظوری میں یہ تاخیر غوری سیاست کی کچھ پیچیدگی کے باعث ہوئی جس کا ایک مختصر حوالہ ضروری ہے۔

جب سلطان معزالدین کا جنازہ دمیاک سے غزنی کے لیے روانہ ہوا تو اس کے ترکی غلاموں نے سلطان کی لاش اور اس کے خزانوں کو ضبط کر لیا اور جبراً تمام غوری امراء ملک کو اس سے علیحدہ رکھا۔ جب اس کی لاش کرمان[3] پہنچی تو معزی غلاموں کی پوزیشن اور بھی مضبوط ہو گئی۔ کیونکہ یلدوز نے معید الملک محمد عبداللہ سنجری کو اس بات پر متعین کیا کہ وہ لاش کو بحفاظت غزنی لے جائے۔ لاش کے غزنی پہنچنے کے دو ہی دنوں کے اندر اندر غوری امراء اور معزی غلاموں کے درمیان معزالدین کا ایک جانشین مقرر کرنے کے سلسلے میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ غوری امراء نے بامیان کی شاخ یعنی سلطان بہاء الدین سام کے لڑکوں (جلال الدین علی اور علاؤ الدین محمد) کی حمایت کی۔ ادھر معزی غلاموں نے سلطان غیاث الدین محمود، غیاث الدین محمد کے

---

(1) Epigraphia Indo-Muslimica، 1911-12ء، ص:2

(2) صرف چار تانبے کے سکوں کے علاوہ ایبک کا کوئی سکہ دستیاب نہ ہو سکا ہے۔ یہ چاروں سکے جن پر ''قطبی'' لکھا ہوا ہے نلسن رائٹ کے مطابق شاید کرامن سے جاری کیے گئے تھے۔ The coinage metrology of the Sultan of Delhi، ص:69، اور ص:14-15

(3) یلدوز کے کرمان پر اسی نام سے مشہور ایرانی صوبے کا اشتباہ نہ ہونا چاہیے۔ منہاج کے مطابق یہ غزنی سے ہندستان جانے والے راستہ میں پڑتا ہے اور غزنی سے زیادہ دور نہیں ہے۔

لڑکے اور معزالدین کے بھتیجے کو ترجیح دی۔ معزی غلاموں کا محمود کی حمایت کرنے کا سبب اور دوسری باتوں کے علاوہ بلاشبہ یہ بات تھی کہ وہ مرحوم سلطان کا قانونی وارث تھا اور اب وہ اس کی تمام ذاتی جائدادوں (مع اس کے غلاموں کے) کا مالک تھا اور تنہا وہی آزادی کا ایسا پروانہ جاری کر سکتا تھا جو قانونی ہوتا۔ غوری شرفاء خاص طور پر سپہ سالار خروشی اور سلیمان شیش نے جلال الدین علی اور علاؤالدین محمود کو بامیان سے بلوایا۔ جلال الدین علی نے فوراً اپنے بھائی علاؤالدین محمد کو غزنی کے تخت پر بٹھادیا اور اپنے لیے بامیان ہی کے تخت کو پسند کیا۔ معزالدین کا خزانہ ان کے درمیان مساوی طور پر تقسیم ہو گیا اور ہر ایک نے 250 اونٹوں کے بوجھ کے بقدر سونا، ہیرے جڑے ہوئے زیورات اور سونے چاندی کے برتن پائے۔ جلال الدین اپنا حصہ بامیان لے گیا۔

اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معزی غلاموں نے علاؤالدین کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن وہ لوگ دل سے اس پر راضی نہ تھے۔ معید الملک جو بڑی احتیاط سے یلدوز کے اشارہ پر حالات کا جائزہ لے رہا تھا اس نے اسے کرمان آنے کا مشورہ دیا۔ اس نے علاؤالدین کو شکست دی اور تمام غوری شرفاء کو گرفتار کر لیا۔ بہر حال بعد میں علاؤالدین اور اس کے حامیوں کو بامیان واپس آنے کی اجازت دے دی گئی۔ جلال الدین اپنے معزول بھائی کے ساتھ واپس آیا اور یلدوز کے افسران کو بے دخل کر کے دوبارہ اپنے بھائی کو تخت پر بٹھا دیا۔ یلدوز پھر پلٹا اور غزنی کے قلعہ کا چار ماہ محاصرہ کرنے کے بعد دونوں بھائیوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بعد میں سمجھوتہ ہو گیا۔ اور یلدوز نے جلال الدین اور علاؤالدین کو بامیان واپس جانے کی اجازت دے دی۔ آخر میں دونوں بھائیوں ہی میں جھگڑا ہو گیا اور علاؤالدین سلطان محمد خوارزم شاہ سے جا ملا جس نے بامیان پر قبضہ کرنے کے لیے اس جھگڑے کا فائدہ اٹھایا۔ انہیں دنوں علاؤالدین کا انتقال ہو گیا اور ادھر خوارزم شاہ کے ذریعے جلال الدین بھی مارا گیا۔ اس طرح دونوں بھائی جن کی غور کے شرفاء نے حمایت کی تھی ختم ہو گئے۔

غیاث الدین محمود جسے اصل میں معزی غلاموں نے تخت پر بٹھانا چاہا تھا اپنے والد کے 1203ء میں مرنے کے بعد ہی سے فیروز کوہ کا بڑا آرزومند تھا لیکن معزالدین جو غوری قبائلی روایات کے مطابق اپنے بھائی کی بادشاہت کے حصہ کو بانٹنے

ا اختیار رکھتا تھا، نے اس کے حق کو نظر انداز کر دیا تھا اور فیروز کوہ غیاث الدین کے داماد لاؤالدین محمد کے حوالے کر دیا تھا۔ محمود کے حصہ میں بست، اسفرار اور فرح کے لاقے آئے۔ معزالدین کے قتل کے بعد محمود نے فیروز کوہ پر چڑھائی کی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ منہاج لکھتا ہے کہ جب محمود کا اقتدار غور، غرجستان، طالقان، کرزواں اور فرح اور گرمیسر کے اضلاع میں مستحکم ہو گیا تو ایبک نے اور معزالدین کے دوسرے لاموں نے اس کے دربار میں اپنے پیغامات بھیجے اور غزنی اور ہندستان کی سرزمینوں پر حکومت کرنے کے لیے غلامی سے رہائی کے پروانے اور خلعتوں کو بخشنے کی رخواست کی۔[1] محمود نے یلدوز کو ایک چھتر اور سرزمین غزنی کے لیے ایک سند عطا یا۔ 605 ہجری مطابق 1206ء میں جب ایبک نے غزنی پر چڑھائی کی تو اس نے ظام الدین محمد کو فیروز کوہ بھیجا تاکہ وہ اس کے لیے ایک سند کی منظوری کی کوشش رے۔ اس کی وکالت پر محمود نے ایبک کو ہندستان پر حکومت کرنے کے لیے ایک سند اور گلناری رنگ کا ایک چھتر دیا۔[2] شاید اس دستاویز میں غلامی سے آزادی کا پروانہ بھی شامل تھا۔

اس طرح غزنی، غور اور بامیان کے یہی سیاسی حالات تھے جو معزالدین کے قانونی وارث کی جانب سے ایبک کے لیے ایک رسمی سند کے پروانے کے حصول میں تاخیر کا سبب بنے۔

ایبک کی مشکلات

1206ء میں ہندستان میں غوری املاک ملتان، اُچھ، نہروالا، پرشور، سیالکوٹ، تبرہند، ترائن، اجمیر، ہانسی، سرسوتی، کہرا، میرٹھ، کول، دہلی، تھنکر، بدایوں،

---

(1) منہاج، ص: 89

(2) ایضاً، ص: 90 لیکن منہاج ص: 140 پر لکھتا ہے کہ سلطان محمود نے ایک چھتر ملک قطب الدین کو بھیجا اور اسے سلطان کا خطاب عطا کیا اور 602 ہجری مطابق 1206ء میں اس نے بادشاہ کے پاس حاضری کے لیے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا اور منگل 17/ذیقعدہ (26/جون 1206ء) کو وہ لاہور کے شاہی قصر میں تخت پر متمکن ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے سند 602 ہجری، مطابق 1206ء میں دی گئی تھی۔ لیکن مذکورہ بالا بیان زیادہ اغلب ہے۔

گوالیار، بھیرا، بنارس، قنوج، کالنجر، اودھ، مالوہ (ڈونڈ)، بہار اور لکھناوَتی پر مشتمل تھیں۔[1] لیکن ترکوں کی گرفت تمام علاقوں میں مساوی نہ تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض جگہوں میں مثلاً کالنجر اور گوالیار میں ان کا زور اگر ختم نہیں ہوا تھا تو کمزور ضرور ہو گیا تھا۔

معزالدین کے املاک متروکہ کے دو مزید دعویدار تاج الدین یلدوز اور نصیر الدین قباچہ تھے۔ اس سے پہلے کہ ایبک کا اقتدار مستحکم بنیادوں پر قایم ہو سکے اسے ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔

جب سلطان غیاث الدین محمود نے غزنی کے املاک کے سلسلہ میں یلدوز کی توثیق کر دی اور اسے غلامی سے رہائی کا پروانہ بھی عطا کر دیا تو ہندستان کے سلسلہ میں اس کی پوزیشن اس بنیاد پر کہ ہندستان غزنوی ریاست کا ایک حصہ ہے، زیادہ مستحکم ہو گئی۔ اب وہ معزالدین کی ہندستانی املاک کا ایک قسم کا قانونی دعویٰ کر سکتا تھا۔ غزنی سیاست کی اس نئی صورت حال کو نظرانداز کر دینا ایبک کے لیے مشکل تھا۔ درحقیقت ہندستان کی غوری املاک کو ایک آزاد درجہ دیئے اور اسے قایم رکھنے کے لیے اسے صورت حال پر محتاط نظر رکھنا اور ہر طرح کے نامساعد حالات کے رد کرنے کے لیے پیش بینی سے کام لینا ضروری تھا۔

جیسے ہی یلدوز کو سند ملی وہ پنجاب کو فتح کرنے کی نیت کر کے غزنی سے روانہ ہوا۔ ادھر ایبک اس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے روانہ ہوا۔ یلدوز جنگ میں شکست کھا گیا اور کہکشان کی جانب بھاگ گیا۔[2] کامیابی سے خوش ہو کر ایبک نے غزنی کی طرف پیش قدمی کی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں مست ہو کر اپنی کامیابی کی خوشی منائی۔[3] ایبک کو زیر کرنے کے لیے اس موقعہ کو سنہرا خیال کرتے ہوئے غزنی کے عوام نے یلدوز کو دعوت دی۔ غزنی کے مضافات

---

(1) ایضاً، ص: 127، ریورٹی، ص: 491، یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ مورخین دیبل کی فتح کا کوئی حوالہ نہیں دیتے۔

(2) فرشتہ، جلد اوّل، ص: 63

(3) منہاج، ص: 135

میں یلدوز کی غیر متوقع آمد نے ایبک کو ہراساں کر دیا اور وہ تیزی سے سنگ سرخ کی راہ سے ہندستان بھاگ آیا۔[1] یلدوز کی جانب سے جو خطرہ ٹلتا ہوا معلوم ہوتا تھا وہ دوبارہ افق پر چھانے لگا۔ موثر دفاعی اسباب کی خاطر ایبک نے لاہور میں سکونت اختیار کرلی اور اسے اپنا دارالسلطنت بنالیا۔[2] یہ بتانا مشکل ہے کہ کیوں ایبک جیسا تجربہ کار افسر غزنی میں اپنی عیش و طرب کی خاطر اپنے فرائض بھول بیٹھا۔ تاہم (جیسا کہ منہاج لکھتا ہے) اس رسہ کشی میں کوئی تلخی نہ تھی کیونکہ ایبک یلدوز کا داماد تھا۔ جب ایبک کی جگہ التمش نے لے لی تو صورتِ حال بالکل ہی مختلف ہو گئی۔

مشرقی حالات

ریاست کے مشرقی حصہ کے حالات بھی بڑے ابتر تھے۔ اگر شمال مغربی علاقوں کا دفاع ایبک کی حکومت کے تحفظ سے متعلق تھا تو مشرقی علاقے کے لیے ایک عزت کا سوال تھے۔ محمد بختیار خلجی کو علی مردان کے غدارانہ قتل نے محمد شیران کے وفادارانہ جذبات کو برانگیختہ کر دیا۔[3] لہذا شیران نے علی مردان کو اس کے اقطاع نارنکوئی میں پکڑ لیا اور اسے وہاں کے کوتوال بابا کوتوال اصفہانی کے حوالہ کر دیا۔ دیوکوٹ واپسی پر تمام امراء نے اسے خلجیوں کا سردار تسلیم کر لیا لیکن اسی اثنا میں علی مردان نے کوتوال کو ملالیا اور دہلی بھاگ نکلا۔ اس معاملہ میں ایبک کے لیے ایک قانونی مشکل تھی۔ خلجی معزالدین کے غلاموں میں نہ تھے لہذا اس کے جانشین کی حیثیت ایبک کا بہار پر کوئی قانونی حق نہ تھا۔ علی مردان نے ایبک کو اس بار پر آمادہ کیا کہ وہ اودھ کے گورنر قیمز رومی کو اس ہدایت کے ساتھ لکھناؤتی بھیجے کہ وہ خلجی امراء کو مناسب اقطاعات پر

---

(1) ایضاً، ص: 136 عصامی (ص: 101)۔ یہ ایک بڑا تنگ راستہ تھا جس سے "صرف ایک سوار اور ایک گھوڑا" ایک ساتھ گزر سکتے تھے۔ اس راستے کے بہت سے حوالے ملتے ہیں۔ حبیبی اسے سنگ سرخ لکھتا ہے (جس کا مطلب چٹان یا پہاڑی سے گزرنے والے راستہ کے ہیں)

(2) تاج المعاصر، ص: 532 (جیسا کہ عزیز احمد نے حوالہ دیا ہے)

(3) محمد شیران اور اس کے بھائی احمد شیران کو محمد بختیار خلجی نے جس وقت وہ تبت کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ لکھناؤتی اور جاج نگر بھیجا تھا۔ جب محمد بختیار نے ندیہ (Nadia) شہر کو لوٹا اس وقت محمد شیران فوج سے تین دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا پھر وہ تقریباً 18 ہاتھیوں کو پکڑنے کے بعد واپس آ گیا۔ (منہاج، ص: 157)

متعین کرے۔ قیمز نے دیوکوٹ کے اقطاع کو حسام الدین عوض خلجی کے سپرد کیا جو محمد بختیار کے زمانہ میں کنکوری کا انچارج تھا۔ اس بات نے محمد شیران اور دوسرے خلجی امراء کو برانگیختہ کر دیا۔ انہوں نے دیوکوٹ پر چڑھائی کی۔ قیمز نے پیچھے مڑ کر انہیں زبردست زک پہنچائی۔ بعد میں محمد شیران ایک سخت جنگ میں کام آ گیا۔

جب ایبک نے 1206ء میں غزنی پر چڑھائی کی تو علی مردان بھی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ یلدوز کے ہاتھوں میں پڑ گیا جس نے اسے قید کر دیا۔ کسی طرح اس نے رہائی حاصل کی اور ایبک کے پاس واپس آ گیا۔ جس نے لکھناؤتی اس کے سپرد کر دیا۔ ملک حسام الدین نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور علی مردان کا پورا علاقہ اپنے کنٹرول میں واپس لے آیا۔

1206ء کے بعد ایبک کی توجہ نئے علاقوں کو فتح کرنے کے بجائے ان علاقوں کی حفاظت کی طرف مڑ گئی جو پہلے سے مفتوح تھے۔ مزید توسیع کی خاطر سلامتی و تحفظ کو بھینٹ چڑھانے کے بجائے وہ اپنی ہندستانی املاک کے نظم و نسق کا بندوبست کرنے اور ان کے مبہم خط و خال کو واضح کر کے ان کی ایک مرتب شکل بنانے کے لیے زیادہ بے چین تھا۔ یہ بات اسی وقت ممکن تھی جب معزی غلام اور ملک اس کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیں۔ اس نے بہت سی مشکلات پر قابو پالیا تھا لیکن ابھی اس کا کام نامکمل ہی تھا کہ ایک حادثہ نے اس کی زندگی مختصر کر دی۔

وہ چوگان (عہد وسطیٰ کا پولو) کھیل رہا تھا کہ اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور زرین کی نوکلی مونٹھ اس کی پسلی میں گھس گئی لہٰذا 607ھ / 1210ء میں آناً فاناً اس کا انتقال کر گیا۔

قطب الدین ایبک کے کارنامے

قطب الدین ترکوں کے ایک قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔[1] بچپن ہی میں وہ اپنے وطن ترکستان سے جدا کر دیا گیا اور نیشاپور کے غلاموں کے بازاروں میں لایا گیا۔ یہاں امام ابو حنیفہ کے ایک خلف قاضی فخر الدین عبد العزیز کوفی نے اسے خریدا۔[2] قاضی اپنے مذہبی علم و تقویٰ میں مشہور تھے اور اسی سبب سے انہوں نے "ابو حنیفہ ثانی" کا خطاب پایا۔[3] عوفی کے مطابق وہ ایک قاضی تھے جو "سلطان نشان" کے مالک تھے۔[4] انہوں نے قطب الدین کے ساتھ بڑی شفقت کا برتاؤ رکھا اور اس کے لیے اپنے لڑکوں ہی کی طرح تعلیمی سہولتوں کا بندوبست کیا جس میں تیر اندازی اور شہسواری بھی شامل تھی۔[5] قطب الدین ایبک نے بہت جلد بہت سے دماغی اور جسمانی فنون میں مہارت حاصل کر لی۔ اس نے خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت سیکھی اور اسی وجہ سے وہ "قرآن خواں" مشہور ہو گیا۔[6] شاید بعد میں قاضی یا ان کے لڑکوں نے اسے کچھ تاجروں کے ہاتھ بیچ دیا جو اسے غزنی کے غلام بازار میں لے آئے۔ یہاں معز الدین نے اسے خرید

---

(1) ترکی زبان میں "اے" کا مطلب 'چاند' ہوتا ہے اور 'بیک' سے مراد 'حاکم' لیا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ اپنے مردوں اور عورتوں کی خوبصورتی کے لیے مشہور تھا اگرچہ خود ایبک خوبصورتی سے محروم تھا۔ (منہاج، ص: 137) طبقات ناصری میں ہم کم از کم چھ آدمیوں کا نام پاتے ہیں جو اسی قبیلہ کے تھے (شمسی ملکوں کے سلسلہ کا طبقہ یا باب جس میں 25 ترکی خان اور ملک جو تمام کے تمام اصلاً غلام ہیں کی سوانح عمریاں ص: 229-324 میں دی گئی ہیں) ابن حجر عسقلانی اس قبیلے کے گیارہ آدمیوں کی تفصیل بتاتا ہے (الدور الکاملہ جلد اوّل، ص: 23-421) یہ خیال کہ ایبک کا مطلب ایک ایسے شخص سے ہے جس کی ایک انگلی ٹوٹی ہوئی ہو صحیح نہیں۔ قطب الدین ایبک کی ایک انگلی ٹوٹی ہوئی تھی اور اسی بنا پر اسے "ایبک شل" یعنی عیب والا ایبک کہا جاتا تھا (منہاج، ص: 138) ٹھیک جس طرح کے تیمور کا حوالہ لنگ سے دیا جاتا ہے۔ جیبی (جلد دوم، ص: 29-428) کا خیال ہے کہ ایبک کا مطلب بت محبوب یا غلام ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

(2) تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، ص: 21، منہاج ص: 138

(3) عوفی، لباب الالباب، جلد اوّل، ص: 228، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، ص: 21

(4) لباب الالباب، جلد اوّل، ص: 228، کے ان بڑے کے برہان الدین محمد کا بھی تذکرہ کرتا ہے جو انہیں کی طرح اپنے تقویٰ اور علم میں مشہور تھے۔ (5) منہاج، ص: 137

(6) تاریخ معز الدین مبارک شاہ-21

لیا اور اس کی زندگی کے ایک نئے موڑ کا آغاز ہوا جس نے آخر میں اسے دہلی کے تخت تک پہنچا دیا۔

معزالدین کے غلامی کنبہ میں داخل ہونے کے بعد فوراً ہی اپنی ذہانت اور کشادہ دلی کے باعث ایبک نے اپنے آقا کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ ایک رات معزالدین نے ایک جشن کا انعقاد کیا[1] اور اپنے غلاموں کو انعامات سے نوازا۔ ایبک کو بھی قیمتی انعامات ملے۔ مگر اس نے اپنا حصہ دربار کے ملازمین میں تقسیم کر دیا۔ جب سلطان کو اس کشادہ دلی کی اطلاع ملی تو وہ اس سے بہت خوش ہوا اور اسے ترقی دے دی۔ اس کے بعد وہ امیر خرد (شاہی اصطبلوں کا افسر) ہو گیا۔ جو اس زمانہ میں ایک اہم عہدہ تھا۔ غور، بامیان اور غزنی کے سلطانوں کی سلطان شاہ کے ساتھ جنگ کے موقع پر گھوڑوں کی پرورش و پرداخت، ان کے چارے اور ساز و سامان کی خبر گیری کی ذمہ داری ایبک پر ہی تھی۔ ایک دن وہ چارے کی تلاش میں تھا کہ دشمن جاسوسوں نے اسے گرفتار کر لیا اور سلطان شاہ نے اسے ایک آہنی کٹہرے میں قید کر دینے کا حکم دیا لیکن جب سلطان شاہ کو شکست ہو گئی تو اسے اس مصیبت سے چھٹکارا ملا اور وہ اپنے کٹہرے سمیت اپنے آقا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ معزالدین اس منظر سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور اسے اس نے بڑی عنایتوں سے نوازا۔ اس کے بعد اسے جو عہدے ملے اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔

1192ء میں ہم ترائن کی جنگ میں ایبک کو ایک ممتاز رول ادا کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اس کے بعد اسے کہرام اور سامان کا انتظام سونپا گیا۔ یہاں سے ہندستان کی سیاسی زندگی میں اس کی باقاعدہ شمولیت شروع ہوئی۔ اجمالی طور پر ہندستان میں اس کی زندگی کے تین نمایاں ادوار ہیں۔ 1192ء سے 1206ء تک معزالدین کی جانب سے وہ شمالی ہندستان کے بعض حصوں کا آفیسر انچارج رہا۔ 1206ء سے 1208ء تک وہ غیر رسمی اقتدار اعلیٰ کے ساتھ معزالدین کی ان ہندستانی املاک کا مالک و سپہ سالار رہا جو دہلی اور لاہور کے ماتحت تھیں اور 1208ء سے 1210ء تک وہ ایک

---

(1) تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، ص: 21

(2) منہاج، ص: 139-138

آزاد ہندستانی سلطنت کا ایک خود مختار حکمراں رہا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان ادوار میں کون سا دور زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ پہلا دور عسکری سرگرمیوں میں گزرا، دوسرا سیاسی جوڑ توڑ میں اور تیسرا سلطنت دہلی کا ایک مجمل خاکہ تیار کرنے میں۔

ایبک ایک بہترین عسکری لیڈر تھا۔ شمالی ہندستان کی فتح میں جس حد تک معزالدین کے عزم راسخ کا حصہ تھا اسی حد تک اس میں ایبک کی وفادارانہ مستعدی کا بھی حصہ رہا تھا۔ معزالدین احکامات مرتب کرتا اور احکامات جاری کرتا اور ایبک اس کے پروگراموں کا نفاذ کرتا۔ مرکزی ایشیائی مہمات معزالدین کے کاموں میں جب اکثر رکاوٹیں پیدا کرتیں تو اس وقت ایبک ہی تھا جو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے آقا کی ہندستان میں توسیع پسندانہ پالیسی کو روبہ عمل لاتا۔ جتنے دنوں معزالدین زندہ رہا ایبک ہنگامی حالات میں مدد کے لیے اس کی طرف نظر کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی موت کے بعد اسے تنہا اپنے ہی ذرائع و وسائل پر بھروسہ کرنا پڑا۔ وہ غیاث الدین محمود، یلدوز، قباچہ اور علی مردان کے ساتھ بڑی ہوشیاری سے نپٹا۔ اور اس نے حالات کے اقتضا کے مطابق، طاقت، اطاعت اور ترغیب سے کام لیا۔ وہ اپنے مقصد (ہندستان میں معزالدین کی املاک کی ایک آزاد حیثیت منوانا) کے پیچھے ایک ایسے زمانہ میں پوری یکسوئی کے ساتھ لگا رہا جبکہ غزنی سے لکھناؤتی تک معزالدین کی حکومت کے تمام حصے مرحوم سلطان کے افسروں کے مزاجی سرگرمیوں کے باعث طوائف الملوکی کی صورت اختیار کیے ہوئے تھے۔ غوری ریاست میں اس وقت جو غیر یقینی حلاوت تھے ایسے میں یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔

علاوہ ازیں ایبک اپنی دلی و دماغی صلاحیتوں کے لیے بھی ممتاز تھا۔ ڈاکٹر حبیب اللہ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ "اس نے ایرانیوں کے پاکیزہ لطف و کرم میں ترکوں کی بہادری کی آمیزش کر دی تھی۔[1]" تمام ہم عصر اور بعد کے مورخین کے کردار کی وفاداری، فیاضی، دلیری اور عدل و راستی کی خصوصیتوں کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کی سخاوت نے اسے لاکھ بخش (لاکھوں کی بخشش کرنے والا) کا خطاب دیا۔[2] سترہویں

---

(1) فاؤنڈیشن آف مسلم رول ان انڈیا، ص: 86

(2) منہاج، ص: 137، لیکن لاکھوں، سے مراد تانبے کے سکے یا 'جیتل' تھے۔

صدی تک اس کی فیاضی کے قصے دکن میں دور دراز تک مشہور تھے۔ فرشتہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر لوگ کسی کی سخاوت کی تعریف کرتا تو اس زمانہ کا ایک کہتے۔[1] یہ بات اس کی عظمت کو ایک واقعی خراج عقیدت ہے کہ اگرچہ ہندستان میں اس کی پوری زندگی مسلسل عسکری سرگرمیوں میں گزری تاہم عوام کے دماغ پر اس نے جو تاثر چھوڑا وہ تباہی و بربادی کا نہ تھا بلکہ انصاف اور وسعت قلبی کا۔ اس کا سبب حالاتِ جنگ کے خاتمہ کے بعد انتظام عدل اور عوام کے مفادات کی حفاظت کے سلسلہ میں اس کا شدید احساس ذمہ داری تھا فخر مدبر کہتا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ اس کی فوج مختلف العناصر ذرائع جیسے ترکیوں، غوریوں، خراسانیوں، خلجیوں اور ہندستانیوں پر مبنی تھی۔ کسی بھی سپاہ نے کبھی بھی یہ ہمت نہ کی کہ گھاس کا ٹکڑا یا کھانے کا لقمہ یا باڑے سے ایک بکری یا ایک چڑیا ہی زبردستی لے لے۔ یا کسی دیہاتی کے یہاں بالجبر قیام کرلے۔[2] ابوالفضل جس نے غزنی کے سلطان محمود پر اس کے ناحق خون بہانے کی بنا پر تنقیدیں کی ہیں ایبک کی بڑی تعریف کرتا ہے اور اس کے کاموں کے تفصیلی جائزہ کا خلاصہ ان الفاظ میں کرتا ہے کہ "اس نے عمدہ اور عظیم کارنامے انجام دیے۔[3]"

ارم شاہ

ایبک اپنی اچانک موت کے باعث اپنے جانشین کے متعلق کوئی بات نہ کہہ سکا۔ ترکی ملوک و امراء کو اچانک اس کے جانشین کے انتخاب کے لیے اکٹھا ہونا پڑا۔ حالات بڑے نازک تھے اس مسئلہ کے فیصلے میں ذرا سی تاخیر نوزائیدہ مسلم ریاست کو جانشینی کی جنگ کے شعلوں کی نذر کردے سکتی تھی۔ ریاست کے افضل ترین مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے ارم کو تخت نشین کیا۔ ارم شاہ کی شخصیت گمنام شخصیت تھی کیونکہ گزشتہ بیس برسوں کی مسلسل عسکری سرگرمیوں کے دوران کبھی ایک بار بھی اس کا تذکرہ نہ آیا۔ کیا اس سے بہتر کوئی انتخاب نہ تھا؟ اس بات سے انکار نہیں کیا جا

---

(1) فرشتہ، جلد اوّل، ص: 63

(2) تاریخ فخرالدین مبارک شاہ، ص: 33

(3) آئینِ اکبری (سرسید ایڈیشن) جلد دوم، ص: 198

سکتا کہ بہت سے باصلاحیت ترکی امراء شمالی ہندستان کے مختلف حصوں میں کام کر رہے تھے۔ لیکن اس کو انتخاب ایک ایسے شخص تک محدود کر دینا پڑا جو غوری دسترس میں ہو۔ برتری اور لیاقت سے زیادہ دستیابی نے ترکی افسروں کو جولا میں مقیم تھے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ارم کو تخت پر بٹھائیں کیونکہ تخت کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

ارم شاہ کی شناخت مختلف فیہ مسئلہ رہی ہے اس حمایت میں کہ وہ قطب الدین ایبک کا بیٹا تھا جو دلائل ہیں وہ کمزور ہیں۔ جوینی کا کہنا ہے کہ ایبک کا کوئی بیٹا نہ تھا۔[1] اور منہاج اس کی تین لڑکیوں کا حوالہ دیتا ہے۔ جس میں سے دو کی شادی ہو گئی تھی۔ ایک کی موت کے بعد اس کی شادی قباچہ کے ساتھ ہوئی تھی اور تیسری کی التمش کے ساتھ[2] طبقات ناصری کے کچھ اوراق میں ارم شاہ کے ساتھ "بن ایبک" کا لفظ سرخی ابواب میں آیا ہے لیکن اس کو متعین ثبوت کے طور پر نہیں قبول کیا جا سکتا۔ یہ کسی غیر محتاط قسم کے الفاظ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔[3]

---

(1) تاریخ جہاں گشا، تہران ایڈیشن، 1351 ہجری جلد دوم، ص:38

(2) طبقات ناصری، ص:141

(3) جیسا کہ ان مخطوطہ میں ہے جنہیں نساولیز (Nassau Less) نے دیکھا تھا (بلوگرافی انڈیکا ایڈیشن، ص:141) حبیبی کے مخطوطہ میں یہ سرخی نہیں ہے (دیکھیے ص:418) لیکن اس نے اپنے ایڈیشن بلوگرافی انڈیکا کے نسخہ کے متن مطابق یہ اضافہ کر دیا۔
لیکن اس کی ساری ذمہ داری صرف کاتبوں پر نہیں ہے۔ بلکہ بعد کی نسلیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ارم شاہ کو کہاں رکھا جائے لہٰذا انہوں نے اسے ایبک کے بیٹے کی حیثیت دی تاکہ اس طرح صلاحیت کا لحاظ کیے بغیر (ترکی) افسران نے جو اس کا انتخاب کیا اس کی وضاحت ہو سکے۔ لیکن عصامی (دیکھیے ص:102) کے وقت یہ بات ایک عام تعین کی حد کو پہنچ گئی تھی۔
منہاج ارم شاہ کے سلسلہ کے اپنے متن کے پیراگراف میں یہ نہیں کہتا وہ ایبک کا بیٹا تھا۔ در حقیقت منہاج نے اپنے دلائل کے لیے جو انداز اختیار کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارم شاہ ایبک کا بیٹا نہ تھا۔ جب سلطان قطب الدین اللہ کو پیارا ہو گیا تب وہ ہندستان کے ملک اور امراء نے اس فوری اقدام کو قرین مصلحت سمجھا کہ ارم شاہ کو تخت پر بٹھا دیا جائے تاکہ شورشوں کا سدباب ہو سکے اور رعایا اور سپاہیوں کے دلوں کو سکون و اطمینان نصیب ہو۔ قطب الدین کی تین لڑکیاں تھیں۔ قطب الدین کی نگاہ میں التمش اگلا حکمراں تھا وہ اسے اپنا بیٹا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ اور اس نے اسے بدایوں کا اقطاع سونپ دیا تھا۔ ملکوں نے بالاتفاق رائے اسے بدایوں بلا کر دہلی کے تخت پر بٹھایا۔ ایبک کی ایک لڑکی اس کی بیوی ہوئی۔" (ص:141)

چونکہ ارم شاہ کا انتخاب کچھ ایسے ترکی ملکوں کی محرومی کا سبب بنا جو بہت زیادہ لائق تھے اور ایبک کے ترکوں کے کچھ نہ کچھ حق دار بھی تھے لہٰذا اس کی تخت نشینی مزاحمتوں سے بچ نہ سکی۔ اس کی حکومت کی مدت کو ٹھیک متعین نہیں کیا جا سکتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آٹھ مہینوں سے زیادہ نہ رہی۔[1]

ارم کی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی ترکی امراء نے ملک کے مختلف حصوں میں آزادانہ طور پر حکومت کرنے یا اپنے حکمراں کو منتخب کر لینے کے حق کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا۔ قباچہ نے اُچھ اور ملتان پر چڑھائی کر دی۔[2] اور فرشتہ کے مطابق[3] اس نے بھکر اور شیورن پر قبضہ کر لیا۔ خلجی ملکوں نے بنگال میں بغاوت کر دی اور کچھ آزاد رایوں نے ترکی کی غلامی کا خاتمہ کر دیا۔[4]

فوجی کمانڈر (سپہ سالار) امیر علی اسمٰعیل نے اس سلسلہ میں پہلا قدم اٹھایا اور جو امیر داد اور دوسرے ترکی ملک اور افسران سے ملا ہوا تھا بدایوں کے گورنر التمش کے پاس ایک دعوت نامہ بھیجا جس میں اس نے جلد سے جلد اسے دہلی آنے کا اور تخت پر قبضہ کر لینے کا مشورہ دیا تھا۔ ہندستان میں ترکی حکومت کی خدمت کے سلسلہ میں التمش ایک ممتاز ریکارڈ کا حامل تھا۔ التمش کا انتخاب اس کی ذاتی خوبیوں کے علاوہ اس حقیقت کا بھی نتیجہ تھا کہ ایبک اسے ”بیٹا“ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اور اس نے اس کو بدایوں کا اقطاع سونپ دیا تھا جو اس بات کی ایک علامت سمجھی گئی کہ وہ التمش کو اپنا جانشین نامزد کرنے کی خواہش رکھتا تھا التمش نے فوراً اس دعوت کو قبول کر لیا اور دہلی کی طرف روانہ ہوا جہاں اس نے بغیر کسی دقت کے اپنے آپ کو مستحکم بنا لیا۔ دہلی کے قبضہ نے التمش کو اپنے مفادات کو ہر جانب سے موثر طور پر حفاظت کرنے کے لیے

---

(1) اب تک ارم شاہ کا کوئی سکہ دریافت نہیں ہوا ہے۔ ایڈورڈ تھومس اور لونگ ورتھ ڈیمس نے جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی، اپریل 1908ء میں اپنے مضمون کرمان کا دار الضرب، میں کچھ سکوں کو اس سے منسوب کیا ہے لیکن نلسن رائٹ کا خیال ہے کہ تھومس نے بہرام شاہ کے سکوں کو اور ڈیمس کے التمش کے ایک سکے کو غلطی سے ارم شاہ کا سکہ سمجھ لیا ہے۔

(2) منہاج، ص: 141

(3) فرشتہ، جلد اول، 64

(4) ایضاً

ایک فوجی مقام بہم پہنچایا۔

ارم نے امروہہ سے ایک مضبوط فوج اکٹھا کی اور التتمش کی بے دخلی کے لیے دہلی روانہ ہوا لیکن اسے اس کے ساتھ جنگ میں بری طرح پسپائی ہوئی۔ اس کے دو اہم ترکی لیڈر اقسنقر اور فرخ شاہ میدان جنگ میں مارے گئے اور خود ارم گرفتار کر لیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ ارم شاہ اور اس کے حامیوں کی اس چھوٹی جماعت کا معاملہ صاف ہو جانے کے باعث التتمش کی راہ کی پہلی رکاوٹ دور ہو گئی۔ لیکن دوسرے ترکی امراء نے بھی اس کے اقتدار کو چیلنج کیا۔ منہاج اگرچہ ہمیں پوری تفصیل نہیں بتاتا پھر بھی اس کے مندرجہ ذیل بیانات قابل توجہ ہیں :

"جب ترکی اور معزی امراء دہلی میں یکجا ہوئے تو ان میں سے کچھ باقی سے متفق نہ تھے لہٰذا وہ لوگ دہلی کے باہر آ کر جمع ہوئے اور بغاوت کا پروگرام بنایا۔ سلطان شمس الدین مرکز کے شہہ سواروں اور اپنی مخصوص فوج کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوا اور انہیں جود کے میدانی علاقہ میں شکست دی اور یہ حکم دیا کہ ان میں سے اکثر کے سر کاٹ لیے جائیں۔ دوسرے اور بھی متعدد موقعوں پر اس کے اور "ترکی امراء" کے درمیان جنگیں ہوئیں لیکن خدا نے اس کی مدد کی اور جس نے بھی اس کی مخالفت کی یا اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اسے منہ کی کھانی پڑی۔"

منہاج پھر آگے ہمیں بتاتا ہے کہ ایبک تک کی حکمرانی کے تمام علاقوں میں دہلی بدایوں، اودھ، بنارس اور پورا سیوالک کا علاقوں میں التتمش نے اپنی طاقت مستحکم کر لی۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ان علاقوں کو ہندو رئیس واپس لے چکے تھے بلکہ التتمش نے انہیں ترکی اور معزی امراء سے جنہوں نے اس کی مخالفت کی تھی حاصل کیا تھا۔[1]

---

(1) منہاج، ص: 71-170

2

سلطان شمس الدین التمش کے نام کے سلسلہ میں اختلاف

سلطان کے نام کے ہجے اور تلفظ کے سلسلہ میں گزشتہ سالوں میں کافی اختلاف رہا ہے۔ فارسی متنوں تاج المعاصر، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، آداب الحرب اور طبقات ناصری اور سکوں اور کتبوں کے مختلف مصنفین نے مختلف طریقوں پر پڑھا اور مختلف اندازوں میں ان کی تشریحیں کی ہیں۔ اس کے نام کی ہجے الفنسٹن نے التمش[1] (Altamish)، ایلیٹ نے التمش[2] (Altamsh) اور ریورٹی نے ایالتمش[3] (Iyaltimish) کی ہے۔ 1907ء میں ہارتھولڈ نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ لفظ اصل میں التوتمش (ILTUTMISH) تھا یعنی حکومت کو سنبھالنے والا۔[4]

اس نے اپنے اس خیال کی تائید میں موثر دلیلیں پیش کیں۔[5] اس نے بتایا کہ ''توت کا پڑھنا سینٹ پیٹرس برگ کی یونیورسٹی لائبریری میں موجود تاج المعاصر کے ایک بہترین مخطوطہ (مورخہ 829ہجری) سے ثابت ہے جس میں ''د'' حرف غلط

---

(1) ہسٹری آف انڈیا، پانچواں ایڈیشن 1866، ص: 371

(2) ایلیٹ اور ڈؤسن ص: 320

(3) صفحہ 597 میں ریورٹی لکھتا ہے کہ ''میرا سب سے پرانا مخطوطہ اعراب لگاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مرکب لفظ ہے اور اس کا پہلا حصہ ویسا ہی ہے جیسا کہ لیال ارسلن، ایال دوز وغیرہ کا ہے اور اس کا دوسرا حصہ ویسا ہی ہے جیسا کہ کالتمش اور اس طرح کے الفاظ کا۔

(4) بدایونی کا خیال ہے کہ (منتخب التواریخ پہلی جلد، ص: 62) سلطان کو ایسا اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ چاند گرہن کی رات کو پیدا ہوا تھا اس کی اس رائے کی وجہ سے بعض محققین نے لفظ التوتمش کے دور از کار معنی نکالنے کی کوشش کی ہے۔ ریڈہاؤس کی وضاحت کے لیے تھومس کی کرونیکل آف دی پٹھان کنگس آف دہلی، ص: 44 دیکھیے۔ (بقیہ ص: 302 پر)

ظاہر کیا گیا ہے۔ بار تھولڈ کے خیال کی توثیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اکثر ہم عصر شعراء کے فارسی کلام میں جب سلطان کا نام آیا ہے تو یہ (نام) اسی حالت میں قافیہ میں بیٹھ سکتا ہے جب اس کا تلفظ التوتمش کیا جائے۔[6]

گزشتہ تقریباً پچاس سالوں میں سلطان کا نام التتمش لکھا جاتا رہا۔ لیکن 1950ء میں ایک ترکی مصنف حکمت بایور[7] نے پورے مسئلہ پر از سر نو بحث کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ نام التتمش (ILetmish) ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستر قینوں نے خاص طور پر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے ایڈیٹروں نے بایور کے خیال کو تسلیم کر لیا۔ جیبی نے اس مسئلہ کے سلسلہ میں دو بڑے نوٹ چڑھائے ہیں۔[8] مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بایور کے خیال سے واقف نہ تھا۔ اس کی یہ رائے کہ ہم عصروں نے سلطان نام کتابوں کتبوں اور سکوں پر مختلف طریقوں سے لکھا ہے دستیاب معلومات کی محتاط تفتیش کی بنیاد پر ہے لیکن اس نے ان اختلافات کی کوئی وجہ نہیں بیان کی۔ اگرچہ ترکی اور یورپی اسکالروں کی اس سلسلہ میں لسانی تحقیقات نہایت قابل قدر ہیں۔ ہم کسی طرح اس قابل نہیں کہ اس لسانی پہلو پر کوئی اظہار خیال کر سکیں۔ لیکن سلطان کے نام کی کسی نئی شکل کو تسلیم کر لینا اس وقت تک بڑا مشکل ہے جب تک کہ وہ ہم عصر تصانیف اور سلطان کے نام کے بچے کھچے کتبوں میں پائے جانے والے اشعار کے قافیوں سے

امیر خسرو کے کلام سے (دیباچہ دیوان غرۃ الکمال، ص:68 دول رانی خضر خاں ص:48) اور شیخ نظام الدین اولیا کے ایک شعر جس کا امیر حسن نے حوالہ دیا ہے (فوائد الفواد، ص:156) سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے لفظ التتمش عالمگیر اور جہانگیر (جس کا مطلب دنیا کے فاتح ہے) کے ہم معنی ہے۔

(5) Z.D.M.G.، 1907ء، ص:192

(6) مثال کے طور پر منہاج کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ کریں: آں شہنشاہ کہ حاتم بذل و رستم کوشش است / ناصر الدین والدین محمود بن التمش است // (طبقات ناصری، ص:202)

تاج الدین رضا اور شہاب الدین مہمر اکی تصانیف میں جو کلام ملتے ہیں اس تلفظ کی توثیق کرتے ہیں۔ اور جے۔ ایل۔ بوائل (تاریخ جہاں گشا کا ترجمہ، جلد اول، ص:328) بھی التمش لکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔

(7) Belleten، انکرا

(8) طبقات ناصری (جیبی کا ایڈیشن) جلد دوم، ص:78-376، 18-417

مطابقت نہ رکھتا ہو۔[1] ہمارا تعلق نہ صرف اس شکل سے ہے جس میں خود سلطان اور اس کے ہمعصروں نے اس کے نام کا تلفظ ادا کیا اور اسے تحریر کیا۔

التتمش کی ابتدائی زندگی

التتمش ترکوں کے البری قبیلے کا تھا۔ اس کا باپ ایلیم خاں اپنے قبیلے کا سردار تھا اور اس کی بے شمار قرابتیں اور رشتہ داریاں تھیں اور ماتحتین و پیروکار تھے۔[2] اس طرح التتمش کی پیدائش ایک خاصے متمول ماحول میں ہوئی تھی۔ اور قدرت نے اسے اعلیٰ ذوق طبیعت کے علاوہ پرکشش شخصیت اور ذہانت بخشی تھی۔[3] ایک قبائلی خاندان میں جو بھائیوں، عم زاد بھائیوں، سوتیلے بھائیوں اور دوسرے لوگوں پر مشتمل تھا وہ ان لوگوں کی حسد و جلن سے جو اس کی لیاقت و صلاحیت سے کتے تھے۔ مشکل ہی سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اپنے باپ کو جو عام طور پر التتمش کو باہر جانے نہ دیتا تھا اس بات پر راضی کیا کہ وہ اسے ان لوگوں کے ساتھ ایک گھوڑے کے تماشہ میں جانے دیں۔ وہاں ان لوگوں نے زبردستی اسے ایک تاجر غلام کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اس طرح اپنے خاندان سے جدا ہو کر التتمش کو اپنی زندگی کئی سالوں تک غلام تاجروں کے رحم و کرم پر گزارنا پڑی۔ اسے بخارا لایا گیا اور وہاں صدر جہاں کے ایک عزیز کے ہاتھوں اسے فروخت کر دیا تھا۔ یہ ایک معزز اور شریف خاندان تھا اور وہاں التتمش کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا۔ اس خاندان میں قیام کے دوران اپنی زندگی کا ایک دلچسپ

---

(1) قطب مینار پر اس کا نام التوتمش لکھا ہے: (دوسری منزل پر) التوتمش القطبی (دروازے پر) اور التتمش السلطان (تیسری منزل پر)، لسٹ آف محمڈن اینڈ ہندو (مونومنیٹس، کلکتہ 1919-22، جلد دوم، ص:5-6) ملاحظہ ہو۔

سکوں کے متعلق اس سلسلہ میں ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو۔ نیلسن رائٹ دی کوئنج اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطانس آف دہلی، ص:69-71

(2) منہاج، ص:66-7 منہاج کا بیان حضرت یوسف کی قرآنی تاریخ کی بنیاد پر معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ ایک یا دو قرآنی آیتوں کا حوالہ دیتا ہے۔ لیکن اس حقیقت پر کہ التتمش ایک متمول البری خاندان کا تھا اور اسے تاجرین غلاموں کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا تھا یقین نہ کرنے کی یہ کوئی وجہ نہیں۔

(3) ایضاً، ص:168، تاریخ جہاں کشا، جلد دوم، ص:38

واقعہ بیان کرتا ہے۔ ”ایک مرتبہ اس خاندان کے ایک فرد نے مجھے ایک معمولی رقم دی اور کہا کہ بازار چلے جاؤ اور میرے لیے کچھ انگور لے آؤ۔ راستہ میں مجھ سے پیسہ گم ہو گیا اور چونکہ اس وقت میں بہت کم عمر تھا لہٰذا ڈر سے رونے لگا۔ ایک درویش نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کچھ انگور خرید کر دیے اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ ”جب تمہیں طاقت واقتدار حاصل ہو جائے گا تو کیا تم پرہیزگاروں اور راہبوں کی تعظیم و تکریم کرو گے اور ان کی بھلائی کا خیال رکھو گے؟ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔[1]“

صدر جہاں کے خاندان کے بعد التتمش ایک تاجر غلام کے ہاتھوں پڑ گیا جو بخاراحاجی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے بعد دوسرے تاجر جمال الدین محمد چسپ قبا نے اسے خرید لیا اور اسے غزنی لے آیا۔[2]

عصامی[3] اور دوسری تصانیف[4] سے پتہ چلتا ہے کہ التتمش نے اپنا کچھ وقت بغداد میں بھی گزارا جو منگولوں کے ذریعے دیے گئے خونی غسل سے پہلے اپنی متمدن زندگی کے آخری دور سے گزر رہا تھا۔ یہاں اس کی ملاقات (عوارف المعارف کے مشہور مصنف) شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ اوحاد الدین کرمانی اور اس زمانے کے دوسرے محترم بزرگوں سے ہوئی۔[5] صوفیاء سے اس تعلق نے اس کے نوخیز دماغ پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ ابتدائی عہد کے تصوفی لٹریچر میں بہت سی ایسی حکایتیں ملتی ہیں جو صوفیاء اور تصوف سے اس کی دلچسپیوں سے متعلق ہیں۔[6]

---

(1) منہاج، ص:167

(2) ایضاً، ص:168، چست قبا، ہو سکتا ہے کہ کسی خاندان کا نام ہو کیونکہ منہاج ہمیں بتاتا ہے کہ اس زمانہ میں جب التتمش بدایوں کا گورنر تھا اس نے ملک سیف الدین ایبک ’یغان تت“ کو کسی اختیار الدین چست قبا کے ورثاء سے خریدا تھا۔

(3) فتوح السلاطین، مدراس ایڈیشن، ص:119

(4) فوائد الفواد، ص:212، طبقات اکبری، جلد اوّل، ص:62، فرشتہ جلد اوّل، ص:62-60

(5) فوائد الفواد، ص:212

(6) نظامی، اسٹڈیز ان میڈی ول انڈین ہسٹری اینڈ کلچر، ”التتمش کی مذہبی زندگی اور رجحانات“ کے باب کے تحت ملاحظہ ہو نیز اسلامک کلچر، اپریل 1946،

جب جمال الدین چست قبا اسے غزنی کے غلام بازار میں لایا تھا تو اس نے اپنی دلربا خصوصیات و ذہانت کی بنا پر پورے بازار کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ اس کے آمد کی اطلاع سلطان معزالدین کو دی گئی اور سلطان نے ایک ہزار سونے کی اشرفیاں التمش اور اس کے ساتھ ایک دوسرے غلام طمغان ایبک کے بدلے پیش کیں[1]۔ جمال الدین نے یہ سودا قبول نہ کیا اور سلطان نے ان غلاموں کو غزنی میں فروخت کرنے کی ممانعت کردی۔ غزنی میں ایک سال ٹھہرنے کے بعد جمال الدین بخارا چلا گیا جہاں اس نے تین سال قیام کیا پھر وہ غزنی چلا گیا۔ اسے غزنی میں ٹھہرے ہوئے ایک سال ہوا تھا کہ قطب الدین ایبک ملک ناصر الدین حسین کے ساتھ اپنی گجرات کی مہم کے بعد غزنی آیا[2]۔ اس کی توجہ التمش نے اپنی طرف کھینچ لی اور اس نے اسے خریدنے کے لیے معزالدین کی اجازت طلب کی۔ سلطان نے جواب دیا کہ چونکہ غزنی میں اسے بیچنے کی اجازت نہیں لہٰذا اسے شہر دہلی لے جانے دو جہاں اسے خریدا جا سکتا ہے[3]۔ ایبک نے جمال الدین چست نے قبا کو ضروری ہدایت دی اور دہلی میں التمش کو طمغج کے ساتھ ایک لاکھ جتل میں خرید لیا گیا[4]۔ طمغج کو تبرہندہ کا مقطع بنا دیا گیا اور قطب الدین اور یلدوز کی درمیانی جنگ میں وہ مارا گیا۔

التمش کو کیا ابتدائی تعلیم دی گئی اس کا پتہ چلانا مشکل ہے لیکن اسے ضروری

---

(1) منہاج کہتا ہے: ہزار دینار زر کنی (ص 168)، ہو سکتا ہے کہ "زر کنی" سے مطلب خالص ہو۔
ملاحظہ ہو ہوڈی ولا اسٹوائزان اِن مسلم ہسٹری

(2) منہاج، ص 168، منہاج ایبک کی آمد کا سال نہیں بتاتا ہے۔

(3) ایضاً ص 168 یہ واقعہ دیگر باتوں کے علاوہ معزالدین کی سلطنت میں تاجروں کی پوزیشن پر روشنی ڈالتا ہے۔ سلطان صرف اتنا ہی کر سکا کہ وہ اس غلام کو غزنی کے شہریوں کے ہاتھوں فروخت کیے جانے پر پابندی لگا دے۔ مگر اس نے نا ہی جمال الدین کو دہلی سے بے دخل کیا اور نہ اس کے دربار آنے پر پابندی لگائی باوجود اس کے کہ سلطان اس سے ناخوش تھا چست قبا نے غزنی اپنے آپ کو محفوظ سمجھا اور وہ دوبارہ وہاں سے اپنے کاروبار کے لیے آیا۔

(4) موجودہ روپے کے حساب سے اس کا شمار کرنا بڑا مشکل ہے۔ ڈاکٹر عزیز احمد کا انداز نلسن رائٹ (دی کوائج اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطان آف دہلی ص ص 75-72) سے حاصل کردہ اعداد و شمار کی معلومات کی بنیاد پر یہ ہے کہ ایک لاکھ جتل -/5/ 2,083 روپے کے برابر ہوتا ہے (ارلی ترکش امپائر آف دہلی ص 161)

ہی عمدہ تعلیم ملی ہو گی۔ منہاج کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ اسے تقریباً جلد ہی سر جاندار (محافظ دستہ کا سردار) بنادیا گیا۔ یہ ایک غیر معمولی ترقی تھی کیونکہ یہ ایک اہم ذمہ داری ہوتی تھی۔ جسے ایک ایسے غلام کے سپرد نہیں کیا جا سکتا جو ابھی بازار سے لایا گیا ہو۔ بہر حال منہاج یہ بات قطعی طور پر لکھتا ہے کہ قطب الدین نے اسے قابل تعریف صلاحیتوں سے بھرپور پایا اور اسے ایک عہدے سے دوسرے عہدے پر ترقی دیتا گیا۔ یہاں تک کہ اسے امیر شکار[1] بنادیا گیا۔ گوالیار کی فتح (597 ہجری 1200ء) کے بعد اسے اس شہر کا امیر بنادیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چار سال کے اندر ہی التتمش نے حکومت کرنے کے لیے ایک اقطاع حاصل کر لیا۔ اس کے بعد اسے باران اور اس کے مضافات کے اقطاع ملے۔ اس نے ان علاقوں کا انتظام بڑی حسن وخوبی سے انجام دیا جس سے خوش ہو کر قطب الدین نے بدایوں کے اقطاع بھی اس کے سپرد کر دیئے جیسا کہ ریورٹی نے بتایا ہے، سلطنت دہلی کا سب سے بڑا اقطاع تھا۔[2]

جب معزالدین 6-1205ء میں کھوکھروں کی سرزنش کے لیے غزنی سے روانہ ہوا تو اس نے دہلی کی فوجوں کو بھی بلا بھیجا۔ بدایوں دستہ کے ساتھ التتمش بھی ایک کے ساتھ شامل تھا۔ اس موقع پر التتمش نے غیر معمولی ہمت اور سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کھوکھروں کو جھیلم میں کھدیڑ کر بیچ دریا تک ان کا تعاقب کیا اور وہاں ان کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ معزالدین نے اس کے بہادرانہ کاموں کو تعریفی نگاہوں سے دیکھا اور اس کے سلسلے میں اس نے چھان بین کی۔ اس کے بعد اس نے التتمش کو عزت کا ایک خاص خلعت بخشا۔ اور ایک کو اس کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تلقین کی تاکہ وہ اپنے آپ کو ممتاز بنا سکے[3]۔ اس نے مزید حکم دیا کہ اس کے لیے خط عتق (غلامی سے آزاد کی ایک دستاویز) تیار کی جائے[4]۔ حقیقت میں یہ ایک انوکھی ہمت افزائی تھی

---

(1) معزالدین کی زندگی میں التتمش کی ان عہدوں پر تقرری ضمناً اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ معزالدین کے غلام بھی بڑے عہدوں پر فائز ہوئے اور قایم رہے جنھیں عہد وسطیٰ کے کسی حکمراں کے خصوصی حقوق میں شامل سمجھا جاتا تھا۔

(2) طبقات ناصری انگریزی ترجمہ، ص 604

(3) منہاج-170

(4) ایضاً-170

حالانکہ معزالدین نے اپنے اعلیٰ غلاموں جیسے یلدوز، ایبک اور قباچہ کو بھی آزادی نہیں بخشی تھی لیکن اس نے التتمش - اپنے غلام کے ایک غلام کو آزادی بخش دی۔ شاید التتمش کی غلامی سے رہائی کا صحیح طور پر اعلان نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس کی تخت نشینی کے وقت علماء کا ایک وفد قاضی وجیہہ الدین کاشانی کی قیادت میں یہ معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوا کہ آیا اس نے اپنی غلامی سے رہائی کا پروانہ حاصل کیا ہے یا نہیں[1]۔

التتمش کی مشکلات

التتمش کو خانگی اور بیرونی دونوں طرح کی بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ معزی امراء اور ترکی غلام افسران دونوں ہی طرح کے تمام باغیوں کو کچل کر جس طریقہ پر اس نے قطب الدین ایبک کی سابقہ سلطنت پر اپنا قبضہ جمایا اسے پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے لیکن اب بھی تین بڑی طاقتیں - غزنی میں یلدوز، ملتان میں قباچہ اور لکھناوتی میں علی مردان - میدان میں تھیں جن سے التتمش کو اپنے تعلقات کی بنیاد کو طے کرنا تھا۔ یا تو انھیں قبول کر لینا تھا یا ان کا صفایا کر دینا تھا۔ ان کا قبول کر لینا دہلی کے موت کے پروانے پر دستخط کر دینے کے مترادف تھا اور ان کا صفایا کر دینا ایک محتاط پروگرام کے بغیر اور تمام ذرائع ہموار کیے بغیر ممکن تھا۔ جالور اور رنتھمبور کے ہندو سرداروں نے ترکوں کے غلامی کے طوق کو اتار پھینکا تھا۔ ملک کے مختلف علاقوں میں عام طور پر دہلی کا کنٹرول ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اپنے باغی امراء التتمش کی بالادستی کے بعد یلدوز نے اسے ایک چھتر اور ایک دورباش بھیجا۔ یہ تحفے اس بات کی علامت تھے کہ التتمش ایک ماتحت حکمراں ہے کیونکہ اس زمانہ میں حقیقی آزاد حکمرانوں کو خلافت سے ایک خلعت حاصل کرنا پڑتی تھی۔ ہنوز یلدوز ایک اعلیٰ معزی افسر تھا۔ التتمش کے سسر کا سر - التتمش نے اس ماتحتی کی جس کو نشاندہی وہ تحائف کر رہے تھے قبول کیا اور مناسب موقع کا منتظر رہا۔ یلدوز اس بات سے لاعلم تھا کہ وہ ایک طوفان کے دہانے پر کھڑا ہے۔

---

(1) منہاج ص 170

(2) ایضاً ص 170

(3) ابن بطوطہ، رحلہ (قاہرہ ایڈیشن 1928) جلد دوم ص 21

مجمل طور پر التتمش کے 26 سالہ دورِ حکومت کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (1) 1210ء سے 1220ء تک جب کہ وہ خالص طور پر اپنے اقتدار کے مخالفین سے نمٹنے میں مشغول رہا (2) 1221ء سے 1227ء تک جب اسے اپنی توجہ ان حالات کی طرف موڑنی پڑی جو چنگیز خاں کے حملہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے اور (3) 1228ء سے 1236ء تک جب وہ اپنے ذاتی اور خاندانی اقتدار کے استحکام میں مشغول تھا۔

پہلا دور (1220-20ء)

دو نہایت اہم حریف جن سے التتمش کو اس دور میں نمٹنا تھا وہ یلدوز اور قباچہ تھے۔ جب خوارزمیوں نے یلدوز کو غزنی سے کھدیڑ دیا تو وہ فوراً لاہور کی طرف بڑھا اور قباچہ کو بے دخل کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ فرشتہ کے مطابق اس نے پنجاب میں تھا نیسور تک کا علاقہ داخل کر لیا۔ یہی موقعہ التتمش کے وار کرنے کا تھا کیونکہ اگر یلدوز پنجاب میں اپنا اقتدار جمانے میں کامیاب ہو جاتا تو التتمش دہلی میں محفوظ نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا وہ یلدوز کی پیش قدمی روکنے کے لیے روانہ ہوا۔ یلدوز نے التتمش کے پاس ایک پیغام بھیجا جس میں اس نے کہا تھا کہ وہی اس کا حقیقی جانشین ہے اور ہندستانی بادشاہت کا زیادہ حقدار ہے۔ التتمش نے اس کا یہ جواب دیا کہ ”زمانہ بدل چکا ہے اور یہ ایک نیا دور ہے۔ غزنیوں اور غوریوں کے ساتھ کیا ہوا؟ موروثی جانشینی کا زمانہ ختم ہو گیا۔[1] یہ جواب التتمش کے اس مستحکم فیصلہ کا اظہار تھا کہ دہلی کو یلدوز کے قبضہ میں لے جانے کی کوششوں کا وہ قلع قمع کر دے گا۔ بہر حال التتمش نے یلدوز سے گفت و شنید کی اس شرط پر پیش کش کی۔ وہ دونوں بالکل تن تنہا گفتگو کریں۔ یلدوز نے جنگ کا فیصلہ کیا اور ترائن[2] کے تاریخی میدان کی جنگ میں یلدوز شکست کھا گیا۔ (1215-16ء)۔ عصامی[3] کے مطابق وہ ہانسی بھاگا لیکن اسے گرفتار کر کے التتمش کے سامنے پیش کیا گیا۔ حسن نظامی کے اس بیان کے پیش نظر یلدوز معید الملک محمد جنیدی[4] کے ایک تیر سے زخمی ہو گیا اور اپنے بہت سے سرداروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

---

(1) فتوح السلاطین، مدراس ایڈیشن ص 110-11، التتمش کے اہم خیالات یہاں مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں۔

(2) منہاج (ص 135) حدود ترائن، لکھتا ہے جبکہ حسن نظامی کے مطابق (تاج المعاصر) جنگ سامانہ میں لڑی گئی تھی۔ (3) فتوح السلاطین ص 112 (4) تاج المعاصر (مخطوطہ)

پھر اسے بدایوں لاکر مار ڈالا گیا[1]۔ یہ التتمش کی دوہری جیت تھی۔ اپنے بادشاہت کے ایک خطرناک حریف کا راستے سے ہٹ جانا اور غزنی سے مکمل طور پر الگ ہو جانا جو سلطنت دہلی کی ایک آزاد حیثیت کی ضمانت تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ التتمش لاہور اور پنجاب کے دوسرے علاقوں پر فوری طور پر قبضہ کرنے سے رُک گیا۔ اس کے اور قباچہ کے درمیان کسی طرح کا سمجھوتہ ہو گیا اور موخرالذکر کو لاہور پر کچھ دنوں حکومت کرنے کی اجازت دے دی گئی لیکن قباچہ کے ارادے اس سے کہیں زیادہ اونچے تھے جتنا کہ التتمش برداشت کر سکتا فرشتہ کے مطابق وہ اپنے اختیارات سرہند تک وسیع کرنا چاہتا تھا۔ التتمش پنجاب کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں فوری اقدام کا فیصلہ کیا اور 614 ہجری / 1217ء میں وہ قباچہ کے خلاف نکل کھڑا ہوا۔ قباچہ التتمش کی طاقتوں کے حملہ سے بھاگ نکلا لیکن اس کا پیچھا کیا گیا اور دریائے چناب پر منصورا کے نزدیک اسے جنگ کرنا پڑی جس میں اسے ذلت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس کا خاتمہ ابھی دور تھا۔ التتمش نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کے حوالہ کر دیا[2]۔ قباچہ کو التتمش کے حملہ سے جس بات نے مہلت دی وہ جلال الدین منکبرنی کا ہندستان آنا تھا۔

دوسرا دور - چنگیز خاں اور منکبرنی (27-1221ء)

چنگیز خاں کے ساتھ خوارزم شاہ کی کشمکش کی تفصیلات پر بحث پہلے ہی کی جا چکی ہے۔ خوارزم شاہ کا بڑا لڑکا جلال الدین منکبرنی چنگیز خاں کی گرفت سے بچتا بچاتا وادی سندھ پہنچا۔ لیکن قریب سے ہی اس کا تعاقب کرتا ہوا چنگیز خاں بھی پہنچ گیا۔ جوینی لکھتا ہے کہ ”سلطان آگ اور پانی کے درمیان تھا۔ ایک طرف سندھ کا پانی اور دوسری طرف تباہ کن آگ کی طرح ایک فوج تھی بلکہ یوں کہیے کہ ایک طرف اس کا

---

(1) منہاج اس کی، شہادت، کا حوالہ دیتا ہے اور کہتا ہے اور اس کا مقبرہ (بدایوں میں) ایک زیارت گاہ بن گیا ہے اور لوگ وہاں اپنی التجاؤں کے پورا ہونے کے لیے اس کی روحانی برکت حاصل کرنے آتے ہیں۔ طبقات ناصری، ص 135

(2) تاج المعاصر، جیسا کہ حبیب اللہ نے حوالہ دیا ہے (فاؤنڈیشنس، نیا ایڈیشن ص ص 94-107

دل آگ میں تھا تو دوسری طرف اس کا چہرہ پانی کی طرف تھا۔ پھر بھی وہ دل شکستہ نہ ہوا بلکہ مردانگی سے کام لیا۔ مقابلے کے لیے تیاری کی اور جنگ کے شعلوں کو بھڑکایا[1]۔ اور صرف سات سو آدمیوں کی جماعت کے ساتھ وہ چنگیز خاں کی فوج کے سامنے ڈٹا رہا۔ حقیقت میں یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا۔ بہرحال موقع کی نزاکت انتہا کو اس وقت پہنچ گئی جب منکبرنی کے لیے کسی طرح کی فوجی نقل و حرکت کے لیے کوئی جگہ ہی باقی نہ رہی۔ اس کے چچیرے بھائی اخش ملک نے موقع کی نزاکت کا اندازہ لگالیا۔ اس کی لگام پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ اشک آلود آنکھوں اور خشک ہونٹوں سے اس نے خاندان کو الوداع کہا اور دوسرے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ منگولی فوج کو پیچھے دھکیل کر اس نے اپنے گھوڑے پر کوڑا لگایا، اور اس نے دس ایل یا سے زیادہ کے فاصلے سے پانی میں گھوڑے کو لے کر چھلانگ لگادی[2]۔ اور بحفاظت وہ دریار کے دوسرے کنارے پر جا پہنچا۔ عطا ملک جوینی لکھتا ہے کہ "چنگیز اور تمام منگولوں نے حیرت سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس بہادری کا مشاہدہ کرنے کے بعد چنگیز خاں نے اپنے لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ایک باپ کو ایسا ہی بیٹا چاہیے۔[3]"

التمش کو صرف جلال الدین منکبرنی کی آمد کو ہی نہیں بلکہ عجم پر منگولوں کے تسلط کو بھی ذہن نشین رکھنا تھا۔ بھیڑیوں کی جلی ہوئی مونڈے کی ہڈیوں نے جن سے چنگیز خاں فال[4] نکالتا تھا، یا خود اس کی اپنی عقل سلیم نے اسے شمالی ہندستان کے بیچ سے گزر کر ہمالیہ کو پار کر کے منگولیہ اور چین واپس جانے سے روک دیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی دشوار گزار راہ تھی۔ چنگیز نے صرف اپنے افسروں کو سندھ کے اس پار بھیج دیا۔ ممالک

---

(1) تاریخ جہاں گشا، (انگریزی ترجمہ بوائل کا) جلد دوم 409

(2) ایضاً ص 140، وہ جگہ جہاں سے اس کے گھوڑے نے چھلانگ لگائی تھی اب چاؤل جلالی کے نام سے مشہور ہے ایک ایل اندازاً 45 انچ کے برابر ہوتا ہے۔

(3) ایضاً 411

(4) منہاج لکھتا ہے "وہ (چنگیز) نے بھیڑوں کو (مونڈھوں کے) برابر جلا رہا تھا اور ان کا معائنہ کر رہا تھا، (تاکہ وہ ہند میں داخل ہونے کے سلسلے میں فال نکال سکے) لیکن ہند میں داخلے کی اجازت کا فال نہیں نکل پاتا تھا۔ فال نکالنے کی اس قسم کی وضاحت کے لیے ڈبلیو، ڈبلیو، ڈبلو۔ روک ہل کے ترجمہ، دی جرنی آف ولیم آف روبرک ٹو دی ایسٹرن پارٹس آف دی ورلڈ، لندن 1900ء، ص ص 88۔187 ملاحظہ ہو۔

پے در پے منگولوں کے قبضہ میں آتے جارہے تھے اور التتمش نے یہ طے کرلیا تھا کہ دہلی کی سلطنت بھی اس گرداب میں نہ پھنس جائے۔ اب پنجاب اور بالائی سندھ ساگر دوآب (کا علاقہ) چنگیز، قباچہ منکبرنی اور کسی حد تک کھوکھروں کے جنرلوں کے درمیانی کشمکش کا ایک اکھاڑہ بن گیا تھا۔ التتمش اس کشمکش کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا رہا۔ اس جنگ میں جو بھی کمزور ہو جاتا التتمش ہی کو فائدہ پہنچتا بشرطیکہ منگول کنارہ کشی اختیار کرلیں[1]۔ جب منکبرنی ایک کھوکھر سردار رائے کھوکھر سن کن کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو گیا[2]۔ تو التتمش کے لیے ایک پریشان کن صورت حال پیدا ہو گئی۔ لیکن وہ سکون کے ساتھ حالات کو دیکھتا رہا۔ اس کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ کوئی غلط اقدام (جلدی میں) نہ کرے گا۔

شاید اس بات کی یقین دہانی کے لیے منکبرنی دہلی سے کسی طرح کی مدد حاصل نہ کر سکے۔ چنگیز خان نے التتمش کے پاس اپنے سفیر بھیجے۔ منگول سفراء کا خیر مقدم التتمش نے کس طرح کیا اس بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن اس کی پالیسیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اس نے اس بات کی کوشش کی کہ منگولوں کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ مل سکے۔ لیکن جتنے دنوں تک چنگیز خاں زندہ رہا (اس کا انتقال 1227ء میں ہوا) اس کی یہی کوشش رہی کہ دریائے سندھ کے اس پار کے علاقوں پر اپنے اختیارات نہ پھیلائے۔

سندھ ساگر دوآب میں اپنے کو مستحکم کر لینے کے بعد منکبرنی نے سیالکوٹ ضلع میں بسرور (پسرور) کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ وہ دہلی سے تقریباً دو یا تین دن کی مسافت کی دوری پر تھا کہ اس نے ایک سفیر عین الملک کو اپنے اس پیغام کے ساتھ التتمش کے پاس بھیجا کہ ”قسمت کے نشیب و فراز نے مجھے یہ حق بخشا ہے کہ میں تمہاری ملاقات کے لیے حاضر ہوں۔ میرے جیسے مہمان کبھی کبھار ہی آتے ہیں۔ اگر ہم بہبودی کی خاطر ایک دوسرے کی تعاون و مدد کے رشتہ میں بندھ جائیں تو ہمارے مقاصد اور منصوبے پورے ہو سکتے ہیں۔ جب ہمارے مخالفین کو اس اتحاد کے بارے میں، جو ہمارے درمیان ہو گا، اچھی طرح علم ہو جائے تو ان کی مزاحمت کے

---

(1) نظامی، ریلجن اینڈ پالیٹکس آف انڈیا ڈیورنگ دی 13 سینچوری ص ص 31-330

(2) تاریخ جہاں کشا انگریزی ترجمہ جلد دوم ص 414

دانت کند ہو جائیں گے۔[1]" اس نے مزید التتمش سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اسے کوئی ایسی جگہ دے جہاں وہ چند دن گزار سکے لیکن التتمش اتنا نادان نہ تھا کہ وہ اس پھسلاوے کے پیغام کا شکار ہو جاتا۔ عطا ملک جوینی لکھتا ہے کہ اس نے کئی دن تک اس سلسلہ میں غور کیا اور بالآخر اس نے اس پر عذر پیش کیا کہ اس علاقہ میں نہ کہیں آب و ہوا سازگار ہے اور نہ کوئی ایسا مقام ہے جو ایک بادشاہ کے لیے موزوں ہو[2]۔ عین الملک پر حملہ کر کے مار ڈالا گیا۔ منہاج کے[3] مطابق خود التتمش، منکبرنی کے خلاف ایک فوج لے کر روانہ ہوا لیکن منکبرنی نے مقابلہ سے منہ موڑا۔ اور وہ "بلالا اور نکالا کی سرزمین" کی طرف چلا گیا جہاں اس نے دس ہزار سپاہیوں کی ایک فوج تیار کر لی[4]۔

اس کے بعد منکبرنی نے اپنی توجہ قباچہ کی طرف موڑ دی۔ یہ التتمش کے لیے قابل اطمینان بات تھی۔ (منکبرنی) کے ایک کھوکھر رفیق نے بھی ایک فوج سے اس کی مدد کی۔ اچھ کے نزدیک قباچہ کی فوج کو ایک جنگ میں سخت پسپائی ہوئی اور وہ سکر اور بھکر[5] اور وہاں سے ملتان بھاگ گیا۔ قباچہ نے ان چند قیدیوں کو واپس کر دیا جو اس کے قبضہ میں تھے۔ اور بڑی بڑی رقمیں بھیج کر اس نے منکبرنی سے درخواست کی کہ اس کے علاقہ میں چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ چونکہ موسم ناخوشگوار ہوتا جا رہا تھا لہٰذا منکبرنی جڈ کے پہاڑوں میں اپنے گرمیوں کے کوارٹروں میں منتقل ہو گیا۔ لیکن جلد ہی منگولوں کی نقل و حرکت کی اطلاع نے اسے اپنی گرمیوں کی قیام گاہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جب وہ ملتان سے گزر رہا تھا تو اس نے قباچہ سے نعل بہا[6] (جوتے کی رقم) طلب کی۔ یہ بات قباچہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ لہٰذا وہ اس کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن منکبرنی نے اس جگہ ایک گھنٹے سے زیادہ نہ ٹھہرا اور اُچھ کے لیے روانہ ہو گیا۔ جبکہ

---

(1) ایضاً ص 413

(2) ایضاً ص 414

(3) طبقات ناصری ص 171

(4) تاریخ جہاں کشا (انگریزی ترجمہ) جلد دوم ص 414

(5) ایضاً ص 414 غالباً یہاں بھکر کا قلعہ مراد ہے "ایلیٹ اینڈ رسن" بھی ملاحظہ ہو جلد دوم ص ص 554

(6) وہ رقم جو بادشاہ اس علاقہ کے حاکم سے طلب کرتا تھا جہاں سے وہ گزر رہا ہو۔ یہ رقم اس گھوڑے کی نعل کی قیمت کے طور پر تھی جس پر بادشاہ اس وقت سوار ہوتا۔ (ایضاً ص 145)

قباچہ مکمل طور پر ملتان میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔

1224ء میں منکبرنی نے ہندستان چھوڑ دیا اور التمش اپنی فتوحات اور استحکام کے پروگراموں کو عمل در آمد کرنے کے لیے آزاد ہو گیا۔ لیکن تب بھی وہ سندھ یا پنجاب کی سیاست میں بے سمجھے بوجھے چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا۔ جتنے دنوں چنگیز زندہ رہا التمش ان علاقوں کی سیاست میں سنجیدگی سے حصہ لینے سے گریز کرتا رہا۔ جلال الدین منکبرنی کی روانگی کے بعد جس علاقہ کی طرف اس نے سب سے پہلے توجہ کی وہ بنگال تھا۔

تیسرا دور (36-1228ء) بنگال اور بہار

علی مردان نے قطب الدین ایبک کی عسکری اور اخلاقی حمایت کے ذریعہ بنگال میں اپنا اقتدار قایم کر لیا تھا وہ ایک نہایت جابر فرماں روا ثابت ہوا۔ اس کے دو سال حکومت کرنے کے بعد اس کے افسروں نے اسے قتل کر دیا اور غالباً 1211ء کے بعد حسام الدین عوض خلجی کو اس کی جگہ پر بٹھایا گیا[1]۔ عوض نے اپنا خطاب سلطان غیاث الدین رکھا اور ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے کاموں کا آغاز کیا[2]۔ التمش (اس وقت) وادی سندھ کے معاملات میں اتنا زیادہ الجھا ہوا تھا کہ وہ بنگال کی سیاست میں مداخلت نہ کر سکا۔ عوض نے التمش کی ان مشغولیات کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے اختیارات بہار تک وسیع کر لیے۔ اور جاجنگر، ترہت، بنگ اور کامروپ کی ریاستوں سے اس نے جبراً مال گزاری وصول کی[3]۔

جیسے ہی شمالی مغربی سرحدوں پر سے بادل چھٹ گئے التمش نے مشرقی علاقوں کی طرف توجہ کی اس نے دریائے گنگا کے جنوب میں بہار کے تمام ضلعوں پر قبضہ کر لیا اور وہاں ایک گورنر کی تقرری کی[4]۔ وہاں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد وہ 622ہجری / 1225ء میں گنگا کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ عوض اپنی راجدھانی سے التمش کی پیش قدمی روکنے کی غرض سے روانہ ہوا لیکن بالآخر اس نے مطیع ہو

---

(1) منہاج، ص160

(2) ایضاً ص161

(3) ایضاً ص163

(4) ایضاً ص163

جانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دہلی کی فرماں روائی کو تسلیم کر لیا اور ایک کثیر زر تاوان ادا کیا[1]۔ التتمش نے ملک جانی کو بہار کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن التتمش کی واپسی کے فوراً بعد ہی عوض پھر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے جانی کو بے دخل کر کے ایک آزاد حیثیت قایم کر لی۔ التتمش نے فوری انتقامی کارروائی نہ کی لیکن اس نے اپنے بیٹے ناصر الدین محمود، جو اس وقت اودھ کا گورنر تھا، کو مشرق کے حالات کا جائزہ لیتے رہنے اور مناسب وقت پر حملہ کر دینے کے لیے ہوشیار کر دیا۔ جوابی کارروائی میں اس تاخیر کو عوض نے التتمش کی ایک کمزوری سمجھی۔ وہ مشرق کی جانب ایک مہم پر روانہ ہوا لیکن جیسے ہی ناصر الدین محمود کو اس بات کا پتہ چلا اس نے فوراً لکھناؤتی کا محاصرہ کر لیا۔ عوض اپنی راجدھانی کی حفاظت کے لیے واپس پلٹا لیکن اسے شکست ہوئی اور اسے مار ڈالا گیا۔

اب لکھناؤتی پر التتمش کا کنٹرول ہو گیا اور اس نے اپنے بیٹے ناصر الدین محمود کو وہاں کے معاملات سپرد کر دیے۔ عوض نے تقریباً بارہ سال حکومت کی۔ منہاج لکھتا ہے کہ "جب مصنف 641 ہجری، 44-1243ء میں لکھناؤتی گیا تو اسے اس علاقہ میں اس بادشاہ کے عوامی بہبودی کے کام نظر آئے" ان کاموں میں سب سے اہم ایک طرف لکھناؤتی اور لکھنور اور دوسری طرف لکھناؤتی اور دیوکوٹ کے درمیانی دریاؤں پر پلوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ پل دس سے لے کر بارہ دنوں کی مسافتوں کے ہیں "برسات کے موسم میں یہ پورا علاقہ سیلاب زدہ ہو جاتا ہے اور ایک آدمی صرف کشتیوں پر سفر کر سکتا ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں پلوں کی وجہ سے یہ راستے تمام لوگوں کے لیے قابل گزر ہو گئے تھے" التتمش جب 1229ء میں ملک اختیار الدین بلکا کی بغاوت فرد کرنے کی غرض سے مشرق کی جانب گیا اور اس نے عوض کے رفاہ عامہ کے کاموں کا مشاہدہ کیا تو وہ ہمیشہ اس کو "سلطان" کہتا تھا۔ اس نے کہا کہ "ایک ایسے حکمراں کو جس نے اتنے اچھے کام سر انجام دیے۔ سلطان غیاث الدین کے نام سے یاد کرنا بے جا نہ ہوگا[2]۔

رنتھمبور اور مندور

1226ء میں التتمش نے اپنی توجہ رنتھمبور کے قلعہ کی طرف مرکوز کی جو

---

(1) ایضاً 171-163

(2) ایضاً ص 64-162

ناقابلِ تسخیر ہونے کی حیثیت سے مشہور تھا۔ ایک روایت تھی کہ سترہ حکمراں اسے فتح کرنے میں ناکام رہ چکے تھے لیکن التتمش نے 623ء ہجری / 1226ء میں اسے فتح کر لیا۔ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا اور اس چیز نے راجپوتانہ میں سلطان کی حیثیت مستحکم کر دی۔

اگلے سال 624 / 1227ء میں التتمش سیوالک کے مندر قلعہ کے خلاف روانہ ہوا اور اسے بھی فتح کر لیا۔

قباچہ کے خلاف اقدامات

راجپوتانہ میں چند فوجی اسٹیشن قایم کر لینے کے بعد التتمش سندھ میں مزید موثر اقدامات کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ لیکن اس علاقہ کی طرف توجہ کرنے سے پہلے اس نے بھٹنڈا (اس وقت تبر ہندہ کہا جاتا تھا) سرسوتی اور لاہور میں اپنے اختیارات مستحکم کیے۔ 626ھ / 1228ء میں اس نے اُچھ اور ملتان پر بیک وقت حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ خود اُچھ کی جانب روانہ ہوا جبکہ ناصر الدین ایتمر، لاہور کے گورنر کو ملتان پر حملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ قباچہ نے اپنا خیمہ ہرات کے نزدیک لگایا اور اس کی کشتیوں کا بیڑہ جن پر فوجی سامان اور اس کے فوجی پیروکار سوار تھے۔ کیمپ کے سامنے دریا میں لنگر انداز ہو گیا۔ اُچھ نے تین مہینے تک بہادرانہ مدافعت کی لیکن 4 مئی 1228ء کو اطاعت قبول کر لی۔ قباچہ بھکر بھاگا اور اپنے وزیر عین الملک حسین اشعری کو ہدایت کی کہ وہ اس کے خزانے کو وہاں پہنچا دے۔ لیکن التتمش کا دباؤ سخت ہو گیا جس کی وجہ سے قباچہ نے اپنے آپ کو بھکر میں بھی محفوظ نہ پایا۔ لہٰذا اس نے اپنے بیٹے مَلک علاؤ الدین بہرام کو التتمش کے پاس امن کی شرائط پر گفت و شنید کے لیے بھیجا۔ لیکن التتمش نے اس سے غیر مشروط ہتھیار ڈال دینے کی مانگ کی جس پر قباچہ نے موت کو ترجیح دی اور دریائے سندھ میں ڈوب کر جان دے دی۔ اب التتمش نے سندھ اور پنجاب میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کا کام شروع کیا۔ ملتان اور اُچھ کو گورنروں کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ ایک درجن فوجی قلعوں پر قبضہ ہو گیا اور دہلی کے سلطان کے اختیارات مکران تک وسیع ہو گئے۔ ملک سنان الدین حبش، دیول اور سندھ کے ولی نے اس کی بالادستی تسلیم کر لی۔

---

(1) ایضاً ص 172

خلیفہ سے خلعت کی حصولی: شہزادہ ناصر الدین کی موت

22 ربیع الاول 626 ہجری مطابق 18 فروری 1229ء کو خلیفہ بغداد کے سفراء التمش کے لیے خلعت لے کر دہلی پہنچے۔ اگرچہ یہ (اعزاز) محض ایک رسمی نوعیت کا تھا پھر بھی یہ التمش کی ایک طویل المدت آرزو کی تکمیل تھی۔ ساتھ ہی یہ ایک مسلمہ حقیقت کی تصدیق تھی۔ سلطنت دہلی کی بہ حیثیت ایک آزاد مملکت کے منظوری۔ التمش نے اس موقع کو بڑی گرم جوشی اور دھوم دھام سے منایا۔ شہر سجایا گیا اور امراء و شرفاء، غلام و افسران سبھی کی اس موقع پر عزت افزائی کی گئی۔ یہ واقعہ سلطنت دہلی کو ایک خود مختار مملکت کی حیثیت دلانے کے لیے التمش کی بیس سالہ پیہم جدو جہد کا ایک سنگ میل تھا۔[1]

اس واقعہ کی کامیابیوں اور اس قانونی منظوری نے اس کے مرتبہ کو بہت بلند کر دیا۔ اس وقت تک تقریباً اس کے تمام مخالفین ختم کیے جا چکے تھے۔ اب معز الدین کے ہندستانی ورثہ کا وہ تنہا مالک تھا۔ ادھر ادھر کچھ مخالف مراکز تھے لیکن مجموعی طور پر اس کا اقتدار اور مستحکم تھا۔

جمادی الاول 626ھ / 1229ء میں اپنے سب سے بڑے لڑکے ناصر الدین محمود کی موت سے التمش کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ شدید صدمہ پہنچا۔ اس افسوس ناک خبر نے راجدھانی کو رنج والم کی ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔ شہزادہ ایک غیر معمولی خداداد انتظامی صلاحیت کا مالک تھا، جس نے ہانسی، لاہور، اودھ اور لکھناؤتی جیسے فوجی اہمیت والے علاقوں کا انتظام سنبھالا۔ سلطان کی ساری امیدیں اسی سے وابستہ تھیں۔ اس کی اچانک موت سے اس کے خاندانی مفادات بحران کا شکار ہو گئے جس کی

---

(1) بہر حال التمش خلیفہ کی بڑی عزت کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کے ساتھ اس نے ایک طرح کا تعلق برابر قایم رکھا۔ مولانا رضی الدین حسین صنعانی، ایک ہندستانی النسل مسلم جو بعد میں بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، کو خلیفہ نے التمش کے پاس ایک سفیر کی حیثیت سے بھیجا تھا۔ (عبد الرزاق، الحوادث الجامعہ، بغداد ص 263 ملاحظہ ہو) برنی خلیفہ کے ایک دوسرے سفیر قاضی جلال عرس کا حوالہ دیتا ہے وہ التمش کے لیے سفینۃ الخلفاء کی ایک جلد، جس میں (خلیفہ) مامون کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض تحریریں، لایا تھا۔ التمش اس تحفہ سے بہت زیادہ خوش ہوا (تاریخ فیروز شاہی، ص ص 5-103 ملاحظہ ہو)

اس نے کبھی توقع تک نہ کی تھی۔ اگر وہ اپنے باپ کے بعد جانشین ہوتا تو شاید بادشاہ اور ترکی غلام افسروں کی درمیانی جنگ جو التتمش کی موت کے بعد تیس سالوں تک دہلی سلطنت کی تاریخ کی خصوصیت بنی رہی اس کی شکل بالکل ہی مختلف ہوتی۔ چونکہ یہ افسوس ناک حادثہ خلیفہ کی جانب سے اس کے اقتدار کی قانونی منظوری کے فوراً بعد ہوا تھا اس لیے التتمش پر اس کا اثر اور زیادہ ہوا لیکن اس کی جرأت مندانہ طبیعت نے شکست خوردگی گوارہ نہ کی۔ اور اپنی زندگی کے بقیہ سات سالوں تک وہ بڑی شدت سے سلطنت دہلی کے استحکام کے لیے جدوجہد کرتا رہا۔ اس نے بغاوتوں کو فرو کیا۔ نئے علاقے فتح کیے اور کئی مملکتوں سے اپنا اقتدار کی منظوری کرائی۔

لکھناؤتی، گوالیار، کالنجر اور مالوہ میں بغاوت

ناصرالدین محمود کی موت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اختیارالدین بلکا نے بغاوت کر دی۔ 628ہجری/1230ء میں التتمش اس کے خلاف روانہ ہوا اور اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لکھناؤتی کا تخت اس نے ملک علاؤالدین جانی کو بخش دیا۔[1] اگرچہ سلطان معزالدین کا زمانہ ہی میں گوالیار پر قبضہ ہو گیا تھا اور التتمش کو سب سے پہلی ذمہ داری اس کی دی گئی تھی لیکن وہ قایم نہ رکھ سکا اور بعد میں گوالیار ہاتھ سے نکل گیا۔ 629ہجری 1231ء میں التتمش گوالیار کے قلعہ کی طرف روانہ ہوا اور اس نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے پری بہار حکمراں منگل دیو نے گیارہ مہینے تک اس کی سخت مدافعت کی۔ بہر حال 26/ صفر 630ہجری/12 دسمبر 1232ء میں بالآخر جب منگل دیو رات میں اچانک قلعہ سے غائب ہو گیا تو اسے فتح کر لیا گیا۔ التتمش نے جو انتظامی امور انجام دیئے ان میں مجدالملک ضیاء الدین محمود جنیدی کو امیر داد اور سپہ سالار رشیدالدین کو کوتوال مقرر کرنا بھی شامل ہے۔ منہاج السراج کو قضا، خطابت، امامت اور احتساب کی ذمہ داری سونپی گئی۔

گوالیار فتح ہونے کے دو سال بعد التتمش نے سلطان کوٹ اور بیانہ کے اقطاع

---

(1) منہاج ص174 بلکا کی شناخت نہیں ہو سکی ہے۔ ریورٹی کا خیال ہے کہ وہ حسام الدین عوض کا ایک لڑکا تھا لیکن اپنے اس خیال کی تائید میں اس نے کسی ہم عصر کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

مع قلعہ گوالیار کی (شہ نگی) ملک نصرت الدین تائسی کو دی۔ وہ معزالدین غوری کا ایک ترکی غلام افسر تھا اور اپنی عمدہ اور ٹھوس خدمات کی بنا پر کافی ترقی حاصل کر چکا تھا۔ منہاج جو تائسی سے واقف تھا کہتا ہے کہ اگر چہ وہ جسامت اور اپنی شخصیت میں کم تھا لیکن وہ بہادر، باہمت اور عقلمند تھا۔ تائسی کو گوالیار قلعہ میں رہنے کو کہا گیا لیکن قنوج، مہر اور مہابن کے دستے بھی اس کی ماتحتی میں دیے گئے تاکہ وہ کالنجر اور چندیری کے علاقے میں حملے کر سکے۔

631 ہجری (34-1233ء) میں کالنجر پر تائسی کے حملے کا ایک مفصل بیان مناسب ہو گا۔ اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ کتنی تیزی سے ترکی افسروں نے اپنے آپ کو ہندستانی ماحول کے مطابق بنا لیا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں اس سے اس زمانے کے رئیسوں اور راناؤں کی پوزیشن کی بھی وضاحت ملتی ہے۔ کالنجر کا راؤ اپنا قلعہ کا دفاعی انتظام اپنے افسروں پر چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ تائسی جو ایک قلعہ کے محاصرہ میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، کو ایک ہندو رہبر مل گیا اور اس نے رائے کا پیچھا کیا۔ رہبر انھیں لے کر ایک دن ایک رات چلتا رہا لیکن دوسرے دن آدھی رات کو اس نے یہ انکشاف کیا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے اور وہ انھیں مزید آگے نہیں لے جا سکتا۔ تائسی نے رہبر کو قتل کر دینے کا حکم دیا اور خود ایک رہبر کی ذمہ داری لے لی۔ وہ انھیں ایک اونچائی پر لے گیا جہاں کی زمین بھیگی ہوئی تھی۔ اغلبًا طوبت آدمیوں اور جانوروں کے پیشاب کی وجہ سے تھی۔ فوج میں جو لوگ تھے وہ اپنا خوف اس طرح ظاہر کرنے لگے کہ "یہ رات کا وقت ہے اور ہم لوگ اپنے آپ کو دشمنوں کے بیچ پا سکتے ہیں" تائسی اپنے گھوڑے سے اترا اور اس جگہ کا اس نے بڑی احتیاط سے معائنہ کیا اس کے بعد اس نے کہا کہ "دوستوں ہمت نہ ہارو۔ یہ دم والے جانوروں کا پیشاب ہے جو فوج کے پچھلے حصہ کے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو آدمیوں کے قدموں کے نشانات بھیگی زمین پر نظر آ جاتے۔ لیکن یہاں کوئی بھی نشان انسانی قدموں کے نہیں ہیں" لہٰذا وہ لوگ آگے بڑھے۔ صبح میں رائے کو شکست دی اور اس کا چھتر چھین لیا۔

تقریباً پچاس دنوں تک تائسی اس علاقہ میں لوٹ مار کرتا رہا۔ حتیٰ کہ حصہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ۔ پچیس لاکھ جتل تک پہنچ گیا۔

کیوں نہ غارتگروں کو لوٹا جائے؟ یہ نادر خیال اجرا[1] کے رانا جاہر کے دل میں آیا۔ اس نے اس شاہراہ پر ڈیرا ڈالا جس سے حملہ آور فوج کی واپسی کا وہ متوقع تھا اور ان دروں پر بھی اس نے اپنے آدمی مقرر کر دیئے جو پہاڑی ندیوں کے سبب بن گئے تھے۔ اس وقت تائسی کی طبیعت ٹھیک نہ تھی لیکن اس نے اپنی فوج کو تین لائق افسروں کی ماتحتی میں تین دستوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا دستہ جنگ کے لیے تیار مسلح سواروں پر مشتمل، دوسرا فوجی سامانوں اور کیمپ والوں پر تیسرا مویشیوں اور مال غنیمت پر مشتمل تھا، ہر دستہ کو مختلف دستوں سے گوالیار پہنچنے کی ہدایت تھی۔ تائسی نے بعد میں منہاج کو بتلایا کہ "خدا کا شکر ہے کہ کسی نے بھی ہندستان میں میدان جنگ میں میری پیٹھ نہیں دیکھی۔ لیکن ان ہندوؤں نے ہم پر ان بھیڑیوں کی طرح حملہ کیا جو بھیڑوں کے جھنڈ پر حملہ کرتی ہیں۔ میں نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا تاکہ اگر ہندو مجھ پر حملہ کریں تو مسلح گھوڑ سوار، فوجی سامان اور مال غنیمت گوالیار بحفاظت پہنچ جائیں اور اگر وہ دستہ پر حملہ کریں تو ہم اور گھوڑ سوار واپس لوٹ کر ان پر حملہ کر سکیں۔ رانا جس کا (متذکرہ بالا) پلان نہایت عمدہ تھا، نے تائسی کے راستہ اور انتظامات کے سلسلے میں افسوس ناک غلطی کی۔ وہ شاہراہ پر ٹھہرا رہا اور اس کی مڈ بھیڑ مسلح گھوڑ سواروں سے ہو گئی جن کے پاس ساز و سامان نہ تھے جو ان کی نقل و حرکت میں رُکاوٹ ڈالتے۔ لہٰذا وہ شکست کھا گیا[2]۔

دوسری مہم کا آغاز مالوہ کے خلاف کیا گیا۔ بھیلسہ کے فوجی قلعہ اور شہر پر قبضہ کر لیا گیا۔ ایک بت خانہ جس کی تعمیر میں (منہاج کے مطابق) تین سو سال لگے تھے مسمار کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے شہر اجین کی طرف کوچ کیا اور مہاکال دیو کے مندر کو تباہ کر دیا۔ یہ بکرماجیت کا پتلا اور دوسری تاریخی یادگاریں دہلی لے آئی گئیں[3]۔

633ھ / 1236ء میں التتمش بامیان کی طرف روانہ ہوا جو منکبرنی کے ایک

---

(1) چہارہ دیوا خاندان کے چہار دیو سے بلاشک و شبہ بالکل مماثل تھے، جس نے بعد میں نار دار کے پرہاروں کو بے دخل کر کے خود اس کی جگہ لے لی۔ حبیب اللہ: فاؤنڈیشن ص 103

(2) منہاج:-41-239 (3) ایضاً-176

افسر سیف الدین حسن قرلغ کے قبضہ میں تھا جسے منگول بھی بے دخل نہ کر سکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریشانیوں کے باوجود، اس نے غزنی اور سندھ کے درمیان اپنی (آزادانہ) حیثیت (اب تک) قایم رکھی تھی۔ اس مہم کے موقع پر التتمش بیمار پڑ گیا اور پہلی شعبان (20 اپریل) کو نجومیوں کے منتخب وقت پر ایک محفوظ ڈولی میں راجدھانی لوٹ آیا۔ (20 شعبان 633 ہجری / 30 اپریل 1236ء) کو اس نے آخری سانس لی۔[1]

التتمش کی سیرت اور کارنامے

التتمش ہندستان کے ممتاز ترین حکمرانوں میں سے ایک تھا۔ وہ ایک صاحب الرائے محتاط اور دور اندیش سیاستداں تھا۔ اس نے ہندستانی تاریخ کے صفحات پر ایک مستقل نشان چھوڑا۔ ڈاکٹر آر پی ترپاٹھی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "ہندستان میں مسلمانوں کی خود مختاری کا آغاز اگر بجا طور پر کہا جائے تو اسی سے ہوا۔[2] وہی تھا جس نے ملک کو ایک راجدھانی، ایک آزاد ریاست، ایک شاہی حکومت اور ایک حکمراں طبقہ دیا۔ اپنی بے تکان طاقت و قوت اور اپنے محتاط طریقے پر منتخب مقاصد کی انجام دہی کی بنا پر اس نے ہندستان میں غوری املاک کے ڈھیلے ڈھالے اور پیوند لگے ٹکڑوں کو بہتر طریقے پر مربوط کیا اور انہیں ایک مستحکم ریاست سلطنت دہلی میں تبدیل کر دیا۔

التتمش ایبک کی خدمت میں 1192ء میں ایک غلام کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور بیس سالوں سے کم ہی مدت میں وہ ترکی حکومت کا سربراہ بن بیٹھا۔ بلا شبہ اور بھی دوسرے اہم معزی اور قطبی، ملک وہاں موجود تھے۔ جن کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا کہ جب وہ ان لوگوں کو اپنے دربار میں کھڑا دیکھتا تھا تو یہ کیفیت ہوتی تھی کہ وہ تخت سے اتر پڑے اور ان کے ہاتھوں اور پیروں کو بوسے دے۔[3] لیکن اس نے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنے کا راستہ محض اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر بنایا۔ وہ جس وقت تخت نشین ہوا

---

(1) ایضاً، ص: 176 شیخ جمال الدین ہانسوی، شیخ فرید الدین گنج شکر کے ایک ممتاز شاگرد نے سلطان کی موت پر دو مرثیے لکھے ہیں۔ "دیوان" جدل اول ص: 99-398، جلد دوم، ص: 210 ملاحظہ ہو۔

(2) Some Aspects of Muslim Administration in India

(3) برنی- تاریخ فیروز شاہی ص- 137

سیاسی حالات بڑے ابتر تھے اور ہر چیز بادشاہت کے اصول سے لے کر ملک کی سرحدوں تک مبہم اور غیر واضح شکل میں تھی۔ کوئی ایسی روایات بھی نہ تھیں جو اس کی رہنمائی کر سکتیں اور نہ اس کا معزالدین جیسا کوئی رہنما تھا جو بحرانی اوقات میں اس کی مدد کرتا۔ اس طرح اسے ایک ایسے سمندر میں اپنی راہ تلاش کرنی تھی جس کا اس کے پاس کوئی نقشہ نہ تھا۔ بہرحال اس کی تعمیری صلاحیتیں اس موقع پر ابھریں اور اس نے اپنے کاموں کا پروگرام ایسی دانشمندی سے بنایا کہ لگاتار 26 سالہ سیاسی اور فوجی سرگرمیوں کے بعد اپنی موت کے وقت جب اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو سلطنت دہلی اس وقت اپنے صاف اور واضح حدود کے ساتھ نمودار ہو چکی تھی۔ ایک شاہی خاندان مستحکم طور پر قایم ہو چکا تھا اور موروثی جانشینی کے اصول نے عوام کی سیاسی شعور اور حکمراں طبقہ میں ایسی گہری جڑیں پکڑ لی تھیں کہ اس کی موت کے بعد تیس سالوں تک یہی تصور رہا تھا کہ صرف اس کے ورثا ہی تخت پر بیٹھنے کے حقدار تھے۔ سدی مولا کے حامیوں نے جب جلال الدین خلجی کے دور حکومت میں ایک اچانک بغاوت کی تو ان لوگوں نے سلطان ناصر الدین محمود کی ایک لڑکی کے ساتھ سدی کی شادی کا منصوبہ بنایا تاکہ اپنے مقصد کے لیے رائے عامہ ہموار کر سکیں[1]۔ التمش نے عوام کے دلوں میں اپنے خاندان کے لیے ایک گہری عزت و لگاوٹ پیدا کر دی تھی۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جسے باہر کسی خاندان کے سیاسی استحکام کے لیے ناگزیر شرط قرار دیتا ہے۔

التمش عہد وسطیٰ کے شہر دہلی کا حقیقی معمار تھا جو چند وقفوں کو چھوڑ کر 1857ء تک برابر عہد وسطیٰ کی سیاست کا مرکز بنا رہا۔ اس (شہر) کے منارے، مسجدیں، مدرسے، خانقاہیں اور اس کے تالاب اس کے دورِ حکومت میں اپنے عروج پر پہنچ گئے اور اس نے ایک ایسا ثقافتی اور تمدنی ماحول بنایا جس نے مسلمانوں کے جوہر صلاحیت کو، جو عجم کے ابتر حالات کی بنا پر منتشر اور پست ہو چکی تھیں اپنی طرف مائل کر کے جذب کر لیا۔ منہاج لکھتا ہے کہ:

”اس نے دہلی میں لوگوں کو دنیا کے مختلف گوشوں سے اکٹھا کیا۔ یہ شہر عطیات کی (بڑی) تعداد اور متقی بادشاہ کی بے پایاں فیاضیوں کے باعث دنیا کے مختلف

---

(1) ایضاً، ص: 210

گوشوں کے تعلیم یافتہ، معالج اور بہترین اشخاص کی ایک پناہ گاہ اور آرام کی جگہ بن گیا۔ اور ان لوگوں نے جو خدا کے رحم و کرم سے ان مصائب و مشکلات سے جن سے عجم کے شہر اور صوبے دوچار تھے نیز غیر مسلم منگولوں کے حملے کی وجہ سے پیدا ہونے والی آفات سے بچ نکلے تھے۔ انہوں نے اس خود مختار راجدھانی کو اپنا ٹھکانا، جائے پناہ، آرام کی جگہ اور تحفظ کا مقام بنایا۔[1]

حقیقت میں اس نے دہلی کو محض ہندستان میں ترکی مملکت کا ایک سیاسی اور انتظامی مرکز ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے ثقافتی سرگرمیوں کا ایک مرکز بھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ سلطان کے زمانہ کے تصنیفات میں کبھی بھی دہلی کا حوالہ صرف اس کے نام سے نہیں دیا گیا بلکہ اسے یا تو حضرت دہلی (عظیم الشان دہلی) یا شہر کہہ کر پکارا گیا۔

یہ سیاسی ضرورت تھی کہ التتمش ایک خاندانی شہنشاہیت کا قیام کرے۔ امیر معاویہ کی طرح اس نے اسی کو طوائف الملوکی کا ایک بہترین ممکن بدل سمجھا اور اس نے اس کے لیے تصوراتی اور ترکیبی مواد اکٹھا کرنے میں اپنی قوتیں صرف کیں۔ اس نے فارسی شہنشاہی روایات سے مدد حاصل کی۔ اور انہیں ہندستانی ماحول کے مطابق بنایا اس نے اپنے لڑکوں کی تربیت کے لیے بغداد سے دو کتابیں آداب السلاطین اور مآثر السلاطین حاصل کی تھیں۔ یہ کتابیں فارسی بادشاہی نظام کے متعلق تھیں۔ جس کی مفصل تقلید وہ دہلی میں عائد کرنے کا آرزومند تھا۔

التتمش نے جو بادشاہت قایم کی اس کو خاص طور پر ایک ہندستان گیر عسکری و انتظامی سروس سے تقویت اور مدد پہنچ رہی تھی۔ جس کے عہدیداران خالص غیر ملکی تھے اور جو منہاج کے مطابق دو گروپ پر مشتمل تھے۔ ترکی افسران (ترکان پاک اصل) اور تاجک یا اعلیٰ نسل کے غیر ترک ملکی (تاجکان گریزہ وصل) دونوں گروپوں کے بارے میں تھوڑی وضاحت ضروری ہے۔

معزالدین کے خاندانی ورثاء کا اپنے غلاموں پر جو بھی دعویٰ ہو لیکن جب خوارزمیوں اور منگولوں نے غوری خاندان کے تمام افراد کو ختم کر ڈالا تو وہ لوگ آزاد

---

(1) عصامی کہتا ہے کہ عرب، خراسان، چین، بخارا اور دوسری جگہوں کے نامور اشخاص نئے قایم شدہ دہلی کی طرف سیدھے آنا شروع ہو گئے جس طرح پروانے شمع کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ (فتوح السلاطین، ص: 114-15)

ہو گئے، لیکن یلدوز، قباچہ اور التتمش کو نہایت تعلیم یافتہ غلاموں کو خریدنے کا بیحد شوق تھا۔ منگول کے ذریعے عجم کی فتح نے تاجرین غلام کو ان کے بڑے شکاری میدان سے محروم کر دیا۔ پھر بھی کچھ غلام مثلاً سلطان بلبن اور اس کا بھائی اور چچیرا بھائی شیر خاں، التتمش کے پاس سمندری راستوں کے ذریعے بغداد یا جنوبی فارسی بندرگاہوں سے لائے جا سکتے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام غلام تاجروں کے ہاتھ یا تو منگولوں کے حملہ کے وقت یا اس سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ یہ غلام، جو عجم کے مختلف حصوں (اناطویہ سے لے کر ترکستان تک) سے لائے گئے تھے، اور جو ترکی شمار کیے جاتے تھے اپنے آپ کو برابر نیز بھائی بھائی سمجھتے تھے۔ وہ لوگ خواجہ تاش تھے، یعنی ایک ہی مالک کے غلام۔ التتمش جتنے دنوں زندہ رہا وہ اسی کے غلام رہے۔ لیکن اس کی موت کے بعد وہ اپنے آپ کو سلطانی[1] اس سلطان کے غلام یا افسران جسے انہوں نے تخت نشین کرایا تھا، کہنے لگے۔

جہاں تک غیر ترک غیر ملکیوں کا تعلق ہے وہ معزالدین کی موت کے فوراً بعد ہندستان نہیں آئے۔ 1192ء اور 1218ء کی درمیانی مدت میں کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک خوشحال مسلم دریائے راوی کے مشرقی علاقہ کو اپنا وطن بنا لے۔ الا یہ کہ وہ ایک تاجر یا حکومت کا کوئی ملازم یا کوئی ایسا شخص ہو جو حکومت کی ملازمت کا خواہش مند ہو۔ ہندستانی سرحدوں کے نزدیکی علاقے کے دو گروپ۔ خلجی اور افغان۔ حکومت کی ملازمت کی امید میں ہندستان آئے تھے مگر ان کے علاوہ غوری فتوحات کے فوراً بعد مسلمانوں کی بڑی پیمانہ پر ہندستان میں آمد نہ ہوئی تھی۔ لیکن چنگیز خاں کے سیر دریا پار کرنے کے بعد بہت سے غیر ملکی مسلمان جو مختلف میدانوں میں باصلاحیت تھے ہندستان کو ایک خوش حال اور محفوظ مقام سمجھ کر چلے آئے۔ اگرچہ یہ ہجرت زیادہ تر مغرب کی جانب بغداد، شام اور مصر کو ہوئی لیکن دہلی کی اُبھرتی ہوئی مملکت نے بھی مہاجرین کو اپنی طرف مائل کیا۔ برنی کہتا ہے کہ چنگیز خاں نے جو مصیبتیں ڈھائی اس کی وجہ سے بہت سے مشہور شہزادوں، شرفاء، وزراء اور دوسرے اونچے لوگ التتمش کے دربار میں جا پہنچے۔ ان لوگوں کی آمد نے اس کے دربار کی عظمت اور شان و شوکت کو

---

(1) ”سلطانی“ کی اصطلاح غیر غلام نسل کے افسروں نے بھی استعمال کی تا کہ اپنی بے انتہا وفاداری کا اظہار کر سکیں۔

اس قدر بڑھایا کہ یہ محمود اور سنجر کے درباروں کی طرح نظر آنے لگا۔[1]

ان غیر مملوک تاجکوں میں جو التتمش کے دربار میں جمع ہو گئے تھے ایسے افراد بھی تھے جیسے نظام الملک محمد جنیدی، جو کئی سالوں تک سلطان کا وزیر اعظم رہا، ملک قطب الدین حسن غوری، جو منگولوں سے لڑ کر ہندستان آیا تھا اور فخر الملک عصامی۔ فتوح السلاطین کے مصنف کے جد امجد۔ جو بغداد میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور جن کو ہندستان آتے ہی التتمش نے اپنی ملازمت میں رکھ لیا، جیسے لوگ بھی تھے۔ یہ دونوں گروپ ترکی غلام اور غیر مملوک تاجک التتمش کی شاہی حکومت کے دُھرے کی کیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ جتنے دنوں التتمش زندہ رہا اس نے دونوں غیر مالکی عناصر کو مناسب کنٹرول میں رکھا۔ لیکن تازیک (یا تاجکوں) کے خلاف غلام افسران کا تلخ رویہ اس کے ورثہ کے دورِ حکومت میں بڑھ گیا۔

التتمش کے ذریعے کسی ہندستانی النسل مسلمان کی تقرری کے سلسلے میں ہمارے مآخذ بالکل خاموش ہیں۔ لیکن مقامی ہندو سرداروں کو التتمش نے ان کے عہدوں پر قایم رکھا ہوگا۔ اس طرح التتمش کی حکومت ایک ترکی حکومت تھی، جس کی حمایت و خدمت (ایک جانب) ترکی غلام اور تاجک۔ جو دونوں ہی سلطان کی ملازمت میں تھے، کر رہے تھے اور (دوسری جانب) مقامی سردار جو خراج ادا کرنے کے لیے پابند تھے اور امن و امان قایم رکھنے کے لیے کچھ اور خدمات، لیکن جو اپنے عہدوں پر وارثتاً فائز ہوتے اور جن کو عموماً بغاوت یا خراج نہ ادا کرنے کی صورت ہی میں ان کے عہدوں سے معزول کیا جاتا تھا۔ اس طرح التتمش کی انتظامیہ دو عناصر پر مبنی تھی۔ جن کے دو مختلف سیاسی پس منظر تھے۔ ایک وراثتی اور دوسرا ضابطہ پرست۔ ایک بادشاہ کی ملازمت میں اور دوسرا وراثتی استحقاق کا حامل۔ التتمش نے ان مختلف عناصر کو ایک ہی انتظامی سانچہ کا تانا بانا بنانے میں کمال سیاسی دانشمندی اور ہوشیاری کا نمونہ پیش کیا۔ لیکن اگرچہ مقامی سرداروں کا عملی تعاون حاصل کرنے کی برابر کوشش کی گئی (دراصل) ترک اور تاجک ہی شاہی نظامِ حکومت کے اہم ارکان تھے۔

1191ء سے **1210**ء تک کی ہندستانی تاریخ غوری روایات کے سائے تلے

---

(1) تاریخ فیروز شاہی، ص: 27

آگے بڑھتی رہی۔ التتمش نے بڑی حد تک اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی بدولت جس میں کچھ حالات کی سازگاری بھی مددگار ثابت ہوئی، غزنی اور گور کے کنٹرول سے دہلی کو مکمل طور پر آزاد کر لیا۔ اس طرح اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسی حکومت کی تعمیر کی جو خالص ہندستانی تھی۔ لیکن جس کے اعلیٰ عہدیداران خالص ترکی غلام افسران اور تاجک تھے۔ اس کی ماتحتی میں معزالدین کی ہندستانی املاک کی سیاسی انفرادیت غوری یا مرکزی ایشیائی سرزمینوں سے بالکل الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے بڑھ گئی اور جب بغداد کے خلیفہ نے خلعت بھیجی تو ان املاک کو ایک قانونی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔

سلطنت دہلی کے بانی کی حیثیت سے التتمش نے اس کے انتظامی اداروں کے ارتقاء میں ٹھوس کام انجام دیے۔ مرکزی ایشیائی سیاست میں مستقل دخل اندازیوں کے باعث ہندستان میں ایک نہایت مناسب نظام حکومت کی تشکیل کا موقع معزالدین کو نہ مل سکا جب کہ ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے ایبک کی مدت حکومت اتنی مختصر تھی کہ وہ حکومت کی مشینری چلانے کے لیے وقتی انتظامات سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ التتمش نے سلطنت دہلی کے حکومتی ڈھانچہ کو ایک شکل دی اور مواد مہیا کیا۔ اس نے اقطاع، فوج اور سکوں کا انتظام کیا جو تینوں ہی سلطنت دہلی کے نظام شہنشاہی کے اہم عضویات تھے۔

الف--: اقطاع

التتمش نے نظامِ حکومت کے لیے جو انتظامات کیے ان میں اقطاع کے ادارے کی حیثیت ایک محور کی سی تھی۔ اقطاع کے لفظی معنی، ایک 'ٹکڑے' کے ہوتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کا مطلب حکمراں کی جانب سے کسی فرد کو زمین یا زمین کا لگان عطا کرنا ہے۔ ماوردی دو قسم کے اقطاع کا حوالہ دیتا ہے۔ اقطاع تملیک اور اقطاع استغلال پہلی قسم زمین، آراضی غیر مزروعہ یا مزرعہ یا کانوں والی زمین پر مشتمل تھی اور دوسری قسم کا تعلق وظائف سے ہوتا تھا۔[1] یہاں صرف اقطاع تملیک ہی ہمارے

---

(1) احکام السلطانیہ، اردو ترجمہ، حیدر آباد 1931ء ص 303 الخ

مطلب کے لیے اہم ہے۔

اسلامی سیاسی، معاشی اداروں کی ترقی میں اقطاع کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے، ریاست کی خدمات کے بدلے کی شکل میں اس کا وجود اسلام کے ابتدائی زمانہ سے ہی ہے اور بویہد، سلجوقیوں، جنھوں نے اسے سیاسی زندگی کے مختلف حالات و مشکلات کے لیے استعمال کیا، کے دورِ حکومت میں یہ اپنی ترقی کے مختلف ادوار سے گزرا۔ دہلی کے ابتدائی ترکی سلاطین نے خاص طور پر التمش نے اس ادارے کا استعمال ہندستانی سماج سے جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کے لیے اور سلطنت کے دور دور تک پھیلے ہوئے حصوں کو ایک ہی مرکز سے منسلک کر دینے کے لیے کیا۔ اس کے ذریعہ رسل و رسائی کے سلسلہ کی مشکلات پر قابو پایا جا سکا۔ نئے نئے مفتوحہ علاقوں کے مال گزاری کا اکٹھا کرنا ممکن ہوا۔ ساتھ ہی سلطنت کے تمام حصوں میں نظم و ضبط کا قیام بھی ممکن ہو سکا۔ علاوہ ازیں اب تک ہندستان پر ہندو جاگیردار حکومت کرتے آرہے تھے جس نے بہت سی مقامی دشواریاں پیدا کر دی تھیں جنھیں مقامی طور پر ادارے کے ذریعے ہی حل کیا جا سکتا تھا۔ (نظام) اقطاع نے اس وقت کی ان تمام ضروریات کو پورا کر دیا۔

(نظام) اقطاع کے تحت جو جاگیریں دی جاتی تھیں وہ لازماً قسم کی ہوتی تھیں۔ چھوٹی اور بڑی چھوٹی جاگیروں کے ساتھ کسی طرح کی انتظامی ذمہ داری متعلق نہ تھی اور نہ مرکزی خزانہ کو جواب دہی۔ ان چھوٹے اقطاع داروں کو صرف عسکری خدمات کے عوض زمین کے کسی حصہ کی مال گزاری کی وصولی کی اجازت تھی۔ بڑے اقطاع (صوبے)، جو باحیثیت لوگوں کی نگرانی میں دیئے جاتے تھے، کے ساتھ انتظامی ذمہ داری بھی متعلق تھی اور اقطاعدار سے یہ توقع رکھی جاتی کہ وہ اپنے علاقہ میں نظم و ضبط بنائے رکھے اور ہنگامی حالات میں کرمز کو فوجی دستے بھیجے۔

التمش نے ترکوں کو بڑے پیمانے پر اقطاع حوالے کیے۔ اس کا مقصد مقبوضہ علاقوں پر سخت کنٹرول رکھنا اور ہندستان کے جاگیردارنہ نظام کا استیصال کرنا تھا لیکن خود نظام اقطاع میں ایسے عناصر موجود تھے جو جاگیردارانہ خصوصیات کو اختیار کر سکتے

تھے۔ لہٰذا اس نے سختی سے حکومت میں مقامی عنصر کی روک تھام کی اور سرداروں کے قانون استثناء کے جاگیردارانہ تصور کو رد کر دیا۔ جاگیرداروں کو ایک مقام سے دوسرے مقام میں تبدیل کر کے اس نے نظام اقطاع ضابطہ پرست پہلو پر زور دیا۔ اس کے علاوہ التمش پہلا شخص تھا جس نے دوآب (علاقے) کی اقتصادی اہمیت کو بخوبی سمجھا وہاں اس نے دو ہزار ترکی سپاہیوں کو بسا کر شمالی ہندستان کے بہت ہی زیادہ خوش حال علاقوں میں سے ایک پر ترکی ریاست کے لیے مالی اور اقتصادی اختیار حاصل کر لیا۔

(ب) فوج

اگرکہ کوئی متعین تفصیلات دستیاب نہیں مگر محتاط طریقے پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ التمش ہی تھا جس نے دہلی سلطنت کی فوج کو "بادشاہ کی فوج" کی حیثیت سے منظم کیا جس میں بھرتی، تنخواہ کی ادائیگی اور دیگر انتظام اور انصرام مرکزی طریقہ پر ہوتا۔ یہ حقیقت کہ فخر مدبر نے جنگ کے فن پر ایک کتاب لکھنے کی بات سوچی اور اسے التمش کے نام منسوب کر دیا، دیگر باتوں کے علاوہ، فوج کی تنظیم کے سلسلے میں سلطان کی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے۔

(ج) سکّے

سلطنت کے نظام زر کے سلسلہ میں التمش کے کام سلاطین دہلی میں سب سے زیادہ ہیں کیونکہ وہی تھا جس نے چاندی کا ٹنکہ اور تانبے کے جتل-دور سلطنت کے دو بنیادی سکّے-کا آغاز کیا۔ نلسن رائٹ لکھتا ہے کہ "وہ دہلی میں سکوں کی ڈھلائی (کی تاریخ) میں التمش کی حکومت دور آفریں حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہنے میں کسی طرح کی ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہونی چاہیئے کہ یہ ٹنکہ جیسا کہ اس کے وزن سے ظاہر ہوتا ہے، وہی نمونہ تھا جس کے مطابق سلاطین مابعد کے سکے ڈھالے گئے اور انھیں سکوں سے موجود روپے کا سراغ ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جتل کو ایک غیر متعین سکے کی حیثیت دینے کا سہرا بھی التمش ہی کے سر ہے۔ التمش نے بڑے پیمانے پر سکوں کی ڈھلائی کی۔ چاندی کے ٹنکوں اور پیتل کے جتل کا مستقل اور مستحکم بنیادوں پر اجراء ہی بذات خود التمش کا ایک نمایاں اور ممتاز کارنامہ ہے۔ التمش کے سر اس بات کا

بھی سہرا ہے کہ اس نے ٹنکوں پر دارالضرب شہروں کو مہر لگانے کا بیرون سرحدی رواج (Trans Frontier Practice) جاری کیا۔[1]

التمش نے یقیناً شاہی دربار کی کاروائیوں کے لیے اور معاملات کی مناسب روداد کے لیے قوانین وضع کیے ہوں گے تاکہ سلطان الملک کی حکومت کو کنٹرول کر سکے اور ایسا نہ ہو کہ وہ کام کی زیادتی کی بنا پر مفلوج ہو کر رہ جائے۔ اس نے اعلیٰ ملازمتوں کے لیے بھی یقیناً قانون بنائے ہوں گے۔ اگرچہ منہاج نے ان (امور) کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ لیکن ہم اس کے کاموں کے کچھ طریقوں اور اس کے دربار کی تنظم اور مجلسی آداب کے سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعات سے، جو قدیم کتابوں میں ملتے ہیں، ایک خاکہ متعین کر سکتے ہیں۔

(1) التمش کی حکومت مضبوط اور مستحکم تھی لیکن اس میں رحم دلی بھی تھی۔ کبیر خاں ایاز جو ایک غلام تھا اور جسے ایک بڑی قیمت پر خریدا گیا تھا، جب وہ ملتان کی گورنری میں، ناکام رہا تو اسے وہاں سے واپس بلایا گیا اور اسے اس کی گزر اوقات کے لیے ایک گاؤں پلول سپرد کر دیا گیا۔[2]

(2) فوائد الفواد (شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات) میں ایک واقعہ درج ہے، جس سے ہمیں اس بات کا ایک اندازہ ملتا ہے کہ التمش جب اپنے تخت پر بیٹھتا تو کس طرح معاملات کا انتظام کرتا۔ ایک شاعر، ناصری جو شاہی انعام کا بڑا خواہش مند تھا، کو ایک مرتبہ التمش کے دربار میں ایک قصیدہ، جو اس نے بادشاہ کی تعریف میں لکھا تھا، پڑھنے کا موقع ملا لیکن تخت شاہی کے سامنے اس نے چند اشعار ہی پڑھے تھے کہ التمش کو چند ضروری انتظامی امور کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ بے چارے ناصری نے سمجھا کہ اسے بھلا دیا گیا لیکن جیسے ہی التمش کو فرصت ملی وہ ناصری کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے قصیدہ کا مطلع دہرا کر آگے بڑھنے کو کہا۔ شیخ نظام الدین اولیا کہتے ہیں کہ ''سلطان کی یادداشت'' بہت اچھی تھی۔[3]

---

(1) کوئنج اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطانس آف دہلی ص 72 - یہ ذہن نشین رہے کہ درہم ٹنکہ جو غزنی کے سلطان محمود کے ذریعے ڈھالا گیا اس پر شہر کا نام 'محمود پور' بھی لکھا ہے۔ (تھومس، Chronicles ص 48)

(2) منہاج ص 234 (3) فوائد الفواد - ص 213

(3) اسی طرح سلطان اپنے وجدانی شعور میں بھی بڑا حساس تھا۔ اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد علماء کا ایک گروہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ اس کے پاس یہ پوچھنے آیا کہ وہ صحیح طور پر غلامی سے آزاد کر دیا گیا تھا یا نہیں، اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھیں سلطان نے ان کے آنے کا مقصد سمجھ لیا اور اپنی قالین کے نیچے سے اپنا آزادی کا پروانہ نکال کر ان لوگوں کے سامنے پیش کر دیا۔[1]

(4) شاید کہ اس کے دربار میں محققین اور بزرگوں کے لیے اونچی اور نیچی جگہیں مقرر تھیں۔ ایک مرتبہ شیخ نظام الدین ابو المعید اور سید نورالدین مبارک غزنوی کے درمیان حق تقدم کے سلسلہ میں جھگڑا ہو گیا تھا۔[2]

(5) مشکلات پر قابو پانے کے لیے التمش کے اپنے مخصوص طریقے تھے ایک بار علماء کا ایک وفد اس سے ملنے آیا اس نے ان لوگوں کا معاملہ اپنے وزیر نظام الملک جنیدی کو سونپ دیا۔[3]

التمش کی ذاتی زندگی بڑی دیندارنہ تھی[4]۔ منہاج کے مطابق اس کا عقیدہ قابل تعریف تھا۔ اس کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے معمور تھا[5]۔ وہ رات کا بیشتر حصہ عبادت و غور و فکر میں گزارتا لیکن شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے سامعین کو ایک مرتبہ بتلایا کہ ”اس نے کبھی اپنے (ملازمین میں سے) کسی کی نیند خراب نہ کی[6]۔ وہ صوفی بزرگوں کی مثلاً شیخ قطب الدین بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ جلال الدین تبریزی، شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ نجیب الدین بخشی کی بڑی عزت کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شیخ بخشی کو ”باپ“ کہہ کر پکارتا تھا[7]۔ اپنے دربار میں اکثر مذہبی مجلسیں منعقد

---

(1) ابن بطوطہ، (رحلہ) جلد دوم ص 21 (2) فوائد الفواد ص 193-70/2

(3) برنی، ثنائے محمدی (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور میں ہے) 71/3

(4) ملاحظہ ہو نظامی کی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ص 32-100 اور ان ہی کی کتاب۔
Studies in Medieval Indian History and Culture also Islamic Culture-April ،1946-Artoclean Altutmish, The mystic.

(5) منہاج ص 167 -اس مورخ نے ’آب دیدہ‘ کی اصطلاح کی اس جذباتی صفت کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

(6) فوائد الفواد، ص 213

(7) سرور الصدور (شیخ حمید الدین سوالی ناگوری کے ملفوظات) مخطوطہ

کر کے علماء کی خوش رکھتا۔[1] لیکن اس کی پالیسیاں بنیادی طور پر کٹر عالموں کی نصیحتوں اور خیالات سے متاثر نہ ہوئیں۔ اس نے سید نورالدین مبارک غزنوی[2] کی نصیحتوں کو سنا لیکن اپنی پالیسیوں کی تشکیل کے وقت اسے پورے طور پر نظر انداز کر دیا۔ اس نے رضیہ کو اپنا جانشین نامزد کرنے کے سلسلہ میں علماء کے مشورہ کو ضروری نہ سمجھا۔ لیکن اپنی پاک نجی زندگی کی بدولت صوفیاء کی جو نیک خواہشات اس کے لیے تھیں۔ اس کا اس نے پورا فائدہ اٹھایا۔ ملتان کی فتح میں شیخ بہاء الدین زکریا کی حمایت نے اس کی کافی مدد کی اور حوض شمسی کی تعمیر میں شیخ قطب الدین بختیار کاکی نے اس کی اخلاقی حمایت کی۔[2]

التمش کو اپنے آقا سے بہت سے ادھورے کام ترکے میں ملے تھے۔ اس نے ان تمام-انتظامی تعمیراتی اور سیاسی کاموں کو نہ صرف مکمل ہی کیا بلکہ خود اپنی پالیسیاں بھی بنائیں۔ اس کی حقیقت پسندانہ تشخیص، محتاط منصوبہ بندی اور چوتھائی صدی تک اپنے حکومتی نظم و نسق کی راہ میں پیدا ہونے والے تمام حالات سے دانشمندانہ طور پر نمٹنے کی صلاحیت اس کی کامیابی کی ضامن بنی۔ چنگیز خاں اور جلال الدین منکبرنی کے ساتھ وہ جس طرح نمٹا وہ اس کی انتہائی سیاسی شعور اور قابل تعریف سفارتی مہارت کا مظہر ہے۔

ایبک نے سلطنت (دہلی) کا محض ایک خاکہ اپنے ذہن میں قایم کیا تھا۔ التمش نے اس خاکہ کو انفرادیت، بلند درجہ اور قوت ارادی عطا کی اور اس کی رہنمائی کی اور اس کے لیے ایک نظامی حکومت اور حکمراں طبقہ تیار کیا۔

جانشینی کا مسئلہ

جیسا کہ پہلے ہی اس بات کی نشاندہی کی جاچکی ہے، التمش نے ساری امیدیں اپنے بڑے لڑکے ملک السعید ناصر الدین محمود سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ جب التمش

---

(1) منہاج، ص175

(2) برنی، تاریخ فیروز شاہی ص ص92-70

(3) نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ص29-128

کو 1229ء میں خلیفہ بغداد کی جانب سے خلعت ملی تھی تو اس نے ایک بہت ہی قیمتی لباس اور سرخ چھتر اسے بھیج کر خاص طور پر اس کی عزت افزائی کی تھی۔ منہاج لکھتا ہے کہ "سلطنت ہند کے تمام ملک اور عالی مرتبت لوگوں کی نگاہیں اس پر تھیں کہ وہ شمسی سلطنت کا وارث ہوگا۔[1] لیکن بد قسمتی سے خلیفہ کے خلعت کی وصولیابی کے فوراً بعد اس کا انتقال ہو گیا اور ایک جانشین کی نامزدگی کا مسئلہ التمش کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ بن گیا۔ اس کی نظر انتخاب اپنی لڑکی رضیہ پر پڑی۔ یہ ایک جرأت مندانہ اقدام تھا اور اس سے اس کی تمام سماجی ممنوعات سے آزادی ظاہر ہوتی ہے[2]۔ اس نے رضیہ کی صلاحیتوں کو اچھی طرح جانچا اور پرکھا تھا چونکہ وہ اور اس کی ماں ترکان خاتون کوشک فیروزی میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔[3] جب التمش گوالیار کی مہم پر روانہ ہوا تھا تو اس نے رضیہ کو دہلی نظام حکومت کا انچارج بنا دیا تھا[4]۔ اس نے اپنی ذمہ داری اتنی اچھی طرح نبھائی کہ گوالیار سے واپسی (1332ء) کے فوراً بعد التمش نے اپنے شرف مملکت تاج الملک محمود دبیر کو حکم دیا کہ وہ اس لڑکی کو ولیعہد نامزد (رضیہ)[5] کرتے ہوئے ایک فرمان تیار کرے۔ جب دستاویز کا مسودہ تیار ہو گیا تو چند امیروں نے سلطان کو سمجھایا" کہ چونکہ حضور کے پاس نوجوان بیٹے ہیں جو بادشاہت کے لائق ہیں ایسی حالت میں سلطان کے ذہن میں لڑکی کو ولیعہد نامزد کرنے کا کیا مقصد ہے" اس بات کا التمش نے جواب دیا کہ "میرے بیٹے جوانی کی دلفریبی میں مست ہیں اور ان میں کوئی بھی ملکی امور کے انتظام کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ میری موت کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان میں سے کوئی بھی ولیعہد ہونے کے لائق اس سے (میری بیٹی سے) زیادہ (اہل) نہیں۔[6] اس موقع

---

(1) طبقات ناصری، ص 181 (2) اس میں شک نہیں کہ ترکی اور ایرانی تاریخ میں ایسی نظیر ملتی ہے کہ عورتوں نے سیاسی اقتدار سنبھالا، (جیسے گور خاں کی بیوہ اور اس کی لڑکی کو نیک خاتون، حلب کی صفیہ خاتون، مصر کی شجرۃ الدر) لیکن ہندستان کے حالات و تجربات کے سیاق میں یہ جرأت مندانہ اور باہمت اقدام تھا۔

(3) منہاج، ص: 185 (4) فرشتہ جلد اول، ص: 68 (5) منہاج، ص: 185

(6) منہاج، ص: 86-185، اس کے فوراً بعد منہاج ان الفاظ میں اپنا تبصرہ کرتا ہے کہ "وہی ہوا جس کی محترم المقام بادشاہ نے پیشین گوئی کی تھی۔" سلطان ناصر الدین محمود کو منسوب اور اس کے دور میں لکھی ہوئی تصنیف کا یہ جملہ اگر التمش کی تقریر کے خط کشیدہ (Italicised) حصے کے ساتھ پڑھا جائے تو شاید یہ بادشاہ وقت کے لیے بھی ایک بالواسطہ الزام ظاہر کرتا ہے۔

پر ایک سکہ یادگار کے طور ڈھالا گیا اور التمش کے نام کے ساتھ اس پر رضیہ کا نام بھی لکھا گیا تھا۔[1]

التمش کی موت کے فوراً بعد امراء خاص طور پر صوبائی افسروں نے رکن الدین فیروز کو تخت پر بیٹھا دیا۔ کیا یہ التمش کی خواہشات کے برعکس تھا یا یہ اقدام مرحوم سلطان کے ذریعے اپنے اصل فیصلے کی منسوخی کی بنیاد پر تھا؟ مندرجہ ذیل حقائق یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ خود التمش نے اپنی رائے بدل دی تھی۔ (1) اپنی سرحدی آخری مہم سے واپسی پر، جب شدید بیمار پڑ گیا تھا، وہ رکن الدین فیروز کو لاہور سے اپنے ساتھ لایا تھا۔[2] (2) منہاج کہتا ہے کہ ایسا اس لیے ہوا کہ چونکہ ناصر الدین محمود کے بعد سلطان کے لڑکوں میں یہی سب سے بڑا لڑکا تھا اس لیے وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز تھا۔[3] (3) شاید یہ وہی موقع تھا جب ایک چاندی کا سکہ جس پر التمش اور فیروز کا نام جاری کیا گیا۔[4] (4) ملکوں کے ذریعے فیروز کی تخت نشینی کا بالاتفاق قبول کر لینا۔[5] التمش کی خواہشات سے بالاتفاق اعراض کرنا معلوم نہیں پڑتا بلکہ التمش کے فیصلہ کو قبول کرنا ہے جو اس نے اپنے آخری سال میں کیا تھا۔

---

(1) J.A.S.B.، 1896ء ص: 218 نمبر 3، نلسن رائٹ (ص: 76-40) بھی ملاحظہ ہو جو اس سکے کو رضیہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔

(2) منہاج ص: 182

(3) ایضاً ص: 182

(4) JA.S.B.، 1894ء ص: 66 لیکن نلسن رائٹ (ص: 75-38) اس سکے کو فیروز کی طرف منسوب کرتا ہے کہ "یہ قابل غور ہے کہ فیروز اور رضیہ دونوں ہی نے اپنے سکوں پر اپنے باپ کا نام بڑھا کر اپنے تخت کے تحفظ کو بڑھانے کی کوشش کی۔"

(5) منہاج، ص: 182

3

شمس الدین التمش کے ورثاء

چہلگانی غلام افسروں کے خاندان

اگر کوئی شمس الدین التمش کو بتاتا کہ اس کی موت کے دس سال بعد اس کے وہ ترک غلام جنہیں اس نے بھاری رقم کے عوض خریدا تھا اور جن کی اس نے بڑی جانفشانی اور محنت سے پرورش و پرداخت کی تھی وہی غلام خود اس کے نسل کے چار افراد کو تخت نشین کرنے کے بعد انہیں قربانی کے بکروں کی طرح ذبح کر دیں گے اور یہ کہ اس کی موت کے تیس سال بعد اس کا ایک غلام اس کے خاندان کے تمام مرد افراد کا صفایا کر دے گا تو اس عظیم حکمراں کو تکلیف ضرور ہوتی مگر حیرت نہیں۔ اس نے ایک حکمراں خاندان کی بنیاد ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس نے خود اپنی آنکھوں کے سامنے کتنے ہی حکمراں خاندانوں کا صفایا ہوتا ہوا دیکھا تھا۔ اسے اس حقیقت کو جان کر بھی حیرت نہ ہوتی کہ اس کے تمام ترک غلاموں کے ذریعے جنہیں اس نے امیر اور ملک مقرر کیا تھا تمام عالی نسب اور اہم تاجک افسران ایک ایک کر کے یا گروپ کی شکل میں ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

التمش کی موت کے بعد کے تیس برسوں کی دو اہم خصوصیات۔ بادشاہ کی کمزوری اور ترک غلام۔ افسران کی بالادستی کے بارے میں برنی کے چند جملوں کا اقتباس پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہاں اس سلسلہ میں پورے اقتباس کی جانچ ضروری ہے۔

برنی لکھتا ہے کہ "شمس الدین التمش" کے دورِ حکومت میں مشہور ملک اور امراء جو برسوں سے انتظامِ حکومت اور سربراہی کرتے چلے آئے تھے، وزراء اور دیگر

ممتاز اشخاص، ملعون منگوں چنگیز خاں کی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں کے خوف سے اپنے اپنے ملکوں سے بھاگ کر شمس الدین کے دربار میں چلے آئے تھے اور ان بے مثال ملکوں، وزیروں اور ممتاز اشخاص کی وجہ سے، جو نہ صرف یہ کہ آزاد فضا میں پیدا ہوئے اور اعلیٰ ممتاز شریف آباد و اجداد کے چشم و چراغ تھے بلکہ تعلیم یافتہ، عقلمند اور باصلاحیت لوگ تھے، سلطان شمس الدین التمتش کا دربار سلطان محمود اور سنجر کیدرباوں کی طرح مستحکم ہو گیا تھا۔ لیکن سلطان شمس الدین کی موت کے بعد اس کے چالیس بندگان ترک کو بالادستی حاصل ہو گئی تھی۔ شمس الدین کے لڑکوں کی پرورش و پرداخت اس ڈھنگ سے نہ ہوئی جیسا کہ شہزادوں کی ہونی چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بادشاہت کے فرائض ٹھیک ٹھیک انجام نہ دے سکے جو فرائض نبیوں کے فرائض کے بعد سب سے زیادہ اہم اور نازک ہیں۔ لہٰذا ترک غلام۔ افسروں کی بالادستی کی وجہ سے وہ تمام معزز لوگ جن کے آبا واجداد پشتوں سے ملک اور وزراء رہتے آئے تھے، شمس الدین کے اخلاف جو دنیا اور اس کی حکومت کے معاملات سے نابلد تھے کے دورِ حکومت میں ختم کر دیے گئے۔

ان شریف النسل لوگوں کے خاتمہ کے بعد شمس الدین کے غلاموں نے ترقی کی اور ”خان“ بن گئے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا نو۔ پیدا، محل، ایوان، شراب خانہ اور ٹھاٹ باٹ تھا۔ اس وقت کے لوگوں نے اس کہاوت کا نمونہ دیکھ لیا جو جمشید سے منسوب ہے۔ ”یہ کہ جب تک شیر جنگل کو چھوڑ نہیں دیتا وہاں کی چراگاہ ہرن کے لیے غیر محفوظ ہے اور باز جب تک اپنے آشیانہ میں نہیں چلا جاتا اس وقت تک بٹیروں اور دیگر چڑیوں (مسیچہ) کا اڑنا ناممکن ہے۔“ جب تک کہ عالی نسب شرفاء اور لیڈروں کو ان کے اعلیٰ عہدوں سے برطرف نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک ذلیل اور درہم خرید، غلاموں کا ترقی کرنا اور ایک لیڈر اور بڑا افسر ہو جانا ممکن نہ تھا۔

”چونکہ شمسی غلامان خواجہ تابش (ایک ہی آقا کے) تھے اور ایک ہی گروپ بنا رکھا تھا اور (وہ) چالیسوں نے ایک ہی طریقہ سے ترقی کی تھی لہٰذا ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو بڑا تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا۔ چنانچہ مملکت فوجوں، عہدوں اور جاہ و مرتبہ کی تقسیم میں سب ایک دوسرے سے برابری کا مطالبہ کرنے لگے۔ ان میں ہر ایک ”میں اور کوئی نہیں“ کا نعرہ لگاتا اور ہر ایک دوسرے سے پوچھتا کہ ”تم کیا ہو جو میں نہیں اور

تم نے کیا کیا ہے جو میں نے نہیں کیا۔

شمس الدین کے جانشینوں کی نااہلی اور شمسی غلاموں کے غلبہ کے باعث اقتدار اعلیٰ (اولوالامر) کا ذرا بھی وقار باقی نہ رہا اور شمس الدین کا وہ دربار جو اپنے استحکام اور طاقت میں اس وقت کی دنیا میں موجود تمام بادشاہوں کے دربار سے آگے بڑھ گیا تھا اب اس کی کوئی وقعت نہ تھی۔[1]

اس کے باوجود سلطان کا عہدہ اور سلطنت برقرار رہا اور خوش کن حالات میں ان کی دوبارہ بحالی محض ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر تھی۔

برنی کے اس دعویٰ کا ایک بہت معقول ثبوت منہاج کی طبقات ناصری میں خاص طور پر ”شمسی ملکوں“ کے عنوان پر اس کے بائیسویں طبقہ میں ملتا ہے۔ جس کی تصنیف مصنف نے ستمبر یا اکتوبر 1260ء میں مکمل کی تھی اس طبقہ باب میں 25 ملکوں کی سوانح عمریاں ہیں۔ باب کے تقریباً نصف حصہ میں بہاء الدین بلبن کی سوانح بیان کی گئی ہے۔ بقیہ 24 ملکوں یا خواتین جنہیں مورخین کے مطالعہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ سب کے سب ترکی غلام افسران ہیں۔ کسی بھی غیر غلام غیر ملکی افسر کو سوانحی خاکہ کے لیے منتخب نہیں کیا گیا۔ نیز ان ترکی غلام افسران مثلاً قتلغ خان، جن کی برتری کو منہاج تسلیم کرتا ہے، کا بھی صرف ضمناً تذکرہ ہے لیکن سوانح عمری کے لیے انہیں منتخب نہیں کیا گیا کیونکہ وہ لوگ بلبن کے مخالفین تھے۔ ان میں سے دو یا تین غلام افسران ”معزی“ خطاب کے حامل ہیں اور شاید التمش نے انہیں ترکہ کے طور پر پایا تھا۔ ان میں سے ایک یقیناً بہاء الدین طغرل کے خاندان کی طرف سے التمش تک پہنچا تھا۔ غلاموں کی خریداری کا حوالہ دیتے وقت منہاج التمش کا حوالہ ”سلطان سعید“[2] کی حیثیت سے دیتا ہے۔ لیکن کچھ موقعوں پر وہ خریداری کا حوالہ (صرف ”سلطان“ کی حیثیت سے دیتا ہے لہٰذا وہاں ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ معزالدین غوری کا حوالہ دے رہا ہے یا التمش کا۔ بہرحال اکثر بڑے ترکی افسران

---

(1) تاریخ فیروز شاہی، ص: 27-28

(2) برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں سلطان کا حوالہ ”سلطان شہید“ کی حیثیت سے دینا غالباً نقل کرنے والے کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

جو 1260ء میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے انہیں التمش نے، شاید نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ غلاموں کی پچاس ہزار جیتلز کی اوسطاً قیمت پر خریدا تھا۔ منہاج نے جتنے ترکی غلام افسران کا حوالہ دیا ہے ان کی مجموعی تعداد چالیس سے زیادہ ہے لیکن بہت سے خاندانوں نے اپنے بعد کوئی وارث نہیں چھوڑا مثلاً اچھ کے کبیر خاں کا خاندان۔ لہٰذا ایسے خاندان جن کا ریاست کے اعلیٰ ترین عہدوں پر بلا شرکت غیر دعویٰ تھا ان کی تعداد کم و بیش چالیس مانی جا سکتی ہے۔ تمام زندہ و مردہ غلام افسران کی منہاج تعریف کرتا ہے لیکن ان سب کی ایک مشترک صفت جس کا ہم ذکر کر سکتے ہیں وہ میدانِ جنگ میں ان کی ہمت و جرأت اور سول معاملات میں ان کی تنظیمی صلاحیت ہے۔

لیکن برنی کی حمایت میں اہم ترین دلیل اب بھی مطلوب ہے۔ منہاج ممتاز محققین کے خاندان کا تھا اور اس نے اپنے باپ اور دادا کا بھی مختصر تعارف کرایا ہے۔ وہ سلسلہ نسب قلمبند کرنے کا شوقین تھا جیسا کہ غوری خاندانوں کے سلسلہ میں اس کے طبقہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر اس نے ایک ارم شاہ اور بقیہ ان چالیس یا پچاس ترکی غلاموں کے باپ اور دادا کا نام کیوں نہ دیا جن کو وہ بہت قریب سے جانتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ خود ان غلاموں کو یہ نہیں معلوم تھا اور نہ وہ اس کو بتا سکے تھے۔ کیونکہ بچپن ہی میں انہیں غلاموں کے شکاریوں نے اپنے خاندانوں سے جدا کر دیا اور وہ ایک بھیڑ کی طرح گلے میں شامل ہو گئے۔ پھر انہیں ان کی جسمانی، تعلیمی اور دیگر خصوصیات کی بنیاد پر انہیں ہوشیاری کے ساتھ منتخب کر کے تاجران غلام نے ان کی پرورش کی اور انہوں نے اپنے لڑکوں کی طرح پڑھایا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ ان کے ذہنوں میں اپنے والدین سے زیادہ ان تاجرین غلام کی یاد باقی رہی ہو گی۔ ان کے نام بھی انہیں تاجرانِ غلام نے رکھے۔ غالباً کسی خاص قاعدے کے مطابق ان کے نام رکھے جاتے تھے۔ ان پچیس افسروں میں جن کی منہاج نے سوانح عمریاں لکھی ہیں پانچ سیف الدین چار تاج الدین، چار اختیار الدین اور دو عزیز الدین ہیں۔

سلطان رکن الدین فیروز شاہ

التمش کی وفات کے دوسرے دن رکن الدین فیروز کو تخت نشین کیا گیا

21 شعبان 633ھ / اپریل مئی 1236ء) منہاج کے مطابق اس کی تین ممتاز خوبیاں تھیں۔ خوبصورت قد و قامت، نرم خوئی اور بے انتہا سخاوت۔ لیکن صرف یہ خوبیاں اس دور میں ایک کامیاب حکمراں کے لیے کافی نہ تھیں۔ اس کے عیش پسند مزاج نے اسے دہلی کے تاج کے لائق نہ رکھا۔ اس کے تفریحی مشاغل کی وجہ سے اس کی ماں شاہ ترکان جو ایک ترکی کنیز اور سلطان کے حرم کی سردار (خاتون) تھی، کو پورے نظام حکومت پر کنٹرول حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ بہر حال یہ بات قابل ذکر ہے کہ رکن الدین انتظام حکومت کے تجربات سے عاری نہ تھا۔ 625 ہجری 1227ء میں بدایوں کا اقطاع اس کے حوالے کر دیا گیا تھا جس کا انتظام اس نے قباچہ کے ایک سابق وزیر عین الملک حسین اشعری کی مدد سے چلایا۔ گوالیار سے واپسی پر التتمش نے لاہور کا نظام حکومت اس کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ سب اقطاع خاص اہمیت کے حامل تھے اور گورنر کی جانب سے کڑی نگرانی کے متقاضی تھے لیکن رکن الدین نے تاج پہننے کے بعد انتظام حکومت سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس نے ملکی خزانے کو بڑی بے دردی سے لٹایا اور عیاشی میں زیادہ سے زیادہ مشغول ہوتا گیا۔

اس کی ماں۔ خداوند جہاں شاہ ترکان۔ علماء سادات اور خداترس افراد کو صدقات و خیرات دینے میں بڑی مشہور تھی اس کے باوجود اس نے ریاست کے معالات پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد دہشت زدگی کی حکومت قایم کر دی اور التتمش کے حرم کی دوسری عورتوں کے ساتھ اس نے بدسلوکی شروع کر دی۔ ان میں سے کئی کو مرواڈالا، جب التتمش کے ایک بیٹے قطب الدین کو فیروز اور اس کی ماں کے حکم سے اندھا کر کے مارڈالا گیا تو ملکوں کا حکومت پر سے اعتماد ختم ہو گیا اور ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت پھیل گئی۔[1] التتمش کے ایک لڑکے۔ ملک غیاث الدین محمد شاہ نے اودھ میں بغاوت کر دی اور لکھناوتی کے خزانہ کو لوٹ لیا جسے دہلی لے جایا جارہا تھا۔ اس نے متعدد شہریوں پر بھی حملے کیے اور لاقانونیت پھیلادی۔ بدایوں کے مقطع ملک عزیزالدین محمد نے بھی بغاوت کر دی۔ ملتان کے مقطع ملک عزالدین کبیر خاں ایاز، ہانسی کے مقطع ملک سیف الدین کوچی اور لاہور کے مقطع ملک علاؤالدین جانی

---

(1) منہاج، ص: 183

نے مل کر فیروز کے خلاف بغاوت کر دی۔ سلطنت کے نہایت بااثر طاقتور ملکوں کا یہ بہت ہی خطرناک اشتراک تھا۔ فیروز ان سے نمٹنے کے لیے دہلی سے روانہ ہوا لیکن خود شاہی افسران یا تو باغیوں کی طاقت سے خوفزدہ تھے یا پھر بادشاہ کے وفادار نہ تھے۔ وزیر نظام الملک جنیدی نے کیلو کھڑی کے مقام پر فوج کا ساتھ چھوڑ دیا اور کوئل کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہاں سے وہ ملک عزالدین محمد سالاری کے پاس شامل ہونے کے لیے روانہ ہو گیا۔ تب جنیدی اور سالاری ملک جانی اور کوچی کی فوجوں میں شامل ہو گئے۔[1]

ملکوں امیروں کی بغاوت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ فیروز کہرام کی جانب فوج لے کر بڑھا۔ دریں اثنا امراء۔ اور غلامان دربار، جن پر سلطان کی فوج کا قلبی دستہ مشتمل تھا نے منصور پور اور ترائن کے قریب بہت سارے تاجکی (غیر ملکی، غیر ترک) افسران کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا کر حالات کو مزید الجھا دیا۔ منہاج نے منظم قتل کی اس سازش کے شکار ہونے والوں میں مندرجہ نام لکھے ہیں:۔ تاج الملک محمود دبیر، مشرف ممالک کا لڑکا، بہاء الدین حسین اشعری، کریم الدین زاہد، ضیاء الملک بن نظام الملک جنیدی، نظام الدین شغر قانی، خواجہ رشید الدین مالکانی اور امیر فخر الدین دبیر۔[2]

سلطنت میں بغاوتوں اور لا قانونیت کے واقعات نے رضیہ کو شہہ دی کہ موقع کا فائدہ اٹھا کر (رکن الدین کے خلاف) ضرب لگائے۔ شاہ ترکان کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ موخر الذکر نے تو حقیقتاً اس کو قتل کروانے کا منصوبہ بنایا تھا۔[3] ان حالات میں رضیہ نے جرأت سے کام لینے کا تہیہ کیا۔ اس نے سرخ جامہ زیب تن کیا جو عموماً ان دنوں مظلوم لوگ انصاف کا مطالبہ کرنے کے لیے پہن لیا کرتے تھے۔ اس نے اپنے باپ کے نام پر دہلی کے لوگوں سے جو اس وقت فرض نماز کی ادائیگی کے لیے جمع تھے براہ راست اپیل کی کہ وہ اسے شاہ ترکان کی سازشوں سے نجات دلائیں۔ مجمع نے محل پر حملہ کر دیا اور شاہ ترکان کو قید کر دیا۔[4]

---

(1) ایضاً، ص:183

(2) ایضاً، ص:184

(3) ایضاً، ص:184

(4) ایضاً، ص:184

اس موقع پر فیروز دہلی لوٹا لیکن دار السلطنت کے (لوگوں کے) تیور اس کے خلاف تھے۔ فوج (کے سردار) اور امراء رضیہ سے مل گئے تھے اور اس کی موافقت میں حلف وفاداری لے چکے تھے۔ اس نے رکن الدین کو گرفتار کرنے کے لیے فوراً ایک فوج بھیج دی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا اور غالباً 18 ربیع الاوّل 634 ہجری مطابق 19 نومبر 1236ء کو اس کی چھ ماہ 28 دن کی ناکام حکومت کے بعد قتل کر دیا گیا۔[1]

منہاج فیروز کی سخاوت کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "نشے کی حالت میں سلطان ہاتھی پر سوار ہو کر سونے کے ٹنکے بکھیرتا ہوا بازاروں سے گزرتا تھا۔[2] مزاجاً وہ شریف تھا جس کی وجہ سے اس کا زوال آیا۔ اس کی حد سے زیادہ شراب کی لت اور صید افگنی کی عادت نے انتظامیہ کو مفلوج کر دیا تھا۔ اور اس کی زیادہ تر دولت سازندوں، مسخروں، خواجہ سراؤں اور دیگر نامعقول لوگوں کی نظر ہو جاتی تھی۔ وہ کسی بھی جاندار مخلوق کو تکلیف پہنچانا نہیں چاہتا تھا اور یہی وجہ اس کی بادشاہت کے خاتمہ کی ہے۔

رکن الدین کی حکومت ناکام ثابت ہوئی۔ لیکن اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں چمک کی صرف ایک رمق ملتی ہے۔ التتمش نے ایک ترک غلام سیف الدین ایبک کو کسی جمال الدین خوب کارنامی ایک شخص سے خریدا تھا اور اسے سر جاندار مقرر کر دیا تھا۔ سیف الدین کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ان فوجیوں اور گھوڑ سواروں سے کم و بیش تین لاکھ جتل بطور جرمانہ وصول کر سکتا ہے جو شاید فوجی معائنہ کے وقت حاضر نہ ہوتے تھے۔ اس نے یہ رقم نہیں لی اور بادشاہ سے عرض کیا کہ "جہاں پناہ نے مجھے سب سے پہلا عہدہ جرمانہ وصول کرنے کا دیا ہے۔ میرے لیے ظالم بن جانا یا مسلمان سے یا رعیت سے جرمانے وصول کرنا ممکن نہیں ہے"۔ شمسی غلاموں میں اس طرح کے ایماندار آدمی کا پایا جانا تعجب خیز ہے۔ التتمش نے اسے نارنول۔ بارن اور سنام کے اقطاع یکے بعد دیگرے بخشے اور آخر میں اسے تاج الدین سنجر کزلک خاں کے 629 ہجری/1232ء میں انتقال ہو جانے پر اچھ کا گورنر بنا دیا۔ سیف الدین حسن قرلغ جو ہمیشہ سے ہندستانی

---

(1) ایضاً، ص:184

(2) ایضاً، ص:184

سرحدوں کی تاک میں تھا، التتمش کی موت کے بعد بنیان کے راستہ اُچھ کی طرف آسانی سے فتح کی امید میں پیش قدمی کی لیکن اس نے سیف الدین کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ پوری طرح مسلح فوج لے کر اُچھ سے باہر آیا اور قرلیغوں کو پسپا کر دیا۔ منہاج کہتا ہے کہ "یہ فتح اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک عظیم کارنامہ ہے۔" التتمش کی موت کے بعد ہندستانی سلطنت (مملکت) کا وقار لوگوں کے دلوں میں گرنے لگا تھا اور چاروں طرف سے اس کے دشمن اس کے حدود پر قابض ہونے کی خواہش کرنے لگے تھے۔ بدقسمتی سے ملک سیف الدین کا انتقال جلد ہی گھوڑے سے گرنے کی وجہ سے ہو گیا۔[1]

سلطان رضیہ[2]

تخت دہلی پر رضیہ کے فائز ہونے کے سلسلے میں چند باتیں قابل توجہ ہیں:

(1) سلطنت دہلی کی تاریخ میں دہلی کے عوام نے پہلی مرتبہ کسی کو اپنی مرضی کے مطابق تخت نشین کیا تھا۔ بعد ازاں دہلی کے عوام کی حمایت رضیہ کے استحکام کا خاص ذریعہ بنی رہی۔ جب تک وہ دہلی سے باہر نہیں نکلی اس وقت تک اس کے خلاف کوئی بھی بغاوت کامیاب نہ ہو سکی اور نہ محل کے اندر کوئی انقلاب ہی برپا ہوا۔

(2) اس نے لوگوں سے کہہ کر جب وہ ان کی توقعات کی برآوری نہ کرے تو وہ اس سے گدی چھین لیں[3]، اپنی تخت نشینی کو ایک معاہدے کی شکل دے دی۔

(3) اس (واقعہ) سے التتمش کا انتخاب صحیح ثابت ہوا۔

(4) ایک عورت کو حکمراں کی حیثیت سے تسلیم کر لینے میں ترک ذہن کی

---

(1) منہاج طبقہ 22، نمبر 4

(2) عربی قواعد سے ناواقفیت کی بنا پر بعض مصنفین نے اسے "سلطانہ' لکھا ہے جس کا مطلب ہوگا 'بادشاہ کی بیوی'۔ منہاج اس کو سلطان رضیۃ الدنیا والدین بنت السلطان (ص:185) لکھتا ہے۔ سکوں میں اس کا نام یا تو سلطان جلالۃ الدنیا والدین (Ind. Mus. Cat. of Coins) جلد دوم، ص:26، نمبر 93) یا پھر السلطان المعظم رضیۃ بنت السلطانہ درج ہے (نیلسن رائٹ ص ص:76,41) سنسکرت کے ترجموں میں اس کا نام جلال الدین درج ہے۔ (Ray. Dynastic History of Northerr India) جلد دوم 1095،)

(3) فتوح السلاطین، ص:132

مردانگی اور جرأت کا پتہ چلتا ہے۔

(5) اس سے ریاست کے معاملات میں علماء کی بے تعلقی اور ان کی عدم اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کیونکہ کسی عورت کو شاہی اختیارات کی تفویض اسلامی رواج[1] کے خلاف عمل تھا۔

(6) دہلی کی فوج اور افسران نے، رضیہ کو تخت پر بٹھایا تھا چنانچہ صوبائی گورنر، جو ترک حکمراں طبقہ کے ایک طاقتور جز ہوا کرتے تھے، فطری طور پر خود کو ذلیل اور نظر انداز کردہ محسوس کرنے لگے جس کا نتیجہ ہوا کہ دور حکومت کے بالکل آغاز ہی سے رضیہ کو اُن کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رضیہ نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صورت حال کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتی تھی۔ حصول اقتدار کے لیے اس کا پہلا قدم ہی اس کے چاق و چوبند سیاسی شخصیت کی دلالت ہے۔ جس قسم کے اچانک انقلاب کا رضیہ نے منصوبہ بنایا تھا اور جسے بڑی خوش اسلوبی سے اس نے انجام دیا اس انقلاب کے لیے اس سے بہتر کوئی وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ منہاج ٹھیک ہی لکھتا ہے کہ ''اس کے اندر وہ تمام قابل تعریف خوبیاں موجود تھیں جن کا بادشاہوں کے اندر پایا جانا ضروری ہے۔''[2] لیکن اس کا عورت ہونا اس کی سب سے بڑی دُشواری تھی۔ یہ دشواری اس کے دل و دماغ کی پوری صلاحیتوں کے آزادانہ عمل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی تھی۔ بہر حال یہ چیز اس کے زوال کا سبب نہ تھی جیسا کہ اس کی حکومت کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خلاف جو مخالف پارٹی بنی وہ نسلی بنیادوں پر منظم ہوئی تھی۔ وہ اس کوشش میں تھی کہ ترک شرفاء کے مقابلہ میں ایک غیر ترک شرفاء کا گروپ تیار کر کے ان کی قوت کو کم کر دیا جائے جس کی وجہ سے مخالفت شدید تر ہوتی گئی۔

---

(1) فتوح السلاطین، ص: 132

(2) سولہویں صدی کے شیخ محدث دہلوی نے علماء کے اس رویہ پر حیرت کا اظہار کیا ہے (تاریخ حقی، مخطوطہ) ہم عصر مورخ منہاج السراج جو اپنے زمانہ کے ایک ممتاز عالم اور قاضی تھے مسئلہ کے پہلو پر ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکے۔

مسلم شریعت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ شریعت شہنشاہیت کو ایک ادارے کے طور پر جائز نہیں سمجھتی۔ بہر حال، ایک ملکہ، ملکہ سبا، کا حوالہ قرآن میں ملتا ہے۔

رضیہ کو سب سے پہلی مشکل اس وقت پیش آئی جب التمش کے مشہور وزیر نظام الملک جنیدی نے اس کی تخت نشینی کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے علاؤ الدین جانی، ملک سیف الدین کوچی، ملک عزالدین کبیر خاں ایاز ملک عزالدین محمود۔ جیسے نمازی شرفاء کی حمایت حاصل تھی انہوں نے اس کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنایا اور مختلف راہوں سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ رضیہ کو دہلی کے عوام کی ٹھوس حمایت حاصل تھی لہٰذا اس طرح کی بغاوت کی کامیابی مشکل تھی۔ لیکن ایک باغی گروہ کی حیثیت سے دہلی کے اطراف میں ان کی مستقل موجودگی نے اس کے اقتدار کے تحفظ کے لیے ایک سنگین خطرہ پیدا کر دیا۔ رضیہ نے ملک نصرت الدین تائسی معزی کو اودھ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اب اس نے اپنی مدد کے لیے بلا بھیجا۔ وہ اس کی مدد کے لیے اپنی فوج لے کر روانہ ہوا لیکن جوں ہی اس نے گنگا پار کیا اس پر ملک سیف الدین کوچی نے حملہ کر دیا اور اسے گرفتار کر لیا۔ چونکہ وہ کسی مرض میں مبتلا تھا لہٰذا قید ہی کی حالت میں مر گیا۔ کوئی ایسا سبب نہیں ملتا جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ ترک غلام افسران آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہیں کرتے تھے جب تک کہ بلبن نے یہ سیاسی تبدیلی نہ کر دی۔ اور تائسی (سلطان) معزالدین کا غلام رہا تھا۔

رضیہ نے باغیوں کے اتحاد کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ شہر سے باہر آکر دریائے جمنا کے کنارے خیمہ زن ہو گئی۔ دونوں فوجوں کی جنگ سے کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ لہٰذا یہ فیصلہ ہوا کہ دوسرے طریقہ سے مسئلہ حل کیا جائے۔ ملک عزالدین محمد سالاری اور ملک عزالدین کبیر خاں ایاز چپکے سے رضیہ کی جانب چلے آئے اور انہوں نے نظام الملک جنیدی اور دیگر باغیوں کو گرفتار کر لینے کا منصوبہ بنایا۔ تاہم ان ملکوں کو اس منصوبہ کی خبر مل گئی اور وہ تیزی سے اپنے خیموں سے بھاگ نکلے۔ ان کا فوراً ہی تعاقب ہوا۔ ملک سیف الدین کوچی اور اس کا بھائی فخر الدین گرفتار ہوئے اور قتل کر دیے گئے۔[1] ملک نظام الملک جنیدی سرمورگی کی پہاڑیوں میں بھاگ کر چلا گیا اور وہیں اس کی موت ہو گئی۔ ملک علاؤ الدین جانی نکوان نامی ایک گاؤں میں مارا گیا۔ اور اس کا

---

(1) ایضاً، ص: 186-187

سر وہاں سے دہلی لے جایا گیا۔[1] اس طرح تمام سرکش عناصر یا تو ختم ہو گئے یا رضیہ کے کنٹرول میں آ گئے۔ رضیہ کے ان لوگوں کو اس قسم کی شکست دے کر ایک خطرناک دستوری نظیر کو سر اٹھانے سے روک دیا۔ ایسی نظیر جس میں حکمراں کی تقرری میں صوبائی گورنروں کی آواز غالب ہو۔[2]

بغاوتوں کو فرو کرنے کے بعد رضیہ نے انتظامیہ تشکیل نو کی طرف توجہ دی، خواجہ مہذب الدین جو نظام الملک کے نائب کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اس کی جگہ پر وزیر مقرر ہوا اور نظام الملک کا خطاب بھی اس کو دیا گیا۔ فوج کا محکمہ ملک سیف الدین ایبک بہتو کی ماتحتی میں دے دیا گیا اور اسے قتلغ خاں کا خطاب دیا گیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد اس کے انتقال کی وجہ سے ملک قطب الدین حسن غوری کو نائب لشکر[3] مقرر کر دیا گیا۔ لاہور کا اقطاع ملک عزالدین کبیر کو سونپا گیا۔ سرکش عناصر سے نمٹنے میں رضیہ نے اپنی کمال کی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا اور جلد ہی جیسا کہ منہاج کا خیال ہے ''لکھناؤتی سے دیبل تک کے تمام ملک وامراء اس کے اقتدار کے آگے جھک گئے۔[4]

ان معاملات کو درست کرنے کے بعد پہلا قدم رنتھمبور کے خلاف اٹھایا گیا، جس کو کہ التتمش کی موت کے بعد ہندو سرداروں نے دوبارہ قبضہ میں لے لیا تھا۔ ملک قطب حسن غوری کو رائے کے خلاف اقدام کا حکم دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کو جو کچھ بھی کامیابی حاصل ہو سکی وہ اتنی ہی تھی کہ ترک ملکوں اور افسروں نے قلعہ بآسانی خالی کرا لیا۔[5] دہلی سلطنت کا وقار شدت سے مجروح ہو گیا، اس کے بعد چوہانوں نے نہ صرف یہ کہ پورے کا پورا شمالی مشرقی راجپوتانہ ہضم کر لیا بلکہ لوٹ مار کرنے والے میواتیوں کی مدد سے ایک جارحانہ گوریلا جنگ چھیڑ دی، جو محمود کے دورِ حکومت کے اختتام تک خود دہلی کے حدود تک جا پہنچی۔ انہیں ایام میں گوالیار میں شروع کی گئی

---

(1) ایضاً۔ ص 187

(2) IHQ، جلد 16، ص: 760

(3) منہاج، ص: 187، حبیب اللہ کے مطابق (IHQ، 16ویں جلد، ص: 760) 'نائب لشکر' کا عہدہ رضیہ نے قایم کیا تھا۔

(4) ایضاً، ص: 187 (5) ایضاً، ص: 187

کارروائی بھی اتنی ہی ناکام ثابت ہوئی۔

رضیہ نے تخت نشین ہونے کے فوراً بعد فوجی افسران اور مختلف اقطاع کے لیے گورنر بحال کیے اور اس کے بعد شاہی دربار کے افسران کی تقرری ہوئی۔ اس نے ملک کبیر اختیار الدین ایتگین کو امیر حاجب اور ملک جمال الدین یاقوت کو امیر اخور مقرر کیا۔[1] موخر الذکر کی تقرری پر ترک ملکوں نے مخالفت کی کیونکہ یاقوت ایک حبشی تھا اور اس سے پہلے اس عہدے پر صرف ترک افسران ہی فائز کیے جاتے تھے۔

بہر حال وفادار اور قابل اعتماد انتظامیہ عملہ مقرر کرنے کے بعد رضیہ نے معاملات پر براہ راست کنٹرول رکھنے کے لیے توجہ کی۔ اگر وہ پردہ میں رہتی تو ایسا ممکن نہیں تھا۔ عصامی کے مطابق اس تخت کو جس پر وہ بیٹھتی تھی درباریوں اور عوام کے حصہ سے ایک پردہ کے ذریعہ علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ اور اس طرح کا بھی انتظام تھا کہ محافظ خواتین اس کے پاس ہی کھڑی رہتیں اور ان لوگوں کے بعد اس کے خونی رشتہ دار ہوتے۔[2] یہ انتظام بڑا بے ڈھنگا اور حارج ثابت ہو رہا تھا۔ رضیہ نے اپنا زنانہ لباس ترک کر دیا اور قبا و کلاہ پہن کر عوام میں نمودار ہوئی۔ وہ ہاتھی کی پشت پر سوار ہو کر باہر نکلتی اور دہلی کے دیگر بادشاہوں کی طرح اس نے سلطنت کے تمام معاملات کو انجام دینا شروع کر دیا۔ منہاج لکھتا ہے کہ "لوگ اسے بالکل صاف دیکھ سکتے تھے۔"

انتظام حکومت میں رضیہ کا بلاواسطہ اور مثبت رول نیز اہم عہدوں پر غیر ترکوں کی تقرری کے باعث ترکی شرفاء میں اس کے خلاف اندرونی غصہ بڑھتا گیا اور انہوں نے اسے تخت سے اتارنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔[3]

ملک عز الدین کبیر خاں ایاز (عموماً "ہزار مردہ" کے نام سے مشہور) کو التتمش نے نصیر الدین حسین، جس کو غزنی کے ترکوں نے قتل کر دیا تھا، کے ورثاء سے خریدا

---

(1) عصامی کا یہ بیان کہ وہ "شاہ اور شاہزادہ" (التتمش اور فیروز کی طرف اشارہ واضح ہے) کا "امیر اخور، تھا یہ تاثر دیتا ہے کہ تقرری خود رضیہ نے نہیں کی تھی (فتوح السلاطین، ص:129) لیکن جیسا کہ یحیٰی سرہندی واضح طور پر لکھتا ہے کہ اس کی تقرری اسی (رضیہ) نے کی تھی (تاریخ مبارک شاہی، ص:26)

(2) فتوح السلاطین، ص:128

(3) منہاج، ص:188

تھا۔ لیکن ملتان کے گورنر کی حیثیت سے اس کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر التمش نے اسے برطرف کر دیا تھا اور اسے گزر اوقات کے لیے پلول کا علاقہ سونپ دیا تھا۔ رکن الدین فیروز نے اسے سنام کے اقطاع کا ذمہ دار بنا دیا۔ اس طرح پھر ایک بار اس کا شمار چوٹی کے افسروں میں ہونے لگا۔ جب وہ رضیہ کے ساتھ مل گیا تو اسے لاہور اور اس کے پورے علاقے کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔

ہمیں اس کی تفصیل تو نہیں معلوم لیکن رضیہ کے خلاف ایک سازش تیار کی جا رہی تھی اور کبیر خاں نے، جس کی خمیر ہی میں بے وفائی اور ہوس تھی، دیگر غلام افسران کے مقابلہ میں زیادہ بہتر جوہر دکھلانے کی غرض سے ان کی بغاوت پر سبقت لے جانے کا فیصلہ لیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے سازشیوں سے اس کا رابطہ نہ تھا۔ رضیہ نے جب اس کے خلاف 636ھ / 1238-39ء میں پیش قدمی کی تو وہ دریائے راوی پار کر کے سودرہ بھاگ گیا۔ رضیہ نے اس کا تعاقب کیا۔ چونکہ سودرہ کے اس پار کا علاقہ منگولوں کے ہاتھ میں تھا اس وجہ سے اس کے لیے گھٹنے ٹیکنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس سے لاہور کا اقطاع لے لیا گیا۔ لیکن ملتان کا اقطاع جو پہلے اسی کے ہاتھوں میں تھا اختیار الدین قراقش ایتگین سے لے کر جسے التمش نے تفویض کیا تھا، اسے دے دیا گیا۔

رضیہ کے خلاف ایک موثر بغاوت اب شروع ہوئی۔ پچھلے تجربات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ چونکہ دہلی کے عوام نے اس کی حمایت کی تھی (اس لیے) وہ صوبائی گورنر جو دہلی پر کوچ کر کے اس کی طاقت کو للکاریں گے اپنی جانیں خطرہ میں ڈالیں گے۔ انفرادی گورنروں کی بغاوتیں، جیسا کہ کبیر خاں کے سلسلے میں ثابت ہو چکا تھا، اتنی ہی ناکام رہیں، ضرورت اس کی تھی کہ ایک صوبائی بغاوت اور دربار کے ترکی امراء کی بغاوت مشترکہ طور پر ایک ایسے مقام پر ہو جو دہلی سے دور ہو، ایسی ہی بغاوت کی کامیابی کی امید کی جا سکتی تھی۔ یہ بات بھی واضح تھی کہ رضیہ کو صرف وہی افسران دھوکہ دینے میں کامیاب ہو سکتے تھے جنہیں رضیہ نے بذاتِ خود مقرر کیا تھا اور جن کی وفاداری پر وہ اعتماد کرتی تھی اس نے اختیار الدین اتنگین کو جو ایک قراختائی ترک تھا اور جس کو اس کے والد نے امیر ایبک سنامی سے خریدا تھا۔ سالٹ رینج سے اپنے دربار میں بلایا تھا۔ پہلے تو اس نے اس کو بدایوں کا ''اقطاع دار'' متعین کیا اور بعد میں اس کو

اپنے دربار میں امیر حاجب کا بڑا اہم عہدہ دیا۔ لیکن احسان مندی ترکی غلام افسروں کی صفات میں شامل نہ تھی۔ اس زمانہ کی روایات اس بات کی متقاضی تھی کہ تخت نشین وہی ہو سکتا ہے جو شمسی خاندان کا ہو۔ البتہ یہ ممکن تھا کہ انتظام حکومت کا پورا کنٹرول بادشاہ سے کسی ”نائب“ یا قایم مقام کو منتقل کر دیا جائے۔ لیکن ایسا اسی وقت ہو سکتا تھا جب امراء ایتگین کو کسی نئے بادشاہ کے ساتھ ساتھ (حاجب) منتخب کر لیتے جس سے وہ ایک ”نائب“ کی حیثیت سے آزاد رہتا۔ اس نے اپنے اس اعلیٰ عہدہ جس پر وہ فائز تھا اپنی ہی محسنہ کی برطرفی کے لیے استعمال کیا۔ التمش کا دوسرا ترکی غلام جس پر رضیہ نے بڑی مہربانیاں کی تھیں وہ اختیار الدین التونیہ تھا۔ التمش کے انتقال کے وقت وہ محض ایک ”سر چھتر دار“ تھا۔ رضیہ نے پہلے اسے باران کا پھر بعد میں تبرہندہ (بھٹنڈہ) کا مقطع مقرر کیا۔ بلاشبہ رضیہ ان دونوں افسران پر اعتماد کر سکتی تھی اس کے باوجود اس اثناء میں جب رضیہ لاہور کی مہم کے سلسلہ میں باہر تھی ان لوگوں نے اس کے خلاف ایک مکمل اور موثر سازش تیار کی۔ منہاج ہمیں پوری تفصیل نہیں بتاتا۔ رضیہ نے اسے ناصریہ کالج کا انچارج بنادیا تھا۔ لہٰذا سازشی اسے اپنے اعتماد میں نہ لے سکے۔ تاہم وہ جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ اہم ہے۔

> ”چونکہ ان ترکی ملکوں اور امیروں کے ذہن جو شمسی غلاموں میں سے تھے، ضیہ سے اس لیے برگشتہ تھے کہ اس نے ایک حبشی جمال الدین یاقوت کو اونچا درجہ (قربت) دے دیا تھا۔ ایتگین ”امیر حاجب اور التونیہ ”بھٹنڈہ کا گورنر“ کے درمیان یک مستحکم محبت و دوستی کا رشتہ تھا (اس لیے) ایتگین نے التونیہ کو اس تبدیلی سے آگاہ یا لہٰذا التونیہ نے خاموشی سے تبرہندہ میں بغاوت کی بنیاد ڈالنی شروع کر دی اور سلطان اطاعت کا قلابہ اپنی گردن سے اتار پھینکا۔“

دوسرے لفظوں میں جب رضیہ باہر تھی تو ایتگین نے التونیہ کو مطلع کیا کہ اگر وہ بغاوت کر دے تو وہ بقیہ معاملات سنبھال لے گا۔ لیکن کیا وہ اپنے سازشی ساتھی کا پورا ساتھ دے گا؟ مستقبل ہی نے یہ ظاہر کیا کہ ایسے ٹھگوں کے درمیان کوئی احترام نہیں ہوتا۔

کبیر خاں کے معاملات درست کر کے رضیہ 9/ رمضان 637ھ / 13/ اپریل

1240ء کو دہلی واپس آ گئی۔ اپنی آمد پر اسے التونیہ کی بغاوت کا پتہ چلا۔ لہٰذا دس دنوں کے بعد وہ تبرہندہ کے لیے روانہ ہو گئی۔ منہاج جیسا کہ بتاتا ہے کہ ”دارالسلطنت کے بعض امیر خفیہ طور پر التونیہ سے ملے ہوئے تھے، لیکن راز بڑی ہوشیاری سے راز رکھا گیا۔ چونکہ رضیہ دہلی سے باہر چلی گئی تھی اس لیے سرکش عناصر کو اس پر حاوی ہونے کا موقع مل گیا۔ جب اس کی فوج تبرہندہ کے قلعہ کے سامنے خیمہ زن تھی تو ترکی امیروں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔ یاقوت کو مار ڈالا اور رضیہ کو گرفتار کر لیا اور اسے تبرہندہ کے جیل میں بھیج دیا۔ دہلی میں موجود ترک امراء جو رضیہ کی قسمت کے سلسلے میں یہی توقع رکھتے تھے انہیں جیسے ہی اس کی خبر ملی انہوں نے معزالدین بہرام کو تخت پر بٹھا دیا۔

یہ خیال کر کے کہ رضیہ التونیہ کے ہاتھوں میں محفوظ ہے چوٹی کے لوگوں نے دہلی دربار کے عہدوں اور اقطاع کی تقسیم کا آغاز کیا لیکن انہوں نے التونیہ کے حقوق کو نظر انداز کر دیا۔ ”ایتگین نائب مملکت“ مقرر کیا گیا اور اس سے توقع کی گئی کہ وہ اپنے اس نئے بنائے گئے عہدہ کے ذریعے پورے نظامِ حکومت پر کنٹرول رکھے۔ نئے سلطان نے ایک یا دو مہینوں کے اندر ہی ایتگین کو قتل کرا دیا اور (اب) التونیہ اپنی بغاوت کے بدلے کسی انعام کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔

رضیہ نے اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھایا اور اس نے التونیہ سے شادی کر لی۔[1] ایک ایسا رشتہ جو دونوں کے لیے سودمند معلوم ہوتا تھا۔ اس رشتہ کے ذریعے رضیہ نے توقع کی تھی کہ وہ دوبارہ اپنی آزادی اور تخت حاصل کر لے گی۔ اور التونیہ نے اس کو اپنی ترقی کا ایک موقع سمجھا۔ التونیہ نے کھوکھروں، جاٹوں اور راجپوتوں[2] کی ایک فوج اکٹھا کی اور کچھ آزردہ خاطر شرفاء مثلاً ملک قراقش اور ملک سالاری کی حمایت حاصل کر لی اور رضیہ کے ساتھ دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ منہاج ان کے خاتمہ کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے۔ ”ماہ ربیع الاوّل 638ھ / ستمبر-اکتوبر 1240ء کو سلطان معزالدین بہرام ان لوگوں کے خلاف ایک فوج لے کر دہلی سے روانہ ہوا اور رضیہ اور التونیہ کو

---

(1) یحییٰ سرہندی کے مطابق (تاریخ مبارک شاہی، ص:29) یہ شادی صفر 638ھ / ستمبر 1240ء کو ہوئی۔

(2) فتوح السلاطین ص:37-132، عصامی کا بیان کئی لحاظ سے بڑا مبہم ہے۔

شکست ہوئی اور وہ لوگ پسپا کر دیئے گئے۔ جب وہ کیتھل پہنچے تو ان کے تمام سپاہیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور وہ سب ہندوؤں کے ہاتھوں میں پڑ گئے اور شہید کر دیے گئے۔ انہیں 24/ربیع الاوّل 638ھ / 14/اکتوبر 1240ء کو شکست ہوئی تھی اور رضیہ اسی کے دوسرے دن شہید کر دی گئی۔

رضیہ کے دورِ حکومت کا سب سے اہم واقعہ نور ترک کی قیادت میں قرامطیوں (اسمٰعیلیوں) کا حملہ کرنا تھا۔ ان واقعات کے سلسلہ میں منہاج کا بیان یہ ہے "ایک قرامطی محقق نورالدین ترک، جو عام طور پر "نور ترک" کے نام سے مشہور تھے، نے دہلی، گجرات، سندھ اور دو آب سے ایک ہزار حمایتیوں کو اکٹھا کیا۔ ان لوگوں نے حنفی اور شافعی مسلک کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اور سنی علماء کو وہ 'ناجی' اور 'مرجی' کہنے لگے۔ 6/رجب 634ھ / مارچ 1237ء کو وہ لوگ جامع مسجد میں دو سمتوں سے داخل ہوئے اور انہوں نے ان لوگوں کو جو جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے مارنا شروع کر دیا۔ جب ہنگامہ پھیل گیا تو کچھ لوگ نصیر الدین ایتم بلدارمی اور امیر ناصری شہر سے بھالوں، خودوں اور ڈھالوں سے مسلح ہو کر آئے۔ انہوں نے ملاحدہ سے جنگ کی جبکہ لوگ مسجد کی چھت سے پتھر پھینک رہے تھے۔[1]

لیکن منہاج کے اس بیان کو شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے ایک اجتماع میں تردید کی ہے۔[2] انہوں نے کہا کہ مولانا نورالدین بارش کے پانی سے بھی زیادہ پاک و صاف تھے۔ چونکہ انہوں نے اپنے وقت کے علماء کی ان کی مادی مشغولیتوں کی وجہ سے مذمت کی تھی لہٰذا منہاج اور اس قسم کے دوسرے لوگ اس سے بہت سختی سے چراغ پا تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دہلی میں قرامطیوں کی اس بغاوت سے وہ مولانا نور ترک، جن کا حوالہ شیخ نظام الدین اولیاء نے دیا ہے، کا کوئی تعلق نہ ہو۔[3]

---

(1) منہاج، ص: 189-90

(2) فوائد الفواد، ص: 189

(3) پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ نظامی، لائف اینڈ ٹائمس آف شیخ فرید الدین گنج شکر، ص: 31-32
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص: 136-39

منہاج کے مطابق رضیہ نے تین سال چھ مہینے اور چھ دن حکومت کی۔[1] اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ وہ التمش کے وارثوں میں سب سے زیادہ لائق تھی۔ اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی اس نے محسوس کر لیا کہ انتظامی امور کے بلاواسطہ اور موثر کنٹرول پردہ ایک رکاوٹ ہے اور اس نے اسے ترک کر دیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ ترکی امراء کی جب جاہ نظم وضبط کے قیام میں ایک زبردست رکاوٹ ہے لہٰذا اس نے ترکوں کی کاٹ کے لیے ان کے مدمقابل ایک غیر ترک امراء (طبقہ) تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پالیسی کے بعد جو مسلسل رد عمل ہوا اس نے رضیہ کو کچل ڈالا، یہ خیال کہ اس کے جمال الدین یاقوت کو ترجیح دینے میں کچھ قابل اعتراض پہلو ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔ جس چیز نے ترکی ملکوں اور امراء کو اس سے برانگیختہ کر دیا وہ وہ خطرات تھے جو اس کی پالیسی میں مضمر تھے۔ رضیہ کے کردار پر بحث کرنے کے سلسلے میں غیر شادی شدہ عصامی کے زن نفرت خیالات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

(الف) سرکش صوبائی گورنروں جیسے ملک کبیر خاں اور (ب) غزنی خوارزمی گورنر ملک حسن قرلغ سے نمٹنے میں رضیہ کی صلاحیتوں کا بخوبی مظاہرہ ہوتا ہے۔ 636ہجری / 1238ء میں منگولوں نے قرلغ ریاست چھین لی اور اس نے سلطنت دہلی کے مغربی صوبوں کی طرف رُخ کیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو دہلی بھیجا۔ شاید اس لیے کہ کسی قسم کے فوجی معاہدہ پر گفت وشنید ہو سکے۔ رضیہ نے بڑی خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا اور اگرچہ اس نے باران کی آمدنی اس کے اخراجات[2] کے لیے اس کے حوالے کر دیا۔ مگر اس نے منگولوں کے خلاف ایک محاذ بنانے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک معقول سیاسی فیصلہ تھا اور اس سے سلطنت منگولوں کے حملہ سے محفوظ ہو گئی۔

معزالدین بہرام شاہ

معزالدین بہرام شاہ 27؍ رمضان 637ھ / 24؍ اپریل 1240ء کو تخت پر بیٹھا۔ جس وقت رضیہ تبرہندہ میں مقید کی گئی ملکوں اور امراء نے دولت خانہ میں 11 شوال 637ھ / 5 مئی 1240 کو اس کی وفاداری کا حلف اٹھایا۔[3] عباسی خلفاء کے مورخین دو قسم کے وزراء۔ عام وزیر اور مطلق وزیر کے درمیان فرق رکھتے تھے۔

---

(1) منہاج۔ ص392

(2) ایضاً، ص: 392

(3) ایضاً، ص: 191

وزیر مطلق کی تقرری اور برطرفی خلیفہ ہی کر سکتا تھا لیکن وہ انتظام حکومت کا مکمل انچارج ہوتا تھا جس میں خلیفہ مداخلت نہیں کر سکتا تھا، یہ انتظام کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ یا تو خلیفہ وزیر کو قتل کرا دیتا یا پھر وزیر خلیفہ کو مار ڈالنے کا منصوبہ بناتا۔ رضیہ کی پالیسی ترکی غلام افسران کو اس نتیجہ پر لے آئی کہ اگر سلطان سے نظام حکومت کے حقیقی اختیارات لے کر ان میں سے کسی ایک کو دے دیے جائیں تو یہ سب بہتر ہوتا کہ نظام حکومت میں ان کی ناقابل چیلنج بالادستی کی توثیق ہو سکے۔ لہٰذا ایک نیا عہدہ جو "نائب مملکت" (ملک نائب یا نائب ملک بھی کہا جاتا تھا) کا تھا اور جو انگریزی اصطلاح ریجنٹ (Regent) کے ہم معنی ہے، قایم کیا گیا۔ ملک اختیار الدین ایتگین کو اس عہدہ کے لیے منتخب کیا گیا۔ معزالدین بہرام کا انتخاب ایتگین کو نائب کی حیثیت سے قبول کر لینے پر مشروط تھا اور حلف وفاداری سلطان اور نائب دونوں ہی کے لیے اُٹھایا گیا۔ ساتھ ہی وزیر کا عہدہ مہذب الدین ہی کو مقرر رہا۔ اس طرح ایک ہی اقتدار کے تین دعویدار تھے۔ اور کوئی شخص بھی جسے متعلقہ افراد کے کردار کی ایک سطحی واقفیت حاصل تھی اس تجربہ کی ناکامی کی گارنٹی دے سکتا تھا۔ حقیقتاً نائب کا عہدہ شاہی حکومت کے ساتھ میل نہیں کھاتا تھا لیکن ہم اسے زمانہ سلطنت کے دوران کبھی غائب اور کبھی نمودار پاتے ہیں۔

منہاج کے مطابق سلطان معزالدین بہرام شاہ ایک ایسا بادشاہ تھا جس میں کچھ قابل تعریف اوصاف تھے۔ وہ شرمیلا اور سادگی پسند تھا اسے نہ تو رسمی لباسوں کا شوق تھا اور نہ بادشاہت کی ظاہری شان و شوکت کی خواہش لیکن وہ بے باک اور خونخوار بھی تھا۔ امراء اسے ایک بے اختیار شہزادے کی حیثیت سے ہی جانتے تھے اور انہوں نے یہ سمجھنے کی زبردست غلطی کی کہ حکومت کے واقعی اختیارات سے محروم کر کے بھی اسے تخت نشین رکھا جا سکتا ہے۔ اسے یہ واضح کرنے کے لیے صرف دو یا اس سے کم ہی مہینے لگے کہ وہ (دراصل) مالک ہے۔ شاید ایک اچھا مالک نہیں پھر بھی ایک مالک وہ بھی قاتلوں کے درمیان ایک قاتل ہے۔

نائب کی حیثیت سے اپنی تقرری کے فوراً بعد ایتگین نے انتظام حکومت کی ساری باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس کے حمایتیوں میں ایک وزیر نظام الملک

خواجہ مہذب الدین محمد عوض تھا۔ ایتگین نے اپنی پوزیشن کو مزید مستحکم بنانے کے لیے سلطان کی ایک طلاق یافتہ بہن سے شادی کر لی اور اپنے صدر دروازے پر ایک "نوبت" اور ہاتھی رکھا حالانکہ یہ سب چیزیں قطعی طور پر سلطان کے لیے مخصوص تھیں۔ ابھی دو ماہ گزرے بھی نہ تھے کہ ایتگین کی حب جاہ کی ان کاروائیوں سے سلطان پریشان ہو گیا۔ 8 محرم 638ھ / 30 جولائی 1240ء کو "قصر سفید" میں ایک مذہبی مجلس کا انتظام کیا گیا جس میں ایتگین بھی مدعو تھا۔ سلطان کے اشارے پر دو ترکی قاتلوں نے اسے مجلس گاہ ہی میں چھرے سے ہلاک کر دیا۔ وزیر مہذب الدین پر بھی حملہ ہوا لیکن زخموں کے مدمل ہو جانے کے بعد وہ اچھا ہو گیا۔[1] دہلی میں یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب رضیہ دوبارہ تخت حاصل کرنے کے لیے التونیہ کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

معزالدین نے بدرالدین سنقر رومی کو امیر حاجب بنایا لیکن بہت جلد ہی اس کی طرف سے مشکوک ہو گیا۔ ملک سنقر کو بھی سلطان کی جانب سے تشویش تھی۔ چنانچہ وہ بھی اس کو ہٹانے کی تاک میں تھا۔ 17 صفر 639ھ / 27 اگست 1241ء کو اس نے مشرف ممالک صدر الملک تاج الدین علی موسوی کے مکان پر ایک خفیہ میٹنگ بلائی جس میں قاضی ممالک جلال الدین کاشانی قاضی کبیر الدین، شیخ محمد شامی اور بعض دیگر امراء مدعو تھے۔ وزیر نظام الملک مہذب الدین کو بھی میٹنگ میں مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے اسے لانے صدر الملک کو بھیجا گیا جب صدر الملک وزیر کے پاس حاضر ہوا تو سلطان کا ایک معتمد وہاں اس کے پاس موجود تھا۔ اور وزیر نے اس کو ایک ایسی جگہ چھپا دیا جہاں سے وہ صدر الملک کی باتیں سن سکتا تھا۔ جب صدر الملک نے اس کو اپنی آمد کا مقصد بتایا تو اس نے اوّل الذکر کو بتایا کہ وہ حمام سے فراغت کے بعد روانہ ہو گا۔ دریں اثناء سلطان کا معتمد بھاگتا ہوا سلطان کے پاس پہنچا اور اس کو سازش کی اطلاع دی۔ معزالدین نے سرعت کے ساتھ سازشیوں کے منتشر ہونے سے پہلے کارروائی کی اور انہیں گرفتار کر لیا۔ سلطان نے غالباً اپنے کو اتنا طاقتور محسوس نہیں کیا کہ ان کے لیے کوئی شدید سزا تجویز کر سکے۔ وہ یا تو باغیوں کا تبادلہ کر سکتا تھا یا پھر انہیں عہدوں سے معزول کر سکتا تھا۔ بدرالدین سنقر بدایوں کا مقطع بنا کر بھیج دیا

---

(1) ایضاً، ص: 192

گیا۔ قاضی جلال الدین کاشانی کو قاضی کے عہدہ سے معزول کر دیا گیا قاضی کبیر الدین اور شیخ محمد شامی نے بدحواسی کے عالم میں شہر چھوڑ دیا۔

تاہم بدر الدین سنقر بدایوں میں ایک گمنام زندگی بسر کرنے کو تیار نہ تھا۔ چار مہینے کے اندر ہی دہلی لوٹ آیا اور فوراً ہی جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی اسے اور سید تاج الدین علی موسوی کو مار ڈالا گیا۔ ان امراء کے قتل سے دیگر امراء خوفزدہ ہو گئے اور سلطان اور ان کے درمیان ایک خلیج پیدا ہونے لگی۔ وزیر نے سلطان کے خلاف بے اطمینانی کو اور شدید کرنے کے لیے حالات سے فائدہ اٹھایا۔

معاصرین کے نزدیک بہرام کی حکومت کا سب سے اہم واقعہ اختیار الدین قراقش کا 16 جمادی الآخر 639ھ / 22 دسمبر 1241ء کو لاہور خالی کرنا اور اس کے دوسرے دن منگولوں کی غارتگری ہے۔[1] یہ ایک ہیبت ناک واقعہ تھا لیکن معاصرین نے اس کی اہمیت کے اندازے میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ ہمیں اس صحیح تناظر ہی میں رکھنا ہے۔ جب تک داوا اور قیدو نے خلجی دور میں اپنی مختصر المعیاد مملکت کی تشکیل نہ کی تھی اس وقت تک شمالی ہندستان کو فتح کرنے کا منگولوں کا کبھی بھی ارادہ نہ رہا۔ اگتائی کے دور حکومت 41-1227ء میں منگولوں کے تمام انسانی و مادی وسائل جو بہر حال غیر محدود نہ تھے، مشرقی یورپ میں پیش قدمی کے لیے استعمال ہو رہے تھے۔ پھر بھی غارتگری اور لوٹ مار منگول سلطنت کے لیے ایک مستقل ذریعہ آمدنی تھا اور اس کے افسران اس معاملہ میں مکمل اختیارات رکھتے تھے۔

جب جلال الدین منکبرنی نے افغانستان کو خیر باد کہا تو اس نے اس علاقے کو ملک سیف الدین حسن اور اس کے قرلغی پیروؤں کے حوالہ کر دیا اور سیف الدین نے کرمان (یلدوز کا سابق دار السلطنت) غزنی اور بنیان[2] پر اپنی غیر مستحکم حکومت قایم کر لی۔ یہ تمام مقامات خود اگتائی کی سرپرستی میں لوٹ مار اور

---

(1) ایضاً، ص: 195، لیکن دوسری جگہ انہوں نے لاہور کی تباہی کو جمادی الاوّل 639 میں بتایا ہے۔

(2) بنیان کرمان کی موجودہ جگہوں سے شناخت ناممکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ ختم ہو گئے یا ان کے نام بدل گئے، ریورٹی کی اس رائے کو قبول نہیں کیا جا سکتا کہ بنیان سالٹ رینج (Salt Range) میں تھا۔ منہاج قطعی طور پر اشارہ کرتا ہے کہ یہ کہیں افغانستان میں تھا۔

غارتگری کا نشانہ بن چکے تھے۔ لیکن (دیہاتوں) کی دہقانی صنعتیں پھر بھی کچھ نہ کچھ چیزیں پیدا کرتی تھیں۔ کوئی متبادل راہ نہ پاکر سیف الدین قرلغ نے منگولوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور خراج دے کر منگولوں کے "شحناؤں" کو اپنے دربار میں مقیم کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ غور اور خراساں کے ملکوں نے بھی یہی پالیسی اپنائی۔ اسی اثناء میں خوارزمی افسر تاج الدین نیالتگین جس نے سیستان میں اپنے آپ کو کافی طاقتور بنالیا تھا اور منگولوں نے سیستان کے "آرک" (قلعہ) میں اس کا انیس ماہ تک (1228-28ء) محاصرہ کیے رکھا۔ قلعہ کا محافظ دستہ ایک عجیب وبا، جو مریض کو تین دنوں میں ہلاک کردیتی تھی، کا شکار ہوگیا۔ اس وبا اور لمبی مدت کے محاصرہ کے بعد تھوڑے بہت لوگ بچ رہے تھے انہیں منگولوں نے مار ڈالا۔[1] اگتائی کی تخت نشینی کے وقت ہندستان کے شمالی مغربی علاقوں کی سرسری طور پر یہی صورت حال تھی۔

چیف منگول کمانڈر اوڈرتا سیستان کے محاصرہ کے دوران ہی انتقال کر دیا گیا تھا۔ اور طائر بہادر جس نے اس مہم میں بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا، کو اگتائی نے اس کی جگہ پر مقرر کر دیا۔ ہم بخوبی یہ فرض کر سکتے ہیں کہ طائر بہادر کو کافی اختیار تمیزی حاصل رہے ہوں گے۔ اور یہ کہ اسے اپنے ماتحتوں پر پورا کنٹرول حاصل ہوگا تاہم اسے اپنے ہی ذرائع و وسائل پر بھروسہ کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے چند برسوں تک کچھ نہ کیا لیکن 637ھ / 1239-40ء میں اس نے اپنی ساری فوجیں یکجا کیں اور سیف الدین قرلغ پر اچانک حملہ کر دیا۔ سیف الدین کو شکست ہوئی اور اس نے غزنی، کرمان اور بیتان کو منگول ایجنٹوں (گماشتوں) کے ہاتھوں میں چھوڑ کر ملتان اور سندھ کی جانب راہ فرار اختیار کی۔[2]

لاہور کی فتح کے متعلق منہاج نے متعدد مقامات پر حوالہ دیا ہے لیکن اس کا تفصیلی بیان مندرجہ ذیل ہے:[3]

"639ہجری (12 جولائی 1241-42ء) میں یہ فیصلہ ہوا کہ منگول فوجیں لاہور پر چڑھائی کریں۔ معزالدین بہرام دہلی کا بادشاہ تھا۔ کبیر خاں ایاز ملتان کا گورنر تھا اور

---

(1) ایضاً، ص: 388-91

(2) ایضاً، ص: 392-(3) ایضاً، ص: 392-96

ملک اختیار الدین قراقش لاہور کا گورنر تھا۔ جب طائر بہادر، جو ہرات اور بادغیس کا کنٹرولر (متصرف) تھا اور دوسرے "نونیان" جو غور، غزنی، گرمر اور طخارستان کے کنٹرولر تھے، سندھ کے کنارے پہنچے تو کبیر خاں نے ان پر رعب ڈالنے کی خاطر اپنے سر پر چھتر کھڑا کر دیا اور اپنے سپاہیوں کو جمع کیا اور (ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے) ایک مقدس جنگ کے لیے تیار ہوا۔ جب یہ خبر منگولوں کے کیمپ میں پہنچی تو لاہور پر چڑھائی کا فیصلہ مصمم ہو گیا اور وہ شہر کے پھاٹک پر جا پہنچے۔

لاہور میں نہ تو کوئی انتظام تھا اور نہ اسلحہ جات ہی تھے اور نا ہی اس کے شہریوں کے دلوں میں کوئی اتحاد ہی تھا۔ اس کے اکثر باشندے تاجر پیشہ تھے جو منگولوں کے دورِ حکومت میں شمالی علاقوں مثلاً خراسان اور ترکستان کا سفر کر چکے تھے اور اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے ان میں کا ہر ایک منگول حکام سے ایک خط تحفظ (پائزا) حاصل کر چکا تھا۔ اس غلط احساس تحفظ کی وجہ سے قلعہ کی دیواروں کی حفاظت میں اور منگول کے ساتھ جنگ میں انہوں نے ملک قراقش کی مدد نہ کی۔ چونکہ ترکی اور غوری امراء بہرام سے خوفزدہ تھے لہٰذا وہ ایک ساتھ اکٹھا نہ ہوئے اور دہلی سے وقت پر کوئی بھی مدد لاہور نہ پہنچ سکی۔ لاہور کے پھاٹک پر کافی دنوں تک قوت آزمائی ہوتی رہی۔ منگولوں نے لاہور قلعہ کے چاروں طرف منجنیق نصب کیں اور اس کی حفاظتی چوکیوں کو تباہ کر دیا۔ ملک قراقش نے اپنی بساط بھر جنگ کی لیکن اسے شہریوں کے درمیان آپسی اختلافات کی خبر تھی۔ نیز ان قاضیوں اور ممتاز لوگوں کے متعلق بھی جن کو چوکیوں کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا اور جو زبردست غفلت و بے پروائی کے مجرم تھے۔ اختلافات کا پتہ تھا۔ لہٰذا قراقش اس نتیجہ پر پہنچا کہ شہر کی حفاظت اس کے بس سے باہر ہے اور یہ کہ حالات کا انجام تباہی پر ہوگا۔ لہٰذا وہ شب خون مارنے کے بہانے شہر سے باہر آیا۔ (16 جمادی الثانی 639 ہجری / 22 دسمبر 1241ء کو) اور ایک اچانک حملہ کے ذریعے منگول فوج کے درمیان سے راستہ بنا کر دہلی روانہ ہو گیا۔ لیکن رات کی تاریکی میں قراقش کا اپنا حرم اس سے جدا ہو گیا۔ اور اس کے بعض ساتھی شدید تاریکی میں اپنے گھوڑے سے گر پڑے اور انہوں نے خود کو قبروں یا گہری خندقوں میں چھپا لیا۔ اس کے بہت سے سپاہی اور حرم کے بعض افراد مارے گئے۔

دوسرے دن لاہور قلعہ کی بچی کھچی محافظ فوج کو جب قراقش کے فرار کی خبر ملی تو ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ منگولوں نے شہر پر قبضہ کر لیا اور ہر محلے میں قتل عام شروع کر دیا۔ باشندوں کے لیے انہیں مار بھگانے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ منہاج ہمیں دو گروپوں کے بارے میں بتاتا ہے ایک وہ جس کی قیادت اقسنقر کوتوال کر رہا تھا اور دوسرا جو "امیر آخور" دیندار محمد کی قیادت میں تھا جنہوں نے اس وقت تک مقابلہ کیا جب تک ان کے جسموں میں سانس باقی تھی۔ اقسنقر، طائر بہادر کے مدمقابل آیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو بھالے کی ایسی کاری ضرب لگائی کہ طائر تو جہنم رسید ہوا اور اقسنقر نے جنت کی راہ لی، منہاج کا دعویٰ ہے کہ منگولوں کو بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ تقریباً تیس ہزار سے چالیس ہزار کے درمیان گھوڑ سوار کم از کم اسی ہزار گھوڑے ہلاک ہوئے۔ منگول کے کیمپ میں کوئی ایسا آدمی نہ تھا جس کو بھالے، تیر یا تلوار کا زخم نہ لگا ہو۔ ان کے بہت سارے 'بہادر' اور 'نونیان' جہنم رسید کر دیئے گئے۔ اس پر سبھی کو حیرت ہے کہ منگول لاہور میں غارتگری کے بعد واپس چلے گئے۔ اس کے بعد کھوکھروں اور دیگر قبائلیوں نے شہر کا رخ کیا کہ کوئی قابل حصول شے بچی ہے۔ لیکن وہ سب قراقرش کی تلوار کا نشانہ بنے جو اس وقت لوٹ آیا تھا۔ لاہور سے بھاگتے وقت اس نے سونے کے ڈلوں اور دوسرے ریاستی خزانوں کو دریائے راوی کے پانی کے نیچے ایک مخصوص مقام میں چھپا دیا تھا جو منگولوں کو نہ مل سکا۔ اس نے اسے واپس حاصل کر لیا۔ منگولوں کی لاہور فتح کے دوسرے دن خراسان اور ماوراالنہر سے آئے ہوئے تاجر یہ خبر لائے کہ اگتائی کا انتقال ہو گیا[1] منگولوں کے "یاسا" اس بات کے متقاضی تھے کہ قاآن کی موت پر تمام مہمات روک دیا جائے۔ "یاسا" کے مطابق قاآن کے انتخاب تک مرکزی حکومت اگتائی کی بڑی بیوہ "تاکنیہ خاتون" کے کنٹرول میں آ گئی۔ منہاج کا یہ کہنا درست نہیں کہ منگولوں کی روایت یہ ہے کہ قاآن کی موت کے بعد تمام مہمات کو ڈیڑھ سال (جسے منگول تین سال کے برابر سمجھتے ہیں) روک دیا جائے۔ شاید دہلی میں خیال رائج تھا۔

---

(1) ایضاً، ص 235-36:

کبیر خاں ایاز نے دہلی کی ماتحتی ترک کر دی تھی لیکن شاید لاہور کی تباہی کے فوراً بعد ہی 639 ہجری (42-1241ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جانشینی اس کے لڑکے تاج الدین ابو بکر ایاز نے کی۔ تاج الدین ایک بہادر جنگجو تھا اس نے ملتان دروازوں کے سامنے قرلغوں کو متعدد بار شکست دی اور کہا جاتا ہے کہ اس نے پورے سندھ کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ لیکن جوانی میں موت اس کی قسمت میں لکھی تھی اور اس کے ساتھ ہی سندھ کے ایازی خاندان کی چند روزہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

سلطان معزالدین نے عوام کے سرداروں سے از سر نو وفاداری اور اطاعت کے اظہار کے مطالبہ کے لیے اس موقعہ کو غنیمت جانا، اس نے ان لوگوں کو "قصر سفید" میں جمع کیا اور منہاج کو خطاب کرنے کے لیے کہا۔ چونکہ منہاج ایک پختہ مقرر اور مبلغ تھا اس نے لوگوں کو ایسا متاثر کیا کہ انہوں نے سلطان کے لیے وفاداری کا ایک نیا حلف اٹھایا۔ بہر حال معزالدین زیادہ دنوں تک ان کی وفاداری سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ ایک مذہبی مجذوب، ایوب، جس کے ایما پر اس نے شہر کے قاضی شمس الدین کو ایک ہاتھی کے قدموں تلے ڈلوا دیا تھا، سے اس کی حد سے زیادہ والہانہ عقیدت نے اس سے عوام کی ہمدردیاں ختم کر دیں بلکہ انہیں اس سے سخت متنفر کر دیا۔

سلطان نے ملک قطب الدین حسن غوری اور خواجہ مہذب الدین کو دیگر امراء کے ہمراہ منگولوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے اور شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لیے روانہ کیا۔ جب شاہی فوج دریائے بیاس کے کنارے پہنچی تو خواجہ مہذب الدین نے سلطان کو یہ کہتے ہوئے ایک خفیہ پیغام بھیجا کہ "یہ امرا اور ترک کبھی مطیع نہ ہوں گے۔ مناسب یہ ہے کہ حضور کی جانب سے ایک فرمان میرے اور قطب الدین حسن کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا جائے کہ ہم فوری دستیاب طریقوں سے تمام امیروں اور ترک کو تباہ کر دیں تاکہ ملک (انس) پاک ہو جائے" ترک امرا کو سلطان کے خلاف مشتعل کرنے کے لیے یہ ایک زبردست دھوکہ بازی تھی۔ معزالدین نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر کماحقہ غور کیے بغیر ایک فرمان لکھ دیا اور اسے کیمپ روانہ کر دیا۔ مہذب الدین کی چال کامیاب ہو گئی۔ اس نے ترکی امراء کو فرمان دکھایا جنہوں نے مہذب الدین کے مشوروں پر سخت برہمی اور غصہ کی حالت میں

سلطان کو معزول کرنے کا حلف اٹھالیا۔ جیوں ہی سلطان کو امرا کی اس بغاوت کا علم ہوا اس نے شیخ الاسلام سید قطب الدین کو فوج کی تالیف قلب کے لیے بھیجا۔ لیکن شیخ الاسلام جب باغیوں کے کیمپ میں پہنچا تو اس نے اپنی رائے کو بدل دیا ورنہ صرف یہ کہ اس نے امرا کے ساتھ اظہار ہمدردی کی بلکہ باغی فوج کے ساتھ دارالسلطنت لوٹا۔ منہاج السراج اور بعض دوسرے علما سے باغیوں کو منانا اور باغی فوج کو ہم رائے بنانے کے لیے کہا گیا۔ لیکن ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ جنگ فروری سے مئی 1242ء تک جاری رہی۔ دونوں ہی جانب خاصا نقصان ہوا۔ منہاج کے مطابق ایسا اس لیے ہوا کہ سلطان پر ایک "فراش" فخر الدین مبارک شاہ فرخی کا خبیث اثر تھا کہ کسی طرح کا مناسب تصفیہ نہ ہو سکا۔ خود منہاج السراج پر بھی سلطان کی حمایت کی وجہ سے حملہ کیا گیا۔ خواجہ مہذب الدین نے قاتلوں کو کرایہ پر ٹھیک کیا اور انہیں تین ہزار جتل دیے تھے، تاکہ وہ اس پر حملہ کریں لیکن اسے اس کے غلاموں نے بچالیا۔

8/ ذیقعدہ 690ھ / 10 مئی 1242ء کو امرا اور ترکوں نے شہر پر قبضہ کر لیا اور معز الدین بہرام شاہ کو قید کر لیا۔ اسی ماہ کی تیرہویں تاریخ کو اسے مار ڈالا گیا۔ اس کی حکومت کی پوری مدت دو برس ڈیڑھ ماہ تھی۔

سلطان علاؤالدین مسعود شاہ

ملک عزالدین بلبن کشلو خاں (بعض اوقات اس کا حوالہ بلبن بزرگ یا بڑا بلبن سے دیا جاتا ہے) ترکی غلام، افسروں میں سب سے بڑا جاہ طلب تھا۔ اس کا دعوا تھا کہ باغیوں کا سردار وہ تھا اور چونکہ اس کی فوج دہلی پر قبضہ کے پہلے دن داخل ہو گئی لہذا اس نے اس سے فائدہ اٹھا کر التمش کی شاہی رہائش گاہ پر جس کا حوالہ ہمارے مآخذ "دولت خانہ" کے نام سے دیتے ہیں اور جو شاید دو محلوں قصر سفید اور قصر فیروز پر مشتمل تھی، قبضہ کر لیا۔ محلوں پر قبضہ کرنے کے بعد کشلو خاں تخت پر چڑھ گیا اور خود کو بادشاہ اعلان کرانے کا حکم دیا۔ ترکی غلام، افسران التمش کے دو جانشینوں کو قتل کر چکے تھے اور تیسرے کو قتل کرنے والے تھے۔ لیکن نہ تو وہ خاندان کی تبدیلی پر اور نا ہی اس طریقہ کے جواز کو تسلیم کرنے پر تیار تھے جس پر کشلو خاں نے تخت پر قبضہ کیا

تھا۔ یعنی محض محلات پر قبضہ پر قبضہ کر کے اور اپنے ساتھی ترکی افسروں کی منظوری کے بغیر باغی امرا مثلاً کہرام کا گورنر اختیار الدین، تاج الدین سنجر قتلق، نصرب الدین ایتھر اور دوسرے التتمش کے مقبرہ پر جمع ہوئے۔ کشلو خاں کے بادشاہ ہونے کا اعلان ابھی ایک ہی بار ہو پایا تھا کہ ان لوگوں نے اعلان روکنے کا حکم دے دیا۔ اپنی کمزوری محسوس کر کے کشلو خاں دوسرے امراء سے مل گیا اور ایک ہاتھی اور ناگپور کی گورنری کے عوض اپنے اس دعوا سے باز آگیا۔

بعد ازاں امرائے تین شہزادوں نصیر الدین، جلال الدین اور علاؤالدین مسعود کو قید سے رہا کر دیا اور انہیں دولت خانہ میں قصر سفید سے قصر فیروزہ (فیروزی رنگ کا محل) میں لے گئے۔ انہوں نے رکن الدین فیروز شاہ کے لڑکے علاؤالدین مسعود کا بحیثیت بادشاہ اعلان کر دیا۔ اور عوام سے اسے قبول کرنے کی اپیل کی۔ ان کے پروگراموں میں اس کے بعد مرکزی عہدوں اور اقطاع کی تقسیم کا نمبر تھا۔ ملک قطب الدین حسن غوری کو نائب مملکت مقرر کیا گیا اور خواجہ مہذب الدین نظام الملک کو وزیر بنایا گیا۔ اور اختیار الدین قراقش ”امیر حاجب“ مقرر کیا گیا۔ منہاج السراج کی جگہ قاضی امام الدین محمد شغور قانی کو قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا۔[1] ان تقرریوں کے علاوہ دیگر اور جاگیروں میں بھی ردوبدل کیا گیا۔ جو بعض اہم ملکوں کے قبضہ میں تھیں۔ ناگور مندور اور اجمیر کو ملک عزالدین بلبن کشلو خاں کے سپرد کیا گیا۔ اور بدایوں کو

---

(1) ہمارے مورخ منہاج کی یہ پالیسی تھی کہ تمام جماعتوں سے اچھے تعلقات رکھے جائیں۔ لیکن مہذب الدین کے دورِ حکومت میں ان کے لیے کسی عہدہ پر فائز رہنا ممکن نہ تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ دہلی کے زوال کے چار دنوں بعد اس نے قاضی القضاۃ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور اگرچہ مہذب الدین کو قتل کر دیا گیا مگر شگور قانی کو برطرف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا 9 رجب 640ھ (2 جنوری 1243ء) کو ہمارے مصنف نے لکھناؤتی کے لیے اپنے دو سالہ سفر کا آغاز کیا۔ وہ بدایوں کے گورنر تاج الدین قتلغ اور اودھ کے گورنر قمر الدین قیران تمر خان کے شکریہ کا اظہار کرتا ہے۔ لکھناؤتی کے گورنر عزالدین طغرل طغان خاں نے اپنی فوج اور کشتیوں کے ساتھ کڑا پر حملہ کیا تھا۔ ایک مستحکم حکومت کے زمانے میں یہ (حرکت) ایک غداری کے مترادف سمجھی جاتی لیکن منہاج کو اس بات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ طغان نے اس کی بڑی خاطر داری کی اور اسے لکھناؤتی لایا (بعد میں) تعجب خیز حالات کے تحت اس کی واپسی دہلی کو ہوئی۔

ملک تاج الدین سنجر قتلق کے حوالہ کیا گیا۔ خواجہ مہذب الدین جو غیر معمولی طور پر جاہ طلب تھا، نے اپنی قوت و اختیار کو کافی وسیع کر لیا تھا۔ اس نے ایک نوبت قایم کیا اور اپنے دروازے پر ایک ہاتھی رکھا۔ اس نے کوئل کو بھی اپنے اقطاع میں شامل کر لیا۔ اس نے ترک امرا کو بہرام شاہ کے خلاف ورغلایا تھا لیکن اب اس نے انہیں تمام اختیارات سے محروم کر دیا، (لیکن) جن لوگوں سے اس کا سابقہ تھا وہ انہیں صحیح طور پر نہیں جانتا تھا۔ ترکی غلام، افسران ایک دوسرے کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ جیسا کہ کشلو خاں کے معاملہ عیاں ہے۔ لیکن وہ لوگ کسی تاجک کی کسی بد تمیزی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ 2 جمادی اوّل 640ھ 1242ء کو شہر کے سامنے والے میدان پر حوض رانی (رانی کا تالاب) کے کنارے واقع فوجی کیمپ میں اسے قتل کرنے کے لیے متحد ہو گئے۔ تب وزارت کا عہدہ صدر الملک نظام الدین ابو بکر کے حوالہ کیا گیا۔ بہاء الدین بلبن جسے دہلی کے زوال کے بعد ہانسی کا اقطاع ملا تھا اسے امیر حاجب مقرر کیا گیا اور سابق امیر حاجب ملک قراقش کو گورنر کی حیثیت سے بہانہ بھیج دیا گیا۔

بہاء الدین بلبن جس کو 7/اکتوبر 1249ء کو الغ خاں کا خطاب اور نائب مملکت کا عہدہ ساتھ ہی فوج کی مکمل کمان حاصل ہو گئی تھی۔ التتمش کے ترکی غلام افسروں میں ایک بعد کا اضافہ تھا۔ اس کی نسل کے بارے میں ہمیں یقینی طور پر کچھ نہیں معلوم۔ منگول حملہ کی اُتھل پتھل کے دوران اسے ترکستان سے بغداد لایا گیا تھا اور خواجہ جمال الدین بصری نے اسے خریدا تھا۔ 630ھ/ 1232-33ء میں دیگر ترک غلاموں کے ساتھ جمال الدین اسے بھی گجرات کے راستہ دہلی لے آیا۔ منہاج کے مطابق التتمش نے دوسرے تمام ترکی غلاموں کو بہاء الدین بلبن ہی کی وجہ سے خریدا اور کچھ دنوں بعد اسے ”خاصہ دار“ کے عہدہ پر متعلق کر دیا۔ ہندستان کے ترکی غلام میں اسے اپنا سگا بھائی، سیف الدین ایبک ملا جس کو بعد میں کشلی خاں کا خطاب ملا تھا۔ اس کے چچیرے بھائی نصرت الدین شیر خاں، کو بھی التتمش نے خریدا تھا۔ ترکی غلام

افسروں میں جن کے متعلق ہمیں واقفیت ہے، صرف یہی ایک خونی رشتہ رکھنے والا گروپ ملتا ہے۔[1] رکن الدین فیروز کے دورِ حکومت میں الغ خاں کچھ ترکوں کے ہمراہ ہندستان بھاگ آیا تھا۔ جہاں اسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ رضیہ کے دورِ حکومت میں اسے دوبارہ "خاصہ دار" مقرر کر دیا گیا بعد میں وہ "امیر شکار" ہو گیا۔ بہرام شاہ کی حکومت میں اسے "امیر اخور" کا عہدہ ملا۔ ملک بدر الدین سنقر ومی جو اس وقت "امیر حاجب" تھا اس نے اس میں پدرانہ شفقت کے ساتھ دلچسپی لی۔ چنانچہ بہاء الدین

---

(1) اس اصول کے تحت کہ احسان مندی ایک ناگزیر خوبی ہے۔ "شمسی ملکوں" (281-324) سے متعلق پھر اپنے طبقہ کے آخر میں منہاج نے اپنے سرپرست کی ایک سوانح حیات دی ہے۔ منہاج جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ یہ ہے مگر یہ اس کے ذاتی علم کی بنیاد پر نہیں۔ "الغ خاں کے باپ اور شیر خاں" کے باپ ایک ہی ماں باپ کے لڑکے تھے۔ وہ لوگ البری خانوں کی نسل سے تھے اور وہ دس ہزار کنبوں کے (سردار) خوانین (دہ ہزار خانہ خاں بودند) میں سے تھے۔ ترکستان کے البری ترک ان کی نسل سے بخوبی واقف ہیں۔ فی الحال (یعنی 1260ء میں) ان کے چچا کے بیٹے قبیلہ کے سردار کی حیثیت سے اس پر حکومت کر رہے تھے۔ "میں نے یہ باتیں کربت خاں سنجر سے سنی ہیں۔" اس بیان کے خلاف متعدد اعتراضات کیے جا سکتے ہیں۔ مصنف جو ایک ماہر عالم اور جج تھا، وہ ثبوت گڑھتا ہے (لیکن ساتھ ہی اس کا بھی لحاظ رکھتا ہے کہ محتاط قارئین اس جعل سازی کا انکشاف کر سکیں۔ کربت خاں جو اودھ کے مقطع کی حیثیت سے اپنی تقرری کے سلسلہ میں الغ خاں کا احسان مند تھا۔" کا حوالہ منہاج اپنے مآخذ کے طور پر دیتا ہے۔ لیکن چونکہ دس سال پہلے ہی کربت خاں کا انتقال ہو چکا تھا لہٰذا معاصرین کے ذریعہ اس کا حوالہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طبقہ میں کربت خاں پر ایک سوانحی نوٹ (نمبر 15) میں منہاج قطعی طور پر کہتا ہے کہ وہ ایک قپچق (شمالی کا سپین علاقہ کا) تھا اگر ایسا ہے تو اس کے پاس ترکستان کے حالات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوگا۔ یہ بیان کہ 1260ء میں بلبن کے چچیرے بھائی سرداروں کی حیثیت سے حکومت کر رہے تھے حقیقت میں اس بات کا اعتراف ہے کہ مصنف ایک داستان گڑھ رہا ہے۔

عصامی (173) جو جانتا تھا کہ سلطان غیاث الدین بلبن اپنے آقا کی سلطنت کا خاتمہ کرنے والا ہے، التمش کو پیشین گوئی کی صلاحیت کا حامل بنا دیتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس نے بلبن کے چچیرے بھائی پر پائی جانے والی خباثت کو دیکھ کر بلبن کو خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن وزیر جنہوں نے سلطان کے لیے اسے خرید لیا اور التمش نے اسے قسمت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا، بلبن کو پہلی ڈیوٹی شاہی اصطبل کی ملی لیکن ترک افسروں کی جانب سے یہ احتجاج ہوا کہ یہ ڈیوٹی ان میں سے کسی فرد کو سونپا جانا بہت ذلت آمیز ہے۔ چنانچہ بلبن کا رتبہ بلند کر دیا گیا۔)

بلبن ریواری کا مقطع مقرر کیا گیا اور اسے وہاں بھیج دیا گیا۔ جب افسروں نے دہلی میں بہرام شاہ کا محاصرہ کیا اس وقت جس ہمت و جرأت مندی کا اس نے مظاہرہ کیا اس سے وہ تمام ترکی اور تاجک باغیوں سے سبقت لے گیا۔ اس کا فوری انعام ہانسی کی گورنری تھی اور مہذب الدین کے قتل کے بعد اسے ”امیر حاجب“ مقرر کر دیا گیا۔

”چونکہ وزیر کا کوئی شمار نہ تھا اور نائب مملکت، کا عہدہ وقتی طور پر ختم ہی معلوم ہوتا تھا لہٰذا دربار میں بلبن کا کوئی رقیب نہ تھا۔ اور وہ نوجوان سلطان کی اپنی صواب دید پر رہنمائی کر سکتا تھا۔ اس سیاست داں کے کردار اور پالیسی کا معائنہ ضروری ہے، جو ایک مختصر وقفہ کو چھوڑ کر چوتھائی صدی کے لیے تخت کی اصلی طاقت اور بیس سالوں کے لیے دہلی کا سلطان بننے والا تھا۔ چونکہ اس نے علاؤالدین خلجی کی طرح نہ کوئی بڑی جنگ جیتی اور نہ کسی شاندار مہم کا آغاز کیا۔ لہٰذا ہم اسے ہندی فتوحات کے منتظمین کی فہرست میں شامل نہیں کر سکتے۔ چونکہ اپنی زندگی کے آخیر تک ”ترکی غلام امراء، جن سے وہ متعلق تھا، کی ساری عصبیت اور خرابیاں اس میں باقی رہیں اور اس نے باشندگانِ سرزمین کو بڑی حقارت سے دیکھا اس لیے ہم اسے ہندستان کے عظیم حکمرانوں کے خانہ میں نہیں رکھ سکتے۔ دراصل اس کا کوئی ایسا عظیم اور بڑا کارنامہ نہیں جس کے ذریعہ ہم اسے یاد رکھ سکیں۔ لیکن اگرچہ وہ انتہائی درجہ کا جاہ طلب تھا پھر بھی اسے خدا نے دانشمندی، دوراندیشی اور ہوشیاری بخشی تھی۔ اگرچہ اس نے کوئی بڑا اور بہتر کارنامہ انجام نہ دیا لیکن اس نے کبھی کوئی غلط اقدام بھی نہ کیا۔ اختیار الدین ایتگین کا انجام (سے) ان خطرات سے آگاہ کر چکا تھا جو اقتدار تک جلد پہنچنے کی راہ میں حائل تھے۔ بلبن نے دوسرے طریقہ سے کام کرنا طے کیا۔ اس نے ترک افسروں پر مشتمل اپنی ایک پارٹی بنانی چاہی جو دربار پر حاوی ہو اور صوبوں کو کنٹرول کرے اور تب وہ اس بات کا صبر سے انتظار کرے کہ مستقبل اپنے دامن میں کیا لاتا ہے۔ لیکن اگر بہاء الدین بلبن اپنی ایک پارٹی بناتا تو یقیناً ایک مخالف پارٹی بھی نمودار ہوتی۔ منہاج اس حقیقت کی پردہ پوشی کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کی کامیابی نے اس کے ہم رتبہ افسروں میں نفرت کی آگ بھڑکا دی۔ ”الغ خاں کا سیاسی درجہ (کار دولت) اتنا بلند ہو گیا تھا کہ دوسرے ملک اس کی خوش قسمتی پر حسد کرنے لگے تھے اور بعض کے کانٹے ان کے دلوں کو چھلنی کرنے لگے

تھے۔ لیکن خدا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دوسروں سے بلند ہو گا۔ لہٰذا جیسے جیسے ان کا حسد بڑھا اس کے "عود دولت" کی خوشبو بھی وقت کے عوددان میں بڑھتی رہی۔[1]

تمام تاریخ دانوں نے علاؤالدین مسعود کی اس بات پر تعریف کی ہے کہ اس نے تمام ملک اور امراء کی منظوری کے بعد یکم شوال 640ھ (24/ مارچ 1243ء) کو اپنے چچا کے لڑکوں[2] جلال الدین اور ناصر الدین کی علی الترتیب قنوج اور بہرائچ کی گورنری کے لیے تقرری کی۔ لیکن اس معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ التمش کے خاندان کے (یہ) "دو شہزادے" ضرورت پڑنے پر سلطان کے متبادل کی حیثیت سے دستیاب تھے۔ اس حقیقت سے بلبن کو عظیم ترین فائدہ حاصل ہونے والا تھا اگرچہ (اس معاملہ میں) تمام ترکی افسران متفق نہ تھے۔ اسی اثنا میں مملکت کے مشرق و مغرب دونوں ہی جانب بحران پیدا ہو گیا۔

جب التمش نے ملک غلام سیف الدین جانی کو لکھناوتی کی گورنری سے برطرف کر دیا تب اس نے اسے اعلا عہدے پر اپنے ایک غلام سیف الدین ایبک کو جسے اس نے اختیار الدین چست قبا کے ورثاء سے خریدا تھا اور جسے "یغان تت" کا خطاب بخشا تھا، مقرر کیا۔ بغان تت جو بہار کا گورنر رہ چکا تھا لکھناوتی روانہ ہو گیا۔ اور دوسرے ترکی غلام افسر ملک عزالدین طغرل طغان خاں کو بہار[3] کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ جب 631ھ (7/ اکتوبر 1233-34) میں "بغان تت" کا انتقال ہو گیا تب التمش نے طغان خاں کو اس کا جانشین مقرر کیا۔

التمش کے انتقال کے بعد ایک بہادر مگر جلد باز ترک، ایک اور خاں جو لکھناوتی شہر کا) مقطع تھا، نے طغان خاں سے ایک جنگ لڑی لیکن موخر الذکر کے ایک تیر کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا اس بات سے لکھناوتی کے دو حصے، ایک جولاہ کوٹ کی

---

(1) منہاج، ص:286، منہاج ہمارے ہیرو کا حوالہ صرف بہاء الدین الغ خاں بلبن کی حیثیت سے دیتا ہے۔ بلبن نے تخت نشینی کے وقت "غیاث الدین" کا خطاب اختیار کیا تھا اور منہاج اسے استعمال نہیں کرتا۔

(2) منہاج مطبوعہ متن میں "ہر دو عم" (دونوں چچا) درج ہے۔ 199 اس کی جگہ ہر دوام پڑھا جائے۔

(3) ایضاً، طبقہ 22 نمبر 5

(4) ایضاً، ص:243

جانب واقع ہے اور رال کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا جودپوک کوٹ کی جانب واقع ہے اور برند کے نام سے مشہور ہے، طغان خاں کے کنٹرول میں آگئے۔[1] طغان نے اپنے قاصد رضیہ کے پاس بھیجے۔ اسے ایک چھتر اور سرخ جھنڈے کا اعزاز ترہت کو تربت کی غارتگری سے کافی مقدار میں مال غنیمت حاصل ہوا لیکن اس نے دہلی تحائف بھیجے اور بہرام شاہ کی حکومت کے دوران وہ وفادار ہی رہا۔

لیکن علاؤالدین مسعود کے دورِ حکومت کے آغاز میں طغان کے مشیر (کدخدا) بہاء الدین ہلال سودانی نے اسے اودھ، کڑا، مانک پور کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا اور اس سے بھی زیادہ بلند حوصلوں کی تکمیل کا مشورہ دیا۔ گزشتہ زمانے میں جب طغان امیر اخور تھا تو التمش نے ملک قمرالدین قیران تمر خاں کو اس کا نائب (یعنی نائب امیر اخور) مقرر کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے دونوں میں شدید منافرت پیدا ہو گئی تھی۔ نصرت الدین تائسی کی موت کے بعد رضیہ نے تمر کو اودھ کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ سلطنت (دہلی) کے علاقوں کے خلاف طغان کی سرگرمیوں کا سبب اس کی تمر سے منافرت ہو۔ لیکن وہ کچھ حاصل نہ کر سکا اور لکھناؤتی واپس چلا گیا۔

تقریباً 1243ء میں جاجنگر کے رائی نارا سنہا اول نے لکھناؤتی کی سرحدوں میں دخل اندازی شروع کر دی۔ طغان نے جاجنگر یا اڑیسہ پر چڑھائی کر دی اور 17/اپریل 1244ء کو ایک مقام، جس کا نام منہاج (جو وہاں موجود تھا) کتاسین بتاتا ہے، پر اسے شکست ہو گئی۔ طغان نے دہلی سے مدد کی اپیل کی لہٰذا تمر خاں کو اس کی مدد کے لیے روانہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ دوسرے سال اڑیسہ کی فوج نے جارحانہ اقدام کیا۔ ان لوگوں نے لاہ کوٹ کے مقطع کریم الدین لاغری اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کر دیا اور 17/اپریل 1244ء کو وہ لکھناؤتی کے دروازوں تک پہنچ گئے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت تیز رفتار قاصد یہ خبر لائے کہ دہلی سے مدد آ رہی ہے لہٰذا اڑیسہ کی فوج واپس ہو گئی۔

تمر، جس کو مدد کے لیے بھیجا گیا تھا، نے لکھناؤتی کے باہر طغان ہی سے ایک جنگ لڑی اور اسے شہر کے اندر کھدیڑ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ طغان نے ہمارے مورخ منہاج سے امن کی شرائط طے کرنے کی درخواست کی۔ یہ طے ہوا کہ طغان

---

(1) ایضاً ص-243

لکھناوتی کا صوبہ تمر کے حوالہ کردے اور ان افسروں کے ساتھ جو تمر کے ساتھ بھیجے گئے تھے دہلی واپس چلا جائے۔ 23/ جولائی 1244ء کو وہ دہلی پہنچے۔ طغان کا خیر مقدم کیا گیا اور اودھ کے گورنر کی خالی جگہ پر اس کی تقرری ہوئی۔ سلطنت کے دو بڑے صوبے (کا انتظام) اس طرح ادل بدل ہو گیا لیکن اس معاملہ میں مرکزی حکومت کا کوئی کنٹرول نہ تھا تمر اور طغان دونوں ہی کا دو سال بعد ایک ہی رات میں انتقال ہوا۔[1]

مغرب میں امور کا انتظام نسبتاً بہتر طور پر کیا گیا۔ کبیر خاں نے اُچھ میں اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ لیکن اپنی اس آزادی سے، جو سلطنت دہلی سے بغاوت کے بعد حاصل ہوئی تھی، لطف اندوز ہونا نہ اس کی اور نا ہی اس کے بیٹے ابو بکر کی قسمت میں تھا۔ ابو بکر کی وفات کے بعد اُچھ ایک خواجہ سرا قسقر، جو امیر دار تھا، اور کوتوال مغیث الدین کے تصرف میں رہا۔ یہ فطری بات تھی کہ ایک منگول جنرل منکوتہ اس غیر منضبط حکومت کی راجدھانی پر، جس نے دہلی کی حکومت کے قلابہ کو تو اُتار پھینکا تھا لیکن جس کا اپنا کوئی بادشاہ نہ تھا، 643ھ (46-1245ء) میں چڑھائی کر دے۔ اور اس سے بھی زیادہ فطری بات یہ تھی کہ ابازی خاندان کے بچے کھچے افسران ایک بار پھر دہلی سلطنت کی حفاظت میں آنے کی خواہش کریں۔ اگرچہ دوسرے امراء ہچکچا رہے تھے لیکن بلبن منگولوں کے خلاف روانہ ہونے کے لیے سلطان کو مشورہ دینے میں اٹل رہا۔ اس کا مقصد جنگ کرنا نہیں تھا بلکہ مختلف تدابیر سے منکوتہ کو واپس بھگا دینا تھا اور اس سلسلہ میں اس کو کامیابی ہوئی۔ 5/ شعبان 643ھ (27/ دسمبر 1245ء) کو جب ہندستانی فوج لاہور۔ دریائے راوی کے پاس پہنچی اس وقت یہ خبر آئی کہ منگولوں نے اُچھ کا محاصرہ ختم کر دیا ہے اور وہ اپنے ہندو اور مسلمان قیدیوں کو رہا کر کے واپس بھاگ رہے ہیں۔ دہلی کی فوج دریائے سودرہ تک گئی اور پھر دہلی 12/ ذی الحجہ 643ھ

---

(1) طغان اور تمر کی سوانح حیات کے لیے ملاحظہ ہو، منہاج، طبقہ، ص:22 منہاج اپنے پرانے عہدے پر دوبارہ مقرر نہیں کیا جا سکا، کیونکہ وہ خالی نہ تھا، لیکن اسے ناصریہ کالج کا ڈائریکٹر (معظم) مقرر کر دیا گیا اور اس کی تمام اوقات کے انتظام و انصرام کا اختیار بھی اسے دیا گیا۔ ساتھ ہی اسے گوالیار کا قاضی بھی بنا دیا گیا۔ اس کا واضح سبب یہ تھا کہ گوالیار مملکت کی حدود میں نہ تھا لیکن جس وجہ سے (منہاج) عوام میں مقبول تھا وہ اس کے خطبے (تذکیر) تھے جو دہلی کی جامع مسجد میں اس نے دیے تھے۔ برسوں بعد شیخ نظام الدین اولیاء نے اس کے ان خطبوں کی تعریف کی۔ دو عہدوں پر اس کی تقرری بہاء الدین بلبن کی سفارشات پر ہوئی تھی۔

(30/اپریل 1246ء) کو واپس آگئی۔ اس مہم نے لاہور کو، جس نے عارضی طور پر اپنی اہمیت کھودی تھی، اُچھ اور ملتان کے ساتھ ہی دہلی سلطنت میں دوبارہ شامل کر دیا۔ اس نے بہاء الدین بلبن کو بھی اگلی صف میں لا کھڑا کیا۔ لیکن وہ اپنے ساتھی ترکی غلام افسروں کی حسد سے واقف تھا لہٰذا اس نے جو دوسرا قدم اُٹھایا۔ سلطان علاؤالدین مسعود شاہ کی جگہ پر ناصرالدین محمود کو تخت نشین کرانے کی سازش۔ اس میں تمام ترک امراء کو اپنے ساتھ ملائے رکھا اور خود اپنے لیے کچھ منفعت نہ چاہی۔

منہاج جو علاؤالدین کی ایک قابل توقیر شہزادہ کی حیثیت سے اس کی تخت نشینی کے وقت تعریفیں کرتا ہے، اب اپنے سرپرست کے نئے خیالات کی ترجمانی کے سلسلہ میں اپنے موقف کو بدل دیتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ناکارہ لوگوں کی ایک جماعت نے خفیہ طور پر سلطان علاؤالدین تک رسائی حاصل کرلی اور انہوں نے اسے غیر پسندیدہ کاموں پر اُبھارا۔ لہٰذا اس نے ملکوں کو قتل کرنا اور انہیں گرفتار کرنا شروع کر دیا اور گویا وہ اسی پر تل گیا۔ اس کی گزشتہ قابل تعریف صفتیں ختم ہوگئیں اور وہ لطف و تفریح، عیاشی اور شکار میں اس قدر منہمک ہو گیا کہ اس سے حکومت کا کام متاثر ہونے لگا۔ اور ریاستی معاملات یکسر نظر انداز ہوگئے۔ لہٰذا تمام ملکوں اور امراء نے عام اتفاقِ رائے سے سلطان ناصرالدین کو خفیہ خطوط لکھے اور اس سے دہلی آنے کی درخواست کی۔[1]

23/ محرم 644ھ (10/ جون 1246ء) کو چار سال ایک ماہ اور ایک دن کی حکومت کے بعد علاؤالدین مسعود کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ جہاں وہ رحمت خداوندی سے جاملا۔ اسی دن اس کا جانشین تخت پر فائز ہو گیا۔

---

(1) ایضاً، ص:201

4

سلطان ناصر الدین محمود

حسب و نسب

سلطان ناصر الدین محمود شمس الدین التمش کا پوتا تھا بیٹا نہیں جیسا کہ غلطی سے اکثر بیان کیا جاتا ہے، عصامی جس کے آباؤ اجداد دہلی دربار کے افسران تھے اس معاملہ میں بالکل واضح رائے رکھتا ہے۔ "جب التمش کا بیٹا شہزادہ ناصر الدین، فاتح ہند کا لکھناؤتی میں انتقال ہوا تو اس نے ایک لڑکا جو اس کی موت کے بعد پیدا ہوا تھا چھوڑا۔[1]"

فرشتہ بھی اسی انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ "سلطان شمس الدین التمش کے سب سے بڑے لڑکے کا نام ناصر الدین تھا۔ اس کے (شہزادہ ناصر الدین) سر زمین لکھناؤتی میں انتقال کے بعد یہ لڑکا (سلطان ناصر الدین) جو شہزادہ ناصر الدین کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا، پیدا ہوا۔ التمش نے (اپنے مرحوم بیٹے کی) محبت میں اس کا بھی وہی نام رکھا اور اس کی تعلیم و تربیت کے لیے انتظام کیا۔[2] ظاہر ہے کہ خاندانی اسباب کی بنا پر التمش نے یہی چاہا کہ بچے کو اس کا پوتا نہیں بلکہ اس کا بیٹا شمار کیا جائے لہٰذا ہمیں اس حقیقت پر متعجب نہیں ہونا چاہیے کہ زندگی بھر اسے التمش کا بیٹا (ابن) ہی کہا گیا۔ منہاج لکھتا ہے کہ "سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان قسیم امیر المومنین کی پیدائش دہلی میں (شہزادہ) ناصر الدین کی موت کے بعد ہوئی تھی۔ التمش نے اسے

---

(1) عصامی (ڈاکٹر مہدی حسن کا ایڈیشن) ص: 140 (2) فرشتہ، ص ص: 70-1، بظاہر اشارہ کرتا ہے کہ شہزادہ ناصر الدین نے اور دیگر اولاد بھی چھوڑی تھی۔ شہزادہ جلال الدین، جس کے بارے میں آگے چل کر حوالے دیے گئے ہیں۔ غالباً وہ سلطان ناصر الدین کا سوتیلا بھائی تھا۔

اپنے بڑے لڑکے کا نام اور خطاب دیا اور اس کی ماں کو لونی دیہات کے ایک محل میں رہنے کے لیے بھیج دیا تاکہ وہ اس کی وہاں پرورش کر سکے۔[1] ظاہر ہے کہ سلطان التتمش خود اپنی بیوی کو ایک لڑکا پیدا کرنے کے سبب علاحدہ جگہ نہیں بھیجتا۔ (مزید یہ کہ) ناصر الدین محمود کی ماں نے ایک ترکی افسر، قتلغ خاں سے شادی کر لی۔ یہ بات التتمش کی ایک بیوہ کے لیے شاید ہی ممکن ہو سکتی تھی۔

تخت نشینی، پالیسی اور کردار

ہمیں یہ نہیں معلوم کہ ناصر الدین کو لونی محل سے کب لا کر دولت خانہ میں اسیر رکھا گیا۔ اگر بہرائچ میں اس کی حکومت اچھی رہی تو اس کا سہرا انچارج افسروں کے سر ہے کیونکہ وہ (ناصر الدین محمود) اتنا چھوٹا تھا کہ ایک ضلع پر حکومت کر ہی نہیں سکتا تھا، چونکہ اس کی پیدائش 1229ء میں ہوئی تھی لہٰذا اس وقت جب ترکی ملکوں نے اسے دہلی آنے کی دعوت دی تھی وہ ضرور سولہ یا سترہ برس کا رہا ہوگا۔ اس کی ماں نے یہ اعلان کیا کہ وہ بیمار ہے اور وہ اسے راجدھانی علاج کے لیے لے جا رہی ہے۔ وہ اسے دن میں اپنی ہی ڈولی میں رکھتی لیکن رات میں وہ ایک نقاب ڈال لیتا اور گھوڑے پر سوار ہو جاتا۔ اس طرح چند گھوڑ سواروں اور چند پاپیادہ لوگوں کے ساتھ وہ امکانی سرعت کے ساتھ دہلی پہنچا۔ اس کی آمد کی خبر صرف انہیں لوگوں کو تھی جو اس سازش میں شریک تھے۔ 23 محرم 644ھ / 27 مئی 1246ء کو قصر سبز میں اس کی تخت نشینی ہوئی۔ دو دنوں بعد اس نے قصر فیروزہ کے عام ہال میں ایک دربار لگایا اور لوگوں نے حلف وفاداری اُٹھایا۔

سلطان ناصر الدین محمود کی تصویر عموماً ایک درویش صفت کی حیثیت سے کھینچی جاتی ہے، جس کا سارا وقت مذہبی عبادات و مراسم[2] میں گزرتا تھا اور جسے سیاسی اور

---

(1) منہاج، ص:202-201

(2) منہاج نے تمام طرح کی فوجی، انتظامیہ اور مذہبی خوبیاں، جو وہ تصور کر سکتا تھا، بادشاہ کے ساتھ متصف کی ہیں۔ لیکن ذیل کا جملہ جس پر اس نے اس کی تعریف ختم کی ہے، ثابت کرتا ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ ہم ان پر سنجیدگی سے غور کریں۔ معاصرین کی بالاتفاق رائے کے مطابق (یہ صفتیں) گزشتہ کسی سلطان میں یا قدیم زمانے سے کسی بادشاہ ("ملوک") میں نہیں پائی جاتیں، (207) منہاج کو دونوں سرپرستوں کی تعریفیں کرنی تھیں لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے بہاء الدین بلبن کو "سلطان" کا خطاب دیا اور ناصر الدین محمود کو "سلطان السلاطین" کا خطاب دیا۔ حکومت کے پندرہویں سال میں منہاج لکھتا ہے کہ "اگرچہ نبی کی روایات کے مطابق بادشاہ کی نسبت الغ خاں کا درجہ ایک باپ کی حیثیت رکھتا ہے (پھر بھی) وہ ہزاروں نئے خریدے گئے غلاموں سے زیادہ مطیع و فرمانبردار ہے۔" (320)

انتظام حکومت کے معاملات میں کم دلچسپیاں تھیں۔ یہ خیال فکر اس کی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس زمانہ کی کھینچا تانی کے گہرے تجزیے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگر اس نے اپنا رخ مذہبی عبادات و رسوم کی طرف موڑ لیا تھا تو یہ سیاسی زندگی کی دہشت ناکی سے فرار حاصل کرنا تھا۔ وہ اصلاً اپنے نظریہ میں ایک سیاسی آدمی تھا اور ایسے حالات میں بیس سالوں تک اس نے اپنا سر دھڑ پر قایم رکھا۔ یہ اس کی سیاسی حکمت و بصیرت کا کوئی معمولی کمال نہیں۔

التمش کی موت (37-1236ء) کے بعد جو دس سال گزرے ان میں چار شہزادوں کو تخت پر بیٹھایا گیا اور پھر انہیں معزول کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ یہ بات سولہ سالہ نوجوان کے لیے ایک تنبیہ تھی۔ شمسی ملک ہی اس کے حمایتی بھی تھے اور وہی اس کے لیے ایک خطرے کا ذریعہ بھی تھے۔ یہ ان کا کہا ماننے پر بالکل تیار تھا کیونکہ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔ عصامی ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے فوجی لیڈران کی خوشنودی حاصل کر لی تھی اور ان میں سے ہر ایک کا پورے خلوص کے ساتھ بہی خواہ تھا۔" اس کی یہ خود سپردگی مکمل تھی۔ وہ ان کی اجازت کے بغیر اپنی کسی رائے کا اظہار نہ کرتا اور اپنے ساتھ اور پیران کی اجازت کے بغیر نہ ہلاتا وہ انہیں بتائے بغیر نہ پانی پیتا اور نہ سونے کے لیے جاتا۔ اس کا کم سے کم ایک اچھا نتیجہ ہوا۔ اس نے (گزشتہ) پریشان شہزادوں کی طرح نہیں بلکہ ایک آزاد آدمی کی حیثیت سے حکومت کی (یا حکومت کرتا ہوا معلوم ہوا)[1] جتنے دنوں شمسی ملک متحد رہے ناصر الدین کو کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ تخت پر بیٹھتا تھا اور وہی احکامات نافذ کرتا جس کی وہ لوگ سفارش کرتے لیکن اس وقت اسے دقت پیش آتی جب شمسی ملک تقریباً دو

---

(1) منہاج کے برخلاف عصامی اس طرح کی بات نہیں کرتا جیسے کہ دو فرمانروا تھے۔ بلکہ جو تصویر اس نے پیش کی ہے وہ بالکل صاف اور واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "میں نے سنا ہے کہ الغ خاں بادشاہ کی خدمت کرتا تھا اور اس کے تمام معاملات کو کنٹرول کرتا تھا۔ بادشاہ محل میں رہتا تھا اور الغ خاں مملکت کی حکمرانی کرتا۔" روایتاً جو مذہبی خوبیاں ناصر الدین کے ساتھ منسوب کی جاتی تھیں انہیں سب سے پہلے عصامی نے اکٹھا کیا۔ سلطان عوامی مالیات سے کچھ نہیں لیتا تھا بلکہ اپنی روزی قرآن کی نقل کر کے اور انہیں پوشیدہ طور پر ہدیہ کر کے حاصل کرتا تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

برابر گروپوں میں منقسم ہو جاتے (ایسی حالت میں) فاتح گروپ کا ساتھ دینا اس کے لیے خطرہ کا سبب بن سکتا تھا۔ لیکن اس کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں اس کا راستہ صاف تھا۔ بہاالدین بلبن راجدھانی میں ملک اعلا تھا اور سلطان بالکل وہی کرتا جو بلبن اسے کرنے کو کہتا۔ دیگر باتوں کے علاوہ یہ بلبن کی پالیسی تھی کہ ہر سال موسم سرما میں منگولوں، آزاد ہندو سرداروں یا باغی ملکوں کے خلاف ایک مہم کے لیے وہ شاہی فوجی جھنڈوں کے ساتھ (یعنی سلطان کو ساتھ لے کر) نکل جاتا تھا۔ منہاج پندرہ برسوں کے واقعات کو سال بہ سال بیان کرتا ہے۔ چند ضروری تشریحات کے سلسلہ میں نفس مضمون سے انحراف کے ساتھ ہمارے لیے بھی ایسا ہی کرنا مناسب ہوگا۔

فرمانروائی کا پہلا سال 644ھ (19/ مئی 1246-47ء)

پہلا بہاء الدین بلبن نے شمال مغرب سرحد پر ایک فوجی مظاہرہ کا فیصلہ کیا۔ جنگ کے لیے کوئی دشمن نہ تھا لیکن کھوکھروں کے سردار نے منگولوں کے لیے ایک مخبر کا کام کیا تھا۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ دہلی کی حکومت (دریائے) سندھ کی سرحد کی حفاظت کے لائق نہ تھی۔ رجب (نومبر / دسمبر 1246ء) میں شاہی جھنڈے دہلی سے روانہ ہوئے اور 10 مارچ 1247ء کو دریائے راوی پار کیا۔ شاہی جھنڈے دریائے سودرہ میں رہ گئے لیکن بہاالدین بلبن کو سالٹ رینج (کوہ جود) اور نندوانا کے قرب وجوار میں غارتگری کے لیے آگے بھیج دیا گیا۔ وہ (دریائے) سندھ تک پہنچا لیکن چونکہ کہیں بھی کوئی کاشت کیا ہوا گاؤں یا شہر باقی نہ تھا اور فوج کے لیے غلہ کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا تھا

(صفحہ 364 کا بقایہ) "وہ خدا کے منتخب بندوں میں ایک تھا جو ہمیشہ خدا کی یاد میں ڈوبا رہتا۔۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک دُرویش تھا جب کہ دوسرے اسے نبیوں کے خانہ میں رکھتے ہیں۔۔۔ میں نے اس مشہور بادشاہ کے سلسلہ میں بہت سی اچھی باتیں سنی ہیں۔ یہاں تک کہ میں ان تمام کو بیان نہیں کر سکتا۔" (150-1)

ہمیں اس کا اختیار نہیں کہ ناصر الدین کے مذہبی مشاغل کے خلوص کے متعلق شبہ کریں۔ ایک صدی گزر جانے کے بعد (اس بات کے متعلق) جب عصامی نے اتنی ساری باتیں سنی تھیں تو یقیناً ان میں کچھ سچائی رہی ہوگی۔ لیکن کوئی بھی اس بات کا دعوا نہیں کرتا کہ، اموی خلیفہ عمر دوم کی طرح، ناصر الدین انتظامی معاملات پر کسی مذہب کے اصولوں کی بنیاد پر غور وخوض کرتا تھا یا یہ کہ ریاست کی پالیسی میں اس کا کوئی اثر تھا۔

لہٰذا اسے لوٹ آنا پڑا۔ سلطان 15/مارچ 1247ء کو سودرہ لوٹ آیا۔ بلبن اور اس کی فوج غالباً بعد میں لوٹی۔

فرمانروائی کا دوسرا سال 645ھ (8/مئی 1247-48ء)

منگولوں کے درمیان خانہ جنگی چھڑی ہوئی تھی لہٰذا بہاء الدین بلبن نے دو آب میں ایک مہم جوئی کا فیصلہ کیا ایک قلعہ جسے تالسندہ کہا جاتا تھا اور جسے ضلع قنوج میں ایک ہندو سردار نے بنوایا تھا ایک سخت معرکہ کے بعد حاصل کر لیا گیا۔ 17/مارچ 1248ء میں شاہی جھنڈے کڑا پہنچے۔ یہاں سے بلبن کو ایک ہندو سردار کے خلاف جس کا نام غلطی سے ”دلکی وملکی“ درج کیا گیا ہے، بھیجا گیا، وہ جمنا اور کالنجر کے درمیان کے علاقوں کا ایک رانا تھا۔ رانا نے غروب آفتاب تک اپنی جگہ کی مدافعت کی اور رات میں فرار ہو گیا۔ بلبن کے ہاتھ وہ سب کچھ لگ گیا جو وہ نہ لے جا سکا تھا۔ شاہی جھنڈے 20/مئی 1248‘ کو دہلی (واپس) پہنچے۔ منہاج کہتا ہے کہ ناصر نامہ نامی ایک کتاب میں اس نے اس مہم کا ایک منظوم بیان تیار کیا۔ اس کے بدلے میں بادشاہ نے ایک سالانہ انعام عطا کیا جس کو وہ بعد تک پاتا رہا۔ بلبن نے اسے ہانسی میں ایک گاؤں جس کی آمدنی تیس ہزار جتل تھی، بخش دیا۔ بادشاہ کا سوتیلا بھائی جلال الدین مسعود شاہ جو قنوج کا مقطع تھا اس سے (بادشاہ) ملنے آیا اور اسے بدایوں اور سنبھل کے اقطاع دیئے گئے۔ لیکن کچھ دنوں بعد اسے اچانک ایک اندیشہ لاحق ہوا اور وہ سنبھل سے سرمور کی پہاڑیوں میں سنتور گڑھ بھاگ گیا جہاں وہ اس جگہ کے رانا سے حفاظت کی توقع رکھ سکتا تھا۔

فرمانروائی کا تیسرا سال 646ھ (26/اپریل 1248-49ء)

بادشاہ زیادہ دور نہیں گیا لیکن بلبن اور ملکوں کو ایک بڑی فوج کے ساتھ رنتھمبور پر حملہ کرنے کے لیے اور میوات کے کوہ پایہ (علاقے) اور بہار دیوا، جو ہندستان کا سب سے بڑا رائے تھا، کی مملکت میں غارتگری کے لیے روانہ کیا گیا۔ منہاج کا بیان، اس حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کرتا کہ مہم ناکام رہی۔ ملک بہاء الدین ایبک کو ہندوؤں نے رنتھمبور قلعہ کے دامن میں مار ڈالا جس وقت بلبن دوسری جانب لڑ رہا تھا۔

18/ مئی 1249ء کو ہزیمت شدہ فوج دہلی لوٹ آئی۔

قاضی سلطنت عماد الدین شر فرقانی کے خلاف کچھ الزامات لگائے گئے اور 29/ مارچ 1249ء کو قصر سفید میں اس کو اس عہدے سے بر طرف کر دیا گیا۔ اور 11/ جون 1250ء کو قاضی جلال الدین کاشانی اس کی جگہ پر مقرر کیا گیا۔

فرمانروائی کا چوتھا سال 647ھ (16/ اپریل 1249-50)

منہاج کے مطابق لوگوں کی یہ عام خواہش تھی کہ بہاء الدین بلبن کی لڑکی رانی یا ملکہ جہاں بنے۔ لہٰذا 2/ اگست 1249ء میں بادشاہ سے اس کی شادی کر دی گئی۔ ذیل کی تقرریاں 16/ اکتوبر 1249ء میں عمل میں آئیں۔ فوج اور انتظامِ حکومت پر پورے اختیارات کے ساتھ بہاء الدین بلبن کو قایم مقام یا نائب مملکت کا عہدہ ملا۔ اس کے نئے عہدے کے پیش نظر اس کا درجہ ملک سے بلند کرنے کے "خان" کر دیا گیا۔ "الغ خاں" یا خان معظم کا خطاب اس کے لیے زیادہ مناسب سمجھا گیا۔ الغ کا چھوٹا بھائی سیف الدین ایبک جو پہلے امیر اخور تھا سے امیر حاجب کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ کیونکہ یہ عہدہ اب الغ نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے بھی کشلی خاں کا خطاب دے کر خانوں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ ملک تاج الدین تبر خاں کو نائب امیر حاجب مقرر کیا گیا اور علاؤ الدین ایاز ریحانی (مورخہ منہاج کا بیٹا) کو نائب وکیل در مقرر کیا گیا۔ اختیار الدین ایبک 'موئے دراز' (لمبے بالوں والا) کو نائب امیر آخور کے عہدہ سے ترقی دے کر "امیر آخور" مقرر کرایا گیا۔ دیگر تقرریوں کے ساتھ، جن کو منہاج نے قلمبند نہیں کیا ہے، ان تمام تقرریوں نے یقیناً الغ خاں کو مرکز میں ممتاز کل بنا دیا ہوگا۔ اس کے مخالفین کے لیے بھی (ترکی) کاروائی شروع کرنے کا وقت سر پر آچکا تھا منہاج کے مطابق، اس کی ابتدائی کامیابیوں نے دوسرے ملکوں کے دل میں حسد کی آگ بھر دی تھی اور ان کے دلوں میں حسد کے کانٹے کچوکے لگا رہے تھے۔[1]

---

(1) منہاج، ترک ملکوں کے موضوع پر طبقہ 22 (اور) نمبر 24، الغ خاں کی سوانح حیات۔

عزالدین بلبن کشلو خاں کی شیر خاں کے ساتھ کشمکش

علاؤالدین مسعود کی تخت نشینی کے وقت عزالدین بلبن کشلو خاں[1] (جو بلبن بزرگ اور بلبن زار، یعنی سفید بالوں والا بلبن، کے نام سے بھی مشہور ہے) نے اپنے تخت کے دعوا سے خواہ وہ جیسا بھی تھا، ناگور، مندور اور سیوالک کی سر زمینوں کے عوض دستبردار ہو گیا تھا۔ جب الغ خاں علاؤالدین مسعود اور اس کی فوجوں کو سرحد کی جانب لایا اور منگول (جنرل) منکوتہ کو اس نے مار بھگایا تب اس نے کشلو خاں کو ملتان اور اپنے چچا کے لڑکے، ملک نصرالدین شیر خاں سنقر کو لاہور اور تبرہندہ (بھٹنڈہ) کی ذمہ داری بخشی۔ برنی کی سند پر فرشتہ بھٹنڈہ اور بھتیز کے قلعوں کی تعمیر کا کارنامہ شیر خاں سے منسوب کرتا ہے۔[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُچھ کو، وقتی طور پر، ایازی خاندان کے افسروں کے تصرف میں رہنے دیا گیا۔

عزالدین بلبن کشلو خاں دہلی آیا اور اس نے ناگور اور سیوالک کے عوض ملتان اور اُچھ کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ نے اس کا مطالبہ منظور کر لیا لیکن اُچھ اور ملتان پر قبضہ کر لینے کے بعد اس نے ناگور حوالے کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا سلطان اور الغ خاں کو اسے مطیع کرنے کے لیے اس کے خلاف روانہ ہونا پڑا۔

ناصرالدین حسن قرلغ، جس کی پوزیشن جلال الدین منکبرنی کے جانشین کی حیثیت سے مشکل رہی تھی، ملتان پر بنیان کے راستے حملہ کر دیا لیکن جنگ کے دوران ہی اس کا انتقال ہو گیا۔[3] لیکن اس کے پیروکاروں نے اس کی موت افشاء نہ کی اور

---

(1) دو بلبنوں کے درمیان التباس سے بچنے کے لیے عہد وسطیٰ کے بعض مورخین عزالدین بلبن کشلو خاں کا حوالہ "بلبن بزرگ" یعنی بڑا بلبن اور بہاء الدین بلبن الغ خاں (جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن ہو گیا) کا حوالہ "بلبن خورد" یعنی چھوٹا بلبن کی حیثیت سے دیتے ہیں۔ زیادہ سہل یہی ہے کہ ان کا حوالہ ان کے خطابات سے، جیسے کشلو خاں اور الغ خاں کے ذریعہ دیا جائے۔ عزالدین بلبن کشلو خاں اور الغ خاں کے چھوٹے بھائی سیف الدین، جس کا خطاب کشلی خاں تھا، کے درمیان محتاط طریقے پر فرق کرنا ضروری ہے۔

(2) جلد اوّل، ص:70

(3) اس دور حکومت میں، بنیان کا تذکرہ اکثر ملتا ہے، یہ غالباً افغانستان میں کوئی شہر تھا لیکن اب اس کا وجود نہیں ہے۔

کشلوں خاں کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ ملتان پر امن طریقے پر ان کے حوالے کر دے۔ جب کشلو خاں کو ان کے دھوکے بازی کا علم ہوا۔ اس وقت تک کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ کیونکہ قلعہ اب گرلغوں کے ہاتھوں میں تھا۔ بہر حال شیر خاں قرلغوں سے قلعہ چھین لینے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے اپنے افسروں کو اس کا انچارج بنایا۔ 1250ء میں کشلو خاں نے انتقاماً دو ماہ تک ملتان کا محاصرہ کیے رکھا لیکن اسے مکمل ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد شیر خان نے اُچھ کا محاصرہ کیا، محافظ دستے نے دروازے بند کر لیے اور لڑنے کی تیاری کرنے لگے، لیکن کشلو خاں، جو اس وقت اتفاق سے اُچھ سے باہر تھا، شمسی ملکوں کے درمیان اس سمجھوتہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جو اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ لوگ آپس میں ملائمت سے معاملات طے کریں گے، چونکہ وہ لوگ ایک ہی خاندان اور ایک ہی آشیانہ کے ہیں، سیدھا شیر خاں کے کیمپ پہنچا، شیر خاں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا لیکن اس نے اس وقت تک اسے آزاد نہ کیا جب تک کہ اس نے اُچھ میں اپنے افسروں کو یہ حکم نہ دے دیا کہ قلعہ شیر خاں کے حوالہ کر دیا جائے۔ جب یہ سب ہو چکا تب اس نے اسے دہلی کی طرف جانے کی اجازت دی۔ الغ نے کشلو کو بدایوں اقطاع کے طور پر دے دیا۔ آئندہ سالوں میں سیوالک (علاقے) کا حوالہ الغ خاں کے اقطاع کی حیثیت سے دیا جاتا ہے۔

فرمانروائی کا پانچواں اور چھٹا سال 648-649ھ (5/اپریل 1250-52ء)

قاضی جلال الدین کاشانی کا انتقال فروری 1251ء میں ہوا اور 31/جولائی 1251ء کو دوسری بار منہاج ہیڈ قاضی مقرر ہوا اور اسے دہلی کی عدالتی حکومت (مسند حکومت) بھی سونپ دی گئی۔ 25/شعبان 649ھ (12/نومبر 1251ء) کو شاہی جھنڈے گوالیار چندیری، نارنول اور مالوہ کی جانب بڑھے۔ اس مہم میں (شاہی فوج) مالوہ کے نزدیک پہنچ گئی۔ اجار کا جاہر (دیوا)، اس خطہ کا سب سے بڑا رائے جس کے پاس پانچ ہزار گھوڑ سوار اور دو لاکھ پیادہ تھے، شکست کھا گیا اور نارنول کا قلعہ جس کی اس نے تعمیر کی تھی فتح ہو گیا اور اسے تباہ کر دیا گیا۔ یہ حملہ محض لوٹ مار کے لیے تھا اور ایسا

لگتا ہے کہ اس سے جاہر دیوا کی طاقت ختم نہ ہوئی۔

1250ء کے آخیر تک پوزیشن مختصر طور پر یوں تھی، مرکزی حکومت "نائب مملکت" کی حیثیت سے الغ خاں اور امیر حاجب کی حیثیت سے اس کے چھوٹے بھائی کشلی خان کے کنٹرول میں تھی اور سندھ کا پورا علاقہ قران کے چچیرے بھائی شیر خاں کے حلقہ اختیار میں آگیا تھا۔ جبکہ دور افتادہ لکھناؤتی کا علاقہ ایک غیر مستقل مزاج اور بے وفا افسر یوزبک طغرل خاں کے قبضہ میں تھا جس کی تقرری کا ذمہ دار الغ خاں تھا۔ مملکت کے مکمل کنٹرول کے علاوہ الغ خاں کو ہانسی اور سیوالک کے علاقے اور چند دیگر چھوٹے علاقے بھی سونپ دیے گئے تھے۔ عزالدین بلبن کشلو خاں سے ناگور لے کر اسے الغ خاں کے چھوٹے بھائی سیف الدین کشلی خاں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ تب ترکی غلام افسران کے حقوق کا کیا ہوتا۔[1] یقیناً بے انتہا سیاسی طاقت اور علاقے پر ایک ہی خاندان کے افراد اور ان سے منسلک لوگوں کی اجارہ داری ہو گئی تھی لہٰذا بہت سے ترک افسروں کو خیال ہوا کہ معاملات کو نئے سرے سے سلجھانا ضروری تھا۔

فرمانروائی کا ساتواں سال 650ھ (14/ مارچ 53-1252ء)

ناصرالدین کی حکومت کے بقیہ، نو سال جس کا بیان منہاج نے کیا ہے، کا اہم موضوع ترکی خانوں اور ملکوں کے دو گروپوں کی طاقت کے لیے رستہ کشی ہے اور اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس معاملہ میں اس (منہاج) کا انداز فکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شکر و احسان مندی ایک ضروری خوبی ہے۔ "چونکہ وہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت الغ کا بڑا احسان مند تھا۔ لہٰذا وہ فطری طور پر دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں الغ

---

(1) منہاج لکھتا ہے کہ (اسی زمانہ میں) اس کو اپنی بہن، جو خراسان میں کہیں تھیں، کی جانب سے ایک خط وصول ہوا جس میں اس نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تھا۔ بادشاہ اور الغ خاں نے اس کے لیے 40 غلام اور 100-سامانوں سے لدے گدھے مہیا کیے تاکہ وہ اپنی بہن کے پاس بھیج سکے، 1250 کی گرمیوں میں اسے انہیں ملتان سے خراسان پہنچانے کا انتظام کرنے کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ (دریائے) بیاس کے کنارے کہیں پر اس کی ملاقات شیر خاں سے ہو گئی۔ جس دن وہ ملتان پہنچا اسی دن عزالدین بلبن بھی اس کے محاصرہ کے لیے پہنچ گیا۔ اب اس کے لیے سوائے اس کے کوئی راستہ نہ رہا کہ وہ عزالدین کے کیمپ ہی میں رہ جائے، گرمی شدت کی پڑ رہی تھی۔ (290)

خاں کی زیادہ تعریف کرتا ہے۔ لیکن وہ تقریباً تمام ہی ترکی ملکوں کا احسان مند تھا اور جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے وہ ان کے جرائم کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس حالت میں بھی، جیسا کہ شیر خاں اور کشلو خاں کے سلسلہ میں ہوا، جب ان لوگوں نے منگول حملوں کا رخ فارس اور چین سے شمالی ہندستان کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ مزید یہ کہ چونکہ اس نے اپنی کتاب کو اپنی زندگی ہی میں شائع کرنا تجویز کیا تھا۔ لہٰذا ترکی سیاسی اقتدار میں کسی بھی غیر متوقع تبدیلی سے اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کے مفادات کو محفوظ رکھنا تھا۔ دوسری جانب وہ عماد الدین ریحان کا کسی طرح سے بھی احسان مند نہ تھا۔ ریحان ایک ہندستانی سیاسی قسمت آزما تھا، جس کا نہ تو ترکی افسروں میں اور نہ عوام ہی میں کوئی پیروکار تھا اور جو منہاج کی کتاب کی تکمیل کے آٹھ سال پہلے ہی مر چکا تھا، مخالف گروپ کے بڑے بڑے ملک جو اگرچہ شکست خوردہ تھے لیکن اب تک زندہ تھے اور منہاج انہیں ناخوش کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن ان کی تمام غلطیوں کے لیے مرحوم ریحان کو ملزم ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ کسی کو بھی اس کی مدافعت سے سروکار نہ تھا۔

الغ خاں کا سب سے بڑا مخالف حسام الدین قتلغ خاں تھا جو علاؤالدین جانی کا بیٹا تھا۔ موخر الذکر التتمش کے زمانہ میں بہار کا گورنر تھا۔ اسے اکثر لوگ ترکی ملکوں میں سے زیادہ عمر اور مرتبہ والا جانتے تھے۔ قتلغ کا سب سے بڑا حامی اس کا داماد عزالدین بلبن کشلو تھا جس کو شیر خاں نے اس کے سرحدی صوبوں سے محروم کر دیا تھا۔ بقیہ دوسرے (امرا) ابن الوقت تھے، جنہوں نے بالآخر اپنی قسمت کو الغ خاں سے منسلک کر لیا۔ یہ بات بھی کہہ دی جائے کہ دونوں پارٹیوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ترک غلام افسروں کی پوزیشن شمالی ہندستان[1] میں اتنی غیر محفوظ تھی کہ وہ ایک خانہ جنگی کی زحمت مول نہیں لے سکتے تھے۔

فرمانروائی کا آٹھواں سال 651ھ (3/ مارچ 1253-54ء)

22/ شوال 651ھ (27/ دسمبر 1252ء) کو شاہی جھنڈے اُچھ اور ملتان کے

---

(1) ایضاً، ص: 215-16

راستے غزنی اور لاہور کی سمت بڑھے۔ اس مہم میں صوبوں کے تمام خان اور ملک شاہی جھنڈوں کے زیر سایہ آگئے۔ بیانہ سے قتلغ خاں اور بدایوں سے عزالدین کشلو خاں، بیاس تک ان لوگوں کے شامل رہے۔ اس کا مقصد کسی دشمن سے لڑنا نہ تھا بلکہ گھریلو مشکلات کا حل کرنا تھا۔ منہاج ہمیں بتاتا ہے کہ "خفیہ طور پر عمادالدین ریحان نے الغ خاں کے ساتھ سلطان اور ملکوں کے رویہ کو تبدیل کر دیا۔" آیا قتلغ اور کشلو کے ذریعہ اسے اس کام پر لگایا گیا تھا یا اس نے اس کام کے لیے خود اپنی خدمات پیش کیں، ابھی تک اس کا انکشاف نہیں ہو سکا۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ وہ یہ کام صرف اپنے ہی بل بوتے پر شروع نہیں کر سکتا تھا۔ منہاج کہتا ہے کہ الغ خاں کو قتل کرنے کی ایک کوشش ناکام ہو گئی۔ لیکن یہ شبہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ قتل کا ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال اس وقت تک کسی بھی پارٹی کے ذہن میں نہ آیا تھا کیونکہ مخالفین کی جو کچھ مانگ تھی وہ عہدوں اور جاگیروں کی مساویانہ تقسیم تھی۔ چونکہ وہ لوگ اس چیز کو جو وہ چاہتے تھے حاصل نہ کر سکے لہٰذا وہ ایک ساتھ مل گئے۔ اور شاہی خیمہ میں آکر انہوں نے درخواست کی کہ الغ خاں کو اپنے اقطاع میں جانا چاہیئے، سلطان، جو اس وقت روہتک میں تھا، نے الغ خاں کو جانے کا حکم دیا اور الغ خاں محرم کی آخری تاریخ 651ھ (یکم اپریل 1253ء) کو ہانسی روانہ ہو گیا۔

تیئیس سالہ نوجوان سلطان کے حکموں پر پرامن طریقے پر عمل کر کے الغ نے عقلمندانہ روش اختیار کی، قتلغ، کشلو اور ریحان کو ایک عارضی فائدہ مند موقع حاصل ہو گیا تھا لیکن مزید غور و خوض کے بعد یقیناً شمسی ملکوں کی رائے الغ خاں کی حمایت میں ہو جاتی۔ منہاج کے مطابق ریحان نے اس پر زور دیا کہ الغ خاں ہانسی کو خالی کر دے اور ناگور چلا جائے تاکہ امیر حاجب کا عہدہ اور ساتھ ہی ہانسی کا اقطاع شہزادہ رکن الدین کو دیا جا سکے۔[1] دوبارہ الغ خاں نے حکم کی تعمیل کی، اس کے چھوٹے بھائی، کشلی خاں، کو امیر حاجب کے عہدہ سے محروم کر دیا گیا اور اسے کڑا کے اقطاع پر حکومت کے لیے بھیج دیا گیا۔ جون یا جولائی 1253ء میں وزیر کا عہدہ ملک محمد نظام جنیدی کو دے دیا گیا اور صدر قاضی کا عہدہ منہاج سے لے کر قاضی شمس الدین بہرائچی کو دے دیا گیا۔

---

(1) یہ سلطان ناصر الدین کا بیٹا تھا اور یقیناً وہ نابالغ رہا ہوگا

(22 ر ستمبر 1253ء) عزالدین بلبن کشلو خاں نائب امیر حاجب ہو گیا اور ریحان کو وکیل دار مقرر کر دیا گیا۔ الغ خاں نے جتنی تقرریاں کی تھیں اس میں تبدیلی کی گئی یا اسے ختم کر دیا گیا اور ریحان کے نامناسب فیصلوں کی وجہ سے حکومت کی مستحکم حالت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ منہاج ہمیں یہ بتلانا بھول گیا کہ قتلغ خاں کو کون سا عہدہ یا علاقہ دیا گیا، بہاردیو، رنتھمبور کا رائے، ہندستان کے رایوں میں سب سے بڑا، سب سے اعلا مرتب نے الغ خاں کے ساتھ ایک جنگ لڑی لیکن الغ خاں کو فتحیابی ہوئی اور وہ ناگور فتحیاب ہو کر لوٹا۔

شیر خاں کا مسئلہ جس کی گرفت میں سندھ کے صوبے تھے، اب بھی باقی تھا۔ شوال (3 ر نومبر 1253ء) کے آغاز میں شاہی جھنڈے اُچھ، تبرہندہ اور ملتان کی فتح کے لیے روانہ ہوئے۔ لیکن سلطان بیاس ہی کے کنارے پر رہا اور اس نے تبرہندہ کے خلاف ایک فوج بھیج دی۔ شیر خاں نے، اپنے چچیرے بھائی کی طرح نہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہندستان چھوڑ دیا اور شیر خان قاآن کے پاس چلا گیا۔ منہاج ہمیں یقین دلاتا ہے کہ منگول نے اس کا باعزت طور پر استقبال کیا لیکن منگول اعلا کمان نے مشرق میں چین میں اور مغرب میں ایران، عراق، شام اور مصر میں اپنی توسیع کے وسیع پروگراموں کو پہلے ہی مرتب کر لیا تھا۔ شیر خاں ان پروگراموں کو بدل نہ سکا مگر منگول دربار میں اس کے جانے نے اسے تمام لوگوں کی نگاہوں میں اس باب کے لیے غیر موضوع بنا دیا کہ اپنے لاحاصل مشن سے لوٹنے کے بعد اسے ہندستان کے کسی سرحدی صوبے کا انچارج بنایا جائے، فروری 1254ء میں حکمراں طبقہ نے اس کے ہندستانی اقطاعات کو ملک ارسلان خاں سنجر کے حوالہ کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر خاں کے افسروں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

اس پارٹی کے متعلق جواب مطعون تھی۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کی وضاحت منہاج ہی کرے:

"ان مظلوموں کی حالت، جن کو الغ خاں کی غیر موجودگی میں معزول کر دیا گیا تھا اور ستایا گیا تھا بہت ابتر ہو گئی تھی۔ انہیں (بے اقتداری کے) کونے میں ڈھکیل دیا گیا تھا۔ ان کی حالت ماہی بے آب کے مانند تھی یا اس بیمار کی طرح جسے نیند نہ آتی ہو، وہ

لوگ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک خدا سے یہی دعا کرتے تھے کہ الغ خاں دوبارہ اقتدار پر واپس آجائے۔ اور ریحان کی تاریکی الغ خاں کی روشنی میں تبدیل ہو جائے۔ مظلوموں کی دعائیں قبول ہو گئیں اور الغ خاں کے فتحیاب جھنڈے راجدھانی کی طرف بڑھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ دربار کے ملک اور افسران یا تو خالص ترکی النسل تھے یا اعلانسب کے تاجک تھے، ریحان ہندستان کے قبائل کا ایک نالائق خواجہ سرا تھا۔ پھر بھی وہ اعلانسب کے افسروں کا حاکم تھا۔ وہ سب کے سب برانگیختہ ہو گئے اور مزید اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکے۔ ریحان کے مصاحبوں کی شرارتوں نے صفت کے لیے چھ مہینوں تک گھر سے باہر نکلنا یا نماز جمعہ میں شریک ہونا مشکل کر دیا۔ دوسرے لوگوں کی حالت کیا رہی ہو گی جن میں ہر ایک ترک تھا، ایک مَلِک جہانگیر اور خصم شکن تھا۔[1]

قتلغ۔ کشلو گروپ کا رویہ ہندستانی مسلمانوں اور ہندو سرداروں کی جانب، جیسا کہ آئندہ کے کچھ واقعات ظاہر کریں گے، شاید کچھ زیادہ ہی وسیع النظری کا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ناگزیر طور پر ترکی غلام افسروں کے قریبی حلقوں کے درمیان ان کے خلاف پڑی ہو گی۔ بہر حال الغ خاں ناگور کے قریبی حلقوں کے درمیان ان کے خلاف پڑی ہو گی۔ بہر حال الغ خاں ناگور سے کام شروع کرتے ہوئے ترکی افسروں کی اکثریت کی۔ ساتھ ہی ان لوگوں کی بھی جن کی تقرری قتلغ۔ کشلو گروپ نے کی تھی، حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پلڑے اب برابر نہ رہے۔

فرمانروائی کا نواں سال 652ھ (21/ فروری 55-1254ء)

موسم سرما کے بالکل آخری حصہ میں سلطان رہب یا رام گنگا کے سر چشمہ کی طرف روانہ ہوا۔ کٹیہر (روہیلکھنڈ) کے ہندوؤں کو جنھوں نے راضی الملک عزالدین دمیشی کو مار ڈالا تھا، سخت سزائیں دی گئیں۔ 27/ اپریل 1254ء کو نظام الدین ابو بکر کی دوسری بار وزارت دی گئی۔

موسم برسات کے بعد “ملکوں کے اجتماع” کی خبر ملتی ہے۔ “مختصر یہ کہ کڑا اور

---

(1) ایضاً، طبقہ 22 نمبر 24 (الغ خاں کی سوانح حیات)

مانک پور کے علاقوں نیز شہر اودھ، جو شمال میں ہے، سے لے کر بدایوں تک اور تبر ہندہ، سنام اور سامانہ نیز سیوالک سے ہندستان کے (ترکی) مَلِکوں نے الغ خاں سے درخواست کی کہ وہ دارالسلطنت کو لوٹ آئے۔ ارسلان خاں اپنی فوج کے ساتھ تبر ہندہ سے اور بن خاں سنام اور منصور پور سے روانہ ہوئے۔ الغ خاں نے اپنی فوج ناگور میں جمع کی اور سیوالک اور جلال الدین مسعود شاہ لاہور سے ان کے شامل ہو گئے۔ وہ لوگ راجدھانی کی جانب بڑھے" [متذکرہ بالا بیان کے پیش نظر] ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگر کوئی [معقول] سمجھوتہ نہ ہو سکا تو سلطان ناصر الدین کی جگہ اس کا سوتیلا بھائی جلال الدین متعین کیا جا سکتا تھا۔

ریحان کی رہنمائی پر سلطان دہلی سے سنام روانہ ہوا جبکہ الغ خاں اور مخالف مَلِک تبر ہندہ میں تھے۔ ریحان جو اپنی گردن پہلے ہی پھندے میں ڈال چکا تھا سلطان کو لڑنے پر اکسا سکتا تھا لیکن سلطان اور ترکی مَلِک، جو اس کے ساتھ تھے، وہ اس طرح کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ دونوں فوج نے اپنی نَقل و حرکت میں اس بات کا لحاظ رکھا کہ اس قدر نزدیک نہ آجائیں کہ تصادم ناگزیر ہو جائے۔ لیکن ساتھ ہی اتنا قریب رہیں کہ گفت و شنید جاری رہ سکے۔ سلطان کا رویہ، اگر کوئی اس کی وضاحت کی کوشش کرے، تو وہ بے تعلقی کا تھا۔ دونوں ترکی پارٹیاں اپنی پالیسی طے کریں اور وہ کوئی بھی انتظام جس کو وہ لوگ پسند کریں منظور کرے گا۔ دونوں جانب سے امیروں کی ایک بڑی تعداد نے امن کی گفت و شنید شروع کر دی، دونوں جانب کے لیے [اصل] فتنہ پرداز ریحان تھا۔

منہاج ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح گفت و شنید ہوئی "قیرۃ قمار الغ خاں کا ایک خاص غلام۔ افسر، اس کی فوج [کی جانب] سے آیا۔ حسام الدین قتلغ (خاں)، امیر علم سیاہ، جو اپنی کبر سنی کی وجہ سے مشہور تھا، اس کے ساتھ اور قطب الدین حسن علی (غوری) کے ساتھ تمام معاملات پر مکمل طور پر بحث کرنے کے لیے متعین کیا گیا" دونوں پارٹیاں اس بات پر راضی ہو گئیں کہ ریحان کو دربار سے ہٹا دیا جائے۔ اور اسے بدایوں کا انتظام دیکھ بھال کرنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ قتلغ نے اس ذاتی حفاظت کا وعدہ کیا ہو لیکن دونوں پارٹیوں نے مشترکہ طور

پر دربار چھوڑ دینے پر اسے مجبور کیا۔ سمجھوتہ کی شرائط منہاج نے نہیں بیان کی ہیں۔ ایسا ممکن معلوم ہوتا ہے کہ قتلغ خاں سے اودھ کو گورنری اور کشلو خاں سے اُچھ اور ملتان کے اس کے پچھلے اقطاع کے متعلق وعدہ کیا گیا ہو۔ الغ خاں کو دہلی لوٹنا تھا اور اسے نائب مملکت کا پچھلا عہدہ پورے اختیارات کے ساتھ سنبھالنا تھا اور مرکزی پالیسی پر اس کے کنٹرول نے اس کے مخالفوں اور غیر جانبداروں دونوں ہی کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ "انتظامات کو مکمل کرنے کے لیے عزالدین بلبن کشلو خاں کو 15/ دسمبر 1254ء کو الغ خاں کے کیمپ بھیجا گیا اور بن خاں ایک ختائی شاہی کیمپ آ گیا" 29/ دسمبر کو منہاج کو مقرر کیا گیا کہ تمام مخالف ترکی افسروں کو ضروری وعدے دے۔ دوسرے دن الغ خاں اور دونوں پارٹیوں کے افسران آئے اور انہوں نے شاہی ہاتھوں کا بوسہ دیا۔ دہلی 21/ جنوری 1255ء کو پہنچا۔

فرمانروائی کا دسواں سال 653ھ (10/ فروری 1255-56ء)

منہاج کہتا ہے کہ "نئے سال کا آغاز" سلطان کے حرم میں ایک انوکھے واقعہ سے ہوا اور اس راز کو کسی نے نہیں جانا، لیکن جس طور پر وہ اس واقعہ کو بیان کرتا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ قتلغ خاں کے ساتھ سلطان کی ماں کی شادی کا واقعہ ہی ہو سکتا ہے[1]۔ "اپنی ماں، ملکہ جہاں سے سلطان کا دماغ برگشتہ ہو گیا اور چونکہ وہ قتلغ کی بیوی تھی اس لیے انہیں اودھ کا اقطاع حوالہ کر دیا گیا اور انہیں وہاں جانے کا حکم دے دیا گیا (16/ فروری 1255ء)" منہاج کو مملکت کا ہیڈ قاضی بنا دیا گیا اور اسے تیسری مرتبہ عدالتی انتظام کی ذمہ داری دی گئی (2/ مئی 1250ء)

دربار میں سب سے زیادہ افسوسناک واقعہ ملک قطب الدین حسن غوری کا الغ خاں کے حکم پر کھلے عام قتل تھا۔ منہاج کو صاف طور پر جھوٹ بولنا پڑا۔ لیکن عصامی ہمیں صحیح حقیقت بتلاتا ہے۔ عصامی کے دادا عزالدین، جنھوں نے اس کی اپنی شفقت کے سائے تلے پرورش کی تھی، سلطان بلبن کی فوج کا سپہ سالار، رہ چکا تھا۔ اور اس کے

---

(1) خاتون کے رویہ کے اسباب کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ قتلغ خاں ایک عمر دراز شخص تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ دربار جہاں الغ خاں اور اس کی لڑکی کا غلبہ ہو اس کو پسند نہ ہو۔

پردادا ظہیر الدین عصامی سلطان ناصرالدین کے وکیل دار تھے۔ اس زمانہ میں چھتر شاہی [شاہی] اقتدار کی علامتوں میں سے ایک تھا۔ الغ خاں نے دوبارہ اپنے اقتدار پر لوٹنے پر سلطان ناصرالدین سے کہا کہ وہ شاہی چھتر کو اس کے حوالہ کر دے۔ اس نے بیمار ہونے کا بہانہ کیا اور چند دنوں دربار نہ آیا۔ سلطان کو تشویش ہوئی اور اس نے ایک صاحب کو اس کی خیریت دریافت کرنے بھیجا۔ الغ خاں نے جواب دیا کہ چھتر کے لیے اپنی آرزو کی وجہ سے وہ بیمار ہو گیا ہے اور وہ ایک سفید چھتر چاہتا ہے جس کے نیچے ایک بید کی چھڑی ہو اور اس کے سر پر ایک عقاب کی جگہ ایک سونے کا پیالہ ہو۔ سلطان جس کو حالات نے بالکل بے اختیار بنادیا تھا فوراً اپنے چھتر کو جدا کرنے پر تیار ہو گیا اور اس نے بڑی خاکساری سے جواب دیا کہ "میں خود اپنے چھتر سے جدا ہونے پر تیار ہوں۔ جو تم چاہو کرو" دوسرے دن الغ خاں اپنے سر پر ایک چھتر کے ساتھ دربار میں نمودار ہوا۔ اس چیز نے پرانے طبقہ امرا کو دہشت زدہ کر دیا اور ملک قطب الدین حسن[1] غوری نے چند طنز آمیز جملے بھی کہہ دیئے۔ الغ خاں برہم ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ بدتمیز مَلِک کو سزا دے کر ایک مثال قایم کر دے گا۔ ایک دن وہ چند قاتلوں کو اپنے ساتھ لے کر آیا اور جب ایک رسمی درباری اجتماع کے لیے قطب الدین حسن محل میں داخل ہوا تو انھوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جب سلطان نے الغ خاں سے پوچھا کہ یہ کس بات کا ہنگامہ ہے تو اس نے جواب دیا کہ "اس شور سے خوف زدہ نہ ہو۔ ایک کانٹا تھا جو برابر باغ مملکت کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ میں نے اسے اکھاڑ دینے کا اور شاہی چھت سے نیچے پھینک دینے کا حکم دے دیا ہے۔" عصامی لکھتا ہے کہ بادشاہ کو سخت تکلیف ہوئی لیکن وہ الغ خاں کی موجودگی میں کچھ نہ کہہ سکا۔[2] یہ پہلا قلم بند کیا ہوا سیاسی قتل تھا جس کا مجرم الغ خاں تھا۔ جب چنگیزی منگولوں نے فیروز کوہ پر حملہ کیا تھا

---

(1) چونکہ قطب الدین حسن غوری کا قتل ایک مشہور و معروف حقیقت ہے لہٰذا منہاج کو اپنے الفاظ احتیاط سے استعمال کرنا پڑے اور شبہات کو غلط جانب موڑنا پڑا۔ "ربیع الثانی میں لوگوں نے قطب الدین حسن علی، جو نائب مملکت رہ چکا تھا، کے بیانات شاہی کانوں تک پہنچائے۔ چونکہ یہ بیانات شاہی مرضی کے خلاف تھے لہٰذا انہیں 23/ ربیع الثانی 653ھ (یکم جون 1255ء) کو گرفتار کر لیا گیا اور قید کر کے مار ڈالا گیا" (220)۔

(2) عصامی، مہدی حسن کا متن، ص ص 56-152۔

تو اس وقت قطب الدین حسن، علی کا بیٹا، غوری یا شنسبانی خاندان کا سب سے اونچے درجہ کا شہزادہ تھا۔ منہاج منگولوں پر اپنے طبقہ (باب) میں منگولوں کی مدافعت کے لیے اس کی کچھ کوششوں کا ذکر کرتا ہے۔ اور اس کے بال بال بچتے ہوئے ہندستان پہنچنے کی تفصیل بتاتا ہے۔ دہلی سلطنت کے افسروں میں وہ شریف النسل کے لحاظ سے ممتاز تھا اس نے کبھی سازشوں میں حصہ نہ لیا اور عام طور پر اس کی عزت کی جاتی اور اس پر بھروسہ کیا جاتا۔ ترکی غلام افسر نہ ہونے کی بنا پر ایک خان کے مرتبہ پر نہ پہنچ سکا لیکن اپنے قتل کے وقت وہ میرٹھ کے اقطاع کا منتظم تھا جسے کشلی خاں کو دے دیا گیا۔

ملک تاج الدین ماہ پشانی کو بہرائچ کا ذمہ دار بنا دیا گیا تھا اور اسی سبب سے اسے قتلغ خاں نے گرفتار کیا اور قید کر دیا۔ لیکن تاج الدین نے اپنے کو ایک مردانہ چال کے ذریعہ آزاد کرا لیا اس نے گھاگھرا ندی کو ایک کشتی سے پار کیا اور چند گھوڑ سواروں کے ساتھ بہرائچ کی جانب روانہ ہو گیا۔ قسمت الٰہی نے ترکیوں کی خوش قسمتی کو ترقی کا اور ہندستانیوں کو انحطاط کا حکم دے دیا تھا۔ ریحان کو شکست ہوئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا اور رجب 653ھ (اگست- ستمبر 1255ء) کو اسے قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت نے قتلغ خاں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔[1]

تاہم قتلغ خاں نے اودھ کے گورنر کی حیثیت سے احکامات کی تعمیل سے انکار کر دیا جس کے متعلق وہ جانتا تھا کہ وہ [دراصل] الغ خاں کے احکامات ہیں اور کچھ دیگر ترکی افسران بھی اسی کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بالآخر، ایک شاہی فرمان کے ذریعہ اسے اودھ سے بہرائچ منتقل کیا گیا۔ لیکن اس نے اس کی تعمیل سے بھی انکار کر دیا۔ تاج الدین تبر خاں اور بکتم اوُر خاں کی ماتحتی میں ایک فوج اس کے خلاف بھیجی گئی۔ سحرامو ضلع بدایوں میں دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی اور خان مارا گیا۔ تبر خاں دہلی واپس ہو گیا۔ اور اسے اودھ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اودھ کو اب بھی فتح کرنا باقی تھا۔ اور یہ بالکل واضح تھا کہ اس مہم میں پوری شاہی فوج کی ضرورت تھی۔ الغ خاں نے جہاں تک ہو سکا تمام سپاہیوں کو جمع کیا اور محرم 654ھ (فروری 1256ء) کو اودھ پہنچ گیا۔ قتلغ اور اس کے افسروں نے شاہی فوج کے سامنے مورچے چھوڑ دیے۔ اور

---

(1) منہاج طبقہ 22 نمبر 12 (بلبن کی سوانح حیات)۔

گھاگھرا ندی کو پار کر کے نامعلوم جگہ میں غائب ہو گئے۔ الغ خاں کا ان کا پیچھا کرنا لاحاصل ثابت ہوا۔

فرمانروائی کا گیارہواں سال 654ھ (13/ جنوری 1256-57ء)

جیسے ہی شاہی فوج دہلی لوٹی قتلغ دوبارہ نمودار ہوا۔ منہاج لکھتا ہے کہ

”چونکہ وہ ہندستان میں اپنا اقتدار نہیں جما سکتا تھا لہٰذا وہ سنتور گڑھ واپس آیا اور سرمور میں اس نے اپنا اقتدار قایم کیا۔ ہر شخص نے اس کی خدمت انجام دی کیونکہ وہ ایک عظیم مَلِک تھا۔ اور دربار کے تمام افسروں نیز ترکی مَلِکوں پر اس کا دعوا تھا۔ وہ جہاں بھی گیا لوگوں نے اس کے لطف و کرم کی بنا پر جو ماضی میں حاصل ہوئیں اور مستقبل پر نظر رکھتے ہوئے اس کی عزت کی۔ جب اس نے سرمور میں پناہ تلاش کی تو رانا دلپت ہندی نے، جس کی ہندوؤں میں ایک اونچی پوزیشن تھی، اس کی خدمت کرنی منظور کر لی۔ کیونکہ یہ ان لوگوں کی عادت تھی کہ بے گناہ لوگوں کی حفاظت کریں۔[1]“

الغ خاں سنتور گڑھ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن رانا اور قتلغ خاں دونوں ہی بچ نکلے اور موخرالذکر کشلو خان کا ساتھ دینے کے لیے، جس نے بغاوت کر دی تھی، مغرب کی جانب روانہ ہو گیا۔

فرمانروائی کا بارہواں سال 655ھ (19/ جنوری 1257-58ء)

1255ء کے تصفیہ کے نتیجہ میں اُچھ اور ملتان کے حصول کے بعد کشلو نے غور کے مَلِک شمس الدین کرت کی وساطت سے ہلاکو خاں کے ساتھ رابطہ قایم کیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو یرغمال کے طور پر دیا اور اس سے ایک منگول شحنا اپنے دربار بھیجنے کی درخواست کی۔ لیکن ہلاکو اس پوزیشن میں نہ تھا کہ وہ کسی کی مدد کر سکے۔ لہٰذا کشلو نے دہلی کے خلاف اپنی ذمہ داری پر بغاوت کا فیصلہ کیا اور اس کا ساتھ قتلغ خاں نے دیا۔ وہ لوگ سنام اور سامانا کی طرف پلٹے اور ان علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ الغ خاں اپنے بھائی کشلی خاں اور اپنے چچیرے بھائی مشیر خاں کے ساتھ مملکت کی پوری فوج لے کر دہلی سے روانہ ہوا۔ لیکن ایک افسوس ناک چوک کی بنا پر دہلی بالکل نہتا رہ گیا۔ سامان اور کیتھل کے مضافات میں کسی جگہ پر فوجیں اتنی قریب آ گئیں کہ ان لوگوں کے درمیان

---

(1) ایضاً، طبقہ 22 نمبر 12 (بلبن کی سوانح حیات)

صرف دس کرہ کا فاصلہ رہ گیا۔ مملکت کے تمام بہی خواہ ایک کشمکش کے خیال سے دہشت زدہ ہو گئے۔ منہاج لکھتا ہے کہ "فوجیں جو آمنے سامنے تھیں بھائیوں اور دوستوں پر مشتمل تھیں۔ ایک ہی دربار کی دو طاقتیں، ایک ہی پوشاک کے دو استر"۔ الغ خاں نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کشلی خاں اور دوسرا حصہ شیر خاں کی قیادت میں لیکن ساتھ ہی اس نے مخالف مَلِکوں سے گفت وشنید بھی شروع کر دی۔ وہ اطاعت اور وفاداری کی شرط پر ان کی عہدوں اور جاگیروں کی مانگوں کو قبول کرنے پر تیار ہو گیا۔

لیکن اسی اثنا میں کہ جنگ اور امن کا مسئلہ شش و پنج میں تھا کچھ سیاسی علما (دستار بندوں) کے، مثلاً شیخ الاسلام قطب الدین اور قاضی شمس الدین بہرائچی، چند ریاستی افسروں (کلاہ داروں) کے ساتھ مل کر قتلغ خاں اور کشلو کو ایک خفیہ خط لکھا۔ ان سے دہلی روانہ ہونے کی درخواست کی اور دروازوں کو ان کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ ان لوگوں نے دہلی میں ان کی موافقت کی فضا تیار کرنا شروع کر دی اور ہر ایک سے داہنے ہاتھ پر بیعت لی۔ منہاج نے ان کے پیغام کے متعلق جو لکھا ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ "دروازے ہمارے ہاتھوں میں ہیں، آپ راجدھانی آجائیں دہلی میں کوئی فوج نہیں ہے، آپ لوگ دربار کے اعلیٰ افسران ہیں اور ہمارے درمیان کوئی اجنبی نہیں ہے۔ اگر آپ یہاں آگئے اور شاہی دربار میں داخل ہو گئے تو الغ خاں اپنی فوج کے ساتھ باہر ہی رہ جائے گا۔ اور تمام معاملات کا تصفیہ آپ کی خواہشات کے مطابق ہو جائے گا۔"

جیسا کہ فارسی شاعر حافظ نے کہا کہ "وہ راز کس طرح راز رہ سکتا ہے جس پر بحث و تمحیص کے لیے میٹنگ بلائی گئی ہو"۔ الغ خاں کے ایجنٹوں نے اسے جو کچھ ہو رہا تھا اس کی اطلاع دی۔ اور اس نے یہ فوری پیغامات بھیجے کہ خط لکھنے والوں کو دہلی سے نکال باہر کیا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا اور شہر کے دروازے بند کر دیے گئے۔ علاؤالدین ایاز زنجانی، نائب امیر حاجب، الغ بیگ کوتوال، جمال الدین نیشاپوری اور وزارت جنگ کے افسروں نے شہر کے تحفظ کے لیے جتنا بھر ہو سکتا تھا کیا۔ سب سے زیادہ خطرناک رات کو امراء "سرخیل" اور شہر کے ممتاز لوگوں کو بھی پشتوں کی حفاظت کے لیے کہا گیا۔

جب دہلی سے خط ان کے پاس پہنچ گیا تو کشلو اور قتلغ فوراً دہلی روانہ ہوئے، موسم گرما کی گرمیوں کے باوجود انہوں نے تقریباً سو کرہ (تقریباً دو سو میل) کا فاصلہ گھوڑوں پر طے کیا۔ اور 21/ جون 1257ء کو دہلی کے مضافات میں پہنچ گئے۔ لیکن انھوں نے دروازوں کو بند پایا۔ ان کے حامیوں کو دو دن پہلے دہلی سے نکالا جا چکا تھا۔ انھوں نے رات میں جوڈ کے باغوں، کیلو گڑھی اور شہر کے درمیان اپنے خیمے گاڑھے اور دوسرے دن پشتوں کے گرد گئے۔ لیکن وہاں وہ کچھ نہ کر سکے۔ اور انھوں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ چند مخالف مَلِک سیوالک چلے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ قتلغ خاں نے ارسلان خاں سنجر کے ساتھ اودھ میں پناہ تلاش کی تھی۔ کشلو خاں دو سو یا تین سو گھوڑ سواروں کے ساتھ سیوالک کے راستے اُچھ واپس ہو گیا۔ لیکن ان کے بقیہ سپاہیوں نے ملازمت تلاش کی اور سلطان کے ملازم ہو گئے۔ ترکی غلام۔ افسروں کی ملازمت میں ہندستانی سپاہی ایک سیاست داں نہ تھا بلکہ محض اُجرت پر کام کرنے والا۔ لہٰذا وہ ان افسروں کی پیروی نہیں کر سکتا تھا جو اس کی تنخواہ دینے کے لائق نہ تھے۔ سال کے آخیر میں منگول سالین نوین کی ماتحتی میں اُچھ سے خراسان اور ملتان آئے۔ کشلو خاں نے ان کے ساتھ ایک سمجھوتہ کیا اور سالین کے کیمپ میں شامل ہو گیا۔

اختیار الدین یوزبک طغرل خاں کی سوانح اور کارنامے

تناؤ کے اس عرصہ میں مشرقی صوبوں پر سے دہلی کا کنٹرول ختم ہو گیا اور اس بات نے لکھناؤتی کے گورنر یوزبک کو اپنے جرائم کے لیے موقعہ فراہم کر دیا۔ یوزبک، جو ایک قپچاقی ترک تھا، کی نشو و نما کا آغاز التتمش کے ایک غلام کی حیثیت سے ہوا۔ رکن الدین فیروز کے دور حکومت میں اس نے ترائن میں تازبک افسروں کی خون ریزی میں اہم رول ادا کیا۔ بہرام شاہ نے اسے قید کر دیا لیکن اس کے زوال کے بعد وہ آزاد ہو گیا۔ کچھ دنوں کے لیے علاؤالدین مسعود نے اسے لاہور اور تبرہندہ میں متعین کیا تھا۔ لیکن وہ ایک ساتھی افسر، ناصرالدین محمود بندار سے اس کا جھگڑا ہو گیا اور اس نے بادشاہ کی مخالفت شروع کر دی۔ 1246ء میں الغ خاں اسے دہلی لایا۔ اور سلطان سے سفارش کی کہ اس کی پچھلی غلطیاں معاف کر دی جائیں۔ کچھ دنوں بعد اسے اودھ

[کا اقطاع] دیا گیا۔ لیکن وہ دہلی چلا آیا اس کی جگہ پر اس نے لکھناوتی کی ذمہ داری حاصل کر لی۔ منہاج لکھتا ہے کہ "غصہ اور حب جا یوزبک کے دماغ میں رچا ہوا تھا"۔

یوزبک نے جاجنگر کی فوج کے ساتھ تین غیر فیصلہ کن جنگیں لڑیں۔ لیکن منہاج لکھتا ہے کہ چوتھی جنگ میں اسے کامیابی ہوئی۔ اس نے اُمَرمردن کے علاقہ پر فتح حاصل کی۔ رائے بھاگ کھڑا ہوا اور اس کے پاس جو کچھ تھا وہ یوزبک کے ہاتھ لگ گیا۔

لکھناوتی واپس آنے پر وہ بادشاہ کی مخالفت کرنے لگا اور اس نے سرخ، سیاہ اور سفید تین چھتر (اپنے سر پر) بلند کیے۔ وہ اپنی فوج کو لکھناوتی سے شہر اودھ لے آیا اور اپنا خطبہ "سلطان مغیث الدین" کے خطاب سے پڑھوایا"۔ دو ہفتہ بعد اودھ کے ایک شاہی دستہ نے ایک ترکی امیر کو اسے خوفزدہ کرنے کے لیے اس کے پاس اس خبر کے ساتھ بھیجا کہ پوری کی پوری شاہی فوج پہنچ چکی ہے۔ یوزبک کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اور ایک کشتی پر سوار ہو کر لکھناوتی لوٹ گیا۔ ہندستان کے تمام باشندوں ہندوؤں، مسلمانوں، مذہبی اسکالروں اور ریاستی افسروں نے یوزبک کی اس حرکت کو ناپسند کیا۔ وہ خود اپنے بادشاہ سے غداری اور بغاوت کا مجرم تھا۔ [بالآخر] ناگزیر طور پر بری حرکت کی سزا ملی اور اس کا اقتدار جڑ سے اکھڑ گیا۔[1]

اس کے بعد یوزبک نے کامروپ پر حملے کا فیصلہ کیا۔ کامروپ کا رائے اس کے مقابلہ کی پوزیشن میں نہ تھا۔ لہٰذا وہ کنارہ کش ہو گیا۔ جبکہ یوزبک نے شہر کو لوٹا اور رائے کے وراثتی خزانوں پر قبضہ کر لیا۔ رائے نے اس بات کا وعدہ کرتے ہوئے قاصدوں کو بھیجا کہ "وہ ایک بھاری تاوان ادا کرے گا اگر اسے دوبارہ بحال کر دیا جائے۔" وہ اس بات پر بھی تیار تھا کہ سکوں کی ڈھلائی اور خطبہ یوزبک کے نام پر ہو لیکن یوزبک نے کسی مصالحت کی طرف کان نہ دیا۔ تب رائے نے دوسری چال چلی جو انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں یاد ہے کہ یوزبک بھی ایک بہت ہی انوکھا آدمی تھا۔ رائے نے اپنے سپاہیوں اور رعایا کو یہ حکم دیا کہ وہ یوزبک کی اس شرط پر اطاعت کر لیں کہ وہ اپنے غلّوں کو ان سے جس قیمت پر وہ چاہے فروخت کر دیں۔ چال کامیاب ہوئی اور یوزبک نے اپنے تمام غلے فروخت کر دیے۔ اس سے پہلے کہ ربیع کی فصل کاٹی جا

---

[1] ایضاً، ص 263

سکے۔ رائے اور اس کی رعایا نے بغاوت کر دی۔ انھوں نے دریاؤں کے تمام بند بھی کھول دیے۔ غلہ باقی نہ بچنے کی وجہ سے لکھناوتی فوج نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ لیکن ہندوؤں نے تمام پانی اور خشکی کے راستے بند کر دیے تھے۔ یوزبک کو پہاڑیوں کے دامن تک پہنچا دینے والا ایک ہندو رہنما بھی مل گیا۔ لیکن یہاں بھی ہندوؤں نے ان کے راستے بند کر دیے۔ اسی اثنا میں یوزبک جبکہ وہ ایک ہاتھی پر سوار تھا کا سینہ ایک تیر سے زخمی ہو گیا۔ اور اس کے خاندان اور پیروکاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ رائے کے سامنے لا کر اس کی آخری خواہش پوچھی گئی۔ جو اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھنے کی تھی۔ اس کی خواہش منظور کر لی گئی۔ یوزبک نے اپنے بیٹے کو دیکھا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

فرمانروائی کا تیرہواں سال 656ھ (8/ جنوری 1258-59ء)

شیر خاں نے تبرہندہ کو ارسلان خاں سے، جسے غیر قانونی طور پر حوالہ کیا گیا تھا، اور جو اس کے دفاع کے لیے تیار تھا، چھین لینا چاہا۔ دونوں کو دہلی تصفیہ کے لیے بلایا گیا۔ فوری طور پر ارسلان خاں کو اودھ اور شیر خاں کو تبرہندہ دیا گیا۔ لیکن اس کے اور ارسلان خاں کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ دونوں نے [اس کے قبل] منگول اعلا کمان سے رابطہ قایم کیا تھا، [اس لیے] الغ خاں سرحدی صوبوں کے سلسلہ میں دونوں میں سے کسی پر بھروسہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا دوسرے سال (فروری 1259ء) کو اس نے شیر خاں کو ایک دوسرے سمجھوتے کے لیے دہلی بلایا۔ بھٹنڈہ کا سرحدی شہر نصرت خاں سنقر صوفی کو دیا گیا۔ اور شیر خاں کو کول، بیانہ، بیلارم، جالیسر، مہر، مہابن کے علاقے اور گوالیار کا قلعہ دیا گیا۔ وہ اس وقت ان سرزمینوں کا مالک تھا جب منہاج نے جون یا جولائی 1260ء میں اپنی کتاب مکمل کی۔

فرمانروائی کا چودہواں سال 657ھ (28/ دسمبر 1258-59ء)

گزشتہ سال منگول حملہ کا خوف تھا اور تمام افسروں کو دہلی بلایا گیا تھا۔ اطلاع آئی تھی کہ ارسلان خاں اور قتلغ خاں نے آنے مین تاخیر کر دی۔ ہندستانی موسم گرما

شروع ہو چکا تھا لیکن الغ نے گرمی کے باوجود ان کے خلاف نکلنے کا فیصلہ کیا۔ قتلغ اور ارسلان نے اپنے سپاہیوں کو دیہاتوں میں منتشر کر دیا۔ اور ایک پیغام بھیجا کہ اگر شاہی فوج واپس چلی جائے تو وہ لوگ وفادار افسروں کی طرح اپنے آپ کو دربار میں حاضر کر دیں گے۔ وعدہ کے مطابق قتلغ اور ارسلان 27/ مئی 1258ء کو سلطان کے سامنے حاضر ہوئے۔ علاقوں میں اس شورش اور مخالفت کے باوجود جس کے مجرم یہ دونوں تھے الغ خاں نے ان کا استقبال بڑی عزت و احترام سے کیا۔[1] مزید یہ کہ اس کی سفارش پر دو مہینوں کے اندر قتلغ خاں کو لکھناؤتی کا اور ارسلان خاں کو کڑا کا علاقہ دیا گیا۔ لیکن فرشتہ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ قتلغ خاں کے خاتمہ کا راز پوشیدہ ہے، ہو سکتا ہے وہ ایک قدرتی موت مرا ہو۔ لیکن زیادہ اغلب یہ ہے کہ الغ خاں کے مخالف، پریشان کن حریفوں کو ختم کرنے کی نئی پالیسی کے مطابق یا تو اسے زہر دے دیا گیا یا پھر اسے قتل کر دیا گیا۔ منہاج دو مرتبہ تذکرہ کرتا ہے لیکن ان دونوں میں قتلغ کی تقرری اور وجود کو ایک سرے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ "18/ دسمبر 1258ء کو لکھناؤتی کا علاقہ ملک جلال الدین مسعود جانی کے حوالہ کر دیا گیا[2]۔ 8/ جون 1259ء کو ایک خزانہ، نقدی، قیمتی برتن کی بڑی مقدار اور دو ہاتھیوں کے ساتھ، لکھناؤتی سے دربار پہنچا۔ الغ خاں نے اس خدمت کا اعتراف کیا اور عزالدین بلبن یوزبک، جس نے ہاتھیوں اور خزانوں کو روانہ کیا تھا، کے پاس لکھناؤتی کے پورے علاقے کے لیے ایک مثال [اقطاع] بھیجا۔[3]

الغ خاں کا چھوٹا بھائی کشلی خاں، جو میرٹھ کا گورنر تھا، جون یا جولائی 1259ء میں انتقال کر گیا۔ اس کا عہدہ اور اس کے علاقے اس کے بیٹے علاؤالدین کے جو عام طور پر ملک چھجو، کے نام سے مشہور تھا، حوالے کر دیا گیا۔ 19/ ستمبر 1259ء کو الغ خاں کی لڑکی سے سلطان کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔

---

(1) ایضاً، طبقہ 22 نمبر 12 (بلبن کے سوانح حیات)

(2) ایضاً، ص ص 225-226۔

(3) ایضاً، ص 313

فرمانروائی کا پندرہواں سال 658ھ (18/دسمبر 60-1259ء)

اس سال کا اہم واقعہ ہلاکو کے سفراء کا پہنچنا تھا[1]۔ الغ خاں نے انہیں ماروتہ میں اس وقت تک ٹھہرائے رکھا جب تک کہ اس نے ان لوگوں کے لیے [مرعوب کرنے کے لیے] انتظامات نہ کریئے۔ وفادار سپاہیوں اور باشندوں کا ایک جم غفیر اور انسانی سروں اور لاشوں کی ایک بڑی تعداد تاکہ ریاست کی طاقت کے دونوں پہلوؤں کو دکھایا جاسکے۔

اس بیان [کی صداقت] میں صرف ایک ہی دشواری ہے۔ ناصرالدین حسن قرلغ 1250ء سے پہلے ہی ملتان کے محاصرہ کے وقت مر چکا تھا۔ ہلاکو کے سفیروں کی آمد میں اتنی مدت کیوں لگ گئی۔

منہاج ہمیں بتاتا ہے کہ "شہر [دہلی] کے اطراف پہاڑی علاقوں میں مفسد قسم

---

(1) منگول سفراء کی آمد کا کوئی سیاسی یا سفارتی مقصد نہ تھا۔ لیکن چونکہ وہ لوگ آہی گئے تھے لہٰذا ان کے استقبال کا معقول انتظام کرنا پڑا۔ وہ انوکھے حالات کی وضاحت منہاج اس طرح کرتا ہے:

ناصرالدین حسن قرلغ نے اپنی لڑکی کی شادی الغ کے لڑکے کے ساتھ کرنی چاہی۔ الغ نے اس معاملہ کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ ایک خاص سفیر جمال الدین علی خلجی کو اس مقصد کے لیے بھیجا جائے۔ جمال الدین کو کشلو خاں کے افسروں نے پکڑ لیا اور اسے اس کے دربار لے آئے۔ وہاں اس نے، منگول سفراء کی موجودگی میں اعلان کر دیا کہ وہ ہلاکو کے پاس جا رہا ہے۔ اور اس کے سفراء نے ہلاکو کو جمال الدین کے جانے کی اطلاع دے دی۔ لہٰذا ناصرالدین قرلغ کے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ الغ خاں کے نام پر، بلا شبہ اس کے علم میں لائے بغیر، ہلاکو کو ایک خط لکھے اور جمال الدین کو چند تحائف کے ساتھ ہلاکو کے پاس بھیجے۔ ہلاکو نے تبریز میں اس دور افتادہ ملک کے سفیر کو خوش آمدید کہا۔ جب جمال الدین لوٹ رہا تھا تو ہلاکو نے بنیان کے شحنا، امیر یفرش کا بیٹا، ایک مشہور مسلمان، کو اس کے ساتھ (دہلی) جانے کا حکم دیا۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ "سالین نوین" کی ماتحتی میں کوئی منگول گھوڑا سلطان ناصرالدین کے علاقہ میں قدم نہ رکھے اور اگر کوئی گھوڑا ایسا کرے گا تو اس کے ہاتھ اور پیر کاٹ دیا جائے" یہ صرف سالین نوین کو حکم تھا، یہ کوئی عہد نامہ نہ تھا، اور یہ سالین کے ورثا پر عائد نہیں ہوتا تھا۔

کے لوگ رہتے تھے جو مسافروں پر ڈاکے ڈالتے، مسلمانوں کو لوٹتے کھسوٹتے، اور ہریانہ، سیوالک اور بنیان کے دیہاتوں کو تباہ و برباد کرتے تھے۔" اس واقعہ کے تین سال قبل ایک دیو قامت ہندو، ملیکہ، نے الغ خاں کے افسروں کے اونٹوں کو چرالیا تھا۔ اور انہیں رنتھمبور تک کے علاقہ میں تقسیم کردیا۔ منگول حملے کے اندیشے کی وجہ سے الغ اس وقت کچھ نہ کرسکا تھا۔ لیکن اب وہ ان پہاڑی علاقوں کی طرف گیا اور وہاں اس نے بیس دنوں تک لوٹ مار مچائی۔ تن سے جدا سر کے بدلے ایک ٹنکہ اور ایک زندہ باغی کے بدلے دو ٹنکے، انعام کے لیے اس نے اعلان کردیا۔ اس کے علاوہ 1250 اہم افراد 142 گھوڑوں سمیت گرفتار کرلیے گئے اور مورتیوں اور راناؤں سے ٹنکوں کے چھ بیگ جن کی مالیت تیس ہزار کی تھی ضبط کرلی گئی جب دہلی کو منگول طرز پر [تن سے جدا] سروں اور بھوسے بھری لاشوں کی ایک بڑی تعداد کے ذریعہ سجالیا گیا اور دو لاکھ پیادے اور پچاس ہزار گھوڑ سوار بھی جمع کرلیے گئے تب کیلوگڑھی (یا شہر نو) سے منگول سفراء قصر سنمر لائے گئے۔ جہاں سلطان نے اپنا دربار لگایا تھا۔ عوام کندھے سے ملائے سڑک کے دونوں کنارے بیس قطاروں میں کھڑے تھے۔

یہ مظاہرہ جو غالباً اپریل 1260ء میں ہوا کسی عوامی معاہدہ یا سمجھوتہ پر منتج نہ ہوا۔ لیکن اس چیز نے الغ خاں کی معاملات کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت اجاگر کردی۔

1260ء کی گرمیوں میں اپنی تصنیف مکمل کرنے سے پہلے منہاج رقم طراز ہے کہ عزالدین کشلو خاں ہلاکو کے دربار میں گیا اور پھر واپس آیا۔ اور یہ کہ وہ قاصدوں کو دہلی بھیج رہا تھا۔ اسے توقع تھی کہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔[2] لیکن عصامی ہمیں بتاتا ہے کہ الغ خاں ملتان روانہ ہوا اور اس نے اس پر قبضہ کرلیا۔[3] کشلو خاں اپنے بیٹے محمد کو ملتان کا انچارج بنا کر پنجاب گیا تھا۔ اس نوجوان کے ساتھ الغ کا سلوک اچھا تھا۔ لیکن تین یا چار دنوں کے بعد وہ اپنے باپ کے پاس بھاگ آیا۔ کشلو نے فیصلہ کیا کہ پنجاب

---

(1) ایضاً، ص 313۔

(2) ایضاً، شمس ملکوں کے متعلق طبقہ (10)

(3) فتح السلاطین، ص ص 50-48 (ڈاکٹر مہدی حسن کا ایڈیشن) اور جگہوں کی طرح یہاں بھی عصامی تسلسل واقعات میں غلطی کرتا ہے۔

میں دہلی کی فوج کو چیلنج کرنا عقل مندی کے خلاف ہوگا۔ لہٰذا اس نے خود کو بنیان میں مستحکم کیا۔ اور منگولوں کی مدد سے اپنے پرانے اقطاع پر دوبارہ فتح حاصل کرنے کے لیے اس نے دو ناکام کوششیں کیں۔ یہ کوششیں ناکام ہوگئیں اور [اس کے بعد] کشلو خاں کا کوئی تذکرہ ہمیں نہیں ملتا۔ یہ الغ خاں کے دوسرے بڑے حریف کا خاتمہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [اب] دہلی سلطنت پر اس کا کنٹرول تکمیل کو پہنچ گیا۔

شمسی خاندان کا خاتمہ: بلبن کی تخت نشینی

جب الغ خاں سلطان ناصر الدین کو اس بات پر مجبور کر رہا تھا کہ وہ شاہی چھتر اس کے حوالہ کر دے اور جب اس نے ملک قطب الدین غوری کو محل میں ایک عوامی اجتماع کے دوران قتل کروانے کا انتظام کیا تو وہ اصلاً ان تمام لوگوں کو جو دربار اور حکومت سے تعلق رکھتے تھے اس بات سے آگاہ کر رہا تھا کہ اسکے مقاصد کو کھیل نہ سمجھا جائے۔ لیکن تخت کے سلسلہ میں اس کے ارادوں کا علم صرف سیاستدانوں تک ہی نہ تھا۔ امیر خورد اپنی سیر الاولیا میں، ناصر الدین کے دوران حکومت شیخ فرید کی زیارت کے لیے الغ خاں کے دورہ اجودھیاں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں "ان دنوں الغ خاں بادشاہت حاصل کرنے کا بہت خواہش مند تھا۔[1] بدقسمتی سے ہمیں کوئی ہم عصر سیاسی تاریخ نہ تو ناصر الدین کی حکومت کے آخری کچھ برسوں کی ملتی ہے اور نا ہی بلبن کے پورے دور حکومت کی۔ پھر بھی ہمیں کچھ واقعات، جیسے بلبن کے لڑکے خان شہید، کی موت کے متعلق ہم عصر تحریریں ملتی ہیں۔ نائب مملکت کی حیثیت سے بلبن کے اختیارات بڑے وسیع تھے۔ لیکن وہ غیر یقینی تھے جس کا اسے تکلیف دہ طور پر احساس تھا۔ پھر وہ کیوں چھ سال تک دست درازی سے باز رہا؟ اس کے بہت سے اسباب خود ہی عیاں ہیں۔ اسے منگولوں کی طاقت سے اندیشہ تھا لیکن مصریوں کے ہاتھوں ہلاکو کی شکست اور بعد میں اس کی موت سے الغ خان کو ضرور اطمینان ہوگا۔ 1260ء میں منگو کا انتقال ہوگیا۔ جس کے ساتھ ہی عظیم منگول مملکت کی مرکزی طاقت بھی ختم ہوگئی الغ خاں نے قتلغ اور کشلو کو کچل ڈالا تھا لیکن دیگر ترکی غلام۔ افسران کے موقف

---

(1) سیر الاولیا، ص79

کے سلسلہ میں اسے پورا اطمینان کر لینا تھا کیونکہ اس کی تخت نشینی کو قانونی شکل دینے کے لیے ان کی منظوری ضروری تھی۔

سلطان ناصر الدین کی موت کی وجہ کیا ہوئی اس سلسلہ میں ضیاء الدین برنی خاموش ہے اسی خاموشی کا سہارا لے کر تاریخ مبارک شاہی [کے مصنف] نے فرض کر لیا ہے کہ سلطان کی موت ایک بیماری سے ہوئی۔ اور عہد وسطیٰ کے اکثر مورخین نے اسی آرام دہ خیال کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن اس بیان سے اوّل تو شمس الدین التتمش کی پوری نسل کے مکمل طبعی خاتمہ کی وضاحت نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ دو مآخذ جن کے بارے میں اب معلوم ہوا ہے اس عہد وسطیٰ کے مورخین ناواقف تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنی کتاب "رحلہ" میں دہلی کے گزشتہ سلاطین کا ایک مختصر جائزہ لیا ہے۔ وہ واضح طور پر کہتا ہے کہ "اس کے بعد اس کے نائب (یعنی نائب مملکت) نے اسے (سلطان ناصر الدین محمود) مار ڈالا اور خود بادشاہ ہو گیا۔[1] عصامی جس کی کتاب "فتوح السلاطین" کا مطالعہ عہد وسطیٰ کے مورخین نے، ٹھیک سے نہیں کیا۔ بڑے زوردار الفاظ میں لکھتا ہے کہ سلطان ناصر الدین کو زہر دے دیا گیا تھا اور یہ کہ اس حقیقت سے دہلی کے لوگ واقف تھے۔

اس سیاق میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب سفاح اور منصور اپنے عباسی خاندان کے تحفظ کے لیے اموی خاندان کے تمام زندہ افراد کو قتل کر رہے تھے تو وہ بعد کے تمام مسلم خاندانی انقلابات کے لیے ایک نظیر قایم کر رہے تھے۔ یہ بات تو معلوم نہیں کہ الغ خاں کا اسلامی تاریخ کا کتنا مطالعہ تھا لیکن اس کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس نظیر پر عمل کرے۔

1266ء میں سلطان ناصر الدین کے چار بیٹے تھے۔ ملک رکن الدین فیروز شاہ ملک شہاب الدین فیروز شاہ ملک شہاب الدین محمد شاہ، ملک تاج الدین ابراہیم شاہ اور

---

(1) رحلہ عربی متن، جلد دوم، ص 22، شاید یہ بات ابن بطوطہ کو اس کے ہندستانی دوستوں نے نہیں بتلائی تھی کہ یہاں لفظ "نائب" کا مطلب قایم مقام یا گماشتہ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ ایک خاص عہدہ کو ظاہر کرتا ہے جیسے "وزیر مطلق"، یعنی عباسیوں [کے عہد] کا وزیر کل۔ یعنی ایسا وزیر جس کی تقرری اور برطرفی بادشاہ کر سکتا تھا لیکن وہ اس کے کاموں میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔

ملک سیف الدین بہرام شاہ۔ الغ خاں کی لڑکی سے سلطان کا 1259ء میں جو لڑکا ہوا تھا اسے فہرست میں شامل کیا گیا ہے یا نہیں یہ معلوم نہیں ہے۔ جب 1253ء میں قتلغ۔ کشلو گروپ برسر اقتدار آیا تو اس نے شہزادہ رکن الدین کو امیر حاجب مقرر کیا۔ لیکن چونکہ یہ بہت چھوٹا تھا لہٰذا اس کے عہدے کی ذمہ داریاں کشلو خاں نائب حاجب کی حیثیت سے ادا کرتا تھا۔ جب الغ خاں پھر برسر اقتدار واپس آگیا تو چھوٹے شہزادے کو اس کے عہدے سے محروم کر دیا گیا 1۔ ان چاروں شہزادوں کے علاوہ التمش کی دیگر بہت سی اولادیں اس وقت (67-1266ء) یقیناً زندہ رہی ہوں گی۔

عصامی لکھتا ہے کہ سلطان کے دو چھوٹے بیٹے الغ خاں کے دونوں چھوٹے بیٹوں کے ساتھ مل جل کر مزے اُڑایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ سب ساتھ پینے پلانے میں مشغول تھے تو الغ خاں کے لڑکوں نے یہ دعوا کیا کہ ان کا باپ اس عہد کا سب سے زیادہ عقلمند اور مصلحت اندیش ہے۔ دونوں شہزادوں نے جواباً کہا کہ "اگرچہ وہ عمر پختہ ہے اور ہم لوگ ناتجربہ کار ہیں مگر ہم ایک ترکیب کے ذریعے اسے اس کے گھوڑے سے اتار سکتے ہیں"۔ آٹھ دینار کی بازی لگائی گئی۔ کچھ دنوں بعد ایک شہزادہ الغ خاں کے ساتھ گھوڑے پر سوار میدان میں جارہا تھا کہ اس نے اپنا کوڑا اس طرح گرادیا کہ جیسے وہ اتفاقاً گر گیا ہو اور پھر مجبور ہو کر الغ خاں کو دیکھنے لگا۔ خان اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ اس نے کوڑا اٹھایا اور شہزادے کو دے دیا۔ بعد میں اس کے بیٹوں نے جب اسے بازی کے متعلق بتایا تو انہیں 80 دینار ادا کرنے کا حکم دیا۔ لیکن وہ سوچنے لگا۔ جس طرح اس نے اس سے پہلے ہزاروں بار سوچا ہوگا۔ عصامی ہمیں بتاتا ہے کہ اس نے اپنے دل میں کہا کہ "بادشاہ کے لڑکوں نے چالیں چلنی شروع کر دی ہیں۔ ایک دن دھوکے اور دغا سے وہ لوگ مجھے گرفتار کرلیں گے، مجھے باندھ دیں گے اور مجھے مار

---

(1) ہر اہم دور حکومت کے شروع میں منہاج اور برنی دونوں ہی سلطان کے لڑکوں، قریبی رشتہ داروں اور اعلا افسروں کی فہرست پیش کرتے ہیں۔ لیکن ناقدوں کی غفلت کی بنا پر ان کی وضاحت میں مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ زیر بحث ان چار ناموں کے متعلق کچھ نسخوں میں "انبا" (بیٹے) اور کچھ میں "اقربا" (رشتہ دار) لکھا ہے۔ لیکن چونکہ منہاج، رکن الدین کا حوالہ خود متن میں شہزادے کی حیثیت سے دیتا ہے اور اس نے ناموں کے آخیر میں "شاہ" کا لفظ لگایا ہے۔ لہٰذا لفظ "انبا" (جو شہزادوں کے معنی میں ہے) بظاہر صحیح ہے۔

ڈالیں گے"۔ یہ اس کے اور شمسی خاندان اور اس کے بہی خواہوں کے درمیاں زندگی کا سوال تھا۔ "وہ رات دن اس معاملہ پر غور کرتا"۔ عصامی اپنی بات جاری رکھتا ہے اور میں نے سنا کہ محتاط منصوبہ بندی کے بعد وہ ایک فاسق منصوبے کو روبہ عمل لایا، بادشاہ کو زہر دے دیا گیا۔ سارے شہر میں ہنگامہ ہو گیا۔ لیکن 665ھ (67-1266ء) میں بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔[1]

دہلی میں کتنی ہی کھلبلی مچی لیکن الغ خاں کو "غیاث الدین بلبن" کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہونے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس نے پرانے خاندان کا چراغ بجھانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کیے۔ فرشتہ ہمیں بتاتا ہے کہ "اعلانیہ یا خفیہ طور پر اس نے شمس الدین التتمش کی نسل کے بہت سارے لوگوں کو قتل کر دیا۔ جنہیں وہ تخت کے سلسلہ میں اپنا حریف شمار کرتا تھا"[2]۔ عصامی کا بیان ہے کہ "جب الغ خاں تخت نشین ہو گیا تو افسروں کے دانت ٹوٹ گئے۔ وہ تمام بغیر کسی دلیل یا سبب کے اس کے کنٹرول میں آ گئے"۔ بہت سے خان اور مَلِک جو سابقہ حکومت میں کافی ممتاز شخصیت کے حامل تھے اب ان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ہم نہیں جانتے کہ منہاج اور اس کے بیٹے ایاز کا اور "ان دنیاوی مال و اسباب کا" جسے منہاج نے بڑی احتیاط سے جمع کر رکھا تھا کیا حشر ہوا۔

غیاث الدین بلبن خود کو ایک فوق البشر (Super man) اور وراثتی بادشاہ ظاہر کرنے لگا۔ افسانوی افراسیاب کا ایک خلف، جو خدا کی عنایت سے، ان تمام برائیوں [کمزوریوں] سے پاک تھا جن کا جسم انسانی شکار ہوا کرتا ہے۔

---

(1) عصامی، ص ص 57-156۔

(2) فرشتہ، جلد اوّل، ص 76۔

5

سلطان بلبن اور کیقباد

تخت نشینی کے بعد بلبن کے مسائل

تخت نشینی کے بعد بلبن کو بہت سارے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے اپنی اہم ترین پالیسی کے طور پر خود انہیں ہتھیاروں کو غیر موثر اور کند کر دینا تھا جنہیں اس نے خود اقتدار کے حصول کے لیے استعمال کیا تھا کہ کوئی دوسرا انہیں دوبارہ استعمال میں لانے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے امرا کے ساتھ تعلقات کو از سر نو طے کیا جائے۔ ملِکوں اور امرا کو یہ بتلا دینا تھا کہ بادشاہت ان کے بس سے باہر ہے اور یہ کہ بادشاہ اور امرا کے درمیان رقابت یا مسابقت کا قطعاً کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا اسے ترکی غلام افسران کی کشمکش کے اس طویل باب کا خاتمہ کر دینا تھا جس میں اس نے خود ایک ایسا رول ادا کیا تھا جسے قبول کرنے کے لیے اب وہ تیار نہ تھا۔ تمام باتوں کے علاوہ[اب] یہ بات لازمی ہو گئی تھی کہ دہلی کے سلطان کی طاقت اور شان و شوقت کو از سر نو قایم کیا جائے۔ اور ہندستان کے لیے۔ ایک نئے مگر قلیل المدت اصول بادشاہت کی بنا ڈالی جائے۔

بلبن کے سامنے دوسرا فوری مسئلہ نظم و ضبط کی بحالی تھی۔ نائب مملکت کی حیثیت سے اس نے امن کی بحالی کی کوشش بے تکے طور پر اور قتل عام کے ذریعے کی تھی۔ وہ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نظم و ضبط کی بحالی صرف ایک مستحکم عسکری اور پولیس عملہ کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ مگر مناسب کاروائی کرنے میں ہاتھ منگول حملہ یا کسی مُلک کی بغاوت اس کی رکاوٹ بنی رہی تھی۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھا کہ ایک سلطان کی حیثیت سے اس کی پوزیشن کا فیصلہ اس امن و امان کے ذریعہ، یا

انصاف کے ذریعہ جیسا کہنا وہ زیادہ پسند کرتا تھا، ہوگا، جو وہ ملک کو دے گا۔ نظم و ضبط کے اعتبار سے بلبن کے لیے چار علاقے مشکلات کا باعث تھے۔ دہلی کے مضافات، دوآب، تجارتی راستے، خاص طور پر، اودھ کو جانے والی سڑک اور کٹیہر (روہیلکھنڈ) کے باغی۔ پہلے تین (علاقوں) میں پھیلی ہوئی بد نظمی اور بلبن کے ذریعہ کیے گئے اقدامات کی تفصیل برنی نے بڑی وضاحت سے بیان کی ہے:

”میں نے قابل اعتماد راویوں سے سنا ہے کہ سلطان بلبن نے اپنی حکومت کا پہلا سال اطراف دہلی کے جنگلوں کو کاٹنے اور میو،(Meo) لوگوں کو دبانے میں صرف کیا۔ وہ شہر سے باہر نکلا اور اپنے فوجی خیمے نصب کیے۔ اور میو لوگوں کے خاتمہ کو اہم ترین ریاستی مہم قرار دیا۔ التمش کے جانشینوں کی نااہلی اور سلطان ناصر الدین، جس نے بیس سال حکومت کی تھی، کی کمزوریوں کے باعث دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں ’میو‘ لوگ کافی طاقتور ہو گئے تھے۔ اور تعداد میں کافی بڑھ گئے تھے۔ وہ لوگ راتوں میں شہر کے اندر آجاتے اور دیواروں کو توڑ کر گھروں میں داخل ہو جاتے اور لوگوں کو طرح طرح سے پریشان کیا کرتے۔ دہلی کے عوام کی نیند میو لوگوں کے خوف سے حرام ہو چکی تھی۔ ان لوگوں نے دہلی کے قرب و جوار کے تمام مسافر خانوں کو بھی لوٹ لیا تھا۔ اور ٹھیک اسی طرح جیسے کہ میو لوگ تعداد میں کافی بڑھ گئے اور کافی جری ہو گئے اسی طرح دہلی کے اطراف میں بڑے اور گھنے درختوں والے جنگل اگ آتے تھے۔ [لہٰذا] دوآب اور ہندستان کے کناروں پر شرپسند دیدہ دلیری سے ڈاکے ڈالتے۔ تمام اطراف کی (دہلی آنے والی) سڑکیں بند ہو گئیں۔ اور قافلوں اور تاجروں کی آمد و رفت ناممکن ہو گئی۔ بالآخر جب لوگوں کے خوف سے شہر کے مغربی دروازے عصر کی نماز کے بعد بند کر دیئے جاتے اور کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اس وقت کے بعد خواہ مقدس مقبروں کی زیارت کے لیے یا سلطانی (شمسی) تالاب کے کنارے لطف اندوز ہونے کے لیے شہر سے قدم باہر نکال سکے۔ حتیٰ کہ نماز عصر سے قبل بھی وہ لوگ پانی لانے والوں اور ان غلام لڑکیوں کو جو تالاب سے پانی لانے کے لیے آتیں پریشان کرتے اور ان کے کپڑے اتار کر انھیں ننگا چھوڑ دیتے۔

بلبن نے صرف میو لوگوں کے خاتمے اور دہلی کے اطراف کے جنگلوں کی

صفائی کے لیے پورا سال وقف کر دیا۔ اس نے متعدد میووں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گوپال گیر میں اس نے ایک قلعہ بنایا اور وہاں بہت سے تھانے (فوجی چوکیاں) قایم کر دیں اور انھیں افغانوں کے حوالے کر دیا۔ ان اراضی کو (جو تھانے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے دی گئیں تھیں) ٹیکس سے بری کر دیا گیا۔ انھیں لڑائیوں میں سلطان کا ایک منظور نظر غلام، یک لاکھی، میولوگوں کے ذریعہ مارا گیا۔ سلطان کی تلوار نے بہت سے بندگان خدا کو میولوگوں کی ایذا رسانی اور غارتگری سے محفوظ کر دیا۔ اس وقت سے اب تک شہر دہلی میولوگوں سے محفوظ ہو گیا۔[1]"

میولوگوں کے کچلنے کے بعد سلطان دو آب کی جانب متوجہ ہوا۔ "دو آب کے شہر (قصبے) اور اس کے علاقے ان اقطاع داروں کو حوالے کر دیے گئے جو مناسب وسائل کے حامل تھے۔ بلبن نے یہ حکم نافذ کر دیا کہ سرکشوں کے دیہاتوں کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ ان کے مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی عورتوں اور بچوں پر بطور مال غنیمت قبضہ کر لیا جائے۔ اور جنگلوں کو مکمل طور پر کاٹ کر صاف کر دیا جائے۔ چند بڑے امرا اپنی بڑی فوجوں کے ساتھ اس مقصد کے لیے مستعد ہو گئے۔ انھوں نے سرکشوں کو نیست و نابود کر دیا۔ جنگلوں کو کاٹ ڈالا اور شر پسندوں کو ختم کر کے دو آب کی رعایا کو فرمانبردار اور مطیع بنا لیا۔

"برنی آگے لکھتا ہے":

دو آب مہم کو مکمل کرنے کے بعد ہندستان (اودھ) جانے والی سڑک کو کھولنے کے لیے بلبن دوبار شہر سے باہر آیا۔ وہ کمپل اور پٹیالہ آیا اور ان علاقوں میں پانچ یا چھ ماہ قیام کیا۔ اس نے بلا جھجک ڈاکوؤں اور باغیوں کو تہ تیغ کیا۔ اس طرح ہندستان جانے والا راستہ صاف ہو گیا۔ اور اب کارواں اور تجار مطمئن ہو کر آ جا سکتے تھے۔ اس علاقے سے بہت سے مال غنیمت دہلی لائے گئے اور یہاں غلام اور مویشی سستے ہو گئے۔ کمپل پٹیالہ اور بھوجپور میں جو ہندستان جانے والی سڑک پر ڈاکوؤں کے بڑے اڈے تھے، مضبوط قلعے اور بلند اور وسیع مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ سلطان نے مذکورہ بالا تینوں قلعوں کو افغانوں کے سپرد کر دیا اور قلعوں سے متصل قابل کاشت زمینوں کو ٹیکس

---

(1) برنی، ص 56

سے بری کر دیا گیا۔ ان افغانوں اور مسلمانوں کی وجہ سے جنھیں ٹیکس سے بری زمین مل گئی تھی وہاں کے (اس علاقہ کے) شہر اتنے مستحکم ہو گئے تھے کہ شاہراہ پر ڈکیتی اور مسافروں کی غارتگری کا مکمل طور پر انسداد ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک تین نسلیں (قرنیں) گزر چکی ہیں اور قلعوں کی تعمیر اور فوجی چوکیوں (تھانوں) کے استحکام کی وجہ سے ہندستان جانے والا راستہ ایک اچھی گزر گاہ بن گیا ہے اور ڈاکہ زنی کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس مہم کے دوران جلالی کا قلعہ بھی تعمیر کیا گیا اور اسے افغانوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح ڈاکوؤں کی کمین گاہیں فوجی چوکیوں میں بدل گئی ہیں۔ جلالی کی زمین کو بھی ٹیکس سے بری کر دیا گیا تھا۔ جلالی جو اس سے پہلے ان ڈاکہ زنوں کی کمین گاہ تھی، جو لوٹ مار کیا کرتے تھے اب مسلمانوں اور سڑکوں کے محافظوں کا وطن بن گیا۔ اور اس وقت سے اب تک یہ اسی حالت میں ہے۔

سلطان جس زمانہ میں ان مہمات میں مشغول تھا اسے اس بات کی برابر خبر دی جا رہی تھی کہ کٹیہر ے کے باغیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ”وہ لوگ رعایا کے گاؤں میں لوٹ مار کرتے اور آسے اجاڑ کر رکھ دیتے۔ ان لوگوں نے بدایوں اور امروہا کے علاقوں کو بھی ستایا۔ ان کی یہ گستاخی ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی۔ وہ لوگ اتنے زیادہ طاقتور ہو گئے تھے کہ بدایوں اور امروہا کے اقطاع داروں کے رعب ودبدبہ کا بھی لحاظ نہ کرتے۔ ان کی طاقت و قوت کی وجہ سے قرب وجوار کے اضلاع کے والی (حکمرانوں) نے بھی مداخلت کی ہمت نہ کی۔ بلبن نے فیصلہ کیا کہ کٹیہر کی سرزنش شاہی فوجیں ہی کر سکتی تھیں۔ کمپل اور پٹیالہ سے دہلی واپس آیا اور اس نے مرکزی فوج کے دستوں کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ اس نے ظاہر یہ کیا کہ وہ پہاڑی علاقوں (کوہ پایہ) میں شکار کھیلنے جائے گا۔ لیکن جب فوج تیار ہو گئی تو وہ کٹیہر کی طرف روانہ ہوا اور وہاں تین دن دو راتوں میں پہنچ گیا۔ برنی لکھتا ہے کہ شاید بلبن نے تمام مردوں کے قتل عام کا حکم دے دیا تھا۔ لیکن یہ بات مہمل ہے کیونکہ سلطان وہاں دیہاتیوں کی ان لوگوں سے حفاظت کے لیے گیا تھا جو انھیں لوٹ لیا کرتے تھے۔ بہر حال بلبن اس علاقہ میں چند دن رہا۔ شر پسندوں (مفردان) کے خون زمینوں پر بہہ نکلے۔ ہر گاؤں کے سامنے لاشوں کا انبار لگ گیا۔ اور سڑی ہوئی لاشوں کی عفونت دریائے گنگا کے

کنارے تک پہنچ گئی اس زمانہ سے لے کر جلال الدین کے دور حکومت کے آخیر تک کشمیر میں کسی باغی نے پھر سر نہ اٹھایا۔[1]

اس کے بعد بلبن خود پہاڑیوں (سالٹ رینج) کے دامن کی طرف روانہ ہوا اور وہاں کے باغیوں کی سرزنش کی۔ ان فوجی کاروائیوں کے نتیجہ میں اس نے اتنے گھوڑے حاصل کر لیے کہ ان کی قیمتیں بازار میں گر گئیں۔ اور ایک گھوڑا صرف تیس یا چالیس ٹنکوں میں خریدا جا سکتا تھا۔[2] اس طرح چند ہی سالوں میں سلطان نے تمام شورش زدہ علاقوں میں امن وامان کے حالات پیدا کر دیے اور تمام سرکش عناصر کو اپنے اقتدار کا مطیع بنا لیا۔

استحکام کو توسیع پر ترجیح

مملکت کے ہر حصہ میں جونہی نظم وضبط کا قیام عمل میں آ گیا بلبن کو اپنی انتظامی پالیسی کے لیے رہنما اصول کی حیثیت سے ”استحکام اور توسیع“ میں سے ایک کو چن لینا پڑا۔ گرچہ وہ بالکل ایک شہنشاہیت پسند تھا لیکن اس نے استحکام کی ایک پالیسی کو اپنانا پسند کیا۔ یہ فیصلہ حالات کے ایک حقیقت پسندانہ تجزیے پر مبنی تھا:

(1) مملکت کے خدود کے اندر ہندو سردار ایک ایسے موقعہ کی تاک میں تھے کہ دہلی سلطنت کی محکومی کا طوق اتار پھینکیں، ان کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنی تھی۔ اور انھیں دہلی کے کنٹرول اور فرمانروائی میں لانا تھا۔

(2) دہلی سے بیاس کی جتنی قربت میں منگولوں کی موجودگی ایک شدید اندیشہ کا باعث تھی کیونکہ اگر موثر روک تھام کی تدبیریں نہ کی جائیں تو طوفان کسی بھی لمحہ اٹھ سکتا تھا۔ جب اس کے جنرل عادل خاں اور تمر خاں نے اس کے سامنے گجرات، مالوہ اور ہندستان کے دوسرے صوبوں کو جو ایبک اور التتمش کی حکمرانی میں شامل تھے فتح کرنے کی تجویز پیش کی تو بلبن نے اپنی پالیسی اس طرح بیان کی:

”یہ ایک دانشمندی کی بات نہ ہوگی کہ شورشوں اور عدم تحفظ کے ان دنوں

---

(1) ایضاً، ص ص 55-59

(2) ایضاً، ص 60۔

میں دہلی چھوڑ کر دور کی مہمات پر روانہ ہوا جائے۔ جبکہ منگولوں نے اسلام کی تمام زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے اور لاہور کو تاراج کر دیا ہے۔ ہر سال ایک بار ہمارے ملک پر حملہ کرنا طے کر رکھا ہے.......... اگر میں راجدھانی سے باہر نکلوں گا تو یقیناً منگول اس موقعہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔ دہلی پر حملہ کر دیں گے اور دوآب کو پامال کر دیں گے۔ خود اپنی مملکت میں امن وامان قایم رکھنا اور اپنے اختیارات کو مستحکم بنانا اس بات سے زیادہ بہتر ہے کہ اس حالت میں جبکہ ہماری مملکت غیر محفوظ ہے۔ غیر ملکی مملکتوں پر حملہ کیا جائے۔ مزید یہ کہ نئے مفتوحہ علاقوں کے لیے باصلاحیت افسروں اور پورے طور پر مسلح فوجوں کی ضرورت ہو گی جنھیں میں اس موجودہ صورت حال میں [دوسرے کام کے لیے] فراہم کرنے سے قاصر ہوں۔ اس لیے میں نے یہ پورا ارادہ کر لیا ہے کہ مضبوط اور منظم فوجوں سے منگولوں کا مقابلہ کروں گا۔ لیکن اگر مجھے موقعہ ملا تو میں بے شک بقیہ ہندستان کو زیر نگیں کروں گا اور اپنی سلطنت کی سرحدوں کی توسیع کروں گا۔[1]

بلبن نے اپنی ساری طاقت ان علاقوں کے استحکام ہی میں لگادی جو پہلے ہی سے اس کے کنٹرول میں تھے۔ اور اس نے کبھی بھی اپنے شہنشاہیت پسندانہ خواہشات کو غلبہ حاصل کرنے کی اجازت نہ دی۔

نظریہ بادشاہی

بلبن غالباً دہلی کا واحد سلطان ہے جس کے بارے میں بتلایا جاتا ہے کہ اس نے بادشاہت کے سلسلہ میں بالتفصیل اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس نے سلطان کے اعلا عہدے کے متعلق اور بادشاہ کے فرائض کے متعلق کچھ کہنے کا کوئی بھی موقعہ اس نے کبھی نہیں کھویا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کرنا ضروری تھا تاکہ بادشاہ کو ایک بلند اور معزز کرسی پر فائز کیا جا سکے اور امرا کے ساتھ کشمکش اور مقابلے کے تمام امکانات کا خاتمہ کیا جا سکے۔ لیکن ان متواتر پند ونصائح کے پس منظر احساس کمتری اور مجرم ضمیر کا جو ضمیر کام کر رہا تھا اسے تاڑ جانا کسی کے لیے مشکل نہیں۔ اپنے ملکوں اور امرا، جو اس کے سابقہ شریک کار رہ چکے تھے، کے کانوں میں بار بار یہ بات

---

(1) ایضاً، ص ص 50-51

ڈال کر کہ بادشاہی ایک ایسی چیز ہے جو خدا کی جانب سے کسی کو ملتی ہے وہ چاہتا تھا کہ اپنے بادشاہ کے قاتل ہونے کے کلنک کو مٹا دے۔ اور ان کے ذہنوں میں یہ بات ڈال دے کہ یہ زہر کا پیالہ اور قاتل کا چاقو نہ تھا جو اسے تخت پر لایا بلکہ یہ خدا کی مرضی تھی۔ علاوہ ازیں منہاج اور برنی کے صفحات میں اس کی غلامی سے آزادی کے کسی حوالے کا نہ پایا جانا ایک اہمیت کا حامل ہے۔ غالباً وہ غلامی سے کبھی بھی آزاد نہیں کیا گیا۔ اور عوام پر حکومت کی اس بنیادی نااہلیت کو اس نے اپنے شاہی اختیارات کے "خدا کے تفویض" کے عیارانہ نقاب کے ذریعہ چھپانے کی کوشش کی۔

بلبن کے نظریہ بادشاہی کے خدوخال اور ہیولا ساسانی فارس سے ماخوذ تھا۔ جہاں بادشاہی کو بلند ترین ممکن مقام کا درجہ دیا گیا تھا۔ اور جہاں اس کے مافوق الفطرت اور خدائی کردار کو علی الاعلان قبول کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ صرف ساسانی شاہی خاندان کا ہی کوئی فرد تخت پر فائز ہو سکتا تھا۔ اس کی نگاہ میں ایران کے خیالی ہیرو ہی اس کے سیاسی نمونے تھے اور وہ حتیٰ الامکان ان کی تقلید کی کوشش کرتا۔ اس کے نظریہ بادشاہی کے بنیادی عناصر مندرجہ ذیل تھے:

(1) بادشاہی زمین پر خدا کی نیابت ہے (نیابت خدائی) اور اپنی عظمت میں رسالت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ بادشاہ خدا کا سایہ ہے (ظل اللہ) اور اس کا دل خدائی ہدایت اور نور کا مخزن ہے۔[1]

اپنی شاہی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اسے ہمیشہ خدا کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس تصور کا حقیقی منشا یہ تھا کہ ایک بادشاہ کے اختیارات کا سرچشمہ امرا یا عوام نہیں بلکہ صرف خدا ہے۔ لہٰذا اس کے کام عوامی جانچ پڑتال کا موضوع نہیں بن سکتے۔ اپنے خود مختارانہ اختیارات کے استعمال کو مقدس بنانے کے لیے یہ اس کا ایک شاطرانہ مذہبی آلہ کار تھا۔

(2) بادشاہی کے لیے ظاہری وقار اور عظمت کو ضروری قرار دیا گیا۔[2] بلبن اپنے پورے دور حکومت میں عوام سے بہت دور رہا اور اس پر اتنی سختی سے عمل پیرا رہا

---

(1) ایضاً، بلبن کے نظریہ بادشاہی کا لب لباب سلطان محمد (80-68) اور بغرا خاں (106-90) کو کی گئی اس کی نصیحت میں ملے گا۔

(2) ایضاً، ص 33-35۔

کہ اس نے عام لوگوں سے گفتگو کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔ دہلی کے ایک دولت مند فخر باونی نے دربار کے افسروں کو رشوت دی کہ وہ اس کے لیے سلطان کے ساتھ گفتگو کا ایک موقع فراہم کر دیں لیکن سلطان نے اپنے افسروں کی درخواست ٹھکرا دی۔[1]

(3) چونکہ وہ بادشاہی کی عظمت پر بہت زور دیتا تھا لہٰذا وہ آداب مجلس پر بھی بہت زور دیتا تھا۔ وہ دربار میں کبھی بھی اپنے پورے کروفر اور شاہی لباس کے بغیر نہیں آتا۔ خود اس کے خدمت گاروں نے بھی کبھی اسے شاہی لباس، موزے اور ٹوپی کے بغیر نہ دیکھا۔[2]

(4) اعلا نسل اور ادنا نسل کے لوگوں کے درمیان بلبن نے ہمیشہ امتیاز پر زور دیا۔ ادنا نسل کے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کے ربط و ضبط یا نظام حکومت کے کسی عہدہ پر ان کی تقرری کو وہ ایک حکمراں کی شان میں توہین سمجھتا تھا۔ اس نے تمام اعلا عہدوں سے ادنا نسل کے لوگوں کو برطرف کر دیا۔ اور ایک نو مسلم کمال مہیار کو امروہا کے متصرف کے عہدہ کے لیے منتخب کر لینے پر اس نے اپنے درباریوں کی سرزنش کی۔[3]

---

(1) ایضاً۔

(2) ایضاً، ص 33۔

(3) ایسے موقعوں پر بلبن کیسا برتاؤ کیا کرتا تھا اس کا ایک خاکہ برنی (ص ص 36-37) ہمیں دیتا ہے۔ جیسے ہی کمال مہیار نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ "ایک ہندو غلام کا لڑکا ہے" تو بلبن غصہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور دربار سے اٹھ کر اپنے خاص کمرہ میں چلا گیا۔ ہر شخص اس بات سے خوفزدہ تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے عادل خاں شمسی عجمی، تمر خاں، مالک الامرا فخر الدین کوتوال اور عماد الملک روات عرض کو شاہی حاضری کا حکم دیا گیا۔ ان لوگوں کے بعد پانچوں کارداران، علاؤ الدین کشلی خان نائب امیر حاجب، ملک نظام الدین بزغالہ، نائب وکیل در اور خاص حاجب عصامی - جو لوگ سفارش کرنے والوں میں سے تھے، انہیں بھی بلایا گیا اور بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ بلبن نے پہلے چار اعلا افسروں کو مخاطب کر کے کہا کہ "آج میں نے اپنے بھتیجے کشلی خاں اور نظام الدین بزغالہ کی ایک ایسی بات برداشت کی ہے جو میں اپنے باپ کی بھی برداشت نہ کرتا وہ یہ کہ یہ لوگ میرے پاس ایک غلام کے ادنا نسل کے لڑکے کو اس سفارش کے ساتھ لائے ہیں کہ اسے اس بنیاد پر امروہا کا خواجگی متعین کر دیا جائے کہ وہ دفتری کاموں کی اہلیت رکھتا ہے اور اس کے لائق ہے۔ اس کے بعد وہ عادل خاں اور تمر خاں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا "تم لوگ میرے پرانے دوست اور رفیق ہو اور تم لوگ اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ میں افراسیاب کا ایک خلف ہوں اور میرے اسلاف کے حسب و نسب کا پتہ اسی سے لگتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ خدا نے مجھے اس صفت کے ساتھ پیدا کیا (بقیہ صفحہ 399 پر)

کہا جاتا ہے کہ اس نے کہا کہ ”جب میں اتفاقاً“ کسی ادنا نسل کے کسی فرد کو دیکھ لیتا ہوں تو میرے جسم کی تمام رگیں اور نس نس غصہ سے پھڑکنے لگتی ہے۔[1]“

(5) نسبیات بلبن کا ایک خبط تھا، اس نے اپنا نسب شاہ نامہ فردوسی کے دیومالائی افراسیاب سے جوڑ رکھا تھا بڑے فخر اور گھمنڈ سے اس بات کا تذکرہ اپنے دربار میں کرتا[2]۔ سید اشرف جہانگیر اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ بلبن اپنے افسروں اور حکومت کے ملازمین کے خاندان کے سلسلہ میں بڑی گہرائی سے چھان بین کرتا تھا۔ ان لوگوں کے خاندانی درجہ کی تعین کے سلسلہ میں اس کی مدد کے لیے ملک کے ہر حصہ سے ماہرین حسب ونسب دہلی میں جمع ہو گئے تھے۔[3]

(بقیہ صفحہ 398) ہے کہ میں ذمہ داری اور اعتماد کے ایک سرکاری عہدے پر ایک ذلیل اور ناسل کے فرد کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا“۔

اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اقتدار، جب تک وہ قایم رہتا ہے، کبھی بھی مضحکہ خیز نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا اقتدار جو ایسی بنیادوں پر زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہتا۔

(1) ایضاً، ص 37-36، سید اشرف جہانگیر سمنائی (وفات 1405) اس افسر کا نام جس نے محمد مہیار کی سفارش کی تھی، دینے کے بعد کہا کہ یہ علم محاسبہ وہندسہ میں ماہر تھا اور اسے چندیری میں تقرری کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ (مکتوبات اشرفی، علی گڑھ مخطوطہ، ورق نمبر 67 الف)

بلبن کے نظریہ بادشاہی اور اعلا نسل اور ادنا نسل کے لوگوں کے متعلق اس کے خیالات کے سلسلہ میں ہمارے لیے معلومات کا واحد ذریعہ صرف برنی ہی ہے۔ عصامی اس موضوع پر ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ چونکہ خود برنی نسل کے متعلق بالکل ویسے ہی خیال رکھتا ہے لہٰذا یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس نے کس حد تک اپنے خیالات کو بلبن سے منسوب کر دیا ہے۔ یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اپنی کتاب فتویٰ جہانداری میں اس نے ان تمام خیالات کو اپنے خیالات کی حیثیت سے بیان کیا ہے (دی پولیٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت پروفیسر حبیب اور ڈاکٹر افسر، ایس خاں کا انگریزی ترجمہ ص ص 101-97 ملاحظہ ہو) اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا سکتا کہ ادنا نسل کے لوگوں کے ساتھ بلبن کے تحقیر آمیز سلوک کے متعلق برنی نے جو کچھ بیان کیا ہے حقیقتاً وہ اس کا غیر ترکوں کے ساتھ برتاؤ ہو جس کو برنی نے اس لیے توڑ مروڑ دیا ہو تاکہ اسے اپنے نظریہ نسل کے مطابق بنا سکے۔

(2) ایضاً، ص ص 39-37، افسران سیابی ترکوں کے لیے ملاحظہ ہو ریورٹی 10-900 حاشیہ، JARS، 1898 ص ص 467-502۔

(3) مکتوبات اشرفی (مخطوطہ) ورق نمبر 76 الف۔

(6) بلبن کا یقین تھا کہ ایرانی رسم و رواج اور طریقہ زندگی کو اپنائے بغیر بادشاہی ممکن نہیں۔ اپنی خاندانی اور عوامی زندگی میں ہر ہر قدم پر اس نے ایرانی روایات کی تقلید کی۔ اس نے اپنے ان لڑکوں کا نام جو اس کی تخت نشینی سے پہلے پیدا ہوئے تھے محمود اور محمد رکھا لیکن اپنے پوتوں کا نام جو اس کی تخت نشینی کے بعد پیدا ہوئے تھے فارسی بادشاہوں کے طرز پر کیقباد، کیخصر اور کیعاؤس رکھا۔

بلبن کی نگاہ میں عدالتی انتظام ایک بادشاہ کا سب سے پہلا فرض تھا[1]۔ یہ اس کی خود مختار حکومت کی نجات دہندہ خصوصیتوں میں سے ایک تھی اور اس چیز نے یقیناً عوام کی محبت اور خوشی حاصل کر لی ہو گی۔ جب کبھی عوام کے ساتھ بے انصافی اور ظلم کا کوئی معاملہ اس کے علم میں آتا تو وہ غضبناک ہو جاتا۔ اور اپنے افسروں کو ہی نہیں بلکہ اپنے رشتہ داروں کو بھی سزا دینے میں اسے کوئی تامل نہ ہوتا۔ مملکت کے مختلف حصوں کے شاہی افسروں کی سرگرمیوں سے اس کے برید (خبر رساں افسران) اسے ہمیشہ آگاہ رکھتے[2]۔ اگر مقامی افسروں کے کسی بھی ظلم و زیادتی کی خبر پہنچانے میں کوئی برید ناکام رہتا تو اسے ایک عبرتناک سزا دی جاتی۔ ایسے ہی ایک فرض سے غفلت کے سلسلہ میں بدایوں کے ایک برید کو پھانسی کی سزا دی گئی اور سولی پر اس کی لاش کی نمائش کی گئی[3]۔ مَلِک بق بق جو قیرابیگ کا باپ اور بدایوں کا اقطاع دار تھا اور ہیبت خاں جو ملک قیران کا باپ اور اودھ کا اقطاع دار تھا کے ساتھ بڑی سختی کا برتاؤ کیا گیا۔ پہلے کو قتل کر دیا گیا اور دوسرے کو مجبور کیا گیا کہ وہ ادنا خدمت گاروں کو مار ڈالنے کے عوض بیس ہزار ٹن کے دیت کے طور پر قتل کا جرمانہ یا بدلہ ادا کرے[4]۔

اگرچہ بلبن ان جھگڑوں کے سلسلہ میں، جو افراد سے متعلق ہوتے بڑا انصاف پسند تھا لیکن وہ عدل و انصاف سے متعلق اپنے تمام اصولوں پر ایسے موقعوں پر لات مار دیتا تھا جب کوئی ایسا معاملہ اس کے سامنے آئے جس میں ایک فرد ریاست کے خلاف

---

(1) برنی-40-41

(2) ایضاً، ص45۔

(3) ایضاً، ص40۔

(4) ایضاً، ص 41-410، قیرابیگ اور قیران دونوں ہی علاؤالدین خلجی کی ماتحتی میں ممتاز حیثیتوں کے مالک تھے۔

کھڑا ہو یا جہاں اس کے اپنے ذاتی اور خاندانی مفادات کا تعلق ہو۔ ایسے معاملات میں نہ تو وہ عدل و انصاف کا نہ مساوات کا اور نہ شریعت کا لحاظ کرتا اور نہایت دھاندلی سے عمل کرتا![1]

سیاسی اختیارات کے استعمال کے لیے بسا اوقات بلبن خلیفہ کی منظوری کی ضرورت کا ذکر کرتا تھا۔ وہ بغداد کے زوال اور خلیفہ کے انجام سے واقف تھا لیکن پھر بھی وہ سیاسی اختیارات کی منظوری کے لیے خلیفہ کی، بحیثیت مسلم سیاسی جماعت کے سربراہ، اجازت پر زور دیتا تھا۔ اس کے سکّوں پر مرحوم خلیفہ کا نام کندہ تھا، اور نمازوں کے خطبوں میں پڑھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی کا خیال ہے کہ "یہ مغل خاقانوں کو ایک چیلنج ہوتا کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ خلیفہ مر گیا ہے، [پھر بھی] خلیفہ زندہ باد"[2]۔

بلبن کا دربار

بلبن نے اپنے دربار کو ایرانی طرز پر منظم کیا تھا اور ساسانیوں کے مجلسی آداب اور رسم و رواج کی ہر ہر قدم پر اور چھوٹی سے چھوٹی بات میں تقلید کی تھی۔[3] سورج کی طرح اپنے تابناک چہرے اور کافور کی طرح اپنی چمکیلی داڑھی[4] کے ساتھ وہ

---

(1) ایضاً، ص 47 میں بلبن کے دور حکومت کے بیان کرنے والوں سے یہ بھی سنا ہے کہ اپنی سخاوت اور انصاف پروری اور نماز اور روزے کی کثرت کے باوجود جس کے بارے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے، باغیوں اور مخالفین کی سرزنش کے سلسلہ میں وہ بڑا بے رحم اور ظالم تھا۔ وہ بغاوت کے جرم میں پوری فوج اور پورا شہر تباہ کر دیتا۔ باغیوں کو سزا دینے کے سلسلہ میں ظالم حکمرانوں کی روایتوں سے ذرہ برابر احتراز نہ کرتا تھا۔ بادشاہی کی عظمت اور رعب و دبدبہ کو قایم کرنے کے لیے اس نے خدا کے خوف کے مطلق پرواہ نہ کی۔ دلیر و جری باغیوں کو مار ڈالنے اور ان پر سختی کرنے کے سلسلہ میں اس نے تمام مذہبی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر وہی کیا جسے اس نے اپنی چند روزہ بادشاہی کے لیے سود مند سمجھا۔ خواہ شریعت اس کی اجازت دیتی ہو یا نہیں۔ جب وہ باغیوں کو سزا دیتا تھا تو اس پر حب جاہ غالب ہو جاتا۔ ممکن ہے کہ بہت سے ان شمسی خانوں اور ملکوں کے شراب یا شربتوں میں اس نے خفیہ طور پر زہر ڈلوایا ہو جن کو وہ اپنی بادشاہت کا حصہ دار اور تخت کے لیے ایک خطرہ سمجھتا تھا لیکن جن کا علی الاعلان قتل اس کی بدنامی کا باعث ہوتا۔ اور اس کی عظمت اور وقار کو مجروح کر دیتا۔

(2) سم آسپیکٹس آف مسلم ایڈمنسٹریشن ان انڈیا، ص ص 36-37

(3) برنی، ص ص 25، 50۔ (4) ایضاً ص 30

عظیم ساسانی بادشاہوں کے طمطراق میں اپنے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتا۔ سولہویں صدی کا ایک مصنف فزونی استر آبادی لکھتا ہے کہ ”اس کا چہرہ لمبا تھا، اس کی داڑھی لمبی تھی اور ایک اونچا تاج پہنتا تھا۔ چنانچہ اس کی داڑھی کی نوک سے اس کے تاج کے اُوپری سرے تک کے لمبائی تقریباً ایک گز ہوتی تھی۔[1] دربار کی شان و شوکت اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں مجلسی آداب و دستور کی محتاط تقلید اس پر جلالی شخصیت کے رعب و داب میں اور اضافہ کر دیتی تھی۔ حاجبین، صلاح دار، جوش، نقیب وغیرہ وغیرہ اس کے چاروں طرف ساکت و جامد کھڑے ہوتے۔ سلطان ان تمام لوگوں سے جنہیں اس کے سامنے حاضر ہونے کا اعزاز حاصل ہوتا سجدہ اور پائے بوس (قدم بوسی) کراتا اس کی موجودگی میں مزاق یا آزادانہ گفتگو کی اجازت نہ تھی۔[2] صرف چند معتمد اور قابل بھروسہ مَلِک تخت کے پیچھے بیٹھتے دوسرے تمام لوگ اپنے درجہ اور مرتبہ کے مطابق اس کے سامنے کھڑے رہتے۔ سلطان اپنے اعلا عہدے کی عظمت کو اپنے رعب اور سنجیدگی سے برقرار رکھتا۔ کسی نے بھی اسے کبھی ہنستے ہوئے اور خوش دلی سے گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس کی زندگی میں ذاتی رنج و الم کے طوفان غیر متوقع غضبناکی کے ساتھ آئے اگرچہ انہوں نے اس کے اندر کے انسان کو مار ڈالا تھا لیکن سلطان کے نظام الاوقات میں خلل اندازی نہ کر سکے۔[3] اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک درباری آداب و شائستگی کا یہ دلدادہ ان سخت پروگراموں کی کئی چھوٹی سے چھوٹی بات پر عمل کرتا رہا جو اس نے اپنے لیے طے کیے تھے۔

جشن کے موقعوں پر دربار بڑا خوش نما منظر پیش کرتا۔ پھولدار قالینیں، ریشمی پردے، رنگ برنگے کپڑے، نقرئی اور طلائی ظروف دیکھنے والوں کی نظریں خیرہ کر دیتے۔ نقیبوں کی آواز دور دور تک چلی جاتی۔ برنی لکھتا ہے کہ ”ان تقریبات کے بعد لوگ کئی کئی دنوں تک دربار کی سج دھج کے متعلق گفتگو کرتے“۔ غیر ملکی سفراء جب اس کے دربار میں آتے تو چکا چوند اور سحر زدہ رہ جاتے۔ سلطان جب جلوس کے

---

(1) بوہیرا (مرزا امان اللہ کے پریس کی چھپی ہوئی، ایران، 1328ھ) ص 12۔

(2) برنی، ص 33۔

(3) ایضاً، ص 110۔

ساتھ نکلتا تو سیستانی سپاہی بے نیام تلوار لیے اس کے ساتھ ہوتے "چمکتا ہوا سورج، چمکتی اور دمکتی تلواریں اور اس کا روشن چہرہ سب مل کر ایک غیر معمولی منظر پیش کرتے" جیسے ہی شاہی گھوڑ سوار آگے بڑھتے "بسم اللہ، بسم اللہ" کی صدائیں فضا میں گونج اٹھتیں۔ طاقت، اقتدار اور عظمت کی اس نمائش نے، جو اس کے دماغ میں اس کے نظریہ بادشاہی کے ساتھ ایک جزلاینفک کی حیثیت سے بس گئی تھی، ملک کے سرکش ترین عناصر کو مطیع کر لیا۔ اور عوام کے دلوں میں رعب و دبدبہ کی لہر دوڑا دی۔

بلبن اور ترکی امرا

ترکی امراہی کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے بلبن ترکی حکمران طبقہ کی طاقت و قوت اور ان کی کمزوریوں سے واقف تھا۔ اس کی قوت کا انحصار ایسی طبقہ کی حمایت پر تھا۔ لیکن اسے تین باتوں سے بچنا تھا:

(الف) بادشاہ اور امرا کے درمیان کشمکش کی پرانی کہانی کا اعادہ۔

(ب) اس کی موت کے بعد بادشاہت کے لیے اس کے لڑکوں اور ترکی امرا کے درمیان مقابلہ۔

(ج) سرحدی علاقوں میں ترکی امراء کے اقتدار کی اجارہ داری، اس مقصد کے لیے اس نے جو طریقے اپنائے وہ ہندستان میں ترکی حکمراں طبقہ کے وسیع تر مفادات کے لیے قطعی تباہ کن ثابت ہوئے۔

(1) اس نے بڑی بے رحمی سے التتمش کے خاندان کے ہر فرد کو مار ڈالا۔

(2) اس نے ان تمام باصلاحیت ترکی امراء کو راہ سے ہٹانے کے لیے جو اس کے اخلاف کے مقابلہ پر آسکتے تھے زہر اور خنجر دونوں ہی کا آزادانہ استعمال کیا۔

(3) اس نے چالیس لوگوں کی اس جماعت پر (ترکان چہلگانی) جس سے اس کا خود تعلق تھا کاری ضرب لگائی اس کے اہم افراد کو مار ڈالا۔ اور اس کی جماعتی زندگی کو جو آپسی رقابت اور حسد کے باوجود غیر ترکی عناصر سے کشمکش کے اوقات میں بڑی کامیابی سے استعمال میں لائی جاسکتی تھی، بالکل تباہ کر دیا۔

(4) اس نے اپنے رشتہ داروں مثلاً شیر خاں کو، محض حسد کی بنیاد پر مار ڈالا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برنی کی دسترس منہاج کی طبقات ناصری تک نہ تھی [اس لیے] اس نے شیر خاں کو منگولوں کے خلاف ہندستانی سرحد کے ایک بہادر محافظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہ بات مہمل ہے۔ منہاج کسی ایسی جنگ کا حوالہ نہیں دیتا جس میں شیر خاں منگولوں سے لڑا ہو۔ اس سے بھی زیادہ گری ہوئی بات یہ ہوتی کہ وہ منگو قاآن کے پاس گیا تھا۔ منگولوں نے اسے کوئی فوری مدد نہ دی لیکن بالکل فطری طور پر اس بات کا شبہ تھا کہ اس نے خود کو ان کے ہاتھوں بیچ دیا ہے۔ بلبن جو اس وقت نائب مملکت تھا اس نے یہ صحیح فیصلہ کیا کہ شیر خاں پر سرحدی صوبے مثلاً اچھ اور ملتان کے سلسلہ میں بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کے بدلے اس نے اسے دہلی کے اطراف کے علاقے جہاں وہ مرکزی حکومت کے زیر نگرانی رہتا، دیدیئے۔ بلبن کی تخت نشینی کے وقت اور اس کے آئندہ چار پانچ برسوں تک شیر خاں دہلی نہ آیا۔ تب بلبن نے اسے زہر دلوادیا۔[1]

اپنے ذاتی اور خاندانی مفادات کے تحفظ کی فکر میں اس نے ترکی حکمراں کے طبقہ کے مفادات کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ اس نے اتنی بے دردی سے ترکی امراء کی صلاحیتوں کو پامال کر دیا کہ جب خلجی تخت کے لیے ان کے مد مقابل ہو کر میدان میں آئے تو وہ [ترکی امراء] بآسانی مات کھا گئے۔ ہندستان میں ترکی اقتدار کے زوال کے لیے بلبن کی ذمہ داری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے استحکام کے پروگرام نے بلاشبہ دہلی سلطنت کے قیام دوام کو تقویت پہنچائی اور خلجیوں کی ماتحتی میں سلطنت کی مزید توسیع کے لیے اس نے راستہ ہموار کر دیا۔ لیکن ترکی امرا کے ساتھ اس کے رویہ نے اسے لنج کر کے رکھ دیا اور اس کی زندگی کی مدت گھٹ گئی۔

فوج کی تنظیم نو

بلبن اپنے سیاسی تجربات کی بنا پر یہ جان چکا تھا کہ فوج حکومت کا اہم ستون ہے۔ لہٰذا اسے حکومت کے دوسرے شعبوں سے پہلے اس کی تنظیم نو کرنی تھی۔[2] التتمش نے جن روایات کو قایم کیا تھا انہیں نقصان پہنچتا تھا۔ اس لیے فوج کی ایک مکمل

---

(1) ایضاً، ص 65۔ (2) ایضاً ص-29

تنظیم نو کی ضرورت تھی۔

(1) بلبن نے فوجوں کی تعداد کے اعتبار سے فوج میں اضافہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں وفادار اور تجربہ کار افسروں کو اپنی فوج کے مرکزی دستوں (قلب اعلا) میں شامل کیا۔ ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔ اور ان کی تنخواہوں کے بدلے انہیں جاگیریں عطا کی گئیں۔[1]

(2) سپاہیوں کے مشاہروں میں اضافہ اور انہیں خوش اور مطمئن رکھنا بلبن کی عسکری پالیسی کا بنیادی حصہ تھا۔ اس نے اپنے لڑکے بغرا خاں کو مشورہ دیا کہ "فوج پر ہونے والے اخراجات کو زیادہ نہ سمجھو اور اپنے دیوان عرض (فوج کا نگراں) کو پرانے سپاہیوں کو قایم رکھنے اور نئے کی بھرتی اور اسے اپنے آپ کو اپنے شعبہ کے تمام اخراجات سے باخبر رہنے میں مصروف رہنے دو۔[2]"

(3) فوج کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے اس نے فوج کی متواتر ورزش کی ضرورت پر زور دیا۔ ہر سال موسم سرما میں صبح کے اول اوقات میں وہ شکار کے بہانے ریواڑی کی طرف جاتا اور اپنے ساتھ ایک ہزار گھوڑ سواروں اور ایک ہزار پاپیادہ فوج کو ساتھ لے جاتا۔ اور کافی رات گئے واپس آتا۔ یہ بات ہو سکتا ہے کہ صحیح ہو لیکن برنی نہایت احمقانہ طور پر مزید لکھتا ہے کہ بلبن نے جو کچھ کیا اس کی خبر ہلاکو کو مل گئی اور یہ کہ ہلاکو نے بلبن کی اس دور اندیشی کی تعریف کی اور اس تعریف پر بلبن خوش ہوا۔ یہ ایک افسوس ناک بات ہے کہ ہمارا تاریخ داں (ضیاالدین برنی) جو اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی تاریخ کی طرح ہزار برسوں سے کوئی تاریخ نہیں لکھی تھی، اس حقیقت سے ناواقف ہو کہ ہلاکو بلبن کی تخت نشینی سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ اس طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مہمل غلطی وہ اس وقت کرتا ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ ہلاکو (جو اس وقت مر چکا تھا) نے بلبن کے بھتیجے علاؤالدین کشلی خاں کو اپنی ملازمت میں شامل ہونے کی دعوت دی اور اس سے عراق کی نصف آمدنی کا وعدہ کیا۔[3]

---

(1) ایضاً، ص 29۔

(2) ایضاً، ص ص 2-101

(3) ایضاً، ص 55-114

(4) بلبن اپنی تمام مہمات کے مقصود کو سختی سے راز میں رکھتا اور کسی کو بھی پہلے سے اس کی نقل و حرکت اور منزل مقصود کی واقفیت نہ ہوتی۔ صرف اپنی روانگی سے پہلے والی شب میں وہ اہم مَلِکوں کو بلاتا اور انہیں اپنے مقصد سے آگاہ کرتا۔[1]

(5) جب اس کی فوجیں روانہ ہوتیں تو وہ اس بات پر خاص توجہ رکھتا تھا کہ غریب اور لاچار افراد کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ وہ خود اپنی فوج کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرتا رہتا اور دریاؤں، پلوں اور دلدلی علاقوں کو پار کرنے میں بوڑھے اور بیمار لوگوں کو ترجیح دیتا۔[2] اس طرح جہاں اس کی فوج باغیوں کے صفایا کے لیے ایک طاقتور ہتھیاروں کے طور پر استعمال ہوتی وہیں اس نے عوام کی خوشنودی بھی حاصل کرلی تھی۔

(6) بلبن نے فوج کی نگرانی کے لیے نہایت ایماندار اور مخلص لوگوں کو مامور کیا تھا۔

بلبن کا قاضی لشکر ایک دیانت دار اور ایماندار شخص تھا جس کی سلطان اور عوام عزت کرتے تھے۔ لیکن ہمیں اس کے بارے میں بہت کم ہی واقفیت ہے خوش قسمتی سے برنی ہمیں عماد الملک کی تھوڑی بہت تفصیل بتاتا ہے، جو شاعر امیر خسرو کا نانا تھا۔ عماد الملک جسے عموماً روات عرض کہا جاتا تھا، نے اپنی زندگی کا آغاز التمش کے ایک غلام افسر کی حیثیت سے کیا تھا اور تیزی سے ترقی کر کے عارض مملکت (وزیر جنگ) کے عہدہ پر پہنچ گیا۔ التمش کی موت کے بعد پریشان کن 30 سالوں کے دوران عماد الملک اسی عہدہ پر فائز رہا۔ بلبن نے تخت نشینی کے اس کے بعد کی توثیق کر دی۔ اپنی ایمانداری، دیانتداری اور وفاداری کی بدولت اسے اپنے آقا کا پورا اعتماد حاصل رہا۔ اسے وزیر کے مالی کنٹرول سے آزاد کر دیا گیا۔ بلبن کے دور حکومت میں فوجوں کی ترقی میں اس کا کچھ کم ہاتھ نہ تھا۔ اپنی وزارت کے افسروں کو وہ اپنی جیب سے انعامات دیا کرتا۔ اور ان کی فلاح و بہبودی میں انتہائی خلوص سے دلچسپی لیتا۔ بسا اوقات وہ اپنے دفتری عملہ کو مدعو کرتا اور ان سے درخواست کرتا کہ اقطاع داروں کے نمائندوں

---

(1) ایضاً، ص 60۔

(2) ایضاً، ص 45۔

سے رشوت نہ لیں۔ اور سپاہیوں کی تنخواہوں کے کسی حصہ میں خود برد نہ کریں۔[1]

(7) بلبن کے پاس ان ہی ایام سے جب وہ ایک خان تھا، ایک ہزار پر مشتمل سپاہیوں کا ایک پرانا اور تجربہ کار دستہ تھا، جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اگر وہ شکاری تفریحات کے لیے بھی نکلتا تو یہ سپاہی اس کے ساتھ ہوتے۔ برنی کہتا ہے کہ بلبن اس دستہ کے تمام سپاہیوں کو شکلاً پہچانتا تھا۔[2]

(8) بلبن بلا مقصد مہم جوئیوں کے خلاف تھا کسی فوجی مہم کے آغاز سے بہت پہلے ہی وہ اس کے متعلق غور و خوص کر لیتا۔ تمام انتظامات پہلے طے کر لیے جاتے تھے۔ اصل مقصد کو ظاہر کیے بغیر اور جنگ شروع ہونے کے ایک سال قبل ہی۔ دیوانِ وزارت اور دیوان ارض کو فوجوں کو تیار اور چوکس رکھنے کے لیے اور کارخانوں میں جنگی ساز و سامان کی تیاری کو تیز تر کرنے کے لیے حکم نامے جاری کر دیے جاتے۔[3]

دو آب کے اقطاعات کی ضبطی

فوج کی تنظیم نو کے لیے اپنے منصوبے کے تحت بلبن نے ان اقطاعات کی شرائط اور میعادات کے متعلق، جو ترکی سپاہیوں کے حوالے کیے گئے تھے تحقیقات کرانی شروع کی۔[4] التمش نے چھوٹے بڑے دونوں ہی طرح کے اقطاع تفویض کیے تھے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ، دو ہزار ترکی سپاہیوں کو، دو آب کے اقطات دیے گئے تھے۔ انہیں دینے کا دوہرا مقصد تھا۔ اوّل تو یہ کہ ترکی سپاہیوں کو ان خدمات کا جو انھوں نے ہندستان میں ترکی حکومت کے لیے انجام دی تھیں انعام دینا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ مملکت کے سب سے زیادہ خوشحال علاقے میں ترکی حکومت کے استحکام کے لیے ان

---

(1) ایضاً 16-114، برنی کے بیان سے ہمیں یہ تاثر حاصل ہوتا ہے کہ آفس کے عملہ کو اس کے خرچ پر دن کا کھانا دیا جاتا تھا۔ وہ وزیر پان کا بھی شوقین تھا برابر پان منگواتا رہتا تھا اور چونکہ خوش اخلاقی کا یہ مطالبہ تھا کہ جو اشخاص وزیر کے پاس معاملات طے کرانے کے لیے حاضر ہوں انہیں بھی پان پیش کیا جائے لہٰذا 50 یا 60 غلام پان تیار کرنے اور پیش کرنے میں لگے رہتے تھے۔

(2) ایضاً، 55۔

(3) ایضاً، 60۔

(4) ایضاً، ص 62 اخ۔

سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ ان جاگیروں کے ساتھ نہ تو کسی طرح کی کوئی انتظامی فرائض منسلک تھے اور نہ مرکزی مالیات کے سلسلہ میں ان کی کسی طرح کی کوئی مالی ذمہ داریاں ہی تھیں۔ ان چھوٹے اقطاع داروں کو بس اس بات کی اجازت تھی کہ وہ عسکری خدمت کے عوض زمین کے کسی حصہ کی لگان وصول کرلیں۔ اس نظام میں جو خطرات تھے انہیں انتظامی مشینری پر التتمش کے محتاط اور مستعد کنٹرول نے دور کردیا تھا۔ لیکن اس کی موت کے بعد جو طوائف الملوکی دور شروع ہوا تو پوری اقطاع مشینری ناکام ہو گئی اور اقطاع داروں نے مرکزی حکومت کی کھلم کھلانا فرمانی کا رویہ اختیار کرلیا۔ اقطاعات کا ادارہ جس کا قیام اس لیے ہوا تھا کہ وہ مرکزیت کی رفتار تیز کردے، اب وہ سیاسی اقتدار کو منتشر کرنے لگا اور مرکزیت پسند رجحانات کو درہم برہم کرنے لگا۔ یہ صورت حال بلبن کے مرکزیت پسند حکومت کے تصور کے موافق نہ تھی۔ لہٰذا اس نے ان اقطاعات کی شرائط و میعاد کی تحقیقات شروع کی، جو دو آب کے دو ہزار ترک سپاہیوں کو دیے گئے تھے۔ اس وقت تک بیشتر اصلی اقطاعدار مرچکے تھے اور جو زندہ تھے وہ اتنے بوڑھے اور کمزور وناتواں تھے کہ کسی طرح کی کوئی عسکری خدمت نہیں انجام دے سکتے تھے۔ دیوان ارض کی چشم پوشی سے انہوں نے اقطاعات پر اپنا قبضہ قایم رکھا اور اس پر اپنے موروثی حق کا دعوا کیا۔ بلبن کا خیال تھا کہ یہ اقطاعات عسکری خدمات کے عوض دیے گئے تھے لہٰذا جب ضامنوں نے اپنے فرائض کی ادائیگی ختم کردی تو جس بنیاد پر معاہدہ ہوا تھا وہ کالعدم ہوگیا۔ غالبًا اقطاع داروں کا ان اقطاعات پر موروثی حق کا دعوا سلجوقی روایات کی بنا پر تھا لیکن بلبن جو بہت سے دوسرے معاملات میں رہنمائی کی غرض سے سنجر کی طرف نگاہ اٹھاتا تھا اس نے اقطاعات کی منظوری کے معاملہ میں اس نظیر کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔

مکمل تحقیقات کے بعد ملکوں کو کچھ معاوضہ دیکر ان اقطاعات کی ضبطی کے لیے بلبن نے احکامات جاری کیے۔ ان بوڑھے اور کمزور سپاہیوں کے لیے بیس سے لے کر تیس ٹنکوں تک پنشن کے طور پر مقرر کردیا جبکہ ان لوگوں کو جو نوجوان تھے اور تندرست تھے مستقل فوج میں شامل کرلیا گیا اور انھیں نقد تنخواہیں دی جانے لگیں۔

---

(1) ایضاً، ص 62 الخ۔

فطری بات تھی اس حکم نامہ نے متعلقہ جاگیرداروں میں ایک بے کلی پیدا کر دی۔ کچھ ترکی سردار دہلی کے مشہور کوتوال ملک فخر الدین کے پاس شاہی حکم کی واپسی کے خیال سے پہنچے۔ وہ لوگ فخر الدین کے لیے تحائف بھی لائے تھے لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے انہیں قبول کرنے انکار کر دیا کہ ”اگر میں تمہاری رشوت قبول کر لوں گا تو میرے الفاظ میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا“ دربار جا کر وہ اپنی جگہ غمگین اور پژمردہ کھڑا ہو گیا۔ جب سلطان نے اس سے اس کی پریشانی کا سبب دریافت کیا تو اس نے یوں وضاحت کی ”میں نے سنا ہے کہ بوڑھے لوگ وزارت جنگ سے معزول کیے جا رہے ہیں۔ اگر بوڑھے لوگ خدا کی رحمت سے محروم کر دیے گئے تو میں قیامت کے دن اپنی قسمت کے بارے میں سوچ کر افسردہ ہو جاتا ہوں“ سلطان سمجھ گیا کہ فخر الدین کا کیا مطلب ہے اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے اور اس نے پورا حکم واپس لے لیا۔[1]

انتظامی اقدامات اور حکومت کی تنظیم

سلطان کی انتظامی کامیابیوں کو بیان کرتے ہوئے برنی کہتا ہے کہ ”قدرت نے بادشاہی کی قبا سلطان بلبن کے جسم پر سی دی تھی“[2] جب وہ تخت نشین ہوا تو ہر عہدیدار کھلم کھلا سرکش تھا اور پوری انتظامی مشینری بگڑی ہوئی تھی۔ اس نے اس کی ساری چولیں کسیں اور تمام حکام کو شاہی اقتدار کا وفادار اور مطیع بنا دیا۔

مشرق و مغرب میں عہد وسطیٰ کی بیشتر حکومتوں کی طرح بلبن کی حکومت بھی نیم دیوانی اور نیم فوجی تھی۔ ایسا عہد وسطیٰ کے جنگی حالات کی بنا پر تھا۔ کیونکہ حکومتی افسران اس وقت تک کام نہیں کر سکتے تھے جب تک وہ دیوانی اور عسکری صلاحیتوں کو مجتمع نہ کر لیں۔ جدید سائنسی ترقی کی وجہ سے آج کل فوجی تربیت ایک مخصوص موضوع بن گئی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں تلوار اور قلم اٹھانے کی تعلیم اکثر ایک ہی ساتھ دی جاتی تھی۔

بلبن نے فولادی ہاتھوں سے ان تمام انتشاری رجحانات کو روک دیا جو سیاسی

---

(1) ڈاکٹر حبیب اللہ کہتے ہیں کہ صرف بوڑھے اقطاع داروں سے متعلق حکم منسوخ کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بقیہ حصہ کا نفاذ کیا گیا (فاؤنڈیشن Foundation، نیا ایڈیشن، ص 166) لیکن برنی کا بیان بالکل صاف ہے کہ ”تمام اقطاع داروں کے حقوق ویسے ہی باقی رہے جیسے وہ تھے“ (ص 64)۔

(2) برنی، ص 32۔

زندگی کے ہر حصہ پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ سیاسی اختیارات کی مرکزیت پر یقین رکھتا۔ بیشتر سرکاری تقرریاں بلا واسطہ وہ خود کرتا یا اس کی اجازت سے کی جاتیں۔ یہ بات کے امروہہ[1] کی ایک معمولی سی تقرری نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ پوری سرکاری مشینری پر سخت نگاہ رکھتا تھا۔ سرحدی صوبے، ملتان اور لکھناوتی، کی پوزیشن نازک ہونے کی وجہ سے اس نے بالآخر ان علاقوں کے گورنروں کی حیثیت سے اپنے لڑکوں کی تقرری کی۔ بلبن اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ کسی امیر یا افسر کو اس بات کا موقعہ دے کہ وہ مملکت کے کسی زور اثر علاقہ میں اپنی پوزیشن مستحکم کرلے۔ اور طغرل خاں کی طرح پریشانیوں کا باعث بن جائے۔ اگر مغربی سرحدی علاقوں کی گورنری کو تخت شاہی کی جانب ایک زینہ بننا ہی تھا تو صرف اس کا بڑا لڑکا ہی اس علاقہ کا ذمہ دار بنایا جائے گا۔

چونکہ بلبن خود ایک بار بادشاہ کے اختیارات کی تخفیف کے لیے ایک قانونی ادارہ- مثلاً نائب مملکت- بنانے میں معاون رہ چکا تھا لہٰذا وہ اس بات کا خیال رکھتا کہ کسی افسر کے ہاتھوں میں بہت سارے اختیارات نہ جمع ہو جائیں۔ اس نے وزیر کے ہاتھوں سے عسکری اور مالی اختیارات لے کر اس کی پوزیشن گھٹا دی۔ خواجہ حسن کی ایک وزیر کی حیثیت سے تقرری محکمہ وزارت کے سلسلہ میں اس کے رویہ کو ظاہر کرتی ہے۔ اور اس بات کا اظہار ہے کہ ایک وزیر سے کس قسم کے کاموں کی انجام دہی کی توقع رکھی گئی تھی۔ مالی اور عسکری اختیارات کی علاحدگی کی وجہ سے حکومت کے کسی بھی عہدیدار کے ذریعہ اقتدار کے غضب کیے جانے کے مواقع بالکل ختم ہو گئے تھے۔

بلبن نے محسوس کیا کہ ایک خود مختار حکومت کو بہتر طریقے پر چلانے کے لیے ایک معقول اور قابل اعتماد جاسوسی نظام کی خدمات کی ضرورت ہے۔ اس کے خفیہ مخبر اسے سلطنت کے ہر حصے میں ہونے والے واقعات سے پورے طور پر با

---

(1) ایضاً، ص 36۔

خبر رکھتے۔ جاسوسی اس کے بیٹوں[1]، رشتہ داروں، صوبائی گورنروں، فوجی افسروں، حکومتی ملازمین اور عوام کی سرگرمیوں کی نگرانی کرتے رہتے اور اس کی اطلاع پہنچاتے۔ بلبن نے بریدوں (مخبر افسروں) کی تقرری کے سلسلہ میں خاص توجہ دی۔ برید کی حیثیت سے کسی فرد کی تقرری اس کے کردار، دیانتداری اور حسب و نسب کی مکمل چھان بین کے بعد ہی ہوا کرتی۔[2] عوام میں بددلی اور عدم اعتماد پیدا کیے بغیر، بریدوں، جن کو بحیثیت افسران عوام جانتے تھے، اور خفیہ جاسوسوں کو برقرار رکھنا سلطان کی جانب سے غایت احتیاط اور ہوشیاری کا متقاضی تھا۔ اس سلسلہ میں بلبن نے اپنے بیٹوں کو اس طرح مشورہ دیا: "مخبروں اور جاسوسوں کو کہیں بھی دربار کے قریب آنے کی اجازت نہ دی جانی چاہیے۔ کیونکہ حکمراں سے ان کی قربت مطیع اور قابل اعتماد دوستوں کو خوف زدہ کر دیتی ہے اور بادشاہ پر سے ان کا اعتماد- جو اچھی حکومت کی بنیاد ہے- ختم ہو جاتا ہے۔"

اپنے بیٹوں کے ساتھ اس کی دو لمبی گفتگوؤں سے، جسے برنی نے بڑی تفصیل سے نقل کیا ہے، بلبن کے سیاسی نظریے اور انتظامی اصولوں کو اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ان نصائح سے مندرجہ ذیل اصول ظاہر ہوتے ہیں:-

(1) حکومت کو تحفظاتی قوانین نافذ کرنا چاہیے اور طاقتوروں کے ظلم و ستم سے کمزروں کے مفادات کی حفاظت کرنی چاہیے۔

(2) اعتدال حکومت کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اور عوام کے ساتھ معاملات میں نہ تو سختی ہی ہونی چاہیے اور نا ہی نرمی۔ ٹیکس نہ تو اتنے زیادہ ہوں کہ وہ عوام کو غریب اور لاچار بنا کر رکھ دیں اور نہ اتنا ہی کم کہ وہ سرکش اور گستاخ ہو جائیں۔

(3) حکومت کو اس بات کی نگرانی رکھنی چاہیے کہ عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مناسب [مقدار میں] غلہ پیدا کیا جائے۔

(4) حکومت کے احکامات سختی سے نافذ کیے جائیں اور حکومت کے فیصلوں

---

(1) ایضاً، ص 81۔

(2) ایضاً، ص 40۔

میں بار بار تبدیلی نہ ہو۔

(5) ریاست کی مالیات کی مناسب منصوبہ بندی اور انتظام وانصرام ہو۔ سالانہ آمدنی کا صرف نصف خرچ کیا جائے اور بقیہ نصف کو ہنگامی حالات کے لیے رکھ چھوڑا جائے۔

(6) حکومت کو کوشش کرنی چاہیے کہ تاجرین پھولیں پھلیں اور مطمئن رہیں۔

(7) فوجیوں کی تنخواہیں پابندی سے ادا کی جائیں اور فوج کو خوش اور آسودہ رکھا جائے۔ انہیں بنیادی اصولوں کے ڈھانچہ پر بلبن نے ایک مضبوط اور بہتر انتظامیہ کی تشکیل کی اور عوام کو امن اور انصاف، دیا جس کی وہ برسوں سے آرزو کرتے آئے تھے۔ سلطان کے متعلق برنی کا جائزہ کسی شخص کے دماغ پر اس حقیقت کا ایک واضح اثر چھوڑتا ہے کہ جہاں بلبن کا برتاؤ ان ملکوں اور امرا کے ساتھ جن کے ساتھ اور جن کے درمیان سے وہ ابھرا تھا، سختی اور درشتگی کا تھا وہیں عوام کے ساتھ اس کا برتاؤ نہایت مشفقانہ اور محتاط تھا۔ اس نے عوام کی بھلائی -ادنا نسل کے لوگوں کو حقیر سمجھنے کے باوجود- کے لیے پدرانہ [لگاؤ] تعلق کا مظاہرہ کیا۔

لکھناوتی میں طغرل کی بغاوت

بلبن کی فوج اپنے سیستانی اور ترکی سپاہیوں کی وجہ سے شان و شوکت کا ایک بہترین نمونہ تھی لیکن ہندستانیوں کی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، اس کی فوج میں ترقی کی کوئی گنجائش نہ تھی اور اس کے افسروں کی بھرتی عموماً عوام میں سے نہیں کی جاتی تھی۔ کیا وہ کسی عسکری آزمائش کا مقابلہ کر سکے گی؟ مشرق و مغرب دونوں ہی جگہ اسے اس آزمائش سے دوچار ہونا پڑا۔ التتمش اور اس کے بیٹے شہزادہ ناصرالدین کو بنگال کے حکمرانوں اور گورنروں کی بغاوت کو کچلنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن جب بلبن، اس کے افسران اور اس کی فوج اسی مسئلہ سے دوچار ہوئے تو انہوں نے اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر نااہل اور ناکارہ ثابت کیا۔ انہوں نے جنگ جیتی ضرور مگر چھ سے کچھ زائد ہی سالوں کے بعد اور وہ بھی محض اپنی کثرت تعداد کی بنا پر۔ مغرب میں پوزیشن مختلف تھی۔ ان تمام تدابیر واحتیاط کے باوجود، جو بلبن نے اپنی فوج کے لیے کی

تھیں اس کا بیٹا اور اس کے افسران ایک منگول سرحدی افسر کے سامنے ڈھیر ہو کر رہ گئے۔

برنی، جو ایران کے حالات سے بالکل ناواقف تھا، اس انداز سے گفتگو کرتا ہے گویا اس وقت ہلاکو بھی زندہ تھا اور وہ (یا اس کے جانشین) سلطنت دہلی کے وجود کے لیے ایک خطرہ تھے۔ یہ ایک مہمل بات ہے۔ ایرانی تواریخ اس بات کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ مصریوں اور جوجی کلاں کا منگول سردار، جو مسلمان ہو گیا تھا، کے ہاتھوں شکست کے بعد ہلاکو کا اقتدار مکمل طور پر پاش پاش ہو چکا تھا۔ چونکہ منگولوں نے شمالی ایران خاص طور پر جنوبی کاسپین کے نہایت زرخیز علاقوں کے بیشتر باشندوں کا قتل عام کر دیا تھا لہٰذا ہلاکو کے جانشینوں کے، جنھیں اِل خاں کہا جاتا تھا، ذرائع آمدنی نہایت ناکافی ہو گئے تھے۔ وہ لوگ کبھی بھی اپنے بجٹ کو متوازن نہ کر سکے۔ اور ان کی کوششوں کے باوجود مصریوں نے انھیں شام سے کھدیڑ دیا۔ ایسے حالات میں اِل خانی سرحدی صوبوں کے گورنر پڑوسی ملکوں کو لوٹ مار کر کے ہی اپنی گزر اوقات کر سکتے تھے۔ بذات خود دہلی کبھی بھی خطرہ میں نہ رہا۔ جب تک کہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں داوا قائدو مملکت کا قیام عمل میں نہ آیا۔ بلا شبہ اِل خانی افسران ان جرنلوں کی نسبت جو ہندستان میں ترکی غلام افسران کی گھٹتی ہوئی تعداد میں سے بھرتی کیے گئے تھے۔ فن حرب اور عسکری تدابیر کے زیادہ کارگر تصورات کے حامل تھے۔ بلبن کے دور حکومت کے دو عسکری واقعات کے سلسلہ میں حقائق کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

ارسلان خاں کا بیٹا، تاتار خاں، جو لکھناؤتی کا گورنر تھا، نے بلبن کو اس کی تخت نشینی کے سال ہی 63 ہاتھی بھیجے تھے۔ طغرل جو لکھناؤتی کے گورنر کی حیثیت سے تاتار خاں کا جانشین ہوا۔ بلبن ایک غلام تھا۔[1] وہ اپنی چالاکی، ہمت، سخاوت اور مستعدی میں مشہور تھا۔ عصامی کے مطابق طغرل نے بلبن کے دور حکومت کے آٹھویں سال (1275ء) سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ غالباً یہ سلطان کے ایک غلام کی پہلی بڑی بغاوت تھی۔ دوسری تمام باتوں کے علاوہ، یہ [واقعہ] پورے نظام [غلامی] میں دراڑ پڑ جانے کی ایک علامت تھا۔ اگر کوئی غلام کامیابی کے ساتھ بغاوت کر سکتا تھا تو پورا شاہی

---

(1) برنی، طغرل کی بغاوت، ص ص 81-92، برنی کہتا ہے کہ طغرل نے بلبن کے دور حکومت کے پندرہویں یا سولہویں سال بغاوت کی۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ بلبن نے صرف بیس سال حکومت کی۔

ترکی نظام غلامی بالکل بیکار ثابت ہو جاتا۔

جو چیز طغرل کے لیے اس کے سرکشی ارادوں میں حوصلہ افزا ثابت ہوئی وہ اس کی جاج نگر کی کامیاب مہم تھی۔ وہاں سے اسے کافی مقدار میں خزانے اور بہت سے ہاتھی حاصل ہوئے تھے اور اس نے انہیں اپنے استعمال میں لایا۔ اس نے سلطان کو یہ سوچ کر کچھ نہ بھیجا کہ وہ کافی بوڑھا ہو گیا ہے اور منگول کے مسئلہ میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ وہ اس کی سرزنش نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنے آپ کو "سلطان مغیث الدین" کے خطاب کے ساتھ لکھناؤتی کا بادشاہ کا اعلان کرادیا اور خود مختاری کی تمام علامتیں بھی اپنا لیں، جس میں ریاست کا چھتر، خطبہ اور سکوں کا اجراء بھی شامل تھا، اس کی سخاوت نے عوام کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اور وہ لوگ بلبن کے غیظ و غضب اور بے رحمی کو بھول گئے۔

بغاوت کی اطلاع ایک حیرت اور ایک قلبی صدمہ بن کر بلبن کو پہنچی۔ اس خبر سے وہ اتنا زیادہ مضطرب ہو گیا کہ نہ وہ کھا پی سکا اور نا ہی رات میں سو سکا۔ اس نے فوراً اودھ کے گورنر ملک ایتگین موئے دراز[1] (لمبے بال والا) جس کا خطاب امین خاں تھا، کو ایک بڑی فوج اور دیگر تجربہ کار مَلِکوں اور امراء مثلاً تمر خاں شمسی اور قتلغ خاں شمسی کا بیٹا ملک تاج الدین کے ساتھ لکھناؤتی روانہ کیا۔ امین خاں نے جیسے ہی دریائے سرجو (موجودہ گھاگھرا) پار کیا طغرل نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے دی۔ مزید یہ کہ طغرل نے وافر عطیات و تحائف کے ذریعہ بلبن کی فوج کے بہت سے امراء اور سپاہیوں کو اپنی جانب ملالیا۔ اپنی واپسی پر شاہی فوج ہندو قبائل کے ذریعہ ستائی گئی اور لوٹ لی گئی۔ بلبن، امین خان کی کارکردگی پر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے امین خاں کو مار ڈالنے کا اور اس کی لاش کو اودھ کے پھاٹک پر لٹکائے جانے کا حکم دیا۔ برنی کہتا ہے کہ "اس پھانسی سے عوام میں نفرت و بیزاری پھیل گئی اور لوگوں نے اسے بلبن کے اقتدار کی تباہی کا آغاز سمجھ لیا"۔

اپنے سابقہ غلام کے ہاتھوں اپنی فوج کی شکست پر بلبن کے غم و غصہ کا ٹھکانہ نہ

---

(1) موئے دراز کا حوالہ منہاج ان افسروں کے درمیان دیتا ہے جن کی تقرری اس وقت ہوئی تھی جب الغ خاں نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ عصامی بھی انہیں حقائق کو پیش کرتا ہے لیکن اسے 'ترامتی' کے نام سے پکارتا ہے اور بتاتا ہے کہ 'ترامتی' کا مطلب بہادر ہوتا ہے۔

رہا۔ اودھ کے گورنر اور اس کی فوج کی ناکامی کے بعد بلبن نے طغرل کو کچلنے کی ذمہ داری دہلی کی ایک [دوسری] فوج کے سپرد کی جس کی قیادت اس نے اپنے ایک چیدہ افسر 'بہادر' کے حوالہ کی۔ اس کے بعد جو جنگ ہوئی اس میں طغرل خاں نے براہ راست بہادر کے قلب لشکر پر وار کیا۔ بہادر دلیری سے لڑا لیکن شاہی فوج کے کچھ دستے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس نظیر نے وبائی شکل اختیار کر لی۔ جب بہادر اپنے بھگوڑے سپاہیوں کے ساتھ دہلی پہنچا تو بلبن نے چاہا کہ اسے قتل کر دے لیکن میدان جنگ میں اس کی بہادری کا ثبوت پیش کر کے بہادر کے دوست اس کی زندگی کو بچانے میں کامیاب ہو گئے اور بلبن صرف اس بات پر مطمئن ہو گیا کہ اسے دربار میں حاضری سے منع کر دے۔[1]

دو جنرل، امین خاں اور بہادر طغرل کے ہاتھوں شکست کھا چکے تھے۔ اس بات نے بلبن کو سخت تشویش میں ڈال دیا۔ امراء کی شکست پر وہ اپنے بوڑھے بازوؤں کو غصہ میں ہوا میں لہراتا۔ اس کی زندگی اجیرن بن گئی اور اس نے ان شکستوں کو اپنے وقار کے لیے ایک زبردست دھچکا شمار کیا۔ لہٰذا 680ھ (1280-81ء) میں اس نے بذات خود طغرل سے نمٹنے کے لیے روانگی کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس نے اس دور کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے دہلی اور اس کے اطراف کی علاقوں کے معاملات قابل بھروسہ لوگوں کے سپرد کرنا چاہا۔ سب سے پہلے وہ سنام اور سامانہ گیا۔ یہ دونوں صوبے اس کے دوسرے بیٹے محمود بغرا خاں کے اختیار میں تھے۔ بلبن نے ان دو صوبوں کو عسکری امراء کی ماتحتی میں دے کر چھوٹے چھوٹے خطوں میں بانٹ دیا اور سنام[2] کا مکمل اختیار اس نے ملک سونج کے سپرد کیا، جو سر جندار تھا۔ سامانہ بلبن کے بڑے لڑکے سلطان محمد کو قاآن ملک کے لقب کے ساتھ، حوالہ کیا گیا، جس کو اس نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ سلطان محمد پہلے کوئل اور دوسرے علاقوں کا ذمہ دار تھا۔ لیکن بعد میں بہت سارے افسروں کے ساتھ جنہیں بلبن باصلاحیت و لائق سمجھتا تھا اسے پورے سندھ کا

---

(1) اس مہم کے سلسلہ میں برنی کی یادداشت کمزور ہے لیکن عصامی نے اس پر دو صفحے لکھے ہیں۔
(ص ص 161-63)

(2) نوٹ: برنی ص: 85 کے مطابق یہاں 'سامانہ' ہونا چاہیئے نہ کہ سنام --- مترجم

ذمہ دار بنا دیا گیا۔

اس کے بعد بلبن دہلی واپس ہوئے بغیر دو آب کی جانب بڑھا۔ اس نے سلطان محمد کو خط لکھ کر سندھ کے ساتھ ساتھ سامانہ کی فوج بھی اس کے حوالہ کر دی اور اسے بھرپور کوششوں سے منگول خطرے کے مقابلہ کی تاکید کی۔ اس نے دہلی کے کوتوال ملک الامراء فخر الدین کو بھی خط لکھا اور اسے نائب غیبت (غیر حاضری میں قایم مقام) مقرر کر دیا۔ اسے حتی الامکان سلطان کو باخبر رکھنا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا اختیار تھا کہ شاہی منظوری کا انتظار کیے بغیر اپنی صواب دید پر ریاستی معاملات کے سلسلہ میں ہر طرح کے احکامات جاری کر سکتا ہے۔ اس کے بعد بغرا خاں کو اپنے ساتھ لے کر موسم برسات کی پرواہ کیے بغیر، بلبن مشرقی سمت میں روانہ ہو گیا۔ ”اودھ پہنچ کر اس نے دو لاکھ آدمیوں کی عام بھرتی کا حکم جاری کیا۔ گھوڑ سواروں، پیادہ سپاہی، پائک، تیر انداز، کہار، کیوانی (کمان والے) خچر سوار، تیر پھینکنے والے، غلام، ملازمین، تاجرین، اور دوکانداروں کا نام رجسٹر میں درج کیا گیا“ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے شاہی فوج کو دس یا بارہ دن مختلف مقاموں پر ٹھہرنا پڑا۔ طغرل نے حاجی نگر بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔ جو سنار گاؤں (موجودہ ڈھاکہ کے قریب) سے کئی منزل مشرق میں ایک جگہ ہے لیکن اس نے یہ اعلان کر دیا کہ بلبن کے دہلی لوٹ جانے کے بعد وہ واپس آکر دوبارہ لکھناؤتی پر قبضہ کرے گا۔

بلبن لکھناؤتی پہنچا اور اپنی فوجوں کو پھر سے مسلح کرنے کے لیے وہاں چند دن ٹھہرا اس نے سپہ سالار حسام الدین کو (مورخ برنی کا نانا[1]) جو ملک باربیک بیکتار کا وکیل دار رہ چکا تھا، لکھناؤتی میں شحنا کے عہدہ پر مقرر کیا۔ اور اسے ہدایت دی کہ وہ دہلی سے موصول ہونے والے تمام کاغذات کو ہفتہ میں تین یا چار بار سلطان کے پاس ارسال کرے۔ چند دن مسلسل سفر کرنے کے بعد سلطان سنار گاؤں پہنچا۔ سنار گاؤں کا رائے، دھنوج رائے اس سے ملنے آیا۔ سلطان نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ طغرل کو، گرفتار کر لے گا خواہ وہ سمندر کے راستے فرار ہونا چاہے، یا خشکی کے راستے۔ بلبن چوں کہ طغرل

---

(1) نوٹ: برنی 87، جد مادر ایں مولف، لکھا ہے لہٰذا انگریزی متن میں- Grand Father of historian کی جگہ great-grand father ہونا چاہیے تھا- مترجم

کے اصل منصوبہ سے واقف نہ تھا لہٰذا اس نے شاید یہ خیال کیا کہ طغرل ذاتی تحفظ کی خاطر سمندر پار بھاگے گا۔ پھر بھی بلبن مسلسل سفر کر کے مشرق کی سمت بڑھا۔ یہاں تک کہ حاجی نگر سے 60 کروہ (120 میل) کے فاصلہ پر پہنچ گیا۔ لیکن طغرل کا کوئی نشان نہ ملا۔ چونکہ اصل فوج آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی لہٰذا بلبن نے ملک بیکتار کو ہدایت دی کہ وہ مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے دس یا بارہ کروہ آگے چلے۔ مقدمۃ الجیش نے کچھ لوگوں کو ترجمانوں کے ذریعہ طغرل کا پتہ لگانے بھیجا۔ بالآخر، ایک ایک پارٹی نے جو، ملک محمد شیر انداز اور دوسرے لوگوں کی ماتحتی میں بھیجی گئی تھی، چند غلے کے تاجروں کے پاس آئے اور ان سے طغرل کا پتہ پوچھا۔ ان لوگوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ چنانچہ ملک شیر انداز نے ان کے دلوں میں دہشت پیدا کرنے کے لیے ان میں سے دو کا سر قلم کر دیا۔ تب ان لوگوں نے بتلایا کہ طغرل کا کیمپ اس جگہ سے صرف نصف فرسنگ (تقریباً ایک میل) پر ہے۔ اور آج اس نے ایک 'سنگی حوض' کے کنارے ڈیرا ڈالا ہے اور کل حاجی پور کی مملکت میں پہنچ جائے گا۔ شیر انداز نے یہ خبر فوراً ملک باربیک بیکتار کو پہنچائی۔

اس وقت طغرل کی فوج آرام کر رہی تھی۔ گھوڑے اور ہاتھی سبزہ زاروں میں چر رہے تھے۔ اور غلط احساس تحفظ کی بنیاد پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہرے دار متعین نہیں کیے گئے تھے۔ وقت ضائع کیے بغیر شیر انداز تیزی سے کیمپ پر ٹوٹ پڑا اور چیخ کر طغرل کو پکارا۔ طغرل اس اچانک افتاد اور چیخ کے اندر پائے جانے والے اعتماد کی وجہ سے خوفزدہ ہو گیا۔ لہٰذا انتہائی گھبراہٹ میں وہ اپنے غسل خانہ سے چپکے سے نکلا اور ایک بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر قریبی دریا کی جانب تیزی سے بھاگا۔ ملک مقدر اور علی نامی ایک افسر نے اس کا تعاقب کیا۔ قریب قریب طغرل دریا تک پہنچ چکا تھا کہ علی نے اسے ایک چھوٹی جنگلی کلہاڑی سے مارا اور اسے گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ ملک مقدر فوراً اپنے گھوڑے سے اترا اور اس کا سر کاٹ کر اس کے جسم کو دریا میں پھینک دیا۔ چونکہ طغرل کے سپاہی اس کو تلاش کر رہے تھے لہٰذا ملک اس کے سر کو دریا کے کنارے نرم مٹی میں دفن کر دیا اور اپنا کپڑا دھونے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد باربیک بیکتار آ گیا اور طغرل کا سر سلطان کے پاس بھیج دیا گیا۔ جب مقدر تفصیلی رپورٹ دینے سلطان کے پاس پہنچا تو

پہلے تو سلطان اس پر برہم ہوا کہ ملک محمد شیر انداز اور اس کی پارٹی نے یہ جوکھم [خود پر] کیوں مول لیا۔ لیکن چوں کہ سب کچھ ٹھیک ہی ہوا تھا اس لیے سلطان نے ان لوگوں کے مراتب بلند کر دیے جو اس مہم میں شریک ہوئے تھے۔ علی "طغرل کش" (طغرل کا قاتل) کا خطاب دیا گیا ار اسے اور ملک مقدر کو مساوی انعام دیا گیا۔[1]

جب بلبن لکھناؤتی واپس آیا تو اس نے بازار کے دونوں اطراف میں دو میل سے زیادہ فاصلے تک پھانسی کے پھندے لٹکانے کا حکم دیا اور طغرل کے تمام دوستوں، حامیوں اور رشتہ داروں کو ان پر لٹکا دیا گیا۔ برنی لکھتا ہے کہ "میں نے بہت سے معمر افسروں کے زبانی سنا ہے کہ دہلی کے کسی بھی بادشاہ نے اتنے وسیع پیمانے پر سزائے موت کا حکم نہ دیا تھا جیسا کہ بلبن نے لکھناؤتی میں دیا تھا" طغرل فوج کے وہ سپاہی جو راجدھانی کے تھے انہیں دہلی میں سزا دینے کے لیے زیر حراست میں رکھا گیا۔

سلطان نے لکھناؤتی کی ذمہ داری بغرا خاں کے سپرد کر کے اس سے پوچھا کہ "اے محمود! کیا تو نے دیکھا نہیں؟" اس نے اس سوال کو تین مرتبہ دہرایا اور کوئی جواب نہ پا کر اس نے وضاحت کی کہ: کیا تو نے بازار میں میری سزائیں دیکھیں؟ اگر فتنہ پرور اور سازشی لوگ تجھے دہلی سے قطع تعلق پر ابھاریں تو ان سزاؤں کو یاد کر لینا جو میں نے طغرل اور اس کے حامیوں کو دی ہیں" اس نے بغرا کو مشورہ دیا کہ وہ ہمیشہ دہلی کا وفادار رہے خواہ تخت دہلی پر کسی دوسرے ہی خاندان کا فرد کیوں نہ فائز ہو۔

لکھناؤتی کی مہم نے بلبن کو، جو کافی ضعیف ہو چکا تھا، کافی تھکا دیا۔ اور وہ تین سال بعد ہی دہلی لوٹ سکا۔ راجدھانی میں اس کی کامیابی کا جشن منایا گیا۔ سلطان نے ملک فخرالدین کو 'بھائی' کہہ کر مخاطب کیا اور اپنی وہ عبا جو وہ پہنے ہوئے تھا اسے دے دی، صدقات و خیرات تقسیم کیے گئے اور قیدیوں کو جشن منانے کے لیے آزاد کر دیا گیا۔ اس کے بعد بلبن نے ان تمام لوگوں کو پھانسی کا حکم سنایا جنھوں نے طغرل کی حمایت کی تھی۔ اور راجدھانی کی سڑکوں پر پھانسی کے پھندے کھڑے کرنے کا حکم دیا لیکن بہت

---

(1) عصامی اور برنی کے بیانات اس سلسلہ میں مختلف ہیں کہ طغرل کو کس طرح مارا گیا۔ برنی کا خیال زیادہ قابل بھروسہ ہے۔ لیکن بوڑھاپے میں اسے قلم بند کرنے کی وجہ سے وہ "طغرل کش" کے ذاتی نام کو یاد نہ رکھ سکا۔ عصامی بتاتا ہے کہ اس کا نام علی تھا۔

سے قیدیوں کے اپنے رشتہ دار دہلی میں موجود تھے جن کی آہ و بکا میں راجدھانی ڈوب کر رہ گئی۔ قاضی فوج، جس کی سفارشات پر بلبن ہمیشہ ہمدردی سے غور کیا کرتا تھا، نے ان کی طرف سے وکالت کی اور سلطان سے معافی حاصل کر لی۔[1] طغرل کے حامیوں ملازموں اور غلاموں کی ذہنی پریشانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم ان میں سے ایک کو اجودھیان میں شیخ فرید گنج شکر کے جماعت خانہ میں روحانی تسکین حاصل کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

سلطان محمد۔ شہید شہزادہ

بلبن نے اپنی مغربی سرحد کی حفاظت کے لیے متعدد تدابیریں کیں 1270ء میں اس نے لاہور کا دورہ کیا اور اس کے قلعہ کی دربارہ تعمیر کا حکم دیا۔ منگولوں نے لاہور کے اطراف کے اکثر دیہاتوں کو تباہ اور ویران کر دیا تھا۔ بلبن نے ان علاقوں کی نئی آبادکاری کے لیے اقدام کیے۔ 1241ء میں منگولوں نے لاہور پر قبضہ کر کے اسے لوٹ لیا تھا لیکن اس کے فوراً بعد اگتائی کی موت کی خبر آئی اور ان کی یاساؤں کے مطابق، جو اس بات کی متقاضی تھیں، کہ قاآن کی موت کے بعد تمام مہمات کو روک دیا جائے۔ منگول فوجیں واپس چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد سے لاہور کا شہر دہلی سے مقرر کردہ گورنروں کے زیر انتظام رہا۔ سرحدیں گھٹتی بڑھتی رہتی تھی لیکن لاہور، دیپال پور، سنام، سامانہ، اچھ اور ملتان تقریباً ہمیشہ ہی سے دہلی افسران کے ہاتھوں میں رہے۔ بلبن کے دور حکومت میں ہندستان پر منگول قبضہ کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن منگول حملہ کا ہمیشہ اندیشہ لاحق تھا۔ متعدد تجربات کے بعد، جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، بلبن نے مغربی سرحد کی پوری ذمہ داری اپنے بیٹے اور ولی عہد سلطان محمد کے ہاتھوں میں دے دی جو بعد کی نسلوں میں 'خان شہید' کے نام سے مشہور ہے۔

بلبن کے صرف دو بیٹے تھے۔ اسے بغرا خاں سے کوئی توقع نہ تھی، جس کے حوالے اس نے لکھناؤتی اس دانشمندانہ مشورہ کے ساتھ کر دیا تھا کہ وہ کم از کم ظاہری طور پر ہی دہلی کا وفادار رہے تاکہ کسی کشمکش کی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ بوڑھے سلطان

---

(1) برنی، ص 108۔

کی ساری امیدوں کا مرکز اس کا سب سے بڑا لڑکا اور اس کا وارث سلطان محمد تھا۔ یہ حقیقت کہ سلطان محمد کئی لحاظ سے اپنے باپ سے مختلف تھا، بلبن کی محبت میں رکاوٹ نہ بنی۔ بلبن تخت نشینی کے قبل ہفتہ میں تین یا چار بار مئے نوشی کی محفلیں جماتا تھا لیکن اپنی تخت نشینی کے بعد اس نے کبھی شراب کے ایک قطرہ تک کو بھی ہاتھ نہ لگایا۔ سلطان محمد پیتا تھا لیکن زیادہ ہرگز نہیں۔ اپنے باپ کے برخلاف وہ بڑا خلیق، متواضع اور اچھے اخلاق و عادات میں بڑا ممتاز تھا۔ پیدائشی شہزادہ ہونے کی وجہ سے اسے ایک، فوق البشر کا سا طریقہ اپنانے کی ضرورت نہ تھی، جس چیز نے اس کے باپ کو عوام کی نگاہوں میں جتنا پروقار بنایا تھا اتنا ہی صاحب بصیرت لوگوں کی نگاہوں میں مضحکہ خیز۔ اپنے باپ کے برخلاف محمد اعلا تعلیم یافتہ تھا۔ بلبن کی تمام ممکن تعریفات کے باوجود منہاج اسے علم و تمدن کے سرپرستوں کی فہرست میں شامل نہ کر سکا۔ اس کے برخلاف ملتان میں سلطان محمد کا دربار لائق اور تعلیم یافتہ لوگوں سے بھرا تھا۔ اس کے درباری (فردوسی کا) شاہنامہ، سنائی اور خاقانی کے دیوان اور نظامی کا خمسہ پڑھا کرتے تھے۔ صاحب علم حضرات اس کے سامنے ان عظیم شعرا کے کلاموں پر بحث کیا کرتے تھے، شہزادہ کی دوررس نگاہوں نے امیر خسرو اور امیر حسن کو منتخب کر لیا تھا اور وہ لوگ پانچ سال تک اس کی خدمت میں رہے۔ ادب کے مربی کی حیثیت سے اس کے حوصلے اور بلند ہی ہوتے گئے۔ اپنی غیر معمولی بصیرت کی بدولت ہی خان شہید نے سفر کے اخراجات کے ساتھ دوبار اپنے قاصدوں کو بھیجا اور شیخ سعدی کو ملتان آنے کی دعوت دی۔ اس کا مقصد ملتان میں شیخ سعدی کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرانا تھا اور اس کے اخراجات کے لیے گاؤں (جاگیر) وقف کر دینا تھا۔ لیکن اپنے بوڑھاپے کی بنا پر شیخ سعدی آنے سے معذور تھے۔ مگر دونوں موقعوں پر انھوں نے ایک غزل اپنے ہاتھوں سے لکھ کر خان کو روانہ کی۔ اور اپنی آمد سے معذوری پر معذرت چاہی۔[1]

بلبن نے پہلے تو سنام اور سامانہ تمر خاں کے سپرد کیا تھا، جو مشہور چالیس ترکوں (چہلگانی) کا ایک ممتاز ممبر تھا۔ لیکن شاید اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کشلو

---

(1) ایضاً، ص ص 68-67۔

(2) برنی کے مطابق (ص 61) یہ سلطان کا سب سے زیادہ قابل بھروسہ معتمد تھا۔

خاں اور شیر خاں دونوں منگولوں سے مدد حاصل کرنے گئے تھے۔ لہٰذا اس نے ان دونوں صوبوں کو اپنے چھوٹے لڑکے کے بغرا خاں کے حوالہ کر دیا جس کی وفاداری پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی اہلیت قابل بھروسہ نہ تھی۔ اس کو بریدوں کو مقرر کرنا پڑا تاکہ بغرا خاں کے کاموں سے باخبر رہے۔ اس طرح وہ اس کے انتظام حکومت کو معقول سطح پر قایم رکھنے میں کامیاب رہا۔ برنی کہتا ہے کہ "اس زمانہ میں منگول سپاہی اکثر دریائے بیاس کو پار کر کے (ہندستانی) خطوں میں داخل ہو جاتے تھے۔ لہٰذا بلبن سلطان محمد کو ملتان سے، بغرا خاں کو سامانہ سے اور مَلِک بار بیکبیکتار[1] کو دہلی سے روانہ کیا کرتا۔ یہ لوگ دریائے بیاس تک جاتے اور منگولوں کو واپس بھگا دیتے۔ اکثر یہی ہوتا کہ یہ لوگ کامیاب ہوتے اور منگولوں کو دریائے بیاس پار کرنے کی ہمت نہ رہتی۔ ان میں سے ہر فوج میں سترہ یا اٹھارہ ہزار گھوڑ سوار ہوتے"۔ جب بغرا خاں کو لکھناؤتی میں مقرر کر دیا گیا تو سلطان محمد کو مغربی سرحد کی پوری ذمہ داری سونپ دی گئی۔

عصامی بغیر کوئی تاریخ بتلائے لکھتا ہے کہ دو منگول فوجوں نے سندھ کی سرحد پار کی۔ سلطان محمد نے اپنے افسروں کو ان کے خلاف بھیجا اور ڈھنڈی کنڈالی نامی ایک جگہ پر جنگ ہوئی۔ تعداد میں زیادہ ہونے کے باعث منگولوں کو فتح ہو گئی۔ لہٰذا محمد نے ان پر جرمانہ عائد کرنا چاہا۔ لیکن چونکہ یہ چیز ان کے وقار کو مجروح کرتی لہٰذا اس نے بجائے سزا کے انہیں اعزازی پوشاک اور انعام دیا۔

گرمیوں میں لکھناؤتی سے واپسی پر بلبن نے اپنی جسمانی قوت گرتی ہوئی محسوس کی لہٰذا اس نے سلطنت سلطان محمد کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا اس نے اسے فوراً دہلی بلایا۔ بلبن کا قاصد دسویں دن ملتان پہنچا۔ سلطان محمد چند اہم ریاستی معاملات میں مشغول تھا۔ لہٰذا اس نے جواباً کہا کہ وہ جلد ہی روانہ ہو رہا ہے۔ قاصد کی جرح کرنے کے بعد بلبن نے محمد کے قول و عمل میں تضاد محسوس کیا۔ بلبن نے ایک شکایتی خط بھیجا لیکن اس وقت حالات نے سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔

684ھ (1285ء) میں سلطان محمد سُمرا قبائلیوں کے خلاف روانہ ہوا۔ شاید

---

(1) برنی کے مطابق (ص 61) یہ سلطان کا سب سے زیادہ قابل بھروسہ معتمد تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اس نے اپنا پڑاؤ جٹر ال کے گرد نواح میں ڈالا تاکہ سمراؤں کو کچلنے کے لیے پیش قدمی کر سکے۔ اتفاقاً بالارادہ اسی وقت ایک سرحدی منگول افسر تمر اس کے خلاف تیس ہزار گھوڑ سواروں کو لے کر روانہ ہوا۔ منگول یا تو بڑی تیزی سے چلے یا وہ اپنی نقل و حرکت کو راز میں رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے کیونکہ سلطان کو منگولوں کی پیش قدمی کے سلسلہ میں صرف ایک اطلاعی خط اس وقت ملا جب وہ لوگ صرف پانچ فرسنگ کی دوری پر رہ گئے تھے۔

سلطان محمد نے اپنے افسروں سے مشورہ لیا۔ ان کا وفادارانہ مشورہ یہ تھا کہ وہ خاموشی سے ملتان واپس چلا جائے اور انہیں جنگ کے لیے چھوڑ جائے۔ کیونکہ جنگ سخت ہو گی۔ ان لوگوں کا بدل تو حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا بدل حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سلطان محمد نے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ شہزادوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ دشمنوں کو دیکھ کر لگاموں کے رُخ موڑ دیں" دوسری صبح منگولوں کا مقدمۃ الجیش نظر آیا۔ شاعر خسرو لکھتا ہے کہ "گردہ در گردہ ان لوگوں نے دریا (راوی) پار کیا اور اچانک آگئے"۔ لیکن اس وقت تک ہندستانی فوج گھوڑوں پر سوار ہو چکی تھی جب منگول پوری طاقت کے ساتھ سامنے آئے۔ دوپہر تک کسی کی فتح کے بغیر جنگ شدت سے جاری رہی لیکن سلطان محمد کی فوج میں منگلی نامی ایک غزّ ترک افسر تھا جس کے بارے میں منگول جانتے تھے کہ وہ بزدل ہے۔ انھوں نے اس کا اتہ پتہ معلوم کیا اور اچانک اس کی صف پر حملہ کر دیا، جو ٹوٹ کر بھاگ کھڑی ہوئی منگول تیزی سے آگے بڑھے اور فوج کا نظم و ضبط مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ عصامی کہتا ہے کہ "چونکہ منگولوں کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی لہٰذا اس نے ہر جگہ اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ ہندستانی صفیں بالکل تتر بتر ہو گئیں اور منگولوں نے ہندستانیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔

کئی گھنٹے بہادری سے جنگ کرنے کے بعد سلطان محمد نے جب اپنی جانب کسی کو نہیں پایا تو اس نے اپنے گھوڑے کا رخ دریا (راوی) کی طرف موڑ دیا۔ لیکن اسے منگول فوج کے ایک قرونہ[1] نے مار گرایا اور اس کے بعد اس کے گھوڑے، تلوار، کمان اور

---

(1) "قرد ناوں" کا تذکرہ اکثر ملتا ہے لیکن اس اصطلاح کا معنی متعین نہیں ہے۔ عارضی طور پر ہم قرونہ کا مطلب یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا شخص جس کی ماں مسلم ہو اور باپ منگولی۔

تیروں پر قبضہ کر لیا۔ سلطان محمد کی دو گانے والی لڑکیوں میں سے ایک نے، جسے منگولوں نے پکڑ لیا تھا، اس کے مشہور گھوڑے کو جس پر قرونہ سوار تھا پہچان لیا۔ اور اس کی آہ وزاری سنکر منگول افسران نے قرونہ کو مجبور کیا کہ وہ انہیں خان شہید کی لاش تک لے جائے۔ ان لوگوں نے اسے خود اپنے ملک لے جانے کی غرض سے اس کی لاش ایک تابوت میں رکھی لیکن رائے کالو، خان شہید کے خسر، نے اپنی مملکت سے کافی روپے منگولوں کو بھیجے اور خان کی لاش ان کے پاس سے لے آیا[1] حسب دستور منگول مال غنیمت سمیٹ کر واپس چلے گئے۔

سلطان بلبن کے آخری ایام

سلطان محمد کی موت بلبن کے لیے جس کی عمر اَسّی سال ہو چکی تھی ایک زبردست صدمہ تھی۔ کیونکہ شہزادہ اس کی دُنیاوی امیدوں کا آخری سہارا تھا۔ اس کی موت میں اس نے اپنے خاندان کے موت کی گھنٹی سُن لی اور یہ اپنے خاندان میں بادشاہت کے دوام کے لیے اس کی زندگی بھر کی کوشش کا المناک خاتمہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ناصر الدین محمود قطب الدین حسن غوری، شیر خاں اور دوسرے اشخاص، جنھیں اس نے اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے لیے تاج کو محفوظ کر سکے، کی روحیں اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگی ہوں۔

آخر چارہ کار کے طور پر اس نے بغرا خاں کو لکھنوتی سے بُلایا اور اسے دہلی میں رہنے کی اپیل کی۔ اس کے پوتے کیخسرو اور کیقباد ابھی بچے اور نا تجربہ کار تھے۔ اگر بغرا خاں بوجھ سنبھالنے کے لیے تیار نہ ہوا تو دہلی کی بادشاہت بچوں کا کھیل (بچہ بازی) بن کر رہ جائے گی، جیسا کہ التمش کی موت کے بعد پوری نسل تک ہوا۔ بلبن کی دلیل قابلِ قبول تھی۔ لیکن بغرا خاں کا مزاج عاجلانہ تھا۔ اور وہ ریاستوں میں ہونے والی انقلابی تبدیلیوں سے ناواقف تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس دو یا تین ماہ رہا۔ اس کے بعد

---

(1) خان شہید کی موت پر ہمیں دو مراثی ملتے ہیں۔ ایک نثر جسے امیر حسن نے لکھا ہے اور دوسرا نظم میں جسے امیر خسرو نے لکھا ہے۔ امیر خسرو کی کسی نظم سے آنکھیں اتنی زیادہ اشک آلودہ نہیں ہوتیں جتنی اس مرثیے سے، جو بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ میں ٹکڑے ٹکڑے نقل کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے خان شہید کی موت کے سلسلہ میں عصامی کا بیان ہمارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ (ص ص 67-166)۔

سلطان کی صحت میں کچھ بہتری ہو گئی۔ لہٰذا بغرا خاں کے ذہن پر لکھناؤتی واپس جانے کی دھن سوار ہو گئی۔ چنانچہ سلطان کی صحت یابی کا بہانہ کر کے وہ سلطان سے اجازت لیے بغیر ہی لکھناؤتی کے لیے روانہ ہو گیا۔ عصامی نے مندرجہ ذیل کہانی بیان کر کے اس المیہ کو ایک بڑا اچھوتا ہوا رنگ دے دیا ہے۔ ”بعض افراد جن پر سکے ڈھالنے (قلب کاری) کا الزام تھا سلطان کے سامنے پیش کیے گئے۔ ان میں ایک بوڑھی بیوہ کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ وہ بے گناہ تھا لیکن اسے غلطی سے پکڑ لیا گیا تھا۔ عورت نے سلطان سے رحم کی درخواستیں کیں۔ مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ سلطان کا یہ قاعدہ ہی نہ تھا کہ ریاست کے خلاف جرائم کے سلسلے میں کوئی نرمی برتے۔ اس مقدمہ میں ماخوذ تمام افراد کو مار ڈالا گیا۔ اسے بوڑھی عورت کا دل منہ کو آ گیا۔ ہر شب وہ اپنے بیٹے کی موت کا ماتم کرنے اور سلطان کے لیے خدائی عتاب کا مطالبہ کرنے کے لیے شاہی محل کے سامنے آتی۔ اس کی چیخ و پکار سے سلطان کی نیند خراب ہو جایا کرتی۔ اور سلطان کے افسروں نے اسے اپنی دلدوز چیخیں بلند کرنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس نے ہر طرح کی تنبیہات کو نظر انداز کر دیا۔ وہ نہ تو "لوہے" (سختی) سے خوف زدہ تھی اور نہ اسے "سونے" کا لالچ دیا جا سکا۔ خان شہید کی موت کے بعد وہ دوبارہ محل کے قریب نہ آئی اور اسے پتہ لگانے کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔[1]

آخر کار، بوڑھے سلطان کا دل ٹوٹ گیا۔ حسبِ معمول وہ دن بھر حکومت کا نظم چلاتا لیکن جب وہ اپنے کمرے میں آتا تو روتا، چلاتا اور اپنے سر پر خاک ڈالتا اور وہ اپنے بیٹے کی موت کو زیادہ دنوں برداشت نہ کر سکا۔ یہ محسوس کرنے کے بعد کہ اس کی موت قریب ہے۔ سلطان نے دہلی کے کوتوال ملک الامراء وزیر خواجہ حسن بصری، اور دیگر اعلا افسروں کو بلایا اور جانشینی کے متعلق اس نے اپنی ہدایت دیں۔

”میں نے اپنے بڑے بیٹے خان شہید کے بیٹے کیخسرو کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔ اسے میرے تخت پر بٹھا دو، وہ ایک ہونہار نوجوان ہے لیکن عمر اور تجربہ میں کم ہے اور بادشاہت کے فرائض ادا نہیں کر سکتا لیکن اس کے علاوہ میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟ محمود (بغرا خاں) جس کی لوگ عزت کرتے ہیں اور جس سے کچھ توقعات

---

(1) فتوح السلاطین ص ص 78-177

وابستہ کی جاسکتی ہیں، لکھناؤتی چلا گیا ہے اور اب اسے واپس بُلانے کے لیے وقت نہیں ہے لہٰذا میرے لیے کیخسرو کو نامزد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے"۔

اس کے بعد اس نے تمام مَلکوں کو رُخصت کیا۔ تین دن بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ "کوتوال اور کوتوالی کے افسران باہمت اور باصلاحیت تھے اور عوامی رُجحانات سے واقف تھے۔ لہٰذا ان حقائق کی بُنیاد پر، جن کے اظہار کا تعلق عورتوں سے ہے، وہ لوگ خان شہید کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کیخسرو تخت نشین ہو گیا تو بہت بُرا ہو گا۔ لہٰذا دن میں ان لوگوں نے کیخسرو کو ملتان بھیج دیا اور بغرا خاں کے بیٹے کیقباد کو معزالدین کا خطاب دے کر تخت نشین کر دیا۔ اور رات کے آخیر پہر میں وہ لوگ بلبن کا جنازہ دارالامان میں دفنانے کے لیے کوشک لعل (سرخ محل) سے نکال کر لے آئے۔

بلبن کے جنازہ کی، حسبِ دستور، تمام رسمیں ادا کی گئیں بلکہ اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر۔ مَلکوں اور افسروں نے اپنے سروں پر مٹی ڈالی اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ وہ تمام اس کے جنازے کے پیچھے پیچھے ننگے سر قبرستان تک گئے۔ جب اس کی لاش قبر میں رکھی جانے لگی تو ملک فخر الدین کوتوال نے اپنے آقا کو آخری خراجِ عقیدت پیش کی اور اس کی موت میں قدیم اور محترم خاندانوں کے چراغ بجھتے دیکھا۔ وہ چھ ماہ تک زمین پر سویا۔ دوسرے ممتاز مَلکوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ شہر کے بہت سے لوگوں نے مرحوم سلطان کی روح کی تسکین کے لیے فقراء میں کھانے تقسیم کیے۔[1]

بلبن کی کامیابیاں اور ناکامیاں

بلبن کی موت کے بعد اس کا خاندان تین سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کے افسران میں سے اگر کسی کو اس بیان پر یقین ہو گا کہ "بادشاہ خدا کا نائب ہے" اور یہ کہ "بادشاہ کا دل خدائی الہامات کا مخزن ہے" تو اسے یقیناً بلبن کے دعوے اور اس کے جانشینوں کے درمیان تضادات پر حیرت ہوئی ہو گی۔ کیقباد کی حکومت نے بھی ممتاز ترکی غلام افسروں کو قتل کرنے کی بلبن کی پالیسی پر عمل کیا۔ جلال الدین فیروز خلجی نے

---

(1) برنی ص ص 120-23

انھیں اعلا عہدوں پر ان کی اجارہ داری سے محروم کر دیا۔ لیکن ان لوگوں کو قتل نہ کیا جنھیں اس نے اپنی ملازمت میں لے رکھا تھا۔ ان لوگوں نے اس کی فیاضی کا صلہ یہ دیا کہ سراسر اس کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ بالآخر، بلبن کی موت کے تقریباً بارہ سال بعد، ترکی غلام افسروں کے تمام اخلاف کو علاؤالدین خلجی نے یا تو قید کر دیا یا انھیں قتل کر دیا۔ اس طرح ان کے دورِ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔[1] برنی بیان کرتا ہے کہ ”اس وقت جب میں تاریخ فیروز شاہی کو ترتیب دے رہا ہو (1357ء) بلبن کی موت کے بعد سے ستر سال یا ڈھائی نسلیں گزر چکی ہیں۔ ان کی کثیر تعداد کے باوجود آج اس کے خاندان کا کوئی فرد اور نہ اس کے بیٹوں، غلاموں یا افسروں کے خاندانوں کا کوئی فرد باقی بچا ہے۔[2]

لیکن اگرچہ بلبن کا خاندان ختم ہو گیا مگر دہلی کی حکومت قایم رہی اور یہی وہ ادارہ ہے جس کے سیاق میں بلبن کی زندگی کے کارناموں کا اندازہ کرنا ہے۔

بلبن کی جو تعریفیں برنی نے کی ہیں ان سے ہم صرف ایک معاملہ میں بلا تامل اتفاق کر سکتے ہیں۔ ہریانہ سے لے کر بہار تک مملکت کے اہم صوبوں میں اس نے قلعوں اور فوجی چوکیوں کی مدد سے امن وامان قایم کر دیا۔ اس ابتدائی کام کے بغیر خلجی عہد کی کامیابیاں ممکن نہ تھیں۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے۔ یہ امن و امان شہروں اور خاص طور پر دیہاتوں میں سلطنت کے افسران نے اور بقیہ علاقوں میں موروثی ہندو سرداروں نے قایم رکھا۔

اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ تقریباً دوسرے تمام معاملات میں اس کا رجعت پسندانہ رویہ۔ اعلا حسب و نسب جس سے مرادایسے غلام جو ترکی النسل ہوں یا غیر ملکی نسل کے ہوں پر اس کا مصر ہونا۔ مفید سے زیادہ مضر ثابت ہوا۔ اس چالیس سال کی مدت کے دوران جس میں بلبن نے ریاست کو اپنے کنٹرول میں رکھا، وو بڑی

---

(1) یہاں حکومت سے مراد ترکی غلام افسروں کی حکومت ہے۔ یعنی وہ ترکی غلام جنھیں تاجران غلام نے پڑھایا لکھایا اور انھیں بادشاہوں۔ (مثلاً) معزالدین، ایبک التتمش نیز بلبن نے خریدا۔ آزاد ترکوں نے بھی اس وقت ہندستانی تاریخ میں ممتاز رول ادا کیا ہے جب تک وہ آخر کار ہندستان کی مسلم آبادی میں جذب نہ ہو گئے۔

تحریکوں کا آغاز ہو رہا تھا جن کے مطابق بلبن نے اپنی پالیسی میں نہ ترمیم کی اور نہ وہ کر سکتا تھا۔ پہلی (تحریک) تو یہ کہ متعدد ہندوؤں کے مزدور طبقہ کی انجمنوں اور برادریوں - مثلاً کپڑا بننے والے، قصائی اور فیل بان وغیرہ - نے اجتماعی فیصلوں کے مطابق (مذہب) اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ ایسی حکومت برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے جس کی بنیاد اس مفروضے پر ہو کہ فتح کے حق کی بنیاد پر تمام اعلا عہدے سلطان کے ترکی غلاموں کے قبضہ میں رہیں۔ دوسری [تحریک] یہ تھی کہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد نے فارسی سیکھنا شروع کر دیا تھا اور اس بات نے حکومت کے لیے اس بات کا امکان پیدا کر دیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے ناگزیر کر دیا، کہ وہ نئے میدانوں میں کاموں کا آغاز کرے۔ خاص طور پر زمین کے لگان کے سلسلہ میں جس کی سب سے بڑی مشکل دو زبانیں جاننے والے کلرکوں اور محاسبوں کی کمی تھی۔ بلبن ریاست کے پرانے ہی ڈھانچہ پر قایم رہا حالانکہ اس کی افادیت کب کی ختم ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت سے التوا کے بعد تبدیلیاں رونما ہوئیں تو انھوں نے ایک انقلابی شکل اختیار کر لی۔

بلبن کی ناکامی اس کی فوج کے لحاظ سے بالکل واضح ہے۔ بلبن نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ دہلی کے خلاف بغاوت نہ کرے۔ کیونکہ دہلی کا ایک بادشاہ لگام کی محض ایک جنبش سے لکھناؤتی کو فتح کر سکتا ہے۔[1] پھر بھی بلبن کو طغرل کی بغاوت فرو کرنے میں چھ یا اس سے زائد سالوں کی مدت لگ گئی۔ اور باضابطہ فوج کی کمک کے طور پر اسے اودھ میں دو لاکھ گنواروں کو بھرتی کرنا پڑا۔ بلبن نے کسی بڑے ہندو رائے کا مقابلہ نہیں کیا کیونکہ اس اوّلین فرض منگولوں سے جنگ کرنا تھا۔ اس کے باوجود اس کے افسران سرحدی منگول افسروں کے حملوں کے مقابلہ میں شکست کھا گئے۔ دو سرحدی جنگوں کے متعلق عصامی جو مجموعی اعتبار سے عسکری معاملات کے سلسلہ میں ہمارے لیے ایک بہتر ماخذ ہے کہتا ہے کہ ”منگولوں کی فتوحات کی سب سے پہلی وجہ تعداد میں ان کی زیادتی تھی“ لیکن ہندستانی فوج تعداد میں کم کیوں تھی؟ بلاشبہ عصامی کچھ مُبالغہ سے کام لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ علاؤالدین خلجی دہلی اور اس کے مضافات سے ایک لاکھ سپاہی ایک دن میں کھڑا کر سکتا تھا۔ تب پھر کیوں دہلی کی فوج اور تعداد میں

---

(1) ایضاً، ص 96

اس قدر ناکافی تھی کہ سلطان محمد اور اس کے افسران تیس ہزار گھوڑوں کی ایک سرحدی فوج کے ذریعہ مار ڈالے گئے؟ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ دیوانی افسروں کی تقرری کے سلسلے میں بلبن اعلا نسبی یعنی غیر ملکی ہونے کی شرط پر سختی سے کار بند تھا۔ یہی اصول ناگزیر طور پر فوجی افسران کے سلسلہ میں لاگو کیا گیا کیونکہ وہ افسران جو جنگ کرتے تھے انھیں انتظامی افسر یا اقطاعدار بھی ہونا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے دستیاب افسروں کی تعداد کم پڑ جاتی تھی۔ اور افسروں کی کمی ان سپاہیوں کی تعداد کو بھی محدود کر دیتی تھی جنھیں وہ بھرتی کر سکتے تھے۔ ہمیں یہ بھولنا نہ چاہیے کہ بلبن کی موت اور علاؤالدین خلجی کی تخت نشینی کے درمیان صرف دس سال کی مدت تھی۔ علاؤالدین نے صرف وفاداری قوت اور کارکردگی کا لحاظ رکھا اور کبھی کسی کے حسب ونسب کے لیے پریشان نہ ہوا۔ یہی ایک ایسا اصول ہے جس پر ایک اچھی حکومت کی تعمیر ممکن ہے۔ اپنے اعلا نسبی کے خبط کی وجہ سے بلبن، اپنی موت کے آتے آتے، زمانے کے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ دیوانی اور عسکری دونوں ہی میدانوں میں بلبن اور اس کا حکمراں طبقہ آزمائش میں پورا نہ اترا۔

معزالدین کیقباد کا دورِ حکومت

کیقباد جب 688ھ (1387ء) میں تخت پر بیٹھا تو ایک سترہ یا اٹھارہ سالہ - خوبصورت، شائستہ اور کریم النفس - نوجوان تھا۔ اس کی پرورش اس کے دادا کی سخت نگرانی میں ہوئی تھی اور اس کے معلّموں نے اسے کبھی اجازت نہ دی کہ وہ کسی حسین دوشیزہ کی شکل دیکھ سکے۔ یا شراب کا ایک قطرہ بھی چکھ سکے۔ اس نے ہر طرح کے جسمانی اور دماغی فنون مثلاً خطاطی، ادب، تیر اندازی، نیزے بازی وغیرہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ جیسے ہی وہ تخت پر بیٹھا اس کی زندگی نے ایک پلٹا کھایا۔ اس نے اپنے آپ کو عیاشی کے حوالہ کر دیا۔ اور اپنے سارے اوقات شراب اور صید افگنی میں گزارتا۔ بلبن کا دربار جو اپنے سخت نظم وانضباط اور سنجیدہ ماحول کے لیے مشہور تھا اب وہ مسخروں، عیاشوں، رقاصاؤں اور سازندوں کا ایک اڈّا بن گیا۔ اس نے کیلوگڑھی[1] میں

---

(1) یہ عام خیال کہ کیقباد نے شہر نو یا کیلوگڑھی کی بنیاد ڈالی تھی، صحیح نہیں کیونکہ منہاج اس کا حوالہ ناصرالدین محمود کے زمانے میں بھی دیتا ہے (ریورٹی 634ھ، ورق نمبر 2)

ایک عظیم الشان محل تعمیر کرادیا اور وہاں عیش و نشاط اور رنگ رلیوں کی دنیا میں زندگی گزارنے لگا۔ برنی تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح ان نوخیز لڑکیوں کو جن کے سینے بھی ابھی نہ اُبھرے تھے، تیر اندازی، گھوڑ سواری، رقص اور دربار میں پیش کرنے کے لیے فارسی اور ہندی گانوں کے گانے کی تعلیم دی جاتی جہاں لڑکیاں اور انھیں تربیت دینے والے دونوں ہی شاہی انعامات پاتے۔ نوجوان بادشاہ کی بدقسمتی یہ تھی کہ اسے اپنی کثرت مباشرت پر قابو نہ تھا۔ جس نے اس کے چہرہ کو پیلا اور جسم کو لاغر و کمزور بنا کر رکھ دیا۔ عصامی، جو ایک صوفی منش اڈھیڑ عمر کا کنوارا تھا، کا بیان اور بھی پُرزور ہے:-

"دن رات بادشاہ اپنی طرب و نشاط کی محفلوں میں ڈوبا رہتا۔ اس کے لیے اور کسی چیز کے لیے وقت نہ تھا۔۔۔۔۔۔۔ ہر وقت اس کے پاس سُرخ ہونٹوں والی چاند جیسی دوشہزائیں موجود رہتیں۔ میں نے اسی بادشاہ کے متعلق، جو اپنی جوانی کی وجہ سے اپنی جنسی خواہشات کا غلام تھا، سنا ہے کہ جب وہ اپنے گھوڑے کو آہستگی سے بھی ہانکتا تو وہ ایک رات میں اسے دس میلوں تک لے جاتا۔ جی ہاں! بادشاہت [ایک طرف] نوجوانی اور دیوانگی اور [دوسری طرف] کمسن لڑکیوں کے ساتھ ہر وقت کے ارتباط، ان دونوں [باتوں] کا یکجا ہونا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ آگ اور روئی کی قربت۔ بالآخر، شاہی شہسوار نے، جنسی خواہش کی گرمی سے مجبور ہو کر، اپنے گھوڑوں کو اتنی غفلت و بے پرواہی سے دوڑایا کہ اس کا آدھا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا"[2]۔

ظاہر ہے ریاست کا بوجھ دوسروں کو اپنے کندھوں پر اُٹھانا پڑا۔ برنی لکھتا ہے کہ "میں نے قاضی شرف الدین سرپائن سے سنا ہے کہ اگر ملک نظام الدین اور ملک قوام الدین علاقہ دبیر ریاست کے ستون کی حیثیت سے نہ ہوتے تو کیقباد کی سلطنت ایک ہفتہ سے زیادہ نہ چلتی۔ یہ لوگ بچے کچے شمسی اور بلبنی مَلکوں میں سے تھے۔ ان کی رانائی، ذکاوت اور معاملات کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت میں ان کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ لیکن قوام الدین سیاست میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ ریاستی پالیسی کی رہنمائی کا

---

(1) امیر خسرو نے اس کا ایک بہت خوب صورت خاکہ قرآن السعدین میں کھینچا ہے ص 54۔ الخ۔

(2) عصامی، اشعار، 3521 اور 05-3800

کام اس نے اپنے شرکاءِ کار کے حوالہ کر دیا تھا۔

ملک فخر الدین کوتوال کا بھتیجہ اور داماد ملک نظام الدین، جو سرکاری طور محض ڈیڈ بیک تھا عملی طور پر اور اس نے نظام حکومت کے تمام اختیارات حاصل کر لیے تھے۔ شاید اس نے اس حمایت کا پورا فائدہ اُٹھایا جو فخر الدین نے کیقباد کو دی اور اسی نقاب میں اس نے اپنی پوزیشن مستحکم کرلی۔ اس نے نائب وکیل در، نائب حاجب اور سرجندار کے عہدوں پر اپنے حامیوں کی تقرری کی۔ اس کے حوصلے اتنے ہی زیادہ بلند ہوتے گئے جتنا کہ سلطان اپنی عیاشی میں غرق ہوتا گیا۔ اور بالآخر اس نے تخت کی حصولی کے لیے منصوبے بنانا شروع کر دیے۔ [اُدھر] وہ انتظام حکومت کی دیکھ بھال کرتا اور [ادھر] اس کی بیوی محل کو کنٹرول میں رکھتی۔ اس کی بیوی کو سلطان کی ماں کہا جاتا تھا۔

نظام الدین کے خلاف جو الزامات لگائے گئے ان میں سے ایک الزام کیخسرو کے قتل کا تھا جو تخت کا سب سے قریبی جانشین تھا۔ برنی صرف اتنا لکھتا ہے کہ اس نے بادشاہ سے جب وہ نشے تھا، کیخسرو کے قتل کا حکم لے لیا اور اس کو روہتک میں مروا ڈالا۔ لیکن دوسرے مآخذ سے ہمیں جو معلوم ہوتا ہے اس سے یقیناً نظام الدین کی ذمہ داری کم ہو جاتی ہے۔ ابن بطوطہ کے مطابق فخر الدین کوتوال نے بلبن کے انتقال کے وقت ایک جعلی دستاویز تیار کی کہ تمام مَلِکوں اور امراء نے کیقباد کی تخت نشینی قبول کرلی ہے پھر اسے کیخسرو کو دکھلا کر اسے ملتان بھاگ جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے شہر کے دروازے کھلوا دیے اور شہزادہ بھاگ گیا۔ یحییٰ سرہندی لکھتا ہے کہ وزیرِ ملک بیک، حسن بصری اور دوسرے لوگ جنھوں نے کیخسرو کی حمایت کی انھیں گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔[1] عصامی کہتا ہے کیخسرو چند مہینے اپنی بدقسمت پر رویا اس کے بعد چونکہ وہ ضِدّی اور ناتجربہ کار تھا لہٰذا اس نے ایک غلط قدم اُٹھایا۔ اس نے شکار کے بہانے ملتان چھوڑ دیا اور غزنی چلا آیا۔ جہاں سے وہ منگولوں کے ملک جا پہنچا۔ لیکن منگول اپنی خانہ جنگیوں میں مشغول تھے لہٰذا کیخسرو اپنی تمام دولت ختم کرنے کے

---

(1) تاریخ مبارک شاہی، ص 52۔

بعد ہندستان میں منڈولی واپس آیا۔ نظام الدین نے غلط یا صحیح کیقباد کو ایک چچیرے بھائی سے خبردار کیا "جس نے تخت کی خاطر منگولوں کی اطاعت اور خراج کا وعدہ کیا تھا"۔ سلطان کے حکم پر منڈولی میں کیخسرو کی گردن مار دی گئی[1]۔

نظام الدین کے کہنے پر اور دوسری سزائیں بھی دی گئیں۔ وزیرِ خواجہ خطیر کو ایک گدھے پر بٹھا کر راجدھانی کی گلیوں میں گھمایا گیا۔ ان باتوں نے شرفاء کو دہشت زدہ کر دیا۔ اور تمام اہم ترکی مَلِک اور امراء نظام الدین کو ذلیل اور خطرناک سمجھنے لگے۔ لیکن اس کی پوزیشن اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ اس کے اقتدار کی مخالفت ناممکن تھی۔ دوسری طرف نظام الدین نے تمام اہم ترکی امراء سے چھٹکارا پانے کا ایک منصوبہ بنایا۔ ایک دربار میں جو کیلوگڑھی میں منعقد ہوا تھا اس نے ملتان کے گورنر کی جانب سے ایک جعلی رپورٹ پڑھی جس میں منگول حملہ پر شاہی فوجوں کی فتح کی اطلاع دی گئی تھی۔ اسی بہانے سے تمام مَلِکوں اور امرء کو سلطان کو مبارک بادی پیش کرنے کے لیے بلایا گیا۔ جب وہ لوگ دربار میں آئے تو ان میں سے کچھ کو تو مار ڈالا گیا اور کچھ کو جلاوطن کر دیا گیا۔ عہدوں کی تقرری پھر سے ہوئی اور صرف وہی لوگ جنھیں نظام الدین کا اعتماد حاصل تھا درباری مقرر کیے گئے۔

اس اثنا میں کہ نظام الدین حکومت کو ان تمام عناصر سے جنھیں وہ ناپسند کرتا تھا، پاک کر رہا تھا کمتر خاں نے ہندستان پر حملہ کر دیا اور ملک کو لاہور سے لے کر ملتان تک اُجاڑ ڈالا۔ خان جہاں "باربیک" کو اس سے نمٹنے کے لیے بھیجا گیا۔ جب منگول فوج نے شاہی فوجوں کی آمد کی خبر سنی تو وہ پیچھے ہٹنے لگی۔ کچھ منگولوں کو پکڑا گیا اور انھیں مار ڈالا گیا۔ بعد میں نظام الدین نے سلطان سے دھوکے سے ان منگولوں (جنھیں نومسلم کہا جاتا تھا) کی پھانسی کا فرمان حاصل کر لیا جنھوں نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا اور ہندستان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے[2]۔

نظام الدین نے بڑی بے دردی سے مَلِکوں اور امرء کی گردن زدنی کی پالیسی پر عمل کیا اور باصلاحیت ترکی افسران کے خاتمے کے لیے وہ طریق عمل اختیار کیا جس کا آغاز بلبن نے کیا تھا۔ مزید یہ کہ نظام الدین نے ملتان کے گورنر مَلِک علاالدین شیخ اور

---

(1) عصامی، ص ص 2-190 (2) ایضاً ص ص 82-181

باران کے گونر ملک ناصر الدین توزکی، جو دونوں بلبن کے اہم مَلِکوں میں سے تھے، کو قتل کرا دیا۔

نظام الدین کی پالیسی نے ملک فخر الدین کوتوال، جس کی عمر 90 برسوں کی ہو چکی تھی، کو نظام الدین کے انجام کے متعلق تشویش میں ڈال دیا۔ اس نے اسے نصیحت کی کہ وہ بادشاہی کے خیال کو چھوڑ دے اور اپنے خاص کاموں میں لگ جائے۔ اپنے کرداروں کی زبان میں بات چیت پیش کرنے کا برنی کا جو مخصوص طریقہ ہے، اسی کے مطابق وہ فخر الدین کی زبانی نظام الدین کو اس کے بوالہوس منصوبوں سے باز رکھنے کے لیے طویل نصیحت پیش کرتا ہے:-

"نظام الدین! میں نے تمہاری پرورش کی ہے اور تمہیں پڑھایا لکھایا ہے۔ تم میرے نزدیک ایک بیٹے کی طرح ہو۔ میرے باپ نے بادشاہ کے ذاتی خدمت گار کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اور کوتوال کے عہدے تک پہنچ گئے جس پر ہم لوگوں کا تقریباً اسی سال سے قبضہ ہے۔ ہماری خواہشات کی انتہا بس یہیں تک ہے۔ ہماری کامیابی کا راز یہ رہا ہے کہ ہم لوگوں نے کبھی بھی ریاست کی سیاست میں حصہ نہ لیا۔[1]"

نظام الدین نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں وہ بہت آگے جا چکا تھا اور اگر وہ اپنے قدم پیچھے ہٹائے گا تو اسے مار ڈالا جائے گا۔ تب سخت متنفر ہو کر فخر الدین نے یہ کہا کہ "تب ہم لوگوں کو، ہمارے خاندانوں کو اور بچوں کو تم مردہ اور برباد سمجھو"۔ پھر بھی نظام الدین ترکی مَلِکوں کو ختم کرنے کی اپنی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔

جب کیقباد دہلی میں تخت نشیں ہوا تو اس کے باپ بغرا خاں نے لکھنوتی میں اپنے آپ کو سلطان ناصر الدین کے خطاب کے ساتھ بادشاہ اعلان کروا دیا اور اپنے نام پر سکتے اور خطبہ جاری کرایا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان مستقل خط و کتابت تھی۔ بغرا خاں جانتا تھا کہ اس کا بیٹا لہو لعب کی زندگی گزار رہا ہے اور یہ کہ نظام الدین اسے ابھار رہا ہے کہ وہ اہم مَلِکوں اور امراء کو ہلاک کر ڈالے۔ اور اس کا آخری مقصد یہ ہے کہ خود

---

(1) برنی، ص ص 38-134، فخر الدین کوتوال نے کیخسرو کی بے دخلی کے لیے جو کچھ کیا اس کی روشنی میں یہ بیان قبول نہیں کیا جا سکتا۔

کیقباد کا بھی خاتمہ کر دے۔ لہٰذا اس نے کوشش کی کہ اپنے خطوط میں اشارات اور بالواسطہ تجاویز کے ذریعہ کیقباد کو اس طرف متوجہ کرے۔ لیکن کیقباد نے اپنے باپ کے تحریری مشوروں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لہٰذا جب اس کی حکومت کے دو سال گزر گئے تب بغرا خاں نے فیصلہ کیا کہ وہ بذات خود اپنے بیٹے سے ملاقات کرے گا۔

امیر خسرو[1] اور ضیاء الدین برنی[2] نے ان حالات کے متعلق دو مختلف بیان پیش کیے ہیں جن کے تحت باپ اور بیٹے کی ملاقات ہوئی تھی۔ خسرو کہتا ہے کہ بغرا خاں لکھناؤتی سے دہلی کو فتح کرنے کے ارادے سے نکلا۔ جب وہ بہار پہنچا تو کیقباد نے نکل کر اسے للکارنے کا فیصلہ کیا۔ برنی کہتا ہے کہ پیش قدمی کیقباد کی طرف سے کی گئی جو ایک بڑی فوج کے ساتھ اپنے باپ کی ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ جب بغرا خاں اپنے بیٹے کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا فوجی مقصد ختم کر دیا (اگر اس کا ایسا کوئی مقصد تھا) اور اس کے کوچ نے ایک ملاقات کی شکل اختیار کر لی۔ بہر حال اس نے اپنے دبیر شمس الدین کو کیقباد کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا: دہلی کی سلطنت میری ہے لیکن اگر یہ میرے بیٹے کے پاس چلی گئی ہے تو اسے اپنے باپ سے لڑنا نہ چاہیے۔ میرے لیے لکھناؤتی کی سلطنت جو میرے باپ کا ورثہ ہے، زیادہ پسندیدہ ہے" کیقباد نے جواباً کہا کہ اس نے تخت کی منگولوں سے حفاظت کی ہے اور اسے اپنے باپ کے لیے محفوظ رکھا ہے، دوسرے دن بغرا خاں نے ایک پیغام لے کر اپنے حاجب کو اپنے بیٹے کے پاس بھیجا۔ ابھی کشتی بیچ دریا میں تھی کہ کیقباد نے اس کی جانب ایک تیر پھینکا اور حاجب مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ بغرا خاں نے اسے دوسرا پیغام بھیجا: "میرے بیٹے! بغاوت کا ارادہ اپنے دل سے نکال دو، تخت کا میں وارث ہوں اور تم اسے میرے ذریعہ حاصل کر سکتے ہو، کیقباد نے ایک سخت جواب بھیجا: "اپنے حسب و نسب پر فخر نہ کیجیے کیونکہ کوئی بھی کسی سلطنت کا وارث اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کو قایم رکھنے کے لیے

---

(1) اس مثنوی قران السعدین (مولوی محمد اسمٰعیل علیگڑھ 1918ء ایڈیشن) میں اس تاریخی ملاقات کا تفصیل بیان ہے۔

(2) تاریخ فیروز شاہی ص ص 139-56۔

لڑنے کی طاقت نہ رکھتا ہو" میرا دعوا تخت پر تین نسلوں کی بدولت ہے۔ التتمش، ناصر الدین محمود اور بلبن۔[1]

بغرا خاں کو اپنے بیٹے کے اس سلوک پر بڑا افسوس ہوا مگر وہ سمجھ گیا کہ اس کی وجہ نظام الدین کا فتنہ پرداز منصوبہ ہے۔ بالآخر اس نے ایک محبت بھرا خط لکھا جس میں اس نے اپنے بیٹے سے ایک ملاقات چاہی جس کو دیکھنے کے لیے وہ اتنا ہی مشتاق تھا جتنا یعقوب، یوسف کو دیکھنے کے لیے تھے۔ بغرا خاں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کیکاؤس کو کیقباد کے پاس تحائف کے ساتھ بھیجا اور کیقباد نے اپنے بیٹے کیمرس کو اپنے باپ کے پاس بھیجا۔ اس تمام وقت کے دوران، نظام الدین برابر اس کے لیے کوشاں تھا کہ بغرا خاں اور کیقباد کے درمیان جھڑپ ہو جائے۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ کیقباد اس بات پر مصر ہو کہ اس کا باپ وہ تمام آداب دربار ادا کرے جو ایک ماتحت کرتا ہو۔ بغرا خاں نے غیر معمولی سلامت طبع کا ثبوت دیا اور ماتحتوں جیسے درباری آداب قبول کر کے نظام الدین کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

کیقباد نے (تخت شاہی پر بیٹھ کر) پتھر کی طرح بے حس عظمت کا مظاہرہ کیا اور شاہانہ بے تعلقی سے اپنے باپ کی طرف نظریں کیں، جو کہ جھکا ہوا زمین کو بوسے دیتا تخت تک پہنچا اور اس کے پیر پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ لیکن بالآخر کیقباد کا دل بھر آیا۔ اور وہ اپنے باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ اور اشک آلودہ آنکھوں کے ساتھ جس نے تمام تماشائیوں کے دل پگھلا دیئے، وہ اسے تخت پر لے آیا"۔ اس ملاقات کی تفصیل خسرو نے اپنی تمام غیر معمولی شاعرانہ تخئیل کی برجستگی کے ساتھ بڑی وضاحت سے بیان کی ہے۔ جب تمام جشن ختم ہو گئے اور بغرا خاں نے لکھنؤتی واپس جانے کا فیصلہ کیا تب جدا ہوتے وقت اس نے کیقباد کے کانوں میں سرگوشی کی اور اسے نظام الدین سے چھٹکارا پانے کا مشورہ دیا۔

کچھ دنوں تک تو کیقباد شراب اور صید افگنی سے بچتا رہا لیکن دلربا نوجوان معشوقاؤں کی وہ بڑی تعداد جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھی، اسے دو بار ہفتہ بھر میں،

---

(1) قرآن السعدین، ص 118 التتمش کی لڑکی بغرا خاں کی ماں تھی۔ ناصر الدین کی بیٹی کیقباد کی ماں تھی اس طرح اس کا دادا تھا۔ قرآن السعدین، ص 22 بھی ملاحظہ ہو۔

اس کے پرانے طریقوں پر لے آئی۔ حد سے زیادہ لطف اندوزی اور عیاشی نے اس کی صحت پر اثر ڈالا اور وہ بیمار پڑ گیا۔ نظام الدین نے مختلف جبلوں سے جانے میں تاخیر کی۔ ترکی افسران نے موقع غنیمت سمجھا اور نظام الدین کو ملتان کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا لیکن نظام الدین کو زہر دے دیا۔ برنی نے نظام الدین کے جاہ طلب کردار اور اسے نازیبا طریقہ کار سے سختی سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی انتظامی صلاحیتوں سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اس کی موت کے بعد حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ گرچہ دربار بلبن کے بہت سے پرانے امراء کیقباد کی ماتحتی میں کام کرنے کی غرض سے واپس آگئے تھے۔

جب نظام الدین کا راستہ ہٹ گیا تو کیقباد نے سامانہ سے ملک فیروز خلجی کو بلایا اور اسے ارض ممالک مقرر کیا۔ اور شائستہ خاں کے خطاب کے ساتھ باران کا گورنر بھی۔ ملک فیروز (جو بعد میں جلال الدین خلجی ہوا) اپنے بھائی، شہاب الدین، جو علی گرشپس (بعد میں سلطان علاؤالدین خلجی بنا) کا باپ تھا جو نئے عناصر کا غلبہ چاہتے تھے اور دوسرا بلبن کے خاندان کا اقتدار قایم رکھنا چاہتا تھا اور قدیم ترکی امراء کے مفادات کی مخالفت کر رہا تھا۔ جو اب تک ریاست میں حاوی رہا تھا۔ اسی اثنا میں جبکہ کیقباد، جسمانی اور دماغی لحاظ سے ناقابل علاج طور پر مفلوج ہو کر بے یار و مددگار کیلوگڑھی کے محل میں پڑا تھا، ملک کچھن اور ملک سرخہ نے اس کے بیٹے کیومرس کو شمس الدین دوم کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔ اور رسم تاجپوشی چبوترہ ناصری میں ادا کی گئی۔ ان لوگوں کا مقصد بلبن کے خاندان کو اور ترکی اشرافیہ کی طاقت کو بحال رکھنا تھا۔

اس کے بعد ترکی ملکوں نے اس گروہ سے جس کی قیادت ملک فیروز خلجی کر رہا تھا خلاصی کا ایک منصوبہ بنایا۔ انہوں نے ان ملکوں کی جن کو انہیں قتل کرنا تھا ایک فہرست تیار کی جس میں فیروز خلجی نام سرفہرست تھا۔ اس وقت خلجی ملک "بھوگل پہاڑی"[1] پر شاہی فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ملک احمد چپ 'نائب امیر حاجب' سے جب اسے اس سازش کا علم ہوا تو اس نے فوراً اپنا کیمپ غیاث پور کو منتقل کر دیا۔ اس نے اپنے

---

(1) برنی (ص 172) "بہار پور" لکھتا ہے لیکن عصامی (ص 203) اور یحییٰ سرہندی (ص 157) اسے "بھوگل پہاڑی" بتاتے ہیں جسکی شناخت آج بھی ہو سکتی ہے۔

رشتہ داروں کو باران سے یہ بہانہ کر کے بلا لیا کہ ایک متوقع منگول حملہ کے لیے اسے ان کی ضرورت ہے۔ بہت سے غیر ترکی افسران جو ترکوں کے اس خلاصی کے پروگرام میں شامل کر لیے گئے تھے وہ خلجیوں سے جا ملے۔ دوسرے دن ترکی گروپ نے کارروائی شروع کی۔ فیروز خلجی کے پاس ایک پیغام یہ کہتے ہوئے بھیجا گیا کہ وہ کیومرس کے دربار میں اپنے آپ کو حاضر کرے۔ خلجی ملک اس وقت قنوج کی فوج کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے حکم کا مقصد تاڑ لیا۔ اور حکم کی بجا آوری میں تاخیر کا فیصلہ کیا۔ اس کے فوراً بعد کچھن ایک نہایت اہم پیغام لے کر پہنچا۔ ملک فیروز نے بڑی چالاکی کی اور ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا اور اس نے کچھن کو یہ تاثر دیا کہ اسے سازش کے بارے میں معلوم ہی نہیں ہے۔ اس نے فوج کے معائنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھن سے درخواست کی کہ وہ اسے یہ کام ختم کر لینے دے۔ لیکن جیسے ہی کچھن ایک خیمہ میں آرام کرنے کے لیے گیا اس کا سر کاٹ کر اس کے جسم کو جمنا میں پھینک دیا گیا۔ اب ان دونوں مخالف گروپوں میں کھلی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ فیروز خلجی کے لڑکے تیزی سے محل میں داخل ہو گئے اور کیومرس کو پکڑ کر اپنے کیمپ لے آئے۔ چند ترکی افسران جس میں ایتمر سرخہ بھی شامل تھا، کمسن بادشاہ کو واپس لینے دوڑے لیکن انہیں پکڑ لیا گیا اور مار ڈالا گیا۔ فخر الدین کوتوال کے چند لڑکے بھی پکڑ لیے گئے اور ان کی زندگی کے خوف سے کوتوال نے دہلی کے عوام سے اپیل کی کہ وہ کمسن بادشاہ کے دوبارہ حصول کے لیے کوئی کوشش نہ کریں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلجی اس وقت تک شاہی اختیارات حاصل کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ غالباً جو کچھ کام انہوں نے کیا تھا وہ محض دماغی حیثیت کا تھا جب ابتدائی طوفان تھم گیا تو فیروز خلجی نے کیومرس کو کیلوگڑھی کے محل میں باضابطہ طور پر مسند نشین کیا۔ اس نے ملک چھجو کو ولی بادشاہ (Regent) کی ذمہ داری پیش کی اور سرحدی علاقوں – ملتان، بھٹنڈہ اور دیپال پور کی ذمہ داری اپنے لیے پسند کی۔ چھجو نے اس پیش کش کو رد کر دیا اور کڑا اور مانک پور کی گورنری کو ترجیح دی۔ فخر الدین کوتوال نے بھی ولی بادشاہ کی ذمہ داری سنبھالنے سے انکار کر دیا۔ چھجو اور فخر الدین کوتوال کے انکار کر دینے کے بعد کمسن بادشاہ کی نیابت (Regent) کی ذمہ داری ملک فیروز خلجی کی قسمت

میں آئی۔ تین ماہ سے کچھ زائد دنوں تک کیومرس تخت پر قایم رکھا گیا[1]۔ اس کے کچھ سکوں مورخہ 698ھ /1290ء کا بھی انکشاف ہوا ہے[2]۔ لیکن سیاسی اختیارات کا یہ مضحکہ خیز انتظام وانصرام زیادہ دنوں قایم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ فیروز خلجی نے کارروائی کا فیصلہ کیا۔ کیقباد کیلوگڑھی محل کے ایک حجرہ میں اپنی افسردہ زندگی گزار رہا تھا۔ ایک مَلِک جس کے باپ کو کیقباد نے مار ڈالا تھا، کو مناسب کارروائی [یعنی کیقباد کے قتل] کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے کیقباد کے مفلوج جسم کو ایک چادر میں لپیٹ کر دریائے جمنا میں لات مار کر پھینک دیا۔ اس کے ساتھ اقتدار کی وہ اجارہ داری جو سلطان معزالدین کے زمانہ سے اب تک ترکی غلام افسران کے ہاتھوں میں تھی، ختم ہو گئی۔

---

(1) تاریخ مبارک شاہی ص 61، ان کارروائیوں کی تشریح یحییٰ سرہندی نے برنی کے بہ نسبت زیادہ تفصیل سے بیان کی ہے لیکن کئی تفصیلات میں اس کا بیان برنی سے مختلف ہے۔ ملاحظہ ہو، ص 58-57۔

(2) رائٹ، ص 66، روجرس کا "لاہور میوزیم کیٹالوگ Catalogue نمبر 84، براؤن کوائنس آف انڈیا ص 71۔

چوتھا باب

خلجی خاندان

1

جلال الدین فیروز خلجی

جلال الدین فیروز کی تخت نشینی

جون 1290ء میں کیلوگڑھی محلہ میں شائستہ خاں جلال الدین فیروز خلجی کا حتمی طور پر اقتدار اعلیٰ حاصل کر لینا محض ایک شاہی خاندان کی تبدیلی سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ پچیس سال پیشتر بلبن کی تخت نشینی کے برخلاف اس [تبدیلی] کا مطلب ایک دور کا خاتمہ تھا کیونکہ مملوک خاندان کے ساتھ ساتھ اس نسل پرستی کا بھی خاتمہ ہو گیا جو قطب الدین التتمش اور ان کے جانشینوں کے سیاسی موقف کی امتیازی خصوصیت رہی تھی۔ ترکوں نے فتوحات کا آغاز کیا تھا اور اپنی غیر معمولی قوتوں سے دشمنی کو پسپا کر دیا تھا لیکن انھوں نے ریاست کی تنظیم میں نسلی عصبیت کو بہت اہم مقام دیا۔ یہاں تک کہ عالمگیر خلافت کی رسمی ماتحتی بھی اس کے ترکی کردار کو برائے نام ہی متاثر کر سکی [دہلی] سلطنت کو ایک ترکی کاروبار کی حیثیت دے کر اس کی باگ ڈور ایسے ہی لوگوں تک محدود کر دینے کی کوشش کی گئی جو، منگولوں کے حملوں اور ماحول کے اثرات کی وجہ سے اس [اقتدار] پر بلا شرکت غیر اپنی اجارہ داری کو قایم رکھنا دن بدن دشوار ہوتا ہوا محسوس کر رہے تھے، اور جنھیں بالآخر بلبن کے دورِ حکومت میں، مخالف عناصر کے خاتمہ کے لیے خطرناک طریقوں کو اپنانا پڑا۔ خلجی گروہ، جسے عام طور پر غیر ترکی سمجھا جاتا تھا، کی آسانی سے فتح نے اس حقیقت کی نشاندہی کر دی کہ نسلی مطلق العنانی زیادہ دنوں تک ریاست کو قایم نہیں رکھ سکتی تھی کیونکہ وہ ایک ایسے مرحلہ میں پہنچ چکی تھی جہاں نئی طاقتیں نئی امنگیں اس بات کی متقاضی تھیں کہ نئے طور پر انضباط قایم کیا جائے۔ فتوحات کے دور کے برجستہ طرائق اعمال (Improvisation) بنیادی تفرقہ انگیز رجحانات کا مزید تدارک نہیں مہیا کر سکتے تھے۔ توسیع مملکت کی ملتوی شدہ پالیسی سے زیادہ ایک باقاعدہ انتظامیہ کا قیام نظریے اور ایک نئے سماج کا متقاضی تھا۔

سلطان کا مصالحانہ مزاج نئے پروگرام کے لیے فالِ نیک ثابت ہو رہا تھا۔ عبوری مدت کو حتی الامکان سہل بنانے کے لیے اور شکست خوردہ شہریوں کی ترکوں سے عقیدت کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے دہلی میں اپنا داخلہ ملتوی کر دیا اور کیلوگڑھی میں کیقباد کے نامکمل محل میں اپنا دربار لگایا۔ اس کے بعد جب حکومت کی تشکیلِ نو ہوئی تو اس کے رشتہ داروں اور حمایتیوں کو فطری طور پر کلیدی عہدے ملے۔ لیکن پرانے امراء کی ایک عام بے دخلی سے دانشمندانہ طور پر گریز کیا گیا۔ بلبن کے دوست، اور شہر دہلی کے ممتاز شہری، ملک الامراء فخر الدین کی راجدھانی کے کوتوال کی حیثیت سے توثیق کر دی گئی جب کہ خواجہ خطیر وزارت پر برقرار رہا۔ اپنی قایم مقامی کے دور میں فیروز نے کڑا پر گورنری کے لیے ملک چھجو کی درخواست کو قبول کر لیا تھا اور وہاں بلبنی خاندان کے بچے کھچے افراد کو جانے کی اجازت اب دے دی گئی۔ اس کے رشتہ داروں میں سے فیروز کے بھائی یغرش خاں کو فوجی وزارت کی قیادت ملی جب کہ اس کا بھتیجہ احمد چپ نائب باربک بنا۔

جلال الدین فیروز کے جذبات واحساسات

بہر حال چند ماہ کے اندر ہی شہریوں کی نفرت وعداوت تقریباً اس کی تعریف و تحسین میں تبدیل ہو گئی۔ جب انہیں سلطان کے فطری انکساری اور مخالفین کے جذبات کے لیے اس کے انتہائی احترام کے بارے میں معلوم ہوا جیسا کہ برنی بیان کرتا ہے کہ شروع میں انعامات اور عہدوں کی لالچ میں لوگ اس سے صلح کے لیے بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ [اس کے پاس] آئے اور میل ملاپ کے لیے اس کے مخلصانہ اشتیاق کو دیکھ کر [تدریجاً] مطمئن ہو گئے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے سلطان کے اندر ایک بے مثال امن پسند اور مہربان دل آدمی پایا جو اپنی عمر کے ستر برس بتا چکا تھا اور جس کی صرف یہی ایک خواہش تھی کہ ایک پرہیزگار مسلمان کی طرح خدائی خدمت میں لگ کر اپنا دن بتا دے انہیں اب تک بلبن کا رعب دارانہ اور سرد مہری کا برتاؤ یاد تھا اور جب چند ماہ بعد دہلی میں اپنے پہلے سرکاری داخلہ کے موقعہ پر فیروز نے اپنے انسانی جذبات وخواہشات کا کھلم کھلا مظاہرہ کیا تو ان لوگوں کو کسی حد

تک یہ بات ناخوشگوار محسوس ہوئی۔ اقتدار کے نشہ میں مدہوش اس کے رشتہ داروں کی جھلاہٹ کی انتہا نہ رہی جب اس نے قصر سرخ کے دروازے پر گھوڑے سے نیچے اترنے پر اصرار کیا جس کے اندر- جیسا کہ اس نے احمد چپ کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا- وہ بسا اوقات بلبن کے سامنے گھٹنوں کھڑا رہتا تھا۔ اس نے شاہی دربارِ عام میں افسروں کی مخصوص جگہوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر چیخ اٹھا اور اس نے علی الاعلان کہا کہ چھجن اور سرخد کے مفسدانہ ارادوں کی وجہ سے اسے زبردستی تاج پہننا پڑا اور اسے اپنے بچوں اور رشتہ داروں اور دیگر متوسلین کے مستقبل کو خطرہ میں ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا کیوں کہ اس جیسا کوئی معمولی نسل کا آدمی اپنے چند پیروکاروں کے ساتھ کیوں کر تاج کو سنبھالے رہنے اور اسے اپنے بچوں کے لیے میراث کے طور پر چھوڑنے کی کبھی امید کر سکتا ہے۔ جب کہ بلبن جیسے قوی ارادہ اور مستحکم بادشاہ کے خاندان کے ہاتھوں سے یہ [سلطنت] اس کی موت کے تین سالوں کے اندر ہی نکل گئی؟"

اس طرح کے جذبات واحساسات ایک ایسے بھولے بھالے اور مخلص دل کی ترجمانی کرتے ہیں جسے اقتدار نے آلودہ نہ کیا تھا اور جو بچوں کی طرح گول مول باتوں سے احتراز میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ اس وجہ سے سیدھے سادھے اور غیر سیاسی لوگوں کی نظر میں وہ ایک درویش صفت حکمراں تھا کیونکہ آئین ملکداری کو اپنے دلی جذبات کا تابع بنا کر اس نے گزشتہ مطلق العنانوں سے اپنے آپ کو مکمل اور پسندیدہ طور پر ممتاز کر لیا تھا۔ شاید اس کا دور حکومت رائج الوقت "خون و آہن" کے طریقۂ حکومت سے شعوری احتراض کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے۔ اور جیسا کہ برنی اشارہ کرتا ہے کہ اس رحم دل ضعیف [بادشاہ] کا قصور نہ تھا کہ محبت کی طاقت میں اس کے یقین کا جو بے جا فائدہ اٹھایا گیا۔ لیکن ان حقیقت پسند سیاست دانوں کے دل میں جنھوں نے بلبن کی سخت اور بے دردانہ روایات میں تربیت پائی تھی، فیروز کے جذباتی اظہارات اور اضطراری افعال سے اندیشہ ہو گیا۔ کیونکہ حالات شاہی اختیارات کے نہایت جارحانہ استعمال کے متقاضی تھے۔ نئے خاندان کے لیے وفاداریوں کو حاصل کرنا اور مرکزی حکومت کے رعب ودبدبہ کی بحالی کے ذریعہ تحفظ وہ انضباط قایم کرنا ایسے کام تھے جن

کی عاجلانہ ضرورتیں کسی قسم کی مشق آزمائی کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ یہ محض نہ پسیجنے والی سخت دلی تھی جس کے ذریعہ بلبن مملکت میں امن پسند ضمانت دینے کے قابل ہو سکا تھا۔ لیکن مشرقی صوبوں میں اس کی دہشت پسند پالیسی کے باوجود دہلی کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ مرحوم بادشاہ کی حسرتناک موت سے تاج کے وقار کو نقصان پہنچا تھا اور اس کے لیے قوی اقدامات کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ جذباتی نرم خوئی ایک ایسے بادشاہ کو زیب نہ دیتی تھی جس کا پہلا فرض مغربی پنجاب سے منگولوں کو نکال باہر کرنا تھا اور سلطنت کی توسیع کا آغاز کرنا تھا۔

ملک چھجو کی بغاوت

لیکن فیروز اپنے دل کی پکار پر قایم رہا اور "چند روزہ اقتدار کی غیر یقینی شان و شوکت" کے لیے مسلمانوں کا خون بہانے اور اپنے رفیقوں پر مصائب ڈھانے سے اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ لیکن جلد ہی اس کی امن پسندی ایک سخت آزمائش میں پڑ گئی۔ اسی سال اگست (1290ء) میں ملک چھجو کشلی خاں جو بلبن کا بھتیجہ اور پرانے شاہی خاندان کا سردار تھا، نے کڑا میں پرچم بغاوت بلند کیا۔ اس سے پہلے ملک چھجو نے قایم مقامی (Regency) کی پیشکش ادا کر دی تھی جب عارض ممالک کی حیثیت سے، فیروز نے خلجیوں کے خلاف ایک سازش کو ناکام بنا دیا تھا۔ اور نہایت کم عمر کیومرس کو تخت پر بٹھا دیا۔ ممکن ہے چھجو اس سازش میں ملوث نہ رہا ہو لیکن اس پہلو سے اس کی ہمدردی فطری تھی اور غالباً فیروز اس سے ناواقف نہ تھا۔ اس لیے اسے (چھجو) نے مصلحتاً ایک بالفعل حکمراں سے (De-Facto.Ruler) الگ تھلگ مشرق میں سکونت اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ امید تھی کہ اگر ممکن ہو سکا تو اپنے چچیرے بھائی بغرا خاں، جس نے 1287ء میں[1] بنگال میں آزادانہ طور پر خود مختاری حاصل کر لی تھی، کی حمایت حاصل کر کے بالآخر ایک وسیع تر مزاحمت کی تشکیل کر سکے گا۔ محترم المقام فخر الدین کوتوال- جو نئے نظام حکومت کا سرگرم حامی نہ تھا، نے فیروز کی ہچکچاہٹ کو دور کر دیا اور ملک (چھجو) کو کڑا کا اقطاع دے دیا گیا۔ اور اسے بلبنی خاندان کے تمام زندہ افراد کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی گئی۔[2]

---

(1) تاریخ مبارک شاہی ص54 (2) ایضاً ص59

کڑا میں ملک نے اپنا منصوبہ بنایا اور جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے کہ اودھ کے گورنر امیر علی حاتم خاں اور پرانے دورِ حکومت کے دیگر امراء جو شرق میں عہدوں پر فائز تھا، گرمجوشی کے ساتھ اس سے آملے۔[1] بلغی خاندان کو گنگا پار کے علاقوں کے ہندو سرداروں کو بھی وسیع پیمانے پر رعایات حاصل تھیں کیونکہ راناؤں اور رواتوں کی ایک بڑی تعداد اپنے مشہور پیادوں اور تیر اندازوں (ڈھانک) کے ساتھ چھجو سے آملی تھی۔ رواتوں نے چھجو سے پان کے پتے قبول کر لیے تھے-جو وفاداری اور دوستی کی علامت تھی-اور ڈینگیں ماری تھیں کہ وہ فیروز شاہی کے شاہی چھتر کو توڑ ڈالیں گے۔[2] اس طرح کی حمایت کی وجہ سے اور اس واقفیت کی بنا پر کہ راجدھانی اور قرب وجوار کے اضلاع میں اب تک خلجیوں کو جائز وارث کی حیثیت سے قبول نہیں کیا گیا تھا۔ چھجو نے- جیسا کہ برنی بتاتا ہے[3]- خود کو سلطان مغیث الدین اعلان کرا دینے، اپنے سکّے جاری کرانے، اپنے نام کا خطبہ پڑھانے اور خود مختاری کے مخصوص اختیارات حاصل کرنے کے قابل سمجھ لیا۔ اس بات کی توثیق اب نہیں ہو سکتی تھی کہ یہ اقدام اس نے بغرا خاں کے اس منصوبہ میں شمولیت[4] یا انکار یا مجبوری کے [اظہار] کے بعد کیا یا پہلے۔ بغاوت کی وسیع تیاریوں کی خبر جب پھیلی تو وہ افسران جو دوآب اور اس کے پار کے علاقوں میں مقیم تھے، اپنے آپ کو الگ تھلگ مقامات پر غیر محفوظ محسوس کرنے لگے

---

(1) برنی ص 181 اس کا نام حاتم خاں مولازادہ سلطان بلبن (سلطان بلبن کا ایک آزاد کردہ غلام بتاتا ہے۔ اسے کیقباد نے سرجاندار (شاہی حفاظتی دستہ کمانڈر) مقرر کر دیا تھا۔ (تاریخ مبارک شاہی ص 53) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیومرس کی تخت نشینی کے موقع پر [اسے اودھ کا گورنر] مقرر کر دیا گیا تھا اور سرجاندار کا عہدہ جواب دو حصوں میں بٹ گیا تھا احمد چپ اور ملک ہرن مار کو ملا (مبارک شاہی ص 62) مشرق کے افسروں کمیں ملک الپ غازی جن کے سپرد کرک (؟) تھا ملک بہادر ملک مسعود (آخور بیگ) اور ملک محمد بلبن تھے (مبارک شاہی ص 64) برنی نے (ص 183) ملک اہغی، ملک تاجودرا اور ملکا اہجن کے کارناموں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

(2) برنی ص 18 امیر خسرو اپنی مفتاح الفتوح (مرتبہ پروفیسر اے رشید علی گڈھ 1954ء ص 14 میں انہیں ہندو چوروں کا نام دیتے ہیں۔ تاریخ مبارک شاہی (ص 63) میں ان سرداروں میں سے ایک کا نام بیرم دیو یا بھیم دیو کو ٹلہ دیا گیا جو آخری جنگ میں مارا گیا تھا۔ حکمراں طبقہ کے ان دونوں پرانے گروپوں میں اتحاد کا ہونا اہمیت کا حامل ہے اتحاد دوسری کی ایک وجہ یہ حقیقت ہو سکتی ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور مغرب کی سمت واپس ہونے لگے۔ راجدھانی اور اس کے اطراف میں اپنے طرفداروں کی حمایت اور برنی کے الفاظ میں چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی مانند لاتعداد پیروؤں پر اعتماد کر کے چھجو نے دہلی کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا[5]۔ شاید امروہہ کے خط سے شہر پہنچنے کا ارادہ کرتے ہوئے وہ گنگا کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب بڑھا اور بدایوں کے راستے رام گنگا کے کنارے کنارے چلا جہاں اس کے دو حمایتی ملک بہادر اور الپ غازی اپنی فوجوں کے ساتھ اس کا انتظار کر رہے تھے۔[6]

یہ کوئی ناقابل اعتنا جنگی چال نہ تھی۔ لیکن فیروز کی نرم مزاجی اپنے اندر ایک پختہ کار جنگجو کو چھپائے رکھتی تھی جو براہِ راست عسکری للکار کی قدر افزائی کر سکتا تھا۔ اپنے سب سے بڑے لڑکے خان خاناں کو راجدھانی کا انچارج بنا کر اس نے اپنی فوجیں مرتب کیں اور کوئل (علی گڑھ) کے راستے بدایوں کی طرف بظاہر روہیلکھنڈ کے راستے کو بند کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔[7] اپنے آگے اس نے اپنے بیٹے ارکلی خاں کی ماتحتی میں ایک دستہ دعویدار (تخت) کا سراغ لگانے اور اسے روکنے کی غرض سے روانہ

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ)

(جس کے بارے میں مفتاح الفتوح اشارہ کرتی ہے) کہ ہندو سرداروں نے مرکزی حکومت کو کئی سالوں سے خراج ادا نہیں کیا تھا۔

(3) برنی ص 181۔

(4) بلاشک وشبہ بغرا کا دورِ حکومت 1289ء کے آخر تک ختم ہو گیا تھا کیونکہ اس کا بیٹا اور اس کا جانشین رکن الدین کیکاؤس نے اپنے سکے 1290ء میں جاری کیے (مجلہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی 1922ء ص 410) ریاض السلاطین میں ایک روایت درج ہے کہ جلال الدین فیروز کے تخت نشینی پر بغرا نے بادشاہت کے نشانات و علامات ترک کر دیے (ترجمہ اسلام کلکتہ 1904ء ص 90 چونکہ اس نے دہلی کی فرمانروائی قبول نہ کی اور اس کے بیٹے کیکاؤس نے اس کی جانشینی کی اور خود مختاری کے تمام مخصوص اختیارات کو برقرار رکھا، لہٰذا کیا یہ ممکن ہے کہ بغرا کی دست برداری اور اس کے بیٹے کی جانشینی کا تعلق اودھ کے واقعات سے ہو؟ شاید بغرا چھجو کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے حقیقت پسند وزراء نے اس کی مخالفت کی اور انھوں نے کیکاؤس کو تخت پر بٹھا دیا۔

(5) برنی، ص 7

(6) تاریخِ مبارک شاہی ص 63 لوگ ایک ساتھ کرک (؟) کے مقام پر آملے اور تب گنگا کو دوبارہ پار کر کے انہوں نے، بہلانا، گاؤں میں اپنے خیمے گاڑھ دیئے۔

کر دیا۔ اپنے والد سے دس یا بارہ کروہ امروہہ کی سمت میں آگے چل کر شہزادہ باغی فوج تک جا پہنچا جو راہب (رام گنگا) کی دوسری جانب حرکت کر رہی تھی۔ کشتیوں کی کمی کی وجہ سے جنہیں دشمنوں نے چھین لیا تھا، ارکلی خاں صرف رات ہی میں بیڑوں اور چھوٹی کشتیوں پر ایک مختصر فوجہ دستہ بھیج سکا۔[8] حملہ کامیاب ثابت ہوا اور دشمنوں میں ابتری پھیل گئی اور جیسا کہ امیر خسرو لکھتا ہے کہ وہ خیموں کو توڑ کر تیزی کے ساتھ شمال کی جانب خیالہ کی پہاڑیوں کی طرف نکل گئے۔[9] دو نوں تک ارکلی خاں ویران خیموں کو لوٹتا رہا اور اس کے بعد تیزی سے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اس اثنا میں جب کہ فرخ آباد کے قریب بھوجپور میں گنگا پار کر کے سلطان روہلکھنڈ کے راستے آگے بڑھا اور چھوٹے دعویدار کے ہندو مسلم جماعتوں سے برسرپیکار ہوا۔ شہزادے نے رام گنگا کے پل پر دشمنوں کو جا لیا۔ پورے دن چھجو بڑی دل جمعی سے لڑتا رہا۔ غروب آفتاب تک جنگ غیر فیصلہ کن رہی لیکن رات کو اس کے ایک ہندو حامی رائے بھیم دیو کے ایجنٹ نے عقب سے سلطان کے جلد ہی پہنچنے کی اطلاع دی۔ اس خبر سے اس کی طاقت نے جواب دے دیا اور وہ اپنے چند پیروکاروں کے ساتھ چپکے سے خیمہ سے نکل گیا۔ صبح میں ارکلی خاں نے دریا پار کیا اور اسے بہت ہی آسانی سے فتح حاصل ہو گئی۔ بھیم دیو اور الپ غازی مارے گئے اور ملک مسعود اور بلبن گرفتار ہوئے اور تب بغیر سردار کے باغیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔[10] چند دنوں بعد چھجو کو بھی ایک فیصل کشیدہ دیہات (مواسی) میں گرفتار کر لیا گیا جہاں اس نے پناہ لے رکھی تھی۔ اور جس کے سردار نے اس کے تعاقب کرنے والوں کے حوالہ کر دیا۔[11]

فیروز جو اس وقت بھی روہلکھنڈ میں تھا، جب اس سے ارکلی خاں قیدیوں کے ساتھ جا ملا، اب دریائے سرجو (گھاگھرا) کے کنارے واقع مشرقی اضلاع کی طرف مڑ

---

(7) تاریخ مبارک شاہی میں اس مقام کا نام کبر بتایا گیا ہے جہاں سے ممکن ہے کہ چھجو یا ہو۔ ایلیٹ (جلد سوم ص539) ایک حاشیہ میں کہتا ہے کہ کبر روہلکھنڈ میں ہے۔

(8) مفتاح الفتوح ص ص 13-12

(9) ایضاً ص 13، تاریخ مبارک شاہی میں ہے (ص 63) اسے 'جیاد' کا نام دیا گیا ہے۔

(10) تاریخ مبارک شاہی میں اس کا نام پیرم دیو کوٹلہ لکھا ہے۔ (11) برنی ص 184

گیا۔ تاکہ ایرانی حکومت کے مقامی حمایتوں کی سرزنش کرے اور ضمناً ہندستان کے راستہ پر ڈاکوؤں سے پُر جنگلوں کا صفایا کردے۔ بعضوں نے، مثلاً روپل کے سردار نے اطاعت قبول کرلی اور زبردست خراج ادا کیا اور بعض دوسرے سرداروں مثلاً کھسن کے علاقے تاراج کیے گئے۔ ہندو باغیوں کو پھانسی دی گئی اور ہندستانی مسلمانوں کو غلاموں کی طرح بیچ دیا گیا۔[1]

فیروز کی اعلیٰ ظرفی

اپنے اندر کے پوشیدہ سپاہی کالوہا منوا کر فیروز نے ایک ایسی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا جس نے اس کے ساتھ دشمنوں کو شرمندہ کر کے رکھ دیا۔ لیکن جس کا اس نے بہت جذباتی انداز میں مبالغہ آمیز طور پر مظاہرہ کیا۔ وہ روہلکھنڈ میں اپنے خیمہ پر تھا کہ قیدی امراء وہاں لائے گئے۔ جیسے ہی اس نے شکست خوردہ امراء کو ننگے سر بیڑیاں پہنے اور خاک آلودہ کپڑوں میں دربار کے میدانوں میں لے جاتے دیکھا، سلطان کرب سے چیخ اٹھا، اپنی آنکھیں بند کرلیں اور طیش میں حکم دیا کہ پرانے زمانہ کی طرح قیدیوں کو کپڑے پہنچائے جائیں ان کی مہمان نوازی کی جائے۔ بعد میں اس نے امیر علی سرجاندار اور اعلیٰ امراء کو ایک دعوت اور احباب کی ایک محفل میں مدعو کر کے راسخ العقیدہ سیاست دانوں کی حیرت زدہ کر دیا[2]۔ جام دور جب شباب پر تھا تب اس نے دل شکستہ و شرمندہ امراء سے لطف و کرم اور تسلی و تشفی کی باتیں کیں اور دور اندیش احمد چپ کی سراسیمگی کی حد نہ رہی جب اس نے اپنے آقا کے خاندان کے لیے ان کی وفادارانہ اور مخلصانہ کوششوں کو بڑے پُر جوش طریقے پر سراہا۔

بلبن کے طریقوں کے مطابق باغیوں کو سزا دینے کے سلسلہ مین اپنی توقعات

---

(1) مفتاح الفتوح ص ص 21-23

(2) برنی، صفحہ 173 کہتا ہے کہ اس واقعہ کو شاعر امیر خسرو نے بتایا۔ سلطان ایک مونڈھے (سرکنڈے کی کرسی) پر بیٹھتا تھا اور خسرو اس کے بغل میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ برنی قطعی طور پر امیر علی سرجاندار، ملک طرغی کا بیٹا ملک الغی ملک تاجور اور ملک اجن، دوسرے بڑے امراء کا ایسے قیدیوں میں حوالہ دیتا ہے جن کی گردنوں میں طوق دوشاخہ تھے ملک چھجو اس وقت تک گرفتار نہ ہوا تھا۔ [نوٹ: یہاں پر صفحہ 183 ہونا چاہیے۔ مترجم)

نہ پوری ہونے کی وجہ سے۔ کیونکہ بادشاہ نے اس سے زیادہ سخت کوئی قدم نہ اٹھایا کہ چھجو کو ملتان میں باعزت طور پر قید کر دیا اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ برہم بھتیجے نے بادشاہوں جیسی سختی یا دست برداری کا سخت مطالبہ کیا۔ لیکن فیروز نے پرجوش طریقے پر اقرار کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ ظلم و تشدد اور خونریزی کے ساتھ حکومت چلانے سے قاصر ہے۔ اور اس نے اس بات کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کر دی کہ وہ اپنے رشتہ داروں میں سے کسی ایسے شخص کے لیے جگہ خالی کرنے کے لیے تیار ہے جو اپنی بنیادی انسانیت کے بدلے ایسی ”ناخداترس' انسان کش بادشاہت “ کرنے پر تیار ہو۔ وہ اپنی زندگی کے اس آخری دور میں ان ممتاز لوگوں اپنے باعزت دوستوں اور سرپرستوں کو قتل یا ان کی بے عزتی نہیں کر سکتا تھا۔ کیا وہ کبھی ان دنوں کو بھول سکتا تھا جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ افسروں کی قطاروں میں کھڑا رہتا تھا اور بڑے اشتیاق سے اس بات کی توقع کرتا تھا کہ حاتم خان ان کے سلاموں کا جواب دے؟ ممکن ہے کہ [یہ] باغی اس کو اس طرح کا موقع نہ دیتے لیکن اس حالت میں، وہ بڑی سادگی سے یہ دلیل پیش کرتا ہے ”مسلمانوں کے خون بہانے کا گناہ ان پر ہوتا اور خدا انہیں جہنم میں جھونک دیتا، میں نے فتحیابی کا شکرانہ ان کے ساتھ رحم کر کے ادا کیا کیونکہ بہر حال وہ انسان ہیں اور مسلمان ہیں اور یقیناً وہ فیاضی کی قدر کریں گے اور احسان مندی کے احساس سے وہ مجھے مزید کوئی نقصان پہنچانے سے باز آجائیں گے۔“ کم از کم ایک بار بھی اس کے اس اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچی کیونکہ شکست خوردہ امراء نے اسے مزید کوئی ضرر نہ پہنچایا۔

فیروز کی عسکری مہمات

اپنی واپسی کے فوراً بعد سلطان کو ایک دوسرے فوجی مقابلہ سے دوچار ہونا پڑا۔[1]

---

(1) واقعات کے تسلسل کو واقعہ نگاروں نے اگرچہ مختلف انداز میں بیان کیا ہے لیکن عصامی اور تاریخ مبارک شاہی کا مصنف منگولوں کے حملہ کو چھجو کی بغاوت کے فوراً بعد منڈاور اور رنتھمبور مہم سے پہلے رکھنے پر متفق ہیں۔ امیر خسرو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ چھجو کے خلاف مہم سے سلطان کی واپسی کو بیان کرتا ہے (حر، ص 11، 23، 12-16) یہ بات کہ سیدی مولا کے واقعہ کے قبل ہی منگولوں کا حملہ ہوا تھا۔ اس حقیقت سے ثابت ہوتا ہے کہ منگولوں کا سردار الغو جو عبداللہ کے حملہ کے بعد (باقی اگلے صفحہ پر)

سنام دیپال پور ملتان سرحد پر جہاں ابھی فوراً ہی ارکلی خاں کو مقرر کیا گیا تھا۔ ایک بار پھر عبداللہ نامی ایک منگول کی قیادت میں منگولوں نے حملہ کر دیا۔[1] فیروز نے [اس] سرحدی کمان میں عمر گزاری تھی اور کافروں سے جنگ کرنے میں خوشی محسوس کرتا تھا فوراً اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہو گیا۔[2]

حملہ آوروں سے جس مقام پر مڈبھیڑ ہوئی اس کا نام واقعہ نگاروں نے 'بررام' بتلایا۔[3] مقدمہ الجشوں کے درمیان چند روزہ معمولی نوک جھونک کے بعد جس میں دہلی کے فوجوں کا پلڑا بھاری تھا۔ منگول بغیر لڑے واپس ہونے پر راضی ہو گئے۔ سلطان نے عبداللہ، جسے اس نے اپنا بیٹا کہا، کو مبارکباد بھیجیں۔ لیکن اسی اثنا میں کہ عبداللہ سرحد پر سے واپس ہو رہا تھا ہلاکو کے دوسرے پوتے الغو کی قیادت میں منگولوں کی ایک جماعت نے اسلام قبول کر لیا اور وہیں رہی گئی اور اس نے ہندستان میں مقیم ہونے کی

(بقیہ صفحہ 447) دہلی میں مقیم ہو گیا تھا نے سدی کے غدارانہ ارادے کی خبر دی تھی (مبارک شاہی ص65) سدی کو ارکلی خاں نے دہلی میں اس وقت گرفتار کیا تھا جب سلطان منڈوار مہم کی وجہ سے باہر تھا۔ مبارک شاہی (ص64) کے مطابق خان خاناں منگول حملہ کے فوراً بعد انتقال کر گیا تھا اور ارکلی خاں جو اپنے بھائیوں کا رقیب تھا، کو ملتان سے بلا لیا گیا اور اسے دہلی کا انچارج بنا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ خان خاناں جو سدی کا ایک جوشیلا پیر تھا، زندہ رہتا تو سدی کی گرفتاری عمل میں نہ آتی۔

(1) برنی (ص218) عبداللہ کو منحوس ہلو (ہلاکو) کا پوتا کہتا ہے۔ مبارک شاہی (ص24) اسے خراسان کے شہزادے کا بیٹا بتلاتی ہے۔

(2) اس کی کھری ایمانداری کی ایک مثال کی حیثیت سے برنی (ص ص 192-97) بیان کرتا ہے کہ منگولوں کے خلاف اپنی زندگی بھر کی لڑائی کے مدِ نظر کس طرح اس نے اپنی بیوی سے اپنی تخت نشینی کے بعد اس خواہش کا اظہار کیا کہ اسے "المجاہد فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ میں لڑنے والا) کے لقب سے موسوم کیا جائے۔ اور اس نے خواہش کی کہ وہ قاضی اور ان شیوخ کو جو اس کے چھوٹے لڑکے کی شادی کے موقعہ پر مبارک باد دینے آئیں گے، یہ مشورہ دے کہ وہ لوگ سلطان سے درخواست کریں کہ وہ انہیں اس خطاب کو جمعہ میں شامل کرنے کی اجازت دے دے۔ لیکن جب اس نے ایسا کیا اور قاضی فخر الدین ناقلہ نے واقعی نئے چاند کی مبارک بادیوں کے موقعہ پر یہ درخواست کی تو سلطان نے بڑی انکساری سے انکار کر دیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ اس نے اس خطاب کی خواہش کی تھی لیکن بعد میں غور و خوض کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کا مستحق نہیں۔

(3) عصامی فتوح السلاطین (مہدی حسین ایڈیشن ص205) برنی ص218۔

دعوت دی، جہاں انہیں مکان و وظائف اور سماجی مراتب عطا کیے گئے۔[1] لیکن عام انتظامی امور کی انجام دہی اس وقت تقریباً ناممکن ہو گئی جب سلطان نے اس کشادلی کا ثبوت ٹھگوں جیسے شق القلب مجرموں کے ساتھ پیش کیا جن میں سے ایک ہزار مجرمین تو ثابت شدہ قتل اور شاہراہ پر ڈکیتی کے جرائم میں ماخوذ تھے۔ ان کی قسمت پر رحم کھا کر اور ان کی ندامت اور وعدوں کو قبول کر کے سلطان نے انہیں کشتیوں میں بھر کر نشیبی گنگا کی طرف بھجوادیا اور لکھناؤتی کی سرحد پر انہیں رہا کروادیا۔

پھر بھی سلطان کی فوجی طاقت محفوظ تھی۔ اسی سال اس نے راجپوتانہ میں چوہانوں کے خلاف ایک مہم شروع کی جن کی طاقت اس وقت مشہور، ہمیرا کے زیر قیادت رنتھمبور میں مرکوز تھی اور ہر سمت میں وہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ ان لوگوں نے عملاً اجمیر کو گھیر لیا تھا اور ہریانہ کے صوبے بھی ان کا دباؤ محسوس کر رہے تھے جہاں میواتی مقاتل کی (کارروائیوں) کے سبب پہلے سے ہی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ بلبن کی کوششیں بھی انہیں دبانے میں ناکام رہی تھیں۔ ان کے خلاف ایک وسیع پیمانہ کی جارحانہ کارروائی حقیقت میں اتنی ہی زیادہ اہم تھی کہ جتنی کہ سندھ کے سرحد کی بازیابی۔ طبیعتاً اور طویل تجربے کی بنا پر بھی فیروز ایک ایسے موقع کا آرزومند تھا کہ ایک 'جہاد' ہو اور وہ کھلے میدان میں جنگ کرے"۔ لیکن جیسا کہ نتیجہ ظاہر ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کے دوبارہ تسلط کے لیے ایک زبردست مہم اس سے کہیں زیادہ سوچی سمجھی جارحانہ کارروائی اور ثابت قدمی کی متقاضی تھی جتنی کہ دراصل اس کے قبضۂ اختیار میں تھی۔

ایواری اور نارنول سے گزر کر شاہی فوجیں الور میں داخل ہو گئیں اور انہوں نے منڈاور[2] کا محاصرہ کر لیا جو غالباً چوہانوں کی شمال کی آخری چوکی تھی۔ اس قلعہ سے

---

(1) برنی ص219

(2) برنی اور مبارک شاہی میں اس جگہ کا نام مندروج درج ہے لیکن عصامی اسے 'منداور' کا دیتا ہے اور طبقاتِ اکبری میں اس کا نام 'ماندو' ہے جو ناممکن ہے۔ اس کی شناخت سوائے منداور کے جو سیر الک کے علاقہ میں ہے دوسری کسی جگہ کے ذریعہ ناممکن ہے۔ صرف عصامی (ص ص 9-208) اور مبارک شاہی (ص64) قلعہ پر قبضہ کا حوالہ دیتے ہیں جس میں موخر الذکر کے مطابق چار ماہ صرف ہوئے تھے۔ قیاس ہے کہ اس مدت میں جھابن اور رنتھمبور کے خلاف مہمات بھی شامل تھیں۔

کوئی بڑی مزاحمت نہ ہوئی اور دیہاتی علاقوں میں لوٹ مار سے کافی مالِ غنیمت مویشیوں کی شکل میں ہاتھ لگے۔ چمبل سے مغرب کراؤلی کے علاقہ سے گزر کر رنتھمبور کی طرف پیش قدمی کر کے شاہی فوجیں دو ہفتے میں جھابن کے قریب پہنچ گئیں جو چوہان راجدھانی تک جانے والے راستہ کے لیے ایک بچاؤ کا کام کرتا تھا۔ قراالبہادر کی ماتحتی میں ایک قراولی دستہ بھیجا گیا جس نے قلعہ سے دو فرسنگ نزدیک کے فاصلے پر کھدیڑ کر راجپوتوں کی ایک نہایت طاقتور فوج کو نمایاں طور پر شکست دے دیا، جو بے وقوفی سے قلعہ کے باہر حملہ آوروں سے دوبدو جنگ کے لیے نکل آئی تھی۔ چوہانوں کا کمانڈر جو گردن سائی نامی ایک مشہور جنگجو تھا، مارا گیا اور شکست خوردہ راجپوت جو ہر سمت میں بھاگ رہے تھے ان کا پیچھا چمبل کنواری اور بنارس کی دریاؤں کے پار تک کیا گیا۔ اس شکست کے بعد فوجی سردار نے جھابن قلعہ کو خالی کر دیا اور رنتھمبور چلا گیا۔ اس کے بعد جھابن کے قلعہ کے مورچہ بندی مسمار کر دی گئی[1]۔ جب کہ سپاہی لوٹ مار کر رہے تھے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے کی فکر میں تھے، سلطان اپنے بت شکنی کے جذبے کو بت شکنی کے ذریعہ تسکین دے رہا تھا حالانکہ وہ ان کی صناعی اور نقوش کی تعریف بھی کرتا جارہا تھا۔[2]

جب کہ جس مبینہ آسانی کے ساتھ جھابن پر قبضہ کر لیا گیا (اس کے برخلاف) رنتھمبور کی فتح کچھ زیادہ ہی دشوار کن ثابت ہوئی۔ قلعہ مضبوط تھا اور ایک ڈھلوان پہاڑی پر واقع تھا۔ سلطان نے محاصرہ کا فیصلہ کیا اور اپنے جھابن کے خیمہ سے فرمان جاری کیا کہ ضرور منجنیقین (مضربیہا)، ساباطہا اور گرگجہا نصب کی جائیں اور ایک پاشیب تیار کی جائے۔ جس وقت یہ تیاریاں جاری تھیں فیروز معائنہ کے لیے نکلا۔ لیکن جب اس نے ناقابلِ تسخیر قلعہ کو دیکھا اور اس پر حملہ کی قیمت کا اندازہ اپنے فوجوں کے مصائب سے لگایا تو وہ جذبات سے مغلوب ہو گیا اور اس کا عزم جو پہلے ہی راجدھانی اور خود اس کے خیمہ میں سازش کی اطلاعات کی وجہ سے کمزور پڑ چکا تھا بالآخر کمزور پڑ گیا۔

---

(1) مفتاح الفتوح۔ ص ص 21-30

(2) مفتاح الفتوح (ص 30) میں درج ہے کہ جھابن کے خلاف پوری کارروائی میں صرف ایک ترک سپاہی زخمی ہوا حالانکہ ہزاروں کی تعداد میں راوت مارے گئے۔

”اس طرح کے اس قلعوں کے عوض بھی کسی مسلمان کے روئیں کے نقصان کا خطرہ بھی مول لینے سے انکار کرتے ہوئے اس نے فوری واپسی کا حکم نافذ کیا۔ احمد چپ نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے اس خطرے کی نشاندہی کی کہ اس طرح ہندوؤں کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور اس سے درخواست کی کہ کم از کم وہ محمود اور سنجر جیسے بادشاہوں کی تقلید کرے جس کی بلاشبہ پارسائی کبھی ان کے شاہانہ کاموں میں رکاوٹ نہ بنی۔ لیکن فیروز نے اس کے جواب میں کوئی اطمینان بخش دلیل پیش نہ کی سوائے اس کے کہ اس نے اپنے سابقہ عقائد کو دہرایا اور برحق انداز مگر غیر منطقی طور پر اس بات کو رد کر دیا کہ اس کا مقابلہ ایسے لائق بادشاہوں کے ساتھ کیا جائے جن کی مملکتوں میں، برخلاف اس کی مملکت کے، ایک بھی بت پرست نہ تھا۔[1]

فیروز شاہی اور سازشی [افراد] سِدی مولا کا معاملہ

یہ بات بالکل واضح تھی کہ فیروز جیسا ایک عصالہت پسند (idealist) بادشاہ فن ملک داری نہیں سیکھے گا اور اگرچہ برنی، جو خود ویسا ہی غیر سیاسی تھا اس کی ذاتی خوبیوں کی تعریف کرتا رہا مگر (اس کے) درمیان چہ می گوئیاں مسلسل اور زور زور سے ہونے لگیں۔ ذاتی اجتماعات اور شرابوں کی محفلوں میں وہ لوگ اس کی حد سے زیادہ انکساری اور مرعوب نہ کر سکنے کی افسوسناک نااہلیت پر گفتگو کرتے۔ مندوار رنتھمبور مہم کے دوران ایسے ہی ایک اجتماع میں جو ملک تاج الدین کوچی کے گھر پر ہوا تھا، اور جب شراب کی وجہ سے وہ لوگ اپنے احساسات کے اظہار میں غیر محتاط ہو رہے تھے تب سلطان کے کچھ قریب ترین لوگوں نے بڈھے کو مار ڈالنے اور تاج الدین کو چاکو تخت نشین کرنے کے متعلق بڑھ چڑھ کر باتیں کیں۔ اس طرح کی باغیانہ اگرچہ نشہ کی حالت میں گفتگو نے فیروز جیسے نرم مزاج کو مشتعل کر دیا لیکن اس نے محض ان لوگوں کو ایک ذاتی میٹنگ میں بلایا اور ایک بار پھر اس نے جذبات سے معمور اپنی انسان پرستی کا اعادہ ان کے سامنے کیا۔ اس نے ان کی ضمیروں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ جب اس نے مشتعل ہو کر اپنی تلوار کھینچ لی اور انہیں ابھارا کہ وہ اسے مار ڈالیں۔ یہ ملاقات بھی شراب کے

---

(1) برنی ص ص 18-214

جاموں پر ختم ہوئی جس طرح کڑا کے باغیوں پر ہوا تھا۔ سلطان شعر گنگناتے ہوئے اشک آلودہ ہو گیا۔ اسی وقت دربار کے نکتہ سنج نصرت صباح نے بڑی چالاکی اور چاپلوسی سے اعتراف کیا اور "نشہ کی بکواس" کے لیے معافی کی درخواست کی۔ سب سے زیادہ معتز نکتہ چینیوں کو اس سال کے لیے ان کے اقطاعوں کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔[1]

صرف ایک مشتبہ سازش کے موقعہ پر فیروز نے نسبتاً زیادہ سخت قدم اٹھایا لیکن یہ بھی اس کی اضطراری فطرت کا ایک نمونہ تھا۔ یہ سیدی مولا نامی ایک نہایت معزز غیر ملکی نسل کے صوفی کی پھانسی تھی جس راہبانہ پارسائی کشش زبردست دولت کے ایک پراسرار سرچشمہ کی بنا پر اور تیز ہو گئی تھی، جس کے ذریعہ وہ ایک بڑی خانقاہ کو چلاتا تھا اور تمام طبقوں کے لوگوں کی بے انتہا خاطر تواضع کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سیدی درویشوں کے غیر تقلید پسند فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور کیقباد کے دورِ حکومت سے ہی اس کے حیرت انگیز صدقات و عطیات نے اسے ایک ایسا ادارہ بنا دیا تھا، جس نے بالآخر مذہبی زاہدین کے ساتھ ساتھ معزول شدہ بلبنی امرا و افسران کو بھی اس کی جانب کھینچا۔ اس کے مستقل زائرین میں نئی حکومت کے کچھ ممتاز افراد بھی تھے مثلاً سازش پسند قاضی، جلال کاشانی، اور مذہبیت پسند شہزادہ خان خاناں۔ لیکن منڈاور کی مہم کے موقعہ پر اس شہزادہ کا انتقال ہو گیا۔ ممکن ہے کہ وہ درویش اپنی اس پوزیشن کے امکانات سے بالکل ناواقف نہ تھا۔ لیکن نو آباد منگول سردار ملک الغو کے ذریعہ دی گئی اس خبر کی کبھی تصدیق نہ ہو پائی کہ سازش یہ تھی کہ پرانی حکومت کے دو ہندو افسران ہتھیا پائک اور نرنجن کوتوال کے ذریعہ کسی جمعہ کو سلطان کو قتل کرا دیا جائے وہ [درویش] خلیفہ کی حیثیت سے خود مسند نشیں ہو جائے۔[2]

لیکن ایک قریبی ہم عصر مصنف درویشوں کے ایک حریف گروہ کی حسد و جلن پر زور دیتا ہے جن کی بہتان تراشیوں کو سخت مزاج ارکلی خاں نے چونکہ وہ اپنے بڑے بھائی کے دوستوں سے نفرت کرتا تھا بڑی خوش اعتقادی سے سنا اور اسی اثناء میں کہ

---

(1) ایضاً ص 192-190

(2) عصامی (ص ص 14-611) کہتا ہے کہ قحط دو سال تک رہا برنی (ص 610) زیادہ درست طور پر لکھتا ہے کہ اس کے بعد والے سال (1296ء) زبردست مانسون آیا تھا۔

سلطان باہر مندور میں تھا اس نے ملزمین کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلا دیا۔ سلطان کی واپسی پر انہیں اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان لوگوں نے تمام الزامات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ان میں سے کوئی ایک بھی جرم ان کے خلاف ثابت نہ کیا جا سکا۔ ادھر علماء نے آگ کے ذریعہ آزمائش کے طریقہ انصاف کو ممنوع قرار کر دیا لہٰذا سلطان نے غالباً ان کے ارتکاب جرم کو صحیح مان کر دونوں ہندو ہتھیا پائک اور نرنجن کو قتل کرنے کا حکم دے دیا اور قاضی جلال الدین اور بلبنی افسران کو جلا وطن کر دیا۔ اس کے بعد وہ آگ بگولا ہو کر سدی کی سیاست میں دخل اندازی (کی سرزنش) کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ چونکہ موخر الذکر بار بار انکار کر رہا تھا لہٰذا فیروز جھنجھلا گیا اور غصہ سے بے تاب ہو کر قلندروں کے ایک گروہ سے جو بے چینی سے اس موقعہ کی تلاش میں تھا، اپیل کی کہ "اس شخص" سے انتقام لیں۔ حیرت ہے کہ یہ شریف اور رحم دل طبیعت کا انسان بڑی پسندیدگی سے سدی کو دیکھتا رہا جب کہ اس پر جھپٹا جا رہا تھا اور بڑی بے رحمی کے ساتھ اس پر چاقو چلائے جا رہے تھے بالآخر ارکلی خاں کی ہدایت پر ایک ہاتھی کے قدموں تلے کچل ڈالا گیا۔ گرد و غبار کا ایک زبردست طوفان اور ایک طویل المدت خشک سالی جس نے شہر میں اور سیوالک علاقہ میں قحط کے حالات پیدا کر دئے ساتھ ہی سلطان کا الم ناک خاتمہ تمام واقعات سدی کے مداحوں کے لیے اس کی بے گناہی کے واضح ثبوت فراہم کرتے رہے۔[1]

تاہم سلطان کی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود بلبن کے ٹھوس کاموں اور فیروز کے افسران جنہیں ناقابلِ حد حالات کے تحت کام کرنا پڑا تھا، کی کارگزاریوں کے سبب سلطنت قایم رہی۔[2] اگرچہ اس کا دل ایک مضبوط مرکزیت کی حامل اور توسیع پسند

---

(1) برنی کہتا ہے (ص 210) کہ "بلبن کے ان مولازادگان (رہا کردہ غلام) ملکوں اور امراء کے بیٹے تھے اور جن کے پاس گزر اوقات کے لیے کوئی ذریعہ نہ تھا نہ انہیں کوئی کام ملا تھا نہ ان کے پاس اقطاعات تھے اور نہ سپاہی ورنرنجن (یا بیر نجتن) کو توال اور ہتیا پاک جو پہلوانوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور جنہیں بلبن کے دورِ حکومت میں گزر اوقات کے لیے سالانہ ایک لاکھ جتل ملتا تھا، اور جو جلالی دور میں مفلسی اور تنگدستی کا شکار ہوئے تھے۔ یہ سب اور دوسرے برطرف کردہ اعلیٰ سیدی مولا کی خانقاہ میں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔

(2) برنی ہمیں بتاتا ہے (ص 205) کہ جلال الدین کے دورِ حکومت میں یہ ناممکن تھا کہ افسران عوام کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔

ریاس[کے قیام] کے خون آشام تقاضوں سے گھبراتا تھا تاہم اس نے اپنے گورنروں کو یہ آزادی دے دی تھی کہ وہ روایتی قوت و ہمت سے حکومت کریں۔ اس بات نے جہاں ایک نہایت منضبط نظام حکومت کی، یقین دہانی کی وہیں اس نے نتیجتاً توسیع کی راہیں بھی کھولدیں اور اس اقدام سے وہ تعطل بھی دور ہو گیا جس کا خطرہ ریاست کو فیروز کی جمود پسند طبیعت سے لاحق تھا۔ لیکن یہ طریق عمل تاریخ کے غیر رحم دلانہ آزمائش کا تقریباً ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے اپنے ساتھ خود اس شخص کو بہالے گیا جو اس قدر الم ناک جرات و ہمت کے ساتھ ایک ایسے نصب العین سے چمٹا رہا جس کی صحیح قدر شناسی دنیا کی جانب سے ہنوز باقی ہے۔

علی گرشسپ کی سازش

کڑا کی گورنری کی خالی جگہ پر جلال الدین نے اپنے بڑے بھائی کے لڑکے علی گرشسپ (جو بعد میں سلطان علاؤالدین ہوا) کو مقرر کیا تھا جس کی اس نے بچپن سے پرورش کی تھی اور اپنی لڑکی اس کی زوجیت میں دے دی تھی۔ یہ نوجوان بڑا ہو کر اپنے چچا کے بالکل مخالف [طبیعت] کا نکلا- خود غرض، بے ایمان، جارح۔ اس شخص کے حوصلے ایسے تھے جن کی راہ میں اپنی مغرور اور چرب زبان بیوی اور اپنی ساس کو وہ مستقل طور پر ایک رکاوٹ سمجھتا تھا۔ لیکن اس کی گھریلو تلخیوں نے اس خاندان سے اور اپنے غیر ہمدرد نکتہ چینوں سے ایک ایسے طریقہ پر انتقام کی اس کی خواہش کو اور بھڑکایا جس کے ذریعہ وہ ناقابلِ برداشت [سسرالی] خاندان کی ماتحتی سے نجات پا سکے گا۔ اور شاید ایک آزاد بلکہ شاندار زندگی پا سکے گا۔ کڑا میں اسے ملک چھجو کے سابق حمایتی ملے جو اس کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اس کی مدد پر تیار تھے۔ چونکہ روپیہ اس کی پہلی ضرورت تھی لہٰذا پڑوسی ہندو ریاستوں پر حملہ سرمایا فراہم کرنے کی ایک اچھی صورت دکھائی پڑی۔ چونکہ دہلی کی نظریں راجپوتانہ پر گڑھی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں لہٰذا علی نے پارماروں کی مالوہ ریاست کی طرف اپنا رخ کیا۔ یہ ملک پچھلی ایک صدی سے تیزی سے زوال پذیر تھا اور اب بگھیلا یادوؤں اور چوہانوں کی پڑوسی طاقتیں اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر لگی ہوئی

تھیں[1]۔ لیکن اسکے مندر اگرچہ ماضی میں وقتاً فوقتاً ان کو لوٹا گیا تھا لیکن اب بھی وہاں سے مذہبی و مادی تسکین کی اشیاء حاصل کی جا سکتی تھیں۔ سلطان کی اجازت سے، جو سوچ اور سمجھ سے زیادہ خوش و جذبہ کے تحت دے گئی تھی، علی 1293ء کے اواخر میں چندیری کے راستے بھلسا کی جانب ایک حملہ آور جماعت کو لے کر روانہ ہوا۔ مزاحمت کے سنبھلنے کا موقع نہ دے کر اس نے قدیم شہر اور اس کی مالا مال مندروں سے زبردست انعام حاصل کر لیا۔ وہ مویشیوں اور قیمتی دھاتوں کے مالِ غنیمت کے ساتھ نیز ان جاں گزیر مورتیوں کے ساتھ، تاکہ انہیں کٹر اور متشدد قدموں سے روندا جائے، واپس آیا۔ یہ تمام چیزیں علی نے نہایت مکاری سے سلطان کا اعتماد اور اسکی ہمدردی حاصل کرنے میں لگا دی۔ لیکن سب سے قیمتی اثاثہ اس نے خود اپنے پاس رکھا۔ یعنی جنوب کی ہندو مملکتوں کی افسانوی دولت، ان کی دفاعی پوزیشن اور ان تک پہنچنے والے راستوں کے سلسلہ میں حاصل شدہ اطلاعات جو اس نے بڑی محنت اور مشقت سے حاصل کی تھی۔ وندھیا پہاڑوں کے جنوب کا علاقہ مسلم حملہ آوروں تک کے لیے تقریباً اچھوتا تھا کیونکہ یادو مملکت شمال میں رونما ہونے والے اہم واقعات سے بدقسمتی کی حد تک بے فکر ہو کر خاندانی رقابت کی قدیم دورِ شجاعت کے دور کی طرف جنگوں (chivadri wers) میں مگن تھی لہٰذا علی گرشسپ نے اس مملکت پر ایک نہایت ہی خفیہ حملہ کے ذریعہ اپنے آپ کو مالا مال کرنے اور اس کے بعد ہی آزاد خود مختاری کے لیے ہلہ بول دینے کا منصوبہ بنایا۔

اس کی چال کامیاب ہوئی کیونکہ سلطان نے اپنے بھتیجے کے نکتہ چینوں کے سامنے وہ باتیں رکھیں جنہیں وہ اپنی محبت میں، اس کی وفاداری کا مزید ثبوت سمجھتا تھا[اور] اپنی قدردانی کا اظہار اپنے بھتیجے کو اس کے مرحوم باپ کا اعارض ممالک کا عہدہ دے کر کیا۔ نیز اس کی گورنری میں اودھ کا بھی اضافہ کر دیا۔ مزید اس نے اسکی یہ درخواست قبول کر لی جس میں اس نے اپنے صوبے کے فاضل لگان (فواضل) کو فوجوں کی مزید بھرتی پر خرچ کرنے کی اجازت چاہی۔ اس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ فوجیں چندیری کے آگے کے دولت مند مگر دفاعی لحاظ سے کمزور ممالک پر حملے کے

---

(1) پرمار مملکت کے زوال کی تفصیل کے ہو ڈی، سی، گنگولی آف دی پرمار ڈائنسٹی ڈھاکہ 1933۔

لیے استعمال کی جائے گی اور اس سے لگان کی خزانے کو مالا مال کیا جا سکے گا۔

تقریباً سال بھر علی نے اپنے ساز و سامان اکٹھا کرنے اور 1295ء کے موسم سرما کے آغاز میں وہ آٹھ ہزار چنیدہ سواروں کی سر کردگی میں یادو راجدھانی دیوگیر (دیواگیری) پر حملے کے لیے روانہ ہوا۔ دیوگیر ااس وقت چندر دیو(1271-1310ء) کے زیرِ حکومت تھا، جو اپنے سابقہ کارناموں کی شہرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ[حملہ] ایک حیرت انگیز کارنامہ تھا جو کمال جرأت مندی سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس [علاؤالدین] نے ضیاء الدین برنی کے چچا علاؤالدین ملک کو کڑا کا انتظامِ حکومت اس ہدایت کے ساتھ سپرد کر دیا کہ وہ دہلی کو ہمیشہ اس کے صحیح مقاصد کے سلسلے میں مغالطہ میں رکھے اور وہ بندیل کھنڈ کے راستے روانہ ہو گیا۔ غیر دوستانہ اور دشوار علاقے سے اس کا آٹھ ہفتوں کا یہ سفر اس وجہ سے نسبتاً آسان رہا کہ اس نے یہ تاثر دیا کہ وہ دہلی کے سلطان کے عتاب سے بچنے کے لیے ایک مفرور شہزادہ تھا۔ چنانچہ یادو کے سرحدی شہر اچل پور میں اسے برائے نام دفاع کا سامنا کرنا پڑا۔ لاجوری کی گھاٹی سے بلا کسی دقت و پریشانی کے گزر کر وہ سیدھے بجلی کی طرح، راجدھانی کی جانب نیچے اترا چونکہ اس کی فوج راج کمار سنگھانا کے ساتھ باہر ایک مہم پر گئی ہوئی تھی اور خورد و نوش کا سامان بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ لہٰذا رام چندر کی ہمت نے محاصرہ کی للکار کو قبول کرنے سے جواب دے دیا اور اس نے اطاعت کی پیش کش کر دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ حملہ آور طے شدہ تاوان اکٹھا کر سکیں جو شیلا سنگھانا اپنی فوج کے ساتھ واپس آ گیا اور اپنے باپ کے سخت اصرار کی پرواہ کیے بغیر اس نے ایک جوابی حملہ کر دیا لیکن علی کی خوش تدبیری نے اس ابتدائی مزاحمت کو پسپا کر دیا اور دیوگیری کے دوبارہ شکست خوردہ رائے کو پہلے سے زیادہ بھاری تاوان ادا کرنا پڑا اور فاتح سپاہیوں کو شہر لوٹنے کی بھی چھوٹ دینی پڑی۔ اس کے نتیجہ میں سونا، چاندی، موتی جواہرات، قیمتی پتھر، ریشمی سامان، غلام، ہاتھی اور گھوڑوں کی شکل میں جو کچھ حاصل ہو وہ فاتح کے خواب و خیال سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ چونکہ اس سلطنت نے صدیوں سے اپنی بندرگاہوں اور تجارتی مرکزوں کے ذریعہ کثیر غیر ملکی دولت اکٹھا کر رکھی تھی۔ دہلی کے کسی بھی سلطان کے نصیب میں اس قسم کی چیزیں کبھی نہیں آئی تھیں۔

دریں اثنا علی گرشسپ کے کارناموں کی خبریں چھن چھن کر فیروز تک پہنچ چکی تھیں۔ گرچہ اپنے بھتیجے کی اس رازداری پر اسے تھوڑی سی تکلیف بھی پہنچی تھی پھر اس توقع پر اسے خوشی تھی کہ اس قدر وسیع مقدار میں ایک خزانہ اس کے پاس آرہا ہے چنانچہ وہ اپنے بھتیجے جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ کڑا واپس ہونے سے پہلے اس سے ملنے آئے گا، کے استقبال کے لیے گولیار تک آیا۔[1] جب لوگوں میں علی کی کڑا کو براہ راست واپسی کے سفر کی افواہیں گشت کرنے لگیں تو سلطان نے مناسب اقدام کی صلاح کے لیے اپنے مشیر کاروں کو طلب کیا۔ احمد چپ جیسے حقیقت پسند نے، جو علی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس طرح کی بلا اجازت مہم کے خلاف سخت اقدامات کا مطالبہ کیا اور اس کو ان نتائج سے باخبر کیا جو اس جاہ طلب نوجوان کے ساری دولت سیدھے کڑا لے جانے کی وجہ سے پیدا ہو سکتے تھے۔ لہٰذا سلطان سے مطالبہ کیا گیا کہ چندیری میں علی کا راستہ روکنے کے لیے فوراً پیش قدمی کرے۔ لیکن احمد کی اس مایوسانہ صدائے باوجود کہ ”اگر خود مابدولت دہلی واپس ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ہم سبھوں کو قتل کر ڈالیں۔ سلطان کا اپنے بھتیجے پر اعتماد متزلزل نہ ہو سکا۔ وہ خوش فہمی کے ساتھ دہلی واپس ہو گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ علی مالِ غنیمت لے کر واپس آئے اور وہ اس کی معذرت کو قبول کرے۔ اس کے دربار میں علی کا چھوٹا بھائی الماس بیگ تھا جس کی شادی بھی سلطان کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ اس نے اپنے واپس آنے والے بھائی کی ہدایت پر اس بوڑھے سلطان کو یقین دہانیوں اور خوش آئند توقعات کے ذریعہ دھوکے میں رکھنے کا منصوبہ بنایا۔ جب کہ دوسری طرف علی نہایت سرعت سے اپنے صوبے کو واپس جا رہا تھا۔ وہاں سے اس نے ایک تفصیلی روداد اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے ارسال کی جس سے اس نے اس سے پہلے کہ وہ خود حاضر ہونے کی جرأت کر سکے سلطان سے اس کی توقیع (دستخط) کے ساتھ ایک معافی نامہ کی درخواست کی کیونکہ ”وہ اس بات سے غیر مطمئن تھا کہ اس کی ایک سالہ غیر حاضری کے دوران اس کے دشمنوں نے اس کے چچا کے ذہن کو مسموم بنانے کے لیے جانے کیا کیا کیا ہو“ سلطان تو اپنے خاص قاصدوں کے ذریعہ خط بھیجنے کے لیے بالکل تیار ہی تھا لیکن جب

---

(1) تاریخ مبارک شاہی ص 27

وہ قاصد کڑا پہنچے تو علی کی فوجی طاقت اور اس کے منصوبوں کا حال جان کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ انہیں قید کر لیا گیا اور دہلی خبر پہنچانے سے روک دیا گیا۔ علی کا منصوبہ، جس کی خاطر اس نے گھاگھرا پر راستہ بنانے کا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا، لکھناؤتی پر قبضہ کرنے کا تھا جس نے حال ہی میں آزادی حاصل کی تھی اور جو اس وقت بلبن کے پوتے سلطان رکن الدین کیکاؤس کے قبضہ میں تھا لیکن اس کے چچا کی خوش فہمی کے سبب ایک اور بہتر امکان پیدا ہو گیا تھا۔ الماس بیگ اس بھولے بھالے شخص کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا بھائی اپنے احساسِ جرم پر نہایت پشیمان تھا اور یہ کہ سلطان جب تک ذاتی طور پر جا کر اسے معاف نہیں کر دیتا اندیشہ ہے کہ وہ خودکشی کر لے کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ اپنے رومال میں زہر رکھتا تھا۔ گہری تشویش اور اپنے بھتیجے کے لیے محبت سے بھرے دل کے باعث فیروز نے فوراً اس سے ملاقات کا فیصلہ کیا اور الماس کو آگے بھیج دیا کہ وہ اسے اپنی جلد آمد کا یقین دلا کر اسے خودکشی سے باز رکھے۔

جلال الدین فیروز خلجی کا قتل

اور اس طرح جیسا کہ برنی کہتا ہے ”اس کی تباہی اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچ رہی تھی، اور احتیاط کے تمام مشوروں کی پرواہ کیے بغیر بلکہ ان سے رنجیدہ ہو کر فیروز سیدھے پھندے کی طرف بڑھا جسے اس کے لیے اس کے محبوب بھتیجے نے لگا رکھا تھا۔ اس نے احمد چپ کو اصل فوج خشکی کے راستے کڑا لے جانے کی ہدایت کی اور خود صرف ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ رمضان 695 جولائی 1292ء کے اوائل میں دریائے گنگا میں جو موسلادھار بارش کی وجہ سے بہت چڑھی ہوئی تھی، کشتیوں کے ذریعہ سفر کے لیے روانہ ہوا۔ جب 17 رمضان[1] (20 جولائی) کو شاہی کشتی کڑا شہر کے قریب پہنچی تو علی نے کسی بھی طرح کی کوئی گنجائش باقی نہ رکھنے کی نیت سے الماس کو

---

(1) فیروز کے قتل اور کڑا میں علاؤالدین کی تخت نشینی کے اعلان کی تاریخ برنی 17 رمضان 695 بتلاتا ہے لیکن امیر خسرو علاؤالدین کے تخت نشینی کی تاریخ بدھ 16 رمضان 696-19 جولائی 1296ء بتلاتا ہے۔ خسرو کی تاریخ زیادہ قابل بھروسہ ہے۔

بھیجا کہ سلطان کو اس بات پر آمادہ کرے کہ سلطان فوج سے بھری کشتیوں کو دوسرے کنارے پر چھوڑ دے۔ مبادا یہ کہ اس کا بھائی خوف زدہ ہو جائے اور خود کشی کر لے، حتیٰ کہ ان چند معتمدین کو بھی، جو سلطان کے ساتھ تھے اسی بہانے سے نہتا کر دیا گیا۔ ان کے دل ڈوبنے لگے جب انہوں نے سر سے پیر تک مسلح علی کی فوجوں کو دیکھا جو گنگا ندی کے کنارے جمنا کے سنگم کے پاس خطرناک طور پر صف بند تھیں۔ علی کی عدم تواضع کی نحیف سی آواز میں شکایت کرنے کے بعد، کہ علی کا اب بھی اس کے پاس نہ آنا غیر مہذبانہ فعل تھا۔ جس کا الماس نے مناسب طور پر ایک عیارانہ جواب دیا۔ فیروز قانع و صابر ہو کر واپس اپنی جگہ پر قرآن کی تلاوت کرنے لگا اور اس کے حاضر باش امراء اپنی زندگیوں سے مایوس ہو گئے۔ کشتی سے اترنے پر علی اپنے خدم و حشم کے ساتھ سامنے آیا اور رسماً اپنے آپ کو اپنے چچا کے قدموں پر ڈال دیا۔ جلال الدین نے اسے محبت سے اٹھایا، اس کے رخساروں کا بوسہ دیا اور چچا کی محبت پر شک کرنے کے لیے ڈانٹتے ہوئے اسے کشتی کی جانب کھینچا تبھی اشارہ دے دیا گیا پہلی ضرب غیر موثر ثابت ہوئی لیکن جیسے ہی سلطان اپنی کشتی کی جانب بھاگا دوسری ضرب نے نے اسے گرا دیا اور اس کے تن سے جدا سر کو ایک بھالے کی نوک پر بلند کیا گیا۔ اس کی منجمد نگاہیں ڈوبتے سورج کے نیچے اپنے بیوفا بھتیجے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جس نے نہایت تیزی سے اپنے سر پر شاہی چھتر کو نصب کرا دیا اور اپنے آپ کو بادشاہ اعلان کرا دیا[1]۔ کشتیوں پر کے تمام امراء اور سپاہیوں کو مار ڈالا گیا اور [وہ] فوج (جو) احمد چپ کی ماتحتی میں خشکی کے راستے آ رہی تھی نہایت کرب کے ساتھ دہلی واپس ہو گئی۔

اگرچہ جلال الدین کی حکومت اپنے اواخر میں غیر اہم ثابت ہوتی مگر یہ مملوکوں کے تجرباتی عہد کو علاؤالدین کی منصوبہ بند شاہی معیشت سے مربوط کرتی ہے۔ ترکوں کی رجعت پسند متروک نسلی خاتمے اور ایک متحد ہندو مسلم ریاست کے قیام کا ایک میدانِ عمل تیار کرنے کے لیے تاریخ نے اسے ایک آلۂ کار کے طور استعمال کیا۔ اس کام کے لیے اس کا ہٹیلا رومانی تصور ایک ضروری ہتھیار ثابت ہوا۔

---

(1) برنی ص ص 26-233 صرف عصامی (ص ص 233-219ء) علاؤالدین کے اصل نام کا تذکرہ کرتا ہے جس کی برنی نے بھی (ص ص 234-174) تائید کی ہے۔

کیونکہ اس کی وجہ سے بلاشبہ عبوری طریق عمل کے لیے آسانیاں فراہم ہو گئیں اور اس نے جڑ پکڑی ہوئی عصبیتوں کو کند کر دیا۔ اصلاح شدہ اشوک کی طرح اس نے انسانی محبت اور اعتماد کے ذریعہ حکومت کرنے کی کوشش کی لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس نے اس [تجربے] کی ناکامی کی قیمت بہادری کے ساتھ جان دے کر ادا کی تو یہ ایک قرارداد جرم ہے جس کی تلافی کے لیے پوری انسانیت اس وقت سے لے کر اب تک کچھ نہ کر پائی ہے۔

2

علاؤالدین خلجی: حصول اقتدار

دہلی پر قبضہ

علاؤالدین محمد شاہ السلطان کے لقب کے ساتھ علی گرشسپ کی بادشاہت کا اعلان اسی وقت کر دیا گیا جب اس کے چچا کا سر، جسے بعد میں اودھ بھیج دیا جاتا تھا، ایک نیزے پر سورج کی ڈوبتی کرنوں کے درمیان اس کے خیمہ میں گھمایا جا رہا تھا۔ وہ جلال الدین کے بڑے بھائی شہاب الدین مسعود کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس کے تین چھوٹے بھائی الماس بیگ، قتلغ تیگین اور محمد تھے لیکن صرف الماس بیگ ہی کا تاریخوں میں ذکر آتا ہے۔[1] جلال الدین کا قتل گھناؤنا تو ضرور تھا لیکن مسلم شہنشاہیت کے ایک طالبِ علم کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس قسم کے جرائم صدیوں پرانی روایات کے مطابق تھے اور جو اتنی اہم بات ہے وہ یہ کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سازشی [افراد] لازماً کسی اخلاقی جرم کے مرتکب تھے۔ امیر خسرو جس کی تصانیف علاؤالدین کے زمانہ کی ہیں[2] اور عصامی جس کی تصانیف اس وقت کی ہیں جب علاؤالدین کے خاندان کا وجود ختم ہو چکا تھا دونوں ہی اسے ایک "خوش بخت آدمی"- ایک چیدہ آلہ کار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ موخر الذکر کہتا ہے کہ "جب خدا کسی شخص کی مدد کرتا ہے تو ساری دنیا اس کی اطاعت کرتی ہے" اس طرح کے خیالات حد سے زیادہ سادہ لوحی کا شکار ہیں۔ آنے والے سالوں میں علاؤالدین کو اپنے آپ پر اس حقیقت کے پیشِ نظر اس بات کا فخر ہوتا تھا کہ اگرچہ وہ کتابی علوم سے ناواقف تھا مگر اس نے ایک ہی درسگاہ کی- یعنی تجربہ کے درس گاہ کی- تعلیم حاصل کی تھی جس کی

---

(1) عصامی ص 220

(2) دول رانی: جب کسی منتخب شخص کے پاس کسی "نامعلوم" سمت سے مدد آتی ہے تو اس کی توقعات سے زیادہ اس کی خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے۔

اصل اہمیت ہے۔ ہم جب سال بہ سال اس کی زندگی کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم اسے متحمل، محتاط، شجاع، سخت دل اور منصوبہ بندی اور انتظامی صلاحیت کا حامل پاتے ہیں۔ نئے اور غیر متوقع حالات سے نبرد آزما ہو کر اس نے 'واقعی' نہایت سرعت سے وہ صلاحتیں حاصل کرلیں جو انسانوں پر حکومت کرنے کے لیے درکار ہوتی ہیں اور اپنے دل ودماغ اور قوتِ ارادی کو تقویت پہنچانے کے لیے (ہماری رائے باوثوق سندوں پر مبنی ہے) وہ خدا پر یقین محکم رکھتا تھا اور اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ اس کے تمام اعمال بخش دیے جائیں گے، کیونکہ اس کا حقیقی نصب العین "بندگانِ خدا" کی خدمت کرنا تھا۔[1] حاجی الدبیر کے مطابق اپنی تخت نشینی کے وقت اس کی عمر تقریباً تیس سال تھی اور اس کا انتقال پچاس سال کی عمر میں ہوا۔[2] نمازیں باجماعت ادا کرنے نہیں جاتا تھا۔ واحد ہم عصر شخصیت جن کے تقدس پر اس کو یقین تھا وہ شیخ نظام الدین اولیا تھے لیکن دنیاوی جاہ ومنزلت والوں سے ملنا شیخ کے اصولوں کے خلاف تھا۔ چنانچہ علاؤالدین نے کبھی ذاتی معاملات کی کوشش نہ کی۔ [چونکہ] شیخ اسے رد کردیتے۔ وہ اس بات پر زور دیتا کہ "وہ ایک مسلمان اور ایک پیدائشی مسلمان ہے" اور اس طرح وہ مسلمانوں کے طریقِ زندگی ان کے روایتی عقیدے سے واقف تھا۔ لیکن جہاں تک مسلم علماء کا تعلق تھا اس نے اپنے صدر الصدور کو اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ ان "عبادت گزاروں کی فوج" کو کنٹرول کرے، ان کا انتظام و انصرام کرے اور انہیں وظائف اور جاگیریں بہم پہنچائے۔ وہ ان لوگوں میں ان کے مخالفین "مسلم مفکرین" میں کسی طرح کی کوئی دلچسپی نہ لیا۔[3] اس طرح خوش قسمتی سے اس کا دماغ پہلے جڑ پکڑی ہوئی عصبیتوں اور کٹرپن سے آزاد تھا۔ اس نے اپنے کاموں میں ایک تازہ زاویہ نظر اور (تجربات) سیکھنے کی صلاحیت دکھائی جس کی دہلی کے تمام حکمرانوں میں کمی تھی۔

کڑا میں اس کی تخت نشینی کے پہلے دو دن ایک عارضی حکومت کی تشکیل اور

---

(1) ظفر الوالہ ص 785 جس کا حوالہ ڈاکٹر کے، ایس لال نے دیا ہے۔ (Khijis) ص 41

(2) خیر المجالس، ص 341۔

(3) برنی ص 338 وہ شرعی فرائض کی ادائیگی میں بڑا سست تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

دہلی کی طرف روانگی کی تیاریوں میں صرف ہو گئے۔ سلطان کے بھائی الماس بیگ کو الغ خاں کا خطاب دیا گیا اور ملک نصیر الدین جالیسری کو نصرت خاں کا، مَلِک یوسف ہربزالدین کو ظفر خاں کا سلطان کی بیوی ماہ رو کے بھائی سنجر (عصامی کے مطابق جس کی رگوں میں شاہی خون تھا)[1] کو الپ خاں کا خطاب ملا" علاؤالدین نے اپنے معتمد دوستوں کا رتبہ بلند کر کے انہیں امراء کا درجہ دیا اور وہ لوگ جو پہلے ہی امراء کے درجہ میں تھے انہیں مَلِک کا مرتبہ دیا گیا۔[2] بارش شدید ہو رہی تھی "گنگا اور جمنا سمندر کا منظر پیش کر رہی تھیں اور چھوٹی چھوٹی ندیاں چڑھ کر گنگا اور جمنا کے برابر ہو گئیں تھیں، علاؤالدین کو یہ موقع راس آیا کیونکہ اس کا پہلا کام فوجوں کی بھرتی کا تھا۔ لہٰذا اس نے بارش کے دوران ہی کام کا آغاز کر دیا اور اپنے افسروں کو ہدایت کی کہ وہ سپاہیوں کی صلاحیتوں کی جانچ اور ان سے ضمانتوں کے مطالبے جیسی روائتی پیش بندیوں پر زور دیے بغیر حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ فوجوں کو بھرتی کریں سلطان کی دریادلی کی طرف لوگوں کی توجہ کھینچنے کے لیے لکڑی کی ایک چھوٹی منجنیق یا غلیل بنائی گئی اور شام کے وقت شاہی خیمہ کے پاس منتظر مجمع پر ان سے پانچ من سونے کے ٹکڑوں کو برسایا جاتا تھا۔

علاؤالدین نے فیصلہ کیا کہ اس کی فوج دو حصوں میں دہلی کی طرف روانہ ہو گی جس میں سے پہلی خود اس کی اور نصرت خاں کی قیادت میں بدایوں اور باران (بلند شہر) کے راستے اور دوسری طغر خاں کی قیادت میں کوئل) (علی گڑھ) کے راستہ جائے گی۔ علاؤالدین عسکری کاموں کے لیے تربیت یافتہ سپاہیوں کی اہمیت سے واقف تھا لیکن اس کے پیش نظر جو مہم تھی وہ عسکری نہ تھی بلکہ سیاسی تھی۔ جو چیزیں اسے مطلوب تھیں وہ تھی تعداد کی کثرت اور سیاسی رائے عامہ کو اپنی حمایت میں ہموار کرنا"۔ دویا

(بقیہ گذشتہ صفحہ)

روزے اور نماز کی اہمیت سے ناواقف تھا۔ وہ روائتی اسلام پر ایک جاہل کی طرح۔ کامل یقین رکھتا تھا۔ وہ غلط مذہب اور غلط عقیدہ کے (بدعتی مسلمانوں کے) خیالات سے واقف نہ تھا اس نے کبھی سنا اور نہ کبھی اس نے اس کا اظہار ہی کیا۔

(1) عصامی ص 240۔

(2) برنی ص 242

تین ہفتوں ہی میں یہ خبر کہ علاؤلدین لوگوں میں سونا لٹاتا ہوا اور حتیٰ الامکان گھوڑ سواروں کی تعداد کو بھرتی کرتا ہو دہلی کی طرف بڑھ رہا ہے، ہندستان کے شہروں اور دیہاتوں میں پھیل گئی اور ہر طرح کے لوگ۔ فوجی اور غیر فوجی۔ سلطان کی طرف دوڑ پڑے جس وقت وہ بدایوں پہنچا اس وقت اس نے 56 ہزار گھوڑ سواروں اور ساٹھ ہزار پاپیادہ سپاہیوں کو اپنے جھنڈے تلے اکٹھا کر لیا تھا۔ بڑے بڑے جلالی شرفا۔ تاج الملک کوچی، ملک اباجی، اخوربک، ملک امیر علی دیوانہ، ملک عثمان، امیر آخور، ملک امیر کلاں، ملک عمر سرخہ اور ملک ہرن مار۔ جنہیں اس کے خلاف بھیجا گیا تھا، نے باران (بلند شہر) میں اس سے مل جانے کا فیصلہ کی۔ علاؤالدین نے ان میں سے ہر ایک کو تمیں چالیس اور بعض کو پچاس من تک سونا دیا اور ان کے فوجیوں کو فی کس تین سو چاندی کا ٹنکا انعام میں ملا۔ "اس بات نے دہلی میں جلالی خاندان اور امراء کو توڑ دیا اور وہ ڈانواڈول ہو گئے" لیکن چونکہ جمنا کی کشتیاں اس کے کنٹرول میں نہ تھی لہٰذا علاؤالدین کو اکتوبر میں ستارہ سہیل[1] (Canopus) کے طلوع ہونے تک، جب دریا قابلِ عبور ہو جاتا انتظار کرنا پڑا۔

فطری طور پر علاؤالدین نے دہلی کے واقعات سے اپنے آپ کو باخبر رکھا تھا۔ جلال الدین کے قتل کی خبر ملنے پر دربار میں تین دنوں تک غم منایا گیا اور اس کے بعد ملکہ جہاں نے امراء سے مشورہ کیے بغیر اپنے چھوٹے لڑکے قدر خاں کو رکن الدین ابراہیم کے خطاب کے ساتھ تخت پر بٹھا دیا جو اتنا کمسن تھا کہ ریاستی انتظامات کرنے سے قاصر تھا۔ اس کے بعد وہ دربار کو کیلوگڑھی سے دہلی میں قصر سبز میں منتقل کر کے جلالی امرا کے درمیان اقطاعات کو تقسیم کرنے لگی اور ریاستی کاغذات پر احکامات نافذ کرنے لگی۔ اس کا منجھلا لڑکا ارکلی خاں جو باپ کی اجازت کے بغیر ملتان کی گورنری پر واپس چلا گیا تھا، اپنی ماں کے اس رویہ پر سخت رنجیدہ ہوا اور نہ آنے کا فیصلہ کیا۔ علاؤالدین ارکلی خاں سے اگر خوف زدہ نہ تھا تو محتاط ضرور تھا، کیونکہ واحد وہی تھا جو فوجی شہرت میں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ یہ سن کر ارکلی خاں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے

---

(1) جنوب کی سمت آسمان پر چمکنے والا سب سے روشن ستارہ۔

خوشی میں نقارے بجوانے کا حکم دیا۔ جب باران میں جلالی امراء علاؤالدین سے جا ملے تو ملکہ جہاں نے مایوسی کے عالم میں ارکلی کو لکھا کہ وہ فوراً آئے اور اپنی بے وقوف ماں کی غلطی کو معاف کر کے اپنے باپ کے تخت پر قبضہ کر لے۔ لیکن ارکلی نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ اس کا جواب تھا کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔ آیا اپنے باپ کی موت کے بعد ارکلی وقت پر دہلی پہنچ سکتا تھا یا نہیں یہ بات مشتبہ ہو سکتی ہے لیکن اس بات کی وضاحت مشکل ہے کہ اس نے اپنے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے کچھ کیوں نہیں کیا۔

تخت نشینی اور مخلوط حکومت

اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں علاؤالدین نے جمنا کے گھاٹ عبور کیے اور سری میں خیمہ زن ہو گیا۔ رکن الدین اس کی مخالفت کے لیے باہر نکلا لیکن تقریباً آدھی رات کو اس کی فوج کی بائیں بازور نے ایک ہنگامہ برپا کیا اور علاؤالدین سے جا ملے۔ رات کے آخری حصہ میں نہایت دل برداشتگی کے ساتھ رکن الدین بدایوں گیٹ سے شہر میں داخل ہوا اور جلدی جلدی حتی الوسع نقدی اور گھوڑے اکٹھا کر کے غزنی گیٹ کے ذریعہ ملتان کے راستہ پر جا نکلا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں حرم 'الغو' احمد چپ اور ملک قطب الدین علوی اور اس کے بیٹے تھے۔

دہلی کے تمام افسران جو اپنے اپنے عہدوں پر برقرار رہنا چاہتے تھے-وزراء قاضی، صدر، شحنا اور کوتوال اپنے قلعوں کی کنجیوں کے ساتھ تیزی سے علاؤالدین کی اقامت قبول کرنے دوڑ پڑے۔ کسی شخص کی انفرادی منظوری کے سلسلہ میں پریشان ہونا اس کے لیے غیر ضروری تھا۔ 21 اکتوبر 1292ء (سوموار 22 ذی الحجہ 700 کو وہ التتمش کے سفید محل (قصر سفید) اور بلبن کے سرخ محل (قصر لال) میں تخت پر متمکن ہوا۔ سری میں ہزار ستون (ایک ہزار پائے والا) محل کی تعمیر ہونے تک سرخ محل ہی شاہی رہائش گاہ برقرار رہا۔

آنے والے سالوں میں علاؤالدین مخالفین کے گروپ کو للکارنے اور کچل ڈالنے کے لیے بالکل نہ گھبرایا۔ لیکن اپنی حکومت کے آغاز میں اس نے دانش مندی سے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے لیے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ عام مقبولیت حاصل کرے۔

چنانچہ اس نے تین عناصر پر مشتمل - قدیم مملوک حکومت کے امراء جو اب بھی عہدوں پر فائز تھے، جلال الدین کے وہ افسران جو اس کے حمایتی بن گئے تھے اور وہ افسران جنہیں علاؤالدین نے خود مقرر کیا تھا- ایک مخلوط حکومت کی تشکیل کی۔ وزارت "وزیروں میں سب سے بہتر وزیر" خواجہ خطیر کے سپرد کی گئی۔ قاضی صدرالدین عارف نے جنہیں صدر جہاں اور سلطنت کا قاضی اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا۔ ان دونوں عہدوں کو عزت و دبدبہ بخشا۔ انہیں یہ امتیاز ان کے علم کے باعث نہیں حاصل ہوا تھا بلکہ اس کے لیے کہ وہ دہلی کے بدمعاشوں کی دنیا سے واقف تھے اور اس کے بڑے بڑے بدمعاشوں میں کوئی بھی اس کے دربار میں کسی طرح کا دھوکہ یا فریب نہیں کر سکتا تھا۔[1] سید اجل، پرانی حکومت کے شیخ الاسلام اور خطیب کی ان کے عہدوں پر توثیق کر دی گئی۔ دیوانِ انشاء (مرکزی سکریٹریٹ) عمدۃ الملک اعلیٰ دبیر کے حوالہ کیا گیا۔ اس کے دو ہونہار اور ذہین لڑکے حمید الدین اور ملک عزالدین میں ایک کو دربار کے اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا اور دوسرے کو دیوان سلطنت کے معاملات کی نگرانی کرنے کی ہدایت کی گئی۔ ملک فخرالدین کوچی جو سلطان جلال الدین کے ساتھ کڑا گیا تھا لیکن گرفتار کر لیا گیا تھا اور پھر اسے معافی دے دی گئی تھی، دہلی کا دادبک[2] مقرر کر دیا گیا۔ نصرت خاں گرچہ وہ ملک نائب (قایم مقام) کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا مگر حکومت کے پہلے پانچ سالوں کے دوران اسے دہلی کا کوتوال بنا دیا گیا۔ ظفر خاں کو وزیر جنگ بنایا گیا۔ ملک اباجی جلالی کو آخور بیگ کا عہدہ ملا اور ملک ہرن مار نے نائب باربک کا عہدہ پایا۔ مورخ ضیاء الدین برنی کے چچا علاء الملک کو کڑا اور اودھ کے علاقے تفویض ہوئے اور مورخ کا باپ موید الملک جو ارکلی خاں کا ایک افسر رہ چکا تھا لیکن دہلی ہی رہ گیا تھا۔ اسے باران (بلند شہر) کی گورنری (نہایت و خواجگی) عطا کی گئی۔ ملک جونا[3] (قدیم) کو نائب وکیل دار مقرر کیا گیا۔ ہر قسم کے ریاستی وظائف اور خیراتی اوقاف وغیرہ کی نہ

---

(1) ایضاً ص 350۔

(2) تاریخ مبارک شاہی ص 69 علاء الدین کے ہاتھوں اس کی معافی کا ایک اہم سبب یہ حقیقت تھی کہ اس نے ہمیشہ سابقہ سلاطین کو غلط مشورے دیئے تھے۔ کوچی خاندان کا وجود عہدِ مملوک ہی سے قایم تھا۔

(3) محمد بن تغلق جسے بعد میں یہی خطاب ملا تھا سے فرق کرنے کے لیے ایسا کہا جاتا ہے۔

صرف توثیق کر دی گئی بلکہ ان میں اضافہ بھی کر دیا گیا۔ اور اس سلسلہ میں نئے ریاستی احکامات (مثال) نافذ کیے گئے۔ برنی نے اس سال کے اپنے تاثرات کا مختصراً اظہار خیال کیا ہے مگر خصوصی طور پر دہلی کے ایک شہری کی حیثیت سے۔

"سلطان علاؤ الدین کے دربار کو جلالی اور علائی خانوں اور ملکوں سے اس طرح مزین کیا گیا تھا کہ گزشتہ کسی حکومت نے اس کا مشاہدہ نہ کیا.......... پرانی فوج نئی بھرتیوں کے ذریعہ تعداد میں کافی بڑھ گئی اور ہر شخص کو ایک سال چھ ماہ کی تنخواہ بطورِ انعام نقد دی گئی۔ اس سال امراء اور عام لوگ دونوں ہی مسرت و شادمانی سے اس قدر لطف اندوز ہوئے کہ ایسا میں نے کبھی دوسرے دورِ حکومت میں نہیں دیکھا اور وہ لوگ جو مجھ سے بڑے ہیں ان کو بھی اس طرح کا کوئی مبارک سال یاد نہ ہوگا۔[1]

لیکن سلطنت دہلی کا مقابلہ ہندستان کے بقیہ حصوں سے کرنا تھا اور (اس نقطہ نظر سے) اس کا مستقبل تاریک معلوم پڑتا تھا۔ شمالی ہندستان پر ترکی تسلّط کے نوے سال سلاطین دہلی کے اقتدار کو محض جزوی طور پر مستحکم بنانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ شاہی اقتدار کو عاید کرنے اور کم از کم ظاہری طور پر ایک موثر نظامِ حکومت کا آغاز کا کام بھی تکمیل سے بہت پیچھے تھا۔ بے شمار ناساز گار عناصروں سے ہر سمت خطرہ لاحق تھا۔ مغرب میں دریائے راوی سلطان کے حدود اختیار کی انتہا تھی۔ سامانہ اور دیپال پور نہایت اہم سرحدی چوکیاں شمار کی جاتی تھیں۔ لاہور سے اس پار پنجاب کا علاقہ کھوکھروں کی مستقل یلغاروں یا مغل حملوں کے باعث تقریباً انسانی آبادی سے خالی علاقہ تھا اس وقت ملتان ارکلی خاں کے ہاتھوں میں تھا جو علاؤ الدین سے سخت بھرا ہوا تھا اور اس نے دہلی سے آئے ہوئے بھگوڑوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ راجپوت ریاستیں اب بھی اپنی آزادی کے راگ الاپ رہی تھیں۔ چتوڑ اور رنتھمبور راجپوت طاقت کے عظیم مراکز تھے اور صرف پانچ سال قبل موخر الذکر کو مطیع بنانے کے سلسلہ میں جلال الدین کی ایک کوشش ناکام ہو چکی تھی اور جنوب میں گجرات تھا جہاں بگھیل (حکمراں) فتح اور کامیابی کی شاندار روایت پر عمل پیرا تھے۔ وسطی ہندستان میں دھار، اجین اور چندیری محض وقتاً فوقتاً شمال کے عسکری دباؤ کے آگے جھک جاتے تھے۔ دہلی

---

(1) برنی ص 248

مملکت کے چاروں اطراف میں ترکی حکومت کے مخالفین کی ایک مضبوط پٹی تھی۔ اس علاقہ کے سرداروں کی دلیرانہ خلاف ورزیاں دہلی کے حکام کے لیے مستقل دردسری کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ بلبن جیسے طاقتور حکمرانوں کو بھی بارہا انہیں کچلنے کے لیے عسکری مہمیں چلانی پڑیں۔ ذرا ہٹ کر مشرق میں بہار اور بنگال فی الواقع آزاد تھے وندھیا پہاڑوں کے جنوب کا علاقہ پہلے ہی کی طرح سیاسی کشمکش میں مبتلا تھا، دیوگیری کے یادَوا اپنے اقتدار اور وقار کو دوبارہ بحال کر چکے تھے۔ وارنگل کے کاکاتیہ، دوار سُمدُ د کے ہوئے سالا، چولا، چیرا اور پانڈیہ آپسی جنگوں میں منہمک تھے۔ اور انہیں اس کی ذرّہ برابر بھی پرواہ نہ تھی کہ مستقبل میں کیا چھپا تھا۔

ملتان

علاؤالدین جیسے جاہ طلب حکمراں کو جو ہندستان کا شہنشاہ بننے کی خواہش رکھتا تھا، شدید اور متنوع مسائل در پیش تھے۔ اس نے ان کی سنگینی اور وسعت کو سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن اگر ہم نتائج کی بنا پر فیصلہ کرنا چاہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی حکومت کے پہلے دو سالوں کو حکومت کے کاموں کی دیکھ بھال، منصوبہ بندی اور غور و خوص کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ اس کے بعد اپنی کامیابیوں کی بدولت اس کی خواہشات بڑھی اور تجربات کے ذریعہ اس کی عسکری اور غیر عسکری صلاحیتیں اور ترقی پذیر ہوئیں۔

اس کا فوری کام سابقہ سلطان کے تمام زندہ افراد کا خاتمہ تھا۔ اس سے اس کام کو اپنے دو معتمد جنرلوں الغ اور ظفر خاں کو سونپا جو تیس سے لے کر چالیس ہزار پر مشتمل فوجوں کو لے کر ملتان پہنچے۔ انھوں نے شہر کا ایک سخت محاصرہ کر لیا اور اگرچہ ارکلی خاں نے اس کی دفاع کے لیے مناسب انتظامات کر رکھے تھے مگر کوتوال اور ممتاز شہریوں نے اس کے ساتھ غداری کر دی۔ چونکہ یہ لوگ بخوبی سمجھ رہتے تھے کہ جنگ کا ایک ہی انجام ہو سکتا تھا۔ جلالی خاندان کے بدقسمت افراد نے شیخ رکن الدین (شیخ بہاء الدین زکریا کے پوتے) کی شفاعت چاہی جو ان جنرلوں سے ان کی زندگی کی ضمانت کا وعدہ لینے میں کامیاب ہو گئے لیکن اگر یقین دہانی کی گئی تو اس کے خلاف ورزی ہوئی۔ ملتان پر قبضہ کر لیا گیا اور جلال الدین کے دو لڑکوں کو ان کے خاندان اور ان کے

پیروکاروں کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا۔ اسی اثنا میں کہ الغ خاں اور ظفر خاں قیدیوں کو دہلی پہنچا رہے تھے، نصرت خاں، جو سلطان کے پاس سے ہدایت لے کر آیا تھا، نے ابوہار میں ملاقات کی اور قیدیوں کو اپنے ذمہ لے لیا۔ ارکلی خاں، رکن الدین ابراہیم، الغو خاں اور احمد چپ اندھے کر دیے گئے۔ ان کی عورتوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے غلاموں اور جائداد کو ضبط کر لیا گیا۔ سلطان جلال الدین کے لڑکوں کو ہانسی میں قید کر دیا گیا اور ارکلی خاں کے لڑکوں کو قتل کر دیا گیا۔ ملکہ جہاں اور حرم کی دوسری عورتیں احمد چپ کے ساتھ دہلی لائی گئیں، جہاں انہیں نصرت خاں کے گھر میں نگرانی میں رکھا گیا۔

قادر کا حملہ، جرن منجور کی جنگ

98-1297ء کے موسم سرما میں علاؤالدین کو ایک منگول حملہ کا سامنہ کرنا پڑا۔ امیر خسرو نے اس کا جو بیان پیش کیا ہے وہ سادہ نثر میں ذیل میں درج ہے۔[1]

”تاتار فوج سیلاب کے مانند سلیمان پہاڑوں (کوہ جودی) سے بہادری کے ساتھ چلی اور اس نے دریائے جہلم اور ستلج کو عبور کیا۔ انھوں نے کھوکھر دیہاتوں کے کھیتوں (نائی) میں آگ لگا دی۔ قصور کے مکانات تباہ کر دیے اور (جلتے ہوئے گھروں اور (دیہاتوں کی) روشنی شہر کے مضافات سے دیکھی جا سکتی تھی۔ بہر حال انہوں نے جو ہنگامے مچائے وہ شاہی کانوں میں پہنچے بغیر نہ رہ سکے۔ مرحوم الغ خاں، جو ریاست کا داہنا بازو تھا، کو ہدایت دی گئی کہ وہ فوج کے دائیں بازو اور متعلقہ افسروں کے ہمراہ روانہ ہو۔ دو چوکیوں کا فاصلہ ایک دن میں طے کر کے خان 5 فروری 1298ء (جمعرات 2 ربیع الاول 697ھ کو ستلج کے کنارے جرن منجور پہنچا اور اس نے اپنے سپاہیوں کو کشتی کے بغیر دریا عبور کرنے کی ہدایت جاری کی۔ منگول، جنہوں نے دہلی کی فوج کے ندی پار کرنے سے پہلے بہت بہادری کا دعویٰ کر رہے تھے، چیونٹیوں

---

(1) خزائن الفتوح ص ص 37-33 غالباً برنی (ص 250) ٹھیک ہی کہتا ہے کہ ظفر خاں اور الغ خاں دونوں ہی فوج کی قیادت کر رہے تھے لیکن چونکہ علاؤالدین ظفر خاں کے ذکر کو بھی ناپسند کرتا تھا اس وجہ سے خسرو خزائن الفتوح میں کہیں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔ خسرو نے تاتاری، منگولی، حتیٰ کہ ترکی اور چینی بھی مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ قائدو کے مردار خوارو کا تذکرہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ منگولوں کی یہ فوج مرکزی ایشیا سے آئی تھی اور اسے ایران کے اِل خاں نے نہیں بھیجا تھا۔

اور ٹڈیوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے اور چیونٹیوں کی طرح وہ روند ڈالے گئے۔ مختصراً یہ کہ بیس ہزار منگولوں کو ابدی نیند سلا دیا گیا۔ جہاں تک قادر کے ذاتی تومان کا تعلق ہے اس کے مجروحین کے سر کاٹ دیے گئے اور زندوں کو بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ الغ خان نے قایدو کے مردار خواروں کے اوپر اس فتح کا جشن منایا اور تب قیدیوں کو دہلی لے آیا گیا جہاں انہیں ہاتھیوں سے روندا کر ہلاک کر دیا گیا۔

پرانے امراء کا زوال

حکومت کے دوسرے سال نصرت خاں کو وزیر بنا دیا گیا۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ خواجہ خطیر کا انتقال ہو گیا تھا یا اسے معطل کر دیا گیا تھا۔ علاء الملک ان امراء ہاتھیوں اور خزانے کے ساتھ دہلی آیا جسے علاؤالدین نے کڑا میں اس کے پاس چھوڑ دیا تھا چونکہ وہ بہت موٹا اور سست ہو گیا تھا، لہٰذا دہلی کے کوتوال کا عہدہ ملک الامراء فخرالدین کوتوال دہلی کے غلام سے لے کر اسے منتقل کر دیا گیا اور بلدیہ کے تمام غیر ترکی ملازمین (بنیان تازیک) اس کے ماتحت کر دیے۔

اب علاؤالدین نے ان تمام افسران جن کو اس نے خود مقرر نہیں کیا تھا [یعنی پرانی مملوک حکومت کے بقیہ افسران، نیز وہ جو اس کے چچا کے خاندان کا ساتھ چھوڑ کر اس سے آملے تھے-کا خاتمہ کر کے اپنی تشکیل کردہ مخلوط حکومت کے خاتمہ کا فیصلہ کیا-اس سلسلہ میں برنی ہی ہمارا براہِ راست ماخذ ہے لیکن آئندہ برسوں کی تفصیلات صرف برنی ہی کی کہی ہوئی باتوں کی بنا پر قابلِ فہم ہیں۔[1] مملوک حکومت کی سب سے بڑی لعنت بادشاہ یا اس کے امراء یا اعلیٰ ترین افسران کے درمیان ایک مستقل کشمکش تھی۔ اور امراء کی ابرابر یہ کوشش رہی تھی کہ بادشاہ کو وہ اپنے قبضے میں کیے رکھیں تاکہ خود ان کا اپنا ایک گروہ پوری حکومت کنٹرول کر سکے۔ جلال الدین کے خلاف چھجو اور امیر علی سر جاندار کی بغاوت اور خود دربار میں مملوک امراء کی سازشی گفتگوؤں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان امراء کی تخلیق کس خمیر سے ہوئی تھی۔ علاؤالدین نے اس انداز سے اپنی بالادستی ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اندر کسی کو ذرا بھی شک باقی نہ رہے

---

(1) برنی ص 257

کہ اصل مالک کون ہے۔ برنی ہمیں بتاتا ہے کہ "علاؤالدین کی حکومت کے مستحکم ہو جانے کے بعد تمام جلالی مَلِکوں کو۔ جنھوں نے اپنے آقا سے غداری کر کے علاؤالدین کے ساتھ شمولیت اختیار کرلی تھی۔ اور اس سے منوں سونا، اقطاعات اور عہدے حاصل کر چکے تھے۔ انہیں راجدھانی میں یا فوج میں گرفتار کر لیا گیا اور باقی ماندہ افراد کو ہلاک کر دیا گیا۔[1] جو دولت انہوں نے علاؤالدین سے حاصل کی تھی مع ان کی اپنی جائدادوں کے ضبط کرلی گئی۔ ان کے مکانوں کو سلطان کی جائداد بنادیا گیا اور ان کے سپاہیوں اور غلاموں کو علائی امراء کے حوالے کر دیا گیا۔ جلالی ملکوں میں سے صرف تین اشخاص کو باقی رکھا گیا اور علاؤالدین کی حکومت کے آخیر تک انہیں اس کے ہاتھ سے ذرا بھی نقصان نہ پہنچا۔ ملک قطب الدین علوی، ملک نصیر الدین مرانا، جو ہاتھیوں کا شحنا (شحنہ فیل) تھا اور ملک امیر جمال خلجی جو قادر خاں کا باپ تھا۔[2] ان تینوں نے سلطان جلال الدین اور اس کے لڑکوں کا نہ تو ساتھ چھوڑا تھا اور نہ ہی سلطان علاؤالدین سے انہوں نے کوئی دولت حاصل کی تھی، لہٰذا یہ تینوں محفوظ رہے۔ جب کہ دوسرے تمام جلالی امراء کی جڑیں اور شاخیں کاٹ دی گئیں۔ اس سال نصرت خاں نے اپنے تقاوِر قرقی ضبطیوں کے ذریعہ ایک کروڑ نقد جمع کیا اور اسے خزانے میں جمع کر دیا۔[3] مسلم شریعت کے مطابق ایک غلام اپنے مالک کو ترکے میں ملتا ہے۔ وہ اپنے آقا کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتا اور اس کے بچے بھی اس کے آقا کے غلام ہوتے ہیں۔ غلاموں پر مبنی ایک انتظامیہ تشکیل کرنے میں سلطان معزالدین غوری کا مقصد خواہ کچھ بھی رہا ہو (لیکن) اگلے سالوں میں تمام طاقتور بادشاہوں کا رجحان یہی رہا کہ آزاد افراد پر مبنی عوامی سروس [انتظامیہ] سے بھی اسی طرح کی غلامانہ خدمات لی جائیں۔ اگرچہ انہوں نے [اس موقف میں] [وقتاً فوقتاً] کافی ترمیمات بھی کیں۔

---

(1) دو یا تین کے علاوہ، معزول امراء کے خاندانوں میں سے کسی فرد کا آئندہ سالوں میں کوئی بھی تذکرہ نہیں آتا۔

(2) جیسا کہ ان کے خاندانی ناموں سے ظاہر ہے ان تینوں امراء میں سے کوئی بھی مملوک حکومت کے بچے کھچے افراد میں سے نہ تھا ایک مجموعی اندازے کے مطابق جلال الدین نے اپنی تخت نشینی پر اپنے اعلیٰ افسران کے ایک تہائی حصہ کو مملوک حکومت سے ہی لیا تھا یہ لوگ بھی یقیناً جلالی افسروں کے خاتمے میں شامل تھے۔

(3) ایضاً۔ ص 51-250

گجرات کی فتح

علاؤالدین اب اپنی حکومت کے توسیع مملکت کے پہلے منصوبے پر روانہ ہوا۔ ایک راجپوت بارڈ نینسی کی قلم بند کی ہوئی روایت کے مطابق اس مہم کا آغاز مادھو نامی ایک شخص کی درخواست پر ہوا۔ جو اپنے مالک کرن بگھیلا کے خلاف سلطان سے مدد طلب کرنے دہلی آیا تھا۔ کرن نے مملکت کی راجدھانی سے اس کی عارضی غیر موجودگی کے دوران مادھو کی بیوی کا اغوا کر لیا گھا۔ بدقسمت خاتون روپ سندری کی بد دعا کی کہانی جس طور پر اس مالا میں درج ہے، مفروضہ کو تقویت پہنچاتی ہے ورنہ یہ بات قابل توضیح بن جاتی ہے کہ سلطان نے اپنے پہلے حملہ کے لیے آخر اس دور دراز صوبے کو کیوں منتخب کیا، جسے اب تک کوئی بھی ترکی فوج موثر طور پر مغلوب نہ کر سکی تھی۔ اور جہاں تک صرف مالوہ یا راجپوتانہ کے راستے سے ہی پہنچا جا سکتا تھا جو دونوں ہی دہلی کے حدودِ اختیار سے باہر تھے۔ سلطان اس پوزیشن میں نہ تھا کہ کامیابی کی کسی یقین دہانی کے بغیر ہی یہ خطرہ مول لے۔ لیکن جب اس طرح کی یقین دہانی خود گجرات کے ایک وزیر کی جانب سے مل گئی تو اس علاقہ کو فتح کرنے کے لیے فوجی مہم کو شروع کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔

شاہی فوج 24 فروری 1299ء کو الغ خاں اور نصرت خاں کی مشترکہ کمان میں دہلی سے روانہ ہوئی۔ راجپوتانہ سے ہو کر آگے بڑھنے کے دوران چتوڑ کے رانا نے جنرلوں کو حد سے باہر نہ جانے دیا تاہم ان لوگوں نے جیسلمیر کو (محفوظ) نہ چھوڑا۔ تب ان لوگوں نے بناس پار کر کے ردوسا کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ گجرات کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی الغ خاں اور اس کے دوستوں نے ملک کو وسیع پیمانے پر لوٹا کھسوٹا اور وہاں دہشت زدگی پھیلادی۔ کرن بگھیلا نے جس پر اچانک یہ آفت آپڑی تھی۔ بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی۔ تعاقب کے دوران اس کا خزانہ اور اس کی عورتیں، جن میں اس کی خاص رانی کملادیوی بھی شامل تھیں، دشمنوں کے ہاتھ لگیں۔ رانی باعزت طریقے پر دہلی لایا گیا اور علاؤالدین نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ راجدھانی انہلوارہ کے علاوہ گجرات کے دوسرے خوشحال شہروں کو بھی لوٹا گیا اور حملہ آوروں نے بے شمار

مال غنیمت اکٹھا کیا۔ سوم ناتھ کا مندر، جسے کمار پال (74-1143ء) نے دوبارہ تعمیر کیا تھا منہدم کر دیا گیا۔ امیر خسرو نے اس وحشیانہ حرکت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "انہوں نے سوم ناتھ مندر کو کعبہ مقدس کی جانب رو بہ سجدہ کرا دیا.......... آپ اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ مندر نے پہلے سجدہ کیا اور تب اسے ایک غسل دیا گیا۔[1] اس کے بعد نصرت خاں کھمبیات (کیمبے) کی جانب بڑھا۔ اس نے کھمبیات کے مسلم تاجروں (خواجاؤں) سے جو بے حد مالدار ہو گئے تھے نقدی اور نوادرات چھین لیے اس نے کافور ہزار دیناری نامی غلام جو بعد میں سلطنت کا ملک نائب بنا، کو زبردستی اس کے مالک سے لے لیا اور سلطان کے پاس لے آیا۔

گجرات اب دہلی کے قبضہ میں آ گیا۔ جس سرعت اور آسانی سے اس پر قبضہ ہو گیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو حکمراں کرن عوام میں غیر مقبول تھا یا اس کی عسکری اور انتظامی تنظیمیں قدیم اور متروک ہو چکی تھیں۔ کسی نزدیکی معاصر مورخ نے بھی اس کے زوال کے اسباب پر بحث نہیں کی ہے۔ لیکن عصامی ہمیں بتاتا ہے کہ جب رائے کرن نے انہلوارہ میں اپنے وزیروں سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے بلا تکلف یہ کہہ دیا کہ فرار کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ "دشمن آ چکے ہیں اور آپ کی تیاری نہیں ہے۔ آپ سوئے ہوئے ہیں اور اس نے اپنی تلوار کھینچ لی ہے" لیکن جب ترک واپس آ گئے تو اس نے اپنی فوج اکٹھا کی اور ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔[2] فرشتہ مزید بتاتا ہے کہ "رائے کرن تحفظ کے لیے دکن میں دیوگیری کے حکمراں رام دیوا کے پاس بھاگ کر چلا گیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ بگلانہ روانہ ہو گیا جو دکن سے متصل گجرات کا ایک علاقہ ہے اور اس نے وہاں رام دیو کی مدد سے اپنے آپ کو جما لیا۔[3] الپ خاں جو سلطان کی بیوی کا بھائی تھا، گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 7-1306ء کے موسم سرما تک کرن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی۔

اپنی واپسی پر جلور کے نزدیک الغ اور نصرت کو ایک شدید بغاوت کا سامنا کرنا

---

(1) خزائن الفتوح ص 48

(2) عصامی ص ص 45-244

(3) فرشتہ ص 103۔

پڑا۔ عصامی ہمیں بتاتا ہے کہ گجرات کو لوٹنے کے باعث سپاہی کافی مالدار ہو گئے تھے اور انہیں الغ خاں کا تقاضا ناگوار گزرا جو وہ تشدد کے ذریعہ سلطان کے حصوں کے لیے تیار کر رہا تھا۔ چار افسران- محمد شاہ کھبر و یلچق اور براق[1] جو منگولی تھے اور اسلام لے آئے تھے۔ لیکن لوٹ مار کرنے میں افغانوں جیسے تھے نے زبردست مالِ غنیمت اکٹھا کیا تھا جسے وہ حوالہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لہٰذا ایک دن انہوں نے علی الصباح الغ خاں کے خیمے پر دو یا تین ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ حملہ کر دیا۔ الغ خاں جو بیت الخلا میں تھا، نصرت خاں کے خیمہ میں بھاگ گیا۔ لیکن باغیوں نے نصرت کے بھائی عزالدین کو قتل کر دیا جو الغ کا حاجب تھا۔ انہیں کیمپ میں علاؤالدین کی بہن کا لڑکا سویا ہوا ملا۔ یہ سمجھ کر یہ الغ خاں ہے ان لوگوں نے اسے بھی قتل کر دیا تب شاہی گھوڑ سوار اور پاپیادہ نصرت کے خیمہ کے سامنے اکٹھا ہوئے اور نو مسلم امراء اور [ان کے حامی] گھوڑ سوار بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے بعض، جیسے محمد شاہ اور کھبر و نے رنتھمبور کے رائے ہمیّر سے پناہ مانگی اور دیگر لوگ جیسے یلچق اور براق رائے کرن کے پاس چلے گئے جو اس وقت نندبار میں مقیم تھا۔ گرچہ سازشی فرار ہو گئے لیکن دہلی میں موجود ان کی عورتوں اور بچوں کو ان کے جرم کی قیمت اپنی عزتوں اور زندگیوں سے چکانی پڑی۔ عزالدین کے قاتلوں کی بیویوں کو بھنگیوں کی آغوش میں دے کر برسرِعام ذلیل کیا گیا اور ان کے بچوں کے سروں پر اتنی ضربیں لگائی گئیں کہ ان کی دھجیاں اڑ گئیں۔ برنی ہمیں بتاتا ہے کہ ”مردوں کے جرم میں عورتوں اور بچوں کی گرفتاری اور سزا کا رواج اسی سال سے آغاز ہوا۔ اس سے پہلے مردوں کے جرم میں عورتیں اور بچے نہیں ستائے جاتے تھے۔[2]

سیوستان

جس سال گجرات کا حملہ ہوا اسی سال منگول صالدی نے دینے سیوستان (سبی) پر حملہ کر دیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ظفر خاں کو حملہ آوروں سے نمٹنے کے لیے

---

(1) تاریخ مبارک شاہی میں ایک غیر مذکور ماخذ کی بنیاد پر منگول باغیوں کی مندرجہ ذیل فہرست دی گئی ہے۔ ملحق، کسرا، باقی، تمغان، محمد شاہ، تمر بُغا، شادی بُغا اور قتلغ بُغا

(2) برنی ص 253 اور عصامی صفحہ 45-244

بھیجا گیا۔ قلعہ سے تیروں کے برسائے جانے کے باوجود وہ قلعہ میں جا گھسا اور اس نے منگولوں کو ایک ذلت آمیز قبولِ اطاعت پر مجبور کر دیا۔ صالدی اور اس کے بھائی کو ان کے سارے پیروکاروں کے ہمراہ بیڑیاں پہنا کر دہلی لایا گیا۔ اس بات نے عوام کے دلوں میں ظفر خاں کی دھاک بٹھا دی جو اس وقت سامانہ کا گورنر تھا۔ لہٰذا الغ خاں اس سے حسد کرنے لگا اور جیسا کہ ہمیں برنی بتاتا ہے کہ علاؤالدین اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح ایک ایسے ذہین افسر سے نجات حاصل کر سکے۔ اسے زہر دے کر اندھا کر دیا اسے ایک فوج کے ساتھ لکھناؤتی فتح کرنے اور وہاں اپنے آپ کو مستحکم کرنے کی غرض سے روانہ کر دے۔ لیکن برنی کا یہ شبہ انصاف پر مبنی نہیں ہے علاؤالدین ظفر خاں پر مکمل اعتماد کرتا تھا۔ البتہ جب موخرالذکر نے کیلی کی جنگ کے موقعہ پر اس کے قطعی احکامات کی خلاف ورزی کی تب ظفر خاں کے متعلق اس کی رائے بدل گئی۔ جیسا کہ اس حقیقت سے ثابت ہوتا ہے کہ خسرو خزائن الفتوح میں ظفر خاں کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔

نبیؐ اور سکندر

سیوستان سے ظفر خاں کی واپسی کے کچھ ہی دنوں بعد علاؤالدین کے نکتہ چینوں نے اس کے متعلق دو افواہیں پھیلائیں جس کے متعلق برنی، جو نصف صدی کے بعد لکھ رہا تھا، یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ثابت شدہ حقائق تھیں۔ ان دو باتوں کو عہدِ وسطی اور دورِ جدید کے [بعض] مصنفین نے بھی بلا سوچے سمجھے اس سے نقل کر لیا ہے۔ علاؤالدین نے اعلان کیا کہ (جیسا برنی ہمیں یقین دلاتا ہے) کہ نبیؐ عربی کے چار دوست (خلفاء راشدین) تھے جن کی مدد سے انہوں نے اپنا مذہب پھیلایا تھا تاکہ قیامت تک ان کا نام یاد کیا جاتا رہے۔ علاؤالدین کے بھی چار ”خان‘ تھے۔ الغ خاں، نصرت ظفر اور الپ جنھوں نے بادشاہوں جیسا جاہ و جلال حاصل کر لیا تھا۔ لہٰذا وہ ان کی مدد سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالے گا اور ابدی شہرت حاصل کرے گا۔ یہاں [اس بیان کو قبول کرنے میں] متعدد قسم کی پیچیدگیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ اگر علاؤالدین ظفر خاں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا تو پھر ایک نئے عقیدہ کی بنیاد ڈالنے کے لیے اسے اپنے مددگاروں میں سے ایک کیوں کر شمار کر سکتا تھا؟ دوسرے یہ، جیسا کہ

برنی ہمیں برابر بتاتا رہتا ہے کہ علاؤالدین مسلم علماء کی صحبت میں کبھی نہیں رہا اور اسلام پر اس کا عقیدہ جاہلوں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے عقیدہ کی طرح پختہ تھا۔ ایسا آدمی کیوں کر ایک نئے مذہب کے قیام کی بابت سوچ سکتا تھا؟ برنی جو اس بے بنیاد گپ کے لیے ہمارا واحد ماخذ ہے، ہمیں اس نئے مذہب کے اصولوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ اس سلسلہ میں عصامی بالکل خاموش ہے۔ اس کے عہد کے دوسرے مصنفین مثلاً امیر خسرد اور شیخ نصیر الدین چراغ، کے دلوں میں علاؤالدین کے لیے اس کی مذہبی رسومات کے سلسلہ میں عدم دلچسپی کے باوجود، گہری وقعت ہے اور وہ اس کے خلاف اس قسم کا الزام عائد نہیں کرتے۔

شاید اسی زمانہ میں علاؤالدین نے "سکندر الثانی" کا خطاب حاصل کر لیا تھا اور اسے خطبہ میں بھی پڑھوایا اور اپنے سکوں پر نقش کرایا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ دوسرے مسلم بادشاہوں، مثلاً بد قسمت علاؤالدین محمد خوارزم شاہ نے بھی اسی خطاب کو اختیار کیا تھا۔ لیکن ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ علاؤالدین نے کبھی بھی یہ سوچا کہ وہ نہ صرف تاریخی سکندر کی فتوحات کا مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ ایرانی داستانوی سکندر کا بھی۔ جو ربع مسکوں کا یا کرۂ ارض کے چوتھائی حصہ آبادی کا فاتح [سمجھا جاتا] تھا۔[1] برنی علاؤ الدین کے پراگندہ خیالات کو دور کرنے کا سہرا اپنے چچا علاء الملک کے سر باندھتا ہے۔ سلطان نے وعدہ کیا کہ نئے مذہب کے قیام کے سلسلہ میں کبھی کوئی لفظ اپنے لبوں پر نہ آنے دے گا۔ فتوحاتی منصوبوں کے سلسلہ میں کوتوال نے علاؤالدین کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کی کہ اس کی سرگرمیوں کا اصل میدان و مملکت ہندستان تھا۔ اسے منگولوں کے حملہ پر قابو پانا تھا اور شمالی ہندستان کے آزاد حکمرانوں کو کچلنا تھا اور اس کام کے ہو جانے کے بعد وہ اپنے تخت پر مطمئن ہو کر بیٹھ سکتا تھا اور دور کے رایوں کے خزانوں کو لوٹنے کے لیے اور ان سے سالانہ خراج وصول کرنے کے لیے اپنے افسروں کو بھیج سکتا تھا۔ لیکن ان رایوں کو اپنی سلطنتوں پر پہلے ہی کی طرح حکومت کرنے کے لیے چھوڑ دیا جا سکتا تھا۔ اس بات پر بہت زیادہ زور نہیں دیا جا سکتا ہے کہ یہ "دو

---

(1) عہد وسطیٰ کے مسلم جغرافیہ دانوں کے مطابق کرۂ ارض کا صرف ایک چوتھائی حصہ (ربع) (اسپا اور شمالی افریقہ آباد تھا اور کرہ ارض کے بقیہ حصہ میں صرف پانی ہی پانی تھا۔

منصوبے "خود برنی کے پیش کیے گئے نقشہ کے اعتبار سے ہی علاؤالدین کے کردار اور اس کی ریاستی پالیسی کے بالکل متضاد تھے اس کی زندگی کا عظیم ترین بحران جلد ہی یہ ثابت کرنے والا تھا کہ علاؤالدین اپنے چاپلوس دوستوں کے ساتھ بہکی بہکی باتیں کرنے والا ایک شرابی نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت پسند اور اعلا ترین صلاحیتوں کا مالک ایک جنگجو سیاست داں تھا اور وہ تمام اہم معاملات کو اپنے ذاتی اختیار میں رکھنا چاہتا تھا۔

قتلغ خواجہ کا حملہ، کیلی کی جنگ

1299ء کے اواخر ماورالنہر کے خان دادا نے اپنے لڑکے قتلغ خواجہ کو بیس تومان (20 لاکھ سپاہیوں) کے ساتھ دہلی فتح کرنے کے لیے بھیجا۔[1] یہ چھ ماہ کا سفر تھا اور منگولوں کی تیاریاں یقیناً بڑی احتیاط سے کی گئی ہوں گی۔ چونکہ (اس مرتبہ) ان کا مقصد فتح کرنا اور ملک پر حکومت کرنا تھا لہٰذا ان لوگوں نے راستہ میں نہ کسی شہر کو لوٹا اور نہ کسی قلعہ کو تباہ کیا۔ وہ لوگ جس راستہ سے آئے تھے اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ 1398ء میں تیمور کی طرح قتلغ خواجہ نے ایک ایسے راستہ کا انتخاب کیا جس پر کوئی بڑا شہر نہ تھا اور جس پر دیہاتی علاقے اور چھوٹے شہر اس کی فوج کے لیے مویشی، غلے اور چارے ضرورت بھر بہم پہنچا سکتے تھے جب منگولوں نے سندھ پار کیا تو راستے کے تمام قلعے لرزہ بر اندام ہو گئے، ملتان کی فوج اپنے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئی۔ ان کے محافظ دستے صرف تاریک راتوں میں ہی منگولوں کے خیمہ پر حملہ کی جرأت کر سکتے تھے۔ ظفر خاں جو کہرام میں تھا، نے قتلغ خاں کو جنگ کی دعوت دی لیکن موخر الذکر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس نے ظفر قاصد سے کہا کہ "بادشاہ صرف بادشاہ سے ہی لڑتے ہیں" اور اس نے ظفر کو دعوت دی کہ وہ دہلی میں اپنے آقا کے جھنڈے تلے اس کے مقابلے کے لیے آئے۔ جیسا کہ متوقع تھا، دہلی پناہ گزینوں سے بھر گیا اور ان کے لیے وہاں مسجدوں، دکانوں، حتیٰ کہ گلیوں میں بھی جگہ باقی نہ رہی۔ کاروانوں کی آمد بند ہو گئی اور چیزوں کی قیمتیں کافی چڑھ گئیں۔ بالآخر منگول دہلی

---

(1) چونکہ اس کی خزائن الفتوح صرف علاؤالدین کی فتوحات (کے ہی بیان) کے لیے مختص ہے لہٰذا خسرو کیلی جنگ کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ لیکن اس نے دول رانی کے سولہ اشعار اس کے بیان میں صرف کیے ہیں اور وہ الغ اور ظفر خان دونوں ہی کا ذکر کرتا ہے (ص ص 61-60) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے مضافات سے چھ میل کے فاصلہ پر کیلی میں خیمہ زن ہو گئے۔

عصامی ہمیں بتاتا ہے کہ علاؤالدین کو صرف ایک یا دو ہفتہ کی مہلت مل سکی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منگول کے متعلق خبر غالبًا اسے اس وقت دی گئی تھی جب وہ سندھ پار کر چکے تھے وہ سرخ محل سے باہر نکلا اور سری میں جمنا کے کنارے اپنا فوجی خیمہ نصب کر کے اس نے تمام افسران کو جن تک احکام پہنچ سکتے تھے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ طلب کیا۔ یہ بہت نازک گھڑی تھی۔ علاء الملک نے بڑی رازداری سے اسے مشورہ دیا کہ وہ گزشتہ بادشاہوں اور کتابوں میں لکھی ہوئی نصیحتوں پر عمل کرے اور محض ایک جنگ کے مشتبہ انجام کی خاطر اپنی مملکت کو خطرہ میں نہ ڈالے۔ دہلی کی فوج ہندورایوں سے لڑنے کی عادی تھی اور وہ پسپائی، چھپ کر گھاتوں میں لگ جانا اور اس طرح کی دوسری منگول چالوں سے واقف نہ تھی۔ تو کیوں نہ سلطان دشمنوں کے پاس قاصدوں کو بھیج کر گفت و شنید اور سیاست کا سہارا لے اور کم از کم کچھ مہلت حاصل کرے؟ علاؤالدین نے اس کا ایک عامل جواب دینے کے لیے اپنے امراء کو بلایا۔ علاء الملک کے دلائل کو دہرانے کے بعد اور پر خلوص طور پر اس کی تعریف کرتے ہوئے۔ کہ وہ وزارت کا مستحق ہے لیکن میں نے اسے اس کی حد سے زیادہ فربہی

(بقیہ)

برنی (ص ص 61-254) اور عصامی (ص ص 61-254) دونوں ہی ہمیں لمبی تفصیلات بتاتے ہیں جو گرچہ کچھ تفصیلات میں مختلف ہیں لیکن خلاصہ ایک ہی ہے۔ دونوں مآخذ کے تنقیدی مطالعہ کے بعد واقعات کی ازسرِ نو ترتیب ممکن ہے۔ برنی کہتا ہے کہ حکومت کے تیسرے سال کے آخیر میں منگول روانہ ہوئے تھے لہٰذا ہم ہندستان میں ان کی مہمات کو بہ اطمینان 1299ء1300ء کے موسم سرما میں رکھ سکتے ہیں۔

گرچہ اس میں عورتوں اور خیمہ کے ساتھ آنے والوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو بھی بیس تمن یا دو لاکھ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اتنے مردوں اور عورتوں کے لیے کھانے نیز ان کے گھوڑوں کے لیے چارے کا حاصل کرنا ناممکن ہوتا۔ فوجوں کی تعداد کے متعلق عہدِ وسطیٰ کے بیانات کو ذرا احتیاط کے ساتھ صحیح ماننا چاہیے۔ وہ فوج جس کے ساتھ چنگیز خاں منگولیا سے روانہ ہوا تھا اس کی تعداد ایک لاکھ نہ تھی اور اس کے لیے ذخیروں کے حصول کے لیے اسے علیحدہ علیحدہ دستوں میں روانہ کرنا پڑا تھا۔ قتلغ خواجہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے سپاہیوں کو ایک ساتھ رکھا اور دس آدمیوں کو بھی یہ اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اصل فوج سے

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی وجہ سے اسے محض دہلی کا کوتوال مقرر کیا ہے۔ اس نے ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا فیصلہ سنایا:۔

"ایک کہاوت ہے کہ تم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ایک اونٹ چرا کر نظروں سے اوجھل ہو جاؤ گے" ٹھیک اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ تم دہلی پر حکومت کرو اس متعلقہ خطرات کی للکار سے بچے بھی رہ سکو۔[1] دشمن دو ہزار کرو کا فاصلہ طے کر کے مجھ سے دہلی کے مینار تلے جنگ کے لیے للکارنے آیا ہے۔ اس وقت اگر میں نے کوئی کمزوری دکھائی تو نہ تو عوام کی نظروں میں میری کوئی عزت باقی رہے گی اور نہ ہی بہادر جنگجو سپاہیوں کی نظروں میں بلکہ آئندہ نسلیں میری داڑھی کا مذاق اڑائیں گی۔ ہرگز نہیں! خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ میں کل سیری سے کیلی کی طرف کوچ کروں گا اور قتلغ خواجہ سے نبرد آزما ہوں گا۔ اور یہ دیکھوں گا کہ خدا ہم میں سے کسے فتح عنایت کرتا ہے۔"

اس نے محل اور شہر علاء الملک کے ذمے کیا اور یہ کہا کہ وہ چابیوں کا بوسہ دے (اور یہ ہدایت کی کہ وہ) انہیں فاتح کے حوالے کر دے گا اور اس کی اطاعت و وفاداری کے ساتھ خدمت کرے گا۔ اسے اس کی خواہش نہ تھی کہ اپنی تباہی میں دہلی اور ملک کو بھی گھسیٹ لے۔ علاؤالدین کے روانہ ہو جانے کے بعد علاء الملک نے بداوں کے دروازے کے علاوہ تمام دروازوں کو بند کر دیا۔ غالباً اس لیے کہ اگر ضرورت پیش آئی تو دوآب بھاگا جا سکے۔[2]

کیلی کی جنگ کے محتاط جائزے سے قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ منگول

(بقیہ گذشتہ صفحہ)

علیحدہ کر لیں۔ یہ چیز کھانے پینے کے ذخیروں کی حصولی میں مزید مشکل پیدا کر دیتی۔

(1) گرچہ علاالملک صرف مبہم اشارے کرتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصالحت صرف دو شرائط پر ممکن ہو سکتی تھی۔ سیاسی حاکم کی حیثیت سے داوا خاں کا مطیع ہو جانا یا علاؤالدین کے دیوگیری خزانے سے دست بردار ہو جانا۔ لہٰذا علاؤالدین کسی بھی گفت و شنید کے لیے تیار نہ تھا ساتھ ہی اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ بغیر لڑے بھڑے فتح حاصل کر سکتا ہے کیونکہ منگول کو اس مزاحمت کا اندازہ نہ تھا جو دہلی کے لوگ پیش کر سکتے تھے۔ عصامی علاء الملک کی تجویز اور علاؤالدین کے جواب کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔

(2) برنی، ص ص 59-255

اب اس شہرت کے اہل نہیں رہے تھے جو چنگیز خاں نے ان کے لیے حاصل کی تھی۔ ان کے حوصلے باقی تھے لیکن صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں، نیز یہ کہ مصریوں کے ہاتھوں ہلاکو کی شکست کے بعد سے منگولوں کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی باتیں قصہ پارینہ بن چکی تھیں۔ یہ کوئی دانش مندی نہ تھی کہ اس طرح کی جنگ کے لیے چھ ماہ کا سفر اختیار کیا جائے۔

کیلی میں دونوں فوجوں کی صف بندی عہدِ وسطیٰ کے رواج کے مطابق عمل میں آئی۔ دہلی کی فوج کے دائیں جانب دریا تھا اور بائیں جانب خار دار جھاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ علاؤالدین نے وسط میں اپنی جگہ بنائی۔ دائیں جانب اس نے ظفر خاں کو رکھا جس کی پشت پر (دیگر لوگوں کے علاوہ) ممتاز رائے اور ہندستانی النسل (ہندو) جنگجو تھے۔ بائیں جانب علاؤالدین نے نصرت خاں اور اس کے سپاہیوں کو سلطان کے سامنے کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ دائیں سے بائیں جانب فوج کئی میلوں تک چھائی ہوئی تھی اور وسط سے اس کا کنٹرول کرنا مشکل تھا۔ پھر علاؤالدین کا یہ منشانہ تھا کہ دہلی کی قسمت کا فیصلہ محض سپاہیوں کی ایک جنگ پر چھوڑ دیا جائے۔ لہٰذا اس نے ایک سخت حکم نافذ کیا کہ "کوئی افسر سلطان کے حکم کے بغیر اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ افسران اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ یہ محض کوئی خالی دھمکی نہیں تھی۔ منگول فوج میں وسطیٰ کمان قتلغ خواجہ کے ہاتھوں میں تھی اور بایاں بازو ہجلک اور دایاں بازو تمریغہ کے ہاتھوں میں جب کہ ایک توان (دس ہزار سپاہی) طرغی کے تحت تھی تاکہ چھپ کر گھات میں لگا رہے اور جہاں ضروری ہو حملہ کر دے۔ عصامی کے مطابق قتلغ خواجہ کی جانب سے علاؤالدین کے پاس چار قاصد اس پیغام کے ساتھ آئے کہ "ہندستان میں اس طرح کے بادشاہ اور ایسی فوج کسی کی یادداشت میں نہیں۔ درخواست یہ ہے کہ میرے قاصدوں کو خیموں کا چکر لگانے اور اعلیٰ افسروں کے ناموں کو دریافت کرنے کی اجازت دے دی جائے"۔ علاؤالدین کے لیے یہ فائدہ مند تھا کہ یہ اجازت دے دی جائے اور قاصدوں نے قتلغ خواجہ کو بجا طور خبریں پہنچا دی۔

دونوں فوجیں آمنے سامنے جنگ کے لیے صف بستہ ہو گئیں لیکن علاؤالدین

کو جنگ کے لیے حکم نافذ کرنے کی جلدی نہ تھی۔ اسے حالات کا مکمل جائزہ لینا تھا۔ مشرق سے پے در پے فوجی اور افسران اس کے پاس آ رہے ہوں گے، دشمنوں کے پیچھے بہت سے قلعے تھے جس کی حفاظت اس کے سپاہی کر رہے تھے اور بہت سے شہر تھے جو دہلی کے وفادار تھے۔ منگولوں کی فوج جو مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھی یقیناً اپنے لمبے سفر کے بعد تھک چکی ہو گی اور اس کے ذخیرے کم پڑ سکتے تھے۔ اگر منگولوں نے دہلی پر قبضہ کی امید میں اچانک یلغار کر دی تو وہ ان سے لڑنے کے لیے موجود تھا۔ لیکن تاخیر یقیناً اس کے موافق تھی۔ اور وہ منگولوں کو یہ جتا سکے گا کہ ان کے لیے دانشمندی یہی تھی کہ وہ ایک ایسے ملک سے واپس چلے جائیں جہاں انہیں کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن اسی لمحہ اس کے سب سے بڑے افسر نے اس کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ ظفر خاں کا جنگی جوش اس کے بہتر فیصلہ پر غالب آ گیا۔ سلطان سے اجازت لیے بغیر اس نے اپنے سامنے ہجلک کی فوج پر حملہ کر دیا اور بقیہ میدانِ جنگ کا خیال کیے بغیر اس نے اس کا سخت تعاقب کیا۔ اس (حرکت) نے منگولوں کو مصنوعی پسپائی کا اپنا معروف حربہ استعمال میں لانے کا موقعہ مہیا کر دیا۔ ظفر خاں کی پیادہ فوج اس سے پیچھے رہ گئی حتیٰ کہ اس کے بہترین گھوڑ سوار بھی اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ تقریباً اٹھارہ کروہ تک دشمنوں کا تعاقب کرنے کے بعد جب وہ حالات کا اندازہ لگانے کے لیے واپس مڑا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھ صرف ایک ہزار گھوڑ سوار ہیں۔ چونکہ فوج کے دوسرے بازو (علاؤالدین کے حکم کے مطابق) ساکت کھڑے تھے لہٰذا طرغی اپنے دس ہزار گھوڑ سواروں کو ظفر خاں اور دہلی فوج کے درمیان حائل کر دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ظفر خاں واپس نہیں آ سکتا تھا۔ طرغی کے سپاہی اس کی پشت پر دو میل کے علاقے پر چھا گئے۔ اس نے اپنے افسران- عثمان آخور جک عثمان یغان، علی شاہ رانا اور دیگر لوگوں سے ان حالات کے تحت جتنا بھی ممکن تھا مشورہ کیا۔ اگر وہ لوگ علاؤالدین کے پاس واپس لوٹ جاتے ہیں تو وہ انہیں ان کی نافرمانی کی سزا دے گا لیکن واپسی ناممکن تھی کیونکہ منگولوں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ لہٰذا ان لوگوں نے آخری دم تک لڑ کر مر جانے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ وہاں کوئی زندہ بچ ہی نہ سکا لہٰذا کیا ہوا یہ بتلانا مشکل ہے۔ لیکن عصامی بیان کرتا ہے کہ ظفر خاں طرغی کے آدھے لوگوں کو مار

ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایک تیز کے ذریعہ مارا گیا جو اس کے زرہ سے گزر کر اس کے دل میں داخل ہو گیا تھا۔[1]

ظفر خاں کے بے دھڑک حملے نے اس کی دلیری کی دھاک بٹھا دی اور اس نے ظاہر کر دیا کہ ایک ایک کے دو بدو مقابلہ میں ایک ہندستانی (ایک) منگول سے لڑ کر اسے شکست دے سکتا تھا۔ پھر بھی پہلے دن ظاہراً منگول ہی فتحیاب رہے اور ہندستانی افسران افسردہ تھے۔ دوسرے دن جب فوجیں صف آرا ہوئیں تو علاؤالدین کے افسران اس کے پاس مشورہ لے کر آئے کہ وہ دہلی کے شہر پناہوں کی حفاظت میں واپس چلا جائے اور وہاں سے دشمنوں سے لڑے۔[2] لیکن علاؤالدین کے کچھ اپنے اندازے تھے۔ لہٰذا اس نے اس بات پر دھیان نہ دیا بلکہ اس نے جواب دیا کہ "کل فوج کا ایک حصہ محض اس وجہ سے برباد ہو گیا کہ اس نے اپنی جلد بازی میں میرے حکم کی تعمیل نہ کی، جو (نقصان) ہو چکا تھا اب اس کی تلافی نہیں کی جا سکتی۔ میں ان خطرات سے ناواقف نہیں جنہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے پھر بھی اگر میں (کسی جانب) جاؤں گا تو آگے ہی کی طرف جاؤں گا" تاہم وہ حملہ کرنے کا حکم نہیں دے رہا تھا۔ اور چونکہ قتلغ کو بھی تامل درپیش تھا لہٰذا فوجیں صبح سے شام تک آمنے سامنے کھڑی رہیں۔ تیسرے دن بھی فوجیں آمنے سامنے کھڑی رہیں لیکن تاریکی چھا جانے کے بعد منگول اپنے وطن کی جانب دس میل پیچھے کھسک گئے۔ علاؤالدین نے اسی میں دانشمندی سمجھی کہ دشمنوں کو محفوظ طریقے پر چلا جانے دے اور وہ دہلی لوٹ آیا۔ عصامی کہتا ہے کہ "پورے شہر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور کسی نے بھی مرحومین کی پرواہ تک نہ کی" قتلغ خواجہ اپنی ماوراء النہر واپسی کے فوراً بعد ہی مر گیا۔[3] اس بات کے

---

(1) عصامی ص 258 کہتا ہے کہ علاؤالدین کو ظفر خاں کی موت پر اس کی نافرمانی کے باوجود دلی افسوس ہوا تھا۔ یہ حقیقت کہ سلطان نے اسے دائیں بازو کی کمان سونپی تھی، ثابت کرتی ہے کہ اسے سلطان کا پورا اعتماد حاصل تھا۔

(2) یہ بات قابلِ عمل نہ تھی۔ برنی کے مطابق قلعہ کی دیوار کی مرمت نہ ہوئی تھی نیز یہ بھی کہ دہلی اور اس کے مضافات کے شہر قلعہ کی دیوار سے باہر کافی دور دور تک پھیل چکے تھے۔ قلعہ کی دیوار کی خستہ حالی کی تصدیق خزائن الفتوح ص ص 28-27 سے ملتی ہے۔ [نوٹ: ص 257 ہونا چاہیے۔ مترجم]

(3) مبارک شاہی ص 83-82 اور دول رانی ص 61

لیے علاؤالدین کی دھاک جم گئی کہ کس طرح تمام حالات پر نظر رکھتے ہوئے فوج کی کمان سنبھالی جاسکتی تھی۔ افسروں کو اپنے اپنے اقطاعات جانے کی اجازت دے دی گئی۔

رنتھمبور کی فتح، تین بغاوتیں[1] (1299-1300ء)

موجودہ بین الاقوامی قانون اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایک ریاست دوسری ریاست کے سیاسی پناہ گزینوں کو پناہ دے۔ معمولی جرائم کے سلسلہ میں بھی مجرمین کی تحویل کی مانگ معاہدوں کی بنیاد پر ہی کی جاسکتی ہے۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندستان میں حالات مختلف تھے۔ دوسری مملکت کے سیاسی پناہ گزینوں کو پناہ دینا ایک ''غیر دوستانہ فعل'' سمجھا جاتا تھا اگرچہ یہ ضروری نہ تھا کہ یہ جنگ کا ایک سبب بن جائے۔ بیانہ کی گورنری پر واپسی کے بعد الغ خاں نے رنتھمبور کے ہمیر دیو کے پاس اس پیغام کے ساتھ قاصدوں کو بھیجا کہ چونکہ وہ ایک دوست حکمراں تھا لہٰذا یا تو وہ محمد شاہ کھبرو اور مسلم منگولوں کو جو اس کے پاس پناہ کی تلاش میں گئے تھے قتل کر دیے یا انھیں الغ خاں کے پاس بھیج دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ ہمیر کے مشیر کاروں نے سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا کہ وہ ایسے لوگوں کے لیے جن کا اس پر کوئی دعویٰ نہ تھا اپنے خاندان کو خطرہ میں نہ ڈالے۔ لیکن ہمیر نے ان کی بات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا جواب تھا کہ[2] ''اے خان، میرے پاس کافی دولت اور کافی سپاہی ہیں اور میں کسی سے جھگڑنے کی خواہش نہیں رکھتا، لیکن میں لڑنے سے ڈرتا نہیں۔ میں ان دو یا تین ترکوں[3] کو نہیں چھوڑوں گا جو میرے پاس اپنی زندگی کے خوف سے بھاگ کر آئے ہیں''۔ اس طرح پانسا پھینکا جا چکا تھا۔ جب اس کے ہندو معتمدین نے اس سے ہمیر کے جواب کی وضاحت طلب کی تب الغ خاں رنتھمبور کی طرف روانہ ہو گیا۔ سلطان علاؤالدین جسے تمام باتوں کی خبر دے دی گئی ہوگی، نے نصرت خاں کو، جو اس سال اودھ کا گورنر تھا، الغ خاں کی مدد کے لیے پیش قدمی کا حکم دیا۔ ان دو خانوں

---

(1) مبارک شاہی ص ص 83-82 دول رانی، ص 61۔

(2) امیر خسرو اپنی خزائن الفتوح (ص ص 52-50) اور دول رانی ص ص 66-65) میں رنتھمبور مہم کا ایک مختصر بیان دیتے ہیں۔ دول رانی کے مطابق رنتھمبور قلعہ کا محیط فرسنگ تھا اور دہلی سے دس دن کے سفر کے فاصلہ پر تھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

نے جھائن [4] پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد رنتھمبور کا محاصرہ کیا لیکن ایک دن محاصرہ کے سلسلہ میں ہدایت کرتے ہوئے نصر خاں قلعہ کی دیواروں کے بہت قریب آگیا۔ اسے ایک منجنیق کے پتھر [5] سے سخت چوٹ لگی اور دو یا تین دنوں بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس سے محاصرہ کرنے والی فوج سراسیمہ ہو گئی اور ہمیر نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنے بارہ ہزار گھوڑوں اور پاپیادہ سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کے ہمراہ باہر آیا اور اس نے الغ خاں کو جنگ میں شکست دے کر اسے جھائن تک واپس کھدیڑ دیا۔ الغ خاں نے پسپائی کے حالات سے سلطان کو مطلع کیا۔ اگر وہ محاصرہ اٹھالے گا تو یہ شاہی وقار پر ایک دھچکا ہو گا۔ لیکن اگر ماہ یا دو ماہ وہیں ڈٹا رہا تو ہندو اسے مغلوب کر لیں گے۔ سلطان جلال الدین نے رنتھمبور کی طاقت کا صحیح اندازہ لگایا تھا۔ صرف علاؤالدین کی غیر معمولی صلاحیت اور ریاست کے تمام ذرائع و وسائل پر اس کے مکمل اختیار ہی کے سبب (بالآخر) قلعہ فتح کیا گیا۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

خسرو تینوں بغاوتوں میں سے کسی کا ذکر نہیں کرتا۔ لیکن برنی (ص ص 78-272) غلطی سے اکت خان کی بغاوت کو چتوڑ مہم کے دوران بتاتا ہے۔

(2) یعنی جس طور پر عصامی نے (ص ص 63-261) جو اس سلسلہ میں ہمارا واحد ماخذ ہے اسے بیان کیا ہے۔

(3) منگول محمد شاہ اور کھبرو یقیناً اپنے پیروکاروں کی ایک تعداد بھی رکھتے تھے کیونکہ خزائن الفتوح (ص 51) میں بیان ہے کہ "ان بدبخت منگولوں میں سے جنہوں نے اسلام سے منہ پھیر لیا تھا چند نو مسلموں نے قلعہ کے تین میناروں میں آگ روشن کی تھی۔

(4) جھائن کو فتح کرکے اسے نئے شہر (شہر نو) کا نام دیا گیا۔ ڈاکٹر کے، ایس، لال اپنی (Khaljis)(101 نوٹ میں لکھتے ہیں کہ نہ ہی جھائن اور نہ ہی اس کے تبدیل شدہ نام کی حامل کسی جگہ کی اب نقشہ پر تشخیص کیا جاسکتی ہے، ایک چھوٹی سی جگہ "تائے گوں" جس کا مطلب ٹھیک شہر تو ہوتا ہے رنتھمبور سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے۔ غالباً اسی سے برنی کے "جھائن" کی شناخت ممکن ہے۔

(5) ڈاکٹر کے ایس لال لکھتے ہیں کہ "بہت ممکن ہے کہ سنگ مغربی یا مغربی پتھر کسی قسم کی میزائل (Missile) ہو جو علاؤالدین کے زمانہ میں جنگوں میں مستعمل ہو توپ کے گولے سے اس کی شناخت کرنے سے انہوں نے بجا طور پر انکار کیا ہے (Khaljis 102n) منجنیق کے پتھر تراشے ہوئے اور گول کیے ہوئے تھے جو فٹ بال سے چھوٹے ہوتے لیکن کرکٹ بال سے کافی بڑے ہوتے تھے منجنیق کے چھڑ کی مار انہیں سخت قوت اور تیزی سے کافی دور تک لے جاتی تھی (1922ء میں) میں نے اس طرح بہت سے پتھروں کو چتوڑ کے قلعہ کی ٹوٹی ہوئی دیواروں میں دیکھا تھا۔ تراشے کے نشان بہت آسانی سے دیکھے جاسکتے تھے۔ ایڈیٹر۔

اکت خاں کی بغاوت

علاؤالدین نے اپنے افسروں کو تلپت میں، جو دہلی کی پہلی منزل ہے، حاضر ہونے کا حکم دیا۔[1] لیکن اس اثنا میں کہ اس کے آدمی اکٹھا ہو رہے تھے، وہ شکار میں اتنا وقت گزار رہا تھا۔ اس بات نے سلطان کے مرحوم بھائی محمد کے بیٹے سلیمان شاہ اکت کو جو وکیل دار کے عہدے پر فائز تھا اور جسے ظفر خاں کی موت کے بعد کیلی میں دائیں بازو کی کمان دی گئی تھی، ایک موقعہ فراہم کر دیا۔ ایک رات سلطان اپنے کچھ سپاہیوں کے ساتھ شکار کے میدان میں رہ گیا اور شاہی خیمہ میں نہ لوٹا۔ دوسرے دن صبح اس نے گھوڑ سواروں کو ایک دائرہ (نرغہ) بنانے کا حکم دیا تاکہ شکار کو اس کی جانب ہانکا جا سکے۔ اس اثنا میں وہ مونڈھے (سرکنڈے کی کرسی) پر بیٹھ گیا اور وہ لوگوں کے کام کی تکمیل کا انتظار کرنے لگا۔ اسی لمحہ اکت خاں اور اس کے ملازم مسلم منگول، جو سلطان کو مار ڈالنے کی سازش کر چکے تھے، شیر شیر چلاتے ہوئے آگے بڑھے اور اس پر تیر چلانے لگے۔ علاؤالدین نے اپنے سرکنڈے کی کرسی بطور ڈھال استعمال کی۔ ایک غلام جس کا نام مانک (یانایک تھا) اس نے اپنے آپ کو سلطان کے آگے کر لیا اور تیر کے چار زخم کھائے۔ اس کے بعد اس کے ”یایک“ (ذاتی محافظ) آگے بڑھے اور اپنی ڈھالوں سے اس کی حفاظت کی۔ یہ موسم سرما کا زمانہ تھا اور سلطان کا کوٹ اور پوشاک (قباو گلہ) روئیوں سے بھرا تھا۔ پھر بھی اس کے بازو میں تیر کے دو گہرے زخم آئے اور وہ خون کی کمی کے باعث بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب اکت خاں قریب آیا تو پایکوں نے ننگی تلواروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن چونکہ اسی وقت وہ چیخ پڑے۔ ”سلطان مر گیا، ایک مردہ کا سر کیوں کاٹتے ہو؟“۔ (اس لیے) اکت مطمئن ہو گیا اور شاہی خیمہ کی طرف بڑھا جہاں وہ تخت پر بیٹھ گیا اور اعلان کر دیا کہ اس نے سلطان کو مار ڈالا ہے۔ کٹھ پتلیوں کی طرح درباری افسران نئے بادشاہ کو خوش آمدید کہنے لگے اور جو امراء وہاں موجود تھے انہوں نے اپنی مبارکبادیاں پیش کیں (یہ اس لیے کہ) ظاہر ہے کہ کوئی بھی تخت شاہی پر بیٹھنے کی ہمت

---

(1) تلپت پرانی دہلی سے بارہ میل مشرق اور کیلو گڑھی کے جنوب میں ایک میدانی علاقہ ہے ڈاکٹر کے ایس لال (Khaljis 104 n)

اس وقت تک نہ کر سکتا تھا جب تک کہ اس نے سلطان کو واقعی نہ مار ڈالا ہو۔

جب اکت خاں نے حرم میں داخل ہونا چاہا تبھی وہ مزاحمت سے دوچار ہوا۔ حرم کا انچارج افسر ملک دینار اور اس کے ماتحتین اپنی زرہ بکتر پہنی اور حرم کے دروازے پر اکت خاں سے ملاقات کر کے اس سے بولے کہ وہ اسے علاؤالدین کے حرم میں داخل نہ ہونے دیں گے جب تک وہ انہیں علاؤالدین کا سر نہ دکھائے گا۔ اسٹالے، لین، پول (Staley Lane- Poole) بڑے اچھے انداز میں بیان کرتا ہے کہ ''سر نمودار ہوا لیکن اپنے صحیح کندھوں پر'' جب علاؤالدین کو ہوش آیا تو اسے سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ وہ الغ خاں کے پاس جھائن چلا جائے کیونکہ اسے ایک گہری سازش کا شبہ ہو گیا تھا لیکن ملک حمید الدین نے اسے مشورہ دیا کہ وہ سازش کو مکمل نہ ہونے دے۔ کیونکہ اگر ایک رات بھی بادشاہ کے پتہ ونشان کی نامعلومی کی حالت میں گزر گئی تو وہ لوگ جنھوں نے اکت خاں کو قبول کر لیا تھا خوف سے اسی سے منسلک رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ علاؤالدین نے اسی مشورہ پر عمل کیا۔ جب وہ شاہی خیمہ میں پہنچا، پانچ یا چھ گھوڑ سوار اس کے ساتھ ہو گئے اور اکت خاں کی بازی مات ہو چکی تھی۔ وہ افغان پور بھاگا لیکن دو افسروں نے اس کا تعاقب کر کے اس کا سر کاٹ لیا اور اسے علاؤالدین کی خدمت میں لے آئے۔ علاؤالدین کو اس کا افسوس تھا اس نے کہا کہ ''بارہا یہ سر میری گودوں میں رہا ہے۔ اکت کے چھوٹے بھائی قتلغ خاں کو فوراً قتل کر دیا گیا۔ اس دوران جب کہ وہ اپنے زخموں سے صحتیابی تک تلپت میں مقیم رہا۔ علاؤالدین نے سازش کے سلسلہ میں تحقیقات کیں اور جن کو اس نے مجرم پایا انہیں سخت سزائیں دی گئیں۔

رنتھمبور پر گھوڑے یا پیادہ فوج کے ساتھ براہِ راست حملہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تیروں منجیقوں کے چلانے اور پتھروں اور آگ کے شعلوں کی بوچھار کرنے کے اعتبار سے قلعہ کے محافظ دستوں کو غلبہ حاصل تھا۔ علاؤالدین نے ایک پاشیب کی تعمیر کے طویل اور دشوار کن طریقے کے ذریعہ ہی قلعہ (کی دیواروں) کی چوٹی تک پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ جس میں یقیناً بے شمار زندگیوں کی قیمت چکانی پڑتی۔ اس پر کس طرح عمل درآمد کیا گیا اس کا ایک خاکہ برنی نے پیش کیا ہے:-

قلعہ کو پہلے سے ہی گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ سلطان کی آمد کے بعد محاصرہ اور سخت کر دیا گیا۔ آس پاس کے دیہاتوں سے جولاہے لائے گئے اور ان کے سلے ہوئے جھولوں کو سپاہیوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ سپاہیوں نے جھولوں کو مٹی سے بھرا اور خندقوں میں ڈال دیا گیا۔ اس طرح ہائے ہائے کی آواز کے ساتھ ان لوگوں نے یاشیب کی بنیاد ڈالی۔ اور گرگج کو اونچا کر دیا۔[1]

مغارب نصب کیے جا چکے تھے۔ لیکن قلعہ کے محافظ دستے آگ اور پتھر پھینک پھینک کر یاشیب کو برباد کرتے رہے۔ دونوں جانب سے بے شمار لوگ مارے گئے۔ دہلی کی فوج نے دھاڑ تک کا علاقہ تاراج کر دیا اور اس علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے آئی۔[2]

قبل اس کے کہ دیواروں کی اونچائی تک بالو کے جھولوں کا ڈھیر کھڑا کیا جا سکے اور اس کے اوپر سے گھوڑے اور پیدل فوج کے گزرنے کے لیے ایک مائل بہ فراز راستہ بنایا جا سکے۔ کافی وقت لگ گیا۔ محاصرین کے درمیان جانی نقصان یقیناً کافی ہوا ہوگا لیکن علاؤالدین کے سخت انضباط نے - اس نے ہر فرار ہونے والے سے تین سال کی تنخواہیں واپس مانگی تھیں - فوج کو اپنے کام میں لگائے رکھا اور ایک بھی گھوڑ سوار یا پیادہ میدانِ جنگ سے نہ فرار ہوا۔ خزائن الفتوح کے مطابق مکمل محاصرہ مارچ یا اپریل (رجب) میں شروع ہوا اور موسم گرما کی گرمیوں سے لے کر موسم برسات تک جاری رہا۔ دو بغاوتیں اور بھی ہوئیں لیکن علاؤالدین نے رنتھمبور کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور اس نے وہاں سے ٹلنے کا نام تک نہ لیا۔

مَلِک عمر اور منگو خاں کی بغاوت

علاؤالدین کی بہن کے دو لڑکوں نے - بدایوں کا گورنر ملک عمر اور اس کا بھائی منگو خاں جو اودھ کا گورنر تھا (غالباً نصرت خاں کی جگہ پر اس کی تقرری ہوئی تھی) علاؤالدین کو رنتھمبور میں مشغول دیکھ کر بغاوت کر دی اور ہندستان کے سپاہیوں کو بھرتی

---

(1) ہمیں ایک ایسے مائل بہ فراز راستے (ascending rood) کا تصور کرنا ہوگا جو مٹی سے بھری ان جھولوں پر سے ہوتا ہوا قلعہ کی اونچائی تک پہنچتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نچلا حصہ یاشیب (اپنی یعنی پیر سے) کہلاتا ہوگا اور اوپری حصہ گرگج۔

(2) برنی ص، 288۔

کرنے لگے۔ لیکن وہ لوگ کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ علاؤالدین کے ذریعہ بھیجے گئے افسروں نے انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں رنتھمبور لے آئے۔ سلطان نے اپنی موجودگی میں انہیں قتل کروادیا۔ ”ان کی آنکھیں خربوزوں کی پھانکوں کی طرح نکال لی گئیں“۔

”حاجی مولا کی بغاوت“:- جب علاء الملک کو دہلی کا کوتوال مقرر کیا گیا تھا تو دہلی بلدیہ کے نچلے اور درمیانی طبقے کے ہندستانی النسل (تازی) عملہ کو برخاست نہ کیا گیا تھا کیوں کہ عام حالات میں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیلی کی جنگ کے کچھ دنوں بعد علاالملک کا انتقال ہو گیا تھا اس کی جانشینی دو افسروں نے کی۔ بایزید ترمذی[1] دہلی کا کوتوال مقرر کیا گیا۔ لیکن سری، جہاں سلطان نئے محل اور شہر کی تعمیر کر رہا تھا اور جہاں کے قلعہ کی دیواریں شاید مکمل ہو چکی تھیں کی کوتوالی علاؤالدین ایاز (جو محمد بن تغلق کے مشہور وزیر محمد ایاز کا باپ تھا) کے سپرد کی گئی۔ بایزید ترمذی اپنی سختی و درشتگی کی وجہ سے شہر میں بہت غیر مقبول تھا۔ اس بات نے نیز رنتھمبور میں سلطان کی مشغولیت نے سابق کوتوال فخرالدین کے ایک آزاد کردہ غلام حاجی مولا کو، جو اس کے اعلیٰ افسران کے عملہ میں سے ایک تھا اور جو اس وقت دو آب کے شہر بار تول کا شحنا تھا دہلی میں بغاوت کا ایک موقع دیا۔ برنی کے مطابق حاجی ایک بد خصلت بد معاش اور بے رحم فسادی تھا جس نے پرانی نظامِ حکومت کے کوتوالی عملہ کی حمایت حاصل کر لی تھی۔

ایک دن رمضان کی دوپہر میں (10رمئی سے لے کر 8رجون تک) جبکہ موسم گرما کی سخت گرمی نے سبھوں کو گھر میں بند کر رکھا تھا، حاجی مولا اپنے کچھ سپاہیوں کے ہمراہ بدایوں کے دروازے سے [شہر میں] داخل ہوا اور بایزید کے گھر کی طرف بڑھا۔ اور اسے اس کے تہہ خانے (فرو خانہ) سے بلایا کہ وہ ایک حکم نامہ سن لے جو وہ سلطان کے پاس سے لایا ہے۔ کوتوال بلا کسی شک و شبہ کے چپل پہنے تنہا باہر چلا آیا۔ حاجی نے اسے مار ڈالنے کا حکم دیا۔ اس کے اِرد گرد جو لوگ تھے اس نے انہیں ایک

---

(1) برنی اسے ترمذی کا نام دیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس کا اصل نام نہ تھا بلکہ آمودریا پر واقع مشہور شہر ترمذ کا باشندہ ہونے کی بنا پر اس کی ایک نسبت تھی۔ فرشتہ اسے کسی نامعلوم ماخذ کی بنا پر بایزید کا نام دیتا ہے۔

دستاویز دکھائی جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ یہ سلطان کا فرمان ہے اور جس کی پیروی میں اس نے کوتوال کو قتل کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے علاؤ الدین ایاز کو بلوایا لیکن متاخر الذکر کو اس کے مفسدانہ منصوبے کا علم ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے سری کے پھاٹکوں کو بند کر دیا۔ کوتوالی کے ملازموں اور غنڈوں کی مدد سے جنہیں وہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا حاجی نے قصر سرخ پر مع شاہی خزانے، اسلحہ خانے، اصطبل اور قید خانے کے قبضہ کر لیا۔ اس نے قیدیوں کو آزاد کر دیا اور کچھ نے اس کی پیروی کرنی قبول کر لی۔ اس کے بعد وہ سرخ محل سے ایک غوری جو "شہنشاہ" کے نام سے مشہور تھا اور سلطان التتمش کی ایک لڑکی کا خلف تھا[1]، کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ علوی کو زبردستی لایا اور اسے شاہی تخت پر بٹھا دیا۔ تمام افسران کو جنہیں حاجی پکڑ سکا تھا مجبور کیا گیا کہ وہ علوی کے ہاتھوں کو بوسہ دیں جب کہ حاجی نے شاہی عہدے باغیوں کو تفویض کیے۔ ریاستی خزانے، اسلحہ جات اور گھوڑوں کی آزادانہ تقسیم نے حاجی کو اس لائق بنا دیا کہ تقریباً ایک ہفتہ تک اس نے دہلی پر قبضہ رکھا اور اس کے شہریوں کو دہشت زدہ کیے رکھا۔ بغاوت کے چوتھے دن امیر کوہ ملک حمید الدین[2] اپنے بیٹوں، رشتہ داروں اور مرحوم ظفر خاں کے کچھ گھوڑ سواروں کے ہمراہ جو معائنہ (عرض کے لیے امروہہ سے آئے تھے، مغربی یا غزنی دروازے کی جانب سے شہر میں گھس پڑا۔ سڑکوں پر دونوں کی جنگ کے بعد حاجی اور اس کے آدمیوں کو حمید الدین بھنڈار کال

---

(1) علوی کا مطلب حضرت علی کے ایسے خلف کا ہوتا ہے جو رسول اللہ کی بیٹی بی بی فاطمہ کے علاوہ ان کی کسی دوسری بیوی سے ہو۔ حضرت علی اور فاطمہ کے اخلاف سیدوں کا درجہ رکھتے ہیں فرشتہ کہتا ہے کہ جس علوی کا حوالہ دیا گیا ہے وہ عموماً شہنشاہ کے نام سے مشہور تھا برنی اسے ہمیشہ نجف (یعنی علی کا نواسہ) کا نام دیتا ہے لیکن یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(2) فرشتہ کے مطابق ملک حمید الدین بدایوں کے دروازہ سے شہر سے باہر نکلا اور شہر سے باہر اس نے وفاداروں (جس میں مرحوم ظفر خاں کے گھوڑ سوار بھی شامل تھے) کو جمع کیا اور اس کے بعد غزنی کے دروازے سے دوبارہ شہر میں داخل ہوا۔ غزنی بس یہی کہتا ہے کہ وہ زبردستی غزنی کے دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ چونکہ حمید الدین تلپت میں موجود تھا اور رنتھمبور کے محاصرہ میں شامل تھا لہٰذا ڈاکٹر کے ایس لال کا یہ خیال درست ہی معلوم ہوتا ہے کہ علاؤ الدین نے بغاوت کو راز میں رکھا اور اس نے ملک حمید الدین کو اس کے فرو کرنے کے لیے بھیجا۔

کے دروازے کی طرف بھگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور وہاں موچیوں کی گلی میں اس نے حاجی کو اس کے گھوڑے سے گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ گرچہ حاجی کے پیروکار اس پر اپنی تلواروں سے وار کرتے رہے انھوں نے اسے کئی جگہوں سے زخمی بھی کر دیا لیکن وہ اس وقت تک نہ اٹھا جب تک کہ اس نے حاجی کو نہ مار ڈالا۔ اس کے بعد وہ سرخ محل کی طرف روانہ ہوا اور بد نصیب علوی کو پھانسی دے کر اس کے سر کو نیزے پر رکھ کر پوری دہلی میں گھمایا۔

اس کے بعد جو سزائیں دی گئیں ان کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نظامِ حکومت کی دوبارہ بحالی کا سب سے پہلا مسئلہ شاہی خزانے کا تھا۔ ان تمام لوگوں کو جنھوں نے حاجی سے روپے لیے تھے گرفتار کر لیا گیا اور انھیں قید کر دیا گیا۔ اور تمام روپے جن کو اس نے تقسیم کر دیا تھا خزانے میں واپس لائے گئے۔ تقریباً چھ یا سات دنوں بعد الغ خاں کو بڑی تیز رفتاری سے دہلی بھیجا گیا اور شہر سے باہر معزی محل میں اسے ٹھہرایا گیا۔ تمام باغیوں کو اس کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے انھیں مار ڈالنے کا حکم دیا۔ اگرچہ سابق کوتوال ملک الامراء فخر الدین کے پوتوں کو بغاوت کا علم تک نہ تھا لیکن ان تمام کو مار ڈالا گیا اور اس کے خاندان کا کوئی نشان تک باقی نہ رکھا گیا۔

بغاوت کی خبر حتی الامکان تیزی کے ساتھ علاؤالدین کو پہنچاچائی گئی لیکن اس معاملہ کو اس نے اپنے افسروں پر چھوڑ دیا اور بات کو فوج سے پوشیدہ رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جولائی کے آغاز میں یاشیب پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قلعہ کی فوج کا ذخیرہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ امیر خسرو ہمیں بتاتا ہے کہ "قلعہ میں عسرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ عوام ایک دانہ غلہ کے بدلے دو سونے کے ٹکڑے دینے پر تیار تھے۔ لیکن وہ حاصل نہیں کر پاتے تھے۔ پانی اور سبزیوں کی کمی کی وجہ سے قلعہ کانٹوں کا ایک ریگستان بن گیا تھا۔[1] ایک رات رسم جوہر کی ادائیگی کے لیے ہمیر نے بہت بڑی آگ روشن کی۔ عورتیں اس کی بڑی رانی رنگا دیوی[2] کی قیادت میں شعلوں میں جل کر

---

(1) خزائن الفتوح ص ص 53-52

(2) خسرو اور تمام فارسی میں لکھنے والے مورخین رسم جوہر کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے بڑی رانی کا نام ڈاکٹر کے ایس لال (Khaljis ص 112) نے ہربیلاس سارداکی ہمیر اص 44 کے حوالے سے دیا ہے۔

ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد ہمیر دیو اپنے آدمیوں کے ساتھ یا شیب پر لڑنے اور مر جانے کے لیے آیا۔ بیشتر منگول لڑائی میں مارے گئے۔ 10 جولائی 1301ء جب سلطان قلعہ میں داخل ہوا تو اس نے محمد شاہ کو زخمی پڑا پایا۔ اس سے سلطان نے پوچھا کہ "اگر میں تمہارے زخموں کا علاج کراؤں گا اور تم اچھے ہو جاؤ تو تم میرے ساتھ کیسا برتاؤ کرو گے؟" زخمی منگول نے جواب دیا کہ اگر میں صحت یاب ہو جاؤں تو میں تمہیں مار ڈالوں گا اور تخت پر ہمیر دیو کے بیٹے کو بٹھاؤں گا۔" سلطان نے غصہ میں محمد شاہ کو ہاتھی کے قدموں تلے روند دیے جانے کا حکم دیا لیکن بعد میں مرحوم کی ہمت اور وفاداری کو یاد کر کے اس نے اسے مناسب طریقے سے دفنانے کا حکم دیا۔[1] رن مل اور دوسرے راجپوتوں کو جو رائے کے پاس سے سلطان کے پاس بھاگ آئے تھے قتل کر دیا کیونکہ ان لوگوں نے خود اپنے سردار سے غداری کی تھی لہٰذا علاؤالدین کا کہنا تھا کہ وہ ان لوگوں سے اس بات کی توقع نہیں رکھتا کہ وہ اس کے وفادار رہیں گے۔[2] قلعہ کو ان تمام اشیاء کے ساتھ جو اس کے اندر موجود تھیں بطور تحفہ الغ خاں کے حوالے کر دیا گیا اور سلطان دہلی واپس آ گیا۔ لیکن چونکہ وہ شہریوں سے نالاں تھا اور بہت سے صدروں کو اس نے دہلی سے جلاوطن کر دیا تھا لہٰذا وہ ایک ماہ تک شہر میں داخل نہ ہوا اور اندری اور تھلا میں شکار میں اپنا وقت گزارتا رہا۔[3] الغ خاں نے وارنگل اور معبر کی فتح کے لیے ایک

---

(1) فرشتہ ص108

(2) فرشتہ (ص 108) صرف رن مل اور دوسروں، کا حوالہ دیتا ہے لیکن ڈاکٹر کے۔ ایس۔ لال (Khaljis ص113) ہر بیلاس سارداکی ہمیر (ص ص42-38) کی بنیاد پر لکھتے ہیں کہ "رن مل جو علاؤ الدین کے پاس راجپوتوں کے سلسلہ میں تصفیہ کے لیے گیا تھا، غداری کر کے سلطان کے ساتھ ہو جانے پر راضی ہو گیا اور اس نے ایک لکھی ہوئی دستاویز اس سے حاصل کر لی جس میں اسے مکمل معافی بخش دی گئی تھی۔ رن مل نے یہ دستاویز اپنے راجپوت دوستوں کو دکھائی اور ان میں سے کچھ لوگ مع رتن پال کے، محصور قلعہ سے شاہی خیمہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ رن مل اور رتن پال دونوں ہی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہمیر کے وزیر تھے۔

(3) عصامی ص669 برنی کہتا ہے کہ چونکہ [illegible] شہریوں کے نفرت و غصہ کا سبب بنا تھا اور اس نے بہت سے صدروں کو جلاوطن کر دیا تھا لہٰذا علاؤالدین شہر میں داخل نہ ہوا بلکہ مضافات میں مقیم ہو گیا (ص112)

بڑی فوج اکٹھا کی لیکن چار یا پانچ ماہ بعد جب وہ دہلی جا رہا تھا اس کا انتقال ہو گیا۔ سلطان کو سخت افسوس ہوا اور اپنے بھائی کی روح کے نجات کے لیے اس نے کافی مقدار میں روپے صدقے میں دیے۔[1]

---

(1) عصامی کے اس بیان پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ملتی کہ علاؤالدین کے حکم پر الغ خاں کو زہر دیا گیا۔ یہاں عصامی انتشار کا شکار ہے۔

3

علاؤالدین خلجی

بغاوتوں کے اِنسداد کی تدابیر محکمہ مال گزاری میں اِصطلاحات

چتوڑ، طرغی (3-1301)

بغاوتوں کے اِنسداد کے لیے چار تدابیر

علاؤالدین کی تاجپوشی کے وقت سے تین بغاوتیں ہو چکی تھیں۔ اس لیے رنتھمبور کے محاصرہ کے دوران سلطان نے اپنی مجلس خاص کے اراکین کو ان سوالات کا جواب دینے کے لیے طلب کیا۔ ”بغاوتوں کے اسباب کیا ہیں؟ سلطان نے کہا کہ ”اگر ان اسباب کا پتہ چل جائے تو میں ان کو رفع کرنے کی کوشش کروں گا“۔ اکثر و بیشتر ایسے کارگزار افسران مر چکے تھے جن کی حمایت کے سبب علاؤالدین کو ابتدائی دور میں کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔ لیکن ان کے جانشین بھی ان کے معیار سے کم نہ تھے۔ برنی ملک عین الملک ملتانی اور ملک حمیدالدین اور ملک عزالدین برادران (پسران علاء دبیر) کا خصوصی طور پر ذکر کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض دیگر عقلمند افسران کو بھی بلایا گیا۔ کئی دنوں کے بحث و مباحثہ کے بعد مجلس خاص [کے ممبران] نے بادشاہ کو خوف یا خود اپنے گروہ کے خیالات و مفاد کا لحاظ کیے بغیر بغاوتوں کے اسباب کی یہ فہرست بندی کی۔

”بغاوتوں کے چار اسباب ہیں، اوّل، لوگوں کے اچھے اور برے کاموں سے بادشاہ کی عدم واقفیت، دوئم شراب، لوگ شراب نوشی کی مجلسوں کا انتظام کرتے تھے جہاں وہ ایک دوسرے سے دل کھول کر باتیں کرتے اور بغاوتوں اور سازشوں کے منصوبے بناتے تھے۔ سوئم، مَلِکوں اور امراء کے درمیان میل و محبت اور رشتہ داریاں،

جس کی وجہ سے یہ ہوتا تھا کہ اگر کسی امیر کو سزا دی گئی تو اس کے سو قرابت مند یا دوست اس کا ساتھ دینے کو کھڑے ہو جائیں گے۔ چہارم، دولت، اگر لوگوں کے ہاتھوں میں (ضرورت سے) کم پیسے رہیں گے تو وہ اپنا دھیان روزی کمانے میں لگائیں گے اور کسی کو بغاوت یا سازش کے متعلق سوچنے کا موقعہ بھی نہ ملے گا۔"[1]

(1) ضبطیٔ املاک

علاؤالدین نے ضبطی اموال کو ترجیح دی لیکن برنی کے مبالغہ آمیز بیان سے ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سلطان، عہد وسطیٰ کے قانونی تصورات کے حدود سے باہر گیا ہوگا۔ کوئی شخص بھی [محض] اپنی دولت مندی کی وجہ سے لوٹا نہیں گیا۔ اپنی تخت نشینی کے بعد علاؤالدین نے ہر قسم کے سرکاری خیراتی عطیات کی نہ صرف توثیق کی تھی بلکہ توسیع بھی۔ اب اس نے ان سبھوں کی منسوخی کا حکم جاری کیا "جس کسی کے پاس بھی کوئی گاؤں بطور ملک، انعام یا وقف موجود تھا وہ ایک جنبش قلم سے واپس لے کر خالصہ میں شامل کر لیا گیا۔ وقف میں ایسی کوئی چیز بھی واپس نہ لی گئی جو اولاً اس میں شامل نہ تھی۔ مزید براں، عہد وسطیٰ کی ریاست تمام خیراتی عطیات، خواہ ان کا معطی کوئی بھی ہو، کی نسبت مکمل اور آخری اختیار رکھنے کی دعویدار تھی۔ ہم قطعی طور پر یہ جانتے ہیں کہ علاؤالدین نے اکثر لوگوں کو اس اصول کے اطلاق سے مستثنیٰ کر دیا۔[2] خود برنی اعتراف کرتا ہے کہ دہلی کے جاگیرداروں کے پاس کئی ہزار تنکہ [کے مالیت کی جائدادیں] چھوڑ دی گئیں۔ پھر بھی یہ عام اصول پوری سلطنت کے لیے بنا تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ "دہلی میں سوائے ملک و امراء، سرکاری ملازمین (کارداران)، ہندو اور ملتانی تاجران اور ہندو ساہوکاروں کے مکانات میں بہت کم سونا [کسی کے پاس] بچ رہا"۔

(2) محکمہ سراغرسانی کی تنظیم

چونکہ سلطان کو باخبر رکھنا ضروری تھا اس لیے یہ انتظام کیا گیا کہ اس کو تین

---

(1) برنی ص 282-87 گرچہ صرف برنی ہی ان تدابیر کا مفصل ذکر کیا ہے لیکن دوسرے معاصر ذرائع سے بھی ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

(2) یعنی عصامی کے بزرگوں کو دیے ہوئے دو گاؤں ضبط نہیں کیے گیے عصامی ص ص 382-83۔

ذرائع سے معلومات برابر ملتی رہیں۔ مہتمم (انچارج) افسران، سراغ رساں افسران یا برید، جن کا کام یہ تھا کہ معلومات جمع کر کے بادشاہ کے پاس پیش کریں، اور منہاس یا جاسوس[1] دو خاص جگہیں جن کے متعلق اطلاع مانگی جاتی تھی، وہ امرا کے مکانات اور منڈیاں تھیں۔ امراء کے مکانات میں جو کچھ ہوتا تھا اس کی خبر جاسوسوں کے ذریعہ بادشاہ کے پاس بھیجی جاتی تھی۔ ان رپورٹوں کو بغور پڑھا جاتا تھا اور مناسب تشریحات طلب کی جاتی تھیں۔ جاسوسوں کے خوف سے امراء اپنے گھروں کے اندر بھی تھرتھراتے تھے اور جب وہ شاہی دربار میں جاتے تھے تو ایک دوسرے سے اشاروں سے باتیں کرتے تھے "مختصر یہ کہ وہ کسی ایسے قول و فعل کے مرتکب نہ ہونا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ان کی تنبیہ یا سزا ہو"۔

(3) دہلی میں ممانعت شراب

علاؤالدین کے حکمِ امتناع (شراب) میں کوئی مذہبی پہلو نہ تھا۔ چونکہ شراب نوشی پر عام اعتبار سے علاؤالدین کو کوئی اعتراض نہ تھا لیکن چونکہ سیاسی طور پر یہ اقدام ضروری تھا اس لیے اس نے خود مئے نوشی ترک کر دی۔ شیشے کے بنے ہوئے شاہی جامِ شراب اور چینی مٹی کے دیگر ظروف بدایوں گیٹ کے نزدیک توڑ دیئے گئے اور شاہی ظروف سے اتنی شراب انڈیل کر پھینکی گئی کہ برسات کے موسم کی طرح کیچڑ جمع ہو گئی۔ اس کے بعد ہاتھی پر بیٹھ کر افسروں نے دہلی کے کوچہ و بازار میں اعلان کیا کہ کوئی بھی شراب نہ بیچے اور نہ اس (شراب خانوں) کے نزدیک جائے۔ ایسے اجازت یافتہ سرائے کے مالکان اور شراب سازوں کو دہلی سے نکال دیا گیا۔ اور ان سے ہونے والے محصول کو خارج از حساب کر دیا گیا۔ خود دار اور غیرت مند اشخاص نے پہلی ممانعت کے بعد ہی شراب نوشی بند کر دی۔ لیکن دوسرے لوگ اپنے گھروں کے اندر

---

(1) برید یا سراغ رساں افسران کو لوگ جانتے تھے (کھلے طور پر کام کرتے تھے) انہیں اس کا اختیار تھا کہ اطلاعات طلب کریں اور مقامی افسروں کا یہ فرض تھا کہ ان کو باخبر رکھیں برید کے فرائض کے ایک مختصر بیان کے لیے ملاحظہ ہو، برنی کی فتاویٰ جہاں داری۔ پولیٹیکل تھیوری آف دہلی سلطنت از حبیب و افسر بیگم، منشور 8، سیکشن I (ص 33-30) لغوی طور پر منہی سے مراد وہ شخص ہے جو منہیات کے متعلق خبر دے۔ دراصل وہ جاسوس تھا اور فرشتہ نے صحیح طور پر برنی کے لفظ 'منہی' کی جگہ 'جاسوس' استعمال کیا ہے۔

چینی سے شراب بناتے تھے اور زیادہ قیمت پر بیچتے تھے۔ انہوں نے شہر کے باہر سے بھی ٹھیلوں پر لکڑی اور گھاس کے نیچے شراب کے مٹکوں کو چھپا کر منگوانے کی کوشش کی۔ علاؤالدین نے بدایوں دروازہ کے نزدیک خشک کنویں کھدوانے کا حکم دیا اور جن لوگوں کو حکم عدولی کرتے پایا گیا ان کو ان کنوؤں میں ڈالا گیا۔ ان میں اکثر مر گئے اور جو بچ سکے وہ کافی علاج کے بعد ہی اپنی صحت بحال کر سکے۔ پھر بھی، سخت پابندی کے زمانہ میں بھی دہلی سے دس یا بارہ کروہ دور جا کر عمدہ شراب پی سکنا ممکن تھا۔ لیکن دہلی کے 4 یا 5 کروہ کے اندر کے علاقوں یا غیاث پور، اندرپت اور کیلوگڑھی جیسے مضافات میں شراب بالکل نہیں ملتی تھی۔ بالآخر علاؤالدین نے کچھ نرمی اختیار کی اور یہ حکم دیا کہ اگر کوئی شخص اپنے مکان کے اندر اپنے مصرف کے لیے شراب تیار کرے اور اس کو بیچنے یا دعوت مئے نوشی کے انتظام کا ارتکاب نہ کرے تو اس کو تنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور جاسوسوں کو اس کے گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ جوئے بازی اور بھنگ کا استعمال بھی ممنوع ہو گیا۔

(4) امراء کی روک تھام

علاؤالدین نے پہلے عہد حکومت کے تمام امراء کو ختم کر ڈالا تھا، یہ سبق کافی تھا، اب اسے صرف اپنے مقرر کیے ہوئے افسران سے نمٹنا تھا اور وہ احتجاج کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ اس زمانے کے تقریباً نصف صدی بعد برنی لکھتا ہے کہ "سلطان نے ملک و امراء، دربار کے ملازمین اور صاحب حیثیت لوگوں کو ایک دوسرے کے گھروں میں جانے کی اور دعوتوں میں جمع ہونے کی ممانعت کر دی (وہ) سلطان کی اطلاع و اجازت کے بغیر آپس میں شادیاں نہیں کر سکتے تھے اور وہ عام لوگوں کو اپنے گھروں میں جمع ہونے کی اجازت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ برنی مصر ہے کہ یہ احکامات سختی سے عائد کیے گئے۔ امراء کے گھروں میں مہمان داری اور ضیافتیں ختم ہو گئیں۔ اور وہ بہت محتاط طور پر رہنے لگے۔ اور کسی سازشی یا فسادی یا بدنام شخص کو اپنے پاس بھی نہ آنے دیتے تھے۔ اور جب وہ شاہی دربار میں بھی جمع ہوتے تو شانہ بہ شانہ ہو کر بہ اطمینان گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ فرشتہ مزید لکھتا ہے کہ اگر کسی امیر کو یا کو کسی مہمان کو

اپنے گھر ٹھہرانا ہوتا یا کوئی شادی طے کرنا ہوتی تو اسے سیدھا وزیر کو (اجازت) کے لیے لکھنا پڑتا۔ معاصرین اس کو فتنہ انگیز خاں کہا کرتے تھے اور اس کی بہت خوشامد کرتے تھے تاکہ وہ ان کے کاموں کے لیے سلطان کی اجازت مناسب موقع دیکھ کر حاصل کرے۔[1] بھائی چارہ کی اس کیفیت کو، جو مملوک دور کے امرا (کی تنظیم) کی لعنت رہی تھی، اعلیٰ امرا کے درمیان فروغ پانے نہ دیا گیا۔ شاید پلہ اب دوسری جانب زیادہ جھک گیا۔ افسران اب سلطان کی اطاعت گزاری کے اس قدر عادی ہو گئے کہ اب وہ (جیسا کہ آئندہ پائیں گے) سلطان کے منظور نظر لوگوں کی، خواہ ان کی اہلیت جیسی بھی ہو، نیز سلطان کے قاتلوں کی بھی اسی طرح اطاعت گزاری کرنے لگے۔

سلطان اور ہندو سردار

[عہدِ وسطیٰ کے] ہندستان کے نظام لگان کو اس وقت تک صحیح طور پر سمجھا سکتا ہے جب تک اس موضوع پر مسلمانوں کے دینیاتی ادب کو بالکل نظر انداز نہ کر دیا جائے۔ [ملک] عرب ایک ریگستان ہے جہاں اکا دکا خداداد نخلستان واقع ہیں بحیرۂ خزر (Caspian Sea) سے جنوب میں واقع 4 یا پانچ ضلع ایسے ہیں جہاں سالانہ 80 انچ کے قریب بارش ہوتی ہے۔ شیراز اور فارس کے ایرانی صوبوں میں مانسون کا اثر بہت کمزور ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ عراق سے لے کر چین کی سرحد تک کے وسیع علاقے میں Cyclonic (نہ کوئی مانسونی) بارش ہوتی ہے جس کی مقدار تقریباً چار انچ سالانہ ہے۔ یہ علاقہ [زراعت کے لیے] کلی طور پر قنات اور کاریز کے ذریعہ مصنوعی آبپاشی پر انحصار کرتا ہے مواخرالذکر دونوں الفاظ سے مراد زمین کے نیچے [بنی ہوئی] نالیاں ہیں جو کئی نسلوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔ اس وسیع علاقہ میں زراعت کے سلسہ سب سے ضروری امور حقِ زمین کے متعلق نہیں بلکہ حقِ آبپاشی کے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو اصول اس علاقہ میں کارگر ثابت ہوتے ہیں ان کا اطلاق اس علاقہ میں نہیں ہو سکتا جو کہ ہمارے ملک کی مانند ہوں جو زراعت کے لیے بہت زیادہ حد تک مانسون پر منحصر کرتا ہے، یہ بات سب سے پہلے مسٹر مورلینڈ نے

---

(1) فرشتہ، جلد 1، ص: 10

پیش کی، جس نے امام یوسف کی کتاب الخراج کو [اِس سلسلہ میں] کار آمد نہ پایا اور [اس کے مطالعہ میں] آگے نہ کوشش کی۔ ہمیں ہندو نظام لگان کو اپنی بنیاد بنا کر آگے بڑھنا ہو گا۔[1]

مسٹر مورلینڈ لکھتے ہیں کہ ”میں نے درمیانی حقدار کی اصطلاح ان تمام مختلف گروہوں کے لیے استعمال کی ہے جنہیں بادشاہ کی جانب سے اس کا حصہ [لگان] وصول کرنے کی اور اس [حصے] کو کلی یا جزوی طور پر رکھنے [صرف کرنے] کی اجازت ملی ہوئی تھی۔ درمیانی حقداروں کو ہم سرداروں (chiefs)، نمائندوں، جاگیرداروں معافی داروں اور کسانوں کے طور پر درجہ بندی کر سکتے ہیں،[2] اب [یہ ذہن نشین رکھنا ہے] کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندستان کا آزاد حکمراں رائے، [کہلاتا] تھا۔ لیکن چونکہ رائے کا لقب کم درجہ کے ماتحت سرداروں نے بھی اختیار کرنا شروع کر دیا اس لیے واقعی آزاد و مختار رایوں نے بھاری بھر کم سنسکرت آمیز لقب اختیار کیے جن کو ہمارے فارسی ماخذ نے صحیح طور پر ترجمہ کرنے کی زحمت نہ کی۔ ہندو عہد کے سرداروں کو ڈاکٹر عرفان حبیب نے الگ الگ گروہوں میں تقسیم کیا ہے مثلاً سامنت، رنا کا (رانا)، روتاس (راوَت) ٹھاکر اور راج پتر (یا راجپوت۔ سامنت[3] اور راج پتر کی اصطلاح دہلی سلطنت

---

(1) مورلینڈ، ایگرین سسٹم آف مسلم انڈیا، باب ا (ص3)

(2) ایضاً۔

(3) ڈاکٹر عرفان حبیب کا مضمون بعنوان The Social Distribution of handedproperty in Pre-Birtish India (جو بین الاقوامی معاشی تاریخ کانفرنس،) میونخ (جرمنی) اگست 1965ء میں پڑھا گیا تھا۔ لفظ راج پتر کا مطلب شاید رائے کے بیٹے یا نزدیکی رشتہ دار ہو گا۔ لفظ راجپوت، جو دہلی سلطنت کے [دور کے] مورخ کبھی بھی استعمال نہیں کرتے، کے رائج ہونے کے سلسلہ میں ڈاکٹر عرفان حبیب یہ رائے پیش کرتے ہیں۔ ”ایک دلچسپ [نئی] صورتحال [جو اس زمانہ میں ترقی پذیر ہوئی] جس کی طرف اب تک کم توجہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح اس دیہی، طاقتور طبقہ نے، اپنے مختلف اجزا کو قبیلوں یا ذیلی ذاتوں کی صورت میں ضم کر کے شمالی ہند میں پھیلی ہوئی راجپوتوں کی بڑی ذات کی صورت میں اپنا سماجی استحکام کر لیا۔ سولہویں صدی کے مآخذ میں لفظ راجپوت کا استعمال ایک ذات کے نام پر اور اس کے اجزا کے جذبہ اتحاد، دونوں ہی کی نشاندہی کے لیے یک بیک ملنے لگتا ہے۔ یقیناً یہ مطلب ماقبل عہد میں تدریجاً مروج ہوا ہو گا۔ دیہی شرافیہ کا یہ ذاتی استحکام شاید ایک طبقاتی [جذبہ] استحکام سے ترقی پایا ہو گا۔ چونکہ اونچا طبقہ دیہی اشرافیہ میں ضم کر لیا گیا“۔ (ص34)

کے دور کے فارسی ماخذ میں نہیں ملتی۔ جنہیں [جس گروہ کو] کو مورلینڈ نے نمائندوں کا نام دیا ہے انہیں ہم ان کے مترادف قرار دے سکتے ہیں جن کو برنی نے خوطس، مقدم اور چودھری کہا ہے۔ یہ نمائندگان اس طریقہ تحصیل میں ایک اہم حیثیت رکھتے تھے، جس کو مورلینڈ نے جماعتی تشخیص کا نام دیا ہے۔ [اس طریقہ کے تحت] دہلی کی مرکزی وزارت لگان، پرانی شرحوں کو ذہن نشین رکھتے ہوئے، ایک یا کئی گاؤں پر ایک متعین رقم عائد کر دیتی تھی اور یہ نمائندگان اس رقم کو [انفرادی] کسانوں یا کاشتکاروں سے وصول کرنے کی ذمہ داری قبول کر لیتے تھے۔ مورلینڈ، کسان کا لفظ واقعی کھیتی کرنے والے کے لیے محدود رکھا ہے تا کہ ان کو ٹھیکہ داروں یا خالصتاً ممیز کیا جا سکے۔ جو سرکار سے کسی بڑے علاقے کا لگان وصول کرنے کا ٹھیکہ لیا کرتا تھا۔ آخری بات یہ کہ کسی عطیہ یا جاگیر کی تحریری شرائط، خواہ وہ جو بھی ہوں، کو کسی وقت بھی بادشاہ کی مرضی کے مطابق منسوخ کیا جا سکتا تھا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ واضح تخصیص و امتیاز قایم کرنے کے بعد مورلینڈ، علاؤالدین کے لگان سے متعلق اصلاحات [کے مطالعہ] کے سلسلہ میں ان کا استعمال نہیں کرتا۔ کسی مقامی سردار [راجہ] کے علاقہ میں سلطان کو یہ حق نہ تھا کہ راجہ اور کاشتکاروں کے معاملات میں کسی طرح کی دخل اندازی کرے۔ جب تک کہ راجہ مقررہ رقم ادا کرتا رہے۔ لیکن نمائندگان، کے سلسلہ میں سلطان کو قانوناً یہ اختیار تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ "نمائندگان ۔ یعنی خوطس، مقدم اور چودھری -[سے متعلق معاملات] تک ہی محدود تھیں۔ لیکن [اس سلسلہ میں] دو معاصرین، جن تک مورلینڈ کی پہنچ نہ تھی، کے بیان پر غور کر لینا بہتر رہے گا۔

1311ء میں علاؤالدین کے پاس پیش کیے جانے والی ایک تصنیف میں امیر خسرو لکھتے ہیں "جب فتح مند فوج کے نیزہ وروں نے ضعیف البصر رایوں کی آنکھوں میں اپنے نیزوں کی نوک سے کاجل لگا دیے تو ان میں سے بعض دور اندیش بڑے زمینداروں کی آنکھیں ترکوں کی آنکھ چھید دینے والے نیزوں کے ڈر سے کھل گئیں اور وہ دربار معلیٰ میں حاضر ہو گئے۔ اعلا حضرت نے ان میں سے ہر ایک پر نظر عافیت ڈالی اور ان کی توقعات سے زیادہ ان پر مہربانی کی نتیجہ یہ ہوا کہ ساری مملکتِ ہند میں

کوئی گستاخ ہندو (رائے) باقی نہ رہا۔ یا تو انہوں نے جنگ کے سُرخ میدان میں اپنی آنکھیں بند کرلیں یا تخت شاہی کے آگے سر بسجود ہو کر دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں[1]، ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا ہوگا کہ علاؤالدین ان ہندو رایوں سے مصالحت کے لیے تیار تھا جو اس کے پاس حاضر ہوئے اور 4/جمادی الثانی 711ھ (19/اکتوبر 1312ء) کو منعقد ہونے والے دربار میں ان کی تعداد خاصی رہی ہوگی، چونکہ امیر خسرو لکھتے ہیں کہ "بڑے بڑے ملکوں کے (تخت شاہی کے آگے) سر جھکائے ہونے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین پر ٹیلے نکل آئے ہیں۔ اور رایوں کے زمین پر سر ٹکانے کی وجہ سے ان کے سر پر لگے ٹیکوں سے تمام زمین سُرخ ہوگئی"۔[2]

علاؤالدین نے تجربے صرف تجربے سے تعلیم حاصل کی تھی اور وہ ملاؤں کے تمام منقول نظریات کو وہ مہمل سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا۔ اسی لیے وہ اپنے اقتدار کے حدود اور پابندیوں سے واقف تھا۔ وہ ایک غیر مسلم ملک کا مسلم حکمراں تھا اور وہ جانتا تھا کہ صرف ان ہی اصولوں کی بنا پر حکومت کر سکتا تھا جو ہندو عوام کو بھی قابل قبول ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس کے نقطۂ نظر سے اصل فرق یہ تھا کہ اول الذکر ذات اور موروثی [حکومت] کے اصول کو مانتے تھے جبکہ پڑھے لکھے مسلمان، جن میں ذات کا نظام نا معلوم تھا، ایک ایسی سیاسی حکومت چاہتے تھے جس میں ترقی کی راہیں اہلیت کی بناء پر کھلی ہوں۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ، پرانی روایات کے مطابق وہ حکومت کے تمام مسلم ملازمین کی برطرفی کے اختیار کو استعمال کر سکتا تھا۔ اور وہ بلا کسی روک ٹوک کے اس اختیار کو عمل میں لایا بھی۔ دوسری طرف اسے رایوں کو اور ان کی رعایا کو ان کے روائتی طرزِ زندگی پر [بلامداخلت] چھوڑ دینا پڑا۔ بشرطیکہ وہ خراج ادا کیے

---

(1) خزائن الفتوح، ص 55 (نوٹ: ص 59 ہونا چاہئے۔ مترجم) سیاق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 'ہند' سے مراد شمالی یا ہندستان ہے۔

(2) خزائن الفتوح ص 168 جب ایک مسلمان تخت کے آگے جھکتا ہے تو نقیب 'بسم اللہ' پکارتے' لیکن جب ہندو جھکتا تو وہ ہدایت اللہ (خدا تمہیں راہِ راست دکھائے) پکارتے۔ صوفیاء کے شاگرد اپنے پیروں یا مشائخ کے آگے جھکا کرتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء اس طریقہ کو صحیح قرار دیتے ہیں اور اس کے جواز میں ان کے دلائل کا ایک مختصر بیان فوائد الفواد میں ہے۔ لیکن ان کے ایک اہم شاگرد شیخ نصر الدین چراغ اس طریقہ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

جاتے رہیں۔ جن کو ان رایوں نے قبول کیا تھا۔ اگر خود رائے کو معزول کیا جاتا تو اسی طرح کا سلوک [ادائیگی خراج] ان دوسرے سرداروں یا رواتوں سے کیا جاتا جو اس کے ماتحت تھے۔ رائے ماتحت علاقوں میں رہنے والے عام ہندوؤں کی زندگی میں مداخلت نہ کی گئی۔ دہلی مملکت کے بڑے شہروں کی زندگی میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ لیکن رایوں کے زیرِ حکومت علاقوں میں رسم و رواج -اور حق موروثیت- مکمل طور پر جاری رہے۔

مختلف ماخذ سے ہمیں یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ مصالحت کی اس پالیسی کی انتہا پسند مولویوں کے ایک کم تعداد مگر سخت زبان گروہ نے بڑی سخت نکتہ چینی کی۔ وہ اتنے غیر عملی خیال کے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح پیغمبر نے عرب میں کفر و شرک کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ اسی طرح وہ بھی ہندستان میں ہندو مذہب کو بالکل ختم کر سکتے تھے۔ نقطۂ نظر میں فرق تھا لیکن حقائق کے متعلق کوئی اختلاف نہ [ہو سکتا] برنی کی فتاویٰ جہانداری (جو 1375ء کے بعد لکھی گئی تھی) کے مندرجہ ذیل دو پیراگراف اس غیر عملی انتہا پسند مولویانہ نقطہ نظر کے ایک صحیح نمونے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں:

'مسلمان بادشاہ اس وقت تک توحید کی حرمت اور اسلام کی برتری قایم نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ کفر کی بیخ کنی کی ہر ممکن کوشش نہ کرے اور کافروں کے [مذہبی] رہنماؤں، جو ہندستان میں برہمن تھے، کو قتل نہ کرے۔ مجاہدینِ اسلام اور بادشاہوں کی تمام طاقتیں جہاد میں صرف ہونی چاہئیں اور انہیں اس سلسلہ میں خود کو جوکھم میں ڈالنا چاہیے۔ تاکہ حقیقی مذہب جھوٹے مذاہب کو اکھاڑ پھینکے۔ اور تب ایسا معلوم ہونے لگے گا کہ یہ چھوٹے مذاہب کبھی تھے ہی نہیں۔ چونکہ ان کی ظاہری چمک دمک اور شان و شوکت چھین لی گئی ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر اس تمام حیثیت و اقتدار کے باوجود جو اللہ نے اسے دی ہے، ایک مسلمان بادشاہ ہندوؤں سے محض جزیہ و خراج لینے پر مطمئن ہو جاتا ہے اور کفر و کفار دونوں کو قایم رہنے دیتا ہے اور ان کے استیصال کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا ہے تو پھر اس سلسلہ میں ایک اسلامی حکمراں اور ایک کافر رائے میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ چونکہ کافروں کے رائے [حکمراں] بھی ہندوؤں

سے جزیہ و خراج وصول کرتے ہیں، جو کہ ان کے جھوٹے مذہب میں شریک ہیں اور اس طرح حاصل کی ہوئی رقم سے اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ در حقیقت وہ [کہیں زیادہ] سو گنا زیادہ ٹیکس وصول کرتے ہیں:

سلطنت دہلی دو صدیوں سے کچھ کم عرصہ تک پھلی اور پھولی اور اس نے ہندستان کو بعض وہ چیزیں عطا کیں جن کی اس کو ضرورت تھی لیکن ہندستان کو اس طرح کے جہاد کی ضرورت نہ تھی جیسا کہ برنی کے تصور میں تھا اور دہلی کے تمام سلاطین نے ایک مذہبی مشن کا خیال ترک کر دیا۔ کسی اور شخص کی بہ نسبت برنی خود یہ بات بخوبی جانتا تھا: وہ مزید لکھتا ہے:

"لیکن کفار کو اکھاڑ پھینکنے کی خواہش (ہندستان کے) حکمرانوں کے دلوں میں موجزن نہیں ہے۔ برخلاف اس کے، اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ کفار و مشرکین خراج کے ادا کرنے والے ہیں اور ذمّی ہیں، ان کفار کی عزت افزائی ہوتی ہے۔ انہیں امتیازات دیئے جاتے ہیں، خیال کیا جاتا ہے اور بلندی عطا کی جاتی ہے۔ بادشاہ انہیں نقارہ، علم، زیورات، زربفت کے لبادے اور آراستہ گھوڑے دیتے ہیں اور انہیں گورنری اور دیگر اعلا عہدوں پر بحال کرتے ہیں اور ان کے دارالسلطنت دہلی میں، جس کی بلند درجگی کی وجہ سے تمام دیگر مسلم شہروں کے درجے بھی بلند ہو گئے ہیں۔ مسلم بادشاہ نہ صرف اس کی اجازت دیتے ہیں، بلکہ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ کفار، مشرکین اور بت پرست اور گوبر پوجنے والے (سرگین) محل نما مکان بنواتے ہیں، زربفت کے کپڑے پہنتے ہیں اور سونے اور چاندی کے سامانوں سے آراستہ عربی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ہزاروں طرح کے وسائل ہیں وہ آرام اور خوشی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنی ملازمت میں رکھتے ہیں اور ان کو اپنے گھوڑوں کے آگے ڈوراتے ہیں۔ مسلمان ان کے دروازوں پر ان سے بھیک مانگتے ہیں اور اسلام کے اس دارالسلطنت [اہم مقام] میں، جس کی وجہ سے اسلام کی عمارت سربلند ہے، انہیں رائے، (بڑے حکمراں)، رانا (چھوٹے درجہ کا حکمراں، ٹھاکر (جنگباز)،

ساہا (مہاجن)، مہتا[1] (انتظام کار) اور پنڈت (پجاری) کہا جاتا ہے۔[2]

علاؤالدین کی لگان سے متعلق اصلاحات

برنی [کی تصنیفات] سے قدرے طویل اقتباسات پیش کرنا ضروری تھا۔ چونکہ علاؤالدین کی لگان سے متعلق اصلاحات کا واحد تذکرہ، جو ہمیں دستیاب ہے، وہ اسی کے قلم سے ہے۔ برنی یہ بات بخوبی ظاہر کر دیتا ہے کہ رایوں کو اپنی رعایا پر ٹیکس لگانے، یا ضرورت سے زیادہ ٹیکس لگانے کا حق تھا۔ اور ٹیکس لگانے کے حق کے حامل ہونے کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہ قلعے اور فوجیں بھی رکھتے ہوں گے۔ اکثر رائے اور روات اس بات کے لیے مجبور تھے کہ ضرورت پڑنے پر مقامی یا مرکزی انتظامیہ کی مدد کریں۔ لٰہذا سپاہیوں کو رکھنا ان کا ایک فرض رہا ہوگا، چونکہ ہندو قانون رسم و رواج، ذات اور قبیلے کے درمیان رائج احکام پر مبنی ہے لٰہذا رایوں اور راوتوں کی اپنی (علاحدہ) عدلیہ بھی رہی ہوں گی، ان کی کچہریوں کے فیصلوں سے دہلی [کی عدالتوں] میں اپیل کا ہمیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

برنی کا تعلق سرکاری افسروں کے ایک خاندان سے تھا اور وہ [ایک طرف] رایوں، راناؤں اور راوتوں اور (دوسری طرف) ایک یا زائد گاؤں کے مکھیاؤں یا ان کے ماتحتوں، جنہیں خوطس، مقدم اور چودھری کہتا ہے، کے فرق سے ناواقف نہ رہا ہوگا۔ مقدم ایک عربی لفظ ہے جس کا مطلب اہم یا اول [مرتبہ کا] شخص ہے اور زیر بحث سیاق میں اس کا مطلب ایک یا کئی گاؤں کا مکھیا ہے۔ چودھری ہندی کا ایک معروف و مشتمل لفظ ہے لیکن برنی اسے مقدم کے مترادف کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ خوط ایک غیر، ہندی لفظ ہے۔ اس کا پہلا اور آخری حرف عربی یا فارسی کا اصل ہے لیکن جب یہ غیر فارسی داں اشخاص کے استعمال میں رہا تو اس کی شکل تبدیل ہوگئی۔ اس کا نزدیک ترین فارسی لفظ خط ہے [یعنی] وسہ دستاویز جس کے ذریعہ خوط نے اس گاؤں کا

---

(1) برنی نے جس طور پر لفظ 'مہتا' کا استعمال کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مطلب کوئی معمولی کلرک نہیں بلکہ اور بلند درجہ کا افسر ہوگا۔ برنی خود لکھتا ہے کہ جب محمد بن تغلق نے گجرات کے ایک رائے کو معزول کیا تو اس نے اس کی جگہ پر ایک مہتا مقرر کیا۔ اس لیے انتظام کار، کا لفظ اس کا زیادہ صحیح بدل ہے۔

(2) حبیب اور افسر بیگم، پولٹیکل تھیوری آف دہلی سلطنت، فتاویٰ جہانداری، منشورہ 11 ص ص 48-46۔

لگان وصول کرنا قبول کیا ہوگا جو حکومت نے اس کے ذمہ لگایا ہوگا، جس قسم کے گاؤں سے فی الحال ہمارا تعلق ہے ان کے لیے مور لینڈ [حکمراں] سرداروں (رایوں، راناؤں اور راوتوں)، جن کے ماتحت کسانوں سے مرکزی وزارت لگان کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اور ان مکھیاؤں، جن کا نام وزارت کے زیرِ نگرانی ہوتا تھا، کے درمیان واضح فرق قایم نہیں کرتا۔ تیرہویں صدی کی فارسی تاریخیں ہمیں لگان کے طریقوں کے متعلق کچھ نہیں بتاتی ہیں۔ لیکن یہ اندازہ کرنا حق بجانب ہوگا کہ چونکہ دیہی علاقوں میں [نگرانی کے لیے] حکومت کے پاس مناسب عمال نہ تھے اس لیے جب تک مقررہ رقم لگان ادا ہوتا رہتا وہ یہی کمزور طبقوں کے لیے زیادہ فکر مند نہ ہوتی ہوگی۔ علاؤالدین پہلا حکمراں تھا جس نے دیہی علاقہ میں جہاں جماعتی تشخیص، کا طریقہ رائج تھا، ایک نئے نظام لگان کو جاری کرنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا۔

پہلے [ان علاقوں کے متعلق] ان الزامات کو لیں جن کا ذکر سلطان نے بیانہ کے قاضی مغیث الدین سے کیا۔ مجھے یہ خبر برابر ملتی رہی ہے کہ خوط اور مقدم لوگ عمدہ گھوڑوں پر سواری کرتے ہیں، عمدہ کپڑے پہنتے ہیں، شکار کرتے ہیں، فارسی تیروں کا استعمال کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے جنگ کرتے [رہتے] ہیں۔ لیکن وہ خراج، جزیہ گھری اور چونگی [ٹیکس] کے طور پر ایک جتل بھی ادا نہیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے [ماتحت] گاؤں پر حقوق خوطی عائد کرتے ہیں۔ وہ عورتیں رکھتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور سینکڑوں مختلف طریقوں سے اپنے غرور و تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض بلانے پر بھی دیوانی آفس میں حاضر نہیں ہوتے اور محصلان (لگان وصول کرنے والے) کو خاطر میں نہیں لاتے............ ہماری مملکت کا سو کردہ کا علاقہ بھی صحیح طور پر ہمارا اطاعت گزار نہیں ہے'۔[1]

علاج کیا ہے؟ برنی لکھتا ہے کہ علاؤالدین نے اپنے دانشمندوں سے ان امور کے متعلق مشورہ کیا جن سے 'ہندوؤں' کو دبایا جا سکے اور ہر شخص خوط سے لے کر بلھار تک ایک ہی اصول کے تحت خراج ادا کرے اور طاقتوروں کی رقم خراج کا بوجھ

---

(1) برنی، ص 291۔

کمزوروں پر نہ پڑنے پائے، لفظ 'ہندو' سے برنی کی مراد ہمیشہ اونچے طبقہ کا ہندو ہے[2] اور اس سباق میں سیکھا ہے۔ لفظ بلہار کا مطلب بھنگی لیا گیا ہے لیکن برنی اسے سب سے نیچے درجہ کے کاشتکار کے لیے استعمال کرتا ہے۔

"اس مقصد کے حصول کے لیے، جو کہ انتظامیہ کا اصل مقصد ہوتا ہے، دو ضابطے بنائے گئے۔ اول یہ کہ ہر کاشتکار، خواہ اس کی کاشت چھوٹی ہو یا بڑی وہ ناپ اور فی بسوہ پیداوار کے حساب سے [بحکم مساحت و وفاء بسوہ] [کاشت] کرے اور انہیں بلا کسی قسم کے ردوبدل کے نصف [بطور لگان] دینا ہوگا۔ اس ادائیگی میں خطوط اور بلہار کے درمیان کسی طرح کوئی تمیز نہ برتی جائے گی۔ خوطوں کو کسی قسم کے حقوق خوطی عائد کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔[2] دوئم یہ کہ بھینسوں اور بکریوں، درحقیقت تمام دودھ دینے والے مویشیوں۔ پر چرائی کا ٹیکس مقرر اور عاید کر دیا گیا۔ اور [چرائی کے] ٹیکس کی وصولی کسانوں کے گھروں پر ہی کی جائے گی۔ اس طرح کوئی بدعنوانی نہ ہو سکے گی۔ اور لگان کی وصولی میں کسی قسم کی چوہے، بلّی کی آنکھ مچولی نہ کھیلی جا سکے گی، طاقتور کا بوجھ کمزور پر نہ ڈالا جا سکے گا۔ اور طاقتور اور کمزور دونوں ہی کو ایک حکم کے مطابق [لگان] ادا کرنا پڑے گا"۔[3]

فرشتہ، اپنے ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر لکھتا ہے کہ مقدموں اور عام کسانوں دونوں ہی کے لیے مندرجہ ذیل چھوٹ مویشیوں کے سلسلہ میں مقرر کر دی گئی۔ چار

---

(1) مورلینڈ، ایگریرین سسٹم ص32 نوٹ - برنی لفظ ہندو، استعمال کرتا ہے لیکن زیر بحث اور دیگر موقعوں پر جب یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، سباق سے یہ بات ظاہری ہوئی ہے کہ اس کا مطلب کسان نہیں بلکہ اونچے طبقہ کے لوگ ہیں اس کی ساری کتاب کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں یہ نتیجہ اخذ کروں گا کہ "سلطنت کو دو نہیں بلکہ تین اجزاء پر مشتمل سمجھتا تھا، مسلم، ہندو اور کسانوں کا جم غفیر۔ اگر مورلینڈ نے برنی کی فتاویٰ جہانداری کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ اس بات کا قائل ہو جاتا کہ ہمارا مصنف [برنی] نیچی ذات کے تمام مسلمانوں کو بھی جم غفیر میں شامل کرتا تھا۔

(2) فرشتہ اس کی تعبیر یوں کرتا ہے: مقدموں کی دستورات کی رقم وصول کر کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھی (109) لیکن اس طرح ریاست کے مطالبے کی رقم نصف پیداوار سے بھی زیادہ ہو جائے گی اور خوطوں (مقدموں) اور کسانوں سے طلب کردہ رقم میں بھی فرق باقی رہ جائے گا۔ خود برنی کے بیانات سے زیادہ مطابقت اس صورت میں ہو گی جب ہم نتیجہ اخذ کریں کہ تمام دستورات مکمل طور پر منسوخ کر دی گئیں۔

(3) برنی، ص287

بیل اور بارہ بکریاں اور بھیڑیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو [ظاہر ہے کہ] چراگاہوں کی کمی نہ رہی ہوگی۔

ان دو ضابطوں نے پہلی بار ریاست کا کاشتکاروں کے ساتھ براہِ راست تعلق قایم کر دیا۔ برنی اشارہ کرتا ہے، گرچہ اس کی صراحت کرنے کا خیال اسے نہ ہوا، کہ اس کام کے لیے بتہ کافی عمال کی ضرورت پڑی ہوگی جن کی درجہ بندی وہ محصلان (خراج وصول کرنے والے) عامل (لگان وصول کرنے والے)، گماشتاؤں، (نمائندوں) متصرفان (حساب رکھنے والے اور ان کی جانچ کرنے والے) عہدیداران دفاتر (آفسوں کے مہتمم) اور نویسندگان (کارکوں)[1] کی حیثیت سے کرتا ہے۔ بنیادی دستاویز پٹواری کی بہی ہوتی تھی۔ وہ اپنے کاغذات کو شاید فارسی میں قلمبند نہیں کر سکتا ہوگا۔ لہٰذا ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا ہوگا کہ مرکز اور ضلعوں میں کام کرنے والے بہت سارے عاملوں کو فارسی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبان کی بھی واقفیت رکھنی پڑتی ہوگی۔ ایک بڑے علاقہ میں یہ دوسری زبان ہندی رہی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نئے مقرر کیے گئے ان افسران میں سے کافی لوگ ہندو رہے ہوں گے۔

علاؤالدین کو چودھری، خطوس اور مقدم کو دبانے میں زیادہ دشواری نہ پیش آئی ہوگی۔ اور ان کی کثیر دولت، واقعی یا خیالی، چھین لی گئی ہوگی۔ ان کی اطاعت گزاری [اب] اس حد کو پہنچ گئی کہ شہر کے لگان آفس کا ایک پیادہ 20 خطوس، مقدموں اور چودھریوں کی گردن کو باندھ کر اور مار پیٹ کر خراج وصول کرتا۔ ہندوؤں (گاؤں کے مکھیاؤں) کے لیے سر اٹھانا ناممکن ہی ہو گیا۔ سونا، چاندی، ٹنکہ، جتل اور فاضل اشیاء، جو بغاوت کا سبب ہوتی ہیں۔ ہندوؤں کے گھروں میں ذرا بھی باقی نہ رہیں۔ اور ان کے وسائل کی کمی کے باعث خوط اور مقدم اب مسلمانوں کے گھروں میں اجرت پر کام کرنے لگے۔"

اصل کام لگان کے نئے نظام کی تشکیل تھی، وزیر مملکت، شرف قائنی (یا قائی) کے جو بے مثال [صلاحیت رکھتا] تھا اور نویسندگی اور خطاطی نیز تکنیکی علوم،

---

(1) ان افسران کے لیے صحیح مترادف الفاظ انگریزی زبان میں متعین کرنا مشکل ہے لیکن برنی کی "فہرست" سے اس کام کا مجموعی اندازہ ہو جاتا ہے جو انہیں کرنا پڑتا تھا۔

ہوشیاری، کارگزاری، فنِ تقریر اور تفتیش کے معاملات میں اپنے تمام معاصرین پر فوقیت رکھتا تھا، خود کو اس کام میں کئی سالوں تک لگائے رکھا اور بڑی سرگرمی دکھائی۔ [نتیجہ یہ ہوا کہ] دہلی کے اطراف کے گاؤں اور دوآب کے شہروں اور قصبوں، اور بیانہ سے جھائن اور پالم سے دیپالپور اور لاہور تک اور سامانہ اور سنام کے پورے علاقے اور رایوری سے ناگور اور کڑا سے کنودی تک اور امروہہ وافغان پور سے کبر تک اور دیبھائی سے بدایوں اور کہٹرک سے کوپلہ تک اور کیتھر (روہلکھنڈ) کا سارا علاقہ ناپ اور فی بسوہ پیداوار کے حساب سے خراج کی وصولی کے لحاظ سے اور کرہی (مکان ٹیکس اور چرائی (چرائی ٹیکس) کی ادائیگی کے اعتبار سے ایسا ہو گیا جیسے کہ وہ [سارا علاقہ] ایک ہی گاؤں ہو۔[1] اس نے اپنا کام اتنے موثر طور پر کیا کہ نافرمانبرداری، بغاوت، گھوڑ سواری کرنے، اسلحہ رکھنے، عمدہ کپڑے پہننے اور پان کھانے کی عادتیں، چودھریوں، خوطوں اور مقدموں میں سے بالکل ختم ہو گئیں۔ خراج کی وصولی کے واسطے ہر ایک کے لیے ایک ہی قانون بن گیا۔[2]

برنی کی جغرافیہ بہت خلط ملط معلوم ہوتی ہے لہٰذا [متذکرہ بالا بیان

---

(1) برنی کے جملے کی ساخت قواعد کے اعتبار سے اور جغرافیائی [واقفیت] کے لحاظ سے بہت غیر تشفی بخش ہے۔ اسے من و عن ترجمہ کر دیا گیا ہے اور دانستہ طور پر اوقاف بندی سے مبرا رکھا گیا ہے، جیسا کہ اصل عبارت میں ہے۔

کرہی اور چرائی- ظاہر ہے کہ چرائی کا مطلب وہ ٹیکس ہے جو چراگاہ [کے استعمال] پر لگتا تھا اور کاشتکاروں کے گھروں پر وصول ہوتا تھا۔ لفظ، کرہی، مہمل ہے۔ پروفیسر ہوڈی والا کا خیال ہے کہ اسے گھری پڑھا جائے (ہندی لفظ گھر سے ماخوذ)۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہمیں یہ فرض کرنا ہوگا کہ زراعت پر ٹیکس اور چرائی ٹیکس کے علاوہ کوئی اور دوسرا گھر پر لگنے والا ٹیکس ہوگا۔ یا پھر یہ کو چونکہ چرائی ٹیکس ہمیشہ کسان کے گھر پر وصول کیا جاتا تھا (برخلاف زراعت پر ٹیکس کے) جو کہ زیادہ آسانی سے کھیت پر وصول کیا جاتا تھا۔ خاص کر جب لگان جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا ہو) لہٰذا برنی چرائی اور گھری کے الفاظ کو ایک ہی ٹیکس کے لئے استعمال کرتا ہے۔ چراگاہ پر لگایا جانے والا ٹیکس جو کسانوں کے گھر پر وصول کیا جاتا تھا۔ موخواند کر صورت زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔ (ہوڈی والا، ص273)

(2) برنی، ص288۔

o[نوٹ: "River Country" کی اصطلاح مورلینڈ مخصوص معنیٰ میں استعمال کی ہے وہ اسے دوآب کے علاقہ سے مختلف مانتا ہے اور الہ آباد کو اس میں شامل نہیں کرتا۔ مترجم]

کی] مور لینڈ کی تشریح کو صحیح مان لینا مناسب ہوگا۔ فہرست سے، جس طور پر وہ ہے، ہمیں یہ واقفیت ہوتی ہے کہ [نئے] ضوابط کا نفاذ تدریجاً دہلی، دریاؤں کا درمیانی علاقہ اور دو آب کے بقیہ حصوں میں کیا گیا۔ مشرق کی جانب روہلکھنڈ [اس میں] شامل تھا لیکن اودھ اور بہار نہیں، جنوب کی جانب مالوہ اور راجپوتانہ کے علاقے شامل تھے، مگر گجرات نہیں، جبکہ مغرب کی سمت ملتان کو چھوڑ کر پنجاب کے تمام علاقے شامل تھے[1]۔ افسوس یہ ہے کہ دو بڑی عمدہ، جدید اصطلاح- اولاً راجگان جو ہمعصر مصنفین کے الفاظ رائے، رانا[2] اور راوت کے معنیٰ سے بہت اچھی طرح میل کھاتی ہے اور ثانیاً، 'نمائندگان' یا وہ کسان جو لگان کی تشخیص کے معاملہ میں اپنے ساتھی کسانوں کی نمائندگی کرتے تھے، جو برنی کے چودھری، خوطس اور مقدم کے مترادف ہے۔ قایم کرنے کے بعد مسٹر مور لینڈ اس طرح رقمطراز ہیں جیسے کہ علاؤالدین نے مندرجہ بالا علاقہ میں تمام راجگان کا (بھی) خاتمہ کر دیا ہو۔[3]

تقریباً چار صفحات پر برنی [گاؤں کے] ان سرداروں (خوطس، مقدم اور

---

(1) ایگریرین سسٹم، ص 34۔

(2) خزائن الفتوح میں امیر خسرو 'راوت' کا لفظ رایوں کے ماتحت سرداروں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن عسکری اعتبار سے وہ انہیں کہیں کہیں مقدم بھی لکھتا ہے۔ اس نے زمینداران بزرگ کی اصطلاح صرف ایک مرتبہ استعمال کی ہے۔

(3) [گاؤں کے] سردار (Headman) کی شناخت راجہ سے کرنے کی بنا پر مسٹر مور لینڈ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، جو بہت قابل قبول نہیں معلوم ہوتا ہے، 'نصف پیداوار کے مطالبے کے بعد معمولی کسانوں کے پاس کوئی خاص فاضل (غلہ) باقی نہ بچتا ہوگا۔ اور یہ (اقدام) اس طرح اس نجی (ناجائز) آمدنی کی روک تھام کرتا جس کے متعلق یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ وصول کیا کرتے تھے۔ جبکہ (دوسری طرح) راجاؤں کے علاقوں پر شرح کے مطابق پورا ٹیکس عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشی اعتبار سے وہ ان کی حیثیت بھی کسانوں کے طرح کی ہونی اور چرائی ٹیکس کا اجراء ان کی غیر مزروعہ زمینوں کی آمدنی کو بھی کم کر دیتا۔ (ان اقدام) کا معاشی نتیجہ یہ وہ ہوتا ہے کہ فاضل پیداوار کا اگر کل نہیں تو بہت بڑا حصہ شاہی خزانے میں چلا جاتا۔ معمولی کسانوں کا معیار زندگی یکساں اور معمولی درجہ کا ہو جاتا۔ راجاؤں کا معیار زندگی گر جاتا اور وہ فوجیں بحال رکھنے یا گھوڑوں اور دوسرے جنگی ساز و سامان اکٹھا کرنے کے قابل نہ رہ جاتے"۔ (ایگریرین سسٹم ص 33)۔

یہاں [ان نتائج کو قبول کرنے میں] کئی دشواریاں پیش ہیں (1) برنی کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

چودھری اور ان کے حقوق کا ذکر آٹھ مرتبہ کرتا ہے۔ وہ رایوں، راناؤں اور راوتوں کے الفاظ سے بخوبی واقف تھا لیکن اس سلسلہ میں ان الفاظ کا استعمال نہیں کرتا اگر ان [موخر الذکر گروہ] کا تعلق اس معاملہ سے ہوتا تو یقیناً برنی انہیں شامل کر لینے میں خوشی محسوس کرتا۔ لیکن علاؤالدین کی یہ پالیسی ہی نہ تھی کہ راجاؤں کے علاقہ کے کسانوں کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔ یا وہ ذمہ داریاں لے لے جن کے لیے اُس کے پاس مناسب تربیت یافتہ عملہ نہ تھا۔ لہٰذا ہمیں یہ نتیجہ نکالنا ہوگا کہ اس علاقے میں جسے برنی نے خلط ملط طور پر بیان کیا ہے اور جس کی مورلینڈ نے زیادہ صحیح طور پر حد بندی کی ہے، یہ ضوابط صرف ان گاؤں میں نافذ کیے گئے جن کے لگان گاؤں کے سرداروں [نمائندگان] کے ذریعہ ادا کیے جاتے تھے اور صرف یہی گاؤں جن کے بیچ میں راجگان کے گاؤں بھی واقع تھے، صحیح معنوں میں علاؤالدین کے دورِ حکومت میں خالصہ [علاقے] تھے۔ ان گاؤں میں حکومت کسانوں سے براہ راست رابطہ رکھتی تھی۔ علاؤالدین خالصہ علاقہ کے گاؤں کو افسران کو بطور جاگیر دینے [کی پالیسی] میں یقین نہ رکھتا تھا۔ راجاؤں کے علاقوں میں مداخلت نہ کی گئی۔ ظاہر ہے کہ جب تک دہلی سلطنت مضبوط رہی ان راجاؤں نے واجب الاداء رقوم پابندی سے ادا کیں۔ لہٰذا ان کا تذکرہ گاہے بگاہے ملتا ہے۔ لیکن فیروز شاہ کے مرنے کے بعد وہ ماقبل علاؤالدین نسب ناموں سمیت ان ذاتوں، قبیلوں اور گروہوں، جو ماقبل مسلم دور سے چلے آرہے تھے،

(بقیہ صفحہ 508 سے آگے)

اس بیان کو علاؤالدین نے ہر حال میں نصف پیداوار کا مطالبہ کیا، لفظاً بہ لفظ صحیح نہ سمجھنا چاہیئے۔ خود علاؤالدین نے مشکل حالات میں [اس شرح میں] ترمیم کا مشورہ دیا تھا (2) [گاؤں کے] سرداروں کو محض وقتی طور پر دبا دیا گیا۔ غیاث الدین تغلق نے دوبارہ انہیں 'تسلیم' کر لیا اور برنی لکھتا ہے کہ جب فیروز شاہ کی حکومت کے زمانہ میں اس نے اپنی کتاب لکھی تو وہ لوگ خوشحال تھے۔ (3) راجاؤں رایوں، راناؤں اور راوتوں) نے کیلی کی جنگ میں علاؤالدین کے جھنڈے کے نیچے لڑا تھا اور [لہٰذا] انہیں ختم کر دینے کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ اگر علاؤالدین کی یہ خواہش ہوتی بھی تو اس کے پاس اس کے ذرائع نہ تھے کہ وہ ایک جنبشِ قلم سے کاشتکاروں کے تمام فاضل پیداوار کو خزانے میں لے لے۔ اس کام کے لیے ایک ایسے عملہ کی ضرورت تھی جس پر وہ اپنا اختیار قایم نہ رکھ سکتا تھا، اور جو بہر حال دستیاب ہی تھا۔ اگر وہ یہ کوشش بھی کرتا تو فاضل پیداوار کا خاصا حصہ کالے بازار کی نذر ہو جاتا۔

کے سرداروں کی حیثیت سے ممتاز طور پر نمایاں ہوئے۔ ڈاکٹر عرفان حبیب کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ علاؤالدین نے عمداً ان دو دیہی طبقوں کی کش مکش کا فائدہ، ان علاقوں کے 'طاقتور' کے مقابل 'کمزور' کا محافظ بن کر اٹھایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ طاقتور، کا مطلب ہم دیہی اشرافیہ کا نچلا درجہ سمجھیں جو گاؤں کے سرداروں پر مشتمل تھا۔ جہاں تک برنی کے اس بیان کا سوال ہے کہ علاؤالدین نے بلا کسی قسم کے ردّ و بدل، نصف پیداوار کے لینے کا حکم دیا، ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ برنی یہ حکم بھی علاؤالدین سے منسوب کرتا ہے کہ کاشتکاروں کو اتنی زراعتی پیداوار اور دودھ ہی وغیرہ چھوڑ دیا جائے جو سال بہ سال ان کے کام آسکے لیکن وہ دولت نہ اکٹھا کر سکیں، علاؤالدین کے عملی فلسفے میں قحط اور اس طرح کی آفات سے کسانوں کی محافظت ریاست کا فرض تھا [کیونکہ] خود کسان کے اپنے وسائل اس قابل نہ تھے کہ اس طرح کے حادثات کا مقابلہ کر سکے۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ بعض علاقوں میں ہر گاؤں کا لگان علاحدہ علاحدہ سردار کے ذریعہ لیا گیا جبکہ دوسری صورتوں میں کسی راجہ سے اس کے پورے علاقہ پر مقررہ، یکمشت رقم کے طور پر لیا گیا۔ شاید یہ فرق ہندو زمانہ سے چلا آرہا ہوگا۔ یا ان صورتوں میں جبکہ راجہ کو جنگ میں شکست دی گئی تھی، دہلی کی وزارت لگان نے [زیادہ مناسب سمجھ کر] لگان وصول کرنے کا کام کئی ایک سرداروں کو دے دیا۔

برنی یہ بات بھی بالکل واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ کسانوں سے براہِ راست لگان وصول کرنے کے طریقہ کار نے ایک دوسری لعنت پیدا کر دی۔ وزارت لگان کے افسران و عملگان میں رشوت خوری، بدعنوانی یا رشوت خوری کے لیے محض برطرفیوں کو قابلِ ذکر نہ سمجھا گیا" اسی نائب وزیر، شرف قائنی، نے تمام کارکنوں، متصرفوں، دفتر کے عہدہ داروں، گماشتاؤں اور محصلوں کے ذمہ باقی تمام بقایا رقوم وصول کرنے کے لیے سخت اقدام کیے۔ اس نے پٹواری کی بہی سے ایک ایک جتل بقایا رقموں کا پتہ لگایا جو ان میں سے ہر ایک کے ذمہ تھی اور اس بہی کے مطابق [مطلوبہ رقم] مار پیٹ کر، زنجیروں میں بندھوا کر اور شکنجوں میں کسوا کر وصول کیا۔ کسی کے لیے بھی بے ایمانی سے ایک ٹنکہ بھی لینا یا ہندو یا مسلمان سے رشوت لینا ناممکن بن گیا۔

اس نے بے ایمان عاملوں، متصرفوں اور محکمہ لگان کے دیگر (بدعنوان) افسران کو اتنا بد حال اور مفلس بنا دیا کہ ایک ہزار یا پانچ سو ٹنکوں کی رقم کے مطالبوں کو بھی پورا نہ کر سکنے کے باعث وہ سالوں تک گرفتار رہے۔ لوگ عامل، متصرف اور محکمہ لگان کے افسروں کو بخار سے بھی زیادہ بری چیز سمجھنے لگے اور لوگ کسی متصرف سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے پر تیار نہ ہوتے متصرف کا کام وہی لوگ قبول کرتے جو اپنی زندگی سے تنگ آ گئے تھے اور ان کا زیادہ تر وقت قید خانوں میں مار کھاتے ہوئے گزرتا"۔[1] علاؤ الدین کا اندازہ تھا کہ صرف دہلی میں محکمہ لگان کے تقریباً 10 ر ہزار افسران کی سرزنش کی گئی تھی [اس طرح کے] قیدی جن کو مبارک شاہ نے آزاد کیا ان کی تعداد برنی کے مطابق تقریباً 17 یا 18 ہزار ہو گی لیکن عصامی کے مطابق اس تعداد میں بدعنوان افسران اور سیاسی مجرمان دونوں ہی شامل تھے۔[2]

قاضی مغیث سے گفتگو

فتاویٰ جہانداری کی دریافت نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں مختلف اشخاص سے جو تقاریر منسوب کی ہیں ان کو غیر تاریخ قرار دے سکتے ہیں سوائے اس صورت میں جبکہ برنی خود جائے وقوع پر موجود تھا یا قابل اعتماد حوالے پیش کرتا ہے۔ اس طرح کی تقریر کرنے والا ایک شخص صرف وہی خیالات پیش کرتا ہے جو ہم برنی کی فتاویٰ جہانداری میں پاتے ہیں، مع ان غلطیوں کے تکرار کے جو برنی نے [اس میں] کی ہیں۔ بعض دوسرے کرداروں کی تقریری میں برنی نے، ایک جدید ڈرامہ نگار کی طرح، اس طور پر تیار کی ہیں کہ وہ اس شخص کے کردار، جیسا کہ برنی اسے سمجھتا تھا، نے مطابق ہو۔ برنی ہمیں مسلمان اور بیانہ کے قاضی مغیث الدین کی گفتگو کا طویل بیان پیش کرتا ہے جو اس کے مطابق سلطان اور قاضی مغیث کے درمیان، لگان سے متعلق ضابطوں کے اجراء کے بعد ہوئی تھی، یہ کہنا ممکن نہیں کہ ایسی کوئی گفتگو ہوئی ہی نہ تھی لیکن پچاس سال گزر چکے تھے اور ظاہر ہے دونوں

---

(1) برنی، ص ص 89-288

(2) عصامی، 347۔ ن تمام اشخاص میں سے جن کو سزائیں دی گئی تھی۔ محکمہ لگان کے افسران کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

شخصوں کی گفتگو کو برنی نے ترتیب دیا ہے۔ گفتگو کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے برنی کو سلطان کو اسلام کی تاریخ سے اس سے بھی زیادہ ناواقف ظاہر کرنا پڑا جتنا کہ ایک ایسا شخص واقعی ہو سکتا تھا جو اپنی صلاحیتوں سے دہلی کے تخت تک پہنچا تھا۔ دوسری طرف برنی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قاضی مغیث کو مسلم صحیفوں اور دینیات سے اس سے زیادہ واقفیت عطا کر سکتا جتنا کہ اسے خود حاصل تھی۔

''سلطان علاؤ الدین غیر تعلیم یافتہ تھا اور وہ علماء کی صحبت میں زیادہ نہ رہتا تھا جب '' بادشاہ بنا تو اس کا یقین تھا کہ حکومتی اور انتظامی معاملات شریعت کے احکام و ضوابط سے آزاد تھے اور جبکہ اول الذکر کا تعلق بادشاہوں سے تھا، موخر الذکر قاضیوں اور مفتیوں کے سپرد کیے گیے تھے اپنے اس یقین کے مطابق وہ وہی کرتا جو وہ حکومت کے انتظام کے لیے ضروری سمجھتا، خواہ وہ شریعت کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ وہ انتظامی معاملات کے سلسلہ میں کبھی بھی کوئی [مذہبی] مسئلہ دریافت نہ کرتا اور بہت کم علماء اس کی صحبت میں موجود ہوتے۔ لیکن بیانہ کے قاضی ضیاء الدین اور مولانا ظہیر لنگ اور مولانا مشہد کہرامی اکثر شاہی دستر خوان پر مدعو ہوتے اور امرا کے ساتھ باہری کمرے میں کھانا کھاتے تھے، بیانہ کے قاضی مغیث کی سلطان تک پہنچ تھی اور امراء کے ساتھ مجلس حکومت میں شریک ہوتا تھا؛ قاضی مغیث کے ساتھ سلطان کی گفتگو چار نکات کے متعلق تھی

(1) اوّل یہ کہ بحیثیت خراج گزار ہندوؤں کا کیا مقام تھا۔ ایمانداری قاضی سے مطالبہ کرتی تھی کہ وہ یہ کہے کہ قرآن یا حدیث کے صحیح مجموعوں میں سے کسی جگہ بھی ہندوؤں کا نام نہیں آیا ہے اور یہ کہ علماء نے [ان کے تعلق] اپنے دلائل کو قیاس کی بنا پر ان امن پسندانہ سمجھوتوں کی روشنی میں قایم کیا تھا جو پیغمبر نے بحرین کے زرتشتوں کے ساتھ کیے تھے اور یہ کہ اس سلسلہ میں کافی اختلاف رائے تھا اس کے بجائے قاضی نے دو ایسی جھوٹ باتیں کہیں جو برنی کو پسند ضرور تھیں۔ مگر صریحاً جھوٹ تھیں جنہیں غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ 'ہندو پیغمبر کے سب سے بڑے دشمن تھے اور یہ کہ پیغمبر نے کہا کہ ہندوؤں کو قتل کیا جائے، تاراج کیا جائے اور غلام بنایا جائے، اپنی زندگی میں پیغمبر کو کبھی کسی ہندو سے ساتھ نہ ہوا اور صحابہ میں سے کسی

میں بھی پیغمبر کا ایسا کوئی قول درج نہیں ہے۔ دوئم یہ کہ گرچہ امام ابو حنیفہ جن کے عقائد کے ہم سب پیرو ہیں، نے ہندوؤں سے شرط اور جزیہ کی مصالحت کی اجازت دی ہے لیکن دوسرے فقہاء نے 'اسلام یا تلوار' کے علاوہ اور کوئی صورت قرار نہیں دی ہے۔ یہ بات بھی برنی کی زبردست عدم واقفیت کو ظاہر کرتی ہے جس کا اعادہ وہ فتاویٰ جہانداری میں بھی کرتا ہے۔

(2) دوئم یہ کہ علاؤالدین نے دریافت کیا کہ شریعت ان لوگوں کے متعلق کیا کہتی ہے جو عوامی رقم چراتے ہوں یا رشوت لیتے ہوں یا غلط حساب تیار کرتے ہوں۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا کیونکہ، جیسا کہ یہ بات عام ہے، شریعت ریاست کے ذریعہ بنائے گئے قوانین کے متعلق خاموش ہے، قاضی نے کہا کہ 'میں نے کسی کتاب میں [بات] کے متعلق نہیں پڑھا ہے، سلطان جیسا مناسب سمجھے اس طور پر بدعنوان افسروں کو سزا دے سکتا تھا،'[1] 'لیکن اس کی اجازت نہ تھی کہ خزانہ عامہ سے چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ سلطان نے جواب دیا کہ اس نے وزارت لگان کے افسران کے لیے کافی عمدہ تنخواہیں مقرر کی تھیں لیکن پھر بھی وہ بدعنوان ہیں۔

(3) سوئم یہ کہ دیوگیری سے حاصل کیے ہوئے خزانے کا مالک کون تھا؟ علاؤالدین کا دعوا تھا کہ یہ اس کا ذاتی مال تھا۔ اس نے تخت نشینی کے قبل یہ حاصل کیا تھا اور اسے خزانہ عامہ سے علاحدہ رکھتا تھا۔ شریعت کا ایک صحیح واقف کار یہ جواب دیتا ہے کہ یہ لوٹ کا مال تصرف ناجائز تھا،[2] لیکن برنی نے، جو یہ سمجھتا تھا کہ ہندوؤں کو لوٹنا ہر حال میں جائز تھا، قاضی سے یہ جواب دلوایا کہ وہ 'مسلمانوں کے خزانہ عامرہ' کا (حصہ) تھا

---

(1) دیکھیے حبیب اور افسر بیگم پولیٹیکل تھیوری آف دہلی سلطنت منشورہ 1، ص ص 51-49 مولفین نے امام شافعی کے اقتباسات پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے خیالات وہ نہ تھے جو برنی نے ان سے منسوب کیے ہیں۔ اس کے برعکس وہ پیغمبر اور قریش کے درمیان صلح حدیبیہ کو، جس نے عربوں کو قبول مذہب کی آزادی کی ضمانت دی۔ اوائل اسلام کی عظیم فتوحات میں سے ایک شمار کرتے ہیں۔ اسلام کی غلط نمائندگی کرنے میں برنی اکثر اتنا نیچے گر جاتا ہے کہ حقارت کی نظر ڈالنے کے قابل بھی نہیں رہ جاتا۔

(2) سلطان محمود کی لوٹ مار کے سلسلہ میں غزنی کے قاضی کا یہی خیال تھا۔ (دیکھیے، حبیب، سلطان محمود آف غزنین، دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ)

سلطان نے یہ رائے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(4) چہارم یہ کہ اس کا اور اس کے اہل خاندان کا شاہی خزانے پر کتنا حق تھا؟ اس موضوع پر بھی قرآن و حدیث میں قاضی نے جواب دیا کہ تین ممکن صورتیں تھی۔ خلفاء راشدین کی روایات کے مطابق سلطان صرف 234 ٹنکہ سالانہ کی تنخواہ کا حقدار تھا، جو اپنے سواروں کو دیتا تھا۔ اگر وہ ایک معتدل روش اختیار کرنا چاہتا تھا تو وہ اپنی تنخواہ سے جو وہ اپنے اعلیٰ ترین افسر کو دیتا تھا۔ اگر وہ علماء دینوی کے مشوروں پر عمل کرنا چاہتا تھا تو وہ ان (اعلا) افسران سے کچھ زیادہ رقم لے سکتا تھا۔ لیکن قاضی نے عجلت کے ساتھ یہ بات مزید کہی کہ اگر سلطان سیاسی مصلحت کے نقطۂ نظر سے اس کی رائے جاننا چاہتا تھا وہ یہ چاہے گا کہ شاہی اخراجات میں ہزار گنا اضافہ ہو چونکہ سلطنت کے وقار سے ریاست کے استحام کو تقویت ملتی ہے۔

اس موقع پر برنی، جو کہ علاؤالدین کے خاندان کے مرنے کے بعد بہت سالوں بعد لکھ رہا تھا اور اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ قیامت کے دن علاؤالدین کا کیا حشر ہوگا، نے دو مزید پیراگراف اس لیے جوڑ دیے کہ وہ یہ دکھلانا چاہتا تھا کہ علاؤالدین کس طرح اپنے طریق کار کو قاضی مغیث کے سامنے صحیح کرنا چاہتا تھا اور شاید خدا کے سامنے بھی ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔

”تم کہہ سکتے ہو کہ میرے احکام شریعت کے خلاف ہیں۔ لیکن میرے عمل کا طریقہ یہ ہے۔ اس سوار سے جو معائنہ (عرض) کے وقت غیر حاضر رہتا ہے۔ پچھلے تین سالوں کی تنخواہ واپس لینے کا میں نے حکم دے دیا ہے۔ جو شراب پیتے یا بیچتے ہیں انہیں میں خشک کنویں میں ڈلوا دیتا ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی بیوی سے زنا بالجبر کرتا ہے تو میں اس مرد کو آختہ کروا دیتا ہوں (اور عورتوں کو قتل کروا دیتا ہوں[1])

---

(1) شرکاء [تجارت] کے درمیانی رقم کی خرد برد چوری (سرقہ) کے مترادف نہیں جس کے لیے قرآن میں ہاتھ کاٹ دینے کا حکم ہے۔ اس لیے اپنی فتاویٰ جہانداری میں برنی لکھتا ہے کہ ”خزانہ عامرہ یا بیت المال ‘جس میں تمام مسلمان شرکاء [کی حیثیت رکھتے] ہیں، میں خرد برد یا اور دوسری بدعنوانیوں کی سزا نہ قتل ہے اور نہ ہاتھ کاٹنا“ (پولیٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت، ص62)۔

بغاوتوں کی صورت میں اچھے اور برے، پختہ کار و ناپختہ کار دونوں ہی کو قتل کرا دیتا ہوں اور میں ان کی عورتوں اور بچوں کو مفلس اور قلاش بنا ڈالتا ہوں۔ میں بے ایمان افسروں سے عوامی رقم لاتوں اور گھونسوں سے وصول کرتا ہوں اور جب تک آخری جتل وصول نہ ہو جائے میں انہیں قید و بند میں رکھتا ہوں۔ سیاسی مجرموں کو میں زندگی بھر کی قید میں رکھتا ہوں۔ کیا تم یہ کہو گے کہ سب [احکام] شریعت کے خلاف ہیں؟

قاضی نے جس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنی موت کے لیے تیار ہے، جب دوسرے دن اس سے ملاقات کرنے آیا تو سلطان نے اسے ایک ہزار ٹنکے دیئے اور وہ جامعہ جو وہ زیب تن کیے تھا۔ اور گفتگو جاری رکھی "مولانا مغیث! اگرچہ مجھے زیادہ تعلیم نہیں حاصل ہے اور میں نے زیادہ کتابیں نہیں پڑھی ہیں پھر بھی میں ایک پیدائشی مسلمان ہوں اور میرے اسلاف کئی نسلوں سے مسلمان رہے ہیں۔ بغاوتوں کو روکنے کے لیے جن کے دوران ہزاروں جانیں تلف ہوتی ہیں، میں لوگوں کو وہ احکام دیتا ہوں جو میرے خیال میں ان کے لیے اور ریاست کے لیے مفید ہیں۔ لیکن آج کل لوگ نڈر اور بے پرواہ ہیں اور صحیح طور پر میری اطاعت نہیں کرتے ہیں اس لیے میرے لیے ضروری ہو گیا کہ میں ان کو سخت سزائیں دلواؤں تاکہ حکموں پر عمل کی یقین دہانی مہیا ہو۔ وہ احکام صادر کرتا ہوں جو میں ریاست کے لیے مفید سمجھتا ہوں اور جو حالات مناسب نظر آتے ہیں میں یہ نہیں جانتا کہ شریعت [احکام] کی اجازت دیتی ہے یا نہیں میں نہیں جانتا کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے میرا کیا حال ہو گا لیکن مولانا مغیث میں خدا کے آگے دعا کرتے وقت ایک بات ضرور کہتا ہوں، اے میرے مولا تو جانتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی بیوی کی عصمت دری کرتا ہے تو وہ مجھے کوئی (ذاتی) نقصان نہیں پہنچاتا۔ اگر وہ چوری کرتا ہے تو میرے ترکہ میں سے نہیں چراتا، اگر وہ شراب پیتا ہے تو مجھے کوئی ذاتی نقصان نہیں پہنچاتا اگر وہ تنخواہ لے کر [فوجی] معائنہ کے وقت حاضر نہیں ہوتا ہے تو دس یا بیس سواروں کی غیر حاضری سے معائنہ کا کام رُک نہیں جاتا۔ ان چار گروہوں [کے متعلقہ افراد] کے متعلق

میں پیغمبر کے بتائے ہوئے احکامات پر عمل کرتا ہوں۔[1] لیکن آج کل ایک سے ایک لاکھ تک بلکہ ایک سے پانچ یا دس لاکھ تک ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جنہیں بغاوت کے منصوبے بنانے اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے کے علاوہ زندگی میں اور کوئی کام نہیں ہے۔ میں تو ایک جاہل آدمی ہوں جو نہ پڑھ سکتا ہے اور نہ لکھ سکتا ہے سوائے الحمد، قل ھو اللہ، دعائے قنوت اور التحیات[2] کے میں اور کچھ پڑھنا نہیں جانتا ہوں، میں نے حکم دے دیا ہے کہ اگر میری حکومت میں کوئی شادی شدہ شخص کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ زنا بالجبر کرتا ہے تو اسے آختہ کر دیا جائے۔ لیکن اس خوفناک حکم کے باوجود میری عدالت میں ایسے بہتیرے لوگ لائے جاتے ہیں جنہوں نے دوسروں کی بیویوں کے ساتھ زنا بالجبر کیا ہے۔[3] اس حقیقت کے باوجود کہ ان سے تین سالوں کی تنخواہ واپس طلب کی جاتی ہے ایسا کوئی فوجی معائنہ نہیں ہوتا جس میں سو یا دو سو گھوڑ سوار غیر حاضر نہ ہوں۔ وہ روپے لیتے ہیں مگر معائنہ کے وقت حاضر نہیں ہوتے ہیں اور [نتیجتاً] اپنی زندگی قید میں گزارتے ہیں۔ [محکمہ] لگان کے نویسندوں کی چوریوں کی وجہ سے میں نے ان میں تقریباً دس ہزار آدمیوں کو قلاش بنوا دیا ہے اور ان کے جسموں پر کوڑے لگوائے ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے اطوار نہیں بدلتے تم کہہ سکتے ہو کہ [محکمہ] لگان کی کلرکی اور بدعنوانی جوڑواں کی مانند ہیں۔ شراب بیچنے اور پینے کے جرم میں ہم نے کتنے لوگوں کو خشک کنوؤں میں ڈلوا کر ہلاک کرا دیا ہے اور کرتا رہتا ہوں۔

---

(1) پیغمبر کے مستند احکامات کے ساتھ علاؤالدین کے اعمال کی مطابقت طے کرنا ناممکن ہے۔ اس کی سیدھی وجہ یہ ہے کہ علاؤالدین کے زمانہ کی صورتحال بالکل مختلف تھی۔

(2) مسلمانوں کی عبادات کا یہ لازمی جز ہیں اور انہیں عربی میں پڑھا جاتا ہے۔ لٰہذا علاؤالدین یقینی حروف تہجی اور اعراب سے واقف رہا ہوگا۔

(3) شریعت کے احکام، اس مضمر اشارہ کے ساتھ ان کا نفاذ نہ کیا جائے، زنا کی سزا سنگساری قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی کیا نہیں گیا۔ شاید علاؤالدین نے صرف زنا بالجبر کے واقعات ہی تک اپنی سزاؤں کو محدود رکھا۔ چونکہ وہ اس سلسلہ میں عورت کی سزا کا ذکر نہیں کرتا۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو اس صورت میں قبل کے ایک پیراگراف کے اس جملہ کو کہ "اور عورت کو میں مار ڈالنے کا حکم دیتا ہوں" کسی کاتب کا [غلط] اضافہ سمجھ کر علاحدہ کر دینا ہوگا۔ سزائے موت زنا بالجبر کی صورت میں دی جاتی تھی لیکن معصوم اور مظلوم عورت کو کوئی سزا نہ دی جاتی۔

ان کنوؤں میں وہ کون سی شراب پیں گے یا بیچیں گے؟ لیکن اللہ کی مخلوق کو درست کرنے میں کوئی شخص کامیاب نہ ہوا ہے۔ تو میں کس طرح ہو سکتا ہوں؟"

وارنگل پر حملہ، چتوڑ کی فتح

1302-3ء کے موسم سرما میں علاؤالدین کی صورتحال اس لائق تھی کہ وہ دو مہموں کی تیاری کر سکے۔ دیوگیری سے جو دولت حاصل ہوئی تھی اس کا فطری طور پر تقاضہ یہ تھا کہ وارنگل، جو تلنگانہ کا دارالسلطنت تھا اور جہاں اس وقت کاکاتیہ خاندان کا رائے، پرتاپ رُدرادیو، جسے فارسی مورخین لدر دیو لکھتے ہیں، حکومت کر رہا تھا، کے خلاف بھی ایک مہم تیار کی جائے۔ الغ خاں اس کی تیاری میں تھا لیکن اس کی موت کے سبب اس کے منصوبوں کا خاتمہ ہو گیا۔ علاؤالدین نے ذاتی طور پر چتوڑ کے خلاف روانہ ہونے کا ارادہ کیا اور ہندستان کے تمام امراء و گھوڑسوار اور پیدل فوج کو وارنگل کے خلاف روانہ ہونے کا حکم دیا۔ اعلیٰ کمان جونا (بزرگ) کو، جو دادبیکی حضرت تھا، اور ملک چھجو کو، جو کڑا کا گورنر تھا، اور نصرت خاں مرحوم کا بھتیجہ تھا، دی گئی۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس فوج نے کب کوچ شروع کیا۔ نیز یہ کہ چونکہ مالوہ اس وقت فتح نہ ہوا تھا، یہ بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ شاید یہ فوج بنگال کی جانب سے کوچ ہوئی ہو گی[1]۔ لیکن یقینی طور پر ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ سفر تمام کرنے میں کافی وقت لگایا اور اپنے مقصد کے حصول میں بہت بری طرح ناکام رہی۔ جب یہ وارنگل پہنچی تو بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا اور بارش ان کے راستہ میں حائل تھی لہٰذا ہندستان کی فوج وارنگل میں کوئی کارنامہ نہ انجام دے سکی اور سلطان نے اس کو واپس بلا لیا۔ 1303ء کے موسم سرما کے شروع میں یہ ہندستان واپس پہنچی لیکن اس کی تعداد کافی کم ہو چکی تھی اور اس کے سازوسامان ضائع ہو چکے تھے۔[2]

چتوڑ کی مہم کے لیے ہمیں زیادہ تر امیر خسرو، جو کہ خود وہاں موجود تھا[3]، پر انحصار کرنا ہے۔ عظیم راناؤں- کمبھ، سانگا اور پرتاپ کے ناموں نے چتوڑ کے شاہی

---

(1) فرشتہ، ص 14، لکھتا ہے کہ فوج بنگال کے راستے وارنگل بھیجی گئی تھی۔

(2) برنی، ص 300۔

(3) خزائن الفتوح، ص ص 63-60، دول رانی، ص ص 67-66۔

خاندان کو وہ عظمت اور دبدبہ عطا کر دیا ہے جس کا مقابلہ عہدِ وسطیٰ کا کوئی دوسرا راجپوت شاہی خاندان نہیں کر سکتا۔ پھر بھی علاؤ الدین کی تخت نشینی کے وقت رنتھمبور کے بعد یہ راجپوت ریاستوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا اور بحیثیت ایک آزاد ریاست کے اس کا قایم رہنا دہلی سلطنت کے لیے ایک للکار تھی [چتوڑ کا] قلعہ جس کا بیان اکثر کیا گیا ہے، بہت مستحکم تھا، چتوڑ کا قلعہ۔ بند پہاڑی ایک ایسا چٹانی تودہ ہے جو میدانی علاقہ سے یکایک بلند ہو گیا ہے اور بالکل الگ تھلگ کھڑا ہے۔ اس کی لمبائی ساڑھے تین میل ہے اور اپنے مرکز پر یہ تقریباً 1200 گز چوڑا ہے۔ کنارے پر اس کا قطر 8 میلوں سے زائد ہے اور بلندی کسی مقام پر بھی 400 یا 500 فٹ سے زیادہ نہیں۔[1] لیکن اگر کوئی شخص اس 400 یا 500 فٹ کی بلندی تک چڑھ جائے، جو پر سکون حالات میں کوئی مشکل کام نہیں، تو وہ خود کو ایک عمودی گھاٹی اور 40 فٹ بلند پتھر کی دیوار کے روبرو پائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ قلعہ میں 84 ذخیرہ آب تھے جن میں سب سے بڑا ایک تالاب تھا جو رائے کے قلعہ محل (Fort Palace) کے سامنے تھا۔ خسرو لکھتا ہے کہ 'قلعہ ہندوؤں کی جنت تھی، جس میں ہر سمت چشمے اور باغات تھے۔ اس کا ایک رائے تھا جس کی ایک منظم فوج تھی جو پوری طرح مسلح تھے لیکن تیز رفتار تھی۔ دوسرے ہندو رایوں کے مقابلہ میں اس کا تخت ہفت کرسی سے بلند تھا۔[2] اس پہاڑی سے کچھ دور، مشرق کی سمت، دو ندیوں، گمبھیری اور براچ کا سنگم ہے جن کے درمیان ایک دوآبہ (علاقہ) بن جاتا ہے۔ قلعہ کے شمال میں ایک چھوٹی پہاڑی ہے جس کو خسرو نے چتروری کا نام دیا ہے لیکن جو عام طور پر چتوڑی کہی جاتی ہے۔

سلطان کے سیاہ رنگ کے شامیانہ کے ساتھ شاہی فوج نے سوموار 28/ جنوری 1303ء (8/ جمادی الثانی 702) کو کوچ کا نقارہ بجایا۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ وہ چتوڑ کب پہنچی لیکن گمبھیری اور براچ کے دو آب میں شاہی خیمہ نصب ہوا اور فوج نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ علاؤ الدین نے چتوڑی پر واقع اپنے رہائشی خیمہ سے [فوجی] کارروائیوں کی رہنمائی کی، خسرو لکھتا ہے کہ ”برسات کے دو مہینوں کے دوران

---

(1) وی، اے، اسمتھ، اکبر، ص ص 82-83۔

(2) خسرو۔ دول رانی ص ص 66-67۔

محاصرہ کرنے والوں کی تلواروں کی طغیانی پہاڑی کی کمر تک پہنچ گئی لیکن اس سے اوپر نہ جا سکی حیرت انگیز ہے وہ قلعہ جس کے سر پر اولوں سے ضرب نہ دی جا سکی، سلطان نے قلعہ پر منجنیق کے پتھروں سے ضرب لگانے کا حکم دیا جبکہ مسلح سپاہیوں نے ہر جانب سے اس پر حملہ کیا۔ خسرو کسی یاشیب بنانے کا ذکر نہیں کرتا لیکن اس کے بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ روبرو حملہ کی کوششیں دو مرتبہ ناکامیاب ہو چکی تھیں۔ ممکن ہے کہ وبا یا قحط نے محاصرین کو مفلوج کر دیا ہو۔ اس کے بعد جو بیان ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رائے نے خود اپنی مرضی سے ہتھیار ڈال دیا۔ سوموار 25/اگست 1303ء (8/جمادی الثانی 702ھ) کو سلطان قلعہ میں داخل ہوا اور خسرو کا بیان ہے کہ وہ اس کے ساتھ قلعہ میں داخل ہوا رائے رتن سین جس کی تخت نشینی کو صرف ایک یا دو سال گزرے تھے اور جسے دوسرے ہم پلہ رایوں سے کوئی مدد نہ ملی تھی، اپنے سنگی دروازے سے یوں نکلا جیسے پتھر سے چنگاری، اور دریا پار کر کے شاہی خیمہ کی جانب دوڑ پڑا اور اس طرح چمکتی ہوئی تلواروں [کے وار] سے امان پایا……… گرچہ وہ ایک باغی تھا لیکن شاہی حسن خلق کی نسیم سحری نے اس کو گرم ہواؤں کی لپیٹ سے بچا لیا؛ ایسے معاملے [کے بیان] کے متعلق خسرو غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا ہوگا کہ چتوڑ کے [لوگوں کے] رسم جوہر کی ادائیگی بعد کے زمانہ کی من گھڑت ہے۔ خسرو نے رنتھمبور میں [کی جنگ کے موقع پر] جوہر کا ذکر کیا ہے اور اگر چتوڑ میں بھی یہ ہوا ہوتا تو یقیناً وہ اس کا ذکر کرتا۔

رائے کی محافظت کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس کی توسیع اس کے خاندان کے افراد تک بھی کر دی گئی لیکن شاید اس کے مقدمان تک نہیں۔ خسرو لکھتا ہے کہ سلطان نے غصہ میں تین ہزار مقدمان[1] کے قتل کا حکم صادر کیا تاکہ غریب رعیت جو اپنا سر نہ اٹھا پاتے تھے، ان

---

(1) مطبوعہ متن میں 'تیس ہزار مقدم' لکھا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک غلطی ہے۔ فارسی میں تین اور تیس (سہ اور سی) بہت ملتے جلتے انداز میں لکھے جا سکتے ہیں۔ [یہ] مقدم محض سپاہی نہ تھے بلکہ رعیت تھے جن کے تحت کاشتکار تھے۔ ان کے خاتمہ کا اصل سبب یہ تھا کہ کاشتکار کو راحت نصیب ہو، یہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے کہ چتوڑ کے قلعہ میں اس طرح کے 30 ہزار مقدم موجود ہوں۔ خسرو نے جو سبب بتایا ہے۔ اس کے تحت ادنیٰ سپاہیوں کے قتل کے حکم کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ اس بات کی تصدیق ٹوڈ کے بیان سے بھی معلوم ہوتی ہے "چتوڑ کی بربادی کے گناہ کی قسم اس سوگند کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس طرح کی ساڑھے تین بربادیوں کا ذکر وہ لوگ کرتے ہیں۔ نصف سے مراد یہ [زیر بحث بربادی] ہے۔ چونکہ اگرچہ شہر میں غارتگری نہ ہوئی لیکن [سورماؤں میں سے] سب سے عمدہ اور بہادر لوگ قتل کر دیے گیے"۔ راجستھان، جلد 1 ص 309۔

کو کچھ راحت نصیب ہو، چتوڑ کا نام خضر آباد رکھا گیا اور اسے ولیعہد خضر خاں کے حوالہ کیا گیا، جس کی عمر اس وقت سات یا آٹھ سالوں کی تھی اور اسے ایک سرخ شامیانہ، سنہرا کام کی ہوئی خلعت، دو سنہرے اور سیاہ علم اور ایک دو رنگی ڈنڈا (دورباش) بھی عطا کیا گیا۔ عصامی کے مطابق انتظامی امور ملک شاہین، نائب باربک کے حوالے کیے گیے، جو ایک غلام تھا اور جسے علاؤ الدین اپنا بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔[1] یہ کام تمام ہونے کے بعد سلطان تیزی کے ساتھ دہلی روانہ ہوا چونکہ اس وقت تک اس کو اپنے دارالسلطنت پر منگولوں کی پیش قدمی کی خبر مل چکی ہوگی۔

طرغی دہلی کا محاصرہ

علاؤ الدین نے [متذکرہ بالا] دو دور دراز کی مہموں کے لیے دہلی اور [بقیہ] ہندستان کو فوجوں سے بالکل خالی کر دیا تھا اور ممکن ہے کہ اس نے سرحدی قلعوں سے بھی فوجوں کو بلا لیا ہو۔ ماوراء النہر کے منگولوں کو اس کی خبر ہوئی ہوگی اڑتیس یا چالیس ہزار گھوڑ سواروں کو لے کر طرغی کو فوراً دہلی پر قبضہ کر لینے کے لیے بھیجا گیا۔[2] یہ منصوبہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا تھا اگر طرغی سلطان کی واپسی کے پہلے دہلی پہنچ جاتا۔ لیکن ایسا کر سکنے میں وہ ناکامیاب رہا۔ پھر بھی صورت حال سنگین تھی، شاید [کسی قدر] مضحکہ خیز بھی، ملتان، دیپال پور اور سامانہ میں کہیں بھی اتنی کافی مضبوط فوج نہ تھی جو منگولوں کی پیش قدمی روک سکتی یا کم از کم دہلی کی طرف پسپا ہو کر وہاں سلطان کی مدد کرتی۔ علاؤ الدین کو دہلی واپس ہوئے ایک مہینہ گزر چکا تھا جب منگولوں نے اس کا محاصرہ شروع کیا۔ اس کی فوج کے اسلحے برسات کے دوران چتوڑ کے محاصرے کے دوران ضائع ہو گئے تھے اور اسے اس کی مہلت نہ ملی تھی کہ فوج کا معائنہ کر سکے اور اسے گھوڑوں اور اسلحوں سے دوبارہ تیار کر سکے ملک، جونا (بزرگ) اپنے دل شکستہ سپاہیوں کے ساتھ دوآب واپس پہنچ چکا تھا لیکن چونکہ منگولوں نے جمنا

---

(1) عصامی، ص 272، خضر خاں، تقریباً اسی عمر کا تھا جتنا کہ مبارک شاہ، جو 1316ء میں انتیس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

(2) برنی ص 300، بعض نسخوں میں درج ہے کہ 'طرغی کے ساتھ صرف 20 یا 30 ہزار سوار تھے؛

کے تمام گھاٹوں پر قبضہ کر لیا تھا اس لیے وہ ہندستان کی فوج کول اور بدایوں میں رکی پڑی رہی اور شاہی حکم کے باوجود دہلی نہ آسکی۔

ان حالات کے تحت سلطان نے چند سواروں کے ساتھ دہلی سے باہر لکڑی کا ایک حصار بنوایا۔ اس نے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا لیکن اپنے کیمپ کی حفاظت کے لیے بہت محتاط رہا۔ اس کے مسلح پا پیادہ سپاہ دن رات نگرانی کرتے رہتے۔ ہر دستہ کے آگے پانچ مسلح ہاتھی تعینات تھے۔ دونوں فوجوں کے ہراول دستوں میں کچھ جھڑپیں ہوئیں لیکن طرفین میں سے کسی کو کوئی فیصلہ کن کامیابی نہ حاصل ہوئی۔ اور منگولوں کو شاہی خیمہ میں گھس جانے کا موقعہ نہ مل سکا، جو کہ ان کا اصل مقصد تھا۔ برنی جو اس وقت دہلی میں موجود تھا لکھتا ہے کہ شہریوں میں منگولوں کا خوف اس سے پہلے کبھی بھی اس حد تک ظاہر نہیں ہوا تھا اور یہ کہ اگر طرغی جمنا کے کنارے ایک مہینہ اور رک جاتا تو اس کا اندیشہ تھا کہ شہر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور قبضہ سے باہر نکل جاتا۔ کاروانوں کی نقل و حرکت بند ہو گئی تھی اور اس لیے پانی، لکڑی اور چارہ کی قلت تھی۔ لیکن چونکہ علاؤالدین سارے شہر میں محافظت نہ کر سکتا تھا اس لیے "منگول گھوڑ سوار چبوترہ سبحانی، موری ہدودھی اور حوض سلطانی کے کنارے تک پہنچ گئے اور انہوں نے سلطان کے غلوں اور دیگر اشیاء کو (شہریوں کے ہاتھ) سستے داموں بیچ دیا اور اسی لیے غلہ کی کوئی خاص قلت نہ ہوئی۔[1] سلطان پر حملہ کرنے اور اس کی فوج کو پسپا کرنے کی کوئی صورت طرغی کو نظر نہ آئی اور مجبور لوگوں کی دعاؤں کی وجہ سے ملعون طرغی دو مہینوں تک دہلی کے محاصرہ کے بعد مال غنیمت کے ساتھ اپنے ملک واپس ہو گیا[2]" برنی لکھتا ہے کہ دہلی کے اس طرح بچ جانے پر دانشمند حضرات کو بھی حیرت تھی لیکن

---

(1) برنی ص ص 32-130 [چھاپے کی غلطی معلوم ہوتی ہے ص ص 2-301 ہونا چاہیے۔ مترجم] موری اور ہدودھی کی نشان وہی مشکل ہے۔ اونچا چبوترہ جس کو چبوترہ سبحانی کہا جاتا ہے، کا ذکر ہمارے مورخین اکثر کرتے ہیں۔ خسرو لکھتا ہے کہ چونکہ حوض شمسی (سلطان شمس الدین کا تالاب مٹی سے بھر گیا تھا اس لیے علاؤالدین نے دوبارہ اس کی کھدائی کرا دی تھی۔ چنانچہ زمین کے نیچے سے بھی پانی نکلنے لگا اور بارش کا پانی بھی اس میں جمع ہوتا تھا۔ (خزائن الفتوح ص ص 33-30 اگرچہ خسرو اس کے متعلق خاموش ہے۔ علاؤالدین نے اپنی ترقی پذیر دہلی کی ضرورتوں کے لیے ایک اور تالاب بنوایا تھا۔ شاید 1311ء کے بعد زیر بحث حوض سلطانی سے مراد شاید حوض شمسی ہے۔

(2) نوٹ:۔ یہ کہا جاتا ہے کہ طرغی کی واپسی حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کی دعاؤں کے سبب ہوئی۔

دراصل طرغی کی بازی اسی وقت مات ہو گئی تھی جب اس نے دیکھا کہ سلطان اپنے دارالسلطنت کو واپس آ چکا ہے اور پورے ملک میں دفاعی انتظامات کی نگرانی کر سکتا ہے۔ مخالف سرزمین میں مزید قیام کا مطلب اس کی پوری فوج کا صفایا تھا۔

پدمنی کا قصہ، چتوڑ علاؤالدین کے دورِ حکومت میں

وہ مورخ جو قدیم ماخذ کا مطالعہ کرتا ہے اسے پدمنی کے قصے کا 1311ء میں آغاز کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ خسرو، برنی، عصامی اور تمام نزدیکی ہم عصر مصنفین اس کے متعلق خاموش ہیں۔ علاؤالدین نے چتوڑ پر قبضہ کیا اور جلد ہی دہلی لوٹ گیا۔ اس نے رتن سین کو معاف کر دیا اور یہ سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی جواز نہیں کہ اس نے رائے کی بیویوں یا عورتوں کے متعلق سوچنے کی زحمت بھی کی ہو گی لیکن 1540ء میں چتوڑ کی فتح کے 237 سالوں بعد-ملک محمد جائس (جائیس اودھ میں رائے بریلی کے نزدیک ایک چھوٹا شہر ہے) نے ایک ہندی نظم پدماوت لکھی جس نے بجا طور پر کلاسیکی ہندی ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ملک محمد جائسی نے ہندی زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھا ہو لیکن اودھی روایات یہ ہیں کہ انہوں نے ممکن حد تک فارسی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا۔ ہمیں اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اس نے اپنی اس عظیم مثالی نظم (Allegory) میں (جیسا کہ اس نے خود اعتراف کیا ہے) چتوڑ، کو بطور جسم، راجہ کو بطور 'دماغ' لنکا کو بطور 'قلب' پدمنی کو بطور 'عقل'...... اور علاؤالدین کو بطور 'ہوس' پیش کیا ہے۔ چونکہ مصنف کا مقصد ایک رومانس کو پیش کرنا تھا اس لیے وہ تاریخی واقعات، جغرافیائی حد بندیوں یا کم از کم مروجہ ہندو نظام ذات اور رسم و رواج [کے اصولوں] کا لحاظ رکھنے کے لیے پابند نہ تھا۔ اس کے مطابق آٹھ سالوں کے محاصرے کے باوجود علاؤالدین چتوڑ پر قبضہ نہ کر سکا۔ لیکن اس نے ایک دھوکے سے رائے کو گرفتار کر لیا اور اسے دہلی لے گیا اس نے رائے کو رہا کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ رائے کی بیوی، پدمنی، جو لنکا کی ایک شہزادی تھی، جسے اس نے اس دور دراز جزیرے میں بارہ سالوں کی کوشش کے بعد حاصل کیا تھا، کو اس کے حوالے نہ کر دیا جائے۔ لیکن جیسا کہ وہ قصہ مشہور ہے، کہ ہندو جنگبازوں نے ایک چال چلی اور زنانہ

ڈولیوں میں بیٹھ کر دہلی گئے اور جب وہ رائے کے نزدیک پہنچے تو وہ ان [ڈولیوں] میں سے کود کر باہر آ گئے اور اس طرح رائے بحفاظت چتوڑ واپس لے آیا گیا۔

ڈاکٹر کے ایس لال نے صحیح طور پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ پدماوت سے قبل کے کسی دستیاب ماخذ میں اس قصہ کا ذکر نہیں ملتا۔ فارسی مصنفین مثلاً فرشتہ، بابو پدماوت کی کہانی سے محض سنی سنائی باتوں کی بنا پر واقف تھا، نے اس میں جوڑ توڑ کر دی ہے تاکہ تاریخ کے مسلمہ واقعات سے کسی طور پر ان کی مطابقت قایم کر دی جائے۔ راجپوت بھاٹ [گویئے] جو انہیں (واقعات کو) سمجھتے تو تھے لیکن جن کو دہلی [کی تاریخ سے کوئی واقفیت نہ تھی، نے اس قصہ کو بخوبی قبول کر لیا اور تاریخی حقائق کا لحاظ کیے بغیر، اس کے واقعات میں اضافہ کیا۔ راجستھانی تاریخ کے "ایک عظیم محقق ڈاکٹر گوری شنکر اوجا نے اس قصہ کے واقعات کے بعید از قیاس ہونے پر تفصیلی بحث کی ہے اور (اس سلسلہ میں) ان کی رائے فیصلہ کن ہے۔

کوئی بھی ہم عصر مورخ اس کا بیان واضح طور پر نہیں پیش کرتا کہ علاؤالدین کی حکومت کے دوران چتوڑ کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کی کیا صورت تھی۔ ظاہر ہے کہ خضر خاں نام نہادی طور پر گورنر تھا اور وہ چتوڑ میں رہتا نہیں تھا اور ملک شاہین سلطان کے کوف سے گجرات کے رائے کرن کے پاس بھاگ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین نے چتوڑ کے براہِ راست انتظام کا خیال ترک کر دیا تھا، گرچہ اس نے وہاں فوج کا ایک حفاظتی دستہ رکھا۔[1] فرشتہ لکھتا ہے کہ "سلطان نے احتیاط کے تقاضوں کے مطابق چتوڑ کی ذمہ داری خضر خاں کے ہاتھوں سے رائے کی بہن کے ایک لڑکے مالدیو کو تبدیل کر دی جو اس کی خدمت میں رہا تھا اور جس نے ہر طرح پر وفاداری کا ثبوت پیش کیا تھا۔ اس کنور نے مختصر ہی عرصہ میں اس علاقہ میں اپنا اقتدار جما لیا اور تمام راجپوت اس کی حکومت سے خوش تھے اور اس کی حمایت کرتے تھے۔ وہ سلطان کی حکومت کے آخیر تک اس کا وفادار رہا۔ وہ ہر سال اپنے ملک کے تحائف کے ساتھ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ایک گھوڑا اور خاص خلعت پانے کے بعد واپس ہوتا

---

(1) برنی، ص 323، علاؤالدین کے گورنروں کی ایک فہرست پیش کرتا ہے اور [اس میں] ملک ابو محمد کا نام بحیثیت گورنر چتوڑ مندرج ہے۔

اس نے ہر اس مہم میں جس کے لیے اسے حکم دیا گیا 5 ہزار گھوڑوں اور 10 ہزار پیدل فوج کے ساتھ شرکت کی اور بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔[1] یہ حقیقت ہے کہ علاؤالدین کا ایک کتبہ، مورخہ مئی 1310ء (ذی الحجہ 709) چتوڑ میں موجود ہے اس حقیقت سے غیر مطابق نہیں کہ مملکت علاؤالدین کو اپنا حاکمِ اعلیٰ سمجھتی تھی اور اس کی فوج کا ایک دستہ اپنے قلعہ میں رکھتی تھی۔ لیکن فرشتہ لکھتا ہے کہ جب علاؤالدین اپنے بسترِ مرگ پر تھا اس وقت چتوڑ کا رائے باغی ہو گیا۔ اس نے سلطان کے افسروں اور آدمیوں کے ہاتھ پاؤں بندھوا کر انہیں قلعے کی فصیل سے نیچے پھنکوا دیا۔[2] اس طرح چتوڑ نے پھر آزادی حاصل کر لی۔ 1321ء کے لگ بھگ، مالدیو کے مرنے کے بعد، سوسوڈاں کے رانا ہمیر نے میواڑ پر قبضہ کر لیا اور اس کے اخلاف ہندستان کی آزادی کے وقت تک اس علاقہ پر حکومت کرتے رہے۔

---

(1) فرشتہ، ص 115- دوسری جانب ٹوڈ (Tod) لکھتا ہے کہ مالدیو چتوڑ میں تعینات شاہی فوجی دستہ کے ساتھ رہا۔ لیکن ہمیر نے میدانی علاقوں کو تاراج کیا اور اس نے اپنے دشمنوں کو قلعہ بند شہروں پر قبضہ قایم رکھنے دیا جہاں (لوگ) اطمینان کے ساتھ رہ سکتے تھے، ذی الحجہ 709ھ (مئی 1310ء) کا کتبہ جس کا ذکر ڈاکٹر کے۔ ایس لال (خلجیز، ص 130) نے کیا ہے اس حقیقت کی منافی نہیں کرتا کہ علاؤالدین ایک ہندو کنور کے ذریعہ چتوڑ پر حکومت کرتا تھا۔ ڈاکٹر کے، ایس، لال مسلمانوں کے قلعہ کی فصیلوں سے پھینکے جانے (کے واقعہ) کا سال غلطی سے 1311ء قرار دیتے ہیں۔ فرشتہ نے قطعی طور پر یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ 1316ء میں ہوا جب علاؤالدین اپنے بسترِ مرگ پر تھا اور گجرات میں بھی ایک بغاوت واقع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کے۔ ایس۔ لال کے مطابق مالدیو، جالور کے سنگرا سردار کنہار دیو ر چوہان کا بھائی تھا (خلجیز ص 130) ملک شاہین کے فرار کے فوراً ہی بعد چتوڑ کو مالدیو کے حوالے کیا گیا ہو گا۔ جتنی واقفیت ہمیں حاصل ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہن نے انتظامیہ کی دیکھ بھال بہت تھوڑے دنوں تک ہی کی۔

(2) فرشتہ، ص 123

4

علاؤالدین خلجی: معاشی ضوابط

ضوابط کا مقصد

برنی لکھتا ہے کہ "طرغی کا حملہ کافی اہمیت کا حامل ایک مصیبت تھی۔ اس نے علاؤالدین کو اس کے مہمل خوابوں سے جگایا اور اس نے مہموں کی قیادت اور قلعوں کا محاصرہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے سری میں اپنا قلعہ بنوایا اور وہیں رہنے لگا لہٰذا سری اس کا دارالسلطنت بن گیا اور وہاں کی عمارتوں کی تعداد اور آبادی بڑھنے لگی۔ دہلی کے قلعہ کی پرانی دیوار کی مرمت کر دی گئی اور جہاں ضرورت ہوئی نئے قلعے بنوائے گئے۔ اس نے مشہور اور کار گزار کوتوالوں کو ان قلعوں کا ذمہ دار بنانے کا حکم دیا اور کافی تعداد میں منجنیقیں اور عرادے بنوانے کا بھی حکم دیا۔ ہوشیار کاریگروں کو کام پر لگایا جاتا تھا اور ہر قسم کے اسلحوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ غلے اور چارے کے ذخیروں کو بھی جمع کیا جاتا تھا اور سامانہ اور دیپال پور میں کار گزار سپاہیوں کو بڑی تعداد میں بھرتی کیا جانا اور تیار رکھنا تھا۔ منگولوں کے سرحد پر واقع اقطاعات کو کار گزار اور تجربہ کار امراء والیوں اور فوجی افسروں کو مقرر کر کے مضبوط کیا گیا۔[1]

یہ انتظامات منگولوں کے ان غولوں کے لیے کافی ثابت ہوئے جو (ہندستان پر) حملہ آور ہونے والے تھے۔ لیکن علاؤالدین نے (ان اقدامات کے علاوہ) اشیاء کی قیمتیں طے کرنے پر کئی سالوں تک اپنی توجہ مرکوز کی اور جو کچھ کیا گیا اس کا ایک تفصیلی بیان برنی نے پیش کیا ہے۔ تاریخ کے طالب علم کو مورلینڈ کا یہ فیصلہ قبول کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ "ایسا قصہ گڑھنے کے لیے ضیاء برنی کا کوئی مقصد نہ تھا اور زیادہ اہم نقطہ یہ ہے کہ اس داستان طرازی کے لیے معاشی تجزیہ کی جس صلاحیت کی ضرورت تھی وہ اس کا حامل بھی نہ تھا...... یہ ناقابلِ تصور ہے

---

(1) برنی، ص ص 302-3

کہ ضیاء برنی جیسا ایک مصنف (علاؤ الدین کے معاشی ضوابط) کی خصوصی باتوں کو اپنے دماغ سے اختراع کر سکتا تھا۔ لیکن یہ بات قابلِ تصور ہے کہ اس زمانہ کی معاشی صورت کے پیشِ نظر علاؤ الدین جیسا ایک بادشاہ جسے بلا شبہ لائق وزراء کے مشوروں کی مدد حاصل تھی، تدریجاً اس پالیسی کے بنیادی اصولوں کو طے کر لیتا، جسے اسے عمل کرنا تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس لحاظ سے جدید نظام کمزور ہیں وہ اس معاملہ میں مضبوط پوزیشن میں تھا۔ چونکہ اسے جاسوسوں کے ایک وسیع سلسلہ کی خدمات حاصل تھیں اور موثر سزائیں دینے کی راہ میں کسی قسم کی جذباتی رکاوٹ نہ تھی[1]۔ (اس سلسلہ میں) برنی ہمارا واحد ماخذ نہیں ہے لیکن دیگر معاصرین سے جو باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں وہ تصدیق شہادت کی حیثیت رکھتی ہیں صرف برنی ہی تفصیلات پیش کرتا ہے۔

اپنی تاریخ فیروز شاہی میں برنی اس طور پر لکھتا ہے کہ جیسے علاؤ الدین کے معاشی ضابطوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ منگولوں کے خلاف ایک مضبوط اور کارگزار فوج تیار کی جا سکے۔ اس فوج کی تنخواہ کی رقم کی ادائیگی ریاست کی آمدنی سے ہی ہوتی۔ اس بنا پر علاؤ الدین نے ایک تربیت یافتہ اور اچھی طرح مسلح گھوڑ سوار کی تنخواہ اگر اس کے پاس ایک گھوڑا ہو تو 234 ٹنکہ سالانہ تجویز کی اور اگر کسی سوار کے دو گھوڑے ہوں تو 78 ٹنکے فاضل (تجویز کیے)[2]۔ اگر وہ اس سے زیادہ تنخواہ دیتا تو اس کا خزانہ پانچ یا چھ

---

(1) ایگریرین سسٹم، ص ص 37-36

(2) برنی کا جملہ جس صورت میں وہ ہم تک پہنچا ہے قواعد کے اعتبار سے بہت غیر تشفی بخش ہے لیکن متفقہ طور پر اس کا جو عام مطلب ہوتا ہے وہ ہے 234 ٹنکہ، اور دوسرا گھوڑا رکھنے کی صورت میں 78 مزید ٹنکہ۔ لیکن فرشتہ یوں رقم طراز ہے "جب ذریعہ معاش کی اشیاء اور اسلحوں کی قیمتیں کم کر دی گئیں تو بادشاہ نے سپاہیوں کی تنخواہ مندرجہ ذیل درجوں میں مقرر کر دیں۔ اول یہ کہ 234 ٹنکہ، دوم 156 ٹنکہ، سوم 78 ٹنکہ۔ جب افسروں نے اس حکم (شرح) کے مطابق کام کیا تو 4 لاکھ 75 ہزار گھوڑ سواروں (کی بھرتی ہوئی اور ان کا) رجسٹر پر اندراج ہو گیا' (114) یہاں ایک غلطی بالکل صاف ظاہر ہوتی ہے 78 ٹنکوں پر ایک گھوڑ سوار کا گزارہ ممکن نہ تھا ہو سکتا ہے کہ یہ ایک پیادہ سپاہی کی تنخواہ ہو، گرچہ برنی اس معاملہ میں خاموش ہے 4 لاکھ 75 ہزار کی تعداد علاؤ الدین کی کل فوج، مرکزی و مقامی اور سوار و پیادہ کی رہی ہو گی لیکن اس معاملہ میں بھی کسی ہم عصر ماخذ سے ہمیں علاؤ الدین کی کل فوج یا گھوڑ سواروں کی تعداد معلوم نہیں ہوتی۔ صرف کسی مہم کے لیے بھرتی کی گئی فوج کی تعداد کا کہیں کہیں ذکر ملتا ہے۔ منگول عموماً گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے اور ان کی حرکت پذیر صفوں کے مقابلے میں پیدل فوج بیکار ثابت ہوئی ہو گی لیکن اور دوسرے بہت سے فوجی کام تھے جو پیادہ سپاہی ہی انجام دے سکتے تھے۔

سالوں میں خالی ہو جاتا۔ وزیروں نے مشورہ دیا کہ گھوڑ سوار اس تنخواہ پر گزارہ کر سکتے تھے، بشرطیکہ اشیاء کی قیمتیں کم کر دی جائیں۔ علاؤالدین تیار ہو گیا۔ بشرطیکہ کہ (اس سلسلہ میں) "قتل سزائے موت اور فرعونی دہشت زدگی کو کام میں نہ لایا جائے۔ مجرم اشخاص کے علاوہ اور کسی شخص کے خلاف حکومتی اختیارات (State-Force) کو استعمال نہ کیا جاتا تھا۔ مقصد یہ نہ تھا کہ کاروبار کے عام طریقے کو یکسر بدل دیا جائے بلکہ اسے مستحکم کیا جائے اور جاری رکھا جائے۔ لیکن برنی یہ کہنے کے بعد معاشی ضوابط بنیادی طور پر ایک فوجی اقدام تھا تفصیل سے اس کا بیان کرتا ہے کہ علاؤالدین نے کس طرح ان اشیاء کی (بھی) قیمتیں مقرر کر دیں جن کی کوئی اہمیت فوجوں کے لیے نہ تھی۔ مزید یہ کہ یہ ضوابط اس کے بہت بعد جاری رہے جبکہ اس کی عسکری ضرورت ختم ہو چکی تھی۔ فتاویٰ جہانداری میں قیمتوں کے کنٹرول کے متعلق اپنے مشورہ میں، جو ایک ایسے عام بادشاہ کے لیے ہے جو قحط کی صورتِ حال کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو۔ برنی قیمتوں کے کنٹرول کو ایک رفاہ عامہ کارروائی قرار دیتا ہے جس کی ضرورت ہر وقت ہے۔ "ریاست کی حکمت عملی اور کارروائیاں ایک دوسرے پر منحصر کرتی ہیں۔ مثلاً جس طرح کہ ایک فوج خزانے سے ادائیگی تنخواہ کے بغیر اچھی طرح سے نہیں رہ سکتی اسی طرح وہ اشیاء ضرورت کی کم قیمت (بنائے رکھے) بغیر بھی سکون سے نہیں رہ سکتی اور ٹھیک جس طرح اشیاء کی ارزانی کسی فوج کی مناسب تشکیل کے لیے ضروری ہے اسی طرح جب تک ضروریات زندگی کی قیمتیں کم نہ ہو جائیں اس وقت تک عوام میں خوش حالی شان و شوکت اور استحکام قایم نہیں رہ سکتا"۔ ایسے قحط کے دوران جو کلیتہً بارش نہ ہونے کی وجہ سے ہو، ایک حکمراں لاچار ہو جاتا ہے۔ لیکن اچھی فصل کے زمانہ میں جب کہ باران رحمت ہوتی ہے اور فصلیں، پھل، جوتے ہوئے کھیت اور باغات سرسبز و شاداب ہوتے ہیں تب (بھی) سوداگرانِ کاروانی (وہ بیوپاری جو ایک جگہ سے دوسری جگہ مال لے جاتے اور بیچتے تھے) اور سوداگران بازاری (جو ایک متعینہ جگہ میں بیوپار کرتے تھے) زیادہ قیمت پر اشیا کو بیچتے ہیں اور چونکہ نرخوں کے بڑھانے سے کثیر منافع ہوتا ہے اس لیے تمام صاحب صلاحیت (متمول) لوگ تجارت کرنے لگتے ہیں اور کم قیمت پر خرید کر زیادہ پر فروخت کرنے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ (احتکار)، احتکار کا

طریقہ پیسے والے لوگوں کے لیے ہی ممکن تھا اور چونکہ مہاجنی اور بڑے پیمانہ کے کاروبار پر ہندوؤں کی بلاشرکت غیر اجارہ داری تھی لہٰذا احتکار کا مطلب (برنی کی نظر میں) یہ تھا کہ دولت مسلمانوں کے گھروں سے ہندوؤں کے گھروں میں منتقل ہو جاتی تھی۔

فیروز شاہی کی حکومت کے اوائل سالوں میں شیخ نظام الدین اولیاء کے ایک ممتاز خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ نے علاؤالدین کے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کیا تھا جس کو حمید قلندر نے مختصراً بیان کیا ہے۔ ملک التجار قاضی حمید الدین (ایک بار) اودھ آیا اور ایک دعوت دی۔ جب اور مہمان رُخصت ہو گئے تو قاضی نے شیخ (نصیر) کو یہ قصہ سنایا "ایک بار جب میں علاؤالدین کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے ایک تپائی پر کھلے سر بیٹھے دیکھا۔ اس کے پیر زمین پر تھے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نزدیک گیا لیکن چونکہ سلطان نے میری طرف کوئی توجہ نہ کی اس لیے میں باہر آیا اور ملک قرابیگ کو جو سلطان کی مجلس میں میرا ساتھی تھا، وہ حالت بیان کی جو میں دیکھ کر آیا تھا۔ قرابیگ سلطان کے نزدیک آیا اور اس سے گفتگو شروع کی۔ "اے مسلمانوں کے بادشاہ، میری ایک گزارش ہے" سلطان نے جواب دیا "کہو" (جب) میں کمرے میں آیا تو سلطان کو کھلے سر (بیٹھا ہوا) اور کسی خیال میں ڈوبا ہوا پایا۔ حضور کیا سوچ رہے تھے۔ سلطان نے جواب دیا "سنو کچھ دنوں سے (یہ) خیال بار بار میرے ذہن میں آ رہا ہے۔ خدا کی اتنی ساری مخلوق ہے لیکن اس نے مجھے ان کی بادشاہی (ذمہ داری) سونپ دی ہے۔ مجھے بھی کچھ ایسا کام کرنا چاہیے جس کا فائدہ ہر شخص کو ملے۔ میں نے سوچا کہ ایسا کون سا کام مجھے کرنا چاہیے۔ اگر میں اپنی تمام دولت بلکہ ایسے سینکڑوں اور خزانے دے دوں تو بھی یہ تمام لوگوں کے لیے کافی نہ ہوں گے۔ میں معاملہ پر غور کر رہا تھا- میں کونسا ایسا کام کروں جس سے تمام لوگوں کو فائدہ پہنچے؟ ابھی فوراً میرے دماغ میں ایک خیال آیا ہے اور وہ تم کو سمجھاتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں غلوں کی قیمتوں کو کم کردوں تو اس کا فائدہ سبھوں کو ہوگا لیکن غلوں کی قیمتیں کم کس طرح کی جائیں؟ میں سلطنت کے تمام (ہندو) نایکوں کو جو دہلی میں غلہ لاتے ہیں، حاضر کرنے کا حکم دوں گا (ان میں سے) بعضوں کے پاس دس ہزار بار برداری کے جانور ہیں جب کہ دوسروں

---

(1) پولٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت ص ص 38-34

کے پاس بیس ہزار ہیں، میں انہیں بلواؤں گا نیز ان کے اہل و عیال کے اخراجات کے لیے بھی تا کہ وہ (حسب معمول) غلہ لائیں اور میری مقرر کی ہوئی قیمتوں پر بیچیں۔ سلطان نے ایسا ہی حکم دیا اور ہر سمت سے غلے لائے جانے لگے۔ چند دنوں میں اس کی قیمت 7 جتل فی من ہو گئی۔ روغن (گھی) چینی اور دیگر اشیا بھی سستی ہو گئیں اور تمام لوگ سلطان کے حکم سے مستفیض ہونے لگے" قاضی حمید کی گفتگو کا اقتباس پیش کرنے کے بعد شیخ نے کہا کہ "علاؤالدین بھی کیا بادشاہ تھا۔ خدا اس پر اپنی رحمت نازل کرے"۔ ایک شخص جو (اس مجلس میں) موجود تھا' اس نے تبصرہ کیا کہ "لوگ اس کی قبر کی زیارت کرتے ہیں (اس کٹہرے کے گرد) دھاگے باندھتے ہیں اور ان کی مرادیں پوری ہوتی تھیں۔[1]

امیر خسرو کے خزائن الفتوح، جو ہمارا اولین ماخذ ہے 1316ء[2] میں لکھی گئی تھی اور سلطان کی خدمت میں پیش کی گئی تھی اور اس کی اشاعت بھی ہوئی تھی گرچہ فوج کے اس وقت تک کے کارنامے بہت زبردست تھے لیکن خسرو نے علاؤالدین کے انتظامی اور معاشی اقدام کی تعریف ان کے فوج سے تعلق کی بنا پر نہیں بلکہ رفاہِ عامہ کے لحاظ سے کی ہے۔ ان کی بعض ٹکڑوں کو سیدھے سادھے انگریزی ترجمے میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

"ہر شخص جس کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے یہ سمجھ لے گا کہ ایک اچھے انتظام کار (جہاں دار) کا درجہ فاتح (جہانگیر) سے برتر ہے...... اس کتاب میں انتظامی امور کی فوجی امور پر ترجیح دی گئی ہے.......... عوام کی قسمت کا ستارہ اسی دن ابھرا جب

---

(1) خیر المجالس ص 231 فارسی متن، مولفہ پروفیسر خلیق نظامی، پروفیسر نظامی کے مطابق شیخ نصیر الدین کی ولادت اودھ میں 77-1276ء اور وفات دہلی میں 1356ء میں ہوئی تھی۔ شیخ نظام الدین اولیا سے ان کی پہلی ملاقات 43 سال کی عمر میں یعنی 1310ء کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ شیخ الاعظم کی خانقاہ میں رہنے کے لیے بعد میں منتقل ہوئے۔ اس زمانہ کے سلسلے کے چشتی قواعد کسی شیخ کو سلطان یا اس کے امراء کی خدمت میں جانے کی اجازت نہ دیتے تھے اور مستند چشتی ملفوظات میں جواب موجود ہیں سلاطین کے ذکر سے احتراز پایا جاتا ہے۔ لیکن ان گزرے ہوئے بادشاہوں کے ذکر کی اجازت تھی۔ شیخ نصیر الدین کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ نظام الدین کی خانقاہ میں (مناسب حدود کے اندر) علاؤالدین کی عزت کی جاتی تھی۔

(2) معرکہ مہم کے متعلق ایک مزید باب کا اضافہ 1313ء میں کیا گیا۔

سلطان کے دل میں یہ احساس جاگا کہ خدا نے اس کو ان کا سربراہ بنایا تھا۔ اولادِ آدم کے لیے سلطان کی محبت اس سے زیادہ ہے جتنا آفتاب کو ماہتاب اور ستاروں سے ہے.......... اول یہ کہ اس نے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک (کے علاقوں میں) کئی بار رعایا کا خراج معاف کر دیا ہے (دوئم) اس سے اپنی تلوار کی ضرب سے ہند کے راایوں کے 'خزائن' جو انہوں نے مہاراج اور بکرماجیت[1] کے زمانہ سے نسلاً بعد نسل جمع کر رکھے تھے، کو شاہی خزانے میں منتقل کر دیا تھا۔

اس کے علاوہ اس نے عوام کے ذریعہ معاش کو سستا کرنے کے خیال سے کاریگروں (بیوپاریوں) جو اپنے مالوں کو زیادہ قیمت پر بیچتے تھے، کے ٹیکس کا بوجھ کم کر دیا۔

اس نے ان کے اوپر ایک ایماندار رئیس (نگراں) مقرر کر دیا ہے تاکہ وہ چاپلوس اور چالباز دوکانداروں سے انصاف کے کوڑے کی زبان سے گفتگو کر سکے اور ان (کمزوروں، غرباء) کو قوتِ گفتار عطا کر سکے جن کے پاس یہ نہ تھی دوکانداروں کے باٹوں کی تفتیش کے لیے ہوشمند افسران بحال کیے گئے۔ ہر اس سیاہ قلب دوکاندار سے جو سنگدلانہ طور پر کاروبار کرتا تھا۔ کوڑے مار مار کر اس کے دل کا پتھر (کم وزن کا باٹ) چھین لیا گیا۔ ان افسران کی سختی اتنی زبردست تھی کہ یوں سمجھیے کہ ان کے تمام باٹ کے پتھر لوہے کے ہو گئے جن پر صحیح وزن کندہ تھا تاکہ اگر کوئی کم وزن چیز بیچے گا تو یہی لوہا اس کے گلے کی زنجیر بن جائے گا اور اگر اس نے مزید بدعنوانی کی تو (اس کے گلے کی) زنجیر تلوار بن جائے گی اور اسے موت کی آخری سزا دی جائے گی۔ جب کاریگروں (بیوپاریوں) نے یہ سختی دیکھی تو انہوں نے اس آہنی انتظام (میزان آہن) کی خلاف ورزی ترک کر دی اور اس (میزان آہن) کو اپنے گرد ایک حصار آہن تصور کیا اور (باٹوں پر کندہ) اوزان کو اپنی روح کا محافظ تصور کیا (حفاظت کے لیے ایک تعویز تصور کیا)۔[2]

مزید یہ کہ رعایا کی اکثریت کے لیے اس نے اس طرح شمشیر زنی کی ہے کہ

---

(1) خزائن الفتوح، ص ص 12-14

(2) ایضاً، خسرو کی عبارت آرائی سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ دوکانداروں کو پتھروں کے باٹ کی جگہ منظور شدہ لوہے کے باٹ رکھنے پر مجبور کیا گیا۔

سندھ کے دریا کے کنارے سے لے کر (مشرقی) سمندر تک کسی نے بھی چور طرار اور رہزن کا نام بھی نہیں سنا ہے۔ راتوں کو ادھر ادھر مارے پھرنے والے لوگ جو دیہاتوں میں آگ لگایا کرتے تھے اب مشعل لے کر راستوں کی نگہبانی کیا کرتے تھے۔ ایک رسی کا ٹکڑا بھی اگر گم ہو جائے تو اسے تلاش کرنا پڑتا تھا یا ہرجانہ بھرنا پڑتا تھا۔[1]

مزید یہ کہ چونکہ بارش رحمت (سلطان) نے اس زمانہ میں بھی جبکہ کنجوس بادلوں کے دامن سے بارش کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ اشیا کی قیمتوں کو بنائے رکھا ہے جس سے شہر اور گاؤں دونوں ہی جگہ کے لوگوں کو فائدہ پہنچا جہاں کہیں بھی سفید بادلوں کے دامن بارش سے خالی رہے اور عوام حادثوں سے دوچار ہوئے اس نے شاہی گوداموں سے غلّوں کو وہاں بھیج کر عوام کے لیے غلّوں کی فراوانی مہیا کی۔[2]

مزید یہ کہ تمام حوائج یا محتاجوں کے لیے، جن پر عوام کا انحصار ہوتا ہے اس نے ایک دارالعدل قایم کیا جو ایماندار مزدوروں کی پیشانیوں سے زیادہ کشادہ ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ ہر قسم کے کپڑے اور دیگر اشیاء جو باہر سے لائی جاتی ہیں، وہ اسی جگہ (دارالعدل میں) کھولی جائیں پھر دوبارہ باندھی نہ جائیں۔ (باندھ کر کسی اور جگہ لے جا کر بیچی نہ جائیں، خسرو نے عمدہ کپڑوں کی بہت سی قسموں کا ذکر کیا ہے، جن کا ہمارے لیے کوئی مطلب نہیں (جو ہمارے لیے محض ناموں کی ایک فہرست ہے)۔ کرپاس، حریر، بہاری، گل باقلی، شعر، گلیم، جز، خز، دیوگیری اور بہادیوگیری ہر قسم کے خشک میوے (تھکہ) جو زمین سے پیدا ہوتے تھے لیکن جن کی فہرست بندی بہت طویل ہو گی اور خواص و عوام کی ضروریات کی تمام ضروری اشیاء اس جگہ سے دستیاب ہیں تاکہ ہر شخص بلا شور و ہنگامہ، ایمان داری کے ساتھ اپنی ضرورت کے مطابق عمدہ اور مناسب ترین چیزیں خرید سکے - اور بادشاہ کی فیاضی سے مستفیض ہو سکے۔[3]

خسرو کے ان بیانات میں ان باتوں کی تصدیق ملتی ہے جو اس کا دوست برنی 45 سالوں بعد لکھنے والا تھا۔ لیکن برنی کے حقائق کو اس کے نتائج سے علیحدہ رکھنا ہو گا۔

---

(1) ایضاً، ص ص 18-19

(2) ایضاً، ص ص 23-24

(3) ایضاً ص ص 21-23

ہمیں یہ بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہی کچھ بیان کر سکتا ہے جو اس نے خود دہلی میں دیکھا تھا اور یہ کہ بقیہ مملکت میں کیا ہوا اس کے متعلق وہ ہمیں خود اپنا اندازہ قایم کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔

فطری طور پر جو پہلا سوال (اس سلسلہ میں) اٹھتا ہے وہ بنیادی اصول ہے جس پر ضابطے مبنی تھے۔ بد قسمتی سے عہدِ وسطیٰ اور دورِ وسطیٰ اور دورِ حاضر کے تمام مورخین اس نکتہ کو نہیں پا سکے ہیں چونکہ برنی نے اس اصول کو اپنی تاریخ فیروز شاہی میں مندرج "عام بازار" سے متعلق تذکرے کے درمیان لکھ دیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "علاؤالدین ہر چیز یہاں تک کہ اتنی معمولی چیزیں، جیسے سوئیاں، کنگھیاں، کفش و نعلین (سلیپریں اور جوتے) کاسۂ سبو اور ٹوپیاں کے تیار کرنے پر خرچ شدہ رقم محنت (حکم بر آورد) کے تعین میں دن رات غور و خوض کرتا۔[2] لیکن فتاویٰ جہانداری کی تصنیف کے وقت اس نے تفصیلات (کے بیان) میں غلطیاں نہیں کیں اور علاؤالدین کے اصول کو اور واضح طور پر بیان کیا "بادشاہ کو اپنے دربار ہی میں تمام اشیاء کی قیمت ان کے بنانے پر خرچ شدہ رقم محنت (بر آورد) کے اصول کی بنا پر طے کرنی چاہیے"۔[2] برنی (بلکہ علاؤالدین) مارکس کے اس اصول کے بہت نزدیک آ پہنچا کہ (اشیاء کی) قیمتیں (ان کے بنانے کے سلسلہ میں) سماجی اعتبار سے ضروری مزدوری اور وقت پر منحصر کرتی ہیں لیکن مارکس (کی بحث) کا تعلق ایک ایسے آزاد مارکیٹ سے تھا جو سرمایہ داری صنعتی مقابلہ اور جدید رسل و رسائل کی اثرات کی وجہ سے نمودار ہوا تھا۔ علاؤالدین کو اشیاء کے تیار کرنے پر خرچ شدہ رقم محنت پر مبنی قیمتوں (کے نظام) کو عہدِ وسطیٰ کے ایک مشرقی معاشرے میں عاید کرنا تھا۔ اصل دشواری غلوں کی قیمتیں طے کرنے میں تھیں۔ جب یہ کام ہو گیا تو بقیہ اشیاء کی قیمتیں (ان کے) تاجروں کی لگائی ہوئی رقموں پر کچھ منافع کا لحاظ رکھ کر اور ہنر مند اور غیر ہنر مند مزدوروں کو ان کی مزدوری کی اجرت کا لحاظ رکھ کر طے کی جا سکتی تھیں۔ علاؤالدین کی انتظامیہ نے شاہراہوں کو محفوظ بنا دیا۔ سرمایہ کی کمی نہ تھی لیکن رسل و رسائل کا سلسلہ منتشر تھا اور تاجروں پر

---

(1) تاریخ فیروز شاہی ص316۔

(2) پولیٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت ص35۔

ضرورت سے زیادہ منافع خوری کا الزام تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے، علاؤالدین نے بعض تاجروں کے لیے، جنھیں ریاست کی طرف سے مالی اعانت ملتی تھی اور (جن کے کاروبار پر) نگرانی کی جاتی تھی، ضابطے (میزان) بنائے اور (بات) نے بالواسطہ طور پر پورے تجارتی نظام کو سیدھا کر دیا۔ اس نے قیمتوں کو (محض) ریاست کی طاقت ہی کے ذریعہ کم نہیں کیا- وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے ہمیں اس بات پر متعجب نہ ہونا چاہیے کہ بعد کے بعض حکمرانوں کے وقت میں بھی جنھوں نے اس معاملہ کی طرف زیادہ توجہ نہ دی، قیمتیں اتنی ہی کم رہیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ علاؤالدین کے اندازے سے صحیح تھے اور وہ ایک معمول پر مبنی بازار کے قیام کے لیے کوشاں تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین نے ہندو مہاجنوں (ساہا) کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی۔ اسے ان کی مدد کی ضرورت نہ تھی لیکن اسکے ضوابط کے تحت بڑھتے ہوئے منافعوں کی ضمانت کے پیش نظر ان کے لیے قرضوں اور تجارت میں رقمیں لگانے کی سہولتیں بڑھ گئی ہوں گی ہندوؤں کی دو تجارت پیشہ ذاتیں تھیں جن کو ضروریات زندگی دو اشیاء پر تقریباً اجارہ دارانہ گرفت حاصل تھی- نایک[1] جو غلوں کی

---

(1) بعد کے زمانہ میں لفظ نائک معنی کے اعتبار سے محدود ہو گیا۔ علاؤالدین اس کا استعمال ان تاجروں کے لیے کرتا ہے جو غلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے اور ان میں بعض 10 ہزار یا 20 ہزار باربرداری کے جانور اس کی خدمت میں پیش کر سکتے تھے۔ نایک یقیناً کسی تجارت پیشہ ہندو ذات ہندی نام ہے۔ اس زمانہ کے سب سے ممتاز نایک ملک نایک آخوربک میسرا (میسارا) تھا جو سامانہ کا گورنر تھا اور جس کا تذکرہ امیر خسرو نے دیارِ اعلیٰ کے ہندو افسر کے طور پر کیا ہے۔

(دول رانی، ص 61) تجارت کے میدان میں مسلمان کی صورتِ حال کمزور تھی۔ چونکہ قانون اور رائے عامہ دونوں ہی ان کے لیے سود خوری کے مانع تھے۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلم تاجروں یا صنعت کاروں کو خود اپنے سرمایہ پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا اور وہ قرضوں کی سہولت کی توقع نہ رکھ سکتے تھے۔ زیادہ منافع خوری (احتکار) کو ایک گناہ سمجھتے ہیں برنی حق بجانب تھا۔ ضرورت سے زیادہ منافع خوری (احتکار) کے واقعی طور پر کرنے یا ایسا کرنے کے الزام سے بچنا مشکل تھا۔ لہٰذا مسلم ملا عموماً اپنے پیروکاروں کو غلوں کی تجارت کو پرہیز کرنے کو کہتے تھے۔

بیرونی تجارت یا جنوبی ہند سے تجارت دونوں ہی اعتبار سے ہندو تاجروں کی صورتِ حال بہتر تھی۔ صرف وہی لوگ سلطان کے قایم کیے ہوئے بازاروں کے لیے جنوبی ہندستان سے ریشمی کپڑوں کو لا سکتے تھے۔ یہ ایک فطری بات تھی کہ ان کے گروپ کی نمائندگی کرنے والوں کی خاصی تعداد دہلی میں تھی۔

تجارت کرتے تھے اور ملتانی تاجر جو کپڑوں کی تجارت کرتے تھے، علاؤالدین نے ان کی اجارہ داریوں کو (جو روایات یا مقابلے پر مبنی تھیں) ریاست کی زیر نگرانی اجارہ داریوں میں تبدیل کر دیا۔ اس کے ضوابط سے ان کو (کچھ) ذاتی دقتیں ہوئی ہوں گی لیکن اس کی تلافی اس سے ہوگئی کہ ان کے کاروبار بڑھ گئے اور ان کے منافعوں کی ضمانت مہیا ہوگئی۔

(ان) ضوابط کا جو بیان برنی نے پیش کیا ہے اس کی تشریح کے قبل اس زمانہ کے سکوں اور اوزان کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ فرشتہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس زمانہ کا ٹنکہ ایک تولہ سونا یا چاندی کے برابر ہوتا تھا اور ایک نقرئی ٹنکہ پچاس جتلوں یا تانبے کے سکوں کے برابر ہوتا تھا۔[1] اس جتل کا وزن معلوم نہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا وزن ایک تولہ تھا لیکن دوسروں کا خیال ہے کہ آج کل کے تانبے کے سکوں کی طرح ایک جتل کا وزن پونے دو تولہ تھا۔ اس زمانے کا من 40 سیر کا ہوتا تھا اور ایک سیر چوبیس تولوں کے برابر ہوتا تھا۔ چونکہ بعد کے حکمرانوں نیسکوں میں استعمال شدہ سونے یا چاندی کی مقدار کو کم کرنا چاہا لہٰذا علاؤالدین کے زمانے کا ٹنکہ، جس میں چاندی کی مقدار کافی تھی شیر شاہ کے (رائج کردہ) روپے کے چلن تک، ڈھائی سو سالوں تک، معیار کا پیمانہ بنا رہا۔ ایک تولہ کا وزن مختلف صدیوں کے دوران بدلتا رہا ہے لیکن اگر ہم ایک تولہ کو 180 گرین (troy) کے برابر فرض کرلیں[2] تو (ڈاکٹر عرفان حبیب کے اندازے کے مطابق) علاؤالدین کے زمانہ کا ایک من آج کل کے 25.44 پونڈ اور 12.35 سیروں کے برابر ہوگا۔

منڈی یا غلوں کا بازار

پہلا اور سب سے مشکل ضابطہ مختلف قسم کے غلوں کی قیمتوں کے تعین کے متعلق تھا۔ ہمیں یہ نہیں بتایا جاتا ہے کہ قیمتوں کی فہرست حساب کی بنا پر طے کی گئی۔

---

(1) فرشتہ، ص 114 مسٹر نلسن رائٹ اس خیال کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتے ہیں کہ ایک ٹنکہ 48 جیتلوں کے برابر تھا۔ لیکن دودھاتی سکوں کے نظام میں) شرحوں میں کچھ تغیرات لازمی تھے۔

(2) برطانوی حکومت کے سرکاری در یہی تھے۔

لیکن خسرو اور برنی بار بار ہمیں یہ یقین دلاتے ہیں کہ قیمتوں میں کسی طرح کے اضافے کی اجازت نہ دی گئی۔ فی من کے در سے حکومت نے جو قیمتیں مقرر کی تھیں وہ یہ ہیں۔ گیہوں 1/2 7 جیتل، بارلی (جو) 5 جیتل، موٹھ 3 جیتل۔ جب تک علاؤالدین زندہ رہا خواہ بارش ہو یا نہ ان قیمتوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہ ہوا غلوں کے بازار میں قیمتوں میں کسی قسم کی اتار چڑھاؤ نہ آنا عجوبۂ زمانہ تھا۔

آج کل کے سیر (کے وزن) کے مطابق حساب لگانے پر ہم یہ اندازہ قائم کر سکتے ہیں کہ ایک علائی ٹنکہ جو برطانوی حکومت ہند (کے زمانہ کے) ایک روپیہ کا ہم وزن ہوتا مگر جس کی چاندی کی مقدار زیادہ ہوتی تھی، کے عوض دہلی کا ایک شہری 88 سیر گیہوں، 98 سیر چنا، چاول یا ماش کی دال اور 205 سیر موٹھ خرید سکتا تھا۔ صحیح حساب طے کرناد شوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان اعداد میں شاید 15 یا 20 فی صد کی غلطی ادھر ادھر ہو سکتی ہے مگر یہ (اعداد) علائی ٹنکہ کی غلوں کی قوت، خرید کا اندازہ مہیا کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

دوسرا ضابطہ، ملک قبول الغ خانی کی شحنہ منڈی کی حیثیت سے تقرری کے متعلق تھا۔[1] وہ ایک ہوشیار اور تجربہ کار ملک تھا جسے بادشاہ تک رسائی تھی۔ اسے کافی بڑا اقطاع اور گھوڑ سواروں اور پیادوں کی ایک بڑی تعداد دی گئی تھی جس کی وجہ سے اس کی طاقت و دبدبہ میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس کے شرکاء میں سے ایک اسے نائب نگراں کی حیثیت سے ملا ہوا تھا لیکن ساتھ ہی علاؤالدین نے ایک ذمہ دار شخص کو جو سلطان کے مزاج سے واقف تھا، منڈی کا سراغ رساں (برید) مقرر کیا۔

---

(۱) الغ خاں کی اصطلاح سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الغ خاں کی ملازمت میں رہا ہوگا جیسا کہ ذیل کے پیراگرافوں سے ظاہر ہوگا۔ ملک قبول صرف دہلی کی منڈی کا مہتمم نہ تھا بلکہ غلوں کی فراہمی کے پورے انتظامی سلسلہ کا بھی۔ اس کا اصل کام غلّے کے نگراں کی حیثیت سے تھا۔ اس کی ماتحتی میں ایک افسر دہلی کی منڈی کا مہتمم رہا ہوگا اور یہ فرض کر لینا زیادہ قرین قیاس ہوگا کہ اسی (موخر الذکر) افسر کو قیمتوں کے اضافہ کا مشورہ دینے کے لیے تلووں پر ڈنڈا مارنے کی سزا (bastinada) دو مرتبہ دی گئی۔

تیسرا ضابطہ سلطانی گوداموں میں غلے کی فراہمی کے متعلق تھا۔[1] سلطان نے دوآب کے علاقے کے تمام خالصہ شہروں کا خراج جنس کی صورت میں وصول کرنے کا شاہی گوداموں میں لے جانے کا حکم دیا۔ جھائن یا شہر نو میں سلطان کے حصہ (کے لگان) کا نصف جنس میں طلب کیا گیا (وہ) غلہ پہلے جھائن میں رکھا گیا اور پھر دہلی لے جایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی شہر میں کوئی محلہ ایسا نہ تھا جہاں شاہی غلے سے بھرے ہوئے دو یا تین مکانات (گودام) کے موجود نہ تھے۔

چوتھا ضابطہ غلہ لے جانے والے تاجروں کو ملک مقبول کے زیر نگرانی لگائے جانے کے متعلق تھا" سلطان نے حکم دیا کہ غلہ لے جانے والے تمام تاجروں کو شحنہ منڈی کا ماتحت بنا دیا جائے اور ان کے لیڈروں کو گلے میں طوق و زنجیر ڈال کر اس کے سامنے پیش کیا جائے۔ سلطان نے ملک مقبول کو حکم دیا کہ وہ انہیں بازار میں اپنی نگرانی میں رکھے اور جب تک عاید کردہ شرائط کو پورا نہ کریں ان کے گلوں سے طوق و زنجیر نہ اتارے۔ ایک دوسرے کے ضامن بن کر وہ ایک متحدہ جماعت (یک وجود) یا کارپوریشن کی مانند ہو جائیں۔ انہیں اپنی بیویوں، بچوں، اسباب اور مویشی سمیت جمنا کے کنارے رہنے کا حکم دیا جائے۔ غیر ہنگامی زمانوں میں ان تاجروں نے دہلی میں اتنا غلہ لا دیا کہ شاہی گوداموں میں جمع کیے ہوئے ذخیروں کو چھونے کی بھی نوبت نہ آئی۔

پانچواں ضابطہ احتکار کی سخت ممانعت کے متعلق تھا۔ مرکزی وزارت نے دوآب میں اپنے (مقرر) تمام ایجنٹوں اور افسروں سے ایک راضی نامہ لیا کہ وہ کسی بھی احتکار کو نہ کریں گے اور اگر اس طرح کا معاملہ دریافت ہوا تو وہ حکومت کے آگے جوابدہ ہوں گے۔ ذخیرہ اندوزی یا زیادہ منافع خوری کی غرض سے رکھے ہوئے غلوں کو ضبط کر لیا گیا اور اس شخص کو سخت سزا دی گئی۔ کسی بھی تاجر جاگیردار یا بنیا کے لیے یہ نا

---

(1) یہ ضوابط اس صورت میں نہیں (موجود میں) جیسا کہ علاؤالدین نے انہیں بنایا تھا برنی (اپنی کتاب لکھتے وقت) ان اقدامات کو یاد کر رہا تھا اور انہیں منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کر رہا تھا۔ غلوں کے متعلق اس نے پہلے تو 8 ضوابط کا ذکر کیا ہے اور ہر ایک کو علیحدہ ایک پیراگراف میں بیان کیا ہے۔ ایک افسوسناک غلطی کی بنا پر فہرست کا ضابطہ نمبر 3 تشریحی پیراگرافوں کا ضابطہ نمبر 2 بن گیا ہے اور نمبر 2، نمبر 3 بن گیا ہے۔ میں نے تشریحی پیراگرافوں میں برنی کے اپنے دیے ہوئے نمبروں کی تقلید کی ہے۔

ممکن ہو گیا کہ وہ ایک من غلہ کی بھی منافع خوری کر سکے یا اپنے گھر کے اندر بھی ایک یا آدھ من غلہ مقررہ سرکاری قیمتوں سے زیادہ قیمت پر بیچ سکے۔

چھٹے ضابطہ کے تحت انتظامی اور دیوانی محکموں کے افسروں سے ایک عہد نامہ طلب کیا گیا کہ وہ غلے کے تاجروں کو کاشتکاروں کے کھلیانوں سے ہی (بغیر گھر لے جائے ہوئے) نقد قیمتوں پر غلہ دلوائیں گے۔ دو آب میں جو کہ شہر (دہلی) سے نزدیک ہے، سلطان کے حکم کے مطابق مرکزی وزارت نے اپنا شحناؤں اور متصرفوں (محکمہ لگان کے (افسران) سے یہ عہد نامے لیے گئے کہ وہ کاشتکاروں سے خراج اس سختی سے وصول کریں گے کہ ان کو منافع خوری کی غرض سے اپنے غلّوں کو سوداگران کاروانی کے ہاتھوں سستے داموں پر بیچنا ہی پڑے گا۔......... لیکن کاشتکاروں کو یہ اجازت رہے گی کہ وہ اگر چاہیں تو جتنا غلہ وہ لے جا سکیں اتنی مقدار میں وہ بازار میں لے جائیں اور انہیں مقررہ سرکاری قیمتوں کے مطابق منافع حاصل کرنے کے لیے بیچ سکیں۔[1]

ساتویں ضابطہ کے مطابق سلطان غلہ بازار کے متعلق تین آزاد ذرائعوں سے الگ الگ رپورٹ روزانہ حاصل کرتا تھا۔ پہلی شحنا منڈی سے، دوسری بریدوں سے، تیسری منہیوں یا خفیہ جاسوسوں سے، جنہیں اس کام کے لیے بحال کیا گیا تھا معمولی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ علاؤالدین اپنی تخت نشینی کے وقت بالکل ان پڑھ نہ تھا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ چونکہ اسے جاسوسوں کی پیش کردہ بہت ساری رپورٹوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی تھی اس لیے اسے جلدی جلدی اور بہ خطہ فارسی (رپورٹوں) کے پڑھنے میں بہت جلد مہارت ہو گئی۔[2] جب بازار کے نگراں نے ایک یا دو موقعوں پر قیمتوں میں نصف جتل کے اضافے کی رائے پیش کی تو اسے 20 ڈنڈے لگائے گئے۔ لوگ ایمانداری سے کام لینے لگے۔ چونکہ وہ جانتے تھے کہ سلطان کے جاسوس اسے تمام باتوں کے متعلق خبر دیتے رہتے تھے۔

---

(1) برنی، 308-307 کاشتکاروں کو یہ چھوٹ (اختیار دے دینے کا نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ مقامی لگان افسران پر، اس صورت میں کہ وہ کاشتکار کو غلے کی قیمت کو ایک خاص حد سے زیادہ کرنا چاہتے تھے، ایک روک لگ گئی ہوگی۔ فرشتہ کے مطابق کاشتکار نزدیکی قصبہ میں سرکاری نرخ پر اپنا غلہ بیچ سکتا تھا۔ اسے دہلی لے جانا ضروری نہ تھا۔

(2) فرشتہ، جلد اول، ص 110

علاؤالدین کے دورِ حکومت میں دہلی میں نہ قحط پڑا اور نہ قیمتوں میں اضافہ۔ لیکن بارش نہ ہونے کی صورت میں (قلت اور مہنگائی کی روک تھام کے لیے) راشننگ کے انتظام کے لیے مندرجہ ذیل ضابطہ بنایا گیا۔ ہر محلّہ کے بقالوں کو اس کی آبادی کے مطابق مرکزی بازار سے غلّے کی مقررہ مقدار روزانہ دی جاتی تھی۔ مزید یہ کہ مرکزی بازار کے ذریعہ کسی شخص کو یہ اجازت حاصل تھی کہ وہ ایک وقت میں آدھ من غلہ خرید سکے اور وہ (مرکزی بازار) ایسے امراء اور معزز اشخاص کو جن کے پاس اپنی زمین یا گاؤں نہ تھے ان کے متوسلین کی تعداد کے مطابق براہِ راست غلہ فراہم کر سکتا تھا۔[1] بازار میں نظم و نسق قایم رکھنا ضروری تھا۔ خاص کر خشک سالی کے دنوں میں اگر کوئی لاچار و مجبور شخص ظلم و ستم کا شکار ہوتا تو اس علاقہ کے شحنا کی سزا یقینی تھی۔

سرائے عدل

سرائے عدل خصوصی طور پر مصنوعات کا بازار تھا۔ جو سامان یہاں فروخت ہوتے تھے وہ دور دراز مقاموں سے سلطان کی مملکت سے باہر علاقوں سے اور یہاں تک کہ بیرونی ممالک سے بھی لائے جاتے تھے اور ان کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں سرکار سے خاص امداد (Subsidized) دی جاتی تھی۔ یہ مخصوص اشیاء کپڑے، جڑی بوٹیاں (ادویات[2]) خشک میوے، مکھن (روغن ستور، گھی) اور چراغوں کے لیے تیل تھے۔ یہ اشیاء خراب ہوئے بغیر کافی دنوں تک رکھی جا سکتی تھیں۔ پہلا ضابطہ سرائے عدل کے قیام کے سلسلہ میں تھا۔ کوشک کے نزدیک، بدایوں دروازہ کے اندرونی

---

(1) برنی ص 308

ہمارے یونانی حکیم سارے عہدِ وسطیٰ کے دوران اس قسم کی بہت سی جڑی بوٹیوں کو دوا کے طور پر استعمال کرتے رہے جو مرکزی ایشیا میں پیدا ہوتی تھیں۔ اس معاملہ میں انھوں نے بو علی سینا (Avicenna) کی تقلید کی۔

خسرو نے اسے شاعرانہ طور پر یوں بیان کیا ہے کہ "اگر کوئی شخص اپنے سامان کی گٹھری کو کسی دوسری جگہ کھولتا تو اس کے جسم کے جوڑوں کو تلوار سے کھول دیا جاتا (خزائن الفتوح ص 23)

(ہر کسی کاں کشادہ بر بندد۔ بند بندش بہ تیغ بہ کشایند۔ مترجم)

(2) مشروع سے مطلب ریشم اور اور سوت کو ملا کر بنا ہوا جس کے پہلے کی مسلمان کو شروع کی رو سے اجازت تھی

جانب کافی وسیع زمین ایک عرصہ سے خالی پڑی ہوئی تھی۔ سرائے عدل اسی جگہ بنوائی گئی۔ چونکہ جو اشیاء وہاں (فروخت کے لیے) رکھی جاتی تھیں وہ بہت قیمتی ہوتی تھیں اس لیے زیادہ اہم دکانیں یقیناً مستحکم طور پر بنائی گئی ہوں گی۔ سلطان نے حکم دیا کہ تمام اشیاء خواہ وہ سوداگروں کے پیسوں سے خریدی گئی ہوں یا حکومت کی دی ہوئی رقوم سے۔ کو سرائے عدل لایا جائے۔ کسی نجی مکان یا دوسرے بازار میں نہ لے جایا جائے۔ اگر اس حکم پر عمل نہ ہوتا یا کوئی شے مقررہ قیمت سے ایک جتیل زیادہ پر بھی فروخت ہوتی تو وہ شے ضبط کر لی جاتی اور بیچنے والے کو سخت سزا دی جاتی[1]۔ اس حکم کی وجہ سے ایک سے ایک ہزار ٹنکوں کی مالیت تک کی تمام اشیاء صرف سرائے عدل میں ہی (فروخت کے لیے) لائی جاتی۔ یہ بازار صبح کے وقت سے لے کر عصر کی نماز (نماز دیگر) کے وقت تک کھلا رہتا یعنی دوپہر کے ایک گھنٹہ بعد تک۔

دوسرے ضابطہ کے سلسلہ میں برنی ہمیں سرکاری قیمتوں کی فہرست میں مندرج بعض چیزوں کا نام بتاتا ہے۔ جہاں تک ریشمی کپڑوں کی فہرست کا تعلق ہے اس فہرست کی ایک خرابی یہ ہے کہ ان کے ناپ کے بغیر صرف قیمتیں دی گئی ہیں۔ شاید ایک معیاری ناپ رہا کرتا ہوگا اور برنی قارئین سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اس (ناپ) کو ذہن نشین رکھیں گے۔ بہر حال اب اس قسم کے کپڑے ناپید ہو چکے ہیں اور ان کی قیمتوں کو بیان کرنا محض اس لحاظ سے ضروری ہے کہ قارئین کو یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ کپڑے بننے والے عمدہ کاریگروں کو اچھا معاوضہ ملتا تھا (الف) ریشمی کپڑے- خزدہلی 16 ٹنکے۔ خزکوئلہ، 6 ٹنکے۔ مشروع شعری[2] (عمدہ) 3 ٹنکے۔ شیریں (عمدہ) 5 ٹنکے شیریں (اوسط، میانہ) 3 ٹنکے۔ شیریں (موٹا) 2 ٹنکے۔ سلاہتی موٹا 2 ٹنکے (ب) ان سوتی کپڑوں کے ناپ نہیں بیان کیے گئے ہیں لیکن شاید یہ اوسط بستر کی چادر کے ناپ کے برابر ہوتی ہوگی- برد (عمدہ) سرخ لکیر والا 6 جتیل[3]۔ برد موٹا 36

---

(1) 6 جتیل کاتب کی بین غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(2) یہ بات ظاہر ہے کہ گز بازار میں بکتا تھا۔

(3) فرشتہ نے نمک کی قیمت یہی لکھی ہے (ص 114)، برنی (کی کتاب کے قلمی نسخوں) کا متن تمام نسخوں مین اس جگہ پر (ناقص ہے) پڑھا نہیں جا سکتا ہے۔

جتل۔ ناگوری استر (سرخ) 24 جتل۔ استر موٹا 12 جتل۔ چادر، 10 جتل۔ مزید یہ کہ کوئی شخص ایک ٹنکہ میں 40 گز موٹا یا 20 گز عمدہ بنا ہوا سوتی کپڑا خرید سکتا تھا۔ (ج) دیگر اشیاء (کے شرح) ایک سیر مصری 2 1/2 جتل، معمولی قسم کی چینی 1 1/2 جتل بھورے رنگ کی چینی (شکر سرخ) 3 سیر ا جتل 3، گھری 1 1/2 سیر ا جتل۔ سیسم کا تیل 3 سیر ا جتل۔ نمک پانچ سیر ا جتل 4۔ برنی لکھتا ہے کہ دیگر اشیاء خواہ عمدہ ہو یا معمولی کی قیمتوں کا اندازہ مندرجہ بالا فہرست سے لگایا جا سکتا تھا۔

تیسرا ضابطہ تاجروں کے ناموں کے اندراج کے متعلق تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ دہلی کے تمام تاجر خواہ ہندو ہو یا مسلمان، نیز ساری مملکت کے تاجر خواہ ہندو یا مسلمان خود کو (اپنے ناموں کو) دیوان ریاست کے رجسٹر میں درج کرائیں (تاکہ) ان کے کاربار کی نگرانی کی جا سکے۔ شاہی حکم کے مطابق ہر قسم کے تاجروں کے لیے قوانین (میزان) بنائے گئے۔ اور ان تاجروں کے لیے قوانین (میزان) بنائے گئے۔ جہاں تک دہلی کا تعلق ہے، ان تاجروں سے جو (شہر میں) غلہ لایا کرتے تھے ایک عہد نامہ لیا گیا کہ وہ ان غلّوں کو اتنی ہی مقدار میں آئندہ سالوں میں بھی لایا کریں گے اور انہیں مقررہ قیمتوں پر سرائے عدل میں فروخت کیا کریں گے۔ ایسے رجسٹرڈ شدہ سوداگروں (سوداگران میزانی) نے دیگر صوبوں سے اور اطرف سے اتنا غلہ لا دیا کہ وہ سرائے عدل میں جمع پڑا رہا اور فروخت نہ کیا جا سکا۔

چوتھا ضابطہ ملتانی تاجروں کے متعلق تھا۔ سرائے عدل (میں بکنے والا) کا سامان سوداگران میزانی دور دراز (جگہوں) سے لاتے تھے اور زیادہ قیمتی سامانوں کو لانے کے لیے انہیں کچھ سرکاری مالی امداد (Sibsidy) کی ضرورت ہو گی۔ قیمتیں صارفین کے مفاد کا خیال رکھ کر طے کی گئی تھیں۔ لیکن وہ اسی صورت میں بحال رکھی جا سکتی تھیں کہ اشیاء کو براہِ راست صارفین کے ہاتھوں بیچا جائے اور تاجروں کو اس بات کی اجازت نہ ہو کہ وہ اپنا مال زیادہ قیمت پر فروخت کرنے کے لیے دوسری جگہ نہ لے جائیں۔ اس سلسلہ میں برنی لکھتا ہے کہ دہلی نیز صوبوں کے سوداگروں نے کوشش کی کہ عمدہ، اعلیٰ قسم کے اور قیمتی کپڑوں کو جو اطراف میں دستیاب نہ تھے، سرائے عدل میں سرکاری نرخ پر خرید کر دوسری جگہوں پر لے جائیں اور زیادہ قیمت پر

فروخت کریں۔ علاؤالدین کے پاس ایسی انتظامیہ تھی جو معاملات کی دیکھ بھال اور جنگ کرنا جانتی تھی۔ لیکن کاروبار (کی نگرانی) اس کے بس کی بات نہ تھی، اس لیے مطلوبہ اختیارات اور ذمہ داری تاجر پیشہ لوگوں کے ایک ممتاز گروہ کے حوالے کی جا سکتی تھی۔ سلطان علاؤالدین نے حکم دیا کہ خزانہ سے 20 لاکھ ٹنکہ کی رقم دولت مند ملتانی تاجروں کو دی جائے انہیں سرائے عدل کا افسر (عہدے دار) مقرر کر دیا جائے۔ ملتانی تاجروں کو سلطان کے ہر جانب سے سامان لانے کو اور انہیں اس طور پر سرائے عدل میں مقررہ قیمتوں پر فروخت کرنے کو کہا جائے کہ وہ (معمولی) (خوردہ فروش) سوداگروں کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائیں۔

پانچواں ضابطہ پروانہ رئیس (پرمٹ دینے والا افیسر) کی تقرری اور اختیارات کے متعلق تھا۔ سلطان علاؤالدین نے حکم دیا کہ قیمتی قسم کے کپڑے مثلاً تسبیح، تبریزی، کج معبری، زربفت اور زرنگار کپڑے، خز دہلی (دہلی کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے) کمخواب تبریزی، حریری، چینی، دیوگیری[1] وغیرہ عام لوگوں کو نہ فروخت کیے جائیں، جب تک کہ پروانہ رئیس ایک تحریری پرمٹ نہ جاری کرے۔ پروانہ رئیس ملکوں اور معزز اشخاص کو ان کی آمدنی و مالی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے پرمٹ جاری کرے۔ پروانہ رئیس ملکوں اور معزز اشخاص کو ان کی آمدنی و مالی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے پرمٹ دیتا۔ ایسے لوگوں کو، جن کے متعلق اس کا یہ خیال تھا کہ عمدہ قسم کے کپڑے سرائے عدل میں خرید کر دوسروں کو دیدیے جائیں گے جو انہیں صوبوں میں (لے جا کر) چار گنا یا پانچ گنا زیادہ قیمت پر فروخت کریں گے پرمٹ دینے سے وہ انکار کر دیتا۔

گھوڑوں، غلاموں اور مویشیوں کا بازار

ان تینوں بازاروں پر عام ضابطوں کا اطلاق ہوتا تھا- (اشیاء کی) قیمتوں کا (ان کی) عمدگی کے مطابق تعین، سوداگروں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ، دونوں (کے کام) کی

---

(1) بعض قسم کے کپڑوں کے ناموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دہلی سلطنت کے باہر یا غیر ممالک میں بنائے جاتے تھے۔ ملتانی تاجروں (کی ان کپڑوں کی خرید) پر علاؤالدین کا کوئی اختیار نہ تھا اور ان کی قیمتیں خرید سونے یا چاندی یا پھر ہندستان کی بنی اشیا مثلاً سوتی سامان یا چینی کی صورت میں ادا کی جاتی ہوگی۔ ان اشیاء کی بیرونی ممالک میں بہت مانگ تھی۔

سخت نگرانی اور بادشاہ کی جانب سے متواتر ذاتی تفتیشات۔

گھوڑے

تجربہ کار گھوڑے کے دلالوں کی مدد سے فوج میں مصرف کے لائق گھوڑوں کو تین قسموں میں تقسیم کر دیا گیا۔ قسم اول 100 سے 120 ٹنکوں تک، قسم دوئم 80 سے 90 ٹنکوں تک، قسم سوئم 60 سے 70 ٹنکوں تک۔ چھوٹے ہندستانی ٹٹو جو فوجی مصرف کے نہ تھے، کی قیمت 10 سے 120 اور 25 ٹنکوں تک گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

گھوڑوں کے تاجروں کا خاتمہ کرنے کے سلسلہ میں علاؤ الدین کو بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ اس زمانہ کے ضابطہ کے مطابق گھوڑ سوار فوج میں داخلے کا خواہش مند کسی شخص کو ایک یا دو گھوڑے اور ضروری ساز و سامان انتظام کر کے عرض (فوجی معائنے) کے وقت حاضر ہونا پڑتا تھا۔ مہتمم افسر وہاں اس کی جانچ کرتا اور اگر اسے معیار کے مطابق پایا جاتا تو گھوڑے کی قیمت اسے دے دی جاتی اور گھوڑے کی قیمت کے تعین میں حکومت گھوڑے کے دلالوں کے لیڈروں (مہتران دلاں) کے مشورے پر عمل کرتی۔ اگر اس (شخص) کی ملازمت کے دوران گھوڑا بیکار ہو جاتا یا مر جاتا تو اس گھوڑ سوار کو نئے گھوڑے کی قیمت مل جاتی۔ لیکن چونکہ زیادہ تر امیدوار گھوڑ سوار عرض کے قبل اپنے گھوڑوں کو نہ خرید سکتے تھے اس لیے بعض دولت مند لوگ گھوڑوں کو خرید کر اصطبلوں میں تیار رکھنے کو ایک منفعت بخش کاروبار سمجھتے تھے۔ وہ سربرآوردہ دلالوں سے ساز باز کر لیتے تھے جو نہ صرف ان گھوڑوں کی قیمتیں بڑھانے میں مدد دیتے تھے بلکہ (امیدوار) گھوڑ سوار اور تاجر دونوں ہی کمیشن لیتے تھے۔ علاؤ الدین نے سخت احتیاطی تدابیریں اختیار کیں۔ ایسے بہت سے گھوڑے کے تاجروں کو، جو اس طرح (بے ایمانی) سے اپنی روزی کما رہے تھے، گرفتار کر کے دور دراز قلعوں میں بھیج دیا۔ سخت ممانعت کر دی گئی کہ کوئی بھی گھوڑے کا سوداگر یا سرمایہ دار بلاواسطہ یا کسی ایجنٹ کے ذریعہ گھوڑے نہ خریدے اور نہ ہی وہ کسی گھوڑے کے بازار کے نزدیک جائے۔ گھوڑوں کی دلالی کے پیشے میں جو لوگ پیش پیش تھے ان کی جانچ پڑتال کی گئی اور جن کو مجرم پایا گیا انہیں گھوڑوں کے تاجروں کے ساتھ دور دراز قلعوں میں

قید کر دیا گیا۔

لیکن گھوڑوں کے ایسے تاجروں کے بغیر جو گھوڑوں کی مختلف قسموں کا تعین اور ان کی قیمتیں طے کرتے تھے۔ حکومت کو اپنا کام چلانا ناممکن ہو گیا نیز یہ کہ صرف گھوڑے کے تاجران ہی بذاتِ خود کافی نہ تھے۔ اگر سپاہی کو گھوڑا خریدنا ہوتا تو وہ کہاں سے خرید سکتا تھا؟ اگر کوئی شخص بازار میں گھوڑا لاتا تو وہ اسے کس کے ہاتھوں بیچتا؟ مزید یہ کہ سوداگران کاروانی ملک کے مختلف حصوں نیز بیرون ملک سے گھوڑے دہلی میں لاتے تھے۔ ان تاجروں کو بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا تھا اور انہیں دہلی میں (رہنے والے) ایسے تاجروں کی ضرورت تھی جو ان کے لائے ہوئے گھوڑوں کو فوری طور پر خرید لیتے اور انہیں اس وقت تک اصطبلوں میں رکھنے کا انتظام کر سکتے جب تک کہ ان گھوڑوں کے خریدار نہ آئیں۔ برنی کسی ایسے متبادل انتظام کا ذکر نہیں کرتا جو علاؤ الدین نے دہلی کے رہنے والے گھوڑے کے تاجروں کے عوض بہ حیثیت ایک درمیانی تاجر کی فرشتہ شاید ہمیں (اس سلسلہ میں) ایک ایسی اطلاع پیش کرتا ہے جو برنی نے نظر انداز کر دی تھی۔ (یعنی یہ کہ) دہلی کے رہنے والے گھوڑے کے تاجروں کی سزا وقتی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد جب قیمتیں معمول پر آ گئیں تو علاؤ الدین نے تاجروں پر مہربانی کی اور انہیں خرید و فروخت کی اجازت دے دی۔ لیکن وہ سلطان کی (مقرر کی ہوئی) قیمتوں کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے۔ تاجروں سے فرشتہ کی مراد تینوں چیزوں کے تاجر ہیں۔ گھوڑے، غلام اور مویشی۔

چوتھے ضابطے کے تحت یہ انتظام کیا گیا تھا کہ گھوڑے کے دلالوں کے سربرآوردہ اشخاص کو دو مہینوں یا 40 دنوں کے بعد سلطان کے سامنے حاضر کیا جائے۔ وہ (ان سے) سختی کے ساتھ تفصیلات دریافت کرتا۔ گھوڑے کے دلالوں کے ساتھ اتنی سختی برتی گئی کہ (اگر ہم برنی کا وثوق کریں) وہ موت کے متمنی ہو گئے۔ لیکن سرکاری تفتیشات کے خوف نے صورتِ حال کو قابو میں رکھا۔ تینوں بازاروں میں خفیہ جاسوس مقرر کیے گئے اور ان کی رپورٹ کی کوئی

بات نظر انداز نہ کی جاتی۔ اس لیے ایک یا دو سالوں میں گھوڑوں کی قیمتیں تھم گئیں۔

تاجروں کی سزا، دلالوں کی نگرانی اور ایماندار دلالوں کو سخت نگرانی کے تحت کام کرنے کی اجازت کے متعلق علاؤ الدین کے تمام احکامات کا اطلاق غلاموں اور مویشیوں کے بازاروں میں بھی کیا گیا۔ گھوڑے کے خرید کے سلسلے کے بر عکس اپنی دونوں (چیزوں) کے لیے آخری (Ultimate) خریدار حکومت نہ تھی اور اس سلسلہ میں بھی فرشتہ کا یہ سوچنا صحیح ہے کہ (درمیانی) تاجروں کو معاف کر دیا گیا اور انہیں (منافعوں کے) مقررہ حدود کے اندر اپنا کاروبار جاری رکھنے دیا گیا۔

غلامان

گھر کے کاموں کے واسطے ایک لونڈی (کنیز کاری) کی قیمت 5 سے 12 ٹنکوں کے درمیان اور داشتہ بنانے کے لیے کنیزوں (کنیز کناری) کی قیمت 30-20 اور 40 ٹنکے مقرر کی گئی 600 یا 200 ٹنکوں کی قیمت والے غلام بہت کم فروخت کیے جاتے تھے۔ اگر کوئی ایسا غلام بازار میں لایا جاتا۔ جو اب ایک ہزار یا دو ہزار ٹنکوں میں بھی نہیں خریدا جا سکتا ہے تو جاسوسوں کی مخبری کے ڈر سے کوئی شخص اسے خریدنے کی ہمت نہیں کرتا۔ ایک خوبصورت جوان غلام کی قیمت 10 سے 15 ٹنکوں تک تھی لیکن غیر تجربہ کار نوجوان کی قیمت صرف 7 یا 8 ٹنکے تھے۔

مویشی

بار برداری کے عمدہ قسم کے جانور، جن کی قیمت ان دنوں 30 سے 40 ٹنکوں تک ہے (اس وقت) 4 یا حد سے زیادہ 5 ٹنکوں میں ملتے تھے۔ (دیگر قیمتیں اس طور پر

---

(1) فرشتہ، ص 14 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتہ نے برنی کے بیانات میں شیخ عین الدین بیجاپوری کی ملتھات طبقات ناصری کی بنا پر اضافے کیے۔ اس کتاب کا کوئی قلمی نسخہ اب تک نہیں ملا ہے اس کے مصنف کو شاید ان کتابوں تک رسائی رہی ہو جو ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ اغلباً وہ ہم عصر یا نزدیکی ہم عصر نہ تھا۔

تھیں) افزائش نسل کے لیے نر جانور (ستور جفتی) 3 ٹنکے، گوشت کے لیے گائیں 1 1/2 سے 2 ٹنکے، دودھ دینے کے لیے بھینسیں 10 سے 12 ٹنکے، گوشت کے لیے بھینسیں 5 سے 6 ٹنکے، فربہ خصی بھیڑ 10 سے 12 یا 14 جتل۔

عام بازار

ملک مقبول کو خصوصی طور پر ناظم غلہ مقرر کیا گیا تھا اور غلہ منڈی اس کے زیر نگرانی رکھی گئی تھی۔ سرائے عدل کو دولت مند ملتانی تاجروں کے زیر نگرانی رکھا گیا تھا۔ لیکن عام بازار جو شہر کے مختلف حصوں میں واقع تھے وزارت تجارت (ایوان ریاست) زیرِ اختیار تھے۔ علاؤالدین نے اس نظم و نسق میں کوئی ردّ و بدل نہ کیا۔ لیکن برنی کے مطابق علاؤالدین نے ماتحت کارندوں کے ایک گروپ کی مدد سے تمام اشیا کی قیمت ان کی تیاری پر خرچ شدہ رقم محنت کے اصول (حکم بر آورد) کی بنا پر مقرر کیں خواہ وہ شے کتنی ہی معمولی قسم کی ہو۔ ٹوپیاں ، موزے، کنگھیاں، سوئیاں، گنّے، سبزیاں، سالن یخنی، حلوہ ، ریوڑی۔[1] مختلف قسم کی روٹیاں، پان، رنگ، ڈلی، گلاب اور پودے۔ مختصر یہ کہ ان تمام اشیاء کی، جو عام بازاروں میں بکتی تھیں (قیمتیں طے کی گئیں) دربار سے طے کی ہوئی قیمتوں کی فہرست دیوانِ ریاست میں بھیج دی گئیں۔

برنی لکھتا ہے کہ تاجر جن چیزوں کو بیچتے تھے وہ خود کو ان کی قیمتوں کا طے کرنے والا واحد صاحبِ اختیار سمجھتے تھے۔ وہ لوگ بے شرم بے باک، دھوکہ باز بدمعاش، بد تمیز، خطرناک، دروغ گو، اور شورہ پشت ہوتے تھے.......... بڑے بڑے بادشاہ اور وزراء بھی ان کی خرید فروخت پر نگرانی رکھنے میں ناکام رہے ہیں علاؤالدین نے وزیرِ تجارت کی تقرری کے سلسلہ میں بہت غور و خوض کیا اور یعقوب ناظر کو اس عہدہ کے لیے منتخب کیا اور اس کے دبدبہ میں اضافہ کرنے کے لیے اسے مملکت کا محتسب اور ناظر (باٹ اور ناپ کی جانچ کرنے والا) کا عہدہ بھی دیا۔ بقول برنی، یعقوب لوگوں کے مزاج سے اور معاملات کی پیچیدگیوں سے بخوبی

---

(1) حلوہ اور ریوڑی ہندستان کی مشہور مٹھائیاں ہیں۔

واقف تھا۔[1] اگر وہ ایک طرف قابلِ اعتماد اور ایمان دار تھا تو دوسری طرف سنگدل، متشدد، بدخو اور ظالم بھی تھا۔ اس جیسے افسر نے دیوان ریاست کے عہد کی عزت افزائی کی۔ یعقوب نے ہر بازار کے لیے شحنا مقرر کیے اور بے ایمان دوکانداروں کو مار پیٹ، زنجیروں سے باندھنے اور دیگر ذلت آمیز طریقوں سے سزا دے کر مواخذہ کیا۔ شحناؤں کو حکم تھا کہ وہ مقررہ قیمتوں پر عمل درآمد پر نگاہ رکھیں ان اشیاء جو کہ قیمتوں کی فہرست میں شامل نہ ہو سکی تھیں، قیمتوں کو روز بروز قایم رکھیں۔[2]

جوان ہو یا ضعیف ہر شحنا اس بات پر متفق تھا کہ یعقوب جیسا متشدد شخص کبھی بھی وزارت تجارت کا ذمہ دار نہ بنا تھا۔ وہ بازار کے نرخوں کی دس یا بیس مرتبہ جانچ کرتا تھا اور مقررہ نرخ سے زیادہ قیمت لینے کے لیے تاجروں کو سخت سزا دیتا تھا۔ ان سخت اقدام نے تاجروں کو کم قیمت کرنے پر مجبور کر دیا لیکن وہ اس طرح کی حرکتوں سے مکمل طور پر باز نہ آئے۔ مثلاً کم وزن کے باٹ رکھنا، عمدہ چیزوں کو چھپا کے رکھنا۔ کم سن اور جاہل خریداروں سے جھوٹ بولنا۔ آخری تدارک کے طور علاؤالدین ان بچوں کو بازار میں خریداری کے لیے بھیجا کرتا تھا جو شاہی کبوتر خانہ کی دیکھ بھال کے لیے رکھے جاتے تھے۔ یعقوب ناظر اس طرح کے خرید کے متعلق دریافت کیا کرتا اور اگر کسی دوکاندار نے صحیح وزن (کا سامان) نہ دیا ہوتا تو وہ مطلوبہ وزن سے دوگنا وزن کا گوشت دوکاندار کے بدن سے کٹوا دیتا ان متواتر سزاؤں کی وجہ سے بازار (کے معاملات) درست ہو گئے۔

---

(1) محتسب کے لیے ایک مترادف لفظ انگریزی میں تلاش کرنا مشکل ہے۔ عام طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ محتسب اپنے زیرِ اہتمام شہر کے عوام کی اخلاقی زندگی کی نگہبانی کرتا تھا مگر وہ کسی مقدمہ کی سماعت نہ کر سکتا تھا اور نہ (تفتیشات کے سلسلہ میں) کسی گھر کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ ہندستان میں محتسب کے فرائض کے ساتھ اکثر کچھ اور کام بھی جوڑ دیے جاتے تھے۔ خصوصاً کوتوال کے فرائض، مملکت کے محتسب کی حیثیت سے یعقوب ناظر تمام مقامی محتسبوں کے کاموں کی نگرانی کر سکتا تھا اور ا (احکام السلطانیہ) کے مطابق اور ناپ کی دیکھ بھال کا کام بھی محتسب کے عام فرائض میں شامل تھا۔

(2) برنی نے ص318 میں لکھا ہے کہ جن چیزوں کی قیمتیں (فہرست میں) نہ لکھی گئی تھیں ان کے متعلق شحنا کبھی کبھی خریداروں سے پوچھ تاچھ کرتے تھے اور اگر کوئی بیوپاری زیادہ قیمت پر کوئی چیز بیچتا تھا تو اس کو گرفتار کر کے رئیس کے پاس لاتے تھے۔

برنی کے بیان کا تجزیہ

زیادہ تر یادداشت پر مبنی اپنے بیان میں جو برنی نے ان ضوابط کے متعلق تاریخ فیروز شاہی میں پیش کیا ہے، اس نے صرف دہلی کے شہر کا ہی ذکر کیا ہے (بغیر کسی اور جگہ کے ذکر کے) اس نے صوبائی صدر مقاموں، قصبات نیز دیہی علاقہ جات (کے معاملات) کو نظر انداز کر دیا ہے۔ دہلی کے سلطان ان کی دیگر دشواریاں خواہ جو بھی رہی ہوں، رومن شہنشاہوں کے برعکس، اپنے دارالسلطنت کے عوام سے خوفزدہ نہ رہتے تھے اور نہ ہی انہیں فوج کی بغاوت کا خدشہ لگا رہتا۔ اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ علاؤالدین کیوں دوآب علاقے کے کسانوں کو صرف دہلی کے شہریوں کی خاطر لوٹ کر ایک طویل اور غیر ضروری دردسری مول لیتا۔ قیمتوں کے تعیّن معاملہ میں تبصرہ کرتے ہوئے برنی فتاوی جہانداری میں لکھتا ہے کہ بادشاہ کو یہ جاننا چاہیے کہ خرید و فروخت اور قیمتوں کے تعین کے سلسلہ میں جو بھی انتظام (نقش) وہ دارالسلطنت میں کریگا وہ اس کے تمام صوبوں میں بھی نمودار ہوں گے۔ اسکی مملکت کے افسر اور رعایا انہیں قبول کر لیں گے اور ان پر عمل کریں گے۔[1] برنی کی آدھی کہی کہانیوں کو بامعنی بنانے کے خیال سے مورلینڈ نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ دہلی کو بقیہ ملک سے علیحدہ کر لیا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ سارے ملک میں قیمتوں کو کم رکھنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ یہ کوشش دہلی ہی تک محدود تھی، جہاں کے مرکزی مستقل فوج کا زیادہ بڑا حصہ تعینات تھا اور ان ضوابط پر عمل دارآمد اتنے ہی علاقے تک محدود تھا جو دہلی کے بازار کے علیحدہ کر دینے (کے انتظامات) کے لیے کافی تھا۔[2] یہ دلیل اس بات کو نظر انداز کر دیتی ہے کہ صرف دہلی میں ارزانی سے فوج کو جس کی بھرتی ملک کے مختلف حصوں سے ہوتی تھی، فائدہ نہ ہوتا۔ سپاہیوں اور گھوڑ سواروں کے اہل و عیال کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا روزی کمانے والے اپنے متعلقہ شخص کے آمدنی کے نصف

---

(1) پولٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت ص 36۔

(2) اگیریرین سسٹم، ص 37 نہ مورلینڈ اور نہ ہی ڈاکٹر کے ایس لال، علاؤالدین کے اس بنیادی اصول کی طرف توجہ دیتے ہیں کہ اشیا کی قیمتوں کا تعین ان کے تیاری پر خرچ شدہ رقم (نرخ برآورد) کی بنا پر کیا جائے۔

حصے، اگر اس سے زیادہ نہیں، پر ان کا حق ہوتا تھا اور چونکہ وہ لوگ مملکت کے مختلف حصوں میں شہروں اور دیہاتوں میں رہتے تھے اس لیے صرف دہلی میں قیمتوں کے کم کیے جانے سے ان کو کوئی خاص راحت میسر نہ آتی یا ریاست کے گھوڑ سواروں کی تنخواہ کم کرنے میں مدد ہوتی۔ بنیادی بات یہ ہے کہ علاؤالدین کی یہ خواہش نہ تھی کہ دہلی کے بازار کو علیحدہ (Isolate) کر دیا جائے۔ سلطان نے اس بات پر زور دیا کہ سرائے عدل کی اشیاء باہر نہ جا پائیں لیکن اگر ایسا کیا جاتا تو اس صورت میں اس کے پاس ایسے ذرائع نہ تھے کہ وہ اشیاء کو دہلی صوبائی علاقوں میں لے جانے سے روک سکے۔ دوسری بات یہ کہ اگر ملتانی تاجروں کو دور دراز صوبوں سے چیزوں کو لانا تھا تو وہ شمالی ہند کی چیزوں کو دور دراز علاقوں کو بر آمد کیے بغیر کس طرح یہ کام کر سکتے تھے؟ جو نقدی امداد نہیں دی جاتی تھیں وہ صرف اس حد تک کافی ہوتی کہ امراء اور دہلی کے دولتمند لوگوں کے لیے قیمتی ریشمی کپڑے لائے جا سکیں۔

لہٰذا فرشتہ کے اس نتیجہ کو صحیح ماننا چاہیے کہ یہ ضوابط علاؤالدین کی ساری مملکت میں نفاذ کے لیے تھیں۔ اگر ان کا نفاذ صرف دہلی میں ہوتا تو گھوڑ سواروں کی تنخواہوں کو کم کرنے کے ایک ذریعہ کی حیثیت سے یہ بے معنیٰ ثابت ہوتیں۔ چنانچہ دہلی میں غلّوں کی قیمتوں کی فہرست کو بیان کرنے سے قبل فرشتہ لکھتا ہے کہ دہلی میں قیمتیں اس طور تھیں، ملک کے بقیہ حصوں میں ان کا اندازہ اسی بنا پر کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سرائے عدل (میں بکنے والے) کے کپڑوں اور دیگر اشیاء کی قیمت کے سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ دہلی کی قیمتوں کو اس لیے بیان کر دیا گیا ہے کہ دیگر علاقوں کی قیمتوں کا اندازہ ہو سکے، مزید یہ کہ گھوڑ سواروں کی بھرتی تمام بڑے شہروں میں ہوتی تھی اور گھوڑوں کے خرید کی قیمت حکومت مقامی نرخ کے مطابق ادا کرتی ہوگی۔ دہلی میں حکومت کے حکم سے گھوڑوں کی قیمت کم کرنے کا صرف یہی اثر ہوتا کہ صوبوں میں پائے ہوئے گھوڑے دہلی کے بازاروں میں نہ لائے جاتے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ چونکہ دہلی عوام کے اجتماع کا ایک عظیم مقام تھا (اس لیے) میں وہاں (رائج) گھوڑوں کی قیمت مثال کے طور پر دے رہا ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برنی یہ فرض کر لیتا ہے کہ علاؤالدین کا مقصد پوری

مملکت کو نہیں بلکہ صرف دہلی کو قحط کے اس اثرات سے بچانا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو تیسرے ضابطہ کے مسودہ کو یوں پیش کرنا پڑا جو قارئین کی قوتِ فہم کی تذلیل ہے۔ چنانچہ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ سارے دو آب کے خالصہ گاؤں کا سرکاری لگان جو کل خالصہ (علاقے) کی آمدنی کے نصف کے برابر اور جھائن کے علاقہ کے خالصہ (علاقہ) کی آمدنی کے چوتھائی کے برابر تھا۔ جنس کی صورت میں لیا جاتا تھا اور دہلی سے لے جانا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جہاں دہلی میں فراوانی ہو جاتی وہاں دیگر شہروں اور قصبات (کے لوگوں) کو فاقہ کشی کی حالت میں چھوڑ دیا جاتا۔ اسی طرح چھٹے ضابطے (جس طور پر برنی نے اسے پیش کیا ہے) سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے کہ خالصہ گاؤں کے لوگوں کو اپنی پیداوار کا نصف حصہ بطور خراج ادا کر دینے کے بعد بقیہ حصہ بھی فروخت کرنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے انہیں اپنے خاندان کے افراد کے لیے کچھ غلہ نہ بچتا تھا۔ اس کا نتیجہ ان کی فاقہ کشی ہوتا اور زراعت کا کام بند ہو جاتا۔ برنی (ان ضوابط کے بیان میں) خود اپنی زبان استعمال کر رہا ہے۔ کسی سرکاری دستاویز کی نقل نہیں پیش کر رہا ہے۔ لہٰذا فرشتہ نے ان دو ضوابط کو ترمیم شدہ طور پر بیان کرنے میں خود کو حق بجانب محسوس کیا۔

دوسرا ضابطہ - شاہی خالصہ علاقوں میں وزارت لگان کا حصہ غلّے کی صورت میں وصول کیا جاتا، اور اس غلّے کو قصبات میں جمع کر کے گوداموں میں رکھا جاتا۔ اگر بازار میں غلہ کافی مقدار میں وصول نہ ہوتا تو سرکاری گوداموں میں جمع شدہ غلہ سرکاری نرخ پر فروخت کیا جاتا۔

پانچواں ضابطہ - اپنے مصرف کے غلے کو علیحدہ کرنے کے بعد رعیت کو (مطلوبہ) پیداوار اپنے کھیتوں میں ہی فروخت کر دینا ہوتا تھا۔ معاہدے کے مطابق مقررہ مقدار کے غلّے کے علاوہ وہ ایک دانہ بھی اپنے گھروں کو نہ لے جا سکتے تھے۔ لگان وصول کرنے والے افسروں کو مطلوبہ (غلہ) کے پیداوار مناسب طور پر وصول کرنا ہوتا تاکہ رعیت کو ان کے غلوں کی نقد قیمت ان کے کھیتوں پر ہی مل جائے اور وہ اپنے حصہ سے زیادہ (غلہ) گھروں پر نہ لے جا سکیں اور ان کے پاس احتکار کے لیے غلہ نہ بچ رہے۔[1]

---

(1) فرشتہ ص ص 13-112 فرشتہ کے دوسرے اور پانچویں ضابطے برنی کے تیسرے اور چھٹے ضابطے کے مطابق ہیں۔

اس طرح لکھے جانے پر یہ ضوابط زیادہ صحیح انداز پیش کرتے ہیں کہ واقعی ہوا کیا تھا۔ خالصہ کے علاقوں کا سرکاری حصہ (لگان) جنس میں وصول کیا جاتا اور شہروں اور قصبات میں نہ کہ صرف دہلی میں گوداموں میں جمع ہوتا اور تب کاشتکاروں کو یہ اجازت تھی کہ اپنی ضرورت کے علاوہ جو غلہ ان کے پاس فاضل بچ رہا ہو وہ یا تو غلہ کے تاجروں کے ہاتھوں اپنے کھلیانوں میں ہی فروخت کر دیں۔ اپنی پیداوار کو کسی نزدیکی شہر میں لے جا کر مقررہ نرخ کے مطابق فروخت کریں۔ کسی کاشتکار خاندان کے فی کس کے لیے کس قدر غلہ کی ضرورت ہوگی اس کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ خسرو لکھتا ہے۔ قحط کے زمانہ میں خالصہ گاؤں کا لگان معاف کر دیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ غلّے اور دیگر اشیاء کی قیمتیں مملکت کے دیگر شہروں اور قصبات کے مقابلہ میں زیادہ نہ رہی ہوں گی۔ واحد مستثنیٰ شے عمدہ قسم کے ریشمی کپڑے تھے جن کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں سرکاری امداد ملتی تھی۔

علاؤالدین کے معاشی ضوابط سلاطین (دہلی) کے عہدِ حکومت کا سب سے بڑا انتظامی کارنامہ ہے۔ جہانگیر کے عہد میں لکھنے والا (7یا1606ء) فرشتہ پر تبصرہ کرتا ہے "علاؤالدین کی حکومت کے اختتام تک قیمتیں یکساں رہیں اور بارش کی کمی یا ان دیگر اسباب کی بنا پر جن کی وجہ سے قحط واقع ہوتے ہیں، ان میں کوئی ردّوبدل نہ ہوا۔ یہ ایک نایاب اور غیر معمولی کارنامہ تھا۔ اس سے قبل کبھی ایسا نہ کیا جا سکا تھا۔ اور کون جانے کہ آئندہ بھی اس طرح کا کام ممکن ہو گا یا نہیں۔[1]

فیروز شاہ کی حکومت کے اوائل میں حمید قلندر نے شیخ نصیر الدین چراغؒ[2] کے ایک بیان کو اختصار میں پیش کیا ہے۔ اس زمانہ میں ضیافتیں عام تھیں زیارتوں کے موقعوں پر اور صفر[3] کے مہینے میں آخری چہار شنبہ کے دن عام احاطوں میں یا باغوں یا تالابوں کے کنارے بیٹھنے کی جگہ پانا مشکل تھا۔ ہر طرف رقص و موسیقی کا سلسلہ تھا۔

---

(1) فرشتہ، ص 112۔

(2) خیر المجالس، ص 43۔

(3) ایک شدید علالت سے پیغمبرؐ کی صحت یابی کے لیے اظہارِ تشکر کے طور پر یہ دن مسلمانوں میں ایک خوشی کا دن مانا جاتا ہے۔

دعوتوں کا خرچ ایک ٹنکہ ہوا کرتا، پھر وہ علاؤالدین کے عہد کی ارزانی کا ذکر کرتے اور کہتے۔

اس زمانہ میں کتنی ارزانی تھی۔ اس زمانہ میں کوئی بھی فقیر ایسا نہ تھا جس کے پاس (کم از کم) ایک روئی بھرا ہوا جامہ (لبا بچہ) نہ ہو۔ اور اس لبا بچہ کی قیمت کیا ہوتی؟ اگر موٹے سوتی کپڑے کا ہوتا تو ایک ٹنکہ، اور اگر لکیر دار سوتی کپڑے کا ہوتا تو 2 ٹنکہ 20 جتل۔ باہری جامہ، جاگمی کی قیمت 30 جتل اور اندر کے سلائی کے سوتی استر کی 12 جتل۔ روئی کی قیمت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے۔ ڈھنیہ اور درزی کی اجرت 6.7.4 جتلوں تک تھی۔ ان دنوں وہ لوگ ایک روئی سے بھرا ہوا سوتی جامہ ایک ٹنکے سے کم میں نہ سیتے (ملک) کافور مہردار روئی سے بھرے ہوئے سوتی جامے بنوا کر غریبوں میں تقسیم کیا کرتا تھا۔

علاؤالدین کی اس سلسلہ میں کامیابی کے وجوہات کے تجزیے میں برنی جزوی طور پر درست ہے[1]۔ بہت حد تک یہ کامیابی شہنشاہ کی ذات توجہ اور عنقریب اور اس کے احکام کی ایمانداری اور سخت گیری کی بنا پر تھی لیکن پہلی بات تو یہ (قابلِ غور ہے) کہ علاؤالدین نے محض حکومت کی طاقت کے سہارے پر قیمتوں کو کم نہ کیا اور نہ ہی وہ کم کر سکتا تھا۔ علاؤالدین کی سزاؤں کا ذکر کرتے وقت برنی خود اپنا متواتر لکھا ہوا یہ بیان بھی بھول جاتا ہے کہ علاؤالدین نے قیمتوں کا تعیّن اشیا کی تیاری پر خرچ شدہ رقم۔ محنت (نرخ بر آورد) کے مطابق کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے عملی کام نے اسے یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ انتظامی امور کے مانند معاشی معاملات میں وہ بذریعہ نگرانی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن براہِ راست اختیار کے امکانات محدود ہی ہو سکتے تھے۔ خصوصی طور پر غلّے کی پیداوار پر اس کا اختیار اس مختصر حصہ (marginal portion) تک ہی محدود تھا (جس کی قیمتوں یا فراہمی میں) جوڑ توڑ کر کے وہ مملکت کے شہروں اور قصبوں کے بازاروں میں استحکام قایم رکھ سکتا تھا اور خالصہ (علاقوں) کی پیداوار کے

---

(1) برنی) ص 312) لکھتا ہے کہ اس زمانہ کے دانشمند لوگ کہتے تھے کہ غلّے اور دیگر اشیاء کی قیمتوں کو قایم رہنے کے چار اسباب تھے (۱) سلطانی احکام کی سختی (۲) زائدگان (۳) لوگوں کے ہاتھوں میں سرمایہ کی کمی (۴) ایماندار اور سخت گیر افسر جو نہ رشوت لیتے تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

سرکاری حصے (جنس میں لگان) کے ذریعہ اسے وہ مطلوبہ مختصر حصہ دستیاب ہو جاتا۔ اگر وہ اس سے زیادہ (دخل دینے کی کوشش کرتا تو وہ ناکام رہتا۔ سرائے عدل میں بکنے والی سرکاری امداد پر فراہمی و فروخت کیے جانے والی کنٹرول کی ہوئی اشیاء کا انتظام کرنے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دینے کے علاوہ اس نے ہر شخص کو اس کا موقعہ دیا کہ وہ اپنی روزی کما سکے۔ شرط یہ تھی وہ ایماندارنہ طور پر کام کرے۔ قیمتوں میں گراوٹ سے اجرت کمانے والوں کو وقتی طور پر کچھ سہولت ملتی۔ کیونکہ اجرتیں اتنی تیز رفتاری سے نہ گرتیں جتنی کہ قیمتیں۔ ہمیں یہ فرض کر لینا ہوگا کہ علاؤالدین اس بات سے واقف تھا۔ اس کے (قایم کیے ہوئے) انتظام کا سب سے بڑا فائدہ تحفظ (Security) تھا۔ ہر شخص کو یہ معلوم ہوتا کہ اسے کیا اجرت ملے گی اور اس سے وہ کون سی اشیاء خرید سکتا تھا۔ المناک بات یہ تھی (اس سارے انتظام کی) ہر بات محض ایک فرد کی حیات و تندرستی پر مبنی تھی۔ یہ علاؤالدین کی طاقت سے باہر بات تھی کہ وہ خدا کی مخلوق کے لیے وہ تحفظ مہیا کر سکے جو خود اس کو نصیب نہ تھا۔

(بقیہ گزشتہ صفحہ)

اور نہ کسی کا خیال و لحاظ کرتے تھے۔ یہ دانشمند حضرات شاید معاشیات کی الف ب سے بھی ناواقف تھے۔ زائد لگان اور عوام کے ہاتھ میں قیمتی دھاتوں (سونا، چاندی کی کمی کا نتیجہ قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے جس کو کوئی سلطان یا اس کے افسر روک نہیں سکتے تھے لیکن کیا وہ خود بھی اس اصول نرخ بر آور کا مطلب صحیح طور پر سمجھتا تھا جس کو وہ بطور بنیادی اصول کے پیش کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص تاجروں کو ان کی قیمت و خرید (Purchase price) سے کم پر اشیا کو فروخت کرنے پر مجبور کرے اور کسانوں کے پاس اتنا غلہ و نقدی بھی نہ چھوڑے جس پر وہ سال بہ سال گزارہ کر سکیں تو دونوں ہی تباہ ہو جائیں گے اور اس کا نتیجہ قیمتوں میں ایک زبردست اضافہ ہوگا جس کو کسی قسم کی حکومتی طاقت روک نہیں سکتی ہے۔

5

علاؤالدین خلجی

آخری منگول حملے۔ مالوہ اور راجستھان

علی بیگ، ترتاق اور طرغی[1] کے حملے

برنی لکھتا ہے کہ، جب قیمتیں کم کر دی گئیں تو ایک مسلح سوار (مرتب) کو 234 ٹنکوں میں بھرتی کیا جا سکتا تھا۔ اور دو گھوڑے رکھنے والے سپاہی 78 (مزید) ٹنکوں میں سپاہیوں کو تیر اندازی اور اسلحہ حات کے اعتبار سے عرض یا معائنہ کے موقعہ پر جانچا جاتا اور فوج کی تنظیم مستقل طور پر کی گئی۔ منگولوں نے ہندستان میں اپنی قسمت۔ آزمائی صرف دو اور موسم سرما کی مہموں میں 6-1305ء اور 7-1306ء میں کیں۔ لیکن برنی کے حافظے نے یہ لکھتے وقت اس کا ساتھ نہ چھوڑا کہ "کئی ہزار منگولوں کو ان کی گردنوں میں رسی ڈال کر دہلی لایا گیا اور ان کو ہاتھیوں کے پیروں تلے ڈال دیا گیا اور ان کے سروں کو چبوترے اور منارے بنانے میں کام میں لایا گیا۔ میدان جنگ اور شہر دونوں ہی جگہوں میں منگولوں کی سڑی ہوئی لاشوں کی وجہ سے تعفن پھیل گیا"۔

1305ء میں علی بیگ، ترتاق اور طرغی تلواریں سونتے ہوئے ترکستان سے دریائے سندھ کی طرف کوچ کیا اور تیر کی مانند دریائے جہلم کو پار کیا، لیکن طرغی جو اس سے قبل دو مرتبہ اس ملک میں آچکا تھا، خوفزدہ تھا کہ اس کے سر کو نیزہ پر گھمایا جائے گا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پسپا ہو گیا۔[1] لیکن اعلا کمانڈر علی بیگ تھا جو چنگیز خاں کا ایک خلف تھا۔ اس نے اور ترتاق نے 50 ہزار سواروں کے ساتھ آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

---

(1) برنی، ص ص 20-319۔ خزائن الفتوح ص ص 41-37۔ فرشتہ ص 114۔ عصامی، ص ص 98-394۔ عصامی یہ غلطی کرتا ہے کہ وہ جنگ کا ہانسی سرساوا میں واقع ہونا بیان کرتا ہے جبکہ خسرو صاف لکھتا ہے کہ یہ ہندستان میں ہوئی اور برنی لکھتا ہے کہ یہ امروہہ ضلع میں ہوئی۔

نوٹ: برنی اور عصامی 'ترتاک' لکھتے ہیں، مگر [illegible] میں 'ترتاق' لکھا گیا ہے۔

ان کی عقل و ہوشیاری جس کے تحت انہوں نے یہ منصوبہ جنگ تیار کیا، کسی لحاظ سے قابل تعریف نہیں کہی جاسکتی۔ انہوں نے 'پہاڑوں کے دامن کے علاقے، سیوالک، کو تاراج کیا۔ آفت زدہ باشندے گنگا کے گھاٹوں کو پار کر کے بھاگے لیکن منگولوں نے ان کا تعاقب کیا اور "ہندستان کے شہروں میں (آتش زنی کر کے) دھواں پھیلا دیا" ملک نایک آخور بک میسر، جو سنام اور سامانہ کا گورنر تھا اور جس کو خسرو دربار کا ایک ہندو افسر[2] لکھتا ہے، شاید دیگر سرحدی افسروں کے ساتھ دہلی واپس ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی سرحدی افسر بھی، جو اس کے ساتھ پسپا ہو گئے تھے، منگولوں کو سرحدی قلعوں اور دہلی سے علاحدہ راستہ اختیار کر کے دوآب میں داخل ہوتا دیکھ کر یقیناً متعجب ہوئے ہوں گے۔ علاؤالدین نے بھانپ لیا کہ اس کی رعایا پر اتنی مصیبتیں ڈھانے کے بعد (اس مرتبہ) وہ لوگ بالکل اس کے پنجہ میں آگئے تھے۔ عصامی کے جمع کی ہوئی روایات کے مطابق، بہرام ایبہ، محمود سرتیہ، تکلی، تغلق، قرمشی، تولک اور قطا ان افسران میں سے تھے جو نایک کے ماتحت تھے۔ ہندو کمانڈر نے اپنے فرائض کو نہایت عمدہ طور پر انجام دیا۔ خسرو لکھتا ہے کہ "ایک علاقہ کو جو اتنا طویل تھا جتنا کہ ایک بے کار آدمی کا دن، فوج نے اس تیزی سے طے کر لیا جیسے کہ ایک مشغول آدمی کا دن گزرتا ہے، 20/ دسمبر 1305ء (جمعرات 10 جمادی الثانی 705ھ) کو امروہہ ضلع میں کسی جگہ پر اس کا مقابلہ منگولوں سے ہوا۔ منگولوں نے ایک یا دو کمزور سے حملے کیے جیسے کہ مچھروں کی ایک فوج تیز ہوا کے خلاف اڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے بعد تیز تلواروں نے اپنا کام شروع کیا اور "آگ کے رنگ کے چہرے" (سرخ، خون آلود) زمین پر گرنے لگی۔ علی بیگ اور ترتاق نے ہتھیار ڈال دیے اور شاید ان کے ساتھ ان

---

(1) خزائن الفتوح کا پیچیدہ طرز بیان قاری کے ذہن کو پریشان کر دیتا ہے۔ لیکن دول رانی میں خسرو لکھتا ہے کہ چونکہ وہ دین (اسلام) کو کافروں کے ہاتھوں نقصان پہنچانا چاہتا تھا اس لیے زمانے نے اس کا مقدر یہ بنا دیا کہ اس کی موت کافروں کے ہاتھوں ہو، خسرو کے دونوں بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ترکستان لوٹنے پر طرغی کی موت غیر مسلم منگولوں کے ہاتھوں ہوئی۔

(2) دول رانی ص 61۔ "ان دونوں ترکی خواتین کو دربار کے ایک ہندو افسر نے اچانک گرفتار کر لیا" بعض نسخوں میں 'نایک' کو 'مانک' بھی لکھا ہے۔

کے مرتبے کے مطابق سلوک کیا گیا۔ برنی لکھتا ہے کہ 20 ہزار گھوڑے، جو مقتول منگولوں کے تھے، دربار میں لائے گئے۔ علاؤالدین نے ایک شاندار دربار آراستہ کرایا کہ ملک نایب اور اس کے ساتھی افسروں اور جنگی قیدیوں کو وہاں پیش کیا جائے۔ تخت کو چبوترہ سبحانی پر نصب کیا گیا۔ اور شاہی فوج، دورویہ، وہاں سے اندرپرستھ تک کھڑی کی گئی۔ مجمع اتنا بڑھا تھا کہ ایک پیالہ پانی کی قیمت 20 جتیل اور نصف ٹنکہ ہو گئی۔ خسرو لکھتا ہے کہ ''ان دورنگوں کے قیدیوں 'سرخ اور سفید' کے متعلق یہ حکم تھا کہ بعض کو قتل کر دیا جائے اور بعض کو مقید کر دیا جائے۔ دونوں سرداروں کی جان بخش دی گئی۔ لیکن ان میں سے ایک بلا کسی قسم کی گزند پہنچائے ہی مر گیا اور دوسرے کے ساتھ کسی طرح کی چھیڑ نہ کی گئی۔[1]

کبک، اقبال، مدبر اور تائی بو کا حملہ

اگلے سال منگولوں نے علی بیگ اور ترتاق کی شکست کا بدلہ لینا چاہا۔ لیکن اس دفعہ ایک متحدہ فوج کے بجائے انہوں نے تین کمانڈروں کے تحت تین فوجیں بھیجیں۔ پہلی کی قیادت کبک نے کی، اور اقبال اور تائی بو اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ ''ایرانی ماہ دی (دسمبر) میں انہوں نے سندھ کے ریگستان میں (اپنی فوج کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے) دھول اُڑائی اور اس علاقہ کے باشندے اپنے اسباب چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لیکن چونکہ یہ بدخو (تیز) ہوا سنام اور کہرام میں (تباہی کی) گرد نہ اڑا سکی اس لیے یہ ناگور کے ویرانے کی جانب مڑ گئی اور اس ریگستان کے باشندوں کو اپنی لپیٹ میں لے

---

(1) خزائن الفتوح ص 41۔ لیکن عصامی کی جمع کردہ روایات کے مطابق علاؤالدین نے ان دونوں جنرلوں کو ضروری لوازمات کے ساتھ، جن میں ان دونوں کے لیے ایک ایک ہندستانی نژاد کنیز بھی شامل تھی، امیر کا درجہ دیا۔ لیکن دو مہینوں بعد ترتاق نے نشہ کے عالم میں یہ بکنا شروع کیا کہ اس کی فوج، اس کے گھوڑے، اس کے ترکش اور اس کی ٹوپی کا کیا ہوا۔ یہ خبر سن کر علاؤالدین نے اسے قتل کر دینے کا حکم دیا۔ علی بیگ کا بھی اس کے دل میں پوشیدہ شر کی بنا پر یہی حال ہوا (298)۔

برنی (321) کے مطابق علاؤالدین نے تمام قیدیوں کو ہاتھیوں کے پیروں تلے روند کر مار دیے جانے کا فوری حکم دیا۔ فرشتہ (15-114) لکھتا ہے کہ 88 ہزار منگولوں کے سر بری (شہر) کے مناروں کی تعمیر میں استعمال کیے گئے۔

لیا۔ علاؤالدین نے اپنی فوج کو (مختلف حصوں میں) تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور پوری فوج کو اپنے منظور نظر غلام افسر ملک عزالدین کافور سلطانی کی قیادت میں دے دیا۔ اس کی مدد، تغلق، مرہٹہ نژاد کافور اور عین الملک[1] جیسے افسران کر رہے تھے۔ اس کو یہ حکم ملا تھا کہ وہ تیزی کے ساتھ کوچ کرے اور تینوں منگول فوجوں کو یکے بعد دیگرے کچل دے۔ دہلی کی فوج واقعی صبح وشام کا خیال کیے بغیر تیزی سے روانہ ہوئی۔ آب عالی نامی ایک جگہ پر جو شاید کسی دریا یا تالاب (کے نزدیک واقع) ہو، مسلم فوج کی ایک کمزور لہر کبک (کی فوج) سے ٹکرائی اسے گھیر لیا گیا اور گرفتار کر لیا گیا اور اس کے تابعین یا مارے گئے یا اسیر ہوئے۔ لیکن ان میں سے کچھ بقیہ دو منگول فوجوں کی جانب بھاگے اور دہلی کی فوج نے ان کا تعاقب کیا۔ دونوں ہی دریا کی جانب بھاگے۔ وہ مال غنیمت حاصل کرنے آئے تھے لیکن اب انہوں نے اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھا کہ وہ اپنی جانیں بچا سکیں۔[2] دہلی کی فوج نے سرحد تک ان کا تعاقب کیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا ان کو گرفتار کر لیا اور قتل کر دیا گیا۔

کبک اور (دیگر) قیدی منگول دہلی لائے گئے۔ یہ حکم دیا گیا کہ ان میں سے کچھ کے خون اور ہڈیوں کو قلعہ اور منارے کی تعمیر میں کام میں لایا جائے بقیہ قروناؤں[3] کے سر کاٹ لیے گئے اور ان کے سروں کا اتنا بلند انبار جمع ہو گیا جو آسمان کو چھو لیتا، کبک کو کچھ دنوں تک قید میں رکھا گیا اور اسکے بعد قتل کر دیا گیا۔ منگولوں کا خطرہ ختم ہو گیا۔ 'منگولوں کا خوف دہلی اور اس کے اطراف سے غائب ہو گیا۔ مکمل طور پر امن وامان قایم ہو گیا۔ منگول جس راستہ سے آیا کرتے تھے وہاں کی رعیت اب اطمینان کے ساتھ

---

(1) برنی جو کہ (اس واقعہ کے) چالیس سالوں بعد لکھ رہا تھا، نے ان مہموں کوغ غلط ملط کر کے مختلف سالوں میں بیان کیا ہے۔ عصامی کی جمع کردہ روایات میں صرف کبک پر فتح کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن یہ جنگ اتنی اہم نہ تھی جتنا کہ اس نے سمجھا۔ وہ اقبال کا ذکر نہیں کرتا:- شاید اس وجہ سے کہ وہ فرار ہو گئے تھے۔ خزائن الفتوح جو اس واقعہ کے چھ سالوں بعد لکھی گئی تھی اس سلسلہ میں ہمارا مستند ترین ماخذ ہے۔ خسرو اس کا ذکر دول رانی میں بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے، اس کے بعد تین جنرل ہوا سے زیادہ تیزی کے ساتھ کوچ کرتے ہوئے ملتان آئے اور راوی کو پار کیا۔ ایک (کا نام) تائی بو تھا دوسرا اقبال اور تیسرا کبک کے سپاہی بالو کے ذروں کی طرح بے شمار تھے اور وہ ترتاق اور علی بیگ کے انتقام کے خواہاں تھے" (ص ص 62-61)

(2) عصامی، ص 311

کھیتی کر سکتی تھی۔[1] دیپال پور اور لاہور کا گورنر غازی ملک ہر سال جاڑوں میں اپنی فوج کے ساتھ سرحد تک جایا کرتا تھا۔ اور چراغ لیکر منگولوں کو ڈھونڈھا کرتا تھا۔ 'منگولوں کے ذکر کی زحمت بھی اب کسی کو گوارا نہ تھی، خضر خاں کے نام ایک افسر، بدر، کے خط کے مطابق جس کی نقل اعجاز خسروی میں موجود ہے، سلطان علاؤالدین (کے نام) کا خطبہ غزنی کی جامع مسجد میں پڑھا جاتا تھا۔

مالوہ کی فتح[1]

خسرو کے اس بیان کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ شمالی ہندستان کے، بڑے بڑے رایوں، نے 1305ء آتے تک علاؤالدین کی ماتحتی قبول کرنا ہی بہتر سمجھ لیا تھا۔ علاؤالدین (کی حکومت) کے معاشی معاملات اور محاصل سے متعلق امور اب بہت حد تک درست کیے جا چکے تھے۔ اور اس کی فوج کی از سر نو تنظیم کی جا چکی تھی۔ لہٰذا اب وہ اس حالت میں تھا کہ مالوہ، سوانہ اور جالور پر حملہ کر سکے۔

خسرو لکھتا ہے کہ مالوہ کا علاقہ اتنا وسیع تھا کہ ماہر جغرافیہ داں بھی اسکی سرحدوں کی حدبندی نہیں کر سکتے تھے۔ وزیر، کوکا پردھان، رائے مہک دیو سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس کے پاس 30 یا 40 ہزار سوار اور لا تعداد پا پیادہ سپاہی تھے۔ پھر بھی (محض) 10 ہزار (سپاہیوں) پر مشتمل دہلی کی فوج اسے شکست دینے میں کامیاب ہو گئی (دوران جنگ) اس کا گھوڑا دلدل میں پھنس گیا۔ اسے تیروں سے چھلنی کر دیا گیا اور اس کا سر کاٹ کر دہلی بھیج دیا گیا۔ ہمارے مآخذ یہ نہیں بتلاتے کہ دہلی کی اس فوج کی قیادت کس نے کی تھی۔ لیکن کوکا کی شکست کے بعد علاؤالدین نے اس علاقہ کا انتظام

---

(1) دول رانی، ص 62۔

(2) مرکزی ایشیا کی اس زمانے کی تاریخوں میں لفظ 'قراؤنا' کا استعمال منگولوں سے مختلف مگر ان سے منسلک ایک گروہ کے لیے کیا جاتا ہے۔ شاید وہ منگولوں اور ان گرفتار شدہ مسلم عورتوں کی اولاد تھے جو ان کے قبضہ میں تھیں۔

(3) برنی کے (اس) جملے (321) کی تشریح اسی منارہ سے ہوتی ہے۔ 'انہوں نے بدایوں دروازہ کے باہر منگولوں کے سروں کا ایک منارہ بنایا۔ یہ اب بھی موجود ہے اور لوگوں کو علاؤالدین کی یاد دلاتا ہے۔

(4) برنی، ص ص 23-322۔

اپنے ایک افسر عین الملک کے سپرد کیا اور اسے مانڈو کا قلعہ بھی تسخیر کرنے کا حکم دیا، جہاں رائے مہک دیو موجود تھا۔ عین الملک ایک انتظام کار اور "صاحب قلم" تھا۔ لیکن خسرو ہمیں اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ فوجی لحاظ سے بھی اسے شہرت حاصل تھی۔ اس نے اجین، دھار اور چندیری کو زیر کیا اور اس نے جو امن و امان قایم کیا وہ اتنا موثر تھا کہ تلوار نے اپنا کام ادا کرنے سے انکار کر دیا اور نیام میں واپس ہو گئی۔

'مانڈو کے قلعہ کا محیط (گھیرا) 4 فرسنگ ہے، پھر بھی چونکہ (ملحقہ) کھلا ہوا علاقہ دشمنوں کے ہاتھ میں تھا اس لیے مہک دیو کی صورت حال نازک تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کی ماتحتی میں ایک فوج بھیجی لیکن اس فوج کو شکست دی گئی اور اس کا بیٹا مارا گیا۔ اس کے بعد عین الملک نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ اس کی خوش قسمتی سے رائے کا ایک محافظ سپاہی اس سے مل گیا اور اس کی فوج کو ایک خفیہ راستے سے رات میں اس طور پر لے گیا کہ اس بات کی خبر رائے کو اس وقت ہوئی جبکہ دشمنوں کے تیر اس پر برسنے لگے۔ وہ چشمہ سار کی جانب بھاگا اور وہاں مارا گیا۔ 24/ دسمبر 1305ء (جمعرات 5/ جمادی الثانی 705ھ) کو قلعہ فتح کیا گیا۔

سوانہ کی فتح[1]

خزائن الفتوح میں جس کا مقصد علاؤالدین کی فتوحات کو شد و مد کے ساتھ پیش کرنا تھا، خسرو لکھتا ہے کہ دہلی سے 500 فرسنگ تک کے علاقے میں کوئی آزاد رائے باقی نہ بچا تھا۔ لیکن اپنی (تصنیف) دول رانی میں وہ اعتراف کرتا ہے کہ (شاہی) فوج سوانہ کا محاصرہ پانچ یا چھ سالوں سے کیے ہوئے تھی لیکن ایک نصف اینٹ کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔ سوانہ[2] کے رائے سیتل دیو کا قلعہ مضبوط تھا اور تمام راوت اور میوٗ اس کے مطیع تھے، خسرو کے اندازے کے مطابق سوانہ دہلی سے صرف 100 فرسنگ کے فاصلہ پر تھا۔ اس لیے سلطان کو بذات خود اس کے خلاف روانہ ہونے کی ضرورت پڑی۔ شاہی فوج دہلی سے 3/ جولائی 1309ء (بدھ 13/ محرم 708ھ) کو روانہ ہوئی۔

---

(1) خزائن الفتوح، ص ص 59-55، فرشتہ، ص 115، دول رانی ص 69۔

(2) دول رانی، ص 68، ایک ایرانی فرسنگ 3 1/2 سے لے کر 4 میلوں کے برابر ہوتا ہے۔

سلطان نے اپنا خیمہ قلعہ کے مشرق میں نصب کیا۔ فوج کا داہنا بازو قلعہ کے جنوب میں اور بایاں بازو شمال کی طرف خیمہ زن ہوا۔ منجنیقوں کو ملک کمال الدین گرگ کے ذمہ لگایا گیا۔ لیکن قلعہ کی فتح پاشیب کی تعمیر کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی۔ اور یہ کام سلطان کی آمد کے بہت قبل ہی شروع کیا گیا ہوگا۔ جب پاشیب تیار ہو گئی تو سلطان نے حملہ کا حکم دیا اور جنگ صبح سے رات تک جاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محصور جن کے لیے فرار ممکن نہ تھا۔ بعض سپاہیوں نے فصیل سے کود کر جالور کی جانب بھاگنے کی کوشش کی لیکن سلطان کی فوج کو اس کی خبر ہو گئی اور اس نے ان کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ تاریکی (ان دونوں کے درمیان) حائل ہو گئی۔ 9ر ستمبر 1309ء (سوموار، 22ر بیع الاول 708ھ) کو رائے کی تیروں سے چھلنی لاش سلطان کے سامنے لائی گئی اور اس کے زبردست قد و قامت کو دیکھ کر ہر شخص حیرت زدہ رہ گیا۔ مفتوحہ قلعہ اور علاقہ کمال الدین گرگ کی ذمہ داری میں دے دیا گیا۔

جالور کی فتح

علاؤالدین کی فوج نے جالور کی فتح یقیناً کی مگر اس کا کوئی ہم عصر بیان دستیاب نہیں۔ خسرو کے مطابق علاؤالدین نے کمال الدین کو (اس) علاقہ کے نافرمانبردار راؤں کو مطیع کرنے کا حکم دیا۔ اور تاریخ مبارک شاہی کا یہ بیان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ کمال الدین کے ہاتھوں جالور کی فتح اور رائے کا مارا جانا اسی (قمری) سال میں ہوا جبکہ ستیل دیو[1] (مارا گیا) چند سالوں کی غلطی سے قطع نظر راجپوت تذکرے بھی تقریباً یہی بیان پیش کرتے ہیں۔ مگر وہ جالور[2] کے رائے کنہر دیو کے خاندان کے متعلق کچھ تفصیلات بھی پیش کرتے ہیں۔

---

(1) خزائن الفتوح ص ص 72-68، دول رانی ص 69، عصامی ص ص 9-307 فرشتہ (ص 118) سوانہ کی فتح کے بیان کو وارنگل (کی فتح) سے خلط ملط کر دیتا ہے (جیسا کہ دول رانی میں اس کا بیان دیا گیا ہے) اور (اس معاملہ میں) قابل اعتماد نہیں۔

(2) سوانہ، جو دھپور سے 50 میل جنوب مغرب میں ایک شہر ہے (کے، ایس لال، خلجیز، ص 134)

(1) تاریخ مبارک شاہی، ص 78۔

(2) دیکھیے۔ ڈاکٹر کے۔ ایس۔ لال خلجیز، ص ص 39-135۔

ڈاکٹر کے ایس لال لکھتے ہیں کہ جالور کی فتح کے ساتھ راجپوتانہ کی تقریباً تمام اہم ریاستیں یکے بعد دیگرے زیر کی جاچکی تھیں۔ جیسلمیر، رنتھمبور، چتوڑ، سوانہ اور جالور اور ان سے ملحقہ مملکتیں - بندی، مندور اور ٹونک - سب ہی پر حملے ہو چکے تھے۔ ایسا اندازہ ملتا ہے کہ جودھپور (مارواڑ) بھی سلطنت کے ماتحت تھا۔ گرچہ علاؤالدین کے ہاتھوں اس کی فتح کا کوئی واضح حوالہ نہیں ملتا۔ لیکن (جودھپور) میں (واقع) پنڈوا کے ایک کتبہ مورخہ 1358 سمبت (1301ء) میں جوگنی پورا (دہلی) کے علاوہ (علاؤالدین) کا ذکر بحیثیت حاکم وقت کیا گیا ہے۔[1] ہم عصر مورخین صرف رنتھمبور اور سوانہ کا ذکر کرتے ہیں جن کی فتح سلطان کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے علاقوں اور قلعوں کی تسخیر اس کے افسروں کے ذمہ سونپی گئی ہوگی۔ اور ان کی صحیح تاریخ دستیاب کتبوں اور راجستھان کے بھاٹوں کے قصوں کے ایک محتاط تجزیے کی بنا پر ہی مرتب کی جاسکتی ہے۔

(باضابطہ) راجستھان پالیسی کا فقدان

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مملکت کے 'اندرونی' (Home) (باضابطہ طور پر زیر انتظام) صوبوں کے لیے علاؤالدین کی ایک واضح انتظامی اور معاشی پالیسی تھی۔ اگر ہندو روایات اس کے متقاضی تھیں کہ رایوں، راناؤں اور راوتوں کے عہدے وراثتی ہوں تو وہ ان میں دخل اندازی نہ کرے گا۔ لیکن وہ ہندو تاجر پیشہ ذاتوں کا تعاون حاصل کر سکتا تھا۔ اور اسکی حکومت بلہاروں، جو اپنے وطن میں کاشتکاروں کی سب سے نیچی ذات کا تھا، سے رابطہ قایم کر سکتی تھی۔ اس بات پر نگاہ رکھ سکتی تھی کہ بلہار پر بھی منصنفانہ اور مساوی طور پر ٹیک عائد عاید کیا جائے۔ دکن اور اس کے آگے جنوبی چار ریاستوں کے متعلق بھی اس کی ایک واضح پالیسی تھی۔ ان کی قدیم دولت کو لوٹنا تھا اور انہیں ایک سالانہ خراج دینے پر مجبور کرنا تھا۔ لیکن ان کے انتظامی امور میں مداخلت نہ کرنی تھی۔ اور ان کی زمین کا ایک بسوہ بھی (سلطنت میں) شامل نہ کرنا تھا۔ لیکن نہ تو علاؤالدین کے افعال سے اور نہ اس کے مورخین کے تبصروں سے ہمیں کسی ایک

---

(1) ایضاً، ص 139۔

واضح راجپوت پالیسی کا کوئی اندازہ نہیں ملتا۔ وہ کسی ایسے رائے کو گوارا کرنے کو تیار نہ تھا جو دہلی کی بالادستی کو بے چوں اور چرا قبول نہ کرتا ہو اور وہ شاہراہوں کی مناسب حفاظت پر بھی زور دیتا تھا۔ لیکن اسکے علاوہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ راجستھان کو ختم کرنے کے منصوبہ پر محض کبھی کبھی ہی کوشش کی گئی۔ اور (بالآخر) اسے ناقابلِ عمل سمجھ کر ترک کر دیا گیا۔ رنتھمبور اور جھائن کا علاقہ ضم کر لیا گیا۔ اور اسے معاشی ضابطوں کے دائرہ عمل کے اندر لایا گیا۔ لیکن چتوڑ کے تین ہزار راؤتوں کا قتل بے سود ثابت ہوا اور راجستھان کے دیگر حصوں کو شاہی ضوابط کے تحت لانے کی کوشش نہ کی گئی۔ راجستھان کے تین بڑے قلعوں کی فتح میں زبردست جانی نقصان ہوا تھا اور (اسکے عوض) کوئی قابل قدر دولت حاصل نہ ہوئی تھی۔

اگر کوئی رائے اس کے دربار میں حاضر ہوتا اور وقتی طور پر اس کے ایک اعلا افسر کی طرح کا رویہ اختیار کرتا تو علاؤالدین اس کے پیش کردہ تحفوں سے مطمئن ہو جاتا۔ اگر سلطان کو کسی زیر کردہ رائے کے علاقہ میں اپنا افسر مقرر کرنے کی ضرورت بھی ہوئی تو راجستھان کی سماجی تنظیم میں مداخلت نہ کی گئی۔ بنیادی طور پر اقتدار راوت ہی کے ہاتھوں میں تھا اور اس خراج کے علاوہ جو اس کے افسران جمع کر سکتے علاؤالدین نے راوتوں کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی۔ حالات کے تحت اس سے زیادہ کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ اور آخر میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ علاؤالدین کے دور حکومت میں راجستھان (کا علاقہ) اتنا اہم نہ تھا جتنا کہ یہ بعد میں ہو گیا۔ قریبی طور پر متحد ایک راجپوت برادری کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ راجستھان کے رایوں کے درمیان متواتر جنگوں نے علاؤالدین کے خلاف کسی طرح کے اتحاد یا اس کے ساتھ ایک مشترکہ تعاون کو ناممکن بنا دیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے رایوں کے درمیان منقسم مملکتوں پر مشتمل راجستھان دکھن کی دولت مند ریاستوں کے آگے بالکل ماند پڑ جاتا تھا۔

ضیاالدین برنی، جو کہ عمومی طور پر (علاؤالدین کی پالیسیوں کا) نکتہ چیں ہے، راجستھان کی فتح کے بعد علاؤالدین کی مملکت کا مندرجہ ذیل بیان پیش کرتا ہے[1] سلطنت کے صوبے، ہر چہار سمت، قابل اعتماد ملکوں اور وفادار افسروں کے ذمہ لگائے

---

(1) برنی، ص ص 323-24۔

جا چکے تھے۔ باغیوں اور مخالفوں کو دبایا جا چکا تھا۔ رعیتوں کے دل سلطان کو پیمائش (کے اصول) کی بنیاد پر لگان (خراج) ادا کرنے، اور کرہی (گھرہی) اور چرائی (ٹیکس) دینے پر رضامند ہو چکے تھے۔ بغاوت کا احمقانہ خیال اور غلط قسم کے حوصلے لوگوں کے دماغوں سے نکل گئے تھے اور امراء اور عوام اطمینان کے ساتھ اپنے کاموں اور کھیتی باڑی میں لگ گئے۔ رنتھمبور، چتوڑ، منڈل گڑھ، دھار، اجین، مانڈو، علائی پور، چندیری، ایرج، سوانہ اور جالور، جہاں حکومت کمزور تھی، کو طاقتور گورنروں (والیان اور مقطعان) کے ذریعہ قابوں میں لایا گیا۔ مندرجہ ذیل صوبوں کا کارگزار گورنروں کی تقرری کر کے مستحکم بنایا گیا۔

1- گجرات-الپ خاں
2- ملتان اور میوستان- تاج الملک کافوری
3- دیپال پور اور لاہور- غازی ملک تغلق
4- سامانہ اور سنام- ملک نایک اخور بک میسرہ
5- دھار اور اجین- عین الملک ملتانی
6- جھائن- فخر الملک میرٹھی
7- چتوڑ- ملک ابو محمد
8- چندیری اور ایرج- ملک تمر
9- اودھ- ملک تیگین
11- کڑا- ملک ناصر الدین سوتلیہ

مزید یہ کہ کوئل (علیگڑھ) برن (بلند شہر)، میرٹھ، امروہہ، افغان پور، کبر اور (درحقیقت) پورے دوآب (علاقہ) کو اس طرح مطیع و فرمانبردار کر لیا گیا جیسے کہ وہ ایک واحد گاؤں ہو۔ اس (علاقے) کو خالصہ میں شامل کر لیا گیا اور (اس کی آمدنی) کو سپاہیوں کی نقد تنخواہ کی ادائیگی کے لیے صرف کیا گیا۔ (سلطنت کی) پوری نقدی آمدنی خزانوں میں داخل کی جاتی اور سپاہیوں کی نقد تنخواہ کی ادائیگی اور کارخانوں کے

---

(۱) برنی اس واقعہ کو بہت عرصہ بعد لکھ رہا تھا۔ ممکن ہے کہ ملک ابو محمد چتوڑ میں سلطان کی جانب سے ریزیڈنٹ کی حیثیت سے ہو۔

اخراجات (کی ادائیگی) میں صرف ہوتی۔

اسماعیلی بوہروں کی سرزنش

جیسا کہ قبل وضاحت کی جاچکی ہے، اسلامی راسخ العقیدگی کی ایک ناخوشگوار خصوصیت اسماعیلی اقلیت کی تعذیب تھی۔ ان پر خفیہ مجلسوں میں محرمات کے ساتھ مباشرت کا غلط الزام لگایا جاتا تھا۔ برنی[2] انہیں 'اباحیتان' (محرمات کے ساتھ مباشرت کرنے والے لوگ) کہتا ہے لیکن عصامی صاف لکھتا ہے کہ اس گروہ کو ہندی زبان میں بوہرا کہتے ہیں[3]۔ 1311ء سے کچھ قبل سلطان نے ان کے متعلق تفتیش کا حکم دیا تھا۔ ہمیں اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیۓ کہ چونکہ تفتیش ان پر الزام عائد کرنے والوں ہی کے ذریعہ ہوئی تھی۔ راسخ العقیدہ علما۔ لہٰذا ناجائز مباشرت کا الزام ثابت ہوگیا اور علاؤالدین نے مجرموں (کے جسموں) عارہ سے دو حصوں میں کٹوانے کا حکم دیا۔[4]

---

(1) یہاں پر دو آب کا مطلب جمنا اور گنگا کے درمیان کا سارا علاقہ نہ سمجھنا چاہیۓ۔ بلکہ صرف وہ حصہ جسے مسٹر مورلینڈ نے 'River Country' کہا ہے یہ گنگا اور جمنا کے درمیان واقع تھا اور شمال کی جانب یہ ذیلی پہاڑی سلسلے کے جنگلات تک پھیلا ہوا تھا۔ لیکن جنوب کی سمت یہ علی گڑھ سے زیادہ آگے کو نہ جاتا تھا۔ تیرھویں صدی کے دوران یہ علاقہ تین صوبوں میں منقسم تھا، میرٹھ، برن اور کوئل۔ لیکن علاؤالدین نے اس کو بھی دہلی کے علاقہ کی مانند وزارت لگان کی براہ راست نگرانی میں شامل کر لیا تھا۔ (ایگریرین سسٹم، ص 231) یہ بات پائی جائے گی کہ برنی کے مندرج کو وہ تمام شہر اس محدود معنی میں دو آب کے حصہ ہیں۔

(2) برنی (ص 336) انہیں اباحیتان اور بودھکان لکھتا ہے، موخر الذکر شاید بورگان ہے، جس کی غلط ہجے کی وجہ سے یہ شکل ہوگئی ہے۔

(3) عصامی، ص 293۔

(4) خزائن الفتوح ص 20۔ یہ افسوس ناک ہے کہ ہم خسرو کو یہ الزام عائد کرتے ہوئے اور اس سزا پر خوش ہوتا ہوا پاتے ہیں۔ لیکن وہ حکومت کی پالیسیوں کو حق بجانب دکھانے کے لیے ایک کتاب لکھ رہا تھا اور اس معاملہ میں اسے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ کس طرح جادوگروں کو ان کی گردنوں تک زمین میں دفن کرکے سنگسار کیا گیا۔

6

علاؤالدین خلجی

دکن اور مزید جنوبی علاقہ

بگلانہ کی فتح: دیوگری[1] پر دوسرا حملہ

عصامی کی جمع کی ہوئی زبانی روایات کے مطابق 1297ء میں ملتان کی فتح کے بعد الپ خاں اس کا پہلا گورنر مقرر ہوا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ملک قرابیگ (جس کا ذاتی نام احمد جھیتم تھا) کو رائے کرن کو انہلوارا سے دوبارہ، نکال باہر کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ 1299ء میں نصرت خاں اور الغ خاں کی واپسی کے بعد کرن نے انہلوارا پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ جب قرابیگ انہلوارا سے چار فرسنگ کے فاصلہ پر تھا تو اس نے رات بھر کوچ جاری رکھا اور صبح میں شہر پر حملہ کر دیا۔ کرن پھر بگلانہ کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد قرابیگ کو دہلی بلایا گیا۔ اور گجرات کی گورنری الپ خاں کو سونپی گئی۔ الپ خاں کی حکومت مقبول رہی۔ کم از کم حکمراں طبقہ کے درمیان عصامی لکھتا ہے کہ اگر کوئی سردار اسے نظر انداز کرتا تو الپ خاں فوراً اس کے علاقہ پر حملہ کر دیتا۔ تمام جنگجو اس کے ہاتھوں میں موم جیسے ہو جاتے۔ اس نے اس خطہ میں اسلام کی عظمت کا اس طرح مظاہرہ کیا جس طرح موسم بہار چمن کی خوبصورتی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ منگولوں نے تھار ریگستان کی جانب سے گجرات کی جانب پیش قدمی کی کوشش کی لیکن ان کو الپ خاں نے غازی ملک، جو سلطان کے حکم کے مطابق وہاں پہنچ گیا تھا، کی مدد سے شکست دی۔ اس مہم میں منگولوں نے شاید بود و باش اختیار کرنے کے خیال سے اپنی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لائے تھے۔ لیکن ہندستانی فوج نے حملہ آوروں کی فوج کا راستہ روکنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اور انھیں ایک زبردست شکست ہوئی۔

---

(1) خزائن الفتوح ص ص 64-68، برنی، ص ص 156-57، فرشتہ جلد اوّل ص ص 116-18 عصامی ص ص 273-81۔

ہندستانی قیدیوں کو رہا کیا گیا اور اٹھارہ ہزار منگول گھوڑا سوار اور تین ہزار گھوڑا سوار خواتین گرفتار کی گئیں۔ اور ان کو دہلی بھیج دیا گیا۔

7-1307ء کے لیے علاؤالدین نے دو جنوبی مہم کا منصوبہ بنایا۔ الپ خاں کو رائے کرن کو بگلانہ پہاڑیوں سے نکال باہر کرنے کا حکم دیا گیا۔ رائے نے اپنی سرزمین کی دو مہینوں تک سخت مدافعت کی۔ تب الپ خاں نے اپنے افسران کی ایک میٹنگ بلائی اور انھوں نے فتح یا موت کا فیصلہ کیا۔ رائے کرن کو شکست دی گئی اور وہ فرار ہو گیا۔ الپ خاں نے اس کا تعاقب دیوگیری سے ایک دن کی مسافت کی حد تک کیا اور اس کے بعد رائے اس تصور کی طرح غائب ہو گیا جس کو دوبارہ گرفت میں نہیں لایا جا سکے، بعد میں یہ پتہ چلا کہ اس نے وارنگل میں پناہ لی تھی۔

دوسری مہم دیوگیری کے رائے رام چندر دیو کے خلاف تھی جس نے تین یا چار سالوں سے اپنا خراج ادا نہیں کیا تھا۔ اس مہم کو صحیح طور پر سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم یہ قبول نہ کر لیں کہ عصامی کے اس بیان میں کسی حد تک صداقت ہے کہ رام دیو نے علاؤالدین کو ایک خفیہ پیغام یہ بھیجا تھا کہ وہ اس معاملہ میں مجبور ہے چونکہ اس کا بیٹا بھلامہ اور مملکت کے تمام (سربرآوردہ) لوگ سلطان کے وفادار باقی نہ رہے تھے۔ رام دیو کا ذاتی رویہ بالکل نہ بدلا تھا" جب امتداد زمانہ میری راکھ کو بھی منتشر کر دے گا اس وقت بھی میری روح اس سوگند کو یاد رکھے گی جو اس نے لی تھی۔ (اس کا) مشورہ یہ تھا کہ دہلی سے ایک فوج بھیجی جائے۔

علاؤالدین کو ایک افسر زیادہ بہتر یہ ہوتا کہ ایک غلام افسر کی ضرورت تھی تاکہ وہ علاحدگی ان دونوں کے درمیان حائل نہ ہوتی جو بادشاہی نظام میں (بادشاہ اور اس کے ماتحت افراد میں) ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس نے ملک شاہین کا انتخاب کیا تھا لیکن جب وہ چتوڑ سے فرار ہو گیا تو علاؤالدین نے اس کی جگہ ملک کافور کو دے دی۔ یہ ضروری تھا کہ علاؤالدین کا منظور نظر (منتخب شدہ) افسر ایک ایسا شخص ہو جس کی صلاحیت اور جوہر پر حرف لانا ممکن نہ ہو۔ کافور نے کبک کے خلاف مہم میں کارنمایاں انجام دیے تھے۔ اب علاؤالدین نے تیس ہزار سواروں، جن کو دیوگیری کی مہم کے لیے تیار کیا گیا تھا، کی قیادت اس کے حوالے کی۔ فرشتہ کے مطابق علاؤالدین نے

کافور کو تمام دیگر افسران سے بلند درجہ عطا کرنے کے لیے واضح اقدام کیے۔ شاہی چھتر اور شاہی خیمہ اس کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ افسروں کو ہدایت کی گئی کہ روزانہ اس کی خدمت میں حاضر ہوں اور اس سے ہدایت حاصل کریں۔ فوج کی فوری ذمہ داری سراج الدین خواجہ حاجی، وزیر جنگ، کے حوالہ کی گئی، جو ایک باصلاحیت اور محنتی شخص تھا لیکن جو (دوسروں کی) ہدایات کے مطابق کام کرنے کا عادی تھا۔ عین الملک ملتانی اور الپ خاں کو ہدایات روانہ کی گئیں کہ وہ کافور کی ہر ممکن مدد کریں اور اسے شکایات کا کوئی موقعہ نہ دیں۔[1]

خزائن الفتوح ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سلطان نے یہ حکم دیا تھا کہ رائے اور اس کے خاندان کے افراد کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے اور ظاہر ہے کہ اس حکم پر عمل کیا گیا ہوگا۔ کافور نے فوج کو حسبِ معمول (دہلی سے) پہلی منزل، تلپت، میں اکٹھا کیا اور تب دھار کے راستے دیوگیری کو کوچ کیا اور سگون گھاٹی کے ذریعہ وہاں پہنچا۔ خسرو کے مطابق دیوگیری کی فوج نے معمول مزاحمت کی اور اس کے بعد دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ رام دیو نے ہتھیار ڈال دیے مگر اس کا بیٹا فوج کے ایک حصہ کے ساتھ فرار ہو گیا۔ فرار شدہ فوج کا ساز و سامان حکومت اور فاتح سپاہیوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ لیکن کافور لکھتا ہے کہ "جب کافور دکن میں داخل ہوا تو اس نے باشندوں کو اپنی مشفقانہ حفاظت میں لے لیا اور ایک چیونٹی کو بھی ضرر نہ پہنچنے دیا۔[2]" وہ مزید لکھتا ہے کہ رام دیو نے مزاحمت کو لا حاصل پایا۔ اس لیے وہ اپنے سب سے بڑے لڑکے، سنگھانا، کو دیوگیری چھوڑ کر ملک کافور سے ملنے باہر آیا۔ کافور اسے دہلی لے گیا اور دورانِ راہ اس نے کافور کا دل بالکل موہ لیا۔ جب وہ دربار میں داخل ہوا تو علاؤالدین نے رام دیو کے سر پر موتی اور جواہرات نثار کرایا اور اس کو اپنے مہمان کے بطور دہلی میں چھ مہینے رکھا۔ خسرو لکھتا ہے کہ "ہر روز اس کی قدر افزائی بڑھتی جاتی اور اس کے رتبہ میں اضافہ ہوتا جاتا۔ یہاں تک کہ ہلال کے مانند، مناسب مدت میں اس کا دائرہ ترقی ماہ کامل کی طرح بالکل

---

(1) فرشتہ دو ضائع شدہ ایسے مآخذ کا حوالہ دیتا ہے جو اب ضائع ہو چکے ہیں۔ عین الدین بیجاپوری کی ملحقات اور قاضی احمد غفاری کی نسخہ جہاں آرا۔ اس کے بیان کی تصدیق مشکل ہے۔ لیکن اس کو اسی حد تک قبول کیا گیا ہے جہاں تک یہ ہمعصر مآخذ کے مطابق ہے۔

منور ہو گیا"۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ "رام دیو کی جو عزت افزائی کی گئی وہ ایسی تھی کہ دربار کے لوگ اس میں اور سلطان میں کوئی فرق نہیں کر سکتے تھے" وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ سب کچھ مخصوص حکمت عملی کے تحت نہیں کیا گیا۔ علاؤالدین کو اس بات کا احساس تھا کہ اس کی بادشاہت دیوگیری سے حاصل شدہ دولت کی وجہ سے (قایم ہوئی) تھی۔ بالآخر رام دیو کو ایک لاکھ 2 ٹنکہ پیش کیا گیا۔[3]" اور ایک شفق رنگ کے شامیانہ (کے استعمال) کی خصوصی رعایت کے ساتھ رائے رایاں کا خطاب عطا کیا گیا اور واپس جانے کی اجازت دے دی گئی"۔ گجرات کا نوساری کا علاقہ انعام کے طور پر اس کو تفویض ہوا۔ شاید اسی حاضری کے دوران اس نے اپنی بیٹی جھتیاپالی کی شادی علاؤالدین سے کر دی۔

دَول رانی

اس مشہور مثنوی کو قلم بند کرنے میں خسرو نے تاریخی واقعات کو ٹھیس نہیں لگائی لیکن بعد کے مصنفین کی غلطیوں کے لیے وہ ذمہ دار نہیں۔ گجرات کے پہلے حملہ کے دوران علاؤالدین کے افسروں نے رائے کرن کے حرم کے کچھ افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ قیدیوں میں سے ایک کملادیوی تھی جو رائے کی بیویوں میں سے ایک تھی۔ اس خاتون کی پریشانی اس وقت کچھ کم ہوئی جب اسے معلوم ہوا کہ وہ شاہی حرم میں داخل کی جائے گی۔ خود کو ان تبدیل شدہ حالات کے مطابق بنا کر اس نے اپنی خوبصورتی اور پرخلوص خدمات سے سلطان کا دل جیت لیا۔ 7-1306ء کے دوران کسی موقعہ پر سلطان کی طبیعت کو موزوں پا کر اس نے ایک گزارش کی رائے کرن سے اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے پہلی مر چکی تھی۔ لیکن دوسری کی عمر اس وقت چھ سال کی تھی جب وہ دہلی کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ کیا سلطان کی مہربانی کے ذریعہ اسے اس کی بیٹی، دول رانی مل سکتی تھی؟ علاؤالدین نے رائے کرن کو حکم بھیجا کہ سات یا آٹھ

---

(2) عصامی یہ لکھنے میں درست نہیں ہو سکتا کہ دیوگیری شہر کو دوبارہ لوٹا گیا۔ یہ علاؤالدین کی پالیسی کا ایک عنصر تھا کہ رائے اور عوام دونوں ہی کی خوشنودی حاصل کی جائے۔

(3) عصامی دو لاکھ کے سونے کے ٹنکے لکھتا ہے۔

سال کی یہ لڑکی فوراً بھیج دی جائے۔

خسرو کے اس بیان سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ کرن اس کی حکم کو پا کر بے حد خوش ہوا۔ لیکن وہ اس پر عمل کرنے کو تیار تھا۔ کیونکہ اس کا مطلب دہلی سے مصالحت اور اس کی پہلے سے مختصر سلطنت کی محافظت تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ دول رانی روانہ ہو سکے۔ علاؤالدین کی پالیسی بدل گئی اس نے بگلانہ کو ضم کر لینے اور دول رانی کو بزور گرفتار کر لینے کا حکم دیا۔ رام دیو کا بڑا لڑکا سنگھانا، دول رانی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر چونکہ بگھیلا اپنی ذات کو یادو (کی ذات) سے اونچا سمجھتے تھے اس لیے کرن کو یہ رشتہ قبول کرنے میں تامل تھا لیکن جب کرن مہاراشٹر میں ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے تھا تو سنگھانا نے اپنی درخواست دہرائی۔ اور اپنے چھوٹے بھائی بھلانہ کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھیجا تاکہ لڑکی کو لے آئیں۔ کرن جس کا تعاقب اس وقت الپ خاں کر رہا تھا اس حالت میں نہ تھا کہ انکار کر سکے اور لڑکی حوالہ کر دی۔ لیکن دیوگیری سے صرف ایک ہی فرسنگ کے فاصلہ پر بھلانہ کی مڈ بھیڑ الپ خاں کی فوج کے ایک دستہ سے ہو گئی جس کی قیادت دلاور پنچمی کر رہا تھا۔ اور جو جنگ اس کے بعد ہوئی اس کے دوران دول رانی کا گھوڑا ایک تیر سے زخمی ہو گیا اور آگے نہ بڑھ سکا۔ دلاور نے اس کی لگام پکڑ لی اور اسے الپ خاں کے پاس لے گیا جس نے "اسے اپنی بچی کے مانند رکھا"۔ اور اس

---

(1) فرشتہ، جس نے دول رانی پڑھی تھی اور جو اپنے قارئین کو بھی اس کتاب کے متعلق سفارش کرتا ہے۔ اس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ سنگھانا نے اپنے بھائی بھلانہ کو اپنے باپ کی اجازت کے بغیر بھیجا تھا۔ جب الپ خاں کرن کو نہ پا سکا تو وہ ایک دریا کے کنارے کی سمت چلا گیا تاکہ دو دنوں تک آرام کر سکے۔ اس کے تین یا چار سو آدمیوں نے مشہو ایلورا کے غاروں کو دیکھنے کے لیے اس کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اپنے سفر کے دوران انہوں نے ایک مرہٹہ فوج کو دیکھا۔ اور اسے ایک مخالف فوج سمجھ کر وہ لڑنے لگا۔ لیکن درحقیقت یہ بھلانہ (کی فوج تھی) جو دول رانی کو لے جا رہی تھی۔ جب اس کا گھوڑا زخمی ہو گیا تو اس کی ایک خادمہ چلا اٹھی 'یہ دول رانی ہے' اس کی عزت لحاظ رکھو۔ وہ فوراً الپ خاں کے پاس لے جائے گئی

(2) خزائن الفتوح ص ص 116-73، عصامی ص ص 83-281، برنی 63-157 پروفیسر حبیب خزائن کا الفتوح کا ترجمہ (علاؤالدین کی مہمیں) ص 28-21، سابقہ پروفیسر کرشنا سوامی اینگر کا لکھا ہوا اس کتاب کا دیباچہ، جس میں انہوں نے ملک کافور کے راستہ کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے، فرشتہ ص ص 63-151، ڈاکٹر کے۔ ایس۔ لال خلجیز ص ص 200-193۔ ہوڈی والا، ص ص 55-251۔

کے بعد اسے دہلی بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام واقعات ملک کافور کے حملہ کے قبل ہو چکے تھے۔ الپ خاں گجرات واپس چلا گیا۔ دیوگیری کے متعلق اسے کسی قسم کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔[1]

وارنگل کی مہم

جنوبی علاقوں میں ملک کافور کی مہموں کے لیے ہمارا سب سے مستند بیان امیر خسرو کی خزائین الفتوح ہے لیکن اگرچہ یہ تصنیف ایک ادبی شہ پارے کی حیثیت سے صدیوں سے موجود ہے اس کی تاریخی اہمیت پر سر سید احمد خاں اور سر ہنری ایلیٹ نے روشنی ڈالی۔ عہد وسطی کے زیادہ تر فارسی مورخین اس کے متعلق ناواقف تھے اور انہوں نے برنی کی نقل کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ برنی نے واقعات کے بہت بعد (اپنی تاریخ) لکھی۔ دکن کی جغرافیہ کے متعلق اس کی معلومات بہت غلط تھیں اور دو اہم معاملات میں اس کی یادداشت نے اس کو دھوکہ دیا۔ اور اس کی غلطیوں کو ان تمام مورخین نے دہرایا ہے جنہوں نے اس پر انحصار کیا ہے۔ ملک کافور وارنگل جاتے ہوئے دیوگیری نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ جب کافور معبر جاتے ہوئے وہاں گیا تو رام دیو کی موت نہیں ہوئی تھی۔ وہ زندہ تھا اس نے کافور اور اس کے سپاہیوں کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔

لیکن برنی کے دو بیانات ہیں، جو غور طلب ہیں، اس وقت تک ملک کافور نے اپنی دھاک جمالی تھی اور جو فوج وارنگل بھیجی جانے والی تھی اس کی قیادت علاؤالدین نے تفصیلی ہدایات کے ساتھ اس کے حوالہ کی۔ ان (ہدایات) کو مختصر یوں بیان کیا جا سکتا ہے:-

تم ایک دور دراز ملک کو جا رہے ہو۔ وہاں بہت دنوں تک رکنا نہیں۔ وارنگل کو

---

(1) قرآنی حکم کے مطابق اللہ اور اس کا رسول مال غنیمت 1/5 حصے کے حقدار تھے اور (بقیہ) 4/5 سپاہیوں کو ملتا۔ لیکن یہ قانون رضاکاروں کے لیے تھا نہ کہ باضابطہ بھرتی سپاہیوں کے لیے، جن کو جنگ و امن دونوں ہی حالتوں میں تنخواہ ملتی تھی۔ دہلی سلطنت کی روایات کے مطابق تمام قیمتی چیزیں- جواہرات، سونا، چاندی، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ بلاشرکت غیر ریاست کی املاک ہوتے۔ بقیہ کا 1/5 حصہ - غلام، غلے، مویشی وغیرہ سپاہیوں کے حصے میں جاتے۔

فتح کرنے اور رائے رودر دیو کو اکھاڑ پھینکنے کی تم ہر ممکن کوشش کرنا۔ لیکن اگر رائے اپنے خزانے، ہاتھی اور گھوڑے حوالے کردے اور آئندہ خراج (دینے) کا وعدہ کرے تو یہ انتظام قبول کرلو اور (محض) اپنی نام آوری کی خاطر اس پر مصر مت ہونا کہ رائے خود کو تمہارے آگے حاضر کرے یا یہ کہ تم اس کو دہلی اپنے ساتھ لاؤ ملکوں اور امرا کے ساتھ مناسب طور پر پیش آنا اور بڑے بڑے کمانڈروں کی عزت و حشمت کا خیال رکھنا۔ خواجہ حاجی اور بڑے بڑے امراء کے مشورے کے بغیر کوئی کام شروع نہ کرنا۔ سپاہیوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا۔ بلا ضرورت سختی اور ظلم نہ ہونا چاہیے۔ کسی ایسے کام کے مرتکب نہ ہونا جس کی وجہ سے پریشانی پیش آئے۔ فوج میں چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور خیانتوں کو نظر انداز کرنا۔ افسروں کی تمام اچھی اور بری باتوں سے خود کو واقف رکھنا۔ امراء کو (آپس میں) ملنے جلنے یا ایک دوسرے کے خیموں میں جانے سے منع کرو۔ مزید یہ کہ امراء کے ساتھ اپنے سلوک میں اتنا نرم نہ ہو جاؤ کہ وہ نڈر اور نافرمان بن جائیں اور نہ اتنے سخت ہو جاؤ کہ وہ تمہارے دشمن بن جائیں اور تم سے نفرت کرنے لگیں۔ سونے اور چاندی کے علاوہ مال غنیمت[1] کا خمس وصولنے میں سختی نہ کرو اور اگر کوئی امیر ان غلاموں اور گھوڑوں کو رکھنا چاہے جو اس نے گرفتار کیے تھے تو انہیں اس کے پاس رہنے دو۔ اگر کوئی ملک یا امیر اپنے سپاہیوں کے لیے قرض لینا چاہے تو اسے وہ روپے دے دو اور رسید لے لو۔ اگر کوئی گھوڑا۔ خواہ وہ کسی افسر کا سپاہی ہو، چوری ہو جائے یا جنگ میں مارا جائے یا کسی اور وجہ سے نقصان ہو جائے تو اسے شاہی اصطبل سے ایک بہتر گھوڑا دو لیکن خواجہ حاجی کو حکم دو کہ اس طرح سے ضائع ہونے والے تمام گھوڑوں کا حساب اپنے آفس میں رکھے۔ چوں کہ یہ حکومتی کاموں کے لحاظ سے ضروری ہے۔[2]

سرکاری خبروں کو تیزی سے (دہلی) پہنچانے کے لیے علاؤ الدین نے جو

---

(1) برنی، ص ص 327-28۔

(2) برنی، ص ص 330-31۔ چوں کہ فوج کے ساتھ وارنگل میں قرابیگ بھی تھا اس لیے ہم برنی کا یہ بیان قبول نہیں کرسکتے کہ اُسے (قرابیگ) اور بیانہ کے قاضی مغیث الدین کو سلطان نے شیخ نظام اولیاء کے پاس حالات دریافت کرنے کو بھیجا تھا۔ چونکہ چالیس دنوں سے فوج کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔

انتظامات کیے برنی ان کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جب علاؤالدین کسی مہم پر فوج کو روانہ کرتا تو اس کا قاعدہ تھا کہ تلپت سے ہی، جو پہلی منزل تھی، تھانے قایم کرتا۔ ان تھانوں کا سلسلہ اس جگہ تک جاتا جہاں فوج برسرپیکار ہوتی یا اس جگہ تک جہاں تک تھانے قایم کیے جاسکتے تھے ہر منزل پر تیز رو گھوڑے رکھے جاتے تھے اور پورے راستہ پر ہر نصف کروہ یا ایک کروہ کے چھٹے حصہ پر (دانگ کروہ) پیادے (دھاوے) مقرر ہوتے (تاکہ اگلے آدمی تک ڈاک لے جاسکے) راستہ میں واقع ہر شہر میں اور جہاں گھوڑے رکھے جاتے تھے وہاں واقعہ نویس بھی مقرر ہوتے تھے۔ اس طرح روزانہ یا ہر دوسرے تیسرے دن فوج کی کارروائیوں کی خبر بادشاہ کو مل جاتی تھی۔ اور فوج کو بادشاہ کی خیریت معلوم ہو جاتی۔ اس انتظام کی وجہ سے فوج میں یا شہر میں کوئی جھوٹی افواہ پھیلائی نہیں جاسکتی تھی۔[2]

سرخ چھتر اور سرخ شامیانہ کے ساتھ فوج 31/اکتوبر 1309ء (25 جمادی الاول 709ھ) کو روانہ ہوئی۔ کوچ کے راستہ کے متعلق خسرو کچھ اشارے کرتا ہے۔ لیکن ان کی توضیح مشکل ہے۔ اس نے جن شہروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض اب موجود نہیں۔ نیز یہ کہ راستہ کے انتخاب کے سلسلہ میں بعض ایسے عناصر اثر انداز ہوئے ہوں گے جن کا اندازہ اب ہم نہیں لگا سکتے۔ رسد کی فراہمی، مقامی لوگوں اور ان

---

(1) فارسی میں لفظ 'پور' کے معنی 'بیٹا' اور ہندی میں اس کے معنی 'شہر' ہے۔ اس معاملہ میں خسرو کے ذہن میں کوئی 'مغالطہ' نہ رہا ہوگا۔ جیسا کہ پروفیسر ہوڈی والا (ص 251) کا خیال ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (یہاں) کتابت کی غلطی ہوئی ہے۔ اور یہ جملہ درست ہو جائے گا اگر ہم فارسی متن کو یوں پڑھیں، دور آں مقام کو از مسعود، پور بادشاہ (شمس الدین التمش) نامی گشتہ است: (یعنی) اُس جگہ پر جو بادشاہ (شمس الدین التمش) کے بیٹے مسعود (کے نام) پر مشہور ہے، خسرو اس مسعود کی تخصیص کرنا چاہتا جس کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا تھا۔ اور (ساتھ ہی) لفظ 'پور' کے دونوں معنوں سے اپنی واقفیت بھی۔ اس شہر کی شناخت اب تک نہیں کی جاسکی ہے۔ ڈاکٹر آئنگر کا کہنا ہے کہ ہمیں اس کا جائے وقوع بھرت پور کے نزدیک ماننا ہوگا۔

(2) ایلیٹ نے ان دریاؤں کو Jun, Chambal, Kunwari, Niyas and Bahuji لکھا ہے۔ پروفیسر آئنگر لکھتے ہیں کہ 'Jun' شاید وہ چھوٹی ندی ہے جو بیانہ سے گزر کر جمنا میں شامل ہو جاتی ہے (XXIII)۔ چمبل اتنی معروف ہے کہ اس بحث کی ضرورت نہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کے سرداروں کا رویہ، سڑکوں کی حالت بہتر یہ ہو گا کہ غیر طے شدہ سوالات کو آئندہ تحقیقات کے لیے چھوڑتے ہوئے ہم خسرو کے بیان کے مطابق چلیں۔

نو دنوں کے سفر کے بعد فوج مسعود پور پہنچی جو سلطان مسعود[1] کے نام پر ہے۔ پھر 13/ نومبر 1309ء (سوموار 6، جمادی الثانی 709ھ) کو فوج روانہ ہوئی۔ سڑک سخت ناہموار تھی۔ بارش کے پانی کے ریلے سے پہاڑوں کے کناروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ اور (راستے میں) چٹانیں اور کانٹے بکھرے تھے۔ چھ دنوں کے کوچ کے دوران فوج نے پانچ دریاؤں کے گھاٹ پار کیے - جون، چمبل، کنواری (کواری)، نیاس اور بہوجی[2] - اور سلطان پور پہنچی جسے ایرج پور[3] بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں چار دنوں تک قیام کیا گیا۔ 25/ نومبر 1309ء (اتوار 19/ جمادی الثانی 709ھ) کو فوج پھر ایک

(بقیہ صفحہ 571 سے آگے)

کنواری کو اب کواری کہتے ہیں۔ ایلیٹ نے Niyas اور Bahuji کی شناخت سندھ (Sind) اور بتوا (Betwa) سے کی ہے اور ڈاکٹر آئنگر اس شناخت میں ان سے متفق ہیں۔ اس معاملہ میں پروفیسر ہوڈی والا (ص ص 52-251) کے تعمیری دلائل کا اقتباس پیش کرنا کافی ہو گا۔ تمام معاملوں پر غور کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خسرو کی نیاس (یا نباس) سے مراد 'درحقیقت، 'نواح' ہے اور اسکی 'بہوجی' (یا بھوجی) سے مراد 'پہوج' (Pahuy) ہے..... تھورنٹن لکھتا ہے کہ نواح کالی سندھ کی معاون ندیوں میں سے ایک ہے اور یہ دونوں ندیاں منکندر اگھاٹی سے 35 میل آگے ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ گزیٹیر، (524،497) چمبل جمنا کی معاون ہے۔ کنواری، نوج اور پہوج' یہ سب سندھ کی شاخیں ہیں جو خود چمبل کی ایک معاون ہے اور اسی میں شامل ہو جاتی ہیں۔ 'پہوج' جہانسی سے 25 میل جنوب مغرب میں ایک جھیل سے نکلتی ہیں اور سندھ میں گرتی ہے۔

(3) پروفیسر ہوڈی والا لکھتے ہیں کہ اُس ایراج پور (کا معاملہ) ایک معمہ ہے۔ میری رائے ہے کہ یہ ایرج ہے۔ یہ ایک بہت قدیم جگہ ہے اور اس کے جغرافیائی جائے وقوع ایسی ہے کہ اسے بہت اہم بنا دیتی ہے۔ گوالیر سے ایرج 65 میل جنوب۔ مشرق اور چندیری 105 میل جنوب میں ہے۔ (253) برنی لکھتا ہے کہ ہندستان کے امراء کافور سے ایرج میں ملے ہوں گے۔ برنی اور فرشتہ نے جن جگہوں کا ذکر کیا ہے ان کو ہمیں نظر انداز کرنا ہو گا۔ چوں کہ وہ (دونوں) یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کافور دیوگیری ہو کر وارنگل گیا تھا۔

(1) اس جگہ کا تعین اب تک دشوار ثابت ہوا ہے۔ (ہوڈی والا، 25) ڈاکٹر آئنگر نے اسکی شناخت نربدا کے اس پار ریلوے جنکشن کھنڈا سے کی ہے۔ لیکن دشواری یہ ہے، جیسا کہ پروفیسر ہودی والا نے نشان دہی کی ہے، کہ کھنڈوا پہنچنے کے بعد نربدا پار کیا گیا نہ کہ پہلے۔

سنگلاخ راہ کو پار کر کے آگے بڑھی۔ 11 دنوں کے سفر کے بعد 5/ دسمبر 1309ء (یکم رجب 709) کو کھنڈار[1] پہنچا گیا۔ یہاں 14 دنوں کا قیام ہوا تا کہ فوج کا معائنہ کیا جا سکے۔ 'سردار' ملک اور فوج کے ممتاز اشخاص سرخ چھتر کے سامنے جمع ہوئے جب فوج پھر روانہ ہوئی تو اسے نشیب و فراز (علاقوں) سے گزرنا پڑا اور چھوٹی اور بڑی ندیوں کو پار کرنا پڑا۔ سب سے بڑا دریا جسے پار کرنا پڑا وہ (دریائے) نربدا تھا؛ جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان (نوح) کا ایک حصہ باقی رہ گیا تھا؛ (نربدا مابداں ماست کہ گوئی مادہ ایست از طوفان باقی) دریائے نربدا کو پار کرنے کے آٹھ دنوں بعد وہ لوگ نیل کنٹھ[1] پہنچے اور چونکہ نیل کنٹھ دیوگیری کی سرحد کے اندر تھا۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ کسانوں کے مکانوں اور کھیتوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ پھر دو دنوں کا قیام ہوا تا کہ آگے کی راہ کا حل دریافت کیا جائے۔ 30/ دسمبر 1309ء (منگل 26/ رجب 709ھ) کو کوچ کا نقارہ پھر بجا، 'سڑک' دھڑکتے ہوئے دل کی طرح اوپر نیچے ہوتی گئی، اور بڑی لاحاصل مشکلوں کے بعد تلنگانہ جانے کی راہ تک پہنچا گیا۔

'اب (آگے کی) سڑک ستار کے تار سے بھی پتلی اور کسی حسینہ کی زلفوں سے زیادہ سیاہ (تاریک) تھی۔ خسرو یہ تاثر پیش کرنا چاہتے ہیں کہ (راہ میں) تیز رو نالے تھے اور آدمی اور جانور پہاڑیوں کے کناروں سے پھسل کر گر رہے تھے اور پھر فوج کی پریشانی میں اضافہ کرنے کو، بادلوں نے اپنے ناتمام موتیوں کو برسانا شروع کر دیا۔ بالآخر، پہاڑیوں کو پار کرنے کے بعد فوج بیجے گڑھ کے مضافات[2] میں داخل ہو گئی۔ یہ (علاقہ) ایک دوآبہ تھا، جو بہار اور براگی دریاؤں کے درمیان تھا اور انہوں نے ایک

---

(1) آئنگر کی رائے ہے کہ نیل کھنڈ تاپتی کنارے سے کسی جگہ پر واقع پر تھا۔ (25)

(2) برٹش میوزیم کے ایک مخطوط کی بنا پر، جو خسرو کی موت کے گیارہ سالوں بعد کے این نسخے کی نقل ہے، پروفیسر حبیب، 'بیجے گڑھ' لکھتے ہیں۔ ایلیٹ 'بیجانگر' لکھتا ہے۔ جیسا رگڑھ "باواگڑھ" یعنی 'ویراگڑھ' کی خرابی معلوم ہوتا ہے۔ یہ (مقام) مدھیہ پردیش کے چندا ضلع گڑھ چرولی تحصیل میں واقع ہے۔ اور وین گنگا کے بائیں کنارے کے نزدیک، اس کی ایک معاون ندی، جس کا نام کیرا گڑھی ہے کے کنارے پر ناگپور سے 80 میل جنوب مشرق میں واقع ہے...... دوآبہ تشکیل کرنے والے دریاؤں کا نام صریحاً غلط ہے۔ ویرا گڑھ کی ہیرے کی کان کا ذکر فرشتہ (1، 323) اور ابو الفضل (آئین ترجمہ جلد نمبر 2، 230) کرتے ہیں، (ہوڈی والا، 254)۔

ایسے علاقے دیکھا۔ جہاں ہیرے کی ایک کان کے کچھ آثار تھے۔ اسی دن ملک کافور کچھ چنندہ گھوڑ سواروں کے ساتھ آگے روانہ ہوا اور قلعہ سربر[1] کے پاس پہنچا جو کہ تلنگانہ کے علاقہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ گھوڑوں کو دم لیے بغیر ہی محاصرہ کا حکم دیا گیا۔ محاصرے کرنے والوں نے تیر پھینکے اور قلعہ کے اندر کے راوتوں نے 'مار'، 'مار' کا شور مچایا۔ خسرو کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قلعہ کے اندر کے راوتوں کو اچانک گھیر لیا گیا تھا (ان میں سے) بعض نے رسم جوہر ادا کرتے ہوئے خود کو اور اپنے بیوی بچوں کو آگ میں ڈال دیا۔ (اس کے بعد) محاصرہ کرنے والے قلعہ کے اندر گھس گئے اور تلوار نے ان لوگوں کا صفایا شروع کر دیا، جو آگ سے بچ رہے تھے۔ بقیہ مقدمان لڑتے ہوئے جان دینے پر آمادہ تھے۔ لیکن اس اثنا میں خواجہ حاجی نے مداخلت کی۔ قلعہ کے مقدم کے ایک بھائی انانیر، کو جو روپوش ہو گیا تھا۔ ایک میدان میں پایا گیا۔ اسے گرفتار کر کے لایا گیا اور قلعہ کی دیکھ بھال اس کے حوالہ کی گئی۔ اُن لوگوں نے ہندوؤں کے اس بجھے ہوئے چراغ میں آگ لگا دی تاکہ وہ فساد کی آگ کو بجھا سکے، قلعہ سے بھاگتے ہوئے پناہ گزینوں نے وارنگل کی راہ اختیار کی۔[2]

اگر تلنگانہ کے راوتوں کو عوام کی حمایت حاصل ہوتی تو ان کے لیے بہتر صورت یہ تھی کہ پوری مملکت میں گوریلہ جنگ کا طریقہ اختیار کرتے۔ اگر عوامی حمایت نہ بھی حاصل تھی تو ان کو متفرق علاقوں میں تیز رفتار، حرکت پذیر،

---

(1) سربر یقیناً سیرپور تندوا ہے- جواب (پرانی) ریاست، حیدر آباد کے عادل آباد ضلع میں واقع ہے۔ ... سری پور قدیم گونڈ سلطنت کا، بلال پور سے پہلے دارالسلطنت تھا۔ بلال پور کی جگہ چندا نے لی جس جگہ کے نام پر اس سلطنت کا ہی نام پڑ گیا۔ جیسا کہ مغل (عہد کی) تمام تاریخوں میں لکھا جاتا تھا۔ وارنگل، سری پور سے جنوب میں ہے (ہوڈی والا، ص ص 55-254)۔

فرشتہ اور CHI (جلد نمبر 3، 112) یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ کافور کے اندور (موجودہ نظام آباد) جانے کا ذکر کرتے ہیں۔ اندور، وارنگل کے جنوب مغرب میں ہے۔

(2) ڈاکٹر آئنگر لکھتے ہیں کہ کنربل شاید کنر نامی وہ گاؤں ہو، جو وارنگل سے بہت دور نہیں ہے اور اس کے قدرے جنوب مغرب میں ہے۔ اس کا امکان نہیں چونکہ کافور وارنگل کے شمال میں تھا۔ پروفیسر ہوڈی والا کنیریل کی شناخت ضلع ایکنڈول یا کریم نگر میں واقع گورانٹی سے کرنے کے لیے مائل معلوم ہوتے ہیں۔ ایکنڈول، ہنان کونڈا سے 30 میل سے بھی کم دوری پر شمال کی جانب ہے۔

دستوں کے ذریعہ دفاعی تنظیم اختیار کرنی چاہئیے تھی۔ دونوں میں سے کوئی بھی طریقہ کامیاب ثابت ہوتا کیونکہ حملہ آور فوج کے پاس بہت کم وقت تھا اور پورے تلنگانہ کو زیر کرنے کی کوشش میں خود تباہ ہو جاتی۔ لیکن راوتوں نے وارنگل میں رائے رودر دیو کے پاس بھاگ کر کافور کا کام آسان کر دیا۔ اس غلط اقدام نے حملہ آوروں کا کام سہل بنادیا۔ وہ صرف ایک ہی قلعہ کو زیر کر کے اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا۔

14/ جنوری 1310ء (سنیچر 10/ شعبان 709ھ) کو فوج سر بر سے روانہ ہو کر کنز بال کے مزروعہ کھیتوں تک جا پہنچی۔ (18/ جنوری /14/ شعبان) جب خیمے نصب کیے جا رہے تھے اسی وقت کافور نے ایک ہزار چنندہ گھوڑا سواروں کو وارنگل کے مضافات کی جانب مترجموں کو حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ان میں سے دو افسر اور 40 گھوڑا سوار نام کونڈہ پہاڑی پر چڑھ گئے۔ جہاں سے وارنگل کے باغات صاف نظر آتے تھے۔ چار ہندو گھوڑ سوار ان کے سامنے پہنچے۔ ان میں سے ایک کو انہوں نے چار پروں والے ایک تیر (تیر چہار پری) سے مار ڈالا۔ اور اس کی لاش کو (اپنے) کمانڈر کے پاس بھیج دیا۔ ملک کافور نے خود دھوپ میں نکل کر قلعہ کا معائنہ کیا۔" اس دن خواجہ حاجی نے بھی بعض مضبوط دفاعی مقامات کا معائنہ کیا"۔

وارنگل کے قلعہ دو فصیلیں یا قلعہ کی دیواریں تھیں۔ ہر دونوں کے گرد ایک کھائی تھی۔ پرتاپ رودر دیو اندورنی قلعہ میں رہتا تھا جس کی فصیل پتھر کی تھی۔ راوتوں نے باہری قلعہ میں اپنی جگہیں سنبھالیں۔ یہ زیادہ وسیع تھا اور اس کے گرد مٹی کی فصیل تھی۔ "لیکن یہ دیوار اتنی کڑی تھی کہ کوئی آہنی ہتھیار بھی اس کو پار نہیں کر سکتا تھا۔ اور منجنیق کا پتھر بھی اس (کی دیوار) سے اس طرح ٹکرا کر واپس ہو جاتا جیسے کہ کسی لڑکے کے ہاتھوں پھینکا ہوا آخروٹ (Nut)۔"

---

(1) ہوڈی والا کے مطابق خسرد جس جگہ کو انام کونڈ (یا ان مکنڈا) لکھتا ہے وہ (دراصل) ہنام کونڈا ہے جو وارنگل کے قبل کاکاتیہ حکمرانوں کا دارالسلطنت تھا (255)

قلعہ کی محافظ فوج جھنڈے ہوا میں لہرا○ رہے تھے۔ اور راوت لوگ منجنیقوں اور محزبوں # کے لیے پتھر جمع کر رہے تھے اور ڈھیلے پھینکنے کے لیے غلیل (Slings) بھی۔

دوسرے دن (15 / شعبان، 19 / جنوری) ملک کافور کا خیمہ انام کونڈا پہاڑی پر اور شاہی خیمہ قلعہ کے دروازے کے سامنے لگایا گیا۔ اگلی شب ناصر الملک سراج الدولہ خواجہ حاجی نے خود سے ایک چراغ لیکر فوج کے دستوں کو مناسب جگہوں پر تعینات کیا۔ یہاں تک کہ پورا قلعہ گھیر لیا گیا۔ "ہر تو ماں (10 ہزار سپاہی) کو 12 سو گز (کی لمبائی) کا علاقہ سپرد کیا گیا۔ اور قلعہ کو گھیرے ہوئے خیموں کا محیط 12546 گز تھا"۔ خیموں کے گرد ایک مضبوط کاٹھ کی دیوار بنائی گئی تاکہ ان کو کھلے علاقے (کی جانب) سے حملوں سے بچایا جا سکے۔ اس علاقہ کے ایک مقدم، مانک دیو، نے پورن ماشی کی رات میں آدھی رات کے وقت حملہ کیا لیکن یہ بری طرح ناکام ہو گیا۔ بعض قیدیوں نے یہ بتایا کہ وارنگل سے چھ فرسنگ دور پہاڑیوں میں واقع شہر دھم دھم میں تین ہاتھی رکھے گئے تھے۔ ملک قرابیگ میسرہ کو انہیں پکڑ لانے کے لیے بھیجا گیا اور اگرچہ انہیں کسی دوسری جگہ ہٹا دیا گیا تھا پھر بھی وہ انہیں پکڑ لانے میں کامیاب ہو گیا۔

سبات اور گرگج کو قلعہ کی بلندی سے اونچا کیا گیا اور ان کے سامنے کی کھائی کو بھر دیا گیا۔ قلعہ کی دیوار جو چوڑائی میں تقریباً 100 ہاتھ کے برابر تھی سخت پتھروں کی ضرب سے ایک طرف سے اتنا شکستہ ہو گئی تھی کہ اب وہ ہندوؤں کی بغلوں سے زیادہ نیچی ہو گئی تھی۔ جبکہ اس کے دوسرے جانب منجنیق پتھروں سے اس (دیوار) میں کئی دروازے کھل گئے تھے۔ منصوبہ یہ تھا کھائی کے وسطی حصہ سے لیکر قلعہ کی کمر تک

○ یہ حملہ بھی مندرجہ بالا اقتباس کے نزدیک ہی ہے گرچہ اس کا ترجمہ واوین میں نہیں پیش کیا گیا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے "علم کفرہ بر سر ہر کنگرہ از بیم نگوساری در سرزہ" (کافروں) کے جھنڈے شکست کے خوف سے ہر کنگرے پر کانپ رہے تھے) خزائن الفتوح، ص 91- مترجم)

#(یہاں پر بھی کچھ غلطی معلوم ہوتی ہے۔ اصل عبارت یہ ہے "واعر دہائے ہندو واز ترس شکستن در نالہ میگروندو بعضے کہ بے سنگ بود ندو زردمیں محاند اختند"۔ خزائن الفتوح، ص 92-91۔ مترجم)

(دیوار کے نصف حصہ تک) ہو اور جو اتنی چوڑی ہو کہ سو آدمی شانہ بشانہ اس پر سے گزر سکیں، لیکن اس (کے بنانے) میں بہت وقت لگے گا اس لیے ملک کافور کی طلب کردہ ایک کاؤنسل نے فوری حملہ کا فیصلہ کیا۔ ملک کافور نے ہر خیل (دستہ) کو 13/ فروری (11/ رمضان) کی چاندنی رات کو لمبی سیڑھیاں اور دیگر سامان اکٹھا کرنے کا حکم دیا اور اگلی صبح حملہ کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا۔ جب سورج ایک نیزے کی بلندی پر تھا۔ تو 14/ فروری کو طبل جنگ کے ذریعہ حملہ کا حکم دیا گیا۔ بعض سپاہیوں نے قلعہ کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی جبکہ منجنیقوں نے دونوں جانب سے پتھر پھینکے۔ خسرو کا یہ بیان کہ (ایک طرف تو) نصف فصیل گرد بن کر آسمان کی طرف اڑ گئی (دوسری طرف) نصف فصیل معمولی مٹی بن کر زمین پر گری، مبالغہ آمیز ہے کیوں کہ اس کی تردید اس کے بیان سے ہوتی ہے کہ 'شام ہوتے ہوتے محاصرہ کرنے والوں نے فصیل کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا، 15 اور 16 فروری کو سخت جنگ آزمائی کے بعد حملہ آوروں نے باہری قلعہ پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور اس کی فصیل پر اپنے جھنڈے نصب کر دیے۔ اب ان کے سامنے دوسری گڑھی تھی۔ اور اس کے پرے (دوسرا) سنگی قلعہ، 'جس کی دیواریں اتنی چکنی تھیں کہ ایک چیونٹی بھی ان پر چڑھ نہیں سکتی تھی۔ اور جس کے پتھر اس صناعی سے جوڑے گئے تھے کہ کدال کی نوک بھی انہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اور جو اتنے خوبصورت تھے کہ کسی منجنیق کو اس نقصان پہنچانے کی خواہش نہ ہو گی؛ حملہ آور بھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ گڑھی کشتیوں کے بغیر کیسے پار کیا جائے جب جنگ یکایک بند ہو گئی چونکہ رائے رودر دیو نے جو اپنے دولت کی محافظت روایتی ہندستانی سانپ کی طرح کر رہا تھا، ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔

امیر خسرو نے دونوں جانب کے افراد کا جو مکالمہ پیش کیا ہے اس کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں۔ گفتگو 'ہندی زبان' میں کی جاتی تھی۔ 'جو کہ ہندی تلوار (Mohannad) سے بھی زیادہ تیز تھی لیکن ظاہر ہے کہ تشبیہات واستعارات ارسطالیسی منطق کی اصطلاحات (Terms of Aristotelian Logic) اور ذو

(اصل عبارت یہ ہے "زمانے ہندوئے فصیح برآں تراز تیغ ہندی"۔ خزائن الفتوح، ص 111، مترجم)

معنیٰ فارسی الفاظ (جن کے استعمال میں خسرو خوشی محسوس کرتا ہے) استعمال نہ کیے گئے ہوں گے۔ رائے نے اظہار اطاعت کے طور پر اپنا ایک طلائی مجسمہ بھیجا جس کے گلے میں ایک زنجیر پڑی تھی۔ وہ اپنی دولت سے دستبردار ہونے کو اور سالانہ خراج دینے کو تیار تھا۔ وہ 20 ہزار گھوڑے، ہندستانی اور بیرونی (بحری و کوہی) اور ایک سو جوان اور مضبوط ہاتھی جو کہ معبر کے پیلان مست تھے نہ کہ بنگال کے پیلان سبزی خور دے سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنا سونا تھا کہ ان سے ہندستان کی تمام پہاڑیوں پر سونے پتہ چڑھایا جا سکتا تھا۔ اور اسکے پاس بیش قیمت جواہرات کا ذخیرہ تھا۔ رائے کے بسیّوں (پیغام بروں) نے سرخ چھتر کے آگے خود کو سر بسجود کیا اور ملک کافور کی ہچکچاہٹ کو سلطان کی ہدایت یاد دلا کر دور کیا۔ اور خضر خاں کے سر کی قسم کھائی کہ اگر جنگ بند کر دی گئی تو (وہ اپنا وعدہ پورا کریں گے) کافور نے اپنی تلوار کو نیام میں ڈال دیا اور اپنا داہنا ہاتھ بڑھایا اور اظہار عنایت کے طور پر پیغام بروں کی پیٹھ پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔

شب میں رائے کے افسروں نے اس کے خزانوں کو اکٹھا کیا اور اگلی صبح کو انہیں کافور کے پاس لائے جو کہ سلطان کی طرف سے عطا کیے ہوئے بلند مقام پر بیٹھا تھا۔ افسروں نے اپنی مقررہ جگہ لے رکھی تھیں اور امراء اور عوام ستاروں کی طرح مجتمع تھے۔ کافور کے اس سوال کا کہ کیا رائے نے اپنے تمام خزانے بھیج دیے تھے، پیغام بروں نے جواب دیا کہ 'ان جواہرات میں ایک جوہر (قیمتی پتھر)، جو دنیا میں بے مثال ہے، گرچہ حکماء کے مطابق ایسا جوہر (مادہ) وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔[2] کا کام ایک دن میں ختم نہیں کیا جا سکا ہوگا، چونکہ خسرو آگے یہ لکھتا ہے کہ

"جب رائے نے تمام چیزیں جو اس نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پائی تھیں، اپنے 'کوب منطق' سفیروں سے بھجوادیں تو ان کی مقدار اتنی (زیادہ) تھی کہ عقلمند لوگوں کے اندازے سے باہر تھی۔ پھر بھی عارض ممالک، جواہرات (کے اس ڈھیر)

---

(1) خزائن الفتوح اور برنی کے مطابق رائے رودر دیو خود کافور کے پاس حاضر نہ ہوا۔ یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور سلطان کی ہدایات کے مطابق تھا۔ لیکن دول رانی (70) میں خسرو لکھتا ہے کہ کافور نے رائے کی حاضری پر اصرار کیا اور وہ آیا۔

(2) خوافی خاں جس کی دسترس، خزائن الفتوح تک نہ تھی، روایات کی بنا پر لکھتا ہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے پاس آیا۔ انہیں درجہ وار طور پر ترتیب دیا اور ہر پتھر کا اندراج مناسب جگہ پر کرلیا"۔

خسرو مزاحیہ طور پر یہ لکھا ہے کہ آئندہ خراج (کی رقم یوں طے کی گئی) کہ ہندوی عدد 'ایک لکھا گیا اور اس کے بعد دس (عدد) صفر لکھے گئے۔ ہر صفر ایک رقم کی نشان دہی کرتا تھا جو سلطان کے ایجنٹ کو ہر سال ادا کی جائے گی۔ خدا کرے کہ قیامت کے دن تک زندہ رہے#۔

فوج کا معائنہ (عرض) کیا گیا۔ اس نے اپنے واپسی سفر 22/مارچ 1310 (16/شوال 709ھ) کو شروع کیا اور 9/جون 1310 (10/محرم 710ھ) کو وہ دہلی پہنچی۔ 23/جون 1310ء (24/محرم 710ھ) کو سلطان کا سیاہ خیمہ چبوترہ سبحانی پر بدایوں گیٹ کے نزدیک لگایا گیا اور خزانوں کا معائنہ کیا گیا جو ایک ہزار اونٹوں پر رکھ کر لائے گئے تھے۔ اس کا انتظام کیا گیا تھا کہ عوام بھی خزانوں کو دیکھ سکیں۔

دوار سمدرا اور معبر کی مہمیں

جیسا کہ خسرو نے لکھا ہے، اس وقت تک منگولوں کو غزنی تک واپس ڈھکیل دیا جا چکا تھا اور ان کے قراوائی دستوں کو بھی سندھ دریا پار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ علاؤ الدین کی سلطنت ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک پھیلی ہوتی تھی۔ لہٰذا اس نے ایک دوسری مہم جنوب بعید (Fan South) کو ملک کافور کی قیادت میں بھیجنے کا فیصلہ

(بقیہ صفحہ 578 سے آگے)

'کوہ نور' ملک کافور نے وارنگل لایا تھا یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ نام اس کو کب دیا گیا۔ فارسی میں جوہر کا مطلب قیمتی پتھر یا 'مادہ' (Substance) صفت (Attributes) سے ممیز) ہوتا ہے۔ خدا 'جوہر یکتا' (Unique Substance) ہے یا وجود لازمی (Necessary Existance) لیکن یہ پتھر (جوہر) بھی بحیثیت پتھر بے مثال ہے (نوٹ: اصل عبارت یہ ہے [میان ایں جواہر جو ہرے باشد، کہ درہمہ عالم فرداتوں گفت۔ نزدیک فیلسوفان کامل ایں چنیں جوہر خود وجود ندارد' خزائن الفتوح ص 119۔ مترجم)

#(اصل عبارت یہ ہے 'چون سہکش بیگانہ برسر ہندو خراجے بیروں از حساب وضع محاکرد 'ہندوئے برہند سہ خطے براستی نبوشت، ودہ خزانہ صفر راور تہہ آں شبت کرد کہ از مالامال گرداند و بہ محصل آں بادشاہ ابقااللہ امی یومد الحساب رسانہ۔ خزائن الفتوح، ص 120۔ مترجم)

کیا۔ توقع یہ تھی کہ وہ 500 سے زیادہ ہاتھیوں کو حاصل کر سکے گا۔ دہلی سے معبر جانے اور واپس آنے میں پورا ایک سال لگ گیا۔

17/ نومبر 1310ء (بدھ 24/ جمادی الثانی 710ھ) کو شاہی چھتر دہلی سے روانہ ہوا لیکن پہلے اسے جمنا کے کنارے تلپت لے جایا گیا۔ جہاں وزیر جنگ خواجہ حاجی نے 14 دنوں تک (فوج کا) معائنہ کیا۔ 2/ دسمبر 1310ء (9/ رجب 710ھ) کو صبح میں کوچ کا نقارہ بجا اور 21 طویل منزلوں کے بعد فوج کیتھن پہنچی[1]۔ (کیتھن سے آگے) 17 دنوں کے دوران فوج نے اونچی پہاڑیاں، گہری وادیاں اور تین دریاؤں کو، جن میں سب سے بڑا نربدا تھا، پار کیا جس کے بعد کہر گاؤں[2] پہنچا گیا۔ یہاں بیس دنوں کا قیام ہوا تاکہ پھر فوج کا معائنہ کیا جا سکے۔ تمام افراد، جو موجود تھے یا غیر حاضر تھے، کی گنتی کی گئی۔ تلنگانہ کے رائے کے بطور خراج بھیجے ہوئے 24 ہاتھی اس جگہ پر فوج سے آملے 29/ جنوری 1311ء (جمعہ 7/ رمضان 710ھ) کو فوج کہر گاؤں سے روانہ ہوئی۔ اور تاپتی اور دوسرے دریاؤں کو پار کرنے کے بعد 3/ فروری 1311ء

---

(1) اس مہم سے متعلق سب سے زیادہ مستند، بلکہ دراصل واحد، ماخذ امیر خسرو کی خزائن الفتوح ص 72-112، ہے۔ برنی ص ص 332-34 عصامی ص ص 285-90 اور فرشتہ جلد نمبر 1، 119-20 بعض صحیح باتیں پیش کرتے ہیں لیکن بہت سی غلط باتوں کے ساتھ، جدید تصانیف کے طور پر ملاحظہ ہو، پروفیسر حبیب کے خزائن الفتوح کے اردو ترجمہ کا پیش لفظ از ڈاکٹر آئنگر ص ص 39-29، ہوڈی والا ص ص 2259-58، ڈاکٹر کے۔ ایس۔ لال، خلجیز، ص ص 201-21 ذیل غلطیوں کو نوٹ کر لینا چاہیے۔

دوار سمدرا کو دہور سمندر لکھا گیا ہے۔ ہندی میں سمندر کے معنی ساگر ہے۔ فارسی میں اس کا مطلب ایک داستانوی آگ کا کیڑا (Mythical Salamander) بھی ہوتا ہے۔ ہمیں اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ فارسی مصنفین (جن میں خسرو اور فرشتہ بھی شامل ہیں) نے دوار سمندر کے نزدیک سمجھنے کی غلطی کی ہے۔

(پنداریور کے سردار) پر سورام دلوائی کا نام پارس دلوی لکھا گیا ہے۔ فارسی میں 'دلو' کا مطلب بالٹی ہوتا ہے۔

سنسکرت لفظ 'ویر' جس کے معنی جنگجو یا بہادر ہے' کو فارسی میں 'بیر' لکھتے ہیں جس کا مطلب (بھی) ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ جنوب کے دو شہزادوں کا نام لفظ 'ویر' سے شروع ہوتا ہے- ویر بلال اور ویر پانڈیہ- اور ہمارے مصنفین اس بارے میں واضح نہیں ہیں کہ جب وہ لفظ بیر استعمال کر رہے ہیں تو ان کا مطلب کوئی شخص ہے یا کوئی مقام۔ پیغمبر کے ایک افریقی صحابی کا نام بھی بلال تھا جو موذن تھے۔

اور پھر (آخری بات) یہ کہ سنسکرت میں 'دیو' کے معنی خدا ہے جبکہ فارسی میں اس کا مطلب

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(جمعرات 13 رمضان 710ھ) کو دیو گیری پہنچی۔ رام دیو نے فوج کے استقبال کے لیے ہر طرح کی تیاریاں کر رکھی تھیں۔

اس شہر کو جنت کی طرح آراستہ کرنے اور سپاہیوں کی ضرورت کی تمام اشیا کو بازاروں میں فراہم کرنے کا حکم دیا...... ہر بازار کا نقشہ ایک نئے نمونہ پر تیار کیا گیا تھا۔ سونے اور چاندی کے ٹنکوں سے بھرے چھوٹے اور بڑے تھیلوں کو لیکر صراف (بازاروں میں) بیٹھے ہوئے تھے۔ بزاز بہار ہند سے لیکر بارود خراسان تک ہر قسم کے کپڑے فراہم کر سکتے تھے .... پھلوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ...... ہر شخص مناسب داموں پر چیزیں خرید سکتا تھا۔ ترکوں نے ہندوؤں کو نہیں ستایا۔ اور ہندوؤں کی رائے ترکوں کے خلاف نہ تھی٥۔ لیکن فوج ایک ہزار اور دس ہزار کے دستوں میں اپنی ترتیب اور سامان رسد کی فراہمی کے لیے دیو گیری میں تین یا چار دنوں سے زیادہ نہ ٹھہر سکتی تھی۔ رام دیو نے اپنے سرحدی سردار پر سورام دلوائی 2۔ کو شاہی فوج کو مدد پہنچانے کا حکم دیا تھا#۔ دلوائی (دلوی) اس کے انتظام میں (ایک) بالٹی (دلو) کی طرح اپنا منہ کھولے بیٹھا تھا، جو سمندر کو نگل جانا چاہتی ہو۔ مزید یہ کہ چونکہ دلوی ایک (ایسی) بالٹی کی مانند تھا جس کو شاہی افسران اوپر کھینچ رہے تھے۔ (اس لیے) وہ چاہتا ہے کہ دونوں بیروں (کنوؤں) - ویر بلال دیو اور ویر پانڈیہ - کو اپنے ساتھ، مع

(بقیہ صفحہ 580 سے آگے)

ایک دیو یا بھوت ہے۔ ان تمام ذو معنی الفاظ کی بنا پر اکثر یہ کام مشکل ہو جاتا ہے کہ خسرو کے اشارات اور تشبیہ و استعارات کی تشریح کی جاسکے۔ تقریباً ہر جگہ پر خسرو دہلی کی فوج کو ترکی کی فوج لکھتا ہے۔ گرچہ (اسکا) کمانڈر ایک گجراتی تھا۔ اور اس کے پاس سپاہی ہندستانیوں کے مختلف طبقوں سے بھرتی کیے گئے تھے۔

(1) کوئی ایسی جگہ نہیں ملتی جس کی شناخت اس کی کیتھن سے کی جاسکے جس کا ذکر خسرو کرتا ہے کم از کم اب تک کوئی ایسی شناخت تشفی بخش طور پر نہیں کی جاسکی ہے۔ لیکن کوچ کی طوالت اور سرسری بیان کے پیش، نظر ہم امکانی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتھیہن کی منزل نگدا کے علاقہ کے کہیں آس پاس رہی ہوگی' (ڈاکٹر آئنگر)

(2) 'میں یہ تجویز کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ 'کہر گاؤں' سے مراد گرگاؤں ہے جو اب نیمار ضلع میں ہے۔ یہ نربدا کی ایک معاون ندی کندی کے کنارے پر ہے۔ تھورنٹن نے لکھا ہے کہ یہ اندور سے 60 میل جنوب سے نیمار ضلع میں ایک زوال پذیر شہر ہے جس میں ایک قلعہ اور فصیل ہے کہر گاؤں، بیجاگڑھ کے مستحکم قلعہ سے تقریباً 25 میل مشرق میں واقع ہے۔ خوافی خاں لکھتا ہے کہ بیجاگڑھ کو کہر گاؤں بھی کہا جاتا تھا' (ہوڈی والا)۔

متعلقہ سمندروں کے-ایک ہی کوزہ میں اوپر کھینچ لے؛

2/ فروری 1311ء (بدھ 17/ رمضان 710ھ) کو دیوگیری سے روانہ ہوکر (شاہی) فوج تین دریاؤں، سینی، گوداوری اور بنہر کو پار کر کے پانچ دنوں میں پرسورام کے علاقہ میں بندری (پندر پور[1]) (شہر) پہنچی۔ پرسورام نے کافور کو صحیح حالات دریافت کرنے میں مدد کی اور مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔ معبر کے دونوں رائے ہم خیال (یک رائے) ہوا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں سندر پانڈیہ، جو چھوٹا بھائی تھا نے باپ کے خون سے اپنی ہتھیلی رنگ لی اور ویرپانڈیہ، جو بڑا بھائی تھا، نے اپنے شہروں کو غیر محفوظ چھوڑ کر کئی ہزار ہندوؤں کو لیکر پدر کش (رائے) کی کھال کھینچنے کو نکل پڑا۔ یہ خبر سن کر کہ ان دونوں شہروں کو ان کے مہارائے بلال دیو نے غیر محفوظ چھوڑ دیا ہے دوار سمدرا کا رائے ان شہروں کے مہاجنوں کو لوٹنے کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن اسی اثنا میں اس کو شاہی افواج کی خبر ملی اور وہ وپے دار السلطنت لوٹ گیا۔

خسرو لکھتا ہے کہ اس طرح کے معاملات میں (فیصلے کی) ذمہ داری ملکوں پر ہوتی تھی، انہوں نے فیصلہ کیا کہ رائے بلال دیو پر (فوری) حملہ ضروری تھا قبل اس کے کہ وہ اپنی مدافعت کی تیاریاں مکمل کر سکے۔ لہٰذا دس ہزار سپاہیوں کو چنا گیا اور کافور کی قیادت میں دوار سمدرا گیا۔ وہ بارہ دنوں کے سفر کے بعد وہاں پہنچے۔ اور 26/ فروری 1311ء (جمعرات 5/ شوال 710ھ) کو اس کو گھیرے میں لے لیا۔ آپ ایک مضبوط قلعہ کو دیکھیں گے جس کے گرد پانی ہے اور جس کو بیر (کنواں) کہتے ہیں۔ ایک کنوئیں (بیر) میں پانی ہوتا ہے لیکن یہاں ایک (ایسا) کنواں (بیر) ہے جو پانی میں ہے 1۔ دوسرے دن کافور نے قلعہ کا چکر لگایا اور صدر دروازے کے سامنے اپنے خاص امرا کے ساتھ ڈیرہ جمایا۔

جمعہ کو عشاء کی نماز کے بعد رائے نے گیسو مل نامی ایک افسر کو محاصرہ کرنے

---

(1) خسرو نے رام دیو کے اس وقت تک زندہ ہونے اور شاہی فوج کے استقبال کے متعلق تیقن کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ افسوس ناک ہے کہ اکثر مصنفین مع ڈاکٹر اینگر، جن کے پاس خزائن الفتوح کا ترجمہ موجود تھا، نے برنی (بیان) کی تقلید کی ہے جس کا حافظہ یقینی کمزور ہو گیا تھا۔ اور جو رام دیو کا تذکرہ بطور متوفی کرتا ہے۔

(2) ڈاکٹر اینگر کے مطابق (ص29) یہی اس کا صحیح نام ہے۔

والی فوج کا حال دریافت کرنے کو بھیجا۔ گیسو نے خبر دی کہ "اگلی صبح کو حملہ کیا جائے گا اور قلعہ کو بالکل مصطح کر دیا جائے گا۔ مصلی کی طرح"۔ خسرو نے قلعہ کے اندر جو گفتگو ہوئی ہوگی اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بہر حال جمعہ کو، بالک دیو نایک دوسرے پیغام بروں کے ساتھ شاہی چھتر کے سامنے حاضر ہوا اور رام دیو اور رودر دیو کی طرح بلال دیو کی جان بخشی کی درخواست کی امن (کے معاہدے) کے بدلے میں وہ اپنی تمام دولت، گھوڑے اور ہاتھیوں سے دستبردار ہو جائے گا۔ اس موقع پر۔ اور اپنی پوری کتاب کے پلان سے متضاد انداز میں خسرو ملک کافور کو ایک مبلغ اور لٹیرے کے انداز میں بولتا ہوا دکھاتے ہیں۔ رائے کے پیغام بروں کو کہا گیا کہ "سلطان کی جانب سے بلال دیو اور دیگر تمام رایوں کے متعلق میرا حکم یہ ہے۔ اوّل یہ کہ میں ان کو اسلامی کلمہ کی دو نفیوں کو قبول کرنے کا موقعہ دوں۔ (یعنی) لاالہ الااللہ۔ اگر وہ اس کو نہ منظور کریں تو میں خراج کا جوا (ذمہ) ان کے کندھوں پر رکھوں۔ اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں تو میں ان کی گردن پر بوجھ نہ رکھوں بلکہ ان کی گردنوں کو ان کے سروں کے بوجھ سے ہلکا کردوں"۔ کافور کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ قبول اسلام کو (ادائیگی) خراج یا لوٹ مار کو ایک متبادل کے طور پر پیش کرے۔ بہر حال یہ بات خسرو کہہ رہا ہے نہ کہ کافور۔

غلط فہمیوں کے تدارک کے طور پر رائے کے پیغام بروں نے درخواست کی کہ

---

(1) ڈاکٹر ائنگر شہر کا صحیح نام پندر پور بتاتے ہیں۔ 'پندر پور شاید سرحدی شہر تھا اور پر سورام دلوائی کی حکومت میں شامل تھا۔ ہوئے سالا (حکمراں) ویر سومیشور کے ایک کتبہ کا ذکر ہمیں ملتا ہے جو یہاں دریافت ہوا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پندر پور بلال دیو اور یادو حکومتوں کے درمیان کا ایک سرحدی مقام تھا' (ص 30)۔

(2) اصل متن میں 'پنہور' لکھا ہے۔ ڈاکٹر ائنگر اسے بنہر اور ہوڈی والا 'ممیما' لکھتے ہیں۔

(1) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خسرو بیر کا لفظ قلعہ کے لیے استعمال کرتا ہے اور دوار سمدرا (کا لفظ) شہر یا ہوئے سالاؤں کی پوری مملکت کے لیے۔ لیکن اس خیال کی تصحیح اس کے اس جملہ سے ہو جاتی ہے 'بہر حال اس قلعہ کو بیر اور دوار سمدرا کہا جاتا ہے (ص ص 30-129) وہ لفظ 'ہوئے سالا' کا استعمال کبھی بھی نہیں کرتا۔ اور بلال دیو کی پوری مملکت کے لیے اس کے پاس کوئی نام نہیں معلوم ہوتا ہے۔

ان کے ساتھ دو شاہی ایجنٹ بھیجے جائیں۔ یہ ایک معقول تجویز تھی اور کافور نے دو ہندو پر مار حاجبوں، (پیغام بروں) کو ان کے ساتھ جانے کو کہا۔ بلال دیو نے ان کو کہا کہ وہ اپنے لیے کچھ بھی نہ رکھے گا، سوائے اپنے جنیو کے، 'جو کہ ہندو مذہب کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اور جس کے ساتھ ہندو مذہب بندھا ہوا ہے'؛ اس نے آئندہ ایک سالانہ خراج ادا کرنا بھی قبول کیا۔ جب یہ خبر کافور کو ملی تو اس نے اپنے ابرو پر سے غصہ کی شکن دور کر دی اور اپنی کمان کو اس کے خانے میں رکھ دیا۔ دفاع پر تیار ہونے سے قبل دوار سمد راپر حملہ کرنے کے اپنے منصوبہ میں کافور کامیاب رہا اور کوئی خاص قابل ذکر خون خرابہ نہ ہوا۔

اسی صبح[1] کو بالک دیو نایک، مین دیو اور جتمل، رائے کے چند دیگر پیغام بروں کے ساتھ قلعہ کے باہر آئے۔ شاہی چھتر کے آگے اپنے سروں کو جھکایا اور 36 ہاتھی نذر کیے۔ منگل کی صبح کو رائے نے اپنے گھوڑے بھیجے۔ اتوار کی صبح کو رائے خود قلعہ

---

(1) خسرو یہ نہیں کہتا کہ وہی دن تھا بلکہ یہ کہ یہ 6/ شوال کی تاریخ اور جمعہ کا دن تھا (27/ فروری 1311ء)۔

(2) ملک کافور 5/ شوال کو دوار سمد را پہنچا اور اس مہینہ کی 17/ تاریخ کو وہاں سے روانہ ہوا۔

(1) ڈاکٹر انگر تابر کو توپر نامی ایک گاؤں سے شناخت کرنے کی طرف مائل معلوم ہوتے ہیں؛ جو ایک ایسا گاؤں ہے جہاں توپر نامی ایک چھوٹی سی ندی ہے۔۔ ترملی سے مراد شاید ترمنگلن دریا ہے یا ایک درہ جو ترمنگلن سے کچھ مغرب میں ہے۔

(2) 'وہ دریا جہاں وہ لوگ شب بسری کے لیے پہنچے تھے یقیناً کاویری ہوگا' (ڈاکٹر انگر)۔

(3) خسرو 'مردی' (جرات) کے لفظ کا استعمال اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ اس کے مقابلہ میں اس (لفظ) نامردی (بزدلی) استعمال کر سکیں، جو وہاں کے باشندوں کی خصوصیت تھی۔

(4) یہاں پر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ کاتب خسرو کی دی ہوئی تاریخ لکھنا بھول گیا ہے۔

(5) بیر ڈھول کا شہر اس مہم میں اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ بیر سے مراد کنواں یا دیرپانڈیہ ہو سکتا ہے۔ اس موقعہ پر شاید اس کا مطلب مواخر الذکر ہی ہے۔ خسرو نے ڈھول کا لفظ ہندی میں سرے (Drum) کے معنی میں استعمال کیا ہوگا۔ لہٰذا بیر ڈھول کا مطلب دیرپانڈیہ کا سرا (دار السلطنت) بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کے۔ ایس۔ انگر لکھتے ہیں:

"ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ امیر خسرو نے بیر ڈھول کا نام ایک بار دار السلطنت کے لیے اور دوسری بار بادشاہ کے لیے استعمال کیا ہے اور (اس طرح) ہماری الجھن اور بڑھانے میں مزید ثابت ہوا ہے۔ ہمیں بیر ڈھول'

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

سے باہر آیا۔ اور شاہی چھتر کے سامنے سر جھکانے کے بعد اسے واپس جانے کی اجازت دی گئی۔ تاکہ وہ سب خزانوں کو بھیج سکے۔ ساری رات رائے کے خزانوں کو جمع کرنے میں گزر گئی۔ اور وہ سب شاہی خزانہ کے افسروں کے حوالہ کر دی گئی۔ اس دارالسلطنت (مملکت) میں، جس کے چاروں شہر (دہلی) سے چار ماہ کی مسافت کی دوری پر تھے، 12 دنوں کا قیام کرنا پڑا تاکہ بقیہ فوج وہاں پہنچ سکے۔[2] دوار سمدرا سے حاصل شدہ ہاتھیوں کو دہلی روانہ کر دیا گیا؛ بعض بعد کے مصنفین نے یہ بھی لکھا ہے کہ بلال دیو کے دہلی کی فوج کو معبر کو تاراج کرنے میں مدد کی اور اسکے بعد وہ دہلی گیا۔ ان دونوں باتوں کے لیے کوئی سند نہیں۔ بلال دیو کے افسران معبر میں بحیثیت رہنما بہت مفید ثابت ہو سکتے تھے لیکن وہ دستیاب ہی نہ تھے۔

10/ مارچ 1311ء (جمعرات 18/ شوال 710ھ) کو جنگبازوں نے معبر کی جانب کوچ کیا۔ انہیں ایک دشوار راہ طے کرنی تھی۔ اور ہر رات ایسی زمین پر انہیں سونا پڑتا جو اونٹ کی پیٹھ سے بھی زیادہ غیر مسطح تھی، 5 دنوں کے کوچ کے بعد جب معبر کی سرحد تک پہنچا گیا تو انہیں ایک بلند پہاڑ ملا جو (ایسا معلوم ہوتا تھا کہ) مملکت کی

(بقیہ صفحہ 584 سے آگے) کہ دیر چولا کے معنی میں لینا ہوگا۔ اگر اس کا مطلب دارالسلطنت سمجھا جائے تو صحیح ہوگا۔"

اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ خسرو نے 'بیر ڈھول' نام اختراع کیا ہے چونکہ دول رانی میں اس کا متعلقہ بیان یہ ہے۔ 'یہاں بھی ایک بڑا رائے تھا جو کہ ہندو تاجپوشوں میں ایک موتی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی حکومت بحر و بر تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک برہمن تھا جس کا نام سندر پانڈیہ تھا۔ اس نے پٹن (مچھلی پٹم) کو اپنا رہائشی مقام بنایا تھا۔ جب کہ اس کا مندر راس اور بت برمت پوری میں تھے۔ اس کی ایک بڑی فوج تھی اور بہت سے جہاز۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس کی ملازمت میں تھے۔ جب سلطان کی فوج پٹن پہنچی تو وہ گمراہ رائے اپنی راہ بھول گیا۔ یہاں پٹن سے مراد سندر پانڈیہ کا دارالسلطنت ہے۔ لہٰذا بیر ڈھول یا 'دیر پانڈیہ کا سرا یقیناً محض ایک استعارہ تھا جس کو خسرو نے اس موقعہ کے لیے اختراع کیا تھا۔ دول رانی میں اس کو اس (لفظ) کے استعمال کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن پٹن کا لفظ بہت ہی مبہم ہے، چوں کہ سنسکرت میں اس کے معنی 'ایک شہر' ہے۔

(1) خسرو دیر پانڈیہ اور سمندر کے درمیان ایک طویل مکالمہ پیش کرتا ہے لیکن اس کی کوئی تاریخی قدر و قیمت نہیں ہے۔

(2) کم (ک۔ ب۔ م) کی شناخت اب تک نہیں کی جا سکی ہے۔

حفاظت کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس کے دونوں جانب ایک درہ تھا، ایک (کانام)[1] ترملی اور دوسرے کا تابر تھا[1]۔ وہ درّوں سے تیر کی طرح گزرے اور ایک دریا (کاویری) کے کنارے بابو پر خیمہ زن ہوئے۔ اس کے بعد وہ مردی۔ نامی ایک قلعہ کے پاس، جس کو انہوں نے نقارہ بجاکر (جنگ کرکے) فتح کیا۔ ذیقعدہ 2 (مارچ) کے مہینے کے ایک جمعرات کو فوج کنواری (کاویری) کے کنارے سے بیر ڈھول (ویرچول) کی جانب ویر پانڈیہ کی تلاش میں روانہ ہوئی۔ دونوں بھائیوں میں خانہ جنگی کے باعث کوئی (موثر) مزاحمت ممکن نہ تھی۔ دونوں ہی صرف فرار کے امکانات پر غور کر سکتے تھے۔ خسرو کا بیان بعض جدید مصنفین کی اس بات کی مکمل طور پر تردید کرتا ہے کہ ایک بھائی نے دہلی فوج کی مدد چاہی جیسا کہ ہم دیکھیں گے کافور نے دونوں بھائیوں کو شکست دی۔

جب فوج ویرچولا کے نزدیک پہنچی تو ویرپانڈیہ نے بحر عرب کے کسی جزیرے میں بھاگنے کو سوچا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ تھا۔ لہٰذا جبکہ دشمنوں کی فوج ویرچولا کے مضافات میں تھی اس وقت ویرچولا اور اسکے رایوں نے فرار کی تیاری کی۔ غروب آفتاب کے بعد وہ کہم کے شہر کو بھاگ گیا۔ اور وہاں سے کچھ دولت اور لوگوں کو لے کر وہ کندور (کنانور) کے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن چونکہ وہ یہاں بھی اپنا قدم جمانے میں ناکام ہوا اس لیے وہ شیروں اور ہاتھیوں سے بھرے جنگل میں بھاگ گیا۔

ویرچولا میں فوج نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو پایا جو رائے کی خدمت میں تھی۔ لیکن چونکہ رائے غائب ہو گیا تھا اس لیے ان کو ہتھیار ڈالنا پڑا۔ وہ مرتدوں کی مانند قابل گردن زدنی تھے لیکن انہیں معاف کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

جب شاہی فوج ایک سیلاب کی مانند ویرچولا میں داخل ہوئی تو اس نے پایا کہ

---

(1) کندور یقیناً کنانور ہے جو کہ سری رنگم سے تقریباً چھ میل دور کولیرون دریا کے شمالی کنارے پر نسبتاً بڑے دریا کے اس پار واقع ہے۔ کنانور اس وقت یک اہم جگہ ہوگی۔ چونکہ وہ ویر بلال سوئم کے زمانہ تک ہوئے سالاؤن کا دارالسلطنت تھا؛ (ڈاکٹر کے۔ اس۔ انگر)

o (اصل عبارت یہ ہے 'وابر کافر مزاج کے بہ ہندوئے سیہ پوش مانست از قوس قزح کمان ہندوی کشیدہ، کزائن الفتو، 163۔ مترجم)

'بیر (کندال) بھاگ گیا تھا اور ڈھول (سرا) خالی تھا؛ اس کے بعد 'ہندو صفت (Hinduminded) کالے بادل مع ہندوی قوس قزح، دخل انداز ہوئے اور خسرو اس کا نتیجہ یوں بیان کرتا ہے:

"آپ کہہ سکتے ہیں کہ ابر ایک 'پردہ تقدیر تھا' جو کہ فتح مند فوج کے سامنے آگیا تاکہ مفرور لوگوں کو پناہ مل سکے۔ شاہی فوج اور راوتوں کے بیچ بارش میں بھی جنگ ہوئی اس کے بعد زمین پر ہڈیاں نظر آئیں"۔

اصل فوج ویرچولا میں خیمہ زن رہی لیکن اس کے باوجود کہ اطراف کے دیہی علاقے میں اس قدر سیلاب تھا کہ سڑک اور کنویں میں تمیز کرنا مشکل تھا، ایک دستہ ویر پانڈیہ کی تلاش میں بھیجا گیا۔ انہوں نے ایک گاؤں دیکھا جہاں ہندوؤں نے اپنے پانی پر بلبلوں کے مانند اپنے خیمے لگا رکھے تھے۔ لیکن فوج کے آنے پر وہ غائب ہو گئے۔ آدھی رات میں یہ خبر ملی کہ رائے کنڈور (کنانور) میں تھا اور بارش ہی میں فوج روانہ ہو گئی لیکن رائے وہاں نہ تھا۔ 'ہندو اپنے کھوئے ہوئے سر (دار) کو کھوج رہے تھے اور اس کھوج میں وہ اپنا سر بھی کھو بیٹھے۔ بعض راوتوں نے حالت ناامیدی میں پیدا ہو جانے والی جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا ہو گا۔ جب بادل چھٹ گئے تو خزانوں - موتیوں اور قیمتی پتھروں سے لدے ہوئے 108 ہاتھی پائے گئے اور شاہی خزانے کے افسروں کے حوالے کر دیئے گئے۔ یہ شبہ تھا کہ رائے شاید جل کوٹ[1] (پانی کا قلعہ) گیا ہو، جو اس کے اسلاف کا قدیمی شہر تھا۔ وہ عجلت کے ساتھ اس تلاش میں روانہ ہوئے۔ جل کوٹ سے آتے ہوئے لوگوں نے بتایا کہ رائے وہاں نہ تھا۔ اس نے چند ساتھیوں کے ساتھ جنگل میں پناہ لی تھی۔ اور اس طرح اپنی جان بچائی تھی۔ ویرپانڈیہ کو ڈھونڈ نکالنا ضروری تھا چونکہ صرف وہی ایسا معاہدہ کر سکتا تھا جس کا اطلاق پوری مملکت پر ہو سکتا

---

(1) یہ یقیناً ایک مضبوط قلعہ رہا ہو گا جس نے بعد کی صدیوں کے دوران ایک اہم رول ادا کیا اور جو برطانوی عہد میں دیو کوٹا کہا جاتا تھا۔ دراصل یہ نیو کوٹا ہے، یعنی جزیرہ میں قلعہ، جس کو عام طور سے ٹیکوٹائی کہتے ہیں جو لیرو کے دہانے پر ہے۔ لیکن اس زمانہ میں شمال کی جانب اس جزیزہ کے اندر تک پھیلا ہو گا۔ جو دریا نے وہاں پر بنا دیا ہے (ڈاکٹر کے۔ ایس آئنگر)

(2) ڈاکٹر آئنگر اسے برہماپوری چرامبرم سے شناخت کرتے ہیں چونکہ اس کی بھی ایک سنہری چھت تھی۔

تھا۔ لیکن ملکوں کی مجلس نے یہ طے کیا کہ اس کوشش کا نتیجہ مایوس کن ہی ہوگا اور کنانور (کندور) لوٹ آئے۔

اگلی صبح یہ خبر ملی کہ برمت پوری کے مقام پر ایک طلائی مندر ہے اور یہ کہ رائے کے ہاتھ اس کے گرد اس طرح گھوم رہے تھے جیسے سورج کے گرد بادل۔ فوج وہاں کے لیے روانہ ہوئی اور آدھی رات کو وہاں پہنچی۔ دوسرے دن اس نے 250 ہاتھیوں کو حاصل کیا۔ کافور نے تب طلائی مندر کا رخ کیا جس کی چھت اور دیواروں میں لعل اور ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ کافی زبردست بربادی اور لوٹ مار ہوئی۔ جہاں کبھی جواہرات چمکتے تھے وہاں تلوار چمکی۔ جہاں گلاب کے پانی اور مشک سے دلدل بن جاتے تھے وہ جگہ اب کو خون اور گرد سے لت پت تھی۔ اور مشک سے معطر زمین سے اب خون کی بو آرہی تھی۔" طلائی بت جن کو لنگ مہاویر کہا جاتا تھا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ اور نارائن کی مورتی زمین پر گر گئی۔ دفن کیے ہوئے خزانوں کا پتہ چلانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس کے بعد وہ دستہ ویرچولا میں مقیم اصل فوج سے ملنے کے لیے روانہ ہوا اور اس جگہ پر 3/اپریل 1311ء (سوموار 13/ذیقعدہ 710ھ) کو وہاں پہنچا۔ ویرچولا کے مندر کی نیو کھود ڈالی گئی۔

دس (؟ چار) دنوں بعد سرخ چھتر کو جنبش میں لایا گیا۔ 17/اپریل 1311ء (جمعرات 17/ذیقعدہ 710ھ) یہ کانم کے شہر میں پہنچی اور وہاں سے (روانگی 5 دنوں بعد یہ متھورا (مدورا) پہنچی جو کہ سندرپانڈیہ کا دارالسلطنت تھا، رائے اپنی رانیوں کے ساتھ بھاگ گیا تھا اور اس نے جگنار (سوکاناتھ[2]) کے مندر میں دو یا تین ہاتھی چھوڑ دیے تھے کافور اتنا برہم ہوا کہ اس نے اس مندر میں آگ لگا دی۔ ست بندرامیشیر، میں کافور کے ایک مسجد بنانے کا واقعہ، اور ہندو رایوں کا اتنار واداد ہونا کہ انہوں نے اس

---

(1) (متذکرہ بالا) دستہ کے شامل ہونے کے کم از کم 4 دنوں بعد یہ فوج روانہ ہوئی ہوگی۔ دس شاید کتابت کی غلطی کی وجہ سے ہے۔ پروفیسر آئنگر کانم کو کدم باوانم سے شناخت کرتے ہیں۔

(2) ایلیٹ کی اس تجویز کو کہ یہ مندر جگن ناتھ یعنی وشنو کو منسوب تھا، ڈاکٹر آئنگر قابل قبول نہیں سمجھتے، جو ہمیں یہ یقین دلاتے ہیں کہ جگنار لفظ چوکاناتھ کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے جو کہ شیو یا سندرار لیش شہر مدورا کے سرپرست دیوتا کا ایک متبادل تامل نام ہے۔ (ہوذی والا ص:257)

کو مسمار نہ کیا۔ یہ سب بعد کی من گھڑت باتیں ہیں۔ اس کا ذکر فرشتہ میں ملے گا۔ لیکن اگر کافور نے مسجد بنائی ہوتی تو خسرو یقینی اس کا ذکر کرتا۔ اگر فرشتہ کے زمانہ میں رامیشورم میں کوئی مسجد تھی تو یہ بعد کی نسلوں کی تعمیر کی ہوئی ہوگی۔

فوج کا کام تمام ہو چکا تھا۔ خسرو کے مطابق اس نے 512 ہاتھی 5000 ہزار گھوڑے اور پانچ سو من وزن کے بیش قیمت پتھر حاصل کیے تھے۔ 25/اپریل 1311ء (اتوار 4 ذی الحجہ 711ھ) کو فوج واپسی پر روانہ ہوئی۔ 19/اکتوبر 1311ء (سوموار 4 جمادی الثانی 711ھ) کو علاؤالدین نے ایک عام دربار کافور اور فوج کے افسروں کے خیر مقدم کے لیے منعقد کیا۔ بڑے بڑے امرا اور ٹیکہ دار رائے صف در صف کھڑے تھے۔ اور بسم اللہ (خدا کے نام پر) اور رہدایت اللہ (خدا تمہاری ہدایت کرے) کی صدائیں حاضرین کے درمیان گونج رہی تھیں۔ خسرو لکھتا ہے کہ کمانڈر اعلا نے ایک ایسی خدمت انجام دی تھی جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اور اس کے ساتھ کے امیروں اور کمانڈروں نے جہاد کی روایات تازہ کرنے میں اپنی جانیں جوکھم میں ڈال دی تھیں۔ اگر ہم جہاد کو لوٹ کھسوٹ کے مترادف مان لیں تو فرشتہ یہ کہنے میں شاید صحیح ہے کہ علاؤالدین نے جو دولت حاصل کی تھی وہ سلطان محمد غزنوی (کی حاصل کردہ دولت) سے زیادہ تھی۔ سوائے معبر کے جہاں رائے کا پتہ نہ چل سکا تھا، مندروں کو نہیں لوٹا گیا۔ کسی بھی حالت میں ایک جارح فوج کے لیے جوار تلاش نہیں کیا جا سکتا پھر بھی جنوب بعید کی مہموں کے لیے جو فوجی منصوبہ بندی کی گئی تھی وہ ہمیں حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ علاؤالدین نے اپنی دونوں مطلوبہ باتیں حاصل کر لیں۔ اپنے اقتدار اعلا کی قبولیت اور کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دولت۔ جبکہ عدم الحاق کی اس کی عقل مندانہ پالیسی نے کافور کے لیے اس کا موقعہ فراہم کیا کہ وہ دکن اور جنوب بعید میں عہد وسطیٰ کی سب سے کامیاب فوجی مہم کی قیادت کر سکے۔

7

علاؤالدین خلجی۔ اواخر سال، کافور

نو مسلموں[1] کا قتل عام

19/اکتوبر 1311ء کی عظیم الشان مجلس کے انعقاد کے قبل سلطان نے ایک منصوبہ بند قتل عام کے ذریعہ ملک کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ سلطان نے کافور کے ساتھ پانچ افسروں کو تعینات کیا تھا جن کا کام یہ تھا کہ آگے جا کر معبر میں حالات دریافت کریں۔ ان میں سے ایک اباجی مغل نے جو ایک مذہب تبدیل کردہ منگول یا نو مسلم تھا، ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے مترجموں کو ہندوؤں کو یہ بات بتانے کو کہا۔ لیکن ہندوؤں کا حملہ غیر متوقع اور اچانک طور پر ہوا اور مترجم ایک تیر سے مارا گیا۔ جب تین دنوں کے بعد اباجی اصل فوج کے پاس واپس آیا تو کافور نے اسے قید کر دیا۔ جب فوج دہلی پہنچی تو سلطان نے اباجی کا سر قلم کر دینے کا حکم دیا۔ اس سبب سے ایک سازش ہوئی۔

اس وقت دہلی میں دس ہزار سے زیادہ نو مسلم یا منگول تھے، برنی کے مطابق بعض نو مسلم ایک عرصہ سے ملازمت میں تھے اور ان کی تنخواہیں اور انعامات کو (شاہی) خزانے کے قوانین کے مطابق کم کر دیا گیا تھا۔ چونکہ سلطان اپنے بازوؤں کو پرواز کرنے کے لیے صرف ایک کپڑے کا جامہ پہن کر آتا تھا اور اس کے ساتھ جو لوگ ہوتے وہ مسلح نہیں ہوتے تھے اس لیے سازشیوں نے یہ امید کی تھی کہ دو یا تین سو منگول گھوڑا سوار سلطان اور اس کے ساتھ موجود مصاحبوں کو مار ڈالنے اور نو مسلموں اور ان کے ہندستانی پیروؤں کی حکومت کی تشکیل میں کامیاب ہو جائیں گے۔

برنی لکھتا ہے کہ جب سلطنت کی فلاح کا سوال ہوتا تو علاؤالدین کسی قسم کی بندش یا لحاظ

---

(1) عصامی، ص: 91-288، برنی، 32-331 (نوٹ: ص 45-334 ہونا چاہیے۔)

پر دھیان نہ دیتا۔ خواہ مذہبی (تعلق) ہو یا خون کا رشتہ یا دوسرے کے حقوق۔ سلطان کے ایجنٹوں نے سازش کا پتہ لگا لیا۔ اور اس نے اپنے افسروں کو ایک خفیہ حکم دیا کہ سلطنت کے وہ تمام نو مسلم جن کے پاس جاگیریں[2] ہوں، (جاگیر دارانہ) ان کو ایک مقررہ دن قتل کر دیا جائے۔ اس جابرانہ حکم کے تحت تقریباً 20 یا 30 ہزار نو مسلموں کو جن کو اس سازش کی کوئی خبر نہ تھی قتل کر دیا گیا۔ اور ان کے بیوی بچوں کو عسرت کا شکار بنا دیا گیا۔

خضر خاں کی شادیاں

1307ء میں جب دول رانی کو آٹھ سال کی عمر میں شاہی محل میں لایا گیا تھا اس وقت خضر خاں کی عمر 10 سال تھی۔ اور اس کی ماں نے سلطان کے حکم کے مطابق، اس سے کہا تھا کہ وہ اس کی زوجیت میں ڈال دی جائے گی۔ خضر خاں کی عمر اتنی ہو چکی تھی کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ لیکن دول رانی اتنی کم عمر تھی کہ وہ یہ باتیں نہ سمجھ سکی ہو گی۔ پھر بھی چونکہ نو عمر شہزادہ کسی حد تک اس کے بھائی سے ملتا جلتا تھا

اور دول رانی اس کے ساتھ رہا کرتی تھی اس لیے ان دونوں میں ایک گہری محبت ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد شاہی پالیسی میں تبدیلی آ گئی۔ شاید خضر خاں کی ماں کی خواہش کی بنا پر۔ اور یہ طے کیا گیا کہ خضر خاں کی شادی اس کے ماں کے بھائی الپ خاں کی لڑکی سے کی جائے۔ اس شادی کی تیاریوں میں تین سال صرف ہوئے۔ اور 2/ فروری 1312 (بدھ 23/ رمضان 711ھ) کو یہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ انجام پائی۔ تمام بڑے افسروں کو حاضری دینی تھی۔ اور رائے رام دیو نے دیوگیری سے آنے کی زحمت گوارا کی۔ رخصتی 9/ اپریل 1312 (یکم ذی الحجہ 711ھ) کو ہوئی۔ لیکن چونکہ اس شادی سے خضر خاں کی دول رانی سے ''محبت کا علاج'' نہ ہوا اس لیے اس کے والدین نے اس کے ساتھ ایک نجی تقریب میں شادی انجام دینے کی اجازت دی۔

---

(1) شاید اس لیے کہ یہ گرمی یا برسات کا موسم رہا ہو گا۔ برنی یا عصامی کوئی تاریخ نہیں لکھتے۔ یہ سازش معبر سے فوج کی واپسی کے فوراً ہی بعد ہوئی ہو گی۔

(2) برنی ص: 331 یہ شرط (جو کاتب کا اضافہ معلوم ہوتی ہے) بے مطلب معلوم ہوتی ہے۔ تمام نو مسلموں کو قتل کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں جاگیر کے لفظ کا استعمال مغل عہد میں کیا جاتا تھا اور برنی کے زمانہ میں مستعمل نہ تھا۔

(3) دول رانی، ص: 323-91، عصامی ص: 314-24

شاید یہ واقعہ 1315 کے موسم گرما کا ہو۔ اس کے کچھ دنوں بعد خضر خاں نے امیر خسرو کو اپنی محبت کے متعلق ایک مثنوی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور ان کو وہ مسودہ دکھایا جو اس نے تیار کیا تھا۔ شاعر نے یہ کام قبول کر لیا۔ اور عمدہ ترین طور پر انجام دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس طور پر مشہور مثنوی دول رانی خضر خاں (عشقیہ بھی کہی جاتی ہے) تیار ہوئی۔ خسرو لکھتا ہے کہ وہ اس کام میں چار مہینے اور چند دنوں تک مصروف رہا۔ اور یہ کہ اس نے یکم فروری 1316 کو اسے تمام کیا۔ یہ کتاب خضر خاں وارث تخت کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار کی گئی تھی۔ اور کتاب کے متعدد حصہ میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ خضر خاں آئندہ بادشاہ ہوگا۔ لیکن جبکہ کتاب زیر تصنیف تھی خضر خاں بدقسمتیوں کا شکار ہو گیا۔ اور خسرو بھی کسی حد تک اسکے رویہ کا نکتہ چیں بن گیا۔ علاؤالدین خلجی کا 4ر جنوری 1316ء کو انتقال ہو گیا اور جب شاعر نے یہ مثنوی تمام کی اس وقت خضر خاں گوالیر کے قلعہ میں قیدی بنا کر اندھا کر دیا گیا تھا۔ بعد میں، شاید مبارک شاہ کے انتقال کے بعد، اس نے مبارک شاہ کے حکم پر تین شہزادوں کے قتل کے متعلق 319 اشعار کا اضافہ کیا۔ اس طرح وہ مثنوی جسے بطور ایک رومان پیش کیا جانا تھا۔ اس کا اختتام ایک المیہ کی طرح ہوا۔ دول رانی کی اندرونی شہادت کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ علاؤالدین نے ستمبر یا اکتوبر 1315ھ تک اپنے کام حسب معمول انجام دیے۔ اس کی بیماری کی شدت کا دور زیادہ طویل نہ تھا۔

ملک کافور دیوگیری میں

دہلی سے واپسی کے کچھ دنوں بعد رام دیو کی موت ہو گئی۔ اور اس کا لڑکا بھلاما دہلی کے خلاف باغی ہو گیا۔ کافور، جسے معبری کی مہم کے کچھ دنوں بعد ملک نائب (ایجنٹ یا ذاتی نمائندہ) کا خطاب شاید دے دیا گیا تھا، کو بغاوت فرد کرنے کے لیے وقتی طور پر اس مملکت کی ذمہ داری سنبھال لینے کے لیے بھیجا گیا۔ جب کافور نے گھاٹ سگون نامی درہ عبور کر لیا تو بھلاما فرار ہو گیا۔ اور کافور نے خون خرابہ کے بغیر دیوگیری پر قبضہ کر لیا۔ عصامی جس نے شاید ایسے لوگوں سے ملاقات کی ہو گی جنہیں کافور کی

---

(1) خصوصی طور پر ملاحظہ ہو دول رانی (ص 74)

حکمرانی کا زمانہ یاد تھا۔ اس کا بہت مداح ہے۔ کافور کا سب سے اہم مسئلہ مراٹھہ کو اپنی طرف ملا لینا تھا اور اس میں وہ کامیاب ہو گیا، اس نے کسی کو قتل یا قید نہیں کیا، شہر کے لوگوں نے اس کی مخالفت کے زیر سایہ آزادی پائی۔۔۔ اس نے ان لوگوں کو حفاظت کی یقین دہانی کے خطوط لکھے جو بد ظن ہو گئے تھے اور تمام مرہٹہ لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔ کسی حکمراں کا عدل اس کی مملکت کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو کسی باغ کے لیے موسم برسات کی بارش، کمپیل میں ایک ہفتہ (قیام) کے علاوہ کافور دیوگیری ہی میں رہا۔ اس کے بعد اسے سلطان کے لڑکے شادی خان کی الپ خاں کی ایک دوسری لڑکی کی شادی میں شریک ہونے کا فوری حکم ملا اور وہ ایک ہفتہ میں دہلی پہنچ گیا۔

علاؤالدین کے افسروں کے تین ترتیب وار گروپ

کئی دہائیوں بعد اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے برنی نے علاؤالدین کے افسروں کو تین ترتیب وار گروپوں[1] میں منقسم کیا۔ پہلے گروپ، جس میں وہ الغ خاں، نصرت خاں، ظفر خاں، الپ خاں، ملک علاالملک (بزرگ) ملک فخر الدین جونا، داد بک، ملک اصغری سر دوات دار اور ملک تاج الدین کافوری، کا شمار کرتا ہے۔ جنہوں نے علاؤ الدین کو اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالنے میں مدد کی۔ اس کی اہلیت اور کارگزاری پر کوئی شبہ کیا یہ نہیں جا سکتا۔ "لگاموں کی ایک جنبش سے وہ ایک مملکت کو فتح کر سکتے تھے۔ اور (دوسری جانب) ایک عقل مندانہ اور دوررس اقدام کے ذریعہ وہ وسیع علاقہ میں پھیلے ہوئے ہنگاموں کو دبا سکتے تھے۔ لیکن (عام) انسانوں کے بیرونی (باتوں پر مبنی) فیصلے کے مطابق وہ لوگ سلطان جلال الدین کے قتل کے ذمہ دار تھے اور وہ نئی حکومت کے تحت تین یا چار سالوں سے زیادہ تک نہ قایم رہ سکے۔ برنی یہ لکھنا بھول جاتا ہے کہ الپ خاں ایک مستثنا کی حیثیت رکھتا ہے۔

علاؤالدین کے افسروں کا دوسرا گروپ بھی کارگزار افراد پر مشتمل تھا، مثلاً ملک

---

(1) خزائن الفتوح میں کافور کا بحیثیت ملک نائب کبھی ذکر نہیں ہوتا۔ ملک نائب یا نائب ملک کو ولی (Regent) کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ مغل عہد میں اس کا ہم معنی لفظ وکیل ہے۔ وہ خطاب جو بیرم خاں نے اختیار کیا تھا۔

(2) عصامی ص: 325-27

حمید الدین، ملک عزوالدین (اعلا دبیر کے بیٹے)، ملک عین الملک ملتانی، نظام الدین الغ خان (جالور کا گورنر اور الپ خاں کا بھائی)، ملک شرف قآنی اور خواجہ حاجی ملک حمید الدین نائب وکیل دار تھا، ملک عزیز الدین دبیر ممالک، ملک شرف قآنی نائب وزیر اور خواجہ حاجی نائب عرض تھا۔ ان ممتاز افسروں کی وجہ سے چار وزارتیں (محکمے) (ریاست، انشاء، لگان، جنگ) جن پر حکومت کی تمام تفصیلات اور معاملات کا انحصار ہے اتنی کارگزار ہو گئیں کہ کسی اور زمانے یا پشت میں اس طرح کی مثال کا ذکر نہیں ملتا۔

اپنی سلطنت کے اواخر چار یا پانچ سالوں میں علاؤالدین ملک نائب پر بہت زیادہ مہربان ہو گیا تھا اور اس کو سلطنت کا سب سے بڑا افسر بنا دیا۔ حمید الدین اور عزیز الدین برطرف کر دیے گئے اور شرف قآنی کو قتل کر دیتا گیا۔ لہٰذا چاروں (متذکرہ بالا) وزارتوں میں سے کسی کا بھی وقار باقی نہ رہا۔ سوائے محکمہ جنگ کے۔ بہاالدین دبیر، جسے عمدہ الملک کا خطاب ملا۔ ایک بیوقوف وزیر تھا۔ علاؤالدین تجربہ کار وزراء اور افسران کو خود سے دور رکھتا اور صلاح و مشورہ کا طریقہ بالکل ترک کر دیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ سلطنت کا اقتدار اس کے خاندان کے افراد اور افسروں کے ہاتھوں میں مرکوز رہے اور عام پالیسی یا تفصیلات سے متعلق تمام امور اس کی واحد (ذاتی) خواہش پر مبنی ہوں۔ لہٰذا اس نے امور سلطنت میں غلطیاں شروع کر دیں۔[1]

حسبِ عادت اپنا یہ تبصرہ کرنے کے بعد کہ نیچے درجہ کے لوگوں کی تقرریوں کی وجہ سے انتظامیہ کا حال بگڑ رہا تھا۔ برنی لکھتا ہے: "گرچہ علاؤالدین کے اواخر میں ملک قیران امیر شکار اور ملک قیرابیگ کو بڑی عزت حاصل تھی پھر بھی انہیں کوئی

---

(1) برنی، ص: 331-38

(2) اکثر کاتب دیوان ریاست یا وزارت صنعت و تجارت کی جگہ پر دیوان رسالت لکھنے کی غلطی کرتے ہیں جس کا مطلب محکمہ خط و کتابت ہے اور جو دیوان انشا (سکریٹریٹ) کے مترادف ہے۔ لفظ دبیر کا مطلب سکریٹری ہے۔ عزیز الدین کو اس لیے مقرر کیا گیا تھا کہ وہ اپنے باپ کی مدد کر سکے جو نائب دیوان انشا (یا دبیر ممالک) تھا اور یہ یقین تھا کہ وہ (عزیز الدین) اپنے باپ کی جگہ لے گا۔ لیکن برنی کے مطابق دیوان رسالت یعقوب ناظر کو ملی تھی۔ ملک حمید الدین کو بحیثیت وزیر ریاست اس جگہ ملی ہو گی گرچہ برنی اس کے وکیل دار (دربار میں معاملات کی پیشی کا انچارج) کے پرانے خطاب کے ساتھ اس کا ذکر کرتا ہے۔

(1) برنی، ص: 331

عہدہ یا جاگیر نہ ملی تھی۔ انہیں اعزاز حاصل تھا مگر وہ تنہا ہو گئے، جہاں تک علاؤالدین کے افسروں کے آخری گروپ کا تعلق ہے، برنی کا بیان غلط بیان اور مبالغہ دونوں ہی کا شکار ہے۔ علاؤالدین کے کردار میں امرد پرستی کا کوئی عنصر نہ تھا اور اگرچہ کافور ایک خواجہ سرا تھا پھر بھی کافور کے ساتھ علاؤالدین کا کوئی غلط قسم کا تعلق نہ تھا سوائے اسکے کہ دوسرے تمام افسروں کے برخلاف کافور کا کوئی رشتہ دار یا پیروکار نہ تھا اس لیے کہ اس پر زیادہ اعتماد تھا۔ علاؤالدین نے غیر دانش مندانہ طور پر یہ سوچا کہ جب اس کے خاندان کے لوگوں سے اس کو ناامیدی محسوس ہو رہی تھی تو وہ کاور پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ اس کی عمر کے آخری سالوں میں علاؤالدین کے پاس کافی وفادار افسر تھے، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، انہوں نے اور ان کے جانشینوں نے سلطنت دہلی کو تین اور پشتوں تک قایم رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اور مرکزی حکومت کے مکمل زوال کے بعد بھی علاؤالدین کی روایات پندرہویں صدی کے صوبائی (حکمراں) خاندانوں کی انتظامیہ میں ظاہر تھیں۔ لیکن اپنی بیس سالہ حکومت میں علاالدین نے اپنے افسروں کو اپنا اپنا عہدہ اور مقام سمجھنے کی ترتیب دی تھی اور ان کے درمیان ایک اجتماعی جذبے کی نشوونما کو روکا تھا۔ ادھر اس کے افسروں نے اپنی اپنی حفاظت کا رویہ اختیار کیا۔ وہ صاحب تخت کی پیروی کریں گے لیکن وہ بادشاہ بنانے کا محل کی اندرونی سازشوں میں حصہ نہ لیں گے جس سلطان سے وہ محبت کرتے تھے اور جس کی عزت کرتے تھے وہ مر رہا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے علاج کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ تھا اس ڈر سے کہ اس پر بادشاہ کے قتل کا الزام نہ لگایا جائے۔

لہٰذا اپنے آخری دنوں میں، جب ناقابل برداشت تکلیف اور بیہوشی کے دورے یکے بعد دیگرے پڑ رہے تھے، اس وقت سلطان کے پاس ملک نائب کافور ہی واحد صلاح کار بچ رہا تھا اور کافور، جس کی کارگزاریاں بحیثیت ایک انتظام کار اور پانچ کامیاب مہموں کے کمانڈر تک بے داغ رہی تھیں، نے ناقابل معافی سازشوں اور جرائم کے ذریعہ ریاست پر مکمل اختیار حاصل کر کے اپنی یقینی بربادی سے خود کو بچانے کی ناکام کوشش کی۔ چونکہ سلطان کے اعلا افسران معاملات میں غیر جانبدار رہتے تھے، جن کو وہ سلطان کے ذاتی امور سمجھتے تھے۔ اس لیے ناگریز طور پر محل میں دو

پارٹیاں بن گئیں۔ ایک طرف گجرات کا گورنر الپ خاں اور اس کی بہن ملکہ جہاں تھی۔ ان کی صورت حال اس وجہ سے اور بہتر ہو گئی تھی کہ دونوں وارثان تخت، خضر خاں اور اس کے چھوٹے بھائی شادی خاں کی شادیاں الپ خاں کی بیٹیوں سے ہو گئی تھی۔ برنی لکھتا ہے کہ الپ خاں اور ملک نائب کافور کے درمیان ایک سخت جان لیوا دشمنی تھی۔ اس کی نفرت کی وجہ نہیں بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ روز بروز بڑھتی گئی۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر الپ خاں کی پارٹی بادشاہ پر اثر انداز ہو گئی تو وہ کافور کا صفایا کر دے گی۔

علاؤالدین کے آخری دن، الپ خان کا قتل، خضر کا محروم الارث اور مقید ہونا

یہ کہنا مشکل ہے کہ علاؤالدین کی اصل بیماری کیا تھی۔ برنی اسے استسقا لکھتا ہے۔ امیر خسرو اشارہ کرتا ہے کہ یہ جگہ کی بیماری تھی۔ اور عصامی، جو خود کو باہری علامات مرض ہی تک محدود رکھتا ہے، لکھتا ہے کہ سلطان کمزور اور نحیف ہو گیا تھا اور شدید درد نے اس کی قوت فیصلہ کو متاثر کر دیا تھا۔ اور بے ہوشی کے متواتر دوروں کا باعث بن گئی تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ "درد کی شدت آدمی کو دیوانہ بنا دیتی ہے اور ناگزیر طور پر وہ غافل اور غیر محتاط ہو جاتا ہے، فرشتہ نے بعض مآخذ کی بنا پر صورت حال کو مختصراً بیان کیا ہے، چونکہ خضر خاں اور ملکہ جہاں خود کو لامتناہی ضیافتوں اور جشنوں میں مشغول کیے ہوئے تھے اور اس کے علاج اور تیمارداری کی فکر نہ کرتے تھے، اس لیے سلطان نے اپنی بیماری کو ان کی بے پروائی سے منسوب کیا اور اس کا دل ان کی طرف سے بھر گیا، خضر خاں کی اپنی دلچسپیاں تھیں۔ دعوتیں، محفل شراب، چوگان، ہاتھیوں کی جنگ، بہت سارے برے قسم کے مصاحب اسکے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اور امیر خسرو کو ہمیں یہ بتانے میں کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا کہ ان کی نظم کے ہیرو کا کردار بہت حد تک رو بہ زوال ہو گیا تھا۔ اس کی ماں بھی اپنا وقت ان تقریبوں میں صرف کرتی جو غیر تعلیم یافتہ اور پردہ نشیں عورتوں کو بہت مرغوب ہے۔ تقریبات شادی، ختنہ وغیرہ۔ وہ ایک بات جس کی طرف ان کی توجہ نہ ہوئی وہ سلطان اور اس کی بیماری تھی اور ہر روز وہ کسی ایسی حرکت کے مرتکب ہوتے جس سے اس کا شبہ اور ناراضگی بڑھتی

جاتی۔ لہٰذا سلطان نے ملک نائب کو دکن سے اور الپ خاں کو گجرات سے بلایا اور ان کی فوری آمد سے خوش ہوا۔

چتوڑ فتح کے بعد علاؤالدین نے خضر خاں کو ایک ایسی عمر میں اپنا جانشین مقرر کر دیا جبکہ اس صلاحیتوں کو پرکھا نہیں جا سکتا تھا اور اس نے اس مضمون کا وثیقہ تیار کر کے اپنے اعلا افسروں سے دستخط کرالیا تھا۔ اس لیے ہر شخص کو یقین تھا کہ خضر خاں اپنے باپ کا جانشین ہوگا۔ لیکن خضر خاں کا کردار اس کی تربیت اور ماحول کی وجہ سے خراب ہو گیا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ 18یا16 برس کی عمر سے ہی عیش وعشرت کا اتنا دلدادہ ایک نوجوان سلطنت کی ذمہ داریوں کا بوجھ نہ سنبھال سکے گا۔ جب نوجوان شہزادے نے باپ کی علالت کے دوران اس کی نافرمانی شروع کر دی تو علاؤالدین (نامزدگی کے معاملہ میں) مزید غور و خوض کرنے لگا۔ دہلی پہنچنے پر الپ خاں اور کافور نے یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ سلطان زیادہ دنوں تک زندہ نہ بچے گا۔ اس کے بعد جو جدوجہد ہوئی اس میں کافور کو دو فائدے حاصل تھے۔ ملک نائب کی حیثیت سے سلطان کی نیابت میں جو مملکت کے انتظام کا۔ اختیار اسے حاصل تھا۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ بہت سے اعلا شاہی افسر اس کے ماتحت رہ چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ جبکہ الپ خاں سلطنت کے ایک بڑے افسر کی حیثیت سے سلطان سے رسماً تعظیم کے لیے حاضر ہوا۔ کافور بحیثیت ایک وفادار غلام کے محل کے زریں منزل میں رہتا تھا اور اس نے سلطان کے کمرہ اور اس کے علاج کی ذمہ داری سنبھال لی۔ لیکن اس نے آہستہ آہستہ قدم اٹھایا۔ سلطان کو پہلا مشورہ یہ تھا کہ الپ خاں کو اپنے صوبے میں واپس جانے کا حکم دے اور چونکہ الپ خان نے تامل کیا یا حکم کی نافرمانی کی اس لیے اس نے سلطان کے دماغ میں بہت سارے شکوک بیدار کر دیے۔ اسی وقت خضر خاں نے جس نے سلطان کی صحت یابی کے لیے ہستناپور کے بزرگوں کے مزاروں پر پیدل جا کر دعا مانگنے کی منت مانی تھی۔ اپنی منت پورا کرنے کا عہد کیا۔ لیکن وہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر گیا اور اپنے ساتھ گویوں اور رقاصاؤں کو ساتھ لے جا کر ہر شخص کو منغض کر دیا۔ خسرو لکھتے ہیں کہ حسین دوشیزاؤں کی زلفیں ہر وقت اس کے ہاتھ میں ہوتیں جیسے کہ

---

(1) دول رانی، 236

پرہیزگاروں کے ہاتھوں میں تسبیح ہوتی ہے۔

اس کی غیر حاضری میں الپ خاں مار دیا گیا۔ برنی لکھتا ہے کہ کافور نے سلطان سے الپ خاں کے قتل کا حکم حاصل کر لیا۔ عصامی لکھتا ہے کہ سلطان نے ایسا حکم صادر کرنے سے انکار کر دیا لیکن یہ فیصلہ خدا کے آگے اور خود ان کے ضمیر کے آگے جوابدہی (کی شرط) کی ساتھ ملک کافور کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ کافور نے، جو ان دونوں میں سے زیادہ قوی تھا سلطان کے کمرے کے نزدیک ہی ایک انفرادی مقابلہ میں اس کو قتل کر دیا اور اس کی لاش کو ایک قالین میں لپیٹ کر دفن کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد خضر خاں کو جو میرٹھ میں تھا، سخت احکامات روانہ کیے گئے۔ اسے تمام علامات سلطانی چھتر، دور باش (عصا)، ہاتھی اور علم جو اسے تخت کے جانشین کی حیثیت سے دی گئی تھیں، بلا تاخیر واپس کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسے گنگا اور ہمالیہ کے درمیان کا علاقہ دیا گیا تاکہ وہ شکار اور دوسری تفریحات میں مشغول ہو کر الپ خاں کی موت کا غم بھلا سکے۔ اسے امروہہ میں اپنا صدر مقام قایم کرنا تھا اور وہیں دو تین مہینوں تک رہنا تھا۔ اور بلا بلائے دہلی نہیں آنا تھا۔ خضر خاں نے ملک حسام الدین کی معرفت علامت سلطانی واپس کر دیا اور خود امروہہ روانہ ہو گیا۔ لیکن وہاں دو یا تین دنوں رہنے کے بعد اس نے بغیر اجازت دہلی لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ علاؤالدین نے پہلے تو اسے گلے لگایا لیکن چونکہ وہ اپنے حکم کی نافرمانی کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس لیے اس نے خضر خاں کو قیدی بنا کر گوالیر لے جانے کا حکم دیا۔ اس نے کافور سے ہر طرح کی قسمیں جیسے خدا کی، رسول کی، شریعت کی، دین کی، سلطان کے حق نمک اور تلوار کی قسمیں لیں کہ وہ شہزادے کی آنکھ کو نقصان نہ پہنچائے گا اور اس کی جان نہیں لے گا۔ شہزادہ اور متعدد عورتوں کو، مع دول رانی، ڈولوں میں سوار کر کے دو دنوں میں گوالیر لے جایا گیا۔ خسرو کے مطابق خضر کی سزا کی وجہ سے علاؤالدین کی حالت اور خراب ہو گئی۔[1]

---

(1) امیر خسرو (دول رانی، ص: 233-54) اور عصامی (ص: 329-35) دونوں ہی بیمار سلطان کے بستر کے نزدیک اس جنگ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ خسرو زیادہ قابل اعتماد ہے چونکہ اس نے درباری حلقوں میں روز بروز کے حالات کے متعلق سنا ہوگا۔ لیکن اس کی اصل توجہ خضر خاں کے انجام پر مرکوز تھی۔ اس کے برعکس، عصامی نے واقعہ کا سب سے زیادہ معتدل بیان پیش کیا ہے۔

سوانہ کے گورنر کمال الدین گرگ کو حکم دیا گیا کہ الپ خاں کے بھائی اور جالور کے گورنر، نظام الدین الغ خاں کو قتل کر دے۔ جب وہ یہ کام انجام دے چکا تو اسے گجرات بھیجا گیا۔ جہاں الپ خاں کی وفادار فوج نے حیدر اور زیرک کی قیادت میں بغاوت کر دی تھی۔ باغیوں نے کمال الدین گرگ کو گرفتار کر لیا اور سخت اذیتیں دے کر مار ڈالا۔ اسی وقت چتوڑ کے رانا نے بغاوت کر دی اور دکن میں رام دیو کے داماد، پرپال دیو نے اپنے سپاہیوں کو جمع کیا اور کئی ایک تھانوں پر قبضہ کر لیا۔ ملک دینار شحنہ پیل کو گجرات بھیجا گیا۔ باغیوں نے سلطان کا خط پھاڑ دیا اور اس کے پیغامبر کو مار ڈالا اور ملک دینار سلطان کی موت کی خبر سن کر گجرات کی سرحد پر سے واپس ہو گیا۔

عصامی کے بیان سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ سلطان نے تمام معاملات کافور پر چھوڑ دیے تھے اور سکون کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن خسرو اور برنی لکھتے ہیں کہ اس کا دماغ بہت پریشان تھا، اوّل الذکر لکھتا ہے کہ اس کے دل میں تین زبردست عناصر (جذبات) میں کشمکش ہو رہی تھی۔ بیٹے کے لیے محبت، بیماری اور بدمزاجی یہ تینوں عناصر نے اس کے جگر پر قابو حاصل کر لیا تھا اور موت نے اس کشمکش کا خاتمہ کیا۔[1]

عصامی کے مطابق ایک دن کافور نے سلطان کے بستر کے نزدیک ہی بڑے بڑے سول اور فوجی افسروں کی میٹنگ بلائی۔ یہ طے کیا گیا کہ رام دیو کی بیٹی جھتیاپالی کے بطن سے پیدا علاؤالدین کے ایک بیٹے شہاب الدین عمر کو، جو اس وقت چھ سالوں اور چند مہینوں کا تھا، اس کا جانشین بنایا جائے اور یہ کہ کافور کو نائب یا ولی کا عہدہ ملے۔ جبکہ مشورہ جاری تھا سلطان کی حالت خراب ہو گئی اور بیماری کی وجہ سے اس کی زبان سرخ ہو گئی تھی۔ کمزوری اور غشی کے سبب وہ مجلس کے دوران ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ پھر

---

(1) دول رانی، ص: 259

(2) عصامی، ص: 335-36

(3) دول رانی، ص: 260-64، علاؤالدین کے موت کی صحیح تاریخ دول رانی میں دی گئی ہے۔ (ص: 259)

(4) برنی، ص: 369، نہ تو جامع مسجد کا اور نہ علاؤالدین کی قبر کا نشان مل سکا ہے۔ شاید سری کے آثار کے کسی ڈھیر کے نیچے وہ دبی پڑی ہیں۔

بھی تمام حاضر لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ خاموشی اجازت عطا کرتی ہے۔

4/ جنوری 1316ء (6 شوال 715ھ) کو رات کے آخری حصہ میں علاؤالدین کا انتقال ہوا۔ ملک نائب نے مرحوم سلطان کی انگلی سے شاہی انگوٹھی نکال لی اور اسے سنبل کے حوالہ کر کے اسے فوراً گوالیر جانے کا حکم دیا۔ قلعہ کا انتظام اپنے ذمہ لینے اور اس کے حاکم کو دہلی روانہ ہونے کا حکم دینے کے لیے وہ انگوٹھی کو اپنے اختیارات کی سند کے طور پر استعمال کرے گا۔ جیسے ہی قلعہ پر اس کا اختیار قایم ہو جائے گا۔ وہ خضر خاں کو اندھا کر کے واپس آ جائے گا۔ اس قبیح کام کے بدلے امیر حاجب کا اعلا عہدہ اسے ملے گا۔ ہر کام حسبِ حکم انجام دیا گیا۔ سنبل کو روانہ کرنے کے بعد کافور نے دکھاوے کے کچھ آنسو بہائے اور رات کے اختتام کے وقت سلطان کی لاش کو سری کے محل سے باہر لایا اور جامع مسجد کے باہر اس کے مقبرہ میں، جس کی تعمیر قبل ہی ہو چکی تھی، دفن کر دیا۔

سلطان شہاب الدین عمر، ملک کافور[1] کی حکومت

علاؤالدین کی موت کے ایک دن بعد ملک نایب نے ملکوں اور امیروں کی ایک میٹنگ بلائی اور شہاب الدین عمر کو تخت نشین کر دیا۔ اس نے ان کے سامنے ایک وثیقہ پڑھا جس کے مطابق علاؤالدین نے خضر خاں کو محروم الارث کر کے شہاب الدین کو اپنا جانشین بنا دیا تھا۔ مرحوم سلطان کے تمام بیٹوں مبارک خاں (سب سے بڑا)، شادی خاں، فرید خاں، عثمان خاں، محمد خاں، ابو بکر خاں، سبھوں کو نئے نئے بادشاہ کی قدم بوسی کے لیے کہا گیا۔ ملک نائب نے چاروں وزارتوں لگان، انشا، جنگ اور ریاست کو حکم دیا کہ علاؤالدین کے عہد کے تمام قوانین اور ضوابط کو جاری رکھا جائے۔ مزید یہ کہ وزارتوں کے سب ہی افسر پالیسی اور تفصیلات کے متعلق تمام باتوں میں اس سے حکم لیا کریں، جیسے کہ وہ مرحوم سلطان سے لیا کرتے تھے۔ اقتدار کے ان 35 دنوں میں جو اسے حاصل ہو سکے، کافور ہر صبح کو ہزار ستون محل کی چھت پر ایک مختصر المدت دربار کرتا، اس کے بعد وہ کمسن سلطان کو اس کی ماں کے پاس بھیج دیتا۔ درباریوں کو رخصت کر دیتا اور نچلی منزل پر اپنی رہائش گاہ میں آتا۔ جہاں افسر اس سے حکم لینے کو

---

(1) برنی، ص: 272-77، عصامی ص: 337-44، فرشتہ ص: 123-24

موجود رہتے تھے۔ کافور کے ہاتھوں میں اقتدار کا تبادلہ آسانی کے ساتھ ہو گیا تھا اور اس نے جو واحد ایک مہم اپنے ذمہ لی اس کی انجام دہی میں اس کے حکموں کی تعمیل کی گئی۔ دیوگیری سے روانہ ہوتے وقت اس نے عین الملک ملتانی کو ذمہ داری سونپی تھی۔ اب اس نے عین الملک ملتانی کو حکم بھیجا کہ اپنے تمام سپاہیوں کے ساتھ دہلی واپس آ جائے۔ اس سے پرانی شاہی خاندان کے کسی شہزادہ کو مملکت پر قبضہ کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ لیکن یہ عین الملک کی ذمہ داری نہ تھی اس نے کافور کے حکم کی تعمیل کی۔ جب وہ شمال کی جانب کوچ کر رہا تھا تو اسے اور پیغام ملا کہ اسے گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اسے حکم دیا گیا کہ وہ گجرات کے باغیوں کی سرزنش کرے۔ عین الملک اس جانب مڑ گیا لیکن جب وہ چتوڑ کے نزدیک تھا تو اسے خبر ملی کہ ملک کافور کو مار دیا گیا تھا اور اس نے اور اس کے افسروں نے یہ طے کیا کہ جہاں وہ تھے وہیں رُکے رہیں۔

فیروز شاہ اپنی فتوحات میں کافور، جس کے مقبرے کی اس نے مرمت کی تھی، کا ذکر احترام کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس کے خلاف کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور اگر وہ ان دو اصولوں کا پابند رہتا جس کی اس سے توقع کی جاتی تھی۔ اپنے آقا کے خاندان کی عزت اور بڑے ملکوں کے مشورے سے ملک کی حکومت تو اس کے برسر اقتدار رہنے کی امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن علاؤالدین کے بستر مرگ کے نزدیک (رہنے کے دوران) جنوب بعید کا یہ عظیم کمانڈر ایک نہایت پست قسم کی سازشوں میں مشغول ہو گیا۔ اس نے اپنے آقا کے خاندان کے افراد کو ضرر پہنچانا شروع کر دیا اور اس کا خدشہ تھا کہ کسی بڑے دربار (بار) میں وہ تمام علاقائی امرا کو گرفتار کر کے قتل کرادے گا۔ لیکن جو کچھ وہ واقعی کر سکا وہی کافی گھناؤنا تھا۔ اپنی حکومت کے پہلے دن ہی اس نے حجاموں کو حکم دیا کہ شادی خاں، جو خضر خاں کا سوتیلا بھائی تھا، کی آنکھ کے دیدوں کو تراش کر نکال دیں۔ علاؤالدین کی خاص ملکہ، ملکہ جہاں کی تمام جائداد اور جواہرات ضبط کر لیے گئے اور اسے ایک گوشہ (بے توجہی) میں ڈال دیا گیا۔ کافور کو خضر خاں کے حامیوں کی بغاوت کا اندیشہ تھا اور وہ ان کا تختہ الٹ دینے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مبارک خاں کو صرف قید کیا۔ جو خضر خاں کا ہم عمر تھا۔ اور اسے فوری طور پر اندھا نہیں کرایا۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ خواجہ سرا ہونے

کے باوجود کافور نے رائے رام دیو کی بیٹی، جھتیاپالی سے شادی کر لی۔ شاید اس لیے کہ سلطان کا (اس طرح) سوتیلا باپ بن جانے کی وجہ سے اس کی حیثیت بڑھ جائے گی۔

مرحوم سلطان کے محافظ دستہ کے سپاہیوں نے، جنہیں پائک کہا جاتا تھا اور جن کے درجے 50 یا سو کے کمانڈروں جیسے تھے۔ محل کے دروازے بند ہو جانے کے بعد کافور کو اپنے سازشی شرکاء کے ساتھ خفیہ باتیں کرتے دیکھا۔ اپنے چار سرداروں، مبشر، بشیر، صالح اور منیر کی قیادت میں انہوں نے یہ طے کیا کہ ان کا یہ فرض تھا کہ اپنے انجام کی پروا کیے بغیر کافور کو قتل کر کے خاندان کے افراد کی مزید بربادی کو روکیں۔ کافور کو اس سازش کا شبہ ہو گیا اور اس نے مبشر کو اپنے کمرہ میں بلایا۔ مبشر نے مسلح ہو کر جانے پر اصرار کیا۔ سلطان علاؤالدین کے سامنے بھی اسے یہ خصوصی اختیار حاصل تھا اور کافور پر اپنی تلوار کا وار کیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھی بھی داخل ہوئے اور کافور کا سر کاٹ دیا۔ ان لوگوں نے دو یا تین دربانوں کو بھی مار ڈالا جنہوں نے کافور کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد وہ مبارک کے قید خانہ کی طرف بڑھے اور اس کی ہتھکڑیاں کاٹ دیں۔ جب اگلی صبح حکومت کے بڑے بڑے افسر آئے تو انہوں نے ملک کافور کو مردہ اور مبارک خاں کو موجود پایا۔ خسرو لکھتا ہے کہ کافور نے تلوار اور نمک کی قسم کھائی تھی لہٰذا نمک نے تلوار بن کر اس کی گردن کاٹ لی، جو کچھ بھی ہوا اس پر کسی نے اظہار تاسف نہ کیا۔

8

قطب الدین مبارک شاہ خلجی

نیابت، تخت نشینی اور ابتدائی پالیسی[1]

جب اگلے دن[2] امرا دربار میں اکٹھا ہوئے تو انہوں نے نائب ملک یا ریجنٹ کی خالی جگہ مبارک خاں کو دی۔ موخر الذکر نے اسے قبول کرنے سے معذرت کی۔ بطور نائب اس کی صورتِ حال بہت مشکل اور اس کی جان غیر محفوظ ہو گی۔ ان لوگوں کو اسے اپنی ماں کے ساتھ کسی دوسرے ملک جانے کی اجازت دے دینا چاہیے۔ پھر بھی امرا کی دلیل قابل قبول تھی اور اس نے خود کو آمادہ کر دینے کے لیے (انہیں) موقعہ دیا۔ مرحوم سلطان نے ایک چھ سالہ لڑکے کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی لیکن سبھوں نے اسے قبول کر لیا۔ اور اس غلطی کا ازالہ فوری طور پر نہ کیا جا سکا۔ مبارک کو کچھ عرصہ تک بحیثیت نائب کام کرنا چاہیے اور اس کے بعد وہ مناسب کارروائی کریں گے۔ چند ہفتوں تک بحیثیت نائب کام کرنے کے بعد مبارک نے یہ شکایت کی کہ خورد میاں سلطان کی ماں اور رام دیو کی بیٹی جھتیاپالی نے اس کو زہر دینے کی کوشش کی تھی۔ شہاب الدین کو قیدی بنا کر گوالیار بھیجا گیا اور اسے اندھا کر دیا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جھتیاپالی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ 18/اپریل 1316ء (اتوار 24/محرم 716ھ) کو پورے تزک و احتشام کے ساتھ مبارک تخت

---

(1) عصامی ص:47-344، برنی 89-379

(2) ہمارے ہم عصر ماخذ میں سے کوئی بھی ملک کافور کے قتل کی صحیح تاریخ کا ذکر نہیں کرتا۔ بقول عصامی کافور ایک مہینہ اور بقول برنی 35 دنوں نائب رہا۔ جب یکم فروری 1316ء کو خسرو نے دوال رانی کے اصل حصہ کو ختم کیا تو اس وقت کافور زندہ تھا۔ چونکہ اس کے قتل کا ذکر ان 319 اشعار میں ہے جو شاعر نے مبارک شاہ کے قتل کے بعد کتاب میں اضافہ کیے تھے۔

نشین ہوا۔ ملک کافور نے علاؤالدین کے تمام قوانین و ضوابط کی تعمیل پر زور دیا تھا۔ بحیثیت نائب مبارک کی پالیسی کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تخت نشینی کے قبل اس نے اپنی کوئی پالیسی پر عمل شروع نہیں کیا۔

برنی لکھتا ہے کہ اپنی تخت نشینی کے وقت مبارک نے ایک صالح شہزادہ ہونے کا تاثر دیا۔ اور (اس کی) سلطنت کے پہلے درشت اقدام کے لیے ہم بہ مشکل اسے موردِ الزام قرار دے سکتے ہیں۔ وہ محافظ فوجی، باپایک جنہوں نے کافور کا قتل کیا تھا، اپنی حیثیت کو بالکل بھول بیٹھے۔ انہوں نے دعوا کیا کہ انہوں نے مبارک کو تخت نشین کیا تھا، شور و ہنگامے کے ساتھ دربار میں داخل ہونے اور تخت شاہی کے حضور اپنا سلام عرض کرنے کے لیے انہوں نے بڑے بڑے امرا پر بھی سبقت حاصل کر لی۔ بڑے بڑے امراء کی برابری میں وہ خلعت اور بیٹھنے کی جگہ کا مطالبہ کرتے۔ مبارک نے جو کسی طرح بھی ذاتی طور پر ان کا مرہونِ منت نہ تھا، ان کو ایک دوسرے سے علاحدہ کر دینے کا حکم دیا اور انہیں ملحقہ شہروں میں لے جا کر قتل کر دیا گیا۔[2]

نئے سلطان کے اقدام میں پہلا قدم یہ تھا کہ نئی سلطنت کے لیے مقبولیت حاصل کی جائے گرچہ یہ کام علاؤالدین کے معاشی قوانین اور ضوابط کے زبردست ڈھانچے کو الٹ کر ہی کیا جا سکتا تھا (بقول فرشتہ) ان ضوابط میں سے ہر ایک کا مقصد عقلمندانہ اور مفید تھا۔ اپنی تخت نشینی کے دن اس نے ان تمام لوگوں کو جن کو علاؤالدین نے قید کرا دیا تھا تقریباً ۱۲ ہزار لوگ آزاد کر دیا خواہ وہ سیاسی جرائم یا رشوت خوری کے مرتکب ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض ۲۰ سالوں سے قید میں تھے اور ان میں کسی کو بھی پھر آزاد ہونے کی امید نہ تھی۔ فطری طور پر وہ نئے بادشاہ کے بہت مشکور تھے۔ علاؤالدین کی اواخر سال میں ضرورت مندوں کی طرف سے درخواستوں کی ممانعت

---

(1) فہد سپہر، ص:51

(2) مبارک کے متعلق یہ قصے کہ وہ اپنے پایکوں اور اپنی ماں سے التجا کرتا تھا کہ وہ صوفی بزرگ شیخ زادہ جام سے اس کے لیے دعا کی درخواست کریں، بعد کی من گھڑت باتیں ہیں۔ برنی اور عصامی کے مطابق پایکوں نے کافور کے قتل کے لیے خود ہی پیش قدمی کی۔ اور انہوں نے سلطان علاؤالدین کے حق نمک کے جذبے کے تحت یہ کام کیا۔

کر دی گئی تھی۔ مبارک نے دوبارہ درخواستیں لیے جانے کا حکم دیا اور اکثر و بیشتر یہ احکامات درخواست کرنے والوں کی خواہشات کے مطابق ہوتے۔ اس کی حکومت کے چار سالوں اور چار مہینوں کے دوران سیدوں اور علماء کے لیے عطیات میں اضافہ ہوا۔ سپاہیوں کی تنخواہیں بھی بڑھیں، بہت سے لوگوں کو وہ گاؤں اور راضیات واپس مل گئیں جو علاؤالدین کے دور میں خالصہ میں شامل کر لی گئی تھیں، نئی تنخواہیں اور جاگیریں بھی دی گئیں اپنی فطری نیکی کی وجہ سے سلطان نے تمام بھاری ٹیکسوں کو اور سخت مطالبات کو ختم کر دیا اور ساتھ ہی وزارت لگان میں مار پیٹ اور قید و بند کے استعمال کو بھی[1] علاؤالدین کے معاشی ضوابط بالکل غاب ہو گئے۔ خوبصورت لڑکوں اور خواجہ سراؤں اور دلفریب دوشیزاؤں کی قیمتیں 500، 1000 اور 2000 ٹنکوں تک بڑھ گئیں۔ غلوں اور دیگر اشیاء کی قیمتیں بھی بڑھیں اور سرائے عدل (میں عائد ہونے) والے ضوابط سب ختم ہو گئے۔ اجرتیں چار گنا بڑھ گئیں۔ ایک نوکر کی تنخواہ، جو 10 یا 12 ٹنکے ہوا کرتے تھی۔ اب 70، 80 ٹنکے (سالانہ) ہو گئی۔ ملتانی سوداگر پھر اپنے نجی کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ سوداگر اور دوکاندار اب جس طرح چاہتے ویسے ہی اپنا کاروبار کرتے۔ گرچہ نشہ کی ممانعت کے متعلق علاؤالدین کے حکم کو نئے سلطان نے جاری رکھا اس حکم کی خلاف ورزی مختلف طور پر کی جاتی اور شہر میں شراب لائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اس تبدیلی سے مستفیض ہوئے تھے وہ علاؤالدین کو کوستے اور نئے سلطان کو دعائیں دیتے۔

برنی لکھتا ہے کہ سلطان قطب الدین نے علاؤالدین کے کسی بھی قانون یا ضابطے کا نفاذ نہ کیا لیکن چونکہ مرحوم سلطان کے (بعض) افسر اپنی جگہوں پر قایم تھے اور ان کے زیر انتظام وسیع علاقے تھے۔ اس لیے سلطنت کے پہلے سال میں صوبائی حکومتیں اور مستحکم ہو گئیں۔ کسی بھی جانب کوئی ہنگامہ یا فساد نہ کھڑا ہوا اور لوگوں کے دل (نئی) حکومت سے مطمئن تھے۔ یقیناً کچھ نئی تقرریاں بھی ہوئیں اور نئے خطابات دیئے گئے۔ مرحوم سلطان کے شحنہ پیل ملک دینار کو ظفر خاں کا خطاب ملا (اور) بعد

---

(1) برنی، 82-83 الخ

میں سلطان نے اس کی لڑکی سے شادی کرلی۔ سلطان کی ماں کے بھائی (نیائی) محمد مولانا کو شیر خاں کا خطاب ملا لیکن اسے کوئی عہدہ دینے کا ذکر نہیں ملتا۔ مولانا بہاء الدین کے بیٹے مولانا ضیاء الدین خطاط، جس نے سلطان کو خطاطی سکھائی تھی، کو قاضی خاں کے خطاب کے ساتھ صدر جہاں مقرر کیا گیا۔ اسے اپنے نیزے میں سنہرے جھنڈے باندھنے (بند زر) کا خصوصی اختیار بھی دیا گیا۔ مرحوم سلطان کے ایک بہت ہی پرانے افسر ملک قرابیگ کو تقریباً 14 (مختلف) عہدے ملے اور اس کے بعض بیٹے بھی اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیے گئے۔

حسن برادرو اور سلطان کے اخلاقی تنزل کا معاملہ

قطب الدین اندھا کیے جانے اور قتل کیے جانے سے بال بال بچا تھا۔ اور جب وہ تخت نشین ہوا تو اسے انسانی تکلیفوں کا واقعی لحاظ تھا۔ لیکن جیسے جیسے انکی صورت حال مستحکم ہوتی گئی اس نے اپنے انتخاب کو خدا کی مرضی (کے مطابق) سمجھنا شروع کر دیا اور خلیفۃ اللہ (خدا کا نمائندہ) کا خطاب اختیار کر لیا، جو ہم اس کے سکوں پر کندہ پاتے ہیں۔ چونکہ خلفاء راشدین نے بھی خود کو صرف پیغمبر کا خلیفہ (نمائندہ) کہا تھا اس لیے مبارک کا دعویٰ طفلانہ اور احمقانہ تھا۔ لیکن ہمیں اس سے یہ اندازہ ملتا ہے کہ اس کا دماغ کس طرح کام کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے درباریوں سے سوال کرتا ہے کہ "کیا تم میں سے کسی کو بھی یہ توقع تھی کہ تخت نشین ہونگا؟" اور جب نفی میں جواب دیتے تو وہ دعویٰ کرتا کہ صرف خدا نے (کے حکم سے) اسے تخت پر بٹھایا ہے۔ اور صرف خدا ہی اس کو ہٹا سکتا تھا۔ معاشی ضوابط کے علاوہ جن کو قایم رکھنا اس کی صلاحیت سے باہر تھا، مبارک نے اپنے باپ کی پالیسی کے مطابق ہی کام کیا۔ لیکن وہ اپنے (جنسی) جذبات پر قابو نہ رکھے گا۔ شاید وہ قابو رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

مبارک کے کردار کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اس نظریہ کو قبول نہ کرلیں کہ وہ پیدائشی طور پر جنسیاتی گمرہی کا شکار تھا۔ وہ ایک سرگرم مرد پرست تھا اور ساتھ ہی غیر جنس (عورتوں) کے ساتھ بکثرت مباشرت کا دلدادہ بھی۔ غیر جنس (عورتوں) کے ساتھ خواہش مباشرت کی تسکین وہ بآسانی کر سکتا تھا کیونکہ

سلطان کے حرم میں عورتوں کی کمی نہ تھی۔ عصامی لکھتا ہے کہ جب بھی سلطان کسی مہم پر جاتا تو اس کے حرم کی چنندہ دوشیزائیں اس کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر جاتیں۔ اس کی امرد پرستی بھی اس کی بربادی کا سبب نہ بنتی اگر وہ مناسب قسم کے رضامند لونڈوں کا انتخاب کرتا۔ سارا ہندستان اس کے انتخاب کے لیے دستیاب تھا۔ اور اس کے افسر مناسب کاروائی انجام دیتے۔ بدقسمتی سے وہ حسن اور حسام الدین نامی دواخیافی بھائیوں کی محبت میں گرفتار ہو گیا جو کہ نارمل طبیعت کے نوجوان تھے لیکن وہ جبراً سلطان کی امرد پرستی پورا کر کے ہی اپنا جاہ و چشم کو قایم رکھ سکتے تھے۔ مبارک کا پسندیدہ حسن تھا۔ لیکن جب حسن موجود نہ ہوتا تو اس کی جگہ حسام الدین لیتا۔ یہ کوئی پوشیدہ معاملہ نہ تھا۔ چونکہ مبارک حسن کو کھلے دربار میں گلے لگاتا اور چومتا تھا۔ برنی تو جماع کا منظر کا تصور بھی پیش کرتا ہے۔ ان حرکتوں کی کوئی شہادت نہیں ملتی لیکن اس کا ثبوت بعد میں ہونے والے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ لازمی تھا کہ سلطان کی جنسی خواہشات اور تیز ہوتی جاتیں چونکہ ان دونوں بھائیوں سے اس کی محض جزوی تسکین ہوتی تھی جب کہ وہ دونوں بھائی اس حرکت کی وجہ سے اتنی شرمندگی محسوس کرتے کہ ان لوگوں نے اس کو مار ڈالنا جائز سمجھا۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے۔ تغلق نامہ، جو امیر خسرو کی آخری تصنیف ہے، ان دو مہینوں کی جدوجہد کے متعلق ہے جن کی وجہ سے غیاث الدین تغلق کو تخت نصیب ہوا۔ یہ تصنیف اب شائع ہو چکی ہے لیکن چونکہ ہم لوگوں کے زمانہ تک اس کی (مفصل) واقفیت حاصل نہ تھی اس لیے ہمیں عہد وسطیٰ کے ان مورخین کی غلطیوں کی تفتیش کی ضرورت نہیں جو برنی (کی تاریخ کے نسخوں) کے کاتبوں کی غلطیوں کی وجہ سے بھٹک گئے تھے۔ خسرو کے مطابق یہ دونوں بھائی برادرو نام کی ایک فوج پیشہ ذات کے افراد تھے۔ برادرو (ایک جنگجو گروہ کے) ہندو تھے جن کی صفت یہ تھی کہ وہ اپنا سر دینا اور دشمنوں کا سر کاٹنا اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ گروہ ہمیشہ ہندو راؤں کی خدمت میں رہتا تھا چونکہ وہ اپنے حکمراں کے لیے اپنی جانیں

---

(1) برنی بار بار حسن کو 'ولد الزنا' کہتا ہے لیکن ہمارے عظیم مورخ کے لیے یہ محض ایک (معمولی) گالی تھی۔

قربان کرنا اچھی طرح جانتے تھے۔[1]

خواہ وہ راجپوت تھے یا نہیں براداروں کی غالباً ایک ہندستان گیر ذات یا جماعت تھی، جو خصوصی طور پر ہندو راؤں کے محافظ دستوں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انہیں ایک خدمت گزار طبقہ سمجھنے یا گجرات ہی تک محدود[2] مان لینے کے لیے ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں۔

جب 1395ء میں عین الملک ملتانی نے مالوہ فتح کیا تو یہ دو اخیافی برادرو حسن حسام الدین بحیثیت غلام دہلی لائے گئے اور علاؤالدین کے نائب خاص حاجب ملک شادی نے ان کی پرورش کی۔ مبارک کو حسن سے محبت ہو گئی۔ اپنی سلطنت کے پہلے ہی سال میں سلطان نے اسے خسرو خاں کا خطاب دیا اور کافی عزت افزائی کی۔ نوجوانی کی ناعاقبت اندیشانہ حماقت میں سلطان نے مرحوم ملک نائب کے اقطاعات اور فوج کو اس برادو لڑکے کے حوالہ کر دیا۔ اور اپنی ہوس (ہوا) سے برانگیختہ ہو کر اس نے اسے (عہدہ) وزارت بھی تفویض کیا۔[2] برنی جس کے دشنام طرازی کے رجحان کے متعلق کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے اور جو وضاحت کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قارئین کے تصور کے لیے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا آگے چل کر یہ لکھتا ہے جوانی کی مستی اور شہوت کی وجہ سے وہ حسن پر اتنا فریفتہ تھا اور اس قدر مجنونانہ طور پر

---

(1) تغلق نامہ سطور 38-337 (اصل اشعار یہ ہیں:۔

برادو صت ہندو پست سر باز کہ سر باز باشد ہم سر انداز
بوند ایں طائفہ در پیش رایاں کہ جاں باززند بر فرمار دایان

(2) برنی اس کی وضاحت نہیں کرتا کہ وہ لوگ کون تھے۔ لیکن (وہ صرف یہ لکھتا ہے کہ) جب حسام الدین گجرات کا گورنر تھا تب اس نے وہاں کے اپنے رشتہ مند براداروں کو گجرات کے تمام بہادر براداروں کے ساتھ اکٹھا کیا۔ اس جملہ کا ایک غیر محتاط مطالعہ نے یہ تاثر پیدا کر دیا ہے کہ یہ برادو لوگ گجراتی تھے۔ اور طبقات اکبری کے مصنف نے آواز کی مماثلت کی بنا پر انہیں ایک خدمت گزار (خدمتیہ) ذات قرار دے دیا ہے۔ برنی کے متن میں جسے سر سید نے تیار کیا تھا۔ انہیں پروایا بردار لکھا گیا ہے۔ پروفیسر کے (تیار کردہ) متن میں براؤ لکھا ہے۔ تغلق نامہ میں لفظ برادو، صاف لکھا ہے لیکن لفظ براؤ قافیہ اور بحر کی ضرورتوں کو بھی پورا کرے گا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حسن برادو گجرات میں پیدا نہیں ہوا تھا اور وہاں کبھی نہیں گیا تھا۔

اس سے محبت کرتا تھا کہ وہ ایک لمحہ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ کم ذات (بداصل) کمسن بروادی لڑکا، خبث طبع کی وجہ سے اکثر سوچا کرتا تھا کہ جب سلطان اس کے ساتھ بری حرکت کرتا ہوتا یا برسرعام اس کا بوسہ لیتا ہوتا تو اپنے خنجر سے اس کو ہلاک کر دے۔ وہ ولد الزنا ہمیشہ سلطان کی موت کا منصوبہ تیار کرتا رہتا۔ دکھاوے کے لیے وہ ایک بے شرم طوائف کی طرح اپنا جسم بادشاہ کے حوالہ کر دیتا لیکن باطن میں سلطان کی (جنسی) بالادستی کی وجہ سے وہ اپنے دل میں گہرا اور خونی جذبہ رنجش پالتا رہا۔ پھر بھی سلطنت کے پہلے سال کے دوران عوام خوش تھے کیونکہ مبارک کی تخت نشینی نے عدم استحفاظ کے جذبہ کو ختم کر دیا تھا جو علاؤالدین کی موت کے بعد سے طاری تھا۔ اس وقت تک خسرو خاں کو عوام کی نظروں میں کوئی خاص اہمیت کا درجہ نہیں حاصل ہوا تھا۔

گجرات کے متعلق انتظامات

کافور کے قتل کی خبر سن کر عین الملک دیوگیری کی فوج لے کر گجرات جاتے ہوئے چتوڑ میں رک گیا تھا۔ اب سلطان نے ملک تغلق کو اس کے پاس یہ پیغام لے کر بھیجا کہ وہ مہم کو جاری رکھے۔ عین الملک راضی تھا۔ لیکن جب اس نے ملک تغلق کی موجودگی میں امراء کی ایک مجلس منعقد کی تو اعتراضات کی صدائیں بلند ہوئیں۔ انہوں نے سلطان کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کی پالیسی کیا ہوگی۔ اور ان کا مشورہ یہ تھا کہ انہیں اسی جگہ پر ایک یا دو مہینوں تک انتظار کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ سیاسی مطلع کچھ اور صاف ہو جائے۔ تغلق سمجھ گیا کہ وہ اپنے عہدوں کی ضمانت چاہتے تھے۔ وہ اسی دن دہلی کے واپسی سفر پر روانہ ہوا اور سلطان کو یہ مشورہ دیا کہ وہ ہر اہم افسر کے نام ایک علیحدہ فرمان، مع خلعت، روانہ کرے ان تحائف کے ساتھ چتوڑ واپس آنے پر تغلق شاہ نے تمام افسروں کو کوچ کے لیے تیار پایا۔ عین

---

(1) برنی، ص:381

(2) ایضاً، ص:381-82

(3) ص:391

(4) ص:388-89-395,396، عصامی ص:347-52

الملک کو خبر دی گئی کہ وہ اعلیٰ کمانڈر ہو گا جب کہ ہراول کی قیادت تغلق نے کی۔

گجرات کی فوج حیدر اور زیرک کی قیادت میں اس وجہ سے بغاوت کی تھی کہ کافور نے الپ خاں کو قتل کرا دیا تھا۔ چونکہ کافور کو اس کا بدلہ مل چکا تھا اس لیے بغاوت اب بے معنی ہو گئی تھی۔ پھر بھی حیدر اور زیرک نے بغاوت کو جاری رکھا اور انہلوارا شہر کے باہر نکلے۔ عین الملک نے ہر امیر کو علیحدہ علیحدہ خط لکھا۔ اس نے ان کو توجہ دلائی کہ جنگ فضول ہو گی اور اس نے ان میں سے ہر ایک کی نوکری برقرار رہنے کی ضمانت دی بشرطیکہ جنگ کے دن وہ عین الملک کا ساتھ دے۔ اس نے دہلی فوج کے ناقابل تسخیر ہونے کے متعلق بھی اشارہ کیا۔ امراء نے جن کا ارادہ سلطنت کے خلاف بغاوت کا نہ تھا۔ جنگ کے روز دہلی کی فوج میں شرکت کر لی۔ اور حیدر اور زیرک اور ان کے پیرو پناہ ڈھونڈنے کے لیے دور دراز (علاقوں کے) رایوں کے پاس بھاگ گئے۔ عین الملک کے صحیح اندازے اور عقلمندانہ پالیسی اور دہلی کی فوج کی برتر طاقت کی وجہ سے انہلوارا اور سارا گجرات پھر سے مطیع کر لیا گیا۔ اور اس کی فوج مستحکم ہو گئی۔ سلطان نے دینار ظفر خاں، جو علاؤالدین کا ایک پرانا تجربہ کار افسر تھا، کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اور اس کو گجرات کا گورنر مقرر کر دیا۔ ظفر خان نے گجرات کا انتظام اتنے اچھے طور پر کیا کہ تین چار مہینوں کے بعد ہر شخص الپ خاں کا دور انتظام بھول گیا۔ اصل کام یہ تھا کہ ہندو راؤں کے ساتھ مصالحت قایم کی جائے اور برنی ہمیں یقین دلاتا ہے کہ تمام رائے، رانا اور مقدم ظفر خاں کے ساتھ شامل ہو گئے۔

اپنی سلطنت کے دوسرے سال دیوگیری سے واپسی پر سلطان نے ظفر خاں کو بلا کسی بظاہر سبب کے قتل کرا دیا اور خسرو خاں کے بھائی حسام الدین کو گجرات کا گورنر مقرر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ حسام الدین نے مذہب اسلام ترک کر دیا تھا اور صحیح یا غلط طور پر اس زمانہ کے بعد سے اسے مرتد کہا جانے لگا۔ دونوں بھائی سلطان کے قبضہ سے نجات حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ حسام الدین نے اپنے رشتہ داروں اور گجرات میں موجود ممتاز برادؤں کو بغاوت کرنے کی نیت سے اکٹھا گیا۔ لیکن اس کے اقتدار کی جڑیں گہری نہ تھیں۔ گجرات کے امراء نے اسے گرفتار کر کے بیڑیاں پہنا کر سلطان کے پاس بھیج دیا۔ لیکن سلطان نے اسے صرف ایک طمانچہ لگایا اور دربار میں ایک اعلا

عہدے پر مقرر کر دیا۔ اور سلطان کے اس رویہ پر امرا کو جھنجلاہٹ محسوس ہوئی تو دوسرے اقدام سے ایک خوشگوار تعجب بھی ہوا۔ ”وجیہ الدین قریشی کو“ جو نسبتاً اور ذاتی صفات کے اعتبار سے بھی اعلا کمان اور قیادت کا اہل تھا، صدر الملک کا خطاب ملا اور گورنر بنا کر گجرات بھیجا گیا۔ وہ وزرا میں عدیم المثال اور امراء میں بہترین تھا۔ در حقیقت خدا نے اس کی ذات میں تمام صفات مجتمع کر دی تھیں۔“ اس نے جلد ہی حسام الدین کی تمام غلطیوں کا ازالہ کر دیا اور اپنے (حسن) انتظام کے لیے نیک نامی حاصل کی۔ جب عین الملک دیوگیری کا گورنر مقرر ہوا تب وجیہ الدین دہلی بلایا گیا اور تاج الملک کے خطاب کے ساتھ اس کو وزیر مقرر کیا گیا۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ مبارک جس کا کردار اس قدر گر گیا تھا۔ کس طرح اتنی عمدہ تقرریاں کر سکتا تھا۔

دیوگیری[1] پر مبارک کا فاتحانہ حملہ

یہ علاؤالدین کی پالیسی تھی کہ دکن کے کسی حصہ کا انضمام نہ کیا جائے۔ چونکہ ایسے ختم شدہ علاقے کا دور دراز دہلی سے انتظام ممکن نہ تھا۔ بھلاما کی بغاوت نے اس کے لیے اور کوئی صورت نہ چھوڑی سوائے اس کے کہ کافور کو فوری طور پر انتظام سنبھالنے کے لیے بھیجے اور کافور نے ان تمام سرداروں کو جو مطیع ہو گئے بحالی کے خطوط لکھے۔ جب سلطان نے یکایک اسے دہلی بلایا تو کافور نے انتظام حکومت عین الملک کے سپرد کیا پھر اس کی باری میں عین الملک کو کافور نے پوری فوج کے ساتھ دہلی بلایا۔ مناسب اقدام یہ ہوتا کہ وہ علاقہ قدیم یادو خاندان کے کسی شہزادہ کے حوالہ کیا جاتا جسے اس کے

---

(1) خسرو کی نہہ سپہر، ص:146-49، 195-21 برنی، ص:389-93

عصامی ص:352-62 امیر خسرو کی مثنوی مبارک کے حکم پر دربار میں پیش کرنے اور سلطنت کے دوسرے سال کے دوران اشاعت کے خیال سے تیار کی گئی تھی۔ امیر خسرو کے مطابق خسرو خاں کو دوبارہ وارنگل کے محاصرہ کے لیے بھیجا گیا اور رودردیو سے جو کچھ حاصل ہو سکا اسے اکٹھا کرنے کے بعد وہ مبارک سے دہلی کے واپسی سفر میں جاملا۔ برنی نے یہ لکھنے میں صریحاً غلطی کی ہے کہ مبارک نے خسرو کو معبر جانے کا حکم دیا۔ جبکہ وہ خود دہلی روانہ ہوا۔ دوسری طرف عصامی مبارک خاں کی دیوگیری کی فتح کے سلسلہ میں خسرو خاں کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ لیکن وہ خسرو خاں کے یک لاکھی کو مطیع کرنے اور اس کے بعد معبر بھیجے جانے کا تفصیلی ذکر پیش کرتا ہے۔ برنی نے غلطی کی ہے لیکن ہنہ سپہر اور عصامی کے حوالوں سے اس کی تصحیح کی جاسکتی ہے۔ خسرو خاں دکن ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ گیا تھا۔

لوگ قبول کرتے اور جو دہلی کا وفادار ہوتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا کوئی شہزادہ دستیاب نہ تھا۔ مبارک نے رام دیو کے ایک داماد ہرپال دیو کو دیوگیری کا کچھ علاقہ دیا جس پر دہلی کے کسی امیر کی ماتحتی کے بغیر حکومت کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ رگھو نامی ایک شخص نے جسے خسرو حکمراں کا نائب اور وزیر بیان کرتا ہے۔ دیوگیری میں مرکزی اقتدار کا شائبہ قایم رکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے رگھو کی وفاداری پر دہلی کا کچھ حق تھا چونکہ اس نے وفاداری کے ساتھ دہلی کا ساتھ دیا تھا۔

مبارک کی خواہش تھی کہ تخت نشینی کے فوراً بعد ہی دیوگیری روانہ ہو جائے لیکن امراء کا خیال تھا کہ اس طرح کا کوچ غیر محفوظ ثابت ہوگا۔ پہلے انہیں اس کا اقتدار قایم کرنے کا موقع ملنا چاہیے' سلطنت کے دوسرے سال میں (جس کی ابتداء اپریل 1317ء سے ہوئی) مبارک (اس) مہم پر روانہ ہوا۔ جب تلپت میں فوج جمع ہوئی تو اس کے خیمے طول میں تقریباً 3 فرسنگ (10 سے 12 میلوں تک) پھیلے ہوئے تھے۔ کوچ کے دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا دیوگیری نے کوئی مزاحمت نہ کی اور مراٹھا سرداروں نے مبارک کو کوچ کے دوران ہی یا دیوگیری پہنچنے پر اطاعت پیش کی۔ دو قابل توجہ غیر حاضری راگھو اور ہری پال کی تھی وہ بھاگ گئے تھے اور خسرو خاں کو امیر شکار، ملک تغلق کے ساتھ ان کے خلاف بھیجا گیا۔ امیر خسرو کے (اس سلسلہ میں) جغرافیائی حوالے مبہم ہیں۔ رگھو ۱۰ ار ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ پہاڑیوں میں بھاگ گیا۔ اس کے بعد دریا کے کنارے واقع ایک قلعہ کا ذکر ملتا ہے لیکن دہلی کی فوج نے اس کا محاصرہ کرنا چاہا۔ تو رگھو اپنے سپاہیوں سمیت بھاگ گیا۔ رگھو کا تعاقب آگے کرنا مشکل تھا اور اس کی کوشش نہ کی گئی۔ لیکن جب فوج واپس ہو رہی تھی تب خبر ملی

---

(1) اس مہم کے لیے ہنہ سپہر، جو ہمارا ابہترین ماخذ ہے، کم سے کم تفصیل کو زیادہ سے زیادہ الفاظ میں بیان کرتی ہے۔

(2) تلبغہ، ناگوری سے ممیز کرنے کے لیے اکثر اس کو تلبغہ بغدہ لکھا جاتا ہے۔

(3) نہہ سپہر ص: 195-2-2 ہری پال دیو کی گرفتاری کا ذکر کسی وجہ سے دکن کی مہم کے بیان کے اختتام پر پیش کیا گیا ہے۔

(4) خسرو کی نہہ سپہر (ص: 81-132) میں پیش کردہ بیان اس محاصرہ کا واحد وہ ذکر ہے جو ہمیں دستیاب ہے۔ یہ ہم عصر اور قابل اعتماد ہے حالانکہ اس میں خزائن الفتوح جیسی صحیح بیان کی کمی ہے۔

کہ ہرپال دیوان پہاڑیوں میں چھپا تھا۔ خسرو خاں نے اس کو گرفتار کرنے کا کام بغدہ کے بیٹے ملک اختیار الدین تلبغہ (امبر کوہ) کے سپرد کیا۔ دو یا تین جھڑپوں کے بعد رائے ہری پال زخمی ہوا اور گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی گردن میں رسّی ڈال کر سلطان کے سامنے لایا گیا۔ اور مبارک نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔

وارنگل کا دوسرا محاصرہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وارنگل کے پرتاپ رودر دیو نے اپنا خراج کئی سالوں سے نہ بھیجا تھا۔ اور جب خسرو خاں رگھو کے تعاقب کے بعد واپس لوٹا تو سلطان نے اپنے بہترین افسروں کے ساتھ اسے وارنگل کے خلاف بھیجا۔ انتظامات دوبارہ علاؤالدین کے بہترین جنرل خواجہ حاجی کے ذمہ تھے۔ اس کے بعد امیر شکار ملک تغلق کا درجہ تھا۔ وارنگل کا دوسرا محاصرہ پہلے سے مشابہ تھا۔ خسرو خاں نے انام کونڈا پہاڑی سے وارنگل کا جائزہ لیا۔ دروازے کے سامنے ایک جھڑپ کے بعد محافظ فوج قلعہ کے اندر ڈھکیل دی گئی۔ محاصرہ کرنے والوں کی فوج نے دروازہ کو آگ لگا دینا چاہا لیکن شاید کامیابی نہ ہوئی چونکہ ان کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ انہوں نے قلعہ کے گرد اپنے خیمے ڈال دیئے۔ دیور مہتا کی قیادت میں ایک شب خوں کو دو امیروں اودھ کے غازی کامل اور چندیری کے گورنر تمر نے ناکام کر دیا۔ محاصرہ کرنے والے باہری فصیل کے ایک منارے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور پرتاپ رودر دیو کا ایک وزیر انیل مہتا جھڑپ کے دوران گرفتار ہو گیا اور خسرو خاں کے پاس لیجایا گیا۔ جس نے اسے معاف کر دیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد جو طلوع آفتاب کے بعد شروع ہوئی اور دوپہر تک جاری رہی محاصرہ کرنے والوں نے مٹی سے بنے ہوئے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور ملک عنبر اور شہاب عرب کی قیادت میں 1-5 گز چوڑی یا شیب کی تعمیر کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ رائے نے صلح کے لیے دو پیغام بھیجے۔

خسرو نے مصالحت کی گفتگو کا جو شاعرانہ بیان پیش کیا ہے اس کی تفصیلات پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ رائے نے ایک سو ہاتھی اور بارہ ہزار گھوڑے اور جو اس سے ممکن ہو سکا اتنا مال و اسباب بھیجا۔ خسرو نے 5 ضلعوں بدر کوٹ، کیلاش، باسودان،

ایلورا اور کیر کی سپردگی اور 60 سونے کی اینٹوں کے سالانہ خراج کا مطالبہ کیا۔ لیکن کچھ گفت و شنید کے بعد وہ سرحدی قلعہ بدر کوٹ کی ہی علیحدگی اور سونے کی اینٹوں (آجور زر) کے سالانہ خراج پر مطمئن ہو گیا۔ رائے نے خراج کا ایک عہد نامہ تحریر کیا اور اپنے قلعہ کی فصیل سے متواتر تین صبح کو شاہی چھتر کی رسم تعظیم ادا کی۔ علاؤالدین نے رائے کو جو چھتر، دوز باش اور جھنڈے دیئے تھے۔ انہیں ہتھیار ڈالنے کی علامت کے طور پر واپس لے لیا گیا اور وہ نئے سلطان کے لیے تحفوں کے طور لائے گئے۔ سلطان ایک ماہ سے ایلورا میں ٹھہرا ہوا تھا اور خسرو خاں وہاں سے اس سے جا ملا۔ وارنگل کے ہاتھیوں سمیت فوج نربدا کے کنارے سلطان سے ملی۔

اسدالدین کی سازش، مبارک کی سخت گیری

جب کہ مبارک دیو گیری میں تھا تب ہی اسدالدین نے، جو سلطان جلال الدین کے چھوٹے بھائی بغرش خاں کا بیٹا اور ایک کہنہ مشق سازشی اور قدرے نامور جنگ باز تھا، گھاٹی سگون نامی ایک درے سے گزرتے وقت سلطان کے قتل کر دیئے جانے کی ایک سازش کی تھی۔ حرم کی لڑکیوں کے ساتھ بوس و کنار کرتے وقت مبارک اتنا بے پرواہ ہو جایا کرتا تھا سازشیوں کو یہ توقع تھی کہ دس یا بارہ شمشیر باز اسے قتل کر دیں گے اور اُس کے بعد اسدالدین (کی بادشاہت) کا اعلان ہو جائے گا۔ لیکن سازشیوں میں سے ایک آرام شاہ، جس کا باپ خرم کھجوری سلطان جلال الدین کا وکیل دار رہ چکا تھا نے سلطان کو سازش سے آگاہ کر دیا۔ سلطان نے کوچ روک دیا۔ اسدالدین ملک کھجوری اور ملک مصری اور دیگر سازشی رات ہی میں گرفتار کر لیے گئے۔ انہیں اقبال جرم کے لیے مجبور کیا گیا اور اگلی صبح کو شاہی چھتر کے سامنے قتل کر دیے گئے۔ لیکن مبارک شاہ نے یغرش خاں کے پورے خاندان سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ 29 بچے جو یغرش خاں کی نسل سے تھے، جو اپنے گھروں سے باہر نکلنے کے قابل بھی نہ تھے، سلطان کے حکم سے دہلی میں گرفتار کیے گئے۔ اور بھیڑوں کی طرح ذبح کر دیے گئے۔ یغرش کی جمع کردہ جائداد ضبط کر لی گئی اور اس کے خاندان کی عورتوں کو سڑکوں پر بھیک مانگنے کو

---

(1) یہ دو نام، کھجوری اور مصری، صرف ایک بعد کی تاریخ، تاریخ مبارک شاہی میں ہمیں ملتے ہیں۔

چھوڑ دیا گیا۔

جھائن پہنچنے پر مبارک نے اپنے تینوں بھائیوں خضر خاں، شادی خاں اور شہاب الدین عمر جو اندھے کیے جا چکے تھے اور جن کو گوالیر میں بحیثیت قیدی کھانا اور کپڑا ملا کرتا تھا، مار ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ سلطان کے حفاظتی دستہ کا سردار شادی کھتری اس کام کو انجام دینے کے لیے اور ان کی عورتوں کو دہلی لانے کے لیے بھیجا گیا۔ ان قتلوں کا ذکر خسرو نے ان اشعار میں کیا ہے جو اس نے دول رانی میں بعد میں جوڑے تھے۔ جب شادی کی آمد کا مقصد معلوم ہوا تو عورتیں رونے لگیں۔ نابینا شہزادے باہمت طور پر قلعہ کے باہر آئے لیکن ان کے بازوؤں میں کوئی طاقت یا ان کے جسموں میں کوئی قوت باقی نہ تھی، شادی خاں نے کوتوال پر حملہ کر دیا اور اسے پٹخ دیا۔ لیکن اس کے پاس کوئی اسلحہ نہ تھا اور یہ ایک بیکار کوشش تھی بہرحال پر نابینا شہزادے کو زیر قابو رکھنے کو دس دس آدمی تھے۔ پھر بھی جب شادی کھتری نے شہزادوں کا سر قلم کرنے کا حکم دے کر چاروں طرف دیکھا تو کوئی بھی اس کام کو کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ بالآخر محافظ دستوں میں سے ایک کم ذات ہندو نے اپنی آستین چڑھائی، شادی کھتری نے اپنی تلوار لی اور ایک ہی وار میں خضر خاں کا سر قلم کر دیا۔ دوسرے دونوں شہزادے بھی اسی طرح قتل کر دیئے گئے۔ شہزادوں کو وجے مندر میں دفن کر دیا گیا جو گوالیار کے قلعہ کا ایک منارہ ہے۔

دیو گیری روانہ ہوتے وقت سلطان کو چاہیے تھا کہ کسی تجربہ کار علاقائی افسر کو اپنی غیر حاضری میں نائب مقرر کر دے۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس نے ایک غلام

---

(1) امیر خسرو کی جانب سے خضر خاں کے ایک پیغام کا ذکر کرتے ہیں جس میں سلطان نے نابینا شہزادہ کو ایک گورنری کی پیشکش کی بشرطیکہ وہ دول رانی کو اس کے حوالے کر دے۔ خضر نے اسے علیحدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بہرحال شہزادوں کے قتل کا کوئی تعلق دول رانی (کے معاملہ) سے نہ تھا جیسا کہ خسرو نے خود ہی وضاحت کی ہے۔ جبکہ اپنی ناراضگی کی وجہ سے سخت دل مبارک شاہ اپنے رشتہ داروں سے اور برہم ہو گیا اور یہ سمجھنے لگا کہ اس کی سلطنت کا استحفاظ تیر تلواروں سے انکی خون ریزی پر منحصر کرتا ہے تو اس نے دشمنی کے جذبے کے تحت تخت کے تمام دعویداروں کے خاتمہ کا فیصلہ کیا۔ (ص:74-273) خسرو کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خضر خاں کی ماں قلعہ میں موجود تھی۔ دول رانی کے انجام کے متعلق ہم قیاس آرائی کر سکتے ہیں لیکن کوئی بات قطعی طور پر معلوم نہیں ہے۔

بچہ کو جسے علاؤ الدین کے زمانہ میں یار یلدہ کہا جاتا تھا۔ لیکن جس کا نام شاہین تھا چنا اور اس کو وفا ملک کا خطاب دیا۔ اور بے دھڑک طور پر دہلی اور اس کی تمام دولت کو اس کے ناتجربہ کار اور ناقابل اعتماد ہاتھوں میں سونپ دیا۔ دہلی لوٹنے پر سلطان نے گجرات کے گورنر ظفر خاں کو قتل کرادیا۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد وفا ملک کو قتل کرادیا۔ کسی طور پر وہ سلطان کے خلاف سازش میں ملوث تھا۔ لیکن تفصیلات معلوم نہیں۔

اسد الدین کی سازش، نے سلطان کو اس کی خطرناک صورت حال سے آگاہ کرنے کے بجائے الٹا اثر کیا۔ اُس نے اسے اور زیادہ بے باک اور خون کا پیاسا بنادیا۔ دہلی واپس ہونے کے بعد اس نے اپنے باپ کے افسروں اور خود اپنے بنائے ہوئے افسروں دونوں ہی کو اپنا مطیع پایا۔ دو صوبوں گجرات اور دیوگیری، کی فتح کا سہرا اسے ملا ہوا تھا اور پوری سلطنت میں امن اور سکون تھا۔

اس (بات) نے سلطنت کے تنزل اور بغاوتوں اور ہنگاموں کا تمام ڈر اس کے دماغ سے دور کر دیا۔ جوانی، طاقت، دولت، ہاتھیوں اور گھوڑوں کی ملکیت، حوصلے، کامیابی، فتح، استحکام، حفاظت اور قدیم اور نئے امرا کی وفاداری کی وجہ سے اس کی بیہوشی اور بڑھ گئی اور اس کی وجہ سے ناعاقبت اندیشی، دہشت زدگی اور ظلم میں اضافہ ہوا۔ اس کے کردار کی صفات غائب ہو گئیں۔ وہ غصیلا، گفتگو میں بیشرم، کینہ پرور اور ظالم بن گیا۔ وہ معصوموں کا کا خون بہانے لگا اور اپنے نزدیک کے لوگوں کے ساتھ گفتگو میں فحش اور بدکلام ہو گیا۔ خاص طور پر دیوگیری سے واپسی کے بعد محل کے یا اس سے باہر کسی شخص کو بھی اس سے سلطنت کے معاملوں پر کھل کر گفتگو کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔[1]

محل کی طرز رہائش کی نفاستیں غائب ہو گئیں۔ سلطان نے عبادات ترک کر دیں اور رمضان کے مہینے میں کھلے عام کھانا کھاتا۔ دو مقتدر امراء عین الملک ملتانی اور قرابیگ، کو ہزار ستون محل کی چھت پر سے بے شرم بھانڈ عورتوں نے اس قدر زور سے گالیاں دیں کہ محل کے صحن میں موجود ہر شخص نے ان کو سنا۔ ایک گجراتی بھانڈ جس کا نام توبہ تھا کو سلطان نے اتنی آزادی دے رکھی تھی کہ وہ ملکوں کی بیویوں اور ماؤں کو گالیاں دیتا۔ ان کے کپڑوں کو گندہ کر دیتا اور کبھی کبھی سلطان کی مجالس میں ننگا

---

(1) برنی، ص: 294-95

ہو کر آتا۔ اور فحش باتیں بکتا۔ خود سلطان کا یہ عالم تھا کہ وہ (اکثر) عورتوں کے کپڑے اور زیورات پہن کر دربار میں آتا۔ ہمیں اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ان حالات کے تحت علاؤالدین کے عہد کا کوئی بھی اعلا افسر اس خود سر سلطان کے ساتھ اتنا ارتباط محسوس نہیں کرتا کہ وہ اسے کوئی مشورہ دے سکے۔ محل میں ان کے بے عزتی کی جاتی " اسے صبر کے ساتھ برداشت کرتے اور (انہوں نے) اسے اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔

ملک یک لکھی کی بغاوت، خسرو خاں معبر میں

دیوگیری چھوڑنے کے قبل سلطان نے اس صوبے کی گورنری ملک یک لکھی کو تفویض کر دی تھی جو علاؤالدین کا ایک ہندو نژاد غلام، افسر تھا جو کہ بردید ممالک (مرکزی سراغرساں افسر) رہ چکا تھا۔ یک لاکھی نے بغاوت کر دی، شمس الدین، کا لقب اختیار کیا اور اپنے سکے جاری کیے۔[1] دیوگیری کے باہر لکڑی کا ایک قلعہ بنوایا لیکن مقابلہ کی تیاری کرنے کے بجائے اس کو خود کو شراب اور موسیقی میں لگا رکھا۔ یہ سن کر مبارک دنوں تک اژدہے کی طرح پیچ و تاب کھاتا رہا۔ تیسرے دن اس نے خسرو خاں کو دیوگیری کی بغاوت فرد کرنے اور اس کے بعد معبر جانے کا حکم دیا۔ پانچ اعلاترین افسروں کو اس کے ساتھ شامل کیا گیا۔[2] یغدہ کا بیٹا تلبغہ، شادی ستیلہ، امیر شکار، قتلغ، تاج الملک اور سب سے آخری، مگر کم اہمیت نہیں۔ خواجہ حاجی، جو کہ وزیر جنگ تھا۔ دیوگیری میں خسرو کو کوئی دقت نہ ہوئی۔ جب وہ گھاٹی سگون پہنچا تو دیوگیری میں موجود تین اعلیٰ ترین افسر، تلبغہ ناگوری، نصیر الدین اور شمد ملک نے اس کو لکھا کہ "گرچہ وہ ایک احمق کے قیدی بن گئے تھے۔ پھر بھی وہ سلطان کے وفادار تھے اور جلد ہی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ بالآخر عمران نامی ایک افسر نے دیوگیری سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر اپنی فوج کو صف آرا کر دیا۔ یک لکھی کو گرفتار کر لیا اور اسے شاہی فوج کے حوالہ کر دیا۔ جب یک لکھی دہلی پہنچا تو سلطان نے اس کی ناک اور کان کاٹ دیئے جانے کا حکم دیا۔ جب کہ اس کے تمام ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا۔ پھر بھی بعد

---

(1) عصامی، ص: 355-62، برنی ص: 397-4-1

(2) ڈاکٹر کے۔ ایس لال خلجیز (ص: 32، 33) شمس الدین محمود شاہ کے نام پر ڈھلے ہوئے دو مخلوط دھات کے سکوں (Billon coins) مورخہ 718ھ کا ذکر کرتے ہیں۔ شاید وہ یک لاکھی کے سکے ہیں۔

میں یک لکھی کو سامانہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ دیوگیری کی گورنری عین الملک ملتانی کو دی گئی۔ دیوگیری کے اشراف کا عہدہ (لگان اور حساب) تاج الملک کو دیا گیا جو اعلادبیر کا ایک لڑکا تھا اور مجید الدین ابورجا نائب گورنر مقرر ہوا۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ مبارک اتنی عمدہ تقرریاں کر سکتا ہے۔ ان تجربہ کار افسروں نے جلد ہی صوبے کی حالت سدھار دی۔

خسرو خاں معبر میں کچھ خاص کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ برنی کے مطابق معبر کے دونوں رائے اپنے دونوں شہروں سے بھاگ گئے اور وہ صرف چند ہاتھی چھوڑ گئے، جن کو خسرو خاں نے قبضہ میں لے لیا۔ مبارک شاہی میں لکھا ہے کہ خسرو خاں نے متلی (موٹر پلا) پر قبضہ کر لیا جہاں سے 26 ہاتھی اور چھ درہم وزن کا ایک ہیرا ملا۔ عصامی لکھتا ہے کہ جب خسرو خاں نے پٹن پر حملہ کیا، جس شہر کا ذکر خسرو نے بھی کیا ہے تو سراج تقی نامی ایک دولت مند مسلمان تاجر کے سوا تمام لوگ بھاگ گئے۔ خسرو نے تقی کی دولت پر قبضہ جما لیا۔ اور اس کی بیٹی سے شادی کا ارادہ کیا۔ اس بدنصیب نے زہر کھا لیا اور اپنی بیٹی کی رسوائی دیکھنے سے بچنے کے لیے اپنی جان دے دی۔ ہمارے تمام ماخذ اس بات پر متفق ہیں کہ مانسون کی وجہ سے شاہی فوج کی نقل و حرکت میں بہت دشواریاں پیش آئیں لیکن ایک طرف خسرو اور دوسری جانب فوج پر واقعی اختیار کے حامل افسروں کے درمیان اختلافات کا اثر اور زیادہ مفلوج کن ثابت ہوا۔ خسرو کی کوشش یہ معلوم ہوتی تھی کہ کسی طرح بھی مبارک کے پنجے سے نکل سکے۔ کسی جزیرہ میں داخل ہو کر یا کسی قلعہ پر قبضہ کر کے۔

گزشتہ واقعات سے واقفیت کی روشنی میں یہ کہنا آسان ہے کہ خسرو کے لیے مبارک کی ناقابل علاج وارفتگی کے پیش نظر اعلیٰ افسروں کو خسرو کی خود اپنی ذمہ داری پر سلطنت کے حدود سے باہر بھاگنے کی کوشش پر چشم پوشی کا رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے فرائض کے متعلق ایک دوسرا، مہلک رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے خسرو خاں پر کڑی نگرانی رکھی اور بالآخر اسے دہلی لوٹنے پر مجبور کیا۔ ان کو یہ امید تھی کہ سلطان خسرو کو سزا دے گا اور انہیں ان کی وفاداری کا صلہ ملے گا۔ سلطان کے حکم کے مطابق خسرو کو دیوگیری سے دہلی تک کہاروں کے بدل دور کے ذریعہ سات یا آٹھ دنوں میں لے جایا گیا۔ اور اس طرح اسے ان اعلا افسروں کے خلاف

سلطان کے دماغ کو بھڑکانے کے لیے دو یا تین مہینوں کا موقعہ مل گیا۔ کئی دہائیوں کے بعد برنی کو یہ اندازہ جس کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہو سکتا تھا، پیش کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ اس بدبخت باغی نے جماع کے وقت جب کہ عجیب کیفیت ہوتی ہے، ملکوں کے خلاف بادشاہ سے شکایت کی[1] سلطان نے اسے ان لوگوں کا کمانڈر بنا کر بھیجا تھا اور ان لوگوں نے اسے قیدی بنا کر واپس بھیجا تھا۔

جب فوج دہلی واپس ہوئی تو ملک تمر اور تلبغہ بغدہ، جنہوں نے اس معاملہ میں سبقت دکھائی تھی، نے خسرو خاں پر الزامات عائد کیے اور اپنے الزامات ثابت کرنے کے لیے گواہ پیش کیے۔ لیکن سلطان اپنے تئیں فیصلہ کر چکا تھا اور خسرو خاں کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔ ملک تمر کو معذول کر دیا گیا۔ اور دربار میں آنے سے منع کر دیا گیا جبکہ اس کا چندیری کا اقطاع خسرو خاں کو تبدیل کر دیا گیا۔ ملک تلبغہ بغدہ کو جس نے خسرو خاں پر الزام لگانے میں زیادہ جسارت کی تھی، منہ پر ایک تھپڑ لگایا اور اسے اس کے اقطاع اور فوج سے محروم کر کے قید کر دیا گیا۔ جن لوگوں نے خسرو کے خلاف گواہیاں دی تھیں انہیں سخت تنبیہ کی گئی اور قید کر کے مختلف شہروں میں بھیج دیا گیا۔ یہ نہیں ذکر کیا گیا ہے کہ دوسرے افسروں کو سزائیں ملیں لیکن تمام متعلقہ لوگوں کے لیے یہ تنبیہ کافی تھی۔

محل کے اندر رہنے والے اور سارے شہر کے باعقل لوگوں کو صاف اندازہ ہو گیا ہے کہ سلطان کی موت قریب آ رہی تھی، سلطنت کے تمام عمایدین اور افسروں نے جنہیں دربار سے کچھ بھی تعلق تھا، خواہی نخواہی خسرو خاں کی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ خسرو کا اثر مسلمہ تھا اور سلطان کی غفلت، ناواقفیت اور بدمزاجی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ اس کے کسی بھی بہی خواہ کو ایک لفظ بھی کہنے کی ہمت نہ تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ سلطان کی خسرو خاں پر بڑھتی ہوئی فریفتگی کو دیکھتے رہتے تھے۔ جب کہ سلطان کے خلاف بغاوت کے لیے خسرو کا ارادہ اور نمایاں ہو گیا۔ لیکن سلطان کی سخت گیری، ناانصافی اور بدتمیزی کی وجہ سے وہ سب کے سب لاچار ہو گئے تھے۔

---

(1) برنی ص:400

سلطان اور شیخ نظام الدین اولیاء

یہاں پر (نفس مضمون سے) تھوڑا انحراف ضروری ہے اس زمانہ میں موجود لوگوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کی ہندو اور مسلمان عوام اور مختلف طبقہ سے لوگ اتنی عزت کرتے جتنی کہ شیخ نظام الدین اولیاء کی وہ عظیم چشتی سلسلہ جس کے وہ ایک رکن تھے اس بات کا متقاضی تھا کہ صوفیاء کو بادشاہوں اور حکمرانان وقت سے علیحدہ رہنا چاہیئے اور انہوں نے اس اصول پر سختی سے عمل کیا تھا۔ ان کی زندگی سادہ تھی جو کثیر تحائف ان کی خانقاہ میں وصول ہوتے انہیں فوراً غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ وہ تمام مذہبی تعصبات سے نا آشنا تھے۔ اور ان کے ایک بزرگ شاگرد کرشن مہاراج کی تعریف میں ہندی اشعار کہا کرتے تھے جو بعد میں دہلی کی گلیوں میں گائے جاتے تھے۔ ان کی اہم خصوصیت، جیسا کہ انہوں نے ایک دوسرے صوفی کے متعلق کہا تھا یہ تھی کہ وہ نفس گیر تھے۔ یعنی ایک ہمدردانہ اور ذی فہم دماغ رکھتے تھے جو ان کے پاس حاضر ہونے والوں کے مسائل کو فوراً بھانپ لیتا۔ اور ان کی ضرورت کے مطابق مشورہ دیتا تھا۔ ان کا مقصد عظیم لوگوں کو راہ راست خدا کی عبادت اور اپنے انسانی بھائیوں کی خدمت کی جانب رہنمائی کرنا تھا۔

علاؤالدین خلجی ان کی عزت کرتا تھا اور ان سے کسی طرح کے جھگڑے کی کوئی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ ان صفات کے لحاظ سے جن کا حامل کوئی صوفی بزرگ نہیں ہوتا اور ان خدمات کے اعتبار سے جو کوئی صوفی بزرگ انجام نہیں دے سکتا ہے۔ سلطان کی بھی عزت کی جاتی تھی۔ لیکن مبارک کا رویہ دوسرا تھا۔ خضر خاں صرف رسمی طور پر ان بزرگ کا ایک شاگرد رہا تھا۔ اور امیر خسرو صاف لکھتا ہے کہ وہ شہزادہ اس قدر عیش پسند تھا کہ اس نے اپنے روحانی رہنما کو بالکل بھلا دیا۔ لیکن جب مبارک

---

(1) تلبغہ یغدہ اور تمر دونوں ہی کو خسرو خاں نے کسی طرح ملا لیا تھا چونکہ انہوں نے اس کی طرف سے تغلق کے خلاف جنگ کی۔ خواجہ حاجی، جو خالصتاً ایک فوجی انتظام کار تھا اور جس نے خود کو کبھی بھی سیاسی معاملات میں نہ الجھایا کا ذکر ہمارے ماخذ اس زمانہ کے بعد بالکل نہیں کرتے۔

(2) ایضاً، ص: 401

(3) سیر الاولیاء، پہلے باب کے آخر میں چودہواں نکتہ، شیخ کی والدہ کے متعلق، برنی: 396

نے خضر خاں کو قتل کرادیا تو اس نے تو یہ اپنا فرض سمجھا کہ شیخ سے بھی جھگڑا مول لے۔ لیکن ایسے شخص سے کس طرح لڑائی مول لی جا سکتی تھی جو بالکل امن پسند ہو اور جو دشمنوں کو معاف کر دینے کی ضرورت کی تعلیم دیتا اور اس پر عمل بھی کرتا تھا۔ مبارک نے شیخ زادہ جام نامی ایک شخص کی حمایت واعانت شروع کر دی جس نے خود کو شیخ نظام الدین کا ایک طرح کا مدمقابل بنا رکھا تھا۔ لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد سلطان نے شیخ رکن الدین کو ملتان سے بلا بھیجا اور انہیں ایک خصوصی اعزاز بخشا۔ اگر شیخ رکن الدین کی پالکی میں کوئی درخواست ڈال دی جاتی تو سلطان خود اس کو پڑھتا اور اس پر غور کرتا۔ یہ ترکیب بھی ناکام رہی۔ چونکہ دونوں بزرگوں نے آپس میں جھگڑا نہ ہونے دیا۔

سلطان اور شیخ کا سامنا شیخ ضیاء الدین رومی کے سوئم[1] کے موقع پر ہوا۔ شیخ نظام الدین نے سلطان کو سلام کیا لیکن مبارک خود کو اتنا بڑا سمجھتا تھا کہ سلام کے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ سلطان نے اپنے درباریوں کو غیاث پور میں واقع شیخ کی درگاہ جانے سے منع کر دیا۔ وہ برابر یہ بھی اعلان کرتا کہ جو شخص شیخ کا سر (قلم کر کے) اس کے سامنے لائے گا وہ اسے ایک ہزار ٹنکہ دے گا۔ لیکن کسی کو بھی یہ لالچ محسوس نہ ہوئی اور نہ شیخ خوفزدہ ہوئے۔ جب سلطان کی بنائی ہوئی جامع مسجد، جسے مسجد میری بھی کہتے ہیں تیار ہو گئی تو اس نے ایک عام حکم جاری کیا کہ تمام علماء اور صوفی بزرگ اسی مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں۔ شیخ نظام الدین نے جواب دیا کہ "میرے گھر سے نزدیک ترین مسجد کا مجھ پر سب سے زیادہ حق ہے" مبارک کی زندگی کے آخری مہینے (جمادی الاوّل 720ھ مطابق 9/جون 1320ء) میں معاملہ بہت سنگین صورت اختیار کر گیا۔ اس زمانہ کا دستور تھا کہ دہلی کے تمام ممتاز لوگ خواہ وہ سرکاری نوکری میں ہوں یا نہیں، نئے قمری مہینے شروع ہونے پر بادشاہ کو مبارک باد دینے جاتے تھے۔ شیخ نظام کبھی نہیں گئے۔ لیکن اپنے ایک خدمت گزار شاگرد اقبال کو اپنی طرف سے بھیجا کرتے تھے۔ مبارک نے اعلان کیا کہ اگر اگلے ماہ شیخ خود نہیں آئے تو وہ شیخ کو ایک عاملانہ حکم کے ذریعہ (آنے پر) مجبور کرے گا۔ شیخ نے جا کر اپنی والدہ کے مزار پر دعا مانگی لیکن اور کچھ

---

(1) متوفین کے تیسرے دن قرآن خوانی کی رسم۔

نہیں کیا۔ جب اگلے قمری مہینے کے پہلے دن سورج طلوع ہوا تو مبارک کا قتل ہو چکا تھا۔

سلطان کا قتل[1]

خسرو خاں نے سلطان کے سامنے یہ عرضداشت پیش کی کہ جب کہ دوسرے ملکوں کی اپنی جماعتیں تھیں اس کی کوئی جماعت نہ تھی۔ لہٰذا سلطان نے (آبو کے نزدیک) بہل وال میں[2] اور صوبہ گجرات میں برادوؤں کی بھرتی کی اجازت دے دی۔ شاعر خسرو لکھتا ہے کہ بہت سے ہندوؤں نے جنہیں برادرو کہا جاتا تھا، بغاوت کی غرض سے اس کی شرکت اختیار کر لی۔[3] تغلق نامہ کے مطابق ۱۰ ہزار برادرو گھوڑ سوار اپنے راؤں اور راناؤں کی قیادت میں بھرتی کیے گئے۔ خسرو خاں کا اگلا قدم افسروں کے درمیان شریک کار حاصل کرنا تھا۔ ایک عورت کے سلسلہ میں سلطان بہاء الدین دبیر سے ناراض تھا اور وہ اسے قتل کرا دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا بہاء الدین سازش میں شریک ہو گیا۔ یوسف صوفی، محمد قرۃ قیمار کا بیٹا شائستہ اور اس طرح کے چند افسر بھی ملائے گئے۔ سلطان شکار کھیلنے کے لیے مسراوہ گیا ہوا تھا اور برادرو لیڈران اس کو شکار کے میدان میں ہی قتل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یوسف صوفی اور اس کے ساتھیوں نے انہیں منع کیا۔ کھلے میدان میں فوج ان سبھوں کو صفایا کر دے گی۔ سب سے بہتر پالیسی یہ رہے گی کہ سلطان کو محل میں قتل کر دیا جائے اور محل کو بطور قلعہ استعمال کیا جائے اور دہلی میں موجود امرا کو گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب خسرو پھاٹکوں اور دروازوں (درہائے چک) کی کنجیاں حاصل کر لے اور برادروؤں کو اندر لانے کی اجازت لے لے۔ خسرو نے سلطان کو یہ سمجھایا کہ چونکہ وہ زیادہ رات تک اس کے پاس رہتا تھا اس لیے اپنے لوگوں سے مل نہیں سکتا تھا لیکن اگر (ضروری اجازت نامہ کیساتھ) کنجیاں اس کے آدمیوں کے حوالہ کر دی جائیں تو وہ اطمنان کے ساتھ سلطان کے ساتھ بھی رہ سکتا تھا اور اپنے لوگوں سے بھی مل سکتا تھا۔ سلطان نے چھوٹے دروازے کی کنجیاں خسرو کے آدمیوں کو دینے کا حکم دے دیا اس کے بعد سے تین یا چار

---

(1) برنی، ص: 508، 481 (381 سے 413 ہونا چاہیے۔ مترجم) تغلق نامہ، سطور 384-297

(2) برنی، ص: 131

(3) تغلق نامہ، سطر 337

سو برادر روزانہ زیریں منزل میں واقع ملک کافور کے کمرے میں جمع ہونے لگے جو کہ اب خسرو خاں کے حوالے کردیا گیا تھا۔

بڑے بڑے ملک مبارک کے مزاج سے اس قدر خائف تھے کہ ان میں سے کسی کو بھی یہ تجویز پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ چند برادروؤں کو، جو رات میں اکٹھا ہوا کرتے تھے، گرفتار کرلے اور یہ دریافت کرے کہ وہ کس کام کی منصوبہ بندی کرتے تھے۔ 7/ مئی 1320ء (29/ جمادی الاوّل 720ھ) کو قاضی ضیاء الدین نے جو سلطان کا استاد رہ چکا تھا اور رات میں محل (کی حفاظت) کا ذمہ دار تھا۔ ہمت سے کام لیا اور تحقیقات کرانے کی تجویز پیش کی۔ سلطان برافروختہ ہو گیا اور سخت دست جواب کیساتھ اس کو رخصت کر دیا۔ اتفاقاً ٹھیک اسی وقت خسرو آ پہنچا۔ سلطان نے اسے وہ تمام باتیں بتادیں جو قاضی نے کہیں تھیں۔ برنی کو یہ لکھنے میں کوئی تامل نہ ہوا کہ خسرو خاں نے ایک بار پھر سلطان کی ہوس کی تسکین کے لیے آمادہ ہو کر اس کا اعتماد حاصل کر لیا۔

سلطان علاؤالدین کے مشہور ہزار ستون محل کے آثار سری میں مٹی کے دو ڈھیروں کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت تھی چونکہ اس زمانہ کے انجینئر چوڑے پتھروں کی بنی ایک چھت کو پتھر کے ستون کے سہارے ہی کھڑا کر سکتے تھے اس لیے (اس محل میں) اس طرح کے ستونوں کی تعداد بہت کافی رہی ہوگی۔ زیریں منزل (جسے برنی ہزار ستون لکھتا ہے) میں مختلف وزارتوں اور علموں کے ان کاموں سے متعلق دفاتر تھے جن کے لیے سلطان کی ذاتی نگرانی کی ضرورت پڑتی تھی۔ شاید (اس میں) ایک بڑا صحن تھا اور دفتروں سے کچھ دور پر محل میں کام کرنے والے عمال اور محافظ سپاہیوں ے رہنے کے کمرے تھے۔ حفاظت کا ہر ممکن انتظام کر دیا گیا تھا۔ محل کے گرد کوئی کھائی نہ تھی لیکن اس کے دروازے مضبوط تھے۔ لیکن ہر بڑے پھاٹک میں ایک چھوٹا دروازہ بنا تھا جس کو برنی در چک لکھتا ہے جو مغرب بعد بڑے پھاٹک کے بند ہونے کے بعد ہی کھولے جاتے تھے۔ پہلی منزل پر (برنی کا بام ہزار ستون) بادشاہ کے رہائشی کمرے، دربار کے کمرے اور وہ کمرہ تھا جس میں تخت رکھا تھا۔ دوسری منزل پر (برنی کا بالائے بام ہزار ستون)[1] سلطان کا حرم واقع تھا۔ دستیاب

ماخذ کی بنا پر مزید تفصیلات کا بیان ممکن نہیں۔

جب یکم جمادی الآخر 720ھ (9/ جولائی 1320ء)[2] کی شب میں گھڑیال کا رات کی پہلی پہر گزرنے کا گھنٹہ بجا تو وہ امرا اور ملک جن کی رات کی ڈیوٹی نہ تھی وہ محل سے رخصت ہوئے اور قاضی ضیاء الدین نے سلطان کو خسرو کے ساتھ پہلی منزل پر چھوڑ کر محل کے محافظ دستوں کی نگرانی کے لیے زریں منزل میں آیا۔ اسی وقت رندھول جو کہ خسرو کا ماموں تھا، بہت سے برادروؤں کے ساتھ جو اپنی چادروں کے اندر چھرے چھپائے ہوئے تھے، محل میں داخل ہوا۔ ان میں سب سے ایک جہریا تھا جس نے سلطان کو قتل کرنے کا ذمہ لیا تھا۔ اندھول نے قاضی کو پان پیش کرنے کو ہاتھ بڑھایا لیکن اسی وقت جہریا نے اسے چھرے کا ایک ایسا وار لگایا کہ وہ اسی جگہ پر گر کر مر گیا۔ قاضی کے قتل پر لازمی طور پر شور و ہنگامہ ہوا اور برادرو محل میں داخل ہوئے اور چند ثابت قدم برادوؤں کے ساتھ جہریا سیڑھی کی طرف دوڑا۔ سلطان نے پہلی منزل کی کھلی چھت پر سے کچھ شور سنا ہوگا اور خسرو کو کہا کہ وہ دیکھے کہ کیا بات تھی۔ خسرو نے دیوار پر سے جھانک کر دیکھنے کا ڈھونگ رچایا۔ اور کہا کہ سلطان کے گھوڑے کھل گئے تھے اور لوگ صحن میں ان کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب یہ بات ہو رہی تھی اسی وقت جہریا اپنے ساتھی برادروں کے ساتھ محل کی پہلی منزل پر پہنچا اور سلطان کے دو خاص محافظوں، اسحٰق اور ابراہیم کو اپنے چھروں سے مار ڈالا۔

سلطان کو اب یہ بات سمجھ میں آئی کہ بغاوت شروع ہو گئی تھی۔ اس نے

---

(1) بام ہزار ستون کا مطلب ہزار ستون کی چھت تھا اور بالائے بام ہزار ستون کا مطلب ہزار ستون کی چھت کے اوپر (یا دوسری منزل) غالباً بعض چھتوں کے اوپر کوئی عمارت نہ تھی۔ سنگی محل بہت گرم ہوا کرتا ہوگا اور دہلی میں موسم گرما میں کمروں کے اندر سونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

(2) مبارک شاہ کے قتل اور غیاث الدین کی تخت نشینی کی تاریخیں امیر خسرو نے تغلق نامہ میں دی ہیں۔ اس معاملہ میں وہ شاید ہی کسی قسم کی غلطی کر سکتے تھے اور اگر غلطی ہوتی بھی تو ان کے دوست اس کی تصحیح کر دیتے اس معاملہ پر سید ہاشم فریدی نے تغلق نامہ کے اپنے اردو دیباچہ میں پر احتیاط طور پر بحث کی ہے۔ میں نے خسرو کی (دی ہوئی) تاریخوں کی تقلید کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سال 9/ جولائی تک مان سون دہلی نہ پہنچا تھا۔ شاید سلطان اور خسرو ایک کھلی چھت پر تھے لیکن ایک (نیچی) دیوار کے اوپر سے وہ نیچے صحن کی جانب دیکھ سکتے تھے۔

جوتے پہنے اور دوسری منزل پر جانے والی سیڑھی کی جانب دوڑا۔ لیکن خسرو نے یہ اندازہ کر لیا کہ سلطان حرم کے اندر چلا گیا تو معاملہ مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے وہ سلطان کے پیچھے دوڑا اور اس کی زلفوں کو پکڑ کر مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں لپیٹ لیا۔ سلطان آگے نہ بڑھ سکا اور خسرو کی جانب مڑ کر اس کو پٹخ کر اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ لیکن اس کی کوشش کے باوجود خسرو نے اس کی زلفوں کو نہ چھوڑا اسی وقت جہریا آ پہنچا اور خسرو چلایا۔ "مجھے بچاؤ۔" جہریا نے اپنی کلہاڑی (پٹہ) کا وار سلطان کے سینہ پر لگایا اور اس کی زلفوں کے سہارے اس کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اس کا سر کاٹ دیا۔ ہزار ستون کی تینوں منزل پر اس رات بہت سے لوگ مارے گئے۔ خاص کر دوسری منزل میں اس قدر برادرو بھرے ہوئے تھے کہ محافظ سپاہیوں نے خود کو ادھر ادھر کونوں میں چھپا لیا۔ برادرؤں نے تیل کے برتنوں میں (دیوت) بتی ڈال کر تمام کونوں میں روشنی کی۔ سلطان قطب الدین مبارک کا سر سے جدا دھڑ پہلی منزل سے نیچے صحن میں پھینک دیا گیا۔ اسے بآسانی پہچان لیا گیا اور ہر شخص نے جان بچانے کے لیے بھاگنا شروع کیا۔ لیکن قلعہ کے دروازے برادرؤں کے ہاتھ میں تھے۔

برادرؤں کی محل کے اندر کی سازش اور اس کی ناکامی دہلی سلطنت میں بروئے کار سیاسی عناصر کی نشان دہی کرتی ہے لہٰذا اگلے دو مہینوں (کے واقعات) کی ایک محتاط اور واقفیت پسندانہ معاملہ کی ضرورت ہے۔

9

ناصر الدین خسرو خاں

خسرو[1] خاں کی تخت نشینی

سازش کاروں نے یہ طے کیا تھا کہ سلطان کے قتل کے بعد وہ کیا کریں گے۔ اس مختصر مقدمہ کے دوران جس (میں سماعت) کا موقعہ اسے دیا گیا تھا خسرو نے غیاث الدین تغلق سے غالباً یہ ٹھیک ہی کہا تھا کہ ابتداء میں اس کا ارادہ تھا کہ شاہی خاندان کے شہزادوں میں سے کسی ایک کو تخت نشین کرادے۔ لیکن اس کے مشیر، جن کو یہ یقین تھا کہ شاہی خاندان کا کوئی بھی شہزادہ جو تخت نشین ہوگا وہ اس کو قتل کردے گا اس پر حاوی ہوگئے۔ برادرو لوگ، گرچہ وہ اچھے جنگجو تھے۔ غیر تعلیم یافتہ اور غیر مذہب تھے۔ چونکہ خسرو کی دو ماہانہ مدت اقتدار میں ان میں سے کوئی بھی کسی سرکاری عہدہ پر بحال نہ ہوا تھا اس لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ وہ غیر تعلیم یافتہ تھے۔ ایسے ایک گروہ کے لیے دہلی سلطنت کے پالیسی متعین کرنا ممکن نہ تھا۔ مبارک کے قتل کے وقت

---

(1) برنی، ص:25-405، عصامی ص:31-362، امیر خسرو کی تغلق نامہ، ص:121-1 انرائٹ ص:4-103 خسرو خاں کی دو ماہانہ مدت حکومت کے متعلق جو تصنیفات ہم تک پہنچی ہیں میں سب سے اہم تغلق نامہ ہے۔ یہ غیاث الدین تغلق شاہ کے حکم پر اور اس کو اور ادبی دنیا کو پیش کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی۔ لیکن اس میں اس طرح کی تصانیف کی کمزوریاں (موجود) ہیں۔ ہندوؤں کھوکھروں میولوگ اور غیاث الدین تغلق کی فوج کے دوسرے ہندوؤں کا ذکر ہے مگر ان خدمات کا نہیں جو انہوں نے انجام دی تھیں۔ اسی طرح خسرو خاں کی تخت نشینی اور قتل کے دوسرے دن جن مسلم افسروں نے اس کو بحیثیت سلطان قبول کیا تھا ان کا بھی ذکر نہیں ہے۔ لیکن بیان کے دوران خسرو خاں کے بہت سے افسروں کا ذکر آتا ہے۔ نیز اور بھی کچھ تفصیلات ہمیں تغلق نامہ سے ملتی ہیں جس کے لیے ہمیں شکر گزار ہونا چاہیئے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس مثنوی کی عہد وسطیٰ میں صحیح طور پر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

شاید کوئی مسلمان موجود نہ تھا۔ لیکن مسلم افسروں میں جو لوگ خسرو خاں کے پیروکار تھے ان کو جلد از جلد محل لایا گیا ہو گا۔ بہاء الدین دبیر شائستہ خاں بن قرۃ قیمار، یوسف صوفی وغیرہ کا ذکر برنی ان لوگوں کے درمیان کرتا ہے جو سازش سے آگاہ تھے۔ پھر بھی ہم خسرو خاں کے ان مسلم مشیروں کا نام یقینی طور پر نہیں بتا سکتے جو اس فیصلہ کے ذمہ دار تھے کہ وہ تخت نشیں[1] ہو۔ لیکن خسرو کی تخت نشینی کے لیے دو باتیں ضروری تھیں۔ شاہی خاندان کے تمام شہزادوں کو اندھا یا قتل کر دیا جائے اور دہلی میں مقیم تمام بڑے افسروں کو فوراً ہزار ستون محل کی پہلی منزل پر لا کر وعدوں اور دھمکیوں کے ذریعہ سلطان تسلیم کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

براد رو لوگ دوسری منزل پر واقع شاہی حرم میں گھس پڑے۔ اب تک علاؤالدین کے چار بیٹے قتل کیے جا چکے تھے۔ لیکن پانچ ابھی زندہ تھے۔ فرید خاں (۱۵ سال) ابو بکر خاں (۱۴سال)، بہاء الدین خاں (۸ سال)، علی خاں (8سال)، عثمان خاں (5سال)۔ برادو لوگوں کو محل کے اندر کے راستے معلوم نہ تھے۔ اور وہ چلائے کہ انہیں شہزادوں کی تلاش تھی، تاکہ وہ ان میں سے ایک کو تخت پر بٹھا سکیں۔ کسی کو بھی مغالطہ نہ ہوا۔ پھر بھی ان کی ماؤں کو اپنے بچوں کو حوالہ کرنا پڑا۔ فرید اور ابو بکر کو دو رکعت نماز ادا کرنے کی اجازت دی گئی، قبل اس کے کہ ان کے سر قلم کیے جائیں۔ بقیہ

(بقیہ)

اشاعت نہ ہوئی اور یہ اکثر محققین کی دسترس سے اس وقت تک باہر رہی جب تک سید ہاشم فرید آبادی نے علی گڑھ کے مولانا رشید احمد مرحوم کے 1933ء میں تیار کردہ متن کی بنا پر اس کو طبع نہ کرایا۔ عہد وسطیٰ کے کسی بھی مورخ نے اس کو استعمال نہیں کیا ہے۔

عصامی نے خود آزادانہ طور پر تفتیشات کیں اور وہ کھوکھروں کے ساتھ انصاف برت سکا۔ لنجنگوں کے متعلق اس کے بیانات خسرو سے زیادہ واضح ہیں۔

بد قسمتی یہ ہے کہ برنی کا تعصب اسے ان دو مہینوں (کی تاریخ) کے لیے قابل اعتماد بنا دیتا ہے۔ اس نے کوئی تفتیش نہ کی تھی اور یادداشت کی بنا پر لکھ دیا تھا۔ اور اس کی واحد خواہش یہ تھی کہ کسی طرح اپنی باتوں کو قارئین سے صحیح منوا لے۔ اس کی کتاب اس جگہ پر اور تمام جگہوں سے زیادہ دشنام آمیز ہے۔

(1) تغلق نامہ سطر 356، یہ ذمہ داری چند برادروؤں اور صوفی پر عاید کرتی ہے لیکن برادروؤں کو اس کام کو انجام دینے کا دماغ نہ تھا اور یوسف صوفی تنہا اس کام کو کرنے کا خطرہ مول نہ لیتا۔

دو شہزادوں کو اندھا کر دیا گیا۔ اور ان کو قصر لال میں بھیج دیا گیا۔ شاعر نے اس المناک منظر کا تفصیلی بیان پیش کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شہزادوں نے انجام کا سامنا بہادری کے ساتھ کیا۔ ان شہزادیوں میں جو اس رات ماری گئیں رام دیو کی بیٹی اور مبارک شاہ کی ماں جھتیابالی تھی۔ برادرو لوگوں نے شاہی حرم میں جو تباہی مچائی اس کا اندازہ تصور پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا۔ فرشتہ کے مطابق علاؤالدین کی بہن کا ایک لڑکا، ملک نصرت جو دنیا سے کنارہ کش ہو گیا تھا اور برسوں سے درویشانہ زندگی گزار رہا تھا، بھی مار ڈالا گیا۔[1]

سازش کاروں کا دوسرا منصوبہ، جس کو ساتھ ہی ساتھ انجام دینا تھا یہ تھا کہ دہلی میں مقیم بڑے بڑے افسروں کو رات ہی میں پہلی منزل پر واقع شاہی کمروں میں لایا جائے اور خسرو کو اپنا سلطان قبول کرنے پر ان کو آمادہ کیا جائے۔ دروازے کھول دیے گئے اور سارا محل تیل کے چراغوں اور مشعلوں (دیوت) سے روشن کر دیا گیا۔ اور یکے بعد دیگرے تمام امرا کو آنے کے لیے آمادہ یا مجبور کیا گیا۔[2] رات میں جو بات چیت ہوئی وہ قلم بند نہیں کی گئی ہے۔ لیکن سورج نکلنے تک تمام حاضرین نے خسرو کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور وہ سلطان ناصر الدین کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ اگلے دو قمری مہینوں میں اس کے نام کا خطبہ سلطنت کی تمام مسجدوں میں پڑھا گیا اور اس کے نام پر سکے ڈھالے گئے۔ اس کے حامیوں کی خواہش یہ تھی کہ اس کو بھی دیگر مسلم بادشاہوں کی طرح سمجھا جائے۔ مسجدوں میں حاضرین نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اصل ماخذ کے ایک محتاط مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مندرجہ ذیل افسروں نے جن میں سے بیشتر علاؤالدین کے تحت کام کر چکے تھے، خسرو خاں حکومت

---

(1) فرشتہ، ص:129

(2) محل کی پہلی منزل پر جو لوگ آدھی رات کے وقت لائے گئے ان میں سے مندرجہ ذیل لوگوں کا ذکر برنی کرتا ہے۔ عین الملک ملتانی، وحید الدین قریشی، بہاء الدین دبیر اور ملک قرابیگ کے لڑکے۔ وہ لکھتا ہے کہ ان کو یرغمال کے طور پر رکھا گیا۔ برنی کا یہ کہنا درست نہیں کہ عین الملک کا خسرو خاں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ دونوں اکثر موقعوں پر ایک ساتھ کام کرتے تھے۔ جب خسرو خاں، ملک یک لکھی کے خلاف دیوگیری گیا تھا تو عین الملک اس کے ساتھ گیا تھا۔

میں شامل ہو جانا قبول کیا۔ (1) تاج الملک وحید الدین قریشی وزیر[2] مقرر کیا گیا۔ (2) عین الملک ملتانی کو علیم الملک کا خطاب دیا گیا، غالباً اس کی علمیت کی وجہ سے (3-5) ملک قرابیگ کے عہدے اس کے بیٹوں کو دے گئے۔ سلطان قطب الدین کے افسروں کی اپنی فہرست میں برنی ملک قرابیگ کے تین بیٹیوں کا ذکر کرتا ہے۔ ملک حسن جو سب سے بڑا تھا۔ ملک حسین جو منجھلا تھا اور سب سے چھوٹا ملک بدرالدین (ابو بکر) (6) ملک فخر الدین جونا (ملک تغلق کا بیٹا) امیر اخور مقرر کیا گیا۔ (7) محمد قرۃ قیمار کا بیٹا شائستہ خاں وزیر جنگ مقرر کیا گیا۔ (8) یوسف صوفی کو ملک صوفی کا خطاب دیا گیا۔ وہ ایک مشیر تھا مگر اس کے عہدے کا ذکر نہیں ملتا۔ (9) ملک تمر، چندیری کا گورنر (10) کمال الدین صوفی (11) کافور مہردار، امیر حاجب (12) شہاب نائب امیر حاجب (13) تیگین، اودھ کا گورنر (14) بہاء الدین دبیر جس کی دوبارہ تقرری دیوان انشاء کے وزیر کی حیثیت سے ہوئی جو (عہدہ) اسے علاؤالدین (کے عہد) سے ملا ہوا تھا اور اسے اعظم الملک کا خطاب ملا۔ (15) سنبل خاتم خاں (16) ملک یک لکھی قدر خاں (اس یک لکھی سے مختلف جس نے دیوگیری میں بغاوت کی تھی اور اب سامانہ کا گورنر تھا۔ (17) عنبر بغرا خاں (18) بغدہ کا بیٹا تلبغہ (19) تلبغہ ناگوری (20) یوسف چاوش (21) ملک قبول جسے سلطان علاؤالدین نے شحنہ منڈی مقرر کیا تھا۔ 22-23 سری کوتوال احمد ایاز اور اس کا بیٹا محمد ایاز عصامی دویا تین اور مسلم ناموں کا تذکرہ سرسری طور پر کرتا ہے۔ ان کے سوانحی حالات اور عہدوں کا ذکر کیے بغیر۔

کوئی بھی برادرو اور شاید کوئی ہندو۔ کسی باضابطہ سرکاری عہدے پر مقرر نہیں کیا گیا۔ خسرو خاں کے چھوٹے بھائی حسام الدین "مرتد" کو خان خاناں کا خطاب

---

(1) عصامی لکھتا ہے کہ خسرو خاں نے "دویا تین" مہینوں تک حکومت کی۔ برنی لکھتا ہے کہ خسرو خاں کے ڈھائی مہینوں تک حکومت کرنے کے بعد ملک فخر الدین جونا دہلی سے فرار ہو گیا۔ امیر خسرو جو اس طرح کے معاملہ میں غلطی نہیں کر سکتا تھا، لکھتا ہے کہ مبارک شاہ کا قتل جمادی الثانی 720ھ (9/ جولائی 1320ء) کی پہلی شب کو ہوا۔ وہ تغلق شاہ کی تخت نشینی کی تاریخ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ سنیچر یکم شعبان 720ھ (6/ ستمبر 1320ء) (تغلق نامہ، سطور 6-1345 اور 549 اس بات کی وضاحت جناب ہاشمی مرحوم نے بھی تغلق نامہ کے دیباچہ میں کی ہے۔ (14-18) جونا کے دہلی سے فرار کی صحیح تاریخ کا پتہ لگانا مشکل ہے۔

(2) وحید الدین قریشی جس کے متعلق برنی کا خیال بہت اچھا تھا، کا ذکر پھر دوبارہ ہمارے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ملا۔ براوردوؤں کو صرف خطابات اور وظائف ملے اور براورو گھوڑ سواروں اور پیادہ سپاہیوں کی کمانیں ملیں۔ رائے اور رانا کے خطابات کے ساتھ۔ امیر خسرو لکھتا ہے کہ خسرو خاں کے تین یا چار چچا تھے۔ ان میں سے ایک رندھول، کو رائے رایان کا خطاب ملا۔ بقیہ دو شاید ناگ اور کجب برہما کو براورو دستوں کی اعلاترین کمانوں پر ہی قناعت کرنی پڑی۔ مرحوم سلطان کے قاجھریا کو موتی اور جواہرات پہنائے گئے۔

براوروؤں کی بغاوت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس نے سلطنت دہلی کے زمانہ عروج میں اس کے اندر ایک بحران پیدا کر دیا تھا لیکن یہ بادشاہت کے کار منصبی میں ایک بحران تھا نہ کہ اسلام یا ہندو مذہب یا ہندو مسلم تعلقات میں۔ اصل سوال یہ تھا۔ کیا وہ سازش کار جو محل کے اندر ایک انقلاب بپا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے وہ سلطنت کے امور میں بھی حاوی رہ سکیں گے؟ سلطنت کے چھوٹے اور بڑے افسران مرکزی حکومت، جس پر ان کی تنخواہ اور حیثیت کا دارومدار تھا، کی اطاعت گزاری کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ ان کا پہلا رڈ عمل یہ ہوا کہ جو کچھ ہوا تھا اس پر خود کو راضی بہ رضا کر لیں۔ اور نئے سلطان کو قبول کر لیں۔

چونکہ عصامی (کی فتوح السلاطین) اور تغلق نامہ کی اشاعت کے قبل تک تاریخ کے طالب علموں کے پاس براورو بغاوت کی واحد وہی تشریح موجود تھی جو برنی نے پیش کی ہے۔ اور جس میں اس نے ایک ہندو مسلم جدوجہد کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس لیے پہلے ان غلطیوں کو دور کرنا ضروری ہے جو برنی نے اپنے مشتعل تصور کے ذریعہ پیدا کر دی ہیں۔ اس کا بیان (مندرجہ ذیل) پیراگراف میں پیش ہے۔

"اپنی تخت نشینی کے وقت خسرو خاں نے سلطان قطب الدین کے بعض

(بقیہ)

ماخذ میں نہیں ملتا۔

(3) وزارت جنگ ایک عرصہ سراج الدین خواجہ حاجی کے ذمہ تھی۔ جس کا ذکر اکثر شب نویس (رات میں لکھنے والا) کی حیثیت سے ملتا ہے۔ شاید وہ اب مر چکا ہے۔ خواجہ حاجی اصولاً کبھی بھی سیاست کے اعلا امور میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ اور ملک کافور اور خسرو خاں کے ایک وفادار ماتحت کی حیثیت سے کام انجام دیتا تھا۔

یہ فہرست برنی، عصامی اور تغلق نامہ میں موجود تذکروں کی بنا پر کی گئی ہے۔

غلاموں کو جو مرحوم سلطان کے حامی تھے اور بڑے بڑے امیر بن بیٹھے تھے، گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اس دوران ان میں سے بعض کو ان کے گھروں میں ہی قتل کر دیا گیا جب کہ بعض دوسروں کو محل میں لایا گیا اور ایک کنارے لے جا کر قتل کر دیا گیا۔ قاجی ضیاء الدین کی بیوی اور بچے رات کے شروع ہی میں فرار ہو گئے۔ لیکن اس کا مکان مع ان تمام چیزوں کے جو اس میں موجود تھیں رندھول کو دے دیا گیا۔۔۔ خسرو خاں نے سلطان قطب الدین کی بیوی سے شادی کر لی۔[1]

بدبودار سانسوں اور گندی بغلوں (گندہ بغل) والے برادروؤں کا شاہی حرم پر بلا روک ٹوک قبضہ ہو گیا۔ اس طرح بدقسمتی محل کے اندر واقع ہونے والی بغاوتوں کے دوران ناگزیر تھی لیکن اس کے آگے برنی جو کچھ لکھتا ہے اس کو رد کر دینا ضروری ہے چونکہ یہ عقل سلیم اور شہادت دونوں ہی کے خلاف ہے۔

تخت نشینی کے پانچ یا چھ دنوں بعد محل میں موتیوں کی پوجا شروع ہو گئی...... برادرو لوگوں نے برسر اقتدار ہونے کی بنا پر بڑے بڑے علاقی اور قطبی امراء کے مکانات پر' مع ان کے تمام اثاثہ، قبضہ کر لیا۔ اور ان کی مسلم عورتوں اور کنیزوں کو تصرف میں لائے۔ ظلم کے شعلے آسمان تک بلند ہو گئے۔ مزید یہ کہ چونکہ برادرو اور ہندو صاحب اقتدار بن بیٹھے تھے۔ اس لیے انہوں نے قرآن شریف کے نسخوں کو بطور کرسیوں کے استعمال کیا اور محرابوں میں بت رکھ کر ان کی پوجا کی۔ خسرو خاں کی تخت نشینی اور برادروؤں اور ہندوؤں کی بالادستی کی وجہ سے کفر کے طریقے دن بدن زور پکڑتے گئے۔ خسرو خاں کی خواہش تھی کہ برادرو اور ہندو زیادہ طاقتور بن جائیں اور بڑی تعداد میں اس کے ساتھ ہو جائیں...... تمام سلطنت کے ہندوؤں نے خوشی منائی اور یہ امید لگائی کہ دہلی پر ہندوؤں کا اقتدار ہو جائے گا اور مسلمانوں کو دبا دیا جائے

---

(1) چونکہ ایک مسلمان بیوہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد چار حیض (کی مدت) گزرنے کے قبل شادی نہیں کر سکتی اس لیے اس شادی کو ناجائز قرار دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے اس میں شرکت کی تھی ان کو تغلق شاہ نے سزائیں دیں۔

فرشتہ کے مطابق (ص:128) خسرو خاں نے علاؤالدین کی ایک بیٹی کو اپنے بھائی حسام الدین خان خاناں کی زوجیت میں دیا۔

گا۔ اووہ کمزور ہو جائیں گے۔[1]

یہاں پر ہمیں برنی کے دماغ میں خود ساختہ تین خالص وہموں کا سامنا در پیش ہے۔ اولاً تو قاضی ضیاء الدین کے گھر کے علاوہ اور کسی علاقی یا قطبی امیر کا مکان نہیں لوٹا گیا۔ برنی کوئی مثال پیش نہیں کرتا۔ اور نا ہی وہ کر سکتا تھا۔ چونکہ وہ تمام امراء نئی سلطنت کے تحت سرکاری عہدوں پر مقرر کیے گئے۔ دوسرے یہ کہ چونکہ خسرو کی خواہش یہ تھی کہ اس کو خطبہ و سکہ کا اختیار رکھنے والے ایک عام مسلم بادشاہ کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ اس لیے وہ اپنے محل کو بت پرستی کا مرکز، جہاں قرآن کی بے حرمتی کی جاتی ہو۔ نہیں بننے دے سکتا تھا۔ اس کے برادرواس کے امور سلطنت کے متعلق کچھ مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ اور اسے کلیتہً اپنے چندہ مسلم مشیروں پر انحصار کرنا تھا۔ تیسرے یہ کہ اس جگہ پر، اور دیگر جگہوں کی طرح، برنی ہندوؤں کے ایک چھوٹے سے گروہ، برادروؤں کو تمام ہند جماعت کے مترادف بنانے کی غلطی کرتا ہے ہندوؤں کی کثیر جماعت غیر جانبدار رہی۔ جو ہندو فوج میں تھے وہ ان افسرون کی قیادت میں لڑے جن کی قیادت کے وہ عادی بن چکے تھے۔ تغلق نامہ میں صاف لکھا ہے کہ فوج کی نصف تعداد ان پر مشتمل تھی۔

خسرو خاں کے متعلق یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ اس نے برادروؤں کے علاوہ کسی اور ہندو ذات کے لوگوں سے مدد کی اپیل کی۔ اور اگر اس نے مدد کی اپیل کی بھی ہوتی تو اس کی سنوائی نہ ہوتی۔ اس نے مزید ہندو سپاہیوں کی بھرتی کا حکم نہ دیا۔ چونکہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جہاں تک دہلی کے پھر سے "ہندوانہ" ہو جانے کا سوال ہے۔ خسرو نے سلطنت کے اعلاترین عہدوں کو پرانی سلطنت کے امراء کے ہاتھوں میں دے کر اس مکان کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ راجپوتانہ کے بڑے سے بڑے رائے اور سلطنت کے چھوٹے درجہ کے ہندو سرداروں نے خسرو خاں اور برادروؤں (کے معاملہ) پر کوئی توجہ نہ دی۔ یہ ان کا معاملہ نہ تھا۔

---

(1) برنی ص ص 410-12، ان گالیوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے جن کی بوچھاڑ برنی نے خسرو خاں پر کی ہیں چونکہ وہ بار بار دہرائی گئی ہیں۔

(نوٹ: فارسی متن ص 412 میں یہی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ مترجم)

چونکہ تغلق شاہ نے، فتح مکہ[1] کے بعد پیغمبر کی سنت کی تقلید کرتے ہوئے، اپنی تخت نشینی کے وقت ان تمام امراء کو معاف کر دیا جو اس کے خلاف لڑے تھے۔ اس لیے امیر خسرو ان کا ذکر نہیں کرتا۔ جب تک اس کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن خسرو خاں کی حکومت کی تشکیل کے بعد وہ افسروں کے رویہ کا صحیح بیان پیش کرنے میں تامل نہیں محسوس کرتا"۔ (سلطنت کے) مشرق و مغرب میں تمام فوجی کمانڈروں نے جنگ کرنے کے بجائے اطاعت قبول کر لی۔ ترکوں نے اپنے ترکی بھالے نہیں اٹھائے، ہندوؤں نے ہندوؤں پر حملہ نہیں کیا۔ میدان جنگ کے تمام امراء کاہل اور کمزور ہو گئے تھے۔ اور ان کی حالت قصاب کے آگے بکری کی مانند تھی۔ سلطنت کے صوبوں میں بھی امرا اطاعت گزاری پر کمربستہ ہو گئے۔[2]

یہ منصوبہ اس لیے ناکام رہا کہ خسرو خاں میں اس کام کی صلاحیت نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود سوچنے کی اس کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ اور اس نے صرف اپنے مشیروں کی رائے پر عمل کیا۔ وہ نوجوان تھا اور جنگ یا انتظامیہ کا اسے زیادہ تجربہ نہ تھا۔ (دستیاب اعلیٰ درجہ کے امراء کے درمیان اس کے مشیروں کا انتخاب اچھی طرح نہ ہوا تھا۔ ان کے دماغ ایسے نہ تھے جن پر ایک سلطنت کا انتظام سنبھالنے کے لیے بھروسہ کیا جا سکے۔ جس طرح کی مخالفت سے علاؤالدین کو محض ایک معمولی جھٹکا پہنچتا وہ اس کے آگے بالکل ڈھیر ہو گئے۔

واحد وہ افسر جس نے نئی سلطنت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا وہ دیپال پور کا گورنر غازی ملک تغلق تھا۔ لیکن شاعر اسے یہ سوچتے ہوئے دکھاتا ہے"۔ دہلی کے سپاہیوں کے رجسٹر میں (مندرج) بادلوں کی طرح گتھے ہوئے دو لاکھ سپاہی ہیں۔ اگر وہ رستم بھی ہو تو ایک امیر کی فوج، اوا ایک ضلع دیپال پور (کے وسائل) کس طرح اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ میری فوج کس طرح دہلی کی فوج کا مقابلہ کر سکتی ہے؟ ہوا گرد کس طرح بادلوں (کی بلندی) تک لے جا سکتی ہے؟ میری طاقت بہت کم ہے اور میرا بوجھ زیادہ تو میں کیسے اسے لیجا سکتا ہوں؟[3] ان خیالات کے بوجھ تلے تغلق دبا رہا اور اس

---

(1) تغلق نامہ ص136، سطر 2621۔

(2) ایضاً ص37 سطور 90-687۔

(3) ایضاً ص71 سطور 38-1335

نے کوئی مثبت اقدام نہ کیا۔

کشمکش کی ابتدا

لیکن تغلق کے تیز طبع لڑکے، فخر الدین جونا نے، جو اس سلطنت کے ایک ممتاز افسر کی حیثیت سے اس کے معاملات کو دیکھ رہا تھا اور جسے دہلی کی صورتِ حال پسند نہ تھی، تعطل کو توڑا۔ اس نے اپنے دوستوں کی خفیہ میٹنگ رات میں بلائی تھی۔ انہوں نے اسکو مشورہ دیا کہ اپنے والد سے رابطہ قایم کرے چونکہ دہلی کی حکومت اتنی مضبوط تھی کہ اس کو للکارنا مشکل تھا۔ پیغامبر علی یغدی اس جواب کے ساتھ واپس آیا کہ تغلق کی یہ خواہش تھی کہ وہ (جونا) اُچھ کے گورنر بہرام ایبہ کے لڑکے کے ساتھ جلد از جلد دیپال پور آجائے اس لیے (برنی کے مطابق ایک سہ پہر میں اس نے اور ایبہ کے بیٹوں نے چند گھوڑوں، غلاموں اور نوکروں کے ساتھ دیپال پور کی راہ لی۔ یہ خبر خسرو خاں تک مغرب کے قبل نہ لائی جا سکی اور شائستہ خاں، وزیر جنگ جو ان لوگوں کے تعاقب، میں روانہ کیا گیا۔ ان لوگوں کو نہ پکڑ سکا۔[1] دیپال پور دہلی سے کوئی دو سو میل پر ہے دریائے سرستی (سرسوتی) ان دو ضلعوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اور دریا کے کنارے سرسا (سرستی بھی لکھا جاتا ہے) کا شہر اور قلعہ تغلق نے اپنے ایک افسر سرتیہ کو سرسا پر قبضہ کرنے اور جونا کی حفاظت کے لیے بھیجا تھا۔ سرسوتی اور دہلی کے درمیان کا یہ راستہ آئندہ جنگ کی جائے وقوع بننے والا تھا۔ سلطنت کے بقیہ حصہ میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔

باپ اور بیٹے نے آپس میں مشورہ کیا اور جنگ کرنا طے کیا۔ لیکن پہلا مسئلہ شرکاء کی تلاش تھی۔ ایک ہی مضمون کے پانچ خط پاس پڑوسی افسروں کے پاس بھیجے گئے۔ ان کے جواب سے مرکزی حکومت کے اس خوف اور عزت کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے جو علاؤالدین کی حکومت نے پیدا کر دیا تھا۔ (1) بہرام کا بیٹا ایبہ اپنی فوج کے ساتھ ہر ممکن سرعت کے ساتھ تغلق سے آملا۔ وہ مستقبل کے متعلق راضی بہ رضا

---

(1) تغلق نامہ (سطور 1804 اور 803) میں لکھا ہے کہ دہلی عظیم فوج میں سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ جونا کا تعاقب کرے۔ لیکن اس سلسلہ میں برنی زیادہ قابل اعتماد معلوم ہوتا ہے۔

تھا۔ لیکن پڑوسی افسروں میں وہ واحد شخص تھا جو تغلق کے ساتھ لڑا۔ (2) ملتان کا گورنر مغلطی، تغلق کا خط پڑھ کر سخت برہم ہوا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ دیپال پور ملتان کا محض ایک تابع علاقہ ہے۔ میری یہ پالیسی نہیں ہے کہ میں اعلا عہدیداروں کے خلاف لڑوں، خصوصاً اس حالت میں کہ میری فوج میرے پاس موجود نہیں ہے۔ تغلق کے ایک دوست بہرام سراج نے مغلطی کے خلاف فوج کو بھڑکایا۔ مغلطی اپنی جان بچانے کو بھاگا۔ لیکن ایک نہر میں، جو تغلق نے اس وقت بنوائی تھی جب وہ ملتان کا گورنر تھا، گر گیا۔ اور بہرام سراج کے ایک بیٹے نے اس کا سر کاٹ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تغلق کو ملتان سے کوئی مدد نہ ملی۔ مگر (اب) اس کو اس جانب سے کسی (مخالفانہ) حملہ کا ڈر نہ رہا۔ (3) سامانہ کے گورنر ملک یک لکھی، ایک ہندو غلام جسے علاؤالدین نے نوازا تھا اور ترقی دی تھی، دیوگیری میں بغاوت کے بعد اپنی بحالی کے لیے شاید خسرو خاں کا مرہون منت تھا۔ اس نے تغلق کا خط خسرو خاں کو بھیج دیا۔ اور فوراً اپنی فوج کو لے کر دیپال پور کے خلاف روانہ ہوا۔ لیکن اسکو شکست ہوئی اور وہ سامانہ کی طرف پسپا ہوا۔ وہ خسرو خاں سے دہلی میں جا ملنے کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ روانہ ہو سکے۔ برہم شہریوں نے اس کو مار ڈالا۔ (4) تغلق کا خط ملنے کے وقت سندھ کے گورنر محمد شاہ لُر کو اس کے افسروں نے سیوستان میں گھیر رکھا تھا۔ تغلق کے ساتھ شامل ہونے کے لیے وہ اپنے افسروں سے مصالحت کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن یا تو اس سبب سے کہ فاصلہ زیادہ تھا یا یہ کہ وہ سست رفتار تھا، وہ دہلی اس وقت پہنچا، جب تغلق شاہ تخت نشیں ہو چکا تھا۔ اپنی اعلانیہ پالیسی کے مطابق سلطان نے کسی غصہ کا اظہار نہ کیا اور محمد شاہ کو اجمیر کا گورنر مقرر کیا۔ (5) کمال الدین گرگ کا بیٹا ہوشنگ جالور کا گورنر تھا۔ اس نے آنے کا وعدہ کیا لیکن دانستہ طور پر ایسا کیا کہ وہ جنگ کے بعد ہی پہنچا۔ اسے جالور واپس بھیج دیا گیا۔

محتاط طور پر لکھا ہوا ایک خط عین الملک ملتانی کو بھیجا گیا جو اب وزیر بن گیا تھا۔ اس نے خسرو خاں کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے یہ خط اس کو دکھا دیا۔ تغلق کو شاید اس کی توقع تھی۔ چونکہ اس کا اگلا اقدم یہ ہوا کہ ایک زبانی پیغام بھیجا۔ اس مرتبہ عین الملک کا خفیہ جواب صاف تھا۔ وہ ایک اعلا تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ مذہبی تعصب

قسم کی کوئی مہملانہ بات سننے کو تیار نہ تھا۔ اس نے لکھا کہ 'میرے اسلاف دس پشتوں سے مسلمان رہے ہیں" شاید اس کا اشارہ اس جانب تھا کہ تغلق، جس کو وہ اچھی طرح سے جانتا تھا اتنا قدیم مسلمانی سلسلہ نسب نہیں پیش کر سکتا تھا۔ وہ کسی کی جانبداری نہیں کرے گا۔ لیکن جب تغلق (کی فوج) کا علم دہلی کے نزدیک نمودار ہوگا تو وہ علیحدہ ہو جائے گا۔ اگر تغلق جنگ جیت گیا تو وہ نئے سلطان کی مرضی کے مطابق دونوں صورتوں کے لیے تیار ہوگا یا تو نئے سلطان کی خدمت کے لیے یا قتل کر دیئے جانے کے لیے۔

تغلق کا دعویٰ تھا کہ وہ اسلام کی عظمت سلطان علاؤالدین خلجی کے خاندان سے وفاداری اور دہلی کے مجرموں کی سزا کے لیے لڑ رہا تھا۔ جہاں تک کہ اس کے ساتھی افسروں کا تعلق تھا اس اپیل کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن ایک دوسری جانب سے مدد ملی۔ چار عجیب و غریب سطروں[1] میں امیر خسرو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ "تغلق کی فوج" گرچہ وہ چھوٹی تھی، شمالی علاقہ میں بسنے والی نسلوں کی افراد پر مشتمل تھی جو اکثر اس کے ساتھ تاتاروں سے لڑی تھی اور تب وہ ان کا شمار مندرجہ ذیل طریقے پر کرتا ہے۔ "غز" ترک منگول، رومی (یونانی) روسی، تاجک اور خراسانی۔ عمدہ نسلوں کے لوگ (پاک اصل) نہ کہ مخلوط نسلوں والے (اصل بد) لیکن اس کے بعد جو دو جنگیں ہوئیں ان میں وہ صرف ایک منگول افسر کا ذکر کرتا ہے۔ ان نسلوں (کی گنتی) در اصل ان دو ہندو گروہوں کی شمولیت سرکاری پردہ پوشی کے طور پر کی گئی ہے۔ جنھوں نے اس واقعی تغلق کا ساتھ دیا۔ کھوکھر جن کی قیادت ان کا مبارک قدم شہزادہ سہج رائے اور ان کے سردر گل چندر اور نیجو کر رہے تھے اور میواتی یا میو لوگ۔ چونکہ تغلق اسلام کی شوکت کے لیے جنگ کر رہا تھا اس لیے ہندوؤں کو شامل کرنے میں اس کو کوئی تامل نہیں ہوا۔ مزید یہ کہ پنجاب کی جگہ جو ذاتوں کے لیے اب اس کا نام فتح کے مترادف بن گیا تھا اسے ان کے سرداروں کے متعلق تفصیلی واقفیت حاصل تھی اور انہوں نے اسے مدد دی جو سلطنت کے افسروں کی جانب سے نہ ملی تھی۔ ان سرداروں اور بہرام ایبہ کے علاوہ تغلق کو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ اعلا کمانیں اپنے خاندان کے افراد

---

(1) ایضاً! سطور 1095-99۔ کھوکھر سردار کے کارنامے عصامی نے بیان کیے ہیں۔

نوٹ (سطور 1595-99 ہونا چاہیے۔ مترجم)

کو دے اس کے فوراً بعد ہی تغلق کے افسروں نے ایک کارواں کو گرفتار کر لیا۔ جو سندھ کا خراج دہلی لے جا رہا تھا اور جس میں کافی گھوڑے بھی لے جائے جا رہے تھے۔ اور اس نے اس دولت کو محتاط طور پر اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا تا کہ وہ آئندہ جنگ کے لیے خود کو تیار کر سکیں۔

سرسوتی کی جنگ

جب فخر الدین جونا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو خسرو خاں نے محسوس کیا کہ تخت کے چاروں ستونوں میں سے ایک ٹوٹ گیا تھا اور یہ کہ پورے ڈھانچے کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ حسب معمول اس نے اپنے مشیروں سے صلاح طلب کی اور ان کی رائے کے مطابق اس نے سلطان علاؤالدین کے تین نابینا بیٹوں- بہاء الدین، علی اور عثمان- جو لال قلعہ میں مقید رکھے گئے تھے، کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس نے خان خاناں کی قیادت میں 40 ہزار سواروں پر مشتمل ایک فوج روانہ کی۔ لیکن اصلی فوجی کمان ملک قتلغ امیر شکار کو دی گئی۔ اس جگہ کا پتہ لگانا مشکل ہے جہاں، بقول عصامی، سرسوتی کی جنگ لڑی گئی۔

دہلی کی فوج برسا کے قلعہ کو جس پر محمد سرتیہ نے تغلق کی جانب سے قبضہ جما رکھا تھا کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ دیپال پور کی فوج، جس کے ہراول میں شہزادہ جونا اور ماہی نشان تھا۔ علاپور گاؤں اور بھٹ کے تالاب کے پاس سے گزری۔ اس کے بعد اگر ہم تغلق نامہ کو صحیح مان لیں تو دہلی کی فوج کو، کسی احمقانہ غلطی کی بنا پر رات میں دس کردہ کے ویران علاقے میں کوچ کرنا پڑا اور اگلی صبح کو، پیاسے تھکے ماندے اور گرد سے بھرے ہوئے سپاہی دشمن کے بالکل سامنے جا پہنچے اور انہیں جنگ شروع کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔[1] دونوں فوجوں نے سرعت کے ساتھ خود کو عہد وسطیٰ کے مروجہ طریقہ پر صف آرا کیا۔ دہلی کی فوج میں خان خاناں نے مع چھتر، قلب فوج میں جگہ لی۔ قتلغ نے ہراول دستہ کی قیادت کی۔ تلبغہ یقدہ نے بائیں بازوں کی تشکیل کی۔

---

(1) ایضاً سطور 62-1756۔

(2) ایضاً، سطر 1777۔

"ہندو اور مسلم دستے علیحدہ کیے گئے۔ ہندو سواروں کی قیادت ہندو راوتوں نے کی"۔ دیپال پور کی فوج میں تغلق نے قلب (فوج) میں جلہ لی، جونا کو اس کے آگے جگہ دی گئی اور کھوکھروں، جن پر ہراول دستہ مشتمل تھا، کی قیادت ان کے سردار گل چند۔ نیجو اور ان کے پیرو کار کر رہے تھے۔ بایاں باز بہرام ایبہ کی کمان میں تھا اور داہنا بازور تغلق کے دو بھانجوں، اسد الدین اور بہاء الدین کی (قیادت میں)۔

عصامی کے مطابق دہلی (فوج) کے ہراول دستوں پر کھوکھروں کا حملہ اتنا شدید تھا کہ وہ تتر بتر ہو گئے اور قلب فوج کی جانب بھاگے۔ قتلغ کے گھوڑے کو گولی لگی اور وہ اس پر سے نیچے گر گیا۔ اور اس نے کھوکھروں سے، جنھوں نے اسے گھیر لیا تھا، چلا کر کہا کہ وہ ایک بڑا افسر ہے اور اسے تغلق کے پاس لے جایا جائے۔ لیکن ان لوگوں نے اس کی باتوں پر دھیان نہ دیا اور اس کا سر کاٹ لیا۔ جب خان خاناں کے آگے کی صفیں قلب فوج کی جانب بھاگنے لگیں تب خان خاناں نے، جس نے شاید ہی کبھی فوج کی قیادت کی تھی، فرار کا فیصلہ کیا۔ کھوکھروں کو اپنی اس آسان فتح پر تعجب ہوا۔ گل چندر نے اپنا گھوڑا خان خاناں کے چھتر بردار کی جانب دوڑا دیا، اس کو قتل کر دیا اور چھتر کو لا کر تغلق کے سر پر یہ فگن کر دیا۔ اور اس طرح دہلی کے بڑے بڑے امراء کے فیصلے کی پیش بندی کر دی۔ اس طرح تغلق نے بادشاہت کی پہلی نشانی ایک کھوکھر کے ہاتھوں سے پائی۔[1] برادرو لوگوں نے شاید کوئی خاص حصہ جنگ میں نہ لیا۔ خان خاناں نے میدان جنگ میں موجود تمام چیزیں دشمن کے ہاتھوں میں چھوڑ دی۔ اور تین دیگر خانوں-یوسف خاں، شائستہ خاں اور قدر خاں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ تغلق کو قلتغ کے انجام پر افسوس ہوا۔ لیکن جب زخمیوں کے درمیان سے ملک تمر کو اس کے سامنے لایا گیا۔ تو اس نے اس کا مناسب علاج کرایا۔ شکست خوردہ فوج کے مسلم سپاہیوں کے تغلق کے سپاہیوں نے بے عزتی کی لیکن جب وہ اس کے سامنے لائے گئے تو اس نے ان کو معاف کر دیا۔

---

(1) عصامی، 73-370، امیر خسرو لکھتے ہیں کہ دہلی کی فوج ایک ہی حملہ میں تتر بتر ہو گئی۔ لیکن بد قسمتی سے وہ (عصامی کے بر عکس) اس حالت میں نہ تھا کہ اس بات کو صاف بیانی کے ساتھ قبول کر لے کہ یہ کھوکھر لوگ ہی جنھوں نے سر سوتی کی جن لوگوں کو ملک تغلق اور 'اسلام کی شوکت'، کے لیے جیتا۔

مال غنیمت کی وصولی اور فوج کی ترتیب کا انتظار کرے تغلق میدان جنگ سے دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ تغلق نامہ میں اس کے کوچ کی مندرجہ ذیل منزلوں کا ذکر ہے ہانسی، مدینہ، (روہتک کے شمال میں ایک گاؤں) روہتک، مندوتی، پالم (موجودہ بین الاقوامی ہوائی اڈہ) کو سامبر کی پہاڑی اور لہراوت کا میدان۔ جہاں پر جمنا اس کی پشت پر اور دہلی (کا شہر) اس کے سامنے تھا، وہ جنگ کے لیے خیمہ زن ہوا۔ یہ لکھا گیا ہے کہ اپنے قبضہ میں آئے ہوئے علاقے میں تغلق نے سختی کے ساتھ امن و امان قایم کیا۔ اور اس نے چھ لاکھ ٹنکوں کی اس رقم (کو قبول کرنے) سے انکار کر دیا جو اس کے افسروں نے بے قصور غلے کے تاجروں کے ایک کارواں سے زبردستی وصول کر لیا تھا۔ لیکن خسرو خاں کے علاقوں میں انتشار بڑھتا جا رہا تھا۔

لہراوت کی جنگ

جب شکست خوردہ فوج دہلی واپس ہوئی تو کچھ تامل کے بعد خسرو خاں نے اپنے مشیروں سے صلاح مانگی۔ ان کی یہ رائے کہ پالم کے مشرق میں تمام علاقے دے کر تغلق سے مصالحت کر لی جائے اس لیے رد کر دی گئی کہ یہ فاتح کمانڈر کو منظور نہ ہو گی اور خسرو خاں کو ایک بادشاہ کا رویہ اختیار کرنے اور جنگ کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ دہلی میں جمع کثیر دولت کو تقسیم کر دیا جائے تاکہ سپاہیوں اور افسروں کی وفاداری حاصل ہو سکے۔ جس طرح یہ ساری دولت لوٹی گئی اس کا بیان مشکل ہے۔ خواتین، ملک اور دیگر افسروں نے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں ٹنکے لیے...... گرچہ مسلمانوں کو کافی (رقم) ملی، ہندوؤں کو اس سے دوگنی (رقم) ملی...... پھر بھی دشمن کے خوف سے خزانوں کی تقسیم کرنے والے کی عظمت کو نقصان پہنچتا ہے۔ جو (اس طرح سے دولت) بانٹتا ہے اسے کوئی عزت حاصل نہیں ہوتی اور وہ جسے یہ ملتی ہے وہ اس کے لیے (خود کو) کسی طرح پر احسان مند نہیں محسوس کرتا[1]۔ برنی لکھتا ہے: کہ خصوصی انعامات کے علاوہ ہر سپاہی کو ڈھائی سالوں کی تنخواہ ملی اور مطالبے اور اخراجات کے تمام کاغذات جلا دیے گئے۔

---

(1) تغلق نامہ، سطور، 68-2167، 2196۔ 93-2190

خسرو خاں اپنی فوج کے ساتھ سری کی محل سے باہر آیا اور حوض خاص، جسے بعض ماخذ میں حوض علائی بھی لکھا گیا ہے، کے سامنے خیمہ زن ہوا۔ (اس کی) مخلوط فوج کا بیان تغلق نامہ میں اس طور پر ہے۔ "یہ نصف مسلم اور نصف ہندو تھی جو سیاہ اور سفید بالوں کی طرح ملی ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی ماتحتی میں مسلمان ان سے اس طرح ملے جلے ہوئے تھے جیسے ان کے اپنے سائے۔ وہ ہندوؤں سے اس طرح ملے ہوئے تھے جس طرح ان کی خیرات ان کے گناہوں کے ساتھ (ملی ہوتی ہے[1]) فوج ہندو اور مسلمانوں سے (مخلوط طور پر) اس طرح بھری ہوئی تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی متعجب تھے[2]" ان دونوں گروہوں کو مناسب طور پر ایک منظم فوج کی صورت میں متحد کرنے کے لیے فوجی صلاحیت اور سیاست دانی دونوں ہی کا، بد قسمتی سے فقدان تھا۔

خسرو خاں نے جمعہ سے قبل کی شب جنگ کی تیاریوں میں گزاری۔ اس کے خیمہ کے آگے ایک چھوٹی گھاٹی کھودی گئی تھی، اور اس کے پیچھے ایک مٹی کی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ اس کے سپاہی جگہ کی کمی کی وجہ سے پریشانی میں تھے۔ رات ہی میں عین الملک اجین اور دہار کی جانب فرار ہو گیا۔ لیکن اس کا پتہ خسرو خاں کو اگلی صبح تک نہ چلا۔

جمعہ کے دن جب آفتاب ایک نیزہ کی بلندی پر آگیا تب خسرو خاں نے تغلق کے خیمہ پر حملہ کیا۔ خسرو کے افسروں نے جو جگہیں لے رکھی تھیں ان کا بیان تغلق نامہ میں ہے اور یہ قابلِ توجہ ہے۔ داہنا بازو، یوسف صوفی خاں، کمال الدین صوفی، قرۃ قیمار کا بیٹا شائستہ خاں، کافور مہر دار، شہاب نائب باربک، قیصر، خاص صاحب، غمر بغرا خاں، اودھ کا گورنر تیگین، بہاء الدین دبیر، بابا بازو، رائے رایان رندھول، ناگ، کجب برہما اور مالدیو کی قیادت میں تمام برادرو سنبل حاتم خاں، امیر حاجب، تمام دیوانجات کے افسران، مع دیوان عرض، تلبغہ، یغدا۔ ان امرا کا شمار ممکن نہیں جو حال ہی میں

---

(1) یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلم دینیات بعض صورتوں میں گناہوں کی تلافی کے لیے خیرات تجویز کرتی ہے۔

(2) ایضاً سطور۔ 49، 314، 3389۔

(3) ایضاً سطور 3272، 69، 3267۔

مقرر کیے گئے تھے...... دس ہزار برادو گھوڑ سوار، مع اپنے راناؤں اور راؤں کے۔ ہاتھیوں کے گرد متعین تھے۔[3] ہندو دوستوں نے اپنے جھنڈے کے لیے گائے کی دمیں استعمال کیں جن میں سور کے دانت بندھے ہوئے تھے۔ تغلق نے حسب معمول حکم دیا تھا کہ ماہی نشانات میں مور کے پر باندھے جائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرح کے مسلمانوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ لگایا تھا جب کہ دونوں طرح کے ہندوؤں نے "نارائن نارائن" کا۔ تغلق کی خواہش نہ تھی کہ اس صبح جنگ شروع کی جائے لیکن خسرو خاں کے حملہ نے اس کے لیے کوئی چارہ نہ چھوڑا۔ عصامی کے مطابق تغلق نے خود قلب فوج میں جگہ لی۔ علی حیدر اور سہج رائے (ایک کھوکھر سردار) تغلق کے پیچھے کھڑے تھے۔ گل چندر نے، مع تمام کھوکھران، ہراول کی قیادت کی داہنا بازو فخر الدین جونا شغوری، شہاب اور شادی داور کی قیادت میں تھا۔ بایاں بازو (تغلق کی بہن کا بیٹا) بہاء الدین بہرام ایبہ یوسف شحنہ پیل، نور مند (ایک افغان) کرمی (ایک منگول نو مسلم) اور (تغلق کے بھائی سپہ دار داور کے بیٹا) اسد الدین کی کمان میں تھا۔

جنگ کے متعلق برنی کا پیش کردہ بیان قابل اعتنا نہیں ہے۔ امیر خسرو اور عصامی دونوں یہ لکھنے میں متفق ہیں کہ خسرو خاں کا حملہ اتنا سخت تھا کہ تغلق کے پاس تین سو سے زیادہ آدمی موجود نہ رہے۔ برادو سردار رندھول اور کجب برہما نے ملک جونا کے دستہ پر جو ان کے سامنے تھا، ایسا زبردست حملہ کیا کہ وہ شغوری شہاب کی جانب ہٹا اور اس طرح جو جگہ خالی ہو گئی اس میں برادرو گھس پڑے اور آگے نکل گئے۔ اسد الدین نے تغلق کے بائیں جانب سے قلب کی طرف حرکت کی لیکن بغرا خاں اور تلبغہ بھی اس کو روکنے کو آگے بڑھے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ تغلق کی فوج کی شکست ہو رہی تھی۔ دشمنوں کی صفوں کو منتشر ہوتا اور صرف چند ہی آدمیوں کو اپنی جگہ پر قایم دیکھ کر خسرو خاں نے شائستہ خاں کو دشمن کے ساز و سامان پر حملہ کرنے کو کہا۔ شائستہ خاں نے تغلق کے خیمہ کی۔ رسیاں کاٹ دیں اور آواز دی کہ تغلق اپنے علاقہ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ خسرو کے فتح مند سپاہی دشمن کا ساز و سامان لوٹنے میں لگ گئے۔ یہ ایک زبردست غلطی تھی۔ چونکہ عہد وسطیٰ کے فن جنگ کا ایک اہم اصول یہ تھا کہ فتح حاصل ہونے کے موقعہ پر سخت انبساط قایم رکھا جائے۔

اس زبردست بحران میں بھی تغلق کے ہوش و حواس قایم رہے۔ اس نے اپنے اعلا افسروں کو اکٹھا کیا۔ پھر اس کے گرد جمع لوگوں کی تعداد پانچ سو تھی۔ اس کو فائدہ یہ تھا کہ دشمن کے سپاہی بالکل بدنظمی کی حالت میں تھے۔ ہر شخص ان چیزوں کو لوٹ رہا تھا جو اسے مل سکی تھیں۔ تغلق نے فیصلہ کیا کہ اصل اہمیت کی حامل وہ جگہ ہے جہاں خسرو خاں تھا۔ اگر اسے جیت لیا جا سکے تو بازی، جو تقریباً ہاری جا چکی تھی، دوبارہ جیتی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے کھوکھر سردار گل چندر کو عقب سے خسرو خاں پر حملہ کرنے کو بھیجا جب کہ اس نے خود سامنے کی جانب سے حملہ کیا۔ اس دوطرفہ حملہ نے خسرو خاں کو یہ یقین دلا دیا کہ اس کی جان خطرہ میں ہے۔ خواہ بقیہ فوج کا حال جو بھی ہو اور چونکہ اسے بڑی فوجوں کی قیادت کا تجربہ نہ تھا اس لیے اس نے اپنی جان عزیز کو بچانے کے لیے راہ فرار اختیار کی۔ اس (حرکت) نے جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ اپنے سردار اس کی جگہ پر نہ دیکھ کر خسرو کے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ گل چندر نے خسرو کے چھتر بردار کو قتل کر دیا اور چھتر کو تغلق کے سر پر سایہ فگن کر دیا۔ جب تغلق نے یہ سوچا کہ فتح اس کو حاصل ہو چکی تھی۔ تو ایک مخالف فوج، مع ہاتھیوں کے جن میں سے کچھ صاف اور کچھ غیر واضح طور پر نظر آ رہے تھے، ایک نشیب کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ عصامی کہتا ہے کہ یہ خسرو کی فوج کی بائیں بازو کا ایک حصہ، جس کی قیادت سنبل حاتم خاں کر رہا تھا اور جو (اب تک) اپنی جگہ پر قایم تھا۔ لیکن تغلق نامہ کے مطابق صوفی خاں اور کافور مہردار بھی وہاں موجود تھے۔ دہلی کی فوج کے اور حصوں کی طرح اس میں مسلم اور ہندو دونوں ہی سپاہی موجود تھے۔ لیکن موخرالذکر کی تعداد زیادہ تھی۔ تغلق نے پہلے تو اس کی تعداد و طاقت کا بہت زیادہ اندازہ لگایا لیکن اس کو شکست دینے میں اسے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔

عصامی اور خسرو ہمیں اس کا کچھ اندازہ فراہم کرتے ہیں کہ شکست خوردہ سپاہیوں کا کیا حال ہوا۔ عصامی کے مطابق تمام ان برادروؤں کو جو میدان جنگ میں کام نہ آتے تھے دوسرے دن سلطان کے حکم کے مطابق دہلی کی سڑکوں اور گلیوں میں مار دیا گیا۔ خواہ برادوروؤں کی کوئی ذات تھی یا پیشہ ورانہ گروپ، اس قتل عام نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ خسرو لکھتا ہے کہ فتح مند فوج کے مسلم سپاہیوں نے شاذ و نادر ہی شکست

خوردہ مسلم سپاہیوں پر اپنی تلواریں چلائیں لیکن کھوکھروں، افغانوں، منگولوں اور میو لوگوں نے کسی قسم کی روک تھام گوارا نہ کی۔ اگر شکست خوردہ مسلمانوں کو جان کی امان ملی ہوئی تھی تب بھی ان کو ان کے تمام اسباب سے محروم کیا جا سکتا تھا۔ اصل بدنصیبی (شکست خوردہ غیر برادرو) ہندو سپاہیوں۔ خواہ وہ زندہ، مردہ یا زخمی ہوں۔ کی تھی جن کو کسی طرح کی حفاظت حاصل نہ تھی۔[1] ان کے روپے، گھوڑے اور جواہرات چھین لیے گئے اور رانا اور راوت، جو اپنے تمام زیورات پہن کر جنگ میں آئے تھے۔ خصوصی طور پر لوٹ کے شکار بنے۔ لیکن خسرو اس بات کو بھی لکھتا ہے کہ تغلق کے افسروں نے شاید و باید ہی لوٹ مار میں حصہ لیا۔

جنگ کے بعد تغلق اپنے خیمہ کو واپس آیا اور دہلی کے تمام سر برآوردہ افسر اس کو خراج عقیدت پیش کرنے حاضر ہوئے۔ ان میں محمد ایاز بھی تھا جس نے اپنے باپ ملک احمد ایاز کی جانب سے سری کی کنجیاں اسے پیش کیں۔ اگلی صبح (سنیچر یکم شعبان 920ھ 6/ ستمبر 1320ء کو جب کہ سڑک کے دونوں جانب سپاہیوں کی قطاریں لگی تھیں، تغلق باضابطہ فوجی جلوس کے ساتھ محل ہزار ستون کی جانب روانہ ہوا۔ وہ دروازے کے قریب اترا اور راضی کے لیے (عام) معافی کا وعدہ کر کے امراء اور ملکوں کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ تخت پر اس نے جگہ نہیں لی۔

تغلق نامہ میں اس بات چیت کا بیان پیش کیا گیا ہے جو اس کے بعد ہوئی۔ اور اس میں بعض ٹکڑے ایسے ہیں جسے شاعر خود اپنی طرف سے نہیں لکھ سکتا تھا۔ اپنے اسلاف کے لیے کسی قسم کا دعویٰ جس کے متعلق حاضرین کو دھوکہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیے بغیر تغلق نے صاف گوئی کے ساتھ کہا؛ میں کسی کام کے لائق آدمی نہ تھا۔ (آوارہ مرد) (میں) سورج اور چاند کی گرمی و سردی کا شکار تھا۔ مرحوم سلطان جلال الدین خلجی نے مجھے ایک معمولی عہدے سے ترقی دے کر اپنے نزدیک کا عہدہ دیا۔ اور میں متواتر جاگ جاگ کر اپنی تلوار سے، جو ہیرے کی طرح تیز تھی، اس کی حفاظت کرتا تھا"۔ اس کے بعد اس نے اپنے حالات زندگی کا ایک مختصر بیان دیا۔ جلال الدین کی موت

---

(1) ایضاً، سطر 2522۔

(2) ایضاً ص ص 128-38، عصامی ص ص 379-80۔

کے بعد وہ بہت ملول رہا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بعد علاؤالدین کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ وہ الغ خاں کی ملازمت میں داخل ہوا۔ اور پھر اس کی موت کے بعد اس نے سلطان علاؤالدین کی خدمت میں اپنی کمر کسی۔ "اس کے بعد سے جو بھی ترقیاں مجھے حاصل ہوئی ہیں وہ اس عظیم المرتبت بادشاہ کی وجہ سے"۔

اس موقع پر امراء نے قطع کلام کیا۔ تغلق اپنی صفات کو۔ جن کی وجہ سے اسے ترقیاں حاصل ہوئی تھیں، نظر انداز کر رہا تھا، جب رنتھمبور کے ہمیر دیو نے اپنی فوج کو جنگ کے لیے بھیجا تھا تب الغ خاں نے تغلق کو فوج کی کمان سونپ دی تھی اور اس نے دشمنوں کے دو تہائی حصہ کو تہہ تیغ کر دیا تھا وہ وقت اس کی خوش قسمتی کے دن کی صبح کے مانند تھا، اس کی دوسری فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کی اس فتح کا تذکرہ کیا جو اسے اپنے ہمنام منگول (سردار) تغلق کے تومان پر اور رائے ببھوں کی اتنی ہی بڑی فوج پر، سمندر کے کنارے حاصل ہوئی تھی۔ اس نے رائے سے نقد (خراج) وصول کیا تھا اور سمندری راستہ سے لائے جانے والے اسباب تجارت پر محصول لگایا تھا۔ اس نے مبارک (شاہ) کی موت سے قبل تک کے عرصہ میں 18 فتوحات حاصل کی تھیں اور اس کے بعد سے دو اور - 'خدا نے آپ کو ایک بڑے کام کے لیے بچا رکھا تھا۔ ورنہ کون اتنے قتل و غارت گری کی آزمائش کے بعد زندہ بچ سکتا تھا؟'' وہ تخت کا مستحق تھا۔

لیکن تغلق اب بھی آمادہ نہ تھا۔ "میرے تخت و تاج میری کمان اور تیر ہے جس طور پر علائی شہزادوں کو قتل کیا گیا تھا۔ اس سے اسے صدمہ ہوا تھا"۔ باغی (شاہی) حرم میں گھس گئے تھے۔ بعض شہزادیوں کو پوشیدہ طور پر یا کھلے عام، اپنے تصرف میں لے لیا تھا اور بعض دیگر (شہزادیوں) کو ہندوؤں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مرتد خاں خاناں نے کئی (شہزادیوں) کے ساتھ زنا بالجبر کیا تھا، تین مقاصد اس کے سامنے تھے۔ اول تجدید اسلام۔ دوئم یہ کہ ہندو زاد ملعونوں سے سلطنت کو چھین کر شاہی خاندان کے کسی زندہ بچے ہوئے شہزادے کے حوالہ کر دینا اور سوئم یہ کہ ان احسان فراموش ملعونوں، جنھوں نے شہزادوں کو قتل کیا تھا، مناسب حال سزا دینا۔ "اگر شاہی خاندان میں سے بچا ہوا کوئی شہزادہ موجود ہو تو اس (کی بادشاہیت) کا اعلان کیا جائے۔

اگر کوئی باقی نہ تھا تب یہاں پر بہت سے لائق ملک موجود ہیں۔ مجھے اپنا دیپال پور پسند ہے...... میرے لیے میری تلوار اور منگولوں کا سر (کافی ہے) تم لوگ تاج اور صاحب تاج کی دیکھ بھال کرو۔"

امراء نے اپنے سر زمین پر ڈال دیئے۔ تغلق کی قبولیت (بادشاہت) اتفاق رائے سے ہو گی لیکن اس کی نامنظوری کی وجہ سے خانہ جنگی شروع ہو سکتی تھی۔ اس طرح مزید کچھ گفت و شنید کے بعد انہوں نے اپنی آخری اور فیصلہ کن دلیل پیش کی، جو کام آپ کے ہاتھوں انجام ہوئے ہیں ان کی وجہ آپ کی عزت آسمان تک بلند ہو گئی ہے۔ اگر کوئی دوسرا آدمی تخت نشیں ہو گا تو ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ پر محتاط نظر رکھے گا اور آپ کی جرأت کا جو حال ہے اس کے پیش نظر وہ آپ کے نیزے کا خوف کیے بغیر کیسے چین کی نیند سو سکے گا؟ ان حالات کے تحت، خواہی نخواہی وہ اپنے تکیہ کے ایک کانٹے کی مانند (آپ کو) نکالنے پر مجبور ہو جائے گا، ان لوگوں نے اس کی توجہ ابو مسلم خراسانی کے انجام کی طرف دلائی، جس نے امویوں کا تختہ الٹ دیا تھا، عباسیوں کو تخت نشین کرا دیا تھا اور ایک وفادار افسر کا رویہ اختیار کیا تھا۔ پھر بھی خلیفہ ابو جعفر منصور نے اس کے قتل کا حکم دیدیا تھا، چونکہ وہ اتنا اہم شخص تھا کہ ایک رعیت کی طرح نہیں رہ سکتا تھا۔ اس دلیل کا کوئی جواب نہ تھا۔ تغلق نے کچھ دیر سوچا اور اس کے بعد اپنے امراء کی درخواست کو منظور کر لیا۔ ان لوگوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے تخت پر بٹھا کر، غیاث الدین کے لقب کے ساتھ اس کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان دو سر بر آوردہ قسمت آزماؤں کے انجام کا ذکر باقی ہے جو بازی ہار گئے تھے۔ ان کے قریبی دوستوں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ چونکہ انہوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ ان (دونوں) کی صحبت میں دیکھے جانے کا یقینی مطلب موت تھی۔ خان خاناں نے ایک ضعیفہ کی جھونپڑی میں پناہ تلاش کی لیکن اسے پہچان لیا گیا۔ اور ملک جونا، جسے جنگ سے پہلی والی رات میں اسے گرفتار کرنے کو بھیجا گیا تھا، نے محتاط طور پر اپنے باپ کے رحم دلانہ اور عفو پرور مزاج کے متعلق کچھ باتیں کہیں۔ لیکن رحم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا چونکہ وہ (خان خاناں) زنا بالجبر اور قتل دونوں ہی کا مجرم تھا۔ تغلق نے دہلی کی سڑکوں پر اس کی تشہیر کا حکم دیا۔ اس کے بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ اور اس کی لاش کو

ایک منارہ پر الٹا لٹکا دیا گیا۔

خسرو خاں کا ساتھ بھی اس کے برادروں نے چھوڑ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تلپت گیا۔ اور پھر دہلی واپس ہوا۔ جہاں اس نے ایک ویران باغ میں چھپنے کی کوشش کی۔ شاید اپنے مرحوم آقا ملک شادی کے مقبرے کے باغ میں۔ جنگ کے بعد تیسرے دن اس کا پتہ چلا اور ملک جونا (جو اب الغ خاں ہو گیا تھا) نے اس کی پریشان حالت کو دیکھ کر پھر رحم کی بات کی۔[1] تغلق شاہ کے مسند کے سامنے لائے جانے پر خسرو نے زمین بوسی کی۔ اس نے مبارک شاہ کا قتل کیوں کیا تھا؟ خسرو خاں کا جواب تغلق نامہ نے مجملاً یوں پیش کیا ہے "حقائق سب ہی لوگوں کو معلوم ہیں۔ اگر میرے ساتھ وہ نہ گیا ہوتا جو نہیں کیا جانا چاہیے تو میں بھی وہ نہ کرتا جو مجھے نہیں کرنا چاہیئے تھا"۔ بقیہ تمام باتوں کا الزام اس نے اپنے مشیر کاروں پر لگایا۔ اس کی اپنی خواہش یہ تھی کہ کسی ایک شہزادہ کو تخت نشین کرائے اور بعد میں بھی اس نے کوشش کی کہ پالم سے مشرق کے تمام علاقوں کو دے کر تغلق شاہ سے مصالحت کرے۔ اس نے اپنی سزا بھی خود تجویز کی۔ اسے اندھا کر دیا جائے اور رہنے کو ایک گاؤں دے دیا جائے۔ لیکن سلطان نے کہا کہ وہ اصول قصاص - جان کے بدلے جان - کا پابند تھا اور اسے اپنی گردن کو تیز تلوار کے لیے تیار رہنے کو کہا اس کے بعد سلطان کے حکم پر جلاد نے خسرو خاں کو اسی جگہ قتل کر دیا[2] جہاں پر مبارک شاہ کا سر قلم کیا گیا تھا۔ اور اسی طرح سے اس کی لاش کو نیچے صحن میں پھینک دیا گیا۔

---

(1) ایضاً سطور 2874-76

(2) ایضاً سطور 2882

پانچواں باب

تغلق خاندان

1

سلطان غیاث الدین تغلق (25-1320ء)

نام اور نژاد

سلطان غیاث الدین کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو نے اپنی (تصنیف) تغلق نامہ میں لکھا ہے:

معظم غازی تغلق ترا نام
مغل ہم نام تغلق داشت از ایام[1]

اس شعر سے بالکل واضح ہے کہ تغلق سلطان کا ذاتی نام تھا نہ کہ ایک قبائلی نام جیسا کہ سر دولزے ہیگ نے تجویز کیا ہے۔ عفیف بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے جب وہ یہ لکھتا ہے کہ اس خاندان کے پہلے بادشاہ کا نام سلطان تغلق تھا۔ اور دوسرے کا سلطان محمد[2] سکوں اور کتبوں کی شہادت بھی امیر خسرو کے (کے بیان) کی تصدیق کرتی ہے۔ سلطان محمد خود کو ابن تغلق شاہ کہا کرتا تھا لیکن فیروز شاہ اور اس کے جانشینوں نے کبھی بھی تغلق کو بطور خاندانی نام استعمال نہیں کیا۔ پھر بھی اس پورے خاندان کو تغلق کہنا ہی زیادہ موزوں ہوگا۔ اگرچہ غیر صحیح۔

مورخین کے درمیان سلطان تغلق کے سلسلۂ نسب کے متعلق کافی اختلاف رائے رہا ہے۔ ابن بطوطہ نے ملتان کے مشہور سہروردی صوفی بزرگ شیخ رکن الدین

---

(1) تغلق نامہ، ص 138۔

(2) عفیف، تاریخ فیروز شاہی 27۔

لفظ تغلق کے معنی کے متعلق قیاس آرائی بے کار ہے' چونکہ کوئی بھی اوائلی ماخذ اس معاملہ پر روشنی نہیں ڈالتے اور فرشتہ کا خیال ہے کہ یہ ترکی لفظ قتلغ کی بگڑی ہوئی شکل ہے جواب قبول نہیں معلوم ہوتا ہے۔

ابوالفتح کی سند کی بنا پر یہ لکھا ہے کہ تغلق ترکوں کے قراؤنہ قبیلے کا تھا' جو ترکستان اور سندھ کے درمیان پہاڑی علاقہ میں آباد تھے۔[1] اس بات کے علاوہ کہ ابن بطوطہ کے اس بیان کی تصدیق اس عہد کے دوسرے مصنفین نہیں کرتے۔ لفظ قراونہ کی نسلی اور صرفی اصلیت ابھی تک غیر واضح ہے اور بعد کے مصنفین نے اس کے متعلق جو تشریحیں پیش کی ہیں وہ بھی صورت حال کی پوری وضاحت نہیں کر پاتی ہیں۔ مارکوپولو انھیں مخلوط نسل کے لوگ قرار دیتا ہے جن کے باپ تاتاری اور مائیں ہندستانی تھیں۔[2] Mzik کا خیال ہے کہ (لفظ) قراونہ کا تعلق سنسکرت (لفظ) کرن سے ہے جس کے معنی مخلوط النسل ہے اور جو اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کا باپ کھتری لیکن ماں شودر ہو۔[3] فرشتہ جس نے تغلقوں کی ابتدا کے متعلق لاہور میں تفتیشات کی تھیں، کو یہ پتہ چلا کہ غیاث الدین کا باپ، ملک تغلق، سلطان بلبن کا ایک ترکی غلام تھا۔ اور یہ کہ اس کی ماں مقامی جاٹ خاندان[4] کی عورت تھی۔ لیکن یہ بیان ہم عصر ماخذ کی تصدیق کا محتاج ہے۔

روضۃ الصفا قراؤنہ کا ذکر منگول فوج[5] کے ایک خصوصی دستہ کی حیثیت سے کرتی ہے لیکن سلطان غیاث الدین کا ایک قراؤنہ ہونا بہت مشتبہ ہے۔ تخت نشینی کے قبل اپنی تقریر میں، جس طور پر ہم عصر ماخذ امیر خسرو کی تغلق نامہ میں پیش کیا گیا ہے، تغلق بے کم و کاست اس بات کا اقبال کرتا ہے جو کہ اس کے تمام سامعین جانتے تھے (یعنی کہ) ابتدا میں وہ کسی اہمیت کا حامل شخص نہیں تھا (آوارہ مرد)۔ جب تک بادشاہ نے کچھ اس طرح کی کی بات خود نہ کہی ہوگی اس وقت تک شاعر نے بادشاہ کی تقریر کو اس بات پر مبنی کرنے کی جرأت نہ کی ہوگی۔ اس کے خاندان کے لیے ایک شاہی سلسلہ نسب تلاش کرنے کی بدرتیج کی طرح کی کوششوں کو اس وجہ سے رد کردینا

---

(1) رحلہ، جلد 2 ص 31۔

(2) یول (yule) کی مارکوپولو، ص ص 99-98۔

Die Reise des arabers Ibn Battuta durch Indian and China-97. (3)

(4) فرشتہ، جلد 1 130

(5) روضۃ الصفا، جلد 5، 96

چاہیے کہ مقصد خوشامد نہ تھا۔ ان تمام مختلف الآرا کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندستان، مرکزی ایشیاء اور ایران سب ہی جگہوں میں لفظ قراؤنہ ایک مخلوط نسل (کے لوگوں) کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ منگولی یا ترکی باپ اور غیر ترکی عورتوں کی اولاد۔

ابتدائی حالات

تغلق کے ہندستان میں آنے کے وقت کے متعلق مورخین میں اتفاق رائے نہیں عفیف[1] اور ابن بطوطہ[2] یہ واقعہ علاؤالدین کے زمانہ میں بتاتے ہیں۔ لیکن امیر خسرو نے تغلق نامہ میں صاف لکھا ہے کہ کافی عرصہ تک (دہلی میں) تلاش معاش کے بعد تغلق کی بھرتی جلال الدین کی فوج کے شاہی دستوں میں ہوئی۔ تغلق نامہ اس کے بیرون ملک سے آنے کے متعلق خاموش ہے اور اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندستان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے پہلی سرخروئی الغ خاں کی ماتحتی میں رنتھمبور کے محاصرہ کے دوران حاصل کی تھی۔ لیکن دراصل سلطان علاؤالدین خلجی کی حکومت کے دوران ہی ملک تغلق نے عہدے اور درجہ میں ترقی حاصل کی۔ اس نے بہت جلد ہی سلطان کو اپنے جذبہ خلوص اور لگاؤ اور اپنی عسکری ہنر مندی سے متاثر کر لیا ہوگا چونکہ سرحدی علاقوں کا انتظام و انصرام، جو اسے سونپا گیا' وہ سلطنت کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک تھا، تغلق نے پہلے تو ملتان اور پھر دیپالپور کے گورنر کی حیثیت سے سلطنت کی عمدہ طور پر خدمت کی۔ اس نے ملک پر منگولوں کے مملکوں کو کامیابی کے ساتھ روکا اور سرحدی شہروں کی موثر طور پر قلعہ بندی کی۔ ابن بطوطہ ایک کتبہ کا ذکر کرتا ہے جو اس نے ملتان کی جامع مسجد میں دیکھا تھا۔ جس میں تاتاریوں کے خلاف

---

(1) تاریخ فیروز شاہی ص36 عفیف لکھتا ہے کہ تینوں بھائی 'تغلق رجب اور ابو بکر- سلطان علاؤالدین کی حکومت کے زمانہ میں خراسان سے دہلی آئے۔ خلجی سلطان نے ان سبھوں کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ لیکن تغلق نامہ سے صاف طور پر اس غلطی کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔

(2) رحلہ، جلد2۔ ص29

(3) تغلق نامہ، ص138- لیکن برنی لکھتا ہے کہ اس نے منگولوں کے خلاف بیس جنگیں جیتی تھیں۔ (تاریخ فیروز شاہی ص416)

اس (تغلق) کی 29 فتوحات کا ذکر تھا۔ شاید مہمات کی تعداد کے متعلق ابن بطوطہ کی یادداشت نے اسے دھوکہ دیا تھا۔ چونکہ امیر خسرو اس طرح کی صرف اٹھارہ فتوحات کا ذکر کرتا ہے۔ کسی بھی مورخ نے ان فتوحات کی فہرست نہیں پیش کی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض محض ایسی جھڑپیں رہی ہوں گی جو مغربی سرحد کی حفاظت کے لیے تعینات ہندستانی فوجوں اور منگولوں کے درمیان ہوئی ہوں گی۔

امیر خسرو کے مطابق جلال الدین کے انتقال کے بعد ملک تغلق کی کارگزاریوں کی سرگزشت میں گمنامی کا ایک ایک مختصر وقفہ رہا۔ شاید اس نے اپنی حمایت و وفاداری اس تیزی کے ساتھ نہ تبدیل کی جیساکہ دیگر جلالی امراء نے اپنے آقا کے قتل کے بعد کیا تھا۔ وہ علاؤالدین کے بھائی، الغ خاں، کی ملازمت میں داخل ہوا اور اس کا ملازم خاص بن گیا۔ جب الغ خاں کا انتقال ہو گیا تو اس نے علاؤالدین کی ملازمت کر لی۔ 'اسی (علاؤالدین) کی عنایتوں کی وجہ سے میں نے وہ مقام حاصل کیا جس میں تم مجھے اب پاتے ہو، اس نے اپنی تخت نشینی[1] کے موقع پر کہا تھا۔ برنی اس کا نام پہلی مرتبہ علی بیگ اور خواجہ ترتاق کے حملہ کے سلسلہ میں کرتا ہے۔ عصامی اور خسرو کے مطابق اس موقع پر اعلیٰ کمان ایک ہندو افسر، ملک نایک، کو دیا گیا تھا اور تغلق اس کے خاص ماتحتوں میں سے ایک تھا۔ بعد میں جب اقبالمند آ پہنچا تو غازی ملک اس کے خلاف روانہ ہوا اور حملہ آور کو ایک زبردست شکست دی۔ شاید اسی کامیابی کے بعد اسے مغربی سرحد کا ذمہ دار بنایا گیا۔ اور دیپال پور کا اقطاع اس کو تفویض کیا گیا۔

گرچہ تغلق نے علاؤالدین کی حکومت کے زمانہ میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا تھا پھر بھی یہ تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ملک کافور، جس نے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا اور ایک بادشاہ ساز کا رول اختیار کر لیا تھا' کی زیادتیوں کے خلاف ذرا بھی احتجاج نہ کیا۔ لیکن مبارک خلجی نے اس کی خدمات کا اعتراف کیا اور اس کے عہدے پر اس کی توثیق کی۔

"تذکرۃ"، اس مشن کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جس پر قطب الدین مبارک نے

---

(1) تغلق نامہ ص 137

محمد تغلق کو بھیجا تھا۔ عصامی کے مطابق شہاب الدین عمر کی تخت نشینی کے بعد اس کے نائب ملک کافور نے عین الملک ملتانی کو دیو گیری سے بلوایا اور گجرات میں حیدر اور زیرک کی بغاوت کو فرو کرنے کو بھیجا۔ وہ دیو گیری سے روانہ ہوا لیکن جب وہ چتوڑ میں خیمہ زن تھا تو اس نے کافور کے قتل کی خبر سنی۔ وہ اسی جگہ رک گیا اور دہلی کی سیاست میں تیزی سے واقع ہونے والی تبدیلیوں کو بغور دیکھتا رہا۔ حصول اقتدار کے بعد قطب الدین نے ملک تغلق کو عین الملک کے پاس بھیجا تاکہ وہ اس کو اپنا کوچ جاری رکھنے پر آمادہ کرے۔ اگرچہ عین الملک نے چتوڑ میں اس کا خیر مقدم کیا لیکن عین الملک کے افسران کسی مہم کو شروع کرنے پر تیار نہ تھے۔ اہم لوگوں نے سلطان کو ابھی تک نہیں دیکھا ہے، وہ تقریباً ایک مہینے تک انتظار کرنا (حالات کو دیکھتے رہنا) چاہتے تھے۔ ان کے تامل کا اندازہ کر لینے کے بعد تغلق دہلی واپس ہوا اور یہ تجویز کی کہ عین الملک کے تمام افسروں میں سے ہر ایک کو خلعت اور فرامین بھیجے جائیں جن میں ان کے عہدوں پر ان کی توثیق کے احکام درج ہوں۔ یہ تجویز مان لی گئی اور افسروں کو گجرات کی جانب کوچ جاری رکھنے پر آمادہ کرنے میں ملک تغلق کو کامیابی ہوئی۔ ملک تغلق فوج کے شامل چلا لیکن اعلیٰ کمان عین الملک ہی کے ہاتھوں میں رہی۔ غازی تغلق نے قابل ستائش ایک سفارتی خدمات انجام دی تھی۔

حصول اقتدار

قبل ایک باب میں خسرو خاں کے خلاف ایک تحریک کی تنظیم میں غازی ملک کے رول کا بالتفصیل ذکر کیا جا چکا ہے۔ امراء نے غازی ملک، جس نے نڈر اور پختہ تجربہ کار لیڈر کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا لیا تھا، کی تاج پوشی کر کے ایک عقلمندانہ کام کیا۔ ابن بطوطہ کے مطابق غازی ملک شروع میں تاج قبول کرنے پر رضامند نہ تھا اور بہرام ایبہ کشلو کو اسے قبول کرنے کو کہا۔ لیکن مواخر الذکر نے جب اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ ''اگر تم قبول نہیں کرو گے تو ہم لوگ تمہارے بیٹے کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے''۔ تب تغلق نے فوراً تاج قبول کر لیا۔ اس موری سیاح کا یہ بیان بہت زیادہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ امراء کے پیش نظر وہ دلائل کا صحیح بیان

جو تغلق نامہ میں قلم بند ہے، وہ پیش کیا جا چکا ہے، تغلق کے لیے اب محض ماتحت افسر بنے رہنا نا ممکن ہو گیا تھا۔

ملک غازی نے غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا۔ گرچہ وہ عمر میں کم نہ تھا لیکن خدا نے اسے بے حد جوش و ولولہ، بے خطا قوت فیصلہ اور تمام انتظامی امور میں باضابطگی کی صفات عطا کی تھیں۔ زمانہ قدیم سے مروجہ طریقہ کے مطابق اس نے انتظامی امور کی از سرِ نور تشکیل کی۔ اور اس میں اپنے دوستوں، رشتہ داروں اور حمایتیوں کو شامل کیا۔ اس نے نائب باربک کا عہدہ اپنے بھتیجہ اسد الدین کو دیا۔ ایک دوسرا بھتیجہ بہاء الدین عرض ممالک مقرر ہوا۔ ملک جعفر کو نائب عرض بنایا گیا۔ سلطان کے داماد 'ملک شادی کو دیوانِ وزارت کا نگراں مقرر کیا گیا۔ قاضی کمال الدین' قاضی القضاۃ کو صدر جہاں کے خطاب سے نوازا گیا اور قاضی شمس الدین کو دہلی کا قاضی مقرر کیا گیا۔

عوامی طبقہ سے ترقی حاصل کر کے اقتدار پانے والے ایک شخص کی حیثیت سے جیسا کہ وہ تھا، سلطان نے ایک طرف تو عہدے اور ترقیاں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو دیں مگر دوسری طرف، بلبن کی تقلید کرتے ہوئے، اس نے اپنے بیٹوں کو اعلیٰ خطابات دیئے۔ سب سے بڑا بیٹا ملک فخر الدین کو الغ خاں کا خطاب ملا۔ اور بقیہ کو خاں کا خطاب ملا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سلطان کے دو بھائیوں، ابو بکر اور رجب کے نام اور اس کے بھتیجہ کمال الدین فیروز، جو اس وقت محض 14 سالوں کی عمر کا رہا ہو گا، کا نام اس فہرست میں موجود نہیں ہے۔ شاید وہ دونوں بھائی اس وقت تک مر چکے تھے اور بھتیجہ بھی اتنا کم سن تھا کہ اسے کوئی اعزاز عطا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بہرام ایبہ کو کشلوں کا خطاب ملا۔ اور سلطان کے ذریعہ 'برادر' کہہ کر مخاطب کیے جانے کا بے نظیر اعزاز بھی اسے ملا۔ اس کے اُچھ کے اقطاع میں ملتان بھی شامل کر دیا گیا۔ سلطان ایک متبنیٰ بیٹا تاتار خاں، تاتار ملک بن گیا (کا خطاب مل گیا) اور ظفر آباد کا اقطاع اسے ملا۔ برہان کا بیٹا، "قتلغ خاں"، دیو گیر کا نائب وزیر بنایا گیا۔ سلطنت کی اس از سر نو تنظیم کردہ مشن کے ذریعے ہی غیاث الدین کے انتظامی اصلاحات اور شاہی اقتدار کی بحالی کی اپنی پالیسی کی ابتداء کی۔

سلطان کے مسائل

جس سلطنت کا انتظام غیاث الدین کو سنبھالنا پڑا تھا وہ مشکل مسئلوں سے بھری پڑی تھی۔ اس کی وسعت اس کے دور دراز اور سرحدی علاقوں پر یکساں طور پر اختیار کیے رکھنے کی مانع تھی۔ صوبوں میں برابر پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ سندھ صرف برائے نام دہلی کے ماتحت تھا۔ مرکز کی پریشانیوں کا فائدہ اٹھا کر وہاں کے سردار 'امر' نے ٹھٹھ اور زیریں سندھ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور واقعتاً آزاد ہو گیا تھا۔ اس طرح عین الملک ملتانی کے واپس بلا لیے جانے کے بعد سے گجرات سورشوں کا شکار تھا۔ نظم وضبط کی بحالی کے لیے ملک دینا، ظفر خاں، حسام الدین اور وجیہہ الدین قریشی کی کوششیں مکمل طور پر ناکام رہی تھیں۔ راجپوتانہ میں چتوڑ اور جالور اہم شاہی قلعہ تھے۔ لیکن ان پر جانباز راجپوت سرداروں کے غیر متوقع حملے ہو رہے تھے۔

مشرق میں صوبہ بنگال، جو ہمیشہ ایک مسئلہ بنا رہا، کی وفاداری وقتی نوعیت کی تھی۔ اس کا حکمراں شمس الدین فیروز، جو بلبن کا ایک خلف تھا، 1322ء میں مر چکا تھا۔ اس کے دو بیٹے 'شہاب الدین بغرا شاہ اور غیاث الدین بہادر شاہ نے اس کی زندگی ہی میں بغاوت کر دی تھی۔ بہادر شاہ نے سنار گاؤں میں خود کو مستحکم کر لیا تھا۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد اس نے لکھناوتی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور اپنے بھائیوں 'شہاب الدین اور ناصر الدین کو نکال باہر کیا۔ اس صورت حال نے دہلی کے سلطان کی مداخلت کو ضروری بنادیا۔ ترہت اور جاجنگر ابھی بھی طاقتور ہندو رایوں اور زمین داروں کے قبضہ میں تھے۔

دکن کے حالات بھی کسی طرح اطمینان بخش نہ تھے۔ علاؤالدین خلجی نے اس علاقے کو صرف تاخت تاراج کیا تھا اور دکن کے حکمرانوں کی ادائیگی خراج کی قبولیت سے ہی مطمئن ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی وفاداری بالکل سطحی تھی اور دیوگیری اور تلنگانہ میں شاہی اقتدار قایم رکھنے کے لیے برابر فوجی مہمیں بھیجنی پڑی تھیں۔ صورت حال بہتر بنانے کے لیے قطب الدین مبارک خلجی نے اپنے باپ کی پالیسی بدلی تھی اور سابقہ یادو مملکت دہلی سلطنت کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ جب دہلی میں سیاسی پیچیدگیاں

رونما ہوئی تو تلنگانہ کے رائے پرتاپ سنگھ رودر دیو نے دہلی کی نام نہاد ماتحتی کا نقاب بھی اتار پھینکا۔ 1318ء میں اس نے جو معاہدہ خسرو خاں سے کیا تھا اس کی مکمل طور پر خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ مراٹھوں کے ملک کی سرحد پر واقع قلعہ بند بھدر کوٹ کی جانب روانہ ہوا اور شاہی حفاظتی دستہ کو نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اپنے وسائل کو بہتر بنانے کے بعد اس نے اڑیسہ کے حکمراں کے حملوں کو بھی پسپا کر دیا۔ اور اپنا تسلط مغربی گھاٹ اور گوداوری سے لے کر جلار دریا کے علاقہ تک پھیلایا۔ معبر میں بھی شاہی تسلط کو اکھاڑ پھینکا گیا تھا۔ گرچہ ہوئے سالا مملکت کے ویر بلال سوئم نے سرکشی کا مظاہری نہ کیا لیکن وہ بھی واقعتہً آزاد ہو گیا۔

نئے سلطان کی فوری توجہ کے طلبگار ان غیر تشفی بخش سیاسی حالات کے علاوہ انتظامیہ کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ افسروں اور ان کے ماتحتوں کو ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے رشوتیں دی گئی تھیں۔ قطب الدین اور خسرو خاں دونوں نے ہی سپاہیوں کو راضی کر کے اپنی صورتحال مضبوط بنانے کے لیے کافی رقمیں خرچ کی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ خسرو خاں کے ذریعہ روپیوں کی بے دھڑک تقسیم سے خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ علاؤالدین خلجی کا نظامِ لگان درہم برہم ہو گیا تھا۔ اور نتیجتاً حکومت کے مالی استحکام کو شدید نقصان پہنچا تھا۔

لہٰذا جن مسائل کا سامنا غیاث الدین تغلق کو درپیش تھا وہ نہ صرف وسیع حدود کے تھے بلکہ پیچیدہ نوعیت کے بھی۔ گرچہ بنیادی طور پر وہ ایک فوجی لیڈر تھا۔ غیاث الدین نے جلد ہی صورت حال کا اندازہ لگا لیا اور جرائتمندانہ مگر مناسب اقدامات کے ذریعہ سلطنت کی مشین (کی رفتار) کو ایک معمول پر لایا۔ برنی پُر معنی انداز میں تبصرہ کرتا ہے کہ جس کام کو انجام دینے کے لیے دوسروں کو سالوں کی ضرورت ہوتی وہ اس کو دنوں میں کر دیتا۔[1] اس کی مضبوط اور چاق و چوبند انتظامیہ نے لوگوں کے لیے امن اور خوش حالی مہیا کی اور بقول برنی وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ علاؤالدین دوبارہ زندہ ہو گیا تھا۔[2]

---

(1) تاریخ فیروز شاہی ص 426 (2) ایضاً 425

معاشی تدابیر

تخت نشینی کے بعد جلد ہی غیاث الدین نے اپنی توجہ خالی خزانہ کی بحالی اور سلطنت کی مالیات کی از سر نو تنظیم پر لگائی۔ اس مقصد کے لیے اس نے نظام لگان میں اصلاحات کے لیے ایک عملی منصوبہ کا خاکہ تیار کیا' جو دراصل علاؤالدین خلجی کے نظام کی سختی اور اس کی جانشینوں کی غیر محتاط ڈھلائی کے درمیان بین بین کا ایک تصفیہ تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ اس کی تمام انتظامی کارروائیوں بنیادی پر اعتدال پسندانہ نوعیت کی تھیں۔[1] (طریقہ اعتدال اور میانہ روی)

گرچہ برنی کے غامض انداز تحریر کی وجہ سے اس کی (غیاث الدین کی) زرعی پالیسی کی تفصیلات کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ پھر بھی سلطان کے مقاصد کا کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے مسئلہ کا حل تین سطحوں پر تلاش کیا۔ مقطعوں (صوبائی گورنروں) کی (سطح پر) مقدموں (گاؤں کے مکھیاؤں) کی (سطح پر)۔ کسانوں کی فلاح کا خیال اس کے دماغ میں اول مقام رکھتا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ کسانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جائے کہ وہ نہ اتنے دولت مند بن جائیں کہ بغاوت کا خیال انھیں اپنی طرف مائل کرنے لگے اور نہ انھیں بالکل مفلس بنا دیا جائے چونکہ اس صورت میں وہ کاشت کاری چھوڑ دیں گے۔[2] علاؤ الدین خلجی کی اصلاحات کے دخانی انجمن نے کاشتکاروں کی معاشی زندگی کو مفلوج کر دیا تھا۔ ٹیکسوں کا بوجھ اتنا بھاری تھا کہ کام کرنے کی قوتِ محرکہ ختم ہو گئی تھی۔ اور کاشت کو بہتر بنانے یا اس کی توسیع کرنے کی خواہش لوگوں میں باقی نہ رہی تھی۔ جو فوائد ان کو صدیوں سے حاصل ہوتے رہے تھے وہ اب ختم ہو گئے تھے، اور وہ تنگدستی اور مفلسی کے پنجے میں پڑ گئے تھے۔ مقطعوں کو بھی دشواریوں کا سامنا تھا۔ کاشت میں کمی ہوئی تھی اور چونکہ مقدموں کی دستورات ختم کر دی گئی تھیں اس لیے وہ مقطعوں اور کسانوں کے درمیان بطور ایک رابطہ کام کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر مقطعوں کی آمدنی کم ہو گئی تھی۔ ایسی

---

(1) ایضاً ص427

(2) ایضاً ص431

مایوس کن صورت حال تبدیلی کی متلاشی تھی۔ غیاث الدین تغلق نے مناسب حال ہمت و صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور لگان کے معاملات کو سختی مگر ہمدردی کے ساتھ حل کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش کی۔

کسان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس نے علاؤالدین کے پیمائش اور فی بسوہ پیداوار کے اصول (حکم مساحت) کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ پر غلہ کی تقسیم (حکم حاصل) کے اصول کا اطلاق کیا۔ یہ دو لحاظ سے فائدہ مند تھا۔ اول یہ کہ اس نے کاشتکار کے لیے بہتر کاشت سے پیدا شدہ منافع کی یقین دہانی مہیا کی اور دوسرے یہ کہ اس نے کلی یا جزوی طور پر فصل خراب ہونے کی صورت میں چھوٹ کی گنجائش مہیا کی۔ اس طریقے کی تعریف کرتے ہوئے برنی لکھتا ہے کہ اب حادثات کا خیال رکھنے یا فصل پیدا کرنے والے یا نہ پیدا کرنے والے علاقوں میں فرق قایم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن حکومت کے حصہ (لگان) کے تناسب کے متعلق برنی غیر واضح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ 'سلطان نے لگان وصول کرنے والے افسروں کو حکم دیا کہ وہ اقطاعوں یا دیگر اراضیوں پر اندازہ یا تخمینہ کے اصول کے مطابق یا مخبروں کی اطلاعات اور 'موخران کے بیانات کی بنا پر دس یا گیارہ میں سے ایک سے زیادہ نہ لیں[1] اس غیر واضح جملے کا مطلب یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کا حصہ کل پیداوار کے دسویں حصہ سے زیادہ نہ ہوتا تھا یا (زیادہ صحیح طور پر) اس کی یہ توضیح کی جا سکتی ہے کہ لگان میں اضافہ کر تناسب 1/10 یا 1/11 سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ نظام لگان میں اصلاحات کی ابتدا کرنے میں سلطان کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ کسانوں کو راحت اور ساتھ ہی مالیات کی بحالی۔ یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لگان کو پیداوار کے 1/10 حصہ کی حد تک کم کر دیا ہوگا۔ روایتی طور پر حکومت کا حصہ 1/5 تھا جس کو علاؤالدین خلجی کی حکومت کے زمانہ میں بڑھا کر 1/2 کر دیا گیا تھا۔ لیکن علاؤالدین کے نظام نے قحط سالی کی صورت میں راحت کی یقین دہانی بھی مہیا کی تھی۔ اور اس کے بعد کے جاری کیے ہوئے نظاموں میں یہ بات بالکل ممکن نہ تھی۔ گرچہ یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ علاؤالدین کے بعد کے دور میں اتنی بھاری شرح لگان کا اطلاق ممکن نہ تھا۔

---

(1) ایضاً ص 429

یہ بات مان لی جاسکتی ہے کہ اس افرا تفری، کے دوران تبدیلیاں ضرور واقع ہوئی ہوں گی۔ برنی لکھتا ہے کہ قطب الدین مبارک خلجی نے عوام پر سے بھاری خراج اور شدید مطالبات کا بوجھ ختم کر دیا۔[1] لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے لگان کو بالکل موقوف کر دیا۔ غالباً اس نے اس کے اطلاق کو اس تناسب سے کچھ کم کر دیا ہو علاؤالدین نے مقرر کیا تھا۔ اور یہ بات بخوبی فرض کرلی جاسکتی ہے کہ یہ دور روایتی 1/5 حصہ کے برابر ہی رہا ہو گا۔ غیاث الدین نے اس کو ایک قانونی شکل دے دی۔ اس گنجائش کے ساتھ کہ، جہاں ممکن ہو سکے، اس کو 1/10 یا 1/11 کی حد تک بڑھایا جاسکتا ہے۔ برنی کا مندرجہ ذیل بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ اضافہ مروجہ شرح پر ایک مزید اضافہ کی نوعیت کا تھا۔ وہ لکھتا ہے "زمین پر لگان تدریجاً بڑھایا جانا تھا چونکہ اچانک اضافہ کا بوجھ ملک کو برباد کردے گا اور خوش حالی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو گا"۔[2]

افسروں کو ہدایت دی گئی کہ زراعت میں ہر سال اضافہ ہو اور اسی تناسب سے سرکار کے لگان کو بھی بڑھایا جائے۔ محصول میں اضافہ تدریجاً ہونا چاہیے اور اس حد تک کہ یہ کسانوں کی خوش حالی کو متاثر نہ کرے اور اپنی اراضی میں اس کی دلچسپی کو کم نہ کر دے۔ سلطان نے اپنے افسروں کو برابر لگان میں ایسے اضافے کے خلاف تنبیہ کی جس کی وجہ سے کسانوں کو اپنی اراضی کی پر کاشت قایم رکھنا مشکل ہو جائے اور غیر مزروعہ اراضی کو زیر کاشت لانے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ اس نے لگان کی وصولی کے متعلق گورنروں اور مقطعوں کے طریقہ کار کو متعین کیا اور کسانوں کو ان کی بالا دستی اور مظالم سے بچانے کے لیے ہر ممکن احتیاط برتی۔

غیاث الدین تغلق علاؤالدین کے اس اصول کو صحیح نہیں مانتا تھا کہ گاؤں کے مقدموں کو ایک معمولی کسان کی حیثیت کا بنا دیا جائے۔ حکومت کا لگان وصول کرنے کے نظام میں ان کی خدمات کی اہمیت کا وہ کلی طور پر معترف تھا۔ وہ یہ فرض کئی پشتوں سے ادا کرتے آئے تھے۔ اور اس سلسلہ میں تجربہ اور روایتی وقار حاصل کر چکے تھے۔ شاید اس نے کہا تھا کہ "اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرداروں اور مقدموں کے

---

(1) ایضاً ص 383

(2) ایضاً ص 430

کاندھوں پر کافی ذمہ داریاں تھیں"۔ اس لیے اس نے ان کی دستورات کی بحالی کا حکم دیا اور ان کی اراضیوں اور چراگاہوں کو لگان کی ادائیگی سے چھوٹ دے دی لیکن ساتھ ہی اس نے اس بات پر زور دیا کہ "سرداروں یا (ہندو) مقدموں کو اس حالت میں رکھا جائے کہ وہ (حکومت کے اقتدار کی جانب سے) بے پرواہ نہ ہو جائیں اور دولت کی زیادتی کی وجہ سے باغیانہ اور شرکشانہ روش نہ اختیار کرلیں"۔ اس طرح اس نے مقدموں کے ساتھ روادارانہ مگر سخت رویہ اختیار کیا۔ ان کی خدمات کا فائدہ اٹھایا گیا۔ ان کا وقار بحال کیا گیا مگر انہیں مفسدانہ یا مخالفانہ رویہ اختیار کرنے کے لائق نہ ہونے دیا گیا۔

اس نئی صورت حال میں لگان کی وصولی ٹھیکہ داروں کے ذریعے کیے جانے کے طریقے کی ہمت افزائی نہیں کی گئی لیکن اعلیٰ سطح پر اس کی روک ممکن نہ تھی۔ چونکہ گورنر اپنے عہدوں پر ٹھیکہ دارانہ شرائط پر فائز تھے۔ فاضل آمدنی (فواضل) جو انھیں خزانہ میں بھیجنا پڑا اس کی رقم متعین ہوتی ہے۔ ایک ایسا معاملہ نہ تھا جو واقعی آمدنی واخراجات کی بنا پر ہر سال طے کیا جائے۔ برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں درج تمام متعلقہ مگر منتشر حوالوں کو یجا کر کے ان احکام کا ایک واضح نقشہ پیش کیا جا سکتا ہے جو مقطعوں اور گورنروں کی ہدایت کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ ملکوں اور امراء کو "ان کے علاقوں کے لیے محصول کا نصف دسواں یا نصف گیارہواں حصہ یا 1/10 یا 1/11 حصہ دینے کے لیے" سلطان رضامند تھا۔ اسی طرح اگر ایجنٹ اپنی تنخواہ کے علاوہ 1/2 فیصد تک کی رقم زیادہ لے لیتے تو ان سے باز پرس نہ کی جائے اور نہ یہ رقم ان سے تعذیب کے ذریعے وصول کی جائے۔ لیکن اگر وہ معمول سے تجاوز کریں اور زیادہ رقم غصب کرلیں تو انھیں کوڑے لگا کر اور قید کر کے ذلیل وخوار کیا جائے۔ اور وہ رقم ان سے وصول کی جائے انھیں اپنے اقطاعات پر مناسب حد تک ہی مطالبے کرنا چاہیے' اور اس طرح حاصل شدہ رقم میں سے کچھ حصہ اپنے ماتحتوں کو دینا چاہیے'۔ ٹھیکہ داری کے طریقہ کی یہ ترمیم شدہ صورت گورنروں اور مقطعوں کے کاندھوں پر اور زیادہ ذمہ داری عائد کر دیتی تھی انھیں یہ دیکھنا تھا کہ بلا ظلم و دوست درازی لگان وصول کیا جائے۔ کسانوں سے بہت زیادہ مطالبات نہ کیے جائیں اور یہ کہ مقدم اپنے (ٹیکسوں کے) بوجھ کو کسانوں پر نہ منتقل کر دیں اور انھیں) (مقطعوں کو) ان کی باری میں 'یہ

حکم تھا کہ وہ انصاف اور ایمانداری کے ساتھ کام کریں ورنہ دیوان وزارت میں ان کے ساتھ سختی برتی جائے گی۔

نظام لگان میں اصلاحات کا یہ مبہم خاکہ بھی سلطان کے مالی انتظامات کی عمدہ اور صحتمندانہ خصوصیتوں کو صاف طور پر ظاہر کر دیتا ہے۔ یہ بات مان لینے کے بعد بھی کہ حکم مساحت بالکل ختم نہیں ہوا اور یہ کہ تدریجی طور پر ہی اس نے پیداوار کے بٹوارہ کے طریقہ کو جگہ دی۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ (غلہ) پیدا کرنے والے طبقے کے مفادات کا مناسب خیال پیش نظر رکھا گیا اور یہ کہ اس کو بھاری لگان کی وصولی اور ظلم سے بچانے اور بہتر اور وسیع پیمانہ پر کی گئی کاشتکاری کا فائدہ بہم پہنچانے کے لیے اقدام کیے گئے۔ افسروں کی مختلف سطحوں پر کارگزاری کے لیے قواعد وضع کیے گئے اور اس سپاہی شہنشاہ نے سختی کے ساتھ ان کے نفاذ کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہمیں اس بات پر تعجب ہونا چاہیے کہ شاہی خزانہ کی آمدنی کافی بڑھ گئی اور سلطان کو سیاسی استحکام کی اسکیموں پر عمل کرنے کا موقعہ ملا۔

فوج کی از سرِ نو تنظیم

مالیات کے بعد فوج کی صورت حال نے سلطان کی توجہ اپنی جانب مبذول رکھی۔ علاؤالدین خلجی نے ایک بہت موثر جنگی مشین تیار کی تھی جو اس کے کمزور جانشینوں کے زمانہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ غیاث الدین جو ایک کار آزمودہ فوجی رہنما تھا' نے فوج کی تنظیم نو کی موثر ترین طور پر کوشش کی۔ اس کی عسکری پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ سپاہیوں کو معاشی اور دیگر لحاظ سے مطمئن رکھا جائے۔ برنی بامعنی اندازہ میں لکھتا ہے کہ وہ اپنے سپاہیوں کی جانب ان کے والدین سے بھی زیادہ شفقت برتتا۔ وہ اس پر نظر رکھتا کہ ان کی تنخواہوں اور وظائف کی رقوم میں کسی قسم کی خرد برد نہ ہو۔ برنی کا یہ غلط بیان ہے کہ سراج الملک خواجہ حاجی دوبارہ وزیر جنگ بحال کیا گیا شاید اس کی کمزور یادداشت کی وجہ سے قلم بند ہوا تھا۔ وہ مشہور اور تجربہ کار سورما منظر سے روپوش ہو چکا تھا اور ہم اس عہد کی مہموں میں اسے کوئی حصہ لیتا ہوا نہیں پاتے ہیں۔ فوج کی کارگزاری بہت حد تک اس پر منحصر تھی کہ گھوڑوں کو کس طرح رکھا

جاتا تھا۔ غیاث الدین نے حلیہ اور داغ سے متعلق علاؤالدین کے ضوابط کا سختی کے ساتھ نفاذ کیا۔ تخت نشینی کے دو سالوں کے اندر ہی غیاث الدین نے اپنی فوج کی تنظیم اس موثر طور پر کرلی تھی کہ وہ جنوب بعید کی جانب ایک مہم روانہ کرنے کے متعلق سوچ سکا۔[14]

وارنگل کی مہم

انتظامی امور کو درست کرنے کے بعد سلطان نے سلطنت کے دور دراز اور سرحدی علاقوں میں اپنے اختیار و وقار کی بحالی کے مسئلے پر توجہ دی۔ تلنگانہ (کے معاملات) نے فوری طور پر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی چونکہ رائے پرتاپ رودر دیو نے دوبارہ اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سلطان نے سرکش رائے سے نمٹنے کے لیے اپنے بیٹا الغ خاں کو مقرر کیا۔ 721ھ / 1321ء میں شہزادہ ایک بڑی فوج کی قیادت میں دہلی سے روانہ ہوا اور علائی عہد کے بہت سے تجربہ کار افسر بھی فوج میں شامل تھے۔[1] مراٹھہ لوگوں کے ملک تک پہنچنے میں اس کو کسی بھی قبل کی فوج کے مقابلے میں کم وقت لگا۔ وہ دیوگیری میں آرام لینے اور بھرتی کرنے کے لیے رکا اور پھر تلنگانہ کے دارالسلطنت وارنگل کے لیے روانہ ہوا۔ راہ میں اسے کوئی مزاحمت، درپیش نہ ہوئی۔ وارنگل پہنچنے پر اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جو سارے دکن میں اپنے استحکام اور مضبوطی کے لیے مشہور تھا اس کے 70 برج تھے جن میں سے ہر ایک کی حفاظت ایک نائب کرتا تھا۔ ملک کافور کی دکن کی مہموں کے سلسلہ میں امیر خسرو نے قلعہ کا بیان پیش کیا ہے۔

عصامی[2] کے مطابق محاصرہ چھ مہینوں تک، فتح کی کوئی صورت ظاہر ہوئے بغیر، جاری رہا۔ سلطان کو الغ خاں کی وفاداری کے متعلق شبہ ہو گیا۔ اور اس تاخیر سے اپنی بے اطمینانی کے مضمون کا خط وہ ہر ہفتے بھیجنے لگا۔ اس غلط فہمی کے اسباب کی تشریح عصامی نے نہیں کی ہے لیکن وہ الغ خاں کو کسی قسم کے باغیانہ خیال سے بری الذمہ قرار

---

(1) ایضاً ص 446، فتوح السلاطین، مدراس ایڈیشن، ص 392 بھی دیکھیے۔

(2) فتوح السلاطین، مدراس ایڈیشن ص 392

دیتا ہے۔ محافظ فوج کے استقلال کے ساتھ قلعہ کی محافظت کی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رسد کی قلت نے اس کی کمر ٹوٹ جانے کا اندیشہ لاحق کر دیا۔ دوسری جانب محاصرہ کرنے والوں نے متعلقہ علاقوں کو جلا ڈالنے اور رسد پہنچانے کے تمام علاقوں کو بند کر دینے کی دوطرفہ پالیسی اختیار کی۔ رودر دیو، جس پر بہت (فوجی) دباؤ تھا، نے صلح کی گفتگو شروع کی اور خراج ادا کرنے کی پیش کش کی۔ بشرطیکہ شہزادہ محاصرہ اٹھالے۔ اور اس کے علاقہ سے واپس ہو جائے۔ اس نے سوچا کہ ملک کافور کی طرح الغ خاں بھی دہلی کے سلطان کی بالادستی کی قبولیت سے مطمئن ہو جائے گا لیکن الغ خاں کا ارادہ اس مملکت کے انضمام کا تھا اور اس نے صلح کی شرائط پر غور ہی نہ کیا۔

برنی اور عصامی کے بیانات سے دو اہم حقائق ظاہر ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ایک مہینہ تک فوج کے پاس دہلی سے پیغامات نہ پہنچے چونکہ رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اور دوسری یہ کہ شاہی افسروں کے درمیان کچھ بے چینی پیدا ہو گئی تھی چونکہ وہ ایک دور دراز مخالف علاقہ میں لڑتے لڑتے تھک گئے تھے۔ ابن بطوطہ کا یہ بیان کہ شہزادہ بغاوت کا منصوبہ بنا رہا تھا قابلِ توجہ نہیں۔ برنی یا عصامی، جن دونوں میں سے کسی کا بھی رویہ الغ خاں کی جانب ہمدردانہ نہ تھا، اس کی شہادت نہیں دیتے۔ اول الذکر شیخ زادہ دمشقی اور عبید پر اس فساد کا الزام عائد کرتا ہے اور موخر الذکر صرف عبید کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ عصامی[1] لکھتا ہے کہ عبید کو، جو ایک نجومی بھی تھا، الغ خاں نے قلعہ کی فتح کے متعلق پیشین گوئی کرنے کو کہا۔ ایک ہفتہ تک حساب لگانے کے بعد اس نے ایک تاریخ کی پیشین گوئی کی اور یہ پیش کش کی کہ اگر یہ پیشین گوئی صحیح ثابت نہ ہو تو اس کو قتل کر دیا جا سکتا تھا۔ وہ تاریخ غلط ثابت ہوئی اور عبید کو اپنی جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تھا اس لیے اس نے اپنے افسروں کے درمیان سلطان کی موت کی افواہ پھیلا دی۔ اور یہ مشہور کیا کہ شہزادہ اس بات کو چھپا رہا تھا چونکہ وہ ان سب کی جانیں لے لینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بیان مکمل طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ عبید نے افواہ ضرور پھیلا دی لیکن وہ امراء کو شہزادہ کی بدنیتی کا یقین کس طرح دلا سکتا تھا۔

---

(1) ایضاً ص 395

(2) ایضاً ص 395

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس افواہ کی وجہ سے شاہی خیموں میں بڑی بدحواسی پھیلی اور یہ کہ دہلی واپس ہونے کے لیے افسران بھی بے چین ہونے لگے۔ الغ خاں کی صورت حال کو جس بات نے اور بھی مشکل بنا دیا وہ یہ افواہ تھی کہ دہلی میں کسی شخص کو تخت نشین کیا جا چکا تھا۔ اس افواہ نے الغ خاں کو بالکل مفلوج کر دیا۔ دہلی کی فوج کے بعض بڑے افسروں نے رائے رودر دیو کے ساتھ مصالحت کر لی اور رائے نے گنگا کی اور سوم ناتھ کی قسم کھائی کہ واپسی کے دوران ان پر حملہ نہ کرے گا۔ انھوں نے اپنے خیمے اٹھا لیے، خندقوں میں آگ لگا دی اور اس جگہ کو چھوڑ کر جلد ہی روانہ ہو گئے۔

ایسے موقع پر جب کہ فتح حاصل ہونے والی ہی تھی۔ افسروں کی جماعت کی غدارانہ چال نے الغ خاں کو بہت صدمہ پہنچایا۔ لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ واپس ہوتی ہوئی فوج کے ساتھ روانہ ہو۔ راہ میں اس نے بدظن افسروں کو راہ پر لانے کی کوشش کی لیکن ان کی بہانہ بازیوں اور مبہم خواہشوں سے اس کو ناامیدی ہوئی۔ جب وہ کلگیر پہنچا تو مجید ابو رضا اس سے آ ملا جس نے آس پاس کے زمینداروں کو خطوط لکھے کہ وہ باغیوں کو گرفتار کر کے تباہ کر ڈالیں تمر اور تگین کے بہت سے سپاہیوں کو کلیان[1] میں تہہ تیغ کر دیا گیا۔

الغ خاں دیو گیری کو روانہ ہوا جہاں اس کا چھوٹا بھائی محمود خاں نے جو اس صوبہ کا مقطع تھا، اس کا استقبال کیا۔ محمود سازشیوں اور ان کے حمایتوں کو دہلی لے گیا جہاں ان کو مناسب سزائیں دی گئیں۔ بعضوں کے سر قلم کر دیے گئے اور بعض کو ہاتھیوں کے پیروں تلے روندھ دیا گیا۔ دارالسلطنت میں ایک دوسری فوج تیار کی گئی اور الغ خاں کے پاس اس ہدایت کے ساتھ بھیجی گئی کہ وارانگل کا محاصرہ دوبارہ کیا جائے اور تلنگانہ کی فتح کی تکمیل کی جائے۔ اس دوسری فوج کے بھیجے جانے سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ سلطان کو الغ خاں کی وفاداری کے متعلق کسی طرح کا شک نہ تھا۔ الغ خاں تازہ کمک کے ساتھ وارنگل کے خلاف روانہ ہوا۔ اس موقع پر الغ خاں زیادہ محتاط تھا اور اپنے رسل و رسائل کے لیے موثر اقدام کیے۔ اپنی راہ میں واقع بیدر کا قلعہ اور چند دیگر قلعوں پر اس نے قبضہ کر لیا اور ان کی حفاظت کے لیے حفاظتی دستے تعینات

---

(1) فتح السلاطین 99-389

کیے۔

رائے رودر دیو کو سخت تعجب ہوا جب اس نے شاہی فوجوں کو دوبارہ گھیر اڈالے ہوئے پایا۔ گرچہ وہ مقابلہ کے لیے پوری طرح تیار نہ تھا پھر بھی اس نے مقابلہ کی مدت کو طول دے کر دشمنوں کو تھکا دینا چاہا۔ اپنے پچھلے تجربہ کے باوجود الغ خاں کارروائیوں کو تیز نہ کر سکا اور محاصرہ پانچ ماہ تک جاری رہا۔ بالآخر جب اس کی فوج کو فاقہ اور بیماری کا سامنا کرنا پڑا تو رائے نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شہزادہ کے پاس پیغامبر بھیجے تاکہ اسے پناہ کی جگہ دی جائے اور قلعہ خالی کر دینے کی پیش کش کی۔ شاہی فوج نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ گھروں کو لوٹا اور بعض عوامی عمارتوں کو مسمار کر دیا۔ رائے کو اس کے تمام رشتہ داروں اور متوسلین کے ساتھ قدر خاں کی حفاظت میں دہلی بھیج دیا گیا لیکن قید کی بے عزتی برداشت کرنا اس کی قسمت میں نہ تھا۔ سلطان کے سامنے پیش کیے جانے سے قبل ہی وہ مر گیا۔ ممکن ہے کہ اس نے خودکشی کر لی ہو۔

گٹی، کنٹ اور معبر کی فتح شاید وارنگل کی مہم کے تسلسل ہی کے طور پر عمل میں آئی۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ گٹی اس وقت جگ لاپی گنگ دیو نامی ایک تیلگو سردار کے قبضہ میں تھا۔ اس نے اسے الغ خاں کے حوالے کر دیا۔ راجہ مندری (راجہ مہندری) پر ایک دوسرے شاہی افسر سالار علوی نے قبضہ کر لیا۔ ایک پانڈیہ مورخ بدورا پر ترکوں کے تسلط کو 1323ء میں قرار دیتا ہے۔ جس کی بنا پر اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ یہ فتح الغ خاں یا اس کے کسی افسر نے حاصل کی ہو گی۔

تلنگانہ اب دہلی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا اور الغ خاں نے اس کے نظم و ضبط کے لیے عارضی انتظامات کیے اس نے وارنگل کا نام بدل کر سلطان پور رکھا اور تلنگانہ کی مملکت کو کئی انتظامی اکائیوں میں تقسیم کر دیا۔ سہولت کے خیال سے، نیز پالیسی کے تقاضوں کے تحت، اس نے مقامی ہنر منداور باصلاحیت لوگوں کو نظرانداز نہیں کیا بلکہ ممکن حد تک ان سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے قدیم ہندو افسروں کو ان کی جگہوں پر بحال رکھا اور بعض سابقہ وزیروں کے ساتھ فراخدلانہ سلوک کیا اور نہ ہی اس نے عوام کو لوٹ مار اور مندروں کی توڑ پھوڑ کی حرکتوں سے بدظن کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس علاقہ پر دہلی حکومت کی گرفت غیر یقینی اور متزلزل رہی۔ الغ خاں کے کارناموں

پر دربار میں خوشیاں منائی گئیں۔

جاجنگر کی مہم

تلنگانہ مہم کا ایک شاخسانہ جاجنگر (اڑیسہ) کی مہم تھی، جو بھانودیو ثانی، جس نے رودر دیو کی مدد کی تھی اور گونڈوانہ کے سرداروں کے ساتھ معاہدے کیے تھے، کی سرزنش کے لیے روانہ کی گئی تھی۔ الغ خاں کے 1324ء کے وسط کے لگ بھگ وارنگل سے روانہ ہوا۔ مشرقی گھاٹ کے کنارے کنارے کوچ کرتے ہوئے اس نے چھوٹے چھوٹے نائیکوں کو زیر کیا اور راجہ مہندری پر قبضہ کر لیا۔ جب وہ جاجنگر کی سرحد پر پہنچا تو رائے جس کے پاس ایک بڑی فوج تھی، اس کی مخالفت کی۔ ایک خونی تصادم ہوا جس کے اختتام پر دہلی کی فوج نے دشمنوں کے خیموں کو لوٹا اور جنگی ہاتھیوں کے ایک مکمل دستہ کے علاوہ کافی مال غنیمت حاصل کیا۔ ہاتھیوں کو تلنگانہ لے جایا گیا اور وہاں سے دہلی روانہ کیا گیا۔ عصامی کے مطابق سلطان نے الغ خاں کو اس کی شاندار کامیابیوں کی بنا پر ایک خلعت عطا کی اور دو یا تین ہفتوں تک بڑے تزک و احتشام کے ساتھ فتح کا جشن منایا۔ راجہ مہندری کے ایک کتبہ، مورخہ رمضان 724ء/1324ء میں الغ خاں کی اڑیسہ میں فتوحات کا ذکر ہے اور اس کو خانِ جہاں[3] کہا گیا۔

منگولوں کا ایک حملہ

دکن میں فوجی کاروائیاں بمشکل ہی ختم ہوئی تھیں جبکہ معزی سرحد پر ایک اچانک ہنگامہ سلطان کے لیے پریشانی کا باعث بنا۔ سامانہ کے گورنر گرشسپ نے ایک پیغام دربار میں اس اطلاع کے لیے بھیجا کہ شیر مغل کی قیادت میں دو منگول فوجیں دریائے سندھ پار کر چکی تھیں اور آگے بڑھ رہی تھیں۔[3] نائب وزیر ملک شادی کی قیادت میں اور دیگر افسروں کے ساتھ ایک فوج روانہ کی گئی۔ ان لوگوں کو سامانہ جانے اور گرشسپ کو مدد پہنچانے کی ہدایت کی گئی۔ گرشسپ نے حملہ آوروں سے دو

---

(1) فتوح السلاطین ص ص 3-402

(2) حاجی الدبیر جلد 3 ص 860

(3) فتوح السلاطین ص 403

مقامات پر جنگ کی اور کافی تعداد میں قیدی حاصل کیے[1]۔ اس کے بعد فتح مند فوج دارا السلطنت واپس ہوئی اور افسروں کو مناسب انعامات دیئے گئے

گجرات کی مہم

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد گجرات میں ایک بغاوت ہوئی۔ عصامی نہ تو اس کے سرغنہ کا نام اور نہ اس کی جائے وقوع کا ذکر کرتا ہے۔ وہ صرف یہ لکھتا ہے کہ باغی ایک بلند قلعہ میں اکٹھا ہوئے۔ درحقیقت علاؤالدین کے انتقال کے بعد سے یہ صوبہ صرف برائے نام ہی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ سلطان نے بغاوت کو دبانے کے لیے ملک شادی کو گجرات بھیجا۔ شادی جلد ہی ہنگامہ کی جگہ پر پہنچ گیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک جھڑپیں چلتی رہیں مگر آخر میں محصور دستہ نے ایک چال چلی۔ ان میں سے بعض نے ملک شادی کو اپنے گانے اور ناچ سے محفوظ کرنے کے لیے اس کے خیمہ میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کر لی۔ لیکن عورتوں کا لباس پہنے ہوئے افراد دراصل بھیس بدلے ہوئے سپاہی تھے اور انھوں نے اپنے لباس کے اندر اسلحے چھپا رکھے تھے۔ انھوں نے مَلِک کو اچانک دبا لیا اور چھرا مار کر اس کو ہلاک کر دیا۔ اس اچانک حادثہ نے شاہی فوج کی ہمت پست کر دی اور وہ منتشر ہو کر گرتی پڑتی دہلی کی جانب فرار ہوئی۔ غیاث الدین کو مَلِک شادی کے افسوس ناک انجام پر بہت گہرا صدمہ پہنچا۔ عصامی ہمیں اپنا ماخذ نہیں بتاتا۔ لیکن اس طرح کے قصے عہد وسطی کے ہندو اور مسلمان مورخین دونوں ہی نے اکثر بیان کیے ہیں اور ان سے احتیاط برتنا ضروری ہے۔

بنگال کی مہم

گجرات کی مہم اور اس کے افسوس ناک انجام نے ملک کے دوسرے حصوں میں سلطان کے منصوبوں کو متاثر نہیں کیا۔ بنگال میں آپسی، مہلک جنگوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی اور اس نے مشرقی علاقہ میں ایک مہم روانہ کی۔ جو حالات بنگال میں اس کے ممد ثابت ہوئے وہ یہ تھے۔ بنگال میں سلطان بلبن کے دوسرا لڑکا بغرا

---

(1) فتوح السلاطین، ص 404

(4) ایضاً ص 409 الغ

خاں کا ایک خلف شمس الدین فیروز 1322ء میں مر گیا اور اس نے چار بیٹے شہاب الدین، بغرا خاں، نصیر الدین، غیاث الدین بہادر شاہ اور قتلو خاں چھوڑے۔ فیروز کے بیٹوں کے درمیان آپسی جنگ کا سلسلہ تھا اور غیاث الدین بہادر کی حب جاہ نے ہر جگہ ہنگامہ بپا رکھا تھا۔ اس شہاب الدین کو مار بھگایا جس نے لکھناؤتی میں اپنے باپ کی جگہ لی تھی قتلو خاں کو قتل کر دیا اور نصیر الدین سے چھیڑ خانی کی۔ ریاض السلاطین کے مطابق نصیر الدین اور شہاب الدین نے غیاث الدین کے پاس پناہ لی۔ اور اپنے بیباک بھائی (کی حکومت) کا تختہ الٹ ڈالنے کے لیے اس سے مدد مانگی۔ لیکن عصامی لکھتا ہے کہ جب غیاث الدین تغلق نے بنگال کو جاتے ہوئے گومتی کو پار کیا تب نصیر الدین سلطان سے جا ملا اور اس کی مطلع کیا کہ اس نے اپنے بھائی غیاث الدین بہادر' جسے بھورا بھی کہتے تھے' کو دہلی کے اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے کے لیے کیا تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ لکھناؤتی سے بعض امراء آئے اور سلطان کے سامنے بنگال کے حکمراں کی زیادتیوں کی شکایت کی۔ غیاث الدین تغلق پر ان کی اپیل کا مناسب اثر ہوا اور اس نے بذات خود بنگال کے خلاف روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔

مشرقی مہم پر روانہ ہونے سے قبل سلطان نے اپنی غیر حاضری میں سلطنت کی دیکھ بھال کے انتظامات کیے۔ غیر متوقع منگولی حملہ اور گجرات کا المیہ (اس سلسلہ میں) تنبیہ کے لیے کافی تھے۔ اس نے الغ خاں کو دکن سے بلا لیا اور ایک نیابتی کانسل مقرر کیا جو الغ خاں، شاہین (اخور بیک) اور احمد ایاز پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد وہ دہلی مشرق کی جانب روانہ ہوا۔ جب وہ ترہت کے نزدیک پہنچا تو نصیر الدین اور علاقہ کے کچھ رایوں اور زمینداروں نے اس کو خراج عقیدت پیش کیا۔ گرچی بنی، یحییٰ، نظام الدین بدایونی اور دوسروں نے نصیر الدین کو لکھناؤتی کا حکمراں لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لکھناؤتی (کی حکمرانی) کا صرف دعویدار تھا اور اس جگہ سے مفرور ایک پناہ گزیں تھا۔ وہ دہلی یقیناً نہیں گیا تھا لیکن یہ ممکن ہے کہ اس نے تغلق شاہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے اپنے کچھ حمایتیوں کو بھیجا ہو۔ جب تغلق شاہ ترہت کی سرحد پر پہنچا تو نصیر الدین نے اپنے بھائی کے منحرف رویہ کے متعلق اس کو آگاہ کیا۔

سلطان نے بہرام خاں کو مع چند دیگر افسران، جن میں ذوالجی اور نصیر الدین

شامل تھے نامزد کیا اور لکھناؤتی کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ لکھناؤتی کے نزدیک دونوں فوجوں کا سامنا ہوا اور جنگ کا آغاز بہادر نے ذوالچی پر جو قلب کی قیادت کر رہا تھا، ایک حملہ سے کیا۔ لیکن اسے بآسانی پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔ اور اس کی فوج منتشر ہو گئی۔ شاہی فوج نے پسپا ہوتے ہوئے بنگالی سپاہیوں کا کچھ دور تک تعاقب کیا۔ فرار کے دوران بہادر کو کسی ایک خوبصورت کنیز کے متعلق یاد دلایا گیا جو کہ خالی کیے گئے خیموں میں چھوٹ گئی تھی وہ فوراً واپس ہوا، اسے اپنے ساتھ لیا اور بھاگا۔ دو یا تین پہاڑیوں کو پار کرنے کے بعد وہ اچانک ایک دریا کے نزدیک پہنچا جہاں وہ ایک دلدل میں پھنس گیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا اور بہرام کے سامنے پیش کیا گیا۔

فتح مند فوج شاہی خیمہ کو واپس ہوئی جہاں جنگی قیدیوں کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے بہادر شاہ کو دیکھنے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس فتح کے لیے، جو اس کے آدمیوں کو حاصل ہوئی تھی۔ عصامی لکھتا ہے کہ اس وقت سلطان کے علاوہ خیمہ میں دو اور بادشاہ موجود تھے۔ ایک وہ جو صلح کی تلاش میں آیا تھا اور دوسرا وہ جس نے جنگ کی راہ اختیار کی تھی اور ہرا دیا گیا تھا۔ بہادر کو زنجیر پہنا کر قید میں ڈال دیا گیا اور نصیر الدین کی لکھناؤتی کے باجگذار حکمراں کی حیثیت سے توثیق کر دی گئی۔ ستگاؤں اور سونار گاؤں تاتار خاں کے ذمہ کر دیے گئے۔ دہلی کی مسجدوں میں فتح نامے پڑھے گئے اور شاہی فوجوں کی کامیابی شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی۔[2] ایک سکہ جس پر غیاث الدین تغلق اور ناصر الدین ابراہیم شاہ کے نام کندہ ہیں ان کے مشترکہ اقتدار اعلیٰ کی نشاندہی کرتا ہے۔

ترہت پر حملہ

بنگال سے واپسی کے موقع پر سلطان نے ترہت پر حملہ کیا۔ عصامی لکھتا ہے کہ رائے جنگلوں میں بھاگ گیا لیکن شاہی فوجوں نے اس کا تعاقب تیزی کے ساتھ کیا لیکن وہ راستہ کھو بیٹھیں اور اس کو بہت سے درختوں کو کاٹنا پڑا۔ بڑی مشکلوں کے بعد

---

(1) تاریخ فیروز شاہی ص452

فتوح السلاطین ص418

حملہ آور ایک قلعہ کے نزدیک پہنچے مگر یہ بہت مضبوط تھا اور اس پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ملحقہ زمین تاراج کر دی گئی اور بہت سے آدمی مارے گئے۔ غیاث الدین نے ترہت کو ہل تلبغہ کے بیٹے احمد خاں کے ذمہ لگایا اور دارالسلطنت کی جانب اپنے واپسی سفر پر روانہ ہوا۔

افغان پور کا حادثہ

بنگال اور ترہت میں اپنی کامیاب مہموں کے بعد سلطان تیزی کے ساتھ تغلق پور کی جانب روانہ ہوا جس کی بنا، عصامی کے مطابق، مشرقی مہموں کی ابتدا کے وقت ڈالی گئی تھی۔ (اس) نئے شہر سے تین یا چار کردہ کے فاصلے پر واقع افغان پور میں لکڑی کا ایک کوشک عارضی طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ سلطان کا خیر مقدم اسی عمارت میں کیا گیا۔ اور دارالخلافہ میں داخلہ کی ایک سعد ساعت کا انتظار وہ اسی میں کرنے والا تھا۔ (خیر مقدم کی) رسوم کے تمام ہونے کے بعد دستر خوان چنا گیا، سلطان نے بعض درباریوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ برنی لکھتا ہے کہ ’جب ملک اور امراء ہاتھ دھونے کو باہر آئے تو آسمان سے بدنصیبی کی ایک بجلی زمین کے لوگوں پر گری، اور کوشک کی چھت جس کے نیچے سلطان بیٹھا تھا یکایک گر پڑی اور وہ اور پانچ چھ دیگر اشخاص کچل کر مر گئے۔[1]

یہ المناک حادثہ ایک متنازع فیہ موضوع بنا رہا ہے۔[2] جبکہ برنی کا ترسا دینے

---

(1) تاریخ فیروز شاہی ص452 خط کشیدہ حصہ کا ایلیٹ کا یہ ترجمہ (جلد3، ص235) غلط فہمی میں ڈال دینے والا ہے۔ ”آسمان سے ایک بجلی زمین پر آگری“۔

(2) اس مسئلہ پر تفصیل بحث سر وولزے ہگ (JRAS‘ جولائی 1922ء ص31-330) ڈاکٹر ایشوری پرشاد (ہندستان میں قراؤنا ترکوں کی تاریخ ص46 الخ) ڈاکٹر، اے، مہدی حسین (محمد بن تغلق کا عروج و زوال، ص166 الخ) اور ڈاکٹر معین الحق (مسلم یونیورسٹی جرنل، 1939ء زیر عنوان ”کیا محمد بن تغلق پدر کش تھا؟“) نے کی ہے۔ سر وولزے ہیگ اور ایشوری پرشاد جونا خاں پر شک ظاہر کرتے ہیں جبکہ موخر الذکر دونوں حضرات اس کو تمام الزامات سے بالکل بری کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اس کے خلاف پدر کشی کا الزام ثابت کرنے کے لیے بہت سارے ماخذ کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ اپنے بیان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انھوں نے یحییٰ سرہندی، ابوالفضل، نظام الدین احمد، بدایونی اور دیگر اشخاص، جو عصامی اور ابن بطوطہ کے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں، کے تمام واضح بیانات واشارات کی مدد لی ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

والا اختصار اس معاملے کی تمام پہلوؤں پر غور کرنے میں مد ثابت نہیں ہوتا۔ عصامی اور ابن بطوطہ کچھ دلچسپ اطلاعات ہمیں بہم پہنچاتے ہیں جنھیں قبول کرنے سے قبل ان کی محتاط چھان بین کی ضرورت ہے۔ ابن بطوطہ، جو واقعہ کے تقریباً آٹھ سالوں بعد ہندستان آیا تھا، نے اپنے محسن محمد بن تغلق کے خلاف بدنیتی کا الزام عائد کرنے کے لیے حالات کا ایک ایسا سلسلہ پیش کیا ہے جو اس کے نظریہ کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس سلسلہ کی ابتدا بہرام ایبہ کے اس جملہ سے ہوتی ہے جو اس نے غازی ملک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر موا خرالذکر تاجپوشی کے لیے رضامند نہیں ہوتا تو اس کے بیٹے کو منتخب کر لیا جائے گا۔ اس طور پر اس احسان فراموش موری سیاح نے باپ اور بیٹے کے درمیان غلط فہمیوں کی (اپنی پیش کردہ) تصویر میں رنگ آمیزی کے لیے اپنے موئے قلم کو پہلی جنبش دی ہے۔ تلنگانہ کی پہلی مہم کے موقعہ پر اس پر باغیانہ ارادے کا الزام لگا کر (اس تصویر کے) مزید خط و خال کھینچے گئے ہیں۔ تصویر کی تکمیل ابن بطوطہ اس وقت کرتا ہے جب وہ شیخ نظام الدین اولیاء کے ذریعہ وجد کی کیفیت کے دوران الغ خاں کو فرمانروائی عطا کرنے اور شیخ کے تابوت کو شہزادے کے ذریعے کاندھا دینے کے واقعوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے مطابق موا خرالذکر حرکت سلطان کو ناگوار ہوئی تھی۔ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ الغ خاں کی حد سے زیادہ سخاوت اور بہت زیادہ غلاموں کی خریداری نے بھی سلطان کے دماغ کو اس کی طرف سے مشکوک بنا دیا تھا۔ اور بالآخر ایک نجومی کی اس پیشین گوئی نے کہ سلطان اس مہم سے زندہ واپس نہ ہوگا، کا ذکر بھی اس غرض سے کیا گیا ہے کہ ایک ایسی فضا تیار کی جائے جس میں اپنے باپ کے خلاف

(بقیہ صفحہ 669)

دوسری جانب آغا مہدی حسین نے فرشتہ، حاجی محمد قندھاری، رائے بندرا بن (لب التواریخ ہند' قلمی نسخہ انڈیا آفس ورق 38ب) اور محمد بلاق (مطلوب الطالبین) پر کلیتہً انحصار کرتے ہوئے بالکل متضاد نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ یعنی یہ کہ کوشک کی چھت کا گرنا محض ایک اتفاق تھا اور کسی سازش کا نتیجہ نہ تھا۔ لیکن جانبین کی طرف سے ماخذ اور اسناد کی یہ زبردست صف آرائی معمولی مہم و فراست کے نقطہ نظر کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ الغ خاں کے مخالفوں یا حامیوں نے عصامی اور ابن بطوطہ کے علاوہ جن مصنفین کے حوالے دیے ہیں سب کے سب بعد کے عہد کے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے ماقبل عہد کی تصانیف سے اپنے نظریے کی مناسبت سے استفادہ کیا ہے۔

شہزادے کی کوئی قبیح سازش ناقابلِ یقین نہ معلوم ہو۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ کوشک کی تعمیر خود سلطان کی ہدایات کے مطابق کی گئی تھی۔

عصامی جس نے اپنی تصنیف 1350ء میں اپنی تمام کی تھی، اس واقعہ کا مندرجہ ذیل بیان پیش کرتا ہے: جب سلطان جمنا کے کنارے پہنچا تو شہزادہ اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا اور جمنا کو پار کر کے شاہی فوج کے سامنے جا پہنچا۔ سلطان کو دیکھ کر وہ فوراً اپنے گھوڑے پر سے اترا۔ اپنے باپ کے قدموں کو چوما۔ اس کی درازی عمر کی دعا مانگی اور اپنی کوتاہیوں کے لیے معافی چاہی۔ ابن بطوطہ کے برعکس عصامی نے کوشک کی تعمیر میں پہل کرنے کا ذمہ دار الغ خاں کو بتایا ہے۔ جس نے یہ کام احمد ایاز کے سپرد کیا۔ وہ مزید یہ لکھتا ہے کہ اپنی غیر حاضری کے دوران اس کی نامناسب حرکات کی جو مخالفانہ رپورٹیں سلطان کو پیش کی گئی تھیں ان کی وجہ سے وہ صاف دلی کے ساتھ شہزادے سے بغل گیر نہیں ہوا۔ سلطان کوشک میں داخل ہوا جو بہت عمدہ طور پر سجایا گیا تھا۔ اپنی جگہ پر بیٹھ جانے کے بعد سلطان نے قوی ہیکل ہاتھیوں کو اپنے سامنے صحن میں دوڑائے جانے کا حکم دیا۔ اس کی وجہ سے زمین میں ارتعاش پیدا ہوا اور اس نے نو تعمیر شدہ کوشک کو گرا ڈالا۔ سلطان اس کے نیچے دب کر مر گیا۔ راوی شہزادہ کی لعنت ملامت کرتا ہے جس نے احمد ایاز کو لالچ دلا کر اپنے باپ کو مار ڈالنے کی سازش میں شریک کر لیا تھا۔ بعد میں الغ خاں کے وزیر مقرر کیے جانے کے واقعے کو اس الزام کی تائید میں پیش کیا گیا۔

اپنے باپ کے قتل میں سلطان محمد کے ساز باز کا معاملہ صرف معاصرہ اور بعد کے مورخین کے مثبت یا مبہم بیانات ہی کی بنا پر نہ تو ثابت کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی تردید کی جا سکتی ہے ہمیں ان حالات کا نقشہ ذہن نشین کرنا چاہیے جن میں یہ حادثہ واقع ہوا۔ تغلق انقلاب سے شروع ہو کر محمد بن تغلق کے تخت نشینی تک کے مختلف واقعات کی اگر ہم شیرازہ بندی کریں تو ہم اس مسئلہ کا ایک صحیح اندازہ کر سکتے ہیں اور ایک اطمینان بخش نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ ناصر الدین خاں خسرو کے اخور بک کی حیثیت سے سلطان محمد خود کو نئے حالات کے مطابق نہ بنا سکا۔ وہ دربار سے بھاگ گیا اور اپنے باپ سے دیپال پور میں جا ملا۔ اس کے بعد جو جدوجہد ہوئی اس میں وہ پیچھے نہ رہا۔ اور

اس سلسلہ میں اس کی خدمات ہی کی بنا پر اسے الغ خاں کا خطاب ملا۔ تلنگانہ کی دو مہموں کے لیے فوج کی اعلیٰ کمان اسی کو سونپی گئی۔ اگر اسکے باپ کو اس کی وفاداری پر شک ہوتا تو اسے وہ دکن سے واپس بلا لیتا۔ اس بات کی طرف عصامی کا اشارہ الغ خاں کی جانب اس کی نفرت کی محض ایک علامت ہے۔ اور سب سے آخر میں یہ بات کہ بنگال جاتے ہوئے سلطان نے الغ خاں کو مجلس نیابت میں شامل کیا تھا۔ یہ بات اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک کہ اسے اپنے باپ کا کلی اعتماد حاصل نہ ہوتا۔ مزید یہ کہ اسے ولیعہد مقرر کیا ہی جا چکا تھا۔ لہٰذا وراثت کے متعلق کسی شبہ سے اس کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہو سکتی تھی۔

پدر کشی کا الزام اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ باپ اور بیٹے کے درمیان تعلقات کشیدہ تھے اور اس سلسلہ میں ایک عجیب دلیل پیش کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خسرو خاں کے ذریعے شیخ (نظام الدین اولیاء) کو دی ہوئی دولت کی بازیافت کے سلسلہ میں سلطان کی محتسبانہ کارروائیوں کی وجہ سے شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ شیخ نے وہ دولت غرباء میں تقسیم کر دی تھی اور اب اسے واپس نہیں کر سکتے تھے۔ مزید یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ چونکہ شیخ اور الغ خاں کے تعلقات دوستانہ تھے اس لیے سلطان اور اس کے بیٹے کے تعلقات یقیناً خوشگوار نہ رہے ہوں گے لیکن اس وقت اس واقعے کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے جب اس کشیدگی کی ابتدا ہوئی۔ یہ تخت نشینی کے ساتھ ہی ساتھ واقع نہیں ہوئی ہوگی چونکہ یہ مفروضہ واقعات کے اس سلسلہ کے منافی ہے جو اوپر بیان کیے جا چکے ہیں نا ہی اس بات کا یقین کیا جا سکتا ہے کہ الغ خاں اور شیخ کے درمیان ارتباط سلطان کی بنگال میں موجودگی کے دوران ہوا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ کسی بھی مورخ نے سیاسی امور کے سلسلے میں شیخ کے نام کا ذکر نہیں کیا ہے۔ چشتی سلسلہ کی روایات کی تقلید کرتے ہوئے وہ بادشاہوں کے دربار میں جانے سے بھی پرہیز کرتے تھے چہ جائیکہ سیاسی امور میں مداخلت، جو کہ ان کی فطرت کے بالکل خلاف تھی۔ مختصر یہ کہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سلطان کے دل میں شیخ کے لیے دوستانہ جذبات نہ تھے تو بھی اس بات سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ اس وجہ سے اس کے تعلقات اپنے بیٹے کے ساتھ اچھے نہ تھے بال کی کھال نکالنے

کے مترادف ہوگا۔ حقائق بھی اس بات کی حمایت نہیں کرتے۔

ابن بطوطہ کا بیان سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے اور یہی بات عصامی کے بیانات کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جو خود اعتراف کرتا ہے کہ اس نے یہ قصہ بوڑھے آدمیوں سے سنا تھا اگرچہ وہ یہ بات قبول کرنے میں تامل نہیں کرتا کہ بنا بنایا ہوا کوشک ہاتھیوں کی دوڑ کی وجہ سے پیدا شدہ ارتعاش کی وجہ سے گر گیا تھا۔ وہ اپنے بیان کو (یہیں پر) ختم کر کے اپنی دلیل کو قایم رکھ سکتا تھا۔ لیکن الغ خاں کی ملامت کرنے کے اپنے جنوں کی رو میں اس نے سازش کے متعلق ایک قصہ بھی جوڑ دیا، اس بات سے بے خبر ہو کر کہ وہ خود اپنی تردید کر رہا تھا۔ وہ اس بات کا اشارہ بھی نہیں کرتا کہ ہاتھیوں کی دوڑ کا حکم الغ خاں کے اشارے پر دیا گیا تھا۔ یہ کام بقول عصامی، سلطان کے حکم سے کیا گیا تھا۔ جس کی قسمت میں ایک حادثہ کا شکار ہو کر، نہ کہ ایک سازش کی بنا پر، مرنا لکھا تھا۔ الغ خاں کی شرکت کے متعلق اپنے بیان کی ابتدا میں عصامی لکھتا ہے کہ ایک ہوشیار آدمی اس واقعہ کی اس طرح کی تشریح کر سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کے بارے میں اس کو یقین نہ تھا۔ ابن بطوطہ، جس نے عصامی کے بھی بعد اپنا بیان قلم بند کیا ہے، صرف ایک ہاتھی کا ذکر کرتا ہے جو الغ خاں نے سلطان کو پیش کیا تھا۔ جیسے ہی یہ کوشک میں داخل ہوا وہ عمارت گر گئی اور سلطان اور اس کا چھوٹا بیٹا محمود مارے گئے۔ جس طور پر اس نے واقعہ بیان کیا ہے وہ ناقابلِ یقین ہے گرچہ اس نے اس کو ایک بزرگ شخصیت شیخ رکن الدین کی سند کی بنا پر پیش کیا ہے۔ ضمناً یہ بات بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ یہ حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ شیخ رکن الدین جن کے تعلقات محمد بن تغلق کے ساتھ بہت اچھے تھے، بادشاہِ وقت کے متعلق اس طرح کی بات کے بارے میں ایک غیر ملکی کو شامل راز بنا سکتے تھے۔ شاید ابن بطوطہ کے حافظہ نے اسے دھوکہ دیا تھا یا پھر اس نے اپنے اس ناقابلِ یقین بیان کو مستند بنانے کے لیے بدنیتی کے ساتھ اور عمداً ایک بزرگ کے نام کو استعمال کیا۔

ابن بطوطہ اور عصامی کی شہادت کو اس طرح نمٹا کر، اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ اور جدید دور کے مصنفین کی جانب سے عائد کردہ پدر کشی کے الزام کی تردید کے لیے کچھ قرائنی شہادت کو بھی پیش کر دیا جائے۔ اول یہ کہ شاہی

اقتدار اختیار کرنے کے بعد محمد بن تغلق اور اس کی ماں کے درمیان خوشگوار تعلقات قایم رہے۔ دوسرے یہ کہ تخت پر اس کے دعویٰ کی مخالفت نہ تو اس کے زندہ بھائیوں میں سے کسی نے کی اور نہ امراء کے کسی گروہ نے اور ان کی وفاداریوں کو انعامات اور ترقیوں کا وعدہ کر کے خریدے جانے کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ آخری بات یہ کہ الغ کی فطرت اس کے خلاف اس طرح کے الزام کی نفی کرتی ہے۔ اپنے خاندان کے افراد کی جانب اس کا رویہ عموماً نرم دلانہ اور مشفقانہ تھا۔

بعض محققین کے اس خیال کو کہ کوشک بجلی گر جانے کی وجہ سے مسمار ہوا تھا، سلطان کی موت کے وقت پیش نظر جانچنا چاہیے۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد اس حادثہ کا وقوع ربیع الاول 725ھ (یا فروری۔ مارچ 1325ء) میں قرار دیتے ہیں جو ان کے مطابق ایسا وقت نہ تھا جبکہ بجلی گرنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر مہدی حسین نے بساطین الانس کے مصنف علی احمد حسین، جو سلطان غیاث الدین کا ایک درباری تھا اور لکھناؤتی کی مہم میں اس کے ساتھ شامل تھا، کی سند پر اس (حادثہ) کا وقوع مئی 1325ء قرار دیتے ہیں جب کہ گرم ہوائیں چل رہی تھیں اور درجہ حرارت بہت بڑھا ہوا تھا لیکن علی احمد بجلی گرنے کا تذکرہ نہیں کرتا ہے۔

اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کی برنی کے اس غامض فقرے اور حسن تعبیر کے اس انداز بیان کی کیوں اس قدر تنقیح کی گئی ہے اور کیوں اس پر اخفائے حق کا الزام لگایا گیا ہے۔ شاید اس کا یہ مطلب تھا ہی نہیں کہ اس عمارت پر بجلی گری تھی وہ صرف یہ تاثر پیش کرنا چاہتا تھا کہ ایک آفت آپڑی تھی جو اپنی شدت اور اچانک وقوع پذیریوں کے اعتبار سے بجلی گرنے کے مترادف تھی۔ ان حالات کے پیش نظر ابن بطوطہ اور عصامی کے یہ بیانات قابل قبول ہیں کہ عمارت اس وجہ سے گر پڑی کہ جلدی جلدی بنائی گئی تھی اور اس کی بنیاد مضبوط نہ تھی۔ در حقیقت یہ عمارت ایک فوری ضرورت کے لیے عارضی طور پر بنائی گئی تھی لیکن ان مورخین نے الغ خاں پر جس (باغیانہ) ارادے کا الزام لگایا ہے اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ غیر فطری ہے اور قرائنی شہادت کے منافی ہے۔

سلطان اور شیخ نظام الدین اولیاء

کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے عظیم ترین صوفی بزرگ شیخ نظام الدین اولیا کے ساتھ سلطان غیاث الدین کے تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ اس کشیدگی کی وجہ یہ تھی کہ خسرو خاں نے اپنی تخت نشینی کے موقع پر شیخ کو پانچ لاکھ ٹنکوں کا نذرانہ پیش کیا تھا جنھوں نے اسے قبول تو کر لیا تھا لیکن اپنی خانقاہ کے قاعدے کے مطابق اس ساری رقم کو ضرورت مندوں اور غریبوں کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ جب غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا تو اس نے ان تمام لوگوں سے روپے واپس مانگے جو خسرو خاں کی عنایتوں سے فیضیاب ہوئے تھے۔ اس شاہی مطالبے کا جواب شیخ نے یہ دیا کہ چونکہ وہ رقم بیت المال کی تھی اس لیے انھوں نے اس کو عوام میں تقسیم کرا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جواب سے سلطان کو رنج ہوا تھا اور شیخ کی طرف سے اس کا رویہ مخالفانہ ہو گیا۔ غیاث الدین تغلق، جلال الدین خلجی کے عہد سے ایک ممتاز افسر رہ چکا تھا لہٰذا اسے شیخ اور ان کے خدا ترسانہ اور مخلصانہ طرز زندگی کی بخوبی واقفیت رہی ہوگی۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مطابق ان کی خانقاہ میں تحفوں اور نذروں کا سلسلہ جمنا کے پانی کی طرح ہر وقت رواں رہتا تھا۔[1] لیکن نصیر الدین چراغِ دہلی مزید یہ لکھتے ہیں کہ شیخ کوئی بھی چیز کل کے لیے بچا کر نہ رکھتے ایک ہاتھ سے تحفے قبول کرتے اور دوسرے سے انھیں تقسیم کر دیتے۔ علاوہ ازیں شیخ نے ہمیشہ دنیاوی امور سے شان استغنائی برتی تھی۔ وہ کبھی بھی حکمرانوں کے دربار میں حاضر نہ ہوتے اور نہ سیاست میں حصہ لیتے۔ ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ہیں کہ 'جبکہ شہنشاہ آتے اور جاتے رہتے اور شاہی خاندانوں کا عروج و زوال ہوتا رہتا، حوصلہ مند شہزادے مقابلہ اور جنگ کرتے رہتے اور سازشیں اور منصوبے تیار کرتے رہتے اور درباری لوگ خوشامدیں اور غداریاں کرتے رہتے، وہ بزرگ اس فرض کی ادائیگی میں لگے رہتے جو انھوں نے خود پر عائد کر رکھی تھی اور غیاث پور میں واقع الگ تھلگ اپنی خانقاہ میں روحانی نجات کا اپنا کام خاموشی کے ساتھ

---

(1) خیر المجالس، ص 257

(2) لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو، ص 135

(3) فتوح السلاطین، ص 20-117

کرتے رہتے تھے[2]، غیاث الدین تغلق ان باتوں سے ناواقف نہ رہ سکتا تھا اور ان تمام باتوں کو جانتے ہوئے وہ شیخ کے اس تبصرے پر ناراض نہیں ہو سکتا تھا۔

اس مبینہ کشیدگی کی ایک دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شیخ سماع کے دلدادہ تھے۔ سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد کرمانی اس واقعہ کی تفصیل پیش کرتے ہیں اس واقعہ کو مناسب تناظر سے دیکھنا چاہیے۔ دہلی کی سلطنت کی بنیاد اوائلی سالوں سے ہی علماء محفل سماع کے انعقاد پر اعتراض کرتے آئے تھے اور انھوں نے التمش کو اس مسئلہ پر قاضی حمید الدین ناگوری[3] کے خلاف ایک محفل منعقد کرنے پر زبردست اثر کی وجہ سے ان سے حسد کرتے تھے، نے شیخ کے ذریعے سماع کی محفلوں کے برابر انعقاد کے خلاف ہنگامہ کھڑا کیا اور اس معاملہ کو سلطان کے سامنے اس مذہبی رنگ میں پیش کیا کہ اسے محققین کی ایک مجلس طلب کرنی پڑی تاکہ اس مسئلہ کے قانونی اور مذہبی پہلوؤں پر غور کیا جاسکے۔ شیخ نظام الدین کو بھی اس مجلس میں شرکت کی دعوت دی گئی تاکہ وہ اپنی رائے سے علماء کو آگاہ کر سکیں اور ان کو مطمئن کر سکیں۔ چونکہ اس مجلس میں بعض ایسے علماء تھے جن کو شیخ سے ذاتی عناد تھا اور ان کو بدنام کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے مجلس کے دوران کچھ ناشائستہ حرکتیں کیں۔ سلطان کا رویہ ایک غیر جانبدار ناظر کا سا تھا۔ شیخ کو علماء کے تکبر اور تنگ نظری (کے رویے) سے تکلیف پہنچی۔ جب شیخ نے اپنے طرز عمل کی ایک حدیث دہرائی تو علماء نے ہنگامہ کیا کہ انھیں حدیث نہیں چاہیے بلکہ وہ اس معاملہ میں امام ابو حنیفہ کا فیصلہ جاننا چاہتے تھے۔ پیغمبر کی سنت کی جانب اس بے ادبانہ رویہ سے شیخ آزاردہ ہو گئے۔ اور امیر خورد کرمانی کے مطابق گستاخ علماء کے تکلیف دہ انجام کی پیشین گوئی کی۔ واقعہ کے پورے بیان سے کہیں بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ خود غیاث الدین تغلق نے شیخ کی جانب ذرا بھی بے ادبانہ رویہ اختیار کیا۔ لیکن سلطان کی موجودگی کے دوران علماء کے اس ہنگامہ سے یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ ان کو اس کی خاموش حمایت حاصل تھی لیکن اس خیال کی صحت کے متعلق کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ سلطان نے درحقیقت کئی مرتبہ کوشش کی کہ ان لوگوں کو ٹھنڈے دل سے معاملہ پر غور کرنے پر آمادہ کرے۔ اسکے علاوہ شیخ کے نظریے کی صداقت کا اسے اس حد تک یقین تھا کہ اس نے قاضی کی یہ تجویز رد کر دی کہ سماع کو غیر قانونی قرار د

جائے۔

یہ قصہ کہ سلطان نے شیخ کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ بنگال کی مہم سے دار السلطنت میں اس کی واپسی کے قبل ہی وہ دہلی کو چھوڑ دیں اور یہ کہ جواب میں شیخ نے کہا تھا کہ "ہنوز دہلی دور است" بعد کی من گھڑت باتیں ہیں اور اس کی شہادت معاصر ذرائع سے نہیں ہوتی اس وقت شیخ بہت بیمار تھے اور اپنی موت سے چالیس دن قبل سے ہی کھانا چھوڑ دیا تھا اس وقت ان کا دھیان اپنے رب سے لگا تھا نہ کہ سلطان کی واپسی یا شہزادے کے مستقبل سے۔ بعد کے دور کے سریع الاعتقاد مصنفین نے غیاث الدین کے ساتھ شیخ کے تعلقات کے پورے قصہ کو ایک ایسا رنگ دے دیا ہے جس کی تاریخی طور پر کوئی سند نہیں۔

جائزہ

سلطان غیاث الدین تغلق غیر معمولی صلاحیت کا ایک حکمراں تھا۔ وہ دور رس، ثابت قدم اور باسلیقہ (حکمراں) تھا۔ کئی دوسرے بادشاہوں کی طرح اس نے ایک معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بلندی کا مقام حاصل کیا۔ اس نے اعلیٰ نسبی کا کوئی دعویٰ نہ کیا۔ بلبن کے برعکس اس نے اپنے لیے کوئی من گھڑت شاہی نسب نامہ اختراع نہ کرایا۔ اپنی حیثیت کے (استحکام کے) لیے اس نے اپنی صلاحیتوں پر ہی بھروسہ کیا۔ اس کا عروج اچانک نہ ہوا۔ وہ تدریجاً ایک عہدے سے دوسرے پر ترقی پاتا رہا اور تجربہ حاصل کرتا رہا اور ہر معاملات کی جانکاری حاصل کرتا رہا۔ وہ ٹھنڈے مزاج کا تھا اور سوچ سمجھ کر کام کرتا تھا۔ مصیبت کے وقت وہ چٹان کی طرح ثابت قدم رہتا۔ گرچہ اس کی تربیت علاؤالدین کے طریق کار کے زیر سایہ ہوئی تھی لیکن وہ بے رحمی سے پرہیز کرتا تھا۔ وہ نیک دل اور سخی تھا اور پرہیزگار اور خداترس۔ برنی کے مطابق

---

(1) سیر الاولیاء ص 531۔

(2) ابن بطوطہ کا یہ بیان کہ شیخ کا انتقال سلطان کے حادثہ سے قبل ہوا مہمل ہے۔ شیخ کا انتقال 18 ربیع الثانی کو اور سلطان کا اسی سال کے ربیع الاول کے مہینے میں ہوا۔

شیخ کی طویل اور تکلیف دہ علالت شاید گندو مثانہ (Prostate gland) کے بڑھ جانے کی وجہ سے پیشاب کی رکاوٹ تھی جو ضعیفی کی ایک ایسی بیماری ہے جس کے لیے اس زمانہ کے معالجوں کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔

اس کی ذاتی زندگی صاف ستھری اور پاکیزہ تھی اور وہ ان تمام برائیوں سے مبرا تھا جو عہد وسطیٰ کے اکثر حکمرانوں کے کردار کو داغدار بنا دیتی ہیں۔

اپنی انتظامی پالیسی کی تشکیل میں اس نے میانہ روی اختیار کی جس میں سختی کے ساتھ انصاف پسندی کا امتزاج تھا۔ اس نے اپنے افسروں کی ہدایت کے لیے اور ان کے فیصلوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے ایک مجموعہ قوانین وضع کیا۔ بلبن کی طرح وہ اپنے ارد گرد صاحب صلاحیت لوگوں کو جمع رکھنا چاہتا تھا لیکن بلبن کے برعکس اسے اعلیٰ نسبی کا کوئی خبط نہ تھا۔ اس کی نظر میں صرف اہلیت قابل لحاظ تھی نہ کہ دولت یا سلسلہ نسب۔ اس نے رشوت خوری اور غبن کو سختی کے ساتھ دبایا۔ اپنے افسروں کو چھوٹی چھوٹی لالچوں سے بچانے کے لیے اس نے ان کو کافی تنخواہیں دیں۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ انصاف برتتا تھا۔ محکمہ لگان میں اس کی اصلاحات سے ہندو درمیانی حقداروں کو بہت کافی فائدہ ہوا ہوگا چونکہ اس نے ان کی مراعات اور دساتیر کو بحال کر دیا۔ اس کی فوج میں ہندو افسروں اور سپاہیوں کا خاصا تناسب تھا۔ اگرچہ اپنے ہم مذہبوں کو مطمئن رکھنے کی ضرورت اسے درپیش تھی پھر بھی وہ ایک مقررہ حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ علماء کو خسرو خاں سے ناجائز طور پر حاصل شدہ دولت کو اگلوانے کے لیے اس نے مجبور کیا۔ اور اس معاملہ میں اس نے ان کے ساتھ عوام یا سپاہیوں کی طرح کا سلوک کیا۔ اس نے محکمہ پولیس اور عدل کی از سر نو تشکیل کی جس سے لوگوں کے دل میں مناسب حد تک خوف واحترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ شاہراہیں چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ ہو گئیں اور سلطنت میں امن و تحفظ قایم ہو گیا۔ اس کا عسکری نظام عمدہ اور کار گزار تھا۔ ایک تجربہ کار سپاہی اور ایک کامیاب کمانڈر، جیسا کہ وہ تھا، اسے اس کے سپاہی باپ کی طرح مانتے تھے۔

مختصر یہ کہ تغلق خاندان کا بانی وسیع ہمدردی، مصمم ارادے صحیح قوت فیصلہ کا حامل ایک فرماں رواں تھا۔ وہ دہلی سلطنت کی صحتمندانہ روایات کی بحالی کا خواہاں تھا۔ اس نے علاؤالدین کے مقاصد اور طریق کار کو ایک نئے معنی دیے اور ظلم کی تیز دھار کو ان سے الگ کر کے اس نے ان کو زیادہ قابل قبول اور کار گزار بنا دیا۔ وہ کسی نئے طرز کا موجد تو نہ ہو سکا لیکن اس نے ایک استحکام دینے والے (حکمراں) کا رول ضرور ادا کیا۔

اس کے کارنامے دہلی سلطنت کی انتظامیہ کی پالیسی میں رواداارنہ رجحانات کی ترقی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

2

سلطان محمد بن تغلق (51-1324ء)

عہدِ وسطیٰ کے ہندستان کے کسی سلطان نے اپنے متعلق اس قدر تجسس کو شاید برانگیختہ نہیں کیا ہے جتنا کہ محمد بن تغلق نے۔ اور نا ہی کسی سلطان کی پالیسیاں اس حد تک متنازع فیہ بنی رہی ہیں۔ 26 سالوں کی اس کی حکومت صحیح طور پر سوچی ہوئی مگر برے طور پر عمل در آمد کی ہوئی اور بالآخر ترک کر دی ہوئی اسکیموں اور منصوبوں کی ایک دلکش مگر افسوسناک داستان ہے۔ اس کا اختراع پسند اور خوش تدبیر دماغ نئے منصوبے بنانے میں جتنا تیز تھا اتنا ہی عوام کی نفسیات کو سمجھنے مین ست۔ اپنی اسکیموں پر کامیاب طور پر عمل کرانے کے لیے عوام کے ساتھ جس طرح کا تعلق اور باہمی مفاہمت پیدا کرنے کی ضرورت تھی وہ کبھی اسے حاصل نہ کر سکا۔ اسے لوگوں کی نیتوں کے متعلق شک تھا اور لوگ اس کے اغراض و مقاصد پر شک کرتے تھے اس کے اور اس کی رعایا کے درمیان منھ کھولے ہوئے ایک بڑی کھائی حائل تھی اور امتداد زمانہ کے ساتھ یہ کھائی اور وسیع ہوتی گئی۔ ہر ایک منصوبے نے اگلے منصوبے پر اپنا نامبارک اثر چھوڑا یہاں تک کے ساری فضا تلخی اور مخاصمت سے بوجھل ہو گئی۔

ان تمام باتوں کے باوجود دہلی سلطنت کی تاریخ میں محمد بن تغلق کی حکومت فاصل آب (Watershed) کی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ اسی کے زمانہ میں یہ اپنے نقطہ عروج پر پہنچی لیکن اس کے بعد ایک ردّ عمل بھی رونما ہوا اور یکے بعد دیگرے بغاوتوں نے اس کے اقتدار کی نیو کھوکھلی کر دی۔ سلطان نے اپنے دورِ حکومت میں انتھک طور پر یہ کوشش کی کہ ہندستان کے سیاسی و انتظامی اتحاد کے اپنے تصور کو اور فروغ دے لیکن جب موت نے اس کی آنکھیں بند کر دیں اس وقت کئی ایک آزاد سلطنتیں قایم ہو چکی تھیں اور (دہلی) سلطنت اپنی پرانی سرحدوں کے اندر پسپا ہو چکی

تھی۔ اس کی زندگی کے اس المناک انجام کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خیالات و منصوبات کے تمام جائزوں میں ہر قسم کے تعصبات شعوری یا غیر شعوری طور پر داخل ہو گئے۔ یا تو اسے ایک "بد قسمت عینیت پسند" کے طور پر پیش کیا گیا یا ایک خونی قرار دے کر مطعون کیا گیا۔ جن لوگوں نے اس کی محققانہ افتادِ طبع میں اس کی ناکامیابی کا بہانہ یا اس کی تشریح پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اپنی تمام علمی دلچسپیوں کے باوجود محمد بن تغلق بنیادی طور پر ایک سپاہی اور مردِ عمل تھا جس نے بلبن اور علاؤالدین خلجی سے بھی زیادہ وقت میدان جنگ میں صرف کیا اور یہ کہ اس لیے اس کی پالیسیوں کو بھی اسی اعتبار سے پرکھنا چاہیے۔ یہاں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد بن تغلق کے خیالات اور طرزِ عمل کو اس کے تاریخی ماحول میں مع اس کے روشن و تاریک رُخ کے ساتھ، پیش کیا جائے۔

تخت نشینی

چونکہ غیاث الدین تغلق نے الغ خاں کو قبل سے ہی ولیعہد[1] نامزد کر دیا تھا اس لیے اس کی تخت نشینی آسانی کے ساتھ اور کسی مخالفت کے بغیر انجام پائی۔ اپنے باپ کی موت پر 40 دنوں کی سرکاری مدت غمی کے بعد اس نے دہلی میں اپنی رسم تاجپوشی منانے کا فیصلہ کیا۔ اب تک وہ تغلق آباد میں رہتا تھا۔ لیکن اب وہ پرانے شہر میں داخل ہوا اور نیک شگون کے طور پر دولت خانہ (کی اس عمارت) میں تخت نشین ہوا جس میں دہلی[2] کے کئی سابقہ سلاطین کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ اس تقریب کے موقعہ پر دہلی کا شہر بہت خوبصورت طور پر سجایا گیا تھا۔ برجیاں اور قبے تیار کیے گیے تھے اور دارالسلطنت کی سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں زری کا کام کیے ہوئے اور فنکارانہ طور پر سجائے ہوئے کپڑے آویزاں کیے گئے تھے۔ جب شاہی جلوس شہر میں داخل ہوا تو داہنے اور بائیں سونے کے سکے لٹایے گئے۔ بالا خانوں پر اور تماشہ بینوں کے دامنوں میں بھی سکے

---

(1) تاریخ معصومی کا مصنف (64) لکھتا ہے کہ اس کے باپ نے اسے "سلطان محمد شاہ" کا لقب عطا کیا تھا لیکن اس بات کی تصدیق کسی ابتدائی ماخذ سے نہیں ہوتی۔

(2) فیروز شاہی ص 456

پھینکے گئے۔ جب سلطان بدایوں دروازے سے ہوتا ہوا دولت خانہ کی جانب بڑھا تو سونے اور چاندی کی بکثرت بارش ہوئی۔ برنی لکھتا ہے کہ "تمام لوگ، مرد، عورت، جوان، بوڑھے، بچے اور سن رسیدہ، آزاد و غلام، مسلمان اور ہندو سبھی لوگوں نے صدائے تحسین بلند کی اور سلطان محمد کو دعادی اور اپنے رومالوں (دستارچوں) بیگوں اور جیبوں کو سونے اور چاندی کے سکوں سے بھرا"[1] حکومت کی ابتدا ہی میں فضیلت نمائی کے لیے اس طرح کی سخاوت کا مظاہرہ علاؤالدین خلجی کے علاوہ کسی اور سلطانِ دہلی[2] کے زمانہ میں نہ دیکھا گیا تھا۔

برنی اور عصامی دونوں نے حکومت کی اس پر مسرت ابتدا کو ایک متضاد پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ بعد کے عہد کی خوف و نفرت کی فضا کا موثر خاکہ کھینچا جا سکے۔ تخت نشینی کے جلد ہی بعد اس نے محمد کا نام اختیار کیا (اس کے قبل سے جونا کے ہندی[3] نام سے جانا جاتا تھا) اور ابوالمجاہد کی کنیت اختیار کی۔ عصامی کے مطابق اس نے لوگوں کی یقین دہانی کی کہ وہ اپنے مرحوم باپ کے نقش قدم پر چلے گا اور یہ اعلان کیا کہ "میری مملکت کا ہر ضعیف آدمی میرے لیے باپ کی مانند ہے اور ہر کمسن شخص میری نظر میں (میرے بھائی) بہرام ایبہ کی طرح ہے۔[4]

(نئے بادشاہ کی) تخت نشینی کے وقت اعلیٰ افسران کی تقرری اور نئے عہد کے حکمراں طبقہ کے قلبی گروہ کی تشکیل کرنے والے لوگوں کی عزت افزائی اور ان کو

---

(1) ایضاً ص 457

(2) ابن بطوطہ (رحلہ، انگریزی ترجمہ، مطبوعہ گائیکوارڈ اورینٹل سیریز، 118) کا سلطان کی والدہ مخدومہ جہاں کے متعلق یہ بیان اگرچہ یہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے، اس کا کچھ اندازہ مہیا کرتا ہے کہ یہ تقریب کس شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی ہوگی۔ "لیکن اس کی آنکھ کی روشنی ختم ہو چکی تھی۔ یہ واقعہ یوں پیش آیا جب اس کا بیٹا تخت نشین ہوا تو تمام مَلِکوں اور امرا کی عورتیں اور لڑکیاں عمدہ ترین لباس پہن کر تسلیم عرض کرنے کو حاضر ہوئیں۔ جواہرات سے مرصع ایک سونے کے تخت پر وہ بیٹھی تھی سبھوں نے اس کے آگے کورنش ادا کی اور اس کے بعد یکایک اس کی آنکھوں کی روشنی ختم ہو گئی"۔

(3) فتوح السلاطین مدارس ایڈیشن، ص 421

(4) ایضاً، ص 421، رحلہ، ص 56

خطابات دیا جانا دہلی سلطنت کا ایک مسلمہ طریقہ رہا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ برنی نے تقرریوں کی اس فہرست کو قلم انداز کر دیا ہے لیکن یحییٰ سرہندی (اس سلسلہ کی) ضروری تفصیلات بہم پہنچاتا ہے۔[1] اس کے مطابق سلطان نے اس موقعہ پر مندرجہ ذیل خطابات اور عہدے تفویض کیے۔

'ملک فیروز، نائب باربک، ملک ایاز، خواجہ جہاں، ملک مقبول، ملک کبیرہ، ملک سرتیز، مماد الملک، ملک خرم موبز ظہیر الجیوش، حمید کوملی، رضی الملک، ملک پندار خلجی، قدر خاں اور (اس خطاب کے ساتھ) اقطاع لکھناوتی، ملک حسام الدین ابورجا، نظام الملک (اور اس کے ساتھ) وزارت لکھناوتی، ملک عزالدین یحییٰ بندت، اعظم الملک (اور اس کے ساتھ) اقطاع ستگاؤں، مولانا قوام الدین، قتلغ خاں اور وکیل دار کا عہدہ، مولانا قوام الدین کا بھائی مولانا کمال الدین، صدر جہاں، قوام الدین کا دوسرا بھائی مولانا نظام الدین، علیم الملک، نظام الدین کمال سرخ۔ مخلص الملک، شہاب سلطانی۔ تاج الملک، مولانا یوسف۔ داور ملک، ملک قیران۔ صفر ملک بیگی۔ سردواندا، ملک شہاب الدین ابورجا ملک اتجار اور (اس کے ساتھ) اقطاع نوساری۔

دہلی سلطنت (کی تاریخ) میں محمد بن تغلق کے کار منصبی کے صحیح تعین کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے دورِ حکومت کے تاریخ وار سلسلہ واقعات کو جہاں تک ممکن ہو سکے ٹھیک طور پر مرتب کیا جائے اور اس کے بنیادی سیاسی اور مذہبی تصورات کا تجزیہ کیا جائے، ایک کے ذریعہ ہمیں اس کے ہنگامہ خیز عہد حکومت کے تسلسل واقعات کا اندازہ ملے گا اور دوسرے کے ذریعہ ان واقعات کی علت کا۔

سلسلہ واقعات

سلطان کے مختلف اقدام اور ان کے علتی تعلق کے اعتبار سے ان کے ردِ عمل کا تجزیہ کرنے والے کسی شخص کے لیے سلسلہ واقعات (کا تعین) ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ (سلطان کی مختلف کارگزاریوں کے بیان کے سلسلہ میں) برنی کی رہنمائی ان واقعات کے تسلسل سے زیادہ اس تاثر نے کی ہے جو سلطان کی کارگزاریوں کی نوعیت اور شدت نے

---

(1) مبارک شاہی ص 98۔

اس کے دماغ میں پیدا کی۔[1] ابن بطوطہ ان واقعات (کے بیان) کے لیے قابل اعتماد ہے جو ہندستان میں اس کے قیام کے دوران واقع ہوئے لیکن اپنی آمد سے قبل کے واقعات زیادہ کار آمد نہیں ہیں۔ محمد بن تغلق کے (عہد حکومت کے) دو منظوم بیانات۔ عصامی اور بدر چچ کے پیش کردہ۔ اس کے عہد کے سلسلہ واقعات کا ڈھانچہ ترتیب دینے میں زیادہ مدد ہیں۔ اس کے عہدِ حکومت کے متعلق تمام ماخذ۔ سیاسی تاریخیں، شاعرانہ تصنیفات، سکوں اور کتبوں کی شہادت، صوفیاء سے متعلق کاغذات بیرونی سیاحوں کے تذکرے۔ کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل سلسلہ واقعات ظاہر ہوتے ہے۔

برنی کے مطابق محمد بن تغلق کی تخت نشینی تغلق آباد میں 725ھ /1325ء[2] میں ہوئی۔ عصامی 724ھ /1324ء کو[3] اس کی تخت نشینی کا سال قرار دیتا ہے اور دوسرے ذرائع سے بہم معلومات اس کی تائید پیش کرتی ہیں۔ (الف) ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ غیاث الدین نے چار سالوں تک حکومت کی۔[4] خسرو کی تغلق نامہ[5] سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ 2/ شعبان 720ھ /7/ ستمبر 1320ء کو تخت نشین ہوا۔ اس لحاظ سے اس کی وفات کا سال 724ھ /1324ء ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ محمد بن تغلق کی تخت نشینی کا سال بھی یہی ہوگا۔ (ب) شیخ حمید الدین صوفی ناگور کے اخلاف کو دیئے ہوئے محمد بن تغلق کے ایک فرمان[6] کی تاریخ 14/ ذی الحجہ 724ھ /1324ء ہے (ج) برنی اور عصامی کے بیانات کے مطابق اس صورت میں ممکن ہو سکتی ہے اگر ہم محمد بن تغلق کی تخت نشینی کو ذی الحجہ 724ھ / نومبر۔ دسمبر 1324ء میں فرض کر لیں اور اس کی تاجپوشی کو 40 دنوں بعد یعنی 725ھ /1325ء میں۔

---

(1) وہ اس بات کا بلا تجھک اعتراف کرتا ہے۔ دیکھیے فیروز شاہی، ص 478۔

(2) ایضاً، ص 456۔

(3) فتوح السلاطین ص 421۔

(4) رحلہ ص 5۔

(5) تغلق نامہ، ص 132، الخ۔

(6) دیکھیے سرور الصدور (علی گڈھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں جیب گنج ذخیرہ کا قلمی نسخہ) یہ شیخ حمید الدین صوفی ناگوری کی ملفوظ ہے اور چونکہ اس کی تدوین محمد بن تغلق کے عہد میں کی گئی تھی اس لیے یہ سلطان کے متعلق دلچسپ معلومات مہیا کرتی ہے۔ اس نسخہ میں کچھ اور اہم کاغذات منسلک ہیں مثلاً مندرجہ بالا فرمان۔

محمد بن تغلق کی حکومت کے اولین واقعات میں سے ایک ترمہ شیریں کا حملہ تھا۔ یحیٰ سرہندی اس حملہ کی تاریخ 729/1328 لکھتا ہے[1] لیکن فرشتہ[2] لکھتا ہے کہ یہ 727ھ /27-1326ء میں ہوا تھا۔ اور قرائنی شہادتوں سے اس کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ کلانور اور فرشور (پیشاور) پر سلطان کی فتح کو عصامی اس کی تخت نشینی کے فوراً بعد بیان کرتا ہے۔[3] شاید وہ مہم جس کی وجہ سے کلانور اور فرشور فتح ہوا۔ اس حملہ کے بعد شروع کی گئی ہوگی تاکہ سرحدی علاقہ صورت حال کو بنایا جا سکے اور منگول حملوں کے خلاف موثر دفاعی انتظامات کیے جا سکیں۔

محمد بن تغلق کے عہد حکومت کی پہلی بغاوت کی قیادت اس کے عم زاد بھائی بہاءالدین گرشسپ نے کی۔ عصامی[4] کے مطابق یہ سلطان کی تخت نشینی کے دو سالوں کے بعد ہوئی۔ یعنی 725ھ /27-1326ء میں۔ گرشسپ کے قتل کر دیے جانے کے چند مہینوں بعد کوندھانہ[5] کی فتح کے لیے کارروائی کی گئی۔ گرشسپ کے خلاف کئی مہینوں تک مہم جاری رہی چونکہ اس نے دو مہینوں تک کمتہ میں اور ایک مہینہ تک مہندرگ میں مقابلہ کیا۔ وہ اس وقت گرفتار ہوا جب وہ دوار سمدرا میں داخل ہوا۔ ان تمام باتوں میں 5 یا 6 مہینے گزر گئے ہوں گے۔ عصامی لکھتا ہے کہ کوندھانہ کے قلعہ کا محاصرہ 80 مہینوں تک جاری رہا۔[6]

اس بنا پر اگر اندازہ لگایا جائے تو اس فتح کی تکمیل 728ھ /1328ء کے وسط میں ہوئی ہوگی۔

عصامی لکھتا ہے کہ سلطان نے بہرام ایبہ کشلو خاں کی بغاوت کی خبر اس وقت سنی جب وہ کوندھانا کی مہم کے بعد دیوگیری میں آرام کر رہا تھا۔[7] اس لیے ہم اس کی

---

(1) مبارک شاہی ص 101

(2) فرشتہ جلد 1 ص 134

(3) فتوح السلاطین ص ص 24-423

(4) ایضاً، ص 424

(5) ایضاً، ص 432، فرشتہ 729ھ / 1338ء لکھتا ہے جو صریحاً غلط ہے۔

(6) فتوح السلاطین، ص 432، الخ

(7) ایضاً ص 433

تاریخ 728ھ /28-1327ء کے دوران بھی مقرر کر سکتے ہیں۔ برنی کسی تاریخ کا ذکر نہیں کرتا ہے لیکن اسے اس عہد کی پہلی بغاوت قرار دیتا ہے۔[1]

عصامی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیاث الدین بہادر شاہ کی بغاوت تقریباً اسی وقت ہوئی جبکہ بہرام ایبہ کے خلاف مہم جاری تھی۔ لیکن کامیاب طور پر اس کو فرو کیے جانے کی خبر سلطان کو اس وقت ملی جبکہ وہ ایبہ[2] کے خلاف اپنی مہم ختم کر چکا تھا۔ لہٰذا یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ شاید 728ھ/1328ء کے آخری حصہ یا 729ھ /29-1328ء کی ابتدا میں ہوئی تھی۔ سکوں کی شہادت اس نتیجہ کی تائید کرتی ہے۔ غیاث الدین بہادر شاہ اور محمد بن تغلق کے مشترکہ سکے جو اب تک دستیاب ہو سکے ہیں وہ 728ھ /1328ء سے آگے نہیں جاتے۔

عصامی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان نے دیوگیری جانے کا حکم ملتان[3] سے دہلی واپس آنے کے بعد اور علامی سکوں[4] کے اجراء کے قبل دیا۔ عصامی کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامتی سکوں کا اجراء دولت آباد بھیجے جانے والے لوگوں کے سرکشانہ رویہ کی سزا کے بطور ہوا تھا[5]۔ سکوں کی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامتی سکوں کی ابتدا 730ھ /30-1329ء میں ہوئی تھی[6]۔ لہٰذا دیوگیری کے لیے خروج 729ھ /29-1328ء میں قرار دیا جا سکتا ہے۔

عصامی کے مطابق علامی سکے اجراء[7] کے تین سالوں بعد واپس لے لیے گئے۔ سکوں کی شہادت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے تمام علامتی سکے جو دستیاب ہو سکے ہیں وہ صرف 730ھ/30-1329ء، 731ھ/31-1330ء اور 732ھ /32-1331ء[8] کے ہیں۔

---

(1) فیروز شاہی، ص 478

(2) فتوح السلاطین ص ص 45-444

(3) ایضاً، ص ص 46-445

(4) ایضاً، ص ص 60-459

(5) ایضاً، ص ص 60-459

(6) JASB، جلد 17، 1921 نمبر 1 ص ص 52-147

ضیاءالدین[9] برنی لکھتا ہے کہ سلطان نے خراسان کی فتح کے لیے 3 لاکھ 70 ہزار گھوڑا سواروں کی ایک فوج تیار کی لیکن ایک سال بعد ان سبھوں کو برطرف کر دیا گیا چونکہ مزید عرصہ کے لیے ان کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے خزانہ میں روپے نہ تھے۔ اس کے بعد دس ہزار سپاہی قراچل بھیجے گئے۔ کوئی ہم عصر یا نزدیکی ہم عصر ماخذ اس سال کی کی تخصیص نہیں کرتا جب خراسان کی مہم کے لیے فوج تیار کی گئی تھی۔ پھر بھی اس سال کا لگ بھگ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ 1333ء میں مانسون کی ناکامی (بارش کی کمی) کی وجہ سے سلطان کو اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ دوآب کے علاقہ کے کسانوں کا غلہ ضبط کر لے اور جب ابن بطوطہ مارچ 1334ء میں دہلی پہنچا تو اس نے اگلے چھ مہینوں[10] تک وہاں کے شہریوں کو راشن تقسیم ہوتے ہوئے دیکھا۔ سلطان 1334-35ء کے دوران جاڑے کے موسم کے وسط میں معبر کی بغاوت کو دبانے کے لیے دکن روانہ ہوا اور جب وہ ڈھائی سالوں کے بعد واپس ہوا تو اس کی فوج کا 'معتدبہ' یا 2/3 حصہ طاعون کا شکار ہو چکا تھا۔ اور قحط اس وقت تک جاری تھا۔ اگلے دس سالوں تک مرکزی اقتدار مفلوج رہا لہٰذا نہ تو خراسان کی مہم اور نہ قراچل کی مہم کو 1333ء کے بعد قرار دے سکتے ہیں۔ میر خوند خورد جن کی پیدائش 1310ء کے لگ بھگ ہوئی تھی ایک موقع پر (جس کا ذکر آگے آئے گا)) لکھتے ہیں کہ[11] سلطان نے خراسان کی مہم کی تشہیر کا سلسلہ (دہلی سے) خروج کے سال (1329ء) میں شروع کیا تھا۔ اگلے سال اس نے علامتی سکے جاری کیے۔ اس کی کامیابی سے اسے چاندی کی وہ مقدار حاصل ہو جاتی جس کی اسے ضرورت تھی۔ لیکن اس کی ناکامیابی نے اس کے لیے اور کوئی چارہ نہ چھوڑا کہ وہ اپنی کانسے کے سکوں کو (چاندی کے سکوں سے بدل کر) واپس لے لے اور اس فوج کو برطرف کر دے۔ لہٰذا خراسان کی مہم کے لیے فوج کی

---

(7) فتوح السلاطین ص 460۔

(8) JASB، جلد 17، 1921ء نمبر 1 ص ص 147-52۔

(9) فیروز شاہی ص 477۔

(10) رحلہ ص 117۔

(11) سیر الاولیاء ص 271۔

بھرتی 1330-31ء کے دوران ہوئی ہوگی اور اگلے سال اس کو برطرف کر دیا گیا ہوگا۔ سلطان کے رفاہ عامہ کے کام اور سورگ دواری کا قیام قحط شروع ہونے کے بعد ہوا ہوگا۔ برنی کے مطابق سلطان نے سورگ دواری سے واپسی کے بعد اپنا نام سکوں پر سے ہٹالیا اور اس کے عوض خلیفہ کا نام کندہ کرایا۔[1] وہ سکے جن پر سلطان کا نام نہ تھا وہ سب 741ھ/ 1340-41 کے ہیں۔[2] بقول ابن بطوطہ سلطان سورگ دواری میں ڈھائی سالوں تک ٹھہرا رہا۔[3] اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلطان سورگ دواری سے 741ھ/ 1340ء سے قبل ہی واپس ہوا تھا اور یہ کہ سورگ دواری کے شہر کی بنا 738ھ/ 1338ء کے آخری حصہ یا 729ھ/ 1338ء کے شروع میں رکھی گئی تھی۔

729ھ/ 1328ء سے شروع ہونے والی اور 739ھ/ 1338ء میں ختم ہونے والی دہائی کے دوران، یعنی دیو گیری کو خروج سے لے کر سورگ دواری کے قیام تک کے عرصہ میں سلطان کو کئی بغاوتوں سے نمٹنا پڑا جن میں سے دو اہم بغاوتیں معبر اور بنگال میں، علی الترتیب، 735ھ/ 1334ء، اور 739ھ/ 1338ء میں واقع ہوئیں معرب کے جلال الدین شاہ کے اعلان آزادی کے بعد کے سکے 735ھ/ 1334ء[4] تک ملتے ہیں اور اس بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی بغاوت اسی وقت کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ بنگال میں فخر الدین شاہ کی بغاوت 739ھ/ 1338ء کے دوران کسی وقت ہوئی یہ تاریخ مندرجہ ذیل اندازے کے بنا پر طے کی جا سکتی ہے۔ عصامی کے مطابق یہ بغاوت محمد بن تغلق کی دولت آباد سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد ہوئی۔[5] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ سلطان دولت آباد سے ڈھائی سال کے بعد واپس ہوا۔ چونکہ معبر کے لیے وہ جمادی الاوّل کی 735ھ/ دسمبر 1334ء جنوری 1335ء میں روانہ ہوا تھا اس لیے اس کی واپسی 737ھ/ 1336-37ء کا ہے متذکرہ بالا تاریخ کی تائید کرتا ہے۔

---

(1) فیروز شاہی ص 492

(2) تھومس کرانیکلس اف دی پٹھان کنگس آف دہلی، ص ص 60-259۔

(3) رحلہ جلد 3، ص 87

(4) JARS 1922، ص 344، 1902، ص 673

(5) فتوح السلاطین، ص 471

عصامی کے مطابق دہلی 14 سالوں کی ویرانی کے بعد دوبارہ آباد ہوئی[1]۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو دہلی واپس جانے کی اجازت 743ھ /1342ء میں دی گئی۔ لیکن برنی قطعی طور پر لکھتا ہے کہ سلطان نے، شاید طاعون کی وبا کی وجہ سے، تمام لوگوں کو دہلی واپس جانے کی اجازت اس وقت دی جب وہ تلنگانہ سے واپس آرہا تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ دویا تین کارواں جو وہاں رک گئے تھے ان کو دہلی روانہ کیا گیا۔ بقیہ لوگ جو مہاراشٹر علاقہ ہی میں خوش تھے وہ اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ وہیں رہنے لگے[2]۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ 37-735ھ /37-1335ء کے دوران دہلی کے تمام وہ تارک الوطن جو واپس جانا چاہتے تھے وہ شمال کی جانب واپس جا چکے تھے۔

741ھ /41-1340ء میں، ابن بطوطہ کے مطابق، سلطان نے اپنی سلطنت میں چنگیوں کو ختم کر دیا اور یہ حکم دیا کہ لوگوں سے زکوۃ (در آمدات پر ٹیکس) اور عشر (زمین پر ٹیکس) کے علاوہ اور کوئی ٹیکس نہ لیا جائے[3]۔

جب سلطان سورگ داری میں مقیم تھا تو تین بغاوتیں واقع ہوئیں۔ (1) عین الملک ملتانی کی بغاوت (2) شہاب الدین نصرت خاں کی بغاوت اور (3) علی شاہ نتھو کی بغاوت۔

سلطان کی حکومت کے بقیہ واقعات کی تاریخیں معلوم ہیں اور ان کا ذکر ان واقعات کے بیان کے ساتھ کیا جائے گا۔ لیکن اس کی حکومت کے ابتدائی سولہ سالوں کا یہ سلسلہ واقعات اگرچہ اندازاً پیش کیا گیا ہے پھر بھی یہ ہمیں ان واقعات کو تاریخ وار طور پر اور ان کے علتی تسلسل کے ساتھ مرتب کرنے میں مدد دے گا۔ برنی قطعی طور پر یہ لکھتا ہے کہ اس نے وقتی تسلسل کا لحاظ نہیں رکھا ہے اور یہ تعجب کی بات ہے کہ دورِ جدید کے کسی مصنف نے اس کی (محمد بن تغلق کی) حکومت کے اہم ترین واقعات کی تاریخ وار ترتیب کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

---

(1) تھومس، کرانیکلز، ص263

(2) فتوح السلاطین ص262

(3) فیروز شاہی ص481

سلطان کے سیاسی اور مذہبی تصورات اور رویے

سلطان کے مذہبی سیاسی تصورات محتاط مطالعہ کے مستحق ہیں چونکہ اس کے طرزِ عمل کو بعض صورتوں میں انہوں نے اثر انداز کیا اور اس کے اکثر منصوبوں اور انتظامی پالیسیوں سے وہ متعلق تھے۔

(1) محمد بن تغلق کا دماغ غیر معمولی طور پر جدت پسند تھا۔ معاملات حل کرنے کے لیے رسمی طریقوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا تھا۔ وہ تمام باتوں میں تقلیدی اور روائتی اندازِ فکر سے متنفر تھا۔ سلطان کے دماغ کی اس صفت کا ذکر برنی نے مختلف سیاق میں کیا ہے۔ اس کی سیاسی کارروائیوں کے سلسلہ میں وہ اختراعہا[1] کا لفظ استعمال کرتا ہے اور جب وہ مذہبی اور دیگر معاملات میں اس کے انوکھے طرزِ خیال کا ذکر کرتا ہے تو تحکیمات مجدد[2] کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

(2) سیاسی اعتبار سے سلطان کے تصورات کا بنیادی نکتہ ہندستان کے سیاسی اور انتظامی اتحاد کا حصول تھا۔ وہ ان تمام رکاوٹوں کو۔ خواہ وہ سیاسی ہوں یا تغفلی۔ دور کر دینا چاہتا تھا جو شمال کو جنوب سے علیحدہ کرتی تھیں۔ اشوک کے بعد شاید ہی کسی دوسرے حکمراں نے ہندستان کا بطور ایک سیاسی اور انتظامی اکائی اس طرح تصور کیا۔ جس طرح محمد بن تغلق نے۔ اس کے دکن (میں ایک ذیل دار السلطنت کے قیام) کے

---

(1) رحلہ ص84 (متن کے) اس حصہ کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ سلطان کی ٹیکسوں کے متعلق عامی پالیسی سے اس کا کوئی سروکار نہیں جیساکہ اکثر سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق درآمدات پر غیر شرعی ٹیکسوں کی وصولی سے ہے اور اس کو اس بیان کے ساتھ ملا کر پڑھا جانا چاہیے جو اس نے قبل صفحہ جات 13-12 پر کیا ہے"۔ ہمارے آنے کے وقت ملتان میں یہ قاعدہ تھا کہ تاجروں کی لائی ہوئی اشیاء کا 1/4 حصہ حکومت لے لیتی تھی اور ہر گھوڑے پر سات دیناروں کا ٹیکس لیا جاتا تھا۔ ہمارے ہندستان آنے کے دو سالوں بعد سلطان نے ان ٹیکسوں کو ختم کر دیا اور جب اس نے عباسی خلیفہ ابو عباس کا حلف وفاداری لیا تو اس اس نے حکم دیا کہ تاجروں (الناس) سے زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ اور کچھ نہ لیا جائے، ابن بطوطہ کے حافظے نے اس معاملہ میں اسے دھوکہ دیا کہ یہ واقعہ اس کے ہندستان آنے کے دو سال بعد ہوا۔ یعنی 735ھ / 1335ء۔ جو تاریخ اس نے صفحہ 84 پر دی ہے وہ صحیح ہے اور اس کے بیان کے آخری حصہ سے مطابقت رکھتی ہے کہ یہ (واقعہ) خلیفہ کی حلف وفاداری لیتے کے بعد کا ہے۔

(2) فیروز شاہی ص ص 63-462۔

تجربے کی وجہ سے دکن میں تیزی کے ساتھ ایک تہذیبی تبدیلی رونما ہوئی۔ اب دہلی سے دولت آباد تک ایک دنیا تھی جبکہ اس کی فوجیں دولت آباد سے ملتان اور بنگال سے گجرات کو آ اور جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صوفیاء محققین، تاجر شعرا اور انتظام کاروں نے ان فاصلوں کو دور کر دیا جنھوں نے صدیوں تک ہندستانی عوام کی بصیرت کو محدود رکھا تھا۔

(3) جب محمد بن تغلق دہلی کے تخت پر بیٹھا اس وقت مرکزی ایشیا کے علاقے میں متواتر الٹ پھیر ہو رہی تھی۔ اِل خانوں کی طاقت کمزور ہو چکی تھی اور تیمور بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ مرکزی ایشیاء کی سیاسی زندگی میں ایک خلاء تھا۔ کیا وہ اس خلاء کو پُر کر سکتا تھا؟

محمد بن تغلق کی مضطرب سیاسی روح نے اس سے یہ سوال پوچھا اور اس کا جواب اثبات میں پایا۔ اس نے ایک دور شروع کیا جسے بہت مناسب طور پر اعلا شہنشاہیت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ جس کی روح ہمیں خراسان کی مہم اور (اس کے) دیگر اقدام میں نمایاں نظر آتی ہے۔ برنی نے سلطان کے خیالات اور اولعزمی کو بہت عمدہ طور پر مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے: اس عالی ہمتی کی وجہ سے، جو سلطان کی بے نظیر شخصیت میں رچی ہوئی تھی، اگر آباد کرہ ارض کا پورا چوتھائی حصہ (ربع مسکون[1]) بھی اس کے غلاموں کے قبضہ میں آ جاتا اور اگر ساری دنیا مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک اس کے خزانے کی خراج گزار بن جاتی اور تمام دنیا کے لوگ اس کے حکم کے تابعدار ہو جاتے اور اس کے نام کا سکہ کاری آباد دنیا (ربع مسکون) میں جاری ہو جاتا، پھر بھی اگر کوئی اس سے کہتا کہ کسی جزیرہ میں کوئی زمین یا کسی ملک میں ایک کرہ برابر زمین کا ٹکڑا اس کے زیر اقتدار نہ کیا جا سکا تھا تو اس کے دریا صفت دل اور جہاں پیما روح کو اس وقت تک چین نہ آتا جب تک کہ وہ زمین یا وہ کرہ برابر جگہ اس کے قبضہ میں نہ کر لی جاتی۔ عالی ہمتی اور اولعزمی اور عزت و عظمت کے بے حد خیال کی وجہ سے، جو اس کے دماغ میں بسا ہوا تھا، وہ دنیا میں کیومرس اور فریدون کی طرح اکڑا اکڑا کر قدم

---

(1) ایضاً ص 470، 467

471 بھی ملاحظہ ہو جہاں برنی نے الاحکام المجددۃ والاوامر المخترعۃ کا بطور ایک سبب بغاوت ذکر کیا ہے۔

رکھنا چاہتا تھا اور لوگوں کے ساتھ جمشید اور کیخسرو کی طرح سلوک کرنا چاہتا تھا۔ در حقیقت وہ (مقدونیہ کے) سکندر کے رتبے سے مطمئن نہ ہوتا بلکہ سلیمان کا درجہ حاصل کرنا چاہتا تاکہ جن[2] و بشر دونوں ہی پر حکومت کر کے وہ نبوت کو سلطنت کے ساتھ یکجا کر سکتا اور ہر ملک کے بادشاہ کو اپنا غلام کر کے پیغمبر اور حکمراں دونوں ہی کی حیثیت سے اپنے احکام اپنے دارالسلطنت سے جاری کر سکتا؟

(4) ہندستان کے سیاسی یا تہذیبی علیحدگی کا تصور ہی اس کے لیے سوہان روح تھا وہ بیرونی دنیا کے ساتھ قریبی سفارتی، تہذیبی اور معاشی تعلقات قایم کرنے (کی افادیت) میں یقین رکھتا تھا۔ 714ھ / 1340-41ء میں در آمدات پر چنگیوں کی منسوخی کو اسی سیاق میں دیکھنا چاہیۓ۔ اسکی سیاسی بصیرت ہندستان سے بہت آگے تک پھیلی ہوئی تھی اور ایک جانب مصر تک کے ممالک پر اور دوسری طرف خراسان تک محیط تھی۔ در حقیقت محمد بن تغلق کے برسر اقتدار ہونے کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے ساتھ ہندستان کے تعلقات کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس کے دربار میں ایشیا کے مختلف ممالک سے سفیروں کے پے در پے پہنچنے کا ذکر ملتا ہے۔ موسیٰ کی بھیجی ہوئی عراقی سفارت، تغان تیمور کی بھیجی ہوئی چینی سفارت، خوارزم کے حکمراں قتلودمور کی بیوی، شہزادی ترابک، کی بھیجی ہوئی خوارزمی سفارت، شام کے عربوں کے سردار کے بیٹا امیر سیف الدین کی آمد- ان سبھوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیرونی حکومتیں اس کے ساتھ تعلقات قایم کرنے کے لیے کس حد تک کوشاں تھیں۔ چینی وفد 15/افراد اور 100/ترکوں پر مشتمل تھا۔ اس کی قیادت ترسی کر رہا تھا۔ چین کے شہنشاہ نے سلطان کو کثیر تحائف بھیجے جس نے اس جذبہ خیر سگالی کے جواب کے طور پر ایک اور بڑا وفد اور زائد تحفوں کے ساتھ بھیجا۔ ایران کے سلطان

---

(1) عہد وسطیٰ کے جغرافیہ داں دنیا کو ایک کرہ تصور کرتے تھے لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کا صرف 1/4 حصہ -یورپ، ایشیاء اور افریقہ- ہی آباد تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بقیہ 3/4 حصے پر سمندر پھیلے ہوئے تھے۔ آباد چوتھائی حصے (ربع مسکون) کو وہ ہفت اقلیم میں منقسم کرتے تھے۔

(2) جن غیر مرئی مخلوق ہیں جنکا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے۔ داؤد کے بیٹا سلیمان کو پیغمبری بھی ملی تھی اور بادشاہت بھی اور جن و بشر دونوں ہی ان کے تابعدار تھے۔ اس اعتبار سے وہ تمام حکمرانوں سے بالاتر تھے۔

ابو سعید خاں (35-1316ء) نے عزد بن یزد کو دہلی دربار میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔

محمد بن تغلق نے اپنے نجی سکریٹری بغدن کو سلطان ابو سعید کے پاس ایک کروڑ ٹنکوں کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ رقم عراق کے مقدس شہروں میں تقسیم کرادی جائے۔[1] ان بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی الجھاؤ اور کشیدگیاں بھی پیدا ہوئیں۔ اس لیے محمد بن تغلق کے سیاسی اور مذہبی تصورات کی نشو و نما کو (ان بیرونی اثرات سے) بالکل علاحدہ کر کے مطالعہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ درحقیقت اس کے بعض منصوبے- خراسان کا منصوبہ اور قراچل کی مہم، علامتی سکوں کا اجراء اور یہاں تک کہ بعض افراد[2] کا قتل- یہ تمام باتیں اس وقت تک ناقابل فہم بنی رہیں گی جب تک کہ ہم انہیں مشرقی دنیا کی صورتحال کے وسیع تر ڈھانچہ میں رکھ کر ان کا مطالعہ نہ کریں۔

(5) سلطان مذہب اور فلسفہ کا ایک محتاط طالب علم تھا۔ وہ مختلف قسم کے مذہبی رجحانات کے تجربوں سے گزر چکا تھا مع الادریت اور دہریت۔ بالآخر عقلیت اس کے تصورات کی بنیاد بن گئی وہ تمام مذہبی مباحث کی گہری چھان بین کرتا۔ ضیاء الدین برنی جیسے راسخ العقیدہ علماء دین کی نظر میں یہ عقلیت پسندانہ انداز فکر مذہب سے انکار کے مترادف تھا۔ برنی[3] ایک عمومی تبصرے کے طور پر لکھتا ہے کہ اس نے (محمد بن تغلق نے) بالکنایہ طور پر منقولات اور پیغمبر کی سنتوں پر یقین ترک کر دیا تھا۔ لیکن بعد کے مصنفین تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس نے ختم نبوت کے مذہبی عقیدہ کی تائید میں عملاء کے پیش کردہ دلائل کے متعلق بھی ان سے بحث کرنا شروع کر دیا تھا۔[4] ابن بطوطہ

---

(1) تفصیلات کے لیے دیکھیے نظامی، اسٹڈیز ان میڈیول انڈین ہسٹری اینڈ کلچر، الہ آباد، 1966ء ص 5-6

(2) جب سلطان نے ملتان کے ایک سہروردی صوفی شیخ ہود کو قتل کرادیا اس وقت اس نے ان سے کہا کہ 'یقیناً تمہارا ارادہ یہ تھا کہ تم ترکوں کے پاس بھاگ جاؤ اور یہ دعوا کرو کہ تم شیخ بہاء الدین زکریا کے بیٹے ہو اور یہ بیان کرو کہ سلطان نے تمہارے ساتھ فلاں فلاں حرکتیں کیں اور ان کو میرے خلاف لڑنے پر آمادہ کر کے یہاں لاؤ، رحلہ، ص 91

(3) فیروز شاہی ص 465

(4) شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، ص 129، محمد غوث شطاری گلزار ابرار (قلمی نسخہ)، سید محمد حسینی، جوامع الکلم، ص ص 175-76

لکھتا ہے کہ وہ لوگوں کو فرض نماز کی ادائیگی کے لیے برابر تلقین کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کا یہ مستقل حکم تھا کہ نماز با جماعت ادا کی جائے اور غیر حاضر ہونے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔[1] وہ بحث اور مباحثے جن کی بنا پر بعض راسخ العقیدہ حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی تھی، بالکل دوسرے جذبے کے تحت اور دوسرے مقاصد کے لیے منعقد ہوتے تھے۔ العمری لکھتا ہے کہ علماء اس کی مجلس میں حاضر رہتے ہیں اور رمضان کے مہینے میں اس کے ساتھ افطار کرتے ہیں۔ صدر جہاں ہر شام (کی نشست میں) حاضرین میں سے کسی ایک کو بحث کے لیے کوئی موضوع تجویز کرنے کو کہتا، تب وہ سب اس موضوع کے مختلف تمام پہلوؤں پر سلطان کی موجودگی میں بحث کرتے اور وہ، ان میں سے ایک کی حیثیت سے، ان سے بحث کرتا اور ان کو (ان کے دلائل کو) کو رد کرتا۔[2] ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی صبح کی نشستیں بھی فلسفیانہ مباحثوں میں صرف ہوتیں۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے۔۔۔ کہ صبح کی نماز کے بعد روزانہ صرف فلسفیانہ موضوعات پر ہی بحث ہوتی[3]، یہ مباحثے صرف مسلمان افراد تک ہی محدود نہیں ہوتے تھے۔

دربار میں ہونے ہونے والی بحثوں میں غیر مسلم محققین بھی حصہ لیتے تھے۔ عصامی اور ابن بطوطہ دونوں ہی لکھتے ہیں کہ وہ جوگیوں کے ساتھ نجی گفتگو اور مباحثہ کیا کرتا تھا۔ جین کاغذات کی حالیہ دریافت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جین محققین کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتا تھا۔[4] جینا پر بھاسوری نامی ایک جین نے (ایک مرتبہ) آدھی رات تک اس سے گفتگو کی تھی۔ سلطان نے اسے ایک ہزار گائیں اور دیگر تحائف دیے تھے۔ جین محققین مثلاً راجہ شیکھر اور جینا پر بھاسوری کو اس کی سرپرستی حاصل تھی لیکن تعجب یہ ہے کہ وہ اہنسا (عدم تشدد) کے جینی نظریئے سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔

(6) حالانکہ نماز اور دیگر فرائض کی ادائیگی میں سلطان ظاہر داری کے ساتھ

---

(1) رحلہ، ص 83۔

(2) مسالک الابصار، انگریزی ترجمہ، اوٹو سپائس، 38۔

(3) رحلہ، ص 266

پابند تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ دیگر مذاہب کا روادار تھا اور ان کی مذہبی رسوم اور تہواروں میں شرکت کرتا تھا۔ وہ دہلی کا شاید پہلا سلطان تھا جس کی ہندوؤں کے ہولی کے تہوار میں شرکت کے متعلق واضح ہم عصر شہادت موجود تھے۔[5] اس کی مملکت میں بے شمار جوگی اپنے مسلم پیروؤں کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتے رہتے تھے اور وہ کبھی بھی اس پر اعتراض نہ کرتا۔ غیر مقلدانہ مذہبی فرقوں اور افراد کی خاصی تعداد، جن کا ذکر فیروز شاہ نے اپنی فتوحات میں کیا ہے، کو یقیناً اسی ذہنی آزادی کی فضا میں فروغ حاصل ہوا ہوگا جو محمد بن تغلق نے قایم کر دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پالپتانہ میں واقع ستر بجیہ مندر اور گرنار کے صنم خانوں میں وہ گیا تھا۔ ستر نجیہ کے مندر میں اس نے اظہارِ عقیدت کے کچھ ایسے کام انجام دیئے جو کسی جین سنگھ کے قائد کے لیے (زیادہ) موزوں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک فرمان کے ذریعہ، جس پر شاہی مہر ثبت تھی، ایک بستی اُپسرایہ (منیوں کے لیے مسافر خانہ) بنانے کا حکم دیا۔[6] تیہاگڑھ کے کتبہ[7] میں ایک گئو۔ مٹھ (گائے کا مندر) بنائے جانے کے لیے سلطان کے حکم کا اعلان ہے۔ سلطان کی مذہبی وسیع المشربی نے عصامی جیسے افراد کے لیے اس کے خلاف بدعت اور اختراع کا الزام عائد کرنے کا ایک بہانہ مہیا کر دیا۔

(7) تیرہویں اور چودھویں صدیوں کے دوران منگولوں کے ہاتھوں مسلم ممالک کی بربادی نے مسلمانوں کے ذہنوں میں دو متضاد ردِ عمل پیدا کیا تھا۔

(الف) سیاسی اقتدار سے بے پروائی کا رویہ رکھنے والے صوفیاء نے صوفی سلسلوں کی تشکیل کی اور عوام کے اخلاقی اور روحانی اصطلاح کے ذریعہ مسلم معاشرہ کے احیاء کی ایک تیز رفتار تحریک شروع کی۔

---

(4) فتوح السلاطین ص 515، رحلہ، ص 199

(5) تفصیلی حوالوں کے لیے پروسیڈنگس آف انڈین ہسٹری کانگریس، حیدر آباد اجلاس 1941ء ص 302-295 میں کالی پدا متر کا مضمون بدعنوان 'جین نظموں میں تاریخی حوالے' دیکھیے۔

(6) ایضاً ص 299

(7) فتوح السلاطین ص 515

(ب) امام ابن تیمیہ (1328ء-1263ء) کی قیادت میں دیرینہ عقائد کی پابند ایک جماعت Fundamentalist نے ایک بالکل مختلف رویہ اختیار کیا۔ اس نے تصوفانہ طرزِ فکر کو ناساعد حالات کے سامنے امن پسندی، جمود اور خود سپردگی کی علامت قرار دے کر اس کی ملامت کی اور مسلم معاشرہ کے مختلف اجزاء- عوام، حکمراں، صوفیاء، علماء- کو متحد کر کے اس کے احیاء کے لیے اور سیاسی اقتدار کی بحالی کے لیے ایک تحریک کی تائید کی، مولانا ابوالکلام آزاد کے مطابق اسلام کی تاریخ میں ابن تیمیہ کو ایک بے نظیر اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ چونکہ منگولوں کے ہیجان عظیم کے بعد یہ وہی تھے جنھوں نے ان خطوط کی نشاندہی کی جن کے مطابق سیاسی اقتدار دوبارہ حاصل کیا جا سکتا تھا اور مسلم معاشرہ ازسرِ نو زندہ کیا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ کے خیالات کے بعض پہلو سے محمد بن تغلق متاثر ہوا تھا۔ صوفیاء کی ریاست سے علاحدگی پسندی کے تصور، اور ان کے بعض طریقوں اور ترکیبوں پر اس کی تنقید اس عظیم شامی عالم کے خیالات سے مطابقت رکھتی ہے۔ ابن بطوطہ ہمیں بتاتا ہے کہ ابن تیمیہ کے ایک شاگرد، مولانا عبدالعزیز اردبیلی، سلطان کے دربار میں آئے تھے اور سلطان نے ان سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے دربار میں ان کے قدم چومے تھے۔[1]

ان اثرات کے تحت اسنے جو رویہ اختیار کیا اس کا اس مقولہ کے ذریعہ اظہار ہوا کہ "مذہب اور ریاست جڑواں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا جملہ تھا جو خاص طور پر ان صوفیوں کے خلاف تھا جنہوں نے اس عذر کی بنا پر کہ ریاست مذہب کی نمائندگی نہیں کرتی تھی ریاست سے علاحدگی کی ایک روایت قایم کر لی تھی۔ ایک سکے میں، جو اس نے 1326/727ھ میں جاری کیا تھا۔[2] خود کو محی سنن خاتم النبین (آخری پیغمبر

---

(1) رحلہ، ص 70

(2) سیر الاولیاء، ص 196، برنی اسی خیال کو دوسرے طور پر پیش کرتا ہے، جب وہ یہ لکھتا ہے کہ وہ (محمد بن تغلق) پیغمبری اور بادشاہت کو یکجا کرنا چاہتا تھا، "بادشاہی را با پیغمبری جمع کند" فیروز شاہی، ص 459 تھومس، کرانیکلز آف دی پٹھان کنگس آف دہلی، 211، سلطان کا یہ لقب اختیار کرنا اس صورت میں زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب ہم یہ بات یاد کریں کہ اس سے قبل اس موقعہ پر اس نے ختم نبوت کی حمایت میں پیش کردہ دلائل کے متعلق غور و خوض کیا تھا۔

مکتوبات (قلمی نسخہ)

کی سنتوں کا احیاء کرنے والا) لکھا ہے۔

لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ وہ ابن تیمیہ کے خیالات کی مکمل طور پر تقلید کرتا تھا یا یہ کہ اس نے خود کو ان خیالات کے سانچے میں ڈھال دیا۔ ایسا اندازہ ملتا ہے کہ اس نے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری سے فرمائش کی تھی کہ مخصوص طور پر اس کے لیے تصوف پر ایک کتاب تیار کر دیں وہ خود شیخ فرید الدین گنج شکر کے پوتے، شیخ علاؤالدین کا مرید تھا۔[1] شیخ علاؤالدین دنیاوی اقتدار اور مادہ پرستانہ جدوجہد سے بیزاری کے لیے مشہور تھے۔ ظاہر ہے کہ سلطان اور اس کے پیر دو مخالف سروں پر تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ روحانی تسکین کے لیے اس نے ان کی جانب رجوع کیا اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ صوفیوں کے خلاف اس نے جو کچھ بھی کیا اس کے باوجود اس کے دل میں صوفیوں اور ان کی پارسائی کے لیے ایک گہرا اور مخلصانہ جذبہ احترام موجود تھا۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اس نے شیخ رکن الدین ملتانی کے قدم چومے تھے[2] اور بہرام ایبہ کشلو خاں کی بغاوت کو کچل دینے کے بعد ملتان کے عوام کو معاف کر دینے کے لیے ان کی مداخلت کو منظور کر لیا تھا۔[3] محمد بن تغلق دہلی کا پہلا سلطان تھا جس نے اجمیر میں شیخ معین الدین چشتیؒ اور بہرائچ میں سالار مسعود غازی کے مزار کی زیارت کی۔[4] اس نے سالار مسعود کے مقبرے کے مجاوروں کے درمیان کافی تحائف تقسیم کیے۔[5] اس کی علاوہ بدایوں میں میران ملہم، دہلی میں شیخ نظام الدین اولیاء، ملتان میں شیخ رکن الدین ابوالفتح، اجودھان میں شیخ علاؤالدین[6] اور بہت سے دیگر ہم عصر اور ماقبل عہد کے بزرگوں کی مزاروں پر مقبرے تیار کیے۔

---

(1) سیر الاولیاء ص196، رحلہ، ص20 (لیکن اس نام فرید الدین لکھنے میں ابن بطوطہ کے حافظے نے اسے دھوکہ دیا ہے) اجودھان کے صوفی خانوادے سے سلطان کی عقیدت کا ذکر فیروز شاہی (ص 10 ب) میں بھی موجود ہے۔ شیخ علاؤالدین کی پارسائی اور مقبولیت کے لیے دیکھیے برنی فیروز شاہی ص347

(2) فتوح السلاطین ص439

(3) ایضاً، ص443، فیروشاہی 497

(4) فتوح السلاطین ص446

(5) برنی، فیروز شاہی ص491

(6) نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

سلطان کے خیالات اور طرزِ عمل کے تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تصوف من حیثیت تصوف مخالف نہ تھا، لیکن صوفیوں کی ریاست سے علاحدگی کے رویے کی حمایت نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ حکومت کے مختلف منصوبوں اور اسکیموں کو صوفیاء اپنی اہلیت سے تقویت پہنچائیں وہ اس بات کا خواہشمند تھا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ صوفی خاندانوں کو اپنی انتظامیہ میں ضم کر لے اور اس کی یہ پالیسی، جس کے تحت اس نے مذہبی خاندانوں (کے افراد) سے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی شادیاں کیں، کامیاب ہو جاتی تو حکمراں طبقے کے اندر ایک نیا اور بے جوڑ عنصر رونما ہو جاتا۔

(8) سلطان اس بات کا قائل تھا کہ عہدوں پر تقرری اہلیت کی بنا پر ہونی چاہیے۔ انتظامیہ (تقرریوں) میں اعلیٰ نسبی جو تھوڑا بہت خیال باقی رہ گیا تھا اس کو اس نے ختم کر دیا اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر کم ذات لوگوں کی تقرریاں کیں۔ برنی جس کے دماغ میں ان لوگوں سے نفرت، جنہیں وہ کم ذات سمجھتا تھا، ایک ناقابلِ علاج مرض کی صورت اختیار کی گئی تھی، لکھتا ہے کہ سلطان بولتا تو اس طرح تھا جیسے کہ وہ کم ذات لوگوں سے اس سے بھی زیادہ نفرت کرتا تھا جتنا کہ بتوں سے۔ پھر میں نے اسے ایک کم۔ ذات مطرب کے بیٹا نجبہ (نجبہ مطرب بچہ) اس درجہ تک ترقی دیتے دیکھا ہے کہ اس کا درجہ کئی ملکوں سے بلند ہو گیا۔ چونکہ گجرات، ملتان اور بدایوں اس کے ذمہ کر دیئے گئے۔ اسی طرح اس نے عزیز خمار (شراب بیچنے والا) اور اس کے بھائی، فیروز حجام، منکہ طباخ (باورچی) مسعود خمار، لڈھا، باغبان اور دیگر چنندہ کم۔ ذاتوں (جواہیر لترہ) کو اونچا درجہ دیا اور ان کو علاقے تفویض کیے۔ اسنے ایک نایک جولاہا کے بیٹا شیخ بابو کو اپنی قربت سے نوازا اور اس جیسے کم ذات کا درجہ لوگوں کے درمیان بلند کیا اس نے دیوان وزارت کو پیرا مالی کے حوالے کیا جو ہندو سندھ کے سفلہ ترین اور ذلیل ترین لوگوں میں سے تھا اور اسے مَلِکوں، امیروں، والیوں اور مقطعوں سے بلند درجہ دے دیا۔ اس نے کشن (کرشن) بازران اندرمی کو، جو کہ ذلیلوں میں ذلیل ترین تھا، اودھ کا علاقہ دیا۔ احمد ایاز کے غلام مقبل کو، جو صورت اور سیرت میں تمام غلاموں کے لیے

باعث ننگ تھا، کو گجرات کی گورنری (وزارت) دے دی جو کہ بڑے بڑے مَلکوں اور وزیروں کا عہدہ ہوا کرتا تھا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کہ وہ کس طرح اعلیٰ عہدے اور وسیع علاقے اور بڑے بڑے صوبوں کا انتظام ایسے کم ذات لوگوں کو تفویض کیا کرتا تھا۔[1]

مندرجہ بالا ناموں میں جن پیشوں کا نام شامل ہے وہ ان افسروں کے آبائی پیشوں کو ظاہر کرتے ہیں یہ فرض کر لینا ہوگا کہ وہ افسران خود کافی تعلیم یافتہ اور کارگزار افراد ہوں گے۔ اس بات کی وضاحت اس موقعہ پر ہو جاتی ہے جب برنی اپنی فتاویٰ جہانداری (منشورہ 11) میں یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ "کم ذات لوگوں کو لکھنا پڑھنا نہ سکھانا چاہیے چونکہ ان کے علم حاصل کرنے سے مختلف قسم کی گڑبڑی پیدا ہوئی ہے۔ ریاست کے معاملات میں جو شورشیں پیدا ہو جاتی ہیں وہ ان کم ذات لوگوں کے اقوال وافعال کا نتیجہ ہوتی ہیں جو کچھ ہنر (تعلیم) حاصل کر لیتے ہیں چونکہ اپنے ہنر (تعلیم) کی وجہ سے وہ گورنر (والی) لگان وصول کرنے والے (عامل) (متصرف) افسران، (فرمان دہ) اور حاکم (فرمان روا) بن جاتے ہیں۔[2] سلطان کی یہ پالیسی یقیناً ان خاندانوں کے مفادات کو نقصان پہنچاتی جو تمام عہدوں کو اپنی اجارہ داری سمجھتے تھے۔

(9) سلطان کا یہ خیال تھا کہ وہ اپنے اقتدار کا استحکام اپنی انتظامیہ کو وسیع تر بنیاد پر قایم کر کے ہی کر سکتا تھا۔ کسی اقتدار کے استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی حدیں اس کی رعایا کی حدوں کے برابر ہوں۔ اگر مسلمانوں کے تمام طبقوں کو انتظامیہ میں لیا جاتا تھا تو یہ بھی ضروری تھا کہ ہندوؤں کو بھی حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں پر مقرر کیا جائے۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے۔

نوٹ: سلطان نے شیخ حمید الدین صوفی کے ایک پوتے سے اپنی ایک لڑکی کی شادی کر دی (سرور الدور قلمی) اور ایک دوسری بیٹی مولانا یوسف کو دی (مبارک شاہی، ص 98)

(1) فیروز شاہی ص 505

(2) پروفیسر حبیب اور سر افسر سلیم خاں۔ پولیٹیکل تھیوری آف دہلی سلطنت ص 49۔

کچھ اسی طرح کے خیال کے تحت اس نے ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کیا۔[1] اس کے علاوہ اس نے ہندو عالموں اور شاعروں کی سرپرستی کی۔ شہاب الدین العمری کے مطابق اس کے دربار میں عربی، فارسی اور ہندی کے ایک ہزار شعرا تھے۔[2]

سلطان کے ان ہی بنیادی تصورات کی روشنی میں ہم اس عہد کے بعض مورخین نیز عہد وسطیٰ کے معاشرے کے بعض اہم طبقوں کے تعصبات اور اکراہ کا تجزیہ اور اسکی تشریح کر سکتے ہیں۔ محمد بن تغلق کے لیے ہمارا خصوصی ماخذ، ضیاءالدین برنی، جو سیاست میں ایک قدامت پرست اور مذہبی معاملات میں روایات کا پابند تھا، ایک ایسے حکمراں کے مقاصد کو بمشکل ہی سمجھ سکتا تھا جو بالکل ہی ایک دوسرے زمرہ میں تھا چونکہ وہ مذہب (کے معاملات) میں ترقی پسند تھا اور سیاست میں اختراع پسند۔ محمد بن تغلق کے ان ہی رجحانات کے تفاعل اور تعامل کی روشنی میں اس کی پالیسیوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

ترمہ شیریں کا حملہ

عصامی، علاؤالدین ترمہ شیریں خاں کے حملہ کا ایک واضح نقشہ پیش کرتا ہے لیکن شاعرانہ مبالغوں اور محمد بن تغلق کے خلاف اس کے ذاتی عناد کی وجہ سے یہ (اکثر جگہوں پر) بدنما ہو گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دن ملتان سے ایک قاصد بھاگتا ہوا آیا اور یہ خبر کی کہ سندھ میں ایک منگول طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور یہ تیزی کے ساتھ پھیل رہا تھا۔ سلطان نے حملہ کو ناکام بنانے کے لیے فوری کارروائیاں شروع کیں اور سلطنت کے مختلف حصوں سے فوجی دستے طلب کیے۔ سری سے کوہِ جود (Salt-range) تک کا سارا علاقہ ایک فوجی کیمپ نظر آنے لگا۔ ابھی فوج حرکت میں نہ آئی تھی کہ منگول میرٹھ تک پہنچ گئے تھے اور اس علاقہ کو تاراج کر رہے تھے۔ سلطان نے یوسف بغرا کو دس ہزار گھوڑسواروں کے ساتھ میرٹھ بھیجا اور اس کو ہدایت دی کہ دشمنوں پر اچانک حملہ کرے اور اگر دشمن مزید پیش قدمی کرے تو وہ اس

---

(1) فیروز شاہی ص 501

(2) مسالک الابصار، انگریزی ترجمہ، ص 32

پر عقب سے حملہ کرے گا جبکہ سلطان اس پر سامنے کی جانب سے حملہ کرے گا جب واقعی جنگ شروع ہوئی تو منگولوں کے بگلوں کے شعور سے ہندستانی سپاہیوں کو چکر آنے لگے۔ اس مصیبت کے باوجود دہلی کی فوج نے ترمہ شیریں پر فتح حاصل کرلی اور اس کو پسپا کردیا[1]۔ یہ پہلا اور آخری بیرونی حملہ تھا جس کا محمد بن تغلق کو اپنی حکومت کے دوران مقابلہ کرنا پڑا۔ بلبن اور علاؤالدین خلجی کے برعکس اسے منگولوں (کے حملے) کے متواتر مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی قوت اندرونی بغاوتوں سے نمٹنے میں صرف ہوئی۔

یحییٰ سرہندی لکھتا ہے کہ سلطان ترمہ شیرین کے تعاقب میں کلانور تک گیا اور اس سرحدی چوکی کی قلعہ بندی کرا کر اسے ملک مجیر الدین ابورجا کے سپرد کیا[2]۔

ابن بطوطہ ترمہ شیریں کا ایک مفصل بیان پیش کرتا ہے جو تمام دیگر ہندستانی بیانات سے مختلف ہے اور اسے عصامی، یحییٰ سرہندی اور دوسرے ہندستانی تذکرہ نگاروں (کے بیانات) سے مطابقت دینے کی ایک واحد صورت یہی ہے کہ ہم یہ فرض کرلیں کہ (یہ) دوسرا ترمہ شیریں ایک جھوٹا دعویدار تھا۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ہندستان آتے ہوئے وہ ترمہ شیریں کے مہمان کی حیثیت سے خراسان میں دو مہینے ٹھہرا تھا۔ اس وقت ترمہ شیریں کی طاقت عروج پر تھی۔ وہ ایک وسیع علاقہ پر حکومت کرتا تھا۔ اور بڑی بڑی فوجیں اس کے اشاروں پر کام کرنے کو تیار تھیں۔ ہندستان آنے کے دو سالوں کے بعد ابن بطوطہ کو معلوم ہوا کہ چنگیز کی یاساؤں کی خلاف ورزی کی سزا کے طور پر ترمہ شیرین کی رعایا نے اس کے چچیرے بھائی بازن اغول، کا حلف وفاداری اٹھالیا تھا اور اس کو معزول کردیا تھا۔ ترمہ شیریں ہندستان بھاگ آیا اور اپنی اصل شخصیت کو ظاہر کیے بغیر سندھ میں رہنے لگا۔ ملتان کے گورنر عماد الملک سرتیز نے اسے پہچان لیا اور سلطان کو اس خبر سے آگاہ کیا۔ سلطان کے حکیم کو، جس نے اس کے قبل ترمہ شیریں کی ماتحتی میں کام کیا تھا، اسکی پہچان کی تصدیق کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے زخم کے نشان سے اسے پہچان لیا جس زخم

---

(1) فتوح السلاطین ص ص 65-462

(2) مبارک شاہی ص 101

کے لیے اس کا علاج کیا تھا، احمد ایاز اور قتلغ خان نے ملک میں اس اہم شخصیت کی موجودگی سے پیدا ہونے والے خطرات کے متعلق سلطان کو آگاہ کیا۔ محمد بن تغلق بھی گھبرا اٹھا۔ اس نے اس جھوٹے دعویدار کو دربار میں بلایا اور جب وہ حاضر ہوا تو سلطان غصہ کے ساتھ اس سے مخاطب ہوا۔ اے ولد الزناتم نے کس طرح یہ جھوٹ بولنے کی ہمت کی کہ تم ترمہ شیریں ہو جبکہ ترمہ شیریں مر چکا ہے اور اس کی قبر کا یہ مجاور ہمارے پاس موجود ہے[1]، مرکزی ایشیا کے مورخین کے مطابق ترمہ شیریں نے غزنی کی جانب بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا اور بازن کے پاس بھیج دیا گیا، جس نے اس کو 1332ء میں قتل کرا دیا۔ محمد بن تغلق کو یقیناً صحیح واقعات کی خبر ہوگی۔ ابن بطوطہ نے جو الفاظ اس سے منسوب کیے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کو یہ معلوم تھا کہ اسے ایک جھوٹے دعویدار منگول کے ساتھ معاملہ درپیش تھا جس کے لیے یہ ایک فائدہ بخش صورت تھی کہ وہ ترمہ شیریں ہونے کا دعوا کرے۔ جھوٹے دعویدار کو ہندستان سے باہر نکال دیا گیا۔

کلانور اور فرشور (پیشاور کی فتح)

اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی محمد بن تغلق کلانور[2] اور فرشور کی ایک مہم پر روانہ ہوا۔ غلب یہ ہے کہ یہ (مہم) ترمہ شیریں کے حملہ کے بعد چلائی تھی۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو ایک سال کی تنخواہ بطور پیشگی دے دی اور انہیں تمام ضروری ہتھیاروں، گھوڑوں وغیرہ سے مسلح ہونے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ لاہور کی جانب روانہ ہوا اور دو ماہ بعد وہاں پہنچ گیا۔ وہ لاہور میں ہی ٹھہر گیا لیکن اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ پیشاور کی جانب کوچ جاری رکھیں اس کا مقصد سرحدی خطہ میں ان منگولوں کے خلاف، جو اس علاقہ کے متصل مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے تھے اور ہندستانی سرزمیں پر لوٹ کھسوٹ مچایا کرتے تھے، ایک محافظ فوج کو متعین کرنا تھا۔ عصامی کا خیال ہے کہ ”گزشتہ سالوں میں جو کچھ ہوا تھا اس کے برخلاف اس سال ہندستانی

---

(1) ایضاً، ص258

(2) عصامی قطعی طور پر ”در آغاز ملک“ لکھتا ہے۔ فتوح السلاطین ص423

سپاہیوں نے منگول سرزمین پر لوٹ کھسوٹ مچائی[1]، کلانور اور پیشاور فتح کر لیا گیا اور سلطان کے نام پر خطبہ پڑھا گیا۔ چونکہ وہاں غلہ قطعی دستیاب نہ تھا اور سپاہیوں کو اپنے شکار کردہ جانوروں پر گزارہ کرنا پڑتا تھا لہٰذا وہ جلد ہی اس علاقہ سے عاجز ہو گئے۔ فوج دوبارہ لاہور میں محمد بن تغلق سے جا ملی۔ دو یا تین ماہ سلطان لاہور میں مقیم رہا اور سرحدی علاقہ کے معاملات درست کیے، نیز متعدد سرکش عناصر کو اس نے مطیع کر لیا۔ اس کے بعد وہ دہلی لوٹ آیا۔ عصامی کے مطابق اس نے دو سالوں تک عوام کے ساتھ نہایت ہمدردانہ اور مشفقانہ برتاؤ رکھا لیکن اس کے بعد اس کے رویہ میں تبدیلی آنے لگی۔[2]

بہاء الدین گرشسپ کی بغاوت

یحییٰ سرہندی کہتا ہے کہ محمد بن تغلق کے دورِ حکومت کی یہ پہلی بغاوت تھی۔[3] گرشسپ سلطان کا ایک عم زاد بھائی تھا۔[4] ابن بطوطہ کے مطابق غیاث الدین کی وفات کے بعد اس نے محمد بن تغلق کے حق میں حلف وفاداری اٹھانے سے انکار کر دیا۔[5] لیکن عصامی کہتا ہے کہ محمد بن تغلق نے اسے گرشسپ کا خطاب عطا کیا تھا اور اسے ساگر بھیج دیا تھا۔ جہاں اس نے زبردست شہرت حاصل کی۔[6] اس نے بغاوت اس وقت کی جب اس نے یہ سمجھ لیا کہ سلطان کے کردار اور مزاج میں ایک تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔[7] شاید برنی اپنی یادداشت کی کمزوری کی بنا پر اس بغاوت کے سلسلہ میں کچھ نہیں کہتا۔

---

(1) ایضاً، ص 423

(2) ایضاً، ص 424

(3) تاریخ مبارک شاہی، ص 99

(4) ابن بطوطہ کہتا ہے کہ وہ غیاث الدین تغلق کی بہن کا لڑکا تھا (رحلہ ص 95) فرشتہ اس کا تذکرہ محمد بن تغلق کے چچا کے لڑکے کی حیثیت سے کرتا ہے (جلد 1 ص 135) ابن بطوطہ بلاشک وشبہ درست ہے۔

(5) رحلہ، ص 95

(6) فتوح السلاطین، ص 424، فرشتہ بھی ملاحظہ ہو جلد 1 ص 135

(7) فتوح السلاطین، ص 424

خواجہ جہاں احمد ایاز کو گرشسپ کے خلاف گجرات سے روانہ ہونے کی اور بڑے بڑے ملک مثلاً قوام الدین، قطب الملک، تاتار اشرف الملک وغیرہ کو اپنی معیت میں لینے کی ہدایت کی گئی۔[1] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ سلطان نے اس کے خلاف ایسی فوجیں روانہ کیں جو ملک مجیر (مجیر الدین ابورجا) جیسے بڑے امراء پر مشتمل تھی اور وزیر خواجہ جہاں (اس کا) کمانڈرانچیف تھا۔[2]

جب گرشسپ کو شاہی فوج کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس نے فوراً گوداوری کو پار کیا اور دیوگری کے مغرب میں چل پڑا۔ یہیں مقابلہ ہوا۔ گرشسپ نے قلب لشکر پر جو احمد ایاز کے زیر قیادت تھا حملہ کیا اور اسے بے بس کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کا فائدہ اٹھاپاتا اس کے ایک رفیق کار، خضر بہرام، نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور ابورجا کی فوجوں سے جاملا۔ یہ فرار بہت تباہ کن ثابت ہوا اور اس نے گرشسپ کی ابتدائی فتح شکست میں بدل دی۔ بہر حال اس نے دریا عبور کر کے اور ساگر بھاگ کر اپنی اور اپنے خاندان کی جان بچائی جہاں سے وہ پناہ کی تلاش میں اپنے خاندان کے ساتھ کمپیل کے رائے کے پاس آیا۔ رائے، جو بہادر اور جنگجو تھا، اسے پناہ دینے پر فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے گرشسپ سے کہا کہ "تم نے میرے پاس آکر بہت اچھا کیا۔ میں تمہیں بچانے کے لیے اپنی زندگی کی قربانی دینے پر تیار ہوں، جب تک میرے جسم میں ایک نس بھی باقی ہے کوئی بھی تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا"۔[3] یہ جرأتمندانہ الفاظ تھے جو مخلصانہ طور پر کہے گئے تھے اور جن پر دیانت داری کے ساتھ تعمیل کی گئی۔

دہلی کی فوجیں سختی سے گرشسپ کا تعاقب کرتے ہوئے کمپیل پہنچی۔ محمد بن تغلق بذات خود دولت آباد کی طرف روانہ ہوا اور اس نے کتا (کماتا کے قلعہ) کمک بھیجی۔ گرشسپ اور کمپیل کا رائے دوبارہ جنگ کی نیت سے باہر آئے لیکن بالآخر انہوں نے خود کو قلعہ میں بند کر لینے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً دو ماہ تک جنگ جاری رہی لیکن اس کے بعد محافظ فوج کی حالت غیر مستحکم اور کمزور ہو گئی اور شاہی فوج قلعہ میں

---

(1) ایضاً ص 26-425

(2) ایضاً ص-95

(3) فتوح السلاطین، ص ص 28-427

زبردستی گھسنے میں کامیاب ہو گئی۔ لہٰذا گرشسپ کا میزبان اور کمپیل کا رائے ہسدرگ (انیگنڈی) کے لیے روانہ ہو گیا۔ دہلی کی فوجوں نے ان کا تعاقب کیا اور اس قلعہ کا بھی محاصرہ کر لیا۔ تقریباً ایک ماہ تک ان لوگوں نے بہادری کے ساتھ مدافعت کی لیکن آخر کار شاہی فوج نے ایک زبردست حملہ کیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

اس سلسلہ کی چند تفصیلات میں عصامی اور ابن بطوطہ کے بیانات مختلف ہیں لیکن ان کے بیانات میں حقیقتاً کوئی تضاد نہیں۔ اور ساتھ مل کر یہ صورت حال کی ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ ابن بطوطہ کے مطابق رائے نے گرشسپ سے کہا "تم دیکھ رہے ہو کہ صورت حال کیا ہو گئی ہے۔ ان حالات میں میں نے اپنے خاندان اور پیروکاروں کے ساتھ ہلاک ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم فلاں فلاں حکمراں کے پاس چلے جاؤ اور اسی کے ساتھ قیام کرو وہ تمہاری حفاظت کرے گا"۔ رائے نے گرشسپ کو دوسرے رائے کی مملکت تک پہنچانے کے لیے ایک رہبر کو اس کے ساتھ بھیجا"۔[1] عصامی کے مطابق گرشسپ نے اپنے فرار کے لیے چار گھوڑے تیار کر رکھے تھے۔ اس نے اپنے خاندان کو ان پر بٹھایا اور نہایت چالاکی سے قلعہ سے باہر نکل آیا اور جس نے بھی اس کا تعاقب کیا اسے مار ڈالا۔[2]

کمپیل کا رائے آخر دم تک لڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے رسم جوہر ادا کی۔ اپنی تمام جائدادیں، بیویاں اور بیٹیوں کو جلا ڈالا۔[3] اور تب شاہی فوجوں کے ساتھ آخری اور نہایت خطرناک جنگ لڑی۔ اور میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ جب احمد ایاز نے اینگنڈی پر قبضہ کر لیا تب اس نے ایک ممتاز باشندے کو ان اشخاص کی شناخت کا حکم دیا جو مار ڈالے گئے تھے۔ اور جن کی لاشیں میدانِ جنگ میں پڑی تھیں۔ جب اس شخص کی نظر "تیروں کے نشانات کی گلکاری سے بھرے ہوئے ایک سر" پر پڑی تو وہ ایک گہرے کرب کے ساتھ چیخ اٹھا۔ اس نے مضطرب مستفسرین سے بتایا کہ "یہ ہمارے رائے کا سر ہے"[4] احمد ایاز نے سر کو سونے کی ایک سینی میں رکھنے اور کھال کو جسم سے

---

(1) رحلہ، ص 97

(2) فتوح السلاطین ص 429

(3) رحلہ، ص 97

(4) فتوح السلاطین ص 430

الگ کر کے اسے بھوسے سے بھرے جانے کا حکم دیا۔ مغلوب رائے کے گیارہ بیٹوں کو گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کیا گیا جس نے اعلیٰ نسل اور ان کے باپ کے جرأتمندانہ کردار کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے ساتھ نہایت بہتر سلوک کیا۔ ان سبھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں سے تین، نصر، بختیار اور ابو سلم، سے ابن بطوطہ کی ملاقات ہوئی تھی اور ابو سلم، جو ہر دار کی حیثیت سے معروف تھا، کیونکہ اس کی ڈیوٹی اس پانی پر مہر لگانے کی تھی جس کو سلطان پیا کرتا تھا، کیساتھ اس کے تعلقات دوستانہ تھے۔[1] سلطان محمد بن تغلق نے اسے اس نازک اور اہم ڈیوٹی کے لیے منتخب کیا تھا یہ بات مغلوب رائے کے استقامت، بہادری اور ایک مہمان کے ساتھ وفاداری کی اعلا قدردانی کی مظہر ہے۔

گرشسپ کے مقدر میں کامیابی نہ تھی، ابن بطوطہ اس رائے کے نام کا ذکر نہیں کرتا جس سے اس نے اینگنڈی کے زوال کے بعد پناہ حاصل کی تھی۔ لیکن وہ ہمیں بتاتا ہے رائے نے اس (گرشسپ) سے کہا کہ وہ کمپیل کی رائے کی غلطی کا اعادہ نہیں کر سکتا اور اس نے اسے شاہی فوج کے حوالہ کر دیا۔[2] عصامی کہتا ہے کہ وہ رائے بلال[3] تھا (یعنی دوار سمدرا کا ہوئے سالاد پر بلال سوم جسے بلادیو بھی کہتے تھے) گرشسپ کو سخت بیڑیوں میں جکڑا گیا اور سلطان کے پاس بھیج دیا گیا، جس نے حکم دیا کہ اس کی کھال زندہ اتاری جائے اور اس کی کھال کو بھوسے اور چوکر سے بھر کر ملک بھر میں گھمایا جائے۔[4] ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "سلطان نے اسے اس کی رشتہ دار عورتوں کے پاس لے جانے کا حکم دیا جنہوں نے اسے برا بھلا کہا اور اس کے چہرے پر تھوکا اور اس کے بعد اس نے اس کی کھال زندہ اتروالی۔ اس کے گوشت کا کچھ حصہ چاول کے ساتھ

---

(1) رحلہ، ص96

(2) ایضاً، ص96

(3) فتوح السلاطین، ص431

(4) رحلہ، 96، فتوح السلاطین، ص431

(5) رحلہ، ص96

(6) ابن بطوطہ کہتا ہے کہ بہادر بھورا کی کھال بھی اس کے ساتھ گھمائی گئی۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ بھورا کی بغاوت کشلو خاں کی بغاوت کے بعد واقع ہوئی تھی۔

پکایا گیا اور اس کے بیوی بچوں کے پاس بھیج دیا گیا اور بقیہ کو ایک سینی میں رکھ کر ایک ہتھنی کے سامنے رکھا گیا جس نے اسے کھانے سے انکار کر دیا۔[5] ابن بطوطہ مزید لکھتا ہے کہ جب بھوسے سے بھری ہوئی اس کی کھال سندھ پہنچی تو اس کے گورنر بہرام ایبہ کشلو خاں نے اسے دفنانے کا حکم دے دیا۔[6] لیکن سلطان نے اسے نامنظور کر دیا۔

گرشسپ کے خلاف کارروائیوں کے دھندلکے میں امید کی جو ایک کرن نظر آتی ہے وہ سلطان کے افسران کے ذریعہ پیش کردہ مذہبی رواداری اور وسعتِ نظر تھی۔ اس دوران چند سپاہیوں نے کلیان کے شیولنگ اور مدھوکیشور کے مندر کو کچھ نقصان پہنچایا تھا۔[7] مندر کا ایک معتمد تھکور مالا، احمد ایاز کے سامنے حاضر ہوا۔ اس سے بت کی از سر نو بحالی کی درخواست کی۔ احمد ایاز نے اس بات کا ایک حکم نامہ جاری کیا کہ چونکہ مندر میں عبادت کرنا، درخواست کنندگان کا ایک مذہبی فریضہ ہے لہٰذا انہیں اس کی پیروی کرنی چاہیے“۔ کلیان کا کتبہ[8] اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلطان کے مذہبی آزادی کی پالیسی پر روشنی ڈالتا ہے۔

کوندھانہ کی فتح

کوندھانہ یا سین گڑھ دیوگیری کے قرب وجوار میں واقع تھا اور ناگ نایک کے قبضہ میں تھا۔ محمد بن تغلق قلعہ کے خلاف دیوگیری سے روانہ ہوا۔ رانا آٹھ ماہ تک محصور رہا لیکن مزید مقابلہ نہ کر سکا اور مطیع ہو گیا۔ سلطان نے اس کی دستبرداری کی قدر کی اور قبا اور ایک کلاہ اسے عطا کر کے اس کی عزت افزائی کی۔

بہرام ایبہ کی بغاوت

عصامی کہتا ہے کہ سلطان کوندھانہ کی کامیاب مہم کے بعد دیوگیری[9] میں آرام

---

(7) میسور کے بیدر ضلع میں

(8) Epi-Ind, vol xxxii, Part IV October, 1957,et- Seq

فتوح السلاطین، ص 33-432

(9) ایضاً، ص 433، عصامی کی تائید برنی (کے بیان سے) ہوتی ہے جو کہتا ہے کہ سلطان بہرام کی بغاوت فرو کرنے کے لیے دیوگیری کے ساتھ روانہ ہوا۔ (فیروز شاہی، ص 479)

کر رہا تھا کہ ملتان میں بہرام ایبہ کشلو خاں کی بغاوت کی اطلاع ہوئی۔ وہ فوراً بعد دہلی روانہ ہوا اور نہایت تیز رفتاری کے ساتھ نہایت قلیل مدت میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ ملتان کے لیے فوراً روانہ نہ ہوا بلکہ اس نے دہلی میں تقریباً ایک ماہ تک آرام کیا اور ضروری تیاریاں کیں۔ یہاں اس نے ایک زبردست خیمہ (بارگاہ) کی تعمیر کا حکم دیا۔ اس کے لیے اس میں منبر بنایا گیا۔ ایک جشن کا انتظام کیا گیا جہاں ہر قسم کے لوگوں کو مدعو کیا گیا۔ سلطان نے پہلے جلال حسام کو ایک تقریر کرنے کا حکم دیا اور اس کے بعد خود منبر پر چڑھا اور سامعین کو خطاب کیا۔ اس کے بعد چند موسیقاروں نے لوگوں کو محظوظ کیا۔ سلطان نے مدعوین میں سونے سے بھری سینیاں تقسیم کیں۔ عصامی یہ تمام تفصیلات بیان کرتا ہے لیکن سلطان کی نصیحت کے اصل موضوع کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ وہ اس کی تقریر کے سلسلہ میں ایک غامض اور مبہم تبصرہ کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سلطان نے عوام کے ساتھ ایک ریاکارانہ خطاب کیا۔ شاید یہی موقعہ تھا جب سلطان نے جنوب میں ایک ذیلی انتظامی مرکز کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ صرف اسی طور پر وہ مملکت کے دور دراز علاقوں میں پیدا ہونے والے حالات کا موثر طور پر مقابلہ کر سکتا تھا۔

در حقیقت ایبہ کی بغاوت ظالمانہ سزاؤں کی اس پالیسی کے خلاف پہلا زبردست احتجاج تھی جسے محمد بن تغلق نے اپنی حکومت کے آغاز ہی میں اختیار کیا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ سلطان اس سے ناراض تھا کیونکہ اس نے بہاء الدین گرشسپ کی لاش کو، جسے ساری مملکت میں گھمایا جا رہا تھا، دفنانے کا حکم دے دیا تھا۔ سلطان نے کشلو خاں کو بلا بھیجا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ اور ایک بغاوت کھڑی کر دی۔[1] یحییٰ سرہندی لکھتا ہے کہ سلطان نے علی خطی کو ایبہ کے خاندان کو دیوگیری لانے کے لیے بھیجا۔ علی خطی نے بہرام ایبہ کے ساتھ، جو ایک تجربہ کار امیر اور عظیم شہرت و حیثیت کا عسکری لیڈر نیز تغلق شاہ کا ایک قریبی دوست تھا، سخت اور بے ڈھنگا سلوک کیا۔ اس نے ایبہ کو اپنے دربار میں بٹھایا اور سخت الفاظ کے ساتھ اس کی سرزنش کی۔ اس نے بہرام کے داماد لاولی کی بھی ان الفاظ کے ساتھ لعنت و ملامت کی کہ ”تم اپنے متوسلین کو کیوں نہیں بھیجتے؟ تم چاہتے ہو کہ وہ جائیں نہیں، تم بدمعاشی کا رویہ اپنا رہے

---

(1) رحلہ، ص 97

ہو؛' لاولی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اس نے خلطی کو (اس کے گھوڑے سے نیچے) کھینچ لیا اور اسے مار ڈالا۔ اب حالات نے ایک سنگین صورت اختیار کر لی اور بہرام کے لیے بغاوت کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔[1]

سلطان بہرام ایبہ کے خلاف دہلی سے روانہ ہوا۔ ابوہر کے نزدیک جنگ ہوئی۔ سلطان نے شیخ رکن الدین ملتانی کے بھائی شیخ عماد الدین کو دشمنوں کو دھوکا میں ڈالنے کی خاطر شاہی چھتر کے نیچے بٹھایا۔ چال کامیاب ہوئی، بہرام غلطی سے عماد الدین کو بادشاہ سمجھ بیٹھا اور اسے مار کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان جو ایک کمیں گاہ میں چھپا تھا باہر آیا اور اس نے بہرام کی فوج کو مکمل طور پر کچل ڈالا۔ بہرام کی گردن مار دی گئی اور اس کا سر سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے ایک قتل عام کا حکم دے کر ملتان کے عوام کی سرزنش کے متعلق سوچا۔ جب شیخ رکن الدین کو سلطان کے مقصد کا علم ہوا تو وہ اس کے پاس ننگے سر اور ننگے پیر گئے[2] اور اس سے معافی چاہی۔ سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور اس نے عوام کو معاف کر دیا۔

کمال پور کی بغاوت

ابن بطوطہ کے مطابق دوسری بغاوت جو اس زمانہ میں ہوئی وہ سندھ میں کمال پور کے باشندوں کی تھی۔ سلطان نے خواجہ جہاں کو بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بھیجا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "مجھے ایک فقیہہ سے معلوم ہوا ہے کہ کمال پور کے قاضی اور خطیب کو وزیر کے سامنے پیش کیا گیا اور موا خر الذکر نے ان کی کھالیں زندہ اتارے جانے کا حکم دیا"۔ انھوں نے کہا "کسی اور طریقے سے ہمیں قتل کر دیجیے"۔ وزیر نے پوچھا۔ "تم لوگوں کو قتل ہی کیوں کیا جائے؟" انھوں نے جواب دیا "ہماری سلطان کے حکم کی خلاف ورزی کی بنا پر" وزیر نے کہا "تب میں خود کس طرح سلطان کے احکامات کے برخلاف کر سکتا ہوں؟ حقیقتاً اس نے مجھے تم لوگوں کو اسی طرح قتل کیے جانے کا

---

(1) مبارک شاہی، ص 100

(2) فتوح السلاطین، ص 427

حکم دیا ہے"۔[1]

غیاث الدین بہادر کی بغاوت

بہرام ایبہ کشلو خاں کے خلاف مہم کے تقریباً ساتھ ہی غیاث الدین بہادر، جو بھورا کے نام سے مشہور تھا، کی بغاوت ہوئی۔[2] ابن بطوطہ کے مطابق غیاث الدین تغلق نے بھورا کو دہلی میں بحیثیت ایک قیدی روک رکھا تھا۔ محمد بن تغلق نے اپنی تخت نشینی کے بعد اسے رہا کر دیا اور اسے اپنے سوتیلے بھائی بہرام خاں کو لکھناوتی اور سنار گاؤں کی حکومتیں علی الترتیب عطا کر دیں۔ لکھناوتی میں بھورا اور سلطان دونوں ہی کے ناموں کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور سکوں پر بھی دونوں ہی کے نام کندہ کرنا تھا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا تھا کہ بھورا اپنے بیٹے محمد کو، جو بربت کے نام سے مشہور تھا، یرغمال کے طور پر دہلی بھیجے گا۔ بھورا نے دہلی کی تمام ہدایات کی تکمیل کی لیکن یہ بہانہ بنا کر کہ اس کا بیٹا اس کا حکم ماننے کو تیار نہیں ہے اس نے اپنے بیٹے سے مہذب طور پر انکار کر دیا۔ سلطان نے دلجیوت تاتاری کی سرکردگی میں ایک فوج بھیجی اور اپنے بھائی بہرام خاں کو بھی بھورا سے نمٹنے کی ہدایت کی۔[3]

عصامی کے مطابق سلطان ملتان سے اپنی واپسی کے سفر پر تھا اور دیپال پور پہنچ چکا تھا کہ اس کے بھائی بہرام، جو سنار گاؤں کا گورنر تھا، کے پاس سے ایک ہرکارہ آیا اور اس نے اطلاع دی کہ بھورا نے لکھناوتی میں بغاوت کر دی تھی اور زبردست خون ریزی اور ابتری کا سبب بنا تھا لہٰذا اسے للکارا گیا اور شکست دی گئی۔ وہ ایک ندی کی طرف بھاگ نکلا تھا لیکن اس کا گھوڑا کیچڑ میں پھنس گیا۔ اسے گرفتار کر لیا گیا اور اس کی کھال زندہ ادھیڑ لی گئی۔ اس کی بھونسوں سے بھری کھال اور ایک فتح نامہ (فتح کا پیغام) (سلطان کے پاس) بھیجا گیا۔ سلطان نے چالیس دنوں تک اس فتح کا جشن دیپال پور میں منانے کا حکم دیا اور بھورا ایبہ کشلو خاں کی (بھوسا سے بھری) کھالوں کی ایک بلندی پر سے اس طرح نمائش کی گئی جیسے یہ "ایک چھلکے میں بھرے ہوئے دو گودے ہوں"۔ یہ

---

(1) رحلہ، ص 97

(2) فتوح السلاطین، ص 444

(3) رحلہ، ص 95

بغاوت 731ھ / 31-133ء میں ہوئی تھی۔ [1]

دیوگیری کو خروج

سلطان کے جس اقدام کی سب سے زیادہ غلط تعبیر نکالی گئی ہے وہ دکن میں ایک موثر انتظامی مرکز کے قیام کے لیے اس کی کوشش تھی۔ اس تجربے کی نوعیت، اس کے تحت جو خروج ہوا اس کی حدیں، اس کا ردِ عمل اور بعد کے اثرات- یہ تمام موضوعات غیر متعصبانہ توضیح و تشریح کے مستحق ہیں کیونکہ زیادہ تر غلط فہمیاں ہم عصر تذکرہ نگاروں کے نفسی بیانات ہی کی بناء پر ہیں۔

(1) محرکات

دکن کے تجربہ کے سلسلہ میں مختلف مورخین نے مختلف محرکات کو محمد بن تغلق سے منسوب کیا ہے۔

(الف) برنی لکھتا ہے کہ سلطان نے دیوگیری کو اپنا دار الملک (دار السلطنت) مقرر کیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ محل وقوع کے اعتبار سے زیادہ مرکزیت کا حامل تھا اور دہلی، گجرات، لکھنوتی، سنار گاؤں، تلنگ، معبر، دوراسمدرا اور کمپیل سے مساوی فاصلہ پر تھا۔ [2] جغرافیائی اعتبار سے اس بیان کے غیر صحیح ہونے کے علاوہ اس نکتہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دیوگیری کو اگر دہلی سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا تھا تو دیوگیری سے بھی دہلی کو کنٹرول میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ تاہم حسب معمول برنی کا بیان سلطان کے بنیادی محرک- جنوب کا موثر انتظامی کنٹرول- کو سمجھنے میں مدد ہے۔

(ب) ابن بطوطہ جو سلطان کے دکن کے تجربہ کے تقریباً پانچ سالوں بعد ہندستان آیا تھا، لکھتا ہے کہ "سلطان کی جس بات پر سب سے زیادہ ملامت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے دہلی کے باشندوں کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کا سبب یہی تھا، لوگ گالی گلوچ پر مشتمل خطوط لکھا کرتے اور ان کے لفافہ پر اس بات کی مہر ثبت کر

---

(1) سکہ سے متعلق شہادت کے لیے ملاحظہ ہو لین پول کی دی کوائنس آف دی عثمان اسٹینس آف انڈیا ان برٹش میوزیم"

(2) فیروز شاہی، ص 74-473

دیتے کہ آنحضور کی قسم، آنحضور کے علاوہ کوئی اس خط کو نہ پڑھے"۔ ان خطوط کو وہ ایوان مجلس میں رات میں پھینک دیتے جب وہ انہیں کھولتا تو سلطان کو ان کے مضامین میں گالیاں اور تہمتیں ملتیں لہٰذا اس نے دہلی کو پامال کر دینے کا فیصلہ کیا"۔[1] لیکن دوسرا ہی جملہ جو اس کے بعد یہ افریقی سیاح لکھتا ہے وہ اس کے بیان کی تردید کرتا ہے! اس (سلطان) نے دہلی کے تمام باشندوں سے ان کے گھروں اور مکانوں کو خرید لیا اور انہیں اس کی قیمت چکا دی۔[2] ایک تعزیری کارروائی غالباً ایسی منصفانہ سودے بازی کے ساتھ ساتھ نہیں کی جا سکتی تھی۔ خطوط ڈالنے کا واقعہ سچ تھا بھی تو یہ یقیناً دیوگیری کو خروج کے حکم کا اثر ہو سکتا تھا نہ کہ اس کا سبب۔

(ج) عصامی لکھتا ہے کہ چونکہ سلطان دہلی کے عوام سے بدگمان تھا لہٰذا اس نے ان کی طاقت کو توڑنے کی خاطر انہیں مہاراشٹر کی جانب بھگا دینے کے متعلق سوچا۔[3] عصامی کا بیان یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ بسا اوقات وہ اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے اور ترقی دینے کی فکر میں تھا کہ سلطان اور عوام کے درمیان ایک مخاصمت تھی اور یہ کہ سلطان اپنے تمام منصوبوں میں عوام کے خلاف اپنی اس عداوت سے رہنمائی حاصل کرتا۔ اس طرح کا نظریہ ایک صحیح تاریخی مناظر Historical perspective کو یقیناً دھندلا کر دیتا ہے۔

(د) دکن میں بہاء الدین گرشسپ کے خلاف غالباً اپنی مہم کے دوران فوراً بعد ہی محمد بن تغلق نے جنوب میں ایک مضبوط انتظامی مرکز قایم کرنے کی فوری ضرورت محسوس کی تھی تاکہ اس علاقہ میں پیدا ہونے والے تمام حالات کا موثر اور بھرپور طور پر مقابلہ کیا جا سکے۔ اس کے مشیر کاروں نے اسی مقصد کے لیے اجین[4] کی تجویز پیش کی لیکن اس نے دیوگیری کی حمایت میں فیصلہ کیا۔ دیوگیری کی خوبصورتی اور دنیا کے شہروں میں اس کی عظمت کے دعویٰ کی طرف محمد بن تغلق کی توجہ پہلے ہی شاعر امیر

---

(1) رحلہ، ص94

(2) ایضاً، ص94

(3) فتوح السلاطین، ص446

(4) فرشتہ، جلد1، ص136

خسرو نے اپنی مثنوی صحیفۃ الاوصاف[1] میں مبذول کر دی تھی۔ جب شاعر 721ھ / 1321ء میں اس کے ساتھ (وہاں) گیا تھا۔

سلطان نے اپنے دکن کے منصوبہ پر عمل پیرا ہونے سے پہلے ہی مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح سے غور وخوض کر چکا تھا۔ یہ تجربہ نہ تو ایک طرح کی انتظامی مشق آزمائی تھی اور نہ ہی محض جدت کا ایک مجنونانہ خبط، بلکہ یہ ایک مسئلہ کا سوچا سمجھا حل تھا جس کو دہلی کے سلاطین میں سے ایک ایسے سلطان نے اختیار کیا تھا جسے دکن میں انتظامی کنٹرول اور فوجی کارروائیوں کی دشواریوں کی سب سے زیادہ واقفیت تھی۔ جدید مورخین میں سے پروفیسر محمد حبیب اور گارڈیز براؤن نے سلطان کے اس اقدام کے سلسلہ میں دو اہم نہایت تشریحات پیش کی ہیں۔

پروفیسر حبیب لکھتے ہیں کہ ”محمد بن تغلق اپنے ہم عصروں کے مقابلہ میں دکن سے زیادہ واقف تھا۔ ملک کافور نے اپنی چار کامیاب مہمات کے دوران جنوب کے مالدار ترین مندروں کو تاراج کیا تھا اور بیشتر رایوں کو دہلی کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن علاؤالدین نے دہلی کے لحیم و شحیم اور عقلمند کوتوال علاالملک کے دانشمندانہ مدبرانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے ایک بیگھ زمین کے بھی الحاق سے انکار کر دیا۔ جنوب کے رایوں کو ان تمام جواہرات سے محروم کر دیا گیا جو انہوں نے وکرما جیت کے زمانہ سے ’یکے بعد دیگرے‘ (Star by Star) اکٹھا کیا تھا۔ لیکن ان کی جاگیریں انھیں اس سیاسی مشورے کے ساتھ واپس لوٹا دی گئیں کہ وہ اپنے پڑوسیوں کو لوٹ کر اپنے نقصانات کی تلافی کر لیں۔ مطلق العنان خلجیوں کی یہ عادت نہ تھی کہ وہ اپنی استطاعت سے زیادہ ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔

مبارک شاہ نے اپنی تخت نشینی کے بعد دکن کی پالیسی بالکل بدل دی۔ اس نے نہ صرف دیوگیری کے یادوؤں کو بے دخل کیا بلکہ ان کی مملکت پر اپنی انتظامیہ بھی قایم کر دیا جو چھوٹے چھوٹے افسران کے درمیان تقسیم کر دی گئی جو صدہ امیران (امیران

---

(1) یہ مختصر مثنوی دیوگیری کو مملکت کا دوسرا انتظامی مرکز بنانے کے سلسلہ میں سلطان کے فیصلہ کے 'ماحول کا پس منظر' پیش کرتی ہے۔ یہ مثنوی شاعر کے دیوان نہایت الکمال میں شامل ہے اور راقم السطور نے اس کی علاحدہ تدوین بھی کی ہے۔

صدہ) یا ایک سو کے کمانڈر کہلاتے اور جن سے لگان (مال گزاری) کی وصولی اور عوام کو مطمئن رکھنے کی توقع کی جاتی۔ یہ ایک بے لوچ اور کمزور انتظامیہ تھی۔ گجرا، مالوہ اور راجپوتانہ میں مسلمانوں کی محض ایک مختصر اور منتشر آبادی تھی۔ دیوگیری میں افسران اور ان کے کارندوں کے ماسوا کوئی مسلم آبادی نہ تھی۔ دیوگیری کے جنوب، مشرق اور مغرب میں طاقتور ہندو سردار تھے جو اپنا وقار کھو چکے تھے لیکن طاقت نہیں۔ لیکن ان کی متحد طاقتیں کسی بھی دن (دہلی) سلطنت کی کمزور طاقتوں کو وندھیا پہاڑیوں کے اس پار پراگندہ حالت میں کھدیڑ دے سکتی تھیں۔ اور سلطان علاؤالدین کے حال ہی میں فتح کیے ہوئے گجرات اور مالوہ (کے علاقے) پر دہلی کی گرفت بھی خطرہ میں پڑ سکتی تھی۔ لیکن قسمت کا پانسہ پھینکا جا چکا تھا۔

محمد بن تغلق اس نتیجہ پر پہنچا کہ دیوگیری کی صورت حال اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ وارنگل کی سلطنت کو قایم رہنے دیا جاتا۔ اپنے والد کے دورِ حکومت میں اس نے وارنگل کے خلاف ایک مہم چلائی تھی اور ناکامی کا مزہ چکھا تھا۔ لیکن اس کی دوسری کوشش کامیاب ہوئی اور دیوگیری کی طرح وارنگل کو بھی صدہ امیروں کے سپرد کر دیا گیا۔ تاہم صورت حال جو بھی تھی تشفی بخش نہ تھی۔ غیر ملکی حکومت - شمال کے ذریعہ جنوب پر حکومت - صدہ امیروں کے لیے اتنی ہی ناقابلِ برداشت تھی جتنی کہ (اس) ہندو آبادی کے لیے جن پر ان سے کنٹرول رکھنے کی توقع کی گئی تھی۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ یہ دس سالوں سے زیادہ نہیں چل سکتی تھی۔ (چونکہ) مخالف طاقتیں نہایت زبردست تھیں۔ مزید برآں ہندستان میں اسلام کی کامیابی اس کے مکمل طور پر ملکی ہو جانے پر منحصر تھی۔

معزالدین اور ابتدائی ترکی سلاطین نے دو بڑی تحریکات کی بدولت ہندستان میں کامیابی حاصل کی تھی! مرکزی ایشیا اور فارس پر منگول حملوں نے پناہ گزینوں کی ایک بڑی تعداد کو ہندستان کھدیڑ دیا تھا اور وہاں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ چشتی اور سہروردی صوفی سلسلوں نے اپنے زبردست عسکری نظم و انضباط کے ساتھ ہندستان کے ہر قصبوں اور شہروں میں ایک وسیع مذہبی تبلیغ کا سلسلہ چلایا۔ اور ان کی کوششیں خالص ہندستانیوں کی ایک معقول تعداد کو اسلام کے زمرے

میں لے آئیں۔ باغبانوں، باورچیوں، حجاموں اور دیگر ’جواہیر لترہ‘ جس سے برنی متنفر تھا کی یہ اقلیت فطری طور پر اس سماجی جمہوریت کی خاطر اٹھ کھڑی ہوئی جو ہندستان میں اسلام کا زبردست کارنامہ تھا۔ اور جس نے مملکت دہلی کو وہ قوت بخشی جس کی وہ متقاضی تھی جب تک دکن میں بھی ایسا نہ ہوتا- جب تک کہ (دوسری جگھوں سے) جبراً بھیج کر، یا تبدیلی مذہب کے ذریعہ مسلم آبادی وہاں پیدا نہ ہو جاتی- ہندو ردِ عمل کا پہلا جھونکا ہر چیز کو اڑا لے جاتا۔

محمد بن تغلق جس کی شخصیت میں معزالدین غوری کی محکم گیری کے ساتھ شیخ فریدالدین، جن کے مکتب خیال کا وہ ایک رکن تھا، کی دور اندیشانہ مذہبی رواداری کا امتزاج تھا، نے اس کام کی تکمیل کا مستحکم فیصلہ کیا۔ دہلی کی آبادی موجود تھی جو اس کے زیرِ سایہ بعافیت زندگی گزار رہی تھی۔ یہ جنوبی دارالسلطنت کے لیے ایک بہترین سماجی اور اقتصادی اکائی بن سکتی تھی اور وہ اسے وہاں لے جائے گا۔ لیکن جب تک تبلیغ کا کام بڑے پیمانہ پر شروع نہ کیا جائے اور دکن میں مسلم سماجی اور مذہبی تمدن کے مرکز قایم نہ کیے جائیں اُس کی اسکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا صوفیا(کو بھی تبلیغ اور تعلیم کے مقصد سے منتقل کرانا پڑا۔[1]

کارڈیز براؤن کے مطابق بن تغلق کی تخت نشینی کے ساتھ ہی مملکت کا مرکز ثقل شمال سے مغرب میں منتقل ہو چکا تھا۔ منگولوں کی لوٹ و غارت گری کی بنا پر پنجاب، جو تقریباً ایک صدی تک اس کا شکار رہا، اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔[2] چنانچہ دوسرے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب محمد بن تغلق اپنے دکن تجربہ پر عمل پیرا ہوا تو وہ محض ان مخصوص اقتصادی قوتوں کے زیرِ اثر کام کر رہا تھا جو نہایت سرگرمی سے ملک کی زندگی میں رونما ہو رہی تھیں اور دارالسلطنت کو ایک ایسے علاقہ میں منتقل کرنے کی متقاضی تھیں جو ایک ہندستان گیر حکومت کے ڈھانچہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے معاشی طور پر زیادہ خوشحال ہو۔ اگر تمام ہم عصر اور جدید توضیحات کو پیش نظر رکھا جائے تو

---

(1) علی گڑھ میگزین، جولائی 1930ء-11-1، سیر الاولیاء میں بہت سے ان صوفیاء کا تذکرہ ملتا ہے جو دکن جانے پر مجبور کیے گئے تھے۔

(2) جرنل آف یوپی ہسٹاریکل سوسائٹی، جلد 1 جز دو، ص 13

ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کا تجربہ بنیادی طور پر سیاسی ضرورتوں کے تحت کیا گیا۔ ایک ایسی مملکت میں جہاں معبر اور بنگال جیسے دور دراز علاقوں میں بیک وقت بغاوتیں رونما ہوتی رہتی تھیں، وہاں صورت حال سے نمٹنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا جس کی سلطان نے کوشش کی تھی۔

(2) تعمیل

دکن اسکیم کی تعمیل درجہ بدرجہ اور عوام کی سہولت کا لحاظ کرتے ہوئے کی گئی۔ (الف) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال اس کی حقیقتاً تعمیل سے کم از کم دو سال پیشتر ہی پیدا ہوا تھا۔ یحییٰ سرہندی 727ھ / 1326-27ء کے حالات کے سلسلہ میں رقم طراز ہے! ہر دو میلوں (کروہوں) کے فاصلہ پر دہلی سے لے کر دولت آباد تک کی سڑک کے کنارے کنارے سلطان نے اقامت گاہیں تعمیر کرائیں اور پورے غیر آباد علاقہ کو ایک مسکن میں تبدیل کر دیا۔ ان خطوں میں لوگوں کو رہنے کے لیے اس نے زمینیں دیں، اور ان زمینوں کی آمدنی کا حساب ان تنخواہوں کی مد میں کیا گیا۔ اس نے سڑک کے دونوں کناروں پر درخت بھی لگوائے۔[1] (ب) سب سے پہلے سلطان کی ماں مخدومہ جہاں اور امرا، ملک، غلام، گھوڑے، ہاتھی اور خزانوں کے ساتھ پورا شاہی کنبہ دیوگیری منتقل ہوا۔ اس کے علاوہ سلطان نے تمام صوفیوں، مشائخ (صوفیاء) علماء اور دہلی کے ممتاز اشخاص کو بلا بھیجا۔[2] (ج) عصامی کے مطابق ان اشخاص کے جنہیں دولت آباد ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا، چھ کارواں بنائے گئے۔[3] یحییٰ سرہندی کے مطابق 729ھ / 1328-29ء میں خروج کا حکم جاری کیا گیا۔ (د) سلطان نے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے دہلی کے لوگوں کے گھروں اور مکانوں کو خرید لیا اور اس کی قیمت چکا دی۔[5] (ر) مہاجرین کے لیے سفر اور سواریوں کی سہولتیں مہیا کی گئیں (ز) خود دولت آباد میں نئے آنے والوں کو مفت مکانات اور قیام گاہوں کا انتظام کیا گیا۔ برنی لکھتا ہے کہ "سلطان نے عوام کو دولت آباد کے لیے روانگی اور وہاں پہنچنے کے موقعوں پر کثیر

---

(1) تاریخ مبارک شاہی، ص 98

(2) ایضاً، ص 98

(3) فتوح السلاطین، ص 449

انعامات سے نوازا۔[6] (س) سلطان نے دولت آباد شہر کی تیاری پر کافی غور و خوض کیا تھا اور توجہ صرف کی تھی۔ شیخ مبارک نے شہاب الدین العمری کے سامنے اس شہر کا جو بیان پیش کیا تھا اس کا ایک اقتباس اس سلسلہ میں مناسب ہو گا۔

”اور دہلی کا شہر ملک کا دار السلطنت ہے۔ اس کے بعد قبۃ الاسلام (آتا) ہے اور یہ دیوگیری کا شہر ہے جسے سلطان نے از سر نو تعمیر کرایا اور اسے قبۃ الاسلام کا نام دیا...... چھ سال پہلے جب میں نے اسے چھوڑا تھا اس وقت وہ اپنی تکمیل کو نہ پہنچا تھا۔ شہر کے وسیع و عریض حدود اور اس کی عظیم الشان عمارتوں کی بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ وہ اب بھی مکمل ہے۔ سلطان نے اسے اس طرح منقسم کر دیا تھا کہ ہر طبقہ کے لوگوں کے لیے علاحدہ علاحدہ قیام گاہیں تعمیر کی جائیں۔ ایک محلہ فوجوں کے لیے، ایک وزراء کے لیے، ایک سکریٹریوں کے لیے، ایک ججوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے، ایک شیوخ و فقراء کے لیے اور ایک تاجرین و صنعت کاروں کے لیے۔ ہر محلہ میں ہر طبقہ کی ضروریات کے مطابق، مسجدیں، بازار، عوامی غسلخانے، روٹی (پکانے) کے تنور تھے تاکہ اس محلے کے عوام اشیاء کی خرید و فروخت اور مبادلہ کے سلسلہ میں دیگر محلوں پر انحصار نہ کریں اور ہر محلہ ایک علاحدہ خود کفیل شہر کی مانند تھا جو کسی بات کے لیے دوسروں پر منحصر نہ تھا۔[4]

3-(یہ) ایک عوامی خروج نہیں (تھا)

ہم عصر مورخین کے ذریعہ پیش کردہ ایک عوامی خروج تاثر صحیح نہیں۔ در حقیقت امراء علماء، شیوخ اور شہر کے ممتاز اشخاص پر مشتمل اونچے طبقے کو ہی دولت آباد منتقل کر دیا گیا۔ ہندو عوام اس منصوبہ سے متاثر نہ ہوئے۔ دو سنسکرت کتبے۔ مورخہ 1327ء اور 1328ء- یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دہلی کے ہندوؤں نے اس پورے

---

(4) تاریخ مبارک شاہی، ص 102

(5) رحلہ، ص 94، تاریخ مبارک شاہی، ص 102، عصامی لکھتا ہے کہ بادشاہ نے اعلان کیا تھا کہ جو شاہی احکامات کی پیروی کرے گا اسے بہت سا سونا دیا جائے گا۔

(6) فیروز شاہی، ص 474

(7) مسالک الابصار، اوٹو اسپائس (otto spies) کا انگریزی ترجمہ ص ص 19-18

عہد میں بااطمینان تمام زندگی گزاری۔ برنی کا بیان اس بات کو قطعی واضح کر دیتا ہے کہ یہ اقدام اونچے طبقوں کے لیے ایک مصیبت ثابت ہوا تھا۔ برنی اور عصامی دونوں ہی نے دولت آباد کی جانب شہر کے چیدہ چیدہ اشخاص کی اس محدود (نوعیت کے) خروج کو مبالغہ آمیز طور پر ایک عوامی خروج کی شکل دے دی ہے۔ دہلی کے ممتاز اشخاص کا طبقہ جنوب کے ایک دارالسلطنت کے لیے ایک عمدہ سماجی اور اقتصادی اکائی کی حیثیت سے کام آسکتا تھا اور سلطان نے تبدیلی وطن کے لیے اور ایک نئے علاقے اور نئے ماحول میں بود و باش اختیار کرنے کے لیے صرف اسی طبقہ پر دباؤ ڈالا۔

4- عوام کا ردِ عمل

ایک بالجبر خروج سے لازمی طور پر سخت ردِ عمل رونما ہوگا۔ سلطان کے دکن منصوبہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ گزشتہ تقریباً ایک سو ساٹھ سالوں تک دہلی، سلطنت کا دارالسلطنت رہی تھی۔ اور ایک مخصوص انداز پر اس کی شہری اور تمدنی زندگی فروغ پائی تھی۔ اس کے بازار، خانقاہیں، مدارس، تالاب، باغات، منارے عمارتیں، مقابر ان لوگوں کی نظروں میں ایک مخصوص خوبصورتی و دلکشی رکھتے تھے، جنہوں نے ان کے درمیان پرورش پائی تھی۔ کیقباد کے عہد میں بھی- جبکہ "حضرت دہلی" کے قیام کو مشکل ہی سے ایک صدی گزرتی تھی۔ امیر خسرو جیسے شاعر بھی اودھ میں وطن کی یاد میں تڑپ اٹھا اور اس نے ہندستان کے تمدنی مرکز کو واپس جانے کی شدید آرزو کی۔[1] دہلی کی مکمل جدائی متاثر لوگوں کے لیے کسی طرح بھی ایک روحانی اذیت سے کم نہ تھی۔ اسکے علاوہ گزشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران دہلی صوفیاء کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا دہلی میں ہزاروں خانقاہیں، شفاخانے اور زاویے (مذہبی گھر) تھے اور عوام کی زبردست بھیڑ وہاں جمع ہوا کرتی تھی۔[2] محمد بن تغلق کے منصوبے نے دہلی کے خانقاہی زندگی کو سخت متاثر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سید محمد گیسو دراز نے بیان کیا تھا کہ محمد بن تغلق کے ذریعہ لائی گئی تباہی کے باعث شیخ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ نظام

---

(1) تفصیلی بحث کے لیے مہدی حسن کی "تغلق خاندان" ملاحظہ ہو، ص 145 الخ

(2) کیٹلوگ آف دی دہلی میوزیم آرکیولوجی، 29، تغلق خاندان ص 146

الدین اولیاء اور چند دیگر حضرات کے مقبروں کے ماسوا دہلی کے کسی دوسرے مقبرہ پر ایک موم بتی بھی باقی نہ بچی تھی۔ دہلی کے تہذیبی مراکز کا یہ عام زوال ہی دہلی کی بربادی کی ان نہایت مبالغہ آمیز بیانات کی ذمہ داری ہے جنھیں تاریخ فیروز شاہی اور فتوح السلاطین میں ہم پاتے ہیں۔ برنی کی نظر میں دہلی (کی اہمیت) دراصل اپنے امرا کی قیام گاہوں اور اپنے صوفیاء کی خانقاہوں میں تھی۔ جب یہ ختم ہو گئیں تو پوری دہلی اس کے لیے ویران ہو گئی۔ عصامی کے نہایت معمر جد امجد کا دولت آباد جاتے ہوئے بمقام تلپت انتقال ہو گیا تھا لہٰذا سلطان اور اس کے منصوبے کے خلاف اس کی کدورت قابل فہم ہے۔ ابن بطوطہ محض افواہوں کی بنیاد پر دہلی کی ویرانی کا ذکر کرتا ہے لیکن خروج کے صرف چار یا پانچ سالوں بعد، 734ھ میں اپنی آمد پر جب وہ دہلی کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس کی شان و شوکت خوشحالی اور آبادی کی اسی طرح باتیں کرتا ہے گویا اس کے اوپر کوئی مصیبت آئی ہی نہ تھی۔

محمد بن تغلق کے مطالبہ (خروج) پر صوفی ردِ عمل میں کچھ نظریاتی پیچیدگیاں بھی شامل تھیں۔ ولایت (کسی مخصوص علاقہ پر روحانی حکمراں) کے تصور کو صوفیا اپنی تنظیم کا بنیادی جز مانتے تھے۔ ان کے دائرہ عمل کا تعین ان کے روحانی آقا کیا کرتے تھے۔ جو انہیں عوام کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کے کام کو جاری رکھنے اور تقدیر کے گرم و سرد تھپیڑوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ولایات، عطا کرتے تھے۔ جب سلطان نے انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا چاہا تو انھوں نے اسے اپنی خانقاہی زندگی میں

---

(1) امیر خسرو کے منظوم خطوط ملاحظہ ہوں جو انہوں نے اودھ سے اپنے دوست تاج الدین زاہد کو لکھے ہیں اور غرۃ الکمال میں مذکور ہیں۔

(2) صبح الاعشا کے مصنف نے دو ہزار رباط (سرائے) اور خانقاہوں کا حوالہ دیا ہے این عرب اکاؤنٹ آف انڈیا ان وی 14 سنچوری، ص 29

نوٹ غیاث پور میں نظام الدین اولیاء کی خانقاہ کے متعلق برنی کا بیان ملاحظہ ہو، فیروز شاہی ص 44-341 جوامع الکلیم ص 143

اس تصور کے تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو نظامی کی، ریلجن اینڈ پولٹیکس ان انڈیا ڈیورنگ 13 سینچوری، ص 76-175

ایک مخدوش دخل اندازی خیال کیا۔ انہوں نے سلطان کے احکامات کی پیروی میں تامل کیا لہٰذا سلطان نے اس تامل کو بغاوت سے تعبیر کیا۔ اور ریاست و مذہب کی جڑواں حیثیت کے ایک جوابی نظریہ سے مسلح ہو کر اس نے انہیں جنوب بعید کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ بہت سے لوگوں کے لیے محمد بن تغلق جیسے سلطان کو چیلنج کرنا مشکل تھا لیکن شیخ نصیر الدین چراغ اپنے سلسلہ کی روایات پر سختی سے ڈٹے رہے اور سلطان کے ذریعہ دی گئی تمام سزاؤں اور اذیتوں کو نہایت صبر و استقامت سے برداشت کرتے رہے۔[1]

عہد وسطیٰ کی ایک شہنشاہی حکومت کے تمام زبردست اختیارات کو استعمال میں لا کر صوفیاء کو دہلی سے دولت آباد زبردستی بھیجنا سلطان کے لیے آسان تھا لیکن عوامی مقبولیت میں کمی کی صورت میں رونما ہونے والے اثرات سے بچنا آسان نہ تھا۔ شاید کسی اقدام نے سلطان کو اتنا غیر مقبول نہ بنایا جتنا کہ صوفیاء کی دولت آباد کو بالجبر ہجرت نے۔

محمد بن تغلق سراپا ایک مطلق العنان تھا۔ وہ اپنے احکامات کی خلاف ورزی کو برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہ تھا۔ وہ اس وقت تقریباً پاگل ہو جاتا جب وہ کسی کو اپنی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاتا۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ سلطان ایک رات اپنے محل کی چھت پر گیا اور چاروں اطراف کا معائنہ کیا جب تاحدِ نگاہ اسے نہ کوئی چراغ نظر آیا اور نہ دھواں یا روشنی ہی تو اس نے اظہارِ خیال کیا کہ اب میرا دل خوش ہے اور میری روح کو سکون و اطمینان ہے۔[2] گویا وہ ایک نیرو تھا جو اس وقت اپنا نقارہ بجا رہا تھا جبکہ روم جل کر خاک ہو رہا تھا۔

ممکن ہے کہ برنی، ابن بطوطہ اور عصامی کے ذریعہ پیش کردہ خلاف ورزی کرنے والے لوگوں کی سرزنشوں کی تفصیلات نہایت مبالغہ آمیز ہو لیکن انہیں بے بنیاد مان کر بالکل رد کر دینا مناسب نہ ہوگا۔ یہ سلطان کے خلاف عام منافرت کی عکاسی کرتی ہیں اور خود سلطان کی عام پالیسی کے مطابق ہیں۔ عصامی لکھتا ہے کہ صوفیا اور ان

---

(1) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو خیر المجالس، دیباچہ، ص 58-49

(2) رحلہ، ص 94

تمام دیگر اشخاص کو جو سلطان کے حکم پر دولت آباد روانہ نہ ہوئے تھے، گھروں سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا۔ پولیس نے ان کے بال پکڑ کر انہیں گھسیٹا اور انہیں سخت ترین سزائیں دیں۔[1] جب عصامی یہ لکھتا ہے کہ وہ لوگ ان اشخاص کی طرح زور زور سے گریہ وزاری کرتے ہوئے چل رہے تھے جو زندہ دفن کیے جانے کے لیے لے جائے جا رہے ہوں"[2] تو وہ اس ماحول کا ایک اندازہ پیش کرتا ہے جس میں وہ اہل کارواں دولت آباد کی جانب سفر کر رہے تھے۔

عصامی کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خروج سخت گرمیوں کے مہینوں میں پیش آیا اور اس سے عوام کی کلفت و پریشانی مزید بڑھ گئی۔ عصامی لکھتا ہے کہ "لوگوں کو ایسی مٹی پر چلنا پڑا جسے جلتے ہوئے سورج نے لوہے کی طرح گرم کر دیا تھا"[3] عصامی کی شاعرانہ مبالغہ آمیزی کی رعائت کرتے ہوئے اس بات کا مشکل ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ دہلی سے دولت آباد کا سفر ایک طویل اذیت کا باعث بنا ہو گا۔ اگرچہ ریاست کی جانب سے ہر طرح کی سہولتیں مہیا کی گئیں تھیں، عہد وسطیٰ میں ذرائع مواصلات اور سواریوں کی مجبوریوں کے پیش نظر یہ بات ناگزیر تھی- موسم کی تندھی، وطن کی گزشتہ یادگاریں کارواں میں عورتوں، بچوں اور اور بوڑھوں کی موجودگی، جنوب میں زندگی کی غیر یقینی صورت حال اور سلطان کے ناقابل تصور غیظ و غضب کا دھڑکا- ان تمام باتوں سے مل کر سفر ایک نہایت شدید آزمائش بن گیا تھا۔ تاہم عصامی، جو سلطان محمد اور اس کی خروج (کی پالیسی) کا ایک شدید نکتہ چیں تھا اور جس نے پہلے بہمنی سلطان کے زمانہ میں اپنی کتاب لکھی تھی، اس صورت حال کا خلاصہ دو لائنوں میں بیان کرتا ہے "دہلی کے عوام کی آبادی کا ایک دسواں حصہ جو (اپنی منزل مقصود تک) پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس خطہ کی عظمت و شوکت کا باعث بنا ایسے گروہ جو دہلی میں مفلس و پریشان حال تھے۔ ان کے لیے اس سرزمین میں عمدہ انتظامات کیے گیے تھے"۔[1]

---

(1) فتوح السلاطین، ص 447

(2) ایضاً، ص 447

(3) ایضاً، ص 449

5-دارالسلطنت یا دوسرا انتظامی شہر (مرکز)

سلطان کے دکن تجربہ کے بارے میں یہ عام تاثر کہ اس نے دارالسلطنت کو دولت آباد منتقل کر دیا تھا، درست نہیں۔ درحقیقت اس نے دولت آباد کو مملکت کا دوسرا انتظامی شہر بنایا تھا۔ القلقشندی کے ذریعہ اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ جو یہ لکھتا ہے کہ مملکت دہلی کے دو دارالسلطنت تھے! دہلی اور دیوگیری یا قبۃ الاسلام۔[2] یہ بات قابل غور ہے کہ ایک سکہ میں جو 730ھ میں ڈھالا گیا تھا دہلی کو تخت گاہ دہلی[3] لکھا گیا ہے اور 733ھ کا ایک دوسرا سکہ دولت آباد کا تخت گاہ دولت آباد[4] کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔

دیوگیری (دیوگیر) "دیوتاؤں کی پہاڑی" کی گذشتہ تاریخی اہمیت کے بارے میں ایک اور بات کا اضافہ کر لیا جائے کہ یہ یادوں کا دارالسلطنت تھا، سلطان قطب الدین مبارک خلجی نے اسے قطب آباد5 کا نام دیا اور وہاں ایک دارالضرب قایم کیا[6]۔ قبۃ الاسلام[7] کا لفظ 727ھ / 27-1327ء کا واقعہ ہے کہ اس جگہ کا نام دولت آباد رکھا گیا۔[8] لہٰذا یہ دیوگیری نہ تھا جسے دولت آباد کا نیا نام دیا گیا بلکہ یہ قطب آباد تھا جسے ایک نیا نام ملا۔

---

(1) ایضاً، ص458

(2) ابن عرب اکاؤنٹ آف انڈیا اِن دی 14 سنچری، 30 مسالک الابصار بھی ملاحظہ ہو، (انگریزی ترجمہ) ص18

(3) انڈین میوزم کیٹلوگ، جلد 2، ص59، تخت گاہ کا مطلب دارالسلطنت ہے۔

(4) ایضاً، ص60، سکہ نمبر 385

(5) مثنوی صحیفۃ الاوصاف (مخلوط) نیلس رائٹ بھی 'دی کوائج اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطانس آف دہلی، ص109

(6) تین سونے کے سکوں کا جو 718، 719 اور 720 ہجری میں یہاں ڈھالے گئے تھے انکشاف ہوا ہے کہ ونیکلس آف دی پٹھان کنگس آف دہلی، 80-179 ایڈورڈ تھومس کے اس خیال کی کہ یہ سکے دہلی کے ہیں، ایچ، آر، ینول، (219)(JASB, NS, 35 art) اور نیلس رائٹ (دی کوائج ص109) نے تردید کی ہے۔

(7) نیلس رائٹ، ص119، نمونہ نمبر 484

دکن کے اس تجربہ کے اثرات کا جائزہ دو زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ فوری اور مابعد اس کا فوری اثر سلطان کے خلاف عام آزردہ خاطری تھی جس کی پاداش میں اس نے اپنے عوام کا اعتماد قطعی طور پر کھو دیا اور اپنے مصائب کی بناء پر اس کے خلاف عوام کے دلوں میں غم و غصہ کی خلش کئی دہائیوں تک باقی رہی۔ اپنے متاخرہ نتائج میں محمد بن تغلق کا دکن تجربہ ایک نمایاں کامیابی تھی وہ دیوار جنھوں نے شمال سے جنوب کو جدا کر رکھا تھا ڈھا دی گئیں اور گرچہ دہلی کے انتظامی اختیارات کی دکن تک توسیع کامیاب ثابت نہ ہوئی لیکن تہذیبی و تمدنی اداروں کی توسیع حقیقتاً کامیاب رہی۔ سلطان کے حکم کے تحت جبری خروج کے اثرات کا حوالہ دیتے ہوئے برنی لکھتا ہے کہ "دولت آباد کے چاروں اطراف میں مسلمانوں کے قبرستان نظر آتے تھے" لیکن ان قبرستانوں کے شمال کے لوگوں کے دلوں کو جنوب کی مٹی سے جوڑ دیا۔ بہمنی سلطنت کا عروج آبادی کی اس منتقلی کی بنا پر ممکن ہو سکا۔

عصامی ہمیں بتاتا ہے کہ جب دہلی کے عوام دولت آباد کے لیے روانہ ہو گئے تو سلطان دیہاتوں سے ‘دہقانوں‘ (استائیوں)[9] کو پکڑ لیا اور انہیں دہلی میں بسا دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس بات کے کہنے کا ایک شاعرانہ انداز ہے کہ اس کے حقیقی باشندوں کی منتقلی کے باعث پیدا شدہ خلاء کو جن لوگوں نے بھرا وہ تمام کے تمام ان کے مقابلہ میں غیر مہذب دہقانوں کے مانند تھے۔ برنی واضح طور پر لکھتا ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں کے ممتاز اشخاص کو دہلی مدعو کیا گیا اور وہاں بسا دیا گیا۔[10] یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ جب ابن بطوطہ 1334ء میں دہلی پہنچا تو اس نے دہلی کو محققین، ادباء اور صوفیاء سے پُر پایا۔ اور کوچ کے کوئی مابعد اثرات اسے نظر نہ آئے۔ اس حقیقت کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ ذہن نشین رکھا جائے کہ 1335-1337ء میں سلطان نے لوگوں کو دہلی واپس جانے کی اجازت دے دی۔[11]

---

(8) ایضاً، ص157

(9) فیروز شاہی، ص343

(10) فتوح السلاطین، ص450

(11) تاریخ فیروز شاہی ص474

علامتی سکے

دکن تجربہ کے بعد سلطان کے علامتی سکوں کا نمبر آتا ہے۔ اس اقدام کا مختصراً بیان مندرجہ ذیل ہے: اس زمانہ میں چاندی کے ایک سکہ کو "ٹنکہ" کہا جاتا تھا اور ایک تانبے کے سکہ کو جتل کہا جاتا تھا۔ سلطان نے چاندی کے سکے کی جگہ پر کانسے (Bronze) کا ایک سکہ جاری کیا اور چاندی کے ٹنکہ کے مساوی اسے ایک علامتی سکہ کی حیثیت سے قبول کیے جانے کا مطالبہ کیا۔[1] دوسرے الفاظ میں -اب ایک جتل ہی کو ٹنکہ (کے مساوی) مانا جاتا تھا۔

علامتی سکے عام سکوں سے مندرجہ ذیل اعتبارات سے مختلف تھے (الف) برنی کے مطابق علامتی سکوں کے لیے تانبا (مس) استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن فرشتہ کہتا ہے کہ یہ پیتل یا کانسے (برنج) کا ہوتا تھا سکوں سے دستیاب شہادت اس کے بیان کی تائید کرتی ہے۔[2] (ب) جبکہ دوسرے سکوں پر صرف عربی عبارت کندہ ہوتی علامتی سکوں پر فارسی میں بھی عبارت ہوتی (ج) عہد وسطیٰ کے ادنیٰ دھاتوں کے بیشتر سکوں کی تحریریں پڑھنا مشکل ہے لیکن علامتی سکوں کی تحریروں کو صاف اور واضح بنانے کی خاص طور پر کوشش کی گئی (د) فارسی کا کتبہ یوں تھا! مہر ٹنکہ رائج در روزگار بندہ امیدوار محمد تغلق خدا کی عنایت کے امیدوار محمد (بن) تغلق کی حکومت میں رائج مضروبہ ٹنکہ) اس کتبہ میں رائج (Current) کا لفظ اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ سکہ کی قیمت سلطان پر اعتماد کی بنیاد پر تھی نہ کہ اس کے دھات کی قیمت پر۔ (ر) علامتی سکوں پر

---

(1) ایضاً، ص 481، لیکن مورلینڈ برنی کے الفاظ کی غلط تعبیر نکالتا ہے جب وہ اس اجازت کو دہلی کی بحیثیت دارالسلطنت از سر نو بحالی کی حیثیت دیتا ہے (اگیریرین سسٹم، ص 49)

(2) ایڈورڈ تھومس لکھتا ہے کہ "کسی بھی موقعہ پر یہ علامتی سکے قیمتی رائج الوقت سونے کے سکوں کے عوض جاری نہیں کیے گیے۔ سب سے بڑا سکہ جس پر شاہی مہر کی بدولت اعتماد کیے جانے کا مطالبہ اس نے کیا وہ 140 رتی چاندی کے وزن کا ایک ٹنکہ تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی ذیلی تقسیموں کا بڑی محنت سے تفصیلی طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ کرونیکلس آف دی پٹھان کنگس آف دہلی، ص 245

(4) ایضاً، ص 244، 249

مندرجہ ذیل عربی عبارت بھی کندہ ہوتی؛ وہ جو سلطان کی اطاعت کرتا ہے، خدا کی اطاعت کرتا ہے، خدا کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تمہارے درمیان اختیارات کے حامل ہیں" یہ عوام کے مذہبی جذبات سے ایک اپیل تھی تاکہ وہ علامتی سکوں کا احترام کریں۔

علامتی سکے کے اصول، خواہ وہ کاغذی ہوں یا معمولی دھاتوں کے ہوں جدید دنیا میں اتنے معروف ہیں کہ ان کی تفصیلی بحث کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ان میں سے بعض کی پیش بینی محمد بن تغلق نے یقیناً کی ہوگی۔ اس کی کامیابی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ عوام کے ذریعہ ٹیکسوں اور دیگر ادائیگیوں کے سلسلہ میں علامتی سکے کو حکومت کے ذریعہ قبول کیا جائے۔ جب تک ایسا نہ ہوگا علامتی سکے کی قطعاً کوئی قیمت نہ ہوگی دوم یہ کہ علامتی سکے ایسے طریقوں سے تیار کیے جائیں جن کے راز سے تنہا حکومت ہی واقف ہو۔ سوم یہ کہ ایسے غیر مجاز اشخاص کو جو علامتی سکے تیار کریں یا اس (بات کا) ذکر کریں شدید ترین سزائیں دی جائیں اور اس مقصد کے لیے ایک وسیع پولیس تنظیم کی ضرورت ہوگی۔ اگر یہ ضروری اقدامات کیے جائیں تو علامتی سکے کی کامیابی کا مطلب یہ ہوگا کہ سکوں کی حیثیت سے گردش میں رہنے والی چاندی کا بڑا حصہ ایک غیر متعینہ مدت تک کے لیے بغیر سود قرض کی شکل میں ریاست کے ہاتھوں میں آجائے گا۔ لیکن چونکہ علامتی سکوں کی غیر ممالک میں کوئی قیمت نہ ہوگی لہٰذا کچھ چاندی کے سکوں کی ان تاجروں کو ضرورت پڑے گی جو غیر ممالک سے تجارت کے سامان ملک میں لایا کرتے ہیں۔ اگر ریاست یہ ضمانت دے سکتی ہے کہ مطالبہ پر ایک علامتی سکے کے بدلے ایک چاندی کا سکہ دے دیا جائے گا تو علامتی سکے کی ایک مستقل قدر و قیمت کی یقین دہانی مہیا ہو جائے گی۔ اس کے برعکس، اگر ریاست اور جعلی سکے ڈھالنے والے یا دونوں ہی ایک خاص حد سے زیادہ علامتی سکے ڈھالتے رہیں تو اس کی قدر و قیمت اس کی مقدار میں اضافہ کے تناسب سے گر جائے گی۔

علامتی سکے کا یہ تجربہ ایشیا کے لیے نیا نہ تھا۔ چین کے قوبیلائی خاں (1260-94) اور ایران کے کی خاتو خاں (1293ء) کی سرکردگی میں علامتی سکے کے

اجرا کی کوششیں کی گئیں تھیں۔ ایرانی تجربے ناکام ثابت ہوا تھا لیکن چینی تجربہ کامیاب رہا تھا۔ چاؤ (قوبیلائی خاں کا کاغذی سکہ) کامیاب ہوا تھا کیونکہ (الف) خان نے عوام کے لیے، اگر وہ چاہیں، سونا یا چاندی کے استعمال کی صورت مہیا کر دی تھی (ب) ریاست کے کاغذ اور روشنائیوں کی صنعت کی نقل نہیں کی جا سکتی تھی۔

سلطان نے آخر علامتی سکے کے اجرا کے متعلق کیوں سوچا؟ برنی لکھتا ہے کہ سلطان کے غیر ممالک کو فتح کرنے کے منصوبوں اور اسکی بے انتہا سخاوت و فیاضی نے خزانہ کو خالی کر دیا تھا۔[1] اور دیوالیہ پن کے اس بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ایک تدبیر تھی۔ یہ بات محض جزوی طور پر صحیح ہے۔ اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ تجربہ کا تعلق اس معاشی بوجھ سے تھا جو اس کی مجوزہ خراسان مہم اور اس کے بعد کے قراچل (مہم کے) حادثہ نے اس کے ذرائع پر ڈالے تھے۔ لیکن اس وقت بھی وہ دیوالیہ نہ تھا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب یہ تجربہ ناکام ہو گیا تو اس نے فوراً ہی خود اپنے دار الفریب سے ڈھلے ادنیٰ دھاتوں کے علامتی سکوں کو سونے اور چاندی (کے سکوں) سے بدل لیا تو پھر کیا یہ جدت کا ایک خبط تھا جس نے اسے اس کے اجراء پر آمادہ کیا؟ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سلطان محمد بنیادی مسائل کے معارضی حلوں سے کبھی مطمئن نہ ہوتا تھا جب کبھی کوئی مشکل یا مسئلہ اسکے علم میں آتا تو وہ (اس کا) کوئی بنیادی حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ شاید نہ صرف ہندستان بلکہ پوری دنیا میں چاندی کی کمی ہی اس تجربہ کی وجہ رہی ہو۔ اس عہد میں سونے اور چاندی کی اضافی قدر و قیمت کو تین مستند ماہرین نے مندرجہ ذیل طور پر بیان کیا ہے۔

ایڈورڈ تھومس	8:1
کرنل یول	7:1
نیلس رائٹ اور نیول	10:1

یہی وجہ ہے کہ ہم اس عہد میں چاندی کے ٹنکہ کے وزن میں ایک تدریجی کمی اور سونے کے سکہ کے وزن میں ایک تطابقی اضافہ پاتے ہیں۔ چاندی کی کمی کے سلسلہ میں نیلس رائٹ کا خیال ہے کہ "بنگال کے ماسوا ہندستان میں چاندی کی رسد کے ذرائع

---

(۱) فیروز شاہی، ص:475

ناکافی تھے۔ جنوبی ہندستان کی دولت کافی کم ہو چکی تھی یا کم از کم سلاطین دہلی کو (اب) دستیاب نہ تھی۔ لہٰذا مخلوط دھات (Billan) جسے محمد نے سب سے پہلے اونچی قیمت کے سکوں کے لیے استعمال کیا تھا، کو اور بڑے پیمانہ پر زیادہ کھوٹی صورت میں استعمال کیا جانا تقریباً ناگزیر بن گیا۔[1] محمد بن تغلق کے عہد میں چاندی کی کمی کا مسئلہ وسیع و عریض مملکت میں نئے نئے دارالاضراب کے قیام، اور عسکری مہمات نیز دکن تجربہ پر ہونے والے غیر معمولی اخراجات کی بنا پر اور زیادہ سنگین ہو گیا۔

علامتی سکوں کا اثر مختلف حلقوں میں اور مختلف اندازوں میں محسوس کیا گیا۔

(الف) لوگوں نے علامتی سکوں کو ڈھالنا شروع کر دیا اور (ضیاءالدین برنی کے الفاظ میں) ہر ہندو[2] کا گھر دارالضرب بن گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ ایڈورڈ تھومس اس کی مندرجہ ذیل وجہوں کا انکشاف کرتا ہے! "آنحضور کے دارالضرب کے افسران بالکل انہیں اوزاروں سے کام کرتے تھے جن سے عام کاریگر۔ اور ایسی ہی دھوتوں پر جو گویا عام طور پر دستیاب تھیں۔ شاہی دارالضرب ڈھلے ہوئے اور ایک اوسط درجہ متعدد ہنر مند کاریگری کی دستکاری (سے بنے ہوئے سکوں) کے فرق کو واضح کرنے کے لیے کوئی مخصوص قسم کی مشین نہ تھی۔ ان احتیاطی تدابیر کے برخلاف جو چینی کاغذی نوٹ کی نقل سازی کو روکنے کے لیے اختیار کی گئی تھی، علامتی تانبے (کے سکوں) کی اصلیت جانچنے کے لیے قطعاً کوئی جانچ پڑتال نہ (کی جاتی) تھی اور عام لوگوں کی زیادہ سے زیادہ (جعلی) سکوں کے بنانے کی صلاحیت پر کوئی روک تھام نہ تھی۔"

لیکن پروفیسر محمد حبیب ایک مختلف اور زیادہ مدلل وضاحت پیش کرتے ہیں جب وہ لکھتے ہیں کہ: سکوں (کے بنانے) کے لیے دارالضرب میں ایک خاص قسم کا

---

(1) نیلس رائٹ، دی کوائج اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطانس آف دہلی، ص:160

(2) اس بات کی جانب توجہ مبذول کی جاسکتی ہے کہ اس ضمن میں لفظ ہندو سے برنی نے سناروں کو مراد لیا ہے چونکہ زیادہ تر سنار ہندو تھے لہٰذا وہ ان کے لیے ہندو کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یہ برنی کا ایک پسندیدہ طریقہ تھا کہ جہاں ایک "مخصوص" اصطلاح کی ضرورت ہوتی وہاں ایک "عام" اصطلاح کا استعمال کرتا۔ اس کا خلجیوں کے عروج کے ضمن میں البرینوں کے لیے لفظ 'ترک' کا استعمال کرنا اور اس جگہ پر اور علاؤ الدین خلجی کے ضوابط کے سلسلہ میں خوطوں، مقدموں اور چودھریوں کے لیے لفظ 'ہندو' کا استعمال کرنا اس طریقہ کی مثالیں ہیں جو کافی پیچیدگیوں کا سبب بن گیا ہے۔

مرکب کانسہ ہوتا تھا جسے کسوٹی پر بآسانی پرکھ لیا جا سکتا تھا لیکن کانسے کے (علامتی) سکوں میں دھاتوں کے تناسب کے راز کو سنار دریافت نہ کر پائے تھے۔ اس زمانہ میں جب لوگ سونے اور چاندی کے سکوں کو لیتے تھے تب وہ ان سکوں کو وزن کر لیا کرتے تھے (تراش و خراش کی گنجائش نکالنے کے لیے) اور کسوٹی پر دھاتوں کے خالص ہونے کی بھی جانچ کرا لیتے تھے۔ سلطان نے عوام سے اپنے علامتی سکوں کے سلسلہ میں بھی اسی عمل کی تقلید کی توقع کی۔ لیکن اس معاملہ میں عوام اس کی توقع کے مطابق پورے نہ اترے۔ لہٰذا بہت سے جعلی سکے خزانے کے سکوں سے مل گئے اور چونکہ جعلی سکے رائج ہو گئے اور حکومت ان کی روک تھام نہ کر سکی لہٰذا زیادہ سے زیادہ جعلی سکے ڈھالے گئے۔ ایک کانسے کا سکہ کم از کم اپنے کانسے کے وزن کے بقدر ہوتا۔ یعنی کانسے کے تقریباً پچاس سکے معمولی طور پر ایک چاندی کے ٹنکہ کے برابر ہوتے۔ لیکن کانسے کے جعلی سکے بنانا خلافِ قانون تھا لہٰذا کانسے کا ایک جعلی سکہ کسی بھی بدنصیبی کا شکار ہو سکتا تھا کیونکہ ایک نیا عنصر سزا کا خوف بھی اس کی قدر و قیمت کے تعین کے معاملہ میں شامل ہو گیا تھا۔ دور افتادہ صوبوں میں چاندی کے ٹنکوں کے مقابلے میں سرکاری شرح کے نصف پر یہ چلنے لگا۔ دارالسلطنت میں لوگ جعلی سکوں کو اپنے پاس پائے جانے کے امکان سے خوف زدہ رہتے تھے۔ وہ انہیں پھینک دیتے یا بعد میں انہیں پگھلا کر کانسے کے برتن بنا لینے کے لیے رکھ لیتے۔ سارا معاملہ حکومت کے کنٹرول سے باہر ہو گیا۔ بہت سارے جعلی سکے رائج ہو گئے اور تجربہ کی ناکامی نے بازار میں ایک تباہی مچا دی۔ حقیقت میں کانسے کے جعلی سکے رکھنے والوں کی سرزنش کرنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ وہ بے گناہ تھے۔ در حقیقت تعجب کی بات یہ ہے کہ کسی شخص کو بھی سزا دی گئی۔ یہ بات بالکل ابتدا ہی سے طے تھی کہ ریاستی خزانہ ہر کانسے کے سکے کو واپس لے گا جسے اس نے جاری کیا تھا۔ اب سلطان نے ایسا کرنے کا حکم دیا۔ لوگ ریاستی خزانہ میں کانسے کے ان سکوں کو لے آئے جو ان کے پاس تھے۔ (ریاستی) خزانے نے خزانے کی لاج رکھنے کے لیے ان تمام کانسے کے سکوں کو واپس لے لیا جو ریاستی خزانہ سے جاری کیے گئے تھے، جعلی سکوں کو رد تو کر دیا گیا لیکن ان لوگوں کو کوئی سزا نہ دی گئی جن کے پاس ویسے

---

(1) کرونیکلس، ص:246

سکے موجود تھے کیونکہ وہ ان کے جائز مالکان تھے۔ ان رد کردہ کانسے کے سکوں کے ڈھیروں کو جو بعد میں غالباً گلا دیئے گئے، تغلق آباد میں دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ جعلی سکے جو خزانہ میں واپس نہ لائے گئے تھے، اپنے فلزاتی قدر و قیمت پر صوبوں میں بالخصوص جاری رہے اور وہ ہمارے عہد تک کچھ باقی رہ گئے ہیں۔[1]

(ب) لوگوں نے چاندی کی ذخیرہ اندوزی شروع کر دی اور تمام خرید و فروخت علامتی سکوں میں کرنے لگے۔ اس طرح چاندی کی ایک بڑی مقدار گردش سے باہر ہو گئی۔

(ج) زمین کے لگان کی ادائیگی جعلی علامتی سکوں میں ہونے لگی، خوط مقدم اور چودھری طاقتور اور سرکش ہو گئے۔

(د) سرکش عناصر نے جعلی علامتی سکوں سے اسلحہ جات اور جنگی ساز و سامان خریدے۔[2]

(ر) غیر ملکی تاجروں نے اپنی مصنوعات ہندستان لانا بند کر دیا لہٰذا درآمد کو سخت دھچکا پہنچا۔ جب سلطان نے یہ سمجھ لیا کہ اس کے علامتی سکوں نے ایک ابتری پھیلا دی تھی تو اس نے اسے واپس لے لیا اور سونے اور چاندی کے جائز سکوں سے تمام تانبے کے سکوں کے مبادلہ کی پیش کش کر دی۔[3] گرچہ سلطان نے اس وعدہ کی لاج رکھ لی جو علامتی سکے میں مضمر تھی لیکن اپنے منصوبے کی ناکامی پر وہ بری طرح جھلا گیا۔

خراسان کی مہم

برنی ہمیں بتاتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق نے خراسان اور عراق کی فتح کے لیے تین لاکھ ستر ہزار سپاہیوں کی ایک فوج اکٹھا کی تھی۔ اس منصوبہ کو وہ سلطان کی بداعمالیوں میں شمار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بیرونی ممالک کے عوام کے دھوکہ میں آکر

---

(1) دی پولٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت، ص: 129

(2) فیروز شاہی، ص: 475

(3) برنی لکھتا ہے کہ اس مہر (علامتی سکوں) کے بدلے میں سلطان نے چاندی اور سونے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس نے دل کھول کر اپنے وسائل کو برباد کیا۔ وہ ان ممالک کو فتح تو نہ کر سکا خود اپنی ہی سرزمین پر اس کا قبضہ کمزور پڑ گیا۔ 1 برنی کے بیان سے اس فوج کی بھرتی کی مندرجہ ذیل خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے (الف) دیوان عرض کی اطلاع کے مطابق بھرتی شدگان کی مکمل تعداد تین لاکھ ستر ہزار گھوڑ سوار سپاہیوں کی تھی۔ (ب) تنخواہیں نقدی اور اقطاعات دونوں ہی شکلوں میں ادا کی گئیں۔

(ج) ساز و سامان تیر گھوڑے وغیرہ کی غیر محتاط خریداری کے لیے ایک کثیر رقم دی گئی (د) اس فوج کو ایک سال کی تنخواہ دے دی گئی اور یہ سوچا گیا کہ آئندہ سالوں کے اخراجات حاصل شدہ مال غنیمت سے پورے کیے جائیں گے۔ لیکن مہم چلائی نہ جا سکی اور دوسرے سال جاری رکھنے کے لیے کوئی ذرائع وسائل نہ تھے۔ مزید یہ کہ اس فوج کو کسی دوسری عسکری کارروائیوں میں بھی مشغول نہ رکھا جا سکتا تھا۔

اس عسکری مہم کی منصوبہ بندی کے سلسلہ میں سلطان کے مقاصد کا برنی کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔ لیکن اس بات پر یقین کر لینا مشکل ہے کہ سلطان کے ساتھ اپنی گہری قربت کے باوجود وہ ان حالات سے ناواقف ہو گا جن کے تحت یہ عسکری تیاریاں کی گئیں تھیں، امیر خورد کا مندرجہ ذیل بیان سلطان کے اس طریقہ کار کا ایک واضح نقشہ پیش کرتا ہے جس طرح پر اس نے اپنے منصوبہ کی حمایت میں رائے عامہ کی اور یہ اس کے منصوبوں کے خلاف صوفی رد عمل پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

ان دونوں میں جب سلطان محمد (بن) تغلق نے عوام کو دیوگیری بھیجا اور وہ ترکستان اور خراسان کو (بھی) فتح کرنے اور چنگیز خاں کے اخلاف کو بے دخل کرنے کی فکر میں تھا تو اس نے دہلی اور اس کے مضافات کے تمام سربرآوردہ اور ممتاز اشخاص کو بلا بھیجا۔ ایک بڑا خیمہ (بارگاہ) نصب کیا گیا اور ایک منبر بنایا گیا جس پر سے سلطان کو

(پچھلے صفحہ کا باقی) کے ٹنکے اور ششگانی اور دوگانی دیئے (فیروز شاہی ص:476) یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ درحقیقت سلطان کے پاس چاندی کی کمی تھی ورنہ وہ مبادلہ میں سونا دیتا۔

(1) فیروز شاہی 476، مختلف اسلامی ممالک کی اضافی صورتحال کے متعلق برنی کے ذہن میں کوئی واضح خاکہ نہ تھا۔ یہ بات اس کی ان تعجب خیز غلطیوں سے ثابت ہوتی ہے جو وہ اپنی فتاوی جہانداری کے منشورہ 160 میں کرتا ہے (پولیٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت، ص: 81-75)

کفار (منگولوں) کے خلاف ایک جہاد کے لیے عوام کو (مخاطب کر کے) آمادہ کرنا تھا۔ لہٰذا اس دن اس نے مولانا فخر الدین (زرادی) مولانا شمس الدین یحییٰ اور شیخ ناصر الدین محمود کو بلا بھیجا۔ شیخ قطب الدین دبیر جو سلطان المشائخ (شیخ نظام الدین اولیاء) کے ایک نہایت مخلص و جاں نثار مرید تھے اور مولانا فخر الدین زرادی کے ایک شاگرد تھے، نے اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ داخل ہوں انہیں (سلطنت کے سامنے) لے جانا چاہا۔ لیکن مولانا نے جو سلطان سے ملاقات کرنے پر رضامند نہ تھے، متعدد مرتبہ کہا: "میں اپنے سر کو اس شخص (سلطان) کے محل (سرائے) کے سامنے (دھول میں) لڑھکتا ہوا دیکھتا ہوں۔ میں اس سے شریفانہ سلوک نہ کروں گا اور وہ میری زندگی نہ بخشے گا۔"

بہر حال جب مولانا سلطان کے پاس پہنچے تو شیخ قطب الدین دبیر ان کے جوتوں کو ان کے پیچھے پیچھے لائے اور اپنی بغل میں دبا کر ایک خدمت گزار کی طرح وہاں (دربار میں) کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے ان تمام باتوں کا ملاحظہ کیا۔ لیکن اس وقت اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ مولانا فخر الدین کے ساتھ گفتگو کرنے لگا اور بولا۔ "میں چنگیز خاں کے اخالف کو اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہوں۔ آپ کو میرے اس کام میں میرا ہاتھ بٹانا چاہیے۔" مولانا نے جواب دیا: انشاء اللہ (اگر خدا چاہے گا)! سلطان نے کہا۔ "یہ فقرہ عدم فیصلہ کا اظہار کرتا ہے۔" مولانا نے جواب دیا۔ "یہ الفاظ آئندہ کیے جانے والے کاموں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔" سلطان مولانا کے اس جواب کو سن کر غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا اور بولا۔ "مجھے کچھ مشورے دیجیے تاکہ میں ان پر عمل کر سکوں۔" مولانا نے جواب دیا! اس غصہ سے نجات حاصل کرو۔" سلطان نے پوچھا۔ "کیسا غصہ؟" مولانا نے جواب دیا "جانوروں جیسے غصہ سے۔" سلطان اس جواب سے طیش میں آ گیا اور غصہ اور نفرت کی علامتیں اس کے چہرے پر نمایاں ہو گئیں۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں اور دوپہر کے کھانے کو چلے جانے کا حکم دیا۔ مولانا اور سلطان ایک ہی برتن سے کھانا کھانے لگے۔ مولانا فخر الدین زرادی اتنا زیادہ جھلا گئے تھے کہ سلطان بھی سمجھ گیا کہ وہ اس کے ساتھ کھانا کھانا پسند نہیں کر رہے تھے اور ان کے نفرت کے

احساس کو مزید بڑھانے کی خاطر سلطان گوشت کو ہڈیوں سے جدا کر کے مولانا کو بڑھاتا رہا جنہوں نے (ادھر) بہت کم اور نہایت بے دلی کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے اختتام پر مولانا شمس الدین یحییٰ اور شیخ نصیر الدین محمود کو سلطان کے پاس لایا گیا۔[1]

گرچہ اپنے مختلف منصوبوں پر عمل درآمد کرانے کے لیے محمد بن تغلق کے اقدامات بسااوقات درشت اور عاجلانہ ہوتے تھے۔ لیکن ان کی علت نمائی ہمیشہ صحیح اور صحت مندانہ ہوتی۔ لیکن اس سلسلہ میں چند حقائق قابل ذکر ہیں۔ لفظ "خراسان" کا استعمال بسااوقات بڑے ڈھیلے ڈھالے معنوں میں دیا جاتا ہے لہٰذا اس جغرافیائی خط کو متعین کرنا بڑا مشکل ہے جو محمد بن تغلق کے ذہن میں تھا۔[2] برنی لفظ عراق کو بھی خراسان سے مربوط کرتا ہے۔[3] فرشتہ کہتا ہے کہ جو شہزادے اور ملک بڑی تعداد میں عراق اور ایران سے اس کے دربار میں چلے آئے تھے، ان کی ایک بڑی تعداد نے اسے یہ یقین دلایا کہ ایران اور توران کی فتح نہایت آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔[4] ان خانوں کے اقتدار کے خاتمہ اور تیمور کے اقتدار کے قیام کی درمیانی مدت میں ایشیا اور فارس میں ایک سیاسی خلاء تھا۔ محمد بن تغلق اپنے حلقہ اثرات کو وسیع کرنے کے لیے اس صورتحال کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ غیر ملکیوں کے ساتھ اس کی غیر محدود سخاوت و فیاضی اور غیر ممالک میں مقیم لوگوں کو اس کی داد و دہش کا سارا مقصد اپنے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے ایک موافق فضا تیار کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے چند معاہدے بھی کیے۔ لیکن ان معاہدوں میں ایک شدید رخنہ نے اس کے ذہن کو بدل دیا۔ ایک ایسی بڑی فوج جیسی کہ اس نے بھرتی کی تھی، یقینی عوام کی توقعات کو (ضرورت سے زیادہ) ابھار دیتی۔ لہٰذا مہم سے دستبرداری اور نتیجتاً فوج کی برطرفی نے شکست خوردگی، بے روزگاری اور منافرت کو جنم دیا۔

---

(1) سیر الاولیاء، ص: 271-73

(2) ابن بطوط کہتا ہے: "ہندستان میں تمام غیر ملکیوں کو خراسانی کہا جاتا ہے۔" رحلہ ص: 60-61

(3) فیروز شاہی، ص: 476

(4) فرشتہ، جلد 1، ص: 134

سہوان کی بغاوت

چونکہ 1333/734 میں اپنے سہوان پہنچنے پر ابن بطوطہ نے باغیوں کی لاشوں کو شہر کی پناہ گاہوں میں کیلوں سے جڑا ہوا دیکھا تھا۔ لہٰذا یہ بغاوت یقیناً اسی سال کے دوران ہوئی ہوگی۔ سہوان کے ہندو گورنر رتن کو ڈُنار اور قیصر رومی نے ہلاک کر دیا اور بارہ لاکھ سے زیادہ مالیت کی حکومت کی تمام جائدادوں پر قبضہ کر لیا۔ ڈُنار، ملک فیروز کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے ایک بڑی فوج کی بھرتی کی۔ لیکن اس نے خود کو محفوظ نہ سمجھا اور بھاگ کھڑا ہوا تب فوج نے قیصر رومی کو اپنا قائد بنایا۔ ملتان کے گورنر عماد الملک سر تیز نے بغاوت کو کچلا اور باغیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔

قراچل کی مہم

قراچل علاقہ کی شناخت باعتماد طور پر کماؤں، گڑھوال علاقہ کے ضلع کانگڑا کے وسطیٰ ہمالیائی خطہ سے کی جا سکتی ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ یہ علاقہ دہلی سے 'دس دنوں' کی مسافت کی دوری پر تھا۔[1] اس علاقہ کی حصولی شمالی علاقہ میں قلعہ بندی کے سلسلہ کی تکمیل کے پیش نظر سلطان کی ایک وسیع پالیسی کا ایک حصہ تھی۔ ابن بطوطہ کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ آزاد راجپوت مملکتوں میں چینی مداخلت محمد بن تغلق کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ انہوں نے عسکری اہمیت کے ایک مقام پر ایک مندر تعمیر کیا تھا اور اس علاقہ میں اپنے اختیارات کی توسیع کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

برنی کے اس بیان کو کہ مہم کا تعلق خراسان کی فتح سے تھا قبول نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لکھتا ہے کہ "سلطان نے سوچا کہ چونکہ خراسان اور ماوراء النہر کی فتح کے سلسلہ میں ابتدائی اقدامات کیے جا چکے ہیں اور چونکہ وہ قراچل ہند اور سندھ کے ممالک سے جانے والی مختصر راہ میں رکاوٹ تھی لہٰذا اسے اسلامی پرچم کے زیر اختیار لانا چاہیے۔[1]" چونکہ ہمالیہ خراسان کی راہ میں حائل نہ تھا لہٰذا یہ بیان بے معنی ہے۔ فرشتہ، برنی کی غلطی کی اصلاح کی کوشش میں، محمد بن تغلق کی قراچل مہم کا اصل مقصد چین کو قرار دیتا ہے۔ لیکن کوئی بھی قدیم ماخذ فرشتہ کے خیال کی تائید نہیں کرتا۔ "حاجی الدبیر کی

---

(1) رحلہ، ص: 98

یہ تجویز کہ سلطان قراچل کی عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کرنا چاہتا تھا، سلطان کے کردار کے تمام جائزوں کے منافی ہے۔ درحقیقت سلطان کا مقصد محض سرحدی علاقوں پر قبضہ کرنا اور ان پہاڑی علاقہ کے سرداروں کو اپنے اقتدار اعلیٰ کے تسلیم کرنے پر مجبور کر کے فوجی اہمیت کے حامل ایک خط میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا تھا۔ اس مقصد سے اس نے اپنے بھانجے (بہن کے لڑکے) خسرو ملک کی قیادت میں دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج روانہ کی۔[1] اس نے نہایت تفصیلی ہدایات دیں کہ کس علاقے تک کارروائی کرنی تھی اور فوج کو کہاں قیام کرنا تھا۔ اس کی ہدایات کے مطابق سارے راستہ میں فوجی چوکیاں قایم کرنا تھا تاکہ خورد و نوش کے ذخیروں کی مستقل رسد کی ضمانت ہو جائے اور پسپائی یا ناخوشگوار حالات کی صورت میں یہ پناہ گاہوں کا کام کریں۔

جدیا پر قبضہ کرنے میں فوج کامیاب ہو گئی۔ اور سلطان نے اس علاقہ کو اپنی مملکت میں ضم کر لینے کے فیصلے کی علامت کے طور پر ایک قاضی اور خطیب کو وہاں بھیجا سلطان نے سپہ سالار کو جدیا سے آگے نہ بڑھنے کی تنبیہ کی لیکن اپنی کامیابی کے غرور میں خسرو ملک نے سلطان کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا اور اس سے قبل تیرہویں صدی میں محمد بن بختیار خلجی نے جو غلطی کی تھی اس کا غیر شعور پر اعادہ کرتے ہوئے وہ تبت کی جانب آگے بڑھ گیا۔

اس کے فوراً بعد ہی بارش شروع ہو گئی۔ اور فوج بیماری اور خوف و دہشت کی لپیٹ میں آ گئی۔ پہاڑی لوگوں نے بڑے بڑے پتھر (فوج کے سپاہیوں پر) پھینکے اور دہلی کی فوجوں کو شکست فاش دے دی۔ برنی کے مطابق صرف دس آدمی زندہ بچے۔[2] ابن بطوطہ کے مطابق اپنی بدقسمتی کی کہانی سنانے صرف تین سپاہی[3] ہی واپس لوٹے۔

خسرو ملک کے غلط جوش و ولولے کے سبب جو حادثہ رونما ہوا اس کے لیے

---

(1) فتوح السلاطین، ص:467، ابن بطوطہ کمانڈر کا نام ملک نکبیہ بتاتا ہے، رحلہ ص:98

(2) فیروز شاہی، ص:478

(3) رحلہ، ص:198، ابن بطوطہ دو زندہ بچ جانے والے افراد کا نام بتاتا ہے۔ نکبیہ اور بدر الدین ملک دولت شاہ، وہ تیسرے شخص کے نام کو بھول گیا تھا۔

سلطان کو موردالزام قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اس حادثہ کے نتائج کو اسے بھگتنا پڑا۔ یہ وسائل کی زبردست بربادی اور عوام میں زبردست بے چینی کا سبب بنا۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ قراچل مہم کے کوئی مثبت سیاسی نتائج برآمد نہ ہوئے محمد بن تغلق کے ساتھ ناانصافی برتنا ہوگا۔ ابن بطوطہ کا خیال ہے کہ "اس کے بعد سلطان نے پہاڑیوں کے باشندوں کے ساتھ اس شرط پر معاہدہ امن کیا کہ وہ اسے ایک مخصوص رقم ادا کریں گے۔ چونکہ ان لوگوں کی زمینیں پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھیں لہٰذا وہ اس کی اجازت کے بغیر اسے استعمال میں نہیں لا سکتے تھے۔[1]" یہ ایک ایسا پہلو ہے جسے برنی اور عصامی دونوں ہی نے نظرانداز کر دیا ہے۔ ابن بطوطہ (کے بیان) کی تصدیق مسالک الابصار کے مصنف، جسے دمشق میں مندرجہ ذیل اطلاع ملی تھی، کے ذریعہ ہوتی ہے۔ "قراچل علاقے کے عوام اس سلطان کے ماتحت ہیں ان ٹیکسوں کی بنا پر جو ان سے اسے ملتے ہیں اور (اس کی) دولت کا ایک ذریعہ ہیں۔ انہیں اس کی جانب سے تحفظ اور امن حاصل ہے۔[2]"

قحط، طاعون او معبر کی کامیاب بغاوت

سلطان محمد کی پہلے دس سالوں کی حکومت نہایت نمایاں طور پر کامیاب رہی۔ علاؤالدین خلجی کی مملکت سے زیادہ وسیع علاقہ اس کے براہ راست انتظام میں تھا۔ اور وہ تمام بغاوتوں کو فرو کرنے میں کامیاب رہا۔

لیکن اس کے بعد اسے دو ایسی طاقتوں کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے اختیارات سے باہر تھیں۔ قحط اور گلٹی وار طاعون اس سلسلہ میں برنی کے بیان کی جانچ و پڑتال کے دوران ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ گرچہ اس کی تاریخ فیروز شاہی یادداشت کا ایک کارنمایاں ہے لیکن مصنف کی پہنچ کسی بھی کتاب یادستاویزات تک نہ تھی اور جیسا کہ پروفیسر حبیب نے نشاندہی کی ہے کہ اس کے پاس اس کی یادداشت اور قلم،

---

(1) ایضاً، ص: 99-98

(2) مسالک الابصار، انگریزی ترجمہ، ص: 13

روشنائی اور کاغذ کے ماسوا کچھ نہ تھا۔[1] مزید یہ کہ ہمارے پاس برنی کا بلا تکلف نہ اعتراف بھی موجود ہے کہ وہ سلطان محمد کے دور حکومت کے واقعات کو تاریخی پیرائے میں بیان نہیں کر رہا ہے۔[2]

قحط کے سلسلہ میں برنی کا پہلا پیراگراف بالکل غلط اور افسوس ناک ہے وہ لکھتا ہے۔ "پہلا منصوبہ (اندیشہ) جو مملکت کی تباہی اور رعیت کی بربادی کا سبب بنا وہ یہ تھا۔ یہ بات سلطان کے دماغ میں آگئی کہ دو آب کے کسانوں کے لگان میں ایک سے دس اور ایک سے بیس تک کا اضافہ کیا جانا چاہیے۔"[3] اس نے اس اقدام کے نفاذ کے لیے سخت ضابطے بنائے۔ (اس کے تحت) جو رقم وصول کی گئی اس سے رعیتوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ یہ مطالبے اتنے سخت تھے کہ کمزور اور لاچار کسان بالکل چور ہو گئے جبکہ دولت مند رعیت، جن کے پاس روپے اور ساز و سامان تھے، باغی ہو گئے، علاقہ ویران ہو گیا اور کاشتکاری مکمل طور پر بند ہو گئی۔ مزید یہ کہ دور دراز علاقوں کی رعیت بھی اس خوف سے کہ ان کے ساتھ بھی دو آب کے کسانوں جیسا ہی سلوک کیا جائے گا، سرکش ہو گئی اور وہ لوگ جنگلوں میں جا چھپے۔ دو آب میں کاشتکاری کی کمی اور دو آب کے کسانوں کی بربادی کاروانوں کی آمد میں کمی اور غلوں کے نہ پہنچنے کے باعث دہلی اور اس کے مضافات اور پورے دو آب میں ایک مہلک قحط پڑا۔ غلوں کی قیمتیں چڑھ گئیں تھیں۔ بارش بھی نہیں ہوئی۔ مکمل قحط سالی کئی سالوں تک جاری رہی ہزاروں کی تعداد میں لوگ مر گئے، سماج پریشانی و کلفت کا شکار تھا۔ بیشتر لوگ وہ سب کچھ بھی کھو بیٹھے جو ان کے پاس تھا۔ ملک اور سلطان محمد کی حکومت اسی زمانہ سے پژمردہ اور بے آب ہو گئی۔[4]

---

(1) پروفیسر حبیب، پولٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت، ص:120

(2) فیروز شاہی، ص:476

(3) چونکہ ہم قحط کے زمانہ کی قیمتوں پر بحث کر رہے ہیں لہٰذا اس بات پر بحث کرنا فضول ہے کہ آیا برنی کے اعداد کو حرف بہ حرف صحیح مان لیا جائے۔ اگر انہیں اس طرح قبول بھی کر لیا جائے تب بھی وہ درست ہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ ٹیکسوں میں اضافہ قحط کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کا نتیجہ تھا۔

(نوٹ:- اصل عبادت یہ ہے: خراج ولایت میان دو آپ یکی بہ دہ وکی بہ سبیت می باید ستد
اس کے صحیح مطلب کے متعلق مصنفین کی آراء میں اختلاف ہے۔ مترجم)

صاف ظاہر ہے کہ ہمارے مورخ کی یادداشت اسے دھوکہ دے رہی ہے۔ اپنے مرحوم سرپرست کے خلاف ایک الزام تراشی کی خاطر وہ اثرات کو اسباب کے ساتھ خلط ملط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دو آب کے لگان میں اضافہ کئی سالوں تک بارش کی کمی کا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برخلاف زیادہ اغلب یہ ہے کہ قحط نے سلطان کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ باقی رکھا تھا کہ وہ اس بات کا مطالبہ کرے کہ کسان ریاست کے حصہ کی ادائیگی غلوں کی صورت میں یا (دوسری صورت میں) غلہ کی بازاری قیمت کے مطابق اسکے مساوی نقد رقم میں ادا کریں۔

بہرام ایبہ کشلو خاں کی شکست کی وضاحت کے بعد برنی دوبارہ اپنے (اس) الزام کی طرف رجوع کرتا ہو لیکن جب وہ یوں لکھتا ہے کہ جیسے کہ قحط کشلوں خاں کی بغاوت کے فوراً بعد واقع ہوا تھا تو اس معاملہ میں اس کا حافظہ اسے دھوکہ دے رہا تھا۔ وہ اقدامات جن پر ہم بحث کرتے آرہے ہیں۔ دولت آباد کو خروج، خراسان مہم کے لیے ایک زبردست فوج کی بھرتی قراچل کی مہم قحط سالی کے زمانہ میں نہیں اٹھائے جا سکتے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ان دو سالوں[5] (چھ سالوں، 1328-34) کے دوران جب سلطان اپنے امراء ملک اور سپاہیوں کے ساتھ دہلی میں تھا جبکہ ان کی عورتوں اور بچے دیوگیری میں تھے، دو آب کا علاقہ سخت مطالبوں اور بے شمار ابواب کی بناء پر تباہ ہو گیا۔ ہندوؤں نے اپنے اپنے غلوں کو آگ لگادی اور انہیں نذر آتش کر دیا۔ انہوں نے اپنے مویشیوں کو بھی گھروں سے باہر بھگا دیا۔ سلطان نے شقداروں اور فوجداروں کو دست درازی کا حکم دیا۔ چند مقدموں اور چودھریوں کو مار ڈالا گیا۔ اور بعض دوسروں کو اندھا کر دیا گیا۔ وہ لوگ جو نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے ایک جگہ جمع ہو گئے اور انہوں نے جنگلوں میں پناہ لی۔ اس طرح یہ سرزمین ویران ہو گئی۔ اسی زمانہ میں سلطان کو شکار کے سلسلہ میں برن جانے کا اتفاق ہوا۔ اس نے برن کی پوری مملکت کو تاراج کرنے اور ہندوؤں کے سروں کو لاکر برن کے قلعہ کے میناروں سے لٹکادیئے جانے کا حکم

---

(4) ایضاً، ص: 472-78

(5) چھ "کی جگہ پر" دو "کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(3) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید 1333 میں دو آب مانسون میں نہیں آیا تھا۔

دیا۔ اسی زمانہ میں سلطان ہندستانیوں کو تاراج کرنے کی خاطر اپنی فوج کے ساتھ چلا اور اس نے قنوج سے لے کر دالمؤ تک کی سرزمین کو تاراج کر دیا۔ وہ لوگ جو سپاہیوں کے ہتھے چڑھے مار ڈالے گئے۔ لیکن بیشتر باشندے بھاگ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنے آپ کو جنگلوں میں چھپالیا۔ لیکن جنگلوں کو گھیر لیا گیا اور جو لوگ ان میں پائے گئے انہیں مار ڈالا گیا۔ اس طرح اس سال کے دوران قنوج اور دالمؤ کے درمیان کا علاقہ ویران ہو گیا۔

لگان میں اضافہ کرنے اور دوآب کے کسانوں کے ساتھ ان کے غلوں پر قبضہ پانے کی خاطر ایک جنگ کرنے کے سلسلہ میں سلطان کے مقصد کو برنی بالکل ہی نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن ابن بطوطہ کے ذریعہ اس معاملہ کی وضاحت ہوتی ہے جو دہلی مارچ 1334 میں پہنچا تھا۔ جو غالباً دوآب میں سخت قحط سالی کا پہلا سال تھا۔ "جب قحط ناقابل برداشت ہو گیا تو سلطان نے دہلی کے تمام لوگوں میں چھ ماہ تک خورد و نوش کے ساز و سامان کی تقسیم کا حکم دیا۔ لہٰذا قاضی، کلرک اور امرا گلیوں اور دکانوں میں گھوما کرتے۔ وہ باشندوں کی ایک فہرست تیار کرتے اور ان میں سے ہر ایک کو فی دن ڈیڑھ مغربی رتل (یعنی جدید ہندستانی وزن کے مطابق بارہ چھٹانک) کی مقدار کے حساب سے خورد و نوش کا اتنا ذخیرہ دیتے جو چھ ماہ کی کفایت کر سکے۔[1] جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا اس دوران میں لوگوں میں وہ کھانا تقسیم کراتا تھا جسے سلطان قطب الدین کے مقبرے (کے احاطے) میں تیار کراتا تھا۔ جیسا کہ آئندہ بیان کیا جائے گا۔ اس طرح لوگوں کو راحت پہنچائی[2] جا رہی تھی۔" ابن بطوطہ ہمیں صرف دارالسلطنت کے بارے میں بتاتا ہے لیکن سلطان کی حکومت نے آئندہ خریف کی فصل کے کٹنے تک تمام شہروں میں راشننگ کا ایک کام چلاؤ نظام یقیناً قایم کیا ہوگا اور اس لیے کسانوں سے کم از کم اتنا غلہ وصول کرنا ضروری تھا جس سے کہ یہ مقصد پورا ہو سکے۔

برنی اور ابن بطوطہ اس بیان پر متفق ہیں کہ سلطان اس وقت قنوج میں تھا جب اسے یہ اطلاع ہوئی کہ معبر کے گورنر سید احسن شاہ نے بغاوت کر دی ہے اور یہ کہ اس نے سات یا آٹھ شاہی امرا کو تہ تیغ کر دیا تھا نیز یہ کہ فوج اس سے جا ملی تھی اور معبر فتح

---

(1) ڈاکٹر مہدی حسن کا تخمینہ، رحلہ، ص:85

کر لیا گیا تھا۔ گزشتہ بغاوتوں کے موقعوں پر سلطان نے باغیوں کو سخت سزائیں دی تھیں۔ لیکن سید احسن شاہ جس کا دارالسلطنت ابن بطوطہ کے مطابق دہلی سے چھ ماہ کی مسافت دوری پر واقع تھا، کا اندازہ یہ تھا کہ طویل مسافت اور ایک زبردست قحط سالی، جس سے شاید دوآب، مالوہ اور مشرقی پنجاب تک کا علاقہ متاثر تھا، کی بناء پر مرکزی حکومت کی کمزوری نے اس کے لیے ایک موقع فراہم کر دیا تھا، اس کا بیٹا ابراہیم خرلیط دار شاہی ملازمت میں تھا اور اس کی سرزنش یقینی تھی لیکن وہ یہ قیمت چکانے کے لیے تیار تھا۔ سلطان قنوج سے دہلی واپس آیا۔ تقریباً آٹھ دنوں میں اس نے اپنی فوج کو مسلح کیا اور معبر کے لیے روانہ ہو گیا۔ سید ابراہیم خرلیط دار، جو اس وقت ہانسی اور سرستی کا گورنر تھا، کو فوراً ہی اس کے رشتہ داروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا اور سلطان کی جنوب سے واپسی کے بعد اسے غداری کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔[3] اسی اثناء میں وزیر خواجہ جہاں احمد ایاز دھار پہنچ چکا تھا لیکن اسے اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے بھتیجے نے دو یا تین امرا کے ساتھ مل کر اسے مار ڈالنے اور اس کی جائداد لے کر معبر بھاگ جانے کی سازش کی تھی۔ اسے اس سازش کا انکشاف ان کے ایک معتمد، نصرت حاجب سے ہوا۔ اس نے سازشیوں کو گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔ سلطان نے امرا کو ہاتھیوں کے ذریعے مار ڈال دیئے جانے کا حکم دیا۔ لیکن اس نے احمد ایاز کے بھتیجے کو بذاتِ خود ایاز کے ہاتھوں مار ڈالے جانے کے لیے بھیج دیا اور ایسا ہی کیا گیا۔[4] اس کے بعد احمد ایاز کو دہلی واپس آنے کا اور مرکزی حکومت کی زمام سنبھالنے کا حکم دیا گیا۔

سلطان دولت آباد پہنچا اور وہاں دو یا تین ماہ قیام کیا۔ اس کے بعد وہ تلنگانہ میں بیدر کی جانب بڑھا۔ برنی کے مطابق سلطان نے سخت قسم کے نمائندوں اور افسران کی تقرری کی تاکہ مراٹھوں کی سرزمین سے جو کچھ بھی وہ حاصل کر سکیں اکٹھا

---

(2) مہدی حسن، رحلہ، ص: 117 ظاہر ہے کہ ابن بطوطہ کا یہ بیان درست نہیں کہ قحط، سلطان کی معبر کی روانگی کے بعد شروع ہوا تھا، برنی لکھتا ہے کہ سلطان کے چار منزلوں کو طے کر چکنے کے بعد قحط کی شدت بڑھ گئی۔ عصامی قحط کے سلسلہ میں خاموش ہے۔

(3) ایضاً، ص: 4-103

(4) ایضاً۔ ص 99

کیا جاسکے۔" لیکن بیدر میں سلطان کے قیام کے دوران طاعون کی ایک شدید وبا نے اس کے آئندہ تمام منصوبوں کو ناکام بنادیا۔" ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "اسی زمانہ اس کی فوج میں طاعون پھوٹ پڑا اور اس کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ غلام اور سپاہی (عبد و مملوک) نیز بڑے بڑے امرا مثلاً دولت شاہ جسے سلطان "چچا" کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا اور ہرات کے امیر عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔[1] ابن بطوطہ سلطان کی فوج کے ساتھ موجود نہ تھا لیکن اس نے اس مشہور و معروف وبا ایشیائی یا گلٹی دار طاعون کی وضاحت ایک دوسری جگہ پر (یوں) کی ہے۔ "جب میں مدورا پہنچا تو میں نے پایا کہ وہاں ایک وبا پھیلی ہوئی تھی اور یہ کہ اس کا شکار ہو کر لوگ فوراً ہی دم توڑ دیتے تھے۔ جس کسی کو بھی اس کے جراثیم سرایت کر جاتے وہ دوسرے یا تیسرے دن انتقال کر جاتا اور اگر تیسرے دن نہیں تو چوتھے دن۔ جہاں کہیں میں گیا میں نے لوگوں کو یا تو مرض میں مبتلا پایا یا مردہ۔[2] عصامی جو شاعرانہ طور پر ایک زہریلی ہوا (سموم)، جو سلطان کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھا، کی اصطلاح میں اس کا بیان پیش کرتا ہے، اعلان کرتا ہے کہ "دہلی کے فوجی افسروں میں سے کم و بیش نصف ہلاک ہو گئے اور یہ کہ وہ فوج جسے سلطان دہلی واپس لایا تھا، طاعون (وبا) کا شکار ہو کر ایک تہائی سے بھی کم رہ گئی تھی۔[3]

خود سلطان بھی طاعون کی زد میں آ گیا۔ جیسا کہ مشہور ہے، اپنے ابتدائی دور کے مریضوں کے لیے طاعون مہلک ثابت ہوتا تھا لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ جراثیم کی اہمیت میں کمی ہو جاتی تھی اور لوگ صحت یاب ہونے لگتے تھے۔ غالباً سلطان بعد کے انہیں خوش قسمت مریضوں میں تھا۔ وہ ایک ڈولی میں سوار ہو گیا اگرچہ وہ جانکنی (نزع) کا متوقع تھا پھر بھی وہ دولت آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستہ میں قتلغ خان کے ایک قاصد نے اسے یہ اطلاع دی کہ کمال الدین گرگ کے بیٹے ہوشنگ نے بغاوت کر دی ہے اور کونکن کے ایک ہندو سردار کے پاس پناہ تلاش کر لی ہے۔ لیکن نہ تو سلطان اور نہ ہی ہوشنگ معاملات کو طول دینے پر تیار تھا گرچہ ہوشنگ کا ہندو میزبان اس کے لیے جان کی بازی تک لگانے کو تیار تھا۔

---

(1) ایضاً، ص:101

(2) ایضاً، ص:230

سلطان نے وارنگل سے روانگی کے وقت ملک مقبول کو اس مملکت کا ذمہ دار بنایا تھا۔ دیوگیری پہنچنے پر اس نے ایک کروڑ ٹنکہ (سالانہ) کے ایک معاوضہ یا خراج پر بیدر اور اس کی ماتحت جاگیروں کو شہاب سلطانی نصرت خان کے سپرد کر دیا۔ دیوگیری اور مہاراشٹر کی حکومت قتلغ خاں کے سپرد کر دی گئی جسے یہ اختیار دیا گیا کہ وہ سلطان کی معافی ہوشنگ تک پہنچائے۔ اور سلطان کو اس وقت خوشی ہوئی جب ہوشنگ اس سے ملاقات کے لیے دہلی آیا۔ دہلی کے سابقہ شہریوں کو دارالسلطنت واپس آنے کی ایک عام اجازت دی گئی اور دو یا تین کارواں دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن جن لوگوں نے خود کو مہاراشٹر میں مقیم کر لیا تھا انہیں وہیں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔[4]

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "جب سلطان نے اس بدقسمتی کا مشاہدہ کیا جو فوج پر نازل ہوئی تھی تو وہ دولت آباد واپس ہو گیا۔ صوبوں میں بغاوت پک چلی تھی اور مختلف حصوں میں ابتری کا دور دورہ تھا اور عصائے شاہی اس کے ہاتھوں سے گر چکا ہوتا اگر مشیت ایزدی یہ نہ ہوتی کہ اس کا اقتدار قایم رہے۔" دولت آباد کی واپسی کے دوران سلطان بیمار پڑ گیا۔ لوگوں نے اس کی موت کی افواہیں دور دور تک پھیلا دیں اور اس کی وجہ سے وسیع پیمانہ پر شورشیں ہوئیں۔[5]

ابن بطوطہ کا یہ تاثر کہ سلطان حکومت حقیقتاً اب فوجی طاقت کی بنیاد پر نہ تھی درست ہے۔ مملکت کی ناقابل تسخیر مرکزی فوج جو تغلقوں کو خلجیوں سے ورثہ میں ملی تھی، طاعون میں جانی نقصانات کے باعث اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ وہ مرکزی اقتدار اعلیٰ کے ایک آلہ کی حیثیت سے کئی سالوں تک غیر موثر رہی اور محمد بن تغلق کی کوششوں کے باوجود وہ اپنے سابقہ معیار کے مقابلہ میں کارگزار اور ناقابل تسخیر باقی نہ رہ سکی۔ سلطان نے ایک دہائی تک کسی دور دراز کی مہم کا بیڑا نہ اٹھایا اور فوج جو 1345ء میں اس کے ساتھ گجرات تک گئی تھی اپنی سابقہ حیثیت کے محض ایک سائے کی مانند تھی۔

اس حقیقت نے کہ سلطان کے ذاتی اور فوری کمان کے تحت کوئی ایسی فوج نہ

---

(3) عصامی (مدراس ایڈیشن) ص: 469-17

(4) رحلہ، ص: 101-2، برنی ص: 480-81، عصامی، ص: 449-52

(5) رحلہ، ص: 101

تھی جو مملکت پر قبضہ قایم رکھ سکے اور سرحد پر دشمنوں کو کچل ڈالے باغیوں کے سلسلہ میں ایک عجیب صورتحال پیدا کر دی اگر کسی ضلع کا افسر بغاوت کرتا تو علاقائی یا صوبائی افسر اسے دبا سکتا تھا لیکن اگر صوبائی افسر اس دہائی (1335-45) کے دوران بغاوت کرتا تو سلطان بالکل بے بس تھا۔ وہ اس للکار کا جواب نہیں دے سکتا تھا اور وہ باغی خواہ وہ ایک ہندو سردار یا ایک مسلم افسر ہو ایک آزاد حکمراں بن جاتا، 1334ء کے بعد کی بغاوتوں کی بڑی تعداد یقیناً مرکزی فوج کی اسی کھلی کمزوری کا نتیجہ تھا۔ ایک ہندستان گیر انتظامیہ کے تصور کو بالکل ہی خیرباد کہہ دینا پڑا اور سلطان کا یہ اندازہ درست تھا کہ اس کی فوج اتنی کمزور تھی کہ وہ علاؤالدین بہمن شاہ کا 1347ء میں اس کی تخت نشینی کے بعد مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ غالباً 1334ء کے پلیگ اور سلطان کی (فوجی) کمزوری کا حال ظاہر ہو جانے کے بعد دو خصوصیات، جو قبل سے ہی موجود تھیں، اور نمایاں ہو گئیں۔ سلطان، قصوروار اور معصوم دونوں ہی کی محض شکوک کی بنیاد پر اس امید میں سرزنش کرنے لگا کہ بڑے پیمانہ پر خوں ریزی افسروں کو دہشت زدہ کر دے گی اور انہیں فرمانبردار بنا دے گی۔ دوسری طرف اس کے افسران نے اس کی فوجی کمزوری سے واقف ہو کر بلا مقدمہ سزا پانے پر بغاوت کو ترجیح دیا۔ حکومت کے متاخرہ سترہ سالوں کا اہم عسکری موضوع یہی تھا۔

اسی اثناء میں جبکہ سلطان مہاراشٹر کے حالات سے نمٹ رہا تھا۔ لاہور میں ایک بحران اٹھ کھڑا ہوا مہلاجون، جو ان منگول سرداروں میں سے ایک تھا، جنہیں محمد بن تغلق نے شاہی ملازمت میں لے رکھا تھا، نے لاہور کے گورنر ملک تاتار کو مار ڈالا اور آزادی اختیار کر لی۔ خواجہ جہان دہلی سے روانہ ہوا اور باغی کو شکست دے دی جو لاہور بھاگ گیا۔

سلطان جو، برنی کے مطابق، گرچہ اب بھی بیمار تھا، دیوگیری سے دہلی کی طرف بڑھا لیکن چند دنوں کے لیے دھار میں ٹھہر گیا۔ مالوہ میں بھی زبردست قحط سالی تھی۔ دہلی میں غلوں کی قیمت فی سیر 16 اور 17 جتلوں تک بڑھ گئی تھی۔ لیکن برنی کا یہ بیان کہ بارش کی کمی کی وجہ سے اس سال بھی کوئی کاشتکاری نہ کی جا سکی بالکل درست نہیں۔ ابن بطوطہ، جس کے ساتھ شروع شروع میں ایک نہایت باعزت مہمان کا سا

سلوک کیا گیا تھا، سلطان کے ساتھ اس وقت تک اطمینان سے ملاقات نہ کر سکا جب تک وہ دیو گیری سے ڈھائی سالوں بعد واپس نہ آیا۔ ابن بطوطہ ہمیں بتاتا ہے کہ "ان ہی دنوں میں سلطان کے خیمہ میں پہنچا گنگا کے مغربی جنوبی) کنارے پر واقع مملکتیں، جہاں سلطان خیمہ زن تھا، قحط سالی سے سخت متاثر تھیں جبکہ وہ جو مشرقی شمالی) کنارے پر واقع تھیں، خوش حال تھیں۔" ظاہر ہے کہ اودھ میں کافی بارش ہوئی تھی جبکہ دوآب میں نہیں۔ مشرقی (شمالی؟) کنارے پر واقع مملکتوں کا گورنر عین الملک بن ماہرو تھا اور ان مملکتوں میں اودھ، ظفر آباد، لکھنؤ اور دیگر علاقے شامل تھے۔ عین الملک ہر روز پچاس ہزار من گیہوں، چاول اور غلے نیز جانوروں کے لیے چارے بھی بھیجا کرتا تھا۔

برنی، ابن بطوطہ کے بیان کی صحت کا عملاً اقبال کرتا ہے جب وہ لکھتا ہے کہ سلطان قحط سے چھٹکارا پانے کے لیے شہریوں کو اپنے خاندانوں کے ساتھ ہندستان (اودھ؟) ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ سلطان محمد بن بھی دار السلطنت سے باہر نکلا اور پیالی اور کمپیل سے ہوتے ہوئے گنگا کے کنارے شہر خورد کے سامنے اپنی فوجوں کے ساتھ خیمہ زن ہو گیا۔ لوگوں نے کاشت کردہ زمینوں کے سامنے اپنی اپنی جھونپڑیاں بنائیں۔ اس لشکر گاہ کو سورگ دواری (جنت کا دروازہ) کا نام دیا گیا۔ یہاں کڑا اور اودھ سے غلے آ سکتے تھے اور وہ دہلی کے مقابلے میں سستے تھے۔ اس اثناء میں جبکہ سلطان سورگ دواری میں خیمہ زن تھا، اودھ اور ظفر آباد کے اقطاعات ملک عین الملک ماہرو کے قبضہ میں تھے۔ عین الملک اور اس کے بھائیوں نے سلطان کے پاس دہلی اور سورگ دواری میں، نقدی، اجناس، کپڑے اور 70 یا 80 لاکھ ٹنکوں کی قیمت کے غلے بھیجے۔ عین الملک پر سلطان کا اعتماد بڑھ گیا اور اسے عین الملک کی کارکردگی کا یقین ہو گیا۔[1]

ابن بطوطہ کے مطابق سلطان کو دیو گیری میں تقریباً ڈھائی سالوں تک قیام کرنا پڑا اور اتنا ہی وقت اس نے معبر پہنچنے کی فضول کوشش میں صرف کیا۔ اس بات کی تفتیش ضروری ہے کہ ناکام پریشان کن سالوں میں سلطان کی طاقت اور وقار کو کس قدر

---

(1) فیروز شاہی، ص: 1-480

نقصان پہنچا تھا۔ دکن میں قحط تو نہیں لیکن طاعون پھیلا ہوا تھا۔ لیکن مملکت کے اندرونی صوبے دوآب، مشرقی پنجاب، مالوہ لیکن غالباً اودھ نہیں۔ مسلسل خشک سالی سے سخت متاثر ہوئے تھے اور زراعت کو از سر نو معمول پر لانے کے لیے ایک دانش مند وزیر کو، اگر سلطان ایسا کوئی شخص دریافت کر سکتا، سات یا آٹھ سال لگ جاتے۔ دہلی کی ناقابل تسخیر فوج کا بڑا حصہ افسران کا نصف اور سپاہیوں کا دو تہائی طاعون کی نذر ہو چکا تھا۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ وہ فوج جو طاعون میں تقریباً تباہ ہو گئی تھی وہ مرکزی حکومت کی فوج تھی۔ وہ سول اور فوجی افسر جو صوبوں میں تعینات تھے۔ جن کا ذکر بسا اوقات امیران صدہ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، شاید زیادہ متاثر ہوئے تھے۔

بنگال میں انقلاب

بہرام خاں (بادشاہ کے سوتیلے بھائی) کا سنار گاؤں (ڈھاکہ) میں انتقال ہو گیا اور 1338-39/739 میں بہرام خان کے سلاح دار (اسلحہ جات کا نگراں) ملک فخر الدین نے بغاوت کر دی اور ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے اپنی آزادی کا اعلان کر کے سلطان فخر الدین کا خطاب اختیار کر لیا۔ لکھناؤتی کا گورنر پندار خلجی قدر خان، مستوفی ممالک (آڈیٹر جنرل)، ملک حسام الدین ابورجا، ستگاؤں (چٹاگانگ) کا مقطع اعظم ملک عزالدین یحییٰ اور امبر کو وہ نصرت خاں کے بیٹے فیروز خاں کی معیت میں فخر الدین کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے سنار گاؤں روانہ ہوا۔ فخر الدین اپنی فوج کے ساتھ لڑنے کے لیے باہر آیا۔ ایک جنگ ہوئی، فخر الدین شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا لہٰذا اس کے ہاتھی اور گھوڑے شاہی فوج والوں کے ہاتھ لگے۔

دیگر امراء اپنے اقطاعات پر واپس آ گئے لیکن قدر خاں سنار گاؤں ہی میں رہا۔ جب برسات شروع ہوئی تو قدر خاں کی فوج کے بیشتر گھوڑے مر گئے۔ لیکن اس نے چاندی کے ٹنکوں کی شکل میں کافی دولت اکٹھا کر لی تھی۔ ہر دو تین ماہ بعد وہ محل (سرائے) میں آتا اور ان کا ایک ڈھیر اکٹھا کر کے کہتا "اسی طرح پر میں انھیں شاہی دربار میں پیش کروں گا (دخول) جتنا زیادہ میں اکٹھا کروں گا اتنا ہی میری ملازمت کے لیے بہتر ہو گا۔" ملک حسام الدین نے اسے ایک دور دراز صوبے میں نقدیوں کی اتنی

بڑی رقم کو جمع کرنے کے خطرہ سے آگاہ کیا۔ لوگوں کو لالچ ہو گیا، تنگ نظر اشخاص اس بات کا سبب جاننا چاہیں گے کہ ان روپیوں کو دارالسلطنت کیوں نہ بھیجا گیا۔ تمام جمع کردہ لگان بادشاہ کے خزانہ ہی میں زیادہ محفوظ ہیں۔" لیکن قدر خاں نے ان پر کان نہ دھرا۔ اس نے نہ تو سپاہیوں کو ان کی تنخواہیں دیں اور نہ لگان کو شاہی خزانہ میں بھیجا۔ اس کے بعد فخر الدین نے حملہ کر دیا اور قدر خاں کی غیر تنخواہ یافتہ فوج اس سے جا ملی۔ قدر خاں کو مار ڈالا گیا۔ فخر الدین نے اپنے آپ کو سنار گاؤں میں مستحکم کر لیا۔ اور لکھناوتی کو اپنے غلام مخلص کے سپرد کر دیا۔

قدر خان کی فوج کے عارض علی مبارک نے لکھناوتی پر قبضہ کر لیا اور مخلص کو قتل کر دیا۔ لیکن اس نے کسی بھی شاہی علامات کو اختیار نہ کیا بلکہ دربار سے درخواست کی! میں نے لکھناوتی پر قبضہ کر لیا ہے اگر دارالسلطنت سے کسی افسر کو اس کی ذمہ داری سونپے جانے کے لیے مقرر کیا جائے تو میں دارالسلطنت واپس ہو جاؤں گا۔" سلطان محمد راضی ہو گیا۔ اس نے دہلی کے شحنا، یوسف، کو خان کا خطاب دے کر وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن یوسف کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا سلطان اس معاملہ پر (مزید) توجہ نہ دے سکا۔ اور کسی کو لکھناوتی نہ بھیج سکا۔

فخر الدین کی مخالفت کی بنا پر علی مبارک کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سلطان علاؤالدین کا خطاب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ کچھ دنوں کے بعد ملک حاجی الیاس، جس کے پاس ایک فوج اور بہت سے پیروکار تھے، نے چند ملک امرا اور لکھناوتی کے عوام کے ساتھ مل کر ایک سازش کی۔ اس نے علاؤالدین کو مار ڈالا اور سلطان شمس الدین کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہو گیا۔ 1340-41/741ء میں حاجی الیاس سنار گاؤں کے خلاف روانہ ہوا۔ وہ فخر الدین کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اسے لکھناوتی لا کر قتل کر دیا۔ آگے چل کر ایک لمبی مدت تک لکھناوتی شمس الدین اور اس کے اخلاف کے ہاتھوں میں رہا۔ یہ دوبارہ پھر کبھی دہلی کے سلطانوں کے قبضہ میں نہ آیا۔

یہ بات قابل یقین نہیں کہ سلطان محمد ایک چوک کی بنا پر بنگال کے مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہا۔[1] ممکن ہے کہ قدر خاں کے دل میں باغیانہ منصوبے پرورش پا

رہے ہوں لیکن علی مبارک یقیناً وفادار تھا۔ لیکن سلطان کے پاس ایسے آدمیوں اور ذرائع دونوں ہی کی کمی تھی جن کی اس کے ایک افسر کو صوبے میں خود مستحکم کرنے کے سلسلہ میں ضرورت پڑتی۔ لہٰذا ان مسائل کے پیش نظر جو قریب تر علاقوں میں در پیش تھے وہ اس سلسلہ میں کچھ نہ کر سکا اور بنگال اس کی گرفت سے نکل گیا۔

جنوبی ہند میں ہندو ریاستوں کا قیام

قحط اور طاعون کی وجہ سے سلطنت جس کمزور فوجی اور مالی حالت کو پہنچ گئی تھی اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہوگا کہ سلطان نے ان دو مملکتوں پر اپنا اقتدار قایم رکھنے کی کوشش نہ کی جنہیں اس نے بھاری جانی اور مالی قیمت ادا کر کے اپنی سلطنت میں ملایا تھا۔

(الف) وجے نگر

جب سلطان اپنی طاعون زدہ فوج کے ساتھ شمال کے قحط زدہ علاقوں میں پسپا ہوا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ جنوب بعید پر قبضہ قایم نہ رکھ سکے گا۔ 1336ء میں ہری ہر اور اس کے بھائی بکا نے دریائے کرشنا کے جنوب میں ایک ہندو ریاست کی بنیاد ڈالی جو رفتہ رفتہ وسعت پذیر ہو کر وجے نگر کی مملکت میں بدل گئی۔

(ب) وارنگل

سلطان نے دوسرے حملہ کے بعد وارنگل کو ضم کر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اب (لگ بھگ 1335ء) وارنگل ہاتھ سے نکل گیا اور اس سلسلہ میں وہ کچھ نہ کر سکا۔ برنی ہمیں بتاتا ہے کہ "اس اثنا میں جبکہ سلطان دہلی میں تھا۔ (اور اس سے پہلے کہ وہ سورگ دواری گیا) وارنگل میں ہندوؤں کی بغاوت ہوئی۔ کنہیا نایک اس خطہ میں برسر اقتدار آ گیا اور وارنگل کے گورنر ملک مقبول نے دہلی کا راستہ پکڑا اور وہاں بحفاظت پہنچ گیا۔ وارنگل میں ہندوؤں کا اقتدار مستحکم ہو گیا اور یہ خطہ مکمل طور پر ہاتھ سے جاتا رہا۔

---

(1) تاریخ مبارک شاہی، ص:6-104 یحییٰ سرہندی اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیتا لیکن وہ ہمارے لیے بنگال کے انقلابات کا سب سے عمدہ بیان پیش کرتا ہے جو ہمیں فی الوقت مل سکتا ہے۔

کمپیلی

اسی زمانہ میں کنہیا کے ایک رشتہ دار کو (جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا) سلطان نے کمپیلی روانہ کیا۔ یہ بد بخت اسلام سے مرتد ہو کر ہندو مذہب میں واپس چلا گیا اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ کمپیلی بھی ہاتھوں سے نکل گیا۔ اور ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔[1]

اور یہی سلطان محمد کے ایک ہندستانی گیر انتظام حکومت کے خواب کا آخری انجام تھا۔ مملکت کے 'اندرونی' علاقوں کے علاوہ جیسا کہ برنی لکھتا ہے، "صرف گجرات اور دیوگیری اس کے ہاتھوں میں باقی رہا۔"

نگر کوٹ کی مہم

محمد بن تغلق کی کانگڑا ضلع میں واقع نگر کوٹ کی مہم کا کوئی تفصیلی بیان کسی بھی ابتدائی ماخذ میں نہیں ملتا۔ لیکن یہ بات سلطان نے بذات خود اس مہم کا بیڑا اٹھایا برنی[2] اور عفیف[3] کی تصانیف میں پائے جانے والے چند اشعار پیش کرتا ہے اور 738ھ /1337ء کو فتح کی تاریخ قرار دیتا ہے، اس مہم کی شناخت قراچل مہم سے نہیں کی جاسکتی جیسا کہ سر ولزلے ہیگ نے کیا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ قراچل مہم کے بر خلاف اس مہم کی قیادت بذاتِ خود سلطان نے کی تھی۔ لیکن یہ یقیناً سلطان کی سرحدی چوکیوں کے حصول کی وسیع تر پالیسی کا ایک حصہ تھی۔ شاید قراچل کے سانحہ نے ہی سلطان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بذاتِ خود کمان سنبھالے۔ اس موقعہ پر اس نے زبردست مذہبی رواداری کا مظاہرہ کیا۔ اور سیرت فیروز شاہی کے مطابق جوالامکھی کے مندر کو نہیں لوٹا۔[4]

---

(1) فیروز شاہی، ص: 484

(2) ایضاً (برنی)، ص: 483

(3) ایضاً (عفیف)، ص: 89-185

(4) سیرت فیروز شاہی، ص: 40

بغاوتیں

قحط سالی کے باوجود سلطان کو بہت ساری بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

مسعود خاں کی بغاوت

مسعود خاں سلطان کا سوتیلا بھائی تھا۔ اس کی ماں سلطان علاؤالدین خلجی کی بیٹی تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ”میں نے دنیا میں جتنے آدمی دیکھے ہیں ان میں وہ سب سے زیادہ خوبصورت تھا۔ سلطان نے اس کی ماں کو زناکاری کے الزام میں سنگسار کر دیا تھا لہٰذا اس بات نے مسعود کے دل میں شدید نفرت پیدا کر دی تھی۔ اس کے دو سال بعد مسعود پر بغاوت میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا۔ زبردستی اقرارِ جرم کرائے جانے کے سلسلہ میں دی گئی اذیتوں سے وہ اتنا خوف زدہ ہو گیا کہ اس نے جرم کا کھلم کھلا اقرار کر لیا اور اسے بیچ بازار میں پھانسی دے دی گئی۔ اس کا جسم وہاں تین دنوں تک رہا۔[1]

سنام اور سامانہ میں بغاوت

اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ کسانوں کی ایک بغاوت تھی۔ کاشتکاروں نے لگان ادا کرنے سے انکار کر دیا اور خود کو اپنے منڈلیوں میں بند کر لیا۔ سلطان بذاتِ خود باغیوں کے خلاف روانہ ہوا اور ان کے لیڈروں کو گرفتار کر کے دہلی لے آیا۔

کڑا میں نظام مائینِ کی بغاوت

749ء/ 1338ء میں نظام مائین نے کڑا میں بغاوت کر دی۔ اس نے کئی لاکھ ٹنکوں کے معاوضہ میں کڑا کا لگان وصول کرنے کا ٹھیکہ لیا لیکن وہ وعدہ کردہ رقم کا دسواں حصہ بھی ادا نہ کر سکا۔ اس نے سلطان علاؤالدین کا خطاب اختیار کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اودھ اور ظفر آباد کا گورنر عین الملک اور اس کا بھائی شہر اللہ اس کے خلاف روانہ ہوئے۔ مائین کی کھال زندہ کھینچ لی گئی اور اس کی بھوسے سے بھری ہوئی کھال کو دہلی بھیج دیا گیا۔[2] کڑا کا اقطاع سلطان کی بہن کے شوہر شیخ زادہ بسطامی کے

---

(1) رحلہ، ص: 86

(2) فیروز شاہی، ص: 487، یحییٰ سرہندی اس کے بھائی کا نام لکھتا ہے۔

سپرد کر دیا گیا۔

بیدر میں شہاب سلطانی کی بغاوت

740ھ /39-1338ء میں تاج الملک نصر خاں نے، جو شہاب سلطان کے نام سے بھی مشہور تھا، بیدر میں بغاوت کر دی۔ شاید 1334ء میں بیدر اس کے سپرد کیا گیا تھا اور اسے مرکز کو ایک کروڑ تنکہ ادا کرنے تھے۔ وہ لگان کی مقررہ رقم ادا کرنے میں ناکام رہا اور اپنے وعدہ کے مطابق زراعت کو بھی ترقی نہ دے سکا۔ یہ سوچ کر وہ بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہوا کہ اس کی ناکامی سلطان کے ذریعہ اسکی مناسب سرزنش کا باعث بنے گی۔ قتلغ خاں اس کے خلاف روانہ ہوا اور اسے گرفتار کر لیا۔

گلبرگہ میں علی شاہ نتھو کی بغاوت

یہ بغاوت شہاب سلطانی کی بغاوت کے کچھ عرصہ بعد ہوئی، علی عادل شاہ نتھو، علاؤالدین خلجی کے مشہور جنرل ظفر خاں کا بھتیجہ تھا۔ ٹیکسوں کی وصولی کے لیے مقرر کیے جانے کے بعد اس نے گلبرگہ کے ہندو مقطع ہیرن کو مار ڈالا اور گلبرگہ اور بیدر پر اپنا قبضہ قایم کر لیا۔ قتلغ خاں اس کے خلاف روانہ ہوا اور اسے شکست دے کر دہلی بھیج دیا۔ سلطان نے اسے اور اس کے بھائیوں کو غزنی جلا وطن کر دیا۔ لیکن جب وہ اس کی اجازت کے بغیر واپس چلے آئے تو اس نے انہیں پھانسی دے دیے جانے کا حکم دے دیا۔

عین الملک ماہرو کی بغاوت

امیر ماہرو کا بیٹا، عین الملک، محمد بن تغلق کا ایک قریبی دوست اور رفیق کار تھا جس نے اسے اودھ اور ظفر آباد کا گورنر مقرر کیا تھا۔[1] دو آب کی قحط سالی کے زمانہ میں اس نے اپنے اقطاع میں نہایت عمدہ طور پر کام انجام دیے تھے۔ اپنے بھائیوں کی مدد سے وہ سرکش عناصر سے نمٹا اور اپنے اقطاع میں امن اور خوشحالی قایم کر دی۔ 1338ء میں اس نے کڑا میں نظام مائین کی بغاوت فرو کی۔ سلطان جب سورگ دواری میں تھا تو

---

(1) ظفر آباد کا تذکرہ آئین اکبری میں جون پور سرکار میں ایک پرگنہ کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ غالباً اس کی بنیاد ظفر خاں نے علاؤالدین خلجی کے دور حکومت میں ڈالی تھی۔

عین الملک اور اس کے بھائیوں نے سلطان کے امدادی کاموں میں اسکی مدد کے لیے سخت محنتیں کی تھیں۔ وہ پچاس ہزار من گیہوں اور چاول روزانہ شاہی خیمہ میں بھیجا کرتا تھا۔[1] اس کے علاوہ اس نے ستر سے لے کر اسّی لاکھ ٹنکے نقدی اور اشیا کی شکل میں سلطان کے پاس دہلی اور سورگ دواری بھیجا تھا جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جاچکا ہے۔[2]

عین الملک کے ان کارناموں اور عوام پر اس کی گرفت نے سلطان کو اسکی طرف سے مشتبہ کر دیا۔ اس شک وشبہ کی مزید توثیق اس بات سے ہوئی کہ قحط سالی کے زمانہ میں جب سلطان نے ترک وطن کو ممنوع قرار دے دیا تھا تو بہت سے امراء، افسران اور دیگر لوگ خاص طور پر سکریٹریٹ میں کام کرنے والے (نویسندگان) اودھ اور ظفر آباد چلے گئے اور عین الملک کی پناہ میں آگئے۔ ان لوگوں میں سے چند غبن کے معاملات میں ملوث تھے۔ عین الملک اور اس کے بھائیوں نے ان کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا۔ یہاں تک کہ ان کو گاؤں بھی (بطور جاگیر) دیے گئے۔[3]

سلطان نے عین الملک کو دولت آباد منتقل کر دینے کے متعلق سوچا جہاں عین الملک جیسے عظیم المرتبت اور صاحب بصیرت سیاست داں اور انتظام کار کی ضرورت تھی۔ قتلغ خاں اس کام کے سلسلہ میں خود کو نااہل ثابت کر چکا تھا لیکن عین الملک نے اس منتقلی کو اپنے اثر ورسوخ کو گھٹائے جانے کے لیے ایک تدبیر اور اپنی آخری تباہی کا پیش خیمہ سمجھا۔ تارک الوطن امرا اور نویسندگان نے عین الملک کو یہ یقین دلایا کہ سلطان اسے دکن بھیجنے کے سلسلہ میں مخلص نہیں تھا۔ اور یہ کہ وہ سازشی کھیل کھیل رہا تھا۔[4]

ایک دن محمد بن تغلق نے عین الملک کو ایک پیغام بھیجا جس میں ان لوگوں کی محافظت کو خلاف مصلحت بتایا گیا تھا اور انہیں بیڑیوں میں جکڑ کر فوراً دہلی بھیج دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ عین الملک کے شبہ کی مزید توثیق ہو گئی۔ اور وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ نکل بھاگنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ ایک رات اس نے سورگ دواری کے کیمپ کو چھوڑ دیا

---

(1) رحلہ ص: 105

(2) فیروز شاہی، ص: 486

(3) ایضاً، ص: 486

اور اپنے بھائی سے جاملا جس نے سلطان کے ان سارے ساز و سامان پر قبضہ کر لیا تھا جو اس کے سپرد تھے۔[5] اس فرار کی اطلاع محمد بن تغلق کو ایک غلام ابن ملک شاہ نے پہنچائی جو عین الملک کے ساتھ رہا کرتا تھا۔[6]

سلطان نے جو اس وقت دو آب میں تھا اپنے آپ کو ایک نہایت نازک صورتِ حال میں پایا۔ وہ دار السلطنت سے اتنے دور (علاقے میں) بغاوت کو کچلنے کے لیے فوجوں کو اکٹھا نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے دار السلطنت واپس ہو کر کافی آدمیوں اور ساز و سامان کے ساتھ دوبارہ آنے کے متعلق سوچا لیکن غیر ملکی امرا نے، جو ہندستانی امراء کے لیڈر عین الملک کے سخت مخالف تھے، سلطان کو فوری اقدام کا مشورہ دیا۔ نصیر الدین ادہری نے مشورہ دیا کہ ایک فوری حملہ عین الملک کو اپنی فوجوں کو منظم کرنے میں حارج ہو گا۔ اس مشورہ نے ملکی امرا کو جو اپنے دلوں کی گہرائیوں میں عین الملک سے ہمدردی رکھتے تھے، مایوس کر دیا۔[7] محمد بن تغلق نے اپنی فوجوں کو سامانہ، امروہہ، برن، کوئل اور دیگر شہروں سے بلایا اور دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لیے ایک انوکھی چال چلی۔ اگر ایک سو آدمی باہر سے شاہی خیمہ میں آتے تو ایک ہزار آدمی ان کے استقبال کے لیے باہر آتے اور اس طرح انہوں نے تاثر دیا کہ ہر اطراف سے بڑی تعداد میں شاہی کمکیں پہنچ رہی ہیں۔ سلطان نے تیزی سے قنوج کی طرف پیش قدمی کی اور خود کو قلعہ بند کر لیا۔ اور اس طرح فوجی اہمیت کا ایک مقام حاصل کر لیا۔

عین الملک اور اس کے بھائیوں نے بنگرمؤ کے نزدیک گنگا کو عبور کیا۔ انہوں نے سلطان کے خیمہ پر حملہ کرنا چاہا لیکن غلطی سے وہ وزیر کے خیمہ میں پہنچ گئے۔ وزیر کی فوج ایسے عناصر پر مشتمل تھی جو ہندستانی امرا کے سخت مخالف تھے، ایرانیوں ترکوں

---

(4) ایضاً، ص:486

(5) ایضاً، ص:489

(6) رحلہ، ص:105، ابن بطوطہ ہمیں مزید بتاتا ہے کہ "ہندستان کے بادشاہوں کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر امیر کے ساتھ، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، اپنا ایک غلام رکھتے جو ایک جاسوس کی حیثیت سے کام کرتا اور اس امیر کے متعلق تمام باتوں سے بادشاہ کو مطلع رکھتا۔"

(7) ایضاً، ص:6-105

اور خراسانیوں نے جن پر وزیر کی فوجیں مشتمل تھیں[1]، اچھی طرح جنگ لڑی لہٰذا عین الملک کی فوجیں میدان سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔[2] عین الملک کے ایک اہم رفیق کار ملک ابراہیم منجی نے غداری کی اور کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اسے گھوڑے سے نیچے کھینچتے ہوئے وزیر کے پاس لے آیا۔ عین الملک کے بھائی یا تو گنگا عبور کرنے کی کوشش کرتے وقت غرقاب ہو گئے یا جنگ میں مار ڈالے گئے۔[3]

عین الملک کو بری طرح سے ذلیل و رسوا کیا گیا۔ اسے ایک بیل پر سوار ہونے کو کہا گیا۔[4] اس کا جسم برہنہ تھا سوائے ایک مختصر کپڑے کے جس نے اس کے نجی حصوں کو چھپا رکھا تھا۔ ملک اور امرا کے بیٹوں نے اس کے چہرے پر تھوکا، اسے برا بھلا کہا اور گالیاں دیں۔[5] جب محمد بن تغلق کے سامنے اس حالت میں پیش کیا گیا تو سلطان بہت زیادہ متاثر ہوا اور اسے معمولی کپڑے دیے جانے کا حکم دیا۔ عین الملک کے ہاتھوں کو اس کی گردن سے باندھ دیا گیا تھا اور پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ اس کے تقریباً 62 ساتھیوں کو بے رحمی سے ہاتھیوں سے روندوا دیا گیا اور ان کے گوشت عین الملک پر پھینکے گئے۔ بغاوت کو کچلنے کے بعد سلطان سالار مسعود غازی کے مقبرے کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ اور وہاں سے دہلی واپس ہو گیا۔

عین الملک کو اس کی شکست کے چوتھے دن معاف کر دیا گیا۔ اور ایک شاہی باغ کا نگراں مقرر کر دیا گیا۔ اسے ایک خلعت اور ایک گھوڑا دیا گیا۔ اس کے لیے خورد و نوش کے سامان شاہی گودام سے بھیجے جاتے۔ عین الملک کی بحالی کے سلسلے میں عفیف کا بیان مندرجہ ذیل ہے:

”سلطان نے ایک عام دربار منعقد کرایا اور اس کے تخت کے نزدیک ایک

---

(1) بنگر مؤ اسی نام کے ایک پرگنہ کے مرکز میں واقع ہے، جو اس جگہ سے ہردوئی جانے والی سڑک پر اناؤ سے شمال مشرق میں 31 میل کے فاصلہ پر ہے۔

(2) ایضاً، ص:107

(3) ایضاً، ص:9-108

(4) ایضاً، ص:108، یحییٰ سرہندی لکھتا ہے کہ ”ابراہیم بنگی نے اسکی ٹوپی اتروا کر اور ایک گدھے پر بٹھا کر اسے سلطان کے سامنے پیش کیا۔“

چھوٹی قالین بچھائی گئی۔ اس نے ہر چہار جانب سے قاضیوں، علماء، شیوخ، خواتین، ملک امراء اور عام لوگوں کو بلایا۔ کچھ وقفہ بعد دربار کے خیر خواہ اکٹھا ہو گئے۔ انہوں نے اپنی پیشانیاں خاکسارانہ اطاعت میں زمیں سے رگڑیں اور اپنی اپنی جگہوں پر پورے ادب واحترام کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ تب سلطان محمد نے درباریوں کو زیادہ قریب ہونے کا حکم دیا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو اس نے کہا "میں تم لوگوں کے سامنے ایک سوال رکھتا ہوں۔ اگر کسی شخص کا ایک انمول جوہر گم ہو جائے اور کچھ دنوں بعد وہ اسے گندگی میں پڑا ہوا پالے تو کیا وہ اسے اٹھا لے گا یا اسے وہیں چھوڑ دے گا؟" مملکت کے امراء اور افسران نے جواب دیا: "اسے اٹھا لینا چاہیے، اسے وہیں چھوڑ دینا دانشمندی کے خلاف ہوگا۔" یہ جواب سن کر سلطان نے عین الملک کی طرف اشارہ کیا اور بولا: "میرا وہ جوہر عین الملک ہے جو بد قسمتی سے اپنے بے سلیقہ بھائیوں کی صحبت میں پڑ کر گمراہ ہو گیا تھا، میں نے اسے اٹھا لیا اور اس میں اپنے جوہر کو پالیا ہے۔" یہ حکم دیا گیا کہ عین الملک کو مذکورہ بالا قالین پر بٹھایا جائے۔[5]

محمد بن تغلق کے دورِ حکومت کے بقیہ سالوں میں عین الملک کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا لیکن جب سلطان نے اپنی آخری سانسیں لیں اس وقت ہم اسے ملتان میں پاتے ہیں۔ شہاب سلطانی کو بھی ایک باغ کا انچارج مقرر کیا گیا تھا۔

شاہو افغان کی بغاوت

742ھ / 1341ء میں شاہو افغان نے ملتان کے گورنر بہزاد کو مار ڈالا اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ محمد بن تغلق اس سے نمٹنے کے لیے دہلی سے روانہ ہوا۔ راستہ میں اسے اپنی ماں مخدومہ جہاں کے انتقال کی خبر ملی لیکن اپنے غم و افسوس کے باوجود اس نے اپنی روانگی جاری رکھی۔ دیپال پور کے قریب اسے معلوم ہوا کہ شاہو "افغانوں کے ملک" جس کی وضاحت ابن بطوطہ نے کھمبات، گجرات اور نہروالا سے کی ہے جہاں افغان رہتے تھے۔ بھاگ گیا ہے۔ باغیوں کو گوارا کر لینا سلطان کی پالیسی کے خلاف تھا۔ اس نے اپنی سرزمین میں افغانوں کو بڑے پیمانہ پر گرفتار کیے جانے کا

---

(5) ایضاً، ص:108

حکم نافذ کر دیا۔[1]

خلافت بحیثیت ایک حفاظتی دیوار (GLACIS)

قحط کے آخری سالوں میں (لگ بھگ 1339ء) محمد بن تغلق نے خلافت کے ادارے میں حد سے زیادہ گہری دلچسپی دکھلائی۔ برنی کے مطابق[2]، اس نے خلیفہ کے متعلق اور سقوط بغداد کے خلافت کی صورتِ حال کے متعلق متواتر تحقیقات کیں اور جب اسے مصری خلیفہ کے متعلق معلوم ہوا تو وہ اتنا خوش ہوا کہ اگر راستہ کے بحری قزاقوں اور ڈاکوؤں کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ خلیفہ کے پاس اپنی ساری دولت ہی بھیج دیتا۔ کیا خلافت کے لیے یہ عزت واحترام واقعی تھا یا مسلم ذہن پر خلافت کے غیر معمولی اخلاقی وقار کے ذریعہ مسلم عوام، خاص طور پر مذہبی گروہوں کی مخالفت کو زائل کرنے کے لیے یہ محض ایک بہلاوا تھا؟ اور کیا (خلیفہ کا) ایسا وقار تھا؟ یہ بات اگر ناممکن نہیں تو بعید از قیاس ضرور معلوم ہوتی ہے کہ باہری دنیا سے اپنے سیاسی اور ثقافتی روابط کے باوجود سلطان کئی دہائیوں تک اس بات سے ناواقف رہا ہو کہ مصر میں ایک عباسی خلیفہ موجود تھا۔ خلیفہ کی یہ مبینہ دریافت شاید خلافت پر اس کے اظہار اعتقاد میں تاخیر کی محض ایک وضاحت تھی۔ بہر حال یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ اخلاقی اور قانونی اختیار کے واحد سرچشمہ کی حیثیت سے خلافت پر سلطان کے نظریہ پرستانہ اظہارِ یقین کا زمانہ وہی ہے جو اس کی مملکت میں شدید کشمکش کا اور علما کی مخالفت کے ذریعہ پیدہ شدہ مسائل کا زمانہ تھا۔ 741ھ/ 1340-41ء سے 752ء/ 1351ء تک اس کا وقت اور اس کی طاقت ان بغاوتوں سے نمٹنے میں صرف ہوئی۔ جو ہر طرف سے اژدہے کے دانتوں کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید خلیفہ کے نام کے استعمال کے ذریعہ وہ عوام کا اعتماد حاصل کر کے صورتِ حال کو بہتر بنا سکتا تھا۔

سیرت فیروز شاہی[3] کا گمنام مصنف لکھتا ہے کہ کتابوں کے وسیع مطالعہ کی بنا پر

---

(1) عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص: 408

ابراہیم تنگی نے اس کی ٹوپی اتروا کر اور ایک گدھے پر بٹھا کر اسے سلطان کے سامنے پیش کیا۔"

(2) ایضاً، ص: 491 الخ

(1) سیرت مخطوطہ، ورق: 139

اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ سیاسی اختیارات کے جائز استعمال کے لیے خلیفہ کی منظوری قطعی ضروری تھی۔ لیکن تاریخ الفی ہمیں بتاتی ہے کہ یہ سلطان کا استاد قتلغ خاں تھا جس نے یہ حقیقت اس کے دماغ میں ڈال دی تھی۔ لیکن یہ کہ سیاسی اختیارات کے جائز استعمال کے لیے خلیفہ کی منظوری کی قطعی ناگزیری کا خیال اس کے ذہن میں ایک خاص وقت ہی میں پیدا ہوا۔ یہ بات محض ایک اتفاق نہیں ہو سکتی تھی، یہ اس کے ترکش کا آخری تیر تھا جسے وہ باغیوں کی جماعت کے خلاف استعمال کر سکتا تھا اور بدر چچ کا یہ تبصرہ اہمیت کا حامل ہے کہ خلیفہ کے منشور کی حصولی نے اس کے دشمنوں کو سراسیمہ کر دیا۔[1]

محمد بن تغلق نے 741ء / 1340-41 میں سکوں[2] پر سے اپنے ناموں کو ہٹا دیا کیونکہ وہ اپنے اقتدار اعلا، جسے خلیفہ کی منظوری حاصل نہیں ہوئی تھی کے جواز کے سلسلے میں شکوک وشبہات کی وجہ سے سخت اذیت میں مبتلا تھا۔ 742، 743 اور 744ھ میں جاری کیے گئے سکوں پر مستکفی باللہ کا نام کندہ تھا۔[3] اس بات کی اس سے زیادہ کوئی اہمیت نہ تھی کہ یہ محض ایک علامت کے ساتھ وفاداری کا اقرار تھا کیونکہ مستکفی باللہ کا 740ھ / 1339-40ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ بعد میں اس نے جمعہ اور عید کی نمازیں روک دیں اور اس وقت تک انہیں دوبارہ شروع نہ کیا جب تک کہ خلیفہ نے اس کے لیے عند نشینی کی ایک سند نہ بھیج دی۔ یہ منشور 744ھ / 1343ء میں الحکیم دوم سے وصول ہوا اور اس موقعہ کو بڑے تزک واحتشام اور کروفر سے منایا گیا۔ برنی[4]، ابن بطوطہ[5] اور بدر چچ[6]، سبھی اس بیان پر متفق ہیں کہ سلطان نے خلیفہ کے سفراء کی بڑی

---

(1) قصائد بدر چچ، ص: 14

(2) نیلسن رائٹ۔ دی کوائج، ص: 122 سکہ نمبر 491 الف

(3) ایضاً، ص: 49-148 سکہ نمبر 617 (ب)، 620، الف 621، 622، 622 الف، 623 الف

(4) فیروز شاہی ص: 492، برنی کے مطابق اسنے سعید صرصری کے قدموں کا بوسہ دیا جو اس کے لیے منشور اور خلعت لایا تھا۔

(5) رحلہ، ص: 172 الخ

(6) قصائد بدر چچ ص: 14

عزت افزائی کی۔ سیرت فیروز شاہی کے مطابق اس کے بعد سے ہر سال منشور سلطان کو بھیجے گئے۔ ممکن ہے کہ سلطان کے وہ چیتیاں سکے جن کی پشت پر اعداد (مثلاً 4، 5، 6، 7 اور 8) کندہ ہیں خلافت کے ساتھ اس کی وابستگی کی مدت اپنی سلطنت کے جائز وجود کی مدت کا یا سالانہ منشوروں کی وصولی کا اظہار کرتے ہوں۔

زراعت کی بحالی کے لیے سلطان کی کوشش

ہمیں اب بھی سلطان کے ایک نہایت دور اندیشانہ پروگرام پر غور وخوض کرنا باقی ہے جو بد قسمتی سے ناکام ہو گیا۔ زرعی دشواریوں اور قحط کے سالوں کے بعد زرعی پیداوار میں کمی کے مسائل پر اس نے بہت زیادہ غور وخوض کیا۔ برنی ہمیں بتاتا ہے کہ چار سالوں کے دوران (43-1340ء) جب سلطان دہلی میں تھا اس کی خصوصی توجہ زراعت کو معمول پر لانے کے کام پر لگی رہی لیکن سلطان کے کاموں میں غلطیاں تلاش کرنے کی کوشش میں برنی کچھ غلط بیانی کرتا ہے اور صحیح حالات کی وضاحت نہیں کرتا۔ عہدِ وسطیٰ کے کسان اس بات سے واقف تھے کہ بنجر زمین کو جوتا نہیں جاسکتا۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ بنجر یا نیم بنجر زمین میں فصلیں غیر معمولی محنت اور خرچ کے بعد ہی پیدا کی جا سکتی ہیں لہٰذا برنی سلطان کے ساتھ یہ بات منسوب کرنے میں غلطی پر ہے کہ ”ایک ہاتھ برابر زمین کو بھی غیر مزروعہ نہیں باقی رہنا چاہیے“۔ دوم یہ کہ مزروعہ زمین کی کمی نہ تھی اور ہم یہ بھی فرض کر سکتے ہیں کہ وہ کسان جو زندہ بچ گئے تھے اس مقصد کے لیے کافی تھے۔ لیکن جن چیزوں کی انھیں ضرورت تھی وہ بیج اور ہل بیل تھے۔ درحقیقت عہدِ وسطیٰ میں کاشت کاری کے لیے تمام ضروری اشیاء تھیں سلطان نے شروع میں کاشتکاروں کے لیے یہ تمام چیزیں مہیا کیں۔

ابن بطوطہ ہمیں بتاتا ہے کہ ”قحط کے سالوں میں سلطان نے دارالسلطنت کے باہر کنویں کھودنے اور وہاں فصلوں کی کاشت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے لوگوں کے لیے بیج اور ساتھ ہی ضروری رقموں کو مہیا کیا تھا۔ اور اس نے یہ کاشت کاری غلے کی کوٹھیوں کو بھرنے کے مقصد سے ان سے کرائی تھی۔[1] یہ ریاست

---

(1) رحلہ، ص 88

کے ذریعہ کاشتکاری کے قسم کا ایک تجربہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ لہٰذا اس نے ٹھیکہ پر کاشتکاری کے ایک دوسرے چارہ کار کی کوشش کی۔ آیا سلطان اس کام کو ایسے شخص کے بجائے جو اس کی مستقل ملازمت میں تھے ٹھیکہ داروں کے سپرد کردینے میں محتاط تھا یہ بات مشتبہ ہوسکتی ہے لیکن کسانوں کو اپنی ذاتی پسند کے مقابلے میں ریاستی احکامات کے مطابق فصلوں کی کاشت کی ہدایت دینے میں غالباً سلطان کے ذہن میں ملک کی تمام ضرورتیں پیشِ نظر تھیں۔

ان تنبیہات کو ذہن میں رکھ کر ہم برنی کے جزوی طور پر درست اقتباس کی نقل پیش کرسکتے ہیں:

"ان سالوں کے دوران جب سلطان دہلی سے کہیں باہر نہ گیا، اس نے زراعت کی ترقی اور کاشتکاری میں اضافہ کو اپنا اولین مقصد بنایا۔ سلطان نے زراعت کی ترقی کے لیے ضوابط (اسالیب) بنائے۔ اس مقصد کے سلسلہ میں سلطان کے ذہن میں جو کچھ آیا اسے قلم بند کرلیا گیا اور اسے "ضابطہ" کا نام دیا گیا۔ صرف کاغذ پر محدود ان ضوابط کا اگر نفاذ ہوپاتا اور لوگوں نے ان کو ناممکن نہ سمجھا ہوتا تو دنیا زراعتی پیداوار کی بدولت بہتر اشیا سے پُر ہوجاتی، کثیر رقم اکٹھا ہوجاتی اور ایک ایسی فوج بھرتی کی جاسکتی جو آباد دنیا کو فتح کرنے کے لیے کافی ہوتی"۔

زراعت کی ترقی کے پیشِ نظر دیوان امیر کوہ نامہ ایک شعبہ کی تشکیل کی گئی اور اس کے لیے افسران کو مقرر کیا گیا۔ ملک کو تیس کروہ طول عرض کے فرضی پلاٹوں (دائروں) میں دو شرائط پر منقسم کردیا گیا۔ ان تمام علاقوں میں ایک مٹھی بھر زمین بھی غیر مزروعہ نہ چھوڑی جائے اور فصلوں کو بدل بدل کر لگایا جائے۔ مثلاً بارلی کی جگہ پر گیہوں اور گیہوں کی جگہ پر گنا اور گنے کی جگہ پر انگور اور کھجور پیدا کیے جائیں۔ (ان فرضی مستطیل (پلاٹوں) میں) تقریباً ایک سو شقداروں کی تقرری کی جاتی تھی۔ لالچی، پریشان حال اور منچلے قسمت آزما حاضر ہوئے اور انھوں نے بنجر زمین (زمین اکھل) کے تین لاکھ بیگھے محض تین سالوں میں زیرِ کاشت لانے کی اور بنجر زمین سے تین ہزار گھوڑوں (؟)(کے اخراجات مہیا کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ انھوں نے اس بات کے لیے تحریری ضمانتیں دیں۔ ان ناعاقبت اندیش لوگوں کو، جنھوں نے بنجر زمین کی

کاشت کی زمین کی ذمہ داری سنبھالی تھی مختلف انعامات دیے گئے۔ آراستہ پیراستہ گھوڑے، زر کردہ پوشاکیں اور نقدبان، ان میں سے ہر ایک کو تین لاکھ ٹنکوں کا ایک قرض (سوندھار) دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور اس رقم میں سے پچاس ہزار ٹنکے فوری طور پر دیے گئے۔ یہ روپے جو انھیں ملے یہ گویا ان کے خون کی قیمت تھی۔ چونکہ بنجر زمین کی کاشتکاری نہ کی جا سکی لہٰذا انھوں نے روپے اپنی ضرورتوں پر صرف کر لیے اور اس کے بعد سزا کا انتظار کرنے لگے، دو سالوں کی مدت میں خزانے سے ستر لاکھ سے زیادہ ٹنکے ان لوگوں کو بطور قرض دیے گئے جن لوگوں نے بنجر زمین کی کاشتکاری کی ذمہ داری سنبھالی تھی (لیکن) تین سالوں کے دوران وہ ان بنجر زمینوں کے ایک 1/100 یا 1/1000 حصے کو بھی زیرِ کاشت نہ لا سکے جو ان کے سپرد کی گئی تھی۔[1]

امیران صدہ کی بغاوت اور بہمنی سلطنت کا ظہور

سلطان کی قوتیں اس کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں ان امیران صدہ کی بغاوتوں کو فرو کرنے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جنھوں نے کھمبات سے لے کر دولت آباد تک کی پوری فضا باغیانہ و غدارانہ خیالات سے مکدر کر دی تھی۔ ان بغاوتوں نے بالآخر ایک آزاد بہمنی سلطنت کے ظہور کے لیے راہ ہموار کر دی۔

امیران صدہ کی صورتِ حال کے متعلق ایک بات کہہ دینا ضروری ہے تاکہ اس زمانہ کی تاریخ میں ان کے رول کی وضاحت کی جا سکے۔ دراصل اس اصطلاح کا تعلق ترکوں اور منگولوں کی اس فوجی تنظیم سے ہے جو اعشاریاتی نظام (decimal system) پر تیار کی گئی تھی۔[2] برنی، کیقباد کو بغرا خاں کے اس مشورہ کا حوالہ دیتا ہے جس میں اعشارتی نظام کا تذکرہ فوجی تنظیم کی بنیاد کی حیثیت سے کیا گیا ہے[1]۔ ابتدائی ترکی عہد کے دوران امیران صدہ کے تمام تذکروں کا تعلق منگول سے تھا لیکن ہندستان میں اس کی خود اپنی کچھ خصوصیات رونما ہوئیں۔ اس کی خالص عسکری تعبیر

---

(1) فیروز شاہی، ص ص 99-497

القلقشندی، محمد بن تغلق کے متعلق لکھتا ہے کہ "اس کی فوج کے افسران، خان، ملک، امیر،

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے ساتھ ساتھ کچھ سِول اور انتظامی کاموں کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ ڈاکٹر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں کہ "سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ امراء سو آدمیوں کے کمانڈر تھے جیسا کہ بسا اوقات کہا جاتا ہے یا یہ وہ افسران تھے جنہیں سو گاؤں کا انچارج مقرر کیا گیا تھا اگرچہ برنی کے متن کی بحیثیت مجموعی ایک محتاط تفتیش یہ نتیجہ بر آمد کرتی ہے کہ یہ لوگ ایسے افسران تھے جو فوجی اور سول دونوں ہی کام انجام دیتے تھے اور جن میں سے ہر ایک کی کمان میں سو آدمی تھے[4]۔ اگرچہ امیران صدہ کے ماتحت رکھے گئے سپاہیوں کی تعداد کے متعلق کوئی متعین شہادت دستیاب نہیں ہے لیکن اس خیال کی کہ افسران سول کاموں کو بھی انجام دیا کرتے تھے، حاجی الدبیر کے ذریعہ بڑی وضاحت سے توثیق ہو جاتی ہے۔ اس کے مطابق دو آب میں امیران صدہ کو "ٹیکس وصول کرنے والوں" (عمال) کی نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔[4]

دکن کے انتظام و انصرام کے لیے سلطان کے نئے پروگرام نے امیران صدہ سے مخالفت کی جڑیں اور گہری کر دیں۔ نیا پروگرام یہ تھا، دکن کو ملک سر دواتدار، ملک مخلص الملک، یوسف بغرا اور عزیز خمار کی ماتحتی میں چار اکائیوں میں منقسم کر دیا جائے۔ ان چار افسران کو دولت آباد میں متعین ایک وزیر کے تحت کام کرنا تھا، عماد الملک سر تیز کو دکن کا وزیر اور ایک ہندو، دھارا کو نائب وزیر بنانا تھا۔ لیکن نئے پروگرام کے صرف دو حصوں پر ہی عمل در آمد کیا جا سکا۔

(الف) قتلغ خاں کو دولت آباد سے واپس بلا لینا۔ چند مورخین مثلاً برہان معاصر کا مصنف، دکن میں قتلغ خاں کی کارگزاریوں کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ لیکن

(بقیہ)

سپہ سالار ہیں اور تب معمولی سپاہ … خان، دس ہزار گھوڑا سوار، ملک، ایک ہزار، امیر، ایک سو اور سپہ سالار اس سے کم کے مالک ہوتے۔ صبح الاعشاء (ابن عرب اکاؤنٹ آف انڈیا ان دی 14 سنچوری، ص ص 67-66)

(3) فیروز شاہی، ص 145

(4) قران السعدین، علی گڑھ ایڈیشن، دیباچہ، ص 18، فیروز شاہی، ص 219

(4) قراونہ ترکوں کی تاریخ، ص 209

برنی قطعی طور پر یہ کہتا ہے کہ اس کے زیرِ انتظام دکن کی آمدنی بہت کم ہو گئی تھی اور یہ کہ وہ اس علاقہ کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ سلطان نے اسے واپس بلالیا اور چونکہ غالباً عماد الملک سرتیز فوری طور پر دستیاب نہ تھا لہٰذا اس نے قتلغ کے بھائی، نظام الدین کو جو عظیم الملک[1] کے نام سے بھی معروف تھا، اُس کی جگہ پر بھیجا۔ چونکہ قتلغ خاں سلطان کے غیض و غضب سے لوگوں کو بچانے کے لیے مشہور تھا لہٰذا امیران صدہ اس تبدیلی سے ناخوش تھے اور انھوں نے اسے اپنے خلاف تعزیری اقدام کا ایک پیش خیمہ سمجھا۔ لیکن یہ بات مشکوک ہے کہ صرف ایک اعلا افسر کی منتقلی ہی ان کی بغاوت کا باعث بنی۔ اگر ان کی سرزنش کے سلسلہ میں سلطان کا مصمم ارادہ ایک تلخ اور واضح حقیقت بن گیا ہوتا۔

(ب) عزیز خمار کی تقرری: سلطان عزیز خمار کو گورنر کی حیثیت سے مالوہ بھیجا اور اسے کئی لاکھ ٹنکے عطا کیے تاکہ وہ وہاں طاقت اور عزت کے ساتھ رہ سکے۔ سلطان نے اس سے کہا "اے عزیز! تم دیکھ رہے ہو کہ کس طرح ہر سمت سے بغاوتیں سر اٹھا رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جو بھی بغاوت کرتا ہے وہ امیران صدہ کی حمایت کی بنا پر ایسا کرتا ہے اور یہ کی امیران صدہ مال غنیمت اور لوٹ مال سے فائدہ اٹھانے کی امید میں ان باغیوں کے مددگار بن گئے ہیں۔ کسی کے لیے بغاوت کرنا بس اسی وجہ سے ممکن ہو جاتا ہے۔ ادھر دیکھو! دھار کے امیران صدہ میں تم جسے بھی فتنہ پرور پاؤ اسے تم جس طرح بھی ممکن ہو سکے کچل ڈالو۔[1] یک سنگدل شخص کے لیے اس طرح کے غیر محدود اختیارات کی منظوری کا محض ناجائز ہی استعمال عمل میں آسکتا تھا۔ عزیز خمار نے دھار پہنچ کر واقعی ایک دہشت پسندگی کی حکومت کا آغاز کیا۔ اس نے تقریباً نواسی امیران[2] صدہ کو گرفتار کر کے انہیں پھانسی دلوادی۔ ان پھانسیوں کی خبر نے دولت آباد اور گجرات میں دہشت اور بے چینی کی ایک لہر دوڑا دی۔ جہاں کہیں بھی کوئی امیر صدہ تھا وہ مشتبہ اور محتاط ہو گیا۔[3] جب سلطان کو ان پھانسیوں کی اطلاع ہوئی تو اس نے عزیز کے کارنامہ کی تعریف کی۔ اس نے عزیز خمار کو ایک خاص خلعت روانہ کی اور تمام معزز

---

(1) گجرات کی تاریخ، جلد 3، ص 873 الخ

(2) عصامی اور یحییٰ سرہندی اسے علیم ملک لکھتے ہیں۔

درباریوں کو حکم دیا کہ وہ عزیز کو اس کے کام کی تعریف میں[3] خطوط لکھیں۔ امراء کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ عزیز خمار کو پوشاکوں اور گھوڑوں کے تحائف بھیجیں۔[4] یہ بات امیران صدہ کے ساتھ بے دردانہ نمٹنے کے سلسلہ میں سلطان کے مستحکم فیصلہ کا ایک عام اعلان تھی۔ اور اس بات نے فطری طور پر انہیں اپنی جدو جہد میں جواب بقائے زیست کی جدو جہد تھی اور زیادہ ثابت قدم بنادیا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی نافرمانیوں اور ناشائستہ حرکتوں نے اب منظم بغاوتوں نے جنگوں کی صورت اختیار کر لی۔

گجرات میں بغاوت

برنی عصامی اور ابن بطوطہ ان حالات کے متعلق مختلف بیانات پیش کرتے ہیں جو دابھوئی اور بڑودہ میں افراتفری کا باعث بنے۔ لیکن ان کے بیانات میں کوئی تضاد نہیں اور انہیں ایک دوسرے سے منسلک سمجھا جا سکتا ہے گرچہ ان کے تسلسل کو متعین کرنا مشکل ہے۔

(۱) ابن بطوطہ کہتا ہے کہ سلطان نے گجرات کے نائب وزیر مقبل کو قاضی جلال اور افغانوں کے ایک گروہ کو گرفتار کرنے کو لکھا تھا۔ سلطان کے ایک رشتہ دار اور مقبل کے شریک کار ملک الحکماء نے یہ راز افغانوں پر افشا کر دیا جو فوراً ہی بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تین سو افغانوں نے جنھیں مقبل نے مار ڈالنے کا ارادہ کیا تھا کھمبات پر حملہ کر دیا اور خزانہ کو لوٹ لیا۔[4]

(۲) عصامی لکھتا ہے کہ سلطان کے حکم پر مقبل کے ذریعہ متعدد اشخاص کے قتل کر دیئے جانے کے بعد جورنبال۔ قاضی جلال۔ حلاں ابن لالہ اور جھلو ایک مقام پر اکٹھا ہونے اور سنجیدگی سے سلطان کے خلاف بغاوت کرنے کا حلف اٹھایا۔[2] وہ سرکاری افسران جو ان کی جائداد کی قرقی اور انہیں گرفتار کرنے کے لیے آئے تھے خود ہی گرفتار کر لیے گئے چنانچہ مقبل ان کے خلاف روانہ ہوا۔

---

(3) فیروز شاہی، ص 503

(4) رحلہ ص-14-15

(5) ایضاً، ص 504

(۳) برنی کے مطابق مقبل رقوم اور گھوڑوں کو جب دہلی لے جا رہا تھا تب بڑودہ اور دابھوئی کے امیران صدہ نے خزانوں کو چھین لیا اور ان چند تاجروں کے سامانوں کو بھی لوٹ لیا۔ جو اس کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اس طرح پر مقبل کا وہ تمام خزانہ لوٹ لیا گیا اور وہ انہلوارہ واپس ہو گیا۔

اس طرح پر جو دولت باغیوں کے ہاتھ لگی تھی وہ دہلی کے سلطان کے خلاف ایک تحریک کی تنظیم میں ان کے لیے ایک وسیلہ بن گئی۔ برنی کا خیال ہے کہ ''دابھوئی اور بڑودہ کے امیران صدہ کی بغاوتوں نے پورے گجرات میں ایک سنسنی پھیلا دی[2]، اور صرف ایک چال کی بنا پر مقبل اپنی زندگی کو بچا سکا[3]۔

باغیوں کی کھبات کی جانب روانگی

چار باغی لیڈران تب کھمبات کی جانب روانہ ہوئے اور اس پر قبضہ کر لیا۔ شہر اخی نامی ایک شخص کے سپرد کر دیا گیا[4]۔ سابق شحنا بارگاہ طغی یہاں پر بیڑیوں اور زنجیروں میں ایک جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ باغیوں نے اسے آزاد کر دیا اور ایک کلاہ (ٹوپی) اور ایک قبا (پوشاک) دے کر اسے باغی گروہ کا پانچواں لیڈر منتخب کر لیا لیکن طغی ان کے پاس تیسرے دن ہی بھاگ نکلا اور پٹن (انہلوارہ) پہنچ کر مقبل سے جا ملا۔

ان شکستوں کی خبر مالوہ کے گورنر عزیز خمار کو پہنچی اور سلطان کی ہدایات کا انتظار کیے بغیر وہ مقبل کی مدد کے لیے چل پڑا[5]۔ چاروں باغی لیڈروں نے بھی اپنی تیاریاں کیں اور اپنے سپاہیوں کو ترتیب دیا۔ عصامی کے مطابق شاہی فوج چھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جب کہ باغی فوج سو سواروں سے زیادہ نہ تھی۔ شاہی فوج کی بلا سمجھے بوجھے ترتیب دی گئی تھی۔ طغی مقدمۃ الجیش کی قیادت کر رہا تھا اور عزیز خمار قلب لشکر کی اور مقبل داہنے بازو کی کمان سنبھالے تھا۔ باغی اپنی تعداد کی کمی کی بنا پر روایتی انداز پر اپنی فوج کی ترتیب کی کوشش نہ کر سکے تھے۔ عزیز خمار دشمنوں کی

---

(1) ابن بطوطہ ایک تاجر ابن الکولامی کا نام بتاتا ہے جس نے ''سکندریہ میں ایک بہترین اسکول'' کی تعمیر کی تھی۔ رحلہ (ص 114) بھی ملاحظہ ہو جہاں وہ کچھ ناموں کا ذکر کرتا ہے۔

(2) فیروز شاہی ص 504

صفوں کے قلب پر بے دھڑک پل پڑا۔ اور ایک ایسے بھنور میں پھنس گیا جس سے وہ باہر نہ نکل سکا۔ قاضی جلال نے ایک کمیں گاہ سے اس پر حملہ کر دیا اور تمام باغی لیڈران نے مختلف سمتوں سے ایک متحد حملہ کر دیا۔ عزیز خمار گرفتار کر لیا گیا اور مار ڈالا گیا۔ مقبل کی مکمل شکست ہوئی۔ باغیوں نے مال غنیمت کو ایک خیمہ میں اکٹھا کیا اور اسے چاروں لیڈروں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔[6] باغیوں کے ذریعہ شاہی فوجوں کی یہ پہلی اہم شکست تھی اور اس نے ان میں بڑی جرات مندی پیدا کر دی۔

دہلی سے سلطان کی روانگی

عصامی کہتا ہے کہ جب سلطان کو عزیز کی ہلاکت کی خبر ملی تو وہ دہلی سے گجرات کے لیے روانہ ہوا۔[7] لیکن برنی قطعی طور پر بیان کرتا ہے کہ سلطان ماہ رمضان 744 / ء جنوری 1344 کے اخیر میں دہلی سے روانہ ہوا تھا، جب اسے دابھوئی اور بڑودہ کی بغاوتوں کی خبر ملی تھی اور وہ اس وقت سلطان پور میں تھا جب اسے عزیز خمار کی گجرات کو روانگی کی اطلاع ملی تھی۔ سلطان کی نقل و حرکت اور دہلی کی جانب (کے واقعات) کے متعلق برنی کی تفصیلات عصامی کے مقابلہ میں زیادہ قابل بھروسہ ہیں۔ کشمکش کے دیگر پہلو کے سلسلہ میں عصامی اپنے بیان میں زیادہ مفصل ہے۔

جب محمد بن تغلق نے باغیوں کے خلاف بذات خود روانگی کا فیصلہ کیا و قتلغ خاں نے برنی کے وساطت سے یہ پیغام بھیجا کہ دابھوئی اور بڑودہ کے امیران صدہ کے خلاف سلطان کا بذات خود نہ ہونا اس کی شان کے خلاف ہے۔ چونکہ وہ لوگ عزیز خمار

---

(3) ایضاً، ص 504

(4) فتوح السلاطین ص 504

(5) ایضاً، ص 505

(6) ابن بطوطہ کے مطابق ملک جہاں مبقل سات ہزار گھوڑا سواروں کی سرکردگی میں ملک عزیز خمار کی مدد کے لیے آیا تھا۔ لیکن ان تمام کو شکست ہو گئی۔ رحلہ۔ ص 114

(7) فتوح السلاطین، ص ص 9 408

کے بے رحمانہ اور غیر دانشمندانہ طور پر گردن زدنی کے احکام کی وجہ سے مخالف بن گئے تھے لہٰذا یہ عین ممکن تھا کہ سلطان کی آمد کی خبر سنکر فوراً بھاگ جائیں گے۔ قتلغ خاں نے مہم کی قیادت کی اور شہاب سلطانی اور علی شاہ کی طرح باغیوں کو سلطان کے سامنے پیش کرنے کی پیشکش کی لیکن سلطان نے اس کی درخواست کو نظرانداز کر دیا اور گجرات کی روانگی کے لیے تیاریوں کا حکم دیا اب تک سلطان ایسے ہی اشخاص کے خلاف بذات خود روانہ ہوا کرتا تھا جو حکمراں طبقہ کے اعلا درجہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انتظامیہ کے نچلے درجہ کے افسران کے خلاف یہ اس کی پہلی مہم تھی۔ سلطان بڑی کامیابی سے امرائے اعلا کے حملوں سے نمٹتا آیا تھا اور ان کا استیصال کرتا آیا تھا لیکن امیران صدہ جیسے نچلے طبقہ کے منتظم کاروں نے جب اس کے اقتدار کو للکارا تو اس کی پوری انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی۔ سلطان نے گرشسپ اور ایبہ جیسے لوگوں کو کچل ڈالا تھا لیکن مختلف اور بے میل پس منظروں سے ماخوذ ان اراذل وانفار کے سامنے وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گیا۔ بدلے ہوئے حالات کی بڑی وجہ مرکزی فوج کی کمزوری تھی جو مکمل ایک دھائی بعد بھی طاعون کے اثرات سے پنپ نہیں سکی تھی۔ صرف سلطان ہی کے زیر قیادت اس فوج کی کامیابی کی کچھ توقع کی جا سکتی تھی۔ امیران صدہ ان تمام وقار واثر ورسوخ کے باوجود جس کے بعد میں وہ حامل ہوئے۔ شاہی حکومت کے مراتب میں اعلیٰ مقام نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ بات یقیناً اہمیت کی حامل ہے کہ عصامی، بہمنی سلطنت کے بانی کے اس پس منظر کا تذکرہ کرنے سے پرہیز کرتا ہے۔

گجرات میں بغاوت شروع ہونے سے پہلے سلطان نے اس صوبہ کی گورنری اجودھان کے شیخ علاؤالدین کے بیٹے شیخ معزالدین کے سپرد کر دی تھی۔ جب سلطان نے بذات خود روانگی کا فیصلہ کیا تو اس نے شیخ معزالدین کو تین لاکھ ٹنکے کی ادائیگی کا ایک فرمان جاری کیا تاکہ وہ دو تین دنوں کے اندر ایک ہزار گھوڑاسواروں کا ایک دستہ بھرتی کر کے تیار رکھ سکے۔[1] عصامی اس موقعہ پر شاہی فوجوں کی کمزوری کا ایک نہایت باتفصیل بیان پیش کرتا ہے۔[2] وہ لکھتا ہے کہ گھوڑاسوار سپاہیوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ وہ

---

(1) فیروز شاہی، ص508

(2) فتوح السلاطین، ص ص 12-510

چار ہزار سے آگے نہ بڑھ سکی۔ فوج مکمل طور پر ایک شکست خوردگی کی حالت میں۔ گھوڑے بے جان تھے اور سپاہی غیر مستعد"۔[1]

اس سے قبل سلطان اس مہم پر روانہ ہوا اس نے اپنی غیر حاضری میں مملکت کی دیکھ بھال کے لیے ملک کبیر۔ ملک فیروز اور خواجہ جہاں احمد ایاز پر مشتمل ایک نیا بستی کاؤنسل نامزد کر دی۔ برنی اور عفیف دونوں ہی کے مطابق کاؤنسل کا صدر، جسے سلطان کی طرف سے بھی کام کرنا تھا۔ ملک کبیر تھا جو قبولا کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز ایک غلام کی حیثیت سے کیا تھا اور اعلاترین ممکن پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ سلطان کے حکم پر کبیر نے اپنی خدمات کی پیشکش کرتے ہوئے خلیفہ کو لکھا تھا لہٰذا وہ عملاً خلیفہ کا بھی ایک افسر تھا۔ وہ بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ بہر کیف سلطان اپنی پالیسیوں کی عمل در آمدی میں اس پر بھروسہ کر سکتا تھا۔

سلطان نے کچھ دنوں سلطان پور میں قیام کیا کیونکہ ماہ رمضان کے تین یا چار دن اب بھی باقی تھے۔ وہاں اپنی قیام کے دوران اسے عزیز خمار کا یہ پیغام ملا کہ دابھوئی اور بڑودہ کی بغاوت کی خبر سن کر اس نے باغیوں کو کچلنے کے لیے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ سلطان نے اس خبر سے سخت ناراض ہوا اور بولا! عزیز جنگ کے فن سے ناواقف ہے اور وہ باغیوں کے ذریعہ ہلاک کیا جا سکتا ہے۔[2] اس کے فوراً بعد یہ خبریں موصول ہوئیں کہ عزیز گرفتار ہو کر میدان جنگ میں مارا جا چکا ہے۔ سلطان ان خبروں پر سخت مضطرب ہوا اور ایک رات اس نے مملکت میں شورشوں کے اسباب پر برنی سے تبادلہ خیال بھی کیا۔[3]

برنی اور عصامی کے بیانات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سلطان کی عسکری

---

(1) ایضاً، ص 511

(2) فیروز شاہی ص 509

(3) ایضاً، یہ بات ذہن نشین رکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ عصامی کہتا ہے کہ عزیز جنگ کے فن سے ناواقف تھا۔ فتوح السلاطین، ص 507

پالیسی مناسب مقامات پر قیام کرنے کی تھی غالباً اس لیے کہ نئے مزید ذرائع فراہم کیے جا سکیں اور مختلف جگہوں سے فوجوں کو مختلف مقامات پر بھیجا جا سکے امیران صدہ کی سرگرمیاں بڑی وسیع تھیں اور مختلف سمتوں میں ان پر قابو پانا اور نمٹنا تھا۔ عصامی لکھتا ہے کہ سلطان کو کئی ماہ ناگور میں قیام کرنا پڑا جہاں اسے چاروں کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑا۔[1] ناگور سے اس نے اعظم ملک کو بھڑوچ بھیجا۔[2] کوہ ابو سے اس نے شیخ معزالدین کو انہلوارہ بھیجا اور بھڑوچ سے اس نے ملک مقبل کو دولت آباد کی جانب روانہ کیا۔[3]

سلطان نے باغیوں کو للکارنے کے لیے ایک مقدم دستہ دابھوئی اور بڑودہ روانہ کیا۔ بیشتر سرکشوں کو مار ڈالا گیا لیکن ان میں سے چند اپنے خاندانوں کے ساتھ دولت آباد بھاگ نکلے۔[4]

سلطان نے اعظم ملک کو سو گھوڑا سوار سپاہیوں کے ساتھ بھڑوچ روانہ کیا اور قلعہ کے انچارج قمر کے متعلق خصوصی ہدایات دیں۔ قمر کو قلعہ کے اندر ڈٹے رہنا تھا "خواہ اس کے باہر خون کی کتنی ندیاں ہی کیوں نہ بہہ جائیں"۔ اسے دولت آباد سے آنے والے سپاہیوں پر نگاہ بھی رکھنی تھی۔ اگر باغی قلعہ پر حملہ کر دیں تب بھی اسے قلعہ سے باہر نہ آنا تھا۔ سلطان کا یہ فرمان ملنے پر قمر نے قلعہ کی فصیل کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کو متعین کر دیا اور اپنے آپ کو (قلعہ) بند کر لیا۔[5] جب باغیوں کو بھڑوچ میں ایک فوجی آمد کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کھمبات کو چھوڑ دیا۔ جہاں وہ تین یا چار ماہ سے جمع ہوئے تھے اور جہاں طغی بھی ان سے آملا تھا۔[6] اور وہ بھڑوچ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ اس خیال میں تھے کہ ایک زبردست شاہی فوج وہاں پہنچ چکی ہے لہٰذا انہوں نے بھڑوچ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور یہ توقع کی کہ شاہی فوج ان کے مقابلہ کے لیے باہر آئے گی۔ قلعہ کے اندر فوج کی تعداد تین یا چار سپاہیوں کی تھی اور باغیوں کی فوج

---

(1) فتح السلاطین، ص 511

(2) ایضاً، ص 512

(3) فیروز شاہی، ص 512

(4) ایضاً، ص 512

(5) ایضاً، ص 512

(6) فتوح السلاطین، ص 512 ☆ ایضاً، ص ص 10-509

کی تعداد سات ہزار تھی۔ جب جنگ کی آگ بھڑکانے کی خاطر باغیوں کی کوششوں کا قلعہ سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو جھلو افغان نے ایک دروازہ پر حملہ کر دیا دولت آباد کے کچھ سپاہی اور شیخ زادہ حامد[1] نامی ایک شخص سے قلعہ سے باہر آگئے اور سلطان کی قطعی ہدایات سے یکسر غفلت برتتے ہوئے باغیوں سے الجھ پڑے۔ جھلو کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر میدان میں گر پڑا۔ اسے فوراً گھیرے میں لے لیا گیا اور اس کا سر کاٹ لیا گیا۔ جب جھلو گر پڑا تو دوسرے سپاہی بھی باہر نکل پڑے۔ جو انبال اور قاضی جلال دل شکستہ ہو کر بگلانہ کے حکمراں مان دیو کے پاس بھاگ گئے۔ جس نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا لیکن بعد میں ان کو مال واسباب سے انہیں محروم کر دیا۔[2]

برنی ہمیں بتاتا ہے کہ سلطان نے دہلی کی کچھ فوجوں کے ساتھ بھڑوچ کے امیران صدہ کی معیت میں مقبل کو بھڑوچ سے پناہ گزینوں کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ملک مقبل نربدا کے کنارے ان کو جا لیا اور انہیں ہلاک کر دیا۔ اس نے ان کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا اور ان کے تمام خاندانوں کو حراست میں لے لیا۔[3] مقبل وہاں چند دنوں ٹھہرا اور شاہی حکم پر عمل کرتے ہوئے بھڑوچ کے بیشتر امیران صدہ کو ہلاک کر دیا۔ ان میں سے چند جو مقبل کی تلوار سے بچ نکلے تھے دولت آباد پہنچے جب کہ دوسرے گجرات کے مقدمیں کی پناہ میں آگئے۔

سلطان نے چند دنوں بھڑوچ میں قیام کیا اور وہاں کے حالات درست کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سخت قسم کے ٹیکس وصول کنندگان کی تقرری کی تاکہ لگان کے بقایہ جات کو سختی کے ساتھ وصول کیا جا سکے وہ ان تمام لوگوں سے سخت ناراض تھا

---

(1) ایضاً، ص513

(2) ایضاً، ص514

(3) برنی لکھتا ہے کہ نربدا کے کنارے پر جن باغیوں کو شکست ہوئی تھی ان میں چند کوں سہیر کے مقدم مان دیو کے پاس بھاگ آئے لیکن مان دیو نے انہیں گرفتار کر لیا اور ان تمام کو ان کے جائدادوں سے محروم کر دیا (فیروز شاہی، ص512) لیکن عصامی کے بیان (فتوح السلاطین، ص514) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بھڑوچ کی شکست کے بعد باغیوں نے مان دیو سے پناہ طلب کی تھی دو بڑے قلعوں کے ناموں سے جو اس کی طرف منسوب ہیں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مان دیو بگلانہ کا حکمراں تھا۔

جنھوں نے باغیوں کی حمایت کی تھی۔

دولت آباد میں بغاوت

برنی کے مطابق سلطان نے دولت آباد میں باغیوں کی تحقیقات کے لیے دو نہایت بے رحم افسران، زین تبندہ مجد الملک اور رکن تھانیسری کے منجھلے بیٹے، کی تقرری کی تھی، ان دونوں سے لوگ سخت نفرت کرتے تھے، تھانیسری کا بیٹا اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا اور تحقیقات شروع کر دی جب کہ زین بندہ ابھی دھار ہی پہنچا تھا۔ اس بات نے دیوگیری کے مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک طوفان بپا کر دیا۔ بد قسمتی سے اسی زمانہ میں سلطان نے تین نہایت مشہور و معروف افسران کو علیم الملک کے نام ایک رازدارانہ فرمان کے ساتھ بھیجا جس میں اسے پندرہ سو گھوڑا سواروں کے ایک دستہ کی ماتحتی میں دیوگیری کے ممتاز امیران صدہ کو بھڑوچ بھیج دینے کی ہدایت دی گئی تھی۔[1] عصامی کے مطابق علیم الملک کو فرمان کا مضمون پسند نہ تھا اس کے لیے شاہی حکم کی تعمیل کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ امیران صدہ بھڑوچ کی جانب مشکل سے پانچ فرسنگ بھی نہ پہنچے تھے کہ وہ اپنے انجام کے متعلق سوچنے لگے۔ نور الدین اور اسمٰعیل مسخ افغان نے بغاوت کا فیصلہ کیا اور اپنے اس منصوبہ کی حمایت میں رائے ہموار کی۔ ان کی دلیل تھی کہ ”ہم کیوں اپنی زندگیوں کو اس طرح قربان کر دیں؟ ہمیں سب سے پہلے احمد لاچین، قلتاش اور حسام کے سروں کو کاٹ کر جگ ناگ اور مان دیو کے پاس

---

(1) برنی، ص 513

یہ بات اہم ہے کہ جب عصامی دولت آباد کی بغاوت کا ذکر کرتا ہے تب ہی وہ محمد بن تغلق کے خلاف الزامات کی ایک فہرست تیار کرتا ہے (الف) وہ نیچی نسل کا ایک ہمدرد ہے (ب) وہ مذہب کا بدخواہ ہے (ج) وہ مذہب کی راہ سے بھٹک گیا ہے۔ (د) جوان بوڑھا ہر شخص اس کا شاکی ہے اور اس کے خلاف بغاوت درست و حق بجانب ہے (ز) شریعت کے مطابق اس کا خون جائز ہے۔ (س) قاضیوں نے اس کے قتل کو جائز قرار دے دیا ہے (ش) وہ اسلام سے باغی ہو گیا ہے۔ (ص) اس نے کفار سے اختلاط کا آغاز کیا ہے۔ (ض) اس نے آذان بند کرا دی ہے۔ (ط) اس نے جمعہ کی نمازیں بند کرا دی ہیں (ظ) وہ ہولا کا تہوار مناتا ہے (ع) وہ نجی طور پر جوگیوں سے میل ملاپ رکھتا ہے۔

فتوح السلاطین، ص 515

بھیج دینا چاہیے۔ اس کے بعد ہمیں دولت آباد واپس ہو کر علم الملک کو گرفتار کر لینا چاہئیے"۔

دوسرے دن طلوع آفتاب کے وقت وہ احمد لاچین کے خیمہ میں گئے اور اس کا سر کاٹ لیا۔ شور غل نے قلتاش کو اس کی نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ تیزی سے گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگا لیکن اس کا تعاقب کیا گیا۔ حسام کو اس کے خیمہ میں بلا کسی مزاحمت کے مار ڈالا گیا۔ ان کے سروں کو مان دیو کے دارالسلطنت دیوہار بھیج دیا گیا۔ نورالدین اور اسمٰعیل تیزی سے دولت آباد کی طرف روانہ ہوئے اور دوپہر کے تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گئے۔ بغاوت کی خبریں ناصر تلغچی اور ایک حاجب نے علیم الملک کو پہنچائی جو دیوان میں کام کے بعد اپنی دوپہر کی نیند کے لیے جاچکا تھا۔ اپنے خواب سے بیدار ہو کر اس نے پھاٹکوں کو بند کر دینے کا حکم دیا اور باغیوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس دن کی جنگ غیر فیصلہ کن رہی رات میں علیم الملک کے دولت کے اندرونی کوشک میں چلا گیا جب کہ ناصر اور حاجب نے بیرونی قلعہ کی ذمہ داری سنبھالی اور باغیوں نے دیوگیری کی کھتی پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے دن بھی جنگ دوبارہ غیر فیصلہ کن رہی لیکن تیسرے دن کی صبح کو علیم الملک زندہ گرفتار ہو گیا اور باغیوں نے دولت آباد پر قبضہ کر لیا۔ دیوگیری کا زبردست خزانہ جسے راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی بنا پر دہلی نہ بھیجا جا سکا تھا۔ باغیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ دہلی سلطنت کے کارکنوں کو مار ڈالا گیا۔ لیکن علیم الملک کو رہا کر دیا گیا کیونکہ انھوں نے اسے بے گناہ شمار کیا۔ باغیوں نے تب ایک بادشاہ کے انتخاب کا فیصلہ کیا جب اسمٰعیل کے نام کا تذکرہ کیا گیا تو اس نے حسن کو ترجیح دی۔ لوگ اس پر متفق ہو گئے لیکن چونکہ حسن اس وقت دستیاب نہ تھا اور تاخیر خطرہ سے خالی نہ تھی لہٰذا انھوں نے اسمٰعیل کو تخت پر بٹھا دیا۔ ایک نارنجی رنگ کا چھتر اس کے سر پر بلند کیا گیا اور وہ سلطان ناصرالدین کے نام سے مشہور ہو گیا۔ نورالدین کو خواجہ جہاں کے خطاب کے ساتھ وزیر مقرر کیا گیا۔ اسمٰعیل نے سپاہیوں میں روپے تقسیم کیے اور ہر

---

(1) یہ عصامی کی روایت ہے فتوح السلاطین (ص 512) اور یہ حسن (مستقبل کے بہمنی حکمراں) کی تمام دیگر لوگوں پر فضیلت کو ثابت کرنے کی محض ایک کوشش ہو سکتی ہے۔

شخص کو پندرہ ماہ کی تنخواہ دے دی۔ اس طرح دکن کی پہلی آزاد مملکت وجود میں آگئی[1]۔ اس نے بالآخر عظیم بہمنی سلطنت کے ظہور کا نقشہ پیش کر دیا۔[1]

جب سلطان کو اس بغاوت کا علم ہوا تو وہ تین دن اور تین راتیں نہ سو سکا وہ ایک ایسے سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا جس کا خزانہ چھن گیا ہو، چوتھے دن وہ اپنے قتل و غارت گری پر پچھتایا اور انسانی خون نہ بہانے کی قسم کھائی[2]۔ اس نے چھ ماہ میں ایک زبردست فوج اکٹھا کی[3]۔ اور اس کے بعد دولت آباد کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے زبردست تیاریاں کیں اور اپنی فوج کی تقسیم و ترتیب کا نہایت محتاط طریقہ پر منصوبہ بنایا باغیوں نے بھی زبردست تیاریاں کیں اور باصلاحیت امیران صدہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنی پوری توجہ اور کوشش اس جنگ میں لگا دی۔ لیکن ایک ایسے سلطان کی عسکری تدبیروں اور منصوبوں پر سبقت لے جانا ان کے لیے مشکل تھا جس نے ایک چوتھائی صدی مخالفوں سے زبردست پنجہ آزمائی میں ہی گزاری تھی۔ باغیوں کو شکست ہو گئی اور ان کے بیشتر حامیوں کو میدان جنگ میں مار ڈالا گیا۔ اسمٰعیل مخ افغان اپنے خاندان کے ساتھ دیوگیری کے قلعہ کے سب سے بلند حصہ دھراگیر یا دھراگڑھ، میں بھاگ گیا۔ اسے مکمل طور پر دشمنوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ابن بطوطہ دوسروں سے سنی ہوئی باتوں کی بنیاد پر لکھتا ہے کہ سلطان نے اسے امان نہ دی لیکن اس کے کھانے اور پانی کا انتظام کیا۔ حسن گنگو (مستقبل میں بہمنی سلطنت کا بانی) میرج[4] بھاگ گیا جہاں اس نے دوسرے حملہ کے لیے ایک فوج کی بھرتی شروع کی اور بعد میں اس کے دوست مثلاً سکندر خاں قیر خاں، حسین ہتیہ اور دیگر بھی اس سے آ ملے۔

گلبرگہ بھی باغیوں کے قبضہ میں آ چکا تھا سلطان نے چند امرا کے ساتھ عماد الملک سر تیز کو پناہ گزینوں کو گرفتار کرنے، باغیوں کو کچلنے اور قلعہ کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا۔ سلطان بذات خود کچھ دنوں کے لیے دولت آباد ٹھہر گیا اور

---

(1) ایضاً، ص 251 برنی کے مطابق مہاراشٹر کی ولایت امیران صدہ کے درمیان تقسیم کر دی گئی۔

(2) ایضاً، ص530

(3) ایضاً، ص530

معاملات کی ازسرِ نو تنظیم کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس نے اقطاعات کو امرا کے سپرد کر دیا اور پر امن حالات قایم کرنے کی کوشش کی۔ اسی اثناء میں اسے گجرات میں طغی کی بغاوت کی اطلاع ہوئی اور اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔

بہمنی سلطنت کا ظہور

دولت آباد چھوڑنے سے پہلے سلطان نے خداوند زادہ قوام الدین، ملک جوہر اور شیخ برہان بلارانی ظہیر الجیوش کو قلعہ کی ذمہ داری سونپی اور وہاں ایک زبردست فوج متعین کر دی۔ بہر حال دکن کے معاملات تیزی سے بدل رہے تھے اور حالات نہایت غیر تشفی بخش تھے۔ بھڑوچ کے ان باشندوں کو جو دولت آباد میں مقیم ہو گئے تھے ایک فوج کے ساتھ بھڑوچ بھیج دیا گیا۔ اسی موقع پر غلہ کی قیمتیں چڑھ گئیں اور سپاہیوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسے ہی سلطان نے بھڑوچ کی جانب پیش قدمی کی مورخ برنی نباہتی کاؤنسل کی طرف سے دولت آباد کی جنگ میں اس کی کامیابی کی مبارکباد دینے آیا۔ دولت آباد کی جنگ یقیناً ایک بڑی فتح تھی۔ کم از کم شاہی وقار کے نقطہ نظر سے ہی۔ کیونکہ اس صورت میں کاونسل نے سلطان کو مبارکباد پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ اس بات سے یقیناً بے خبر ہو کر کہ محض چند ہی ماہ میں دکن کی قسمت میں ہمیشہ کے لیے دہلی جدا ہونا لکھا تھا سلطان نے نہایت محبت کے ساتھ برنی کا خیر مقدم کیا۔

بعد میں جب سلطان سہ سنگ کے معاملات کی درستگی میں مشغول تھا اور انہلوارہ کی جانب پیش قدمی کرنا چاہتا تھا کہ اسے دولت آباد سے یہ خبر موصول ہوئی کہ حسن کنگو اور ان دیگر باغیوں نے جو میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ عماد الملک سر تیز پر حملہ کر دیا تھا اور اسے مار کر اس کی فوجوں کو منتشر کر دیا تھا۔ خداوند زادہ قوام الدم، ملک جوہر اور ظہیر الجیوش دولت آباد سے دھار بھاگ چکے تھے۔ حسن کنگو دولت آباد آیا اور 24؍ ربیع الثانی 748ھ / 13 اگست 1347ء میں تخت نشین ہو گیا اور بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی قسمت میں آئندہ ڈیڑھ صدیوں تک جنوب کے سیاسی پردہ پر چھائے رہنا لکھا تھا۔ اسمٰعیل مخ نے نئے بادشاہ کو قبول کر لیا۔ اس خبر نے سلطان

کے حواس باختہ کر دیئے۔ اب اس کے لیے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ مملکت تیزی کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی اور اس عمل کا تدارک اس کے ذرائع اور طاقت سے باہر تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں سلطان گردن زدنی سے باز رہا۔ اس حقیقت کی توثیق عصامی سے بھی ہوتی ہے جو لکھتا ہے کہ عشاء کی نماز کے وقت سلطان کے دل میں ایک "درد" ہوا۔ اور اس نے عوام کے لیے ایک عام معافی کا اعلان کر دیا۔ لیکن عصامی اس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ دوسرے ہی دن جب "درد" رفع ہو گیا تو سلطان اپنے پرانے طریقوں پر واپس آ گیا[1]۔ بہر حال سلطان کو، جو باغیوں کے خلاف ایک فوج روانہ کرنے کا منصوبہ بنا تا آ رہا تھا، اس بات کا یقین ہو گیا ہمنوں کی طاقت اتنی زبردست تھی کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا وہ دکن کو کھو بیٹھنے پر راضی بہ رضا ہو گیا۔

ایک مطلق العنان حکمراں کی تلخ کامیاں

اپنے دورِ حکومت کے سالوں میں محمد بن تغلق کی زندگی شدید افسردگیوں کلفتوں اور برافروختگی سے بھری زندگی تھی۔ اس کے تمام منصوبے ناکام ہو چکے تھے اور بغاوت کا ایک ناقابلِ اصلاح جذبہ عام لوگوں کے دلوں میں سرایت کر چکا تھا۔ اس کی ثابت قدمی تو قایم رہی لیکن تلخ کامیوں کا اظہار مختلف اندازوں میں ہوا۔ سلطان پور میں اس کے قیام کے دوران جب کہ وہ گجرات کے باغیوں کو کچلنے کے لیے جا رہا تھا اس نے اپنے درباری یاد ندیم ضیاء الدین برنی کو بلوایا۔ رات ختم ہونے والی ہی تھی اور ممکن ہے کہ سلطان نے یہ اوقات مشکل حالت میں گزارے ہوں۔ اس نے مورخ سے کہا: تم دیکھ رہے ہو کہ کتنی بغاوتیں سر اٹھا رہی ہیں میں ان بغاوتوں سے خائف نہیں ہوں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ ان بغاوتوں کی وجہ سے سلطان کی حد سے زیادہ سزائیں ہیں۔ خیر! جو کچھ لوگ کہتے ہیں ان کی بنا پر ان سزاؤں کو میں ترک کرنے والا نہیں ہوں، تم نے بہت سی تاریخیں پڑھی ہیں۔ کیا تم نے کہیں ان جرائم کے بارے میں پڑھا ہے جن کے لیے بادشاہوں نے بڑی سزائیں دی ہوں؟ برنی نے ساسانی قانون تعزیرات اور مسلم شریعت کی تفصیلات پیش کیں لیکن حتی الامکان اپنے جوابات کو سلطان کی مرضی

---

(1) ایضاً، ص 536

کے مطابق بنانے کی کوشش کی اس نے کہا۔

"میں نے تاریخ کسروی میں پڑھا ہے کہ ایک حکمراں کے لیے بڑی بڑی سزائیں دیئے بغیر حکومت کرنا ناممکن ہے۔ اگر کوئی بادشاہ ایسا نہیں کرتا تو خدا ہی جانتا ہے کہ سرکش لوگوں کی سرگرمیوں کے ذریعہ کیسا کیسا فتنہ و فساد پیدا ہو جاتا۔ مطیع لوگ بھی ہزاروں قسم کے گناہوں میں ملوث ہو جائیں گے۔ جب ایک معتمد نے ایرانی بادشاہ جمشید سے ان معاملات کے بارے میں دریافت کیا جن میں سزائے موت دی جاسکتی تھی تو جمشید نے جواب دیا: ایک بادشاہ کے ذریعہ سزائے موت دیا جانا سات جرائم کے سلسلہ میں حق بجانب ہے اگر بادشاہ اس حد سے تجاویز کرتا ہے تو سلطنت کے لیے مشکلات اٹھ کھڑی ہوں گی۔

۱- ارتداد- سچ مسلک کو چھوڑ دینا اور مذہبی غلطی پر مصر ہونا۔

۲- قتل- قانون پر چلنے والے ایک شخص کو عمداً قتل کر دینا۔

۳- زناکاری- ایک شادی شدہ شخص کا دوسرے کی بیوی سے مجامعت کرنا۔

۴- سازش- ایک بادشاہ کے خلاف سازش کا منصوبہ بنانا اس صورت میں کہ جب سازش کی حقیقت ثابت ہو۔

۵- بغاوت- بادشاہ کے خلاف ایک بغاوت کی قیادت کرنا یا باغی سرداروں کی مدد کرنا۔

۶- بادشاہ کے دشمنوں، مخالفوں اور حریفوں کی، انہیں اطلاع، اسلحہ یا دوسرے طریقوں سے مدد بہم پہنچاکر، مدد کرنا اس صورت میں جب یہ حقائق ثابت ہو جائیں۔

۷- نافرمانبرداری- بادشاہ کی اس طور پر نافرماں برداری جو ریاست کو خطرہ میں ڈال دے۔ لیکن دوسرے قسم کی نافرماں برداریاں نہیں۔

اس کے بعد سلطان نے برنی سے سوال کیا کہ ان سات صورتوں میں سے کن کن کے لیے پیغمبر نے سزائے موت کی اجازت دی تھی۔ برنی نے جواب دیا: صرف ارتداد، قتل اور زنا کے لیے۔ دیگر چار غلطیوں کے سلسلہ میں سزائے موت ریاست کی فلاح و بہبود کے لیے بادشاہ کی ذمہ داری ہے۔ جمشید نے کہا: "بادشاہوں نے وزراء کا انتخاب کیا ہے انہیں ایک اونچی حیثیت پر فائز کیا ہے اور سلطنت کے معاملات ان کے سپرد کر دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وزراء ریاست کے لیے قوانین (ضوابط) بنانے کے

اہل ہیں اور انہیں مستقل طور پر نافذ کر سکتے ہیں اور ان قوانین کے نفاذ ہی کی بدولت بادشاہ کے لیے کسی بھی جاندار کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگنا ضروری نہیں ہے"۔

اس کے بعد سلطان نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنی پوزیشن کا اظہار کیا!

"جمشید کے ذریعہ مقرر کردہ سزاؤں کا تعلق عہد قدیم سے تھا۔ ان دنوں شر پسند اور فتنہ پرور اشخاص ایک بڑی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں۔ میں بغاوت افراتفری اور سازش کے شک اور قیاس کی بنیاد پر سزائے موت کا حکم دیتا ہوں۔ میں محض معمولی خلاف ورزیوں کے لیے جو میں ان میں پاتا ہوں۔ لوگوں کو قتل کر دیتا ہوں۔ میں اسی طرح اس وقت تک بڑی سزائیں دیتا رہوں گا جب تک یا تو میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا یا لوگ درست ہو جائیں اور بغاوت اور خلاف ورزی سے باز آجائیں۔ میرے پاس ایسا کوئی وزیر نہیں جو میری سلطنت کے لیے ایسے قوانین بنا سکے کہ میرے لیے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگنا غیر ضروری ہو جائے۔ میں سزائے موت اس لیے بھی دیتا ہوں کہ لوگ اچانک میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ میں نے لوگوں میں اتنے زیادہ خزانے تقسیم کرائے لیکن کوئی بھی میرا مخلص خیر خواہ نہ بن سکا۔ لوگوں کے مزاج کا اندازہ مجھے صحیح طور پر مل گیا ہے کہ وہ لوگ میرے دشمن اور مخالف ہیں۔

سلطان کی اس پوری گفتگو میں تلخی اور ناکامی کے احساسات کار فرما ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ سلطان کا ذہن کتنا ان سے متاثر تھا۔

کچھ دنوں بعد پھر اس کی روح کا کرب برنی کے سامنے ابل پڑا۔ طغی آزاد تھا اور سلطان گجرات میں امن و امان قایم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی زمانہ میں دولت آباد میں امیران صدہ کی دوسری بغاوت کی خبریں موصول ہوئی تھیں۔ کیا کیا جائے؟ سلطان نے ابھی اپنی آئندہ کارروائی کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ اس نے برنی کو بلایا اور کہا: "میری سلطنت بیمار ہے اور اس کی بیماری کا علاج کسی دوا سے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر معالج اس کے کمر کے درد کا علاج کرتا ہے تو بخار بڑھ جاتا ہے۔ اگر وہ اس کے بخار کا علاج کرتا ہے تو اس کی شریانوں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ میری سلطنت میں بیک وقت مختلف بیماریاں نمودار ہو گئی ہیں۔ اگر میں ایک مقام کے حالات درست کرتا

---

(1) فیروز شاہی، ص ص 559-10

ہوں تو دوسرے مقام پر افراتفری مچ جاتی ہے۔ اگر میں انہیں دوسرے مقام پر درست کرتا ہوں تو تیسرے مقام پر افراتفری پھیل جاتی ہے۔ سلطنت کی ان بیماریوں کے متعلق ماضی کے بادشاہوں نے کیا کہا ہے؟

سلطان کے اس رقت انگیز لہجہ پر برنی کا جواب بالکل خلاف احتیاط تھا۔ لیکن اس نے سلطان کی روح کی گہرائیوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور سلطان کو اپنے دل کی باتیں ظاہر کرنے پر مجبور کر دیا۔ برنی نے کہا۔ "تاریخ کی کتابوں نے سلطنت کی بیماریوں کے سلسلہ میں بادشاہوں کے متعین کردہ علاجات کو مختلف اندازوں میں بیان کیا ہے۔ چند سلاطین تو یہ دیکھ کر کہ لوگوں نے ان پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے اور یہ کہ ان کے خلاف ایک عام منافرت پیدا ہو گئی ہے۔ سلطنت سے دستبردار ہو گئے ہیں اور اسے اپنی زندگی ہی میں اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کے حوالہ کر دیا ہے جسے انہوں نے مستحق سمجھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے سلطنت کے کسی گوشہ میں جا کر اپنے آپ کو ایسی مشغولیات میں لگا دیا ہے جو انہیں افسردگی سے دور رکھیں نیز انہوں نے (اپنی دستبرداری کے بعد) سلطنت کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی ہے۔ دیگر سلاطین نے سلطنت کی اس بیماری کی وجہ سے جو لوگوں کی (اپنے حکمراں سے) نفرت و دشمنی کی بنا پر ہوتی ہے۔ اچانک اپنے آپ کو شکار، موسیقی اور شراب میں منہمک کر لیا ہے اور ریاست کے تمام معاملات اصولی اور تفصیلی دونوں ہی اور ہر مسئلہ کا حل۔ اپنے وزراء اعلا افسران اور سلطنت کے حامیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ سلطنت کی ایک نہایت خطرناک اور مہلک بیماری خواص (امرا) اور عوام کے درمیان (حکمراں) سے نفرت پیدا ہو جاتا اور عام رعایا میں اعتماد کی کمی واقع ہوتا ہے"۔

اس تقریر میں اس مشورہ کی طرف ایک اشارہ ہے کہ سلطان کے لیے آخری چارۂ کار محض تخت سے دست برداری ہی ہے لیکن یہ مشورہ سلطان کے مزاج کے بالکل خلاف تھا اور اس نے مورخ سے کہا۔

"اگر سلطنت کے معاملات میری خواہشات کے مطابق درست ہو جائیں تو میری خواہش خانۂ کعبہ جانے کی تھی اور مملکت دہلی کے معاملات کو ان تینوں اشخاص فیروز، ملک کبیر اور احمد ایاز۔ کے سپرد کر دینے کی تھی۔ لیکن ان دنوں میں عوام سے

رنجیدہ ہوں اور عوام مجھ سے رنجیدہ ہیں۔ لوگوں نے میرے ذہن کا انکشاف کر لیا ہے اور میں نے لوگوں کے برے اور باغیانہ منصوبوں کا انکشاف کر لیا ہے۔ ہر عمل جس کی میں کوشش کرتا ہوں ناکام ہو جاتا ہے۔ باغیوں، مخالفوں اور نافرماں بردار لوگوں اور بدخواہوں کے لیے میرا علاج تلوار ہے۔ میں اپنی تلوار سے اس وقت تک سزا دیتا رہوں گا اور حملہ کرتا رہوں گا جب تک وہ کاٹتی رہے یا خالی جاتی رہے۔ لوگ جتنی میری مخالفت کریں گے اتنی ہی میری سزائیں بڑی ہوں گی۔

وہ اب ایک بے لگام شخص کے مانند ہو گیا تھا جسے ایک بہت ہی نازک صورت حال کا سامنا درپیش تھا۔

ممکن ہے کہ جس چیز نے اس کی زندگی کی شکست خوردگی میں مزید اضافہ کر دیا اور اسے تنگ مزاج اور بے رحم بنا دیا وہ ایک آپریشن تھا جس کی وجہ سے، ابن حجر عقلانی کے مطابق، وہ نامرد (Impotent) ہو گیا تھا۔[1] اس کی دو لڑکیاں تھیں جو اس زمانہ سے پہلے پیدا ہوئی تھیں لیکن بعد میں اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ نہایت تحقیر آمیز انداز میں عصامی اظہار خیال کرتا ہے: دراصل بادشاہ کا کوئی لڑکا نہ تھا لہٰذا وہ ساری دنیا اپنی ہی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔[2]

شاید ناکامیوں کے انہیں مواقع پر اس نے روحانی مدد اور دعاؤں کی خاطر چند بزرگوں کی جانب رجوع کیا۔ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کو اس نے ایک خط میں لکھا![3] "تمہاری گزارش کے مطابق، پیارے بھائی میں نے تمہارے نام دنیاوی اور مذہبی معاملات کی درستگی کے لیے خدا سے دُعا کی ہے۔"

طغی کی بغاوت-سلطان محمد کا انتقال

طغی ایک ترکی غلام تھا جو ترکستان سے چند تاجروں کے ذریعہ غیاث الدین تغلق کے پاس لایا گیا تھا۔ محمد بن تغلق کے ذریعہ وہ دربار کا نگراں (شحنابارگاہ) مقرر کیا

---

(1) الدُرَرالکامنہ، حیدرآباد ایڈیشن 3، ص 460

(2) فتوح السلاطین، ص 450

(3) مخطوعات شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (مخطوطہ)

گیا اور بعد میں اسے وزیر کی فوج کا افسر بنا دیا گیا۔ فرض سے کسی کوتاہی کی سزا کے طور پر سلطان نے اسے یمن جلاوطن کر دیے جانے کے سلسلہ میں احکامات نافذ کیے۔ اس اثناء میں جب کہ وہ کھمبات میں تھا، گجرات میں قاضی جلال کی بغاوت پھوٹ پڑی اور اس نے باغیوں کو منتشر کرنے کے لیے لوگوں کو آمادہ کر کے سلطان کے لیے چند خدمات انجام دیں۔ سلطان نے اس وفادارانہ رویہ کی قدر کی اور شحنا بارگاہ کی حیثیت سے اس کی دوبارہ تقرری کر لی۔ طغی کچھ دنوں گجرات میں رہا جب کہ سلطان نے دولت آباد بغاوت سے نمٹنے کی خاطر دکن کی جانب پیش قدمی کی۔ لیکن سلطان کی غیر حاضری کے دوران طغی گجرات کے مقدمین اور امیران صدہ سے مل گیا اور علم بغاوت بلند کر دیا اس نے انہلوارہ کے گورنر شیخ معزالدین کو مار ڈالا اور ایک بڑی فوج کے ساتھ بھڑوچ کا محاصرہ کر لیا۔

برنی کے مطابق سلطان نے برسات کے تین موسم گجرات میں گزارے۔ پہلا منڈل تباری میں دوسرا کرنال کے قلعہ کے نزدیک۔ اس کا اصل مقصد صوبہ میں امن امان قایم کرنا تھا جس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی۔ طغی ایک طاقتور مخالف تو نہیں لیکن ایک وبال جان تھا۔ کرنال کے حکمراں نے طغی کو زندہ گرفتار کر کے سلطان کے حوالہ کر دینا چاہا۔ اس کے مقصد کو جان کر وہ ٹھٹھہ کے جام کے پاس گیا۔ موسم برسات کے اختتام پر سلطان کے پاس آ کر مطیع ہو گئے۔ انہیں بدلہ میں پوشاکیں اور انعامات دیے گئے۔ سلطان نے کرنال میں ایک مہتا (ہندو افسر) کی تقرری کی اور کرنال کے رانا، کھنگر کو بحیثیت قیدی سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ سارے صوبہ میں امن امان قایم ہو گیا۔ سلطان نے تیسرے مانسون کو ٹھٹھہ جاتے ہوئے کوندں میں گزارا، یہاں اسے افسوس ناک خبر موصول ہوئی کہ ملک کبیر کا انتقال ہو گیا۔ سلطان نے احمد ایاز اور نائب وزیر ملک مقبول کو دہلی بھیجا اور شیوخ، علماء، ملکوں اور امرا کی ایک بڑی تعداد کو ان کے خاندان کے افراد کو گھوڑوں اور پیادوں کے ساتھ بلا بھیجا۔ جنگجو لوگوں سے بھری کشتیاں دیپال پور، ملتان، اچھ اور سیوستان سے اس کے پاس آئیں۔ ماوراء النہر کے حکمراں امیر قزغن نے چار یا پانچ ہزار منگول گھوڑ اسواروں کے ساتھ مالتون بہادر کو بھیجا۔ اس طرح سلطان ایک غیر معمولی فوج کے ساتھ ٹھٹھہ کی طرف

روانہ ہوا۔

شاہی فوجوں کو طغی کے خلاف چوکس رکھا گیا جو سلطان کے افسران اور بعد میں سلطان کو بھی چکر میں ڈال کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ رہا تھا۔ بھڑوچ سے وہ کھمبات بھاگ گیا اور وہاں سے وہ اساول چلا گیا۔ جب سلطان اساول کی طرف مڑا تو طغی پٹن روانہ ہو گیا۔ کادی کے مقام پر سلطان نے اسے جا لیا اور پٹن کے نزدیک تکلپور میں ایک جنگ میں اسے شکست دے دی۔ لیکن وہ پٹن بھاگ گیا۔ اس کے بعد وہ گونار بھاگ گیا اور بالآخر ٹھٹھہ کے سورماؤں سے پناہ چاہی جنھوں نے چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح بے شمار، ایک فوج کے ساتھ اس کی محافظت کی۔

محمد بن تغلق کی زندگی کی یہ آخری مہم المناک تو تھی لیکن دشمن کے بے دردانہ تعاقب اور اسے مطیع کر لینے کے مصمم عزم کے لحاظ سے ممتاز بھی۔

ایک جگہ سے دوسری جگہ طغی کا تعاقب کرتے ہوئے محمد تغلق مکھیار دارا میں گونڈن جا پہنچا۔ یہاں اسے اپنی بیماری اور بارش کی بنا پر اپنے سفر کو روک دینا پڑا۔ اس کے بعد وہ دریائے سندھ کے پاس جا پہنچا اور ٹھٹھہ کی جانب بڑھا۔ اس کا مرض پھر ابھر پڑا اور دوبارہ درجہ حرارت بڑھ گیا۔ اس نے 10/ محرم کو روزہ رکھا اور مچھلی سے روزہ افطار کر لیا۔ اس سے اس کا مرض بڑھ گیا کیونکہ مچھلی اس کے لیے مفید نہ تھی لیکن اس نے اس بات کو نظر انداز کر دیا اور مستقل دو دنوں تک دریا کے راستہ اپنا سفر جاری رکھا۔ اس کی بیماری بڑھ گئی اور اس کا مضبوط ڈھانچہ ٹوٹنے لگا۔ وہ ایک گاؤں سوند کشتی سے اترا اور ایک ہفتہ بعد 21/ محرم 752ھ /20 مارچ 1351ء میں اپنی آخری سانسیں لیں۔ اس طرح ایک طوفانی زندگی کا خاتمہ ہو گیا جس نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی تمام فکر و تعلق کے باوجود، ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ تک پورے ملک کو ایک امید و بیم، تشویش اور دہشت کی حالت میں رکھا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ "بالآخر لوگوں نے اس سے چھٹکارا پا لیا اور اس نے لوگوں سے چھٹکارا پا لیا"۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد ہی فیروز شاہ نے روپے کی ادائیگی کے ذریعہ ان لوگوں سے جن کے ہاتھ پیر اس نے کاٹ ڈالے تھے اور ان لوگوں کے وارثین سے جنھیں اس نے مار ڈالا تھا معافی کے خطوط حاصل کیے اور انہیں سلطان کی قبر کے

سرے پر ایک بکس میں رکھ دیا تھا۔ یہ بات مرحوم سلطان کی پالیسیوں پر ایک لطیف تبصرہ تھا اور اسے بدنام کرنے کے لیے کفایۃً اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سلطان کی سیاست، (سزائے موت)

محمد بن تغلق جیسے نہایت تعلیم یافتہ حکمراں کے متعلق ایک شخص یہ امید رکھے گا کہ وہ ایک نہایت عظیم انسان دوست ہوگا۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "تمام بادشاہوں میں سے یہ سلطان سب سے زیادہ تحائف دینے کا اور ساتھ ہی خون ریزی کا دلدادہ تھا[1] ...... اس کا دروازہ ایک ایسے شخص کی لاش سے مشکل ہی سے خالی رہتا جس کی گردن مار دی گئی ہو...... بادشاہ تمام غلطیوں کی خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، سزا دیتا اور وہ نہ تو علم والے لوگوں (اہل العلم) اور راست بازوں (صالح) کو بخشتا اور نہ اعلا نسل کے لوگوں (شرف) کو۔ ہر روز زنجیروں میں کسے سینکڑوں لوگ، جن کے ہاتھ ان کی گردنوں سے بندھے ہوتے اور پیروں میں بیڑیاں ہوتیں، اس کے دیوان عام میں پیش کیے جاتے۔ انہیں جنھیں مار ڈالنا ہوتا، مار ڈالا جاتا، جنھیں اذیتیں دینی ہوتی اذیتیں دی جاتیں اور جنہیں مارنا پیٹنا ہوتا مارا پیٹا جاتا۔ سلطان جمعہ کے علاوہ تمام دنوں میں تمام قیدیوں کو دیوان عام میں بلواتا۔[1] ابن بطوطہ متعدد ہولناک سزاؤں کے متعلق بیان کرتا ہے جن کا وہ ایک عینی شاہد تھا۔

برنی، جس کی اس کی ہم عصروں کے ذریعہ تردید کی جا سکتی تھی۔ قلم بند کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتا کہ: مسلمانوں کی اور ایک خدا پر ایمان رکھنے والوں کو قتل کرنا اس کے مزاج اور فطرت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اس نے متعدد علماء شیخ، سادات، صوفیاء قلندران، کارکنان اور فوجیوں کو قتل کرادیا۔ کوئی دن یا ہفتہ ایسا نہ گزرتا جس میں متعدد مسلمانوں کا خون نہ بہایا جاتا اور شاہی محلوں کے سامنے بہنے کے لیے ایک خون کی ندی بنائی گئی۔[2]

سلطان کی سزاؤں نے لوگوں میں نفرت و دہشت کی لہر دوڑا دی اور جب کبھی

---

(1) رحلہ، ص 56

(2) فیروز شاہی، ص ص 60-459

حالات اجازت دیتے وہ "جابر" حکمراں کے خلاف بغاوت کر دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان نے کسی کو کبھی اس وقت تک سزا نہ دی جب تک اس نے اس کی گردن زدنی کے لیے ان چار مفتیوں سے فتویٰ نہ لے لیا جو ہمیشہ حاضر رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ایک مفتی کے لیے مشکل ہی سے ممکن ہو سکتی تھی کہ وہ سلطان کی مرضی کے خلاف کسی رائے کا اظہار کر سکے اور اگر اس نے کبھی ایسا کیا بھی تو مشکل ہی سے اسے کوئی ایسا موقعہ نصیب ہوتا کہ وہ اپنے اس نکتہ کو ایک ایسے فلسفی کے سامنے برقرار رکھ سکے جو نکتہ دانی اور بحث و مباحثہ کی تکنیک سے بخوبی واقف تھا۔[1] یہ عدالت محض ایک دکھاوا تھی جسے وہ اپنی ضمیر کی تشفی کے لیے اور اپنے بے دردانہ قتل عام کو جواز اور منصفی کی تقویت بہم پہنچانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ مظلوم پارٹیوں کے ذریعہ بلائے گئے ایک مدعی علیہ کی حیثیت سے سلطان کی دربار میں حاضری کے دو تین واقعات کو جن کا ذکر ابن بطوطہ[2] نے کیا ہے کہ دکھلاوا سمجھنا چاہیے، جس کا مقصد لوگوں کو ساتھ ہی اپنے ضمیر کو دھوکا دینا تھا۔ گرشسپ، غیاث الدین شیخ شہاب الدین اور دیگر لوگوں جو ظالمانہ سزائیں دی گئیں اور ان کے مردہ جسموں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا اس نے عوام کو غالباً مضطرب کیے بغیر نہ چھوڑا ہوگا۔ برنی لکھتا ہے کہ چند مخصوص امرا اور افسران تھے جو سلطان کی اس بے رحمانہ گردن زدنی کی پالیسی کو اپنانے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس نے خاص طور پر زمیں بندہ مختص الملک، یوسف بغرا، سر دوات دار کے بیٹے خلیل، محمد نجیب، شہزادہ نہاوندی، قرنفل سیاف، ایبہ، مجیر ابورجا، گجرات کے ایک قاضی کے بیٹے اور تھانیسری کے تینوں بیٹوں کا نام لیا ہے۔ مورخ نے ان لوگوں کی خون کی خوفناک پیاس کا ایک خاکہ یہ کہہ کر پیش کیا ہے کہ وبلا تاسف وتردد بیس پیغمبروں کو مار دے سکتے تھے۔

ذاتی کردار: سلطنت کی توسیع اور تخفیف

سلطان محمد بن تغلق عہد وسطیٰ کے ہندستان کی ایک نہایت متاثر کن شخصیت

---

(1) مبارک شاہی، ص115 / 4 رحلہ، ص83

(2) فیروز شاہی، ص460

تھی۔ اس کی دماغی استعداد نے دوستوں اور دشمنوں دونوں ہی سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اور اسے اس کے ہم عصروں سے بہت زیادہ بلند کر دیا۔ اس کی ذاتی زندگی پاک وصاف تھی۔[1] اور بہت سے ایسی برائیوں سے پاک تھا جو عہد وسطیٰ کے بادشاہوں کے کردار پر ایک دھبہ تھا۔ عہد وسطیٰ کے علوم کی شاید ہی کوئی ایسی شاخ تھی جس میں اس نے کچھ حاصل نہ کیا تھا۔ ادب، تاریخ، فلسفہ، فن خطابت، شاعری، منطق، ریاضی، طب، ہیئت اور خطاطی۔ اس کی عربی معلومات محدود تھی۔ وہ اس زبان کو سمجھتا تھا لیکن بول نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس کی یادداشت حیرت انگیز تھی۔ اسے قرآن اور ساتھ ہی ہدایہ کا ایک حصہ زبانی یاد تھا۔ اس کی ذہانت تیز تھی اور گفتگو و بحث و تمحیص کی اس کی صلاحیت بے مثال تھی۔ برنی لکھتا ہے کہ اس کے خوش بیانی سحر انگیز تھی۔ کنایات اور استعارات کے استعمال میں وہ ایک ماہر تھا۔ اپنی تحقیقاتی دلچسپیوں اور ذہنی استعدات کے باوجود وہ بنیادی طور پر ایک باعمل آدمی تھا جس نے کبھی بھی اپنی ذہنی دلچسپیوں سے اپنی انتظامی ذمہ داریوں کو متاثر نہ ہونے دیا اس کی چال ڈھال اور اس کا طرز عمل ایک فوجی جیسا تھا۔ ایک توانا جسم اور چوڑے چکلے مظبوط ہاتھ، جن کی گرفت لوگوں کے ہاتھوں میں لرزش طاری کر دیتی جب وہ ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتا۔ وہ جامہ زیب بھی تھا۔

مضبوط جسمانی ساخت کے ساتھ ساتھ ہمت و بہادری اور زیر دستوں کی حمایت کا جذبہ بھی اس کے دل میں تھا اور اس لحاظ سے بیرونی ممالک میں بھی اس کی شہرت تھی۔ اس کی بیشتر زندگی اس کی تخت نشینی سے پہلے اور مابعد دونوں ہی میدان جنگ میں گزرتی تھی۔ اس نے مبارک خلجی کے امیر اخور کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور سندھ بعید میں ایک باغی کے تعاقب میں اپنی زندگی کا اختتام کیا۔ شاید دہلی

---

(1) فیروز شاہی، ص460

گرچہ وہ اس بات پر مصر تھا کہ لوگ جمعہ کی نماز پابندی سے ادا کریں لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس بات کی بھی اجازت دے دی تھی کہ اس کی مملکت میں طرب آباد (تفریح گاہیں) جہاں لوگ موسیقی سے لطف اندوز ہو سکیں) قایم کیے جائیں اور بلا روک ٹوک کام کریں۔ جیسا کہ ابن بطوطہ نے انکشاف کیا ہے۔ وہ بذات خود موسیقی کا دلدادہ تھا اور نہایت محتاط طریقہ پر نگرانی میں رکھے گئے موسیقاروں کا طائفہ اپنی ملازمت میں رکھتا۔ (مسالک الابصار، ص32)

کے کسی دیگر سلطان نے نہ بذات خود اتنی مہموں کی قیادت کی اور نہ اتنی زیادہ منظم بغاوتوں سے نمٹا جتنا کہ وہ۔ اس متواتر عسکری سرگرمی کے علاوہ وہ اپنے انتظامی اقدامات اور بیرونی دنیا سے ثقافتی روابط کی بنا پر بھی دہلی سلطنت کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ اس نے ایشیائی اور افریقی ممالک کے ساتھ ثقافتی روابط کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ خراساں، عراق، سیستان، ہرات، مصر، ماورالنہر تبریز س وغیرہ وغیرہ سے لوگ اس کے دربار میں آتے اور وہ ان سرزمینوں میں ہونے والی ادبی ثقافتی ترقیوں کے متعلق بلاواسطہ علم حاصل کرتا۔[1] اس کی سیاسی نگاہ وسیع اور قوی تھی اور وہ اپنے مقصد میں ایک زبردست مستقل مزاجی کا حامل تھا جو نہایت ناسازگار حالات میں بھی اس کے مقاصد میں منہمک رکھتے۔ تاہم وہ اپنے اصل مقصد میں ناکام ہو گیا جو کہ ایک ہندستان گیر انتظامیہ کے قیام کا تھا۔

محمد بن تغلق نے اپنے باپ سے ایک وسیع مملکت ورثہ میں پائی تھی۔ اپنے عہد حکومت کی پہلی دھائی میں اس نے اپنی پوری کوششوں سے اسے اور بھی وسیع تر بنایا۔ ہمالہ کے دامن سے لے کر دوار سمدرا اور ٹھٹھہ سے لے کر لکھناؤتی تک پورا ملک اس کے جھنڈے تلے آ گیا۔ پورا دکن مع اس کے دور دراز حصوں کے مثلاً معبر اور وارنگل-اس کے احکامات کی تعمیل کرتا۔ مغربی گھاٹوں کی آزاد ریاستوں۔ سندابور، مہنور، منجرو، جراقتن، دہفتن، بدفتن، قندرائرہ اور کالی کٹ نے اس کی بالادستی قبول کر لی۔ سلطنت دہلی کی تاریخ میں اس سے قبل کبھی بھی سلطان کے اختیارات اور وقار اس منتہائے عروج کو نہ پہنچے تھے اور برنی کے مطابق[2] دہلی کے خزانہ میں ہر سمت سے اتنے لگان نہ جمع ہوئے جتنے کہ محمد بن تغلق کے زمانہ میں۔ مسالک الابصار کا مصنف لکھتا ہے: یہ ایک بڑا ملک ہے جس کے ساحل سمندر پر نوے بندرگاہیں ہیں جس کی آمدنی

---

(1) ہدایہ ایک نہایت ضخیم قانون کی کتاب ہے اور ایک فرد کے لے اسے ذہن میں محفوظ رکھ لینا بالکل ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن متعدد (ایک دوسرے سے) آزاد ماخذ سلطان کے سلسلہ میں اس حقیقت کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن حجر عقلانی الدار الکامنہ جلد 3 ص 460 مسالک الابصار، انگریزی ترجمہ، ص 37

(2) فیروز شاہی، ص ص 463-64

(3) سیر الاولیاء، ص ص 254-55، امیر خورد سلطان کے ساتھ شیخ قطب الدین منور کی ملاقات کا ایک واضح بیان پیش کرتا ہے۔

عطریات، لمحل (لانی) مختلف قسم کے کپڑوں اور دیگر خوبصورت اشیاء سے حاصل ہوتی ہے۔ عالم فقیہہ سراج الدین ابو صفا عمر بن اسحٰق بن احمد الشبلی الااودھی۔۔۔۔ ایک عظیم فقیہہ جو فی الحال دہلی میں سلطان کے دربار میں ہے، نے مجھ سے یہ بیان کیا ہے کہ اس بادشاہ کی سرزمین میں اہم صوبوں کی تعداد 23 ہے، دہلی، دیوگیری، ملتان، کہران (کہرام) سامانہ، سیستان (سیوستان) وجہ (اُچھ) ہاسی (ہانسی)، سسوتی (سرما) معبر، تلنگ (تلنگانہ)، گجرات، بدایوں، اودھ، قنوج، لکھناوتی، بہار، کڑا، مالوہ، لہاور (لاہور)، کلانور، جاج نگر اور دوار سمدر[1]۔

اس وسیع و عریض مملکت پر موثر طور پر کنٹرول قایم رکھنا چودھویں صدی میں ایک نہایت مشکل کام تھا۔ خاص طور پر جغرافیائی بندشوں اور رسل و رسائل کے ذرائع کے محدود ہونے کی بنا پر مقامی مفادات کی خاطر مرکز کے کنٹرول کو کمزور کرنے کے خاطر ان دونوں مجبوریوں کا فائدہ اٹھایا گیا۔ لیکن سلطان نے اپنی تنظیمی صلاحیت اور ذرائع و وسائل کو وسیع مملکت کے ہر حصہ کو اپنے ذاتی کنٹرول میں لانے کے لیے استعمال میں لایا برنی ہمیں بتاتا ہے کہ جب کبھی مملکت میں کسی نئے علاقہ کا الحاق کیا جاتا تو فوراً وہاں مختلف درجوں کے افسروں کو تعینات کر دیا جاتا اور لگانوں کی بلاواسطہ وصولی کے لیے انتظامات کیے جاتے۔[2] جب سلطان نے دولت آباد میں ایک موثر انتظامیہ کے قیام کی کوشش کی تھی تو اس کے پیش نظر وہ سخت مشکلات تھیں جو دہلی سے جنوب کو کنٹرول کرنے کے سلسلہ میں حائل تھیں۔ لیکن بہر کیف یہ اقدام غالباً جغرافیائی بندشوں پر حاوی نہ ہو سکا اور انتشار کے عمل کو صرف وقتی ہی طور پر روکا جا سکا۔ مکمل طور پر دفاع نہ کیا جا سکا۔

لیکن دس سال بعد تجربہ ناکام ہو گیا۔ اور اگرچہ سلطان نے اپنی کوششیں

---

(1) اس ضمن میں دو واقعات کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ فارسی کا ایک محقق اس کے لیے فلسفیانہ کتابیں لایا جس میں ابن سینا کی تصنیفات بھی شامل تھیں (مسالک الابصار ص 41) سلطان نے مولانا معین الدین عمرانی کو قاضی عضد کے پاس بھیجا تاکہ وہ انہیں ہندستان آنے پر اور اپنی کتاب متن موافق کو اس کی طرف منسوب کرنے پر آمادہ کر سکیں (عبد الحق اخبار الاخیار، ص 142)

(2) فیروز شاہی ص ص 70-467

آخری دم تک جاری رکھیں لیکن عہد وسطی کے رسل اور مواصلات کے حالات میں اتنے بڑے ڈھانچے کو قایم رکھنا ممکن نہ تھا۔ مرکز گریز رجحانات، جو حاوی ہونے لگے تھے، ان کو مندرجہ ذیل اسباب سے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ہندستانی تاریخ کی ایک زبردست قحط سالی، گلٹی دار طاعون، جس نے ایسا معلوم ہوتا ہے پوری ایک دہائی تک مرکزی فوج کو مفلوج بنا کر رکھ دیا۔ اور سزائے موت کے ان احکام نے جن کے ذریعہ سلطان نے عوام کو مطیع کرنا چاہا تھا لیکن جو محض مزید بغاوتوں کا باعث بنے۔

لیکن، ہمیں محمد بن تغلق کی ناکامی کے اندازے میں مبالغہ آمیزی سے کام نہ لینا چاہیئے اس نے دہلی سلطنت کی براہ راست انتظام میں شامل علاقوں کی سرحدوں کو وہیں قایم رکھا جہاں وہ علاؤالدین خلجی کی موت کے وقت تھیں۔ ممکن ہے کہ سلطان اور اس کی پالیسیاں نہایت غیر مقبول رہی ہوں اور ممکن ہے کہ عام شہری سلطان کی سزاؤں کے متعلق، صحیح یا مبالغہ آمیز کہانیوں کو سن کر دہشت زدہ ہو جاتے ہوں، لیکن پھر بھی، بلا شک و شبہ ذاتی طور پر لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فتوح السلاطین باغیوں کی سرگرمیوں اور ذہن کی نمائندگی کرتی ہے تو یہ نتیجہ بالکل اطمینان کے ساتھ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے عوام کو اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش باقی نہ رکھی۔ فتوح السلاطین بتاتی ہے کہ ”اگر تمام لوگ اس کے خلاف متحد ہو جاتے تو اسے معزول کر دیا جا سکتا تھا.......... اس کے خلاف بغاوت جائز ہے...... شریعت نے اس کے خون کو جائز قرار دے دیا ہے...... قاضیوں نے اس کی گردن زدنی کی اجازت کا ایک فتویٰ“ (فیصلہ دے دیا ہے)

سلطان کی صورت حال کے ایک درست جائزہ کی کوشش میں تین حقائق کو

---

(1) مسالک الابصار انگریزی ترجمہ، ص 61

اس فہرست میں شہاب الدین نے غلطی سے تلنگ کا دوبارہ تذکرہ کر دیا ہے اس عہد کا کوئی دوسرا مورخ مملکت کے صوبوں کی فہرست نہیں پیش کرتا۔ برنی ضمناً چند صوبوں کا ذکر کرتا ہے (فیروز شاہی ص ص 73-467) لیکن کوئی مکمل فہرست نہیں پیش کرتا۔

جانگر اور دوار سمدرا مملکت کے صوبے نہ تھے لیکن ان کے ہندو حکمرانوں نے دہلی کی بالادستی تسلیم کر لی تھی۔

(2) فیروز شاہی، ص 468

ذہن نشیں رکھنا چاہیئے۔ اول یہ کہ دہلی کے کسی سلطان کو اتنی زیادہ اور اتنی بہتر طور پر منظم بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا جتنا کہ سلطان محمد بن تغلق کو۔ یہ حقیقت کہ وہ ان تمام پر قابو پا سکا یہ ثابت کرتی ہے کہ اس کے پاس نہایت وفادار افسران کا ایک دستہ تھا مزید یہ کہ باغیوں کی کامیابی ان ہی علاقوں تک محدود تھی جن کا الحاق علاؤالدین خلجی کی موت کے بعد ہوا تھا۔ یہ بات یہی ثابت کرتی ہے کہ عظیم خلجی سلطان نے جہاں پر رک جانے کا فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا۔ دوم یہ کہ محمد بن تغلق سلطنت دہلی کے ان چند حکمرانوں میں سے ایک ہے جس کے خلاف کوئی قتل کی سازش قلم بند نہیں ہے اگر اس کے تین اہم مورخین (عصامی، برنی اور ابن بطوطہ) درست ہیں تو، ہندستان میں یقیناً ایسے ہزاروں اشخاص تھے جن کے دلوں میں سلطان سے ذاتی انتقام کا زبردست جذبہ موجزن تھا، مزید یہ بھی بیان نہیں ہے کہ سلطان نے اپنے ذاتی تحفظ کی خاطر اپنے اسلاف کے روایتی اقدامات کے ماسوا کوئی دوسرا اقدم اٹھایا ہو تو وہ اس اعلا درجہ کا فوجی تھا کہ قاتل کے چاقو یا محل کے اندر کی سازشوں کا اسے کوئی ڈر نہ تھا۔ یہ بات کہ خود اس کے افسران اسے معزول کر دیں گے یہ بات اس کے ذہن میں کبھی نہیں آئی اس نے باغیوں اور اپنی رعایا کے بیشتر اشخاص کے متعلق جو کچھ بھی سوچا ہو۔

آخری بات یہ کہ محمد بن تغلق کسی جانشین کو نامزد کیے بغیر انتقال کر گیا۔ دو دونوں تک دریائے سندھ کے کنارے اس کی فوج کا کوئی بادشاہ نہ تھا۔ فیروز شاہ کو اپنے انتخاب کے بعد ٹھٹھہ کے مضافات سے لے کر دہلی تک تمام راستہ کو طے کرنا پڑا۔[2] اگر فوج کے افسران کی اکثریت غدار ہوتی تو وہ تغلق خاندان کو بے دخل کر سکتی تھی۔ محض تھوڑے سے تند خو اور بد خواہ لوگ بھی فیروز شاہ کی پوزیشن کو مشکل بنا سکتے تھے۔ بڑے صوبوں کے گورنر سلطان محمد بن تغلق کی موت جو مرکزی اقتدار کی وقتی کمزوری کا سبب سمجھی جا سکتی تھی، کی خبر پا کر بغاوت کر سکتے تھے۔ لیکن ان تمام نے جلد از جلد فیروز شاہ کو اپنی وفاداری کی پیشکش کر دی۔ بنگال، دکن اور جنوب بعید ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔ لیکن شمالی ہند کی تمام بغاوتوں کو کچل ڈالا گیا تھا۔

---

(1) فتوح السلاطین، ص 405

(2) ایضاً، ص 515

سلطان کے کردار کے متعلق اس کے ہم عصروں اور بعد کے لوگوں نے مختلف تجزیئے پیش کیے ہیں اسے 'متناقضات کا ایک ڈھیر، تخلیق کا ایک عجوبہ، فطرت کی ایک ستم ظریفی، ایک بد نصیب مثالیث پسند اور سب سے بڑھ کر ایک بھیانک خواب اور ایک پاگل انسان، کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن یہ تاثرات زیادہ تر اس کی پیچیدہ فطرت کے جزوی جائزوں پر مبنی ہیں نہ کہ دہلی سلطنت کی تاریخ میں اس کے فیضان اور اثرات کے اثباتی جائزے کی بنیاد پر۔

شہاب الدین العمری، القلقشندی، ابن حجر عقلانی اور صلاح الدین صفو جیسے غیر ملکی محققین نے اس کی قابلیت، سخاوت اور غیر ملکی محققین کے ساتھ مخلصانہ سلوک کی بنا پر غیر مشروط طور پر اس کی تعریف کی ہے۔ ابن بطوطہ سلطان کی فیاضیانہ سخاوت اور مذہبی معاملات میں دلچسپی کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن اس کی گردن زدنیوں کی مذمت کرتا ہے۔ عصامی کے نزدیک سلطان ایک دوسرا الیزید ہے[1] ظالم و مستبد[2] اور ایک بدعتی تھا[3] جو مکمل مذمت کا مستحق تھا۔ وہ شروع سے لے کر آخیر تک سلطان کی ایک وحشت ناک تصویر کھینچتا ہے اور اس کی شخصیت میں ایسی خوبی نہیں پاتا جو اس کے عیوب کی تلافی کر سکے۔ وہ اس کے خلاف ہر بغاوت کو جائز قرار دیتا ہے۔ برنی بھی سلطان کا نکتہ چیں ہے۔ لیکن عصامی کے برخلاف تقریباً ہر ان بغاوتوں میں جن پر اس نے بحث کی ہے۔ اس کی ہمدردیاں محمد بن تغلق کے ساتھ ہیں۔

ایک سترہ سالہ رفیق، برنی کے نزدیک محمد بن تغلق "تضادات کا ایک مرکب" تھا۔ تاہم مورخ کے ذہن کا ایک محتاط تجزیہ ایک شخص کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ در حقیقت سلطان 'متناقضات کا ایک ڈھیر، یا تضادات کا ایک مرکب، نہ تھا بلکہ مورخ خود ہی افسوسناک طور پر متضاد شخصیت کا حامل تھا۔ اس نے سلطان کے کردار کے تجزیئے میں خود اپنے نفسیاتی حالات کی آمیزش کر دی۔ عہدوں کا دروازہ ارباب ہنر کے لیے کھلا رکھنے کی پالیسی، اس کے انوکھے احکامات، امراء کے دلکش حلقہ میں عام لوگوں کی

---

(1) ایضاً، ص 606

(2) ایضاً، ص 607

(3) ایضاً، ص 515

بھرتی، اس کی وہ فلسفیانہ دلچسپیاں جو الہامی کتابوں اور پیغمبروں کی روایتوں ' (کتب سماوی و احادیث انبیاء) کے سلسلہ میں اس کے اندر ایک مسلک رویے کے ارتقاء کا باعث بنیں، یہی وہ اسباب تھے جنھوں نے ہر طرف ایک مکمل ابتری پھیلادی تھی اور قدیم اور باعزت خاندانوں، مثلاً خود برنی کے خاندان، کی صورت حال کو غیر یقینی بنادیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ (برنی کے خیال میں) شدید مذمت کا مستحق تھا۔ لہٰذا برنی سلطان کی تحقیر شروع کردیتا ہے۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتی۔ جیسے ہی مورخ اپنے ذہنی سفر سے پلٹتا ہے اور جیسے ہی اچانک اسے اپنی موجودہ تکلیف وہ حالت کا احساس ہوتا ہے تو اس کے جذبات کی رو بدلنے لگتی ہے۔ " میں محمد بن تغلق کے عہد و حکومت میں حیثیت اور عہدے کا حامل تھا۔[2] اس جیسا ایک مربی اور محسن تعریف کا مستحق ہے، اس کے بعد مورخ اس کی تعریفات کے پل باندھنا شروع کردیتا ہے برنی جب زمانہ حال میں ہوتا ہے تو اس کے دل میں محمد بن تغلق کی محبت ہوتی ہے لیکن جب وہ زمانہ ماضی میں ہوتا ہے تو اس کے دل میں اس کے لیے نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں اس طرح مورخ کا انداز بیان محبت و نفرت کے اتار چڑھاؤ کا حامل ہے۔ جیوں ہی کوئی شخص مورخ کے اس لطیف نفسیاتی پہلو کو سمجھ لیتا ہے تیوں ہی اس کی پیش کردہ تمام تفصیلات کی ایک خاص تناظر کے مطابق ترتیب ہو جاتی ہے۔

محمد بن تغلق کی انتظامیہ

محمد بن تغلق کی حکومت کے دوران دہلی سلطنت کے حکمراں طبقہ کی ساخت اور اس کے کردار میں ایک مکمل تبدیلی رونما ہوئی۔ اگر ایک طرف اس نے نسلی تعلق کی بہ نسبت وفاداری اور قوت کارکردگی پر مبنی ایک حکمراں طبقہ کے خلجی تصور کو فروغ دیا تو دوسری طرف اس نے اس میں نئے عناصر کا بھی آغاز کیا۔ سلطان نے اپنی تخت نشینی کے وقت جو عہدے عطا کیے ان کی فہرست برنی نے نہیں دی ہے۔ لیکن یحیٰی سرہندی نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ تاہم برنی اس عہد حکومت کے متاخرہ دور کے افسران کے چند جستہ حوالہ جات پیش کرتا ہے۔ ان دونوں فہرستوں کے ساتھ ساتھ

---

(1) ایضاً، ص 467

(2) ایضاً

ہم عصر دستاویزات میں پائے جانے والے دیگر افسران کے ناموں کا ایک مطالبہ اس کی انتظامیہ کے بنیادی کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق کا حکمراں طبقہ سات مختلف عناصر پر مشتمل تھا۔

(1) ان افسران کے خاندان جو علاؤالدین خلجی کے دور حکومت سے ہی سلطنت کی ملازمت میں تھے (2) نو مسلم خاندانوں کے افراد جنہوں نے حال ہی میں اعلا عہدوں پر ترقیاں پائی تھیں (3) بیرونی ملک سے آئے ہوئے افراد (4) مذہبی بالخصوص صوفی خاندانوں کے افراد جن کی تقرری سلطان کے ذریعہ عمل میں آئی تھی۔ (5) افغان لوگ (6) امیران صدہ اور (7) ہندو لوگ۔

اس سے قبل یا اس کے بعد کبھی بھی دہلی سلطنت کے حکمراں طبقہ کی ایسے مختلف پس منظروں سے بھرتی عمل میں نہ آئی۔ یہ بات بیک وقت محمد بن تغلق کی انتظامیہ کی مضبوطی اور کمزوری دونوں ہی کا سبب تھی اس نے مملکت کی بنیاد کی توسیع تو کر دی لیکن سلطان کی پوزیشن کمزور بنا کر رکھ دی۔

(1) پرانے خاندان

پرانے امراء میں سلطان کے وزیر خواجہ جہاں احمد ایاز، جو محمد ایاز کا بیٹا تھا، علاؤالدین کے سیری کو توال، قتلغ خاں اور امیر ماہرو کے بیٹے عین الملک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ احمد ایاز، محمد بن تغلق کی پوری پالیسی سے قریبی طور پر وابستہ تھا اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے۔ اسے سلطان کی موت کے بعد اس کی بات کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا۔ قتلغ خاں سلطان کا ایک معلم تھا اور وہ اس کی کافی عزت کرتا تھا اس کے دونوں بھائی، مکال الدین اور نظام الدین بھی انتظامیہ میں ممتاز عہدوں کے حامل تھے۔ قتلغ خاں 1335ء میں دولت آباد کا وزیر مقرر ہوا تھا جب بیماری نے سلطان کو اپنی معبر کی مہم کو خیر باد کہہ کر دہلی واپس ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ قتلغ بغاوتوں سے نہ نمٹ سکا بلکہ درحقیقت وہ جنوب کے مسائل سے نمٹنے کے سلسلہ میں مناسب وقت پر ہمت و جراتمندی کا اظہار نہ کر سکا۔ اس کی حد سے زیادہ احتیاطات یا تذبذب کی پالیسی جنوب کے ہاتھوں سے نکل جانے کی باعث بنی اور مدورا، وارنگل کمپیل اور وجے نگر کی آزاد

مملکتوں کی راہ ہموار کردی۔ لہٰذا بالآخر سلطان کو اسے دکن سے واپس بلانا پڑا۔ عین الملک ماہرو، گرچہ وہ ایک فوجی شخص تھا، ایک نہایت ایماندار انتظام کار تھا اور اس میں انتظامی کارکردگی کے ساتھ علمیت اور فارسی زبان میں لکھنے کی عمدہ صلاحیت موجود تھی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ اسے حکمراں طبقہ کے درمیان ہندستانی گروپ کے ایک لیڈر کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا اور اس لیے غیر ملکی امرا کے لیے وہ قابل قبول نہ تھا جو ہمیشہ اسے کسی نہ کسی مشکل میں الجھا دینے کی فکر میں رہتے۔ اودھ کے گورنر کی حیثیت سے اس کے بہترین کاموں کے متعلق ہمیں واقفیت ہو چکی ہے۔ اس وقت سلطان قحط سالی کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ فیروز شاہ کے دور حکومت میں ایک نمایاں رول کا ادا کرنا اس کی قسمت میں لکھا تھا۔

محمد بن تغلق کی حکومتی تنظیم میں جیسے ہی نئے عناصر داخل ہوئے قدیم امرا کی اس جماعت کا انتظامیہ پر سے بلا شرکت غیر اختیار رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔

(۲) نو مسلمین

محمد بن تغلق کے حکمراں طبقہ کا دوسرا اہم عنصر ہندو مذہب کو خیر باد کہہ دینے والے نو مسلموں پر مشتمل تھا۔ عزیز الدین خمار (شراب کشید کرنے والا) اور قوام الملک مقبول اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ عزیز الدین غالباً ایک مے فروش خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسے خمار کہا جاتا تھا۔ برنی اس کے پست خاندانی حیثیت کا بڑا نکتہ چیں ہے۔ ابن بطوطہ نے اسے امروہا میں بحیثیت ایک ٹیکس وصول کنندہ دیکھا تھا لیکن بعد میں اسے مالوہ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ ہندو مذہب کو خیر باد کہہ دینے والے کسی نو مسلم کی سلطنت دہلی کی ملازمت میں اتنی شاندار زندگی نہ رہی جتنی کہ قوام الملک مقبول کی۔ اس کا تعلق وارنگل کے ہندو امرا سے تھا۔ سلطان نے اسے مشرف بہ اسلام کیا اور اسکے غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اسے کارگر پا کر ترقی دی۔ وہ بہت سے عہدوں پر فائز ہوا جس میں یکے بعد دیگرے ملتان، بدایوں اور گجرات کی گورنری بھی شامل تھی۔ جس وقت سلطان کا انتقال ہوا اس وقت وہ دہلی میں پوری مملکت کے نائب وزیر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ حکمراں ہندو خاندانوں کے چند افراد

بھی اسی گروہ میں شامل تھے۔ کمپیل کے رائے کے بیٹے بھی، جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا یا جن کی مسلمان کی حیثیت سے پرورش ہوئی تھی اسی گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطان کو ان پر بڑا اعتماد تھا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس نے ان میں سے ایک کو اپنے پینے کے پانی رسد کا انچارج مقرر کیا تھا۔ امرا کا یہ گروپ سلطان کے پورے دور حکومت تک، اس کے اعتماد کا حامل رہا۔

(۳) بیرونی ممالک سے آئے ہوئے افراد

محمد بن تغلق نے غیر ملکوں سے آئے ہوئے افراد کو غیر معمولی اہمیت دی اور اپنے انتظام حکومت میں انہیں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز کیا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ ”شہنشاہ ہند سلطان ابوالمجاہد محمد شاہ کی عادتوں میں سے ایک عادت غیر ملکیوں سے محبت کرنا اور گورنروں اور اعلا افسروں کی حیثیت سے بالخصوص ان کی تقرری کر کے ان کی عزت افزائی کرنا ہے۔ اس کے مخصوص افسروں، حاجبوں، وزیروں، ججوں اور نسبتی بھائیوں میں سے بیشتر غیر ملکی ہیں۔ اس نے احکامات جاری کیے ہیں کہ اس کی مملکت میں غیر ملکیوں کو اعزا کہہ کر مخاطب کیا جائے اور نتیجۃً اعزا (معزز) کا ان کا ایک مخصوص نام ہو گیا تھا۔[1] غیر ملکی افسران کے اس گروپ کو غیر امتیازانہ طور پر ملک کے ہر حصہ میں کام پر نہیں لگایا جا سکتا تھا کیونکہ مقامی مسائل کے متعلق ان کی معلومات محدود تھیں لیکن عدالتی عہدوں پر یا خیرات سے متعلق شعبوں میں وہ بہتر طریقے پر کام کر سکتے تھے۔ سلطان اور اس کی پالیسیوں میں ابن بطوطہ کی شدید تنقید اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ عنصر مقامی دباؤ اور تعصب سے متاثر تھا لیکن بحیثیت مجموعی یہ سلطان کا معاون اور وفادار تھا۔

(۴) مذہبی خاندانوں کے افراد

محمد بن تغلق نے جو تجربات کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ مذہبی خاندانوں کے چند افراد کی بھرتی کی جائے۔ جیسا کہ ایک دوسری جگہ پر بیان کیا گیا ہے، اس کی دلیل یہ تھی کہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں تعلیم یافتہ اور متقی لوگوں نے ریاست کے لیے اسی طرح کی خدمات انجام دیں تھیں، یہ مثال غلط تھی کیونکہ حالات بالکل

بدل چکے تھے اور مذہب اور انتظام حکومت کے لیے مطلوبہ ترتیب اتنی زیادہ مختلف بن گئی تھی کہ انتظامی عہدوں پر ایسے اشخاص کی بحالی کی کوشش، جو دینیات یا تصوف کے تربیت یافتہ تو ہوں لیکن جنگ و انتظام حکومت سے ناواقف ہوں لازماً بد نظمی کا باعث ہوتی۔ اجودھان کے شیخ علاؤالدین کے بیٹے شیخ معزالدین کو، جسے نہایت نازک حالات میں گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ باغیوں نے مار ڈالا۔[3] ملتان کے شیخ رکن الدین ابوالفتح کے ایک بھائی شیخ عمادالدین نے بہرام ایبہ کے خلاف مجت کی لیکن مارا گیا۔[4] سید کمال الدین امیر کرمانی کو فوج میں لے گیا۔ دہلی کے ایک مشہور و معروف بزرگ شیخ شہاب الدین کو دیوان المستخرج- لگان کے بقایاجات کی وصولی کے شعبہ کا صدر مقرر کیا گیا۔ یہ بقلیاجات عموماً تعذیب کے ذریعہ اور ڈنڈوں کے زور پر، وصول کیے جاتے اس عہدے کے لیے سب سے زیادہ غیر مناسب ایک صوفی خاندان کا رکن ہی ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عنصر انتظام حکومت کے لیے کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکتا تھا لہٰذا وہ سیاسی منچ پر سے آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔

(۵) افغان

چند افغان خاندان بھی محمد بن تغلق کے انتظام حکومت میں اعلا عہدے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ملک مخ اور مل شاہو لودی افغان ممتاز ملکوں میں سے تھے اور برنی قطعی طور پر ان کے ناموں کا ذکر محمد بن تغلق کے افسران کی فہرست میں کرتا ہے۔[5] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان افغانوں نے اس کے ساتھ تعاون نہ کیا اور ان کی بغاوتوں نے ایک سنگین مسئلہ کھڑا کر دیا۔

(۶) امیران صدہ

ان امرا کے کردار اور پوزیشن پر پہلے بحث کی جا چکی ہے۔

---

(1) رحلہ، ص 4 شہاب الدین العمری اور ضیاء الدین برنی سے ابن بطوطہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

(2) ملاحظہ ہو، نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص366

(3) برنی، فیروز شاہی، ص518

(4) رحلہ، ص97

(5) سیر الاولیاء، ص215

(۷) ہندو افسران

محمد بن تغلق کی حکومت کے دوران ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد انتظامیہ کے اہم عہدوں پر فائز کی گئی۔ چونار[1] کے کتبے میں سلطان کے ایک ہندو وزیر سائے راج کا حوالہ ہے۔ دکن کا نائب وزیر بھی دھارا نامی ایک ہندو[2] تھا۔ سہوان کی گورنری رتن کے سپرد کی گئی تھی۔ بھیرن رائے گلبرگہ کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ اور کوہر کا قطع اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ انتظامیہ کے دلکش دائرہ میں اس ہندو عنصر کے شامل کیے جانے پر قدیم خاندانوں (کے افراد) نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ ان لوگوں کے اپنے مفادات تھے اور اپنی مراعات میں کسی طرح کی دخل اندازی کے وہ مخالف تھے سہوان کی بغاوت اور علی شاہ نتھو کی بغاوت اسی بے اطمینانی کا نتیجہ تھی۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ حالانکہ محمد بن تغلق کو مسلم افسران[3] کی متعدد منظم بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کی ملازمت میں شامل ہندو افسران کی کوئی بغاوت نہ ہوئی۔

بحیثیت مجموعی یہ ساتوں عناصر، ان کی انفرادی افادیت اور اہمیت خواہ جو بھی ہو، ایک ساتھ مل کر آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ اور (اسی وجہ سے) محمد بن تغلق کے حکمراں طبقہ میں جذبے اور نظریے کی اس یکسانیت کی کمی تھی جو اس کی پالیسیوں اور منصوبوں کی کامیاب تکمیل کے لیے ضروری ہے۔

---

(1) رحلہ، ص 87

(2) فیروز شاہی، ص ص 454-55

(3) JASB 1836ء جلد 5، ص ص 4.5 34.2

3

فیروز شاہ تغلق

انتخاب، دہلی کو روانگی[1]

تقریباً دس دنوں کی بیماری کے بعد ٹھٹھہ سے تقریباً اٹھارہ کردہ دور سندھ کے مشرقی کنارے پر جب 20 مارچ 1351 (21 محرم 752) کو سلطان محمد بن تغلق کا انتقال ہو گیا تو اس کے خیمہ کی عورتوں اور مردوں نے جن کی تعداد برنی کے مطابق تقریباً دو لاکھ تھی، دو باتیں یقینی طور پر معلوم تھیں۔ مرحوم سلطان کا کوئی بیٹا نہ تھا اور اس نے کوئی جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔[2]

کیمپ میں موجود تعلیم یافتہ لوگوں کی نظر میں، خواہ وہ غیر فوجی ہوں یا فوجی، صورت حال بہت نازک تھی اور اگر اسے مناسب طور پر کنٹرول نہ کیا گیا تو وہ ایک جانشینی کی جنگ کی باعث بن سکتی تھی۔ مسلم بادشاہت کی عام روایات کے بموجب

---

(1) برنی، ص ص 48-531 عفیف، ص ص 88-36، مبارک شاہی، ص ص 22-118، ڈاکٹر ریاض الاسلام پروفیسر عمل تواریخ، کراچی۔ فیروز شاہ کے موضوع پر ٹائپ کردہ پی ایچ ڈی کا مقالہ

(2) عصامی کے اس بیان کو جو محمد بن تغلق کے دور حکومت میں ہی دیا گیا تھا کہ اس کے اندر انسانی احساسات کا فقدان تھا کیونکہ اس کی کوئی اولاد ہی نہ تھی، یقیناً اس مسئلہ میں فیصلہ کن شمار کیا جانا چاہیے۔ (ص 433)

برنی فیروز شاہ کو خوش کرنے کی کوشش میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ تینوں اہم اعتبارات سے وہ حقدار تھا۔ اپنے پیش رو کے ذریعہ نامزدگی، ناقابل انکار ذاتی لیاقت اور ممتاز اشخاص کے ذریعہ 'انتخاب'۔ لیکن اگر فیروز کی نامزدگی ہوئی ہوتی تو وہ پریشان کن دنوں تک بلا فائدہ سفر، جس کا برنی بالتفصیل تذکرہ کرتا ہے، کے قبل ہی امراء اس سے تخت نشین ہو جانے کے اور ذمہ داری سنبھالنے کی درخواست کر دیتے۔ مزید یہ کہ اگر سلطان محمد نے کسی جانشین کو نامزد کر دیا ہوتا تو اپنے بیٹے کے سلسلے میں خداوند زادہ کے دعویٰ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔

سلطان کو اعلیٰ افسران اور شاہی خاندان کے افراد میں سے دیگر ممتاز لوگوں کے ذریعہ منتخب ہونا پڑتا تھا لیکن ان ممتاز لوگوں میں سے محض چند کیمپ میں موجود تھے۔ دہلی میں مقیم مرکزی حکومت کے افسران کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ صوبوں کے گورنر بھی تھے جن کی سرگرم رضامندی بھی نئے حکمراں کی پر امن تخت نشینی کی توثیق کے لیے ناگزیر تھی جس چیز نے صورت حال کو محفوظ بنا دیا وہ اس بات کا عام احساس تھا، جس کا برنی حوالہ دیتا ہے کہ تغلق شاہ کے خاندان کا واحد فرد، جو توجہ کا مستحق تھا، تغلق کے چھوٹے بھائی ملک رجب کا بیٹا کمال الدین فیروز تھا جو مرحوم سلطان کا تیسرا اعلیٰ ترین افسر بھی رہ چکا تھا۔

سلطان کی موت کے فوراً بعد اس کے اعلی افسروں نے منگولوں کے کمانڈر التون بہادر کے ساتھ جسے ماوراء النہر کے حکمراں امیر قزغن نے مرحوم سلطان کی مدد کے لیے بھیجا تھا، اتنی رقم کی ادائیگی کے ذریعہ، جو وہ مہیا کر سکتے تھے یہ طے کر لیا کہ اس کے آدمی شاہی خیمہ کے کچھ فاصلہ پر رہیں۔ 21/ مارچ کا دن سوگ میں گزارا گیا۔ 22/ مارچ کی صبح کو سیوم کی رسوم[1] کی انجام دہی کے بعد بلا قائی کی فوج سخت پریشانی کے عالم میں دریا کے مشرقی کنارے کی جانب سے سیوستان کے لیے روانہ ہوئی۔ اسی دن ترمہ شیریں خاں کے ایک داماد نورور کرگن' نے جسے مملکت دہلی کی ملازمت میں مرحوم سلطان کے ذریعہ ترقی ملی تھی، خود اپنے لوگوں سے دوبارہ مل جانے کا فیصلہ کیا اور منگولوں کو بلا قائد کی فوج پر حملہ کر دینے کی دعوت دی۔ 24 اور 25 مارچ کے منگولوں کے حملے نہایت شدید تھے ایک موقع پر تو مشکل ہی سے شاہی حرم کی عورتوں اور شاہی خزانے کو ان کے قبضہ میں چلے جانے سے روکا جا سکا۔ اسی اثناء میں ٹھٹہ کے باشندوں نے روانہ ہونے والی فوج پر جنوب سے حملہ کرنا شروع کر دیا۔

دنوں تک بد انتظامی کی حالت میں سفر کے تجربہ نے تمام متعلقہ افراد کو یہ بات باور کرا دی کہ وہ ایک امام قائد کے بغیر مزید آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کمال الدین فیروز

---

(1) سیوم تجہیز و تکفین کے تیسرے دن ادا کیا جاتا ہے جو مردے کو ثواب پہنچانے کی خاطر قرآن پڑھنے اور اس کے نجات کے لیے دعائیں کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ عموماً فجر کی نماز کے بعد کے وقت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

کی حمایت میں اتفاق رائے تھا لیکن مرحوم سلطان کی بہن خداوند زادہ اپنے بیٹے داور ملک کو منتخب کرانا چاہتی تھی۔ ملک سیف الدین خوجہ کو اس کی تنبیہ کے لیے بھیجا گیا۔ لیکن وہ اپنے اختیار سے تجاوز کر گیا اور داور ملک کے لیے امیر حاجب کے عہدے کا وعدہ کر دیا۔ لیکن اس وعدہ کو پورا نہ کیا گیا۔ ادھر فیروز نے اس عہدے کو، جو اس وقت کے تمام عہدوں سے زیادہ خطرناک تھا، قبول کرنے میں واقعی نارضامندی کا اظہار کیا لیکن ایک منگول شہزادے کے قیدی بیٹے تاتار خاں نے، جسے تغلق شاہ نے اپنا متبنّٰی بنالیا تھا اور تعلیم دی تھی، فیروز کے بازو کو پکڑ کر اسے زبردستی تخت نشین کی دھمکی دے کر بحث کا خاتمہ کر دیا۔ فیروز شاہ نے دو رکعت نماز پڑھ لینے کی مہلت چاہی اور اس کے بعد اپنے ماتمی لباس پر شاہی پوشاک پہن کر تخت نشین ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایک ہاتھی پر سوار ہوا اور اپنی بنت عم خداوندزاہد کی طرف روانہ ہوا جس نے اس کی تخت نشینی قبول کر لینے کی علامت کے طور پر اسے اپنے گلے سے لگالیا اور شاہی کلاہ (ٹوپی) جس کی قیمت ایک لاکھ ٹنکہ تھی اس کے سر پر رکھ دی (24 مارچ)

عفیف جس کے اسلاف علاؤالدین خلجی کے زمانہ سے ہی تغلق خاندان سے وابستہ تھے، ہمیں فیروز شاہ کے اولاد کی شادی اور فیروز کی ابتدائی زندگی کا بیان دیتا ہے۔ جس زمانہ میں ملک تغلق دیپال پور کا گورنر تھا اس زمانہ میں عفیف کے لکڑ دادا ملک شہاب عفیف اس کا ایک ماتحت تھا اور ابوہر ضلع کا انچارج تھا۔ تغلق کے دو چھوٹے بھائی تھے، سید سالار رجب اور ابو بکر۔ یہ بات کہ آیا غیاث الدین تغلق ایک جاٹ عورت کا لڑکا تھا نہ ثابت شدہ ہے اور نہ غیر ثابت شدہ ہے۔ لیکن رجب کے لیے وہ ایک باحیثیت ہندو عورت کی تلاش میں تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ رائے انمل بھٹی کی بیٹی بی بی نالا (نائیلا) سب سے بہتر جوڑا ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن جب یہ تجویز رائے کے پاس بھیجی گئی تو اس نے اسے ناراضگی کے ساتھ رد کر دیا۔ شہاب عفیف نے تغلق کو رائے کی سرزمین کی طرف پیش قدمی کا اور رائے اور اس کے مقدمین سے خراج کے بقایاجات کے مطالبہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اس بات نے رائے کے خاندان کو مشکل میں ڈال دیا لیکن دو یا تین دن بعد نوجوان دوشیزہ نے اس پیش کش کو قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اور رائے کو اس فیصلہ سے کچھ اطمینان ہوا، اس نے کہا کہ: ”مجھے ان کے پاس بھیج

دیجیے، سمجھ لیجیے کہ آپ کی لڑکی کو منگولوں نے گرفتار کر لیا ہے"۔ کمال الدین فیروز 709ہجری (10-1309) کو پیدا ہوا تھا لیکن ابھی وہ سات ہی سال کا تھا کہ ملک رجب کا انتقال ہو گیا۔ لہٰذا تغلق نے رنج والم میں ڈوبی ہوئی نوجوان بیوہ سے یہ عہد کیا کہ وہ فیروز کے ساتھ خود اپنے بیٹا جیسا سلوک کرے گا۔ اس وعدہ کو اعلیٰ ظرفی کے ساتھ پورا کیا گیا۔

رجب نے دوسری بیویوں سے دو اور بیٹے قطب الدین اور ابراہیم چھوڑے تھے لیکن فیروز اپنی ماں کی بدولت فوقیت رکھتا تھا۔ سلطان محمد کی تخت نشینی کے وقت فیروز کی عمر اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی۔ سلطان محمد نے اپنے بیٹے کا وعدہ پورا کیااور فیروز کو حکومت کے تمام سول محکموں کے متعلق مکمل تربیت دی۔ ریاستی پالیسی، انتظامیہ، حساب وکتاب، تقرریاں وغیرہ۔ فیروز امیر حاجب یا باربک کے عہدہ پر فائز تھا لیکن سلطان نے اس عہدے سے غیر متعلق بہت سے دیگر فرائض بھی اس کے سپرد کر دیے تھے۔ سلطان پر کارکردگی کا خبط سوار تھا لہٰذا فیروز سے یقینی حد سے زیادہ کام لیا جاتا۔ سلطان کہتا ہے کہ "امیر حاجب! کل عید ہے" اور فیروز کو دستیاب مختصر وقت میں ہی تمام ضروری انتظامات کرنے پڑتے۔ عفیف ہمیں یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ سلطان کا اصل مقصد فیروز کو ایک تربیت دینی تھی۔ لیکن اگرچہ محمد بن تغلق ایک پیشہ ور سپاہی تھا پھر بھی اس نے فیروز کو کسی عسکری خدمت پر متعین نہ کیا بلکہ وہ اس کے شکار کا بہت زیادہ دلدادہ ہونے کا شاکی تھا۔ فیروز نے اپنے عم زادہ بھائی سلطان کی وفادارانہ طور پر اور خلوص نیت سے اطاعت کی اور اس کی موت کے بعد بھی اس سے ہر ممکن محبت برقرار رکھی۔ عفیف جس نے اسے بارہا دیکھا تھا، بیان کرتا ہے کہ فیروز شاہ کی رنگت گوری، ناک بڑی اور داڑھی کشادہ تھی اور اس کا قد اور وزن درمیانی تھا۔

جن لوگوں نے 45 قمری سالوں کی پختہ عمر میں فیروز شاہ کو تخت نشین ہوتے دیکھا تھا وہ لوگ مشکل ہی سے یہ پیشین گوئی کر سکے ہوں گے کہ وہ ہندستان کو تحفظ اور امن و امان کے 38 سال دے گا اور یہ کہ اس عہد کی اہم خصوصیات یہ ہوں گی-(الف) کم قیمتیں اور زیادہ مزدوری (ب) نہ قحط سالی اور نہ وبائیں (ج) نہ کوئی سنگین غیر ملکی حملہ (د) نہ بغاوتیں نہ کوئی اندرونی تناؤ (ر) سلطان کے قتل کی ایک

کوشش اور زہر دینے کی کئی کوششیں۔ لیکن نہ کوئی سازش اور نہ کسی بھی وقت محل میں انقلاب کا کوئی خطرہ۔ تصویر کے دوسرے رخ سے متعلق فیروز کے انتظام حکومت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے حکومت پر انحصار کرنے والے تمام لوگوں کو تحفظ بہم پہنچایا۔ شاہی خاندان کے افراد کو، جو عہد وسطیٰ کے ہندستان کی تاریخ میں پہلی اور آخری بار صاحب تخت کی جانب سے کسی خطرہ میں نہ تھے اور ریاست کے اونچے اور نیچے تمام ملازمین کو، جنھیں اس بات کی ضمانت دی گئی تھی کہ ان کے عہدے ان کے بیٹوں کو ملیں گے اور جنھوں نے عملاً یہ پایا کہ حکومت ان کے حساب وکتاب پر محض ایک رسمی نگرانی کرے گی۔

اگر عین ماہرو کی انشاء کو اس عہد کے خیالات کا آئینہ دار مان لیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام سرکاری افسر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ کسی بھی انسان کو تکلیف نہیں دیتے تھے بلکہ صرف ریاست کو لوٹتے تھے۔ فیروز شاہ کا دور حکومت عہد وسطیٰ کے ہندستان کی ساری تاریخ میں رشوت خوری کا سب سے زبردست دور تھا۔ فیروز ایک اوسط ذہن کا آدمی تھا مگر اس کے تجربات متنوع تھے۔ وہ ایک کمزور شخص نہ تھا لیکن وہ ایسے مادہ سے بھی نہ تھا جس سے مستبد حکمرانوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس کی ناکامی اور کامیابی کے اسباب کو صرف ایک مختصر جملے میں بیان کیا جا سکتا ہے: ”اس نے مطلق العنان مسلم شہنشاہیت کے وحشت انگیز مگر ضروری اداروں میں قرآن کے اصولوں، پیغمبرؐ کی تعلیمات اور اس انسان دوستی کو داخل کیا جو ان تمام مذاہب وملل میں عام تھی جو اس شہنشاہیت کے بنیادی اصول کے عین مخالف تھے“۔ وہ اپنے آپ پر اس حقیقت کی بنا پر نازاں تھا کہ ’خوف اور دہشت‘ کے استعمال کے بغیر ہی اس کی حکومت کا وقار نہ صرف یہ کہ برقرار رہا بلکہ اس میں اضافہ ہی ہوا۔ یہ بات اس کے دور حکومت میں تو ممکن ہو سکی لیکن اس کے بعد ساری باتیں دفعتاً ختم ہو جانے والی تھیں۔ فیروز اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا لیکن پالیسی کے پیش نظر صرف نظر کر دیتا تھا۔ بے رحم اور مطلق العنان ہو جانا اس کی فطرت میں نہ تھا اور اس جیسے کردار اور صلاحیت والے ایک شخص کے لیے کوئی دوسری پالیسی ممکن بھی نہ تھی۔

اس کی تخت نشینی کے دوسرے دن فوج منظم شکل میں روانہ ہوئی۔ تین دنوں

بعد وہ اس حالت میں تھا کہ منگولوں کے خلاف ایک فوجی دستہ بھیج سکے۔ اس دستہ نے منگولوں کو شکست دے کر انھیں کھدیڑ دیا اور ان ہندستانیوں کو آزاد کر دیا جنھیں انھوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ ٹھٹھہ والے بھی پسپا ہو گئے۔ سیوستان میں، جہاں فوج نے ایک ہفتہ یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ تک قیام کیا تھا، پہلی بار جمعہ کا خطبہ فیروز شاہ کے نام پر پڑھا گیا۔ ریاست کا سب سے اہم کام ملک کو فیروز شاہ کی تخت نشینی سے آگاہ کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے پورے ملک میں اشاعت کے لیے ایک عام اعلان جاری کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ مخصوص پیغامبران کو خلعت کے ساتھ اہم افسروں کے پاس روانہ کیا گیا۔ خاص طور پر سید علاؤالدین رسولدار اور ملک سیف الدین شحنا پیل کو خواجہ جہاں کے پاس دہلی بھیجا گیا۔ مسلم ممالک سے آئے ہوئے غیر ملکیوں کو جنھیں مرحوم سلطان نے اکٹھا کر رکھا تھا، حتی الامکان تحائف دیے گئے اور ان سے اپنے وطن روانہ ہونے کی درخواست کی گئی۔ فیروز نے اپنے سوتیلے بھائی ابراہیم کو امیر حاجب یا بادبک مقرر کیا اور اپنے غلام بشیر کو عماد الملک کے خطاب کے ساتھ عرض ممالک مقرر کیا۔ ‘مرحوم سلطان کے جسم کو ایک تابوت میں جس پر ایک شاہی چھتر نصب تھا، رکھ کر ایک ہاتھی کی پشت پر رکھا گیا اور فوج کے ساتھ دہلی لایا گیا؛ غالباً برنی کا یہ بیان درست ہے کہ فیروز نے سیوستان میں اور اپنے سارے سفر میں ممتاز صوفیا سے ملاقات کر کے بزرگوں کے مقبروں پر دعائیں مانگ کر اور تعلیم یافتہ اور متقی لوگوں کو جاگیروں پر دوبارہ بحال کر کے مذہبی لوگوں کا دل جیت لیا تھا۔

فوج بھکر اور پھر وہاں سے اچھ کی طرف روانہ ہوئی۔ اُچھ سے روانہ ہونے کے فوراً بعد فیروز کو دہلی میں وزیر خواجہ جہاں کی ’بغاوت‘ کی اطلاع ملی۔ اس نے یکم اپریل 1351 (3 صفر 752) کو غیاث الدین محمود کے خطاب کے ساتھ ایک چھ سالہ لڑکے کو تخت نشین کر دیا تھا۔ اور اسے سلطان محمد بن تغلق کا بیٹا اعلان کر کے تمام اہم افسران کے پاس اس بات کا پیغام بھیجا تھا کہ وہ اس نابالغ بادشاہ کو قبول کر لیں۔ فیروز نے اس خبر کو پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ وہ ملتان پہنچ گیا، جہاں معاملہ پر مناسب طور پر غور کیا جا سکتا تھا اور فوج میں امن و امان بحال رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن جب حقائق کا انکشاف ہوا تو تمام موجود افسران نے بیک آواز سوال کیا: ”سلطان محمد کی صرف ایک لڑکی تھی جو

تغلق شاہ کے دور حکومت میں پیدا ہوئی تھی، اس کا کوئی بیٹا نہ تھا، پھر کیسے احمد ایاز نے اس کا ایک بیٹا تلاش کر لیا"؟

خواجہ احمد ایاز کی بغاوت

وزیر احمد ایاز، 84 سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا، وہ محض ایک غیر فوجی شخص تھا، اس نے نہ کبھی ایک تیر چلایا تھا نہ کسی بد لگام گھوڑے پر سوار ہوا تھا۔ ایک ایسا شخص کیونکہ ایک ناکام بغاوت پر آمادہ ہو گیا جبکہ امراء اور فوجی فیروز شاہ کو قبول کر چکے تھے؟ عفیف اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ احمد ایاز نے فیروز شاہ کے انتخاب کی خبر سن کر بغاوت کر دی تھی لیکن وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ جو کچھ اس نے بہرام ایبہ کشلو خاں کے بیٹے کشور خاں سے سنا تھا اور خود اپنی تحقیقات کی بنیاد پر عفیف صورت حال کا مندرجہ ذیل بیان پیش کرتا ہے۔ خواجہ جہاں کے پاس ایک رازدار غلام ملیح توتون تھا جسے اس نے سلطان محمد کے پاس بھیجا تھا۔ توتون نے اس وقت فوجی کیمپ چھوڑ دیا جب منگولوں کے ذریعہ اسے لوٹا جا رہا تھا اور دہلی میں خواجہ جہاں کو مندرجہ ذیل رپورٹ بھیج دی: "سلطان محمد کا انتقال ہو گیا ہے، منگولوں نے بڑے بازار پر حملہ کر دیا ہے اور اسے لوٹ لیا ہے۔ فیروز اور تاتار خاں کا نشان و پتہ معلوم نہیں ہے اور یہ بات غیر یقینی ہے کہ آیا وہ منگولوں کے ہاتھوں پڑ گئے ہیں یا مار ڈالے گئے ہیں"۔ خواجہ جہاں سلطان اور فیروز دونوں ہی کے لیے رویا۔ عفیف ہمیں یقین دلاتا ہے کہ "خواجہ جہاں اور فیروز شاہ کے درمیان بڑی محبت تھی۔ ایسی محبت کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تیسرا شخص نہ آسکتا تھا۔ خواجہ جہاں کی بیوی فیروز شاہ کو اپنا بیٹا کہہ کر پکارا کرتی تھی اور اس سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ لہٰذا یہ یقین کر کے فیروز مر گیا ہے اس نے اپنے طور پر اقدام (اجہاد) لیا اور اس لڑکے کو تخت نشین کر دیا، یہ اقدام ایک غلطی ثابت ہوا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے افسران اس سے اس وقت متفق تھے۔[1]

بحیثیت ایک عارضی اقدام ایک نابالغ کو تخت پر بٹھا دینا اور اس کے بعد اسے ہٹا

---

[1] (1) حبیب اور افسر، پولیٹکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت، ص ص 60-159

دینا عہدِ وسطیٰ کی ایک مشہور و معروف چال تھی۔ ایک نابالغ کو تخت پر بٹھا کر امراء کے ذریعے منتخب کردہ ایک نائب (نائب مملکت) مکمل اور قطعی اختیارات کے ساتھ کام کر سکتا تھا اور ریاست کی مشین کو حرکت میں رکھا جا سکتا تھا۔ تاہم خواجہ جہاں نے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ مزید اور قابل بھروسہ شہادت کا انتظار کیے بغیر اس نے سلطان محمد کے انتقال کے محض دس دنوں کے بعد غیر معروف حسب و نسب کے ایک نابالغ کو تخت پر بٹھانے کی سنگین ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ دوم یہ کہ جب فیروز شاہ کی تخت نشینی کی خبریں لے کر قاصد دہلی پہنچے تو نائب وزیر ملک مقبول قوام الملک کی قیادت میں اعلیٰ افسروں کی اکثریت نے نئے سلطان کے لیے حلف وفاداری اٹھا لیا اور اسے اپنے رازدارانہ خطوط میں اس حقیقت سے آگاہ کیا۔[1] خواجہ جہاں کو بھی نئے سلطان کے لیے حلف وفاداری اٹھانا چاہیے ‘تھا اور اپنی وفاداری کی علامت کے طور پر ’لڑکے ‘کو اس کے پاس بھیج دینا چاہیے ‘تھا۔ آیا یہ بات اسے تباہی سے بچا دیتی، یہ مشکوک ہے۔ لیکن اس کی کارروائی اصولاً درست ہوتی۔ لیکن اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے بجائے خواجہ جہاں تین متضاد پالیسیوں پر عمل پیرا ہو گیا۔ اول یہ کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ خزانے میں بہت تھوڑے روپے تھے لہٰذا اسے ریاست کے سونے اور چاندی کے برتنوں اور قیمتی جواہرات کو فروخت کر دینا پڑا۔ لیکن جو کچھ وہ اکٹھا کر سکا وہ بیس ہزار ناقابل بھروسہ اور غیر تجربہ کار گھوڑا سوار تھے۔ دوم یہ کہ (تاریخ مبارک شاہی کے مطابق) اس نے لاحاصل گفت و شنید کی بھی کوششیں کیں۔ فیروز کا جواب سیدھا تھا۔

---

(1) دہلی کے امراء کے درمیان اختلافات فیروز شاہی کی تخت نشینی کی واقفیت کے بعد ہی پیدا ہو سکے تھے۔ مبارک شاہی (120) کے مطابق مندرجہ ذیل افسران نے خواجہ جہاں کی پیروی کو ترجیح دی تھی۔ ملک تھو جو حاجب خاص مقرر کیا گیا تھا۔ اعظم ملک حسام الدین، شیخ زادہ بسطامی، ملک حسن ملتانی اور ملک حسام الدین ادبک۔

قوام الملک کے علاوہ ان افسران کی فہرست مندرجہ ذیل ہے جنھوں نے فیروز شاہ کے پاس حلف وفاداری کے رازدارانہ خطوط بھیجے۔ شرف الملک، ملک ویلان، امیر قتبغہ، ملک خلجین، ملک حسن امیر میران، خواجہ بہاء الدین تہیکر، ملک منتخب ملتغی اور ملک بدر الدین بوتہاری۔

پہلی فہرست کے چند نام برنی نے دیئے ہیں، مبارک شاہی دوسری فہرست کے لیے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیتی۔ لیکن فہرست کے چند افسران فیروز کی ماتحتی میں عہدوں پر فائز نظر آتے ہیں۔

اگر خواجہ جہاں مطیع ہو جائے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔ فیروز کا دعویٰ تھا کہ اگر مرحوم سلطان کا کوئی بیٹا ہوتا تو اس بات کو مجھ سے پوشیدہ نہ رکھا جاتا اور کوئی بھی اتنی زیادہ محبت اور خاندانی احساس کے ساتھ اس کی پرورش نہ کر سکتا تھا۔ آخری بات یہ کہ وہ ہمیشہ اطاعت کے متعلق سوچتا رہا اور بڑھاپے کی طفیل میں فیروز شاہ کی جانب سے معافی کی توقع رکھتے رہا۔ اور اگر بدترین صورت بھی رونما ہوتی تو وہ شیخ نظام الدین اولیا کا ایک شاگرد تھا اور جانتا تھا کہ کس طرح مرنا چاہیے۔

منگل 23 اگست 1351ء (29 جمادی الثانی 751ھ) کو نائب وزیر قوام الملک امیر اعظم قتبغہ کے ساتھ دہلی بھاگ کر سلطان سے اگروہا میں جا ملا۔ یہ وہ مقام تھا جس کے قریب بعد میں فتح آباد شہر کی تعمیر عمل میں آئی۔ فیروز کے لیے خوش قسمت دن تھا اسی دن اس کا بیٹا فتح خاں پیدا ہوا۔ مزید یہ کہ اسی دن (سیرت فیروز شاہی کے مطابق اس کے پاس یہ خبر پہنچی کہ اس کے تین افسران۔ ملک نیکی سر دوات دار، ملک بہرام غزنی اور ملک نوا۔ بالآخر باغی، طغی کو ہلاک کر دینے میں کامیاب ہو گئے۔ ملتان سے روانگی کے بعد فیروز کی پوزیشن مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ آبادی نے بحیثیت مجموعی مع ہندو رایوں کے اسے قبول کر لیا۔ سنام اور گورنر محمود بک، خداوند زادہ قوام الدین اور ملتان سے عین الملک ماہر و مختلف مقامات پر اس سے جا ملے اور دیپال پور میں 36 رائے اس کے پاس پہنچے۔ اجودھان میں اس نے شیخ فرید الدین گنج شکر کے مزار پر دعائیں مانگی اور سرستی (موجودہ سرسا) میں، جسے عفیف دہلی سے نوے کروہ کے فاصلہ پر بتاتا ہے، بقالوں اور مہاجنوں نے اسے کئی لاکھ ٹنکے تحفے میں دیے۔ فیروز کو اپنے سپاہیوں کے لیے روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ لیکن اس نے یہ رقم محض ایک قرض کی حیثیت سے قبول کی اور دہلی پہنچ کر بشیر کو اس کی ادائیگی کا حکم دیا۔ ہانسی میں اس نے ایک مشہور صوفی شیخ قطب الدین منور سے نامناسب وقت پر ملاقات کی غلطی کی۔ یعنی ٹھیک اس وقت جب شیخ اپنے گھر سے باہر جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے جا رہے تھے۔ اور حق بجانب تنبیہ پائی۔

خواجہ جہاں نے مطیع ہو جانے کا فیصلہ کیا، دوسرے دن (14 اگست) جمعہ کی نماز کے بعد روانہ ہو کر وہ اگروہا کے بعد دوسری منزل دھنسوا میں شاہی خیمہ میں پہنچا

یہاں ان مجرموں کی طرح جو اپنے آپ کو انصاف کے حوالہ کر رہے ہوں، اپنے سر پر پگڑی کے بجائے ایک چھوٹی ٹوپی پہن کر اور اپنی گردن سے ایک تلوار باندھ کر خواجہ جہاں حاجیوں (حاضرین) کے درمیان فیروز شاہ کے سہ پہر کے دربار میں کھڑا ہو گیا۔

فیروز خواجہ جہاں کو معاف کر کے اسے دوبارہ وزیر کے عہدے پر مقرر کر دینا چاہتا تھا لیکن اس کے اس منصوبہ کو اس کے افسران نے قطعی نامنظور کر دیا۔ یہ محتاط قیاس ہے کہ اپنے طویل سفر کے دوران اعلیٰ افسران کا ایک اہم موضوع بحث یقیناً مرحوم سلطان کی پالیسی اور افسران اور بادشاہ کا درمیانی تعلق رہا ہو گا۔ فیروز شاہ نے اب تک محض دو اعلیٰ تقرریاں کی تھیں۔ دیگر افسران سلطان محمد کے زمانہ کے تھے جن کی تقرری کی فیروز نے توثیق کر دی تھی۔ انھوں نے مرحوم سلطان کی وفادارانہ طور پر خدمت کی تھی لیکن سب کے سب اس بات کا مستحکم فیصلہ کر چکے تھے کہ اسکے جابرانہ طرز عمل کو باقی نہ رہنا چاہیے۔ اور یہ کہ اعلیٰ افسران کو سلطان کو مشورہ دینے کا حق دوبارہ ضرور ملنا چاہیے۔ بہت ساری جنگیں، بہت ساری بغاوتیں اور بہت ساری خون ریزیاں ہو چکی تھیں۔ وہ اس مطالبہ پر متفق تھے کہ خواجہ جہاں، جو پرانی حکومت کی ایک اہم علامت کے مانند تھا، کو یقینی طور پر ختم کر دیا جائے۔ فیروز کے دربار آکر انھوں نے وزیر جنگ بشیر کی وساطت سے ایک ساعت کی درخواست کی۔ چونکہ بشیر کی پرورش فیروز کے ذریعہ ایک غلام کی حیثیت سے ہوئی تھی لہٰذا وہ کسی غلط فہمی کے بغیر ان کے نمائندے کی حیثیت سے کام کر سکتا تھا۔ جب فیروز شاہ نے انھیں اجازت دے دی تو ان لوگوں نے حد سے زیادہ عزت و احترام کا اظہار کیا ”حج ہر مسلمان پر لازم تھا، وہ اس مقدس سفر پر جانے کی اجازت چاہتے تھے (ان کی) چھوٹی چھوٹی غلطیاں مثلاً مالی بدعنوانیاں معاف کر دی جائیں لیکن سازش نہیں۔ حج کی اصطلاح سے ان کی مراد واقعی سفر کے علاوہ کچھ اور تھی۔ افسران بیک وقت استعفیٰ دے کر یا احکامات کی پیروی سے انکار کر کے حکومت کو مفلوج بنا سکتے تھے۔ یہ بغاوت کے امکان کو بھی ظاہر کر رہا تھا۔

عفیف لکھتا ہے کہ فیروز شاہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ لوگ متفقہ طور پر اور بیک آواز خواجہ جہاں کی تباہی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور وہ حد سے زیادہ سوچ و فکر اور تشویش سے پیلا ہو گیا۔ ملاقات غالباً اس بات پر ختم ہوئی کہ ”بادشاہ اس سلسلہ میں کئی

دنوں تک غور و فکر کرے گا۔ التتمش، بلبن، علاؤالدین یا سلطان محمد کے ادوار حکومت میں امراء اس طرح کے سلوک کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ اور اگر وہ ایسا کرتے بھی تو علی الاعلان گردن ماردی جاتی اور بقیہ دہشت زدہ ہو کر بالکل مطیع ہو جاتے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ فیروز کے دل میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ آرام شاہ اور التتمش کے جانشینوں میں سے متعدد حکمران امراء کے ذریعے منتخب ہوئے اور پھر تباہ کر دیئے گئے۔ فی الحال اس کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان کی بات مان لے، لیکن جتنا جلد ممکن ہو سکے وہ ایک ایسی پالیسی کی تشکیل کرے جو افسران اور بادشاہ کی کشمکش پر روک لگا سکے۔ فیروز نے بشیر کو بلایا اور اس سے افسران کو رازدارانہ طور پر خبر دینے کو کہا کہ وہ خواجہ جہاں سے جس طرح چاہیں نمٹ سکتے ہیں۔ افسران نے خواجہ جہاں کو بادشاہ کی جانب سے یہ اطلاع دی کہ سامانہ کا اقطاع اس کے سپرد کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی انھوں نے محمد بک سپر خاں کو بھی اسکے پیچھے روانہ کر دیا۔ خواجہ جہاں نے سوچا کہ "اسے مجھے مار ڈالنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس نے یہ کوشش کی کہ اس کی نوبت نہ آئے۔ اس نے وہ کلاہ (ٹوپی) اور دستار (پگڑی) پہنا جو اسے شیخ نظام الدین اولیا سے ملا تھا۔ دو رکعت نماز ادا کی اس کے بعد جب وہ اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ کر 'کلمہ شہادت' کا ورد کر رہا تھا کہ ایک مہربان دوست نے جس سے اس نے ایسا کرنے کی درخواست کی تھی' ایک تیز تلوار لی اور اس کا سر کاٹ لیا۔

اب دہلی کا راستہ صاف تھا۔ فیروز نے اپنے آپ کو رجب (اگست ستمبر 1351ء) میں شاہی محل میں جاگزیں کر لیا۔ برنی ہمیں یقین دلاتا ہے کہ محض چار یا پانچ اشخاص کو موت کی سزا دی گئی۔ ملک نتھو سوندھر، حسن ملتانی، حسن ادیک اور احمد ایاز کے دو غلام لیکن ان کے خاندان کے معصوم افراد کو گزند نہ پہنچائی گئی۔ شیخ زادہ بسطامی کو جو مرحوم سلطان کا بہنوئی تھا ملک بدر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔

ابتدائی انتظامی کاروائیاں اور اصلاحات

دہلی میں فیروز کے داخلے کی اکیس دنوں تک خوشی منائی گئی تھی۔ آئندہ کے تمام جشنوں میں بھی اسی مدت کی پابندی کی گئی۔ لیکن سلطان کو فوراً نہایت اہم کاموں

کی طرف توجہ دینی پڑی۔ 'اصلاحات' یا حکومت کے سلسلہ میں انتظامی اور قانونی اقدامات کے متعلق کسی تاریخ کا حوالہ نہیں ملتا۔ لیکن چند معاملات مین تسلسل واضح ہے۔ چند دیگر معاملات میں ہمارے لیے ماخذوں کی ترتیب پر ہی چلنا ہوگا۔

۱- قرض کے رجسٹروں کی دھلائی

دیوان وزارت (یا شعبۂ مالیات) میں حساب کے مجموعہ دار خواجہ فخر شادی نے اپنے کاغذات ٹھیک طرح سے رکھے تھے۔ اس کے رجسٹروں اور فہرستوں میں عفیف کے مطابق، ان تمام اشخاص کے نام درج تھے جنہیں مرحوم سلطان نے دو کروڑ ٹنکوں کے بقدر قرض (سوندھار) دیے تھے۔ اور ان لوگوں کے نام بھی جنھیں خواجہ جہاں کے نقدی سونے اور چاندی کے برتن اور ریاست کے قیمتی جواہرات دیے تھے۔ پابندی فرض کے مطابق فرخ شادی نے یہ فہرستیں فیروز شاہ کے سامنے پیش کیں فیروز شاہ پریشان ہو گیا اور اس نے قوام الملک سے مشورہ طلب کیا۔ قوام الملک نے رائے دی کہ "عسرت و تنگی کا دورہ ہے لہٰذا قرضوں کی وصولی کی کوشش نامناسب ہے۔ حقیقتاً ایک تانبے کے سکہ کو بھی وصول نہیں کیا جاسکے گا بلکہ وصولی کی کوشش کا نتیجہ محض بدنامی کا باعث ہوگا"۔ اس نے مزید یہ مشورہ دیا کہ "ان تمام رجسٹروں کو شاہی دربار کے سامنے بوڑھوں اور نوجوانوں کی موجودگی میں دھو دیا جائے" سلطان نے اس مشورہ کو مان لیا اور رجسٹروں کو پانی سے دھو دیا گیا تاکہ تمام متعلقہ افراد کو اس بات کا یقین دلایا جاسکے کہ ریاست کے دعووں کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ دہلی کے متعدد بے ایمان افراد جنھوں نے ان روپیوں کو خرچ کر دیا تھا جو انھیں زراعت کی بحالی کے لیے قرض دیا تھا مطمئن ہو گئے۔

۲- ملک مقبول قوام الملک کی بحیثیت وزیر تقرری

اسی دن ملک مقبول کو وزیر مقرر کر دیا گیا۔ تقرری کا فرمان عمومی نوعیت کا تھا[1]۔ یہ تمام افسران کو اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہے لیکن عہدے کو موروثی قرار نہیں

---

(1) انشاء ماہرو، ص ص 11-8 (نمبر 2)، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ میں چند فرامین اور چند فارموں، جن میں ناموں کی جگہ خالی تھی، کی شمولیت کی واحد یہ رہی ہو کہ ان کا مسودہ عین ماہرو نے تیار کیا تھا۔

دیتا۔ فرمان میں اس کا خطاب اور پورا نام اس طرح درج ہے۔

”مسند عالی الغ قتلغ اعظم ہمایوں خان جہاں مقبول‘

عفیف اس کی ابتدائی زندگی کا مندرجہ ذیل بیان پیش کرتا ہے:

”خان جہاں تیلنگ کا تھا اور قبول اسلام سے پہلے اس کا نام کنو (پھول) تھا۔ خود اپنی قوم میں اُسے زبردست عزت واحترام حاصل تھا اور تیلنگ کے رائے کے دربار میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ محمد بن تغلق نے رائے کو گرفتار کر لیا اور اسے دہلی بھیج دیا لیکن رائے کا راستہ ہی میں انتقال ہو گیا۔ خان جہاں محمد بن تغلق کے پاس مطیع ہو کر چلا آیا اور کلمہ پڑھ لیا۔ سلطان نے اسے مقبول (قبول کردہ) کا نام دیا اور اس کے ساتھ محبت وشفقت کا برتاؤ کیا۔ بعد میں جب سلطان نے خان جہاں میں ذہانت اور دانشمندی کی تمام علامتیں پائیں تو اس نے اسے شہر دہلی کا نائب وزیر مقرر کر دیا اور اس کے ترقیوں کے دروازے کھول دیے۔ جب خان جہاں کسی دستاویز پر مہر لگاتا اس کا نام اس طرح منقش ہوتا۔ ’مقبول‘ محمد بن تغلق کا غلام‘ اگرچہ ممتاز وزیر لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتا تھا تاہم وہ بہت عقلمند تھا اور اپنی عقلمندی ہی کی بنا پر وہ مملکت کے دارالسلطنت کی زینت بنا۔ قوام الملک کا خطاب اسے اس کی ابتدائی زندگی میں ملا تھا۔ ملتان کی گورنری اس کے سپرد کی گئی اور بعد میں اسے مملکت کا نائب وزیر مقرر کیا گیا جبکہ خواجہ جہاں سلطان محمد کا وزیر تھا۔

نائب وزیر کی حیثیت سے خان جہاں نے قوانین و ضوابط بنائے اور شعبۂ مالیات کو درست حالت میں رکھا صوبوں کے گورنر خواجہ جہاں سے زیادہ خائف نہ تھے لیکن خان جہاں سے وہ بہت خوفزدہ رہتے۔ اگر خواجہ جہاں کسی جگہ کے گورنر کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا چاہتا تو وہ اسے خان جہاں کے سپرد کر دیتا اور مواخر الذکر ضوابط کے مطابق اس کے ساتھ نہایت سخت برتاؤ کرتا۔ مزید یہ کہ جب خواجہ جہاں، جو ایک مذہبی شخص تھا، دیوان سے (اپنی عبادتوں کے لیے) چلا جاتا تو خان جہاں اس کی جگہ پر بیٹھتا۔ وہ گورنروں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتا اور شاہی خزانہ کے لیے بڑی مقدار میں نقدیاں اور اشیاء اکٹھا کرتا۔ خواجہ جہاں تو محض وزیر کا خطاب ہی حاصل

---

(1) عفیف، ص 96-394، حبیب اور افسر، پولیٹیکل تھیوری آف دی دہلی سلطنت، ص 168 میں ترجمہ شدہ۔

تھا ورنہ دیوانِ وزارت (وزارت مالیہ) کے تمام امور خان جہاں کے تجربہ اور ذہانت سے ہی انجام پاتے۔[1]

بحیثیت وزیر اس کے کاموں کے متعلق عفیف لکھتا ہے کہ "وزرائے اعظم کی روایات کے مطابق خان جہاں ہر روز اپنے دفتر میں مسند لگا کر بیٹھتا، وہ محتاط طریقہ پر گورنروں اور دیگر افسران کے کھاتوں کا معائنہ کرتا اور ان سے خزانہ کا حصہ وصول کرتا۔ خزانہ کی آمدنی اور اخراجات روزانہ اس کے سامنے پیش کیے جاتے۔ وہ اس بات پر بہت زیادہ زور دیتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ روپے روزانہ خزانہ میں جمع کیے جائیں اگر کسی دن خزانہ کی وصول کردہ رقم کافی نہ ہوتی تو افسروں کی جانب اس کا رویہ نہایت سخت ہو جاتا اور اپنی سوچ و فکر اور تشویش کی بنا پر وہ کھانا نہ کھاتا۔ ایسے موقعوں پر وہ کہا کرتا کہ "حکومت کا استحکام خزانہ پر منحصر ہے۔ اگر خزانہ میں کافی روپے نہ ہوں گے یا روپے کو غیر مناسب طریقے پر خرچ کیا جائے گا تو حکومت کی بنیادیں ہل جائیں گی اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے کسی دور اندیش بادشاہ کا خزانہ خالی ہو جائے تو حکومت کو برقرار رکھنا ناممکن ہو جائے گا"۔ اسی وجہ سے وزیر رات دن خزانہ کو اکٹھا کرنے میں لگا رہتا[1]، خان جہاں نے بحیثیت وزیر دو ہزار غلام لڑکیوں کا ایک حرم بنا لیا تھا اور اس کے بہت سارے بچے تھے۔ فیروز ہر لڑکے کے لیے گیارہ ہزار ٹنکے اور ہر لڑکی کے لیے پانچ ہزار ٹنکے کا ایک سالانہ عطیہ اسے دیا کرتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خان جہاں نے اپنے پیش رو کی تباہی کے مطالبہ میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ فیروز شاہ نے، جو یقیناً پچھلی حکومت کے آخری زمانے میں اس سے گہرے طور پر واقف ہو چکا تھا، اس کے بعد جلد ہی اسے وزیر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ 69-1368ء (770ھ) میں خان جہاں کی موت تک سلطان اور وزیر دونوں ایک دوسرے کے گہرے تعاون واشتراک سے کام کرتے رہے۔ خاں جہاں ملک کے روزانہ کے انتظام و انصرام کو چلاتا اور بادشاہ اور انتظامیہ کے درمیان ایک فاضل کا کام انجام دیتا۔ وہ سخت محنت کرتا، صبر سے امراء کی بہت ساری توہین آمیز حرکات کو برداشت کرتا اور اس بات کا خیال رکھتا کہ سلطان کا وقار اور عزت و احترام برقرار رہے۔ ادھر

---

(1) عفیف، ص ص 98-397، پولیٹیکل تھیوری ص ص 67-63 میں ترجمہ شدہ

فیروز نے وزیر کو متعدد ایسی رعایتیں دے رکھی تھیں جو اس سے قبل بادشاہوں کی خصوصی مراعات سمجھی جاتی تھیں۔ دونوں کھلے عام طور پر ایک دوسرے کی ہر ممکن عزت کرتے۔ فیروز شاہ کہا کرتا تھا کہ "دہلی کا حقیقی بادشاہ اعظم ہمایوں خاں جہاں ہے، لیکن خاں جہاں نے کبھی بھی اپنی حیثیت کو نہ بھلایا۔ سلطان کی عنایات نے اسے مالا مال کر دیا تھا اور وہ ذاتی طور پر نہایت دیانتدار بنا رہ سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ سلطان کی عنایات کے بغیر اس کے اختیارات بے بنیاد ہیں۔ وہ نہایت وفادار تھا اور سلطان کی طرف کسی اہم معاملہ کے سلسلے میں رجوع نہ کرنے یا اس کے احکامات سے گریز کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ریاست کی پالیسی کا معاملہ سلطان سے متعلق تھا لیکن وہ وزیر کے مشورہ کو مناسب وزن دیتا۔

۳-خوں ریزی اور تعذیب کی ممانعت

ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ سب سے اہم وہ عنصر جو فیروز شاہ کی حکومت کے استحکام کا باعث بنا وہ سیاست کی ممانعت تھی۔ اپنی (تصنیف) فتاوئی جہانداری میں برنی یہ وضاحت کرتا ہے کہ دراصل سیاست کا مطلب 'معاملات کو درست کرنا تھا۔ لیکن اس کے زمانہ میں اس کا مطلب سزائے موت تھا۔ اس معاملہ کی وضاحت فیروز شاہ کے کتابچہ فتوحات سے ہوتی ہے۔ طبقاتِ اکبری (کے مصنف کے مطابق یہ کتابچہ (دراصل) ایک کتبہ (کی نقل) تھا جو فیروز شاہ نے فیروز آباد کی جامع مسجد کے ایک ہشت پہلو منارہ پر کندہ کرادیا تھا۔ اس عبارت کی اندرونی شہادت سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ س کا تخاطب خالص سنی جماعت کے لوگوں سے تھا۔ جن میں صنعتکاروں کی ایک اکثریت ہو۔[۱]

---

(۱) ہوڈی والا، اسڈیز، ص ص40-339، عفیف(20) لکھتا ہے کہ فیروز آباد کے دربار کے قبل یہ کتبہ کوشک نزدلی میں تھا لیکن شاید یہ اس کی غلطی ہے فیردز شاہ نے شکار کے اپنے کارناموں سے متعلق بہت سے کتبے تیار کرائے شاید اس لیے (جیسا کہ عفیف اندازہ لگاتا ہے) کہ برنی کی وفات کے بعد اسے اپنے عہد حکومت (کی تاریخ) کے لیے کوئی مناسب مورخ نہ ملا۔ کسی مسجد کے کتبے میں ان کے خلاف اگر کچھ لکھا گیا تھا تو ہندوؤں کو اس کی پرواہ بھی نہ ہوئی ہوگی لیکن شیعہ اور دیگر غیر سنّی لوگوں کو یقیناً اس کتبے کو برباد کرنے کی فکر ہوئی ہوگی' جس کی نقل فتوحات ہے۔

اول یہ کہ سابقہ ادوار میں مسلمانوں کا خون کافی بہایا گیا اور طرح طرح کے تعذیبی طریقے استعمال کیے گئے ہیں، مثلاً ہاتھوں، پاؤں، کانوں اور ناک کاٹ دیا جانا، آنکھیں نکال دیا جانا، لوگوں کے حلق میں پگھلا ہوا سیسا انڈیل دینا، لوہے کی کیلوں کی ضرب سے ہاتھوں، پاؤں اور سینے کی ہڈیوں کو چور کر دینا، (زندہ) آدمیوں کو آگ پر جلا دینا، زندہ کھال کھینچ لیا جانا۔ لوہے کی کانٹیاں لگے ہوئے کوڑوں سے مارا جانا۔ کسی آدمی کو آرے سے دو ٹکڑوں میں چیر دینا اور دوسری قسم کی قطع اعضاء کی سزائیں خدا نے ہمارے قلب کو توانائی بخشی اور میں نے اس کی عنایتوں کے اظہارِ تشکر کے طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کسی جائز سبب یا غدر کے بغیر کسی مسلمان کا خون نہیں بہایا جائے گا اور یہ کہ کسی طرح کی تعذیب اب استعمال نہ کی جائے گی اور کسی انسان کو قطع اعضاء کی سزا نہ دی جائے گی۔[1]

جرائم کی سزا (کی تجویز و تعمیل) کا کام صدیوں سے حکومت کے قوانین کے دائرہ عمل میں تھا۔ چونکہ شریعت بادشاہت کو جائز تسلیم ہی نہیں کرتی تھی اس لیے اس میں غداری یا بادشاہ کے خلاف جرائم کے لیے کسی قسم کی سزا طے نہیں کی گئی تھی۔ یہ (متذکرہ بالا قسم کے) بہیمانہ اقدام (سزائیں) عموماً باغیوں کے خلاف کیے جاتے تھے یا ان لوگوں کے خلاف جن کے ذمہ حکومت کی رقمیں باقی تھیں (اس ضمن میں) مسلمانوں کا حوالہ اس لحاظ سے برمحل ہے کہ ان دونوں جرائم کے مرتکب تقریباً ہمیشہ ہی مسلمان ہوتے تھے۔ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فیروز لکھتا ہے 'یہ تمام ظالمانہ کام اس لیے کیے جاتے تھے کہ لوگوں کے دلوں میں خوف اور دہشت پیدا کر کے حکومت کے معاملات کو درست کیا جا سکتا تھا۔ اللہ کی مہربانی سے اس ضعیف العباد کے دور حکومت میں ان ظالمانہ سزاؤں کو نرمی، مہربانی اور شفقت سے بدل دیا گیا ہے۔ سزائے موت، کوڑے بازی[2] اور تعذیب کا سہارا لیے بغیر ہی لوگوں کے دلوں میں حکومت کا دبدبہ بڑھ گیا تھا۔

---

(1) فارسی متن، مولفہ، پروفیسر ایس۔ اے رشید، علی گڑھ 1954ء

(2) سیاسی جرائم کی سزا کے لیے ایک ہم عصر مباحثے کے لیے دیکھیے حبیب اور افسر، پولیٹیکل تھیوری ص ص 53-55 (برنی کی فتاویٰ جہانداری کا مشورہ نمبر 13)

اپنے غیر سیاسی جرائم کے لیے مسلمانوں کو قاضیوں کے فیصلے کے مطابق سزائیں دی جاتیں اور عفیف یہ یقین دلاتا ہے کہ فیروز چوری اور قتل کے لیے سزائیں دلانے میں بہت مستعد تھا۔ فیروز شاہ کے ذریعے تعذیب کی ممانعت قابل ستائش ہے لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس نے سیاسی جرائم کے لیے اس کی جگہ پر کوئی دوسرا انتظام نہ کیا۔ لہٰذا حکومت کے محاصل میں غبن کرنے والوں کو کوئی سزا نہ دی جا سکی۔ ایک ہمہ گیر طریقہ سزا کے طور پر قید بندی ایک مناسب حل بن سکتی تھی لیکن مسلم صحیفوں میں سرکاری قید خانوں کے ایک قومی نظام کا تصور موجود نہیں ہے اور حکومتی قوانین نے بھی اس کی کوئی صورت پیش نہیں کی تھی۔ یہ (انتظام) مغرب سے ہمیں ملا ہے اور 19ویں صدی کے دوران بنتھم کے نظریوں سے متاثرہ اصلاحات کا ایک نتیجہ ہے۔

۴- سلطان محمد (کی سزاؤں) کے لیے معافی نامے

مرحوم سلطان نے فیروز اور خان جہاں دونوں ہی کو ترقی اور مراتب عطا کی تھیں وہ اس کے لیے اپنے احترام کا اظہار کرنا چاہتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کرنا چاہتے تھے ان کا طریقہ کار مختلف ہوگا۔ لہٰذا فتوحات کی مندرجہ ذیل سطور پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں"۔ مزید یہ کہ اللہ نے اپنی عنایت سے اس گنہگار بندہ کو اس کا موقع دیا کہ مرحوم سلطان کی جانب سے رقمیں ادا کر کے ان تمام لوگوں، جو مشیت ایزدی کے مطابق میرے آقا، قائد، اور سرپرست، مرحوم سلطان کے دور حکومت میں قتل کر دیے گئے تھے، کے ورثاء سے معاوضوں کے رسید کے بطور گواہوں کے دستخط کے ساتھ راضی نامے (استرضاء) لے لوں، نیز ان لوگوں سے بھی جن کی آنکھیں، ناکیں، ہاتھ اور پیر کاٹ دیے گئے تھے۔ خوشنودی کی ان سندوں کو ایک صندوق میں رکھ کر دار الامن میں مرحوم بادشاہ کے مزار کے سرہانے رکھ دیا گیا (نور اللہ مرقدہ) تاکہ اللہ کی رحمت میرے آقا اور سرپرست کو اپنی دامن میں لے لے اور خدا اپنی عنایت سے لوگوں کو میرے سرپرست سے راضی کر دے[1]۔ جب 1370-71ء (772ھ) میں سیرت فیروز شاہی لکھی گئی تھی اس وقت تک وہ صندوق اس جگہ موجود تھا۔

---

(1) فتوحات پروفیسر رشید کا ایڈیشن، ص16

۵- پیداوار کے مطابق محصول

برنی کے مطابق "دوسرا عنصر جس کی وجہ سے فیروز شاہ کی حکومت میں استحکام پیدا ہوا وہ یہ حکم تھا کہ خراج (زمین پر محصول) اور جزیہ (دیگر محصولات) پیداوار کے مطابق (تناسب سے) لیا جائے (بر حکم حاصل)

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ شریعت کے متعلق عہد وسطیٰ کی لکھی ہوئی کتابوں کے مطابق جزیہ ایک غیر مسلم پر ایک ذاتی ٹیکس تھا جو وہ اس لیے ادا کرتا تھا کہ وہ غیر مسلم بنا رہ سکے۔ لیکن برنی، امیر خسرو، شیخ نظام الدین اولیاء اور بعض دیگر لوگ جزیہ کی اصطلاح زمین کے محصول کے علاوہ کسی بھی اور محصول کے لیے استعمال کرتے ہیں نظام الدین کے بیان کیے ہوئے اور امیر حسن کے قلمبند کیے ہوئے ایک قصہ میں ایک لگان وصول کرنے والا ایک مسلم صوفی سے جو غیر مزروعہ زمین کو زیر کاشت لاتا تھا سوال کرتا ہے "یا تو مجھے کوئی معجزہ دکھاؤ یا جزیہ ادا کرو"۔ عہد وسطیٰ کی شریعت (کے متعلق کتابوں) کے مفہوم میں جزیہ اورنگ زیب کے علاوہ اور کسی نے ہندستان میں وصول نہیں کیا۔ عہد وسطیٰ کا کوئی مصنف جب جزیہ کا بطور غیر مسلموں پر عائد ہونے والے ایک ٹیکس کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس کے شرع مفہوم (Shariat Sense) کو عہد وسطیٰ کے ہندستان میں مروج اس کے واقعی معنی سے خلط ملط کر دیتا ہے یعنی زمین کے محصول کے علاوہ ایک ٹیکس۔

عفیف لکھتا ہے کہ 'سلطنت کی آمدنی (محصول) کا پھر سے تخمینہ کیا گیا (از سر بستہ) اس کی آمدنی (کی رقم) کے تعین کا کام مرحوم خواجہ حسام الدین جنید کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس نے پوری سلطنت میں چھ سالوں تک دورہ کیا اور ذاتی مشاہدہ کی بنا پر (بر حکم مشاہدہ) اس نے سلطنت کی آمدنی کا تخمینہ چھ کروڑ پچھتر لاکھ ٹنکے طے کیا۔ فیروز شاہ کی چالیس سالہ[1] حکومت کی مدت کے دوران دہلی سلطنت کی کل آمدنی یہی رقم رہی۔[2]

---

(1) جنید کے اس کام کے بعد اس کی حکومت کے صرف 32 سال باقی بچے تھے۔

(2) عفیف، ص 94

مسٹر مورلینڈ لکھتے ہیں کہ حکم مشاہدہ کی اصلاح انھیں اس عہد کے ادب میں اور کسی جگہ نہیں ملی۔ جنید کی ماتحتی میں یقیناً خاص تعداد میں عملے کام کر رہے ہوں گے اور اس کے اعداد یقیناً ایک موٹے شمارے پر مبنی ہوں گے۔ عفیف (کے بیان) کا مطلب یہ نہ سمجھا جانا چاہیے کہ ملک کی آمدنی بڑھی ہی نہیں، زرعی پیداوار میں اور بعض وجہ داروں کی آمدنی میں اضافے ہوئے۔ جنید نے (زمین کے لگان میں) حکومت کے حصہ کا اندازہ یقیناً ٹنکوں اور جتلوں میں کیا تھا۔ ممکن ہے کہ گورنروں کو غلوں کی قیمتوں میں تبدیلی کی وجہ سے اس میں تبدیلیاں کرنی پڑی ہوں۔ چنانچہ ملتان کے گورنر عین ماہرو کو ایک موقع پر یہ لکھتے ہوئے پاتے ہیں کہ اس نے سپاہیوں کی تنخواہیں نصف چاندی اور نصف غلہ کی صورت میں ادا کیے جانے کا حکم دیا تھا۔ بعد میں جبکہ اس نے یہ حکم 'قدیم کسانوں' کے لیے جاری رکھا۔ اس نے 'نئے کسانوں' کو حکومت کا کل حصہ (لگان) اپنی فصلوں میں سے غلے کی صورت میں ادا کرنے کا حکم دیا۔ لیکن جیسا کہ مورلینڈ نے توجہ دلائی ہے 'حکومت پیداوار کا جو حصہ وصول کرتی تھی اس کا ذکر ہمارے ماخذ نے کہیں نہیں کیا ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ پیداوار میں حکومت کے حصے کے متعلق کوئی ایک طرح کا اصول پورے ملک کے لیے رائج نہ تھا۔

عفیف دعویٰ کرتا ہے کہ ذریعہ معاش کے طور پر لگان کی تفویض (نان) کے معاملہ میں فیروز بہت فیاض تھا اور یہ کہ اس نے دس ہزار، پانچ ہزار اور ہزار ٹنکوں کے 'نان' دیے اور یہ کہ ساری فوج کو لگان کی تفویض (وجہ) کے ذریعے تنخواہ دی جاتی تھی۔ یہ فیروز شاہ کا ایک انوکھا اور مخصوص طریقہ تھا۔ دہلی کے سابقہ سلاطین نے اس (طریقہ) کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ سلطان علاؤالدین کہا کرتا تھا کہ تنخواہ (وجہ) کی ادائیگی کے لیے کوئی گاؤں تفویض کیا جانا چاہیے۔ ایک گاؤں میں دو سو یا تین سو لوگ ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب ایک وجہ دار کے ماتحت ہو جائیں گے اور اگر اس طرح کے چند وجہ دار اکٹھا ہو جائیں تو وہ ہنگامہ کھڑا کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے علاؤالدین کبھی بھی کسی کو کوئی گاؤں تفویض نہ کرتا بلکہ اپنی ساری فوج کو نقد تنخواہ دیتا'۔ عفیف مزید لکھتا ہے کہ فیروز نے سلطنت کے تمام گاؤں، خطط (ضلع) اور

---

(1) ایضاً ص 94-96

شہروں کو فوج کو (تنخواہ کی ادائیگی کے لیے) تفویض کر دیا۔ اور یہ لکھ دینے کے بعد سلطنت کی مالی بقا کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ فیروز ایک ولی تھا[1]۔ یہ باتیں مبالغہ آمیز اور مہمل ہیں۔ یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ فیروز شاہ کی حکومت کے زمانے میں قانون یا رواج یہ تھا کہ جب کسی وجہہ دار کو تحریری طور پر لگان تفویض کیا جاتا تو (اس علاقہ کا) لگان وصول کرنے والا سرکاری افسر اس کو تفویض شدہ رقم کا صرف نصف حصہ دیتا۔ لگان کی (واقعی) وصولی اب بھی حکومت ہی کا کام تھا۔ مزید یہ کہ (لگان کی) یہ تفویض ٹنکوں یا جیتلوں کے حساب سے کی جاتی ہوگی۔ لہٰذا زرعی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ لگان کا وہ نصف حصہ جو حکومت کا تھا وہ بھی بڑھ جائے گا۔ جیسا کہ عفیف خود ایک دوسری جگہ اعتراف کرتا ہے، بہت سے سپاہیوں کو نقد تنخواہ دی جاتی تھی[2]۔

وہ سپاہی یا افسران جن کو وجہہ داری تفویض ہوتی وہ یا تو تفویض کے حکم ناموں (اطلاق) کو لے کر (متعلقہ) گاؤں میں جا سکتے تھے اور وہاں کے ذمہ دار افسران کو حکم ناموں میں لکھی ہوئی رقم کا نصف حصہ (نقد میں) دیتے یا دوسری صورت میں وہ لوگ اپنے حکم ناموں کو شہر کے دلالوں کے ہاتھوں فروخت کر کے مقررہ رقم کا 1/3 حصہ ان سے لے سکتے تھے۔ بہت سے دلال اس طرح کے حکم نامے یا اطلاق خرید کر دولتمند بن بیٹھے[2]۔ فوجی افسروں کو (متعلقہ) گاؤں کی انتظامی ذمہ داری نہیں دی جاتی تھی لیکن عین ماہرو ہمیں ایسی مثال دیتا ہے جس میں وجہہ داروں نے ضیاء الدین نامی ایک شخص جو لکھناؤتی میں فوجی خدمات کی بنا پر غیر حاضر تھا، کی قایم مقامی میں ناجائز طور پر ایک گاؤں کی انتظامیہ کے اختیارات اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ عین ماہرو ان کے خلاف اپنی سخت شکایت کا حال قلم بند کرتا ہے۔ انھوں نے حکومت کی اجازت کے بغیر ہندوؤں پر جزیہ بھی عائد کیا[3]۔

غیر فوجی کاموں کے لیے (لگان کی) تفویض کے سلسلے میں ان دو طرح کی

---

(1) ایضاً، ص220

(2) ایضاً، ص ص97-269، مسٹر مور لینڈ اس پیراگراف کے صحیح معنی کے متعلق بلا ضرورت ہی متذبذب ہیں۔ عین ماہرو نے اپنی (تصنیف) انشاء میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ بحیثیت گورنر یہ خود وہ تھا جس نے سپاہیوں کو نصف چاندی اور نصف اجناس میں ادائیگی کے کام کی تعمیل کرائی (76-75)

(3) انشاء ماہرو، نمبر28، ص ص63-62

تفویضوں کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے' جو سرکاری افسروں کو ان کے حلقہ اختیار میں شامل گاؤں اور جو دیگر لوگوں صوفیاء اور وظیفہ داروں کو ملتی تھیں۔

فیروز شاہ کے نظام (حکومت) میں کوئی ایسی قانونی تدارک کی صورت نہیں تھی جو اُس کے افسروں کو کسانوں سے ناجائز زیادہ ٹیکس وصول کر کے اور حکومت کی واجب الادا رقموں کو روک کر کثیر دولت جمع کر سکنے سے روک سکتی تھی۔ رشوت خوری کے ذریعہ اس طرح کی جمع کی ہوئی کثیر دولت کی کئی ایک مثالیں عفیف نے افسوس کے ساتھ قلم بند کی ہیں۔

لیکن دوسرے وجہہ داروں کے ساتھ صورت حال دوسری تھی۔ عین ماہرو لکھتا ہے کہ ملتان کے لگان سے مختلف لوگوں کو تین لاکھ ٹنکہ سالانہ کی رقم تفویض کی گئی تھی۔ اس نے وجہہ داروں سے کہا کہ مزروعہ اور غیر مزروعہ زمینوں والے آباد گاؤں ان کے نام پر لکھ دیے جا سکتے تھے۔ مزروعہ زمینوں کی تفویض ان کی گزراوقات کے لیے کافی ہو گی جبکہ غیر مزروعہ زمین ان کے حقوق کو قایم رکھنے میں مد ثابت ہوں گی"۔ یہ صورت ممکن تھی، لیکن اگر وہ ہر چیز نقد کی صورت میں طلب کریں تو یہ بالکل ناممکن ہے"۔[1]

فیروز شاہ کا نظام وجہہ داری اور سرکاری بدعنوانی اور رشوت خوری جس کو اس نے سہارا دیا، یہ دونوں سلطنت کے زوال کے سب سے اہم اسباب تھے۔ تیسرا اہم سبب تمام عہدوں کے موروثی بنا دیے جانے کا اعلان تھا۔

۷۔ موروثی تفویض

عفیف اپنا بیان جاری رکھتا ہے "جب فیروز پوری سلطنت (؟) کی آمدنی کو فوج کی تنخواہ (وجہہ) کی صورت میں تفویض کر چکا تب اس نے ایک اور قاعدہ بنایا۔ اگر کوئی سپاہی مر جائے تو اس کا عہدہ (استقامت) اس کے بیٹے کو "دائمًا" دے دیا جائے گا۔ اگر

---

(1) جیسا کہ قبل بتایا جا چکا ہے، ایسا کرنا بالکل ناممکن تھا۔

(2) عفیف، 96۔ عفیف اعتراف کرتا ہے کہ فیروز نے صرف 38 (قمری) سالوں تک حکومت کی پھر بھی وہ بار بار اس کی مدت حکومت کو 40 سالوں پر مشتمل لکھتا ہے

اس کا کوئی بیٹا نہ ہو تو اس کے داماد کو اگر اس کا کوئی داماد نہ ہو تو دائماً اس کے غلام کو اگر کوئی نہ ہو غلام نہ ہو تو دائماً اس کی عورتوں کو۔ یہ قاعدہ فیروز شاہ کی چالیس سالہ عہد حکومت کے دوران جاری رہا۔[2] کئی سالوں بعد فیروز نے ایک اور فرمان یہ جاری کیا کہ ایسا کوئی سپاہی جو اتنا ضعیف ہو گیا ہو کہ وہ گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتا ہو تو اسے ملازمت میں قایم تو رکھا جائے گا لیکن اسے اپنی جگہ بطور ایجنٹ اپنے بیٹا کو بھیجنا ہو گا اور اگر اس کا کوئی بیٹا نہ ہو تو داماد کو اور اگر داماد نہ ہو تو اپنے غلام کو۔

مزید یہ کہ اگرچہ عفیف صرف فوج کے عہدوں کو وراثتی بنا دیے جانے کا ذکر کرتا ہے لیکن فتوحات میں فیروز یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اس اصول کا اطلاق اپنے تمام افسران کے معاملہ میں کیا۔ 'جب کسی عہدہ پر فائز کوئی آدمی (اصحاب شغل) مر جاتا تو وہ عہدہ اور اس کی عزت و حشمت اس کے بیٹے کو منتقل کر دیتا اور اس عہدہ کے مرتبہ، دستورات اور عزت و حشمت میں کسی قسم کی کمی نہ کی جاتی۔

آخری بات یہ کہ اگر کسی سرکاری نوکر کا ایک سے زیادہ بیٹا ہوتا تو اس کی ذاتی جائداد اس کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء میں تقسیم کر دی جاتی لیکن کم از کم اعلیٰ عہدوں کے معاملے میں اس بات کا فیصلہ حکومت کرتی تھی کہ اس کے کس بیٹے کو وہ عہدہ دیا جائے گا۔ جب یہ اور دیگر وہ اصلاحات جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ نافذ کر دی گئیں تو (ظاہر ہے کہ) حکومت کے تمام ملازمین کے لیے فیروز کی صحت اور درازی عمر کی دعا مانگنا بالکل درست ہی تھا۔ اس نے ان کے تحفظ کی یقین دہانی بڑے پیمانے پر مہیا کی لیکن اس (کی موت) کے بعد وہ یقیناً کالعدم ہو جاتیں۔

8- 'خطبہ' جمعہ میں گزشتہ بادشاہوں کے نام

اب تک خطبہ جمعہ میں صرف حکمراں سلطان کے نام ہی کا ذکر کیا جاتا تھا۔

---

(2) عفیف، ص ص 3-302

(3) فتوحات، پروفیسر رشید کا ایڈیشن، ص 18 (پیراگراف 25) یہ بات قابل اضافہ ہے کہ تمام صورتوں میں، جن کا عفیف نے حوالہ دیا ہے، اعلیٰ عہدے، جس تک وہ عموماً خود کو محدود رکھتا ہے، مرحوم افسران کے بیٹوں کو ملے۔

فیروز نے دہلی پہنچنے کے بعد اس بات کی ہدایت جاری کی کہ خطبہ جمعہ میں اس کے نام سے پہلے مندرجہ ذیل سلاطین کے نام کا ذکر کیا جائے۔ شہاب الدین بن سام، شمس الدین التتمش، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، جلال الدین فیروز، علاؤ الدین خلجی، قطب الدین مبارک، غیاث الدین تغلق شاہ اور محمد بن تغلق۔ قطب الدین ایبک کی غیر شمولیت تعجب خیز ہے۔ جس زمانہ میں عفیف اپنی کتاب کی تصنیف کر رہا تھا فیروز شاہ کے دو جانشین، (ناصر الدین) محمد بن فیروز شاہ اور علاؤ الدین سکندر شاہ۔ کے نام کا خطبہ جمعہ کی فہرست میں اضافہ کیا گیا تھا۔

فیروز شاہ کی عادت تھی کہ ہر جمعہ کی نماز کے بعد وہ محمد بن تغلق کی بہن خداوند زادہ سے ملاقات کے لیے جاتا۔ اپنی پہلی بنگال کی مہم پر فیروز کے روانہ ہونے سے کچھ پہلے اس نے (خداوند زادہ) اور اس کے بیٹے نے قریب کے کمروں اور دروازہ پر مسلح آدمیوں کو متعین کر کے اس کے قتل کی کوشش کے لیے اس رعایت کا فائدہ اٹھایا۔ لیکن فیروز شاہ غالباً خاتون کے دوسرے بیٹے خسرو ملک کے ایک اشارہ سے متنبہ ہو گیا۔ اس نے فوراً اس کمرہ کو چھوڑ دیا، اپنے ماموں، رائے بھیر ہو بھٹی، سے اپنی تلوار لی، بہادری کے ساتھ خود اپنے محل کی طرف روانہ ہو گیا اور خداوند زادہ کی رہائش گاہ کی تلاشی کا حکم دیا۔ مسلح لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا اور انھوں نے اقرار کر لیا۔ کہ خداوند زادہ کی کثیر دولت جس کی بدولت اپنے بیٹے کو تخت نشین کرنے کی توقع کی تھی، کو قرق کر لیا گیا اور اسے ایک کنارہ کشی کی زندگی گزارنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بیٹے، دوار ملک، جو جلا وطن کر دیا گیا اور اس کے منجھلے لڑکے خسرو ملک کو ہر مہینہ کے آغاز میں دیگر لوگوں کی طرح سلطان کی خدمت میں سلامی دینے کا حکم دیا گیا۔[1]

---

(1) میں نے حتی الامکان عفیف کی تقلید کی کوشش کی ہے لیکن عفیف جو دوار ملک کو خسرو ملک کے ساتھ خلط ملط کر دیتا ہے، کی غلطیوں سے، مسئلہ دقتوں سے خالی نہیں۔ برنی (ص 351) لکھتا ہے کہ علاؤ الدین خلجی کے دور حکومت کا قاضی القضاۃ صدر الدین عارف داور ملک کا باپ اور منہاج جرجانی کی لڑکی کا بیٹا تھا، تاریخ مبارک شاہی (ص98) میں لکھا ہے کہ محمد بن تغلق نے اپنی ایک لڑکی مولانا یوسف کی زوجیت میں دی تھی اور مولانا کو داور ملک کا خطاب بخشا تھا۔ سلطان محمد کی صرف ایک لڑکی تھی جو تغلق شاہ کے دور حکومت میں پیدا ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام تمام ماخذ پر غور و خوض کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "داور ملک (بقیہ ص816 پر)

بنگال کی پہلی مہم[2]

ہندستان کی ایک عام تاریخ میں فیروز شاہ کی مہموں کو بہت زیادہ جگہ نہیں دی جاسکتی۔ وہ ایسے مادے سے نہ تھا جس سے فاتحین کی تخلیق ہوتی ہے۔ اپنے عوام کو شہادت کے راستہ پر لے جانے میں اسے کوئی خوشی محسوس نہ ہوتی تھی۔ دشمن کے سپاہیوں کو، جو محض اجرت پر بھرتی کیے جاتے تھے، مارنا اس کے نزدیک بے شمار قتل کے مترادف تھا۔ بہرحال سلطان محمد، معبر، دکن اور بنگال کو کھو چکا تھا اور فیروز شاہ یہ ثابت کرنے کا مستحکم فیصلہ کر چکا تھا کہ مملکت دہلی کے کسی بقیہ حصہ پر کوئی پڑوسی طاقت قبضہ نہیں کر سکے۔ اس وقت کے حالات کے مطابق وہ محض جارحانہ اقدام کے ذریعے ہی ایسا کر سکتا تھا۔ اس نے بنگال میں واقع دور دراز اکڑالہ کی جانب دو مہموں کی قیادت کی اور دونوں موقعوں پر اس نے اس علاقہ پر قبضہ کیے بغیر ہی صلح کر لی۔ اس نے اڑیسہ (جاجنگر) اور کانگڑا کے ہندو حکمرانوں پر حملہ کیا لیکن جنگ سے قبل کی صورت حال برقرار رہنے کے اصول پر ایسے معاہدے کیے جو جانبین کے لیے قابل عزت تھے۔ اپنی طویل ترین مہم کی بنا پر اسے ٹھٹھ اور وہاں سے گجرات جانا پڑا۔ (اس سلسلہ میں) اسے اپنے سپاہیوں کے مصائب پر سخت افسوس ہوا لہٰذا اس نے دوبارہ کسی مہم پر نہ جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ 1367ء کے بعد وہ پڑوسی حکمرانوں کے حملوں کا اندیشہ کیے بغیر پُرامن طریقے پر حکومت کر سکتا تھا۔ اس نے نہ کوئی سرزمین حاصل کی اور نا ہی اسے اپنے ہاتھ سے جانے دیا۔ اس کے دل میں کبھی

(ص 815 سے آگے)

قاضی صدر الدین عارف سے خداوندزادہ (سلطان محمد کی بہن) کا بیٹا تھا۔ داور کا ذاتی نام مولانا یوسف تھا لیکن جب سلطان محمد نے یوسف کی شادی اپنی لڑکی سے کردی تو یوسف کو داور کا خطاب دیا گیا۔ خسرو ملک غالباً دوسرے شوہر سے خداوندزادہ کا بیٹا تھا۔ یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ وہ اس کا شوہر تھا۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ پروفیسر ہودی والا سے متفق ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ: یوسف کا سلطان کے داماد کی حیثیت سے انتخاب یقیناً اس لیے ہوا ہوگا کہ وہ سلطان کی بہن کا لڑکا تھا۔ (اسٹڈیز، 309)

(2) عفیف، ص: 24-109، برنی ص: 97-586، سیرت فیروز شاہی ورق 15 (الف) 17
(ب) انشاء ماہرو، ص: 17-15، مبارک شاہی، ص: 25-124

بھی 'فتوحات کی بہت زیادہ لالچ نہ پیدا ہوئی۔ جس وقت فیروز تخت نشین ہوا تھا، لکھناؤتی اور سنار گاؤں حاجی الیاس شمس الدین کے زیر اختیار آ چکے تھے۔ جسے بھنگ کھانے کی عادت تھی اور جو جذام (برص) کا مریض تھا۔ دارالسلطنت کو لکھناؤتی سے پنڈوا منتقل کیا جا چکا تھا۔ ماضی میں دہلی کا کوئی لحاظ کیے بغیر بنگال میں انقلابات ہو چکے تھے اور حاجی الیاس کا خیال تھا کہ وہ مغرب کی سمت اپنے اختیارات کی توسیع کر سکتا تھا۔ اس نے ترہت پر حملہ کر دیا۔ اور اس کے بعد اس بہانے سے کہ وہ سالار مسعود غازی کے مشہور مقبرہ پر اپنی صحت کی دعائیں مانگنے جا رہا ہے بنارس کے راستہ بہرائچ روانہ ہوا۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ وہ اسی بہانے سے شیخ نظام الدین اولیاء کے زیادہ مقدس مزار پر دعائیں مانگنے دہلی بھی جا سکتا تھا۔[1]

خان جہاں کو نائب غیبت مقرر کر کے فیروز شاہ 8 نومبر 1353ء (10 شوال 754ھ) کو بنگال کے خلاف روانہ ہوا۔ مشرقی اتر پردیش کے رائے اپنے سپاہیوں کے ساتھ اس سے آ ملے۔ ان سرداروں میں سے سب سے اہم گورکھ پور اور چمپارن کا رائے اودے سنگھ تھا جس نے بیس لاکھ کا خراج ادا کیا، جو اس کی جانب سے واجب الادا تھا اور اس کے عوض فیروز کی عنایات سے نوازا گیا۔ ترہت کے رائے نے فیروز کا خیر مقدم کیا اور پہلے ہی کی طرح ایک باجگوار ہونا منظور کر لیا۔ لیکن وہ اور اس کے ماتحت رائے اور رانا (بنگال جانب) کوچ میں شامل نہ ہوئے۔ فیروز نے روانگی کے وقت عین ماہرو کے ذریعے تیار کردہ ایک اعلان جاری کیا تھا جو شاید اس مستحکم مقصد کو ظاہر کرتا ہے؛ کہ اس ملک کو ضم کر لیا جائے گا۔ فیروز نے اعلان کیا وہ سال رواں میں کسی طرح کے لگان یا خراج کا مطالبہ نہ کرے گا۔ آئندہ سال صرف حسب معمول لگان کا مطالبہ کیا جائے گا۔ بنگال کے ان سرکاری افسروں اور ہندو سرداروں کے لیے زمین کی تفویض کو دوگنا کر دیا جائے گا جو اپنے تمام پیروکاروں کو لے کر اس کے پاس حاضر ہوں گے۔ لیکن اگر وہ صرف اپنے پیروکاروں میں سے نصف کو لا سکتے تو ان کی تفویضات میں پچاس فیصد کا اضافہ کیا جائے گا۔ فیروز نے زمین پر وارث کے حق (ارث) کا دعویٰ کیا تھا لہٰذا تمام باشندوں کو اس کی رعایا تصور کیا گیا۔ انہیں کسی خوف و

---

(1) سیرت فیروز شاہی، ص 15 (الف۔ 17 (ب)

اندیشہ کی ضرورت نہ تھی جب تک کہ وہ اس کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں۔[1]

حاجی الیاس نے فیروز کی مشرق کی جانب پیش قدمی کو روکنے کے لیے دریائے کوسی کے ایک گھاٹ پر اس کی مزاحمت کی لیکن فیروز نے تقریباً ایک سو کروہ شمال میں جا کر جیارانام نامی ایک مقام پر اس دریا کو پار کیا۔ اس جگہ کے رائے نے اس کی مدد کی تھی اور فیروز شاہ نے اس کو ایک چھتر کی رعایت عطا کی۔ اس طرح اس نے حاجی الیاس کی چال کو رائیگاں کر دیا۔ اب مغربی بنگال کے مرکز تک فیروز کا راستہ صاف تھا۔ الیاس کے لیے اپنے دار السلطنت پنڈوا بھاگنے اور اس کے کم از کم ممتاز باشندوں کو اپنے ساتھ اکڈالا لے جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

عفیف اکڈالا کا تذکرہ ایک جزیرے کی حیثیت سے کرتا ہے جس پر مٹی کا ایک بڑا قلعہ اور شہر بھی تھا اور وہ کہتا ہے کہ اس سے سات کروہ کے فاصلہ پر ایک دریا تھا۔ جدید مآخذ کے مطابق، جس کا پروفیسر ہوڈی والا نے حوالہ دیا ہے، اکڈالا کا گاؤں دیناج پور ضلع دھنجر پرگنہ میں ہے۔ یہ مالدہ ضلع میں پنڈوہ سے 33 میل شمال، لکھناؤتی یا گور سے 42 میل شمال اور دریائے تنگن کے مالدہ کنارے پر گھوراگھاٹ سے 15 میل مغرب میں ہے۔ اکڈالا تقریباً 25 میل کے رقبہ پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک کشادہ کھائی سے گھرا تھا جو نہروں کے ذریعے چھترامتی اور بولیا کے دریاؤں کے ملا دینے کی وجہ سے بن گئی تھی۔[2] فیروز شاہ نے تقریباً اپریل 1354ء کے آخر میں اپنا خیمہ اکڈالا کے جنوب میں نصب کیا۔ اور اپنے سپاہیوں کو اس کے چاروں طرف لکڑی کا ایک حصار (کاٹھ گڑھ) بنانے کا حکم دیا۔ فیروز کے بدلے ہوئے ذہنی رویہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں ذہن نشین رکھنا چاہیے، کہ اب دونوں جانب کے سپاہی تین اقسام پر مشتمل تھے۔ مسلمان، ٹیکس ادا کرنے والے، ہندو جو دہلی کی یا حکومت بنگال کی ملازمت میں تھے اور امن کی ضمانت کے حامل وہ ہندو جو اپنے رایوں کی ملازمت میں تھے۔ اور یہ کہ آخری قسم کے لوگوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا تھا، چونکہ بہت سے رائے اس طرح کے لوگوں کے ساتھ فیروز کی خدمت میں حاضر ہو گئے تھے۔ سپاہیوں کے درمیان ایک جنگ ہی

---

(1) انشاء ماہرو، ص: 15-17، نمبر 6 (خلاصہ)

(2) ہوڈی والا اسٹڈیز، ص: 311-12

وہ انتہا تھی جس کے لیے فیروز تیار تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کو اس بات کی اجازت نہ دیتا کہ وہ دشمن کے غیر فوجی شہریوں کو تاراج یا گرفتار کریں۔ اور مسلم عورتوں کی عزت لوٹیں یا انہیں غلام بنالیں۔

الیاس کا اندازہ تھا کہ بارش کا پانی فیروز کے کیمپ میں بھر جائے گا اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن فیروز کے افسران نے دریا کے کنارے کی جانب سات کروہ پیچھے اچانک ہٹ کر الیاس کو دھوکے میں ڈال دیا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ حقیقتاً وہ بھاگ رہے ہیں انہوں نے اپنے ساز و سامان کے کچھ حصہ کو جلا دیا اور کچھ خیموں کو کھڑا چھوڑ کر چند قلندروں کو اس بات کے لیے رشوت دی کہ وہ الیاس کو یہ بتائیں کہ دہلی کی فوج پریشانی کے عالم میں واپس بھاگ رہی ہے۔ الیاس نے پسپا دشمن کے تعاقب کا فیصلہ کیا اور اکڈالا سے دس ہزار گھوڑ سواروں، پچاس ہاتھیوں اور بے شمار پیادوں کے ساتھ باہر آیا۔ دہلی کی فوج 90 ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل تھی جو تین ہزار یونٹوں میں امیر شکار ملک ویلدن، ملک حسام نوا اور تاتار خاں کی قیادت میں منقسم تھے۔ بنگال کے گھوڑ ساروں کی تعداد بہت کم تھی اس لیے ان کو شکست ہو گئی اور وہ اکڈالا واپس بھاگے۔ دہلی کی فوج نے اکڈالا کے شہر پر تو قبضہ کر لیا لیکن قلعہ پر نہیں۔ عفیف کا یہ بیان کہ الیاس کے پاپیادہ سپاہیوں کی تعداد دو لاکھ تھی اور یہ کہ ایک لاکھ اسی ہزار بنگال کے بہتر اشخاص تہہ تیغ کر دیے گئے تھے ظاہر ہے کہ ایک مبالغہ آمیزی ہے۔

لیکن فیروز کو کافی قتل و غارتگری کرنی پڑی تھی۔ اس نے اشک آلود آنکھوں کے ساتھ کہا کہ ”یہ غریب لوگ آج اس لیے مردہ پڑے ہیں کہ انہوں نے اپنے لیے اور اپنے خاندانوں کے لیے گزر اوقات کے ذرائع تلاش کرنے کی کوشش کی تھی، پردہ نشین مسلم عورتوں نے قلعہ اکڈالا کی مٹی کی بنی فصیلوں کے اوپر سے ننگے سر ہو کر اس سے اپیل کی لہٰذا اس نے جنگ کے خاتمہ کا فیصلہ کیا۔ اس نے تاتار خاں سے سوال کیا کہ ”اگر میں اپنے سپاہیوں کو ان مجبور عورتوں کو پکڑ لینے کی اجازت دے دوں تو مجھ میں اور منگولوں میں کیا فرق رہ جائے گا؟“ نیز اس نے یہ زیادہ واضح بات بھی کہی کہ بنگال پر قبضہ قایم رکھنے کی گزشتہ سلاطین کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اس نے

اکڈالا کو آزاد پور (آزاد شہر) کا نام دیا۔ اور پنڈوا واپس ہو گیا جسے اس نے فیروز آباد کا نام دیا۔ بنگال کی سرحدوں کو چھوڑنے سے قبل اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اگر کوئی بنگالی ان کے قبضہ میں تھا تو اسے رہا کر دیا جائے۔ ہندو سردار جب اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ گئے تو رخصت ہونے کی اجازت دے دی گئی اور فیروز یکم ستمبر 1354ء (12 شعبان 755ھ) کو فتح مندی کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ فتح کی علامت کی حیثیت سے وہ الیاس کے چند گھوڑوں اور افسروں کے ساتھ ساتھ الیاس کے پچاس ہاتھیوں میں سے گرفتار کردہ چالیس ہاتھیوں کو پیش کر سکتا تھا۔ الیاس کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا معاہدہ بھی یقیناً ہوا ہو گا کیونکہ ہم ان دونوں حکمرانوں کو الیاس کی موت تک تحائف کا تبادلہ کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ یہ قیاس بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے کہ بنگال کے افسروں کو ان کے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔

سول انجینئرنگ کے کارنامے

فیروز کی غیر معمولی صلاحیت یقیناً وہ ایک غیر معمولی صلاحیت کا حامل تھا۔ تعمیر کے میدان میں ظاہر ہوئی عمارتیں بنوانے اور نہریں کھدوانے کے کام میں۔ عہد وسطیٰ کے فن کا موضوع موجودہ سلسلہ کی جلد ششم سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں فیروز کے کارناموں کا، جو تعداد اور خرچ کے لحاظ سے دیگر سلاطین دہلی کے کاموں سے زیادہ تھے، صرف ایک بیان پیش کیا جائے گا یا ان کی ایک فہرست پیش کی جائے گی اور اُن کے جمالیاتی یا فنی قدر و قیمت کے تجزیہ کی کوشش نہ کی جائے گی۔

مرمت کے ابتدائی کام

فیروز اپنی فتوحات میں لکھتا ہے کہ ”خدا کی مجھ پر ایک عنایت یہ حقیقت رہی ہے کہ میں گزشتہ بادشاہوں اور عظیم امراء کی عمارتوں کی مرمت و تجدید کرا سکا ہوں اور میں نے اس مرمت کے کام کو خود اپنی تعمیرات پر فوقیت دی ہے، وہ ان عمارتوں کی

---

(1) عفیف، ص: 124-37، برنی ص: 561-65، مبارک شاہی، ص: 125-26، فتوحات فیروز شاہی، ص: 12-15 (پروفیسر رشید کا ایڈیشن)

جن کی اس نے مرمت کرائی تھی، مندرجہ ذیل فہرست پیش کرتا ہے (1) پرانی دہلی کی جامع مسجد (2) دہلی کا مینار۔ یہ بجلی سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کی بہ نسبت زیادہ بہتر بنا دیا گیا اور زیادہ اونچا کر دیا گیا۔ (3) حوض شمسی، بے ایمان لوگوں نے اس کی ان نہروں کو بھر دیا تھا جن سے اس میں پانی آتا تھا۔ فیروز نے نہروں کو دوبارہ کھولنے کا حکم دیا۔ (4) حوض علائی (یا حوض خاص) یہ مٹی سے بھر گیا تھا اور خشک ہو گیا تھا۔ لوگ اس کے اندر کھیتی کرتے۔ انہوں نے اس میں کنویں بھی کھود دیئے تھے اور پانی کو فروخت کرتے تھے۔ فیروز نے از سر نو تالاب کو کھودنے کا حکم دیا۔ (5) سلطان شمس الدین التمش کا مدرسہ۔ (6) جہاں پناہ، اس کی بنیاد میرے آقا اور مربی، مرحوم سلطان محمد شاہ نے ڈالی تھی جس کے ذریعے میں نے پرورش پائی اور ترقی حاصل کی تھی میں نے اسے مکمل کر دیا؛

عفیف لکھتا ہے کہ فیروز شاہ نے کبھی بھی گزشتہ زمانے کے عظیم شیوخ اور عظیم سلاطین کے مقبروں کے سامنے اپنے سر کو جھکائے۔ یعنی زمین پر اپنی پیشانی کو ٹکائے بغیر زیادہ مدت کے لیے دہلی کو نہ چھوڑا۔ فتوحات میں فیروز دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے مندرجہ ذیل حضرات کے مقبروں کی مرمت کرائی۔

(الف) شمس الدین التمش ا میں نے جہاں ضروری تھا اس کی مرمت کرا دی۔ اس میں صندل کی لکڑی کے دروازے لگائے گئے۔ (مقبرے کے) گنبد کو سنبھالنے والے کھمبے ڈھ گئے تھے۔ میں نے پہلے کی بہ نسبت زیادہ بہتر کھمبے لگوائے۔ مقبرے کا صحن تعمیر کے وقت کچا ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے اس کو پکا (گچ کردہ) کرا دیا۔ گنبد پر لے جانے والی منقش پتھروں کی ایک سیڑھی بنائی گئی اور چاروں میناروں کو سنبھالنے والے چونے گارے کے کھمبے تعمیر کیے گئے۔

(ب) ملک پور میں سلطان شمس الدین کے بیٹے سلطان معز الدین (بہرام)

---

(1) پروفیسر رشید کے ترتیب کردہ مطبوعہ متن میں یہاں ایک یا دو سطریں چھوٹ گئی ہیں۔ یہاں ہمیں ان کاموں کے متعلق نہیں بتایا گیا ہے جو التمش کے مدرسہ کے لیے کیے گئے تھے۔ اور مقبرہ سلطان شمس الدین والدین التمش" کی سرخی بھی نہیں دی گئی ہے جس قبر اور ایک منہدم گنبد والے کمرے کو موجودہ زمانہ میں التمش سے منسوب کیا جاتا ہے اس کے ساتھ فیروز کی وضاحت کی شناخت مشکل ہے۔

(ج) ملک پور میں سلطان شمس الدین کے بیٹے سلطان رکن الدین (فیروز)

(د) سلطان جلال الدین

(ہ) سلطان علاؤالدین۔ یہ ایک بڑی عمارت تھی جس کے ساتھ ایک مدرسہ بھی منسلک تھا کیونکہ فتوحات میں مذکور ہے کہ: ''صندل کی لکڑی کے دروازے اس میں لگوائے گئے اور آب دار خانہ (پانی رکھنے کا کمرہ) کی دیوار اور مسجد کی مغربی دیوار جو مدرسہ میں ہے، کی بنیادوں اور فرش کی مرمت کرائی گئی۔

(و) تاج الدین کافوری- یہ بات قابل توجہ ہے کہ فیروز لکھتا ہے کہ: وہ 52 ہزار گھوڑا سواروں کا قائد تھا اور ایک وفادار خدمت گزار تھا (ز) دار الامان، میرے آقاؤں کا مقبرہ، میں نے اس میں صندل کی لکڑی کے دروازے لگوائے۔ (اور) اس کپڑے کا شامیانہ جس سے کعبہ مقدس کو ڈھانکا جا چکا تھا، ان کی قبروں پر لگایا گیا۔ قبروں کی مرمت و برقراری کے لیے پرانے اوقاف کی توثیق کر دی گئی اور میں نے قالین، روشنی اور ان لوگوں کے دیگر اخراجات کے لیے جو یہاں آتے جاتے ہیں نئی تفویضات کیں۔

(ح) شیخ نظام الدین اولیاء۔ شیخ اپنی وصیت کے مطابق، ایک کھلے میدان میں دفنائے گئے تھے۔ لیکن سیر الاولیاء کے مطابق سلطان محمد نے اس پر ایک بلند گنبد کی تعمیر کر دی۔ فتوحات میں مذکور ہے کہ ''میں نے صندل کی لکڑیوں کے دروازے اور جالیاں (جعفریہا) اس میں لگوائیں۔ سنہری زنجیروں کے ساتھ شیشے کے سنہرے جھاڑوں کو گنبد کے چاروں گوشوں سے لٹکایا گیا۔ میں نے ایک ایسے جماعت خانہ کی تعمیر کی جس کا اس سے قبل وجود تک نہ تھا، سیر الاولیاء کے مطابق یہ جماعت خانہ مقبرہ کے چاروں طرف برآمدوں کی شکل میں تھا جس کے کمروں میں شیخ کے شاگرد رہ سکتے تھے۔ آخر میں گزشتہ زمانہ کے عظیم بادشاہوں اور عظیم شیوخ کے مدرسوں، قبروں اور مزاروں (مقبروں) کے سلسلہ میں فیروز نے پرانے عطیات کی توثیق کر دی اور جہاں ضرورت تھی، نئے عطیات بھی دیے۔[1]

---

(1) فتوحات فیروز شاہی، ص: 15-12 میں ان باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(2) ابتدائی عمارتیں اور فتح آباد

برنی، جس نے اپنی کتاب فیروز کے دور حکومت کے چھٹے سال مکمل کی تھی، دہلی میں سلطان کی تین تعمیرات کا حوالہ دیتا ہے۔ وہ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ فیروز کی تعمیر کردہ جامع مسجد کہاں واقع تھی لیکن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ دیگر مسجدوں کی موجودگی کے باوجود اس میں سخت ہجوم ہوتا۔ مدرسہ فیروز کی تعمیر حوض علائی کے نزدیک ہوئی تھی اور یہ مولانا جلال الدین رومی کے سپرد تھا۔ برنی لکھتا ہے کہ سری کے بندھ کے نزدیک کی تیسری عمارت کو ایک محل (قصر) یا خانقاہ (صوفیاء کا گھر) کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن زیادہ مناسب ہے کہ اسے ایک مدرسہ کا نام دیا جائے۔ اسے مولانا نجم الدین سمرقندی کے سپرد کیا گیا تھا۔ برنی یہ بھی لکھتا ہے کہ ہاسی اور سرستی کے درمیان فتح آباد کے حصار (قلعہ) کی تکمیل اس وقت ہوئی جب جمنا کے کنارے قلعہ فیروز آباد کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں، مبارک شاہی بتاتی ہے کہ جامع مسجد اور حوض خاص (یا علاؤالدین کے تالاب) کے نزدیک مدرسہ کی تعمیر 1352ء (752ھ) میں ہوئی تھی۔

(3) حصار فیروزہ اور نہروں کی تعمیر

ہانسی سے تقریباً دس کروہ کے فاصلہ پر دو گاؤں تھے: 50 مرغزاروں کے ساتھ سراس بزرگ اور 40 مرغزاروں کے ساتھ سراس خورد (کہرک)[1] اس علاقہ میں پانی کی قلت تھی۔ گرمیوں کے زمانہ میں ہندستان آنے والے غیر ملکیوں کو ایک پیالہ پانی کے لیے چار جتل ادا کرنے پڑتے تھے۔ بارش کی کمی کی وجہ سے اس علاقہ میں موسم خریف کے صرف موٹے اناج ہی پیدا کیے جا سکتے تھے۔ ربیع کی فصل گیہوں کے لیے اس سے زیادہ پانی کی ضرورت ہے جتنا کہ دستیاب تھا۔

(بقیہ) جو ظاہر ہے کہ کاتبوں کی غلطی ہے (1) دہلی میں معزالدین سام کی قبر کا حوالہ (2) دہلی کے مینار کی تعمیر کو معزالدین سام سے منسوب کرنا (3) علاؤالدین خلجی کے بیٹوں اور پوتوں کی قبروں کے حوالہ جات۔ فتوحات میں جس ترتیب سے عمارتوں کی فہرست دی گئی ہے اس میں میں نے تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے تاکہ تمام مقبروں کو ایک فہرست میں لایا جا سکے۔

(1) کہرک کے معنی کے لیے ملاحظہ ہو ہوڈی والا اسٹڈیز ص: 313-14

فیروز شاہ نے سراس بزرگ کے مقام پر حصار فیروزہ کے مستحکم شہر کی تعمیریں اور نہروں سے اس پورے خطہ کو سیراب کرنے میں ڈھائی سال گزارے اس مدت کے دوران وہ محض مختصر مدتوں کے لیے دہلی آتا۔

اگرچہ عفیف کا باپ اس عہد میں ایک شب نویس (رات کو لکھنے والا) کی حیثیت سے کام کرتا تھا لیکن فیروز شاہ کے نظام نہر کا ایک زیادہ تفصیلی بیان تاریخ مبارک شاہی میں درج تھا۔ 756ھ (1335ء) میں فیروز شاہ دیپال پور گیا اور ستلج سے مخیر جس کا فاصلہ 48 کروہ ہے، ایک نہر کھدوائی۔ دوسرے سال اس نے منڈل اور سرمور کے مضافات میں جمنا سے ایک نہر نکالی اور سات مزید نہروں کے پانی کو اس میں گرا کر وہ اس کو (یعنی اصل نہر کو) ہانسی اور وہاں سے اراسن (یا پراسن) اور مزید اس مقام تک لے گیا جہاں اس نے ایک مضبوط قلعہ کی تعمیر کی جسے اس نے حصار فیروز کا نام دیا۔ اس نے شاہی محل (کوشک) کے نزدیک ایک بڑا تالاب بنوایا اور اسے اس نہر کے پانی سے بھروایا۔ اس نے ایک دوسری نہر کھوکھر سے نکالی اور اسے سرستی (سیرسا) قلعہ کے بغل سے گزار کر ہرنی کھیرا لایا اور یہاں اس نے ایک قلعہ بنوایا جسے اس نے فیروز آباد کا نام دیا۔ دوسری نہر بدھئی (یا بدھنی) میں جمنا سے حصار فیروزہ تک کھودی گئی۔ یہ وہاں تالاب میں گرتی تھی لیکن اسے مزید آگے بھی لے جایا گیا۔

ملتان کے گورنر کی حیثیت سے عین ماہرو کے ذریعے پیش کردہ ایک اصول کو غالباً پورے نظام نہر پر لاگو کیا گیا تھا۔ بڑی نہروں کی تعمیر ریاست کا کام تھا، چھوٹی اور ذیلی نہریں وغیرہ جو کھیتوں کو پانی پہنچاتیں، ریاستی افسران کے ذریعے تعمیر کی جاتیں اور برقرار رکھی جاتیں۔ لیکن ان کی تعمیر اور برقراری کے اخراجات کو لگان کے تفویض کے حامل اشخاص اور کاشتکاروں کو برداشت کرنا پڑتا۔ انہیں اس کے لیے ادائیگی کرنی پڑتی یا بغیر پانی کے رہنا پڑتا۔

حصار فیروزہ شہر میں، جیسا کہ عفیف نے بیان کیا ہے، ایک شہر پناہ اور اس کے گرد ایک خندق تھی، شہر پناہ کے اندر فیروز نے ایک شاہی محل (کوشک) اور ایک تالاب (حوض) بنوایا تھا۔ وہاں افسروں نے اپنے گھر بھی بنا لیے تھے اور حصار فیروزہ، ایک بڑا، آباد اور خوش حال شہر ہو گیا تھا۔ اسے ایک صوبے (شق) کا دارالسلطنت بنا

دیا گیا۔ جس میں ہانسی، اگروہا، فتح آباد، سلوراتے سرستی (سرسا) کا خطہ، خضر آباد اور دیگر علاقے شامل تھے۔ اس صوبہ کی ذمہ داری ملک ویلدن کے سپرد کی گئی تھی۔

جب (نہروں کے) اس نظام کو عمل میں لایا گیا تو خریف اور ربیع دونوں ہی فصلوں کی کاشت ممکن ہوگئی۔ اندرون زمین پانی کی سطح بھی اونچی ہوگئی اور صرف چار گز گہرائی تک کھود کر ہی ایک کنواں بنایا جاسکتا تھا۔ مذہبی محققین کی ایک اسمبلی نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ اس محنت وسرمایہ کی بنا پر جو اس نے اس میں لگایا تھا فیروز شاہ کو خزانہ عامہ کے دعوؤں سے علیحدہ ذاتی طور پر حق شرب (پانی کا حق) حاصل تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایسی زمین کی کل پیداوار کے دسویں حصہ کا حق دار تھا جو (نہروں کی تعمیر سے قبل) کسی نہ کسی طور پر زیر کاشت رہی تھی۔ اور ایسے گاؤں کے کل لگان کا جو اس کی نہروں کی وجہ سے ہی آباد ہوسکے تھے۔ نہروں سے فیروز کی ذاتی آمدنی تقریباً دو لاکھ ٹنکے سالانہ تھی۔ لیکن یہ بادشاہ کی ذاتی آمدنی کا محض ایک حصہ تھا۔ عفیف لکھتا ہے کہ دہلی کے کسی بادشاہ کے پاس اتنی جائداد نہ تھی جتنی کہ فیروشاہ کے پاس آخر کار اس کی ذاتی جائدادوں کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے افسران کا ایک علیحدہ شعبہ قایم کرنا پڑا۔

(4) جمنا کے کنارے فیروز آباد کا شہر

نظام نہر کے علاوہ فیروز اس کے افسران اور (محکمہ) تعمیر سے متعلق لوگوں کا سب سے زبردست کارنامہ دہلی کے علاقہ میں فیروز آباد (جو اب ناپید ہے) کا شہر تھا۔ شاہ نے سب سے پہلے اپنے محل کے لیے ایک مناسب مقام کی حیثیت سے جمنا کے کنارے واقع کاوین گاؤں کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد اس کے چھوٹے بڑے افسروں نے شہر میں اپنے گھروں کی تعمیر شروع کر دی اور عوام میں سے دولتمند اشخاص نے بھی پختہ مکانات کی تعمیر کے ذریعے اس شہر کی ترقی میں تعاون کیا۔ اٹھارہ میں سے بارہ علاقوں کو، (مواضع) جو شہر فیروز آباد میں شامل تھے عفیف نے گنایا ہے، (اندپت کا شہر، ملک یار پران کی سرائے، شیخ ابوبکر طوسی کی سرائے، کاویں کیتھوارا، لہراوت، اندھالوی، سرائے ملکہ، سلطان رضیہ کے مقبرہ (کے پاس کا علاقہ) بہاری، مہراولی اور سلطان پور کے علاقہ جات۔ شہر جب مکمل ہو گیا تو وہ اندپت سے لے کر ٹیلے

(Ridge) پر واقع فیروز شاہ کے کوشک شکار تک پانچ کروہ تک پھیلا ہوا تھا۔ عفیف نے آٹھ ایسی جامع مسجدوں کو گنایا ہے جن میں سے ہر ایک میں تقریباً دس ہزار پر مشتمل نماز جمعہ کی جماعت ہو سکتی تھی۔ اس پانچ کروہ کے درمیان جو فیروز آباد کو پرانی دہلی سے جدا کرتا تھا، لوگوں کی زبردست نقل و حرکت ہوتی اور عفیف نقل و حمل کے مندرجہ ذیل "متعین کرایوں" کا تذکرہ کرتا ہے۔ گاڑی میں ایک سیٹ، 4 جٹل، ایک بھینس یا بیل (سطور) کا کرایہ 6 جٹل، ایک گھوڑے کا کرایہ 12 جٹل، ایک ڈولی (ڈولہ) کا کرایہ نصف ٹنکہ، لیکن عفیف کو فیروز آباد کی تقریباً مکمل تباہی کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ لکھتا ہے "ساری تعریف خدا کے لیے ہے! اتنا بڑا، اتنا آباد اور اتنا خوش حال شہر، تقدیر الٰہی کے مطابق، مختلف اعتبار سے بالکل تباہ ہو چکا ہے، بیشتر باشندے (تیموری) منگولوں کا نشانہ بننے اور زندہ رہ جانے والے لوگ مختلف سمتوں میں بھاگ گئے۔ ان تمام باتوں میں خدا کی حکمت پوشیدہ ہے۔ شکایت کی گنجائش نہیں ہے۔ خدا کا کوئی حکم کسی انسانی تدبیر سے ٹالا نہیں جا سکتا۔[1] آج نئی دہلی میں کوٹلہ فیروز شاہ اور پہاڑی پر واقع اس کا کوشک فیروز شاہ کے عظیم دارالسلطنت کے واحد آثار ہیں۔

بنگال کی دوسری مہم

عید کے دن ذی الحجہ 756ھ (17 دسمبر 1355ء) کو مصر سے دارالسلطنت سے خلیفہ الحاکم بامر اللہ، ابوالفتح ابی بکر بن ابی ربیع سلیمان کی جانب سے فیروز کو خلعتیں اور ایک منشور ملا جس کی رو سے ہندستان (کی سلطنت) اس کو تفویض کی گئی تھی۔ 1357ء میں ظفر خاں جو نسلاً ایک ایرانی اور سنار گاؤں کے سلطان فخر الدین کا داماد تھا، دو ہاتھیوں کیساتھ حصار فیروزہ میں فیروز شاہ کے پاس آیا۔ اس نے شکایت کی کہ حاجی الیاس نے سنار گاؤں پر اچانک حملہ کر دیا تھا اور فخر الدین کو قتل کر کے اس کے تمام

---

(1) عفیف، ص: 63-137، مبارک شاہی، ص: 28-126

(2) اسی طرح مبارک شاہی میں مذکور ہے۔ عفیف لکھتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہزار (بنگالی) گھوڑ سوار اور بے شمار پاپیادہ سپاہی تھے۔ یہ ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام ٹھٹھہ کے راستے ظفر خاں کے آنے والے اور فیروز شاہ کے دربار میں اس کے حاضری دینے کے متعلق عفیف کے تفصیلی بیان کو اس بیان رد کر دیتے ہیں کہ یہ "تاریخی اعتبار سے مہمل ہے" میں (بقیہ اگلے صفحے پر)

پیروکاروں کو مار ڈالا تھا۔ ظفر خاں محض پانی کے راستہ دہلی پہنچ سکا تھا۔ پورے ہندستانی جزیرہ کا چکر لگانے کے بعد وہ ٹھٹھہ کے راستے دہلی پہنچا تھا۔

ظفر خاں، جیسا کہ مستقبل میں ظاہر ہونے والا تھا۔ ایک باصلاحیت اور صاحب کردار شخص تھا۔ فیروز نے پہلی ملاقات میں اسے "اپنے کپڑے دھلوانے" (کے اخراجات) کے لیے تیس ہزار ٹنکے دیے، بعد میں اس نے خود اس کے لیے اور اس کے پیروکاروں کے لیے چار لاکھ ٹنکے دیے اور اس نے ظفر خاں کے خطاب کی توثیق کر کے نائب وزیر مقرر کر دیا۔ جہاں تک ظفر خاں کی اس درخواست کا تعلق تھا۔ جب ظفر خاں، خان جہاں سے ملاقات کرنے دہلی گیا تو اس نے اسے بھی اتنا ہی مہربان پایا۔ 1358ء (759ھ) میں منگول دیپال پور تک چلے آئے تھے لیکن سرپردہ دار ملک مقبول کی ماتحت ایک فوج کے ذریعے انہیں کھدیڑ دیا گیا۔ نومبر 1358ء (759ھ کے اواخر) میں فیروز کے افسران، جو حاجی الیاس کے پاس تحائف لے جا رہے تھے، کو بہار پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ الیاس کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کا بیٹا سلطان سکندر اس کا جانشین ہو گیا ہے۔ انہوں نے سلطان فیروز سے ہدایات طلب کیں اس نے انہیں تحائف دہلی واپس لانے، گھوڑوں کو بہار میں شاہی فوج کے سپرد کر دینے اور بنگال کے سفراء کو کڑا میں ٹھہرانے کا حکم دیا۔

1359ء (760ھ) میں فیروز شاہ نے خان جہاں کو ایک بار پھر نائب غیبت مقرر کیا اور 80 ہزار گھوڑ سواروں اور 470 ہاتھیوں کے ساتھ بنگال روانہ ہو گیا۔ اس نے ابھی چند ہی منزلیں طے کی ہوں گی کہ تاتار خاں فجر کی نماز کے بعد اس کی ملاقات کے لیے آیا اور شراب کے ان برتنوں کا انکشاف کر کے جنہیں سلطان نے چھپانے کی کوشش کی تھی اس نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ اس وقت تک کسی طرح کے شراب کو

(بقیہ)

فخرالدین کو 1340-41ھ میں معزول کر دیا گیا تھا۔ ان تمام سالوں کے دوران ظفر خاں کیا کر رہا تھا؟ ظفر خاں کا کردار اور اس کی صلاحیتیں دہلی میں یقیناً اچھی طرح معروف و مشہور ہوں گی۔ ورنہ اس کے آتے ہی اسے اعلیٰ ترین افسروں میں نہ رکھا جاتا۔ سابقہ سالوں میں اس کی تاریخ کا اب بھی انکشاف نہ ہو سکا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی حکومت اس کی معروف ذاتی خوبیوں کی بنیاد پر اسے قبول کرنے پر تیار تھی۔ اس کی حمایت کرنے والا نہ کوئی اس کا پیروکار تھا اور نہ اسے کوئی اثر و رسوخ حاصل تھا۔

ہاتھ نہ لگائے گا۔ جب تک تاتار خاں خیمہ میں ہے، فیروز نے خیال کیا کہ تاتار خاں کا رویہ نہایت گستاخانہ تھا اور اس نے اپنی آزادی کی دوبارہ حصولی کی خواہش بھی کی لہٰذا اس نے تاتار خاں کو چند دنوں بعد حصار فیروزہ کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ اودھ اور قنوج کے راستہ سے کوچ کرتے ہوئے فیروز نے جون پور کے شہر کی تعمیر میں چھ ماہ (موسم برسات کو شامل کر کے) صرف کیے۔ اپنے عم زادہ بھائی سلطان محمد، جو کسی زمانہ میں ملک جونا کے خطاب کا حامل تھا، کے نام پر اس نے یہ نام رکھا۔[1] سلطان سکندر کے سفراء اسے مطمئن کرنے میں ناکام رہے لہٰذا اس نے مشرق کی سمت روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ سکندر اپنے باپ کی طرح اکڈالہ کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ اس سفر کے دوران فیروز نے اپنے بیٹے، فتح خاں، کو جس کی عمر تقریباً آٹھ سال کی تھی، اپنا جانشین نامزد کر دیا اور اس کے نام کو بھی سکوں پر منقش کیے جانے کا حکم دیا۔

بنگال کی دوسری مہم کی اصل وجہ کا دریافت کر لینا مشکل ہے۔ سیرت فیروز شاہی بتاتی ہے کہ فیروز، سکندر کی گستاخی سے برہم تھا لیکن سکندر نے حتیٰ الامکان خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔ عفیف اس مفروضہ کی بنا پر لکھتا ہے کہ فیروز ظفر خاں کو سنار گاؤں میں بٹھا دینا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بات، جیسا کہ انجام کار ظاہر ہونے والا تھا، اس وقت تک قطعی ناممکن تھی جب تک سکندر مغربی بنگال پر قابض تھا۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ فیروز نے یہ سوچا تھا کہ سکندر اتنا کمزور تھا کہ وہ خون ریزی کے بغیر فتح حاصل کر سکتا تھا۔ اگر ایسا ہے تو اس نے نہایت غلط اندازہ لگایا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی فوج نے پانی کی رکاوٹ کو عبور کر کے اکڈالا کے مٹی کے بنے قلعہ کو گھیر لیا۔ ایک دن قلعہ کی ایک برج ٹوٹ کر گر گئی اور فیروز کے سپاہیوں نے قلعہ کے اندر گھس جانا چاہا لیکن فیروز نے انہیں ایک دن انتظار کرنے کا حکم دیا۔ اس نے اپنے کمان کے افسر سے کہا۔ ''حسام الدین نوا! میں چاہتا ہوں کہ یہ مقام میرے سپاہیوں کے اس کے اندر جائے بغیر مجھے حاصل ہو جائے۔'' اس نے اس تباہی کا جس کا وہ سبب بنیں گے اور ان مسلم عورتوں کی تکالیف کا جوان کے ہاتھ

---

(1) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جون پور کا نام ایک ہندو رشی کے نام پر تھا۔

لگیں گی، تذکرہ کیا۔ رات کو بنگالیوں نے برج کی دوبارہ تعمیر کرلی اور محاصرہ جاری رہا۔

سکندر نے اپنے وزراء کو "اژدہے" کو واپس ہو جانے پر آمادہ کرنے کے لیے چند ذرائع کی تلاش کا حکم دیا۔ کیونکہ اس کے عوام سخت مصائب کا شکار تھے۔ اس کے وزراء نے ایک خط اور ایک قاصد کے ذریعے فیروز کے وزراء سے ربط قایم کیا۔ اور فیروز امن کی شرائط پر راضی ہو گیا۔ بشرطیکہ سنار گاؤں کو ظفر خاں کے حوالے کر دیا جائے۔ فیروز کی ملازمت میں ایک بنگالی افسر، ہیبت خاں کو، جس کے دو بیٹے سکندر کی ملازمت میں تھے، معاملات کو درست کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اگر عفیف پر اعتماد کیا جائے تو سکندر نے ہیبت خاں سے کہا۔ "سلطان فیروز میرا آقا مربی اور میرا چچا ہے۔ میں اس سے جنگ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر میرا چچا سنار گاؤں کو ظفر خاں کے لیے چاہتا ہے تو میں اسے دے دیتا ہوں۔ مزید یہ کہ ایک فوج کے ساتھ یہاں آنا ضروری نہ تھا۔ اس سلسلے میں اپنے چچا کے لکھے ہوئے فرمان کو ہی مان لیتا، چچا، بھتیجہ کے تعلق سے ایک آخری ثبوت کے طور پر فیروز نے ایک شاہی خلعت، ایک ٹوپی (کلاہ)، اور 80 ہزار ٹنکہ کی مالیت کے ایک تاج اور دیگر تحائف کے ساتھ ملک قبول تورابانہ کو بھیجا۔ ملک قبول نے سکندر کو یہ شاہی خلعت پہنائی اور سات مرتبہ اس کے تخت کا چکر کاٹ کر اس نے تاج کو سکندر کے سر پر رکھ دیا لیکن ظفر خاں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کے بعد سنار گاؤں کے مشکوک تخت کی خاطر فیردز کی محفوظ ملازمت کو نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ مرحوم سلطان فخرالدین کی پارٹی 1341ء میں نیست و نابود ہو چکی تھی اور اسے دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فیروز کی یہ پیش کش بھی ظفر خاں کے ارادے کو نہ بدل سکی جتنی بھی ضرورت ہو اتنی ہی مدت وہ اس علاقہ میں قیام کر سکتا تھا۔

جاجنگر کی مہم[2]

اسی زمانے سے جبکہ تغلق شاہ کے دور حکومت میں الغ خاں نے اس پر حملہ کیا

---

(1) اس ہندی لفظ کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو، ہوڈی والا، اسٹڈیز ص: 317

(2) عفیف، ص: 74-163، مبارک شاہی، ص: 30-129 (بقیہ ص: 830 پر)

تھا، جاجنگر یا اڑیسہ دہلی کی بالادستی یا اقتدار اعلیٰ کا معترف تھا۔ اور اسے پابندی سے ہاتھی بھیجا کرتا تھا۔ لیکن جب فیروز بنگال کی دوسری مہم پر روانہ ہوا تو جیۓ نگر کے گجپتی ویر بھانو یو سوم (ساکہ 1274-1300ء، 1351-78ء) کو بنگال کی حمایت پر آمادہ کر لیا گیا اور اس سرکشی یا "اعلانِ آزادی" کے کام میں اس کے ان وزراء یا مہتاؤں نے اس کی حمایت کی جنہیں اڑیسہ میں پتور کہا جاتا تھا۔ انہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ دہلی بہت دور ہے لہٰذا فیروز نے اپنے ساز و سامان کو کڑا میں اپنے بھائی قطب الدین کے سپرد کر دیا اور تقریباً 40 ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ بہار کے راستے جیۓ نگر کے لیے روانہ ہو گیا۔ عفیف جس کا باپ فوج کے ساتھ تھا، ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ ملک نہایت خوشحال تھا۔ مکانات عظیم الشان تھے اور ان میں خوبصورت باغات تھے۔ کاشت کردہ زمینیں بھی کافی تھیں۔ حملہ آور فوج کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ دو تانبے کے سکوں کے بدلے غلاموں کو خریدا جا سکتا تھا۔ مویشیوں کو خریدنے کے لیے کوئی پریشان نہ تھا کیونکہ وہ بلا کسی قیمت کے مل سکتے تھے۔ ہر منزل پر حملہ آور فوج کو اپنے کھانے کے لیے کافی بکریاں مل جاتیں۔ اس سرزمین میں کوئی مسلمان نہ تھا۔ فیروز جنگ کرے گا لیکن (اس کے بعد) معاف کر دے گا۔ متعصب مسلمانوں کی خوشی حاصل کرنے کے لیے وہ چند قدیم مندروں کی بے حرمتی بھی کرے گا۔ گرچہ وہ جانتا تھا کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی اور ان سب کے علاوہ وہ ہاتھیوں کے شکار سے بھی لطف اندوز ہو گا۔ اگر عفیف کے باپ نے اسے فیروز کی روانگی کے راستہ کے متعلق بتایا تھا تو ہمارا مصنف اسے بھول گیا لہٰذا ہمیں دیگر مآخذ پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

فیروز نے جس قلعہ پر سب سے پہلے حملہ کیا وہ سیکھر یا سیکھن کا تھا جس کی شناخت ڈاکٹر ریاض الاسلام موجودہ پنچت پہاڑی یا پرانے پنج کوٹ کے قلعہ سے کرتے ہیں۔ رائے کا نام ماہرو نے سلمین بتایا ہے اور مبارک شاہی میں سادھن درج ہے۔

(ص: 829 سے آگے)

انشاء، ماہرو ص: 27-35 نمبر 12، ماہرو کی عرضداشت ایک درخواست تھی جو فیروز شاہ کے پاس اس کے فتح نامہ (فتح کے پیغام) کی وصولی کے بعد بھیجی گئی تھی۔ یہ ایک ہم عصر تحریر ہے لیکن اس کا مواد غالباً فتح نامہ سے منتخب کردہ تھا۔

سیرت کے مطابق سیکھر کے رائے کے 30 ماتحت رائے تھے اور اس نے سخت مزاحمت کی تھی لیکن اسے بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس کی لڑکی حملہ آوروں کے ہاتھ لگ گئی جسے فیروز شاہ نے متبنیٰ بنالیا۔ دوسرا اہم مقام تنیانگر تھا جس کا ماہرو از تسارن کی حیثیت سے حوالہ دیتا ہے جس کی ولایت (سرزمین) تنیا ہے۔ ماہرو کے مطابق باشندوں نے کبھی بھی کسی کو لگان ادا نہیں کیا تھا۔ سیرت کے مطابق تنیانگری کی شناخت جاجپلا کے ذریعے کی جاسکتی ہے، دوسری منزل تھی۔ یہاں کے باشندے امن پسند برہمن تھے اور فیروز نے اپنے سپاہیوں کو انہیں پریشان نہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد کی منزلیں جو درج ہیں وہ یہ ہیں:۔ ککل گھاٹی (یا ککلہ) کٹک سے پندرہ میل شمال میں سمارن گڑھ (جس کا حوالہ ماہرو نے دیا ہے) ایک قلعہ جواب کھنڈر ہو گیا ہے۔
کٹک سے پانچ میل جنوب مغرب میں چھترا گڑھ (جس کا حوالہ ماہرو نے دیا ہے)

ہمارے ماٰخذ (ماہرو، مبارک شاہی اور عفیف) اس بیان پر متفق ہیں کہ فیروز نے کٹک بنارسی میں قبضہ کرلیا تھا اور اس نے پوری میں جگناتھ کی مورتیوں کو تباہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد اگر عفیف پر یقین کیا جائے فیروز نے تقریباً دس یا گیارہ میلوں کے ایک جنگل کے ارد گرد مٹی اور لکڑی کی ایک دیوار (کاٹھ گڑھ) بنوائی جس میں آٹھ ہاتھی رہا کرتے تھے اور انہیں جب وہ پیاس اور بھوک سے لاچار ہو گئے تو گرفتار کرلیا۔

گجپتی نے دانشمندی کے ساتھ لڑنے پر بھاگنے کو ترجیح دی تھی۔ اس نے ایک بنگال مسلم افسر، احمد خاں کو، جو اس کی ملازمت میں تھا اپنے باکی نامی ایک چتور کی معیت میں 28 ہاتھیوں کے ساتھ فیروز کے پاس بھیجا۔ لیکن وہ کسی طرح کی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ گجپتی کے فیل خانہ کا نگراں رانا سہیل بھی گرفتار کرلیا گیا۔ بالآخر گجپتی کے خسر رائے داہر نے مداخلت کی اور راگھو جنیا پنڈت کو گجپتی کو مطمئن کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ گجپتی نے (ماہرو کے مطابق) ہندو طریقے پر سر جھکا کر اس بات کا اقرار کیا کہ وہ اور اس کا باپ (دہلی کے) دربار کا غلام ہے اور اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ ان تمام ہاتھیوں کو، جو پکڑ لیے گئے ہیں اور کٹ بنارسی لے آئے گئے ہیں فیروز کے افسروں کے حوالہ کردے گا۔ فیروز نے گجپتی کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ محض ہاتھیوں کا شکار کرنے آیا تھا اور گجپتی کا بھاگنا غیر ضروری تھا۔

ماہر و اور مبارک شاہی دونوں ہی بیان کرتے ہیں کہ فیروز سیدھے کڑا واپس لوٹ آیا۔ وہ مئی یا جون 1361ء میں ڈھائی سالوں کی غیر حاضری کے بعد دہلی پہنچا۔ چھ ماہ تک فیروز شاہ کے راستے میں بھٹکتے رہنے کے متعلق عفیف کے بیان پر یقین کر لینا ممکن نہیں۔

امن و امان کے چار سال[1]

فیروز شاہ کی دہلی میں واپسی کا مناسب طور پر جشن منایا گیا۔ قبوں کی تعمیر کی گئی اور ان 73 ہاتھیوں کی، جو وہ لایا تھا، مناسب ڈھنگ سے نمائش کی گئی۔[2] فیروز آباد کے شہر کی تعمیر عمل میں آ چکی تھی۔ اب فیروز شاہ نے قصر شاہی (کوشک) اور پناہوں کی تعمیر کرائی اس نے مہندواری (چندواری) میں بھی ایک کوشک کی تعمیر کی۔ اس دور کے کار خیر میں (عفیف کے مطابق) فیروز شاہ نے محققین، شیوخ اور دیگر مذہبی لوگوں کو 36 لاکھ ٹنکے کا ایک عطیہ دیا جبکہ بلا پونجی والے غریب اشخاص، کو ایک کروڑ ٹنکے دیے گئے تا کہ وہ غیر مزروعہ زمینوں (زمین اکھل) کو زیر کاشت لا سکیں۔ عفیف ہمیں بتاتا ہے کہ ”غیر مسلم خواہ وہ ’لگان ادا کرنے والے، (مملکت کی رعایا) ہوں یا تحفظ کردہ وہ اشخاص (یعنی رایوں کی رعایات) ہوں۔ فیروز کے شاہی چھتر کے سائے تلے خوش حالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔“

مبارک شاہی ہمیں اس عہد میں نہروں کی کھدائی کے سلسلہ میں فیروز کی سرگرمیوں کا ایک خاکہ پیش کرتی ہے۔ ”دریائے سرستی (سرسوتی) بڑے بڑے پہاڑوں سے نکلتی ہے اور ستلج میں گرتی ہے۔ فیروز کو اطلاع دی گئی کہ بروانامی ایک مقام پر مٹی کا ایک ٹیلہ دریائے سرسوتی کو (فیروز شاہ کی) مسلمہ نہر سے جدا کر دیتا تھا۔ اگر اس ٹیلہ کو کھود کر ہٹا دیا جائے تو سرسوتی کا پانی نہر میں چلا آئے گا پھر سہرند (سرہند)، منصور پورا اور مزید سنام تک پہنچایا جا سکتا تھا۔ فیروز اس مقام تک گیا اور اس ٹیلہ کو کھدوانا شروع کر دیا۔ اس نے سامانہ کے صوبے سے دس کروہ زیٹرر لے کر اسے ضیاء

---

(1) عفیف، ص: 175-85، مبارک شاہی ص: 130-31

(2) ہمارے ماخذ کے ذریعے پیش کردہ ہاتھیوں کے متعلق تعداد کی تصحیح ناممکن ہے۔ وہ ان کی مجموعی تعداد کم از کم 10 بتاتے ہیں لیکن یہ مسئلہ ہندستان کی تاریخ میں کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں۔

الملک شمس الدین ابور جا کے سپرد کر دیا تاکہ اسے وہ زیر کاشت لا سکے۔ اس نے وہاں ایک قلعہ بھی بنوایا جسے اس نے فیروز پور کا نام دیا؛ فیروز شاہ کوٹلہ کو نہ کھدوا سکا لیکن کھدائی کے دوران درختوں کے بہت سے ایسے آثار کا انکشاف ہوا جن کی ماہیت اس وقت نہ سمجھی جا سکی۔ سر وولزے ہیگ کہتے ہیں "اس دور حکومت کے کاغذات کی وجہ سے دودھ پلانے والے جانوروں کی 64 جنسوں کی ہڈیوں کے آثار کا انکشاف ہو سکا جو پلیوسین (سیوالک) عہد میں ہمالیہ کے دامن میں رہتے تھے اور جن کی صرف 39 جنسوں کی نسلیں اب زندہ ہیں۔ ہاتھیوں کی گیارہ نسلوں میں سے صرف ایک اب ہندستان میں باقی بچی ہے اور بوس (Bos) کی چھ نسلوں میں دو باقی ہے۔[1]

کانگڑا کی مہم

نگر کوٹ کانگڑا عہد وسطیٰ کے ہندستان کا مضبوط ترین قلعہ تھا۔[2] آئین اکبری بتاتی ہے۔ "نگر کوٹ ایک شہر ہے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے اس کے قلعہ کا نام کانگڑا ہے۔[3] 1365ء کے موسم سرما کے اختتام پر فیروز نے اپنے ان سپاہیوں کو جو نقد تنخواہ پر ملازم تھے (دس فی صد رقم بطور پیشگی دینے کا حکم دیا اور دکن کی طرف روانہ ہوا۔[4] لیکن یہ بیانہ پہنچ کر وہ وہاں کچھ دنوں ٹھہرا اس کے بعد دہلی واپس ہو کر نگر کوٹ کے لیے روانہ ہوا۔ اس مہم کے سبب کا انکشاف کر لینا مشکل ہے۔ شاید کوئی نیا رائے گدی نشین ہوا تھا جو اپنے پیش رو کی طرح وفادار نہ تھا، کہا جاتا ہے کہ راستہ میں فیروز جوالا مکھی کے

---

(1) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، ص:179

(2) عفیف، ص:90-185، سیرت فیروز شاہی، ورق نمبر 82-177

(3) جیرٹ (Jarrett) جلد 2، ص:312

(4) عفیف کے اس بیان پر کہ مئی جون 1361ء میں دہلی واپس آنے کے بعد فیروز پور سے چار سالوں تک کسی دوسری مہم پر نہ روانہ ہوا تھا۔ پروفیسر ہوڈی والا (اسٹڈیز ص:822) تاریخوں کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تجویزیں پیش کرتے ہیں (الف) فیروز دہلی سے نگر کوٹ رجب 676ء (مارچ-اپریل 1365ء) سے قبل روانہ نہ ہو سکتا تھا۔ (ب) چونکہ اس قلعہ کی فوج نے چھ ماہ تک مزاحمت کی تھی لہٰذا وہ ٹھٹھہ 767ھ (اپریل 1366ء) کے وسط سے قبل نہ پہنچ سکتا تھا اس سال کا موسم برسات گجرات میں گزارا گیا تھا۔ (ج) ٹھٹھہ کے شہر کی فتح غالباً 768ء (1367ء مارچ کے وسط سے قبل نہ ہو سکی ہو گی)

مندر میں گیا تھا۔ رائے قلعہ بند ہو گیا اور حسبِ معمول قلعہ سے باہر کا علاقہ دہلی کی فوج کے قبضہ میں آ گیا جس نے آس پاس کے مندروں کو تاراج کیا اور سنسکرت کی کتابوں کا ایک ڈھیر اکٹھا کر لیا۔

چھ ماہ تک محاصرہ جاری رہنے کے بعد ایک خوشگوار واقعہ امن وامان کا باعث بنا جس کے لیے بظاہر جانبین تیار ہی تھے۔ اس اثنا میں جبکہ فیروز محاصرہ کی کارروائیوں کا معائنہ کرنے کے لیے چکر لگا رہا تھا کہ اس کی نظر رائے پر پڑی رائے نے اپنا ہاتھ جوڑا اور جھک گیا۔ سلطان نے اپنا رومال ہلایا اور رائے کو نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ رائے کے مہتاؤں نے اسے سلطان پر بھروسہ کرنے کا مشورہ دیا۔ جب رائے سلطان کے سامنے آیا اور اس زمانہ کی درباری رسم کے مطابق اس نے قدم بوسی کی تو سلطان نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا اور اسے ایک خلعت اور ایک چھتر عطا کیا۔ رائے اپنے قلعہ میں واپس چلا گیا اور حتیٰ الامکان تحائف بھیجے۔ نگر کوٹ کو فتح نہیں کیا گیا کیونکہ نہ تو سلطان اور نا ہی اس کی فوج قلعہ میں داخل ہوئی۔ دہلی بالادستی کو تسلیم کر لیا گیا اور رائے کے وہ اختیارات قایم رہے جن کا اس کے اسلاف استعمال کرتے آئے تھے۔

عفیف اپنے باپ سے سنی ہوئی باتوں کی بنا پر اس بات پر مصر ہے کہ یہ کہنا غلط ہے کہ یا تو فیروز شاہ نے یا اس سے قبل سلطان محمد بن تغلق نے جوالا مکھی کے بت پر ایک چھتر نصب کیا تھا۔ مختلف مورخین نے اس بیان کو قبول کر لیا ہے یا اس کی تردید کی ہے لیکن جیسا کہ ریاض الاسلام درست ہی انکشاف کرتے ہیں (اس معاملے میں) عفیف خود ہی پراگندگی کا شکار ہے اور اس نے دوسرے لوگوں کو بھی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ مندر کا اندرونی حصہ تین فٹ گہرے اور ایک چوکور گڑھے پر مشتمل ہے۔ وسط میں چٹان کو بڑی دراز کے چاروں طرف کھوکھلا بنا دیا گیا اور آگ روشن کرنے سے گیس شعلہ بن کر بھبھک اٹھتی ہے۔ وہاں کسی قسم کا کوئی بت نہیں ہے۔ شعلہ فگن دراز کو اس دیوی کا شعلہ فشاں منہ سمجھا جاتا ہے جس کے دھڑ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بھون کے مندر میں ہے۔"[1] شعلہ پر ایک چھتر کو نصب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ سیرت بتاتی ہے کہ شریعت کے قوانین کے مطابق پچاس مندروں کو

---

(1) آرکیالوجیکل سروے رپورٹ، جلد 5، ص: 171، جیسا کہ ریاض الاسلام نے حوالہ دیا ہے۔

کوئی نقصان نہ پہنچایا گیا۔

ٹھٹھہ کی مہم (1365-67ء)[1]

اس زمانہ میں نشیبی سندھ اور ٹھٹھہ کے حکمراں (جام انتر کا بھائی، جام علاؤالدین جونا اور جام انر کا بیٹا صدر الدین بنہبیہ تھے۔ ملتان کے گورنر کی حیثیت سے عین ماہرو نے تنبیہ کے رویہ کی سختی سے شکایتیں کی تھیں جس نے ملک پر حملہ کرنے کے لیے منگولوں کو بھڑکانے کی بارہا کوششیں کی تھیں۔ ماہرو کے خیال میں جام اتنا برا نہ تھا لیکن وہ اپنے بھتیجے اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو قابو میں رکھنے کے لائق نہ تھا۔ فیروز نے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ کسی طرح سلطان محمد ٹھٹھہ کی حسرت دل میں لیے انتقال کر گیا تھا، اس خطہ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سلطنت دہلی کی تاریخ میں یہ عسکری مہم سب سے زیادہ بد نظمی کا شکار ہوئی۔[2]

خاں جہاں کو اپنا نائب غیبت مقرر کر کے فیروز نوے ہزار گھوڑ سواروں اور چار سو اسی ہاتھیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس کے دو عظیم افسران، تاتار خاں اور عین ماہرو کا انتقال ہو چکا تھا۔ اجودھان میں شیخ فرید الدین کی قبر پر دعائیں مانگنے کے بعد فیروز سیوستان اور بھکر پہنچا چونکہ ان دنوں ٹھٹھہ سندھ کے دونوں کناروں پر مشتمل تھا اور دونوں شہر مٹی کی بنی مضبوط فصیلوں کی پناہ میں تھے۔ فیروز نے پانچ ہزار کشتیوں کو اکٹھا کرنے اور انہیں دریا میں لے جانے کا حکم دیا جبکہ وہ اور فوج خشکی کے راستہ چلی۔ عفیف لکھتا ہے کہ ہزار کشتیوں کے کنٹرول کی ذمہ داری اس کے والد اور چچا کے سپرد کی گئی تھی۔ ٹھٹھہ کا محاصرہ طویل ہو گیا تھا اور اس کے دوران محاصرین کو دو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں سے کم از کم ایک کی تو پیش بینی کی جا سکتی ہے اور اس کے لیے انتظامات کیے جا سکتے تھے۔ تین چوتھائی سے زائد گھوڑے ایک وبا کا شکار ہو کر مر گئے اور غلوں کی اتنی قلت تھی کہ ان کی بکری دو یا تین ٹنکے فی من تھی۔ حملہ آور اور گھوڑ سواروں کی اکثریت فاقہ کشی کا شکار تھی اور پیدل چل رہی تھی۔ مسلسل جھڑپوں

---

(1) عفیف، 254-194، مبارک شاہی، ص: 131

(2) اس مہم کی تفصیلات کے سلسلے میں عفیف ہمارا اصل ماخذ ہے لیکن اس پر بھروسہ نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

کے بعد ٹھٹھہ والوں نے ایک جنگ کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ بیس ہزار گھوڑسواروں اور پاپیادہ سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ باہر نکلے۔ فیروز اور اس کے افسران، جن کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی محض ایک بروقت طوفان ہی کی بنا پر زبردست شکست سے بچ سکے۔ لیکن اسی شام فیروز نے اپنے افسران سے وضاحت کی: ”ٹھٹھہ اس مرتبہ مغلوب نہ ہوگا۔ لیکن میں اسے حاصل کیے بغیر دہلی واپس جانے والا نہیں ہوں۔ (فی الحال) ہم لوگ گجرات کی طرف روانہ ہوں گے۔ ربیع کی فصل تیار ہونے کے بعد لوٹیں گے، لہٰذا گجرات کی روانگی شروع ہوئی۔ تعاقب کرنے والے ٹھٹھہ والوں کو کھدیڑ دیا گیا۔ لیکن انہوں نے ایک سندھی شعر کہا جس کا ترجمہ پروفیسر ہوڈی والا اس طرح پیش کرتے ہیں: ”شیخ پتھہ (ابراہیم شاہ عالم)[1] کی برکت سے ایک (محمد تغلق) کا تو انتقال ہو گیا اور ایک (فیروز تغلق) بھاگ کھڑا ہوا، فیروز شاہ کی کشتیاں ٹھٹھہ والوں کے ہاتھ لگ گئیں اور انہوں نے بہ طمینان تمام اپنے کھیتوں کی کاشت شروع کردی۔

فیروز کی پسپا ہونے والی فوج میں غلوں کی قیمتیں چڑھ کر فی سیر دو یا تین ٹنکے ہو گئی اور اس کے بعد وہ کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ تھے۔ مزید براں سندھی راہبروں نے جان بوجھ کر کچھ کے رن کی جانب فوج کی غلط رہنمائی کر دی جہاں تاحد نگاہ کھارے پانی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ فیروز نے اپنے سپاہیوں کو حتی الوسع اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ اچھے پانی لے چلنے کا حکم دیا۔ لیکن ان کے آدمیوں کے مصائب بڑے ہولناک تھے۔ انہوں نے سڑے ہوئے گوشت اور ابالے ہوئے چمڑے پر گزر اوقات کی کوشش کی۔ تمام گھوڑے تباہ ہو گئے۔ اور اعلیٰ ترین افسروں کو پیدل چلنا پڑا۔ ہر منزل پر بڑی تعداد میں گھوڑے اور لوگ جاں بحق ہو جاتے۔ دہشت انگیز رن کو عبور کر لینے کے بعد وہ بالوؤں کے ایک ایسے ریگستان میں داخل ہوئے جہاں کسی شکل میں بھی زندگی کا کوئی امکان نہ تھا۔ نہ گھاس، نہ جھاڑیاں نہ پرندے اور نہ درخت، بہرحال بارش کے چھینٹوں نے ان کی زندگی بچائی اور زندہ بچ جانے والے لوگ کسی نہ کسی طرح گجرات پہنچے۔

---

(1) ابراہیم شاہ عالم ہندستانی صوفیاء کے سہروردی مسلک کے بانی، شیخ بہاء الدین زکریا کے شاگرد اور جانشین (خلیفہ) تھے)۔ ٹھٹھہ میں شاہ عالم کی قبر کی ہر زمانہ میں تعظیم کی گئی ہے۔

دہلی میں فیروز شاہ اور اس کی فوج کے متعلق چھ ماہ تک کوئی سرکاری اطلاع نہ مل سکی۔ اس کا سہرا خان جہاں کے سر ہے کہ اس نے حکومت کو برقرار رکھا۔ وہ دہلی کی اس طرح سیر کرتا گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس نے تمام بیش بہا اشیاء شاہی محل سے لے لیں اور انہیں حفاظت کے لیے خود اپنے گھر پر رکھا۔ اس نے بالآخر ایک جعلی فرمان تیار کیا اور اس کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ بادشاہ بخیر تھا اور فتحیاب ہوا تھا اور اکیس دنوں کی ایک جشن کا حکم دیا۔ اس کے بعد فوج کی کلفتوں کے بیان کا ایک حقیقی فرمان اس کے پاس آ پہنچا۔

گجرات کا گورنر اور امیران کا بیٹا، نظام الملک امیر حسین فیروز شاہ کی بہن کا شوہر تھا وہ بڑے اچھے ڈھنگ سے اپنا کام انجام دیتا آرہا تھا اور یہ اس کا ایک بڑا کارنامہ تھا کہ اس نے گجرات کے خزانہ میں دو کروڑ ٹنکے جمع کر رکھے تھے۔ لیکن اس نے فیروز اور اس کی بدنصیبیوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ لہٰذا فیروز فطری طور پر رنجیدہ خاطر تھا۔ فیروز نے اس سے کہا کہ ”اگر تم میری فوج کی مدد کے لیے آتے اور مجھے قسط اور غلے بھیجتے رہتے تو میرے سپاہی تباہی کا شکار نہ ہوتے۔ امیر حسن کو دہلی بھیج دیا گیا۔ اس کو وہاں منتظر رہنا تھا تاکہ جیسے ہی کوئی اعلیٰ عہدہ خالی ہو اس کی تقرری کر دی جائے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیروز نے عارضی طور پر گجرات کی حکومت خود اپنے ہاتھوں میں رکھی۔ خزانہ کے دو کروڑ ٹنکے فوج کو از سر نو مسلح کرنے پر خرچ کر دیے گئے۔ ان سپاہیوں کو جنہیں لگان تفویض کیے گئے، شاہی خزانہ سے لے کر ایک ہزار تک ٹنکے قرض دیے گئے۔ خان جہاں نے شاہی کارخانوں کی ایسی اشیاء کی رسد کے ذریعے فیروز کا تعاون کیا جن کی مقامی طور پر فراہمی ممکن نہ تھی۔ عفیف لکھتا ہے کہ بھیجے گئے صرف ایک قسم کے ہتھیار کی قیمت 70 لاکھ تھی۔ لیکن فیروز شاہ کے بیشتر سپاہیوں نے مسلح ہونے کے بعد گھر واپس ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ فیروز، ان مصائب کے پیش نظر جو انہوں نے برداشت کیا تھا، انہیں روانہ ہونے سے باز رکھنے کے لیے فوجی چوکیاں (تھانہ) قایم نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے دہلی کو یہ احکامات بھیجے کہ ان سپاہیوں اور

---

(1) نوٹ: Stocks یہ سزا دینے کا ایک طریقہ تھا جس میں مجرم کو ایک کاٹھ کے ڈھانچہ میں کھڑا کر دیا جاتا اور اس کے ہاتھوں یا پاؤں کو اس ڈھانچے میں بنے سوراخوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔

افسروں کو براہ راست ریاست کی ملازمت میں تھے "اخلاقاً سزائیں" (تدارک معنوی) دی جائیں۔ ان کو Stocks میں ڈال دیا جائے اور بازاروں میں ایک یا دو دنوں تک ان کی تشہیر کی جائے۔ لیکن ان کی تنخواہوں اور تفویض لگان میں کسی طرح کا ردو بدل نہ کیا جائے۔

گھوڑا سواروں کے فرار نے، جن کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے، یقیناً فیروز کی فوج کو کمزور کر دیا۔ اور وہ دوسری مہم کی ٹھنی ہوئی لڑائی میں اپنی کامیابی پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ظفر خاں کو گجرات کا گورنر مقرر کر دیا گیا گرچہ مہم کے دوران اس سے فوج کے ساتھ خدمت انجام دینے کا حکم دیا گیا۔ علاؤالدین حسن گنگو، جس نے دولت آباد میں بغاوت کی تھی، کے داماد بہرام خاں نے فیروز کے پاس مدد کی اپیل کرتے ہوئے قاصدوں کو بھیجا لیکن فیروز نے جواب دیا کہ وہ اس وقت تک کسی دوسرے کام پر توجہ نہ دے سکتا تھا جب تک کہ ٹھٹھہ فتح نہ ہو جائے۔

جب فیروز نے سندھ کے مشرقی کنارے پر اپنی فوجوں کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوا تو وہاں کے باشندے حیرت میں پڑ گئے۔ وہ فصلیں جو انہوں نے بوئی تھیں کٹنے کے لیے تیار تھیں لیکن نہایت خوفزدہ ہو کر انہوں نے سندھ کے مشرقی کنارے کو چھوڑ دیا اور دریا کے اس پار مغربی کنارے پر بھاگ گئے اور فصلیں کھڑی کی کھڑی چھوڑ دیں۔ دریا کے مشرقی کنارے پر متعدد گاؤں تھے۔ ان گاؤں پر اور غالباً ٹھٹھہ کے مشرقی شہر پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ دہلی کی فوج نے ان فصلوں کو کاٹ لیا جن کو سندھیوں نے بویا تھا۔ غلوں کی قیمتیں جو پہلے فی پسیری آٹھ یا دس جتل تھیں، فصلوں کے کٹنے کے بعد مزید گر گئیں، تقریباً چار ہزار سندھیوں کو جو واپس بھاگ نہ سکے تھے، اکٹھا کیا گیا اور راشنوں پر رکھا گیا۔ فی کس فی دن تین سیر موٹا اناج۔

لیکن مغربی کنارے پر بڑے ٹھٹھہ (کے شہر) تک کیسے پہنچا جائے؟ ٹھٹھہ والوں نے فیروز شاہ کی کشتیوں پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ تقریباً اسی کروہ تک سندھ کے تمام گھاٹوں پر قابض تھے۔ بہت بحث و مباحثہ کے بعد فیروز نے عماد الملک بشیر اور ظفر خاں

---

(1) بھکو، دریائے سندھ میں سکر اور روہڑی کے درمیان کا جزیرہ ہے جس پر ایک قلعہ ہے (ریاض الاسلام)

کو حکم دیا کہ وہ 120 کروہ شمال میں جا کر بھکر کے مقام پر سندھ کو عبور کریں۔ اور تب مغربی کنارے پر اتنی ہی دور واپس جا کر شمال سے مغربی ٹھٹھہ پر حملہ کریں۔ ان دونوں افسروں نے احکامات کی تعمیل کی لیکن جنگ کے دن فیروز شاہ، جو دریا کے اس پار سے صرف ٹھٹھہ کے قلعہ اور فوجوں کے ذریعے اٹھنے والی گرد ہی کو دیکھ سکتا تھا، کشمکش کے نتائج سے سخت مضطرب ہو گیا کیونکہ اس کی فوج مصائب کا شکار ہو کر کمزور اور فرار و غداری کی وجہ سے مختصر ہو چکی تھی۔ رات کو اس نے ایک کشتی میں ایک ملک کو بھیجا اور عماد الملک اور ظفر کو اسی راستہ سے جس سے وہ گئے تھے واپس ہو جانے کا حکم دیا۔ احکامات کے تابع دونوں جنرل 480 کروہ کے ایک نہایت غیر سود مند سفر کے بعد فیروز کے خیمہ میں واپس آ گئے۔

فیروز بطور خود اپنی بہادری پر خوش تھا اور اظہار تفخر کیا۔ (لیکن) ٹھٹھہ والے خود اپنے متعلق کیا سوچتے تھے؟ وہ اس وقت تک خیمہ زن رہے گا جب تک وہ ہتھیار نہ ڈال دیں۔ اگر ضروری ہوا تو وہ وہاں ایک شہر کی تعمیر بھی کر سکتا تھا۔ زیادہ مفید مطلب بات یہ تھی کہ اس نے تازہ دم فوجوں کے لیے ملک بشیر کو خان جہاں کے پاس بھیجا اور خان جہاں نے حتی الامکان مختصر مدت میں شاہی فوج کے ان تمام سپاہیوں کو اکٹھا کیا جو لاہور سے لے کر بہار اور ترہت تک متعین تھے اور ان کو بشیر کی سرکردگی میں فیروز کے پاس روانہ کیا۔ بالآخر حالات فیروز کے موافق ہو گئے۔ ٹھٹھہ میں قحط سالی کی بنا پر غلوں کی قیمت فی سیر ایک یا دو ٹنکہ تک بڑھ گئی اور ٹھٹھہ والے مصائب کا شکار ہو کر اپنی اپنی کشتیوں میں دریائے سندھ عبور کر کے فیروز شاہ کے مطیع ہونے لگے۔ یہاں بہینہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے کہ اب وہ مزید جنگ نہیں کر سکتے لہٰذا انہوں نے اچھ کے مشہور صوفی سید حسین بخاری سے اپیل کی، سید، فیروز شاہ کے خیمہ میں آیا۔ سلطان اور سپاہیوں کے ذریعہ ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور راجام اور بہینہ کے ساتھ حتیٰ الامکان بہتر تعلقات کی ضمانت حاصل کر لی۔ ظاہر ہے کہ ملک کو ان کے اختیارات میں چھوڑ دینا فیروز کے لیے ناممکن تھا۔ لیکن اس نے ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا۔ جب انہوں نے اس زمانہ کے مروجہ دستور کے مطابق غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے تو وہ انہیں دہلی لے آیا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے سالانہ دو لاکھ ٹنکوں کا ایک وظیفہ مقرر کر دیا

اور انہیں دہلی کے سرائے ملکہ نامی ایک جگہ پر بسا دیا۔ بعد میں لوگوں نے اس جگہ کا نام سرائے ٹھٹھہ رکھ دیا۔ بنھیہ سے کسی قسم کی خدمت کا مطالبہ نہیں کیا گیا سوائے یہ کہ جب کسی خاص موقع پر دربار منعقد ہو تو وہ حاضر رہے۔ لیکن یہاں ایک انوکھی رعایت کے طور پر اسے شاہی تخت کے داہنے بازو میں دوسری قالین پر چہار زانو ہو کر بیٹھنے کی اجازت تھی۔ نشیبی سندھ کی حکومت فیروز شاہ نے جام کے ایک لڑکے اور بنھینہ کے بھائی تماچی کے سپرد کر دی۔ انہوں نے شکرانے کے طور پر چار لاکھ کی ادائیگی اور آئندہ سالوں میں خراج کے طور پر چند لاکھ ٹنکے بھیجنے کا وعدہ کیا، کچھ دنوں کے بعد تماچی نے بغاوت کر دی اور جام نے، جسے فیروز نے سندھ بھیجا تھا، تماچی کو گرفتار کر لیا اور اسے دہلی بھیج دیا۔ بنھیہ فیروز کی موت کے بعد دہلی ہی میں رہا۔ تغلق شاہ دوم نے اسے سندھ واپس جانے کی اجازت دے دی لیکن راستہ ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

فیروز شاہ ڈھائی سالوں کے بعد دہلی واپس لوٹا۔ چند گھروں میں خوشیاں منائی گئیں تو چند گھر ماتم کناں تھے۔ فیروز نے کہا "زیادہ بہتر ہوتا کہ میں ٹھٹھہ نہ گیا ہوتا۔" عفیف کے مطابق اس نے ان سپاہیوں کے سلسلہ میں جو مہم پر گئے تھے مندرجہ ذیل ہدایات جاری کیں۔

"ان تمام اشخاص کی جاگیریں، جو ٹھٹھہ یا کچھ کے رن میں مر چکے ہیں، ان کے ورثاء کے لیے ضروری اور غیر مشروط طور پر برقرار رہیں گی۔ انہیں کسی بھی طرح پریشان نہ کیا جائے گا اور اس معاملہ کو میرے سامنے دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے، جنہوں نے گجرات میں ساٹھ فیصد لے کر اور اس کے بعد دہلی واپس بھاگ کر میری مخالفت کی تھی، ان کی تنخواہیں اور جاگیریں بھی برقرار رہیں گی۔ میں کسی شخص کو کسی شکایت کا موقع دینا نہیں چاہتا۔"

طاس گھڑیال

عفیف کے مطابق[1] فیروز شاہ نے ہیئت دانوں کی مدد سے طاس گھڑیال تیار کرایا۔ یہ دھات کا ایک پیالہ تھا جس کا پیندا چھیدا ہوا تھا۔ جب اسے پانی کے ایک ٹب میں رکھا جاتا تو وہ بھر جاتا اور ایک گھڑی یا ۲۴ منٹ کے بعد ڈوب جاتا۔ جب ایسا ہوتا تو

---

(1) عفیف، ص: 254-67

گھنٹی کے بجنے سے لوگوں کو اطلاع ہو جاتی۔ ہر چار گھنٹوں (یاس) کے بعد ایک گجر یا دو گھنٹی بجتی۔ دھات کے پیالے کی غلطیوں کو ایک دھوپ گھڑی کے ذریعے درست کر لیا جاتا۔ پیالہ اور اس کے ٹب گھنٹی اور دھوپ کے ڈائیل کو قصر فیروز آباد کے دروازے کے اوپر رکھا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے تعین کا یہ طریقہ بہت مقبول ہو گیا تھا۔

معبر سے قاصدین بکا کے خلاف، جس نے ان کے شہر پر مع وہاں کی مسلم عورتوں کے قبضہ کر لیا تھا، فیروز سے مدد طلب کرنے آئے لیکن فیروز شاہ نے انہیں یاد دلایا کہ اس کی جانشینی کے وقت انہوں نے بہمنی سلطنت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا بہر حال اب اس وقت اس کے سپاہی ایک دور دراز کی مہم کے بعد بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے۔ دکن پر حملہ کرنے کا خیال فیروز کے ذہن پر بہت دنوں سے سوار تھا۔ لیکن خان جہاں اب مکمل طور پر اسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ بہمنوں کے خلاف ایک مہم قرین مصلحت نہ ہو گی۔

'غلاموں' کا جمع کرنا

جس توجہ اور انہماک کے ساتھ فیروز شاہ نے غلاموں کو جمع کیا اس کے ذکر کے سلسلہ میں عفیف نے قرآن شریف کی اس آیت کی نقل پیش کی ہے، ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو مفید سمجھو اور وہ تمہارے لیے مضر ہو، پہلے تو اس نے اپنے گورنروں کو یہ ہدایت دی کہ جب (لگان کے حصول کے سلسلہ میں) وہ کسی علاقہ پر حملہ کریں تو چنیدہ، خوبصورت اور اچھے خاندان کے کمسن لڑکے اس کے لیے حاصل کیے جائیں۔ گورنروں کو اس بات کا بھی خیال رہتا کہ (بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے جاتے وقت) وہ صاف ستھرے ہوں اور عمدہ کپڑوں میں ملبوس ہوں۔ پہلے زمانہ میں گورنر، بادشاہ کو اپنی حیثیت کے مطابق تحائف پیش کرتے تھے اور یہ توقع کی جاتی کہ ان کی ترقی اور تبادلے کے وقت بادشاہ ان (تحائف) کا خیال رکھے گا۔ فیروز نے اب ایک عام حکم صادر کر دیا کہ گورنروں کے پیش کردہ تحائف کی قیمتوں کا اندازہ کیا جائے اور اسی کے مطابق ان سے مطلوبہ رقموں میں تخفیف کر دی جائے لیکن چونکہ فیروز شاہ کا مرغوب

تحفہ غلام تھے اس لیے گورنروں نے غلاموں کو (بطور تحفہ) لانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد ایک لاکھ اسّی ہزار ہو گئی۔ تمام عہدوں کو وراثتی بنا دینے کے بعد، ممکن ہے کہ فیروز یہ چاہتا ہو کہ ایسی جماعت تیار کی جائے جو اس کی اور اس کے وارثوں کی وفادار ہو۔ مگر یہ صرف ایک مفروضہ ہے۔ جو بات ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ فیروز اپنے ہر غلام کو اس کی صلاحیت کے مطابق درجہ اور تنخواہ دینا چاہتا تھا۔ ان حالات کے تحت اکثر والدین اپنے بیٹوں کو فیروز شاہ کی خدمت میں بطور غلام تربیت پانے کو پیش کرنا چاہتے ہوں گے۔ اس طرح کی غلامی کسی بھی طور پر قانون نہ تھی۔ خوش قسمت غلام امراء کو دیے جاتے تھے۔ جن کو یہ حکم تھا کہ وہ ان غلاموں کی تربیت اپنے بیٹوں کی طرح کریں اور سال میں ایک بار انہیں دربار میں پیش کیا کریں۔[1] دوسرے درجے کا خوش قسمت گروپ تعلیم دیے جانے کے لیے چنا جاتا تھا اور بعض کو حج کے لیے بھی بھیجا جاتا تھا۔

غلاموں کے لیے ایک علاحدہ محکمہ تشکیل کیا گیا، جو وزارت کے تحت نہیں تھا۔ لہٰذا ان (غلاموں) کے علاحدہ مجموعہ دار، افسران اور خزانے تھے۔ بعض غلاموں کو صوبائی صدر مقاموں میں بھیجا گیا اور بعض کو دہلی میں رکھا گیا۔ غلاموں کو سپاہیوں کی طرح یا تو زمین کے لگان کے کچھ حصہ کی تفویض کے ذریعے یا نقد تنخواہ دی جاتی۔ ان کی تنخواہیں دس سے لے کر سو ٹنکوں تک تھیں۔[2] کوئی غلام دس ٹنکوں سے کم نہیں پاتا تھا ان کی تنخواہیں بلاناغہ ہر تیسرے، چوتھے یا چھٹے مہینے خزانہ سے ادا کی جاتی۔ تقریباً 12 ہزار غلاموں کو مختلف پیشوں اور دستکاریوں کی تعلیم دی گئی۔ تمام محکموں اور کارخانوں میں غلام پائے جاتے تھے لیکن اس تنظیم کا اصل مرکز چالیس ہزار غلاموں کی وہ تعداد تھی جو شاہی محل کی حفاظت کرتے تھے۔ ان لوگوں میں سربراہ مملکت کی وفاداری کے بغیر ایک جذبہ یکجہتی پیدا ہو گیا۔ عفیف لکھتا ہے کہ ”الحمد اللہ چونکہ ازل سے یہ مقسوم ہو گیا تھا کہ فیروز کی وفات کے چند سالوں بعد ہی دہلی کے مختلف گروہ آپس میں لڑنے لگیں گے (اس لیے) یہ مصیبت لوگوں پر غلاموں کے ذریعے نازل

---

(1) عفیف، ص: 267-73

(2) سیاق سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنخواہیں سالانہ تھیں۔

ہوئی۔ بالآخر غلام اتنے بیباک ہو گئے کہ انہوں نے بلا تامل فیروز کے خاندان کے شہزادوں کے سر قلم کر لیے اور دربار کے دروازے پر لٹکا دیے۔

بعد کی تعمیرات، اشوک کی لاٹیں[1]

1367ء میں دہلی واپس ہونے کے بعد فیروز شاہ نے سرحد سے باہر (کی مہموں پر) کوچ کا ارادہ ترک کر دیا اور شکار کے ذریعے تفریح طبع کی جن میں اس کے افسر اور غلام شریک ہوتے۔ شکار کے ان پروگراموں کی تفصیل یہاں پر پیش نہیں کی جا سکتی لیکن سرسری طور پر اس زمانہ کی بدعنوانیوں کی علامت کی حیثیت سے ہم یہ بات نوٹ کر سکتے ہیں کہ کوئی بھی کاریگر اس وقت تک بادشاہ کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا جب تک کہ رئیس شہر رشوت (خدمتی) لے کر اجازت نامہ نہ دے دے۔

فیروز شاہ کے قایم کیے ہوئے نئے شہروں میں عفیف فیروز آباد، ہرنی کھیرا، تغلق پور سیدم اور تغلق پور کاسنہ[2] کا ذکر کرتا ہے۔ مبارک شاہی میں درج ہے کہ "1385ء (787ھ) میں اس نے بدایوں سے 7 کروہ کے فاصلہ پر واقع بیولی نامی ایک گاؤں میں ایک قلعہ بنوایا اور اس کا نام فیروز پور رکھا۔ لیکن لوگ اسے اخریں پور (آخری شہر) کہتے ہیں۔ فیروز تغلق کے بنائے ہوئے 9 محلوں یا کوشکوں[4] کی فہرست عفیف نے دی ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون ٹھٹھہ کی مہم کے بعد بنائے گئے تھے۔ اس نے بادشاہ کے حکم سے بنائے گئے سات باندھوں[5] (Dams) کی فہرست بھی دی ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ ضرورت کے مطابق دوسری جگہوں پر بھی

---

(1) اشوک کی لاٹ کے سلسلے میں عفیف ص: 31-329 اور ص: 21-305

(2) دو تغلق پوروں کا ذکر شاید کاتب کی غلطی کی بنا پر ہے۔

(3) مبارک شاہی، ص: 135

(4) کوشک فیروز آباد، کوشک نزدل، کوشک مہندواری، شہر حصار فیروزہ کا کوشک کوشک فتح آباد کوشک جون پور، کوشک شکار، کوشک بند فتح خاں اور کوشک سالوہ۔ کوشک نزول شاید فیروز آباد کے سامنے جمنا کے کنارے پر کوئی چھوٹا سا محل تھا۔ شکار کے سفر کے واپسی کے بعد فیروز یہاں پر ٹھہرا کرتا تھا۔ اور اسی اثنا مین شاہی محل کو اس کی رہائش کے لیے آراستہ کیا جاتا۔

(5) بند فتح خاں، بند مالوہ، بند عالیپور، بند شکر خاں، بند سالوہ، بند سہنیہ اور بند وزیر آباد۔

مضبوط باندھ بنائے گئے۔ فیروز نے خانقاہیں اور سرائیں بھی بنوائیں جن کے اخراجات ریاست کے ذمہ تھے۔ روایتاً ایک مسافر کسی سرائے میں تین دنوں تک مفت طعام و قیام کا مستحق تھا اور بذلہ سنج لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ بادشاہ نے دہلی اور فیروز آباد میں 12 سرائیں بنوائیں اور اس طرح ایک مسافر اپنی جائے رہائش کو بدل بدل کر سال بھر مفت میں گزارہ کر سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ فیروز کا محکمہ تعمیرات عامہ ایک بہت بڑی تنظیم ہوگی۔ ہر قسم کے کاریگروں کو اکٹھا کرنا ہوتا ہوگا اور کاریگروں کے ہر گروہ کا اپنا ایک شحنا ہوتا تھا۔ بڑے عہدیداران یہ تھے۔ غازی ملک محکمہ کا نگراں اور عبدالحق عرف جایر سوندھر، عفیف جس کی قسمت میں ان تمام عمارات کو برباد ہوتے دیکھنا لکھا ہوا تھا، یہ تبصرہ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ "عمارتوں پر لاکھوں ٹنکے خرچ کیے گئے۔" درحقیقت بے اندازہ حد تک روپے برباد کیے گئے۔"

فیروز کے زمانہ میں اشوک کی دو لاٹیں دریافت ہوئیں۔ ان میں سے بڑی لاٹ دہلی سے 90 کروہ پہاڑیوں کے دامن میں واقع سالورہ اور خضر آباد شق (ضلع) کے نویدا نامی گاؤں میں تھی۔ اور چھوٹی لاٹ میرٹھ شہر کے نزدیک۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ان کی نوعیت کیا تھی لیکن اس نے ان کو دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بڑی سنگی لاٹ جس کو فیروز 'منارہ زریں' کہتا تھا، کو کس طرح دہلی لاکر نصب کیا گیا اس کا کچھ اندازہ عفیف سے ہمیں دستیاب ہے۔ معمولی مزدوروں سے لے کر کاریگروں اور اعلیٰ درجہ کے انجینئروں تک ہزاروں آدمی (اس کام کے لیے) بھرتی کیے گئے۔ لاٹ کے گرد کچا چمڑا اور گھاس لپیٹی گئی تاکہ وہ ٹوٹ نہ جائیں۔ اس کی نیو کھودنے پر پتہ چلا کہ ایک چوکور پتھر میں سوراخ بنا کر لاٹ کو مضبوطی سے جمایا گیا تھا۔ اس (نچلے) پتھر کو بھی کھودا گیا اور لاٹ کے ساتھ لایا گیا۔ لاٹ کے نزدیک درختوں کے تنوں کو جمع کیا گیا اور ان تنوں کے ڈھیر پر روئی جمع کر دی گئی۔ لاٹ کو آہستہ آہستہ تنوں پر لٹایا گیا اور تب ایک ایک کر کے ان تنوں کو علیحدہ کیا گیا۔ اور لاٹ کو 12 پہیوں والے ایک چھکڑے پر منتقل کر دیا گیا۔ ہر پہیہ کو ۲۰۰ لوگوں نے رسی سے کھینچا اور اس طرح اس کو جمنا کے کنارے تک لائے۔ اس زمانے میں جمنا رسل ورسائل کا ایک اہم ذریعہ تھی۔ اور دو ہزار سے لے کر پانچ ہزار ستون تک غلے لے جانے کے لیے کشتیاں دستیاب تھیں۔ اس طرح کی بڑی

بڑی کشتیاں ایک ساتھ باندھی گئیں اور لاٹ کو ان پر رکھ کر فیروز آباد لایا گیا۔ لاٹ کو نصب کرنے کے لیے وہاں ایک خاص عمارت تیار کی گئی۔ لاٹ کو سیدھا کھڑا کرنے اور پھر عمودی طور پر اوپر اٹھانے کے لیے لکڑی کی بنی چرخی کو استعمال کیا گیا۔ کثیر تعداد میں مزدوروں کے استعمال کے ذریعے فی دن نصف گز کی رفتار سے لاٹ کو اوپر اٹھایا گیا، جوں جوں لاٹ کو اوپر اٹھایا گیا توں توں عمارت کو بھی اونچا بنایا گیا بالآخر لاٹ کو اس عمارت کی چوٹی پر نصب کیا گیا۔ عفیف، جس کی عمر اس وقت بارہ سال تھی، لکھتا ہے کہ لاٹ 32 گز لمبی تھی جس میں سے 24 گز (کا حصہ) زمین کے اوپر تھا اور 8 زمین کے نیچے۔ لاٹ کے کھلے ہوئے حصہ کی پیمائش کی جا سکتی ہے اور یہ 37 گز ہے لہٰذا فیروز کے زمانے کے گز کی لمبائی 54.18 انچ ہوتی ہوگی۔

دوسری لاٹ پہاڑی پر واقع کوشک شکار میں نصب کی گئی۔ اس کے پانچ ٹکڑے ہو گئے تھے جن کو اب اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اس کی لمبائی 32 3/4 فٹ ہے۔

کارخانے، باغات، مسلمانوں[2] کے درمیان رفاہ عامہ کے کام

فیروز شاہ کے 36 کارخانے تھے جو راتبی اور غیر راتبی دو قسموں کے تھے۔ راتبی کارخانے آدمیوں اور جانوروں کی خوراک مہیا کرتے تھے اور غیر راتبی کارخانوں کا تعلق ان اشیاء سے تھا جو آدمیوں کی محنت سے تیار کی جاتی تھیں۔ عفیف لکھتا ہے کہ اس کا باپ اور چچا علم خانہ (شاہی جھنڈے اور علامات بنانے سے متعلق (کارخانہ) رکاب خانہ (گھوڑوں کے ساز و سامان سے متعلق (کارخانہ) اور بائیں بازو کے ہاتھیوں کے اصطبل کے مہتمم تھے اور وہ ان کی ماتحتی میں کام کرتا تھا۔ راتبی کارخانوں میں صرف غذا کے سامان کی فراہمی پر ایک لاکھ ساٹھ ہزار تنکہ فی مہینہ خرچ ہوتا تھا۔ اس رقم میں ان افسروں اور نوکروں کی تنخواہیں شامل تھیں جو (اس کارخانہ

---

(1) ہوڈی والا اسٹڈیز، ص: 330-31

(2) نوٹ:- ذیلی سرخی میں 'مسلم' کی یہ تخصیص بہت مناسب نہیں معلوم ہوتی، چونکہ متن میں تین قسم کے رفاہ عامہ کے کاموں کا ذکر ہے۔ اس میں سے صرف ایک (نمبر 3) کا تعلق مسلمانوں سے تھا۔ بقیہ دو (نمبر 1 اور 2) سے غیر مسلم بھی مستفیض ہو سکتے تھے۔ عفیف نے بھی ان کا ذکر الگ الگ جگہوں پر کیا ہے۔ (مترجم)

میں) کام کرتے تھے۔ دوسرے کارخانوں میں صرف ہونے والی رقموں کی یہ تعداد عفیف نے دی ہے۔ جم دار خانہ 6 لاکھ ٹنکہ صرف سردی کے کپڑوں کے لیے، علم خانہ 18 ہزار ٹنکے سالانہ (تنخواہوں کے علاوہ) فرش خانہ (قالینوں کے لیے) 2 لاکھ ٹنکے۔

کارخانوں کا انتظام رسمی طور پر بڑے بڑے خانوں اور ملکوں کے ذمہ تھا لیکن ہر کارخانہ کا واقعی اختیار ایک متصرف (نگراں) کے سپرد تھا جس کی تقرری خود فیروز شاہ کرتا تھا۔ تمام کارخانوں کا متصرف خاص یا عام نگراں ابوالحسن تھا اور تمام احکام پہلے اس کے پاس بھیجے جاتے تھے۔ عفیف نے فیروز شاہ کے اس قول کی نقل پیش کی ہے "جس طرح صوباؤں میں لاکھوں (ٹنکوں کی مالیت) کا لگان وصول ہوتا تھا اسی طرح کارخانوں میں (کے ذریعے) لاکھوں کی رقم جمع ہوتی تھی۔ میرے ایک کارخانہ کی بکری یا کاروبار کی رقم (Turn-Over) (تصرف) ملتان کے تصرف سے کم نہیں۔"[1]

کارخانوں کے اپنے علیحدہ دیوان ہوتے تھے، (محکمہ) وزارت جہاں ان کارخانوں کے حساب پیش کیے جاتے تھے ان کی جانچ پڑتال میں اسی طرح کی سست اور غیر موثر تھا، جس طرح کے اقطاعات کی آمدنی کے حساب میں۔ ہر کارخانہ میں حاشیہ (بدعنوانی اور ناجائز اخراجات) کی کافی گنجائش تھی۔ عفیف بار بار دہراتا ہے کہ فیروز شاہ کی 38 سالہ حکومت کے دوران صوبوں یا کارخانوں کی آمد و خرچ کا 'حساب' کبھی بھی صحیح طور پر نہیں ہوا تھا۔ عفیف تبصرہ کرتا ہے کہ یہ بات نہیں کہ فیروز شاہ کے اصولوں سے ناواقف تھا وہ ان سے بخوبی واقف تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن چشم پوشی کی راہ اختیار کرنا اس نے بہتر سمجھا۔ اس لیے اہل محاسبہ (Auditors) نے بھی عمال کی بدعنوانیوں کی گرفت نہ کی؛

عفیف کے مطابق فیروز شاہ کو باغات خصوصاً پھلوں کے باغات لگانے کا بہت شوق تھا۔ اس زمانہ میں صرف دہلی کے مضافات میں 12 ہزار پھلوں کے باغات تھے۔ لیکن فیروز شاہ نے دوسروں کے ملک پر قبضہ نہیں کیا۔ ساری سلطنت میں اس کے (نصب کردہ) پھلوں کے باغات تھے اور باغبانوں کے حصہ کو علیحدہ کرنے کے بعد ان کی کل آمدنی ایک لاکھ اسی ہزار ٹنکے تھی۔ یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ

---

(1) عفیف، 295-96

اس زمانہ میں دہلی کے آس پاس علاقہ میں انگور اگائے جاتے تھے۔ اور انگوروں کی بیلیں اتنے بڑے پیمانہ پر لگائی جاتی تھیں کہ وہ فی سیر ایک جتل کے نرخ سے بکتے تھے۔

اس موقع پر فیروز تغلق کے چند رفاع عامہ کے کاموں کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

(1) بے روزگاری: فیروز نے دہلی کے کوتوال نیک آدمی کو حکم دیا کہ اس کے پاس ایسے آدمیوں کو پیش کرے جو نوکری کے طلبگار تھے۔ کوتوال نے حکم محکموں کے ذمہ دار افسران تک پہنچا دیا، فیروز (بلکہ اس کے ذریعے اس کام کے لیے مقرر کیے ہوئے افسران) کے ذریعے اس بات کی کوشش کی گئی کہ نوکری کے طلبگار لوگوں کے لیے کچھ انتظام کیا جائے۔

(2) شفاخانہ: فیروز نے کئی شفاخانے اس طرح کے بنوائے جہاں لوگوں کا مفت علاج کرنے کے لیے طبیب مقرر تھے۔

(3) شادی کا دفتر (بیورو): یہ صرف مسلمانوں کے لیے تھا۔ شادی کے سن کو پہنچی ہوئی لڑکیوں کے ضرورتمند والدین کو (اگر ذمہ دار افسر کی رضامندی حاصل ہو) 50، 30 اور 25 ٹنکوں کی یکمشت رقم ان کی ضرورت یا خاندانی حیثیت کے مطابق دی جاتی تھی۔

قیمتیں اور اجرتیں

عفیف اور دیگر لوگ جن کی باتیں اس نے قلم بند کی ہیں بار بار یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فیروز شاہ کے عہد حکومت میں کبھی بھی واقعی طور پر قحط نہ پڑا اور نتیجتاً کسانوں اور کاریگروں کی محنتوں کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہوا اور بعض خوش قسمت لوگ جن کو لگان تفویض کیے گئے تھے کی آمدنی دس گنا تک بڑھ گئی۔ عفیف غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے کہ 'دوآب میں مسکرودہ؟ اور کرمہ؟ کی پہاڑیوں سے لے کر کوئل تک کوئی بھی ایسا گاؤں نہ تھا جس کو نام نہادی طور پر غیر آباد کیا جاسکے۔ اور ایک ہاتھ زمین بھی غیر مزروعہ باقی نہ بچی۔ اس زمانہ میں دوآب کے علاقہ میں 52 خوش حال پرگنے تھے، دوآب کے باہر علاقوں میں بھی یہی حال تھا۔ ہر اقطاع یا شق میں (مثلاً

سامانہ) ہر کروہ پر چار گاؤں تھے اور ہر گاؤں میں خوشحال لوگ تھے[1]۔

فطری طور پر علاؤالدین کی حکومت سے ایک تقابلی جائزے کا خیال آتا ہے۔ چونکہ کسی بھی ہندستانی حکومت نے، خواہ دیگر میدانوں میں اس کے کارنامے کچھ بھی ہوں، قیمتوں اور اجرتوں کو ایک عام معمول پر۔ نرخ بر آوردہ یا اشیاء کی تیاری میں خرچ ہونے والی رقم اور محنت کی بنا پر طے کردہ نرخ برقرار رکھنے میں اس حد تک کامیابی حاصل نہ کی جتنی کہ اس خلجی سلطان نے۔ عفیف خود اقبال کرتا ہے کہ اس طرح کی خوشحالی کسی دوسرے بادشاہ کی حکومت میں نہ ہوئی۔ لیکن علاؤالدین کے زمانہ کی قیمتیں اس کی زبردست کوششوں کی وجہ سے تھیں۔ اس نے سوداگروں کو مالی مدد دی، ان کی تنخواہیں مقرر کیں اور ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ فیروز شاہ کے زمانہ کی ارزانی اس کی کوششتوں کی وجہ سے نہ تھیں بلکہ خدا کی مہربانی سے یا جیسا کہ موجودہ زمانہ کے لوگ کہیں گے امن کے زمانہ میں طلب اور رسد کے اصول (Law of Supply and demand) کی کارگیری کی وجہ سے۔ عفیف بعض بنیادی ضرورت کی اشیاء کی قیمتیں درج کرتا ہے۔ گیہوں 8 جتل فی من، بونٹ اور جو چار جتل فی من، گھی یا روغن ستور 1/2 2 جتل فی سیر، چینی 1/2 3 جتل فی سیر۔ عفیف کہتا ہے کہ جب بارش کم ہوتی تو غلہ کی قیمتیں ایک ٹنکہ فی من تک بڑھ جاتیں۔ بعد میں پھر قیمتیں گر جاتیں چونکہ اس زمانہ میں دراصل قحط نہ تھا۔

فی الحال ہمارے پاس صرف دو ماخذ ہیں جو دونوں عفیف سے قبل کے عہد کے ہیں۔ جن کی مدد سے ہم عفیف کے بیان کا ایک تقابلی جائزہ لے سکتے ہیں۔ انشاء ماہرو اور خیر المجالس یا شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات جن کو فیروز شاہ کی حکومت کے پہلے دہائی کے دوران حمید قلندر نے قلم بند کیا۔

ملتان کے گورنر عین ماہرو نے اپنے خط نمبر 20 میں یہ اعتراف کیا ہے کہ سپاہیوں کی حالت اتنی اچھی نہ تھی جتنی کہ علاؤالدین کے زمانہ میں وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کاریگروں نے اجرتوں کو علاؤالدین کے زمانہ کے مقابلے میں اس بنا پر آٹھ یا دس گنا

---

(1) عفیف ص ص 95-293 پر ملک عبد اللہ اقبال کرتا ہے کہ اس کو دیے ہوئے دو پرگنوں کی آمدنی (خراج و محصول) دس گنا بڑھ گئی تھی۔

بڑھادیا تھا کہ غلوں کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا۔ سوداگر اور کاریگر عام طور پر احتکار کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے، خاص طور پر گھی، کپڑے، چینی اور لکڑی کے سلسلے میں عین ماہر واس عربی کہاوت کی نقل پیش کرتا ہے کہ 'وہ پچاس میں خریدتے اور سو میں بیچتے تھے' علاؤالدین کے زمانہ میں ایک عمدہ گھوڑے کی زیادہ سے زیادہ قیمت 120 ٹنکے تھی۔ لیکن عین ماہر و نے جو حساب دہلی میں بھیجا تھا اس میں اس نے گھوڑوں کی قیمت 500 ٹنکے رکھی تھی۔ دیگر اشیاء کی قیمتیں بھی بڑھی ہوں گی۔

ہمارے دوسرے ماخذ کے سلسلے میں پروفیسر خلیق احمد نظامی خیر المجالس کے مولف لکھتے ہیں کہ 1 فیروز کے عہد کو عوام کے لیے امن اور فروانی کے ایک عہد کے طور پر عموماً پیش کیا گیا ہے۔ لیکن خیر المجالس ایک دوسرا تاثر پیش کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ کی حکومت کے اوائلی دور میں معاشی حالات بہت دشوار تھے۔ شیخ اکبر فیروز شاہ (جس کے نام کا ذکر نہیں کیا جاتا) کے دور کے حالات کا مقابلہ علاؤالدین کے زمانہ کے حالات سے کرتے تھے۔ ایک ایسے شخص کی حیثیت جو دونوں زمانہ میں دہلی میں رہا تھا اور ایک عام آدمی کے نقطہ نظر سے معاشی ڈھانچہ کو دیکھا تھا۔ ان کے تبصرات توجہ کے مستحق ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ علاؤالدین کے زمانے میں ہر طرح سے سستی تھی۔ ایک من گیہوں 1/2 7 جتلوں میں خریدا جا سکتا تھا اور اتنی ہی مقدار کی مصری نصف ٹنکہ میں معمولی چینی ایک جتل فی سیر کے حساب سے دستیاب تھی۔ کپڑے اور دیگر اشیاء بھی سستی تھیں۔ ایک لحاف چند ٹنکوں میں سلوائی جا سکتی تھی۔ دہلی میں کئی لنگر خانے تھے۔ مثلاً ملک یار بران کا لنگر، جہاں مفت کھانا تقسیم ہوتا تھا پھر اپنے زمانے (فیروز شاہ کا عہد) کا ذکر کرتے ہوئے شیخ کہتے ہیں کہ "ان دنوں نہ وہ لنگر دار اور نہ وہ لوگ باقی بچے ہیں۔ سب کے سب تباہ ہو چکے ہیں۔

دونوں دور کے حالات کا تقابلی جائزہ کرنے میں محمد بن تغلق کے عہد کے زبردست قحط کو فراموش کر دینا ناانصافی ہوگی۔ جب عین ماہر و یہ لکھتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں کم ہو گئی ہیں مگر اجرتیں نہیں تو شاید ماقبل عہد کے قحط کے زمانہ میں اعداد و شمار

---

(1) کے۔ اے نظامی، خیر المجالس کا فارسی متن، مطبوعہ شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا انگریزی دیباچہ ص 32

اس کے ذہن میں تھے۔ عفیف اور عین ماہر و دونوں ہی اعتراف کرتے ہیں کہ غلوں کی قیمتوں میں استحکام نہ تھا، گرچہ وہ (قیمتوں کے) اتار چڑھاؤ کے تواتر اور حدوں کے متعلق متفق نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ سوداگروں کے خلاف احتکار کا الزام لگانے میں عین ماہر و بالکل واضح ہے۔ عفیف جو کہ سلطنت میں جاری سرکاری بدعنوانیوں کے متعلق اتنا کچھ بیان کرتا ہے، سوداگروں کے طریقۂ احتکار اختیار کرنے کے متعلق لکھنا بھول جاتا ہے۔ شاید بھول کی وجہ سے۔ اگر ہم گھوڑوں کی قیمت، جو ایک ایسا معاملہ تھا کہ حکومت اس سے بے توجہی نہیں برت سکتی تھی، کے اعتبار سے اندازہ لگائیں تو علاؤالدین کی حکومت کے آخری دہائی کے مقابلہ میں فیروز شاہ کی حکومت کے وسط میں صارفین کے لیے اوسط قیمتیں تقریباً 5 گنا زیادہ ہو گئی تھیں۔

دہلی کی ناقابل تسخیر فوج کا زوال

قطب الدین ایبک کے زمانہ سے ہی مختلف دہلی سلاطین کی کوششوں اور توجہ نے دہلی کی فوج کو بہت مضبوط بنائے رکھا تھا۔ علاؤالدین نے غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کر کے محض عسکری صلاحیت اور ضبط و نظم پر توجہ دے کر اس کی (فوج کی) بنیادوں کو اور وسیع بنایا تھا۔ اور اس کے اور اس کے بیٹے مبارک شاہ کے زمانہ میں یہ ناقابلِ تسخیر بن گئی تھی۔ سلاطین دہلی کے کچھ قلعہ شمال مغربی سرحد پر تھے۔ لیکن رایوں کے برعکس سلاطین اپنے قلعوں کے استحکام پر نہیں بلکہ ایک جارحانہ آلہ کے بطور اپنی فوج کی ضرب کاری کی قوت (Striking power) اور تمام مخالفت کو کچل دینے اور کھلے ہوئے علاقوں پر قبضہ کر سکنے کی قوت پر بھروسہ کرتے تھے۔ ہندو رایوں کے برعکس دہلی کے سلاطین نے کوئی بھی بڑے قلعے (بطور آثار) نہیں چھوڑے۔ سوائے تغلق آباد کے جو مکمل نہ ہوا۔

دہلی کی فوج کی طاقت، عرض یا گھوڑا سواروں کے سالانہ معائنے کے اصولوں کی سختی کے ساتھ پابندی پر منحصر تھی۔ حکومت کے پاس اپنے گھوڑا سواروں کی تربیت کی جانچ کے لیے کوئی تنظیم نہ تھی۔ وہ انھیں صرف اس حالت میں ملازمت دیتی جبکہ وہ باضابطہ طور پر تربیت یافتہ ہوتے۔ فوج کا اہم ترین حصہ گھوڑا سواروں پر مشتمل تھا اور

جب کوئی شخص فوج میں بھرتی ہونا چاہتا تو اسے اپنے لیے ایک یا اگر ممکن ہو تو دو گھوڑے کا اور تمام ضروری اسلحوں کا، جن کا استعمال اسے سیکھنا ہوتا، انتظام کرنا پڑتا۔ جب اس کی تربیت ہو جاتی اور اسلحوں کا انتظام ہو جاتا تب وہ عرض کے موقع پر حاضر ہو سکتا تھا جہاں اس کے گھوڑے، اسلحے اور ان کو استعمال کرنے کی اس کی صلاحیت کی محتاط جانچ وزیر (نائب) عرض یا اس کے مقرر کردہ کسی افسر کے ذریعے کی جاتی۔ اگر حکومت کو اس کی خدمات کی ضرورت ہوتی اور وہ معیار پر پورا اترتا تو اسے اس کے گھوڑے اور اسلحوں کی قیمت اور ایک سال کی تنخواہ دے دی جاتی۔ گھوڑے پر ایک خاص نشان لگا دیا جاتا تاکہ اس کی نشان دہی ہو سکے کہ وہ سرکاری ملکیت تھی۔ اور گھوڑا سوار کا حلیہ یا چہرہ رجسٹر میں درج کر لیا جاتا تاکہ اس کی شناخت کی جا سکے۔ اگر حکومت کی خدمت گزاروں کے سلسلے میں سپاہی کا گھوڑا ضائع ہو جاتا تو حکومت اس کے عوض دوسرا گھوڑا دیتی۔ لیکن دیگر صورتوں میں (ضائع ہونے پر) نہیں۔ یہ عرض ایک سخت سالانہ آزمائش تھی جس پر فوج کی کارگزاری اور دراصل ملک کی موثر حکمت منحصر تھی۔

علاؤالدین اس معاملہ میں بہت سخت تھا۔ اور ان گھوڑا سواروں کو جو گھوڑوں کی قیمتیں اور اپنی تنخواہیں لینے کے بعد عرض کے موقع پر حاضر نہ ہوتے، واجبی سزا دی جاتی تھی۔ وہ سپاہیوں کو نقد تنخواہ دیتا تھا اور اس طرح فوج کی کمان اور برطرفی نائب عرض کے ہاتھوں میں مرکوز ہوتی۔ یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اس افسر کی سفارشات کو قبول کرے گا جس کے ہاتھ میں (فوج کی) واقعی کمان ہوتی۔ علاؤالدین کی فوج کا معیار مبارک شاہ اور تغلق شاہ نے قایم رکھا۔ سلطان محمد نے دکن کھودیا۔ لیکن وہ صحیح معنوں میں ایک فوجی تھا اور فوجی ڈسپلین میں کسی قسم کی ڈھیل کو اس نے گوارا نہ کیا۔

فیروز کی تخت نشینی کے ساتھ ہی حالات یکسر بدل گئے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے فیروز شاہ اور ملک کافور کی مہموں کا ایک مقابلہ ہی کافی ہے۔ اگر علاؤالدین کا کوئی افسر فیروز شاہ کی طرح غیر موثر طر پر کسی مہم کی قیادت کرتا تو وہ یقیناً برطرف کر دیا جاتا اور اسے سخت سزا دی جاتی۔ فیروز شاہ کے قوانین، جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، کسی بھی فوج کو یقیناً ناکارہ بنا دیتے۔ جب فیروز شاہ نے افسروں اور گھوڑا سواروں کے عہدوں

کو وراثتی بنادیا تو اس نے حکومت کا اپنے فوجی عملوں کی کارگزاری کی نگرانی کا بنیادی حق ختم کردیا۔ (اس کے) اثرات فوری طور پر ظاہر نہ ہوں گے لیکن فوجی عملے اور ان کے اخلاف کے مالی تحفظ کا خیال، جسے عفیف (اس نرم رویے کے جواز کے طور پر) پیش کرتا ہے، کسی طرح بھی ایسے نمایاں طور پر احمقانہ اقدام کی حمایت میں بطور دلیل پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایک تبصرہ، جسے عفیف وزیر جنگ عماد الملک بشیر سے منسوب کرتا ہے، سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ 80 فیصد گھوڑا سواروں کو زمین کے لگان کی[1] تفویض کے ذریعہ تنخواہ دی جاتی۔ کاغذی طور پر ملک کا سارا لگان فوج کو تفویض کردیا گیا تھا۔ عفیف کا بار بار دہرایا ہوا یہ بیان محض نام نہادی طور پر صحیح ہے۔ لیکن جب افسر یا گھوڑا سوار اطلاق نامہ (تفویض کا حکم) مقامی لگان وصول کرنے والے افسر کے پاس لے جاتا تو اسے تفویض شدہ نقد رقم کا 50 فیصد حکومت کے دیگر اخراجات کے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ اگر سپاہی دہلی یا کسی اور جگہ تعینات ہوتے تو وہ اپنے اطلاق ناموں کو ان کی ظاہری رقم کے تین فیصد حصہ نقد رقم کے عوض دلالوں کو بیچ سکتے تھے۔ یہ دلال عموماً اپنے ایجنٹوں کے ذریعے وہ 50 فیصد کا حصہ حاصل کرلیتے، جس کا حقدار وہ سپاہی ہوتے تھے۔ لہٰذا یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ گھوڑا سواروں کے واقعی گزارے کے قابل اجرت اس ظاہری رقم کا 30 فیصد حصہ ہوتی تھی جو اطلاق نامہ میں درج ہوتی۔ اس نظام نے کسی قسم کی جاگیرداری کو فروغ نہ دیا۔ اس کا مضر اثر اس بات میں تھا کہ سپاہیوں کے ورثاء، سپاہی باقی نہ رہے اور ایسے پنشن یافتہ بن بیٹھے جنھیں مخصوص گاؤں کے لگان (کے مقررہ حصول) پر حق حاصل تھا۔

فیروز شاہ کے انتقال کے بعد عہد کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ باغی گورنروں مقدموں اور ہندو سرداروں کی وجہ سے (حکومت) دہلی اب اس لگان کی وصولی نہیں کرسکتی تھی چونکہ فوج، جس کے خوف نے خراج و لگان کی ادائیگی کے لیے مطیع و فرمانبردار بنا رکھا تھا، بالکل غائب ہوچکی تھی۔ اطلاق نامہ پینشن یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں ردی کے ٹکڑے بن کر رہ گئے، وہ تمام عسکری صفات کھو بیٹھے تھے اور ایک مفلوک الحال مرکزی حکومت انہیں کچھ بھی نہیں دے سکتی تھی۔

---

(1) عفیف، ص 220، وایں طائفہ وجہ دار ہشتاد بہ ہشتاد دریں ملک رسیدہ۔

ٹھٹھہ سے فوج کی واپسی کے بعد اس (فوج کا) زوال نمایاں طور پر شروع ہو گیا اور امن کی بیس سالہ مدت نے اس زوال کو تقریباً بے مشاہدہ طور پر رو بہ تمام ہونے کا موقع دیا۔ ہو سکتا ہے کہ مرکزی شاہی فوج میں تقریباً 80 ہزار گھوڑا سوار تھے لیکن افسروں کو یہ معلوم تھا کہ ان سے بیرون سلطنت علاقہ میں کام کرنے کی توقع نہ کی جائے گی۔ عرض کے موقع پر بیکار گھوڑے لائے جاتے اور رشوت دے کر انھیں صحیح معیار کا طے کرا دیا جاتا۔ وہی ڈھیلا ڈھالا معیار اسلحوں کی جانچ میں بھی بروئے کار ہوتا۔ دوسری ایک دقت یہ تھی کہ پورا سال گزر جانے کے بعد بھی سپاہیوں کے پاس عرض کے موقع پر پیش کرنے کے لیے گھوڑے دستیاب نہ ہوتے۔ فیروز نے ان کے لیے تقریباً 51 دنوں کی مزید مہلت دیے جانے کا حکم دیا چونکہ جمعہ کے دن دفاتر بند ہوتے تھے۔ جب مہلت کی یہ مدت بھی کافی نہ ثابت ہوئی تو فیروز نے مزید دو مہینوں کی مہلت دی جب یہ مدت بھی گزر گئی تو نائب وزیر جنگ ملک رضی نے ایک مستقل بہانہ تلاش کر لیا۔ اس نے یہ عرضداشت پیش کی کہ گھوڑا سواروں نے اپنے اطلاق نامے گاؤں میں بھیج دیے تھے۔ اور وہ اپنے گھوڑے اس وقت تک عرض کے موقع پر پیش نہیں کر سکتے تھے، جب تک کہ انھیں واجب الادا رقم مشاہرہ نہ دے دی جائے۔ لیکن آئندہ سال عرض کے موقع پر وہ یقیناً اپنے گھوڑے حاضر کریں گے! اس کے بعد عرض کو محض اس رشوت خوری کی بنا پر قایم رکھا گیا۔ جس کا امکان اس کی وجہ مہیا ہوتا تھا۔

دراصل فوج کی ساری تنظیم بدعنوانیوں سے بھری تھی۔ فیروز شاہ کو صحیح واقعات بتائے گئے لیکن اس نے چشم پوشی کو ترجیح دیا۔ عفیف ایک گھوڑا سوار کا قصہ بیان کرتا ہے جس کو بادشاہ نے ایک طلائی ٹنکہ دیا تھا تاکہ وہ متعلقہ افسر کو رشوت دے کر اپنا گھوڑا عرض کے موقع پر منظور کرا سکے۔ کم درجہ کے سرکاری نوکر اکثر و بیشتر اپنے اعلیٰ افسروں کو حاصل کردہ رشوت کا ایک حصہ پیش کر کے خود ان کو سزاؤں سے بچاتے ہیں۔ بے ایمان اعلیٰ افسروں کا بھی یہ قاعدہ ہے کہ وہ براہ راست رشوت نہیں مانگتے سوائے ان حالتوں میں جبکہ رشوت کی رقم بہت بڑی ہو۔ بلکہ یہ گندا کام اپنے ماتحتوں پر چھوڑ دیں اور ایک مقررہ رقم یا (رشوت کی رقم کا) فی صد ایک حصہ بطور

تحائف طلب کریں۔ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ فیروز شاہ کی حکومت کی سالانہ آمدنی چھ کروڑ 75 لاکھ تھی، جبکہ وزیر جنگ عماد الملک، جس کی خدمات کی ابتدا ورثہ میں حاصل شدہ فیروز شاہ کے ایک غلام کی حیثیت سے ہوئی، کی جمع کردہ دولت 13 کروڑ ٹنکوں کی تھی۔ حکومت کی دو سالوں کی کل آمدنی سے کچھ کم۔ راپری کا قطاع اسے دیا تھا لیکن اس کا لحاظ کرتے ہوئے دیوان وزارت (کے کارکنوں) نے راپری میں متعین اس کے کارکنوں سے کوئی مطالبہ نہیں کیا، تقرری، بر فی، لگان کی تفویض کے احکام اور ان کی منسوخی سے متعلق بشیر کی تمام سفارشات کو فیروز مان لیتا تھا اور فیروز کے دیگر افسروں کی طرح، بشیر بھی درخواست دہندوں سے رشوت اور تحفے لیا کرتا ہوگا۔ پھر بھی 13 کروڑ ٹنکوں کی وہ رقم جو بشیر نے خشک و پختہ کنوؤں میں اس طرح جمع کر رکھی تھی جس طرح کسان اپنے غلوں کو جمع کرتے ہیں۔ فوجی بجٹ میں اس بڑے پیمانے پر لوٹ مار مچا کر ہی حاصل کی گئی ہوگی کہ دہلی سلطنت کی زبردست اور تاریخی فوج رفتہ رفتہ بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔[1]

زیارت کے لیے بہرائچ جانا، رجعت پسندانہ اور متعصّبانہ اقدام، غیر شرعی ٹیکسوں کی ممانعت

سالار غازی مسعود کے مزار کی زیارت کے لیے فیروز 75-1374ء (776ھ) میں بہرائچ گیا۔ اس نے خواب میں ان کو (سالار مسعود کو) دیکھا جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شہید ہوئے تھے۔ اور (اس کے بعد سے) وہ ظالم، متعصب اور متشدد ہو گیا۔ اس نے اپنے محل کی دیواروں پر کی ہوئی تمام نقاشیوں کو مٹا دینے کا حکم دیا اور سونے اور چاندی کے ظروف کو پگھلا دینے کا۔ خالص ریشم کے اور زربفت کے

---

(1) نہ تو راپری کی آمدنی اور نہ درخواست دہندگان کے تحائف بشیر کی کثیر دولت کی تشریح پیش کر سکتے ہیں ہمیں کوئی دستاویزی شہادت دستیاب نہیں لیکن جو ہوا ہوگا اس کے متعلق مندرجہ ذیل اندازہ صحیح ہوگا۔ جب ایک گھوڑا سوار مر جاتا یا اتنا ضعیف ہو جاتا کہ سواری نہ کر سکتا، تو بھی محکمۂ جنگ اس کی تنخواہ وزارت مال سے حسب سابق طلب کرتا رہتا لیکن اس رقم کا کوئی بھی حصہ (ان) بیٹوں یا وارثوں نہیں دیا جاتا جنھیں فوجی خدمت کے لیے نہ بلایا گیا ہو۔ یہ بتانا ممکن نہیں کہ یہ بے ایمانی سے حاصل کیا ہوا روپیہ کس طرح وزیر جنگ اور دیگر اعلیٰ احکام (باقی ص 855 پر)

کپڑوں کا استعمال بھی منع کر دیا گیا۔ سلطان کی یہ 'احمقانہ تبدیلی' ایک بہت بری حرکت کا باعث بنی۔ ایک برہمن کو اس کے سامنے پیش کیا گیا جو اپنے مکان پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو جمع کرتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس نے ایک مسلمان عورت کو ترک اسلام پر آمادہ کیا تھا۔ فیروز نے اسے دو چارہ کار پیش کیے۔ قبول اسلام یا زندہ آگ میں جلا دیا جانا۔ (ہم اس سلسلہ میں) صرف یہ دعا کر سکتے ہیں کہ اسلام آگ میں جلا کر مار دینے کے طریقہ کو یقینی طور پر ممنوع قرار دیتا ہے۔ خواہ جرم کچھ بھی ہو۔ اور یہ کہ فیروز یقیناً (اس معاملہ میں) ایک ظالمانہ اور ناقابل معافی قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ عفیف یہ بھی لکھتا ہے کہ اس نے دہلی کے برہمنوں پر جزیہ عائد کیا لیکن اس معاملہ میں اس کا ذہن اسے دھوکہ دے رہا تھا۔ چونکہ اس نے جزیہ کے شرعی مفہوم اور اس کے مروجہ غیر زرعی ٹیکس کے معنی کو خلط ملط کر دیا ہے۔ جزیہ کی تین قسموں کی شرح۔ 10، 20 اور 40 ٹنکے، بھی اس نے غلط دی ہے۔ اور پھر یہ کہ صرف دہلی کے برہمنوں سے جزیہ وصول کرنے سے کیا حاصل تھا؟ لیکن اپنی سلطنت کے آخری 15 سالوں میں فیروز ایک ناقابل اصلاح اور مائل بہ زوال متشدد بن گیا تھا۔

فیروز کے اسی نئے متعصبانہ رویے کی بنا پر ہم ان مندرجہ ذیل تعذیبی اقدام کی تشریح کر سکتے ہیں جن کا ذکر اس نے اپنی فتوحات میں کیا ہے۔ (ا) تین ہندو مندروں کی بربادی، جن میں سے مالوہ کے (میں ایک) حوض کے نزدیک تھا، دوسرا صالح پور میں تھا اور تیسرا گوہان کے شہر میں۔ (ب) مسلم عورتوں کو اپنے گھروں سے باہر نکلنے یا دہلی شہر سے باہر کے مزارات کی زیارت کے لیے جانے کی ممانعت (ج) شیعوں کو سزائیں دینا اور ان کی مذہبی کتابوں کو جلانا۔ تفصیلات نہیں دی گئی ہیں لیکن یہ غلط دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ فرقہ مکمل طور پر دبا دیا گیا (د) ملحدین اور اباحتیاں یعنی شیعوں کے اسمٰعیلی گروہ کے لیڈروں کو سزائے موت (ہ) احمد بہاری، جن کو ان کے پیرو خدا مانتے تھے، کا قتل مع ایک شاگرد کے۔ (ر) رکن نامی ایک شخص کا جو مہدی ہونے کا

(ص 854 سے آگے)

کے درمیان تقسیم ہوتا لیکن اگر بشیر کو اس کا پانچواں حصہ بھی ملا تو اس سے اس کی کثیر دولت کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ عفیف لکھتا ہے کہ بشیر کا بیٹا اسحٰق بھی جانتا تھا کہ کس طرح امیر بنا جا سکتا تھا۔

دعویٰ کرتا تھا، اور ان کے چند پیروؤں کا قتل۔ عوام بھی اس اچھے کام میں شامل ہوگئے اور ان کی بوٹیوں کو نوچ ڈالا1۔ (ز) عین ماہرو کے ایک نوکر کا قتل جو یہ کہا کرتا تھا کہ ’میں ہی حق ہوں، اور اپنے اس دعویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایک کتابچہ لکھا تھا۔ (ح) فوج کے سپاہیوں کو مال غنیمت کا 4/5 حصہ دینا نہ کہ 1/5 حصہ جو کہ سلاطین سلف کا دستور تھا۔ قرآن کا حکم ہے کہ سپاہیوں کو 4/5 حصہ دیا جائے لیکن یہ حکم رضاکاروں کے متعلق تھا نہ کہ تنخواہ یافتہ سپاہیوں کے لیے۔

فتوحات میں فیروز شاہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے مختلف قسم کی چنگیوں کو اس لیے ختم کر دیا کہ شریعت ان کی اجازت نہیں دیتی۔ ان ٹیکسوں کی تشریح کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں، کے، اے نظامی نے ان کی جو تشریح کی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

(1) منڈوی برگ (پروفیسر ہوڈی والا اور پروفیسر ایس۔ اے۔ رشید) اسے ترکاریوں اور پھلوں پر عائد ہونے والے ٹیکس خضروات کا ذکر سیرت فیروز شاہی (ورق 61) میں ایک علیحدہ ٹیکس کے بطور پر کیا گیا ہے۔ رائے اس کو پان پر ایک ٹیکس مانتے ہیں اور ڈاکٹر آئی۔ ایچ۔ قریشی اسے سرکاری بازار میں فروخت ہونے والے غلہ پر ایک ٹیکس بتاتے ہیں۔ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اس کے لغوی معنی قبول کر لیا جائے اور بازار میں فروخت کے لیے لائی جانے والی سبزیوں، پتیوں اور گھاس (چارہ) پر ایک ٹیکس سمجھا جائے۔

(2) دلائل بازارہا (بازروں میں دلالی کا کام کرنے والوں پر ٹیکس)

(3) جزاری (قصابوں پر، ذبح کی گئی فی گائے یا بیل پر 12 جتل کے در سے ٹیکس)

(4) امیر طرب (تفریحات ٹیکس، جو شاندار امیر طرب کو دیا جاتا تھا۔ جس کی تقرری حکومت کی طرف سے میلوں وغیرہ کی دیکھ بھال اور کھیل تماشوں کی عام جگہوں کا انتظام کے لیے کی جاتی تھی۔

---

(1) شیعوں کا یقین ہے کہ ان کے بارہویں امام، مہدی، جو کم سنی میں روپوش ہوگئے تھے، دوبارہ ظاہر ہوں گے اور دنیا کے معاملات کو صحیح راہ پر لگائیں گے۔ خود مہدی کہنے والے کئی افراد کا ذکر تاریخ اسلام میں ملتا ہے۔ لیکن عجیب اتفاق یہ ہے کہ وہ سب کے سب سنی تھے۔

(5) گل فروشی (پھول کی بکری پر ٹیکس)

(6) جزیہ تینبول (پان کی بکری پر ٹیکس)

(7) چنگی غلہ (غلے پر ٹیکس، چنگی کے معنی ایک مٹھی ہے)

(8) خیالی (ڈاکٹر آئی۔ ایچ۔ قریشی اور پروفیسر ایس۔ اے۔ رشید اور بعض دیگر اشخاص نے اسے کتابی پڑھا ہے اور اسے کاتبوں پر ایک ٹیکس قرار دیا ہے۔ لیکن اسے خیالی ہی پڑھنا چاہیے یا وہ ٹیکس جو ان لوگوں پر عائد ہوتا تھا جو بازاروں میں غلوں کا وزن کراتے تھے۔

(9) بیل گری (رائے نے اسے بیل گاڑی پڑھا ہے ڈاکٹر قریشی اور پروفیسر ایس۔ اے۔ رشید نے اسے نیل گری پڑھا ہے، یعنی نیل بنانے پر ایک ٹیکس۔ یہ تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر چغتائی نے اسے عمارت میں استعمال کی جانے والی نیل کی تیاری سے متعلق بتایا ہے۔

(10) ماہی فروشی (مچھلی بیچنے پر ایک ٹیکس)

(11) ندافی (روئی دھننے والوں پر ایک ٹیکس)

(12) صابن گری (صابن بنانے والوں پر ایک ٹیکس)

(13) ریسمان فروشی (رسی بیچنے والوں پر ایک ٹیکس)

(14) روغن گری (تیل نکالنے پر ایک ٹیکس)

(15) نخود بریاں (بھنے بونٹ پر ایک ٹیکس)

(16) تہہ بازاری (دوکانداروں پر سرکاری زمین کے استعمال کے لیے کیا جانے والا ایک ٹیکس)

(17) چپّہ (بعض محققین مثلاً پروفیسر ہوڈی والا نے اسے چھپّہ پڑھا ہے یعنی چھپے ہوئے کپڑے پر ٹیکس)

(18) داد بکی (مقدموں کے لیے لی جانے والی فیس، لیکن پروفیر ہوڈی والا کے مطابق متعلقہ جائداد کے دس فی صد سے زائد پر)[1]

(19) قمار خانہ (جو کھیلنے والی جگہوں پر ٹیکس)

---

(1) نوٹ: یہاں پر چھپائی کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ہوڈی والا نے منہاج کا (باقی ص858) پر

(20) کوتوالی (ڈاکٹر آئی۔ ایچ قریشی اسے پولیس والوں کی دستوری قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس میں کوتوال سے وصول کیے جانے والے ٹیکس)

(21) احتسابی (محتسب کے ذریعے وصول کیے جانے والے ٹیکس) محتسب حکومت کی ملازمت میں ہوتا تھا اور اپنی خدمات کی اجرت بطور عوام سے کوئی ٹیکس نہیں وصول کر سکتا تھا[1]۔

(22) قصابی قصابوں پر ایک پیشہ ورانہ ٹیکس، جزاری کے علاوہ)
(23) کوزہ و خشت بازی (مٹی کے برتنوں اور اینٹوں کی بھٹیوں پر ٹیکس)
(24) گھری (مکان پر ٹیکس)
(25) چرائی (چراگاہ کے استعمال پر ٹیکس)
(26) مصادرات (مختلف قسم کے جرمانے)
(27) کبابی (قیمہ کیے ہوئے گوشت پر ٹیکس)
(28) خضراوات (سبزیوں اور پھلوں پر ٹیکس)[2]

عفیف لکھتا ہے کہ قاضی نصر اللہ کو بادشاہ نے 76-1375ء (777ھ) میں حکم دیا کہ ممنوعہ ٹیکسوں کا اعلان ہاتھی پر سوار ہو کر کرے۔ اعلان کے وقت عفیف موجود تھا۔ ممنوعہ ٹیکسوں (چنگیوں) (سے حاصل شدہ رقوم) کا کل میزان 30 لاکھ ٹنکا تھا۔ ان کا تعلق صرف دہلی اور اس کے مضافات سے تھا۔ فیروز شاہ کے لیے یہ ممکن نہ

(ص 857 سے آگے)

کا حوالہ دیتے ہوئے یہ لکھتا ہے کہ قانوناً یہ فیس جائداد کی قیمت کی 10 فیصد سے زائد ہوتی تھی لیکن اس کے بعد خود یہ اضافہ کیا ہے کہ اکثر و بیشتر بے ایمان جج اس سے زیادہ بھی وصول کر لیتے تھے۔ مترجم)

(1) احکام السلطانیہ میں ماوردی لکھتا ہے کہ متاخرین عباسیوں کے دور میں محتسب عوام کے اخلاق کی نگرانی کیا کرتا تھا، وہ مکانوں میں (بلا اجازت) داخل نہیں ہو سکتے تھے اور نہ مقدمہ چلا سکتے تھے چونکہ یہ قاضی کا کام تھا لیکن شہری زندگی کے تمام بظاہر پہلوؤں پر نگرانی ان کے ذمہ تھی۔ ماوردی کے مطابق محتسبوں کی بے ایمانی اور اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے عوام میں ان کی عزت کم ہو گئی تھی۔ ہندستان میں ہمیں بحیثیت محتسب افسروں کی کوئی علیحدہ جماعت نہیں ملتی، یہ زیادہ بہتر پایا گیا کہ محتسب کے فرائض ایسے افسروں کے ذمہ لگا دیے جائیں جنھیں واقعی عالمانہ احتساب حاصل ہوں مثلاً مقطع یا کوتوال۔

(2) امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کاتبوں نے ان ٹیکسوں کی تعداد اور ہجے دونوں ہی کے متعلق بہت گڑبڑ مچائی ہے۔ طبقات اکبری مندرجہ بالا ٹیکسوں میں دو اور کا اضافہ کرتی (باقی ص 859 پر)

تھا کہ پوری سلطنت کے محاصل کا ڈھانچہ تبدیل کر سکے۔

شریعت میں کسی بھی قسم کی چنگیوں، خواہ وہ اچھی ہوں یا بری، (کی وصولی کے انتظام) کا ذکر نہیں۔ اس کی سیدھی وجہ یہ تھی پیغمبرؐ کو واقعی کسی بہت بڑے شہر کے انتظامات سنبھالنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ فتوحات، کتبوں نے دہلی کے شہریوں کو ممنوعہ ٹیکسوں کے دوبارہ اجرا کے خلاف یقین دہانی کی۔ اس کے برخلاف شہر کے افسروں نے، جو ان ٹیکسوں اور اس طرح کے دیگر ٹیکسوں کو پھر سے جاری کرنا چاہتے، ان کتبوں کو برباد کر ڈالا ہوگا۔ نیز یہ کہ دوسرے شہروں کے افسر سلطان یا اس کے گورنروں کی اجازت کے بغیر بھی چنگیاں وصول کر سکتے تھے۔ عین ماہرو نے اپنے خط نمبر 3 میں اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ملتان میں سلطان محمد کے ذریعے منع کر دیے گئے ٹیکسوں کو بعض افسروں نے اس کی اطلاع کے بغیر دوبارہ عائد کر دیا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اور کن شہروں میں اس طرح کی بات ہوئی[1]۔

فیروز کا اقدام شاید ازمنہ وسطیٰ کے پورے دور میں علماء کے اس دعویٰ پر مبنی تھا کہ حکومت کو صرف وہ ٹیکس لینا چاہیے جن کی شریعت اجازت دیتی ہے۔ لیکن وہ دہلی میں لی جانے والی چنگیوں کی ممانعت سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس معاملہ کو عین ماہرو نے محض چند سطروں میں ذکر کر کے ختم کر دیا ہے ”اگر تم صرف وہ ٹیکس وصول کرو گے جو شریعت کی رو سے جائز ہیں۔ یعنی وہ ٹیکس جو پیغمبرؐ نے عائد کیے تھے۔ تو پھر

(ص858) سے آگے

ہے۔ نکاحی (نکاح پڑھانے پر ٹیکس) اور داروغی (داروغہ کی دستوری)

عفیف تین اور ٹیکسوں کا ذکر کرتا ہے، مثلاً دانگانہ، مستقل اور وردی اور ان کی نوعیت بیان کرتا ہے۔ دو مثالیں کافی ہوں گی۔ اگر کوئی ناجائز بار برداری کے جانور پرانی دہلی میں لاتا تو سرکاری افسر اسے کم از کم ایک بار دہلی سے فیروز آباد تک عمارت بنانے کا سامان بلا اجرت ڈھونڈنے پر مجبور کرتے تھے۔ کسی تاجر کے مال پر سرائے عدل کے پاس درآمدی ٹیکس (جسے زکوٰۃ کہا جاتا تھا) دے دیے جانے کے بعد بھی اسے پھر جرانہ لے جایا جاتا اور فی تنکہ ایک دانگ (تانبے کا سکہ) کے درسے اور ایک اور ٹیکس دینے لیے کافی عرصہ تک روکے رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ دانگانہ کا ذکر سیرت فیروز شاہی میں ملتا ہے لیکن بقیہ دو ٹیکس شاید فتوحات فیروز شاہی کی کتابت کے قبل ہی ختم کیے جا چکے تھے۔

(1) انشائے ماہرو، ص48

تمہیں اپنے اخراجات کو بھی ان ہی مدوں تک محدود رکھنا ہوگا جو شریعت کی رو سے جائز ہیں۔ اگر یہ دونوں شرطیں پوری کی جائیں تو تمہارا بجٹ متوازن ہوگا۔ لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر جو اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر بحث کی ضرورت نہیں، شرعی ٹیکس آج کل کی ایک حکومت کے اخراجات کے لیے کافی نہیں ہیں۔ لہٰذا تمہیں جو راہ اختیار کرنی چاہیے وہ وہ نہیں جو شریعت میں متعین کی گئی ہے بلکہ وہ جس کی شریعت اجازت دیتی ہے"۔ (1)

فیروز شاہ کے اعلیٰ افسران

جب فیروز شاہ دربار عام منعقد کرتا تو دس یا بارہ افسروں کو بیٹھنے کی اجازت حاصل ہوتی لیکن بقیہ لوگوں کو جن میں شاہی خاندان کے افراد بھی شامل تھے، کھڑا رہنا ہوتا تھا۔ (قالین پر نہیں بلکہ) کھلی ہوئی زمین پر۔ دربار میں بیٹھنے کی عجیب وغریب رعایت تین ہندو رایوں کو دی گئی تھی۔ رائے مدر دیو، رائے سبیر اور راوت ادہارن۔ وزیر جنگ کی نشست عموماً شاہی تخت کے بائیں جانب ہوتی لیکن بشیر کو اس جگہ پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے کہ قانوناً وہ سلطان کا غلام تھا۔ رواج کا تقاضا یہ تھا کہ دربار کے دوران فیروز صرف وزیر سے گفتگو کرے۔ جب اسے کسی اور شخص سے بات کرنے کی خواہش بھی ہوتی وہ وزیر کے ذریعے ہی بات کرتا۔

جگہ کی کمی کے باعث سلطنت کے سربر آوردہ امرا کا صرف مختصر ذکر ہی پیش کیا جاسکتا ہے:-

(1) تاتار خان- گرچہ خاں جہان وزیر مقرر ہوا پھر بھی تاتار خاں ہی سب سے اعلیٰ مرتبت شخص سمجھا جاتا اور تخت کے داہنے جانب بیٹھتا خان جہاں بائیں جانب بیٹھتا۔ اس کا انتقال شاید بنگال کی دوسری مہم کے کچھ دنوں بعد ہی ہوگیا۔ بعد کے لوگ تاتار خاں کو صرف اس کی دو انسائیکلوپیڈیائی تصنیفات کی بنا پر جانتے ہیں۔ تفسیر تاتار خانی اور فتاویٰ کے تاتار خانی اول الذکر میں راسخ العقیدہ سنی مذہب کے حدود کے اندر قرآن کی تفسیر کے متعلق آرا میں تمام اختلافات کا ذکر تھا۔ مختلف آرا کو ان کے پیش کرنے والے مصنفین کے ساتھ منسوب کیا گیا تھا۔ اسی طرح فتاویٰ تاتار خانی میں حنفی

---

(1) ایضاً، ص:69 (نمبر30)

مذہب کی اختلافات جس طور پر انھیں مختلف فقہاء نے پیش کیا تھا، کو جمع کر دیا گیا تھا۔ دونوں ہی کتابیں حوالے کے لیے مفید ثابت ہوئی ہوں گی لیکن وہ اتنی ضخیم تھیں کہ زیادہ دنوں تک قایم نہ رہ سکیں۔ عفیف کے مطابق فتاویٰ تاتار خانی، 30 جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس کے بعض اجزاء بچ رہے ہیں اور اس کے حوالے فتاویٰ عالمگیری میں پائے جاتے ہیں۔

(2) خان جہاں مقبول: عفیف کے مطابق خان جہاں نے بحیثیت وزیر اٹھارہ سالوں تک خدمت انجام دی اور اس کا انتقال 80 سالوں کی عمر پانے کے بعد 1368ء 69 (770ھ) میں ہوا۔ بحیثیت وزیر اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لی۔ جس کو سلطان محمد نے جونا کا نام دیا تھا اور فیروز سے اس کو خان جہاں کا خطاب بھی ملا۔

خان جہاں کے افسروں، سپاہیوں اور خاندان کے افراد کو انعامات کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیروز نے خان جہاں کو ذاتی طور پر اتنی زمین عطا کی جس سے تیرہ لاکھ ٹنکہ سالانہ کی آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ اور اس کی حکومت کے دوران زرعی پیداوار میں افزائش کے باعث یہ رقم اور بھی زیادہ ہو گئی ہو گی۔ وہ عظیم المرتبت وزیر دستور کے مطابق مقطعوں سے بھی تحائف لیتا لیکن وہ ان تمام تحائف کی ایک فہرست تیار کراتا اور اسے بادشاہ کے آگے پیش کر کے متعلقہ رقم کو شاہی کارخانوں کے خزانے میں جمع کرا دیتا۔ جو کہ براہ راست اس کے اختیار میں نہ تھا دیگر عمدہ وزیروں کی طرح، وہ بھی ہر سال سلطان کو 4 لاکھ ٹنکہ کی نذر پیش کرتا۔ علاوہ ازیں اسے بدعنوانی کے لیے یا رشوت کے لیے آمادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عفیف ہمیں یقین دلاتا ہے کہ ”خان جہاں مقطعوں یا کسی اور سے ایک سکہ تانبے کا بھی نہ مانگتا“ سلطان نے سلطنت کے تمام امور اس کے ہاتھوں میں دے رکھے تھے۔ لیکن فیروز اپنے (صحیح) مقام کو کبھی نہ بھولا۔ جب سلطان سلورا میں مقیم تھا تو خان جہاں اور اس کے افسر سلطان کی ہدایات حاصل کرنے کے لیے ہر سنیچر کو اس کے پاس حاضر ہوتے۔ اگرچہ وہ دونوں ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے تھے پھر بھی کبھی کبھی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ ایک موقع پر جب خان جہاں کو یہ خیال ہوا کہ سلطان اس کی جگہ پر ظفر خاں کو بحال کرنا چاہتا تھا تو اس نے وہ اصل خط سلطان کو واپس بھیج دیا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے اس مضمون کو لکھا تھا کہ عہدہ

وزارت خاں جہاں کے خاندان میں وراثتی بنادیا جائے گا۔ جب چند دنوں بعد دونوں کی ملاقات ہوئی تو فیروز اسے یہ سمجھانے میں کامیابی حاصل کر سکا کہ اس نے اسے غلط سمجھا تھا۔

عفیف کی پیش کردہ دو مثالیں ہمیں اس کا کچھ اندازہ مہیا کرتی ہیں کہ خانِ جہاں کس طرح سلطان کو 'راضی' رکھتا۔ (ایک مرتبہ) دو جاسوسوں نے سلطان کو خبر دی کہ دارالضرب جس کا مہتمم کجر شاہ نامی ایک شخص تھا، سے جاری کردہ چاندی کی شش گانی (ٹنکہ کا 1/6 حصہ) وزن میں نصف رتی کم تھی۔ خاں جہاں نے سلطان کی موجودگی میں فوراً تفتیش کا حکم دیا۔ چونکہ الزام صحیح تھا اس لیے خان جہاں نے کجر شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ سناروں سے یہ معاملہ طے کرے جب کہ وہ سلطان کو باتوں میں مشغول کیے رہے گا وہ بھٹی میں مطلوبہ مقدار کی چاندی ملادیں گے۔ شش گانی کا وزن (اس طرح) صحیح پایا گیا۔ اور اس حقیقت کا اعلان کر دیا گیا لیکن اس کے جلد ہی بعد خان جہاں نے سلطان کو بعض افسروں کو اس وقت ڈانٹتے پھٹکارتے ہوئے دیکھا جبکہ وہ تخت پر بیٹھا تھا۔ ایک جوڑا موزہ، جو قیمتی پتھروں سے آراستہ تھا اور جس کی قیمت 80 ہزار ٹنکے تھی، غائب ہو گیا تھا۔ افسروں نے اسے لکھناؤتی بھیجی گئی ان اشیاء کی فہرست میں شامل کر دیا تھا لیکن واقعتاً اس کو بیچ کر اس رقم کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔ خاں جہاں ان افسروں کو آستینوں سے پکڑ کر سخت غصہ کے عالم میں اس کمرے سے باہر لے گیا جہاں تخت نصب تھا اور انھیں سزائے موت کی دھمکی دے کر غبن کی ہوئی رقم حاصل کر لی۔ جب فیروز نے اگلے دن اس سے اس معاملہ کے متعلق دریافت کیا تو اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ یہ جواب دیا "80 ہزار ٹنکے خزانہ میں جمع کر دیے گئے ہیں، آیا موزے لکھناؤتی گئے تھے یا نہیں یہ ایک الگ سوال تھا"۔

ان دونوں مثالوں سے، جنھیں عفیف نے عمداً چن کر پیش کیا ہے، ہمیں یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے' کہ خان جہاں نے سلطنت کے عمدہ دنوں کے نظم وانضباط اور عمدہ کارکردگی کو قایم رکھا۔ چھوٹے درجے کے افراد کو سزا دینا آسان تھا لیکن جہاں بڑے لوگوں کا معاملہ در پیش ہوتا تو خان جہاں کو احتیاط برتنی پڑتی۔ فیروز اس کو گلے لگاتا تھا اور بھائی کہہ کر مخاطب کرتا تھا لیکن دوسرے افسروں کا بھی سلطان پر اثر تھا۔

خاں جہاں کے تعلقات وزیر جنگ بشیر کے ساتھ بہت اچھے تھے اور اس نے اس (بشیر) کی ناجائز طور پر حاصل کردہ دولت کے متعلق کوئی تفتیش نہ کی۔ یہی بات سلطان کی مجلس خاص کے شحنا ملک شاہین کے متعلق بھی صحیح تھی، جس نے بہت سارے جواہرات اور دیگر قیمتی سامانوں کے علاوہ 50 لاکھ ٹنکوں کا ترکہ چھوڑا تھا۔ "مملکت کے خان اور امیر دولتمند بن گئے اور کافی مقدار میں سونا اور قیمتی پتھر جمع کیے، عفیف کا یہ کہنا درست ہے کہ خان جہاں مملکت کے تمام افسروں پر قابو رکھتا تھا۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ کہ قابو ان کی رشوت خوریوں اور خزانے میں داخل کیے جانے والی رقموں کے خرد برد کی چشم پوشی کے ذریعہ ہی قایم تھا لیکن ایک مثال استثنا موجود تھی۔ عین ماہرو نے بد عنوانی سے چشم پوشی کی مخالفت کی۔

(3) عین ماہروں[1] نے محمد بن تغلق کی حکومت کے دوران بحثیت انتظام کار اچھا مقام حاصل کیا تھا۔ فیروز شاہ نے اسے مشرف ممالک مقرر کیا تھا اور اس حیثیت سے وہ پوری سلطنت کے ٹیکسوں کی وصولی کا ذمہ دار تھا۔ حساب کی جانچ پڑتال ایک دوسرے اعلیٰ افسر، مستوفی ممالک کے ذمہ تھی۔ اور یہ دونوں وزیر کے ماتحت تھے جو محکمہ مال کا انچارج تھا۔ عین ماہرو کے جو خطوط بچ رہے ہیں اور جن کی پروفیسر ایس، اے، رشید نے بڑی احتیاط کے ساتھ تدوین کی ہے۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بڑا ہی مہذب اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ وہ بڑا خوش خلق تھا اور اپنے جوابوں کی نرمی سے لوگوں کے غصہ کا رخ موڑ دیتا تھا۔ لیکن خان جہاں کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ رہ

---

(1) اسے (عین ماہرو کو) واضح طور پر اس عین الملک ملتانی سے ممیز کرنا چاہیے جس کا ذکر برنی نے 1301ء میں رنتھمبور کے محاصرے کے موقع پر پہلی بار کیا ہے۔ عین ماہرو کا انتقال 1360ء کی بنگال کی دوسری مہم کے کچھ دنوں بعد ہوا۔ ان دونوں کو ایک قرار دینے جیسا کہ پروفیسر ایس۔ اے۔ رشید نے کہا ہے۔ کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک شخص کو 75 سال کی کارکردگی کی عمر دینا ہوگا دوسرے یہ کہ جبکہ عین الملک ملتانی ایک مشہور جنرل تھا، برنی لکھتا ہے (ص 90-389) کہ عین الملک (ماہرو) اور اس کے بھائیوں 'جنگ کے امور کی کوئی واقفیت نہ تھی اور نہ عسکری تجربہ عین ماہرو اپنا نام عبداللہ محمد شریف بتاتا ہے۔ عین الملک کا خطاب اسے شاید علاؤالدین کے عظیم جنرل کی موت کے بعد دیا گیا تھا۔ اس کے باپ کا نام امیر ماہرو تھا اور اپنی انشاء ماہرو میں وہ خود کو عین ماہرو لکھتا ہے تاکہ اس کی شناخت غلط طور پر اس عظیم جنرل کے ساتھ نہ کر دی جائے۔ جس کا خطاب اسے دیا گیا تھا۔

سکے۔ دونوں نے ایک دوسرے کے لیے وزیر کے دفتر میں کھلے طور پر اور پھر بادشاہ[1] کے سامنے بھی سخت الفاظ استعمال کیے۔ بالآخر فیروز نے خان جہاں کو عین ماہرو کو مشرف ممالک کے عہدے سے برطرف کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن تین دنوں بعد اس نے عین ماہرو کو ملتان، بھکر اور سیوستان تین صوبوں کا 'مطلق اختیارات' کے ساتھ گورنر بنادیا۔ چونکہ وہ خان جہاں کی ماتحتی میں کام کرنے کو تیار نہ تھا اس لیے صوبے وزارت کے حلقہ اختیار سے نکال کر بادشاہ کی براہ راست نگرانی میں دے دیے گئے۔ وہ بہت ایماندار تھا۔ اپنے ایک خط میں لکھا ہے "میں بادشاہ کے ان ملازموں میں نہیں ہوں جو اثر و رشوت کی بنا پر اپنے فرائض کے راستہ سے ہٹائے جا سکتے ہیں[2]۔ عین ماہرو کو بنگال کی دوسری مہم کے قبل گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ اپنے ایک خط میں وہ اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ وہ تین سالوں تک گورنر رہا تھا۔

(4) عماد الملک بشیر سلطانی: بشیر کی کثیر دولت اور وہ ذرائع جن سے یہ اکٹھا کی گئی تھی، کی خبر فیروز شاہ کو یقیناً ہوگی لیکن اس نے کوئی کاروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ بشیر کی جائداد میری جائداد ہے۔ بشیر نے اپنی جائداد کی ایک فہرست -- جس میں صرف چاندی کے ٹنکوں کی تعداد 13 کروڑ تھی۔ اس کے حوالے کر دی تھی۔ فیروز نے فہرست کو پڑھا اور پھر اسے واپس کر دیا۔ تب بشیر ایک کروڑ ٹنکہ بوروں میں رکھ کر لایا۔ اور فیروز نے اس روپے کو حکومت کے ایک سرمایہ محفوظ کے بطور رکھ لیا۔ جب بشیر اتنا ضعیف ہو گیا کہ کسی کام کے لائق نہ رہا تو اس نے دیوان عرض کا عہدہ اپنے بیٹا الحق کے حوالہ کر دیا۔ اور فیروز شاہ سے ایک خط آزادی حاصل کر لیا۔ اس نے ان چار ہزار غلاموں کو بھی آزاد کر دیا جنھیں اس نے خریدا تھا اور ان کو برسرکار بنانے کے لیے کچھ روپے دیے۔ جب بشیر کا انتقال ہو گیا تو فیروز شاہ نے (متذکرہ بالا) 130 کروڑ ٹنکوں میں سے 9 کروڑ نکال لیے اور بقیہ 4 کروڑ بشیر کے ورثاء میں تقسیم

---

(1) عفیف جس کی ہمدردی خان جہاں کے ساتھ تھی، ان جھگڑوں کو بالتفصیل بیان کرتا ہے۔ جھگڑے کی ابتداء اس وجہ سے ہوئی کہ خان جہاں نے عین ماہرو کو حساب کی جانچ پڑتال کے ان کاغذات کو نہ دیکھنے دیا جس کا وہ رواجاً مستحق تھا۔

(2) انشاء ماہرو، ص 213، نمبر 120

کرنے کی اجازت دے دی۔ اس سلسلہ میں عفیف کا تبصرہ قابل غور ہے۔ ''کسی بھی زمانہ میں کسی خان یا ملک نے اتنی دولت اکٹھا نہیں کی ہوگی جتنی بشیر نے .... تعریف ہے خدا کی، انھیں ایماندارانہ یا غیر ایماندارانہ طور پر جمع کردہ وجہ یا ناوجہ اور پسماندہ اپنی دولت کا حساب (خدا کے سامنے) دینا ہوگا۔ فیروز کے بیٹے سلطان محمد کے خلاف شاہی غلاموں کی بغاوت بشیر کی جمع کردہ دولت کی تقسیم کے لیے تھی"۔

(5) ضیاء الملک شمس الدین ابورجا: ابورجا کی تین سالوں کے دوران (83-1381ء) تیز رفتار ترقی ہمیں اس بات کی واحد مثال پیش کرتی ہے کہ فیروز نے سلطنت کے مالی معاملات میں مزید بدنظمی کو روکنے کی کوشش کی۔ مستوفی ممالک مقرر ہونے کے بعد ابورجا نے سلطان کو ان بدعنوانیوں اور رشوت خوریوں کے متعلق خفیہ طور پر خبر دینا شروع کیا جو محکمہ مال میں رائج ہو گئی تھیں، اور اس کے دل میں امید پیدا کر دی کہ وہ معاملات کو درست کر دے گا۔ فیروز نے تمام کاغذات کو ابورجا کے پاس پیش کرنے کا حکم دے دیا۔ وزیر خان جہاں ثانی مفلوج تھا اور وہ تمام احکام ابورجا کی خواہشات کے مطابق صادر کرتا۔ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ اگرچہ ابورجا بہت اہلیت کا آدمی تھا مگر وہ ماقبل زمانہ میں بے ایمانیوں کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اور اب اس نے ان لوگوں سے بھی ناجائز مطالبات شروع کر دیے جنھیں بادشاہ تک رسائی حاصل تھی۔ خان جہاں ثانی کے اشتعال دینے پر محکمہ لگان کے حکمرانوں نے ابورجا کے خلاف بدعنوانیوں کا الزام خفیہ طور پر فیروز شاہ کے سامنے پیش کیا۔ گواہوں اور کاغذات کی شہادت کے ساتھ انھیں بالکل صحیح ثابت کر دیا۔ اپنے پسندیدہ (وزیر) پر فیروز کا اعتماد اب ناپسندیدگی میں بدل گیا۔ ابورجا کے مکان کی تلاشی لی گئی۔ ایک مکان میں 80 ہزار ٹنکے اور دوسرے میں 3 ہزار ٹنکے پائے گئے۔ چھ مہینوں تک ابورجا روزانہ وزیر کے دفتر میں لایا جاتا اور ایک چھڑی سے اسے مارا جاتا یہاں تک کہ (بالآخر) وہ چھڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ فیروز کی حکومت کے دوران تعذیب کا یہ ایک واحد واقعہ ہے جس کا ذکر ہمیں ملتا ہے۔ بالآخر، فیروز نے اسے 'مروت اور تہلوک،؟ میں جلاوطن کر دیے جانے کا حکم دیا۔ شاید یہ مقامات مغربی ہندستان کے کسی ریگستانی علاقہ میں واقع تھے۔ محمد شاہ نے اسے دہلی واپس بلا لیا لیکن وہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد

مر گیا۔

سلطنت کے اواخر سال[1]

1371-72ء (773ھ) میں ظفر خاں کا انتقال گجرات میں ہو گیا اور اس کے خطاب کے ساتھ وہاں کی گورنری اس کے بیٹے دریا خاں کو ملی۔ 23/ جولائی 1374ء (12 صفر 776ھ) کو ولیعہد، فتح خاں کا انتقال کنتھور میں ہو گیا۔ فیروز شاہ اس سانحے سے بہت متاثر ہوا مگر اس نے کسی اور کو ولیعہد نامزد نہ کیا۔ 1376-77ء (778ھ) میں شمس الدین دمغانی گجرات کا گورنر مقرر ہوا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ حسب دستور محصول (دہلی کو بھیجے جانے والی رقم) کے علاوہ وہ مزید 40 لاکھ ٹنکے اور ایک سو ہاتھی، 200 گھوڑے اور مقدموں کے لڑکوں اور جبلوں میں سے 400 غلام بھیجا کرے گا۔ وہ یہ وعدہ پورا نہ کر سکا۔ اور اس نے بغاوت کر دی۔ لیکن گجرات کے امیران صدہ نے اس کا سر قلم کر دیا اور اس کو فیروز شاہ کے پاس بھیج دیا۔ فیروز شاہ کی سلطنت کے دوران ایک گورنر کی بغاوت کی یہ واحد مثال ہے اور اسے فرو کرانے کے لیے کسی فوج کی ضرورت نہ پڑی۔ اس کے بعد گجرات (کی گورنری) ملک مفرح سلطانی فرحت الملک کے خطاب کے ساتھ ملی۔

1377-78ء (779ھ) میں رائے سبیر، رائے ادھارن اور اٹاوہ کے مقدموں نے بغاوت کر دی۔ لیکن ایک شکست کے بعد انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انھیں ان کے خاندان والوں کے ساتھ دہلی لایا گیا اور وہیں بسا دیا گیا۔ اس علاقہ میں امن وامان قائم رکھنے کا کام تاج الدین کے بیٹے ملک زادہ فیروز اور ملک افغان کو دیا گیا۔

کیتھر کے راجپوتوں کے سردار، رائے کھر کو نے بدایوں کے گورنر سید محمد اور اس کے بھائی سید علاؤالدین کو اپنے محل میں ایک دعوت کے لیے مدعو کیا اور اس کے بعد ان کو قتل کر دیا۔ اس کی حرکت کو جس طور پر مورخین نے پیش کیا ہے، یقیناً ناقابل حمایت تھی۔ قرآن وحدیث اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی شخص بھی کسی دوسرے کے جرموں کا ذمہ دار نہیں۔ فیروز شاہ کے اقدامات، جو کہ تقریباً مجنونانہ

---

(1) عفیف، ص ص 492-503، مبارک شاہی، ص ص 410-131

تھے، اس ناقابل اصلاح اخلاقی اور مذہبی انحطاط کی نشان دہی کرتے ہیں جن کا شکار اس کا کردار ہو چکا تھا۔ اس نے کیتھر کی طرف کوچ کیا اور پورے علاقہ کو تاراج کیا۔ رائے کہر کو ہمالیہ کے دامن میں (واقع) کمایوں کے سرداروں کے پاس بھاگ گیا۔ فیروز نے اس علاقہ کو بھی تاراج کیا لیکن کہر کو نہ پایا جا سکا۔ اس کے بعد فیروز نے سنبھل اور بدایوں میں دو مستعد گورنر مقرر کیے اور شکار کھیلنے کے بہانے اس نے ہر سال سنبھل کا علاقہ تاراج کیا" وہاں شکار کے جانوروں کے علاوہ کچھ نہ باقی رہا"۔

جب سلطان کی عمر 90 سالوں کی ہو گئی اور کمزور و ناتواں ہونے لگا تو وہ خان جہاں ثانی پر زیادہ سے زیادہ حد تک بھروسہ کرنے لگا۔ وزیر نے سلطان کے دماغ میں یہ شبہ ڈال دیا کہ شہزادہ محمد جو اس کا سب سے بڑا زندہ لڑکا تھا، بعض امرا کی مدد سے بغاوت کی تیاری کر رہا تھا۔ ان امرا میں سب سے اہم ظفر خاں کا بیٹا دریا خاں تھا۔ فیروز شاہ نے معاملہ پر کسی قسم کے غور کے بغیر ہی خاں جہاں ثانی اور امرا کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ وزیر نے مہوبا کے حساب کی جانچ پڑتال کے بہانے دریا خاں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن دوسرے امرا اس کے قبضہ میں نہ آ سکے۔ شہزادہ محمد اپنی بیوی کی ڈولی میں بیٹھ کر اپنے باپ کے پاس اس کے حرم میں پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور صحیح صورت حال سے اس کو آگاہ کیا۔ تب فیروز نے شہزادہ کو خان جہاں کی سرزنش کا حکم دیا۔ اعلا افسران، شاہی غلامان، امراء اور زیادہ تر شہری شہزادہ محمد کی حمایت کر رہے تھے۔ جولائی اگست 1387ء (789ھ) میں شہزادہ اور اس کے حامیوں نے رات کے آخری حصہ میں خاں جہاں کے مکان پر حملہ کیا اور اس کو لوٹا اور اس کے حامیوں کو قتل کر دیا۔ خاں جہاں نے دریا خاں کو مار دیا اور اس کے بعد میوات میں واقع مہاری میں کوکہ پردھان کے پاس بھاگ گیا۔ پہلے تو فیروز نے شہزادہ محمد کو وزیر مقرر کیا۔ اور بعد میں بادشاہت کے تمام لوازمات بھی اس کو منتقل کر دیے۔ خطبہ دونوں بادشاہوں کے نام پر پڑھا جاتا۔

اگست ستمبر 1387ء میں شہزادہ محمد جہاں نما محل میں نصیر الدین محمد شاہ کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ اس نے پرانے افسروں کو توثیق کر دی لیکن کچھ نئی تقرریاں بھی کیں۔ ملک یعقوب کو، جو اخور بک رہا تھا، سکندری خاں کا خطاب ملا اور گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا۔ لیکن اپنا عہدہ سنبھالنے کے قبل اسے خان جہاں کی

سرزنش کا حکم دیا گیا۔ دیوانی کے معاملات یا وزارت ملک سماء الدین اور ملک کمال الدین کو تفویض کی گئی۔ جب سکندر اپنی فوج کے ساتھ مہاری پہنچا تو گوکہ پردھان نے خان جہاں کو قیدی بنا کر اس کے پاس بھیج دیا۔ سکندر نے اس کا سر کاٹ دیا اور اسے لے کر دہلی آیا اور اسکے بعد گجرات گیا۔ لیکن صوبائی افسروں کو اب صرف دہلی سے ایک فرمان بھیج کر ہر طرف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سکندر کے ساتھ ایک کمزور ہی فوج بھیجی جا سکی تھی۔ فرحت الملک اور گجرات اور کھمبات کے امیران صدہ نے سکندر کو شکست دے دی۔ اور اسے مار ڈالا۔ اور دہلی فوج کے سپاہی لٹ لٹا کر اور زخمی ہو کر واپس ہوئے۔ سلطان نصیر الدین جو دو مہینوں سے سرمور کی پہاڑیوں میں شکار میں مشغول تھا یہ خبر سن کر دہلی واپس ہوا لیکن وہ کوئی خاص قابل ذکر اقدام نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ دہلی سلطنت کی زبردست فوج کی حیثیت اب صرف اس کے ذاتی خدم و حشم کی ہو کر رہ گئی تھی۔

دو مہینوں بعد فیروزی غلاموں نے بغاوت کر دی۔ دہلی اور فیروز آباد میں ان کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ اور ان کا اصل مقصد، جس کی طرف عفیف نے اشارہ کیا ہے، سکوں کا وہ زبردست انبار تھا جسے بشیر نے اکٹھا کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیروز شاہ نے فیروز آباد کا بڑا محل چھوڑ دیا تھا اور کوشک منزل میں منتقل ہو گیا تھا اور کوشک منزل کے سامنے والے میدان میں ہی وہ غلامان جمع ہوئے، نصیر الدین ان کے ساتھ دنوں تک ان سپاہیوں کی مدد سے لڑتا رہا۔ جنھیں وہ جمع کر سکا۔ تیسرے دن غلاموں نے فیروز کو باہر نکال کر لایا اور اپنے پرانے آقا کو دیکھ کر تمام فیلبان اور غلام شہزادہ کو چھوڑ کر سلطان سے جا ملے۔ نصیر الدین سرمور کی پہاڑیوں کی جانب بھاگ گیا۔ غلاموں نے اس کا گھر لوٹ لیا اور "دہلی میں روز محشر کا نقشہ کھینچ دیا گیا"۔ جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو فیروز شاہ نے فتح خاں کے بیٹا تغلق شاہ ثانی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور تمام معاملات اس کے سپرد کر دیے۔ تغلق نے امیر حسن احمد اقبال کو قتل کرا دیا۔ اس نے سامانہ کے گورنر اور نصیر الدین کے حامی، غالب خاں کو بہار کی طرف جلاوطن کر دیا۔ اور سامانہ کی گورنری ملک سلطان شاہ خوشدہ کو دے دی۔ 21/ستمبر 1388ء (18/رمضان 790ھ) کو فیروز نے آخری سانس لی۔

4

فیروز شاہ تغلق کے جانشین

غیاث الدین تغلق شاہ دوم، 89-1388ء

فیروز شاہ تغلق نے دو جانشین چھوڑے تھے اس کے بیٹے سلطان محمد کی باضابطہ تاجپوشی ہوئی تھی۔ لیکن فیروز غلاموں نے اسے سرمور کی جانب بھگادیا تھا اور فیروز شاہ نے زمام حکومت فتح خاں کے بیٹے تغلق شاہ کے سپرد کردی تھی۔ لیکن تغلق دوم کی باضابطہ طور پر تاجپوشی کبھی نہیں ہوئی تھی لہٰذا فیروزی غلاموں نے، جنھوں نے اسے تخت نشین کیا تھا، فیروز شاہ کی موت (21/ستمبر 1388ء) کے دن اس کی تاجپوشی کا اہتمام کیا۔ اور اس کے لیے غیاث الدین کا خطاب مناسب سمجھا گیا۔[1]

تغلق دوم نے اکتوبر 1388ء میں اپنے وزیر ملک زادہ فیروز کی سرکردگی میں اپنے چچا کے خلاف ایک فوج بھیجی لیکن وہ مہم میں قطعاً ناکام رہی۔ سلطان محمد سرمور سے بکناری اور سنحاب ہوتا ہوا نگرکوٹ چلا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اسے ایک محفوظ پناہ گاہ مل گئی تھی۔

(تاریخ) مبارک شاہی بتاتی ہے کہ ”تغلق شاہ ایک ناتجربہ کار نوجوان تھا جو نہیں جانتا تھا کہ حکومت کیسے کی جاتی ہے“۔ قسمت کی فریب کاریوں سے بے پرواہ، وہ اپنے اوقات مے نوشی اور عیش و طرب میں گزارتا تھا۔ امور سلطنت کا مکمل بے توجہی برتی گئی۔ فیروزی غلام اس قدر بے باک اور بے پرواہ ہوگئے کہ بادشاہ کے اختیارات کا

---

(1) مناسب یہ ہے کہ شہزادہ محمد اور اس کے جانشینوں کے لیے 'سلطان' کا خطاب اور دوسرے دعویداروں کے لیے 'شاہ' کا خطاب استعمال کیا جائے۔ قانونی بادشاہ اور دوسرے چھوٹے دعویداروں کے درمیان فرق کرنا مشکل ہے۔ حقیقت میں دونوں ہی دعویدار تھے۔

اس زمانہ کے متعلق ہمارا سب سے بہتر ماخذ تاریخ مبارک شاہی ہے۔

خاتمہ ہو کر رہ گیا"۔ تغلق دوم نے اپنے بھائی سالار شاہ کو بغیر کسی سبب کے قید کر دیا اور شادی خاں [1] بن فیروز شاہ کا بیٹا، ابو بکر شاہ، اس کے پاس سے بھاگ نکلا۔

نائب وزیر رکن الدین جندہ کی قیادت میں فیروزی غلاموں نے تغلق شاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ 24/فروری 1389ء کو سب سے پہلے انھوں نے ایک بڑے افسر کو دن دھاڑے قتل کر دیا۔ اور جب تغلق اور اس کے وزیر ملک زادہ فیروز نے جمنا کی جانب کھلنے والے ایک دروازے فیروز آباد محل سے فرار ہونے کی کوشش کی تو انھوں نے انہیں گرفتار کر کے قتل کر دیا اور ان کے تن سے جدا سروں کو محل کے پھاٹک پر لٹکا دیا۔

ابو بکر شاہ 90-1389ء

فیروز کے ایک پوتے ابو بکر شاہ کو، رکن الدین جندہ کو اس کا وزیر بنا کر تخت نشین کیا گیا۔ جندہ پر یہ شبہ ہوا کہ وہ ابو بکر کو قتل کر کے تخت پر قابض ہونا چاہتا ہے لہٰذا ابو بکر کے بہی خواہوں نے جندہ اور اس کے گروہ کے غلاموں کو مار ڈالا۔ ابو بکر شاہ نے دہلی پر قبضہ پا لیا اور وہاں کے گزشتہ بادشاہوں کے خزانے اور ہاتھی بھی اس کے ہاتھ آ گئے [2]۔ لیکن صوبوں کا معاملہ مختلف تھا۔ 27/فروری 1389ء کو سامانہ کے امیران صدہ نے سلطان شاہ خوش دل کو مار ڈالا جسے تغلق دوم نے گورنر مقرر کیا تھا اور انھوں نے اس کے اور اس کے حمایتوں کے گھروں کو لوٹ لیا اور اس کا تن سے جدا سر سلطان محمد کے پاس نگر کوٹ بھیج دیا۔

ابو بکر اور سلطان محمد کی کشمکش

سلطان محمد سامانہ کی جانب بڑھا اور دوسری بار اس نے اپنے آپ کو تخت نشین کیا (4/اپریل 1389ء) سامانہ کے امیران صدہ اور پہاڑی علاقوں کے تمام مقدمین

---

(1) برنی، جس نے فیروز کے دور حکومت کے ابتدائی سالوں میں (تاریخ فیروز شاہی) تصنیف کی قطعی طور پر یہ بیان کرتا ہے کہ فیروز نے اپنے سب سے بڑے لڑکے شاہزادہ شادی خاں کو "وکیل دار" مقرر کیا تھا۔ ابو بکر کو ظفر خاں کے بیٹے کی حیثیت دینا غالباً کاتبوں کی غلطی ہے (مبارک شاہی ص 133)۔

(2) مبارک شاہی ص 145۔

اس کے ساتھ ہو گئے۔ وہ دہلی کی جانب بڑھا اور وہاں کچھ دنوں کے لیے اپنے آپ کو مستحکم کر لیا۔ لیکن تمام فیروزی غلام اس کے خلاف تھے لہٰذا انھوں نے اسے نکال باہر کیا چنانچہ محمد نے گنگا کے کنارے جالیسری میں اپنے آپ کو مستحکم کیا اور تقریباً پچاس ہزار معمولی قسم کے سپاہی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اگست 1389ء میں اس نے دہلی پر دوبارہ چڑھائی کی لیکن پھر اسے شکست ہو گئی۔ اب یہ بات بالکل واضح تھی کہ فیروزی غلام، محمد کے قطعی مخالف تھے لہٰذا اس نے ایسے غلاموں کے خلاف، جو دہلی سے باہر تھے اور اس کے دسترس میں تھے، زبردست اقدام کیا۔ 19/ رمضان 791ھ (11/ ستمبر 1389ء) کو ان تمام فیروز شاہی غلاموں کو جو ملتان، لاہور، سامانہ، حصار فیروزہ، ہانسی جیسے اضلاع وشہروں میں آباد تھے انھیں سلطان کے حکم پر گورنروں اور شہروں کے باشندوں نے بلا سبب شہید کر ڈالا[1]۔ جنوری 1390ء میں دہلی پر سلطان (محمد) کے منجھلے لڑکے ہمایوں خاں کے ایک حملہ کو پھر پسپا کر دیا گیا۔ ایک سیاسی تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ شہر دہلی نے ابو بکر کی حامی بھری تھی لیکن نواح کے ضلعی افسران، جو اب بھی ایک مرکزی اقتدار کے خواہش مند تھے، سلطان محمد کو ترجیح دیتے تھے۔ ابو بکر نے جالیسر کے خلاف پیش قدمی کر کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن اسی اثنا میں محمد نے دہلی پر چڑھائی کر دی اور اس پر قبضہ کر لیا۔ اور ابو بکر کو اپنے حریف کے شہر سے بے دخلی کے لیے واپس ہونا پڑا۔

آخر کار، فیروز شاہی غلاموں کی اکثریت ابو بکر سے غیر مطمئن ہو گئی اور حاجب مبشر کی قیادت میں انھوں نے سلطان محمد کو اپنی وفاداری پیش کر دی۔ ان کے بے اطمینانی کے اسباب قلم بند نہیں ہیں لیکن ان کا اندازہ بآسانی لگایا جا سکتا ہے ابو بکر کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ محض دہلی کے شہروں کے وسائل و ذرائع سے غلاموں کو وہ معیار زندگی عطا کر سکے جو فیروز شاہ نے انھیں دے رکھا تھا۔ لیکن فیروزی غلام یہ بھول گئے کہ وہ اپنے آپ کو ایک سنگدل دشمن کے حوالے کر رہے ہیں۔ ابو بکر میوات میں بہادر ناہر کے کوٹلہ (قلعہ) میں بھاگ آیا۔ 8/ ستمبر 1390ء کو غلاموں نے سلطان

---

(1) ایضاً، ص 147، اگر باشندوں (سکنہ) نے بھی قتل میں حصہ لیا تھا تو (ظاہر ہوتا ہے کہ) یقیناً فیروزی غلاموں نے اپنے آپ کو بالکل غیر مقبول بنا لیا تھا۔

محمد کو ابو بکر کے فرار کی اطلاع دی اور وہ تین دنوں کے اندر دہلی پہنچ گیا۔ مبشر کو اسلام خاں کا خطاب دے کر وزیر مقرر کیا گیا۔ لیکن سلطان محمد کا سب سے پہلا کام فیروزی غلاموں سے شاہی ہاتھیوں کی حصولی اور انھیں ان کے پرانے رکھوالوں کے حوالے کرنا تھا۔ غلاموں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی کہ ان کی بالادستی کے دن ختم ہو چکے تھے۔ لہٰذا ان میں سے متعدد راتوں میں اپنے خاندانوں کو ساتھ لے کر بہادر ناہر کے کوٹلہ بھاگ گئے۔ ”جو فیروزی غلام اب بھی شہر میں موجود تھے انھیں تین دنوں کے اندر شہر چھوڑ دینے کی ہدایت کی گئی اور شہر ان گندے لوگوں سے پاک ہو گیا“[1]۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سے مجبور لوگوں نے، جو تین دنوں کے گزر جانے کے بعد سلطان محمد کے ہاتھوں پڑ گئے، دعوا کیا کہ وہ آزاد لوگ ہیں لہٰذا اس نے کہا کہ جو شخص بھی ”“گھرا کھری، کرجنا“ کا صحیح تلفظ ادا کرے گا اسے آزاد آدمی سمجھا جائے گا۔ اس امتحان میں بہت سے ہندستانیوں کی رسوائی ہوئی اور فیروزی غلاموں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ مبارک شاہی میں درج ہے کہ ”یہ کہانی پورے ہند اور سندھ میں بہت مشہور ہے“۔

متعدد امرا راجدھانی آئے اور شہزادہ ہمایوں اور اسلام خاں کی ماتحتی میں ابو بکر شاہ، بہادر ناہر اور پناہ گزیں فیروز غلاموں کے خلاف ایک فوج بھیجی گئی۔ جب جنوری 1391ء میں فوج مہندری کے شہر پہنچی تو دشمن جنگ کے لیے آگے آئے۔ لیکن انھیں شکست ہوئی اور ان کا تعاقب کیا گیا۔ دہلی کی فوج کے دہند کے کنارے کوٹلہ کے قریب خیمہ زن ہوئی۔ سلطان بھی فتح کی خبر سن کر آگیا۔ بہادر ناہر اور ابو بکر نے اطاعت قبول کرلی۔ اوّل الذکر کو عزت کا ایک خلعت پیش کیا گیا اور واپس جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ابو بکر کو امروہہ بھیج دیا گیا۔ جہاں قید میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے ڈیڑھ سال حکومت کی تھی۔

حکومت کے آئندہ دو سال دوآب کے ہندو سرداروں- بیر سنگھ، سبیر، ادھرن، جیت سنگھ راٹھور، بھانو گاؤں کا مقدم، بیر بہاں اور چند وار کا مقدم ابھے چند۔ سے جنگ میں گزرے۔ تفصیل میں جانا ناممکن نہیں ہے۔ لیکن آخر کام ملک عقرب الملک قنوج سے قلعہ میں، رائے سبیر کے علاوہ، ان تمام سرداروں کو ایک کانفرنس

---

[1] (1) ایضاً، ص 150

کے بہانے جمع کر کے انھیں قتل کر دینے میں کامیاب ہو گیا۔

1392ء کے موسم گرما میں وزیر اسلام خاں کو غیر منصفانہ طور پر پھانسی دے دی گئی۔ 1393ء میں سلطان کو ایک جان لیوا مرض لاحق ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس نے بہادر ناہر کے کوٹلہ پر قبضہ کر لیا اور اپنے بیٹے شہزادہ ہمایوں خاں کو شجنا کھوکھر کے خلاف روانہ کیا جس نے بغاوت کر دی تھی۔ اور لاہور کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن 20/ جنوری 1394ء میں سلطان کا جالیسر میں انتقال ہو گیا جہاں اس نے ایک قلعہ بنایا تھا اور جس کا نام اپنے نام پر محمد آباد رکھا تھا۔ لہٰذا شہزادہ ہمایوں کو دہلی سے لوٹ جانا پڑا۔ اس نے چھ سال سات ماہ حکومت کی تھی۔

علاؤالدین سکندر شاہ

سلطان محمد کا منجھلا لڑکا، شہزادہ ہمایوں، 22/ جنوری 1394ء میں سلطان علاؤالدین سکندر شاہ کے خطاب کے ساتھ دہلی میں تخت نشین ہوا۔ خواجہ جہاں کے وزارت کے عہدے کو توثیق کر دی گئی۔ اور اس کے (ہمایوں) باپ کے دیگر افسروں کو بھی پھر سے ان کے عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ مرحوم سلطان کا جنازہ دہلی لایا گیا اور حوض خاص کے کنارے بدر کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ لیکن سکندر کی قسمت میں صرف ایک ماہ سولہ دنوں حکومت کرنا لکھا تھا۔ اس کا انتقال 7/ مارچ 1394ء میں ہو گیا۔

ناصرالدین محمود کی تخت نشینی

جن حالات میں ناصرالدین محمود کی تخت نشینی ہوئی ان سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ چھ یا سات سالوں میں دہلی کی سلطنت کتنی سمٹ گئی تھی۔ وزیر خواجہ جہاں نے بڑی دقتوں کے بعد افسروں کو، اس سے قبل کے وہ دہلی روانہ ہو جائیں، 23/ مارچ 1394ء کو ناصرالدین کی تخت نشینی کے لیے آمادہ کر لیا۔ مرکزی حکومت کے تین اعلا افسران کا ذکر ملتا ہے۔ مقرب الملک کو مقرب خاں کا خطاب دیا گیا اور اسے تخت کا وارث مقرر کیا گیا۔ ملک دولت یاد بیر کو دولت خاں کا خطاب دیا گیا اور اسے باربک کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ عبدالرشید سلطانی کو سعادت خاں کا خطاب دیا گیا اور اسے باربک کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ ملک دولت یاد بیر کو دولت خاں کا خطاب

دیا گیا اور اسے عارض ممالک مقرر کیا گیا۔ بڑے صوبے آزاد ہو چکے تھے اور ان کے حکمرانوں نے دہلی کی کسی رسمی توثیق کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ راجدھانی کے مشرق و مغرب کے صوبوں میں ہندو سرداروں اور غیر مطیع مسلم امرا کی بدولت لاقانونیت کا راج تھا۔ گزشتہ دنوں میں انہیں دہلی کے براہ راست کنٹرول میں لانے کی زبردست کوشش کی جاتی لیکن اب ایک مختلف پروگرام پر عمل درآمد کیا گیا۔ بادشاہ کی پالیسی اور ہندستان کے اتحاد کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وزیر، خواجہ جہاں کو اس کے ساتھی افسروں کی جانب سے سلطان الشرق (مشرق کے سلطان) کا خطاب، اور قنوج سے لے کر بہار تک تمام اضلاع پر حکومت کا حق دے دیا گیا۔ پہلے سے ہی اس سمٹی سمٹائی سلطنت کی اس تقسیم کا بہانہ یہ تھا کہ ہندو سردار اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ ان پر دہلی سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔ خواجہ جہاں اپنی اس مہم میں کامیاب ہو گیا اور جون پور کی مشرقی سلطنت کا قیام عمل میں آ گیا۔

سارنگ خاں کی کاروائیاں

ہو سکتا ہے کہ سارنگ خاں نے، جس کے حوالے دہلی کے حکام نے دیپال پور کیا تھا، ایسی ہی خوش قسمتی کی توقع کی ہو۔ اس نے دیپال پور کی طرف پیش قدمی کی اور اسے اپنے کنٹرول میں لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد لاہور سے بارہ کروہ پر سموتھالا کی جنگ میں اس نے شیخا کھور کو شکست دے دی۔ اور اپنے چھوٹے بھائی عادل خاں کو اس نے لاہور کا گورنر مقرر کر دیا۔ 798ھ (96-1395ء) میں سارنگ نے ملتان کے گورنر خضر خاں پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے سامانہ کے امیر غالب خاں پر حملہ کر دیا۔ غالب خاں بھاگ کر تاتار خاں کے پاس چلا آیا جو دہلی کے ایک حریف بادشاہ نصرت خاں کا وزیر تھا اور تاتار نے، اپنے آقا کے حکم پر، 8/اکتوبر 1397ء کوٹلہ (یا کوہلہ) کی جنگ میں سارنگ خاں کو شکست دے دی اور اسے واپس ملتان بھگا دیا۔ نومبر-دسمبر 1397ء میں تیمور کے بیٹے پیر محمد نے دریائے سندھ پار کر کے اُچھ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے ملتان کے محاصرہ کے لیے پیش قدمی کی اور سارنگ نے چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد غیر مشروط طور پر

ہتھیار ڈال دیے۔

دہلی واقعات 98-1394ء

یہ سلطان ناصر الدین محمود کا زبردست کارنامہ ہے کہ ان جارح افسروں کے باوجود جنھوں نے اس کے لیے نہ تو کوئی طاقت باقی رکھی اور نا ہی کوئی علاقہ وہ بیس قمری سالوں اور دو ماہ تک کسی نہ کسی طور پر خود کو بادشاہ بنائے رکھا۔ جون 1394ء میں مقرب خاں کو دہلی میں رکھ کر اور سعادت خاں کو اپنے ساتھ لے کر وہ بیانہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ لوگ گوالیار کے قریب پہنچے تو سعادت خاں کو اپنے ساتھ لے کر وہ بیانہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ لوگ گوالیار کے قریب پہنچے تو سعادت خاں کے بھائی ملّو اس کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ اس نے علاؤالدین اور مبارک کو گرفتار کر لیا اور قتل کرا دیا۔ لیکن ملّو پناہ کے لیے مقرب خاں کے پاس دہلی کو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ سعادت خاں نے دہلی واپس ہونے کا ارادہ کیا اور سلطان محمود کو اپنے ساتھ واپس لایا۔ لیکن مقرب نے محاصرہ کے مقابلہ کو ترجیح دی جو تین یا اس سے زائد ماہ تک جاری رہا اور سعادت خاں دہلی میں داخل نہ ہو سکا۔ اکتوبر-نومبر 1394ء میں سلطان کے بہی خواہ اسے دہلی لانے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کے ہاتھیوں، سازو سامان اور تمام شاہی لوازمات کو سعادت خاں کے ہاتھوں میں چھوڑ دینا پڑا۔

1395ء کے موسم برسات کی آمد کے وقت سعادت نے فیروز آباد پر قبضہ کر لیا لیکن اپنی آزاد حیثیت کو دستوری شکل دینے کے لیے اسے ایک بادشاہ کی تلاش ہوئی۔ لہٰذا ناصر الدین نصرت شاہ بن فتح خاں بن فیروز کو میوات سے لایا گیا اور فیروز آباد کے شاہی محل (کوشک) میں رکھا گیا۔ "اسے محض ایک کٹھ پتلی (نمونہ) بنا کر رکھا گیا تھا اور ریاست کے تمام معاملات سعادت خاں انجام دیتا" لیکن چند دنوں بعد سعادت خاں کے خلاف اچانک ایک انقلاب رونما ہوا۔ (عدم اطلاع کے سبب) وہ ششدر رہ گیا اور پناہ کے لیے مقرب خاں کے پاس بھاگ آیا جس نے اسے قتل کر دیا۔ فیروز آباد میں نصرت خاں کی حکومت کی دوبارہ تشکیل ہوئی اور محمد مظفر (گجرات کے گورنر کے بیٹے) کو تاتار خاں کے خطاب کے ساتھ وزیر مقرر کیا گیا۔

"اس طرح بادشاہ دور ہو گئے۔ سلطان محمود دہلی میں اور نصرت شاہ فیروز آباد میں۔ مقرب خاں نے بہادر ناہر اور اس کے آدمیوں کو اپنے ساتھ رکھا اور دہلی کا پرانا قلعہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے ملّو کو اقبال خاں کا خطاب دیا۔ اور سیری اس کے ذمہ دے دیا۔ دہلی اور فیروز آباد کے باشندوں کے درمیان ہر روز جنگیں ہوا کرتیں۔ (ان دونوں شہروں کے) مسلمان ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے تھے۔ لیکن کوئی گروہ دوسرے پر حاوی نہ ہو سکا۔ دو آب کے کچھ حصے، پانی پت، سونی پت، روہتک اور جھجر (دہلی سے بیس کروہ تک) ناصر الدین نصرت شاہ کے کنٹرول میں تھے۔ سلطان محمود کے کنٹرول میں صرف دہلی کے مذکورہ بالا دو قلعے (پُرانی دہلی اور سیری) تھے۔ سلطنت کے بڑے صوبوں کے امرا اور ملک بادشاہ بن بیٹھے تھے اور اپنی آمدنی جس طرح چاہتے خرچ کرتے"[1]۔

اس تعطل کو ملّو اقبال نے دور کیا۔ جو ان انتہائی ناعاقبت اندیش مہم جوؤں میں سے ایک تھا جنھوں نے ہندستان کے سیاسی پردے کو داغدار کیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس نے شیخ قطب الدین بختیار کاکی کی قبر پر ایک مقدس قسم کھا کر نصرت خاں کو جہاں پناہ میں لایا لیکن تیسرے ہی دن اس نے اپنے شاہی مہمان پر اچانک حملہ کر دیا۔ جو پہلے تو فیروز آباد آئی کے بعد اپنے وزیر تاتار کے پاس پانی پت بھاگ گیا۔ اقبال نے فیروز آباد پر قبضہ کر لیا۔ دو ماہ مقرب سے جنگ کرنے کے بعد اس سے صلح کر لی۔ تاہم اس نے اچانک مقرب کے گھر پر حملہ کر دیا اور اس کی سابقہ عنایات کو فراموش کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ ملّو اقبال کی پالیسی کے لیے یہ مناسب تھا کہ سلطان محمود کو کسی بھی طرح نقصان نہ پہنچایا جائے۔ "لیکن اس نے ریاست کے تمام امور اپنے ذاتی کنٹرول میں رکھے اور سلطان محض ایک کٹھ پتلی تھا" اقبال کا دوسرا اقدام تاتار خاں کے خلاف پانی پت روانہ ہونا تھا۔ اس کی اطلاع پا کر تاتار خاں نے دہلی پر چڑھائی کر دی۔ لیکن جبکہ اقبال نے دو یا تین دنوں میں پانی پت کو زیر کر لیا، تاتار دہلی کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکا۔ اور مایوس ہو کر اپنے باپ کے پاس گجرات چلا گیا۔

تیمور کے حملہ کے وقت دہلی کی حکومت کے یہی حالات تھے۔ اس حملہ کے

---

[1] مبارک شاہی، ص ص 161-160۔

متعلق گزشتہ باب میں بیان کیا جاچکا ہے اور یہاں اس کا اعادہ ضروری نہیں۔

خضر خاں، جس کو سارنگ نے ملتان سے محروم کر دیا تھا اور جو ممکن ہے کہ اسی بنا پر تیمور کی عنایت کا حقدار بن گیا تھا، حملہ آوروں کے خوف سے میوات بھاگ گیا تھا۔ تیمور نے تحفظ کا وعدہ کر کے اسے بہادر ناہر، مبارک خاں اور زیرک کے ساتھ بلا بھیجا لیکن خضر خاں کے علاوہ سبھی کو قید کر دیا گیا۔ سیوالک میں جب وہ اسے آزاد کر رہا تھا اس وقت اس نے اس سے کہا کہ ”میں دہلی اور وہ سب کچھ جو میں نے فتح کیا ہے تمہارے سپرد کرتا ہوں“ لیکن دہلی اور ان علاقوں میں جہاں سے ہو کر منگول گزرا کرتے تھے طاعون اور قحط زوروں پر تھا۔ خاص طور پر دہلی دو ماہ تک بالکل ناقابلِ سکونت ہو گیا تھا[1] لہٰذا خضر خاں نے اپنے آپ کو ملتان اور دیپال پور میں مستحکم کر لیا اور نہایت غیر دانشمندانہ طور پر دہلی کو دوسروں پر چھوڑ دیا۔

ملّو اقبال خاں کی کاروائیاں 1399-1405ء

نصرت خاں، جس نے دوآب میں کسی جگہ تیمور سے پناہ حاصل کر رکھی تھی، میرٹھ آیا اور دہلی، ”جس حال میں وہ تھا“ پر قبضہ کے قصد سے روانہ ہوا۔ لیکن اس نے ملّو اقبال کے خلاف باران ایک فوج بھیج کر غلطی کی۔ مہم کے کمانڈر شہاب خاں کو چند ہندو پیادہ لوگوں نے قتل کر دیا اور ادھر ملّو اقبال نے دہلی پر چڑھائی کر دی۔ نصرت شاہ میوات بھاگ گیا اور وہیں اس کا انتقال ہو گیا۔ ”دہلی اقبال خاں کے کنٹرول میں آگئی اور وہ سیری کے قلعہ میں مقیم ہو گیا۔ دہلی کے کچھ شہری جو منگولوں کے قتل عام سے بچ گئے تھے، پھر پلٹ آئے اور شہر میں بس گئے۔ تھوڑے ہی وقفہ میں ایک بار پھر سیری لوگوں سے بھر گیا۔ اقبال خاں (اپنی کوششوں سے) دوآب کا ایک حصہ اور دہلی کے آس پاس کے چند اضلاع اپنے اقتدار کے تحت لانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن سلطنت دہلی کے بڑے صوبے اپنے آزاد حکمرانوں کے کنٹرول میں رہے“[1]۔

1399-1400ء کے موسم سرما میں اقبال خاں بیانہ کے شمس خاں کے خلاف روانہ ہوا اور اس سے دو ہاتھی چھین لیے۔ اس کے بعد کٹھیر کی طرف بڑھ کر اس نے

---

(1) ایضاً ص 166-67۔

رائے ہر سنگھ سے خراج وصول کیا۔ 1401-1400ء میں رائے سبیر کی قیادت میں متعدد ہندو سرداروں نے پٹیالی کے قریب اقبال کے خلاف جنگ کی۔ اس نے ان لوگوں کو شکست دے دی اور ان کا اٹاوہ تک تعاقب کیا۔ اور پھر اس نے قنوج کی طرف پیش قدمی کی۔ جون پور کا مبارک شاہ اس کے خلاف نکل کھڑا ہوا لیکن کوئی بھی فوج دریائے گنگا عبور نہ کر سکی لہٰذا ندی کے دونوں جانب آمنے سامنے دو ماہ تک خیمہ زن رہنے کے بعد وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اقبال نے شمس خاں اور مبارک خاں کو اس بات پر تیار کر لیا تھا کہ وہ اس مہم میں اس کے شریک کار بن جائیں لیکن حسب معمول اپنی غداری کا ثبوت پیش کر کے اس نے اب انہیں گرفتار کر لیا اور ہلاک کر ڈالا۔

804ھ (2-1401ء) میں سلطان محمود نے، جس نے طوطاو کرھا گجرات اور دھر (مالوہ) کے حکمرانوں کی مہمان نوازی کا مزہ چکھ لیا تھا، دہلی لوٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ اقبال خاں اس کے استقبال کے لیے باہر آیا اور اسے رہائش کے لیے جہاں پناہ کا شاہی محل (کوشک ہمایوں) دیا۔ لیکن حکومت سے متعلق تمام معاملات اس نے اپنے ہاتھوں میں رکھے لہٰذا اس کے اور سلطان کے درمیان ایک کشمکش ہو گئی۔ تاہم دونوں جون پور کے خلاف روانہ ہوئے۔ اور ابراہیم شاہ شرقی اپنی فوج کے ساتھ ان سے لڑنے آگے بڑھا۔ شکار کے بہانے سلطان محمود اقبال کے کیمپ سے باہر نکل آیا۔ اس نے ابراہیم شاہ کے ساتھ ملاقات کی جس کے ساتھ اس کا کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔ لہٰذا اس نے اچانک حملہ کر دیا۔ اور ملک زادہ ہروی سے قنوج چھین لیا جو اس مقام کا شرقی گورنر تھا۔ شرقی اور دہلی کی فوجیں لڑے بھڑے بغیر اپنے گھروں کو واپس ہو گئیں جب تک ملّو اقبال زندہ رہا۔ سلطان محمود شہر قنوج کی بادشاہت پر ہی قانع رہا۔

تیمور کے حملہ کے انتشار کے دوران گوالیار کے قلعہ پر نر سنگھ دیو نے قبضہ کر لیا تھا اس کے بعد اس کا بیٹا بیرم دیو اس کا جانشین ہو گیا تھا۔ اقبال جیسے محدود ذرائع والے ایک جنرل کے لیے گوالیار کا قلعہ بالکل ناقابل تسخیر تھا۔ دوسرے یہ کہ گوالیار کا رائے دیگر ہندو دو سال گوالیار اور اس کے حلیف رایوں کے خلاف غیر منفعت بخش مہم جوئیوں میں گزارے۔ اس کی قنوج پر قبضہ کر لینے کی کوشش بھی غیر نتیجہ بخش

---

(1) ایضاً، ص168

ثابت ہوئی۔

محرم 808ھ (جون جولائی 1405ء) میں اقبال خاں سامانہ کی طرف روانہ ہوا تھا، جہاں بہرام خاں ترک بچہ نے اقبال کے بھتیجے یعنی سارنگ کے بیٹے کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ لیکن سید جلال الدین بخاری کے پوتے شیخ علم الدین نے مدافعت کی اور اس کے وعدہ پر بھروسہ کر کے بہرام خاں اقبال سے ملاقات کرنے آیا، مزید یہ کہ تلونڈی میں کمال مئین کے (قلعہ) (پر) پہنچ کر اقبال نے رائے داؤد، کمال مینا اور کھل چین بھٹی کے بیٹے رائے ہینو کو اپنے ساتھ لے لیا۔ لیکن اس نے تیسرے دن وعدہ شکنی کر دی۔ اس نے بہرام خاں کی زندہ کھال اتروالی جبکہ دوسروں کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے اور ان کی گردنوں میں قلاوہ ڈال کر انھیں اس کے ساتھ لے جایا گیا۔

اقبال کی مہم کا مقصد خضر خاں، جو اس کے مقابلہ پر اتر آیا تھا، کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچل دینا تھا۔ اجودھیان ضلع میں دھنداندی کے کنارے ایک جنگل میں اقبال خاں کو شکست ہوئی اور 14/اکتوبر 1405ء کو خضر کی فوج نے اسے مار ڈالا اور اس کا قلم شدہ سر خضر خاں کے دار السلطنت فتح پور بھیج دیا گیا۔

سلطان محمود کی دوبارہ بحالی 1405-12ء

دہلی کے امرا نے جو بلا لیڈر رہ گئے تھے، قنوج سے سلطان محمود کو آنے کی دعوت دی لہٰذا وہ آیا اور ایک مختصر فوج کے ساتھ اس نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ ملو اقبال خاں کے خاندان اور اس کے پیروکاروں کو کوئل بھیج دیا گیا۔ اور نیک فطرت بادشاہ نے ان کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا[1]۔ دولت خاں کو ان صوبوں کا فوجدار بنایا گیا جو دوآب میں بادشاہ کے قبضہ میں تھے۔ اور اختیار خاں کو فیروز آباد محل کی ذمہ داری سونپی گئی۔

سلطان محمود کے دو خطرناک پڑوسی تھے۔ مشرق میں شرقی بادشاہ اور مغرب میں خضر خاں نومبر 1406ء میں سلطان محمود قنوج کی جانب روانہ ہوا اور دولت خاں کو ایک فوج دے کر سامانہ کے خلاف بھیجا۔ دہلی اور شرقی افواج ایک دوسرے کے خلاف کنارے آمنے سامنے خیمہ زن رہیں اور اس کے بعد لوٹ گئیں۔ تاہم ابراہیم شرقی نے

---

(1) ایضاً، ص ص 75-174

اپنی فوج کو قایم رکھا اور جیسے ہی دہلی کے سپاہیوں کو واپسی کی اجازت دے دی گئی اس نے قنوج پر حملہ کر دیا۔ اور چار ماہ کے محاصرے کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ ستمبر 1407ء میں ابراہیم شرقی دہلی کے خلاف روانہ ہوا۔ وہ کیچا گھاٹ سے جمنا عبور کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا لیکن یہ افواہ سن کر کہ گجرات کے حکمراں ظفر خاں نے دھر کو فتح کر لیا تھا اور وہ جون پور کے خلاف پیش قدمی کر رہا تھا اس نے راجدھانی واپس ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ سلطان محمود برن اور سنبھل پر دوبارہ قبضہ کر لینے میں کامیاب ہو گیا جہاں ابراہیم نے اپنے افسران متعین کر دیے تھے۔

دریں اثنا دسمبر 1406ء (یا جنوری 1407ء) میں سامانہ کے قریب لڑی گئی ایک جنگ میں دولت خاں نے بیرم خاں ترک بچہ کو شکست دے دی جس نے بہرام خاں ترک بچہ کے انتقال کے بعد سامانہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن چونکہ بیرم خاں نے خضر خاں کی ماتحتی قبول کر لی تھی لہٰذا موا خر الذکر ایک طاقتور فوج لے کر دولت خاں کے خلاف روانہ ہوا۔ دولت خاں جمنا پار بھاگ گیا لیکن جو ملک اور امرا اس کے ساتھ تھے انھوں نے اپنی وفاداری خضر خاں کو پیش کر دی۔ خضر نے حصار فیروزہ کا "شق" قوام خاں کے سپرد کر دیا اور سامانہ اور سنام بیرم خاں سے لے لیے گئے اور انھیں مجلس عالی زیرخاں کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن سرہند اور چند پرگنے بیرم خاں کے سپرد کر دیے گئے۔ "سلطان محمود کے ہاتھوں میں اس کے دوآب کے صوبوں اور روہتک کے ضلع (اقطاع) کے علاوہ کچھ باقی نہ رہا"۔ جیسا کہ آئندہ چند سالوں میں ظاہر ہونے والا تھا، دہلی کو عسکری اعتبار سے ایک فائدہ (گرچہ یہ ایک بدقسمتی بھی تھی) یہ حاصل تھا کہ منگولوں کے قتل عام اتنے تباہ کن ہوئے تھے کہ دس برسوں بعد بھی یہاں ایک حملہ آور فوج کے لیے حسب ضرورت غلّے اور چارے پیدا نہ کیے جا سکتے تھے۔ دسمبر 1408ء میں سلطان محمود حصار فیروزہ کی جانب روانہ ہوا اور قوام خاں نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ لیکن خضر، جو قوام خاں کا حاکم اعلا تھا، اس بات سے فطری طور پر رنجیدہ خاطر ہوا۔ اس نے ملک تحفہ کو ایک فوج کے ساتھ دوآب کی غارتگری کے لیے روانہ کیا۔ جبکہ اس نے خود براہ راست دہلی پر چڑھائی کر دی اور سلطان محمود کا سیری میں اور اختیار خاں کا فیروزہ آباد میں محاصرہ کر لیا۔ لیکن ذخیروں کی کمی نے خضر

خاں کو محاصرہ جاری رکھنے سے باز رکھا۔ لہٰذا وہ راجدھانی فتح پور (یا فتح آباد) لوٹ آیا۔

سلطان محمود 812ھ (1410-1409ء) میں کسی طرح کی مہم پر روانہ نہ ہوا۔ 813ھ (11-1410ء) میں خضر خاں نے تین ماہ کے محاصرہ کے بعد روہتک کو فتح کر لیا۔ "محمود کی سلطنت کے تمام معاملات ٹھپ پڑے گئے۔ وہ اپنے اقتدار کے استحکام کا کوئی ذریعہ سوچ نہ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے آپ کو عیش و طرب میں مشغول کر دیا، 814ھ (12-1411ء) میں خضر خاں نے میوات کے ایک بڑے حصہ کو غارت کیا اور اس کے بعد سری میں سلطان محمود کا محاصرہ کر لیا۔ اختیار نے، جو سلطان محمود کی طرف سے فیروزہ آباد پر قابض تھا، خضر خاں کی اطاعت قبول کر لی اور اس طرح دوآب اور دہلی کے مضافات دونوں ہی خضر خاں کے کنٹرول میں آگئے۔ تاہم غلے اور چارے کی کمی کی بدولت خضر خاں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپریل 1412 میں پانی پت کے راستے فتح پور لوٹ جائے۔

سلطان محمود کا اکتوبر 1412ء میں انتقال ہوگیا اور اس کے امرانے اپنے بادشاہ کی حیثیت سے دولت خاں کے حق میں حلف وفاداری اٹھایا۔ نومبر-دسمبر 1403ء میں خضر خاں دہلی کے خلاف روانہ ہوا اور متعدد مقامات کو زیر کرنے کے بعد سری میں اس نے دولت خاں کا محاصرہ کر لیا۔ چار ماہ محاصرہ جاری رہنے کے بعد دولت خاں نے اپنے آپ کو لاچار پایا اور اطاعت قبول کر لی۔ خضر نے اسے ایک قیدی کی حیثیت سے حصار فیروزہ بھیج دیا اور مئی 1414ء میں دہلی پر قابض ہوگیا۔ ہندستان کے مرکزی حکومت کے عروج کا ستارہ اپنے نقطہ غروب کو پہنچ کر ایک بار پھر آہستہ آہستہ روشن ہونے والا تھا۔

چھٹا باب

سید خاندان

(1414-51ء)

1

خضر خاں

دور سلطنت کے تمام خاندانوں میں سب سے مختصر مدت حیات۔ 37 سال۔ خلجیوں کے بعد، سید خاندان ہی کی تھی۔ لیکن اس کی سوانح حیات نہ تو خلجیوں کے زبردست شہنشاہانہ کارناموں سے اور نہ تغلقوں کے انوکھے انتظامی تجربات ہی سے متصف ہے بہر حال ازمنہ وسطیٰ نے ہندستان کی تاریخ میں یہ ایک خط انفصال ہے، جو ہندستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے سلسلہ میں ایک ایسے دور کی نشاندہی کرتا ہے جب مرکز گریز رجحانات کی شدت باعث نظام حکومت میں ایک مستحکم مرکزی بادشاہت کے تصور کی جگہ انتظامیہ میں علاقائی یا صوبائی (رجحانات) نے لے لی۔ اس دوران بلاشبہ کافی مضطربانہ سیاسی سرگرمیاں عمل میں آئیں لیکن زیریں سطح پر محدود رہیں اور اس (سید خاندان) کی قوت عمل چھوٹے چھوٹے سرداروں اور زمینداروں کی بغاوتوں سے نمٹنے میں ضائع ہو گئی۔ سید سلاطین میں غیر معمولی حد تک اس قسم کی حوصلے مبرا تھے کہ ایک (وسیع) مملکت قایم کی جائے جو کم از کم ان کے اسلاف کی قایم کردہ سرحدوں کے برابر ہو۔ دہلی کی سلطنت کا رقبہ کافی سمٹ گیا۔ اور اس کے حکمراں نہایت محدود حصوں میں اپنی پالیسیوں کی عمل درآمد پر مطمئن رہے، ان کی سیاسی بصیرت دہلی کے چاروں طرف تقریباً دو سو میل کی قطر میں محصور تھی۔

سرکش و باغی سرداروں کے خلاف بے دلی کے ساتھ متعدد تعزیری مہمات کی گئی لیکن ان مہمات سے کوئی مستقل سیاسی مقصد حال نہ ہو سکا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا یہ مقصد بھی نہ تھا، جوں ہی کوئی باغی سردار کچھ خراج ادا کر دیتا یا اس کے آئندہ ادا کر دینے کا ایک مبہم سا وعدہ کر دیتا فوراً ہی ان کا (مہموں کا) خاتمہ ہو جاتا، خطاکار سرداروں کو ہمیشہ معاف کر دیا جاتا، اگر وہ اپنے تمام بقایا خراج ادا کر دیتے۔ غالباً دہلی

سلطنت کی تاریخ میں گزشتہ کسی زمانہ میں بھی اس کے چھوٹے مقاصد کی خاطر اتنی مہمیں اس قدر بے دلی کے ساتھ نہ چلائی گئیں۔ مورلینڈ کا ٹھیک ہی مشاہدہ ہے کہ یہ ایک قابل توجہ حقیقت ہے، کہ ان مہمات میں گورنر اور سرداروں کے ساتھ بہت حد تک ایک ہی طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔ بادشاہ گوالیار کی طرف روانہ ہوتا ہے (متعلقہ) سردار مروجہ (رقم) لگان خواہ ادا کرتا ہے یا نہیں، جیسی صورت رہی، وہ (بادشاہ) بدایوں کی طرف روانہ ہوتا ہے (متعلقہ) گورنر یا تو حاضر ہوتا ہے اور اپنا حساب چکا دیتا ہے یا پھر خود کو قلعہ بند کر لیتا ہے اور اسے باغی سمجھ لیا جاتا ہے، وقتی طور پر یہ صورت حال اس سے مشابہ ہو گئی جسکا سامنا ہمیں اٹھارہ ویں صدی میں ہو گا جبکہ تعلقہ یا "ماتحت علاقوں" میں، یعنی ان علاقوں میں جہاں کوئی فرد آیا گورنر یا جاگیر دار یا (پھر) سردار یا رعیت کی حیثیت سے واقعی طور پر حکومتی اختیارات استعمال کر رہا ہو، ہر طرح کی حقیت اور دائرہ اختیار خلط ملط ہو گئے[1]" اس صورت حال نے یقیناً سید حکومت کے مالیاتی انتظام اور منصوبہ بندی پر برا اثر ڈالا ہو گا، اس دور میں سالانہ آمدنی کا انحصار ریاست کی اپنے سرکش سرداروں کی سرزنش کرنے کی صلاحیت پر تھا۔

ان علاقوں پر بھی، جو دہلی کے ماتحت تھے، حقیقت میں، تغلق امراء کے سرکش اور جاہ طالب امراء کا ہی کنٹرول تھا، ان امراء کا کنٹرول میں رکھنا اتنا ہی دشوار کن تھا جتنا کہ ان کی باغیانہ سرگرمیوں سے اغماض خطرناک تھا، سیدوں نے چند با صلاحیت اور مخلص افسران کو اکٹھا تو کر لیا تھا، لیکن وہ امراء کی ایک ایسی جماعت نہ بنا سکے جو اپنے مزاج میں مخلص ہو اور اپنی فطرت میں وفادار ہو، اس بات نے انکی بنیادی پوزیشن کمزور کر دی اور بے دلی کے ساتھ کی گئی مہمات کی ایک بڑی تعداد تقریباً ناگزیر ہو گئی اس کے علاوہ وہ انتظامیہ میں یکسانیت نہ تھی اور ایسے مختلف قسم کے اشخاص موجود تھے جو اپنے اپنے علاقوں میں مختلف درجات کے اختیارات استعمال کر رہے تھے۔ امراء مقطع، ضابطہ اور زمیندار اور سلطان ان سے مختلف قسم کے ٹیکس۔ محصول، مال، خدمتی اور خراج۔ وصول کرتا۔ اس دور میں اقطاعات کی شقوں میں مزید تقسیم بہت عام ہوئی۔ انتظامیہ کے اس مختلف النوع کردار کے نتیجہ میں سیاسی اتحاد عمل

---

(1) دی ایگریرین سسٹم آف مسلم انڈیا ص 66

کا احساس ناپید ہو کر رہ گیا۔ اور مرکز گریز رجحانات عام اور متشدد ہوتے چلے گئے رایات عالی (شاہی جھنڈا) کے مبہم خطاب کے حامل سید حکمراں کی حیثیت ایک اعلیٰ اقطاعدار سے زیادہ نہ تھی۔

سید خاندان کی سلطنت مسلم بادشاہت کے نظریہ (کی تاریخ) کے ایک دلچسپ تجربہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس خاندان کے بانی خضر خاں نے اپنے آپ کو ایک عجیب و غریب سیاسی صورت حال سے دوچار پایا اس کے دشمنوں نے اسے کمزور بنا کر رکھ دیا۔ حملہ آور اور تاتاریا مغل اس کے عروج کا سبب بنے اور وہ ہر لحاظ سے ایک آزاد پوزیشن نہ حاصل کر سکا۔ مغلوں کی ماتحتی کے اعتراف کی ایک علامت کے طور پر مغل حکمراں (شاہ رخ) کا نام خطبہ میں پڑھا جاتا اور ایک دلچسپ جدت کی شکل دے کر خضر خاں کا نام بھی اس سے منسلک کر دیا گیا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مغل حکمراں کا نام سکوں پر منقش نہیں کیا گیا بلکہ سکوں پر تغلق سلطان کا نام باقی رہا نلسن رائٹ لکھتا ہے کہ "انھوں نے ان ہی سکوں کو جو ماضی قریب میں مروج ہو چکے تھے، محض ان کی تاریخوں میں تبدیلی کر کے برقرار رکھنا زیادہ مناسب سمجھا[1]"

یہ تمام باتیں سیدوں کے سیاسی تصورات اور طرز عمل میں ایک انوکھے دوہرے پن کو ظاہر کر رہی تھی جس کی نظیر عہد وسطیٰ کے ہندستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ غالبًا سید اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے سلسلہ میں مغلوں اور تغلقوں دونوں ہی کے ساتھ اپنی وابستگی کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، تغلق ایک روایتی عزت و احترام کے حامل تھے، خواہ بعد میں وہ کتنے ہی معمولی اور کمزور ہو گئے تھے، جبکہ مغلوں کو ایک قابل لحاظ عسکری طاقت سمجھا جاتا تھا۔ اس دوہرے پن کی ضرورت اسی وقت تک محسوس کی گئی جب تک سیدوں نے اپنا اقتدار نہ جمالیا۔ جیسے ہی یہ مقصد حاصل ہو گیا، ان دونوں ظاہر دارانہ رسموں کو ختم کر دیا گیا، خضر خاں کے جانشین نے اپنے سکوں سے تغلقوں کے ناموں کو حذف کر دیا اور اپنے آپ کو نائب امیر المومنین اعلان کرا دیا۔ 832ھ مطابق 1428ء میں مبارک شاہ نے خود اپنے سکوں کا آغاز کیا اور سید (حکمراں) تمام شاہی اعزازات کا استعمال کرنے لگے۔

---

(1) دی کوائنیج اینڈ میٹرولوجی آف دی سلطانس آف دہلی ص 239

خضر خاں کا عروج

خضر خاں۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے ایک ممتاز امیر ملک ناصر الملک مردان دولت کے ایک متبنیٰ ملک سلیمان کا بیٹا تھا۔ شروع میں مردان کڑا اور مہوبہ ساتھ ہی ضلع بال مئو کے اقطاعات کا ذمہ دار تھا، بعد میں منگولوں کے دباؤ سے نمٹنے کے لیے ملتان کے سرحدی صوبے میں جب ایک نہایت ہوشمند منتظم کار کی ضرورت محسوس ہوئی تو فیروز شاہ نے اسے مشرقی صوبوں سے ملا لیا اور ملتان کا انتظام حکومت اس کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد مردان دولت کے لیے شاہی اعزاز کے ایک اظہار کے طور پر کڑا اور مہوبہ کے اقطاعات مردان کے متبنیٰ بیٹے سلیمان کے سپرد کر دیئے گئے، مردان کے انتقال پر اس کے بیٹے ملک شیخ نے ملتان کا اقطاع پایا اور جب مواخر الذکر کا بھی انتقال ہو گیا تو ملتان کا اقطاعدار سلیمان ہو گیا لیکن سلیمان کی قسمت میں بھی زیادہ دنوں زندہ رہنا نہ تھا چنانچہ اس کی موت کے بعد ملتان کا اقطاع اس کے بیٹے خضر خاں کو سونپ دیا گیا۔

یحیٰی سرہندی کے بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری تقرریاں فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں عمل میں آئی تھیں، لیکن ایسی بات نہیں تھی، بہامد خانی کے مطابق ملتان کی ولایت مردان کو فیروز شاہ کی حکومت کے اختتام کے قریب ملی تھی[1] اور ابو بکر شاہ کے دور حکومت میں اپنی موت تک اس پر قابض رہا۔ اس کے بعد ملتان کی حکومت سلیمان کو سونپ دی گئی[2] سلیمان کی موت کے بعد سلطان محمد شاہ (فیروز شاہ کے بیٹے) نے خضر خاں کو ملتان کی ولایت کا مقطع مقرر کیا[3] فیروز شاہ کی دور حکومت کی ایک نہایت ہی غیر صحت مند خصوصیت موروثی اقطاعات کا حصول تھا اور اسی حصول نے مخصوص خاندانوں کو مخصوص علاقوں میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں مدد پہنچائی اور بالآخر آزاد (شاہی) خاندانوں کی راہ ہموار ہو گئی۔ فیروز شاہ تغلق کی موت کے بعد طوائف الملوکی کی رفتار تیز ہو گئی اور سیاسی اقتدار کے لیے امراء کے درمیان ایک مجتونامہ دور شروع ہو گیا۔ اور راجدھانی سے لے کر شقوں اور اقطاعات تک پورا شمالی ہندستان سیاسی کشمکشوں اور فوجی داؤ پیچ میں پھنس کر رہ گیا۔

---

(1) تاریخ محمدی، ورق 417 الف

1395-96ء میں خضر خاں نے ملو اقبال کے بھائی سارنگ خاں، جو لاہور اور دیپال پور کا گورنر تھا، کے ساتھ جنگ کی اور اس کے نتیجہ میں اسے ملتان کی گورنری سے ہاتھ دھونا پڑا، جسے دہلی نے سارنگ خاں کے حوالے کر دیا خضر خاں نے اپنے آپ کو نہایت مشکل حالات سے دوچار پایا اور میوات کے مقطع بہادر ناہر سے پناہ طلب کی۔ لیکن ہندستان پر تیمور کے حملہ کے ساتھ ہی اس کے دن بھی پھر آئے اور اسے اقتدار پر واپس آنے کا ایک موقعہ مل گیا، جب تیمور نے دہلی پر قبضہ کر لیا، تو میوات سے خضر خاں، بہادر ناہر، مبارک خاں اور زیرک خاں کو طلب کیا گیا کہ وہ اس فاتح کو نذرانہ عقیدات پیش کریں، ہندستان کی سیاسی زندگی اس کے (حملے کے) طوفانی اثر نے سیاسی مہم جوؤں کے لیے ایک راہ کھول دی تھی۔ یحیٰی سرہندی کہتا ہے کہ تیمور نے خضر خاں کو اہمیت دی اور اسے دہلی حکومت بخش دی، اس کے بعد ہندستان سے اپنی روانگی کے موقعہ پر تیمور نے ملتان اور دیپال پور بھی بخش دیا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا ملتان اور دیپال پور کی حکومت دہلی کے انتظام کے علاوہ تھی یا اس کے بدلے میں دی گئی تھی۔ بہر حال اس سے شمالی ہندستان میں خضر خاں کی پوزیشن کافی بڑھ گئی اور سیاسی بالادستی کے لیے دیگر تمام لوگوں پر اسے ایک قطعی فوقیت حاصل ہو گئی پھر بھی اس کی سیاسی راہیں ہنوز ہموار نہ تھیں، تغلق ملک اور امراء کی ایک بڑی تعداد تھی جو خضر خاں کی (اس) ترقی کو برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہ تھی اور جو خود اپنی ترقی کے مواقع کی تلاش میں تھی، دہلی کے تخت تک پہنچنے کے لیے خضر خاں کو بڑی مشقت کے ساتھ راہ نکالنی پڑی۔

تیمور کے ہندستان پر حملہ کے دوران دہلی اور تمام دوسرے خطے جو اس کی زد میں آئے تھے قحط اور طاعون کا شکار ہو کر ویران ہو گئے تھے سلطان نصرت شاہ کچھ دنوں کے لیے دہلی پر قابض ہو گیا لیکن ملو اقبال خاں فوراً ہی برن سے آیا اور اس نے اسے نکال باہر کیا۔ ملو نے سری پر قبضہ کر لیا اور آس پاس کے اقطاعات تک اپنی گرفت وسیع کر لی۔ اس نے دہلی کی نو آبادی کی بھی کوشش کی۔ اس طرح، جبکہ خضر خاں ملتان

---

(2) ایضاً ورق 420

(3) ایضاً ورق 426 (ب)

کی ولایت اور دیپال پور کی شق اور سندھ کے بالائی خطے میں اپنی پوزیشن مستحکم کر رہا تھا اسی وقت ملّو اقبال نے دہلی اور دو آب کے خطّے پر اپنی گرفت مستحکم کرنے کی کوشش کی۔[1]

808ھ مطابق 6-1405ء میں ملّو اقبال جو شرکش مقطعوں کی طاقت و قوت کو کچل دینا چاہتا تھا۔ خضر خاں کے خلاف روانہ ہوا، موا خرالذکر نے اجودھیان کے قریب اس کا مقابلہ کیا اور دریائے دھندا کے کنارے لڑی گئی جنگ میں اقبال کو زبردست شکست ہوئی اس کا زخمی گھوڑا دلدل میں پھنس گیا۔ میدان سے بھاگنے کی اس کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور فوراً ہی اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس طرح خضر خاں کے راستہ سے ایک زبردست حریف ہٹ گیا۔

ملّو اقبال کی موت پر دہلی کے امراء نے سلطان محمود تغلق کو قنوج سے بلایا۔ کمزور اور عیش کا دلدادہ ہونے کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح 1412ء میں اپنی موت تک دہلی اور اس کے نواحی علاقوں پر حکومت کرتا رہا۔ 12-1405ء کی ہی دورانی مدت میں خضر خاں نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی اور دیپال پور کے اس پار تک اس نے اپنے اختیارات کو وسیع کر لیا۔ لیکن دہلی پر قابض ہونے کی اس خواہش کو عملی شکل دینے میں کچھ وقت لگا۔

811ھ مطابق 1408ء میں خضر خاں نے دہلی پر حملہ کر دیا اور سری کے قلعہ میں سلطان محمود کا محاصرہ کر لیا لیکن وہ دارالسلطنت پر قبضہ نہ کر سکا۔ اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور فتح پور واپس ہو گیا، اس نے مزید یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے پنجاب میں اپنی پوزیشن مستحکم کرے اور تب دارالسلطنت پر حملہ کرے۔ 812ھ 10-1409ء میں خضر خاں، بیرم خاں ترک بچہ کے خلاف سرہند روانہ ہوا۔ بیرم نے اپنا خاندان پہاڑیوں پر بھیج دیا۔ اور اس کے بعد اپنی فوجوں کے ساتھ محمود تغلق کے ایک افسر دولت خاں سے جا ملنے کے لیے اس نے پیش قدمی کی، خضر خاں نے دولت کو شکست دے دی اور بیرم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔ دوسرے سال (813ھ مطابق 11-1410ء) خضر خاں میوات کی جانب روانہ ہوا۔ تجارہ، سربستہ کھرول اور اس

---

(1) تاریخ مبارک ص ص 68-167

علاقہ کے دیگر بہت سے شہروں کو تاراج کر لیا اور واپسی میں اس نے سری کا محاصرہ کر لیا۔ اختیار خاں، جو سلطان محمود کی جانب سے فیروز آباد کا انچارج تھا، خضر خاں سے مل گیا لیکن سلطان محمود نے زبردست مزاحمت کی اور خضر خاں کو محاصرہ اٹھالینا پڑا۔ بہر حال اس نے دہلی کے قریب کے چند علاقوں پر اور دوآب پر قبضہ کر لیا اور دہلی کے اطراف تک اپنے اختیارات کی توسیع کے سلسلہ میں اپنی کوشش جاری رکھی۔

سلطان محمود کے انتقال (اکتوبر 1412ء) پر امرا اور مَلکوں نے دولت خاں کے حق میں حلف وفاداری اٹھایا۔ چند ملک مثلاً مبارز خاں اور ملک ادریس نے خضر خاں کا ساتھ چھوڑ دیا اور دولت خاں سے آملے کچھ دنوں خضر خاں خاموشی کے ساتھ ان کی باتوں کا معائنہ کرتا رہا لیکن نومبر دسمبر 1413ء میں وہ دہلی کے خلاف روانہ ہوا اور دروازہ پر خیمہ زن ہو گیا۔ محاصرہ چار ماہ تک جاری رہا۔ دولت نے اپنی مایوس کن صورت حال کا اچھی طرح اندازہ لگا لیا لہٰذا اس نے رحم اور جان بخشی کی درخواست کی۔ خضر خاں نے اسے معاف کر دینے میں کوئی تامل نہ کیا، لیکن اس نے اسے قوام خاں کی نگرانی میں حصار فیروزہ میں اسیر کر دیا۔ اب دہلی خضر خاں کے کنٹرول میں تھی۔

خضر خاں کا دہلی میں داخلہ

17/ربیع الاول 817ھ مطابق 6/جون 1414ء کو خضر خاں اپنی فوج کے ساتھ سری میں داخل ہوا اور سلطان محمود کے محل میں مقیم ہو گیا۔ دہلی کے لوگوں کی خوشنودی اور تعاون حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں جو انتشار اور ابتری کے زمانہ میں کافی مصائب کے شکار ہوئے تھے، بڑے وسیع پیمانے پر ان کو انعام اور وظیفے عطا کیے گئے۔ یحیٰی سرہندی کے مطابق اس بات نے عوام کو خوش حال اور مالا مال کر دیا۔ اہم حامیوں اور امراء کو عہدے اور خطابات ملے، ملک الشرق ملک تحفہ جنہیں تاج الملک کا خطاب ملا تھا، وزیر مقرر کیا گیا۔ سید سلیم کو سہارنپور کا اقطاع اور شق دیا گیا،[2] سلطان کا مشیر خاص ہو گیا اور یحیٰی کے مطابق "سارے امور اسی کے مشورے کے

---

(1) ایضاً، ص 183

(2) ایضاً، ص 183، طبقات اکبری (جلد اوّل ص 266) میں اور ایلیٹ (جلد چہارم ص 47) میں اسے ملک سرور بتایا گیا ہے۔ غالباً "ملک ساروپ" مبارک شاہی کے کاتب کی ایک غلطی ہے۔

مطابق عمل میں آنے لگے"[1] ملک سلیمان کے متبنّیٰ ملک عبدالرحیم کو علاء الملک کا خطاب اور ملتان اور فتح پور کا اقطاع اور شق ملا۔ ملک سروپ[2]؟ (ملک سرور) کو شحنائے شہر اور نائب غیبت مقرر ہوا۔ اور ملک داؤد دبیر ہوا۔ اختیار خاں کو دو آب میں ایک شق ملا اور گزشتہ سلطان محمود تغلق کے غلاموں کو اقطاعات اور دیہاتوں میں توثیق کر دی گئی۔

سیدوں نے جس نئے حکمراں طبقہ کی تشکیل کی کوشش کی تھی اس کے کردار اور بناوٹ کے متعلق قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ (اکثر) افراد کے متعلق بیشتر تفصیلات دستیاب نہیں ہیں، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ مختلف سیاسی اور ثقافتی گروہوں پر مشتمل تھا، اور اس میں اس مجالست کی کمی تھی جو تنہا عہد وسطیٰ کی ایک حکومت کے استحکام کی ضامن ہو سکتی تھی، غالباً سیدوں نے اپنے سیاسی نظام کی اس بنیادی کمزوری کا تدارک ایک ایسے من گڑھت شجرہ نسب کا سہارا لے کر کرنا چاہا جس نے نبیؐ اسلام کے ساتھ تعلق کی بنا پر (ان کی) کم از کم ایک مذہبی برتری کی توثیق کر دی۔

فسانہ نسب نامہ

سید خاندان کے سلسلہ میں واحد ہم عصر ماخذ تاریخ مبارک شاہی کا مصنف لکھتا ہے کہ ایسا بتایا جاتا ہے کہ خضر خاں ایک سید تھا[1] اس کا بیان دو ملفوظات پر مبنی ہے:- اوّل یہ کہ سید جلاج الدین بخاری مخدوم جہانیاں نے ملک سلیمان کا تذکرہ ایک بار سید کی حیثیت سے کیا تھا اور دوم یہ کہ خضر خاں ایک سید کے اخلاقی اوصاف کا حامل تھا، ایک ہم عصر اور اچھے ناقد مورخ کا اس طرح کے سطحی اور ناکافی مواد پر اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھنا حیرت کی بات ہے اگر یحییٰ سرہندی ہمیں اپنی بات کا یقین دلانا چاہتا تھا تو وہ آسانی سے ایک نسب نامہ گڑھ سکتا تھا جس میں خضر خاں (کا شجرہ نسب) کسی امام کے ساتھ ملا دیا گیا ہوتا، یہ کوئی مشکل کام نہ تھا، یحییٰ کا جعلی نسب نامہ معاصرین کو دھوکا تو

---

(1) مبارک شاہی ص 182

(2) یہ تغلق دور کا ایک ممتاز سہروردی درویش تھا اور فیروز شاہ پر بہت زیادہ اثر رکھتا تھا۔ ملاحظہ ہو عفیف کی تاریخ فیروز شاہی، ص ص 16-514۔

نہیں دے سکتا تھا لیکن یہ آئندہ نسلوں کو کچھ حد تک ضرور متاثر کر سکتا تھا، یحییٰ کو یقیناً ان حالات کا علم تھا جن کے تحت یہ لچر قسم کا سرکاری دعویٰ کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کا خواہش مند نہ تھا، کہ ہم اس کے بیان کو سنجیدگی سے قبول کر لیں۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ایک حکمراں کی حیثیت سے اپنی زندگی کے آغاز میں تیمور نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ سیدوں کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے اور یہ کہ انہوں نے یہ حق اسے منتقل کر دیا ہے ممکن ہے کہ خضر خاں نے اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہو لیکن ہندستانی ماحول میں اس کے سید ہونے کی دعویٰ سے اس کا مرتبہ بلند نہ ہوا۔ بعد کے کسی بھی مورخ نے ہمیں اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔ تاریخ محمدی کا مصنف نسب نامہ کے سوال پر معنی خیز انداز میں خاموش ہے۔ خضر خاں اگرچہ یقینی طور پر ایک سید نہ تھا لیکن "سید کا خطاب- اس وضاحت کے ساتھ کہ (یہ) دعویٰ غیر ثابت شدہ ہے اور اسے ثابت نہیں کیا جا سکتا- اس کے خاندان کے لیے بطور سہولت استعمال کیا جا سکتا ہے۔

خضر خاں کی مہمات

خضر خاں کی حکومت کے سات سال سرکش عناصر سے نمٹنے اور بغاوتوں کو فرو کرنے میں گزرے جو اس کی سلطنت کے ہر حصہ میں اژدھے کے روایتی دانتوں کے مانند ابھر آئی تھیں۔ بحران کا سب سے زیادہ شکار کیتھر[1]، بدایوں، اٹاوہ، پٹیالی، گوالیار، بیانہ کمپیل چندوار، ناگور اور میوات کے علاقے تھے، نیم آزاد مقامی سرداروں کے ایک طبقے نے- اقطاع دار زمیندار- جو اس علاقے میں ظہور پذیر ہوا تھا اپنے جغرافیائی صورت حال کا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی سرکشانہ سرگرمیوں کے باعث مرکزی اقتدار کو ہمیشہ برسر جنگ رکھا۔ تاج الملک، جو مشرق میں ہونے والی کاروائیوں کا انچارج تھا، اور زیرک خاں جو مغربی- علاقوں (کی کاروائیوں) کا جوابدہ تھا، کو ساتھ لے کر خضر خاں نے صورت حال سے نمٹنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ 817ھ مطابق 15-1414ء میں سری میں داخلے کے فوراً بعد خضر خاں کو اپنے وزیر

---

(1) روہا کھنڈ، ملاحظہ ہو ایلیٹ جلد چہارم ص 49

ملک الشرق تاج الملک کی ماتحتی میں کیتھر کی طرف ایک فوج روانہ کرنی پڑی۔[1] رائے ہرسنگھ آنولہ[2] کی گھاٹیوں کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن جب اس پر شدید دباؤ ڈالا گیا تو وہ خراج، نقدی اور تحائف[3] (محصول مال و خدمتی) ادا کرنے پر راضی ہو گیا بدایوں کے امیر مہابت خاں نے بھی وزیر کی اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد تاج الملک نے کھور[4] اور کمپیل[5] سرداروں کی سرزنش کی اور گوالیار، سپور اور چند وار کے سرداروں سے خراج (مال و محصول) وصول کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس چند وار کے راجپوت سرداروں سے جاکیسر[6] چھین لیا اور وہاں ایک گماشتہ (ایجنٹ) مقرر کیا، اس کے بعد اٹاوہ[7] کے ہندو سرداروں کی سرزنش کرتا ہوا وہ دہلی لوٹ آیا۔

مغربی صوبے شہزادہ مبارک کے تحت

دوسرے سال 818ھ مطابق 16-1415ء میں خضر خاں نے بیرم خاں کی موت کے بعد تمام مغربی صوبے فیروزپور، سرہند وغیرہ اپنے بیٹے شہزادہ مبارک کے کنٹرول میں دے دیئے۔ ملک سدھو نادرہ کو اس کا نائب اور چند امراء اور مَلِکوں کے ہمراہ جس میں سامانہ کا امیر زیرک خاں بھی شامل تھا راجدھانی واپس ہوا ملک سدھو نادرہ سرہند میں شہزادہ کا نائب مقرر ہوا جون 1416ء میں بیر خاں کے خاندان کے چند ترک بچوں نے بغاوت کردی، انھوں نے ملک سدھو نادرہ کو مار ڈالا اور سرہند پر قبضہ

---

(1) اپنے جانشین مبارک شاہ کے برخلاف، خضر خاں نے اپنے ملکوں کی ذمہ داریاں کو تبدیل کرنے سے پرہیز کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے فیصلے بڑے محتاط طریقے پر کیے جاتے اور سختی سے اس پر قایم رہا جاتا۔

(2) بریلی ضلع میں ایک شہر ہے۔

(3) یحییٰ کہتا ہے کہ محصول و مال و خدمتی (ص 184) ان اصطلاحات کی صحیح تعبیر متعین کرنا مشکل ہے۔

(4) بدایونی (جلد اول ص 276) اس کی شناخت فرخ آباد ضلع میں موجود شمس آباد سے کرتا ہے۔ یہ شمس آباد سے تقریبا چھ میل مشرق میں 27،33 (ڈگری) شمال اور 79، 33 (ڈگری) مشرق میں واقع ہے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر۔ فرخ آباد ص 255، ہنٹر، گزٹ آف انڈیا، بارہویں جلد، ص 375۔

(5) فرخ آباد ضلع میں کمپیل، فتح گڑھ سے 28 میل شمال مغرب میں ایک گاؤں ہے۔

(6) طبقات اکبری (جلد اول ص 266) میں رابری ہے۔

(7) اٹاوہ ضلع میں متھرا سے 38 میل مشرق

کر لیا، خضر خاں نے ملک داؤد اور زیرک خاں کو شر پسندوں سے نمٹنے کے لیے روانہ کیا، ترک بچوں نے براہ راست دہلی کی فوج سے جنگ سے گریز کیا اور پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ دو ماہ تک ان کا تعاقب کیا جاتا رہا، لیکن بالآخر دہلی کی فوج کو تعاقب چھوڑ دینا پڑا1۔

819ھ مطابق 17-1416ء میں خضر خاں نے تاج الملک کو بیانہ اور گوالیار بھیجا شمس خاں اوحدی کا بھائی ملک کریم الدین بیانہ میں اس سے ملاقات کے لیے آیا اور دہلی کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ تب اس کے بعد وزیر نے گوالیار کی طرف پیش قدمی کی، شہر کو تاراج کیا اور رائے اور دیگر سرداروں سے روپے (مال خدمتی) وصول کیا، اس کے بعد وہ کمپیل اور پٹیالی کی طرف مڑا اور پھر کیتھر کی طرف بڑھ گیا۔ رائے ہر سنگھ سے وفاداری کا وعدہ لے کر وہ دہلی واپس آ گیا۔

اگست۔ ستمبر 1416ء (رجب 819ھ) میں گجرات کے سلطان احمد نے ناگور پر چڑھائی کر دی۔ خضر خاں فوراً ناگور کے لیے روانہ ہوا لیکن سلطان احمد دھر کی جانب پسپا ہو گیا۔ اس کے بعد خضر خاں نے اپنی توجہ جھائیں کے امیر الیاس خاں کی جانب مبذول کی، الیاس خاں کو مطیع کر لینے کے بعد خضر خاں گوالیار کی طرف روانہ ہوا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اگرچہ قلعہ ناقابل تسخیر ثابت ہوا لیکن خضر گوالیار سے کچھ خراج (مال و محصول) وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس کے بعد بیانہ کی طرف متوجہ ہوا بیانہ کے شمس اوحدی نے خراج اور ٹیکس (مال و خدمتی و محصول) کی پیشکش کر دی اور خضر خاں دہلی واپس ہو گیا۔

گجرات کے سلطان کے ناگور پر حملہ کر دینے کے باعث سرہند کے ترک بچوں کے خلاف اقدامات میں خلل پیدا ہو گیا تھا، 820ھ مطابق 18-1417ء میں طغان رئیس اور چند ترک بچوں نے، جنہوں نے ملک سدھونا کو مار ڈالا تھا، ایک مرتبہ پھر سرہند میں بغاوت کر دی اور سرہند شہزادہ مبارک کے نمائندہ ملک کمال بدھن کا محاصرہ کر لیا سامانہ کے امیر زیرک خاں کو ترک بچوں کو کچلنے کے لیے بھیجا گیا، جب وہ وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے محاصرہ اٹھا لیا، اور دوبارہ پہاڑ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ زیرک

---

(1) مبارک شاہی، ص 186

نے پایل[1] تک ان کا تعاقب کیا، اور تغان کو تین شرطیں قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ (الف) جرمانہ کی ادائیگی (ب) ان ترک بچوں کو کیمپ سے باہر کر دینا جو ملک سدھو نادرہ کے قتل کے ذمہ دار تھے، (ج) اپنے بیٹے کو یرغمال کے طور پر دہلی بھیجنا۔

اب جب کہ مغربی خطے کے حالات پر وقتی طور پر قابو پایا جا چکا تھا، ادھر کیتھر میں معاملات نے سنگین صورت اختیار کر لی کیتھر کے رائے ہر سنگھ نے 821ھ مطابق 19-1418ء میں دوبارہ بغاوت کر دی، خضر خاں نے اس سے نمٹنے کے لیے تاج الملک کو بھیجا۔ ہر سنگھ نے شکست خوردگی کا مظاہرہ کیا، اس نے کیتھر کو تباہ کر دیا اور اس کے بعد آزردہ ہو کر آنولہ کی گھاٹیوں میں چلا گیا، لیکن اس کا تعاقب کیا گیا اور اس کی فوج اور ساز و سامان کو سخت نقصانات پہنچے، بہر حال اس نے کماؤں کی پہاڑیوں میں پناہ ڈھونڈلی، بیس ہزار مشتمل ایک فوج تعاقب میں بھیجی گئی۔ ہر سنگھ پانچویں دن پہاڑیوں سے باہر آیا۔ دہلی کی فوج زبردست مال غنیمت کے ساتھ واپس لوٹی لیکن اسے رائے کے خلاف کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے بعد تاج الملک نے بدایوں کی طرف اور وہاں سے اٹاوہ کی طرف پیش قدمی کی 1۔ اٹاوہ کے رائے سیر نے اپنے آپ کو قلعہ میں بند کر لیا لیکن آخر کار ایک خراج (مال و خدمتی) دینے پر راضی ہو گیا۔ مئی۔ جون 1418ء میں تاج الملک دہلی واپس ہوا اور اس نے خضر خاں کو خراج اور ٹیکس پیش کیے جس نے اس پر شاہی لطف و کرم کی بارش کی۔

چونکہ کیتھر کے حالات اچھی طرح زیر قابو نہ تھے لہٰذا خضر خاں نے بذات خود رائے کے خلاف روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کوئیل کے اور راہب اور سنبھل[2] کے جنگلوں کے باغی سرداروں کی سرزنش کی اور اس کے بعد بدایوں کی جانب بڑھا اور نومبر۔ دسمبر 1418ء میں اس کا محاصرہ کر لیا۔ مہابت خاں نے چھ ماہ تک مزاحمت کی فتح بالکل قریب تھی کہ اسی اثنا میں چند امراء کی سازش کی خبر نے خضر خاں کو محاصرہ اٹھا لینے اور دہلی واپس آ جانے پر مجبور کر دیا۔

---

(1) پایل اکبر کے دور حکومت میں سرہند کی سرکار میں ایک پرگنہ تھا۔ یہ سرہند سے 25 میل شمال مغرب میں واقع ہے

(2) ایضاً ص 88-187

جو امراء اس سازش میں ملوث تھے ان میں قوام خاں، اختیار خاں اور سلطان محمود کے چند دوسرے غلام شامل تھے۔ خضر خاں نے انھیں ایک تقریب میں، جو 20/ جمادی الاول 822ھ مطابق 14/ جون 1419ء میں دریائے گنگا کے کنارے منعقد کی گئی تھی، مدعو کیا اور ان تمام کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس کے بعد باجوارہ سے خبر آئی کہ ایک فریبی جس نے سارنگ خاں ہونے کا دعویٰ کیا ہے، نے ایک بغاوت کھڑی کر دی ہے۔ سلطان نے سرہند ملک سلطان شاہ لودی کے حوالے کیا اور اسے باغیوں سے نمٹنے کی ہدایت دی۔ ملک سلطان نے خود کو سارنگ خاں کہنے والے جھوٹے دعویدار کو شکست دی اور لاہور کی جانب چلا گیا۔ جو سرہند کا ایک ماتحت علاقہ تھا، جب ملک سلطان اس کے تعاقب میں روانہ ہوا تو وہ اروپر (روپڑ[1]) بھاگ گیا۔ اس کے بعد پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو گیا۔ ملک خیر الدین خانی کو ملک سلطان کی فوج کو کمکیں پہنچانے کی غرض سے روانہ کیا گیا۔ لیکن پہاڑی علاقہ کو قابو میں لانا مشکل تھا۔ لہٰذا دہلی کی فوجوں کو بغیر کسی طرح کی کوئی کامیابی حاصل کیے مہم ترک کر دینی پڑی۔ ملک خیر الدین خانی دہلی لوٹ آیا۔ زیرک خاں سامانہ چلا گیا۔ اور ملک سلطان شاہ روپڑ ہی میں مقیم رہا۔ لیکن جو کچھ اس کی فوج حاصل نہ کر سکی تھی۔ وہ خضر خاں کے دو دشمنوں کے درمیان ایک چند روزہ اتحاد نے ممکن بنا دیا 823ھ مطابق 1420 کے آغاز میں یہ (دعویدار) سارنگ خاں ملک طغان رئیس کے ساتھ دہلی کے سلطان کے خلاف اس کی جدوجہد میں شامل ہو گیا۔ لیکن یہ اتحاد زیادہ دنوں برقرار نہ رہ سکا۔ فرشتہ کے مطابق جب طغان نے یہ دیکھا کہ سارنگ خاں کے پاس کافی مقدار میں ہیرے جواہرات ہیں تو اس نے اسے قتل کر دیا3۔ اس طرح خضر خاں کا ایک زبردست حریف راستہ سے ہٹ گیا۔

اٹاوہ میں صورت حال بگڑنے پر خضر خاں نے 1420ء میں ملک تاج الملک کی

---

(1) ایضاً ص 187

(2) سنبھل مراد آباد کے 22 میل مغرب میں ہے۔

(3) باجوارہ ہوشیار پور کے ڈیڑھ میل مشرق اور جالندھر کے 25 میل شمال میں واقع پینٹر، امپیریل گزیٹیر جلد دوم ص 439

ماتحتی میں ایک دستہ روانہ کیا۔ تاج الملک نے باران اور کوئیل کے سرداروں کی سرزنش کی اور اس کے بعد اٹاوہ پہنچا، اور رائے سبیر کا محاصرہ کرلیا رائے نے اطاعت قبول کرلی۔ اور ایک سالانہ خراج (مال و خدمتی) کی ادائیگی کی پیشکش کی، اس کے بعد تاج الملک نے چندوارہ کی جانب پیش قدمی کی اور اس کو تاراج کیا، کیتھر میں اس نے رائے سنگھ سے ٹیکس اور خراج وصول کیے۔

جولائی 1420ء میں طغان نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور اس نے سرہند کا محاصرہ کرلیا، اور منصور پور اور پائل کے درمیانی خطہ کو تاراج کیا۔ خضر خاں نے بغاوت کچلنے کے لیے خیر الدین کو بھیجا اور اس سلسلہ میں زیرک خاں بھی اس سے آملا۔ لیکن طغان، جسرتھ کھوکر کے علاقے کی طرف فرار ہو گیا اور زیرک خان نے طغان کے اقطاع پر قبضہ کرلیا۔

824ھ مطابق 1421ء میں خضر خاں میوات کی جانب روانہ ہوا بہادر ناہر کے قلعہ میں جو لوگ تھے ان کا محاصرہ کرلیا گیا اور جو لوگ باہر تھے وہ مطیع ہو گئے اور خضر خاں کے ساتھ ہو گئے۔ خضر خاں نے کوٹلہ کے قلعہ کو مسمار کردیا اور اس کے بعد گوالیار کی طرف بڑھا اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اور ملک میں لوٹ کھسوٹ کی۔ گوالیار کے سردار نے خراج ادا کیا۔ اس کے بعد وہ اٹاوہ کی جانب روانہ ہوا۔ اٹاوہ کے سردار رائے سبیر کا انتقال ہو چکا تھا۔ بہرحال اس کے بیٹے نے وفاداری اور خراج (مال و خدمتی) کی ادائیگی کی پیشکش کی۔

13/ جنوری 1421ء کو خضر خاں کے نہایت باصلاحیت وزیر تاج الملک کا انتقال ہو گیا۔ سلطان نے اس کے بڑے لڑکے ملک الشرق ملک سکندر کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ تاج الملک کی موت کے چند ماہ بعد 17/ جمادی الاول 824ھ مطابق

---

(1) سارنگ خاں تیمور کے حملہ کے وقت ملتان اور دیپال پور کا مقطع تھا۔ وہ عوام میں بڑا مقبول تھا۔ اسے یا تو مار ڈالا گیا یا اسے تیمور مرکزی ایشیاء لے گیا۔ چونکہ اس کے اور خضر خاں کے درمیان تعلقات اچھے نہ تھے لہٰذا جان بوجھ کر عوام میں یہ خبر پھیلادی گئی کہ سارنگ خان لوٹ آیا ہے،

(2) مبارک شاہی ص 189، روپڑ، لدھیانہ سے 50 میل شمال مشرق میں ہے۔

(3) فرشتہ، جلد اول، ص 163

20/ مئی 1421ء کو خضر خاں کا انتقال ہو گیا۔

خضر خاں (کے کارناموں) کا ایک جائزہ

خضر خاں بڑا لائق اور صاحب عمل (مستعد) حکمراں تھا جو محض اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک معمولی پوزیشن سے دہلی کے تخت تک پہنچا۔ لیکن دہلی کا تخت مخالفت عناصر کے نرغے میں تھا۔ پنجاب اور کیتھر اور میوات کے علاقوں نے سخت انتظامی مسائل کھڑے کر رکھے تھے، اور باغیوں کے لیے علاقے کی جغرافیائی خصوصیات بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ اور ان کے خلاف کوئی فیصلہ کن اقدام ممکن نہ تھا۔ بہر حال اپنے مَلِکوں مثلاً تاج الملک، زیرک خاں خیر الدین اور چند دوسرے لوگوں، کے تعاون سے اس نے ان علاقوں پر دہلی کا کنٹرول قایم رکھنے کی سخت جدو جہد کی، لیکن کوئی شخص یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ خضر خاں کی یہ کوششیں بے سود تھیں۔ صورت حال اسقدر تغیر پذیر تھی کہ جیسے ہی دہلی کی فوجیں واپس آئیں سردار دوبارہ باغیانہ رویے اپنا لیتے۔ بہر حال اس نے مغرب میں ملتان سے لے کر مشرق میں قنوج تک اور شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر مالوہ کی سرحدوں تک ملک کے تمام خطوں کو سلطنت کے تحت از سر نو متحد کرنے کی زبردست کوشش کی، اس کا نظام حکومت عدل و سخاوت پر مبنی تھا، فرشتہ لکھتا ہے کہ عوام اس کی حکومت میں خوش اور مطمئن تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نوجوان اور بوڑھوں نے غلاموں اور آزاد لوگوں نے (سبھوں نے) سیاہ لباس زیب تن کر کے اس کی موت پر اظہار تاسف کیا"[1]۔

---

(1) تاریخ فرشتہ جلد اول ص 163۔

2

مبارک شاہ (33-1421ء)

خضر خاں کے ذریعہ نامزدگی

خضر خاں نے 1415ء میں مغربی علاقوں کی کمان اپنے بیٹے ملک مبارک کے سپرد کر دی تھی۔ لیکن اپنی موت سے صرف تین دن پہلے اس نے اپنا ولیعہد نامزد کر دیا اور اسے شاہی تخت پر بٹھا دیا۔ اس کی نامزدگی کو تمام اہم امراء اور ملکوں کی منظوری حاصل تھی۔ جب خضر خاں کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے (مبارک شاہ) کے حق میں از سر نو حلف وفاداری اٹھایا اور وہ باضابطہ طور پر 19/ جمادی الاول 824ھ مطابق 22/ مئی 1421ء کو تخت نشین ہوا۔

شمالی- مغربی خطے میں انتظامی کاروائیاں

تخت نشین ہونے کے بعد مبارک نے عموماً تمام امرا اور ملکوں کی ان کے سابقہ اقطاعات اور ذمہ داریوں پر توثیق کر دی۔ لیکن اس نے کچھ رد و بدل بھی کیے۔ حصار۔ فیروزہ اور ہانسی کے اضلاع ملک رجب نادر سے لے لیے گئے اور انھیں سلطان کے ایک بھتیجے ملک الشرق ملک بڈھ کے سپرد کر دیا گیا[1]۔ رجب کو دیپال پور کی شق میں ایک اقطاع دیا گیا۔ یہ تبدیلی حالات کے دباؤ کے تحت ناگزیر بن گئی تھی۔ شمالی مغربی خطے نیز پنجاب میں نظم وانضباط کی عام حالت تشفی بخش نہ تھی اور سرکش عناصر

---

(1) مبارک شاہی، ص 193 طبقات اکبری جلد اول، ص 271۔

سے پنجہ آزمائی کے لیے ایک مضبوط اور طاقتور ہاتھ کی ضرورت تھی۔

جسرتھ کی بغاوت

اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد مبارک کو جسرتھ کھوکر اور طغان رئیس کی بغاوتوں سے نمٹنا پڑا۔ جسرتھ، کھوکر قبیلے کے ایک سردار شخنا کا بیٹا تھا1، جو سیالکوٹ کے قریب رہتا تھا۔ جب تیمور جنوبی پنجاب ہو کر گزر رہا تھا اس وقت جسرتھ نے بلا سوچے سمجھے طانبہ اور دیپال پور کے درمیان اس کی مخالفت کی لیکن جلد ہی وہ اپنے احمقانہ فعل پر نادم ہوا اور شخنا کے پاس بھاگ گیا۔ جب تیمور کے طوفانی حملہ نے شمالی ہندستان کے بے جان سیاسی ڈھانچہ کو مفلوج کر کے رکھدیا تب جسرتھ نے اپنی سرگرمیاں بڑھائیں اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت تو اس کی طاقت کافی بڑھ گئی جب جمادی اول 823ھ مطابق مئی۔ جون 1420ء میں اس نے کشمیر کی ایک خانہ جنگی میں حصہ لیا اور اس کا امیدوار سلطان زین العابدین کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اس کے بعد وہ دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کی بابت سوچنے لگا۔

خضر خاں کی موت نے جسرتھ کو وہ موقعہ مہیا کر دیا جس کا وہ ایک عرصہ سے منتظر تھا۔ سلطان زین العابدین کی مدد حاصل کر کے وہ سیالکوٹ سے تیزی سے روانہ ہوا اور راوی، بیاس اور ستلج کے دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے رائے کمال الدین مائن کے سامنے تلونڈی[2] پہنچا اور لدھیانہ سے لے کر روپڑ تک کے پورے علاقہ کو تاراج کیا چند ہی دنوں بعد اس نے ستلج کو دوبارہ عبور کی اور جالندھر کی طرف روانہ ہو کر زیرک خاں کا محاصرہ کر لیا جہاں تک ممکن ہو سکا اس کی مزاحمت کی گئی اور اس کا مقابلہ کیا گیا، لیکن سید حکمرانوں کی روایات پر چلتے ہوئے اس طرح کی کوئی کوشش نہ کی گئی کہ جسرتھ کو مکمل طور پر مطیع و فرمانبردار بنا لیا جائے۔ اس کے بجائے ایک معاہدہ عمل میں آیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ۔ (۱) جالندھر کا قلعہ خالی کر دیا جائے گا اور اسے طغان کے زیر نگرانی دے دیا جائے (۲) طغان کے ایک بیٹے کو زیرک خاں دہلی لے آئے گا

---

(1) منتخب التواریخ جلد اول ص289، یزدی، ظفر نامہ جلد دوم، ص169، لیکن فرشتہ (جلد اول ص163) اسے شخنا کا بھائی بتاتا ہے۔

(2) تلونڈی، لدھانیہ کے 20 میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔

اور (۳) جسرتھ دہلی کو خراج (خدمتی) دے گا اور خود وطن لوٹ جائے گا۔

جب معاہدہ کی شرائط پر مکمل طور پر اتفاق ہو گیا تو زیرک خاں جالندھر کے قلعہ سے نکلا اور جسرتھ کی فوج سے تقریباً تین کردہ کے فاصلہ پر دریائے پیسی کے کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ جسرتھ اپنے دیئے ہوئے قول سے پھر گیا اور جب زیرک خاں 4/ جون 1421ء کو قلعہ سے باہر نکلا تو اس نے اسے قید کر دیا اور لدھیانہ لے گیا۔ اس کے بعد وہ 22/ جون 1421ء میں سرہند کی طرف روانہ ہوا اور سرہند کے امیر ملک سلطان شاہ لودی کا محاصرہ کر لیا لیکن جسرتھ اپنی تمام کوششوں کے باوجود قلعہ پر قبضہ نہ کر سکا جب مبارک کو ان تمام باتوں کا علم ہوا تو وہ سخت بارش کے باوجود سرہند کے جانب روانہ ہوا۔ دہلی کے سلطان کے ساتھ ایک جنگ سے گریز کرتے ہوئے جسرتھ لدھیانہ کی جانب پسپا ہو گیا اور اس نے زیرک خاں کو رہا کر دیا[1]۔ زیرک فوراً ہی سامانہ میں مبارک سے آملا۔

اب سلطان نے لدھیانہ کی طرف پیش قدمی کی لیکن جسرتھ پہلے ہی ستلدر (ستلج) کو عبور کر چکا تھا اور بحفاظت دریا کے دوسرے کنارے پر جا پہنچا تھا۔ سلطان کے لیے دریا کا عبور کرنا ناممکن بنا دینے کے لیے اس نے تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیا، 9/ اکتوبر (11/ شوال) کو مبارک نے چند امرا، ملک سکندر تحفہ، زیرک خاں، محمود حسن ملک کالو اور دیگر لوگوں کو حکم دیا کہ وہ ندی کو اور آگے جا کر اوپر کے مقام پر پار کریں۔ جسرتھ نے اپنے آپ کو دریا کے کنارے ہی رکھ کر ایک متوازی اقدام کیا۔ لیکن جیسے ہی اس تک یہ خبر پہنچی کہ شاہی فوجوں نے دریا پار کر لیا ہے اس نے مقابلہ کا خطرہ مول نہ لیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مبارک کی فوجوں نے دشمنوں کا تعاقب کیا لیکن جسرتھ نہایت تیزی کے ساتھ جالندھر کی طرف پسپا ہو گیا اور بیاس ندی پار کر لی۔ جب مبارک کی فوجیں بیاس کے قریب پہنچیں تو جسرتھ اور راوی کی جانب بھاگا۔ مبارک نے پہاڑیوں کے دامن میں بیاس عبور کیا اور بھورا کے قریب راوی تک پہنچ

---

(1) مبارک شاہی ص 196، فرشتہ کے مطابق (جلد اول ص 164) جسرتھ کی حراست سے زیرک نے خود نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

گیا۔ جسرتھ نے جہاؤ[1] کو عبور کیا اور تلہار[2] میں داخل ہو گیا۔ جموں کے رائے بھیم کے تعاون سے جو ان کے رہنما کا کام انجام دے رہا تھا دہلی کی فوجیں مزید آگے بڑھیں، سلطان نے جہاؤ کے پار کیا اور جسرتھ کے قلعہ تلہر کو تباہ کر دیا۔ جسرتھ کا جگہ بہ جگہ تعاقب کیا گیا تھا اور اس کے ایک قلعہ کو تباہ (بھی) کر دیا گیا تھا۔ لیکن اسے، مکمل طور پر زیر قابو نہ کیا جا سکا تھا۔ بہر حال، جسرتھ کے خلاف اس مہم کا انجام بظاہر کامیاب ہی رہا اور مبارک محرم 825ھ (دسمبر 1421 - جنوری 1422) میں لاہور لوٹ آیا۔

لاہور کی نو آبادکاری اور فوجی محافظت کی کوششیں

جسرتھ کے خلاف مہم سے اپنی واپسی پر مبارک شاہ نے شہر لاہور کی بحالی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اس وقت یہ اجڑا ہوا اور ویران تھا کیونکہ تیموریوں کی تباہ کاریوں کے بعد یہ بے توجہی کا شکار رہا تھا۔ مبارک کے ایما پر مکانوں کی از سر نو تعمیر و مرمت کی گئی اور لوگوں کو از سر نو آباد کیا گیا۔ قلعہ اور پھاٹکوں کی مرمت میں تقریباً ایک ماہ لگ گیا اس کے بعد لاہور کا اقطاع ملک الشرق محمود حسن کے سپرد کیا گیا۔ اور اس مقام کی فوجی اہمیت اور کھوکھروں اور ترک بچوں کی مستقل شورشوں کے پیش نظر دو ہزار گھوڑوں کا ایک دستہ وہاں متعین کیا گیا۔ لیکن لاہور کی قسمت میں زیادہ دنوں تک پُر امن رہنا نہ تھا۔

جسرتھ کے ساتھ کشمکش

اپریل۔ مئی 1422 میں جسرتھ نے دریائے جہاؤ اور راوی کو عبور کیا اور گھوڑا سواروں اور پاپیادہ سپاہیوں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ لاہور کے قریب جا پہنچا اور شیخ حسین زنجانی 2 کے مقبرے کے قریب وہ خیمہ زن ہو گیا۔ ملک الشرق نے اس کا مقابلہ کیا اور دونوں فوجوں میں 2/ جون کو مڈبھیڑ ہوئی۔ جنگ میں جسرتھ کو شکست ہوئی اور اسے اس کے مٹی سے بنے قلعہ سے نکال باہر کر دیا گیا۔ لیکن پھر دوسرے دن وہ نمودار

---

(1) مبارک شاہ، ص 197، چناب مراد ہے۔

(2) رینکنگ (منتخب التواریخ، جلد اول ص 384) اس کی شناخت چناب کے داہنے کنارے پر واقعہ تلوار کے گاؤں سے کرتا ہے جو بیاس سمر کے ٹھیک سامنے ہے۔ یہ سیالکوٹ سے تقریباً 50 میل شمال میں پہاڑیوں پر واقعہ ہے۔ کے۔ ایس۔ لال کی Twilight of the Sultanat بھی ملاحظہ ہو۔ ص ص 22-321

ہو گیا۔ اس بار یہ جنگ جو قلعہ سے باہر ہوئی ایک ماہ پانچ دنوں تک جاری رہی اور جسرتھ کو قطعی طور پر شکست نہ دی جا سکی۔ وہ کلانور کی جانب بڑھا جہاں رائے بھیم نے جو شاہی فوجوں کی مدد و حمایت کی غرض سے آیا تھا، اس کی مزاحمت کی اور اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن حملہ غیر فیصلہ کن ہی رہا، اب جسرتھ بیاس کے کناروں کی طرف مڑ گیا تاکہ کھوکروں میں سے ایک نئی فوج بھرتی کر سکے۔ لیکن اسی اثناء میں کہ جسرتھ اپنی فوجوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، سکندر تحفہ کی ماتحتی میں دہلی سے کمکیں پہنچ گئیں۔ جسرتھ نے فوراً ہی محمود اور سکندر کی متحد فوجوں کی طاقتوں کا اندازہ لگا لیا اور تلہر کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا[1]۔ لیکن دہلی کی فوجوں نے تعاقب ترک نہ کیا۔

ملک رجب (دیپال پور کے امیر)، ملک سلطان شاہ لودی (سرہند کے امیر) اور رائے فیروز میاں، جسرتھ کے خلاف، جو پنجاب میں سیدہ اقتدار کے لیے ایک سنگین مسئلہ بن گیا تھا، سکندر تحفہ کی کارروائیوں میں شریک ہو گئے۔ جب یہ فوج جموکا کی سرحدوں میں پہنچیں تو رائے بھیم بھی اس میں شامل ہو گیا۔ تب پنجاب کے متعدد امراء کی یہ فوج لاہور کی طرف مڑی۔ مبارک نے ملک محمود حسن کو ایک فرمان بھیجا کہ وہ جالندھر جا کر اپنے آپ کو مضبوط کرے اور نقصانات کی تلافی کرے۔ تب اس کے بعد وہ جسرتھ سے نمٹنے کے لیے واپس آئے۔ وزارت کا عہدہ ملک الشرق سردار الملک کے سپرد کیا گیا اور شحنہ کا عہدہ اس کے ایک بیٹے کے سپرد کیا گیا۔

کیتھر اور کمپیل کے خلاف مہمات

دسمبر، جنوری 23-1422 (محرم 826ھ) میں مبارک کیتھر کی طرف متوجہ

---

(1) یحییٰ سرہندی (ص 197) اس کا نام بھیلم بتاتا ہے اور اسے جموکا "مقدم" کہتا ہے کہ۔ نظام الدین (طبقات اکبری جلد اول ص 272) اس کا صحیح نام "بھیم" بتاتا ہے اور جموں کے راجہ کی حیثیت سے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔

(2) لاہور کے محترم درویشوں میں سے ایک ہیں۔ شیخ علی ہجویری (کشف المحجوب کے مصنف) اور شیخ انجانی ایک ہی پیر کے مرید اور شاگرد تھے اور غزنوی حکومت کے آخری دور میں لاہور آئے تھے۔ ملاحظہ ہو فوائد الفواد (لاہور ایڈیشن 1966) ص 57۔

(3) کلانور، گرداس پور شہر سے 17 میل مغرب میں ہے۔

ہوااور وہاں سے خراج اور ٹیکس (مال و محصول) وصول کیا۔ بدایوں کا امیر مہابت خاں جو خضر خاں کے زمانے میں نہایت خوفردہ ہو گیا تھا، آیا اور اس نے اسے حلف وفاداری پیش کیا۔ اس کے بعد سلطان راٹھوروں کے صوبے کی طرف روانہ ہوا اور اس نے باغیوں اور شرپسندوں کی سرزنش کی۔ وہ چند دنوں گنگا کے کنارے پر مقیم رہا۔ مبازر۔ زیرک خاں اور کمال خاں راٹھوروں سے نمٹنے کی خاطر کمپیل ہی میں چھوڑ دیا گیا2۔

اٹاوہ کے سردار، رائے سبیر کے بیٹے نے، جو مبارک کے ساتھ اس کے خدم و حشم میں ایک بار گھوم چکا تھا، جب ان کاروائیوں کی بابت سنا تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ملک خیر الدین خانی کو ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ کیا گیا۔ لیکن وہ اسے جا پکڑنے میں ناکام رہا۔ لیکن خیر الدین نے رائے کی جاگیر تباہ کر دی اور اٹاوہ پہنچا، جہاں باغیوں کے سرغنہ نے اپنے آپ کو بند کر رکھا تھا مبارک بھی تیزی سے اٹاوہ پہنچا۔ رائے کو مطیع ہونے پر اور بدستور خراج (مال و خدمتی) کی ادائیگی کا وعدہ کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اپریل 1423ء میں سلطان مبارک دہلی واپس آ گیا۔ عارض ممالک کا عہدہ۔ ملک خیر الدین خانی سے لے لیا گیا اور ملک الشرق محمود حسن کے سپرد کر دیا گیا[1]۔

جسرتھ کے خلاف جنگ

قریب قریب اسی وقت جب مبارک اٹاوہ کے معاملات درست کر رہا تھا جسرتھ کھوکر اور رائے بھیم کے درمیان ایک جنگ ہوئی۔ جنگ میں رائے کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا اور زبردست مال غنیمت، گھوڑے اور ساز و سامان جسرتھ کے ہاتھ لگے اس کامیابی سے شہ پا کر اس نے پنجاب میں اپنی سرگرمیوں کا احاطہ وسیع کر لیا۔ کابل کے مغل شہزادوں سے معاہدہ کر کے دیپال پور اور لاہور کو تاراج کیا۔ ملک سکندر اس کے تعاقب کے لیے تیار ہوا لیکن وہ کسی مقابلہ سے بچتا بچاتا فوراً واپس ہو گیا اسی اثناء میں خبر آئی کہ شیخ علی[2] کابل سے بھاگ کر اور سیوستان کے اقطاعات کو لوٹنے

---

(1) مبارک شاہی ص 199۔

(2) فرخ آباد ضلع میں

کی غرض سے آرہا ہے۔ پنجاب اور سندھ کے حالات فوری اقدامات کے متقاضی تھے اور سلطان مبارک نے ملتان اور سیوستان کے اضلاع ملک الشرق محمود حسن کے زیر نگرانی کر دیئے جسے چند ماہ قبل اس نے ملک خیر الدین خانی کی جگہ پر عارض ممالک مقرر کیا تھا۔

ملک محمود حسن ملتان میں

ملک محمود حسن ایک بڑی فوج کے ساتھ ملتان پہنچا اور عوام کے حوصلے و اعتماد کو بحال کیا جنھوں نے ان دنوں کافی مصیبتیں جھیلیں تھیں۔ عوام کی بھلائی میں اس کی گہری دلچسپی نے اسے لوگوں میں ہر دلعزیز بنا دیا۔ جبکہ وافر مقدار میں انعامات پنشنیں اور وظائف، سے لیڈروں کا دل مبارک شاہ کی حمایت جیت لیا۔ اس نے ملتان کے قلعہ کی مرمت کرائی اور س کے دفاعی انتظامات کو مضبوط بنایا دوسرے کسی حملہ کے مقابلہ کے لیے ایک بڑی فوج کی بھرتی کی گئی۔ اسی طرح اس نے اس علاقے میں نظم و انضباط قایم کر دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے جس میں عوام ترقی کر سکیں[1] شمالی مغربی سرحد کے حالات کچھ دنوں کے لیے بہتر ہو گئے۔

گوالیار پر الپ خاں کا حملہ

اسی اثنا میں کہ پنجاب کے حالات دہلی نے سلطان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی، دھر کے حکمراں نے گوالیار پر حملہ کر دیا۔ سلطان سے نمٹنے کے لیے فوراً روانہ ہوا۔ راستہ میں اس نے بیانہ کے سردار سے خراج (مبلغی مال و خدمتی) وصول کیا پھر الپ خاں کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔ الپ خاں نے چمبل کے عام گھاٹوں کو محصور کر رکھا تھا لیکن مبارک نے ایک ایسے مقام سے جس پر نگرانی نہ تھی اچانک دریا پار کر لیا۔ ملک محمود حسن اور نصرت خاں بھی سلطان کے ساتھ ہو گئے۔ ان لوگوں نے

---

(1) ایضاً، ص 201۔

(2) شیخ علی کابل کا نائب تھا، پہلے تو شاہ رخ کے بیٹے سیور غمتش مرزا کی ماتحتی میں اور بعد میں سیور غمتش کے بیٹے مسعود مرزا کابلی کی ماتحتی میں۔

(1) ایضاً ص 202۔

الپ خاں کے ساز و سامان لوٹ لیے۔ الپ کی فوج کے کچھ سپاہیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور بیڑیاں پہنا کر انھیں سلطان کے سامنے لایا گیا لیکن اس نے انہیں آزاد کر دیا۔ دوسرے دن الپ خاں نے امن کی درخواست کی اور سلطان یہ سوچ کر راضی ہو گیا کہ الپ خاں مکمل طور پر دل شکستہ ہو گیا اور پھر وہ دوبارہ سر نہیں اٹھا سکتا۔ الپ خاں کو فوراً گوالیار چھوڑ دینا تھا اور دہلی کے سلطان کو خراج (خدمتی) ادا کرنا تھا۔ سلطان کچھ دنوں معاملات کی درستگی کے لیے چمبل کے کناروں پر مقیم رہا۔ اس نے اس علاقہ سے خراج (مال و محصول) وصول کیا اور جب 827ھ مطابق مئی 1424ء کو دہلی واپس آ گیا۔

محرم 828ھ مطابق نومبر۔ دسمبر 1428ء میں مبارک کیتھر گیا۔ جب وہ گنگا کے کنارے پہنچا تو رائے ہر سنگھ اس سے آملا اور اس وجہ سے اس کی عزت افزائی کی گئی لیکن چونکہ اس نے تین سالوں سے خراج ادا نہیں کیا تھا لہٰذا سے غالباً اس وقت تک حراست میں رکھا گیا جب تک اس نے بقایا رقموں کا حساب صاف نہیں کر دیا۔ سلطان نے گنگا پار کیا اور باغیوں اور شر پسندوں کی سرزنش کی۔ اس کے بعد وہ کماؤں کی پہاڑیوں کے دامن کی طرف بڑھا اور کچھ دنوں وہاں رہا لیکن چونکہ وہاں ٹھنڈک تھی لہٰذا وہ راہب کے کنارے کنارے وطن کی طرف واپس مڑا۔ اس کے بعد وہ کمپیل کے قریب گنگا پار کی اور قنوج کی طرف بڑھا۔ لیکن سخت قحط سالی کے باعث وہ مزید آگے نہ بڑھ سکا۔

میوات میں بغاوت

میواتیوں کے علم بغاوت بلند کرنے کے بعد سلطان اس کے خلاف روانہ ہوا اور ان کے ملک کو تاخت و تاراج کیا۔ میواتیوں نے اپنی سرزمین کو خود ویران کر دیا اور جہرا[1] میں پناہ لی، جو ایک قابل تسخیر محفوظ مقام تھا۔ شاہی فوجیں زخیروں کی کمی کا شکار ہو گئیں اور بغیر کچھ حاصل کیے راجدھانی واپس ہو گئیں۔

ایک سال بعد 1425ء میں سلطان نے دوبارہ میوات کی طرف پیش قدمی کی کیونکہ اس علاقہ کا مسئلہ ابھی بالکل حل نہیں ہوا تھا۔ میواتی سردار- بہادر ناہر کے

---

(1) ایضاً، ص 204، اغلب یہ کہ مقام تجارہ مراد ہے۔ ہوڈی والا ص 405 بھی ملاحظہ ہو

پوتے جلو اور قدو۔ اپنی جگہوں کو برباد کر کے اندور[1] کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ کئی دنوں کے محاصرہ کے بعد، جس کے دوران مبارک کی فوجوں نے سخت دباؤ ڈالا، میواتی سردار پہاڑیوں میں بھاگ گئے مبارک نے اندور کے قلعہ کو مسمار کر دیا اور باغی سرداروں کے تعاقب میں الور کی جانب پیش قدمی کی۔ جلو اور قدو نے اپنے آپ کو الور کے قلعہ میں بند کر لیا۔ بہر حال شاہی فوجوں نے ان پر سخت دباؤ ڈالا۔

اور میواتی سردار ہتھیار رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن قدو نے اپنی پہاڑی جاتے وقت پناہوں میں بھاگنے کی کوشش کر کے پھر بغاوت کی علامت کا اظہار کیا لہٰذا اسے قید میں ڈال دیا گیا اور میوات کو تاراج کیا گیا، لیکن رسد کی کمی نے سلطان کو راجدھانی واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔

بیانہ اور گوالیار

1428ء (محرم 880ھ) کے آخری مہینہ میں مبارک شاہ میانہ کی طرف روانہ ہوا۔ میانہ کے امیر محمد خاں (اوحدی خاں کا بیٹا) نے خود کو قلعہ میں بند کر لیا، جو ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھا سولہ دنوں تک وہ محاصرہ کا مقابلہ کرتا رہا۔ 31 جنوری 1427ء (2/ربیع الثانی 830ھ) کو سلطان ایک عقبی راستہ سے پہاڑی پر چڑھ گیا۔ جب محمود خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس کے حواس باختہ ہو گئے اور رحم کی درخواست کر کے سرنگوں ہو گیا۔ نقدی بیش بہا اشیاء، اسلحہ جات، گھوڑے اور وہ ساز و سامان جو اس نے قلعہ میں بند کر رکھے تھے، بطور نعل بہا[3] حوالے کر دیئے گئے۔ محمود خاں کے خاندان کو باہر نکالا گیا۔ اور جہاں پناہ کے کوشک میں رکھنے کے لیے دہلی بھیج دیا گیا۔ بیانہ کی شق سلطان کے ایک غلام ملک مقبل کے سپرد کر دی گئی۔ ملک خیر الدین تحفہ کو

---

(1) ایلیٹ کے مطابق اندور، نوح ۸ میل جنوب میں نوح اور کوٹلہ کے درمیان میوات کی پہاڑیوں کے مغربی کنارے پر واقع ہے (ایلیٹ Raccs جلد دوم ص ص 100688) اسکا قلعہ، جو ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھا، میواتیوں کا ایک مستحکم مقام تھا۔ پولیٹ (Powlett) کا گزیٹر آف الور ص 35-134 بھی ملاحظہ ہو۔

(2) فرشتہ کے مطابق (جلد اول ص 165) بعض بھگوڑوں نے سلطان کو خفیہ راستہ بتایا تھا۔

(3) اخراجات جنگ، لغوی طور پر ایک ایسا خراج جسے بادشاہ کسی مقام سے گزرتے وقت اس کے حکمراں سے وصول کرتا تھا جو اس گھوڑے کے نعل کی قیمت ہوتی جس پر وہ اس وقت سوار ہوتا۔

سلطان کا قایم مقام مقرر کیا گیا اور سکری لما کا پرگنہ اس کے زیر نگرانی کر دیا گیا۔

اس کے بعد مبارک نے گوالیار کی طرف پیش قدمی کی۔ گوالیار کے راؤں، تھنکر اور چندوار نے اطاعت قبول کر لی اور خراج اور ٹیکس (مال و محصول و خدمتی) قانون قدیم کے مطابق ادا کیا۔ مارچ 1427ء میں سلطان دہلی واپس آیا اور سرحدی اقطاعات کی انتظامیہ میں چند تبدیلیاں کیں۔ ملک الزرق محمد حسن کو حصار فیروزہ کا اقطاع سپرد کیا گیا۔ اور ملک الشرق رجب نادر کو ملتان کے اقطاع کی ذمہ داری سونپی گئی۔

اس کے فوراً بعد محمد خاں دہلی سے بھاگ نکلا اور میوات چلا گیا۔ اس کا خاندان اور دیگر متوسلین جو مختلف جگہوں پر رہ رہے تھے اس سے آ ملے میوات ہی میں اسے ملک مقبل کی اپنے دستہ کے ساتھ بیانہ سے مہر مہاؤں روانگی کی اطلاع ملی۔ ملک خیر الدین تحفہ (صرف قلعہ) کا انچارج تھا۔ مگر اس کے علاوہ بیانہ کی طرف تیزی سے چل پڑا جہاں اس سے اس کے سابقہ حمایتی آ ملے۔ چند ہی دنوں میں اس نے قلعہ پر قبضہ کر لیا[2]۔ مبارک شاہ نے ملک مقبل سے بیانہ واپس لے لیا اور اسے محمد خاں سے موثر طریقے پر نمٹنے کی ہدایت دیگر مبارز کے سپرد کر دیا۔ جیسے ہی محمد خاں نے شہنشاہیت پسندوں کی آمد کی بابت سنا اس نے اپنے آپ کو قلعہ میں بند کر لیا اور ملک مبارک نے بیانہ کی پوری سرزمین پر قبضہ کر لیا۔ اس مقام کی دفاع کی ذمہ داری اپنے چند پیروکاروں کے حوالے کر کے محمد خاں سلطان ابراہیم شرقی سے جا ملنے کے لیے تیزی سے روانہ ہو گیا[3]۔ سلطان مبارک نے بیانہ آنے کا اور اس کے معاملات درست کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اسی اثنا میں اس نے ابراہیم شرقی کی نقل و حرکت کے بارے میں سنا اور اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

ابراہیم شرقی کے ساتھ کشمکش

کالپی کے امیر قادر خاں نے دہلی کو سلطان ابراہیم کی نقل و حرکت کی

---

(1) آگرہ سے ۱۸ میل مغرب میں

(2) مبارک شاہی ص 206

(3) ایضاً، ص 206

تفصیلات سے آگاہ کیا جس نے بھن گاؤں[1] تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اور بدایوں کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ مبارک شاہ نے نوہ پتل میں دریائے جمنا کو پار کیا اور چرتولی کو تاراج کر کے اترولی[2] کے قصبہ کی طرف بڑھا۔ اسی اثناء میں ابراہیم شرقی کا بھائی مختص خاں ایک بڑی فوج کے ساتھ اٹاوہ کے مضافات (حدود) میں پہنچ گیا۔ مبارک نے فوراً ہی اپنی فوج سے دس ہزار کا ایک دستہ علیحدہ کیا اور اسے ملک الشرق محمود حسین کی قیادت میں مختص خاں کے خلاف روانہ کیا۔ مختص خاں کو اس کی اطلاع ہو گئی اور اس سے پہلے کہ دہلی کی فوجیں اس تک پہنچ سکیں وہ دوبارہ ابراہیم کے کیمپ میں شامل ہو گیا۔ محمود نے شرقی کیمپ پر رات میں حملہ کرنے کی کئی کوششیں کیں لیکن دشمنوں کے چوکنا رہنے کے باعث اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ابراہیم شرقی نے اٹاوہ ضلع میں برہان آباد کی طرف پیش قدمی کی۔ مبارک نے اپنا خیمہ دشمنوں کے کیمپ سے کچھ ہی دور پر بین کوٹہ کے قصبہ میں گاڑا۔ لیکن ابراہیم نے راپری کی جانب چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں سے اس نے بیانہ کی جانب پیش قدمی کی اور کٹھیر کے کنارے خیمہ زن ہو گیا۔ مبارک شاہ نے اس کا تعاقب کیا اور چندوار میں جمنا کو پار کر کے دشمن کے کیمپ کے کچھ فاصلہ پر جاکر رک گیا۔ 22 دنوں کی چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے بعد 24؍ مارچ 1428 (7؍ جمادی الثانی 831ھ) میں دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ 3؍ اپریل کو سلطان ابراہیم شرقی نے گدرنگ میں دریا پار کیا اور اپنی مملکت کو واپس ہو گیا۔ مبارک نے گدرنگ تک اس کا تعاقب کیا لیکن مزید تعاقب سے رک گیا۔

اس اطمینان کے بعد کہ شرقی اندیشہ کم از کم کچھ دنوں کے لیے ختم ہو گیا ہے، مبارک نے بھتیاکنٹ کی جانب پیش قدمی کی اور گوالیار کے رائے اور دیگر رایوں سے خراج اور ٹیکس (مال و محصول و خدمتی) وصول کرنے کے بعد وہ بیانہ کی جانب بڑھا۔

---

(1) مین پوری سے ساڑھے نو میل مشرق میں۔ مبارک شاہی میں بھوکانور ہے (ص 207) منتخب التواریخ میں بھونکنون ہے۔

(2) یہ علی گڑھ سے 16 میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ اکبر کے دور حکومت میں یہ سرکار کوئل میں ایک محال تھا (آئین جلد دوم ص 186، امپیریل گزیٹیر جلد اول ص 180)

(3) مین پور ضلع کے شکوہ آباد تحصیل میں

محمد خاں اوحدی نے جس نے شرقی سلطان کی حمایت کی تھی۔ خود کو پہاڑی کی چوٹی پر واقع اپنے قلعہ میں بند کر لیا[1] مبارک نے ایک ہفتہ تک قلعہ کا محاصرہ کیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ محمد خاں کو اس سے رحم کی درخواست کرنی پڑی، سلطان مبارک اسے معاف کر دینے پر راضی ہو گیا اور اس نے قلعہ کے محاصرہ سے اپنی فوج ہٹالی محمد خاں اوحدی قلعہ سے باہر آیا اور میوات چلا گیا۔ سلطان بیانہ میں چند دنوں مقیم رہا اور اس کے دفاع کے انتظامات کیے۔ ملک الشرق ملک محمود حسن کو بیانہ اور اس سے منسلک صوبوں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ مبارک 30/ مئی 1428ء (15/ شعبان 831ھ) کو دہلی واپس آ گیا۔

میواتیوں کے خلاف مہم

جولائی۔ اگست 1428ء میں سلطان مبارک نے میواتیوں کے خلاف ایک سخت اقدام کا فیصلہ کیا جنہوں نے شرقی حکمراں کی حمایت کی تھی، اور (اب بھی) سرکشانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس نے ملک قدو میواتی شرقی حکمرانوں کے ساتھ سفر اور تحائف کے تبادلے کے الزام پر سزائے موت دی۔ ملک سرور الملک کو ان کے قلعوں کو برباد کر دینے کا حکم دیا گیا۔ اس بات نے اس علاقہ کے دیگر سرداروں کو خوف زدہ کر لیا۔ ملک قدو کے بھائی جلال خاں اور دوسرے سرداروں مثلاً احمد خاں، ملک فخر الدین، ملک علی اور اس کے رشتہ داروں نے اپنے آپ کو اندور کے قلعہ میں بند کر لیا۔ جب سرور الملک نے سخت دباؤ ڈالا تو محصرین نے خراج ادا کرنے کی پیشکش کی لہٰذا سرور الملک راجدھانی واپس ہو گیا۔

کھوکروں کے خلاف مہم

اگست ستمبر 1428ء (ذی القعدہ 831ء) میں جسرتھ کھوکر نے کلانور کا محاصرہ کر لیا لاہور کا ایک امیر ملک سکندر تحفہ محصورین کی مدد کے لیے کلانور روانہ ہوا جسرتھ نے محاصرہ اٹھا لیا اور ملک سکندر تحفہ کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا اس کے نتیجہ میں جو جنگ ہوئی اس میں ملک سکندر کو شکست ہو گئی اور وہ لاہور کی طرف پسپا ہو

---

(1) مبارک شاہی ص 209

گیا جسرتھ نے جالندھر کو تاراج کیا لیکن اس پر قابض رہنے میں ناکام رہا اور کلانور چلا گیا اس ہزیمت کی خبر سے سلطان مبارک کو تشویش ہوئی اس نے فوراً سامانہ کے امیر مجلس عالی زیرک خاں اور سرہند کے امیر اسلام خاں کے نام ملک سکندر کی مدد کے لیے بڑھنے کا حکم نافذ کیا۔ اسی اثناء میں ملک سکندر لاہور چھوڑ کر کلانور روانہ ہو گیا اس نے کانگڑا کے قریب جسرتھ کا مقابلہ کیا اور اس کی فوج کو شکست دے دی۔ وہ تمام مال غنیمت جو جسرتھ نے جالندھر سے حاصل کیا تھا، منتشر ہو گیا اور وہ تیزی سے تلہمر کی جانب پسپا ہو گیا۔ ملک سکندر فتحیاب ہو کر لاہور واپس ہوا لیکن جسرتھ کا خاتمہ ابھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح اب بھی مبارک کے لیے ایک امکانی اور اہم خطرہ تھا۔

میواتیوں کی پھر سرکشی

سرکش میواتیوں کی سرگرمیوں نے سلطان مبارک کی توجہ پھر اپنی طرف مبذول کر لی، اس نے حوض خاص کے قریب اپنا خیمہ گاڑھا جہاں امرا اور ملک کے مختلف حصوں سے آ کر اس کے ساتھ ہو گئے۔ وہاں سے اس نے مہندواری کے کوشک کی جانب پیش قدمی کی اور وہاں اپنا صدر مقام قایم کیا جلال خاں میواتی اور دیگر لوگوں نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا اور واجب الادا ٹیکس، تحائف اور خراج (مال و محصول و خدمتی) ادا کر دیا، جولائی۔ اگست 1429ء (شوال 832ھ) میں سلطان واپس ہو گیا اور اس سال وہ کسی دوسری مہم پر روانہ ہوا اسی اثناء میں خبر آئی کہ ملتان کے امیر ملک رجب نادر کا انتقال ہو گیا۔ سلطان نے ملتان کا اقطاع ملک الشرق ملک محمود حسن کے سپرد کر دیا اور اسے عمادالملک کا خطاب بخشا۔

گوالیار کی مہم

30-1429ء میں سلطان نے گوالیار کی طرف پیش قدمی کی وہاں کے باغیوں کی سرزنش کی اور اس کے بعد ہتھیا کانٹ[1] کی جانب بڑھا ہتھیا کانٹ کے رائے کو شکست ہو گئی اور وہ پہاڑیوں کے دامن میں لجپا بھاگ گیا سلطان نے اس کا تعاقب کیا اور باغیوں کی حمایت کرنے کے سبب لجپا کے عوام کی سرزنش کی، اس کے بعد وہ راپری کی

---

(1) ایضاً، ص ص 14-213

جانب بڑھا۔ راپری کا اقطاع حسن خاں کے بیٹے سے لے لیا گیا اور ملک حمزہ کے بیٹے کے سپرد کر دیا گیا۔ مارچ۔ اپریل 1430 (رجب 833ھ) میں سلطان دارالسلطنت واپس آ گیا۔ واپسی کے سفر میں سید سلیم بیمار ہو گیا اور اس کا انتقال ہو گیا۔

سید سلیم کے بیٹوں کی بغاوت

جون-جولائی 1430ء (شوال 833ھ) میں سلطان کو ایک بغاوت سے نمٹنا پڑا جس میں ریاست کے ایک پرانے ملازم سید سلیم کے بیٹے ملوث تھے سید سلیم جس کا مارچ 1430 میں انتقال ہو گیا تھا، خضر خاں کی ماتحتی میں دوآب سرہند کے اقطاعات کا منتظم رہ چکا تھا، اور سلطان مبارک نے سرسوتی[1] کا خطہ اور امروہہ کا اقطاع اسے عطا کیا تھا۔ سید نہایت لالچی آدمی تھا، اور اس نے وافر مقدار میں نقدی، غلے اور دوسری اشیاء کو تبرہندہ کے قلعہ میں جمع کر رکھا تھا[2]۔ اس کی موت پر مبارک نے اس کے اقطاعات اور پرگنوں کو اس کے بیٹوں میں تقسیم کر دیا، سب سے بڑے بیٹے کو سید خاں کا خطاب ملا اور سب سے چھوٹے کو شجاع الملک کا خطاب دیا گیا۔ لیکن سید سلیم کے اختلاف کی خواہشات پوری نہ ہو سکیں، جون 1430ء (شوال 833ھ) میں پولاد ترک بچہ (سید سلیم کے ایک غلام) نے تبرہندہ میں بغاوت کر دی۔ مبارک نے مرحوم سید کے بیٹوں کو قید کر دیا اور ملک یوسف سرور اور رائے ہینو بھٹی کو روانہ کیا کہ وہ پولاد کو اپنی حمایت پر آمادہ کر لیں اور سید کی تمام دولت پر قابض ہو جائیں بہر حال پولاد نے ایک غدارانہ رول ادا کیا اور دہلی افسران کو احساس تحفظ کا جھوٹا دلاسا دے کر اس نے ایک اچانک حملہ کر دیا۔ شاہی فوجوں کو شکست ہو گئی اور پولاد نے اس کے تمام ساز و سامان کو لوٹ لیا اور شاہی فوج شرمسار ہو کر سرسوتی لوٹی۔

اس شکست کی خبر سے مبارک کے حواس باختہ ہو گئے، اور اس نے بذات خود پولاد کے خلاف روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ تبرہندہ روانہ ہوا اور تیزی سے کوچ کرتا ہوا سرسوتی کے خطہ میں جا پہنچا۔ پولاد نے اپنے آپ کو تبرہندہ کے قلعہ میں بند کر لیا، اس

---

(1) ابوالفضل کے مطابق آگرہ کے جنوب مشرق میں ایک ضلع بھدوار کا ایک اہم شہر ہے۔

(2) سرسا، دریائے ستلج اور کھوکھر کے درمیان حصار ڈویزن میں ایک ضلع ہے۔

کے وسائل کافی تھے اور ایک لمبے عرصہ تک مقابلہ کر سکتا تھا۔ زیرک خاں، ملک کالو اسلام خاں اور کمال خاں نے تبر ہندہ کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ ملک الشرق ملتان کے امیر عماد الملک محمود حسن کی پولاد سے نمٹنے کے لیے ملتان سے مدد اور مشورہ کے لیے بلایا گیا۔ اسی اثناء میں پولاد نے ایک درخواست کی کہ وہ عماد الملک پر بھروسہ کرتا تھا اور اگر موا خر الذکر اس کا ساتھ دے تو سلطان کا مطیع ہو جائے گا۔ چنانچہ مبارک شاہ نے عماد الملک کو تبر ہندہ کے قلعہ میں بھیج دیا۔

پولاد اپنی پناہ گاہ سے واپس آیا اور پھاٹک کے سامنے اس نے عماد الملک اور ملک کالو سے ملاقات کی۔ یہ معاہدہ ہوا کہ دوسرے دن پولاد قلعہ سے باہر آئے گا اور سلطان کو سلامی دے گا لیکن اس کی فوج کے چند لوگوں نے پولاد سے کہا کہ اس معاملے میں اس کے لیے خطرہ تھا لہٰذا اس نے مقابلہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سلطان زیادہ دنوں نہ ٹھہر سکتا تھا، کیونکہ سلطنت کے دوسرے حصے اس کی توجہ کے محتاج تھے۔ اس نے عماد الملک کو ملتان واپس بھیج دیا اور خود دہلی واپس آگیا۔ بہر حال خاں اعظم اسلام خاں، کمال خاں، اور رائے فیروز میاں کو تبر ہندہ کا محاصرہ جاری رکھنے اور پولاد کو مطیع کرنے کے لیے خاص احکامات دیئے، ملک الشرق عماد الملک دوبارہ تبر ہندہ آیا، اور اس نے محاصرہ کے لیے ایسے تفصیلی انتظامات کیے کہ ایک شخص بھی باہر نہیں آسکتا تھا، یہ انتظامات کرنے کے بعد وہ ملتان واپس ہو گیا، پولاد اپنی مزاحمت پر چھ ماہ قایم رہا اور نقدی اور تحائف دے کر کابل کے شیخ علی کی مدد بھی حاصل کرلی۔

کابل کے شیخ علی کا حملہ

فروری۔ مارچ 1431ء (جمادی الثانی 834ھ) میں شیخ علی ہندستان پہنچا اور کھوکھر اس کے ساتھ جا ملے۔ شیخ علی کے ایک بھتیجے امیر مظفر اور جسرتھ کھوکر کے ایک بھتیجے خاجیکا نے شیخ علی کی فوج کو تقویت پہنچانے کے لیے سیور اور سلونت [1] سے ایک بڑی فوج اکٹھا کی۔ جب وہ تبر ہندہ پہنچا تو اسلام خاں، کمال خاں اور دوسرے امراء

---

(1) مبارک شاہی ص214 (2) ایضاً ص215

(1) ایضاً ص217۔

نے محاصرہ اٹھالیا اور اپنے اپنے علاقوں میں چلے گئے پولاد قلعہ سے باہر آیا۔ اور اس نے شیخ علی کو دو لاکھ ٹنکے ادا کیے۔ شیخ علی تبر ہندہ سے روانہ ہو گیا لیکن اپنے ساتھ پولاد کی عورتوں اور بچوں کو بھی لیتا گیا، وہ ہندستان میں بیس دنوں رہا، اور اس مدت میں اس نے دیگر شہروں اور دیہاتوں کے علاوہ رائے فیروز کی جاگیر اور اقطاع کو تاراج کیا اور لوٹا۔ عماد الملک نے طلنبہ کی جانب پیش قدمی کی اور شیخ علی کا مقابلہ کرنا چاہا، لیکن مبارک کی جانب سے اسے ہدایات ملیں جس میں ملتان لوٹ جانے اور شیخ علی کے حملہ سے باز رکھنے کا مشورہ تھا۔ مبارک کے متذبذب رویئے سے شہ پاکر شیخ علی نے ملتان کی جانب پیش قدمی کی اور وہاں 7/ مئی 1431ء (24/ شعبان 934ھ) کو پہنچ گیا۔

عماد الملک نے ملک سلطان شاہ لودی (سپاہیوں) کو ایک پیش رودستہ کے طور پر روانہ کیا۔ ایک جھڑپ میں جو 15/ مئی 1431ء کو ہوئی۔ لودی مارا گیا اور شیخ علی نے خسرو آباد پر قبضہ کر لیا اور ملتان کی نمازگاہ تک جا پہنچا۔ لیکن عماد الملک نے خود کو صورت حال سے نمٹنے کا اہل ثابت کیا اور شیخ علی کو ذلت آمیز شکست دی۔

مبارک نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا اور عماد الملک کو کمکیں بھیجیں، خان اعظم فتح خاں زیرک خاں اور ملک کالو، اسلام خاں، ملک یوسف سرور، خان اعظم کمال خان، رائے ہینوذدالجی بھٹی[1] اس کے دفاعی انتظامات میں شریک ہو گئے۔ انھوں نے شیخ علی کی فوج پر حملہ کر دیا جس نے اپنے آپ کو ایک نہایت دشوار حالت میں پایا، عماد الملک کے سپاہیوں نے اس کے بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا اور انہیں لوٹ لیا، جبکہ ان میں سے کچھ جھیلم میں غرق ہو گئے، بہر حال شیخ علی اور امیر مظفر دریا کو تیر کر پار کرتے اور سیور کے قبضہ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ گھوڑوں اور سازو سامان کی شکل میں زبردست مال غنیمت دہلی کی فوجوں کے ہاتھ لگے، حملہ کے انجام کو بیان کرتے ہوئے یحیٰ سرہندی لکھتا ہے کہ "گزشتہ کسی موقع پر کسی دوسرے خطہ میں کسی (حملہ آور) فوج کو اتنی ہولناک مصیبت پیش نہ آئی۔ وہ لوگ جو دریا کی طرف بھاگے غرق ہو گئے اور وہ لوگ جنھوں نے مقابلہ کیا مار ڈالے گئے، اس طرح نہ مقابلہ اور نہ فرار ہی سود مند ثابت ہو سکا"[2] عماد

---

(1) ایضاً ص 220

(2) ایضاً ص 2201-22

الملک محمود حسن اور دوسرے امرا نے سیور تک شیخ علی کا تعاقب کیا لیکن وہ ان کی گرفت سے بچ نکلا اور کابل بھاگ گیا۔ امیر مظفر نے اپنے ذرائع و رسائل پر اعتماد کیا اور خود کو سیور کے قلعہ میں بند کر لیا۔ اسی اثناء میں فوجوں کو مبارک شاہ کی جانب سے حکم ملا کہ سیور کا محاصرہ اٹھا لیا جائے۔

شیخ علی کے ہندستان سے رخصت ہو جانے کے فوراً بعد سلطان مبارک نے ملتان کی انتظامیہ کی تشکیل نو کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا اس نے ملتان کا اقطاع عماد الملک محمود حسن سے لے لیا اور اسے ملک خیر الدین خانی کے سپرد کر دیا یحییٰ سرہندی کے مطابق یہ تبدیلی ناعاقبت اندیشانہ اور غیر دانشمندانہ تھی کیونکہ یہ ملتان میں بغاوت کا سبب بنی۔[1]

جسرتھ کی بغاوت

نومبر۔ دسمبر 1431ء (ربیع الاول 835ھ) میں جب ملک سکندر تحفہ جالندھر کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اسی وقت جسرتھ کھوکر ایک بڑی فوج کے ساتھ اچانک اس کے سامنے آگیا، سکندر نے اپنی چھوٹی سی فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور شکست کھا گیا۔ جسرتھ نے اسے قید کر دیا اور لاہور کی طرف روانہ ہو کر لاہور کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ سکندر کے ایک ماتحت سید نجم الدین اور اس کے ایک غلام خوشخبر نے سخت مزاحمت کی اور قلعہ پر قابض رہے، اسی اثناء میں شیخ علی دوبارہ نمودار ہوا اور اس نے ملتان کی مضافات کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس نے باشندوں پر سخت مصیبتیں ڈھائیں اور طلبہ کے قلعہ کو ڈھا دیا۔ شیخ علی نے طلبہ کے عوام پر مظالم ڈھائے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے یحییٰ سرہندی اظہار خیال کرتا ہے کہ "اگر قصبہ کے بیشتر باشندے یا تو علماء اور قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، یا سید تھے لیکن اس کمینے اور سنگدل ظالم کے دل میں ذرا بھی نہ ہی مسلمانوں کا پاس و لحاظ تھا، اور نہ ہی خدا کے غضب کا خوف تھا، نوجوان عورتوں اور بچوں کو ان کے خاندان سے الگ کر کے ان کے گھروں میں لے جایا گیا، مردوں میں کچھ کو تہ تیغ کر دیا گیا اور کچھ کو چھوڑ دیا گیا"[2]۔

---

(1) ایضاً ص223

(2) ایضاً ص224

ابھی جسرتھ اور شیخ علی کے ذریعہ اٹھایا گیا طوفان تھمنے بھی نہ پایا تھا کہ پولاد ترک بچہ تبرہندہ سے روانہ ہوا اور اس نے رائے فیروز کی جاگیروں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ رائے فیروز کو اپنے مقام کی دفاع کے دوران مار ڈالا گیا، اور پولاد اس کے سر کو تبرہندہ لے آیا، جب ان ہزیمتوں کی خبر سلطان مبارک کو پہنچی تو وہ جنوری۔ فروری 1432ء (جمادی الاوّل 835ھ) میں لاہور اور ملتان روانہ ہوا اور ملک سرور الملک [1] کو بغاوت کے فرو کرنے کے لیے بطور مقدم الجیش روانہ کیا، سامانہ میں شاہی فوجوں کی آمد کی خبر سن کر جسرتھ نے لاہور کا محاصرہ اٹھالیا اور ملک سکندر کو اپنے ساتھ لے کر تلہر کے اپنے پہاڑی قلعہ کی طرف پسپا ہو گیا۔ شیخ علی نے بھی دہلی کی فوجوں کے حملہ سے بچنے کا فیصلہ کیا، اور بار توت [2] کی طرف چلا گیا۔

ہر سنگین شورش کے بعد ملتان اور لاہور کے اوتی غداروں کو تبدیل کر دینا سلطان مبارک کا دستور بن گیا تھا۔ اس نے ملک الشرق شمس الملک کو لاہور کے اقطاع سے محروم کر دیا۔ اور اسے خان اعظم نصرت خاں گرگ انداز کے سپرد کر دیا۔ سرور الملک، شمس الملک کے خاندان کو لاہور کے قلعہ سے باہر لایا اور اسے دارالسلطنت بھیج دیا۔ لاہور کا قلعہ اور جالندھر کا اقطاع اخرت خاں کے تحت آ گیا۔

جولائی۔ اگست 1432ء (ذی الحجہ 835ھ) میں جسرتھ ایک زبردست فوج کی سرکردگی میں لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ نصرت خاں نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے شکست دے دی۔ اس دوران سلطان پانی پت میں ہی اس بات کے لیے تیار ہو کر خیمہ زن رہا کہ کسی بھی شورش زدہ علاقہ کی طرف روانہ ہو سکے،

مئی 1432ء (رمضان 835ھ) میں سلطان نے ملک الشرق عماد الملک کو بیانہ اور گوالیار روانہ کیا تاکہ وہ اس علاقہ کے سرکش لوگوں کی سرزنش کر سکے۔

اگست۔ ستمبر 1432ء (محرم 836ھ) میں سلطان سامانہ روانہ ہوا تاکہ اس علاقہ کے سرکش لوگوں کی سرزنش کی جائے۔ لیکن خود پانی پت میں مقیم رہا۔ اور

---

(1) ایضاً ص 225۔

(2) ایضاً ص 225، پروفیسر ہوڈی والا (409) کی تجویز ہے کہ اس مقام سے مراد غالباً مار کوٹ بامار دات ہے، جواب مغربی پاکستان میں ضلع بنو میں ایک تحصیل ہے۔

سرور الملک کو تبر ہندہ کے خلاف بھیجا، پولاد ترک بچہ نے موثر طور پر اس کا دفاع کیا۔ سرور الملک نے زیرک خاں، اسلام خاں اور ملک راجہ کو کمان میں رکھا اور اس کے بعد وہ سلطان سے ملاقات کے لیے پانی پت کی جانب بڑھا، مہم نے کوئی ترقی نہ کی۔ سلطان نے اس سمت بڑھنے کا خیال ترک کر دیا۔ اقطاعات کی تفویض میں بعض تبدیلیاں کر کے ہی، وقتی طور پر وہ مطمئن ہو گیا، لاہور اور جالندھر کے اقطاعات نصرت خاں سے واپس لے لیے گئے۔ اور انھیں ملکِ الہ داد کالا لودی کے سپرد کر دیا گیا، جب الہ داد جالندھر پہنچا تو جسرتھ نے بیاس پار کیا اور بجوارہ جا پہنچا۔ اس کے بعد جو جنگ ہوئی اس میں الہ داد کو شکست ہو گئی اور پہاڑیوں کے دامن میں کوٹھی چلا گیا۔

میوات کے خلاف مہم

اکتوبر۔ نومبر 1432ء (ربیع الاول 836ھ) میں سلطان نے میوات کی پہاڑیوں کی جانب پیش قدمی کی اور ثاوَرو[1] جا پہنچا۔ جلال خاں میواتی نے اپنے آپ کو اندور کے تقریباً ناقابل تسخیر قلعہ میں بند کر لیا۔ سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کرنا چاہا لیکن جلال خاں نے اسے نذر آتش کر دیا، اور کوٹلہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ غلوں اور ساز و سامان کی بڑی مقدار جو جلال نے اکٹھا کر رکھی تھیں سلطان کے ہاتھوں آئیں۔ لیکن مبارک نے تجارہ کی جانب پیش قدمی کی اور میوات کے علاقہ کو لوٹ لیا جلال خاں نے مطیع ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس نے خراج اور ٹیکس (مال و محصول) ادا کیے[2] تجارہ میں عماد الملک بھی سلطان سے آملا۔ اور بیانہ سے ایک زبردست فوج لے آیا تب سلطان نے گوالیار اور اٹاوہ کے خلاف ملک کمال الملک کی قیادت میں ایک مہم روانہ کی۔

شیخ علی کا دوبارہ حملہ

اس کے فوراً بعد ہی تبر ہندہ پر شیخ علی کے حملہ کی اطلاع موصول ہوئی مبارک فکر مند ہو گیا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں امراء محاصرہ نہ اٹھا لیں جیسا کہ وہ پہلے کر چکے تھے[3]۔ اس لیے عماد الملک کو ان کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا۔ شیخ علی سیور سے

---

(1) مبارک شاہی ص227 (2) ایضاً، ص227

(3) ایضاً، ص227

تیزی سے روانہ ہوا اور لاہور پہنچ گیا۔ ملک یوسف سرور، ملک اسماعیل اور ملک راجہ، جو لاہور کے دفاع کے انچارج تھے، نے اپنے آپ کو قلعہ میں بند کر لیا لیکن جب لاہور کے عوام نے رات میں نگرانی کرنے میں سستی دکھائی تو ملک یوسف سرور اور اسماعیل نے رات میں شہر چھوڑ دیا اور بھاگ نکلے۔ شیخ علی نے، جسے ان کے فرار کی اطلاع ہو گئی تھی۔ ان کے تعاقب میں ایک فوج روانہ کی، شیخ علی کی فوجوں (ان کے) چند سپاہیوں کو مار ڈالا بلکہ کچھ کو قید کر لیا گیا۔ دوسرے دن "شہر کے تمام مسلمانوں کو" قیدی بنا لیا گیا۔ شیخ علی چند دنوں لاہور میں ٹھہرا اور قلعہ کی مرمت کرائی اس کے بعد اپنے پیچھے دو ہزار سپاہیوں کا محافظ دستہ چھوڑ کر وہ دیپال پور کی طرف روانہ ہوا۔ ملک یوسف دیپال پور کے قلعہ کو چھوڑنے ہی والا تھا کہ ملک الشرق نے اپنے بھائی ملک احمد کو اس کی مدد کے لیے ایک فوج کے ساتھ بھیجا۔ چونکہ شیخ علی ملک الشرق سے خوف زدہ تھا، لہٰذا وہ دیپال پور میں نہ ٹھہرا۔

جنوری۔ فروری 1433 (جمادی الثانی 836ھ) میں مبارک سامانہ کی طرف روانہ ہوا جہاں ملک الشرق کمال الملک اس سے آملا۔ اس کے بعد وہ سامانہ بہ راستہ تلونڈی[1] کے مضافات میں پہنچا، عماد الملک اور علم خاں لودی، جنھیں تبرہندہ بھیجا گیا تھا، سلطان سے آملے، دیگر امراء کو بھی قریب رہنے کی ہدایت کی گئی، اس کے بعد سلطان شیخ علی کے تعاقب میں روانہ ہوا جو بھاگ کھڑا ہوا۔ ملک الشرق کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا گیا لیکن شیخ علی نے اپنے گھوڑے اور ساز و سلمان چھوڑ دیئے اور بھاگ نکلا لیکن شیخ کے ایک بھتیجے امیر مظفر نے سیور کے قلعہ کی ایک ماہ تک مدافعت کی لیکن بالآخر اس نے گفت و شنید کا آغاز کیا، اپریل۔ مئی 1433ء (شوال 830ھ) میں اس نے اپنی لڑکی مبارک کے متبنیٰ لڑکے کی زوجیت میں دے دی۔ اور ایک بڑا خراج دے کر دہلی کے سلطان کے ساتھ امن کا معاہدہ کر لیا، مغلوں نے، جن کا لاہور میں محاصرہ کر لیا گیا تھا، ملک الشرق شمس الملک کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ جس نے قلعہ پر قبضہ کر لیا[2]۔ اس کے بعد شیخ علی کے بارے میں کوئی سن گن نہ ملی، سیور کی

---

(1) ایضاً ص 229

(2) ایضاً ص 230

کامیاب مہم کے بعد سلطان نے اپنی فوج، ہاتھی اور خیموں کو دیپال پور میں چھوڑ دیا اور ممتاز درویشوں کے مقبروں کی زیارت کے لیے ملتان چلا گیا، اس کے بعد ہی اس نے کچھ انتظامی تبدیلیاں کیں تاکہ سرحدی دفاعات کو تقویت پہنچ سکے، اور وہ دہلی واپس آ گیا۔

سرورالملک کے اختیارات میں تخفیف اور اس کے ردّ عمل

سلطان نے لاہور اور جالندھر کے اقطاعات شمس الملک سے واپس لے لیے اور انھیں عمادالملک کے سپرد کر دیا۔ بیانہ کو عمادالملک سے لے لیا اور اسے شمس الملک چونکہ سرورالملک وزارات سے متعلق کاموں کے تمام پہلوؤں کی دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا لہٰذا اشراف (محاسبہ)(Auditing) کے فرائض اس سے لے لیے گئے اور انھیں کمال الملک کے سپرد کر دیا گیا، لیکن اس انتظام سے تلخی اور کشمکش پیدا ہو گئی جب مختلف شعبوں کے افسران اور نگراں حضرات نے کمال سے رابطہ قایم کرنا شروع کیا تو اس بات نے سرورالملک کے دل میں بدلہ اور انتقام کے جذبات کو برانگیختہ کر دیا، جس کے دل میں پہلے ہی سے اس بات کا کینہ تھا کہ دیپال پور کا اقطاع اس سے لے لیا گیا تھا، لہٰذا اس نے ایک سازش (انقلاب ملک)[1] کے متعلق سوچنا شروع کر دیا اور اپنے حامیوں کا ایک حلقہ بنا لیا۔ جس میں چند غدار کافر مثلاً کنکو اور کاجو کھتری کے بیٹے، جن کے خاندان قبل سے ہی شاہی دربار کے سائے اور حفاظت تلے رہتے آ رہے تھے، اور جن میں سے ہر ایک کثیر خدمت گزار جاگیر اور اختیارات کا حامل تھا، اور چند غدار مسلمان بھی، مثلاً میران صدر، نائب عرض ممالک، قاضی عبدالصمد، خاص صاحب اور دیگر لوگ شامل تھے"[2] یہ تمام عناصر ایک موقعہ کی تاک میں تھے تاکہ اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

اس اثناء میں جبکہ سرورالملک اس کے خلاف سازشوں کے منصوبے بنانے میں منہمک تھا خود سلطان ایک نئے شہر کی تاسیس میں لگا تھا۔ ایک نومبر 1433ء (17 ربیع

---

(1) ایضاً ص 232

(2) ایضاً ص 232

الاوّل 837ھ) کو اس نے مبارک آباد کی بنیاد ڈالی اور عمارتوں کی تعمیر کے لیے دیدہ زیر انتظامات کیے، اسی ماہ میں تبرہندہ کے قلعہ کی فتح اور پولاد کی موت کی خبر پہنچی جس کا سر سلطان کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ مبارک نے اپنی تعمیری مشغولیتوں سے وقت نکالا، اور تبرہندہ کی طرف اس کے معاملات کی درستگی کے لیے روانہ ہو گیا، لیکن وہ جلد ہی مبارک آباد لوٹ آیا اور دوبارہ نئے شہر کی تعمیر کی نگرانی میں مصروف ہو گیا۔

مبارک کا قتل

غالباً راجدھانی سے سلطان کی مختصر عرصہ کی غیر موجودگی نے سرور الملک کو اپنے منصوبے کی تکمیل کا موقعہ فراہم کر دیا۔ 19/ فروری 1434ء (9/ رجب 837ھ) کو جب سلطان جمعہ کی نماز میں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، میران صدر نے، سرور الملک کی معیت میں، شاہی محافظ کو بڑی چالاکی سے ہٹا دیا، اور چھٹی لینے کے بہانے سے مسلح گھوڑ سواروں کو لایا، (اس طرح) سلطان بے خبری میں ان کی گرفت میں آگیا، کاجو کا پوتا سدھیاں آگے بڑھا اور اپنی تلوار اور نیزے سے سلطان کو قتل کر دیا1۔ یحییٰ سرہندی کے مطابق مبارک نے سترہ سال تین ماہ اور سولہ دن حکومت کی2

مبارک شاہ کو بڑے نامساعد حالات میں زمام حکومت کو سنبھالنا پڑا تھا، اس کی سترہ سالہ حکومت کیتھر، میوات اور شمالی۔ مشرقی خطے میں مستقل عسکری کاروائیوں کا زمانہ تھا، اس نے بھرپور کوشش کی لیکن کوئی ٹھوس اور بامقصد چیز حاصل نہ کر سکا، اس کے سبب کا دریافت کر لینا کچھ مشکل نہیں، فیروز شاہ کے زمانے میں حکومت کے تحت تمام ملازمتیں مستقل اور موروثی قرار دے دی گئیں تھیں۔ فیروز شاہ قانون بنا سکتا تھا، لیکن اس کا نفاذ دوسروں کے ہاتھوں میں تھا، لہٰذا سب سے پہلے تو وزیر جنگ بشیر سلطانی اور اس کے ماتحتین کی بدعنوانیوں کے سبب جو سپاہیوں کی تنخواہوں کو خرد برد کر لیا کرتے تھے، دہلی کی ناقابل تسخیر فوج کا خاتمہ ہو گیا، اور بڑے صوبوں کے حکمرانوں پر کنٹرول قایم رکھنے کے لیے مرکزی حکومت کے پاس کوئی طبعی ذریعہ باقی نہ رہا۔

---

(1) ایضاً ص 234-35

(2) ایضاً ص 235

یہ (صوبائی) حکمراں موروثی تو بناتے گئے تھے، لیکن یہ بات بالکل فطری تھی کہ اگر وہ بھی اپنے ماتحتین کے عہدوں کو موروثی بنادیتے توان کا اثر و رسوخ اختیارات و آمدنی ختم ہو جاتی، دہلی میں فیروز شاہ کے ذریعہ اس بری مثال کے قایم کیے جانے سے قبل دکن کے علاؤالدین بہمنی کو (بھی) اس سوال کا جواب دینا پڑا تھا، بہمنی سلطنت کے باب میں جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا ہے، علاؤالدین بہمنی ان تمام اختیارات کا دعویدار تھا اور ان کا استعمال کرتا تھا۔ جنھیں مسلم شاہی روایات نیز دہلی کی روایات نے سلطان کی ذات سے مختص کر رکھا تھا، اسے اپنے دو اعلیٰ افسران کو اس بات کو جتانے کے لیے پھانسی دینی پڑی تھی، کہ وہ ان (خصوصی) اختیارات کا حامل ہے، لیکن چھوٹے افسران کے سلسلہ میں تبدیلی، برطرفی اور چھوٹی سزائیں ہی (اس مقصد کے لیے) کافی ثابت ہوئیں۔

گجرات، مالوہ، جونپور، بنگال، خاندیش اور معمر آزاد سلطنتوں کے بانیوں کو بھی اس مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا، جب ان علاقوں کے حکمرانوں نے (اپنے) سکوں کو جاری کرواکر اور خطبہ میں اپنا نام داخل کر کے اپنی آواز کا اعلان کیا تو دیگر باتوں کے علاوہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے اقتدار اعلیٰ کے زیر نگیں تمام اقطاعداروں کو یہ آگاہی ہو جائے کہ ان کے اقطاعات اور ان کا اختیار اور عہدے اب موروثی حق کی بنا پر نہیں بلکہ سلطان کی مرضی پر منحصر تھے، جیسا کہ یہ بات صوبائی تواریخ سے متعلق ابواب سے ظاہر ہو جائے گی، ان علاقائی (سلاطین) نے اپنی خود مختاری کے اعلان کے قبل (اپنے علاقوں کی) صوبائی انتظامی مشین پر قبضہ جما لینے۔ (یعنی) اقطاعات کے مالکوں کی برطرفی اور اگر ضروری ہو تو اُنھیں پھانسی دینے کا اختیار (حاصل کر لینے) کی احتیاط برتی۔ اس معاملہ کو احتیاط اور دانشمندی سے طے کرنا پڑتا تھا، رائے عامہ اور اقطاعداروں کی مجموعی رائے دونوں ہی کی حمایت حاصل کرنی پڑتی تھی، اور یہ ثابت کرنا پڑتا تھا کہ صوبائی سلطنت نہ قایم ہو سکنے کی صورت میں صرف طوائف الملکو کی ہی نمودار ہو سکتی تھی، صوبائی گورنروں کے درمیان آزادی کے اعلانات کے سلسلے میں جلد بازی سے کام نہ لیا گیا۔

دہلی جیسی خراب صورت حال کہیں نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے

صوبوں کے گورنروں نے وہ اختیارات اور وقار کھو دیئے تھے جو صوبائی گورنر کو اب بھی حاصل تھے ان پر تغلق بادشاہوں میں سے ایک کا سر کاٹ لیا گیا تھا اور اس کے کٹے ہوئے سر کی عوام میں نمائش کی گئی تھی۔ دیگر لوگوں کو نکال باہر کیا گیا تھا، انھیں تمام اختیارات سے محروم کر دیا گیا تھا، گرچہ وہ نام نہادی طور پر بادشاہ بنے رہے، نتیجتہً دہلی میں شاہی وقار کی بحالی سب سے زیادہ مشکل تھی۔

دیگر سلطنتوں کے بانیوں کی طرح خضر خاں بھی اختیار اعلا حاصل کرنے پر رضامند نہ تھا۔ وہ رایاتِ اعلیٰ (شاہی جھنڈا) کے انوکھے خطاب پر ہی مطمئن تھا، اور جہاں یہ گمان کرنا پڑتا ہے، کہ وہ خود کو تیمور کے سب سے چھوٹے لڑکے ہرات کے مرزا شاہ رخ کا نائب ظاہر کرنا چاہتا تھا، اس طرح کی پالیسی لئے ہوئے عوام کی وفاداری حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن تیمور کے ذریعہ اس کی تقرری ہی صرف ایک ایسا دعویٰ (حقیقت) تھا جو وہ پیش کر سکتا تھا، جب مبارک شاہ نے اپنے سکوں کا اجرا کیا اور خطبہ میں اپنے نام کو پڑھوایا تو وہ صرف اسی نظیر کی تقلید کر رہا تھا، جو صوبائی گورنر نے قایم کر دی تھی، لیکن کیا اعلیٰ افسران (اس کی) اطاعت کریں گے؟ اصل سوال یہ تھا، خضر خاں نے جو بذات خود ایک ایسے زمانہ انتشار کی پیداوار تھا، جس میں ذاتی مفادات کے باعث دہلی کی سلطنت کے ساتھ وفاداری کا جذبہ ختم ہو چکا تھا، اس سوال کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، مبارک شاہ نے اقطاعات کی تبدیلی کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسے انتظامیہ پر مکمل اختیار حاصل تھا، اس کی کوشش یہ ہونی چاہیۓ تھی، اور غالباً یہی تھی، کہ ایک ایسا طبقہ قایم کیا جائے، جو بادشاہ اور ملک کا وفادار ہو، غالباً اس کی تبدیلیاں بہت جلد ہوتیں لہٰذا ایک افسر کے لیے اپنی صلاحیت کے مطابق اچھے کام کا مظاہر کرنا ناممکن ہو گیا، شاید وہ ایک لائق مردم شناش نہ تھا، اور اس نے غلط لوگوں پر بھروسہ کیا۔ شاید ملّو اقبال کی خبیث روح۔ حریص اور ناشکر گزار روح۔ اب بھی دہلی کے سیاست دانوں کے دماغ پر چھائی تھی، کوئی ایسا اصول نہ تھا جس کا مبارک یا (اس کا باپ) سہارا لے سکتے تھے، اور نا ہی کوئی حیرت انگیز کارنامہ تھا جو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ منسوب کیا جا سکتا تھا، صوبائی سلاطین نے بھی، کام کا ایک متعین اصول بنا کر، ان سے زیادہ بہتر کام انجام دیئے، پھر بھی شہید سلطان۔ وہ سلطان جو رذیل احسان

فراموش لوگوں کے ہاتھوں شہید ہوا اس سے انصاف برتنے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ (جیسا کہ فرشتہ کہتا ہے) وہ ایک "مہذب و شائستہ شہزادہ" تھا اور بہت نمایاں خوبیوں کا حامل تھا۔

3

مبارک شاہ کے جانشین

محمد شاہ (43-1434ء)

مبارک شاہ کے قتل کا کام انجام دے کر میران صدر نے اپنی کامیابی کی اطلاع سرورالملک کو دی، جو اس پر بہت خوش ہوا لیکن محمد شاہ، جسے شہید سلطان نے اپنا متبنّی بنا لیا تھا، کی حمایت کر کے اس نے جرم میں غیر ملوث ہونے کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ 19/ فروری 1434ء (9/ رجب 837ھ) کو محمد شاہ (ابن فرید شاہ، ابن خضر خاں[1]) "امرا، ملک، امام، سیدوں، ممتاز لوگوں، عوام، علماء و قضاۃ کی رضامندی سے تخت نشین ہوا"[2]۔ سرورالملک نے حلف وفاداری تو اٹھایا لیکن نہایت خود پسندی کا مظاہرہ کیا اور خزانے، ہاتھیوں اور اسلحہ خانے پر قابض ہو گیا۔ اسے نئے سلطان سے خان جہاں کا خطاب ملا۔ میران صدر کو معین الملک کا خطاب ملا۔

کمال الملک اس بات پر تیار نہ تھا کہ مبارک کے قتل کو بلا انتقام چھوڑ دیا جائے لیکن حالات کے تحت وہ بالکل مجبور تھا۔ دوسری طرف سرورالملک اپنے اہم منصبوں نیز ان افسران سے جو مرحوم سلطان سے تعلق رکھتے تھے چھٹکارا پانے کے لیے فکر مند تھا۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے دوسرے دن اس نے مبارک شاہ کے چند اعلا امرا اور غلاموں (بندگان) کو جنھیں ماہی مراتب کی مراعات حاصل تھی بیعت کے بہانے بلایا۔ ان میں سے چند کو اس نے مار ڈالا اور چند کو قید میں ڈال دیا۔

امیر کوہ (زراعت کے امیر) ملک سورا کو قتل کر دیا گیا۔ ملک کرم چند، ملک

---

(1) مبارک شاہی، ص236

نوٹ:- لیکن تاریخ محمدی کا مصنف کہتا ہے کہ وہ بودھا کا بیٹا اور خضر خاں کا پوتا تھا (ورق 428الف)

(2) مبارک شاہی، ص236

مقبل، ملک فتوح اور ملک بیرا کو قید میں ڈال دیا گیا۔ ان امرا سے نجات حاصل کرنے کے بعد سرور نے انتظامیہ کی از سر نو تقسیم کے ذریعہ خود اپنے حمایتوں کا ایک گروہ بنانے کی کوشش کی۔ بیانہ، امروہہ، نارنول، کہرام اور دوآب کے چند پرگنات، سیدھ پال سدھارن اور ان کے رشتہ داروں کو دیے گئے۔ سیدھ پال کے ایک غلام رانو کو روانہ کیا گیا کہ وہ بیانہ کی شق اپنے قبضہ میں کر لے۔ سرور الملک نے پورے انتظام حکومت کو اپنے کنٹرول میں لانے کی کوشش کی لیکن اس کے تمام منصوبے یکے بعد دیگرے ناکام ہو گئے۔ جب رانو بیانہ پہنچا اور قلعہ کو قبضہ کرنے کی کوشش کی تو یوسف خاں اوحدی نے اس سے مقابلہ کیا اور ایک جھڑپ کے دوران اسے مار ڈالا۔ قلعہ کے پھاٹک پر اس کے سر کی نمائش کی گئی اور اس کے خاندان کو حراست میں لے لیا گیا۔ یہ غصہ اور کرب کا پہلا جراتمندانہ اظہار تھا۔ جو اس گروہ کے دلوں میں پک رہا تھا جو مبارک کے خاندان کے وفادار تھے اور بادشاہ کے قاتلوں کو سزا دینا چاہتے تھے۔

سرور الملک نے کمال الملک کی قیادت میں جس کی وفاداری پر اس وقت اسے شبہ نہ تھا، خان اعظم سید خاں (سید سلیم کا بیٹا)، سدھارن کنکو اور خود اپنے بیٹے ملک یوسف کی معیت میں باغیوں سے نمٹنے کے لیے ایک فوج روانہ کی۔ پہلے تو ملک اِلٰہ داد نے سوچا کہ گنگا عبور کر کے کسی دوسری جگہ چلا جائے اور جنگ سے گریز کرے لیکن جب اسے سرور الملک سے کمال الملک نے اپنے غلام ملک ہوشیار کو کمال الملک کی مدد کے بہانے سے بھیجا۔ اُس کے فوراً بعد میاں جیمن بھی بدایوں سے اپنی فوج کے ساتھ آیا اور آہر میں ملک اِلٰہ داد کے ساتھ جا ملا۔ ملک یوسف، ہوشیار اور سدھارن نے (اب) اپنے آپ کو ایک نہایت مشکل صورت حال سے دوچار پایا اور وہ کمال الملک سے خوف زدہ ہو گئے۔ ملک اِلٰہ داد اور ملک جیمن (کی فوجوں) اتحاد کو نہ روک سکنے پر سرور کی فوج دہلی کی جانب پسپا ہو گئی۔ جب کمال کی فوجی صفوں میں اضافہ ہو گیا اور اس کے حامیوں کی تعداد بڑھ گئی تب وہ 12/ مئی 1434ء (2/ شوال 837ھ) کو دہلی روانہ ہوا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ سرور الملک نے محاصرہ کے مقابلے کی تیاریاں کیں اور تین

---

(1) بلند شہر کے 20 میل شمال مشرق میں۔

(2) مبارک شاہی ص 239، طبقات اکبری (جلد اوّل ص 288) میں میاں جمن درج ہے۔

ماہ جمارہا جبکہ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہیں۔

مبارک شاہی کے مطابق محمد شاہ محصورین سے محبت رکھتا تھا لیکن وہ سرور الملک کا دلی طور پر سخت مخالف تھا اور اس سے مبارک شاہ کے قتل کا انتقام لینا چاہتا تھا دوسری طرف سرور الملک اور اس کے گروہ کے لوگ خوف زدہ تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو سلطان ان سے غداری کر دے۔ 14/ اگست 1434ء (8/ محرم 838ھ) کو سرور الملک اور میران صدر کے لڑکے سلطان کو مار ڈالنے کے مقصد سے محل کے شاہی حصے میں داخل ہو گئے۔ لیکن سلطان کو اس حرکت کی توقع تھی لہٰذا وہ اس کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ سرور الملک کی سازش ناکام ہو گئی اور اسے میران صدر کے لڑکوں کے ساتھ دربار کے دروازے پر مار ڈالا گیا۔ سلطان نے فوراً کمال الملک کو ایک پیغام بھیجا جو اپنے پیروکاروں کے ساتھ بغداد گیٹ سے داخل ہوا۔ سیدھ پال نے اپنے گھر کو نذر آتش کر دیا اور اپنے خاندان کو جلا کر اس وقت تک لڑتا رہا جب تک کہ وہ قتل نہ کر دیا گیا۔ سدھارن کنکو اور دیگر کھتریوں کو مبارک شاہ کے مقبرے کے پاس لے جایا گیا اور وہاں انھیں قتل کر دیا گیا[1]۔ ملک ہوشیار اور کوتوال مبارک کو حراست میں لے لیا گیا اور ان کی گردنیں مار دی گئیں۔ ملک کمال اور دیگر امرا نے سلطان محمد کے ساتھ از سر نو وفاداری کا اعلان کیا۔

اس دوسری حلف وفاداری کے بعد ہی سلطان محمد کی حقیقی تخت نشینی عمل میں آئی۔ کمال کو وزیر مقرر کیا گیا اور اسے کمال خاں کا خطاب بخشا گیا۔ ملک جیمن غازی الملک ہو گیا اور اسے امروہہ اور بدایوں کے اقطاع ملے۔ ملک اِلٰہ داد نے اپنے لیے خان کے خطاب کو رد کر دیا لیکن اپنے بھائی کے لیے دریا خاں کا خطاب حاصل کیا۔ ملک کھون راج مبارک خانی کو اقبال خاں کا خطاب اور حصار فیروزہ کا اقطاع ملا۔ سید سلیم کا بڑا لڑکا مجلس اعلا سید خاں ہو گیا اور چھوٹے لڑکے کو شجاع الملک کا خطاب ملا۔ دیگر امرا نے بھی خطابات اور اقطاعات حاصل کیے۔ انتظام حکومت کو منضبط کرنے کے بعد سلطان محمد نے ملتان کی جانب پیش قدمی کی جو لنگاؤں (Langas) کے ظہور کی بنا پر فوری توجہ کا محتاج تھا۔ اس نے خان خاناں کو وہاں متعین کیا اور پھر دہلی واپس آ گیا۔

---

(1) مبارک شاہی، ص242

1436ء میں سلطان سامانہ کی طرف روانہ ہوا اور جسرتھ کھوکر کے خلاف ایک فوج روانہ کی۔ اس فوج نے باغی کے ملک کو لوٹ تو لیا لیکن کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اس کے بعد مختلف حصوں سے پریشان کن اطلاعات آنے لگیں۔ شمال مغرب میں لنگاؤں نے اپنی طاقت میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ مشرقی علاقوں میں سلطان ابراہیم شرقی نے چند پرگنات پر قبضہ کر لیا۔ جبکہ گوالیار کے رائے نے خراج دینا بند کر دیا۔ صوبوں میں انتشار و بےچینی رائج ہو گئی اور انتشار کی تیز رفتاری کی روک تھام کے لیے سخت اقدامات کی ضرورت تھی۔

مالوہ کے محمود خلجی کا حملہ

ایسے وقت میں جبکہ انتشار و بدنظمی کے رجحانات قابو سے باہر ہو رہے تھے چند علما اور امرا نے مالوہ کے محمود خلجی کو بلانا مناسب خیال کیا۔ لہٰذا وہ دہلی کی طرف روانہ ہوا اور 1440ء میں دہلی کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔ محمد شاہ نے مجبور ہو کر سامانہ سے بہلول لودی اور اس کی فوج بلوا بھیجی اور بہلول کے ساتھ اپنے بیٹے کو حملہ آور سے لڑنے کے لیے روانہ کیا۔ سلطان محمود خلجی کی فوجیں بھی اس کے بیٹوں۔ غیاث الدین اور قدر خاں۔ کی قیادت میں تھیں۔ دن بھر شدت کے ساتھ جنگ ہوتی رہی دوسری صبح محمد شاہ نے امن کی تجاویز بھیجیں اور انھیں سلطان مالوہ نے قبول کر لیا۔ محمود خلجی بڑے بلند حوصلوں والا حکمراں تھا۔ وہ آیا تھا اس وجہ سے کہ کسی بھی آئندہ ہندستان گیر انتظامیہ کا مرکز صرف دہلی ہی ہو سکتا تھا۔ پھر کیوں اس نے ایک غیر فیصلہ کن جنگ کے بعد دہلی سے واپس جانے کا وعدہ کر لیا؟ مشتاق کے مطابق، گجرات کے بادشاہ نے یہ سوچا کہ اگر محمود خلجی دہلی کو فتح کر لے گا تو وہ بہت زیادہ طاقتور ہو جائے گا لہٰذا مالوہ کے بادشاہ کی پوری پالیسی کو مفلوج کر دینے کی خاطر وہ مانڈو کے خلاف روانہ ہوا اور اس طرح مجبور ہو کر محمود خلجی کو اپنی راجدھانی کی مدافعت کے لیے واپس ہونا پڑا۔[1] لیکن ایک زیادہ قابل قبول نظریہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمود خلجی

---

(1) واقعات مشتاقی، ورق 83الف، 83ب

کو ان علما و امرا نے جو اس کے پاس مانڈو گئے تھے یا راستہ میں اس کے ساتھ شامل ہو گئے تھے یہ یقین دلایا تھا کہ دہلی میں کھلے دل سے اس کا خیر مقدم کیا جائے گا اور یہ کہ کمزور سید اقتدار کسی مزاحمت کے قابل نہیں۔ پہلے دن کی زبردست جنگ سے محمود کو یقین ہو گیا کہ اس کی غلط رہنمائی کی گئی ہے۔ لہٰذا اس نے امن قایم کرنے کا فیصلہ کیا اور واپس ہو گیا[1]۔ اسی اثنا میں جبکہ وہ واپسی کے سفر پر تھا بہلول نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے ساز و سامان کو لوٹ لیا۔ اور محمد شاہ بہلول کی اس کامیابی پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے اسے اپنا بیٹا کہہ کر مخاطب کیا۔

845ھ مطابق 1441ء میں محمد شاہ نے سامانہ کی جانب پیش قدمی کی اور دیپال پور اور لاہور کو ملک بہلول لودی کے حوالے کر کے اسے جسرتھ کھوکھر کی سرزنش کی ہدایت دی۔ لیکن جسرتھ نے بہلول کے ساتھ معاہدہ امن کر لیا اور اس کے لیے ایک شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کر کے اسے پھسلا لیا۔ بہلول کی وفاداری کے قدم ڈگمگانے لگے اور اس نے سلطان محمد کی توقعات پر پانی پھیر دیا۔ اس کے برعکس وہ دہلی کے علاقے کے خلاف روانہ ہوا اور پانی پت تک کی ساری سرزمین پر قبضہ کر لیا اور دہلی کا بھی محاصرہ کیا۔ وہ راجدھانی پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ لیکن اپنی واپسی پر اس نے سرہند میں بغاوت کر دی۔ ان باتوں نے سلطان کی پوزیشن کی بنیاد بڑی حد تک کھوکھلی کر دیں اور ”دہلی سے بیس کردہ کے حدود میں رہنے والے، امرا بھی اس کے خلاف ہو گئے“۔ 874ھ مطابق 1443ء میں دس سال کی ایک غیر معروف حکومت کے بعد محمد شاہ نے اپنی آخری سانسیں لیں۔

سلطان علاؤالدین شاہ (76-1443ء)

محمد شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے علاؤالدین عالم شاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھایا گیا اور ملک بہلول اور دیگر لوگوں نے اس کے حق میں حلف وفاداری اٹھایا لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ نااہل تھا۔

1445ء میں علاؤالدین سامانہ کے لیے روانہ ہوا[2] اور ابھی راستہ میں ہی تھا کہ

---

(1) ڈاکٹر یو۔ این۔ ڈے مالوہ، اسی جلد میں مالوہ کے سلسلہ کا باب بھی ہے۔

(2) طبقات اکبری، جلد اوّل، ص 293

اس نے سنا کہ شرقی حکمراں دہلی کے خلاف روانہ ہو رہا تھا۔ علاؤالدین فوراً دہلی لوٹ گیا۔ وزیر حسام خاں نے، جو نائب غیبت بھی تھا، سلطان کی اس جلد بازی کو پسند نہ کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ اس کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ ایک افواہ سن کر دہلی واپس آجائے۔ سلطان اس بات پر رنجیدہ خاطر ہوا۔ 1447ء میں وہ بدایوں گیا جہاں پہلے وہ کچھ دنوں گورنر کی حیثیت سے رہا تھا اور وہیں مستقل طور پر قیام پذیر ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ حسام خاں نے پر خلوص طور پر اس بات کی مخالفت کی اور دہلی نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ سلطان دوبارہ ناراض ہو گیا اور وزیر کے مشورہ کی بالکل پرواہ نہ کر کے بدایوں چلا گیا۔ اس نے اپنی بیوی کے دو بھائیوں کو (شہر کی نگرانی کے لیے) شحنہ شہر اور (زراعت کے لیے) امیر کوہ کی حیثیت سے چھوڑ دیا۔ 1448ء میں وہ بدایوں میں مقیم ہو گیا۔ اس کی بیوی کے بھائیوں نے جھگڑا کیا اور ان میں سے ایک مارا گیا۔ دوسرے دن شہر کے لوگوں نے حسام کے اشارے پر دوسرے بھائی کو بھی مار ڈالا۔ ان لوگوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور بہلول کو زمام حکومت سنبھالنے کے لیے بلایا۔ ملک بہلول نے علاؤالدین کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ وہ محض سلطان کی بہتری کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ علاؤالدین نے جواب میں لکھا کہ ”چونکہ میرے والد تمہیں اپنا بیٹا کہتے تھے اور میں اپنی مختصر ضرورتوں کی تکمیل کے لیے فکر مند نہیں ہوں۔ میں بدایوں کے ایک پرگنہ پر مطمئن ہوں اور مملکت کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں“۔ بہلول نے علاؤالدین کو بدایوں سے بے دخل نہ کیا اور وہ گنگا کے کنارے خیر آباد سے لے کر ہمالیہ کے پہاڑی دامنوں[1] تک کے علاقہ میں 883ھ مطابق 1476ء میں اپنی موت تک[2] حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد اس کے بیٹوں کے حقوق کو اس کے داماد سلطان حسین شاہ شرقی نے نظر انداز کر دیا، جس نے بدایوں کو اپنی سلطنت جون پور سے متحد کر دینے میں بالکل تاخیر نہ کی۔

---

(1) منتخب التواریخ، جلد اوّل، ص 305۔

(2) اس کا شکستہ حال مقبرہ اس کی ماں کی قبر کے بغل میں ایک گھیرے ہوئے احاطہ کے اندر محلہ میران سرائے میں واقع ہے۔ ملاحظہ ہو رضی الدین کی کنیز التاریخ (ہسٹری آف بدایوں)، بدایوں 1907ء ص 54-55 بدایوں میں سیدوں کے چند کتبوں کے لیے ملاحظہ ہو Epigraphic Indica، مولفہ زیڈ، اے، ڈیسائی، 1965ء ص ص 18-111

اس طرح 37 سال کی غیر معروف حکومت کے بعد سید خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ ملتان کی 'مملکت' کی حیثیت سے اس کی ابتدا ہوئی اور بدایوں کی حکومت کی حیثیت سے اس کا اختتام ہوا۔ سیاسی یا ثقافتی و تمدنی کسی بھی اعتبار سے اس (خاندان) نے عہد وسطیٰ کے ہندستان کی تاریخ میں کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہ دیا۔ لیکن دہلی کی تنزلی اور اس کی از سر نو تعمیر کی راہ میں یہ ایک ناگزیر مرحلہ تھا۔

ساتواں باب

لودی خاندان

(1451-1526ء)

1

تعارف

دورِ سلطنت کے حکمراں خاندانوں میں لودیوں کا (شاہی) خاندان آخری تھا۔ اس کا عرصہ حیات خلجیوں کے مقابلہ میں زیادہ تھا اور متاخرہ تغلقوں اور سیدوں کے مقابلہ میں اس کے کارنامے زیادہ شاندار تھے۔ لیکن اس کی 75 سالہ تاریخ کشمکشوں کی ایک کہانی ہے۔ بادشاہ اور امرا کے درمیان، ادنا زمیں داروں اور طاقتور حاکموں کے درمیان، زمانے کے مرکز گریز رجحانات اور حکمرانوں کی مرکز پسند آرزوؤں کے درمیان خود مختارانہ اقتدار کے شہنشاہی معیارات اور ساجھے داری کی حکومت (Partnership in govt.) کے افغانی تصور کے درمیان کشمکش۔ اس پوری کشمکش میں لامرکزیت کی جانب زمانے کے عام میلانات کے علاوہ افغانوں کے مزاج نے ایک اہم رول ادا کیا۔ اخوند درویزا کا خیال ہے کہ:

"قدیم زمانہ سے ہی افغانوں نے کبھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان کا کوئی بادشاہ ہو کیونکہ ان کی خود پسندی اور گھمنڈ نے انھیں ایک ایسے شخص کے سامنے سر جھکانے نہ دیا جو خود انھیں کے اعزہ واقربا میں سے ہوں۔ مزید یہ کہ اگر کسی کو بادشاہ کہنے پر راضی ہو جائیں تو انھیں خدشہ تھا کہ وہ لوگ اس وجہ سے اپنے آپ کو خدمت گزاروں کی سطح پر گرا لیں گے۔ وہ لوگ اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائے اور یہی وجہ تھی کہ تمام افغانوں کو مَلِک[1] کہہ

---

(1) اخوند درویزا تذکرۃ الابرار والاشرار، (مخطوط، یو۔ ایل۔ کیمبرج) ورق نمبر 73 الف، جیسا کہ ڈاکٹر معید الدین نے اپنے مضمون "ہندستان کی پہلی افغانی مملکت کا زوال" میں تذکرہ کیا ہے۔ Asiatische Studien, Etudes Asiatiques جلد نمبر 14، ص ص 27-126

کر مخاطب کیا جاتا تھا۔

افغانی بادشاہ کو ایک طرف تو زمانہ کے انتشاری رجحانات کے خلاف اور دوسری طرف افغانی کردار کی قبائلی خصوصیات کے خلاف جدو جہد کرنی پڑی تھی۔ ملک کی معاندانہ اور تفرقہ انگیز قوتوں کی روک تھام صرف افغانی سپاہیوں کی مدد سے کی جاسکتی تھی لیکن خود افغانوں کے ساتھ نمٹنا بھی آسان نہ تھا۔ ان کے ناز نخروں کو برداشت کرنا تھااور ہر مرحلے میں انکی قبائلی جبلتوں کالحاظ رکھنا تھا۔ لودیوں کو اپنی بقا کے لیے ان کی مدد کی ضرورت تھی لیکن انھیں اپنے آپ کو ان کے قبائلی احساسات سے متاثر ہونے سے محفوظ رکھنا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ افغان، خلجیوں اور تغلقوں کے دور حکومت میں خدمات انجام دے چکے تھے اور خود مختارانہ طور پر طاقت کے استعمال کی شہنشاہی روایات سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن حالات اس وقت یکسر بدل گئے جب افغانی مہاجرین کا ایک نیا ریلا ملک میں داخل ہو گیااور اس نے ہندستانی نظام حکومت میں ان اصولوں کو شامل کرنا چاہا جو افغانوں کے قبائلی نظام کی خصوصیت تھے۔ لہٰذا ہندستان میں شہنشاہیت کی جو روایتیں چل پڑی تھیں انھیں ایک نئے چیلنج کا مقابلہ کرنا تھا۔ افغانی قبائل کی جمہوری روح مختلف انداز میں ظاہر ہوتی ہے:-

(الف) جانشینی کے سلسلہ میں ان کا ذہن محدود نہ تھا۔ (اس معاملے میں) وہ مرحوم بادشاہ کے ذریعہ کی گئی نامزدگی یا وراثتی اصول کی بہ نسبت اہلیت کا زیادہ لحاظ رکھتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے۔ سرہند کے گورنر سلطان شاہ لودی نے اپنے بیٹے قطب خاں کے دعوؤں کو نظر انداز کر کے اپنے بھتیجے بہلول کو نامزد کر دیا۔ سلطان سکندر کی موت پر ان لوگوں نے مملکت کو ابراہیم اور جلال کے درمیان تقسیم کر دیا۔ بہلول کی آخری بیماری کے زمانہ میں چند باا ثر امرا نے اسے اپنے پوتے اعظم ہمایوں کو نامزد کرنے کی ترغیب دی۔ پھر ابراہیم کے ناقابلِ برداشت رویّہ سے متنفر ہو کر ان لوگوں نے اس کے چچا عالم خاں کو گجرات سے بلایا۔ بسا اوقات اپنی ذاتی آزادی کو قایم رکھنے کے لیے ان کی خواہشات نے انتظامیہ میں متعدد پیچیدگیاں پیدا کر دیں (نیز) وہ نفاق اور اختلافات کے بیج بھی بوئے تا کہ اپنے سودے بازی کی قدر و قیمت میں اضافہ

کر سکیں۔

(ب) دہلی سلطنت کی فوج اپنی شکل و صورت تبدیل کر کے "بادشاہ کی فوج" سے ایک قبائلی فوج بن گئی۔ چونکہ اس میں بھرتی مرکز کے ذریعہ نہ ہوتی اور نا ہی مرکز کے ذریعہ اس کا انتظام و انصرام ہوتا لہٰذا اس کی وہ یکجہتی اور تاثیر ختم ہو گئی جو دہلی سلطنت کی خصوصیت تھی۔ افغانی فوجیں ہندستان کی دیگر فوجوں پر محض کثرت تعداد کے دباؤ کی بنا پر حاوی ہو سکتی تھیں لیکن بہتر طور پر منظم غیر ملکی فوج۔ مثلاً بابر کی فوج ۔ سے بالمشافہ مقابلہ پر وہ مشکل ہی سے کچھ حاصل کر سکتی تھیں۔ پانی پت کی جنگ میں ابراہیم کی شکست کا ایک سبب، بلا شبہ، توپوں کا استعمال تھا۔ لیکن افغانی فوج میں کچھ بنیادی تنظیمی خامیاں بھی تھیں۔

(ج) اس عہد میں سلطان کی بعض خصوصی مراعات کو اعلا افسران بھی عام طور پر استعمال کرنے لگے۔ مثال کے طور پر ہاتھیوں کو شاہی ساز و سامان کا ایک حصہ شمار کیا جاتا تھا اور صرف سلطان ہی انھیں رکھنے کا حقدار تھا۔ لیکن اس عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ امرا بڑی تعداد میں ہاتھیوں کو رکھتے اور کشمکش کے اوقات میں انھیں میدانِ جنگ میں لاتے۔ صرف اعظم ہمایوں سروانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سات سو ہاتھی اس کی ملکیت میں تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود (اس میں) ایک ایسی خلقی قوت حیات تھی۔ جو غالباً اس کی جمہوری روح کی پیدا کردہ تھی۔ جس نے لودی اقتدار کو تقریباً تین چوتھائی صدی تک سالم و ثابت رکھا۔ ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی کا خیال ہے کہ:

"اپنی خامیوں کے باوجود بہلول لودی کا تجربہ دلچسپ ہے۔ اس کے فوری فائدہ وفاداری کے اس جذبہ سے ثابت ہو گیا جو اس نے ان افغانی قبائلی لیڈروں میں بیدار کیا جو اس کی خاطر لڑنے کے وقت یہ محسوس کرتے کہ وہ خود اپنے ہی (کسی) مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔ بادشاہی کے استبدادی تصور کو مدھم کر کے بہلول لودی نے اسے اپنے ہمسروں (Peers) (امرا) کی خواہشات کا اثر پذیر بنانے کی جانب ایک نہایت اہم قدم اٹھایا تھا۔ ہمسروں اور امرا کی جانب جوابدہی مطلق العنانی اور دستوری بادشاہت کے درمیان ایک اہم کڑی رہی ہے۔ یہ ایک مزید موقعہ تھا کہ

مسلم بادشاہت کو بہتر بنایا جائے اور اسے ایک دستوری شکل دے دی جائے۔ لیکن (اس موقعہ کی) عدم قدردانی گروپ بندی، حسد وجلد، امرا کی خود غرضی اور عوام کی جہالت اور بے توجہی کی وجہ سے موقعہ ہاتھوں سے نکل گیا[1]۔

افغانی حکومت کی عام سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر بابر بیچ میں دخل اندازی نہ کرتا تو افغانی اقتدار کچھ اور دنوں تک چلتا۔ ہندستان میں مغل اقتدار کے قیام کے فوراً بعد شیر شاہ کا عروج اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ افغان ایک ختم شدہ طاقت نہ تھے اور وہ بابر کے جانشین کو ہندستان سے بھگا سکتے تھے۔

اس عہد کی سیاسی زندگی کی اہم خصوصیت لاہور سے لے کر مانک پور تک پورے شمالی ہندستان میں زمیں داروں کی ایک بڑی تعداد کی موجودگی تھی۔ ان کی طاقت اور وسائل کا شمار کرنا بڑا مشکل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسانوں سے براہ راست تعلق کی وجہ سے ان کی صورتِ حال بہت اچھی تھی۔ وہ بغیر کسی خاص کوشش کے بڑی بڑی فوجیں اکٹھا کر سکتے تھے، ماقبل زمانے میں صرف چند ہی موقعوں پر اتنی بڑی فوجیں میدان جنگ میں لائی گئی تھیں۔ ایک بے چینی، کسی غیر متعین چیز کی تلاش و جستجو، خطرات مول لینے کا جذبہ اور ناقابل تسکین حب جاہ، اس عہد کی تمام سیاسی سرگرمیوں کی خصوصیت تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مہم جوؤں میں سے کسی کو بھی کبھی ایک ایسی مرکزیت پسند مملکت کا خیال نہ ہوا، جو سرسری طور پر بھی خلجی یا تغلق مملکتوں کی سرحدوں کے برابر ہو۔ ان کی سرگرمیاں مقامی، قبائلی اور نسلی ملحوظات کی وجہ سے محدود تھیں اور یہ ایک مرکزیت پسند مملکت کے ظہور کے لیے راستہ ہموار نہ کر سکیں۔ لیکن ان تمام کمیوں کے باوجود لودیوں نے اپنی سیاسی صلاحیتوں کا ایک واضح ثبوت پیش کیا اور ایک ایسے سیاسی ڈھانچہ کو جو دراڑوں اور شگافوں سے بھرا پڑا تھا صحیح وسالم رکھا اور اس کی توسیع کی۔

اس عہد کے دوران سیاسی اہمیت کا مرکز رفتہ رفتہ آگرہ منتقل ہوگیا۔ جہاں سے بادشاہت کے مسائل زیادہ موثر طریقے پر حل کیے جا سکتے تھے۔ یہاں سے اٹاوہ، کوئل اور بدایوں کے زمیں داروں اور ملکوں کو زیادہ آسانی سے کنٹرول میں رکھا جا سکتا تھا۔

---

(1) سم آسپیکٹس آف ایڈمنسٹریشن، ص 84

آگرہ سے میوات کے عوام کی سرگرمیوں پر اچھی طرح نگرانی رکھی جا سکتی تھی اور یہاں سے شرقیوں کے خلاف مہمات کا انتظام زیادہ اچھی طرح کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں نئی راجدھانی سے راجپوتانہ پر بھی نگاہیں رکھی جا سکتی تھیں۔

اس عہد کی دوسری اہم اور نئی تبدیلی' جنگ بندی کا اصول تھا جس کے تحت تمام جنگی کارروائیاں اس صورت میں روک دی جاتیں جب فریقین ایک دوسرے کو فیصلہ کن طور پر شکست نہ دے پاتے۔ بہلول لودی کو دوبارہ شرقی سلطان کے ساتھ جنگ بندی معاہدہ کرنا پڑا۔ پہلی بار چار سال کے لیے اور دوسری بار تین سال کے لیے۔ التوائے جنگ کی مدت کو گزشتہ جنگوں سے ہونے والے نقصانات کی تلافی اور مستقبل میں زیادہ فیصلہ کن جنگ کی تیاری میں صرف کیا گیا۔ اس طرح کشمکشوں کا سلسلہ کئی دہائیوں (Decades) تک چلتا رہتا۔ اور مختلف حکمرانوں و سرداروں کی توجہ ہمیشہ جنگوں کے لیے تیاری کرنے اور منصوبے بنانے میں لگی رہتیں۔

افغان ہندستان میں

افغانوں کی ابتدا کے متعلق نصف دیومالائی اور نصف فرضی بیانات کے سلسلہ میں قیاس آرائیوں کی ضرورت نہیں۔ اولیف کیرو، مورگنسٹیرن بیلو، لونگ ورتھ ڈیمس، ریورٹی اور دیگر حضرات کی تحقیقات نے اس مسئلہ کے بہت سے دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ہمارے نقطہ نظر سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم ہندستان میں افغانی نو آبادیات کی تاریخ اور عہد سلطنت کے ایک حکمراں خاندان کی حیثیت سے بالآخر افغانوں کے ظہور کا سراغ لگائیں۔

اگرچہ افغانی نو آبادکار فرداً فرداً ہندستان یقیناً بہت پہلے ہی آچکے تھے لیکن سلطان ناصر الدین محمود کے دور حکومت میں ہی انھیں بڑی تعداد میں فوج میں بھرتی کیا گیا۔ 1260ء میں جب الغ خاں (مستقبل کا بلبن) میواتیوں کے خلاف روانہ ہوا تو اس وقت اس نے تین ہزار افغانی سپاہیوں کو بھی ملازمت میں رکھا تھا[1]۔ بعد میں بلبن

---

(1) طبقات ناصری، ص 315

نے دہلی کے آس پاس اور جلالی، کمپیل، پٹیالی، بھوج پور وغیرہ میں افغانی فوجی چوکیاں قایم کیں[1]۔ اس عہد کے دوران افغانوں نے جو اہمیت حاصل کی وہ مستقبل میں ان کے اقتدار کی توسیع کے لیے بڑی مددگار ثابت ہوئی اور اس چیز نے ان کے اقتدار کی نشو نما کے لیے ایک مئوثر بنیاد بھی فراہم کر دی۔ علاؤالدین خلجی کے امرا میں اختیار الدین یل افغان[2] اور ملک مسخ افغان بھی تھے جنھوں نے خلجی اور تغلق عہد کے دوران ایک اہم رول ادا کیا۔ محمد بن تغلق کی ماتحتی میں افغان حکمراں طبقہ کے ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتے تھے اور اس کے خلاف کی گئی بغاوتوں میں انہوں نے ایک نمایاں رول ادا کیا۔ ملک شاہ افغان، قاضی جلال افغان اور ملک مسخ افغان نے اس کے خلاف بغاوتیں کھڑی کی۔ ملک مسخ افغان نے دولت آباد میں سلطان ناصر الدین کی حیثیت سے اپنا آزاد اقتدار قایم کر لیا لیکن جب دکن میں حسن گنگو ایک بڑی طاقت بن کر ابھرا تو وہ اس کی حمایت میں اپنے عہدہ سے رضاکارانہ طور پر دست بردار ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغان، امیران صدہ کے ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتے تھے اور (دہلی) سلطنت کی انتظامی بنیاد کے اس کنٹرول نے انھیں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کا موقعہ فراہم کر دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ چودھویں صدی کے آخری حصوں میں افغان زمیں داروں کی ایک بڑی تعداد کا ظہور اسی پوزیشن کی بنا پر ممکن ہو سکا جو وہ امیران صدہ کی حیثیت سے رکھتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے اس وقت وراثتی اصول کی نشو و نما کی ہمت افزائی کی جب اس نے تمام تقرریاں اور وراثتی طریقے پر کیں[3]۔ اپنی جرأت و ہمت اور کردار کی بنا پر ہی افغانی سپاہیوں کو بڑی تعداد میں سرحدی علاقوں میں بھرتی کیا جاتا۔ ملتان کے ایک مقطع نے افغانوں کی ایک بڑی تعداد کو ملازمتیں دیں جس میں بہلول شاہ لودی کا ایک سلف ملک بہرام بھی شامل تھا[4]۔ تغلق دور کے آخری زمانہ میں افغانوں کی اتر پردیش کے مختلف علاقوں میں تقرریاں ہوئیں۔ 1405ء میں دولت خاں لودی کو میاں دو آب[5] کا فوج دار مقرر کیا گیا۔ اور ملک اسد خاں کو ایک مقطع کی حیثیت سے سنبھل کا شق ملا[6]۔ سید حکمرانوں کی ماتحتی میں ان کے اختیارات

---

(1) برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ص 59-57

(2) ایضاً، ص 540

اور بڑھے۔ 1417ء میں خضر خاں نے ملک بہرام شاہ لودی کو سرہند کا ذمہ دار مقرر کیا[7]۔ ملک سلیمان لودی نے ملتان میں اپنی طاقت مضبوط کرلی۔ راپری، حسین خاں افغان اور اس کے بیٹے قطب خاں افغان کے تحت تھا۔

لودیوں کا حصول اقتدار

بہت سے لودی افغان تجارتی کاروانوں کے ساتھ ہندستان آیا کرتے تھے ایک بار ملک بہرام نامی ایک تاجر ملک میں آیا اور اس نے یہیں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے اور وہ اپنے وطن واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ملتان کے گورنر ملک مردان دولت کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ ملک سلطان شاہ، ملک کالا، ملک فیروز، ملک محمد اور ملک خواجہ۔ یہ تمام اپنے باپ کی وفات کے بعد بھی ملتان میں مقیم رہے۔ جب خضر خاں ملتان کا گورنر ہوا تو سلطان شاہ اس کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ ملّو اقبال کے ساتھ خضر خاں کی کشمکش کے موقعہ پر ملک سلطان شاہ نے میدان جنگ میں بڑی بہادری کا ثبوت پیش کیا اور ملّو اقبال کو مار ڈالا۔ اس کی مخلصانہ خدمات کا اعتراف کر کے اسے اسلام خاں کا خطاب دیا گیا اور سرہند کی گورنری عطا کی گئی۔ اس کے بھائیوں کو بھی، جو اس کے ساتھ رہتے تھے، عہدے دیے گئے اور ترقیاں دی گئیں۔ ملک کالا کو دورالا کی گورنری سونپی گئی۔ ملک کالا کی بیوی جب وہ حاملہ تھی ایک حادثہ کا شکار ہو گئی۔ لیکن سیزیرین آپریشن کے ذریعہ اس کے بچے کو بچا لیا گیا۔ یہی بچہ بہلول تھا جو آئندہ چل کر ہندستان میں لودی خاندان کا بانی ہوا اس کے باپ نے بڑی احتیاط کے ساتھ شفقت

---

(3) ملک بیرا افغان کی موت پر اس کے بیٹے داؤد خاں کو اس کی جگہ پر بہار کا مقطع مقرر کیا گیا۔ (مبارک شاہی ص 123)۔ محمد شاہ افغان کے موت کے بعد سر بلی خاں اور محمود خاں، اس کے بیٹوں نے، اپنے باپ کا اقطاع پایا۔ (تاریخ محمدی ورق نمبر 412 الف)

(4) فرشتہ، ص ص 1، 173

(5) ایضاً، ص 160

(6) مبارک شاہی، ص 176

(7) ایضاً، ص ص 195-96

و محبت سے اس کی پرورش کی لیکن جب نیازی افغانوں کے ساتھ ایک جنگ میں وہ مارا گیا تو بہلول اپنے چچا اسلام خاں کے ساتھ رہنے کے لیے سرہند چلا گیا۔ اسلام خاں نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور اپنی لڑکی اس کی زوجیت میں دے دی۔

اسلام خاں خود ایک سرگرم شخصیت کا حامل تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ اپنی عسکری طاقت و ذرائع کو کافی بڑھا لیا اور بارہ ہزار افغان جن میں اکثر و بیشتر اسی کے خاندان کے تھے، اس کی ملازمت میں شامل ہو گئے۔ اپنے جوان بیٹوں کے دعووں کو نظر انداز کر کے اس نے بہلول کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ یہ ایک جراتمندانہ فیصلہ تھا لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے ملازمین تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ اسلام خاں کی مرضی کی بنیاد پر بہلول کی حمایت کر رہا تھا، دوسرا اسلام خاں کے بھائی ملک فیروز کی حمایت میں تھا اور تیسرا گروہ اسلام خاں کے بیٹے قطب خاں کا حامی تھا۔ بہلول نے بڑی چالاکی سے حالات کا مقابلہ کیا اور ابتدائی مشکلات سے بڑی ہوشیاری سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ بہر حال، قطب خاں دہلی آیا اور سرکاری حیثیت سے اس نے سلطان سید محمد شاہ کے افسروں کے ذریعہ اس تک رسائی حاصل کی اور اطلاع دی کہ افغان بڑی تعداد میں سرہند میں جمع ہو رہے تھے اور ممکن تھا کہ وہ مملکت میں ابتری پیدا کر دیں۔ سلطان نے قطب خاں کے ساتھ ملک سکندر تحفہ کو ایک بڑی فوج کے ہمراہ ان ہدایات کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ افغانوں کو دربار میں بھیج دیں لیکن اگر وہ مقابلہ کریں تو انہیں سرہند کے باہر کھدیڑ دیں اسی موضوع کا ایک فرمان جسرتھ کھوکر کو بھی بھیجا گیا۔

جیوں ہی افغانوں کو ان احکامات کی اطلاع ہوئی انھوں نے سرہند کو خیرباد کہا اور سیوالک کی پہاڑیوں کے دامن میں پناہ گزیں ہو گئے۔ جسرتھ اور تحفہ نے ان کے شبہات دور کرنے کی کوشش کی اور انھیں یہ پیغام بھیجا کہ چونکہ وہ کسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے لہٰذا ان کے لیے بھاگنے یا ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن افغانوں نے ان سے تحفظ کے ایک ضمانت نامہ کا مطالبہ کیا۔ اور جب انہیں ضمانت دی گئی تو ملک فیروز لودی اپنے بڑے لڑکے شاہین خاں اور بھتیجے ملک بہلول کو اپنے خاندان کے ساتھ چھوڑ کر ملک سکندر اور جسرتھ کھوکر سے ملاقات کے لیے آیا۔ قطب خاں نے انہیں شہ دی کہ وہ ملک فیروز لودی کو گرفتار کر لیں لہٰذا اسے گرفتار کر لیا گیا۔

متعدد افغان مارے گئے اور ان کے خاندانوں کو لانے کے لیے ایک فوج بھی بھیجی گئی۔ بہلول نے حالات کی سنگینی کا اندازہ اچھی طرح لگالیا اور سیوالک کی پہاڑیوں کی طرف بھاگ نکلا۔ جسرتھ نے سرہند کو ملک سکندر تحفہ کے حوالہ کیا اور قیدیوں کو دہلی بھیج دیا۔

بہلول کو ان باتوں سے اتنی سخت تکلیف پہنچی کہ اس نے تجارتی کاروانوں کو راستہ میں لوٹنا شروع کر دیا اور مال غنیمت اپنے شریک کاروں میں تقسیم کر دیا تاکہ دہلی پر ایک جوابی حملہ کے لیے انھیں تیار کر سکے۔ ایک قلیل مدت میں ہی افغانوں نے اپنی طاقت بڑھالی حتی کہ مغل بھی ان کے شریک ہو گئے۔ بعد میں جب ملک فیروز دہلی سے بھاگ کر بہلول سے جاملا اور قطب خاں کو بھی اپنے کرتوتوں پر پشیمانی ہوئی تو بہلول کی صورت حال زیادہ بہتر ہو گئی۔ اور اس نے اپنے آپ کو سرہند میں مستحکم کر لیا۔ سلطان محمد شاہ نے وزیر ممالک، حسام خاں کی ماتحتی میں ایک زبردست فوج اسے کچلنے کے لیے روانہ کی۔ کڈھا (خضر آباد اور شاہ پورا میں ایک پرگنہ ہے) میں ایک جنگ ہوئی اور حسام خاں کو شکست ہوئی۔ بہلول کی طاقت اور اس کا وقار اس سے اور بھی بڑھ گیا۔ ملک فیروز اور اپنے دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ اس نے سرہند سے لے کر پانی پت تک پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن سلطان محمد کے ساتھ نمٹنے میں بھی اس نے کمال کی ہوشیاری کا ثبوت پیش کیا۔ اس نے اسے بڑی شائستگی کے ساتھ وفاداری اور نمک حلالی کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط بھیجا لیکن ساتھ ہی اس نے اس سے یہ گزارش بھی کی کہ حسام خاں ذاتی طور پر اس سے ایک کینہ رکھتا تھا۔ اس لیے وہ اس وقت تک دربار میں حاضری نہیں دے سکتا جب تک حسام خاں وہاں موجود تھا۔ اگر حسام خاں کو قتل کر دیا جائے اور وزارت حمید خاں کے حوالے کر دی جائے تو بہلول ہر طرح سے اس کی خدمت کے لیے تیار ہو گا۔ سلطان جو عقل و دانشمندی سے محروم تھا اس جال کا شکار ہو گیا۔ اور اس نے حسام خاں کو مار ڈالا۔ ملک بہلول کے نام سرہند (کی جاگیر) کی توثیق کر دی گئی۔ اس سے منسلک علاقے اسے بطور جاگیر دیے گئے۔

لودیوں نے اس خطہ میں اپنی پوزیشن مزید مستحکم کر لی۔ اور اپنے عسکری وسائل میں اضافہ کیا۔ جب مالوہ کے سلطان محمد خلجی نے دہلی پر حملہ کیا تو سلطان محمد نے ملک بہلول سے مدد مانگی جس کے جواب میں وہ سرہند سے بارہ ہزار افغانوں اور

مغلوں پر مشتمل ایک فوج کے ساتھ دہلی روانہ ہوا۔ جنگ میں اپنے کارناموں کی وجہ سے اس نے سلطان کی خوشنودی حاصل کر لی۔ سلطان نے اسے خان خاناں کا خطاب عطا کیا۔ سرہند واپسی کے بعد بہلول، لاہور، دیپال پور، سنام اور کئی ایک پرگنوں کو سلطان کی اجازت کے بغیر اپنے حلقہ اختیار میں لے آیا۔ اب اسے اپنی طاقت پر پوری طرح اعتماد تھا اور دہلی تک اپنے اختیارات کی توسیع کے لیے فکر مند تھا۔ اس کے جلد ہی بعد وہ دہلی کے خلاف روانہ ہوا اور اس نے شہر کا محاصرہ کر لیا لیکن اسے وہ فتح نہ کر سکا اور مایوس ہو کر اسے سرہند لوٹ جانا پڑا۔ لیکن پھر بھی دہلی میں اپنے آپ کو جاگزیں کرنے کی امید اس نے نہ چھوڑی اور دوبارہ حملہ کے پیش نظر وہ اپنے ذرائع کے استحکام میں لگ گیا۔ اسی زمانہ میں اس نے سلطان کا خطاب اختیار کر لیا لیکن خطبہ میں اور سکوں پر اپنے نام کے اعلان کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جب تک دہلی اس کے قبضہ میں نہ آجائے۔ بہلول کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں سلطان محمد کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا سلطان علاؤالدین اس کا جانشین ہوا۔ بہلول نے دہلی پر قبضہ کرنے کی کوششیں تیز تر کر دیں۔

اس وقت ملک کے سیاسی حالات، جو بہلول کے سیاسی حوصلوں کے حصول میں بہت حد تک مددگار ثابت ہوئے یہ تھے۔ شمالی ہندستان کا مرکزی خطہ بہت سے نیم آزاد حکمراں خاندانوں میں منقسم تھا اور فوجی اہمیت کے تمام علاقے قبائلی سرداروں کے کنٹرول میں تھے۔ مہرولی سے لے کر لاڈو سرائے (دہلی کے قریب) تک علاقہ احمد خاں میواتی کے تحت تھا۔ سرہند، لاہور، سامانہ، سنام، حصار فیروزہ اور پانی پت تک کا علاقہ لودیوں کے تحت تھا۔ سنبھل سے لے کر خواجہ خضر (دہلی کے قریب) تک کا حصہ دریا خاں لودی کے قبضہ میں تھا۔ کوئل عیسیٰ خاں ترک بچہ کی ماتحتی میں تھا۔ راپری کا کنٹرول حسن خاں کے بیٹے قطب خاں کے ہاتھوں میں تھا، بھون گاؤں، پٹیالی اور کمپیل رائے پرتاپ کے تحت تھے۔ جبکہ بیانہ، داؤد خاں اوحدی کی ماتحتی میں تھا دہلی کے اردگرد اتنی تعداد میں پھیلے ہوئے قبائلی سرداروں کی موجودگی میں دہلی کے سلطان کی صورتِ حال ایک اعلا قبائلی سردار سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے اختیارات دہلی اور اس کے اردگرد کے چند دیہاتوں تک محدود تھے۔ صحیح مناسبت کے اعتبار سے بہلول کی

کشمکش حقیقتاً دہلی کے سلطان کے ساتھ نہ تھی۔ گرچہ دہلی پر قبضہ اس کے خاندان کے ایک آزاد تسلط کے لیے قطعی ناگزیر تھا۔ بلکہ دیگر سرداروں کے ساتھ تھی جو اپنے اپنے علاقوں میں محدود مگر موثر اختیارات کے حامل تھے۔

بہلول نے ایک فوج اکٹھا کی اور دوسری بار وہ دہلی کی جانب روانہ ہوا۔ پھر قلعہ پر قبضہ کرنے میں اسے ناکامی ہوئی اور شکست خوردہ ہو کر سرہند لوٹ آیا۔ سلطان علاؤالدین نے قطب خاں، عیسیٰ خاں اور رائے پرتاپ سے مشورہ طلب کیا اور اس نے حمید خاں کو، جسے بہلول کے مشورہ پر مقرر کیا گیا تھا، برطرف کر دینے، قید کر دینے اور اس کے اقطاع سے تقریباً چالیس پرگنوں کو "خالصہ" سرزمین میں منتقل کر دینے کے مشورہ کو قبول کر لیا۔ حمید خاں سے اپنی دشمنی کے باعث، جس کے باپ نے اس کے صوبے میں غارتگری کی تھی، رائے پرتاپ نے حمید خاں کو مار ڈالنے پر سلطان کو ابھارا۔ سلطان نے اس کے مشورے کو قبول کر لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس پر عمل در آمد کرے حمید خاں کے چند بھائیوں نے اسے قید خانے سے بھگا دینے کی تدبیر نکال لی۔ اب حمید خاں نے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ زبردستی سلطان کے زنان خانہ میں گھس گیا اور حرم کی عورتوں کو محل سے باہر نکال لایا اور ان کی دولت اور جائدادوں پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات میں سلطان علاؤالدین نے اپنے آپ کو بالکل بے بس پایا۔ لہٰذا وہ بدایوں چلا گیا اور وہیں (مناسب) وقت کا انتظار کرنے لگا۔

اب حمید خاں سوچنے لگا کہ یا تو جون پور کے سلطان محمود کو یا مالوہ کے سلطان محمود کو اس بات کی دعوت دے کر آئے اور دہلی کے تخت پر قبضہ کر لے۔ جب بہلول کو اس بات کا علم ہوا کہ حمید خاں دہلی کے لیے ایک حکمراں کی تلاش میں ہے تو وہ پوری قوت کے ساتھ دہلی روانہ ہوا۔ حمید خاں نے اپنے آپ کو قلعہ میں بند کر لیا اور شہر میں بہول کے داخلے کو روک دیا۔ بہلول نے ایک فوجی جنگ کے مقابلہ میں حکمت عملی کو راہ دی اور متعدد جھوٹے وعدوں اور غلط یقین دہانیوں کے بعد حمید خاں سے ملاقات کا ایک موقعہ حاصل کر لیا۔ حمید کے شبہات عارضی طور پر ختم ہو گئے۔ اور بہلول کم و بیش حمید خاں کے ایک ماتحت افسر کی حیثیت سے دہلی میں مقیم رہا۔

ایک مرتبہ حمید خاں نے چند امرا کو ایک دعوتی جشن میں مدعو کیا اور اس جشن

میں شامل ہونے کے لیے بہلول کو بھی دعوت دی۔ بہلول نے سوچا کہ یہ حمید خاں کی ذہن میں یہ تاثر دینے کا ایک بہتر موقعہ تھا کہ اس کے افغان پیروکار احمقوں کا ایک گروہ ہے اور وہ اس کے لیے کسی نقصان کا سبب نہیں بن سکتا۔ بہلول کے ایما پر دعوتی پارٹی میں انہوں نے عجیب و غریب اور بے ڈھنگے طور طریقے اختیار کیے۔ ان میں سے چند نے اپنے جوتوں کو اپنی کمر میں باندھ لیا اور چند نے انہیں خان کے سر سے اوپر طاقوں میں رکھا۔ جب اس انوکھے طریقے کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ چوروں سے خوف زدہ ہیں۔ ان میں سے چند نے قالین کے ٹکڑوں کی درخواست کی تاکہ وہ اس سے اپنے بچوں کے لیے ٹوپیاں اور فیتے بنوا کر انہیں بطور تحفہ بھیجیں گے۔ حمید خاں حقارت آمیز انداز میں ہنسا اور بولا، "ہاں ہاں میں تمہیں بہترین کپڑے دوں گا جسے تم تحفہ کے طور پر استعمال کر سکو گے"۔ جب پانوں کی طشتریاں آئیں تو چند افغانوں نے چونے کو چاٹ لیا اور پتوں کو چبا گئے۔ چال بڑی کارگر ثابت ہوئی اور حمید خاں سوچنے لگا کہ ملک بہلول کے پیروکار 'دیہاتی گنوار' ہیں اور ان سے کوئی خطرہ نہیں۔ جیوں ہی بہلول یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گیا حمید خاں کی رہائش گاہ پر حفاظتی اور دوسرے انتظامات ڈھیلے کر دیے گئے۔

جب کبھی ملک بہلول حمید خاں سے ملاقات کے لیے جاتا وہ صرف چند ہی آدمیوں کو دربار میں لے جاتا جبکہ دوسرے لوگ قلعہ کے باہر ہی کھڑے رہتے۔ ایک بار حمید خاں نے بہلول کو ایک اعزازی دعوت دی۔ اس کے افغانی ملازمین محافظوں سے لڑ پڑے اور زبردستی یہ کہتے ہوئے گھس پڑے کہ "ہم لوگ بھی حمید خاں کے ملازم ہیں، ہمیں کیوں اسے سلامی دینے کی اجازت نہیں؟ جب اس کی اطلاع حمید خاں کو دی گئی تو اس نے انہیں دربار میں آنے کی اجازت دے دی وہ فوراً ہال میں گھس پڑے اور جہاں بھی انھوں نے حمید خاں کے ایک محافظ کو پایا، بہلول کے دو افغانی پیروکاروں نے اسے دبوچ لیا۔ دعوت کے اختتام پر جب حمید خاں کے آدمی رخصت ہو چکے تو قطب خاں لودی نے اپنے بغل کے نیچے سے ایک زنجیر نکالی اور اسے حمید خاں کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ "تمہیں کچھ

دنوں حراست میں رہنا ہے، گزشتہ عنایات وپاسداری کی بنا پر میں تمہاری زندگی لینے سے پرہیز کرتا ہوں"۔ سازش مکمل طور پر کامیاب رہی۔ دہلی کی سلطنت ملک بہلول کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

2

بہلول لودی (1451-89ء)

نجومیوں کے ذریعہ منتخب شدہ ایک مبارک گھڑی میں 17/ربیع الاول 855ھ مطابق 19/اپریل 1451ء[1] کو بہلول دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ فرشتہ کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاج پوشی دو بار ہوئی۔ ایک تو سلطان علاؤالدین کے ساتھ اس کی خط و کتابت سے پہلے اور دوسری اس کے بعد[2]۔ بہلول نے خطبہ میں علاؤالدین ہی کا نام اس وقت تک باقی رکھا جب تک کہ موخرالذکر باضابطہ طور پر تخت سے دستبردار ہو گیا۔

اس وقت سلطان بہلول کے نو بیٹے تھے۔ خواجہ بایزید، نظام خاں (جو آئندہ چل کر سکندر شاہ ہوا) مبارک خاں، (جو باربیک شاہ کے نام مشہور ہوا) عالم خاں (جو بعد میں سلطان علاؤالدین کے نام سے مشہور ہوا)، جمال خاں، میاں یعقوب، فتح خاں، میاں موسیٰ اور جلال خاں[3]۔ طبقات اکبری کا مصنف مزید 134 امرا کی ایک فہرست پیش کرتا ہے، جو اس کی حکومت کے بطن البطون (Core) کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں لودی، لوہانی، یوسف خیل، سروانی، میواتی، جلوانی، ترک بچہ، فرملی اور ہندو جیسے رائے پرتاپ، رائے کیلان اور رائے کرن شامل تھے۔

دہلی پر قبضہ کے فوراً بعد بہلول نے سلطان علاؤالدین کو یہ خط لکھا کہ "آنحضور کے والد نے میری پرورش کی تھی۔ میں آپ کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا آرہا

---

(1) تاریخ خان جہاں ص ص 1، 140۔

(2) تاریخ داؤدی، علی گڑھ ایڈیشن، ص ص 12-11 فرشتہ 1، 174-75۔

(3) تاریخ داودی ص 12، نظام الدین (طبقات اکبری ص ص 1، 298) اور فرشتہ (1) 174 نے باربک شاہ اور مبارک خاں تذکرہ غلطی سے دو افراد کی حیثیت سے کیا ہے۔

ہوں...... خطبہ سے آپ کے نام کو خارج کیے بغیر علاؤالدین نے جواب دیا کہ ”چونکہ میرے والد تمہیں اپنا بیٹا کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے لہٰذا میں تمہیں اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں اور تمہارے لیے بادشاہت سے مستعفی ہوتا ہوں۔ میں اطمینان کے ساتھ بدایوں میں رہوں گا“۔ بہلول جس اطمینان کا طالب تھا وہ اسے اس جواب سے کس حد تک نصیب ہو سکا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں مگر پھر بھی فوری طور پر اس سے اس کی پریشانیوں میں کمی آ گئی۔ اور وہ دوسرے اہم مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کر سکا۔

حقیقت میں دہلی کا تخت جس پر بہلول متمکن تھا کوئی پھولوں کی سیج نہ تھا۔ متعدد پریشان کن مسائل تھے جنھیں حکمت اور اولوالعزمی کے ساتھ نپٹانا تھا۔ لودیوں کی روایات اور جدید حکمراں طبقہ کے کردار اور بناوٹ کو مدّ نظر رکھتے ہوئے نئی حکومت کے ہر ہر پہلو کو مستحکم اور مقبول بنیادوں پر رکھنا تھا۔ جس طور پر ملا قادن نے جمعہ کے ایک اجتماع میں بہلول کی موجودگی میں افغانوں کی تمدنی روایات کا مضحکہ اڑایا تھا وہ کوئی سرسری بات نہ تھی۔ یہ بات عوام کے اس تامل کو ظاہر کرتی تھی جو وہ لودیوں کو دہلی کے حکمراں کی حیثیت سے قبول کرنے میں محسوس کر رہے۔ حقیقت میں صورت حال اس سے خراب تھی جس سے خلجیوں کو اپنی حکومت کے آغاز میں دوچار ہونا پڑا تھا۔ حالات پر احتیاط و عزم کے ساتھ قابو پا کر ہی عوام کے ذہنوں سے ان تعصبات کو دور کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں بہلول اس وقت تک اپنی صورت حال کو مستحکم نہیں سمجھ سکتا تھا جب تک کہ وہ ایک ایسے مضبوط اور کار گزار حکمراں طبقہ کی تشکیل نہ کر دے جو مملکت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں اس کا شریک بن سکے۔

افغانی معاشرہ کی جمہوری روح، جس کی توثیق قبائلی روایات سے بھی ہوئی تھی، ایک مضبوط و مستحکم شہنشاہیت کی ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ تھی اور افغانوں کے سماجی۔ سیاسی تصورات کے ساتھ مطلق العنانی کی شہنشاہی روایات جنھوں نے گزشتہ صدیوں میں ہندستان کی سیاسی زندگی کی روش کا تعین کیا تھا، کا امتزاج ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ افغانی سیاسی روایات کا زیادہ جھکاؤ سیاسی اقتدار کی تقسیم اور لا مرکزیت کی جانب تھا۔ جب کہ ملک کی سیاسی فضا نے اس بات کو بالکل ناممکن بنا دیا تھا کہ مرکز گریز رجحانات کو قبول کیا جائے۔ اس طرح سیاسی تقاضوں اور افغانی روایات

میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی لہٰذا بہلول کو ان دونوں کے درمیان ایک صحت مند مصالحت پیدا کرنی پڑی تاکہ ہندستان میں اپنے اقتدار استحکام میں دونوں کا پورا پورا فائدہ حاصل کر سکے۔

بہلول کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ سید خاندانوں کے ایک حکمراں کی موجودگی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سلطان علاؤالدین دستبردار ہو گیا تھا لودی اقتدار کا استحکام اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ بدایوں میں مقیم تھا۔ کچھ ایسے امرا موجود تھے جو اب بھی اسے اپنا قانونی مقتدر اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اور لودی بالادستی کے تصور سے راضی بہ اضافہ تھے۔ اس حقیقت سے صورت حال اور بھی پیچیدہ ہو گئی تھی کہ جون پور کا شرقی حکمراں دہلی کے سید سلطان کا داماد تھا اور لہٰذا وہ دہلی سلطنت کو جائز طور پر اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ شرقی۔ لودی کشمکش کے پس منظر میں اس حقیقت نے زیادہ سنگین صورت حال اختیار کر لی اور ایک ایسا خطرہ در پیش کر دیا جس سے بآسانی بچا نہیں جا سکتا تھا۔

پھر وہاں حمید خاں کا بھی ایک گروہ تھا جس سے نمٹنا تھا۔ اس طرح مملکت کے اندر اور باہر اپنے دشمنوں کے ذریعہ پیدا شدہ مسائل میں گھر کر بہلول کو ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑا۔

اس کے لیے دو فوری مسائل خزانے پر قبضہ اور راجدھانی میں امن و انضباط کے قیام کا تھا۔ اس نے خزانے کی حفاظت اور شاہی ذخیروں، اصطبلوں وغیرہ کا انتظام و انصرام اپنے افغانی افسروں کے سپرد کر دیا اور قلعہ کی حفاظت کے لیے تمام فوجی اہمیت کی جگہوں پر افغانی سپاہیوں کو مقرر کیا۔ اس طرح دہلی کے اندر و باہر پر امن حالات قایم کیے گئے اور دہلی میں صورت حال کو محفوظ کر کے بہلول نے اپنی توجہ پنجاب کی طرف کی۔ ملتان کے معاملات کی درستگی کے لیے وہ وہاں روانہ ہو گیا[1]۔

شرقی حکمراں کے ساتھ کشمکش

جب بہلول نے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی تو اس نے راجدھانی اپنے سب

---

(1) طبقات اکبری (1)، ص 301۔

سے بڑے لڑکے خواجہ بایزید، شاہ سکندر سروانی اور اسلام خاں کی بیوہ بیوی متو کے حوالے کیا۔ سلطان محمود شرقی کے حملہ کر دینے کے لیے یہ ایک عمدہ موقع تھا۔ عبداللہ اور نعمت اللہ لکھتے ہیں کہ علاؤالدین کے چند امرا نے، جو اندرونی طور پر بہلول لودی سے عداوت رکھتے تھے، شرقی حکمراں کو دعوت دی[1]۔ اس کشمکش کا دوسرا بڑا محرک سلطان محمود شرقی کی بیوی تھی۔ یہ سلطان علاؤالدین کی لڑکی تھی اور بہلول کے خلاف سخت اقدام اٹھانے کے لیے اپنے شوہر کو ہمیشہ اکساتی رہتی تھی۔ وہ کہا کرتی کہ ''اگر تم اس کے خلاف نہ نکلو گے تو میں ترکش سنبھال لوں گی اور بہلول کے خلاف نکل پڑوں گی[2]۔ شرقی سلطان کے مقاصد سے بہلول بے خبر نہ تھا اور اسی لیے اس نے نہایت خاکساری کا اظہار کر کے اس کے گھمنڈ اور جذبہ خود نمائی کی ناز برداریاں کی تھیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں اسے متاثر کرنے میں ناکام ثابت ہوئیں۔ وہ ایک زبردست فوج کے ساتھ جو ایک لاکھ ستر ہزار پاپیادہ اور گھوڑ سوار سپاہیوں[3] اور چودہ سو جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ 854ھ مطابق 1450ء میں دہلی کے خلاف روانہ ہو گیا اور اس نے راجدھانی کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت بہلول سرہند میں تھا[4]۔ حملہ کی اطلاع پا کر وہ حملہ آور سے نمٹنے کے لیے مڑ گیا۔

دہلی میں مقیم افغانی فوجوں نے صورت حال کا حتی الامکان مقابلہ کیا۔ بی بی متو[5] نے بہت سی عورتوں کو مردانہ لباس پہنا کر انھیں قلعوں کی دیواروں پر محافظ کی حیثیت سے مقرر کیا تاکہ افغانی محافظ کی تعداد کے بارے میں دشمن دھوکے میں رہیں، خان جہاں لودی کا داماد سکندر سوامی جو ایک بہترین تیر انداز تھا، نے دشمن کے ایک مشکیزے پر تیر پھینکا۔ یہ مشکیزے سے اور اس بیل کے جسم سے، جس پر اسے لیجایا جارہا تھا گزر کر زمین پر چبھ گیا۔ تیر اندازی کے اس کمال نے شرقی فوجوں کو قلعہ کی

---

(1) تاریخ داؤدی، 13، 12 تاریخ خاں جہانی، جلد 1 142، طبقات اکبری جلد 1 (301) بھی دیکھیں۔

(2) تاریخ داؤدی 13-12۔

(3) بعض مصنفین اس کے گھوڑ سوار فوج کی تعداد بتاتے ہیں لیکن یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ داؤدی کے مصنف کا یہ بیان زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے کہ یہ سواروں اور پیادوں کی مشترکہ تعداد تھی۔

(4) ایضاً، نظام الدین (طبقات اکبری جلد 1، 301) لکھتا ہے کہ وہ دیپال پور میں تھا۔

(5) تاریخ داؤدی، 13

دیواروں تک پہنچنے میں متامل کر دیا۔ لیکن محمود شرقی نے ایک نئی تدبیر ڈھونڈ نکالی۔ اس نے آتش گیر مادے قلعہ میں پھینکے جس کی وجہ سے لوگوں کے لیے اپنے گھروں کے صحنوں میں بھی چلنا پھرنا ناممکن ہو گیا۔ اس طرح محافظ فوج کو ہتھیار ڈال دینے اور امن کی شرائط پر گفت و شنید کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ سید شمس الدین، دریا خاں لودی کے ساتھ معاملات کے تصفیہ کے لیے باہر نکلا اور ایک خفیہ ملاقات میں اس نے دریا کے افغانی جذبات کو اپیل کی اور بڑی چالاکی سے اسے اپنی جانب کر لیا۔ دریا نے شرقیوں کی وجہ سے دہلی سے منعطف کر کے بہلول کی فوج کی طرف موڑ دی، جو شرقی حملہ کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے فوراً دہلی واپس آ رہی تھی۔

محمود نے فتح خاں ہردی اور دریا خاں لودی کو تیس ہزار سپاہیوں اور تیس ہاتھیوں پر مشتمل ایک فوج کے ساتھ بھیجا تاکہ بہلول کو پانی پت کے مغرب میں روک دیں۔ دونوں فوجیں نریلہ کے مقام پر، جو دہلی سے تقریباً سترہ میل کے فاصلہ پر ہے آمنے سامنے ہوئیں۔ بہلول کی فوج شرقی فوج کے نصف سے بھی کم تھی کیوں کہ یہ صرف چودہ ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ یہاں قطب خاں لودی نے وہی چال چلی جو اس سے پہلے سید شمس الدین بڑی کامیابی کے ساتھ چل چکا تھا۔ اس نے دریا خاں کے جذبات کو ان الفاظ سے اپیل کیا کہ ”تمہاری ماں اور بہنیں قلعہ میں محصور ہیں، تم کیسے آدمی ہو کہ تم اپنی عزت کا خیال کیے بغیر ایک اجنبی کی خاطر لڑ رہے ہو؟ اس تقریر کا مطلوبہ اثر ہوا اور اس وجہ سے دریا خاں کی (شرقی فوج سے) علیحدگی عمل میں آئی۔ اس وعدے پر کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جائے، وہ میدان چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ اور اس طرح کے ساتھ چھوڑ دینے کے بعد فتح خاں حملے کی چوٹ برداشت کرنے کو تنہا رہ گیا۔ اور اس کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار کیا گیا۔ رائے کرن نے، جس کے بھائی رائے پتھورا کو فتح خاں نے مار ڈالا تھا، اسے قتل کر دیا گیا[1]۔

اس حادثہ کی اطلاع نے محمود شرقی کو دل شکستہ کر دیا اور وہ جون پور روانہ ہو گیا۔ بہلول نے پسپا فوج کا تعاقب کیا اور کافی مقدار میں مالِ غنیمت حاصل کیا۔ اس فتح

---

(1) طبقات اکبری، جلد 1 ص 302

نے بہلول کے وقار کو بڑھادیا اور اس کے دشمنوں کو بالکل مرعوب کر دیا۔

امرا کی سرزنش

نریلہ میں اپنی فتح کے فوراً بعد بہلول نے اپنی توجہ اپنے امرا میں موجود سرکش عناصر کی طرف مبذول کی۔ میوات کے احمد خاں نے اطاعت قبول کرلی اور مستقبل میں اپنے بہتر رویہ کے لیے سلطان کے ایک خادم کی حیثیت سے اپنے چچا مبارک خاں کی خدمات بطور ضمانت پیش کیں۔ بہلول نے اس کی معذرت قبول کرلی۔ لیکن اس کے اقطاع کے سات پرگنوں کو علیحدہ کرکے اس کی طاقت کو کم کردیا۔

سنبھل کے گورنر (حاکم) دریاخاں لودی نے ابتدا میں اپنی وفاداریاں شرقی سلطان کو منتقل کردی تھیں اور اسی بنا پر وہ سزا کا مستحق تھا۔ لیکن میدان جنگ میں اس نے شرقی سلطان کا ساتھ چھوڑ دیا اور بہلول سے جاملا تھا اور یہی غداری نریلہ کی فتح میں معاون ثابت ہوئی تھی۔ بہلول نے اس کے اقطاع میں سے سات پرگنوں کو علیحدہ کر دیا لیکن اسے سنبھل سے منتقل نہیں کیا۔

اس کے بعد سلطان کوئل کی جانب بڑھا۔ کوئل کے گورنر عیسیٰ خاں نے وفاداری کا اقرار کیا اور اسے برقرار رکھا گیا۔

اس وقت بہلول کو اصل فکر صوبائی اور دیگر مقامی انتظام کاروں کی ایک مکمل تفتیش تھی تاکہ اس کے اقتدار کی بنیادی اکائیاں مضبوطی سے قایم ہو جائیں لیکن جیسے ہی ان گورنروں نے اطاعت قبول کرلی اور اس کے اقتدار کو تسلیم کرلیا۔ بہلول نے ان کے لیے ان کی جاگیروں کی توثیق کرنے میں تامل نہ کیا۔ اس نے سکیت[1]، کمپیل[2]، پٹیالی[3]، بھون گاؤں[4]، راپری اور اٹاوہ کی طرف توجہ کی۔ راپری کے قطب خاں کے علاوہ تمام گورنروں نے اس کی فرمانروائی قبول کرلی۔ لیکن تھوڑی سی مزاحمت کے بعد

---

(1) یہ اٹاوہ شہر سے بارہ میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔

(2) فتح گڑھ سے 28 میل شمال مشرق میں ایک پرگنہ گاؤں۔

(3) ایٹہ ضلع میں ایک پرگنہ دیہات

(4) مین پوری ضلع میں ایک تحصیل شہر۔ بھون گاؤں، رائے پرتاپ کے ماتحت تھا، جس کو نعمت اللہ، بھون گاؤں کا حاکم اور زمیندار" بتاتا ہے۔

قطب خاں بھی مطیع ہو گیا۔ بہلول نے ان علاقوں میں ان کی توثیق کر دی۔

جون پور کے حکمراں کے ساتھ کشمکش

بہلول اپنی مملکت میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے میں مشغول تھا کہ اسی اثناء میں اسے مجبوراً اپنی تمام تر طاقت اور وسائل کو شرقیوں کے علاقائی توسیع کی خواہشات سے نمٹنے کے لیے لگا دینا پڑا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے طویل دور حکومت میں اوّل تا آخر شرقی خطرہ ہی مشکل ترین مسئلہ بنا رہا۔

856ھ مطابق 1452ء میں بغیر کسی فیصلہ کن نتیجہ کے کشمکش کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ بالآخر راجہ پرتاپ اور قطب خاں نے سلطان محمود شرقی کے ساتھ ایک معاہدہ پر گفت و شنید کی جس کے مطابق (الف) بہلول کو سلطان سید مبارک شاہ کے علاقہ پر قابض رہنا تھا جب کہ سلطان ابراہیم شرقی کے علاقہ پر سلطان محمود شرقی کی ملکیت کر دی گئی۔ (ب) شمس آباد کو سلطان بہلول کے ایک ماتحت کے حوالے کر دینا تھا۔ (ج) بہلول کو ان سات ہاتھیوں کو واپس کر دینا تھا جن پر اس نے گزشتہ جنگوں میں قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن معاہدہ کی شرائط کو روبہ عمل لانے میں مشکلات اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بہلول نے رائے کرن کو شمس آباد پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا جو سلطان محمود کے ایک ماتحت جونا خان کے قبضہ میں تھا۔ جونا خان نے قلعہ سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ بہلول نے شمس آباد کی طرف کوچ کیا اور جونا خاں کو بے دخل کر کے وہاں رائے کرن کو قبضہ دلا دیا۔ محمود شرقی سلطان کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوا۔ شمس آباد کے نزدیک دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی۔ قطب خاں لودی اور دریا خاں نے رات میں ایک حملہ کیا اور وہ اس میں کامیاب ہو جاتے لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ قطب خاں اپنے گھوڑے سے گر پڑا اور شرقی فوجوں نے فوراً اسے قیدی بنا لیا۔ وہ سات سالوں تک شرقیوں کا قیدی رہا۔

سلطان محمود کی موت پر (1459ء) دہلی اور جون پور کی عداوت کچھ دنوں کے لیے ٹھنڈی پڑ گئی اور سابقہ حالات کو اسی طرح قایم رکھنے (Status quo) کی شرط پر ایک معاہدہ ہو گیا۔ اور شمس آباد ایک شرقی ماتحت جونا خاں کو واپس کر دیا گیا۔

چونکہ قطب خاں لودی، جسے شرقیوں نے قید کر لیا تھا، سلطان بہلول کی بیوی شمس خاتون کا ایک بھائی تھا لہٰذا جب تک اس کا بھائی رہا نہ ہو جائے اس وقت تک وہ اس بات کے لیے تیار نہ تھی کہ بہلول چین سے بیٹھے۔ شرقیوں کے ساتھ اس معاہدے کے بارے میں جب اسے معلوم ہوا تو اس نے بہلول کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ اس کے لیے آرام کرنا یا چین سے بیٹھنا مناسب نہیں جب کہ قطب خاں قید میں ہے۔ یہ بات بہلول کے دل کو لگ گئی اور وہ اپنے نامکمل منصوبے کی تکمیل کے لیے واپس مڑا۔ جون پور کی اس وقت کی عام فضا نے اس اقدام میں اس کی ہمت افزائی کی۔ نیا شرقی بادشاہ محمد شاہ اپنی پوزیشن کو مستحکم نہ کر سکا تھا اور ایسے امراء موجود تھے جو اس کے مخالف تھے۔ شرقی سلطان کو جب لودی فوجوں کی حرکت کی اطلاع ہوئی تو ان کے مقابلے کی غرض سے وہ جون پور سے بڑھا۔ اس نے شمس آباد سے رائے کرن کو بھگا دیا اور جونا خاں کو اس کا انچارج بنا دیا۔ سلطان محمد کی طاقت سے رائے پرتاپ اتنا مرعوب ہو گیا کہ اس نے بہلول کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس سے جا ملا۔ شرقی سلطان برسانی[1] پہنچ گیا۔

دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ راپری[2] میں ہوئی۔ اس وقت شرقیوں کی طاقت اور وسائل اس حقیقت کی بنا پر کافی بڑھ گئے تھے کہ راجہ پرتاپ، مبارز خاں اور راپری کے گورنر قطب خاں محمد شرقی کے ساتھ ہو گئے تھے۔ لیکن محمد اس صورت حال کا پورا پورا فائدہ حاصل نہ کر سکا۔ اس نے اپنے بھائیوں سے انتقام کا منصوبہ بنا کر اپنی پوزیشن اتنی کمزور بنا لی کہ بالآخر وہ مار ڈالا گیا[3] ایک حادثہ نے ایک عارضی صلح اور التوائے جنگ کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ سلطان حسین شرقی کا چھوٹا بھائی شہزادہ جلال خاں، جو جون پور کے تخت پر محمد کا جانشین ہوا تھا، تیزی سے اپنے بھائی سے جا ملنے کے لیے رات میں روانہ ہوا۔ اور بہلول کی فوج کو اس نے غلطی سے حسین کا کیمپ سمجھ لیا۔ اسے فوراً

---

(1) ہوڈی والا کے مطابق (اسٹڈیز ص493) میں مین پوری سے 27 میل جنوب راپری کے نزدیک سرسا (کا مقام) تھا۔

(2) تاریخ داؤدی کے مطابق جنگ چندوارہ میں لڑی گئی تھی جو آگرہ ضلع میں فیروز آباد سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔

(3) تفصیل کے لیے جون پور کے شرقیوں کے سلسلہ کا باب ملاحظہ ہو۔

گرفتار کر لیا گیا جس میں قطب خاں بھی شامل تھا، کے لیے ایک بنیاد بن گئی۔ دونوں سلطان کے درمیان سابقہ حالات کی بحالی (Status quo) کی بنیاد پر چار سالوں کی جنگ بندی کا ایک عارضی معاہدہ ہو گیا۔ شرقیوں نے شمس آباد پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ اب رائے پرتاپ سلطان بہلول سے جا ملا۔ سلطان حسین نے قطب خاں لودی کو جون پور سے بلوایا اور باعزت طریقے پر اسے بہلول کے پاس بھیج دیا۔ سلطان بہلول نے جلال خاں کو شرقی سلطان کے پاس واپس بھیج دیا۔

بہلول اور حسین شرقی کے درمیان بہت عرصہ تک کشمکش جاری رہی۔ یہ حسین شرقی کی پوری زندگی تک چلتی رہی اور دہلی کی سیاست دسیوں سالوں تک شرقی حکمراں کے متواتر حملوں سے پیدا شدہ مسائل کے گرد گھومتی رہی۔ حتی کہ اس وقت بھی جب حسین کو جون پور سے بے دخل کر دیا جا چکا تھا اور شرقی سلطنت کا چراغ عملاً بجھ چکا تھا۔ حسین شاہ ایک ایسا سانپ بنا رہا جو زخم خوردہ تو تھا لیکن مرا نہ تھا۔[1]

جنگ بندی کے ان چار سالوں کے دوران ایسی باتیں پیش آئیں جنھوں نے جلد ہی ایک بحران پیدا کر دیا۔ شمس آباد کے ہاتھ سے نکل جانے کا صدمہ بہلول بھلا نہ سکا تھا۔ اس نے جونا خاں سے چھین لیا اور اسے رائے کرن کی ماتحتی میں دے دیا۔ مزید یہ کہ ہندو سرداروں اور زمینداروں کی دل جوئی کا خواہاں ہونے کے باعث بہلول نے دریا خاں سے ضبط شدہ جھنڈے اور نقاروں کو رائے بیر[2] سنگھ دیو (رائے پرتاپ کے بیٹے) کو بخش دیا۔ لازمی طور پر دریا خاں اس اقدام پر، جسے اس نے اپنی بے عزتی سمجھا، سخت برہم ہوا اور اس کا اتنا سخت ردِ عمل ہوا کہ اس نے بیر سنگھ کو قتل کرا دیا۔ بہلول نے صورت حال اپنے بس سے باہر پائی اور دہلی واپس ہو گیا۔

ملتان کی مہم

ملتان میں لنگوں کے اقتدار کی نشو نما پر بحث ملتان سے متعلق باب میں کی گئی ہے۔ شیخ بہاء الدین زکریا کے ایک خلف شیخ یوسف نے، جنھیں ان لوگوں نے اکھاڑ پھینکا

---

(1) تفصیل کے لیے شرقیوں کے سلسلہ کا باب ملاحظہ ہو۔

(2) طبقات اکبری میں "نرسنگھ" درج ہے۔

تھا۔ ملتان چھوڑ دیا اور بہلول لودی کی پناہ میں آگئے جس نے ان ہر ممکن مدد اور حفاظت کی۔ یہی نہیں بلکہ بہلول ان کے خاندان کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو گیا اور اپنی لڑکی شیخ یوسف کے ایک لڑکے شیخ عبداللہ کی زوجیت میں دے دی۔ اپنی پوزیشن کے دوبارہ حصول کے لیے فکر مند ہونے کے باعث شیخ یوسف نے بارہا بہلول سے درخواست کی کہ وہ لنگوں پر حملہ کر کے اور ان کا استیصال کر کے اس کے استحقاق کی حمایت کرے لیکن بہلول اپنی طاقت کی حد سے واقف تھا لہٰذا وہ محض خالی وعدوں سے شیخ یوسف کو خوش رکھتا[1]۔ لیکن جب 873ھ مطابق 69-1468ء میں قطب الدین لنگا کا انتقال ہو گیا تو قطب خاں لودی اور خان جہاں کو دہلی میں اپنا نائب مقرر کر کے ملتان کی طرف روانہ ہوا۔[2] لیکن اپنی روانگی کے دوران ہی اس نے سلطان حسین شرقی کی فوجوں کی نقل و حرکت کے متعلق سنا اور فوراً راجدھانی واپس لوٹ گیا[3]۔

اسی زمانہ میں بہلول نے روہ سے افغانوں کو بلانے کے متعلق سوچا۔ تارک الوطن افغانوں کے متعلق عباس سردانی کے ذریعہ پیش کی گئی تفصیل پورے اقتباس کی مستحق ہے۔

"سلطان بہلول اس وقت دیپال پور کے قرب و جوار میں پہنچ چکا تھا جب اس نے دہلی کے محاصرہ کی پریشان کن خبریں سنیں اس نے اپنی مملکت کے امرا اور معززین سے کہا کہ "ہندستان کی سلطنت وسیع اور مالدار ہے۔ تمام بادشاہ قومدار (جن کے پاس قبائلی پیروکار ہوں) نہیں ہیں۔ میرے وطن میں (دیارِ خود) میرا ایک بڑا قبیلہ ہے جو ہمت و بہادری میں مشہور ہے۔ وہ لوگ اپنی مردانگی اور جسمانی قوت میں ممتاز ہیں مگر خود اپنی سرزمین میں وہ اپنی وجہ معاش کی خاطر پریشان ہیں۔ اگر وہ ہندستان چلے آئیں تو غربت کی لعنت سے نجات پا جائیں گے اور میں اپنے دشمنوں پر حاوی ہو جاؤں گا اور ہندستان کی سلطنت میرے قبضہ میں آجائے گی۔

"سلطنت کے معززین اور امرا نے عرض کیا کہ دنیا کے فاتح بادشاہ کے

---

(1) ایضاً جلد سوم ص 525۔

(2) فرشتہ، جلد دوم ص 325

(3) تاریخ خاں جہانی، جدل اوّل ص 155۔

درخشاں دل میں جو باتیں آئی ہیں ریاست کے مفاد میں ہیں اور جذبہ سخاوت اور اپنی قوم اور قبیلے کی بہبودگی کے خیال سے یہ بات اس کے ذہن میں آئی تھی۔ ورنہ اس کی حکومت اور اس کا دبدبہ، نیز اس کا وقار ساتھ ہی اس کی فوج کی طاقت و قوت دوسروں کے تعاون کی طلب گار نہ تھی...... لیکن مصلحت اس بات کی متقاضی ہے کہ آں حضور روہ کے قبائیلی سرداروں کو یہ فرمان بھیجیں کہ "اللہ تعالی نے دہلی سلطنت کا اقتدار اعلیٰ افغانوں کو بخشا ہے لیکن ہندستان کے دیگر حکمراں انھیں ہندستان سے بھگانا چاہتے ہیں...... ہندستان کا خطہ ارض وسیع اور مالدار ہے یہ ہمارے تمام رشتہ داروں کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ اگر ہمارے رشتہ دار اس سرزمین میں آجائیں تو سلطنت برائے نام میری ہوگی لیکن تمام جاگیروں اور ولایتوں کو جو میرے قبضہ میں ہیں یا مستقبل میں جن پر قبضہ ہو جائے گا۔ وہ برادرانہ بنیاد پر (برادروار) تقسیم کر کے اس پر قبضہ کر سکتے ہیں۔ ان دنوں جون پور کے حاکم سلطان حسین نے بے شمار زمینداروں کی ایک بڑی فوج کی مدد سے دہلی کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ افغانی خاندان (کے لوگ) اسی شہر (دہلی) میں ہیں۔ اگر ہمارے ساتھی قبائلی لوگ بڑی تعدادوں میں ہماری مدد کے لیے آنا چاہیں تو یقیناً ان کی مدد کے لیے یہ ایک مناسب موقع ہے۔ ان فرمانوں کو پاتے ہی وہ اپنی عزت نفس اور وقار کے جذبہ سے فیضان حاصل کر کے، ہندستان چلے آئیں اور سلطان حسین کے قبضہ سے شہر کو چھٹکارا دلائیں۔ جب وہ خود اپنی آنکھوں سے اپنے ہندستانی رشتہ داروں کی متمول حالت کو دیکھ لیں گے اور ان کے خزانوں سے فیضیاب ہوں گے تو ہمارے ہی طرح اپنے وطن واپس جانا پسند نہ کریں گے بلکہ سلطان کی فوج میں شامل ہو جائیں گے اور ہندستان کی بیشتر سرزمین کو شاہ خدمت گاروں کے قبضہ میں لے آئیں گے"۔

سلطان بہلول نے اس مشورہ کا خیر مقدم کیا اور افغنی قبائل کے لیڈروں کو فرمان بھیجے۔

ان فرمانوں کو پاکر روح کے افغان چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح سلطان بہلول کی ملازمت میں شامل ہونے کے لیے آئے۔[1]

---

(1) تاریخ شیر شاہی مصنفہ امام الدین، ڈھاکہ 1964ء ص ص 6-4

حسین شرقی کے ساتھ کشمکش

بہلول نے چندوار میں شرقی فوجوں سے مزاحمت کی۔ سات دنوں کی غیر فیصلہ کن مگر خوں ریز جنگ کے بعد دونوں جانب کے امرا نے تین سالوں کا ایک جنگ بندی کا معاہدہ مرتب کیا۔ اس کے بعد دونوں حکمراں اپنی اپنی مملکتوں میں واپس چلے گئے۔

لیکن اس دوران حسین شرقی کی طاقت بڑھ گئی۔ اس نے اپنی فوج منظم کی اور معاملات درست کیے۔ بہلول کے ماتحت اور مثلاً اٹاوہ کا گورنر (احمد خاں میواتی)، کوئل کا گورنر (رستم خاں) اور بیانہ کا گورنر (احمد خاں جلوانی) یکے بعد دیگرے اس سے جا ملے۔

جنگ بندی کے تین سالہ معاہدے کے ختم ہونے سے پہلے حسین شرقی ایک لاکھ گھوڑ سواروں اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل ایک فوج کی سرکردگی میں دہلی کے خلاف روانہ ہوا۔ یہ بہلول کے لیے نہایت تشویش ناک لمحہ تھا۔ اس نے محمد فرملی اور کپور چند (گوالیار رائے کا بیٹا) کو بھیجا کہ وہ مالوہ کے محمود خلجی سے اس بحران پر مدد کی اپیل کریں اور وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ اگر وہ اس کی حمایت کے لیے آئے تو وہ اسے چھ ہزار گھوڑے دے گا۔ سلطان محمود اس کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ حرکت کر سکے شرقی سلطان روانہ ہو چکا تھا، بہلول راجدھانی سے روانہ ہوا اور بھتواڑ میں اس کے مقابل پہنچا لیکن بہلول جنگ کی پوزیشن میں نہ تھا۔ خاں جہاں نے ثالثی کے فرائض انجام دیئے اور بہلول کو نہایت ذلت آمیز شرائط قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ شہر دہلی اور اس سے اٹھارہ کردہ کے دائرے میں واقع علاقے کو چھوڑ کر دہلی سلطنت کے تمام خطے شرقی سلطنت کے ہوں گے اور بہلول کو فی الواقع جون پور کے ایک ماتحت کی حیثیت سے دہلی میں رہنا ہوگا لیکن حسین شرقی نے اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیا۔ بہلول کو اب کوئی چارہ نہ تھا اور اس نے جو کچھ بھی ذرائع اس کے قبضہ اختیار میں تھے انھیں سے اپنی دفاع کا فیصلہ کیا۔

آس پاس کے علاقوں کو لوٹنے کے لیے اپنی فوجوں کو بھیج کر حسین نے جو ناعاقبت اندیش اقدام کیا اس نے بہلول کے لیے ایک موقعہ فراہم کر دیا کہ وہ اس کے

کیمپ پر جو جمنا کے دوسرے کنارے پر تھا اچانک ایک حملہ کر دے[1]۔ بہلول نے شرقیوں پر سخت ضربیں لگائیں اور انھیں ایک بدترین شکست دی۔ حسین شاہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوا اور اس کے حرم (کے افراد) بہلول کے قبضہ میں آگئے۔

بہلول نے حسین شاہ پر زبردست اور غیر متوقع فتح حاصل کی تھی لیکن پھر بھی وہ شرقی حکمراں سے مصالحت کا خواہشمند تھا۔ جب حسین کی ماں بی بی راجی اٹاوہ میں 883ھ مطابق 1478ء میں انتقال ہوا تو بہلول نے قطب خاں لودی اور کلیان مل (گوالیار کے رائے کیرت سنگھ کا بیٹا) کے ذریعہ اسے اچھی تعزیتیں بھیجیں۔ اسی سال سلطان علاؤالدین کی موت کی تعزیت کے لیے حسین بدایوں آیا۔ لیکن اس نے قلعہ پر قبضہ کا فیصلہ کیا اور بعد میں سنبھل پر قبضہ کر لیا اور س کے بعد ذی الحجہ 883ھ مطابق فروری۔ مارچ 1479ء میں وہ دہلی کے خلاف روانہ ہوا۔

بہلول اس حملہ سے بدحواس ہو گیا۔ سخت مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہو کر وہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر گیا اور وہاں اس نے رات بھر کھڑے ہو کر دعائیں کیں صبح سویرے اس نے محسوس کیا کہ گویا کوئی اسے عصا دے رہا ہے اور اسے ان مویشیوں کو بھگانے کے لیے کہہ رہا ہے جو وہاں بھٹک آئی تھیں۔ یہ ایک فال نیک تھا اور بہلول کو یقین ہو گیا کہ جنگ میں وہ فتح یاب ہو گا۔

دوسری صبح شرقی فوجوں کے خلاف بڑی پراعتمادی سے اس نے حملہ کی ہدایت کی۔ حسین کی قلعہ پر دھاوا بولنے کی کوشش ناکام ہو جانے کے بعد امن کے لیے گفت و شنید کی فضا ہموار ہو گئی۔ قطب خاں لودی نے ثالثی کی اور سلطان حسین کو یہ پیغام بھیجا کہ میں بی بی راجی کا پسندیدہ خادم ہوں جنھوں نے جون پور میں میری قید کے دوران میرے ساتھ بڑا رحم دلانہ برتاؤ کیا تھا اور اسی سبب سے تمھیں مشورہ دیتا ہوں کہ تم سلطان بہلول کے ساتھ امن کا معاہدہ کر کے اپنی راجدھانی واپس چلے جاؤ۔ گنگا کے مشرق کا خطہ تمہارے کنٹرول میں ہو گا اور مغرب کا سلطان بہلول کے قبضہ میں ہو گا"۔ اس پیغام کی بنا پر ایک معاہدہ ہوا اور کاروائیاں بند کر دی گئیں۔ معاہدہ پر بھروسہ کر کے سلطان حسین جون پور واپس ہو گیا اور اپنے کثیر ساز و سامان اور زخائر کو

---

(1) تفصیل شرقیوں کے سلسلہ کے باب میں ملاحظہ ہو۔

اپنے پیچھے آنے کے لیے چھوڑ دیا۔ بہلول اپنے عہد و پیمان سے پھر گیا اور جیسے ہی حسین رخصت ہوا اس نے اس کے سامان کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس نے شرقی فوج کا بھی تعاقب کیا اور متعدد اہم امراء، جن میں وزیر، قتلغ خاں (قاضی سماء الدین) اور نائب عرض، بدھو ○ شامل تھے کے ساتھ ملکہ جہاں کو بھی گرفتار کر لیا۔ شمس آباد، کمپیل، پٹیالی، کوئل، سکیت اور جلالی کو دہلی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ حسین واپس پلٹا اور راپری کے قریب ایک مقام[1] پر اس نے دہلی کی فوجوں کو للکارا لیکن شکست کھا گیا۔ ان حالات میں اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان پرگنوں پر بہلول کے اقتدار کو تسلیم کر لے جن پر اس نے معاہدے کے بعد قبضہ کیا تھا۔

ان پرگنات کے ہاتھ سے نکل جانے پر حسین اپنے آپ کو مطمئن نہ کر سکا اور وہ دوبارہ 884ھ مطابق 1479ء میں روانہ ہوا۔ سومنہار[2] کے قریب لڑی گئی جنگ میں بہلول نے اسے پھر شکست دے دی سلطان حسین راپری کی جانب پسپا ہو گیا۔ لیکن بہلول نے اسکا تعاقب کیا اور اسے دوسری شکست دی۔ جمنا پار کرنے کے دوران وہ زبردست نقصانات کا شکار ہوا۔

اس کے بعد بہلول نے اٹاوہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور وہاں سے حسین شرقی کے بھائی ابراہیم خاں کو بے دخل کر دیا۔ اس نے اٹاوہ کو مبارک خاں کے ایک لڑکے کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد لودی سلطان کالپی کی جانب روانہ ہوا۔ چونکہ دونوں فوجوں کی ایک براہ راست جنگ میں جمنا رکاوٹ بن گئی لہٰذا ایک لمبی مدت تک چھوٹی موٹی جھڑپیں جاری رہیں۔ بکسرے رائے تلوک چند[3] کی مدد نے بہلول کے کام کو آسان بنا دیا۔ اس نے ایک گھاٹ دکھایا جس سے بہلول کی فوج نے دریا پار کر لیا۔ اور فوجوں پر اچانک حملہ کر دیا۔ سلطان حسین شکست کھا گیا اور اس کی فوج منتشر ہو

○ (نوٹ تاریخ خاں جہانی و مخزن افغنی، (مولفہ) سید امام الدین، جلد 1 ص 160 میں یہ نام 'رود ہو' لکھا ہے جو زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔

(1) طبقات اکبری میں اس جگہ کا نام "ارمۃ جور" درج ہے۔

(2) ایٹہ ضلع میں ایک گاؤں ہے۔ ملاحظہ ہو ڈسٹرکٹ گزیٹیر، یوپی جلد 12 ص ص 23-222

(3) یہ دریائے گنگا کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور اٹاوہ کے جنوب۔ مشرق میں 34 میل کے فاصلہ پر ہے۔

گئی۔ بہلول نے جون پور تک اس کا پیچھا کیا جہاں سے وہ قنوج بھاگ گیا۔ بہلول کے ذریعہ تعاقب کیے جانے پر اس نے قنوج چھوڑ دیا اور دریائے رام گنگا کے کنارے پر جا پہنچا۔ یہاں بہلول نے اسے دوسری شکست دی۔

بہلول کی فتحیابیوں نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا اور اس نے جون پور کو ضم کر کے شرقی سلطنت کے خاتمہ کا فیصلہ کیا۔ حسین کو بہار میں پناہ لینی پڑی۔ بہلول نے باربک شاہ کو جون پور کا انچارج مقرر کیا اور اسے چھتر اور دورباش کے استعمال کی اجازت دے دی۔

سلطان حسین نے کسی شکست کو آخری نہ سمجھا۔ وہ جون پور کے لودی گورنر کے خلاف ایک فوج کی سرکردگی میں روانہ ہوا۔ امرا اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ تحفظاتی برتاؤ کی یقین دہانی پر باربک مجھنلی[1] کی جانب پسپا ہو گیا۔ بہلول پھر (اس کے خلاف) جون پور روانہ ہوا اور اس نے اس پر قبضہ کر لیا اور باربک کو پھر بحال کر دیا۔ باربک کی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے بہلول نے پورے طور پر محافظ دستے متعین کیے اور جون پور کی قلعہ بندی کر دی۔

اس کے بعد بہلول نے شرقیوں کے زیر اثر علاقوں پر قبضہ کرنے اور ان کی فوجی حفاظت کی طرف توجہ کی۔ اس نے کالپی پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنے پوتے اعظم ہمایوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد وہ دھول پور کی طرف روانہ ہوا۔ رائے مطیع ہو گیا اور اس نے چند من سونا تحفہ میں دیا۔ بری[2] کا گورنر اقبال خاں بھی مطیع ہو گیا۔

مالوہ پر حملہ

یہ فتوحات سلسلہ وار اتنی تیزی سے واقع ہوئیں کہ بہلول کی اپنے اقتدار کو وسیع کرنے کی خواہش اور تیز ہو گئی اور مالوہ کی طرف متوجہ ہوا۔ جہاں غیاث الدین خلجی (873-906ھ مطابق 1469ء-1501ء) عیاشی اور رنگ رلیوں میں غرق تھا۔ بہلول نے مالوہ کی مملکت میں الہن پور[3] کو برباد کر ڈالا۔ خلجی سلطان نے چندیری[4] کے

---

(1) یادگار ص 16

(2) یہ گورکھپور ضلع میں چھوٹی دریاگنڈک کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر یوپی جلد 13 ص، 299

(3) اس نام کے ضلع کا صدر مقام دھولپور سے 19 میل مغرب اور آگرہ سے 45 میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔

(4) اسی نام کے ایک پرگنہ کا صدر مقام رنتھمبور سرکار میں ہے۔ ملاحظہ ہو، آئین اکبری

گورنر کو بھلسا اور اور سرن پور کی فوجوں کے ساتھ بہلول کے خلاف نکلنے کا حکم دیا۔ بہلول نے اپنی فوج کو تعداد میں بہت کم پایا اور تیزی سے دہلی کی طرف پسپا ہو گیا۔ مالوہ کی فوج نے اس کا تعاقب کیا اور تحائف و ذخیرہ بھیج کر مصالحت کرنے پر اسے مجبور کیا۔ چندیری کے گورنر شیر خاں نے الہن پور[1] کے شہر کی از سر نو تعمیر کی۔

سلطنت کی تقسیم

1485ء میں تاتار خاں کی شکست کے کچھ دنوں بعد بہلول نے اپنی سلطنت اپنے بیٹوں اور اپنے افغانی قرابت داروں کے درمیان تقسیم کر دی۔ باربک شاہ کو جون پور ملا۔ اور کڑا اور مانک پور مبارک خاں نوحالی کے سپرد کیے گیے۔ شیخ محمد قربان فرملی (کالا پہاڑ) کو بہرائچ ملا اور لکھنؤ اور کالپی اعظم ہمایوں کے حصہ میں آئے جبکہ خان جہاں لودی کو بدایوں دیا گیا۔ نظام خاں کو پنجاب اور دوآب کے کچھ حصے ملے۔ یہ بتلانا مشکل ہے کہ آیا یہ تقسیم افغانی قبائلی روایات کے احترام کے بموجب عمل میں آئی تھی یا یہ اس کے سیاسی تجربات کا نتیجہ تھی جو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں اقتدار کے استحکام کی نشاندہی کر رہے تھے۔

کشمیر کے ساتھ کشمکش

کشمیر کے سلطان حسن 84-1472ء اور اس کے چچا بہرام خاں کے درمیان جانشینی کی کشمکش میں، غالباً بہلول نے پنجاب کے گورنر کو ہدایت دی تھی کہ وہ موخرالذکر کی مدد کرے[2]۔ لیکن بہرام کو دولی پورا میں شکست ہو گئی اور اس کے بعد جلد ہی اسے اندھا کر کے مار ڈالا گیا۔ اس کے بعد سلطان حسن نے ملک تازی بھٹ کی قیادت میں پنجاب پر حملہ کے لیے ایک فوج روانہ کی۔ پنجاب کے گورنر تاتار خاں لودی نے اسے شکست دے دی اور سیال کوٹ پر بھی دوبارہ قبضہ کر لیا۔

حسن شاہ کی موت پر اس کے بیٹے محمد شاہ کو جو نابالغ تھا، تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس

---

(1) طبقات اکبری جلد سوم ص 352۔

(2) ایضاً، جلد دوم ص 448 نیز اسی جلد میں کشمیر سے متعلق باب بھی ملاحظہ ہو (پہلی فصل، سلطان حسن شاہ کے سلسلہ کا ٹکڑا)

کی کمسنی کے دوران اس کے کچھ امرا نے اس کے قایم مقام سید حسن کو قتل کر دیا۔ سید حسن کے ایک بیٹے سید محمد نے اپنے آپ کو انتقام کے لیے تیار کیا مگر حالات نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اس نے تاتار خاں لودی سے مدد چاہی جس نے 1484ء میں سرینگر پر حملہ کرنے کے لیے ایک بڑی فوج بھیجی۔ بھمبر کے سردار رائے ہنس نے اس فوج کو شکست دی اور اسے منتشر کر دیا۔

نظام خاں کو تاتار کے خلاف بھیجا گیا

تقریباً 1485ء میں بہلول نے نظام خاں (مستقبل کا سلطان سکندر لودی) کو تاتار خاں یوسف خیلی کے خلاف بھیجا۔ وہ دہلی کے مغرب کے تمام سرکاروں۔ سرہند، حصار فیروز، سامانہ، لاہور اور دیپال پور۔ کا مقطع تھا۔ تاتار خاں کی فوجی طاقت معتد بہ تھی اس کی فوج میں پندرہ ہزار گھوڑ سوار سپاہی تھے۔ عسکری طاقت اور مالی ذرائع نے اس کے اندر باغیانہ خیالات کو جنم دیا اور اس نے نہ صرف یہ کہ سرزمین خالصہ کے کچھ پرگنوں پر قبضہ کر لیا بلکہ ان افسروں کو برطرف کر دیا جنھیں بہلول نے مقرر کیا تھا۔ لہٰذا بہلول نے نظام خاں کو عمر خاں سروانی۔ میاں سعید فرملی نصیر خاں نوحانی، دریا خاں نوحانی اور اس زمانہ کے دوسرے ممتاز امرا کے ساتھ تاتار خاں کی سرزنش کے لیے بھیجا۔ امبالہ کے قریب لڑی گئی جنگ میں تاتار کو اس کی بہادرانہ مزاحمت کے باوجود شکست ہو گئی اور وہ قتل کر دیا گیا[1]۔

بہلول کا انتقال، اس کا کردار اور کارنامے

1488ء میں بہلول حصار فیروزہ، گوالیار اور اٹاوہ کی جانب روانہ ہوا۔ گوالیار کے راجہ مان سنگھ نے اسّی لاکھ ٹنکوں کا تحفہ پیش کیا۔ بہلول نے اٹاوہ سے چوہان سردار سکت سنگھ، کو برطرف کر دیا۔ حسین شاہ شرقی سے اس کی حصولی کے زمانہ سے ہی شہر کا انچارج تھا، اور اسے رائے داؤد کے سپرد کر دیا۔ اپنی دہلی واپسی کے دوران راستہ میں سلطان بہلول لو لگ جانے کے سبب بیمار پڑ گیا۔ اور میلاؤلی میں جہاں اپنی بیماری کے دوران وہ خیمہ زن تھا، 13ر شعبان 894 مطابق 12ر جنوری 1489ء کو انتقال کر گیا۔

---

(1) واقعات مشتاق، ص ص ۹ ب۔ 110 الف (96-100)

بہلول اپنے باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا اور اس کی پرورش اس کے چچا کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ محض اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنے مستقبل کو سنوارنا اس کے مقدر میں تھا۔ اس نے سرہند کے گورنر کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور اس کا اختتام اسّی سال کی پختہ عمر میں دہلی کے سلطان کی حیثیت سے ہوا۔ جس کا اقتدار پنجاب سے بہار کی سرحدوں تک پھیلا ہوا تھا اور دہلی، بدایوں، بارن، سنبھل، راپری، کمپیل اور پٹیالی جیسے اہم شہر اس کی سرحدوں میں شامل تھے۔ راجستھان کا ایک حصہ بھی اس کے قبضہ میں تھا اور گوالیار، دھولپور اور باری کے حکمراں اسے خراج ادا کرتے تھے۔ ایک ایسے عہد میں جب مرکز گریز رجحانات ترقی پذیر ہو رہے تھے اور سیاسی اختیارات کے حصول کے لیے ایک مجنونانہ مسابقت نے ایک زبردست بےچینی اور ابتری پیدا کر دی تھی، یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔

بہلول ایک سیاسی حقیقت پسند کی بصیرت اور مقصد پر قایم ایک مستقل مزاجی کا حامل تھا جو اوّل تا آخر اس کی تمام سرگرمیوں کا محرک بنی۔ اس کے مطابق مقصد ذرائع (حصول) کا جواز فراہم کرتا لہٰذا اس نے قانونی حیلہ، غداری یا دغا کا سہارا لینے میں کبھی تامل نہ کیا اگر اس کے مقصد (کے حصول) کے لیے ان کی ضرورت پڑتی۔ حسین شرقی، مالوہ کے حکمرانوں اور حمید خاں سے نمٹنے کے سلسلہ میں اپنے مقصد کی برابری کے لیے اس نے نہایت گھناؤنے طریقے استعمال کیے۔ نریلہ کے میدان جنگ میں دریا خاں لودی کو رشوت دینے میں اس نے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ لیکن اس کا دل بہادرانہ ہمدردی سے عاری نہ تھا۔ شکست خوردہ شرقی حکمراں کی بیوی کی عزت و احترام کے ساتھ اس کے شوہر کے پاس واپس بھیج کر اس نے مثالی افغانی لوالعزمی (Afghanchivalry) کا ایک نمونہ پیش کیا۔

بہلول نے 38 سال سے بھی زیادہ حکومت کی۔ سب سے طویل مدت جس میں دہلی کا عصائے شاہی کسی سلطان کے ہاتھوں میں رہا۔ ملک کی عام سیاسی فضا کے پیشِ نظر یہ بذات خود ایک بڑا کارنامہ تھا۔ متاخرہ تغلقوں کے زمانہ سے ہی لامرکزیت کا ایک رجحان پیدا ہو چکا تھا اور صوبائی گورنروں سے لے کر مقامی زمینداروں تک ہر فرد اقتدار پر قابض ہونے کا اور مرکز کو چیلنج کرنے کا خواہش مند

تھا۔ بہلول نے صورتِ حال کا بڑی دانشمندی سے مقابلہ کیا۔ مخالفین سے نمٹنے کے لیے اس نے افغانی عسکری طاقت سے فائدہ اٹھایا لیکن ان کے حق میں اپنے شاہی اقتدار سے دستبردار نہ ہوا اگرچہ اس نے افغانی احساسات کے زبردست احترام کا مظاہرہ کیا۔

بہلول دو بڑے مسائل سے دوچار ہوا۔ جون پور کے شرقیوں کے اور دوآب کے راجپوت سرداروں کے (پیدا کردہ) اور دونوں کے ساتھ موثر طریقے پر نمٹنے میں کامیاب ہوا۔ شرقی طاقت کو اس نے بالکل پاش پاش کر ڈالا اور راجپوت سردار بھی زیر کیے گئے۔ ان راجپوت خاندانوں کا خاتمہ، جنھوں نے چودھویں صدی کے آخری چوتھائی میں دوآب کے وسطی اور زیریں علاقوں میں اپنا سر اٹھایا تھا، حقیقتاً بہلول ہی کا کام تھا، جو اس کی سپہ سالاری اور افغانوں کے ساتھ اس کی بھائی چارگی کی بدولت انجام پاسکا[1]۔

چونکہ اس کی صلاحیت و قوت عسکری معاملات میں ہی لگی رہی لہٰذا وہ سِول انتظامیہ کے میدان میں کوئی تجربہ نہ کر سکا۔ اپنے دماغ سے اس نے کوئی نئی بات اختراع نہ کی۔ اس نے دہلی سلطنت کے انتظامی اداروں کو بس ویسا ہی برقرار رکھا جیسا کہ طبقاتِ اکبری کے مصنف نے نشاندہی کی ہے اس نے بس ایک ہی کام انجام دیا۔ اس نے ان جگہوں پر خود اپنے افسروں[2] کی تقرری کی جہاں اس نے انتظام حکومت کو گزشتہ حکومتوں کے غیر پسندیدہ افسروں کے ہاتھوں میں پایا۔ بہلول کا ایک نہایت اہم اقدام، جس نے دہلی سلطنت کی سکوں کی تاریخ میں اس کے نام کو زندہ جاوید کر دیا ہے 'بہلولی' نامی سکوں کا آغاز تھا جو اکبر کے زمانے تک چیزوں کے مبادلہ کا ذریعہ بنا رہا۔

بہلول کی شخصیت بڑی متواضع تھی وہ انصاف پسند، فیاض، سادگی پسند اور منکسر المزاج تھا۔ وہ صبح سویرے بیدار ہو جاتا اور ریاست کے معاملات میں تقریباً دوپہر تک لگا رہتا۔ عبد اللہ کے مطابق وہ بذاتِ خود عوام کی درخواستیں سنتا اور اس کام

---

(1) نیردودھ بھوشن رائے، نعمت اللہ کی ہسٹری آف دی افغانس (Nimatullah's History of the Afghans) ص 56۔

(2) طبقاتِ اکبری، جلد اوّل، ص ص 12-310۔

کو اپنے امرا اور وزرا پر نہ چھوڑتا[1]۔ دوپہر سے عشاء کی نماز تک یا تو وہ علماء کی صحبت میں رہتا یا قرآن پڑھنے یا اجتماعی عبادتوں میں اپنا وقت گزارتا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر وہ اپنے حرم میں جاتا اور تھوڑی دیر وہاں رہتا۔ اس کے بعد وہ اپنے خلوت خانہ میں چلا جاتا۔ وہ اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں بڑا پابند تھا اور وہ علما اور صوفیا کی بڑی عزت کرتا لیکن وہ اس تعصب سے خاص طور پر آزاد تھا جو اس کے بیٹے سکندر لودی کی سرگرمیوں کی خصوصیت تھی۔ اسے ایک بڑی تعداد میں راجپوتوں اور دیگر ہندو زمینداروں کی ایک بڑی تعداد کا اعتماد حاصل تھا اور اس نے انھیں ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا۔ رائے کرن، رائے پرتاپ، رائے بیر سنگھ، رائے تلوک چند اور دھندھو اس کے چند معتمد سرداروں میں سے تھے۔

بہلول کی مطلق العنانی میں قبائلی مساوات کی افغانی روایات کا امتزاج تھا۔ تاریخ داؤدی کا مصنف اس کے متعلق بتاتا ہے کہ:

”وہ ایک سادگی پسند اور منکسر المزاج بادشاہ تھا۔ جب وہ کھانا کھاتا تو دروازے پر سے اپنے دربانوں کو ہٹا دیتا اور (اس وقت) جو بھی اس کے پاس آتا وہ اس کے ساتھ کھانا کھاتا۔ دربار عام میں بھی وہ تخت پر نہ بیٹھتا۔ وہ ایک چھوٹی قالین کا استعمال کرتا تھا۔ اپنے فرمانوں میں وہ امرا کو مسند عالی کے لقب سے مخاطب کرتا۔ اگر اتفاقاً کوئی امیر رنجیدہ ہو جاتا تو وہ اسے منانے کی پوری کوشش کرتا۔ وہ اس کے گھر چلا جاتا اور اپنے کمربند سے تلوار کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دیتا اور یہ کہہ کر اس سے معذرت کرتا کہ ”اگر تم مجھے بادشاہی کے لائق نہیں سمجھتے تو تم کسی اور کو اس کام کے لیے مقرر کردو اور مجھے کوئی دوسری ذمہ داری سونپ دو“[1]۔

خاص طور پر اس کے مندرجہ ذیل کاموں نے معاصرین اور اخلاف کے ذہنوں کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے:-

---

(1) تاریخ داؤدی ص10۔

(2) ایضاً، ص11۔

(1) جب اس نے دہلی کے بادشاہوں کے خزانوں پر قبضہ کیا تو اس نے مال غنیمت اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ اور خود صرف ایک متناسب حصہ لیا[1]۔ آیا تقسیم کا یہ اصول ان تمام مال غنیمت پر لاگو ہو جو اس کی طویل عسکری زندگی میں اس کے حصہ میں آئے یہ بتانا واضح نہیں ہے۔ ڈاکٹر حلیم کے اس خیال کی تصدیق ابتدائی مآخذ سے نہیں ہوتی کہ "اس نے جنگ کے مال غنیمت کو اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا اور خلفائے راشدین، کی طرح اس نے ان کا ایک مساوی حصہ لینا پسند کیا[2]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف دہلی کے خزانوں کے سلسہ میں کیے گئے اقدامات کی بنا پر یہ ایک تعمیم ہے۔ ممکن ہے کہ دہلی کے تخت پر اپنے قبضہ کے فوراً بعد فوج کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اس نے اس مساوی تقسیم کا حربہ استعمال کیا ہو۔

(2) وہ ذاتی محافظین نہیں رکھتا تھا[3]۔ ممکن ہے کہ یہ بات افغانی روایات سے مطابق کی بنا پر ہو لیکن اس سے اس کی خود اعتمادی اور اپنی ہر دلعزیزی پر یقین ظاہر ہوتا ہے[4]۔ سکندر کو رات میں اپنی حفاظت کے لیے ایک خاص محافظ کی تقرری کرنی پڑی تھی۔

(3) اس کا کھانا اس کے محل میں تیار نہ ہوتا بلکہ باری باری اس کے امرا کے یہاں سے جاتا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ "اس کا کھانا گھر پر تیار نہ ہوتا نہ ہی وہ شاہی اصطبل کے گھوڑے پر سوار ہوتا۔ ہر دن امرا میں سے ایک اس کا کھانا بھیجتا اور اسی طرح سواری

---

(1) فرشتہ ص 1179، تاریخ داؤدی کا مصنف لکھتا ہے کہ (ص 11) جو کچھ بھی اسے حاصل ہوتی ۔ دولت، جائداد یا نئے پرگنے ۔ وہ انھیں اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا اور اپنے لیے کچھ بھی نہ رکھتا تھا۔ اس نے کوئی خزانہ جمع نہ کیا۔

(2) اے، حلیم، ہسٹری آف دی لودیز ص 52۔

(3) واقعات مشتاقی۔

(4) مندرجہ ذیل واقعہ، جیساکہ مشتاقی نے قلم بند کیا ہے، صرف ایک ایسے ہی محل میں رونما ہو سکتا تھا جہاں کوئی محافظ تعینات نہ ہوں۔ "ایک ملا بہلول کے ذاتی حجرہ میں چلا آیا۔ اس وقت سلطان غسلخانہ کی طرف جا رہا تھا۔ ملا نے سلطان کا جامہ پکڑ لیا اور اس سے اپنی درخواست سننے اور اسے منظور کرنے کی درخواست کی" واقعات مشتاقی۔

کے وقت ان میں سے ایک اس کے لیے ایک گھوڑا فراہم کرتا"[1] اگر واقعی وہ اس دستور کا تابع تھا تو یقیناً اس کا مقصد افغانی امرا کو انتظامیہ میں شریک ہونے کا احساس دلانا تھا۔ عبد اللہ کہتا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا کہ "یہی کافی ہے اگر میرا نام سلطنت میں شامل ہے۔"

(4) مشتاق لکھتا ہے کہ "امرا کی موجودگی میں وہ تخت پر نہ بیٹھتا اور اس نے انہیں کھڑے ہونے سے منع کر دیا تھا۔ وہ تمام ایک ساتھ عمدہ قالینوں پر بیٹھا کرتے اور (سلطان) ہر ایک کو مسند عالی کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ روزانہ دربار منعقد کرتا اور قالین پر بیٹھتا۔ کچھ امرا کو کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ مجلس میں تمام لوگ نہیں بیٹھتے"[2]۔

بہلول کی حکومت کی انتظامیہ کی بنیاد اور اس کی کارگزاری برادری (قبیلہ) کے جذبہ پر رکھی گئی تھی۔ 1494ء میں شرقی سلطان کے ساتھ اپنی کشمکش کے موقعہ پر سکندر لودی نے اپنے امرا سے ٹھیک ہی کہا تھا کہ "تم لوگوں نے مرحوم سلطان بہلول کے دور حکومت میں "حق برادری" نبھایا تھا[3]۔

---

(1) فرشتہ ص ا۔

(2) واقعات مشتاقی ورق نمبر 9 الف۔ ب

(3) ایضاً، ورق نمبر 12 ب۔

3

سلطان سکندر لودی (1489-1517ء)

تخت نشینی

سلطان بہلول لودی کی وفات کے فوراً بعد سکتی سے پندرہ میل دور ایک گاؤں میلولی میں اس کی جانشینی کے سوال پر بحث کے لیے امرا کا اجتماع ہوا۔ ان میں تین گروہ تھے جو میدان میں اترے ہوئے تین شہزادوں۔ نظام خاں، باربک شاہ اور اعظم ہمایوں۔ کی حمایت کر رہے تھے، نظام خاں کی ماں نے جو ایک ہندو سنار کی بیٹی تھی، سرگرم طور پر اپنے بیٹے کی حمایت کی اور امرا کے ساتھ بہتر برتاؤ کا وعدہ کیا[1]۔ عیسیٰ خاں لودی نے، جو باربک شاہ کی امیدواری کا حمایت کر رہا تھا، یہ اعلان کر کے اس کی تردید کی کہ ایک سنار کے نواسے کو تخت سے کوئی سروکار نہیں، مرحوم سلطان کی ایک بیوی کی اس براہ راست بے عزتی کی بنا پر خان خاناں فرملی کو ایک بہانہ مل گیا کہ اس طرح کے تبصرات کی معقولیت کے بارے میں سوال کرے، عیسیٰ خاں نے یہ کہہ کر اسے جھڑک دیا کہ "تم ایک ملازم ہو اور شاہی رشتہ داروں کے معاملات سے تمہارا کوئی سروکار نہیں"۔ فرملی نے اپنی بے عزتی محسوس کی اور سخت برہم ہو کر نظام خاں کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کر کے مجلس سے چلا آیا۔ اس نے اپنے حمایتوں کو اکٹھا کیا۔ اور بہلول کا جنازہ دہلی لے آیا دوسرے گروہ کسی فیصلے پر پہنچے بغیر جھگڑتے رہے۔

اسی اثنا میں نظام خاں کو اس کی ماں اور وزیر عمر خاں سردانی نے (شاہی) خیمہ میں بلا لیا۔ دہلی روانہ ہونے سے پہلے نظام خاں دہلی کے ایک ممتاز سہروردی بزرگ شیخ سماء الدین کے پاس گیا، اور ایک دلچسپ انداز میں اس کی دعاؤں کا طلبگار ہوا۔ اس نے شیخ سے گزارش کہ کہ "اے شیخ! میں آپ سے علم ہجا اور علم عروض پڑھنا چاہتا

---

(1) فرشتہ، جلد اوّل ص179

ہوں، شیخ نے جواب دیا کہ "پڑھو! خدا تمہیں دونوں جہاں میں سعادت بخشے۔" نظام خاں نے شیخ سے ان الفاظ کو تین بار دہرانے کی درخواست کی۔ اور اس کے بعد اسے ایک فال نیک اور شیخ کی جانب سے ایک دعا سمجھ کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے روانہ ہو گیا[1]۔ جلدی میں اس نے سلطان بہلول کے جنازے کے جلوس میں شرکت کی اور جنازہ دہلی روانہ کر کے[2] بروز جمعہ 17/ شعبان 894 مطابق 16/ جولائی 1489ء کو تاج پہنا، رسم تاجپوشی کالی ندی کے کنارے ایک ٹیلے پر ادا کی گئی، جو کبھی فیروز شاہ تغلق کا شکاری خیمہ تھا۔ اور کوشک فیروز کے نام سے مشہور تھا[3]۔

اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد سلطان سکندر نے دہلی کی جانب پیش قدمی کی اس کے سامنے سب سے بڑا کام افغان امرا کو اپنے اقتدار کو قبول کر لینے پر راضی کرنا تھا اور اپنے رشتہ داروں کو مطیع ہو جانے پر مجبور کرنا تھا۔

عالم خاں لودی، عیسیٰ خاں لودی اور بار بک شاہ کے خلاف مہم

سکندر سب سے پہلے راپری کی طرف روانہ ہوا، جہاں اس کا بھائی عالم خاں لودی اعظم ہمایوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ اس نے راپری اور چندوار کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا۔ عالم خاں پٹیالی بھاگا اور عیسیٰ خاں لودی کی پناہ میں آ گیا۔ راپری محاصرہ کا مقابلہ نہ کر سکا اور (اس کے قلعدار نے) ہتھیار ڈال دیئے۔ اسے خان خاناں لودی کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان اٹاوہ کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں اسے قطعی طور پر علاقہ کو مطیع کرنے میں کئی ماہ لگ گئے۔ عالم خاں نے ہتھیار ڈال دیئے اور سکندر نے نہ صرف یہ کہ اسے معاف کر دیا بلکہ اٹاوہ بھی اسی کی تحویل میں دے دیا۔

دوسرا اہم امیر جس سے نمٹنا تھا وہ عیسیٰ خاں لودی تھا جو پٹیالی میں مقیم تھا، جنگ میں عیسیٰ خاں لودی کو شکست ہو گئی اس کے بعد جلد ہی ایک زخم کی وجہ سے جو اسے جنگ کے دوران لگا تھا۔ اس کا انتقال ہو گیا، سکندر نے پٹیالی کو رائے گنیش کے سپرد کر دیا، جو بار بک شاہ کا ساتھ چھوڑ کر اس سے آ ملا تھا۔

---

(1) تاریخ داؤدی ص 34، یادگار تاریخ شاہی ص 34

(2) طبقات اکبری جلد اوّل ص 314

(3) ایضاً جلد اوّل ص 314، فرشتہ جلد اوّل ص 179

اس کے بعد سکندر نے اسمٰعیل خاں نوحانی کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ اس کے بھائی باربک سے رابطہ قایم کرے اور اسے سکندر کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے اور اس کے نام پر خطبہ پڑھے جانے کو قبول کرائے۔ باربک نے انکار کر دیا اور سکندر بذات خود اس کے خلاف روانہ ہوا۔ قنوج میں دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ شیخ محمد قربان جو کالا پہاڑ سے زیادہ مشہور تھا۔ اور باربک کی فوجوں کا سپہ سالار تھا گرفتار کر لیا گیا لیکن اس وقت سکندر سخت گیر رویہ اختیار کرنے کے لیے مائل نہ ہوا تھا۔ اس نے کالا پہاڑ کو معاف کر دیا اور اس کے ساتھ عزت اور رحمدلی سے پیش آیا۔ لٰہذا کالا پہاڑ نے اپنے طاقت و قوت سکندر کی حمایت میں لگا دی اور باربک سے لڑ کر اسے شکست دے دی۔ باربک بدایوں کی طرف بھاگا۔ لیکن اس کا تعاقب کیا گیا اور بالآخر اسے ہتھیار ڈال دینا پڑا، سکندر نے جو اپنے حریفوں اور دشمنوں کو کچل دینے سے زیادہ ان کے دل جیتنے کا خواہشمند تھا۔ باربک کے ساتھ بھی ویسا ہی فیاضانہ سلوک کیا اور اسے دوبارہ جون پور کے تخت پر بٹھا دیا۔ یہ ایک دانشمندانہ اور موقع شناسانہ اقدام تھا۔ جس نے اس کے حریف بھائی کی خواہش پوری کر دی اور ساتھ ہی ایسی صورت حال پیدا کر دی۔ جس میں حسین شرقی کی اقتدار پر واپسی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گئی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے باربک دہلی کا قلادہ نہ اتار پھینکے، سکندر نے جون پور میں اپنی پوزیشن کے استحکام کے لیے اقدامات کیے۔ اس نے وہاں کے متعدد پرگنوں کو اپنے معتمد امرا[1] کے سپرد کر دیا تاکہ اس طرح باربک کے حوصلوں میں رکاوٹ پیدا ہو جائے۔

اب شاہی خاندان کا صرف ایک اہم فرد اعظم ہمایوں لودی تھا جو اس کے اقتدار کا مخالف تھا سکندر کے خلاف روانہ ہوا اور اسے شکست دے کر اور بے دخل کر کے کالپ کو محمود خاں لودی کے سپرد کر دیا۔ غالباً یہ پہلا موقعہ تھا جہاں سکندر نے ایک باغی کی اس کے صوبے میں توثیق نہ کی۔ شاید اس نے اعظم ہمایوں کو کالپی پر، جو ایک زود اثر (Sensitive) علاقہ تھا، قبضہ قایم رکھنے کے قابل نہ سمجھا۔

---

(1) ایضاً، جلد اوّل ص 316

تاتار خاں لودی اور سلطان اشرف کے خلاف مہمات

کالپی میں اپنی پوزیشن کے استحکام کے بعد سکندر جیتھرا[1] کے گورنر تاتار خاں لودی کے خلاف روانہ ہوا۔ گورنر نے اطاعت قبول کر لی اور سلطان نے اس کی اس کے علاقہ میں توثیق کر دی۔

اس کے بعد سلطان نے اپنی توجہ بیانہ کی طرف مبذول کی۔ اس کا سردار سلطان اشرف اپنے علاقہ میں خود مختار طور پر عمل گزار تھا۔ اس کا باپ سلطان احمد جلوانی جون پور کے سلطان حسین کا وفادار تھا، لیکن جب جونپور کی سلطنت بحرانی دور سے گزر رہی تھی، اور سلطان حسین بہلول کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے شکست کھا رہا تھا تو سلطان احمد جلوانی عملاً آزاد ہو گیا۔ سکندر نے شرقی سلطنت کو دہلی کی مملکت کے ساتھ متحد کر دینے کی اپنی اسکیم کا ایک لازمی جز تصور کیا اس طرح کے تمام سابقہ شرقی ماتحت عہداروں کا خاتمہ کر دے۔ اس نے احمد جلوانی کو ایک تجویز پیش کی کہ اگر وہ بیانہ سے دست بردار ہو جائے تو وہ جالیز، چندوارہ، مارہرہ کو اور سکتی اس کے حوالہ کر دے گا، پہلے تو جلوانی نے اس تجویز کو قبول کر لیا اور قلعہ کی کنجیاں عمر خاں سردارنی کے سپرد کر دینے پر رضامندی ظاہر کر دی لیکن مزید غور و فکر کے بعد اس نے مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ سکندر نے آگرہ کے محاصرہ کا حکم دیا جو ہیبت خاں جلوانی کے قبضہ میں تھا جو سلطان اشرف کا تابعدار تھا، اور اس کے بعد اس نے بیانہ کی طرف پیش قدمی کی سلطان اشرف کو مطیع ہو جانے پر مجبور کر دیا گیا، اور 897ھ مطابق 1491ء میں بیانہ دہلی کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا، سکندر نے بیانہ خان خاناں فرملی کے سپرد کیا اور دہلی لوٹ گیا۔

جون پور پر بچگوٹی راجپوتوں کا حملہ

اپنی دہلی واپسی کے دو دنوں بعد جب سکندر "چوگان" کھیلنے کے لیے باہر نکل رہا

---

(1) ایٹہ کے علی گڑھ تحصیل میں جیتھرا ایک گاؤں ہے جو ایٹہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے یوپی ڈسٹرکٹ گزیٹیر، جلد 12، ص 174۔

تھا تو اسے جوگا کی قیادت میں جون پور پر بچگوٹی[1] راجپوتوں کے حملہ کی خبر ملی۔ پاپیادہ اور گھوڑ سوار دونوں ہی طرح کے ایک لاکھ سپاہیوں کی ایک بڑی فوج جون پور کے خلاف روانہ ہوئی تھی، حملہ آوروں نے مبارک خاں نوحانی کو گرفتار کر لیا بلکہ دریائے گنگا پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے بھٹہ (ریوا) کے رائے بھڈ کی حراست میں رکھا گیا، شیر خاں جو مبارک خاں (نوحانی) کا بھائی تھا، جنگ میں مارا گیا۔ صورت حال کو بس سے باہر پا کر باربک شاہ دریا آباد بھاگ گیا اور کالا پہاڑ سے جاملا۔

اس اطلاع کے پاتے ہی سکندر نے فوج کے اکٹھا ہونے کا حکم نافذ کیا۔ وہ اپنے محل میں نہ آیا بلکہ خیمہ میں اپنا کھانا کھاتا اور تمام وقت فوجی تیاریوں میں صرف کرتا۔ 897ھ مطابق 1491ء میں وہ جون پور کی طرف روانہ ہوا، دال مئو[3] میں باربک شاہ اس سے آملا۔ رائے بھڈ سلطان کی آمد پر خوف زدہ ہو گیا اور اس نے مبارک خاں نوحانی کو آزاد کر دیا۔ سلطان آگے بڑھا اور کاٹھ گڑھ میں وہ جوگا کی فوج پر جھپٹ پڑا۔ عبداللہ اور احمد یادگار کے مطابق سلطان کی اصلی فوج اس کے پیچھے آرہی تھی اور اس کے ساتھ صرف پانچ سو گھوڑ سوار سپاہی تھے، جوگا کی فوج پندرہ ہزار سواروں اور دو لاکھ پاپیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھی، مقابلہ کا خطرہ مول لیے بغیر جوگا میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔ سکندر نے جوگا کی فوج پر تلوار اور آگ برسائی جس کے نتیجہ میں زبردست جانی و مالی نقصان ہوا، جوگا پہلے تو جوند کے قلعہ میں گیا پھر سلطان حسین شرقی سے پناہ مانگی، سکندر نے شائستہ اور مصالحتی انداز میں سلطان حسین کے پاس ایک خط لکھا اور اس سے جوگا کو حوالہ کر دینے کی درخواست کی اس کا جواب شرقی حکمراں نے نہایت تحقیر آمیز اور سخت انداز میں دیا۔ لہٰذا اسکندر کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ حملہ کر دے، حسین قلعہ سے باہر نکلا اور اس نے خود ہی پیش قدمی کی سکندر نے بذات خود فوج کی قیادت اور حسین کو

---

(1) بچگوٹی اصلاً مین پوری چوہانوں کا ایک قبیلہ تھا جو جون پور اور گورکھپور کی سرحدوں پر رہتا تھا، اور سرکشی اور شورش پسندی میں مشہور تھا، ملاحظہ ہو ایلیٹ کی۔ (Memoirs of the North West Provinces) جلد اوّل ص47۔

(2) یہ رائے بریلی ضلع میں گنگا کے کنارے پر ایک شہر ہے۔

(3) دال مئو پرگنہ میں ایک چھوٹا گاؤں ہے (یوپی ڈسٹرکٹ گزیٹیر جلد 39) ص137

(4) یہ مرزاپور ضلع یوپی میں گنگا کے داہنے کنارے پر ہے۔

شکست دے دی جو بہار بھاگ گیا۔ اس کے بعد سکندر نے جون پور کی طرف پیش قدمی کی اور جون پور کے تخت پر دوبارہ باربک شاہ کو متمکن کیا، لیکن اس کے بعد جلد ہی اسے اس علاقہ کے زمینداروں کے ذریعہ باربک کی بے دخلی کی اطلاع ملی، چونکہ بارک شاہ حالات سے نمٹنے میں بالکل نااہل ثابت ہوا تھا لہٰذا سکندر نے اسے پکڑنے کے لیے کالا پہاڑ اور اعظم ہمایوں سروانی کو بھیجا، خود سکندر نے چنار[1] پر حملہ کر دیا۔ حسین شرقی کے امراء نے اپنے آپ کو قلعہ میں بند کر لیا۔ سکندر نے محاصرہ پر زور نہ دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قلعہ تقریباً ناقابل تسخیر تھا۔

چنار سے سکندر نے کنتت[2] کی طرف پیش قدمی کی جو ریوا (بھٹہ) کی جاگیر میں شامل تھا، رائے بھڈ نے فوراً ہتھیار ڈال دیا اور اطاعت قبول کر لی، اس کے بعد سکندر اریل[3] کی طرف اور پھر وہاں سے دال مئو روانہ ہو گیا۔ دال مئو میں اس نے شیر خاں نوحانی جو بچگوٹی بغاوت میں مار ڈالا گیا تھا کی بیوہ سے شادی کی وہ نہایت حسین و جمیل اور شائستہ خاتون تھی۔

رائے بھڈ کے خلاف مہم

اگرچہ رائے بھڈ نے سکندر کی طاقت قبول کر لی تھی لیکن پھر بھی وہ اتنا ہراساں تھا کہ وہ کنتت میں اپنی تمام قیمتی اشیاء چھوڑ کر ریوا بھاگ گیا سکندر نے ان تمام جائداد کو اس کے پاس بھیج دیا، لیکن بعد میں جب اسے یقین ہو گیا کہ رائے کا رجحان شرقی سلطان کی حمایت کی طرف ہے تو وہ 900ھ مطابق 1494ء میں اس کے خلاف روانہ ہوا رائے کے بیٹے بیر سنگھ کو جنگ میں شکست ہو گئی اور خود رائے سرکچھ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا سلطان نے اس کا تعاقب کیا، لیکن راستہ ہی میں رائے کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد سکندر نے پھپوند کی طرف پیش قدمی کی لیکن قحط اور سیلاب نے

---

(1) یہ اجلا اور گنگا ندی کے سنگم پر مرزاپور کے شہری حدود میں واقع ہے۔ ملاحظہ ہو NWP جلد 14، ڈسٹرکٹ گزیٹیر 1884-ص 195

(2) الہ آباد قلعہ کے سامنے جمنا کے دائیں کنارے گنگا کے ساتھ اس کے سنگم پر ہے امپیریل گزیٹیر جلد 10 ص ص 333-332

(3) نعمت اللہ جلد اول ص 180

اس کی معتد بہ فوج[1] کو برباد کر دیا اور اس نے اپنے آپ کو سخت مصیبت میں پایا۔ وہ جون پور رواپس آگیا تاکہ فوجوں کی دوبارہ بھرتی اور از سر نو تنظیم کر سکے۔

حسین شرقی کا حملہ

حسین شرقی کے لیے یہ ایک بہترین موقع تھا کہ وہ لودی سلطان پر حملہ کر دے، مقامی ہندو زمینداروں نے جو جون پور کے برطرف حکمراں سے اب بھی ہمدردی رکھتے تھے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ بہار میں اپنی جائے پناہ سے باہر آئے، حسین نے ایک فوج اکٹھا کی اور سکندر پر حملہ کے لیے آگے بڑھا۔ سکندر نے اس کے مقابلہ کے لیے فوراً گنگا کے کنتت گھاٹ کو عبور کیا اور بنارس پہنچا دونوں فوجوں میں بنارس سے تقریباً 36 میل کے فاصلہ پر ایک مقام میں تصادم ہوا۔ حسین شرقی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوا اور فوراً بہار بھاگا۔

سکندر نے اپنے شکست خوردہ مخالف کا تعاقب کیا جو پناہ کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ رہا تھا۔ ملک کندو کو بہار میں چھوڑ کر وہ بہار کے ضلع بھاگلپور میں (واقع) کہلگاؤں گیا، جو اس وقت بنگال کے حکمراں کے قبضہ میں تھا۔

سکندر نے مہابت خاں کو بہار میں چھوڑ کر درویش پور[2] کی جانب پیش قدمی کی، تربب کے راجہ نے بھی اطاعت قبول کر لی، اور سلطان نے راجہ سے خراج کی وصولی مبارک کے سپرد کی، درویش پور میں اپنے قیام کے دوران سلطان نے شیخ شرف الدین یحییٰ میزی کے مزار پر حاضری دی۔ اس کے بعد وہ بنگال کے سلطان علاؤالدین کے خلاف روانہ ہوا کیونکہ اس نے حسین شرقی کو پناہ دے رکھی تھی، مزید یہ کہ بنگال کے حکمراں نے اپنے بیٹے دانیال کی قیادت میں ایک قراول دستہ بھیجا تاکہ وہ سکندر کی سرگرمیوں پر نظر رکھے جو بہار میں اپنے آپ کو مستحکم کر لینے کے بعد اپنی کمندیں بنگال پر پھینک رہا تھا۔

بہار کے ضلع پٹنہ کے ایک شہر باڑھ میں دانیال کی قیادت میں بنگال کے سلطان علاؤالدین کی فوجوں کی محمود خاں لودی اور مبارک خاں نوحانی کی قیادت میں سکندر

---

(1) خیر الدین، جون پور نامہ

(2) یہ ضلع پٹنہ کے شہر پور تحصیل میں ہے۔

لودی کو فوجوں سے مڈ بھیڑ ہوئی بالآخر دونوں کے بیچ امن کی شرائط پر گفت و شنید ہوئی اور یہ معاہدہ ہوا کہ -(الف) سلطان علاؤالدین سکندر لودی کے دشمنوں کو پناہ نہ دے گا۔ (ب) کوئی بھی حکمران دوسرے کے حدود مملکت پر دست درازی نہ کرے گا اور (ج) سلطان علاؤالدین بہار، ترہب، سارن، سرکار اور اس کی دوسری مفتوحہ سرزمینوں پر سلطان سکندر کے اقتدار کو تسلیم کرے گا۔

بنگال مہم سے اپنی واپسی کے بعد سکندر نے سارن (کا علاقہ) اپنے سپاہیوں میں بطور جاگیر تقسیم کر دیا اور جون پور چلا آیا۔ جون پور میں اپنے چھ ماہ قیام کے دوران سکندر نے اپنی توجہ تمام شرقی یادگاروں، محلوں، باغوں وغیر وغیرہ کو برباد کرنے میں لگائی۔ وہ ہنوز شرقی حکمرانوں کے ذریعہ تعمیر شدہ مسجدوں کو منہدم کر دیتا مگر علماء نے اسے غارتگری سے محفوظ رکھا[1]۔

ریوا پر حملہ اور جون پور میں انتظامی امور کے متعلق کاروائیاں

904ھ مطابق 1498ء میں سکندر لودی نے ریوا (بھٹہ) پر دوبارہ حملہ کیا۔ وہ ریوا کے حکمراں کی اس دعوت پر سخت برہم تھا جو اس نے لودی سرزمین پر حملہ کرنے کے لیے سلطان حسین شرقی کو دی تھی، سکندر بندھوگڑھ[2] کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن وہ اس پر قبضہ نہ کر سکا۔ اپنی ناکامی پر جھلا کر اس نے اس خطہ کو برباد کر دیا جہاں سے وہ گزرا۔

بندھوگڑھ سے سکندر جون پور کی طرف روانہ ہوا اور اس کے انتظام و انصرام کی خاص طور پر اس کے مالی معاملات کی اس نے دیکھ بھال کی۔ جون پور کے گورنر مبارک خاں لودی موچی خیل سے رقموں کی غبن اور بدانتظامی کے متعلق جواب طلب کیا گیا۔ سلطان نے اس کے ساتھ اتنا سخت برتاؤ کیا کہ کچھ امرا نے اسے پسند نہ کیا۔

سلطان کے خلاف سازش

جون پور کے معاملات کو درست کر کے سکندر سنبھل کی طرف بڑھا اور وہاں

---

(1) جون پور میں سلطان کی یادگاروں کو مٹا دینے کی داستان روایت پر مبنی ہے جو وقت کے دھارے کے ساتھ بہتے بہتے مولفین (ڈسٹرکٹ گزیٹیر) تک پہنچی (تھیں)

(2) یہ ریوا شہر سے 60 میل جنوب میں ایک پرانا قلعہ ہے، امپیریل گزیٹیر جلد ششم۔ ص 359

چار سالوں تک قیام کیا (909-905ھ مطابق 1503-1499ء) اس مدت کے دوران کچھ غیر مطمئن عناصر ایک سازش کی تیاری کے لیے متحد ہو گئے۔ 22/امرا نے جو مملکت کے مختلف حصوں میں کام کر رہے تھے اسے معزول کر کے فتح خاں کو تخت نشین کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن شہزادہ نے اپنی ماں اور اپنے روحانی آقا، شیخ طاہر کو یہ راز فاش کر دیا جنھوں نے یہ بات سلطان کے علم میں لانے پر اصرار کیا۔ دہلی کے گورنر اصغر خاں، سعید خاں سروانی، تاتار خاں، محمود شاہ اور دیگر لوگوں کی سازش میں ملوث ہونے کی بنا پر یا تو پھانسی دے دی گئی یا جلا وطن کر دیا گیا۔ کچھ غیر مطمئن امرا گوالیار چلے گئے اور وہاں سے گجرات کی راہ اختیار کر لی۔

گوالیار، دھولپور اور مندریل کے خلاف مہمات

907ھ مطابق 1501ء میں گوالیار کے راجہ مان سنگھ نے اظہار دوستی کے طور پر ایک خواجہ سرا نہال کو دیگر تحائف کے ساتھ سلطان سکندر کے پاس بھیجا۔ خواجہ سرا اپنے مشن میں ناکام ہو گیا، اور دہلی اور گوالیار کے درمیان تعلقات میں تناؤ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔

دھولپور کے رائے پر ان باغیوں کو برانگیختہ کرنے کا شبہ تھا جنھوں نے بیانہ کے گورنر عماد الملک کو بے دخل کر دیا تھا سکندر نے بیانہ کو خواجہ خاں کے سپرد کر دیا اور میوات کے گورنر عالم خاں اور راپری کے گورنر خان خاناں لوہاری کو حکم دیا کہ وہ دھول پور کے خلاف خواجہ خاں کی کاروائیوں کا ساتھ دیں، رائے مانک دیو نے نہایت زبردست مقابلہ کیا، اور تجربہ کار سپاہی خواجہ بیّن[1] کو مار ڈالا۔ چنانچہ خود سکندر مانک دیو کے خلاف روانہ ہوا وہ 6/رمضان 906ھ مطابق 25/مارچ 1501ء میں دھولپور پہنچا۔ رائے خوف زدہ ہو کر گوالیار بھاگ گیا، دھولپور پر قبضہ کر لیا گیا، اور لودی فوج نے نہ صرف یہ کہ اسے لوٹا کھسوٹا بلکہ باغیوں تک کو اکھاڑ پھینکا۔ آدم خاں کو دھولپور کے قلعہ کی ذمہ داری سونپی گئی۔

اس کے بعد سکندر گوالیار کے خلاف روانہ ہوا۔ نہال کے مشن کی ناکامی کے علاوہ وہ بعض باغیوں تیز رائے مانک دیو کو گوالیار کے رائے کے ذریعہ پناہ دیئے جانے کے باعث سلطان سخت برہم تھا۔ دوماہ تک وہ گوالیار کے قریب ایک جھیل

---

(1) طبقات اکبری، جلد اول ص 324

آسی (آسن) کے کنارے خیمہ زن رہا۔ بالآخر رائے نے امن کی درخواست کی (909ھ مطابق 1503) اس نے سعید خاں اور رائے گنیش (پٹیالی کا چوہان سردار) کو نکال باہر کیا اور اپنے بیٹے بکرماجیت کو یرغمال کے طور پر بھیجا۔ سلطان نے شہزادے کی عزت افزائی کی اور بعد میں اس نے دھولپور کو بھی مانک دیو کو واپس دے دیا۔

910ھ مطابق 1504ء میں سکندر مندریل[1] کے خلاف روانہ ہوا اور اس کا محاصرہ کر لیا لیکن حفاظتی فوج قلعہ سے دست بردار ہو گئی۔ سکندر نے مندریل کے مندروں کو مسمار کیا اور ان کی جگہوں پر مسجدوں کی تعمیر کی اور اس علاقہ کو تاراج کیا۔ قلعہ میاں مکن اور مجاہد خاں کے سپرد کر دیا گیا۔

شہر آگرہ کی بنیاد

911ھ مطابق 1506ء میں سکندر لودی نے شہر آگرہ کی بنیاد ڈالی۔ نئے شہر کے لیے جگہ کا انتخاب بہت زیادہ تلاش و تحقیق کے بعد کیا گیا۔ چند دانشور اور تجربہ کار لوگوں کا ایک کمیشن دہلی سے کشتیوں پر آیا اور اس نے دریائے جمنا کے دونوں کناروں کا معائنہ کیا اور اس کے بعد سلطان خود ایک کشتی پر اس مقام کے معائنہ کے لیے آیا۔ نعمت اللہ لکھتا ہے کہ "وہ ایک کشتی پر سوار ہوا اور سفر سے پوری طرح محفوظ ہوتے ہوئے اور راستہ میں شکار کھیلتے ہوئے وہ چلا یہاں تک کہ (کمیشن کے ذریعہ منتخب شدہ) مقام پر پہنچ گیا اور بود و باش کے اعتبار سے اس علاقہ کی بلندی کو اس نے پسند کیا۔ اس نے ملاحوں کے کپتان نایک سے جو اس کی کشتی کھینے کا فرض انجام دے رہا تھا، سوال کیا کہ "(ہمارے مقاصد کے لیے) ان دونوں بلندیوں میں سے کون زیادہ بہتر اور مناسب ہے؟" نایک نے جواب دیا کہ (آگے راہ) وہ جو سامنے ہے زیادہ بہتر ہے۔" سلطان مسکرادیا اور بولا کہ "اس شہر کا نام بھی آگرہ ہی ہوگا"[2]

سلطان نے جس مقام کا انتخاب کیا تھا وہ دیولی کے پرگنہ میں بسہی اور پوییہ کے مواضع میں واقع تھا اور بیا سرکار کے کل 52 پرگنات میں سے 9/ پرگنات اس میں

---

(1) دریائے پربتی کے داہنے کنارے پر گوالیار سے 62 میل کے فاصلے پر ایک تحصیل شہر ہے

(2) نعمت اللہ جلد اوّل ص 195

(3) ایضاً جلد اوّل ص ص 96-195

شامل کر دیئے گئے۔

گوالیار کی مہم

911ھ مطابق 1506ء میں سکندر لودی دوبارہ گوالیار کی طرف روانہ ہوا۔ محکمہ رسد کے انتظامات کے گڑبڑ ہو جانے کے باعث دہلی کی فوجوں کے مقدمۃ الجیش پر چناور[1] میں حملہ ہو گیا۔ اودھ خاں اور احمد خاں کی بہادری نے صورتِ حال پر قابو پا لیا مگر سکندر نے مزید آگے بڑھنے کا خیال ترک کر دیا اور آگرہ واپس لوٹ آیا۔ اگلے سال (912ھ مطابق 1506ء میں) عماد خاں فرملی اور مجاہد خاں کو اونت گڑھ[2] کے قلعہ کو فتح کرنے کی غرض سے روانہ کیا گیا، جسے گوالیار کی کنجی کی حیثیت دی جاتی ہے بعد میں سلطان خود مقدم دستہ میں شامل ہو گیا اور چاروں طرف سے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ قلعہ کی محافظ فوج نے بڑی مدافعت کی۔ جب قلعہ کی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹ گئی تو انھوں نے بڑی سختی سے دست بدست مقابلہ کیا اور قلعہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد بھی ان کی مزاحمت جاری رہی، مجاہد کو قلعہ کا ذمہ دار مقرر کیا گیا لیکن جب سکندر کو اس بات کا علم ہوا کہ اس نے قلعہ سے مسلمانوں کو ہٹانے کی خاطر اونت گڑھ کے رائے سے رشوت لی ہے تو اس کے بعد اسے فوراً ہی برطرف کر دیا گیا۔ سلطان 27/ محرم 913ھ مطابق 8/ جون 1507ء میں آگرہ واپس لوٹا۔ پانی کی کمی کی بنا پر فوج کی اونت گڑھ سے آگرہ واپسی میں سخت دقتیں پیش آئیں اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد پیاس سے مر گئی۔

10/ محرم 915ھ مطابق 30/ اپریل 1509ء کو سلطان بھدوریا راجپوتوں کے ایک قلعہ ہت کانت میں پہنچا۔ عسکری اہمیت کے حامل مقاموں پر تھانے قایم کیے گئے تاکہ اس علاقہ کے باشندوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھی جا سکے۔

916ھ مطابق 1510ء میں شہزادہ شہاب الدین نے اپنے باپ مالوہ کے سلطان ناصر الدین کے خلاف بغاوت کی اور سیری[3] بھاگ گیا۔ ناصر الدین نے اپنے

---

[1] ابوالفضل اس کا ذکر گوالیار سرکار میں ایک شہر کی حیثیت سے کرتا ہے۔

[2] اونت گڑھ یا اوتگیر کرلونی میں ایک تحصیل ہے۔

[3] چندیری میں ہے۔

خطاکار بیٹے کو اس کی جانشینی کے حق سے محروم کر دیا اور اپنے تیسرے بیٹے اعظم ہمایوں کو اپنا ولیعہد نامزد کر دیا۔ شہاب الدین سکندر کے پاس پناہ اور مدد کے لیے پہنچا لودی حکمراں نے اس شرط پر کہ وہ چندیری سکندر کے حوالہ کر دے اس کی مدد کی حامی بھر دی۔ ذی الحجہ 916ھ مطابق مارچ 1511ء میں سکندر لودی نے گجرات کے سلطان محمود کے پاس تحائف کے ساتھ اپنے سفرا بھیجے تاکہ اسے خوش کر سکے۔ اور مالوہ کے ساتھ کشمکش کے سلسلہ میں اسے غیر جانبدار بنا سکے۔ یہ بات دہلی کے سلطان کے ذریعہ گجرات کی آزاد حیثیت کا اعتراف بھی تھی۔ ایک ایسی بات جس سے لودی سلطان اتنے دنوں تک رکا رہا تھا۔

لیکن اس سے قبل کہ سکندر اور شہاب الدین کسی مستحکم اقدام کا منصوبہ بنا سکیں مالوہ کے سلطان ناصر الدین کا انتقال ہو گیا۔ باغی شہزادے نے فوراً اپنے اقدام کے منصوبے کو بدل دیا اور دہلی جانے کا خیال ترک کر کے سیدھے مانڈو کے لیے روانہ ہو گیا لیکن اپنے بھائی کے ساتھ کشمکش میں اس کو شکست ہوئی۔

اعظم ہمایوں جو سلطان محمود دوم کی حیثیت سے مالوہ کے تخت پر بیٹھا تھا، کے مقدر میں نہ تھا کہ وہ چین سے حکومت کر سکے۔ 917ھ مطابق 1510ء○ میں اس کے بھائی صاحب خاں نے ایک سازش بروے کار لائی اور سلطان محمد کی حیثیت سے تخت نشین ہو گیا۔ سلطان محمود دوم چندیری پہنچا اور اس کے گورنر بہجت خاں سے پناہ طلب کی لیکن بہجت نے سختی سے جواب دیا کہ اس کی وفاداری اس شخص کے ساتھ ہے، جس کے قبضہ میں مانڈو ہے، تب محمود دوم مدد کے لیے سکندر کی طرف مڑا۔ موخر الذکر نے اپنی مدد کے بدلہ میں چندیری کا مطالبہ کیا۔ اس سیاسی سودے بازی کی تکمیل کا انتظار کیے بغیر محمود دوم نے میدانی رائے اور اس کے طاقت ور راجپوت دستے کی مدد حاصل کر لی اور 16/ شوال 917ھ مطابق 16/ جنوری 1512ء میں اس نے مانڈو پر قبضہ کر لیا۔

مالوہ میں میدانی رائے کے بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے 918ھ مطابق 1512ء میں چندیری کے گورنر بہجات خاں، سیواس اور ہندیا کے گورنر سکندر خاں اور منصور

○ (نوٹ:-12-1511ء ہونا چاہیے۔ مترجم)

خاں نے بغاوت کی۔ میدانی رائے نے سکندر خاں کو شکست دے دی لیکن بہجات خاں نے آگرہ سے مدد کی اپیل کی اس نے کہا کہ "صاحب خاں کو تخت پر بٹھانے کے لیے اگر آپ مجھے ایک فوج بھیج دیں تو میں آپ ہی کے نام پر خطبہ پڑھواؤں گا اور سکّوں کا اجرا کرواؤں گا" سکندر نے فوراً اس کا جواب دیا اور صاحب خاں کو تخت پر بٹھا دیا گیا، لیکن بہجات اپنے وعدے سے پھر گیا اور سلطان سکندر لودی کے نام پر خطبہ پڑھوانے یا سکّوں کا اجرا کرانے سے انکار کر دیا۔ سکندر نے جنگ سے گریز کیا اور 919ھ مطابق 1513ء میں اس کی فوج دہلی واپس چلی گئی۔ لیکن مانڈو میں نامساعد حالات صاحب خاں کو سکندر لودی کے پاس لے آئے۔ میدنی رائے کے خود پسندانہ حوصلہ سے متنفر ہو کر محمود خلجی نے پہلے تو اس کے قتل کا منصوبہ بنایا لیکن جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو گیا تب 920ھ مطابق 1511ء میں وہ گجرات کے مظفر شاہ کے پاس بھاگ آیا۔ سکندر لودی نے اقدام کا فیصلہ کیا اور چندیری کو فتح کرنے کے لیے ایک فوج بھیجی، اس پر قبضہ کر لیا گیا، اور وہاں صاحب خاں کو مسند نشین کر دیا گیا۔ لیکن سکندر لودی نے چندیری کے انتظام حکومت کو چلانے کے لیے خود اپنے افسروں کی تقرری کی۔

مالوہ میں جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی، اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر سکندر نے اس علاقہ میں اپنے اقتدار کی توسیع کرنی چاہی۔ اس نے سوئی سوپر[1] پر قبضہ کر لیا اور اسے ابو بکر خاں کے سپرد کر دیا جو برطرف شدہ گورنر علی خاں کا بھائی تھا۔ 923ھ مطابق 1517ء میں وہ رنتھمبور کی طرف روانہ ہوا لیکن قلعہ کو فتح نہ کر سکا۔ رنتھمبور کے گورنر نے اس کی فرمانروائی تسلیم کر لی۔

موت اور (کارروائیوں کا ایک) جائزہ

7/ذی القعدہ 923ھ مطابق 21/نومبر 1517ء میں ڈیفتھیریا گلے کے کینسر سے سکندر لودی کا انتقال ہو گیا۔

لطیف جسمانی دلکشی اور تقریری صلاحیتوں سے مزین، شاعری، موسیقی اور طرب و نشاط کا دلدادہ سکندر لودی کی شخصیت چند لحاظ سے عہد وسطیٰ کے

---

(1) ابوالفضل سوئی سوپر کو رنتھمبور کے سرکار میں بتاتا ہے۔

ہندستان کی ایک نہایت ممتاز شخصیت تھی، اس نے ہندستان میں افغانی حکومت کو ایک نیا رخ دیا اور سلطان کے عہد کی عظمت اور وقار کو کافی بلند کر دیا۔ افغانی امرا سے ان کے افغانی جمہوری روایات سے جڑے رہنے کے باوجود بادشاہ کے اعلیٰ رتبہ کو تسلیم کرا لیا گیا۔ اس کے بادشاہ کے اقتدار اس کی عظمت پر زور دینے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔

(1) جبکہ بہلول ایک قالین پر بیٹھا کرتا تھا سکندر نے تخت پر بیٹھنے کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ کسی امیر یا ملک کے بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

(2) امرا اور عوام کے دماغ میں سلطان کے اعلیٰ رتبے کو ذہن نشین کرا دینے کے لیے اس نے مملکت کے بعید تر حصوں میں شاہی فرمانوں کے استقبال کے لیے نہایت مفصل قوانین وضع کیے تھے، گورنروں کو اس بات کی تاکید تھی کہ وہ دربار سے آنے والے ہرکاروں سے اپنے صدر مقام سے چھ میل کے فاصلہ پر آکر ملیں۔ شاہی پیغامبر ایک خاص طریقے کے بنے بنگلہ میں بیٹھتا اور فرمان گورنر کے سپرد کرتا اور اسے بڑی عزت سے اپنے سر پر رکھتا اور اسے منبر پر سے پڑھکر سنانے کے لیے مسجد میں لے جاتا[3]۔

(3) امرا کو اچھی طرح اس بات کا احساس دلایا گیا کہ وہ سلطان کے ملازم ہیں اور ان کی حیثیت اور طاقت محض اس کی مرضی اور خوشی پر منحصر ہے۔ ان لوگوں کو جو جاگیروں کے مالک تھے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ دیوان وزارت کو پابندی سے حساب کتاب دیں، خیانت بد نظمی، غلط کاری یا رشوت کے تمام معاملات کے سلسلہ میں

---

(1) راپری کا ایک سنکی صوفی شیخ حسن مجذوب (اس کے بارے میں ملاحظہ ہو، عبدالحق محدث کی اخبار الاخیار ص 281) اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ملاحظہ ہو واقعات مشتاقی ورق نمبر 23 ب 124 الف۔

(2) تاریخ شاہی ص 49 تاریخ داؤدی ص ص 39-36، مشتاقی کہتا ہے کہ وہ خفیہ طور پر شراب بھی پیتا تھا۔ واقعات ورق نمبر 36 الف۔

(3) واقعات مشتاقی ورق نمبر 19 الف۔ طبقات اکبر جلد اول ص 338۔

بڑی سختی برتی جاتی۔

(4)ایک نہایت اعلیٰ کارگزار جاسوسی کا نظام سلطان کو سلطنت کے تمام معاملات سے اور خاص طور پر امرا کی سرگرمیوں سے باخبر[2] رکھتا۔ مملکت کے معاملات کی براہ راست اور گہری جان کاری کے لیے سلطان خود بھیس بدل کر نکلتا۔ لوگوں کی خفیہ سرگرمیوں کے متعلق بھی اس کی واقفیت سے حیرت زدہ ہو کر عوام اپنی خوش اعتقادی میں یہ سمجھتے کہ کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے جو اسے اس کی سرزمین میں ہونے والے تمام واقعات سے باخبر رکھتی ہے۔

سکندر ایک باصلاحیت منتظم کار، حالات کے تجزیے کے سلسلہ میں واضح ذہنیت کا حامل اور اپنے احکامات کے نافذ کرنے کے سلسلہ میں نہایت چاق و چوبند تھا، اپنے شاہی عہدہ کی ذمہ داریاں نبھانے میں اس نے زبردست احساس ذمہ داری کا مظاہرہ کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ صبح سے لے کر کافی رات تک کاموں میں لگا رہتا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز اور تلاوت قرآن[3] کے بعد وہ انتظامی امور میں لگ جاتا۔ اس کی ذاتی مجلس رات میں شروع ہوتی اور یہی وہ وقت تھا جس میں اکثر وہ گورنروں کو احکامات بھیجتا اور حکمراں سے خط و کتابت کرتا اس کا دستر خوان آدھی رات کو چنا جاتا۔ چند علماء جو اس کے قریبی مصاحبت تھے اس کے بغل میں بیٹھتے مگر اس کی موجودگی میں کچھ بھی کھانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اپنے شاہی کھانے کا حصہ اپنے گھروں کو لے جاتے۔

سکندر کی چاق و چوبند انتظامیہ نے امن اور خوش حالی کی یقین دہانی مہیا کی اور ایک عام آدمی کو عدل و انصاف کی ضمانت دی۔ سلطنت کی تمام شاہراہیں ڈاکوؤں اور

---

(1) جون پور کے گورنر مبارک خاں لودی کے ساتھ خیانت کے ایک الزام کے سلسلہ میں سختی کا سلوک کیا گیا تھا، طبقات اکبری جلد اوّل ص 321، دہلی کے گورنر اصغر، مجاہد خاں، شمس خاں اور دیگر لوگوں کو رشوت ستانی اور غلط کاری کی بنا پر سزائیں دی گئیں۔

(2) امراء کے ذاتی زندگی سے بھی اسے باخبر رکھا جاتا۔ اسے خبر تھی کہ کسی طرح ایک امیر بھیکن خاں اپنے بستر کو اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔ جب رات میں بارش ہونے لگی تھی۔ واقعات مشتاقی ص 15 ب

(3) تاریخ شاہی کے مطابق (ص 49) وہ تہجد کی نماز کے بعد کھڑے ہو کر تین پارہ قرآن کریم کی تلاوت کرتا۔

رہزنوں سے محفوظ تھیں اور ایسے اقدامات کیے گئے تھے کہ عوام میں تحفظ کا ایک احساس پیدا ہو۔

میاں بھوا کی سرکردگی میں اس کے نظام عدلیہ کے تشکیل بڑے موثر طریقے پر کی گئی تھی۔ سلطان ایسے معاملات پر خود غور کرتا اور فیصلے دیتا اس کے پاس لائے جاتے۔ دریا خاں نوحانی کو صبح سے رات گئے تک درخواستوں کو وصول کرنے اور شکایات کی چھان بین کے سلسلہ میں دربار میں موجود رہنا پڑتا۔

سبھی واقعہ نگار سکندر کے زمانہ میں سلطنت کی خوشحالی اور دولتمندی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہر صبح بازار کی قیمتوں کا گوشوارہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا۔ ضروری اشیاء کی قیمتیں عموماً کم تھیں۔ ڈاکٹر ایس۔ اے۔ حلیم کہتے ہیں کہ "لیکن ہم اس تلخ حقیقت سے آنکھیں نہیں بند کر لے سکتے کہ ارزانی سونے اور چاندی کی کمی کے سبب سے اور چیزوں کی نقل و حرکت اور اشیا کی ادلا بدلی نہ ہونے کی باعث تھی کیونکہ سلطنت کا کوئی حصہ بھی سمندر کو نہ چھوتا تھا، دوسرے یہ کہ محکمہ مالیات میں رشوت ستانی کا بازار اب بھی گرم تھا جیسا کہ یہ بات میاں بھوا اور سلطنت کے درمیان اس موضوع پر گفتگو کے اس تذکرہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ رشوت ستانی کی روک تھام کس طرح کی جائے۔

1496ء کو چھوڑ کر جب فصلیں خراب ہو گئی تھیں، زرعی پیداوار عموماً بہتر ہی ہوتی، سلطان زراعت کی ترقی میں بذات خود بڑی دلچسپی لیا کرتا۔ اس نے غلوں پر سے زکوٰۃ (دو آمدی ٹیکس) ختم کر دیا تھا[1] اور اس نے ایک نئے معیار پیمائش کا آغاز کیا جو گز سکندری کے نام سے مشہور تھا اور جو مغلوں کے عہد تک برابر رائج رہا۔ جمع بندی کے کاغذات جو اس کے دور حکومت میں تیار کیے گئے تھے اس کے جانشینوں کے لیے نہایت قابل قدر ثابت ہوئے۔ ایڈورڈ تھوماس (Edward Thomas) کا خیال ہے کہ "باہر کے زمانہ کی اعداد و شمار کی رپورٹیں واضح طور پر سکندر بن بہلول کے جمع بندی کے کاغذات پر مبنی تھیں۔ بعد کے ہندستانی نظام لگان کی کارگزاری میں اس (سکندر لودی) کی بڑی دین ہے۔ گرچہ اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا ہے بہار کے جدول

---

(1) طبقات اکبری جلد اوّل ص320

(Tables) میں موجود ایک ہلکا سا اعتراف یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے[1]۔

سکندر لودی دہلی کے ابتدائی سلاطین کی روایات پر فوج کی تنظیم کی ضرورت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ قریبی رابطہ قایم رکھتا اور کہا جاتا ہے کہ جب اس کی فوج کوچ کر رہی ہوتی تو روزانہ اسے دو فرمان بھیجا کرتا تھا۔ صبح کا فرمان فوج کو اس سفر کے بارے میں جو اسے دن میں طے کرنا تھا ہدایت دیتا اور شام کا فرمان انہیں اس مقام کے بارے میں بتاتا جہاں انھیں رات میں خیمہ زن ہونا تھا[2]۔

سلطان کے بعض فیاضانہ اور مخیرانہ کاموں نے خصوصی طور پر عوام سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اس نے راجدھانی میں غریبوں کے درمیان پکے ہوئے اور نہ پکے ہوئے کھانوں کی روزانہ تقسیم کے انتظامات کیے تھے۔ اس کی سلطنت میں غریبوں اور محتاج کے لیے چھ ماہی، ہفتہ واری روزانہ کے بھتے اور وظیفے مقرر تھے[3]۔ جب وہ اپنے کپڑوں اور بستروں کو بدلتا تو انھیں بیچ دیا جاتا اور اس سے جو رقم حاصل ہوتی اسے یتیم لڑکیوں میں بطور جہیز تقسیم کر دیا جاتا[4]۔

سکندر لودی نے سماج میں غیر اخلاقی رجحانات کی روک تھام کے پیش نظر چند اقدامات کیے۔ اس نے بہرائچ کے جلوس[5] کی ممانعت کر دی جو جیٹھ (مئی جون) کے مہینے میں سالار مسعود غازی کی یاد میں نکالا جاتا تھا۔ مگر جس نے غیر اخلاقی افعال کے ایک موقعہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس نے بزرگوں کے مزاروں پر عورتوں کی آمد کی ممانعت کر دی تھی[6] ایک ایسا امتناعی حکم جو اصلاً فیروز شاہ تغلق نے ایسے غیر اخلاقی جرائم کے پیش نظر جاری کیا تھا۔ جنہوں نے اس طرح کے اجتماعات کو بدنام کر دیا تھا لیکن جو (حکم) اس (فیروز شاہ) کی موت کے بعد یقیناً نظر انداز کر دیا گیا ہوگا۔ اور جس کے نئے اجرا کی ضرورت تھی۔ سکندر نے ستیلا، جسے ضعیف الاعتقاد لوگ چیچک کی دیوی سمجھتے تھے، کی پوجا کی ممانعت کر دی تھی[7]

---

(1) ایڈورڈ تھومس (Edward Thomas) دی ریوینیو ریسورسیز آف دی مغل امپائر ص ص 4-3

(2) تاریخ داؤدی۔

(3) طبقات اکبری، جلد اول ص 336، فرشتہ جلد اوّل ص 189، واقعات مشتاقی ورق نمبر 14 الف۔ ب

(4) تاریخ شاہی ص 49

(5) واقعات مشتاقی ورق نمبر 15، تاریخ داؤدی ص 38

(6) تاریخ داؤدی ص 38۔

(7) واقعات مشتاقی ورق 49 الف۔ ب

فن اور تمدن کے لیے سکندر کے کام نا قابل توجہ نہ تھے۔ وہ علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں۔ فنکاروں اور شعرا وغیرہ کی سرپرستی کرتا اور خود گل رخی کے تخلص سے اشعار کہتا اس کی سخاوت و فیاضی نے عرب و ایران کے عالموں کو اپنی جانب کھینچ لیا[1]۔ ستر عالم ہر رات اس کے پلنگ کے ارد گرد بیٹھتے اور علمی و مذہبی مسائل پر بحثیں کرتے[2] اسی کی دعوت پر دو معروف و مشہور فلسفی۔ شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ۔ تلمبا سے دہلی آئے اور انھوں نے مروجہ نصاب تعلیم میں معقول مضامین کا بیشتر حصہ شامل کر کے مسلمانوں کے تعلیمی ڈھانچہ میں تبدیلی کی کوشش کی[3]۔

لیکن اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ سکندر لودی مذہبی معاملات میں تنگ نظر اور متعصب تھا اور دوسری حیثیتوں سے اس کی کامیاب حکومت غیر مسلموں کے ساتھ اپنے متعصبانہ مذہبی رویہ کی بنا پر داغدار تھی۔ اپنی ابتدائی عمر میں جب وہ ایک شہزادہ تھا وہ مولانا عبداللہ اجودھانی سے برہم ہو گیا تھا جنھوں نے تھانیسر کے ہندوؤں کی ایک مذہبی رسم میں اس کی دخل اندازی پر اعتراض کیا اور کہا تھا کہ اسلام اس طرح کی دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا لیکن جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس کا بت شکنی کا جذبہ نگر کوٹ کے مندر کے بتوں کو تباہ و برباد کر دینے کے ذریعہ ظاہر ہوا۔ اس نے ان بتوں کو قصائیوں کو گوشت تولنے کے لیے باٹ کے طور پر دے دیا۔ اس مذہبی پالیسی کی اتباع کے سلسلہ میں اس کے منشاء کا اندازہ کرتے وقت ایک شخص اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ روایت تو اسے جون پور میں شرقی حکمرانوں کی عمارتوں کو بھی برباد کر دینے کی ذمہ دار بناتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ اس کے دور حکومت میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنا شروع کیا[4] اور انھیں بڑی تعداد مختلف عہدوں پر فائز کیا گیا۔ ایک ایسی حقیقت جس کی جانب شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے بابر کی توجہ مبذول کی[5]۔

---

(1) اخبار الاخیار، ص220، تاریخ داؤدی ص36

(2) واقعات مشتاقی ورق نمبر 15

(3) شیخ عبداللہ کے پاس سکندر کی مودبانہ حاضریوں کے لیے ملاحظہ ہو بدایونی منتخب التواریخ جلد اوّل ص 334

(4) فرشتہ جلد اوّل ص187

(5) مکتوبات قدوسی ص337

سلطان ابراہیم لودی (1517-26ء)

تخت نشینی

سلطان سکندر لودی کی وفات کے بعد 8/ذیقعدہ 923ھ مطابق 22/نومبر 1517ء میں اس کے سب سے بڑے لڑکے ابراہیم کو تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن امرا نے ایک ہی شخص کے ہاتھوں میں طاقتوں کے ارتکاز کو پسند نہ کیا جیسا کہ سکندر کے دور حکومت میں ہو چکا تھا لہٰذا انھوں نے سلطنت کو دو اکائیوں میں تقسیم کر دینے کا انتظام کیا۔ ایک تو ابراہیم کی ماتحتی میں دوسرے اس کے چھوٹے بھائی جلال خاں کی ماتحتی میں۔ جون پور کی گزشتہ سلطنت کی سرحدوں تک کا حصہ ابراہیم کے حصہ میں آیا جب کہ جلال خاں کو اس خطہ ارض پر حکومت کرنا تھا جو شرقیوں کی حکمرانی میں تھا ایک معاہدہ ہو گیا اور اسی کے مطابق سلطنت کو تقسیم کر دیا گیا۔

لہٰذا جلال خاں اپنے ترکے کے حصہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے جون پور روانہ ہوا لیکن وہ چند دنوں کے لیے گالپی میں ٹھہر گیا اور تفریح و شکار میں اپنا وقت ضائع کر دیا۔ اس نے اعظم ہمایوں خاں سروانی کے بیٹے فتح خاں کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

سلطنت کی تقسیم دونوں بھائیوں نے باضابطہ طریقے پر کی تھی اور اگر اس کے احترام کا عزم موجود ہوتا تو یہ منصوبہ اچھی طرح پر چل سکتا تھا۔ مگر راپری کے جاگیر دار خاں جہاں لودی کی دربار میں آمد نے اس انتظام میں خلل ڈال دیا۔ اس نے سلطان ابراہیم اور امرا سے کہا کہ سلطنت کی تقسیم ناعاقبت اندیشانہ ہے اور جتنا جلد اس کو

منسوخ کیا جائے اتنا ہی یہ افغانوں کے مفاد میں بہتر ہوگا۔ خان جہاں لودی کا مشورہ سیاسی طور پر دانشمندانہ ہونے کے باوجود اپنی روح میں عیارانہ (Machiavellian) تھا اور یہ وعدہ شکنی کا نمونہ تھا۔ ابراہیم نے فوراً ہی خاں جہاں لودی کا مشورہ قبول کر لیا کیونکہ وہ اس کی اپنی خواہشات کے مطابق تھا۔

پہلے تو معاہدہ کی منسوخی کا فیصلہ کیا گیا پھر اس کی منسوخی کے لیے ذرائع و طرائق کی تحقیق و تفتیش کی گئی۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ اس سے پہلے کہ جلال الدین خاں اپنے آپ کو جون پور میں مستحکم کرے قدم اٹھانا ضروری ہے۔ اس لیے ایک فرمان جلال کے پاس نہایت شستہ اور دلکش زبان میں اس سے یہ درخواست کرتے ہوئے بھیجا گیا کہ وہ فوراً دربار واپس آئے کیونکہ ایک اہم معاملہ پر اس کے مشورے کی فوری ضرورت ہے۔ ہیبت خاں گرگ انداز جو ظاہری خوش نمائی اور ترغیب و تحریص کی صلاحیتوں کا حامل ایک نہایت دانشمند شخص تھا، اسے شیشے میں اتارنے کے لیے بھیجا گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہیبت اپنی منزل پر پہنچ سکے جلال کے پاس سازش کی اطلاع پہنچ گئی۔ ٹھیک وقت پر خطرے سے آگاہ ہو کر اس نے امرا کے سازشی داؤ کا شکار ہونے سے انکار کر دیا۔ تب ابراہیم نے شیخ زادہ سلطان محمد (شیخ سعید فرملی کا بیٹا) ملک اسماعیل (ملک علاؤالدین جلوانی کا بیٹا) اور قاضی حمید الدین حاجب جیسے امرا پر مشتمل ایک وفد اسی مشن پر روانہ کیا جس میں ہیبت خاں کو ناکامی ہو گئی تھی۔ یہ وفد بھی جلال خاں کو آگرہ آنے کی ترغیب نہ دے سکا۔ لہٰذا ابراہیم نے جلال خاں کے خلاف چند مثبت اقدام کیا اور اس سے پہلے کہ وہ جون پور میں اپنی پوزیشن مستحکم کر لے اسے مفلوج کر دینے کا فیصلہ کیا۔

جلال کے امرا کو اس سے برگشتہ کرنے اور ان کو اپنی حمایت میں کر لینے کے لیے ابراہیم نے انہیں بڑے تحائف اور مستقبل میں انعامات کے دعوؤں کے ساتھ متعدد فرمان بھیجے۔ ہر فرمان ایک معتمد افسر کے ذریعہ بھیجا گیا۔ جلال خاں کے چند ممتاز امرا نے جن کی ماتحتی میں تیس سے لے کر چالیس ہزار سپاہی تھے۔ مثلاً بہار کی ولایت کا حاکم دریا خاں نوحانی۔ غازی پور کا جاگیر دار نصیر خاں اور اودھ اور لکھنؤ کا ضابط شیخ زادہ۔ اپنے آقا کا ساتھ چھوڑ دیا اور ابراہیم سے جا ملے۔

اس لیے 15/ذی الحجہ 923ھ مطابق 29/دسمبر 1517ء میں ابراہیم نے دوسری بار تاج پوشی کی رسم منائی۔ اسی موقعہ پر امرا اور افسروں کی جاگیریں، خلعتیں، عہدے اور ذمہ داریاں عطا کی گئیں۔ حقیقت میں دوسری رسم تاجپوشی دراصل سابقہ معاہدے کے انتظام کی منسوخی کا اور ان علاقوں پر جو ابتدا میں جلال کے سپرد کیے گئے تھے ابراہیم کے خود مختارانہ حق کے دعوے کا ایک عام اعلان تھا۔

جلال کے ساتھ کشمکش

اس صورت حال کو قبول کرنے کی توقع جلال سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ اس معاہدے سے ایک شرمناک انحراف تھا جو اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان عمل میں آیا تھا۔ اس نے اپنی عسکری طاقت بڑھا کر اور مقامی زمینداروں سے مصالحت کر کے کالپی میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنی شروع کر دی اس نے سلطان جلال الدین کا خطاب اختیار کیا اور اپنے نام کو خطبے میں پڑھوایا اور سکوں پر منقش کرایا۔ جیسے ہی اس نے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی وہ گوالیار کی جانب روانہ ہوا۔ جہاں اعظم ہمایوں سروانی نے قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اسے یہ پیغام بھیجا کہ "میں آپ کی (اعظم ہمایوں) عزت اپنے باپ اور چچا کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ حق و انصاف کا ساتھ دیجیے اور اسی کی حمایت کیجیے"[1]۔ اعظم ہمایوں اس پیغام سے متاثر ہوا اور اس نے جلال سے جا ملنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کے درمیان فیصلہ ہوا کہ پہلے تو وہ جون پور کی ولایت کو مغلوب کریں گے۔ لہٰذا انھوں نے اودھ کے گورنر سعید خاں پر حملہ کر دیا، جو لکھنؤ بھاگ گیا اور ابراہیم کو حملہ کے بارے میں لکھا۔

اب ابراہیم کو حرکت کرنی پڑی۔ کسی بھی ناگہانی صورت حال کی ایک مدافعت کے طور پر اس نے اپنے قیدی بھائیوں۔ اسمٰعیل خاں، حسین خاں اور شیخ دولت خاں- کو ہانسی کے قلعہ میں بھیج دیا۔ لیکن ان کے لیے تمام آسانیاں فراہم کر دیں۔ 24/ذی الحجہ 923ھ مطابق 6/جنوری 1518ء کو وہ حد سے زیادہ تیزی کے ساتھ بھون گاؤں پہنچا اور قنوج پر حملہ کا منصوبہ بنایا۔ راستہ میں اسے یہ اطلاع ملی کہ اعظم ہمایوں سروانی

---

(1) نعمت اللہ، تاریخ خان جہانی، جلد اول ص ص 236-37

اور اس کے بیٹے فتح خاں نے جلال خاں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور وہ اس سے ملنے آ رہے ہیں۔ ابراہیم نے ان کے استقبال کے لیے اپنے ممتاز امرا کو بھیجا اور ان میں سے ہر ایک کو ایک خاص خلعت اور ہیروں سے جڑا ہوا ایک چھتر عنایت کیا۔

(پرگنہ) کوئل میں شامل جر تولی کے زمینداروں نے، جو اپنی سرکشانہ سرگرمیوں میں بدنام تھے اسی اثنا میں بغاوت کر دی اور ایک جھگڑے میں انہوں نے عمر خاں (سکندر خاں سور کے بیٹے) کو مار ڈالا۔ سنبھل کا گورنر ملک قاسم ان کے خلاف روانہ ہوا اور ان کے سرغنہ کو مار ڈالا۔ بغاوت فرو ہو گئی۔

جون پور کے متعدد امرا نے مثلاً سعید خاں اور شیخ زادہ فرملی نے جلال کا ساتھ چھوڑ دیا اور ابراہیم لودی سے جا ملے۔ اس سے اس کی پوزیشن کافی مضبوط ہو گئی۔ اعظم ہمایوں سروانی، اعظم ہمایوں لودی اور نصیر خاں نوحانی جیسے ممتاز افغانی امرا کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج جلال سے نمٹنے کے لیے بھیجی گئی، جو اس وقت کالپی میں خیمہ زن تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ فوج کالپی پہنچے جلال تیس ہزار گھوڑ سواروں اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد پر مشتمل ایک فوج کی سرکردگی میں آگرہ پر حملہ کے لیے روانہ ہو گیا نعمت خاتون، قطب خاں لودی، عماد الملک، ملک بدر الدین جلوانی اور وہ لوگ جو جلالی حرم سے متعلق تھے کالپی کے قلعہ میں چھوڑ دیے گئے۔ دہلی کی فوج نے کالپی کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور وہاں کئی دنوں تک گولیوں° کا مقابلہ ہوتا رہا۔ بالآخر کالپی کا قلعہ زیر ہو گیا۔ اور شہر کو لوٹا کھسوٹا گیا۔ کثیر مال غنیمت دہلی کی فوجوں کے ہاتھ لگا۔

سلطان ابراہیم نے آگرہ کی دفاع کے لیے ملک آدم کاکر کی ماتحتی میں ایک فوج روانہ کی جب جلال آگرہ کے قریب پہنچا تو اس نے ابراہیم کی فوج کے ذریعہ کالپی کی بربادی کے انتقام میں شہر کو تاراج کرنے کا ارادہ کیا۔ ملک کاکر نے حالات پر چالاکی سے قابو پایا اور آگرہ کے خلاف جلال کے حملہ کو ٹالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد ہی ملک اسمٰعیل جلوانی، کبیر خاں لودی اور بہادر خاں نوحانی کی ماتحتی میں کمکیں پہنچ گئیں۔ اس کے بعد ملک آدم کاکر نے موثر اقدام کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس نے ایک سخت

°(نوٹ: محمد امام الدین (مولفہ) تاریخ خان جہانی و مغزن افغانی، ص 239 "چند روز بجنگ توپ و تفنگ"۔ مترجم)

رویہ اختیار کرنے سے پہلے امن کی ایک درخواست کرنا بہتر سمجھا۔ اس نے جلال کو یہ پیغام بھیجا کہ اگر وہ اپنا چھتر، آفتاب گیر، نقارے، سکہ اور بادشاہت کی دیگر نشانیوں سے دستبردار ہو جائے اور ایک عام ملک کی طرح رہنا منظور کر لے تو وہ سلطان ابراہیم سے کالپی کی جاگریں اسے واپس دلانے کی درخواست کرے گا۔ جلال نے ان ذلت آمیز شرائط کو منظور کر لیا اور ملک آدم کاکر کے حق میں ان نشانات سے دستبردار ہو گیا۔ کاکر انہیں سلطان ابراہیم کے پاس اٹاوہ لے گیا۔ ابراہیم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور بذات خود جلال کے خلاف روانہ ہونے کا اور اس کا صفایا کر دینے کا فیصلہ کیا۔ جب جلال کو ابراہیم کے مقصد کی اطلاع ہوئی تو وہ گوالیار سے بھاگ نکلا اور اس کے راجہ سے پناہ مانگی۔ ابراہیم کچھ دنوں آگرہ میں ٹھہرا اور وہاں کے معاملات درست کیے۔ اس نے ہیبت خاں گرگ انداز، کریم داد اور دولت خاں اندر کو دہلی کی حفاظت کے لیے بھیجا۔ شیخ زادہ منجھو کو چندیری کی گورنری (ولایت) پر مقرر کیا اور مالوہ کے سلطان ناصر الدین خلجی کے ناتی سلطان محمد کو بھی بلا بھیجا۔

اس کے بعد ابراہیم نے گوالیار پر حملے کا اور جلال کی سرزنش کا فیصلہ کیا۔ گوالیار کو زیر کرنے کے لیے تیس ہزار گھوڑ سواروں اور ساڑھے تین سو ہاتھیوں پر مشتمل ایک فوج روانہ کی گئی۔ ابراہیم نے بھیکن خاں لودی، جلال خاں لودی، خضر خاں نوحانی اور خان لودی کی ماتحتی میں مزید کمکیں بھیجیں۔ جیسا کہ قسمت کو منظور تھا گوالیار کے راجہ مان کا اسی وقت انتقال ہو گیا۔ اعظم ہمایوں سروانی نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اسے زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جلال پہلے تو مالوہ بھاگا لیکن جب اسے محمود کا سلوک پسند نہ آیا تو وہ کڑا کٹنگا کی جانب مڑ گیا۔ راستہ میں وہ بھیلوں اور گونڈوں کے ہاتھوں میں پڑ گیا جنھوں نے اسے گرفتار کر لیا اور سلطان ابراہیم کے پاس بھیج دیا۔ اسے اس کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ ہانسی کے قلعہ میں نظربند کر دیا گیا۔ لیکن بعد میں ابراہیم کے کچھ حمایتوں کے مشورہ پر اسے مار ڈالا گیا۔

اپنے امرا کے ساتھ تعلقات

ابراہیم اپنے امرا اور ملکوں کے ساتھ اچھے تعلقات برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کے

ناقابل برداشت رویہ نے انھیں برانگیختہ کر دیا اور اس کے ارادوں کے متعلق ان کے دماغوں میں اندیشہ پیدا کر دیا۔

میاں بھوا لودی سلطنت کا ایک پرانا اور ممتاز امیر تھا۔ سکندر لودی اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اوزابن نے عدلیہ کے صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے تھے۔ اپنے بوڑھاپے کی بنا پر وہ پہلی کی سی کارگزاریوں کے ساتھ اپنے فرائض انجام نہ دے پایا۔ سلطان نے اسے ملک آدم کاکر کے زیر نگرانی قید میں ڈال دیا۔ اس کے فرائض اس کی جاگیر اور اس کے امتیازات - اس کے بیٹے کو منتقل کر دیے گئے۔ قید میں میاں بھوا کی موت نے اس کے خاندان میں ایک گہری نفرت پیدا کر دی اور قدیم افغانی امرا کو بھی متنفر کر دیا۔

ابراہیم کا اپنے قدیم امرا پر اعتماد رفتہ رفتہ ختم ہو گیا اور یکے بعد دیگرے اس نے ان میں سے بیشتر کو قید میں ڈال دیا۔ اعظم ہمایوں سروانی، جو گوالیار کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اور اسے تقریباً سر کر لیا تھا، کو اچانک آگرہ بلا لیا گیا۔ اور قید میں ڈال دیا گیا۔ جب اعظم ہمایوں کے بیٹے اسلام خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کڑا مانک پور میں علم بغاوت بلند کیا۔ اس نے اپنے والد کی تمام جائداد اپنے کنٹرول میں لے لی اور احمد خاں کو اس کا انتظام اپنے ہاتھوں میں نہ لینے دیا۔ احمد خاں نے اس کو للکارا لیکن اس کو شکست ہوئی۔ سلطان نے اس کی سرزنش کے لیے ایک فوج بھیجنے کے متعلق سوچا لیکن اسی اثنا میں اعظم ہمایوں لودی اور سعید خاں چپکے سے اپنی لکھناؤتی کی جاگیروں کی طرف بھاگ نکلے۔ انھوں نے اسلام خاں سے خط و کتابت کی اور سلطان کے خلاف ایک مشترک اقدام کا منصوبہ بنایا۔ ابراہیم نے احمد خاں (اعظم ہمایوں لودی کے بھائی) حسین فرملی کے بیٹوں، مجلس عالی شیخ زادہ محمود فرملی، علی خاں، غلی خان خاناں فرملی، مسند عالی نجاری خاں فرملی، دلاور خاں سارنگ خانی، قطب خاں (غازی خاں بلوتی)، بھیکن خاں نوحانی، سکندر خاں (ملک آدم کا بیٹا) اور دیگر لوگوں کی ماتحتی میں ایک بڑی فوج اسلام خاں اور سرکش امرا سے نمٹنے کے لیے بھیجی لیکن جب یہ فوج بنگر مئو کے قریب پہنچی تو اعظم ہمایوں لودی کا خاصہ خیل، اقبال خاں، پانچ ہزار گھوڑ سواروں اور چند ہاتھیوں کے ساتھ گھاٹ سے باہر آیا اور شاہی فوجوں پر حملہ کر کے اس نے انھیں

تتر بتر کر دیا۔

شکست کی اس خبر نے ابراہیم کے حواس باختہ کر دیے اور اس نے اعلان کیا کہ اوہ امرا جو باغیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر واپس لوٹے ہیں اس وقت تک مطعون رہیں گے جب تک وہ ان باغی امرا کو جن کی قیادت اسلام خاں کر رہا ہے، شکست دے کر اپنے عزت و مرتبہ کو دوبارہ حاصل نہ کر لیں۔ اس نے انکی فوجوں کو تقویت پہنچانے کے لیے مزید فوجیں بھیجیں۔ باغی فوج تقریباً چالیس ہزار گھوڑ سواروں اور پانچ سو ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس سے قبل کہ ان فوجوں میں تصادم ہو ایک ممتاز بزرگ شیخ بخاری نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور یہ بات طے ہوئی کہ اگر سلطان ابراہیم، اعظم ہمایوں سروانی کو رہا کر دے تو وہ لوگ اس کی مخالفت پر مصر نہ رہیں گے اور کسی دوسرے علاقے میں چلے جائیں گے۔ یہ معاہدہ ہو گیا تو دونوں فوجیں علاحدہ ہو گئیں لیکن سلطان نے اس سمجھوتے کو منظور نہ کیا۔ اس نے بہار کے گورنر دریا خاں نوحانی، نصیر خاں نوحانی اور شیخ زادہ فرملی کو احکامات جاری کیے کہ وہ باغیوں کے خلاف روانہ ہوں اور ان کا مواخذہ کریں۔ نتیجتاً ایک خون ریز جنگ ہوئی اور دونوں جانب بے شمار سپاہی مارے گئے۔ بالآخر شاہی فوجیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ اسلام خاں میدان جنگ میں مارا گیا اور دریا خاں نوحانی کے ملازموں نے سعید خاں لودی کو گرفتار کر لیا۔ ایک زبردست مال غنیمت دہلی کی فوجوں کے ہاتھ لگا۔ سلطان نے اس فتح کا جشن منایا اور صدقہ و خیرات میں کافی رقمیں تقسیم کیں۔ یہ امرا کے خلاف ایک زبردست فتح تھی۔

اسی وقت اعظم ہمایوں سروانی اور میاں بھوا کا قید میں انتقال ہو گیا اور بہار کے گورنر دریا خاں نوحانی اور امیر الامرا خاں جہاں لودی اور حسین فرملی نے بغاوت کر دی۔ چندیری کے گورنر حسین فرملی کو سلطان کے اشارے پر قتل کر دیا گیا۔ اس بات نے امرا کو مزید مخالفت و دشمنی پر اتار دیا کیونکہ انھوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی کہ سلطان تمام ذرائع سے ان کا صفایا کر دینے کے درپے ہیں۔

اس کے فوراً بعد ہی دریا خاں نوحانی کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا بہادر تمام باغیوں کے لیے ایک مرکز اجتماع بن گیا۔ بہادر نے بڑے پیمانہ پر بہار میں باغیانہ رجحانات برانگیختہ کیے اور تقریباً ایک لاکھ گھوڑ سواروں کو اپنے گرد جمع کر لیا۔ اس نے آزادی اختیار

کرلی اور سلطان محمد کی حیثیت سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے نام پر خطبہ پڑھا گیا اور سکے جاری کیے گئے۔ سلطان ابراہیم کی فوج سے شکست کھانے کے بعد غازی پور کا گورنر نصیر خاں نوحانی بھی بہار کے بہادر خاں سے جا ملا۔ اس طرح بہادر کی پوزیشن مزید مستحکم ہو گئی۔ ابراہیم نے اس سے نمٹنے کے لیے ایک فوج روانہ کی۔

سلطان نے اپنے امرا کے شکوک و شبہات برانگیختہ کر دیے تھے اور ان کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے بغاوت کر دیں۔ لاہور کا گورنر دولت خاں لودی کا ایک بیٹا جسے اس زمانہ میں ابراہیم کے پاس آنے کا اتفاق ہوا تھا یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ سلطان سلطنت کے تمام ممتاز امرا کے خلاف اقدام کا ارادہ کر رہا ہے۔ قید میں ڈال دیے جانے کے خوف سے وہ چپکے سے اپنے باپ کے پاس پہنچا اور اسے حالات سے باخبر کیا۔ دولت خاں نے ابراہیم کے خلاف ایک تحریک منظم کرنی شروع کر دی اور پنجاب کے تمام امرا اور جاگیرداروں کی حمایت حاصل کر لی۔

بابر کو دعوت اور پانی پت کی جنگ

ابراہیم سے متنفر ہو کر پنجاب کے امرا نے بابر کو کابل خط لکھا اور اسے ہندستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ سکندر لودی کا بھائی عالم خاں بذات خود اس مقصد کے لیے کابل گیا۔ بابر نے غلام خاں کے ساتھ اپنے چند امرا حالات کے جائزے کے لیے بھیجے۔ ان امرا نے سیال کوٹ، لاہور اور دیگر علاقوں کو فتح کر لیا اور بابر کو حالات سے باخبر کیا، جو یکم ربیع الاول 932ھ مطابق 16/ دسمبر 1525ء میں ہندستان کی فتح کے لیے روانہ ہوا۔ جب عالم خاں لاہور پہنچا تو اس نے اس بات پر زور دیا کہ چونکہ مغل اس کی دعوت پر آئے تھے لہٰذا دہلی کو فتح کرنے کے بعد اسے وہ اس کے سپرد کر دیں۔ عالم خاں اور مغلوں میں اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ لہٰذا عالم خاں چالیس ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ دہلی روانہ ہوا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ جب ابراہیم کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اسی ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج کی سرکردگی میں آگرہ سے چلا۔ عالم خاں نے دہلی کا محاصرہ چھوڑ دیا اور ابراہیم سے جنگ کے لیے تیار ہوا۔ اس نے ایک شبخون مارا اور ابراہیم کی فوجوں کو تتر بتر کر دیا لیکن ابراہیم نے جو پانچ

یا چھ ہزار سپاہیوں کی ایک جماعت کے ساتھ خیمہ سے باہر مقیم تھا۔ صبح کو عالم خاں کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ عالم خاں کو شکست ہو گئی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا اس کے بیشتر سپاہیوں کو مار ڈالا گیا۔

اسی اثنا میں بابر لاہور پہنچ چکا تھا۔ دولت خاں اور غازی خاں اپنے وعدے سے پھر گئے۔ اور ملوت° چلے گئے۔ میر خلیفہ نے عالم خاں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ ہو جائے بابر نے سنام اور سامانہ کی جانب پیش قدمی کی اور تردی بیگ کو چار ہزار گھوڑا سواروں کی سر کردگی میں مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے دہلی کی جانب روانہ کیا۔ ابراہیم نے داؤد خاں کو دس ہزار گھوڑ سواروں اور کچھ ہاتھیوں کے ساتھ تردی بیگ کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا، جس نے داؤد خاں کی فوج پر رات میں اچانک حملہ کر دیا۔ داؤد خاں کے بیشتر آدمیوں کو مار ڈالا گیا اور خود داؤد خاں کو گرفتار کر لیا گیا۔

جب ابراہیم خاں کو داؤد خاں کی شکست کی خبر موصول ہوئی تو اس نے بذات خود روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ ایک لاکھ گھوڑ سوار سپاہیوں اور پانچ ہزار ہاتھیوں لی ایک فوج اس کی ماتحتی میں روانہ ہوئی۔ اس کے علاوہ پا پیادہ فوج کی ایب بڑی تعداد اور آتشی اسلحے وغیرہ (بھی) تھے۔ بابر کی کارگر فوج آٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ لہٰذا اس نے جلد ہی یہ سمجھ لیا کہ لودی فوج کی زبردست تعدادی بالادستی کو غیر موثر بنا دینے کی صرف یہی صورت تھی کہ کسی ایسے مقام پر جنگ لڑی جائے جو اپنی جائے وقوع کے اعتبار سے اس کے موافق ہو اور سواروں اور توپ کے دستوں کے ایک موثر اشتراک کو کام میں لایا جائے۔ بابر نے کامیابی کے ساتھ (یہ) دونوں مقاصد حاصل کر لیے۔ ابراہیم کی فوجیں ٹھیک پانی پت کے جنوب میں تھیں۔ مغل فوج دو منزلوں میں آسانی کے ساتھ شہر پہنچ سکتی تھی۔ اور پانی پت کے گھروں اور عمارتوں کو اپنے داہنے بازو کے لیے بطور پناہ استعمال میں لا سکتی تھی[1]۔

[° سید محمد امام الدین (مولفہ) تاریخ خاں جہانی و مخزن افغانی ص 256، قلعہ بلوت، لکھا ہے۔ مترجم]

(1) رش بروک ولیمس، (این امپائر بلڈر آف دی 16 دی سینچوری، ص 128-38) (An Empire Builder of the 16th Century) نے جنگ کا ایک دلچسپ اور تفصیلی بیان پیش کیا ہے۔

بابر نے احتیاط کے ساتھ اپنی فوجوں کی ترتیب کا منصوبہ بنایا۔ خام چمڑے کی رسیوں سے بندھے ہوئے تقریباً سات سو چھکڑوں کو کام میں لا کر اس نے اپنے کمزور محاذ کو کثرت تعداد کے دباؤ سے بچایا۔ ہر چھ یا سات چھکڑوں کے بعد ایک دفاعی پشتہ (Breast work) تھا جہاں توپ خانہ کے دو ممتاز افسروں۔ استاد علی اور مصطفیٰ۔ کی عمومی نگرانی میں بندوقچیوں اور توپچیوں (Artillery-man) کو متعین کیا گیا تھا۔ یہ تمام تیاریاں کرنے کے بعد بابر دو منزل آگے بڑھا اور 12/اپریل 1526ء کو پانی پت کے شہر جا پہنچا۔ شہر نے اس کے داہنے بازو کو حفاظت مہیا کی اور بائیں بازو کی حفاظت ایک خندق کھود کر اور کٹے ہوئے درختوں کی اباطی (Abatis) کی تعمیر کے ذریعہ کی گئی۔ دفاعی پشتوں اور چھکڑوں کی ایک قطار کے ذریعہ قلب لشکر کو تقویت پہنچائی گئی لیکن صف میں کچھ کچھ دوری پر خالی جگہیں چھوڑ دی گئی جو اتنی چھوڑ دی گئی تھیں کہ پچاس یا سو گھوڑ سوار اس میں سے نکل کر حملہ کر سکیں۔

Rushbrook William کا خیال ہے کہ "چھکڑوں کی قطار دفاعی سے زیادہ جارحانہ ایک تدبیر تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کی صفوں کو ایک لمبے محاذ پر الجھائے رکھا جائے تاکہ (اس کی فوج کے) دونوں کناروں پر (بآسانی) حملہ کیا جا سکے۔ توپچیوں اور بندوقچیوں کے لیے یقیناً اس نے ایک پناہ گاہ کا کام لیا لیکن اس کو کسی بھی اعتبار سے ایک (Laager) یا قلعہ نہیں کہا جا سکتا[1]۔

12/اپریل کے بعد تقریباً ایک ہفتہ تک اور افغانی فوجیں حقیقی جنگ کا آغاز کیے بغیر میدان میں کھڑی رہیں۔ 19/اپریل کو بابر نے حملہ کی ایک غیر موثر کوشش کی بہر حال چند دنوں بعد جنگ شروع ہو گئی۔ بالکل گتھی ہوئی ایک جماعت میں جکڑے ہونے کے باعث ابراہیم کے آدمی نہ آگے بڑھ سکتے تھے اور نا ہی پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ جنگ صبح چھ بجے شروع ہوئی اور دوپہر تک افغانی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں افغانی لاشوں سے، جن کے درمیان ابراہیم کی لاش بھی تھی، پانی پت کا میدان جنگ ڈھک گیا۔ نعمت اللہ کا خیال ہے

---

(1) ایضاً، ص130۔

کہ "سلطان ابراہیم کے ماسوا ہندستان کا کوئی سلطان میدان جنگ میں نہیں مارا گیا"[1]۔ دہلی کی سلطنت جس کی پیدائش 1192ء میں ترائن کی میدان جنگ میں ہوئی تھی، اس نے 1526ء میں، چند میل دور، پانی پت کے میدان جنگ میں اپنی آخری سانس لی۔

---

(1) تاریخ خان جہانی جلد اوّل، ص 259۔

یادگار کہتا ہے (تاریخ شاہی ص 98) کہ لاشوں کے بیچ ابراہیم کو دیکھ کر بابر بہت متاثر ہوا۔ اس نے اس کے سر کو دھول سے اٹھالیا اور بڑی عزت و احترام سے اس کی لاش دفن کی اور اس کی روح کو آرام پہنچانے کے لیے اس نے قند حلوا تقسیم کیا۔